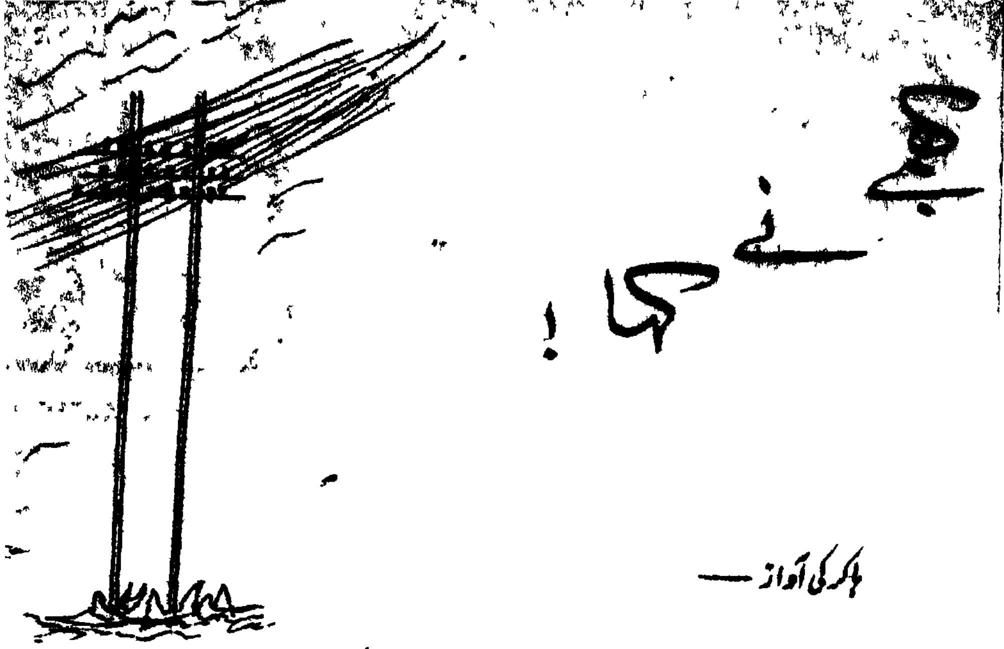
چراغ راہ



مرتبہ

نعیم صدیقی



ہاکر کی آواز —

"حضرت جوش ملیح آبادی ہجرت کرکے پاکستان
پہنچ گئے"

کھمبے نے کہا —

"کیوں کہ برصغیر ہندو پاک کے اسی اسلامی گوشے میں اب
شراب حلال رہ گئی ہے"

روشنی ـــــ ذی ـــــ حریت

ماہنامہ
چراغِ راہ
کراچی

☆

جنوری ۵۶ء

شمارہ ۱	جلد ۹

مندرجات



چندہ سالانہ: ۵/- روپے ☆ فی پرچہ: ۸/ آنے

دفتر اشاعت و انتظام: ـــــ ۹ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی نمبر ۱

دفتر ادارۂ تحریر: ـــــ ۱۲۔ شاہ جمال۔ اچھرہ۔ لاہور

چوہدری غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر چراغِ راہ۔ آرام باغ روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا۔

سوچ بچار

کچھ اپنی رام کہانی

☆
ادارہ

چراغ راہ میری ادارت میں آٹھ برس کا سفر طے کرکے نویں مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ اس صورت واقعہ کا تصور کرکے بالکل غیر شعوری طور پر میں ایک لمحۂ فکریہ سے دوچار ہوں۔

چراغ راہ ایک کاروبار نہیں، ایک ذریعۂ معاش نہیں، صحافت کی ایک دکان نہیں، بلکہ پہلے دن سے میں نے اسے اپنے ذہن میں ایک مشن اور ایک فریضہ کی حیثیت دی ہے۔ میں نے چاہا ہے کہ چراغ راہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے ایک ذہنی تربیت گاہ ہو، بڑھتی نسلوں کو زندگی بخش خیالات دے، خیالات کو اٹھان دے، اس کے ذریعے سوچنے سمجھنے کے انداز بدلیں، اس کے نقطہ نقطہ سے رس لے کر ایک نیا متحرک کردار پیدا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری قوم ایک بار پھر اس سرچشمۂ حیات کا سراغ پالے جس کے چند جرعوں نے اُسے ایک تاریخ ساز طاقت میں بدل دیا تھا۔ اسی مشن کے تحت مختلف علمی مسائل پر معلومات افزا تحقیقی مقالات پیش کئے گئے، اس کے لئے ملکی اور غیر ملکی سیاست کی بحثیں چھیڑی گئیں اور اسی کی خاطر ایک نئی ادبی شاہراہ پیدا کی گئی۔

بس یہ مسافر تہی دامن اور یہ رہرو بے سروسامان صرف اسی مشن کی متاع بے بہا لے کر چل کھڑا ہوا۔ نہ شہرت تھی کہ اس کا سہارا لیا ہوتا، نہ دوستوں کے ایسے حلقے تھے کہ ان پر تکیہ کیا جا سکتا، اور نہ چراغ راہ کو فروغ دینے کے لئے سرمایہ کی طاقت بہم تھی، نہ اشتہار کا طلسم باندھا گیا، نہ کوئی اور تدبیر کی گئی بلکہ فقط دو تین درجن خریداروں کے قافلے کے ساتھ بسم اللہ کہہ کر قدم اٹھا دیا۔ یہ تو خود اللہ ہی کی کارسازیاں ہیں کہ آج یہ ماہنامہ اوسط درجے کے کامیاب جرائد کی صفوں میں جگہ رکھتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ فی الواقع اپنے دور کی ایک زندہ "فکری طاقت" ہے۔ اور یہ چھوٹی سی طاقت ایک ایسی طاقت ہے جو ہمہ وقت معرضِ ابتلا میں رہ کر اور ایک تنہا "توشہید ناز" ہو کر بھی اپنے پاؤں پر کھڑی رہی ہے۔ جس خدائے عظیم کا میں ایک بندۂ ناچیز ہوں اس کے کرم خاص کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس نے اپنے بندۂ مجبور کی غیرت و حمیت پر کبھی کوئی آنچ نہ آنے دی۔ اس نے مجھے اس سے بچایا کہ میں چراغ راہ کی سلامتی کے لئے کسی کا منت کش ہوں، کسی کا دروازہ کھٹکھٹاؤں اور کسی کوچے میں دریوزہ گری کروں۔ میرا ذہن ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جب تک ایک خدمت انجام دینا ممکن رہے گا، دیتا چلا جاؤں گا، جب دیکھوں گا کہ اب حالات اسے جاری رکھنے کے لئے بالکل ناسازگار ہو گئے ہیں تو پھر زمانے سے سازگار حالات کی بھیک مانگتے پھرنے کے بجائے اسے چھوڑ کر کسی دوسری خدمت میں اپنے آپ کو لگا دوں گا۔ ایسے اونچے عزائم اور جذبات کی لاج اگر خود اللہ تعالیٰ ہی نہ رکھنے والا ہو تو مٹی کی ایک مٹھی آخر کیا چیز ہے اور وہ اپنے کس دعوے پر پوری اتر سکتی ہے!

چراغ راہ ایک فکری طاقت ہے مگر ایک مالی طاقت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہے، درحقیقت بہت سارے حصہ داروں کی قربانیوں کے دم سے ہے۔ ایک قربانی وہ ہے جو اس کے قارئین — اور زیادہ تر غریب اور متوسط طبقہ کے قارئین — اپنی کمائی کا ایک حصہ اس پر صرف کرکے عمل میں لاتے ہیں۔ اور قسم قسم کے مصور، رنگین، چٹ پٹے مواد سے آراستہ رسائل کو مسترد کرکے ان کے مقابلے میں چراغ راہ کو دیدہ و دل میں جگہ دیتے ہیں۔ پھر ایک قربانی یہ جو اس سلسلے کے مؤسس اور اس کے "برائے نام" مالک کی طرف سے دی جا رہی ہے کہ وہ اسے منافع سے بے نیاز ہو کر اور اس کی ساری آمدنی لگا کر

کہ اسی میں صرف کرکے اس کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اور ان قربانیوں کے ساتھ ایک حقیر سی قربانی اس کے مدیر کی بھی شامل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی معاشی مشکلات کو خندہ پیشانی سے گوارا کرتے ہوئے، چراغ راہ کی لَو کو اونچا رکھنے کے لئے چند برس سے مصروف کاوش ہے۔ اس کے پاس اور کچھ نہیں، وہ صرف اپنی محنت و قوت کو نچھاور کر سکتا ہے اور صرف اپنے دل و جگر کو گھلا سکتا ہے، سو اپنی دانست میں اس نے اپنے حصے کی یہ قربانی دینے میں کبھی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس کا حال یہ ہے کہ نحیف و زار جسم کے ساتھ بسا اوقات وہ صبح سے قلم ہاتھ میں تھام کر جو بیٹھتا ہے تو شام ہو جاتی ہے اور شام سے جو وہ اپنے موضوعات فکر پر سوچنے میں مصروف ہوتا ہے تو صبح کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی سے تفریحات خارج ہو گئی ہیں، چہل قدمی تک کے لئے وقت نہیں ملتا اور ہفتہ میں کوئی ایک دن ایسا نہیں جس کے بارے میں وہ یہ کہہ سکے کہ آج چھٹی کا دن ہے۔ اس کے کیلنڈر میں چھٹی صرف اس دن ہوتی ہے جس دن تن زار کی نقاہت، اعصاب کا ضعف، درد سر کا شدید حملہ یا کسی بیماری کی آمد اسے کام کرنے کے بالکل قابل نہ چھوڑے۔ اس پر نہ کسی سے داد مطلوب ہے، نہ کلمۂ ہمدردی اور نہ کوئی صلہ! ــــ بس اتنی ہی تمنا ہے کہ کاش ایک بے بضاعت بندہ پر گزرنے والی یہی گھڑیاں خدا کی میزان میں قبولیت کا وزن حاصل کر جائیں۔

اس آٹھ برس کے عرصے میں چراغ راہ کے اوراق میں میں نے اپنے قلم سے کئی لاکھ الفاظ لکھے ہوں گے اور طرح طرح کے موضوعات پر گوناگوں اسالیب سے لکھے ہوں گے۔ توقع ہے کہ کچھ قابلِ قدر خدمات بھی انجام پائی ہوں گی اور انکار نہیں کہ غلطیاں بھی بے شمار صادر ہوئی ہوں گی۔ طرح طرح کے خیالات ذہن میں آتے ہیں اور وہ نگارشات میں اپنا راستہ پیدا کرتے ہیں، رنگا رنگ جذبات و تاثرات ہوتے ہیں جو قلم کی زبان سے بیان ہو جاتے ہیں، قسم قسم کی نفسیاتی کیفیات ہیں کہ جن کا پرتو کاغذ پر پڑے بغیر نہیں رہتا۔ اندھا دھند نہیں لکھتا، سوچتا ہوں اور دیر دیر تک سوچتا ہوں۔ اپنی قوت نقد و نظر کو تھپک کر سلا نہیں دیتا بلکہ اپنی کاوشوں کو اس کی نگاہ کی کسوٹی پر رکھتا ہوں۔ بھلے برے کی تمیز کرنے والی چشم باطن پر پٹی نہیں باندھے رکھتا بلکہ اشاعت سے پہلے ہر چیز کے لئے اس کی منظوری لیتا ہوں۔ لیکن آدمی کی اس ساری چھان پھٹک کے باوجود لغزشِ فکر اور سہوِ قلم کے حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس فریبِ نفس میں کبھی مبتلا نہیں ہوا کہ میرا قلم معصوم ہے، دوسری طرف اپنے آپ سے اتنا بدگمان بھی نہیں ہوں کہ یہ انکسار کروں کہ میرے پلے صرف غلطیاں اور لغزشیں ہی ہیں، کوئی کام کی خدمت کبھی سرانجام نہ پائی ہوگی۔ خدمات خدمات ہیں اور غلطیاں غلطیاں! ان پر اظہار شکر، اور ان پر درخواستِ عفو! وہ اللہ کی عطا، یہ نفس کی کوتاہی!

خدمات سرانجام دیتے ہوئے اور غلطیاں کرتے ہوئے مجھے جن مختلف عناصر سے گزشتہ آٹھ برس میں سابقہ پڑا ہے ان میں سب سے پہلے میں اپنے تھوڑے سے ان دوستوں کا ذکر کروں گا جو مجھ سے محبت کرتے ہیں اور محبت کرنے کے علاوہ اور کوئی معاملہ مجھ سے نہیں کر سکتے۔ ان دوستوں کے سامنے میری کوئی اچھی خدمت آئی تو ان کے دل باغ باغ ہو گئے اور یہ اسے لئے لئے پھرے ہیں کہ دیکھو ایک لکھنے والے نے یہ لکھا ہے اور یوں لکھا ہے۔ اور ان کے سامنے اگر میری کوئی کوتاہی آئی تو بس وہ مسکرا دیئے اور اس کے اندر سے بھی ان کے حسنِ ظن نے کوئی نہ کوئی اچھا پہلو اخذ کر لیا، بلکہ اگر کسی نے ان کے سامنے حرف گیری کی تو یہ دوست نواز نفوس اپنے دوست کی طرف سے مدافعت کرتے رہے۔ ان سے چونکہ مجھے بھی صرف محبت ہی محبت ملی اس لئے میں بھی جواب میں صرف خراجِ محبت ہی پیش کر سکا۔ ان کی اس والہانہ محبت نے جو فائدہ مجھے پہنچایا ہے وہ یہ ہے کہ ہر قسم کے حالات میں میرا حوصلہ بلند رہا اور قدم قدم پر مجھے سہارا ملتا رہا!

کچھ لوگوں کی طرف سے اپنی خدمات کے بارے میں مجھے ایسے ایسے تعریفی خطوط موصول ہوتے رہے ہیں کہ جن کو پڑھ کر ایک بار تو آدمی اپنا بندۂ عاجز ہونا بالکل بھول جائے۔ بلاشبہ کسی کے ہاتھوں سرانجام پانے والے اچھے کاموں کے لئے کچھ نہ کچھ احساسِ قدر دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور آج جبکہ خدا کا دین مدت سے مظلوم ہے، دین کی حمایت میں کسی کا کوئی کلمۂ خیر کہہ دینا اہلِ دل کی نگاہوں میں قیمت پا جاتا ہے، اور ایسے تاثرات کو ظاہر کرنے کی تحریک بھی بہت سے

لوگوں میں ہو سکتی ہے مگر آدمی کو مخاطب کر کے اس کی تعریف کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ تعریف و ستائش بڑے بڑوں کے سر پھرا دیتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھ جیسے کمزور آدمی کو اس ابتلاء میں نہ ڈالا جائے۔ جو لوگ میری کسی خدمت کو موجبِ خیر و برکت پائیں، وہ بس اللہ سے میرے گناہوں کی معافی اور میری دنیا و آخرت کی بھلائی کی دعا تنہائی کے اوقات میں فرما دیا کریں۔ اتنا میرے لئے کافی ہے۔ یوں میں اپنے ذہن کی ساخت کے بارے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ کام کرتے چلے جانے اور اپنی دھن میں لگے رہنے کے لئے مجھے داد و تحسین کی محرک دواؤں کی خوراکوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ایک اندرونی اکساہٹ ہے جو مجھ سے کام لیتی چلی جاتی ہے اور اس میں جب کبھی کمی آتی ہے تو آخرت کے خوفناک مراحل کا تصور اسے پھر تیز کر دیتا ہے۔

مجھے اس کا خوب اچھی طرح شعور ہے کہ زبان و قلم کی قوت سے کام لینے والا آدمی عمر بھر کے لئے کسی خطرناک ابتلاء میں پڑ جاتا ہے۔ یہی فتنہ کیا کم ہے کہ ایک آدمی کے ہزارہا جاننے والے پیدا ہو جائیں، مجلس مجلس اس کا نام لیا جانے لگے اور اس کا سفینہ شہرت کے گرداب میں جا پھنسے۔ یہاں پہنچ کر آدمی پر ایک تباہ کن نشہ سوار ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھنے لگتا ہے۔ اس پر یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہوگا، اگر اس غریب کے بارے میں یہ تصورات باندھے جانے لگیں کہ وہ کوئی بڑا عالم فاضل ہوگا اور مغالطوں ہی مغالطوں کے بل پر اس سے غیر معمولی قسم کی توقعات استوار کی جانے لگیں پھر غضب ہو جائے گا، اگر ان عجیب و غریب تصورات اور مغالطوں کو لکھ لکھ کر اس کے پاس بھیجا جانے لگے کہ تم یہ ہو اور تم وہ ہو اور تمہارے بارے میں ایسے اور ایسے اندازے باندھے جا رہے ہیں۔ مجھے اگرچہ خدا سے یہی امید ہے کہ وہ میرے قلب کی ناؤ کو ان بھنوروں سے بہ سلامت پار نکال لے جائے گا، مگر پھر بھی میں اپنے قدر دانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میری ناتوانیوں کا لحاظ کریں جیسے لئے میرے حلقۂ تعارف کی روز افزوں وسعت ہی خود ایک بارِ گراں ہے، کجا کہ مجھ پر اور زلزلے و جھل پہاڑ لا دے جائیں!

ایک عنصر — اور صحیح معنوں میں خیر خواہ عنصر — مجھے اللہ نے ایسا بھی دیا ہے جو بہ حیثیت مجموعی مجھ سے اور میرے کام سے حسنِ ظن رکھتا ہے اور یہی اخوت کے جذبہ کے ساتھ میری کوتاہیوں پر گرفت کرتا اور براہِ راست مجھے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ یہ لوگ ہیں کہ جو اگر میرے آس پاس، دائیں بائیں موجود نہ ہوں تو میں تباہی کے کسی بھی خوفناک گڑھے میں گر سکتا ہوں۔ کسی کی غلطی پر ٹوکنا بڑا سخت کام ہے اور کسی کو اس کی کوتاہی پر متنبہ کرنا ایک تلخ فرض ہے، مگر یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب یہ اپنا تلخ فرض ادا کرتے ہیں تو ان کے لفظ لفظ سے ان کی پاکیزہ نیت پھوٹی پڑتی ہے اور ان کے فقرے فقرے میں خیر خواہی اور دلسوزی کی روح متحرک معلوم ہوتی ہے۔ یہ گرفت کرتے ہیں تو ان پر پیار آتا ہے، یہ کوئی بات لکھتے ہیں تو اسے پڑھ کر ذرہ بھر بھی بدگمانی نہیں ہو سکتی۔ چراغِ راہ کے بنانے سنوارنے کے کام میں درحقیقت ان کا بہت بڑا حصہ ہے اور خود میرے فکر و کردار کی تشکیل میں ان کے بڑے قابلِ قدر احسانات شریک ہیں۔

کچھ ہستیاں ایسی بھی قسمت میں آئی ہیں کہ جنہیں اگر مدیرِ چراغِ راہ کی کوئی لغزش اور کوتاہی ہاتھ آ گئی ہے تو انہوں نے اس کو اس طرح سے لیا ہے جیسے برسوں کے انتظار کے بعد ایک زریں موقع ہاتھ آیا ہو۔ ان حضرات کو خدمات کے کھاتے میں شاید کبھی کوئی چیز نہیں ملتی، ان کی نگاہ ٹکتی ہے تو کسی بھول چوک، کسی لغزش اور کسی غلطی کے مقام پر اٹک سکتی ہے۔ کوئی ایک غلطی اور لغزش ان کو ہاتھ آ جائے تو ایک طرف وہ ان کے ہاں گرمیٔ محفل کا سامان بن جاتی ہے اور دوستوں، عزیزوں اور معتقدوں اس کو رگیدتے رہتے ہیں، دوسری طرف وہ اگر خود مجھے مخاطب فرماتے ہیں تو ایسے ایسے سنگین خط لکھتے ہیں اور اتنی تہدید آمیز طویل عبارت میں شدتِ تاثر بیان فرماتے ہیں گویا آسمان ٹوٹ پڑا ہے، زمین شق ہو گئی ہے، قیامت کی قرنا بج گئی ہے، دین کی بنائیں متزلزل ہو گئی ہیں اور چراغِ راہ کے آٹھ سال کے کئے کرائے پر پانی پھر گیا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ اس آٹھ سال میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بار ہا شدتِ غم و غضب کے ساتھ مجھے مخاطب کیا گیا ہے اور کتنے ہی خطوط مجھے ایسے ملے ہیں کہ جن کے لکھنے والوں نے اس کا خیال نہیں کیا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ حاشیٔ

توازن کھو بیٹھنے کے بعد لکھا ہے ۔ ایسے جبر باتوں کی بھی میری مجلس میں ایک اہم جگہ ہے ۔ ان حضرات کے طفیل دماغ درست رہتا ہے اور یہ سر پھرا چینے والے تعریفی کلمات کا توڑ کرتے رہتے ہیں ۔ ان سے بس اتنی گزارش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ میں زیادہ موٹی کھال رکھنے والا آدمی نہیں ہوں ۔ نہ میرے قلب کی ساخت میں قدرت نے زیادہ ٹھوس مادہ استعمال کیا ہے ۔ مجھے کسی چیز پر متنبہ کرنے کے لئے ایک ہندیت اشارہ کافی ہوتا ہے ۔ اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ایک آدھ فقرے میں مجھے میری کسی غلطی پر متوجہ کر دیا جائے ، اور اس کی بھی بس ایک ہی بار تکلیف کرنا کسی کی طرف سے بہت ہوتا ہے ۔ پس جہاں ایک پن کی نوک سے کام چل سکتا ہو وہاں برچھی یا کدال لے کے اگر آپ میدان میں اتر آئیں گے تو یہ زیادتی ہوگی ۔ ایک صاحب احساس آدمی سے معاملہ ہو تو آخر معمولی باتوں پر طامن کے آہنی کوڑے برسانے کی کیا حاجت ہے ۔

اپنے کرمفرماؤں کی اس صف کا یہ پارٹ صرف ایک برا اثر مجھ پر ڈالتا ہے ۔ مجھے یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ میرے کام میں کہیں غلطیوں کا پلہ خدمات سے زیادہ بھاری تو نہیں ہوا جا رہا ۔ میں اپنا کام اسی حسن ظن کے ساتھ کر رہا ہوں کہ اس میں غلطیاں ہیں ، لیکن ان کا پلہ خدمات سے بھاری نہیں ہے ۔ بخلاف اس کے اگر دوسری طرح کا شبہ ہونے لگے اور میں محسوس کروں کہ غلطیوں کا پلہ بھاری ہوا جا رہا ہے تو پھر میرے اندر سے اس کام کو جاری رکھنے کا ولولہ ہی جواب دینے لگتا ہے ۔ یہ کام ایک ایسا کام ہے کہ جس میں آدمی اپنا نامۂ اعمال خود اپنے قلم سے قلمبند کرتا رہتا ہے ۔ اب اگر ایسے از خود ریکارڈ ہوتے چلے جانے والے کام کے بارے میں یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ یہ لوگوں کی دینی و دنیوی بھلائی میں جتنا اضافہ کرتا ہے اس سے زیادہ اسے نقصان پہنچا رہا ہے تو پھر ایسے کام کو صرف وہی شخص جاری رکھنے کا حوصلہ کر سکتا ہے جو آخرت کے بارے میں بالکل لاپروا ہو ۔ مجھے جب کبھی اس طرح کا اندیشہ ہوتا ہے تو میں اس کام کی بساط لپیٹ دینے پر تل جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ اس سے ہزار درجہ بہتر ہوگا کہ آدمی ٹوکری ڈھولے یا گھاس کھود لے ۔ چنانچہ اس وقت جب کہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں ایک ایسی ہی ذہنی کیفیت سے گزر رہا ہوں ۔ میں برابر سوچتا بھی ہوں اور بطور استخارہ خدا سے یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ اگر چراغ راہ کے ذریعے میں کوئی کار خیر انجام دے رہا ہوں تو وہ مجھے موجودہ پریشانی اور پست ہمتی کے عالم سے نکال لے اور اگر میں اپنی اور دوسروں کی دنیا و عاقبت کو خراب کرنے کا ذریعہ بن رہا ہوں تو وہ مجھے اس کام کو جاری رکھنے کی توفیق نہ دے ۔ آخر یہ راتوں کی نیندیں حرام کرنا کاہے کے لئے ؟ یہ اپنی جان کو گھلانا کس غرض سے ؟ یہ معاشی حوصلوں کی بساط لپیٹ کر فقر و فاقہ کی زندگی کو خوش آمدید کہنا کون سے مقصد کی خاطر ؟ اگر اس قربانی سے اسلام اور سچائی کا بول بالا نہیں ہوتا ، اگر اس سے انسانیت کی بھلائی حاصل نہیں ہوتی تو پھر یہ سب کچھ فضول ہے ۔ اگر میرے قلم نے بگاڑا بہت اور بنایا کم ہے ، تو میں ایسے قلم کو بھاڑ میں جھونک دوں گا ۔ میرا قلم میری نگاہ میں کوئی بت نہیں ہے کہ جسے میں پوجتا رہوں اور یہ میرا کوئی پیشہ وارانہ اوزار نہیں ہے کہ پیٹ کا دھندا چلانے کے لئے میں کسی قیمت پر چھوڑ نہ سکوں ۔ میرے مہربانوں کی اس صنف کا پارٹ بالعموم اسی طرح میرے لئے حوصلہ شکن ثابت ہوتا رہا ہے اور اس کی عنایات کی وجہ سے بار بار مجھے اضمحلال سے دوچار ہونا پڑا ہے ۔ مانتا ہوں کہ اس معاملے میں میری طبیعت کی اپنی کمزوریاں ضرورت سے زیادہ اثر لینے کا موجب ہوتی ہیں ، اگر میں جو کچھ ہوں ، وہی ہوں ۔ مجھ سے اگر کام لیا جانا ہو تو مجھے چاہیے داد نہ دی جائے لیکن براہ کرم بیداد نہ کی جائے ۔ یہ سلوک میری قوت کو تباہ کرتا ہے ، یہ میرے زور قلم کو ختم کر دیتا ہے اور میرے بڑھتے ہوئے قدم اس کی وجہ سے رک جاتے ہیں ۔ میں باہر کی مخالف طاقتوں کی چیرہ دستیوں سے کبھی نہیں ڈرا ، میں بیگانوں کی زیادتیوں کی وجہ سے کبھی نہیں پسپا ، لیکن اگر چراغ راہ کے اپنے حلقوں سے زیادتی ہونے لگے تو پھر میں محسوس کرتا ہوں کہ میں کمزور ہو گیا ہوں ، میرے نیچے میں گیرائی نہیں رہی ، میرے قلم کی روانی ختم ہو رہی ہے اور میں حریف کے سامنے مضبوطی سے کھڑا نہیں ہو سکتا ۔

ان جارحانہ عناصر کے بعد ہمارے وہ عام قارئین ہیں جو چراغ راہ سے بڑی وابستگی رکھتے ہیں ، اسے طریقے سے خود پڑھتے ہیں ، اگر یہ بھلا یا برا جیسا کچھ بھی

مواد آ رہا ہے، یہ سرے سے اپنے تاثرات ہی سے آگاہ نہیں کرتے اور نہ کبھی کوئی مشورہ دیتے ہیں۔ ان حالات میں یہ بدگمانی ہونے لگتی ہے کہ جیسے کوئی مثبت دلچسپی کارفرما ہی نہیں ہے۔ بارہا ہم ایسی غیر معمولی چیزیں اشاعت کے لئے دیتے ہیں جن کے بارے میں توقع ہوتی ہے کہ ان کے بارے میں بڑے زور شور سے اچھا یا برا ردِ عمل سامنے آئے گا۔ مگر بس ہُو کا ایک عالم طاری رہتا ہے۔ ہم اپنی طرف سے ایسی چیزیں پیش کرتے رہتے ہیں کہ جن سے ذہنوں میں ایک اتار چڑھاؤ پیدا ہو مگر دیکھتے ہیں ایک بحرِ منجمد جوں کا توں پڑا ہے اور اس میں کوئی موج انگڑائی نہیں لیتی۔ کم سے کم ہمیں اس کا ثبوت تو ملنا چاہیئے کہ رسالہ محض تبرکاً خرید کر اور آنکھوں سے لگا کر نہیں رکھ دیا جاتا بلکہ ہم جو کچھ لکھتے ہیں اسے پڑھا جا رہا ہے۔

چراغِ راہ کا وجود سب سے بڑھ کر جن لوگوں کا منت کش ہے وہ بے لوث اور رضاکارانہ جذبات کے ساتھ اس کی قلمی اعانت کرنے والے محسن ہیں۔ ایک رسالے کو اچھے معیار اور حسنِ تنوع کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے ایڈیٹر کم سے کم تین چار مستقل قلمی معاونین کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ چراغِ راہ کا آغاز جب کیا تھا تو میں نے تنِ تنہا اس وادیٔ پُرخار میں قدم رکھ دیا تھا، لیکن بہت تھوڑی مدت میں اندازہ ہوا کہ "یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں"۔ چنانچہ چراغِ راہ پر پانچ چھ معیاری اصحابِ قلم کی نوازشات رہی ہیں اور بغیر اس کے رہی ہیں کہ میں نے کبھی ذاتی طور پر ان کو کھٹکھٹایا ہو اور خط لکھ لکھ کر اصرار کیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ میرے رفیق خالد صدیقی صاحب کی طرف سے کچھ مراسلت ہو جاتی ہے مگر ہمارے اندازِ استغنا کے جواب میں ادھر بھی ایک شانِ بے نیازی رہتی ہے کہ اگر لکھتے رہیں تو لکھتے رہیں، لیکن میدان سے غائب ہوں تو ایسے کہ مہینوں پتا نہیں چلتا کہ وہ یارانِ حلقہ کہاں گئے — جیسے کبھی واسطہ تھا ہی نہیں۔ جب کبھی یہ دورِ ہجر آتا ہے تو میں بایں ہمہ مشاغل تنِ تنہا چراغِ راہ کی ترتیب کا سارا بوجھ اٹھاتا ہوں اور ایک ہی قلم سے اس کے صفحات پر گلہائے رنگارنگ کے تحفے آراستہ کرتا ہوں۔ میرا تو یہ بالکل ذاتی مشن اور شخصی فریضہ ہے، اس میں کوئی ہاتھ بٹائے تو اس کا احسان، نہ بٹائے تو بغیر کسی گلہ شکوہ کے مجھے تو اس مشن اور فریضے کے تقاضے پورے کرنے ہی ہیں۔ کاش کہ یہ چند رفقائے "چراغِ راہ" کم سے کم ہر سہ ماہی میں ایک چیز مرتب کر کے عنایت فرماتے رہنے کا معمول اختیار کر لیں۔

لیکن ان خاصانِ کرام سے بڑھ کر چراغِ راہ کو جاری رکھنے اور اسے دلچسپ بنانے میں ہمارے نوخیز قلمی رفقا کا حصہ ہے۔ اور میں ان کا بہت ہی شکر گزار ہوں کہ یہ ہمارے سنگدلانہ سلوک کے باوجود صدقِ دل سے تعاون کرتے ہیں۔ ہم ان کی چیزوں کو لوٹاتے ہیں، ان میں قطع و برید کرتے ہیں اور ان کو ان کے حسبِ پسند مرتبہ و مقام نہیں دیتے پھر بھی وہ دل پر پتھر رکھ کر ہمارے ساتھ نباہ کرتے ہیں۔ ہم جہاں ان کی بے حد قدر کرتے ہیں، وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ ایڈیٹری کی بہت ساری آزمائشیں بھی انہی کے دم قدم سے ہیں۔

یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ نوخیز رفقا کی صفوں میں صاحبِ صلاحیت ہستیاں بہت ہی کم ہیں جن سے مستقبل کے لئے امیدیں باندھی جا سکیں۔ ان میں کچھ حضرات ایسے نمودار ہوتے رہتے ہیں جو محض معشوقۂ شہرت کے جنون میں کچھ کوچوں کی گردش کرنے کے بعد ناکامی اور مایوسی سے دوچار ہو کر ایک نئے کوچے میں قسمت آزمائی کرنے آتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اپنے خطوں میں یہ لکھتے ہیں کہ وہ فلاں حلقہ میں بڑے مقبول تھے اور فلاں فلاں جرائد ان کی نگارشات کو ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے مگر وہ اب اپنے سابق ادبی اسکول سے بیزار ہو کر اسلامی حلقۂ ادب کی طرف مائل ہو گئے ہیں (ہم مستثنیٰ رکھتے ہیں ان صاحبِ صلاحیت حضرات کو جو فی الواقع قلب و نظر کی تبدیلی سے گذرتے ہیں) حالانکہ ان کی نگارشات ان کے سارے بیان کی تردید کر رہی ہوتی ہیں۔ ان کا اصل مطلوب صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی کوئی چیز ان کے نام کے ساتھ کہیں چھپ چھپا جائے۔ ان کا یہ مطالبہ پورا نہ ہو تو پھر ردِ عمل بڑا سخت ہوتا ہے، مگر بعض طویل المیعاد صبر کے ساتھ اپنے عشق میں سرگرداں رہتے ہیں۔

ایک گروہ اس صف میں ایسے حضرات کا بھی ملتا ہے جو غلبۂ اسلام کے جذبۂ صادق کے تحت میدانِ عمل میں متحرک نظر آتے ہیں اور لیتے اس جذبۂ صادقہ

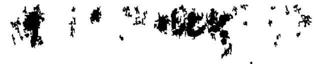
جو صحیح ادبی صلاحیت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور پھر اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قلم تھام لیتے ہیں۔ ان کو ہم جس چیز سے پہچانتے ہیں وہ جذبۂ اخلاص کے ساتھ قوت تخلیق و ایجاد کے فقدان کا پایا جانا ہے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو ادھیڑ عمر یا بڑھاپے میں پہنچ چکے ہیں اور اب وہ اوائل زندگی کا آغاز کر رہے ہیں اور بعض وہ کہ جنہوں نے جب سے آغاز کیا ہے وہ ایک ہی مقام پر ٹھہرے ہیں اور شاید دس برس بعد بھی وہ اسی مقام پر کھڑے ملیں گے۔ گویا "ادب برائے ضرورت" کا بجائے خود ایک اچھا خاصا مستقل مدرسۂ فکر ہمارے حلقے کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ غضب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کے ساتھ رفاقت اور دوستی کے تعلقات بلکہ ان کی بزرگی کے مقابلہ میں نیاز مندانہ جذبات ہماری طرف سے وابستہ ہیں۔ ان کی چیزیں مسترد کریں تو ان سے شرم آتی ہے۔ اور شائع کریں تو دنیا بھر کے سامنے ندامت ہوتی ہے۔

کچھ دوست ایسے بھی نمودار ہوتے رہتے ہیں جو اپنی بالکل پہلی کاوش ہی کو اٹھا کر بھیج دیتے ہیں اور تقاضا کرتے ہیں کہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے ورنہ ان کا دل بیٹھ جائے گا۔ یہ کوئی دورِ مشق خاموشی سے گزارنے پر تیار نہیں ہوتے اور خواہش مند ہوتے ہیں کہ کسی ساکھ رکھنے والے معیاری جریدے میں ان کی پہلی کاوش جلوہ گر ہو۔

ان قسم قسم کے محسنین اور معاونین سے خط و کتابت کرنا اور پھر ہر ایک سے اس کے ذہن کے مطابق معاملہ کرنا واقعی ایک بڑا مشکل کام ہے۔ حال ہی میں اس سلسلے میں ماہر القادری صاحب نے اپنے جو تجربات بیان فرمائے ہیں ان کو پڑھ کر ڈھارس بندھی کہ غیر اس میدان میں سے گزرنے والے اور بھی بہت ہیں۔ ان دوستوں کے معاملے میں تو آسانی ہوتی ہے جو اپنا معاملہ ایڈیٹر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں اور اس پر پورا پورا اعتماد کر لیتے ہیں۔ بعض وہ ہیں — صاحب صلاحیت حضرات میں سے بھی اور بالکل پہلے دن قلم تھامنے والوں میں سے بھی — جو اپنی نگارش کے ساتھ یہ نوٹس بھی لکھ بھیجتے ہیں کہ خبردار! ہماری تخلیق پر ترمیم و اصلاح کا نشتر نہ چلایا جائے، اور اگر وہ یہ نوٹس لکھنا بھول گئے ہوں اور بیچارا مدیر ان کو اعتماد کرنے والوں میں شمار کر کے کوئی قطع و برید کر ڈالے تو پھر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دن ان کا عتاب نامہ ٹپکا جا رہا ہے۔ توبہ تلا کر کے جان چھڑانی پڑتی ہے۔ لیکن کبھی کبھار تو ایک ایک تغیر کے خلاف دلائل کا طومار موصول ہوتے ہیں اور اصرار ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب جواب میں اپنے دلائل لائیں۔ ایڈیٹر صاحب گردن چھڑانے کے لئے آخر ہار مان لیتے ہیں کہ بھئی ہم تو بغیر دلیل کے قائل ہوں، اور کیا چاہتے ہو! لیکن اس سے آگے جانے والے وہ ہیں جو ادھر پلٹتے ہیں تو خود مدیر چراغ راہ پر تنقید کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں کہ تم ایک نالائق آدمی ہو، تمہیں زبان نہیں آتی اور تم شعر کہتے پھرتے ہو۔ کوئی لکھے گا کہ تم تیسرے درجے کے افسانہ نگار بھی نہیں ہو۔ کسی کا تبصرہ پورے چراغ راہ کو لپیٹ میں لے لے گا کہ اس میں یہ اور یہ اور یہ ٹیڑھ ہیں۔

لیکن ہم ان سب سے محبت رکھتے ہیں اور سب کو اس کا مزاج پہچان کر مناسب انداز سے بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خدا کا فضل رہا ہے کہ بعض ایسے اصحاب جن کے مزاج سے میں ہمیشہ ڈرتا رہا ہوں، ان کو بھی جب میں نے محبت آمیز طریق سے بات سمجھانے کی کوشش کی ہے تو وہ متاثر ہوئے ہیں۔ سب سے ٹیڑھا فریضہ یہ پیش آتا ہے کہ ایسے ساتھیوں کو ان کی پرخود غلط ذہنیت کے چکر سے نکالنا ہوتا ہے اور ان پر واضح کرنا ہوتا ہے کہ آپ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ خدا نے اس ذمہ داری کو بھی بجز و خوبی پورا کرنے کی اکثر توفیق دی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے یہ رفقاء بالعموم ہوتے سلیم الطبع ہیں، اس لئے تھوڑا بہت غصہ ہم پر نکالنے کے بعد خیر خواہانہ بات کو مان لیتے ہیں۔

شروع شروع میں میں نے اصول طے کر لیا تھا کہ چیزیں صرف اپنے معیار کی لی جایا کریں گی اور جو کچھ اس کے مطابق نہ ہو گا، بغیر کسی استدلال کے واپس کر دیا جایا کرے گا اور اسی کے مطابق مطبوعہ خط تیار کرا لئے تھے۔ دراصل میں استادی شاگردی کے چکر میں نہ خود پڑا اور نہ دوسروں کی طرف سے ایسی کوئی ذمہ داری اٹھانا پسند کرتا ہوں لیکن پے در پے اصرار ہوتا رہا اور خاص خاص دوستوں نے بھی اس کا مشورہ دیا کہ نو مشق اور غیر معیاری سطح کے



ساتھیوں کو بھی سہنے کے چلا ہے۔ ابتدا کچھ ترمیم و اصلاح اور کچھ انتخاب کرتے ہوئے بنا کم معیار کی چیزیں بھی لے لی جاتی تھیں۔ میں نے یہ [illegible] کردیا۔ اب دوسری طرف سے شامت آتی رہتی ہے۔ یعنی گلہ یہ ہوتا ہے کہ ترمیم و انتخاب کے عمل سے کسی نگارش کو کیوں گزار دیا۔ اور ایسا کرنا بھی ضروری تھا تو ہم سے اس معاملے میں خط و کتابت کی ہوتی اور ہماری رضامندی لی ہوتی۔ اب ان حضرات کو کون بتلائے کہ غریب مدیر چراغ راہ کے سر صرف ایک ایڈیٹری ہی کا کام تو نہیں ہے اور خط و کتابت کے لئے اس کے ساتھ کوئی سیکرٹری ایٹ بھی موجود نہیں۔

مشکل ترین معاملہ ان ساتھیوں کا یہ ہے کہ ہر ایک کے جذبات حد درجہ نازک ہوتے ہیں — آخر شاعر اور ادیب ٹھہرے! ان کی تحریروں میں کوئی ادنیٰ سا تصرف ہوجائے تو ان کا احساس اس طرح کا ہوتا ہے کہ جیسے زمین و آسمان کا سارا انتظام تلپٹ ہوگیا ہے۔ اگر ان کے نتائج افکار میں کتابت کی کوئی غلطی رہ جائے تو ایسا تاثر دیتے ہیں جیسے بس اب ان کی شہرت کو سخت دھکا لگ گیا ہے اور دنیا بھر میں وہ نکو بن کے رہ جائیں گے اور ان کے فن کے بارے میں زمانے کی رائے پر بہت برا اثر پڑ جائے گا۔ اسی طرح کسی چیز کو ذرا زیادہ نمایاں اور اچھی جگہ نہ دی جا سکے تو اس کا ردعمل بھی سخت ہوتا ہے۔ ایڈیٹر کو ان ساری آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہمارے یہ ساتھی دوسرے حلقوں سے ہزار گونہ بہتر و برتر ہیں۔ یہ ہماری "چیرہ دستیوں" کو بڑے حوصلے سے برداشت کرتے ہیں اور اپنی محبت میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بھی ان کی قدر کرتے ہیں اور ان کو ساتھ لے کر ہی اقدام کرنا پسند کرتے ہیں۔ یوں بھی یہ اعتراف کرنا ہم پر واجب آتا ہے کہ چراغ راہ کے بہت سارے اوراق کے دامن کو گزشتہ آٹھ سال میں انہی عزیزوں اور رفیقوں نے اپنے غنچہ ہائے نورس سے بھرا ہے اور آئندہ بھی ہم ان کے تعاون کے بغیر مشکل ہی سے اڑتالیس صفحے ماہانہ پورے کرکے دے سکتے ہیں۔

چراغ راہ کے مقاصد میں ادبی تعمیر کا کام بھی شامل ہے۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ اس پہلو سے ہم اپنے کام پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ پچھلے ڈیڑھ دو برس کا زمانہ ادبی لحاظ سے بڑا بنجر نظر آتا ہے۔ دوسروں کی تو میں نہیں کہتا، چراغ راہ کی حد تک اعتراف کرتا ہوں کہ بہ حیثیت مجموعی اس عرصے میں ہم نے کوئی خاص پیش قدمی ادب کے میدان میں نہیں کی ہے۔ شعر اور افسانہ کے دونوں اہم دائروں میں بس "کچھ نہ کچھ" ہوتا رہا ہے مگر مستقل قدر و قیمت رکھنے والی جاندار تخلیقات شاید ہی ایک آدھ پیش کی جا سکی ہوں۔ اچھا لکھ سکنے والے زیادہ تر گوشۂ عزلت میں پڑے رہے اور صرف ایسے رفقاء نے خلا پُر کئے جو فکر و فن کے لحاظ سے ایک گول دائرے میں گھومتے رہتے ہیں، خطِ مستقیم پر آگے کی طرف اقدام نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ہے کہ اس کیفیت کا صحیح نام ہمیں جرأت سے لے دینا چاہئے، اور وہ ہے جمود!

جمود ہے تو کیوں ہے؟

اس سوال کا جواب بڑا خطرناک ہوگا، کیوں کہ اس سلسلے میں اپنی ہی کچھ کمزوریاں پکڑی ہوں گی اور یہ خود اپنے ہی آپ کو ناگوار گزریں گی، مگر اگر حالات کو ٹھیک کرنا ہے تو اس جواب کو واشگاف بیان کرنا ہوگا۔

اولین مشکل یہ درپیش ہے کہ ہمارے زیادہ اچھے مرتبے کے ادبی ساتھی بیشتر تحریکِ اسلامی سے وابستہ ہیں۔ معاش کا کولہو دن بھر گھمانے کے بعد ان کے بچے کھچے اوقات میں تحریک ان سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس کے کام آئیں — اور لوگ ابھی تک اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ قلم چلا کر بھی کوئی مفید کام کیا جا سکتا ہے اور تحریک کو کوئی تائید بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ علاوہ بریں جہاں کسی آدمی کی ادبی و فکری صلاحیتیں نمایاں طور پر کام کرنے لگتی ہیں، وہاں جھٹ سے انتظامی قسم کی ذمہ داریاں لاد دی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک ایک کرکے ہمارے ادیب میدانِ ادب سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارے کچھ ادیب وہ ہیں جن کے اندر شعلۂ تخلیق ایک بار اس طرح بھڑکا تھا کہ ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہوگئیں اور محسوس ہونے لگا کہ

ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض کے لئے ارتقاء کا نقطۂ آخری یہ ہو
چلاتی رہی حالت ہے ۔ ۔یں ، ب کہیں ڈھونڈے سے بھی ان کا سراغ نہیں ملتا ۔ ظاہر ہے کہ منتہائے مقصود پہنچ جانے
کہ چیزیں اچھے رسالوں میں چھپنے لگیں اور جب وہ چھپنے لگ گئیں تو اکساہٹ کا کوئی اور موجب باقی نہ رہا ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ وہی "ادب برائے ضرورت" کے قائلین ان میں سے ہوں
اور مرتبۂ کمال حاصل کر لینے کا احساس بڑی تباہ کن چیز ہے ۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ کچھ کو یہی شکایت لے بیٹھی ہو کہ ان
جو ضرورت کے احساس کی اسٹیم سے کچھ دور تک چل گئے اور پھر ان کے پہیے جام ہو گئے ۔
کی کما حقہٗ قدر نہیں کی گئی اور انہیں ان کا صحیح مرتبہ و مقام نہیں دیا گیا ۔ کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ ادیبوں میں دوستانہ مجلسی روابط کو قائم رکھنے کے سلسلے میں
جو کمزوری بالعموم پائی جاتی ہے ، ہو سکتا ہے کہ کچھ کرشمے اس کے بھی ہوں ۔ آپس کی چھوٹی باتوں کے کھاتے کھول کر ان پر سود چڑھاتے چلے جانا ،
بات بات سے ناگوار اثر لینا اور پھر ناگواریوں کو قطرہ قطرہ جمع کر کے ایک گندہ "تالاب" تیار کر لینا ہماری برادری کی معروف خصوصیت ہے ۔ اس طرح
کے اسباب سے جب دل پھٹے پھٹے رہنے لگتے ہیں تو ایک طرف باہم دگر استفادہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں ، دوسری طرف ایک بددلی سی
آدمی کو پکڑ کے بیٹھ جاتی ہے ۔ اس ذہنی چکر میں پڑ جانے کے بعد جو کوئی بہت کچھ کر سکتا ہے وہ بھی کچھ نہیں کر پاتا ۔ مگر یہ سب ہمارے اندازے ہی
اندازے ہیں ، ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اصلی باعث ہو ، بلکہ ان حضرات کے طویل مراقبہ کا سبب کوئی دوسرا ہی ہو ۔ سبب کچھ بھی ہو ، کچھ لوگوں
کا اس طرح اسٹیج پر رونما ہو کر پھر پردے کے پیچھے گم ہو جانا بہت سے دوسرے ساتھیوں کے لئے بہت شکن ثابت ہوا ہے ۔

ہماری اور ایک مشکل یہ ہے کہ ہمارا حلقۂ قارئین ادبی ذوق کے لحاظ سے محتاج تربیت ہے ۔ کافی وقت لگے گا کہ یہ حلقۂ خیال کے حسن و جمال
اور اسالیب بیان کی فنی مذرتوں سے حظ حاصل کرنے کے قابل ہو جائے اور وہ سامنے آنے والی چیزوں میں سے ہر ایک کو مناسب قدر و قیمت
دے سکے ۔ مجھے تو اس کا خود خاصا تجربہ ہے کہ میری ایک نظم ۔۔۔۔ جو غیر معمولی ابہام یا فلسفیانہ گہرائی یا ادبی و نفسیاتی باریکیاں نہیں رکھتی تھی ۔
مسلسل آٹھ برس تک اس لحاظ سے مظلوم رہی ہے کہ اس کی ساخت کو سمجھا نہیں جا سکا اور اسی وجہ سے اس کا ایک مقام ہمیشہ ہدفِ اعتراض بنا
رہا ۔ میں دم سادھے یہ سب کچھ دیکھتا رہا ۔ آخر خدا خدا کر کے حال ہی میں اس نظم کی پوزیشن واضح کرنے کے لئے پہلی آواز ہمارے حلقے کے ایک
فرد نے اٹھائی اور مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں" !
اس حلقہ کی ایک خاص شان یہ ہے کہ یہ اگر نگارشات پر توجہ کرتا ہے تو بالعموم خالص فقہی سوالات چھیڑتا ہے ، یا زیادہ سے زیادہ
کسی اخلاقی تقاضے کا واسطہ دیتا ہے (جس کی ضرورت اپنی حد تک تسلیم ہے !) لیکن فکری اور ادبی اور فنی لحاظ سے یہ کچھ زیادہ تعرض نہیں کرتا
اسی کے ساتھ ساتھ اس حلقہ کا مجموعی مزاج سیاسی ہے ۔۔۔۔ اس میں گرما گرمی ہے ، ٹھہراؤ نہیں ۔ وہ صراحت چاہتا ہے ۔ کنایت نہیں ۔ وہ
وضاحت چاہتا ہے ، رمزیت نہیں ۔ وہ پروپیگنڈا کو پسند کرتا ہے ، آرٹ کو نہیں ! پس اس حلقہ کی فضا ادب کے گل و یاسمن کے لئے کچھ زیادہ
سازگار نہیں ہے ۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ عملاً ادب مرجھا کے رہ گیا ہے ۔ صرف کچھ سخت جان شاخیں جوں توں کر کے پنپ رہی ہیں ۔
مگر اس حلقہ کی طرف سے معاملہ تغافل اور بے نیازی کا ہی نہیں ہے ۔ اس کے دل ہمارے ساتھ ہیں ، دماغ دلوں کا ساتھ نہیں دیتے ۔
ہمارے یہ قریب ترین قدر داں ہماری اچھی اور بُری ہر چیز کو خرید تے ہیں ، مگر یہ چیزوں کی ادبی پرکھ نہیں کر سکتے ۔ یہ اپنے ادیبوں سے دلچسپی
ہی نہیں لیتے ، عقیدت رکھتے ہیں ، لیکن ان کی فنی خدمات کا جائزہ نہیں لے سکتے ۔ یہ ہماری نگارشات پڑھ کر جھومتے ضرور ہیں ، لیکن ان کی
تہ میں نہیں اتر سکتے ۔ چنانچہ کتابوں اور رسالوں کی کھپت کو دیکھا جائے تو وہ بڑی ہمت افزا ہے ، لیکن اس کی صدائے بازگشت سننے کی

کوشش کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سناٹا طاری ہے۔ ان دنوں حالات ایک اوسط درجے کے ادیب کے جذبات — اور ادیب بھی بہرحال انسان ہوتا ہے اور انسانی فطرت کے نور میں اس پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں — ٹھٹھر جاتے ہیں۔ اکا دکا افراد ایسے ہوں گے جو منہ سر لپیٹ کے اپنے ادبی راستے پر ایک مقصد سامنے رکھ کر چل کھڑے ہوں تو اپنی دُھن میں چلتے رہیں۔ لیکن کوئی بڑا کاروانِ ادب ایسے بیابان کو پار نہیں کر سکتا۔ اس اظہارِ تاثر کے معنی یہ نہیں کہ ہم لوگ مایوس ہو کر بیٹھ رہیں، نہیں ہمیں محنت کر کے اپنے ان قریب ترین قدردانوں کے دماغوں کو ان کے دلوں کے ہمدوش کرنا ہے، ان کے ذوقِ ادب اور ان کی حسِ جمالیت کی تربیت کی ذمہ داری ہم پر ہی عاید ہوتی ہے۔ مدعا یہ بتانا ہے کہ ایک سبب یہ بھی ہے جو ادبی ارتقا پر اثر انداز ہوتا ہے۔

ادبی ارتقا کا ایک اور لازمہ ایسا ہے کہ جس سے ہم محروم ہیں۔ ہمارے ہاں تنقیدی شعور ابھی لمبی تانے سو رہا ہے۔ مقصدی تنقید جو چند ٹھوس اصولوں پر مبنی ہوتی ہے نہ صرف ادبی، فنی اور جمالی حس کی تربیت کرتی ہے اور لوگوں کو ادبی نگارشات سے لطف اندوز ہونے کے قابل بناتی ہے بلکہ وہ خود اصحابِ فن کی رہنمائی کرتی ہے۔ ناقد ایک ادیب کو اس کے فن کے بعض ایسے قابلِ قدر پہلوؤں سے آگاہ کرتا ہے جن کا خود اسے شعور نہیں ہوتا۔ اور اس طرح وہ اسے ان کمزوریوں کا پتا دیتا ہے جن پر اس کی نگاہ نہیں جاتی۔ ناقد چمنستانِ ادب کا ایک مالی ہوتا ہے جو فضول گھاس پھوس کی کانٹ چھانٹ کرتا ہے اور ایک ایک شاخِ گل کو نشوونما اور ارتقا پانے کے لئے مناسب فضا بہم پہنچاتا ہے۔ جامع بات یہ ہے کہ تنقید ادبی ارتقا کے لئے وجہ تحریک بنتی ہے اور اس ارتقا کے لئے راستے ہموار کرتی ہے۔ ہمارے حلقہ میں ادبی رجحانات کے متوازی تنقیدی رجحان آگے کی طرف اقدام کرتا نظر نہیں آتا، بلکہ شاید اس نے ابھی راستے پر قدم رکھا ہی نہیں۔ اب تک تنقید کے نام سے جو کچھ آ رہا ہے وہ زیادہ تر محض اظہارِ تاثر تھا۔ (زیادہ سے زیادہ دو چار چیزوں کو مستثنیٰ کر دیجئے) اس اظہارِ تاثر میں بھی منفی پہلو زیادہ زور پر رہا ہے۔ بالعموم ہمارے آٹھ سال کے دفترِ تحریر میں کچھ تعارفی تبصرے ملتے ہیں اور کچھ ایسے انفرادی تاثرات سامنے آتے ہیں جن میں کسی تحریر یا کتاب کی یا تو تعریف کر دی گئی ہے، یا اسے پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دیا گیا ہے' یا پھر چند خوبیاں اور چند کمزوریاں گنوا دی گئی ہیں۔ وہ تنقید جو اصحابِ فن کے سامنے اصول و مقاصد کے دیئے جلاتی ہے اور جو ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر نئے راستے کھولتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مقاماتِ خطر سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ قریب قریب کالعدم ہے۔ یہ حس ہی ابھی سرے سے سُن پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو تھوڑی بہت چیزیں ہمارا حلقہ سامنے لاتا ہے ان کا خیر مقدم اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ کام کرنے والے اس شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ شرکائے بزم کہیں برف کے تودے تو نہیں۔ تازہ مثال لینی ہو تو "شعلۂ خیال" اور "اذان" سے لی جا سکتی ہے۔ یہ دو کتابیں ادبی میدان میں خاصے وقفے کے بعد نمودار ہوئیں۔ بحث اس سے نہیں کہ یہ کیسی ہیں اور ان کا مرتبہ کیا ہے، کیا نہیں ہے۔ دیکھئے یہ کہ ان کی آمد پر اس سرے سے اُس سرے تک کہیں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ ان چند سطری تبصروں کو ہم کسی شمار میں نہیں لے سکتے جو مدیرانِ جرائد کو بطورِ فرض ریویو کے دو ایک مقررہ صفحوں میں ہر قسم کی چیزوں پر معمولاً کرنے پڑتے ہیں۔ تنقیدی رجحان جیسے افیم کی گولی منہ میں رکھے سر بہ زانو پڑا رہا، اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ "در عرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت"! کچھ کام کرنے والے ایسے ہو سکتے ہیں جو تنقید کے جنم لینے سے پہلے کے اس برفانی دور میں بھی متحرک رہیں، مگر بہ حیثیت مجموعی ادبی ارتقا جاری نہیں رہ سکتا۔

تنقیدی رجحان کبھی کبھار کروٹ لیتا بھی ہو گا، لیکن وہ اپنا کام کرنے میں ایک خاص سبب سے بہت ہچکچاتا بھی ہے۔ اس کے سامنے وجہ تامل یہ ہے کہ ہمارے چمن کی بہار ابھی تک سبزۂ بیگانہ کے دم سے ہے اور گل و لالہ کم ہیں۔ تنقید کا مالی اگر اپنی قینچی کو حرکت میں لائے [illegible]

اعتنا کر دے تو پھر یہاں رہے گا کیا جسے چمن کا نام دیا جاسکے۔ جہاں روئیدگی ہی کم ہو، وہاں چھٹائی کیا کی جائے۔ مگر مالی کا ہاتھ کثرتِ بوئیت میں احتیاط کرکے بھی بڑے سے گل کھلا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ کانٹ چھانٹ بہت زیادہ کرے، لیکن وہ روئیدگی کے رجحانات کو صحیح رخ پر ڈالنے اور حسنِ ترتیب پیدا کرنے کے لئے قینچی کا استعمال کئے بغیر بھی بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن ایسے حالات میں تنقید کا فریضہ بہت ہی نازک ہو جاتا ہے جس کے لئے مشاق ذہنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کہاں سے آئیں!

بہرحال ادبی ارتقاء کو اگر جاری کرنا ہے تو ہمیں اپنے تنقیدی رجحان کو جگانا ہوگا۔ اس معاملے میں مدیرانِ جرائد کی ذمہ داری درجۂ اول کی ہے وہ اپنے قلمی رفقا پر ایسے راستے کھولیں کہ تنقیدی رجحان میں حرکت پیدا ہو۔ اس سلسلے میں خاص طور پر اُن مواقع سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جبکہ کسی نگارش یا مجموعہ یا ادبی شخصیت کے بارے میں کہیں کوئی بحث چھڑ جاتی ہے۔ ایسی بحث میں پوری دلچسپی لی جانی چاہئے اور مختلف جرائد میں ہر زاویے سے اس پر اظہارِ خیال ہونا چاہئے۔ احتیاط کا تقاضا اس سلسلے میں ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ خلوص کی روشنی سے جب تک ذہن پوری طرح منور نہ ہو، تنقید کے لئے قلم ہاتھ میں نہ لیا جائے۔ کسی نگارش یا کسی ادیب کے بارے میں ناقدانہ اظہارِ رائے کرنے سے پہلے خوب جائزہ لے لیجئے کہ بے جا عقیدت یا کسی طرح کی کد و کاوش کی پرچھائیں تو دل و دماغ پر موجود نہیں ہے۔ غیر مخلصانہ تنقید سے بڑھ کر اور کوئی چیز ادب کے لئے وجہِ تخریب نہیں ہو سکتی۔

گزشتہ دو تین برس میں بعض رفقا کا طرزِ فکر یہ رہا ہے کہ ادبی ارتقاء کی رفتار تنظیم کو مضبوط کرنے سے بنائی جاسکتی ہے اور کام میں کمی اگر ہے تو وہ تنظیمی کمزوری کی وجہ سے ہے۔ اتنا مانتے ہوئے کہ تنظیم اور اجتماعیت ہر کام میں مدد ہوتی ہے، یہ تسلیم کرنے سے مجھے سخت انکار ہے کہ ہماری کمزوری کا اصل اور بڑا سبب تنظیمی ہیئت کا ڈھیلا پن ہے، غلط تشخیص کا نتیجہ غلط نقشۂ علاج ہوگا اور غلط علاج سے صحت بحال نہ ہوگی۔ ادبی ارتقا کی سست رفتاری بلکہ کہنا چاہئے کہ ادبی جمود کا اصل راز صرف ایک ہے —— اپنے تخلیقی رجحانات کی آبیاری نہ کرنا!

کسی نہ کسی نوع کا تخلیقی رجحان تو اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کو دیا ہے۔ تھوڑے سے لوگ ہوتے ہیں جن کو آرٹ کے میدانوں میں تخلیقی صلاحیت سے نوازا جاتا ہے۔ لیکن کسی بھی نوعیت کا تخلیقی رجحان ہو، اتنا ہی پھل دے گا جتنی اس کی آبیاری کی جائے گی۔ تخلیقی رجحان کی آبیاری دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ ایک مطالعہ —— زندگی کا مطالعہ، فطرت کا مطالعہ، انسان کا مطالعہ، معاشرے کا مطالعہ کہ سارے آرٹ کا اولین سرچشمہ یہی ہے۔ اور پھر مطالعہ آرٹ کے ان مظاہر کا جس میں زندگی اور فطرت اور انسان اور معاشرے کی حقیقتوں کو جمالیت کا لباس پہنا کر لایا گیا ہو اور جن کے مطالعہ سے رہنمائی اخذ کی جاسکتی ہے اور اپنے لئے نوبہ نو اکساہٹ حاصل کی جاسکتی ہے۔ دوسرے کاوش اور سوچ بچار —— مطالعہ کے تاثرات کو ایک ایک کرکے عالمِ خیال کے تالاب میں ڈالنا اور پھر کنارے بیٹھ کر صاحبِ فن کی سی باریک نگاہ سے دیکھنا کہ کیسی کیسی لہریں اور کیسے کیسے بھنور پیدا ہوتے ہیں۔ کس طرح متضاد خیالات ابھرتے ہیں اور کس طرح ایک دوسرے کو کاٹتے پیٹتے ہیں، کیا کیا گرم و سرد رویں چلتی ہیں اور پھر تہ میں اتر کر جائزہ لینا کہ اس ساری طوفانی حرکت کے نتیجے میں فکر کی سیپیوں نے کیا کیا آبدار موتی حاصل کئے ہیں۔ ان موتیوں کو برآمد کرکے ساحل پر لا ڈالنا وہ عملِ تخلیق ہے جس سے دوسرے فنون کی طرح ادب پیدا ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ وہ ہیں جو قلم چلانے میں طاق ہوتے ہیں اور انشاء اچھی جانتے ہیں لیکن جس مطالعہ اور جس کاوش کی ہم نے اوپر وضاحت کی ہے اس میں کوتاہ ہوتے ہیں، یہ بہت لکھتے ہیں مگر تخلیق نہیں کر سکتے۔ بہت سے وہ ادیب ہیں جو تخلیق کی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے بھی ہیں، لیکن مطالعہ و کاوش میں اتنی پتہ ماری نہیں کرتے جتنی کرنی چاہئے۔ بس چیزیں لکھنا اور چھپوا لینا، بس یہ ایک چھوٹا سا چکر ہے جس میں وہ گھومتے رہتے ہیں

مگر ہم اپنے ادیبوں کو خیر خواہی سے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کبھی اس چھوٹے چکر میں نہ گھومیں مطالعہ کاوش میں پڑیں اور ساری عمر اس میں لگے رہیں۔ تب تخلیقی صلاحیتیں ابھریں گی اور تب ادبی ارتقاء ہوگا۔

اوپر کہا گیا تھا کہ چراغِ راہ ایک فکری طاقت ہے۔ ہاں، وہ اس معنی میں فکری طاقت ہے کہ اُس نے کتنے ہی سینوں کو امیدوں کی چنگاریوں سے مالا مال کیا ہے۔ اُس نے کھوکھلے دلوں اور دماغوں کو از سرِ نو ایک سرمایۂ یقین دیا ہے۔ اُس نے متزلزل ایمانوں کو سہارا دے کر دوبارہ ایک متحرک و محرک کورس میں بدل دیا ہے۔ اس نے بعض نوجوانوں کی ذہنی و اخلاقی زندگیوں کی تعمیرِ نو کی ہے۔ اُس نے ارادہ و عزم نے بند سوتے کتنی روحوں میں جاری کر دیئے ہیں۔ اُس نے مغربیت کے سیلِ الحاد و فجور میں ڈوبتے ہوؤں کو بچایا ہے۔ اُس نے پرانے لفظوں کو نئے معانی دیئے ہیں اور پرانے حرفِ مدعا کو پیش کرنے کے لئے نئے لفظی پیرائے ایجاد کئے ہیں۔ اُس نے ذوقِ شعر و ادب کا رخ بدلا ہے اور اُس نے نقد و نظر کے پیمانوں میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ اس نے نظریاتِ فکر کے محاذ پر بھی اور سیاسی مسائل کی جنگاہ میں بھی اسلام کے لئے معرکہ آرا ہونے والے سپاہیوں کو کمک بہم پہنچائی ہے۔ اور چراغِ راہ میں جب تک یہ کرشمہ و اعجاز موجود ہے، اس کی غریبانہ و درویشانہ کاغذی ہیئت، اور معیارِ رائج کے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی اس کی شانِ طباعت، اور ساون کی گھٹاؤں جیسی اس کی بے قاعدگیٔ اشاعت مجھے بڑی محبوب ہے۔ اور اس کا یہی اصل کرشمہ و اعجاز اگر باقی نہ رہے تو پھر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی کہ وہ کس حسن و جمال کا جامہ پہن کر شائع ہوا اور کتنے ہزار خریداروں میں پھیل گیا اور اس نے کتنی تحسین حاصل کی اور اس نے کتنا روپیہ لا کے اپنے کارپردازوں کے قدموں میں ڈھیر کر دیا!

مگر یہ فکری طاقت جتنی کچھ ہے اس کے اتنا ہونے پر میں مطمئن نہیں ہوں۔ مخالف طاقتوں کو دیکھتا ہوں اور ان کی بڑھتی یورش کا تصور کرتا ہوں تو فی الواقع مجھے دل زدگی کا یہ چراغ آندھیوں میں ٹمٹماتا دیا نظر آتا ہے۔ وقت وہ ہے کہ اگر ہزار آفتاب ہاتھ لگیں تو تاریکیوں کے اس لشکرِ عالمگیر کے مقابلہ سے ان کو لڑا دیا جائے، مگر ہماری بے سروسامانی کا عالم یہ ہے کہ اندھیاریوں کی اتنی بڑی طاقت کے مقابلے پر لا بھی سکتے ہیں تو بس کوئی ٹمٹماتا دیا۔ کوئی غیر محسوس سا شررِ آرزو، کوئی داغِ جگر!—— کاش کہ ہم اسے ایک مشعل بنا سکتے اور پھر اس مشعل کو روشنی کے ایک مینار میں بدل سکتے۔

بہرحال اپنی خطاؤں اور کوتاہیوں پر خدا سے مغفرت چاہتے ہوئے اور اس کے اب تک کے انعامات کا شکر بجا لاتے ہوئے اور اس کی ذات سے آئندہ کے لئے خیر و فلاح کی امیدیں استوار کرتے ہوئے ہم اپنا قدم آگے بڑھاتے ہیں۔

بقیہ: سمرقند کی ایک شام

جہنم میں پہنچا دوں گا۔

[تیموری آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی جاتی ہے۔ شور بڑھ جاتا ہے۔ ہما خانم خواب کی سی حالت میں کہتی ہے]

ہما خانم: اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب یہ سب تماشہ بیکار ہے۔ آپ نے اسے معزز سردار جن انگاروں کو پھولوں کی حفاظت کا فرض سونپا تھا وہ اپنا کام کر چکے۔ یہ چمن تاراج ہو گیا۔ عزیز وطن غلام بن گیا۔ لُٹ گیا۔ آہ۔

[سسکیاں بھرنے کی آواز آتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کی آواز غائب ہو جاتی ہے۔]

شعور بدایونی

ہم تو ہیں بیزار اپنی جان سے — اور وہ بیٹھے ہیں اطمینان سے

دورِ گل بن جائے گا دورِ جنوں، — ہم نہ تھے آگاہ اِس امکان سے

دشمنِ مہر و وفا ہم ہیں کہ آپ — آپ ہی کہہ دیجئے ایمان سے

سیکڑوں آزار پیدا ہو گئے — ایک نصب العین کے فقدان سے

ناخدا کشتی ڈبو کر ہی رہا — دل میں اٹھتے رہ گئے طوفان سے

اب تو غیروں کے تصرف میں نہیں — اب یہ میخانے ہیں کیوں ویران سے

ضبطِ غم جب تک کیا جب تک کیا — اب یہ باہر ہے مرے امکان سے

اس پریشانی کے عالم میں شعورؔ
کون جی سکتا ہے اطمینان سے

☆

ظفر ہاشمی

سکوں لٹتا ہے، لاکھوں آرزوئیں خاک ہوتی ہیں
بڑی مشکل سے آخر اک دلِ دیوانہ بنتا ہے!

ہماری یہ وفاکیشی بھی آخر رنگ کیا لائی!
جسے اپنا سمجھتے تھے، وہی بیگانہ بنتا ہے!

یہ کیسا انقلابِ خاک و خوں آیا ہے دنیا میں
جہاں مسجد تھی پہلے اب وہاں بت خانہ بنتا ہے!

جہاں پہ ذکرِ حق کی انجمن آرائیاں تھیں کل
وہیں پیمانے چلتے ہیں، وہیں مےخانہ بنتا ہے!

کہیں رحمت کا عالم ہے کہیں زحمت برستی ہے
کئی کاشانے لٹتے ہیں تو اک کاشانہ بنتا ہے!

یہ قطرے آنسوؤں کے کیا ہیں، اہلِ دل ہی سمجھیں گے!
انہی بے صوت لفظوں سے مرا افسانہ بنتا ہے!



بیتاب زیبی

رونقِ لالہ زار ہیں ہم لوگ — حاصلِ صد بہار ہیں ہم لوگ

بے گناہی گناہ ہے اپنا — ہاں سزاوارِ دار ہیں ہم لوگ

کونپلیں تک جھلس چکی ہیں مگر — نغمہ ریزِ بہار ہیں ہم لوگ

صبحِ نو رنجِ انتظار نہ دے — ظلمتوں کے شکار ہیں ہم لوگ

جن کو اپنا وطن نہ راس آیا — وہ غریب الدیار ہیں ہم لوگ

کچھ تو بیتاب! اس کا ہے باعث
کیا یونہی بے قرار ہیں ہم لوگ

"شعلۂ خیال" فریادی ہے!

☆ نعیم صدیقی

"شعلۂ خیال پر ایک طائرانہ نظر" لکھنے والے دوست کی طرف سے ذیل کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے :-

برادرم نعیم صاحب! السلام مسنون - آپ کی عالی ظرفی اور دیانت یقیناً لائقِ ستائش ہے کہ آپ نے میرے مقالے کو اپنے پرچے میں جگہ دی - ہر چند کہ میری تنقید بے رحمانہ تھی، لیکن یقین جانئے کہ میری نیت بھی مخلصانہ رہی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کے قلم سے ایسے گھٹیا اشعار ٹپکیں، مجھے یہ بات ناگوار گزرتی ہے -

آپ کو یہ غلط فہمی بلاوجہ ہوئی کہ "تقابلی مطالعہ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ جیسے فیض کا کوئی حریف اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اب ضروری ہے کہ اس کی پیش قدمی کو روک دیا جائے" ہرگز نہیں - مجھے صرف یہ ظاہر کرنا مطلوب تھا کہ جن اسلامی اقدارِ ادب کو فیض کا سا اشتراکی شاعر غیر شعوری طور پر یا یوں کہیئے کہ فطری طور پر اپنے کلام میں کھپتے ہوئے ہے آپ انہیں شعوری طور پر بھی نہیں نباہ سکے - مقالے میں اسی نقص کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور مقصود محض اصلاح تھا - انشاء اللہ کبھی موقع ملا تو اسلامی نظریۂ ادب پر مفصل مضمون لکھوں گا -

پتہ تحریر نہ کرنے کا سانحہ اتفاقی تھا، ارادی نہیں - میرے بہت سے دوست اس بات کے شاکی ہیں کہ میں اکثر خطوں میں مقام اور تاریخ درج نہیں کرتا - لیکن یہ ہمیشہ غیر ارادی طور پر ہوتا ہے - مگر اب کی بار میں ارادۃً پتہ درج نہیں کرونگا یہ جواب ہے آپ کی اُس بدظنی کا جس نے مقالے کے آخری فقرے کو یہ معنی پہنائے کہ گویا کسی فریب میں لا کر مجھ سے سو تین روپے ٹھگ لئے گئے ہوں، حالانکہ یہاں "دھوکے" سے مراد صرف یہ تھا کہ مرا ذوقِ شاعری تشنہ رہا - میرے مقالے کو آپ دوبارہ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک اور جگہ بھی لفظ "دھوکا" انہی معنوں میں مستعمل ہے -

والسلام

"مقالہ" کی نوعیت بظاہر جیسی تھی، اس کے پیشِ نظر میں کبھی یہ ارادہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے جواب میں کسی امر کی تصریح کے لئے دو حرف بھی لکھوں - میں نے بس اسی کو کافی سمجھا کہ ہمارے قارئین اور اہلِ نظر کی نگاہوں سے "یہ تنقید" گزر جائے اور وہ خود ہی اس کے بارے میں اپنی رائے قائم کریں - لیکن اس خط کے ذریعے صاحبِ مقالہ نے اپنی جو پوزیشن پیش کی ہے وہ میرے لئے موقع پیدا کرتی ہے کہ کچھ کہوں -

سب سے پہلے تو اسی "دھوکے" کے معاملے ہی کو لینا پڑے گا - میں مظفر حسین صاحب سے گزارش کروں گا کہ ان کے ذہن میں چاہے کچھ ہی تاثر ہو، اس تاثر کو منتقل کرنے کے لئے انہوں نے جن الفاظ اور جس اندازِ بیان کو ذریعہ بنایا ہے اس سے ان کے علاوہ ہر شخص یہی نتیجہ اخذ کریگا کہ یا تو شعلۂ خیال کے ناشر نے اشتہار کے لفظی جادو سے، یا کسی کتب فروش نے اپنی چرب زبانی سے اور یا پھر مصنف کے دوستوں

نے تعارفی تبصروں کے [1] زور سے ہمارے تنقید نگار دوست کو کتاب خریدنے پر مجبور کر دیا، لیکن پڑھنے کے بعد وہ مایوس اور بددل ہوئے کہ انہوں نے دھوکے میں آکر ایک فضول چیز پر گاڑھے پسینے کی کمائی صرف کر ڈالی خصوصاً "جب خریدا تھا" کے الفاظ کے ساتھ "میرے ساتھ دھوکا ہوا" کے الفاظ پڑھنے والے کی نگاہ سے گزرتے ہیں تو وہ ٹھیک وہی اور صرف وہی مفہوم لینے پر مجبور ہو جاتا ہے جس کو خط میں "بدظنی" قرار دیا گیا ہے یہ اگر بدظنی ہے تو نہ جانے کتنے افراد اس بدظنی کا شکار ہوئے ہوں گے۔ میں "رفقائے تحریک" اور "یارانِ حلقہ" کے ردِّ عمل کو درکنار رکھ کر عرض کرتا ہوں کہ پرسوں بس میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے اور کل بس اسٹینڈ پر دو نئے ملنے والوں نے اسی طرح کی بدظنی کا اظہار کیا۔ قصور وار آخر کون ہے؟ —— ایسے سب لوگ؟ یا آپ کے الفاظ؟

اپنے تازہ خط میں آپ نے "مراد صرف یہ تھا" کہہ کر جو الفاظ لکھے ہیں کہ "میرا ذوقِ شاعری تشنہ رہا"، اگر یہی معتدل الفاظ اصل مقالے میں لکھے گئے ہوتے تو کسی کو بدظنی نہ ہوتی، لیکن وہاں آپ نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے ایسی انتہا پسندی اختیار کی کہ اصل مدعا سے الفاظ بہت آگے نکل گئے اور اب آپ کو اپنے الفاظ کا ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ گزارش کروں گا کہ تنقید نگار کو، جو دوسروں کے خیالات و تاثرات کو ایک پلڑے میں، اور ان کے الفاظ اور ان الفاظ کی فنی ترتیب کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر بڑے نازک کانٹوں میں تولتا ہے اپنے الفاظ کے استعمال میں بہت ہی زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ اس کے الفاظ تو دوسروں کے لئے "باٹ" اور "پیمانے" ہوتے ہیں، اب اگر باٹ اور پیمانوں ہی میں کمی بیشی ہو جائے تو پھر وزن کہاں درست نکلے گا۔

اب میں آپ کو توجہ دلاؤں کہ آپ کے پورے مقالہ میں الفاظ کا استعمال اسی بے احتیاطی کے ساتھ ہوا ہے۔ براہِ کرم حسبِ ذیل اجزاء کو اپنے لئے ناقد بن کر پڑھیے:-

—— "چھوٹتے ہی شکست خوردہ ذہنیت کا یہ مظاہرہ نعیم کے جذبۂ صادق پر ایک گہری طنز ہے"

—— "اور پھر وہ خود ترسی کی کیفیت میں مبتلا ہو کر بالکل بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا ہے"

—— "نعیم کا لہجہ یہاں جھنجھلائے ہوئے فریادی کا سا ہے"

—— "شاعر کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا"

—— "صبر و رضا کی اسلامی شان سے یہ اشعار قطعاً عاری ہیں"

—— "شاعر کی فریاد میں کوئی وقار نہیں بلکہ ان اشعار میں اس کا ذاتی غم اس طرح چھایا ہوا ہے کہ......"

—— "شاعر کو اپنے ذاتی غم کے دورے سے کچھ سنبھالا ملتا ہے"

—— "نعیم تو ظلم کی اندھی نگری میں انصاف کی بھیک مانگتا پھرتا ہے"

---

[1] صورتِ واقعہ یہ ہے کہ شعلۂ خیال کے لئے تعارفی پوسٹر تک شائع نہ ہو سکا، "دستِ صبا" کی طرح اس کی کوئی تقریب نہیں منائی گئی، حلقۂ احباب کی ادبی مجالس منعقد نہیں کی گئیں، اہم اور معروف جرائد میں اشتہار نہیں دیا گیا، اس پر تبصرے اور تجزیے شائع نہیں ہوئیں، اس کی غزلیں خود اپنے حلقے کے جرائد میں کسی خاص اہتمام سے شائع نہیں ہوئیں، بلکہ شعلۂ خیال تو ایک معمولی کتاب کی طرح نہایت سرسری انداز سے میدان میں ڈال دی گئی۔ اس کی بڑی وجہ مصنف کی مخصوص ذہنی ساخت ہے جس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے آج تک اپنی کسی کتاب پر اپنے بزرگوں اور دوستوں سے مقدمہ یا تعارف نہیں لکھوایا، حتیٰ کہ انتہائی گمنامی کی حالت میں اپنی پہلی کتاب "ذہنی زلزلے" (۱۹۴۵ء) بھی کسی کا سہارا لئے بغیر دنیا کے سامنے رکھ دی اور اس کتاب نے اپنی مقبولیت کا راستہ خود پیدا کیا۔

——"کہیں نہیں ملتی تو وہ اپنا سر پیٹ لیتا ہے"

——"نعیم کی نظموں میں تلخی، تلون، غصہ اور جھنجلاہٹ کے عناصر غالب ہیں"۔

——"اور صرف گالیوں کی کسر باقی رہ گئی ہے"۔

——"کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زنداں کے امتحانِ وفا میں ان کا عشق تو جوبن پر نہیں آیا، غم و غصہ ضرور جوبن پر آ گیا ہے"۔

——"فیض نعیم سے کہیں زیادہ اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیتا ہے"۔

——"حالاں کہ اچھی شاعری جذبات کی تہذیب و شائستگی کے بغیر ممکن ہی نہیں"۔

——"نعیم جو ایک اسلامی شاعر ہونے کا دعوےٰ رکھتا ہے وہ اس معیار پر کہاں تک پورا اترتا ہے؟ میرے خیال میں تو اس پر بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

——"خیالات کا فقدان اسے باتوں کے پھیلاؤ پر مجبور کرتا ہے"۔

——"آپ لوگوں کو شعر سنانے کے بہانے بلا کر ناول سنانا شروع کر دیں تو آپ انہیں دھوکا دیتے ہیں"۔

——"شاعری میں چابک زبانی کام نہیں آ سکتی۔ اس کا مظاہرہ مطلوب ہو تو کوئی مناظرے کا میدان ڈھونڈئیے یا پھر شوق سے سیاسی تقریریں کیجئے مگر شاعری پر رحم فرمائیے"۔

——"میں نہیں چاہتا کہ آپ کے قلم سے ایسے گھٹیا اشعار ٹپکیں"۔ (ناز دو خط)

ان فقروں سے اس انتہا پسندی اور اُس یک رخے پن کی ناقابلِ تردید شہادت مل سکتی ہے جس نے آپ کے مقالے کو ایک تنقیدی تحریر کے بجائے سراسر ایک چارج شیٹ بنا دیا ہے — شعلۂ خیال کے خلاف، یا اس کے شاعر کے خلاف! یہ پورا مقالہ اس مزاج کا ہے جیسے دل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہو۔ میں یہ مانتا ہوں کہ میرے خلاف یا میرے کسی کام کے خلاف لوگوں کو دل کی بھڑاس نکالنے کا بھی کھلا حق حاصل ہے اور میں ان کے اس حق میں کسی طور بھی مزاحم نہیں ہونا چاہتا، مگر ایسی چیزوں کو اگر تنقید کے عنوان سے لایا جانے لگے تو نہ صرف تنقید کا ستیاناس ہو جائیگا۔ بلکہ ادبی مرافعہ میں سرے سے کوئی قابلِ اعتماد معیار باقی نہ رہے گا اور ایک افراتفری مچ جائے گی۔ اس طرح کی بے ہنگم تنقید نگاری کا راستہ اگر نہ روکا گیا تو دنیائے شعر و ادب میں خیالات اور اسالیب کے ارتقاء کو سخت دھکا لگے گا۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے، اور اس موقع پر مظفر حسین صاحب کو بھی اور ان کا سا ذہن رکھنے والے دوسرے اربابِ تنقید کو بھی توجہ دلاؤں گا کہ ذاتی تاثرات سے اثر ہر کوئی لیتا ہے، ان پر رائے ہر کوئی قائم کرتا ہے، اپنی رائے کو ہر شخص تحریر یا گفتگو میں بیان کر سکتا ہے مگر ہر شخص ناقد نہیں ہو سکتا۔ تنقید اسے نہیں کہتے کہ ایک جزئی تاثر کسی تحریر یا کتاب کے بارے میں ذہن میں آیا اور آپ نے اسے پھیلا پھیلا کر زور دار جملوں کے ساتھ لکھ ڈالا۔ تنقید کے لئے ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہتی نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ جذباتی تاثر سے زیادہ شعوری تاثر کو اپنا مواد بنا کر نمودار ہوتی ہے، نیز اس کے لئے متوازن اور انصاف پسندانہ زاویۂ نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

مظفر حسین صاحب کو ان سطور کے پڑھنے پر بڑا رنج ہو گا اور ممکن ہے کہ وہ یہ نتیجہ بھی نکالیں کہ چونکہ شعلۂ خیال پر انھوں نے اپنے الفاظ کے مطابق "بے رحمانہ" تنقید کی تھی، اس لئے شعلۂ خیال کے شاعر کے اندر انتقامی جذبہ کا شعلہ بھڑک اٹھا ہے، لیکن میں ان کے سے بڑھے لکھے آدمی

کے ساتھ زیادہ اونچی توقعات وابستہ کر کے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ میں ان کے سامنے چند شواہد رکھتا ہوں جو خود ان کو بتائیں گے کہ ان کی تحریر ایک تنقید نہیں تھی۔

پہلی بات یہ کہ مقالے کا عنوان ہے "شعلۂ خیال پر ایک طائرانہ نظر" لیکن ہر پڑھنے والا یہ محسوس کرے گا کہ شعلۂ خیال پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بجائے شعلۂ خیال کے شاعر کے کردار کو مرکزِ بحث بنایا گیا ہے۔ دونوں چیزیں متعلق سہی اور دونوں کو زیرِ بحث لانے کا حق بھی تسلیم، لیکن سوال یہ ہے کہ شعلۂ خیال پر کہاں نگاہِ تنقید ڈالی گئی؟ مثلاً دیکھے جانے کی چیز بہت یہ تھیں کہ شعلۂ خیال کے اشعار کی روح مشترک کیا ہے؟ شاعر کی انفراد کہاں کہاں نمایاں ہے؟ اس نے خیالات و اسالیب کے میدانوں میں کوئی متاع تو دی ہے تو کیا دی ہے؟ وہ جس نظریۂ حیات کا علمبردار ہے اور جو اس کی زندگی کا مرکزی سرچشمہ ہے، اس کی ترجمانی کن مواقع پر کی گئی ہے اور کس نہج سے کی گئی ہے؟ اس طرح کی چیزوں پر کوئی بحث نہیں ہے سارا تبصرہ چار الفاظ میں آ گیا ہے — "غصہ، جھنجھلاہٹ، تکرار اور طوالت"۔ یہی الفاظ کئی بار دوہرا دیئے گئے ہیں — تبصرہ نگار کو شعلۂ خیال میں اور کچھ نہیں ملا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک مستند درجے کے تعلیم یافتہ تنقید نگار کو شعلۂ خیال کے اس سرے سے اس سرے تک کوئی ایک مقام بھی ایسا نہ ملا جس کے لئے ان میں کوئی جذبۂ اعتراف پیدا ہوتا، کوئی غزل نہ ملی جس پر وہ جھوم جاتے، کوئی شعر نہ ملا جو ان کے معیار پر پورا اتر جاتا۔ بلکہ ہر موقع جو سامنے آیا وہ مایوس کن ہی تھا۔ شعلۂ خیال کا شاعر کبھی کوئی کھوکھلا شعر بھی کہتا ہوگا، زبان و فن کے لحاظ سے ٹھوکریں بھی کھاتا ہوگا۔ غصے اور جھنجھلاہٹ کا پرتو بھی اس کے اشعار پر پڑ جاتا ہوگا، طوالت اور تکرار کا عیب بھی کہیں نہ کہیں ظاہر ہوتا ہوگا، لیکن اتنا گیا گزرا وہ بہرحال نہیں ہو سکتا کہ ڈیڑھ سو صفحات میں اس کی متعدد چیزیں سامنے آئیں اور ان میں سے کوئی بھی مقامِ اعتبار حاصل نہ کر سکے۔ ایک شخص فنی مرتبے میں ادنیٰ سہی، مگر جبکہ وہ بچپن سے لے کر پختہ سالی تک کے لمبے دور میں شعر سے لذت اندوز ہوتا رہا ہے اور اس کے عیب و ہنر میں تمیز کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے اور کم و بیش بیس برس سے شعر کہتا اور شعر لکھتا ہے، اس کے اشعار شائع ہوتے ہیں اور ان پر اسے ہر طرح کے لوگوں کے تاثرات موصول ہوتے رہتے ہیں، وہ اتنا بدذوق غلط نہیں ہو سکتا کہ مجرد غصے اور جھنجھلاہٹ کی ایک پوٹ کو اٹھا کر اشاعت کے لئے دے دے جس میں خیالات نہ ہوں اور محض طوالت و تکرار کا ایک طلسم بندھا ہو۔ جہاں میں کبر و تعلی سے پرہیز کرتا ہوں وہاں میں اس لایعنی انکسار سے بھی بچنا چاہتا ہوں کہ شعلۂ خیال کو ردی کا ایک پرزہ سمجھنے لگوں۔ میں دوسروں کی نگاہ سے بھی اپنے آپ کو دیکھنا ضروری سمجھتا ہوں، لیکن اپنی نگاہ سے دیکھنا اس سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کیسے تسلیم کر لوں کہ شعلۂ خیال محض گھٹیا اشعار کا ایک پلندہ ہے۔ بخلاف اس کے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوا کہ آپ کا مقالہ یک طرفہ ڈگری ہے۔

تیسری بات یہ کہ آپ خود تسلیم کریں گے کہ تنقیدِ شعر سے فرسنگ ہا فرسنگ پہلے شعر فہمی اور سخن سنجی کے مراحل آتے ہیں اور ان کو عبور کئے بغیر نقد و نظر کی منازل طے نہیں کی جا سکتیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس پہلو سے آپ نے نہ صرف یہ کہ مجھے اچھا تاثر نہیں دیا بلکہ اپنے مقالہ کے بیشمار مطالعہ کنندگان کو بھی ... ہوگا۔ دوسرے مقامات تو یاد نہیں ... لکھتے ہیں۔ لیکن اس سیدھے صاف شعر کے ساتھ کہ

جان اور دل تو تیرے پہنچا دو ... اے بتو! کیا ہے جو کچھ خدا پہ بھی احسان ہوا کرے

جو سلوک آپ نے روا رکھا ہے اس پر ایک دنیا عش عش کر اٹھی ہوگی۔ آپ کا نظریہ یہ ہے کہ ایک شاعر اپنے ہر شعر میں اپنا عقیدہ بیان کیا کرتا ہے۔ اور وہ صرف اپنے ہی ذہن و کردار کی تصویر کھینچتا ہے۔ اس لئے آپ نے اس شعر سے یہ نتیجہ نکالا کہ شعلۂ خیال کا شاعر اپنے بارے میں یہ حقیقت

منکشف کر رہا ہے کہ اس کے جان و دل بتوں پر قربان ہیں اور وہ ان بتوں کو اطمینان دلا رہا ہے کہ زندگی کا اصل سرمایہ تو تمہارے قدموں میں لا ڈالا تھا، اب اگر خدا کے لئے برائے نام ایمان کا دعوےٰ رہے بھی تو اس سے تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ محترم دوست! یہاں شاعر نے اپنا عقیدہ و تصور بیان نہیں کیا، اس نے گرد و پیش میں پائے جانے والے ایک خاص کردار کا ذہنی عکس آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ آپ کی نظر سے اگر محمد علی جوہر کا مشہور شعر — "اک خوفِ خدا اور سہی!" گزرا ہوتا تو آپ کو معلوم ہوتا کہ میرے اس شعر میں طنز کی روح بول رہی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کے علاوہ اور کسی ذہین آدمی نے یہ مفہوم اس شعر سے لیا ہوگا۔ ایسے اور بھی اشعار میرے ہاں پائے جاتے ہیں اور اگر ان سب کے ساتھ یہی سلوک ہوا تو مجھے فریاد کرنی پڑے گی کہ "شعر مرا بہ مظفر کہ بُرد!"

اب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ ایسے صاف سادہ شعر کو یہ بے تکے معنی پہنا کر آپ نے اپنے حق میں قارئینِ نقادہ سے کیسی رائے کا خراج حاصل کیا ہوگا۔ آپ کے قلم سے اس شعر کی یہ تشریح پڑھ کر کون آپ کا حقِ تنقید مانے گا اور وہ آپ کے تاثرات کو کتنا وزن دے گا۔ میں انتہائی محتاط انداز میں آپ کو اس کوتاہی کا احساس دلا رہا ہوں جس کے ہوتے ہوئے کوئی تحریر تنقید کا مرتبہ نہیں حاصل کر سکتی۔

چوتھی بات یہ ہے کہ آپ نے موازنہ کرتے ہوئے فیض کے ہاں سے جس نوعیت اور جس انداز کے اشعار چنے ہیں، شعلۂ خیال سے ان کے مقابل میں لائے جانے والے اشعار اس طرح بالائے طاق رکھے ہیں، جیسے وہ سرے سے کتاب میں ہوں ہی نہیں! اگر آپ کو "اجمال" پسند تھا تو ایسے اشعار بھی تھے جن کی آنچ کھا کر احساس جھرجھری لیتا ہے۔ کیا آپ نے یہ چیزیں نہیں پڑھی ہوں گی۔

جو ریت چلی قیس سے، وہ ریت نہ بدلی سودا وہی، دامن بھی وہی، ہات وہی ہیں
تم شمع جلا دیکھو تو اس ظلمتِ شب میں پروانوں میں جل مرنے کی عادات وہی ہیں
نت حسن کی دنیا کے مظاہر ہیں انوکھے اور عشق کی دنیا کی روایات وہی ہیں
ہر رنگ میں غیروں کی نوازش ہے بدستور ہر حال میں اپنوں کی عنایات وہی ہیں

جب مشعلِ تصورِ جاناں ہے میرے ساتھ تاریک جتنی ہو شبِ ہجراں ہوا کرے
دامن کے چاک، آنکھ کے آنسو، جگر کے داغ جینے کو اور کیا سر و ساماں ہوا کرے
دریا کے موتیوں کا بگاڑے گی موج کیا کتنی ہی تند حرکتِ طوفاں ہوا کرے
یہ چاہیے کہ آنکھ اُٹھائے نہ آفتاب جب اُس جبیں سے صبح نمایاں ہوا کرے

گھٹے گرچہ سینے میں دل اے حمیت! مگر کوئی آنسو ٹپکنے نہ پائے
مزے عاشقی کے اگر ہیں تو جب ہیں سلگتی رہے اور بھڑکنے نہ پائے
وہی رند ہے رند اس میکدے کا جو کھل کر پیئے اور بہکنے نہ پائے

قدغن تو وہ نالوں پہ لگاتے ہی رہیں گے ہم عشق کی آواز اٹھاتے ہی رہیں گے
ہم گیت ترے شوق میں گاتے ہی رہے ہیں ہم گیت ترے شوق میں گاتے ہی رہیں گے

ہاں راہِ محبت کی ہر اک روک سے کہہ دو — عشاق قدم آگے بڑھاتے ہی رہیں گے
گو ہم پہ زمانے میں ہنسی اڑتی رہے گی — ہم پنجہ زمانے سے لڑاتے ہی رہیں گے
یاد آتے رہے وہ تو یہ ہر حال کٹے گی — ہر حال میں وہ یاد تو آتے ہی رہیں گے

چھوڑا ہے جسے برقِ جہاں سوز کی زد میں — پنجرے میں وہ مظلوم چمن یاد رہے گا
کھلی ہوئی ایک ایک روش پیشِ نظر ہے — روندا ہوا ہر سرو و سمن یاد رہے گا
ہر پھول کہ دیتا تھا طرب نقش ہے دل پر — ہر خار کہ رکھتا تھا چبھن یاد رہے گا
تکتی ہوئی حیرت سے وہ نرگس نہیں بھولی — لالہ وہ لئے سر پہ کفن یاد رہے گا
جس جس نے کیا عشق نہ تھی خیر پھر اس کی — یہ معرکۂ دار و رسن یاد رہے گا
وہ جس کے ہر اک ذرے پہ مہریں ہیں لہو کی — پردیس میں وہ پاک وطن یاد رہے گا

بھیگی ہوئی پلکیں ہوں تو پھیلا ہوا دامن
مائل بہ کرم وہ ہوں تو پھر چاہیئے کیا اور
یہ ہم ہی سمجھتے ہیں، خطا ہم سے ہوئی کیا
ہیں دار و رسن ہیچ کہ ہے اس کی سزا اور
ہوتا ہے کبھی یوں بھی محبت کے جہاں میں
کرتے ہیں خطا اور تو ہوتی ہے عطا اور

ہر پھول آستیں میں ہے کانٹے لئے ہوئے — اس باغِ پر بہار میں دامن بچا کے چل
گر حریت کے گیت ہی گانے کا ہو جنوں — زنجیرِ قید اپنے لئے خود اٹھا کے چل
پیشِ نظر اگر ہے حقیقت کی جستجو — بت خانۂ خیال کو ٹھوکر لگا کے چل

ہم شاد رہے، ناشاد رہے! — بس آپ ہمیشہ یاد رہے!
تن قید میں ہو تو کیا پروا — اے قیدی! من آزاد رہے!
ہم خود پریشاں حال سہی — بس مے خانہ آباد رہے!

اسی قصور میں شانوں سے سر اترتے رہے — وہ کیسے لوگ تھے جو پھر بھی عشق کرتے رہے
صفیں بندھی رہیں کانٹوں کی راہِ الفت میں — گزرنے والے مگر مستانہ گزرتے رہے
نظامِ نو ہے محکم شبِ سیہ کے خلاف — ستارے ڈوبے تو سورج یہاں ابھرتے رہے
لیا تھا نام ترا اور سزائے دار ملی — پہنچ کے دار پہ پھر تجھ کو یاد کرتے رہے

ترے ضمیر پہ مانا کہ اضطراب رہا — ترے بغیر بھی لمحاتِ غم گزرتے رہے
پیاری ہو جس کو جان وہ چاہے ہی کیوں انہیں؟ — ہم تو ہزار بات کی کہتے ہیں ایک بات!

یاں قفس میں بھی دیکھ لے صیاد!
بلبلوں کی وہی صدائیں ہیں!

مظفر حسین صاحب کی نگاہ تنقید سے شعلۂ خیال کے یہ اشعار پوچھتے ہیں کہ ہم سے کیا خطا ہوئی کہ ہم کوئی خراج نظر نہ لے سکے۔ زیادہ متعین طور پر کسی مقام کو سامنے لانا ضروری ہو تو میں بتاؤں گا کہ آپ نے فیض کی عالی حوصلگی کے ثبوت میں یہ دو اشعار دستِ صبا سے لئے:۔

غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم — جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا — دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

کیا موازنہ کی ترازو کے پلڑے میں ڈالنے کے لئے شعلۂ خیال سے ایسے دو شعر نہ مل سکے جن میں عالی حوصلگی کا پرتو موجود ہو۔ اسی طرح ؎

"ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت"

کا شعر فیض کے ہاں ایک مثالی شعر ہے یہ تسلیم! مگر ایک موازنہ کرنے والے سے یہ انصاف ضرور چاہوں گا کہ موقع و محل کے لحاظ سے وہ ایک ہی نوعیت کے اشعار پر بحث کرے۔ طویل بیانیہ نظمیں فیض سرے سے جب کہتا ہی نہیں تو کسی دوسرے شخص کے یہاں سے ایسی نظموں کو اس کے غزلیہ اشعار کے مقابلے میں رکھنا بجائے خود زیادتی ہے، اس کے لئے مناسب تھا کہ اقبال، جوش، سیماب، حفیظ اور دوسرے شعرا کے ہاں سے طویل بیانیہ نظمیں نکال کر دیکھی جاتیں۔ غزل کے اسلوب میں لکھنے والے ایک شاعر کے ساتھ کسی دوسرے کا موازنہ کیجئے تو اس کے بھی وہ اشعار لیجئے جو غزلیہ اسلوب میں ڈھلے ہوں۔

پھر آپ نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ مقدمہ میں شعلۂ خیال کا شاعر آپ کو بطورِ خود بتا رہا ہے کہ دورِ قید و بند میں اس کی شاعری ایک نیا موڑ مڑی ہے۔ سو ان چیزوں کا رنگ بہر حال اس رنگ سے مختلف ہے جو اس دورِ زنداں سے قبل لکھی گئی ہیں۔ یوں وہ چند نظمیں بھی شعلۂ خیال میں شامل کر دی گئی ہیں جو تحریکِ اسلامی کے پہلے مرحلۂ ابتلاء (جس سے شاعر خود ذاتی طور پر دوچار نہیں ہوا) سے متعلق تھیں۔ آپ نے ان پہلے کی نظموں کو تو خاص طور پر فیض کے ساتھ موازنہ کرنے میں استعمال کر ڈالا، لیکن نئے رنگ کے ان اشعار کو بالکل ثانوی حیثیت میں ڈال دیا جن کو شعلۂ خیال میں "نغمۂ زنداں" کے نام سے اولیت دی گئی تھی۔ ان میں سے آپ نے صرف ایک پہلی نظم لی اور گنے چنے چند اشعار!

یہ باتیں جو عرض کی گئی ہیں ان کو جو کوئی بھی محسوس کرے گا وہ یہ تاثر لئے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ قلم پکڑتے وقت تنقید نگار کے ہاتھ سے رشتۂ انصاف چھوٹ گیا تھا۔ اور اگر رشتۂ انصاف ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پھر اچھا ہے کوئی لکھے تنقید نگاری ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ شعلۂ خیال کو یہاں سے وہاں تک دیکھ گئے آپ کو ہر جگہ بس غصہ اور جھنجھلاہٹ اور زہرناک تلخی ہی سے سابقہ پڑا۔ اس معاملے میں غلو کا عالم یہ ہے کہ آپ کے نزدیک یہ شعر بھی زہرناک تلخی ہی کا ترجمان ہے، نہ کہ درسِ عزیمت ؎

اس دیس میں خودی پہ ہے اظہار نا روا — گر سر کٹا سکے تو یہاں سر اٹھا کے چل!

اس شعر کو فیض کے شعر کے مقابل میں اس حیثیت سے رکھا جا سکتا ہے کہ وہ تو وطن کی گلیوں کا یہ سماں کھینچتا ہے کہ ان میں تو بس سر جھکا کے چلنے کی

رسم اب چل پڑی ہے۔ شعلۂ خیال کا شاعر اس رسم کے آگے بے چارگی کے عالم میں گھرے ہوؤں کو بتاتا ہے کہ اس رسم کو توڑا جاسکتا ہے اور سر کو بلند رکھا جاسکتا ہے، مگر بس ایک ہی شرط ہے، یہ کہ سر کٹانا ہوگا۔ کون نکتہ ور یہ نکتہ نکالے گا کہ یہ غصّے اور تلخی کا اظہار ہے۔

اسی طرح آپ نے میرے اس شعر پر بھی یہی کرم فرمایا ہے ؎

آخر ہے کس کے بس میں مرا شعلۂ خیال
سنگین و آہنیں مرا زنداں ہوا کرے

اس شعر میں سیدھی سی بات یہ کہی گئی ہے کہ میرے جسم کو قید میں رکھا جاسکتا ہے مگر کوئی طاقت میرے خیالات پر پابندی نہیں لگا سکتی۔ شاعر سنگ و آہن کی اس تعبیر سے بے نیازی دکھاتا ہے جو اسے اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے اور ساتھ ہی اس عزیمت کا اظہار کرتا ہے کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے، وہ تو اسے بہر حال کہنا ہے۔ بہتر ہوتا کہ متعلقہ غزل پوری کی پوری ایک بار آپ اپنے سامنے رکھ لیتے اور پہلے یہ دیکھتے کہ یہ بحر اور یہ زمین کس مزاج کی حامل ہے اور پھر پوری غزل کی تعمیر کس مسالے سے ہوئی ہے۔ یہ پوری غزل فطرتِ سوز و ساز پر مبنی ہے۔

اسی طرح "ظلمت کے خدائے اجل کے کہو" میں "ظلمت کے خداؤ" کے نیچے خط لگا کر آپ نے توجہ دلائی ہے کہ یہاں بھی غم و غصّہ کا مظاہرہ ہے! حالانکہ یہ سیدھا سادا ایک مصرعہ ہے۔ اس میں نظامِ ظلمت کے پاسبانوں کو جن مختلف الفاظ سے مخاطب کیا جاسکتا تھا ان میں سے مناسب ترین کو لیا گیا ہے۔

خیر، یہی مان لیجئے کہ شعلۂ خیال کا مرکزی جوہر تلخی اور غم و غصّہ ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا غم و غصّہ انسانی فطرت سے باہر کی کوئی چیز ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا شاعری کے دائرے میں ان جذبات کے داخلے پر کوئی قدغن ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا غم و غصّہ کی کیفیات دنیا کی شاعری کے جن جواہر پاروں میں نمایاں کی گئی ہیں کیا وہ اب دریا بُرد کر دئے جانے چاہئیں، محض اس لئے کہ آپ نے دنیائے شعر میں ان کی حُرمت کا فتویٰ صادر کر دیا ہے؟ دنیا بھر کی شاعری ــــــ اور خصوصاً جدید دور کی انقلابی شاعری ــــــ کے دفتروں کو کھنگالئے، آپ دیکھیں گے کہ یہ دفتر غم و غصہ کی انہی کیفیات سے بھرے پڑے ہیں۔ ظلم اور بدی کے خلاف جب انسانی فطرت حملہ آور ہوتی ہے تو وہ لجاجت سے لے کر طنز تک اور مشفقانہ نصیحت سے لے کر اظہارِ نفرت و غضب تک اور فریاد سے لے کر جرأت تک سارے ہی ہتھیار موقع بہ موقع استعمال کرتی ہے۔ اب اگر ایک تنقید نگار اُٹھے اور شاعر سے نفرت و غضب کے فطری ہتھیار رکھوا لے اور اس کے ہونٹوں سے رجز کی لَے چھین لے تو وہ اسے کمزور کر ڈالے گا، وہ اسے محض ایک فریادی بنا دے گا۔ اگر فیض کا ایک خاص انداز ہو تو ہوا کرے، آخر یہ کیا ضرور کہ دنیا بھر کے شاعروں کے لئے وہی انداز معیار قرار پا جائے۔ کیوں نہ جوش کے ہاں سے دوسری قسم کے نظائر لئے جائیں، کیوں علی سردار جعفری کی نگارشات کو سامنے رکھا جائے، کیوں نہ دوسرے جدید انقلابی شعراء کی کاوشوں سے مثالیں لی جائیں۔ فیض کو آپ پسند کیجئے، میں بھی پسند کرتا ہوں ــــ اور کسی کو پسند کرنے میں آدمی کے اپنے مزاج کا بڑا دخل ہوتا ہے ــــ لیکن یہ مجھے ہرگز تسلیم نہیں ہے کہ دنیا بھر کی شاعری کے اسالیب کے لئے فیض کا ذوق فیصلہ کن کسوٹی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل ایک شخص میرے اسالیب اور میرے ذوق کو پسند کر بیٹھے، لیکن اسے یہ حق نہیں دیا جاسکتا ہے کہ وہ زمانے بھر کے شعراء کے کارناموں کو اپنی اسی پسند کی کسوٹی پر جانچنے لگے۔ اور یہیں سے وہ فرق سامنے آجاتا ہے جو محض اظہارِ تاثر کرنے اور تنقید کرنے میں ہے۔ آپ کا یہ بیان کرنا اور شے ہے کہ فلاں چیز مجھے پسند ہے یا مجھے ناپسند ہے، لیکن یہ بیان کرنا اور شے ہے کہ کسی قاعدۂ کلیہ یا کسی معیار مسلّمہ کے تحت فلاں چیز سرے سے قابلِ قدر ہے ہی نہیں! آپ کو نفرت یا غصّے کے جذبات کا اظہار

ذاتی طور پر ناگوار ہو سکتا ہے، بُرا کہے۔ لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس شاعری میں یہ عنصر شامل ہو وہ اصولی طور پر قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہے۔ آپ کے مقالے کا بنیادی نقص یہی ہے کہ اپنے ذاتی اور محدود تاثر کو آپ نے اصولی حیثیت دینے کی کوشش کی ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے تنقید کا مرتبہ دے ڈالا ہے۔

اسی طرح آپ نے اپنے ذاتی ذوق کے ایک اور محدود گوشے کو لے کر نقد و نظر کا آفاقی کلیہ بنا ڈالا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "اگر آپ لوگوں کو شعر سنانے کے بہانے بلاکر تاریخ سنانا شروع کر دیں تو۔ ۔ ۔" یہاں پھر آپ نے تاریخی واقعات کے بیان کو دنیائے شعر کے لئے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ عرض ہے کہ ذرا اقبال کے کلام کا جائزہ لیجئے، غالباً ضرورت نہیں کہ میں خاص خاص نظموں کے نام گنوا دوں۔ بانگ درا سے لے کر جاوید نامہ اور بالِ جبریل تک ایسی بے شمار نظمیں ملیں گی جن میں تاریخ بیانی کی گئی ہے۔ اس تاریخ بیانی کے مجرم شبلی اور حالی بھی ہیں، جوش اور حفیظ بھی ہیں، پھر آخر آپ کس کس پر مقدمہ قائم کریں گے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ فرمائیں کہ جن نظموں میں تاریخ کے واقعات سے تعرض کیا گیا ہو ان سے لطف اندوز ہونے کا ذوق مجھ میں نہیں ہے، مگر یہ سیفٹی ایکٹ آپ کیوں نافذ کرنے پر اتر آئے کہ شعر میں تاریخ بیانی کی اجازت نہیں دی جا سکتی؟ آپ کا یہ فتویٰ اگر مان لیا جائے تو بالکل اسی نہج پر دوسرے مفتی اٹھیں گے اور کہیں گے کہ:۔

— ہم شعر سننا چاہتے ہیں، فطرت کے مناظر کا بیان نہیں سننے آئے!

— شعر کے نام پر ہمیں انسانی جذبات کی مصوری گوارا نہیں!

— ہم کو واقعہ نگاری سے دلچسپی نہیں، شعر لائیے، شعر!

غرض یہ کہ ہر شخص اپنے اپنے ذوق کو لے کر آئے گا اور اس کے تحت ایک ایک فتویٰ حرمت صادر کرتا جائے گا، یہاں تک کہ غریب شاعر کے سامنے سرے سے کوئی میدانِ فکر و فن باقی نہ رہے گا۔!

یہاں بھی وہی خرابی ہے کہ آپ نے اپنے ایک محدود انفرادی ذوق کو تنقید کے معیاروں میں لا شامل کیا۔

اب مجھے شعلۂ خیال کی پہلی نظم کی اُس مظلومیت کا ماتم آپ کے سامنے کرنا ہے جو فیضان ہے آپ کے قلم کا! اس نظم کی اصل خوبی ہی یہ تھی کہ اس میں شاعر گوشت پوست کے بنے ہوئے ایک عام انسان کی سی سیدھی سادہ فطرت کے ساتھ اپنے آپ کو سامنے لاتا ہے۔ انسانیت کا مطالعہ اگر فکر و نظر کا کوئی میدان ہے تو اس نظم کے ابتدائی تین چار بند ایوانِ شعر میں مستقل جگہ پائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی روح وہ سوز و گداز ہے جو آرٹ کی جان بنتا ہے۔ مگر ان اشعار کی ساری قدر و قیمت کو ایک تنقید نگار شاعر پر یہ پھبتی کس کر خاک میں ملا دیتا ہے" کہ "وہ خود ترسی کی کیفیت میں مبتلا ہو کر بالکل بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا ہے۔" اگر اس طرح کے الٹے سیدھے فقروں کا نام تنقید ہے تو پھر فن کی خیر نہیں۔

پہلے بند میں ایک سلسلۂ خیال جس انداز سے اپنی کونپل نکالتا ہے اس کے فنی پہلوؤں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا اور نہ زنداں میں آنے والی صبح کی کیفیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ لے دے کے میرے ناقد کی نظر اس مصرعہ پر جمی کہ "ستم رسیدہ انا لے رہا ہے پھر کروٹ"۔ اور اس میں وہ "ستم رسیدہ انا" کو لے کر بیٹھ گیا کہ شاعر کا انا ستم رسیدہ ہوا کیوں؟ اور اب چونکہ یہ ستم رسیدہ ہوا ہے، لہذا ثابت ہوا کہ ذہنیت شکست خوردہ ہے۔ نہ جانے ستم رسیدہ انا اور شکست خوردہ ذہنیت کو کس الجبرے کی مساوات میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔ بھائی صاحب! نشانۂ ظلم ہونا اور ستم رسیدہ ہونا اور جفاکش ہونا اور چیز ہے اور ستم رسیدگی کے نتیجے میں شکست خوردہ ہو جانا اور چیز! آدمی کو زخم آ سکتے ہیں اور وہ ان کا احساس کر سکتا ہے لیکن زخموں سے بچنے کے لئے اگر وہ اپنے اعتقاد اور مشن سے دست بردار ہو جائے تو اس کا نام شکست خوردگی ہوگا۔ مجرد زخم خوردگی کا نام

شکست خوردگی نہیں رکھا جا سکتا۔ "انا" کی ستم رسیدگی کا کوئی تصور مجرد شعر پڑھنے سے نہیں ہو سکتا، اس کا صحیح اندازہ جیل میں سی کلاس میں رہ کر ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ایک چکر اس کوچے کا لگنے کے بعد میرے محترم ناقد اپنی تنقید پر نظرِ ثانی فرمائیں تو وہ شعلۂ خیال کے شاعر کے بہت قریب آ جائیں گے۔ لیکن شعلۂ خیال کی وہ خودی جو کل زخم کھاتے کھاتے نڈھال ہو گئی تھی، صبحِ نو کی آمد پر پھر نئی کروٹ لیتی ہے۔ شکست خوردہ ہو جاتی تو دوبارہ کروٹ نہ لیتی۔ خودی کروٹ لیتی ہے تو ساتھ ہی "تصورات کو انگڑائی جیسے آنے لگی" کی کیفیت بھی شاعر کو محسوس ہوتی ہے، یہ تصورات بھی اس صورت میں انگڑائی نہ لے سکتے جب کہ خودی شکست کھا گئی ہوتی، بلکہ یہ طاقت آنے والے دن کی جولانگہ میں از سرِ نو کش مکش کرنے کے لئے پر تول رہی ہے۔ یہ سب کچھ شعلۂ خیال کے ناقد کی نگاہِ رسا کی دسترس میں نہیں آیا، بلکہ اسے تو بس شکست خوردہ ذہنیت ملی! اس بند کے یہ دو شعر بھی اگر آپ نے اور پڑھ لئے ہوتے تو آپ کو شاعر کی ذہنیت کے مطالعہ کرنے میں خاصی مدد ملتی اور بآسانی "ستم رسیدہ انا" والے مصرعے کا مفہوم متعین ہو جاتا

چٹک رہی ہے کلی اک مرے قفس کے قریب ۔۔۔ جو زخم کھا کے مری طرح مسکرانے لگی
شبِ سیاہ کے پنجرے کو توڑنے کے لئے ۔۔۔ سحر کی روح خود جیسے پھڑ پھڑانے لگی

ان دو شعروں کے آئینے میں آپ شاعر کے نفس کی ساخت کو ملاحظہ فرما سکتے تھے۔ یہ آپ کو بتاتے کہ یہاں ذہنیت شکست خوردہ تھی یا عزیمت مندانہ!

دوسرا بند کسی قدر فلسفیانہ ہے اور اس میں خیالات کے تسلسل ظہور اور ان کے باہم دگر ٹکرانے اور پھر گوناگوں خیالات میں سے کسی فکری حاصل کے برآمد ہونے کا تصور دلایا گیا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ ذہنی کشاکش کی ایک تصویر کشی ہے اور انسانی نفسیات کا ایک مطالعہ ہے،

اب وہ دو بند لیجئے جن میں "شاعر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتا ہے"۔ ان میں پہلے بند (یعنی نمبر ۲) میں فطرتِ نسائیت کا ایک ایسا مطالعہ ہے کہ جس کے ساتھ اگر انصاف کیا جاتا تو ناقد کو محسوس ہوتا کہ اس میں شاعر نے شعر و ادب کو کوئی متاع نو دی ہے۔ مگر اسے تو بس "شاعر کے رو دینے" کے سوا اور کچھ نہیں مل سکا۔ اس کا پہلا مصرعہ ہے "ایک پیکرِ صدق و صفا تصور میں" صنفی دائرۂ اظہار میں ایک پاکیزہ اسلوب پیش کرتا ہے "پیکرِ صدق و صفا" کے الفاظ ذہن کو سفلی پن سے بہت اونچا اٹھا لے جاتے ہیں۔ دوسرے شعر میں ایک ایسی نفسیاتی حقیقت پیش کی گئی ہے جو فطرتِ نسائیت کے گہرے مطالعہ کے بغیر ہاتھ نہیں آ سکتی۔ بعید نہیں کہ "خود اپنے آپ سے کہنا کہ ہائے کیا ہو گا؟!" ہماری دنیائے ادب و شعر میں تازہ اضافہ ہو۔ اور یہ شعر کہ:-

وفا کا رنگ تو کچا نہیں کہ اُڑ جائے
حنا کا رنگ ہتھیلی سے اُڑ گیا ہو گا

مگر ساری بے چینیوں کے اظہار کی راہ کیا ہے:

کبھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھے ہوئے ہوں گے ۔۔۔ کبھی سجود میں سر خاک پر دھرا ہو گا

مگر ناقد کو اس پورے بند میں کچھ نہیں ملا۔ نہ اسلامیت، نہ شعریت، نہ تخیل، نہ فن!

اس سے اگلے بند میں ایک قیدی کے بچوں کی سرگزشت آپ کے سامنے آتی ہے جس میں نفسیاتِ طفلی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ سب کچھ میرے بچوں پر نہیں گزرا، وہ خدا کے فضل سے بہت اچھی حالت میں رہے۔ پھر یہ بند میں نے کیوں لکھا؟ یہ میں نے اپنے ساتھ کے بہت سے

قیدیوں کے احوال و کوائف کو دنیا کے سامنے رکھنے کے لئے لکھا ہے۔ یہی صورت پچھلے بند میں ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ میری بیوی کے پیکرِ صبر و رضا نے غالباً ایک دن بھی میری یاد میں پلکوں کو بھیگنے نہ دیا ہوگا، لیکن میرے سامنے ان سیکڑوں بے گناہوں کی بیویوں کی نمناک آنکھیں بھی تو تھیں جو گوناگوں احوال و احساسات سے دوچار تھے۔ میں نے اس نظم میں درحقیقت کئی سو قیدیوں کو ایک قیدی میں بدل ڈالا ہے اور وہ ایک قیدی میں خود بن گیا ہوں اور کئی سو قیدیوں کے درد و کرب کو میں نے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے :

"دُنیا کے ہر اک دُکھ میں مرا حصہ ماتم"

یا اقبال کے لفظوں میں کہوں تو ———

میں وہ گل ہوں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

میرا حال یہ ہے کہ میں نے صدہا ابنائے نوع کے غم و اندوہ کا بار اپنے جگر پر لے لیا ہے اور اپنی طرح کے بے شمار مظلوموں کا مقدمہ لے کے کھڑا ہوتا ہوں اور ایک تبصرہ نگار آکے مجھ پر طنز کرتا ہے کہ شاعر نے بچوں کی طرح ذاتی غم میں بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ بھائی! اگر شعر کو اس طرح سمجھا جاتا ہے تو پھر خدا ہی بچائے۔

ہزاروں قیدیوں کے اندوہ و کرب کا ترجمان ہونے کی وجہ ہی سے شاعر پانچویں بند کو یوں شروع کرتا ہے کہ "ہزاروں جانوں کو جیلوں میں ڈالنے والو!" یہ ایک مصرعہ نظم کی اجتماعی ساخت کو واضح کر دینے کے لئے کافی تھا، مگر تنقید نگار دوست کی توجہ ادھر نہ جا سکی۔

اسی پانچویں بند پر آپ نے فقرہ چست کیا ہے کہ انصاف کی بھیک مانگی جا رہی ہے۔ حالانکہ اگر پچھلے چاروں بندوں کا پیش کردہ نقشہ سامنے رہے کہ بے شمار افراد سیاہ خانۂ زنداں میں ایک ابتلاء سے دوچار ہیں، ان کی بیویاں ایک عالم اضطراب میں ڈال دی گئی ہیں، اور ہزارہا بچوں کی ذہنی اور جسمانی صحتیں خطرات میں گھر گئی ہیں، ان گنت کنبوں کے لئے سرے سے کوئی ذریعۂ معاش نہیں رہا، یہاں تک کہ مکانوں کے کرایے تک ادا کرنے کی سکت ان میں نہیں اور مکان خالی کرانے کے لئے تقاضے ہو رہے ہیں تو نگاہوں کے سامنے پھیلے ہوئے اس نقشے کو دکھا کر ہزاروں جانوں کو جیلوں میں ڈالنے والوں کو احساس دلایا جا رہا ہے کہ :-

"تمہیں پتا بھی ہے اس قید کا مزا کیا ہے!"

یہ احساس دلاتے دلاتے ہزاروں قیدیوں سے مل کر بنا ہوا ایک قیدی جب یہ شعر لاتا ہے کہ ؎

تمام عمر مجھے قید میں رکھو لیکن
مجھے بتاؤ کہ آخر مری خطا کیا ہے!

تو وہ ملک کے مستبدانہ قوانین کی رگِ ظلم کو پوری طرح فاش کر دیتا ہے۔ اس بند میں نعیم صدیقی کی ذاتی فریاد نہیں، بلکہ درحقیقت شہری آزادیوں اور جمہوری حقوق کا استغاثہ ہے، جسے اس سے پہلے بھی بعض شعراء نے پیش کیا ہے اور اب شاعر نے خیال میں اپنے ایک خاص جاذب انداز سے سامنے لایا گیا ہے۔

اس بند کے خاتمے سے ذہن ایک نیا موڑ مڑتا ہے اور وہ جذباتی تاثرات کے عالمِ مضطرب سے نکل کر سوچ بچار کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ چنانچہ اگلے شعر کا آغاز ہی یوں ہوتا ہے کہ "میں سوچتا ہوں کہ ——" ظاہر بات ہے کہ جذباتی لہروں کو جب شعر میں لایا جاتا ہے تو

یہ کیفیت کچھ اور رہتی ہے اور جب سوچ بچار کے عالم کا عکس پیش کیا جاتا ہے تو انداز دوسرا ہوتا ہے۔ ایک بے لاگ نگاہِ تنقید اس موڑ کا جائزہ لیتی تو وہ شعلۂ خیال کے شاعر کے فن کے اس زیر و بم میں کامیاب فنی عمل کا احساس کرتی۔ مگر شعلۂ خیال کو وہ ناقد نصیب ہوا جس نے ابتدائی حصے کو "ذاتی غم" پر محمول کیا اور بعد کے حصے کو "غمِ جاناں" قرار دیا اور لہجہ کے فرق کی توجیہہ یہ کی کہ وہاں تو اپنا دکھ درد تھا، اس لئے زورِ سخن کارفرما تھا۔ غمِ جاناں کے مرحلے میں آکر لہجہ دھیما پڑ جاتا ہے اور شاعر تھکا تھکا نظر آنے لگتا ہے۔ چھٹے اور ساتویں بند میں اقتدار اور تحریکِ تغیر کی تاریخی کشمکش پر گفتگو ہے اور بتایا یہ گیا ہے کہ یہ کشمکش ہمیشہ سے چلی آرہی ہے اور اسی کی وجہ سے جیل ہمیشہ سے آباد چلے آرہے ہیں، مگر ان بودی تدبیروں سے انسان کے ذوقِ تغیر و انقلاب کا راستہ روکا نہیں جاسکا۔ ملاحظہ ہو ؎

زبانیں پھر بھی حقیقت کے گیت گاتی رہیں — دماغ پھر بھی حقیقت کو سوچتے ہی رہے!
ندامت اپنے بچاؤ کی فکر کرتی رہی — تغیرات ہر اک بند توڑتے ہی رہے!
گواہی دیں گے یہ ٹکڑوں کے ٹکڑے جالے — کہ آدمی کے عزائم بھی غیر فانی ہیں

یہ اشعار شعلۂ خیال کے مبصر کی نگاہ میں بالکل بے جان اور بے دلولہ ٹھہرے ہیں! سبحن اللہ و بحمدہٖ!

آٹھواں بند وہ ہے جس میں سوچ بچار کی گہرائیوں سے شاعر پھر اوپر ابھر آتا ہے اور وہ اپنے سارے تاثرات، اپنی ساری مظلومی، اپنے بیوی بچوں کے سارے ابتلا سے علی الرغم پکارتا ہے کہ :۔

سلوک جیسا بھی چاہو، روا رکھو مجھ سے — رہ یقین سے صداقت پھسل نہیں سکتی
کسی جفا سے مرا دل دہل نہیں سکتا — کسی عطا سے طبیعت بہل نہیں سکتی
جو نت بدلتے ہیں ان مصلحت کے سانچوں میں — یہ میری فطرتِ اسلام ڈھل نہیں سکتی

یہ وہی شاعر بول رہا ہے جس کے بارے میں مظفر حسین صاحب ایم اے کی تشخیص یہ ہے کہ وہ جھوٹتے ہی شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتا ہے ـــــ وہی شکست خوردہ ذہنیت جس شعر کو مقطع بنا کے لائی ہے وہ تو گویا شعلۂ خیال کے اس نسخے میں تھا ہی نہیں جو موصوف کے ہاتھوں میں پہنچا۔ وہ تھا :۔

میں قیدِ یوسفِ کنعاں کی کھا رہا ہوں قسم
یہ قید میرے عقیدے بدل نہیں سکتی!

یعنی وہ اپنے سارے ابتلا کا راز سبب اس حقیقت میں دیکھتا ہے کہ اس کے کچھ خیالات ہیں اور اس کا ایک مشن ہے جو اس ابتلا کا موجب ہوا ہے تو وہ واشگاف لفظوں میں یہ عزیمت مندانہ اعلان کرتا ہے کہ ان طریقوں سے مجھے میرے خیالات اور میرے مشن سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ یہ شعر جو حاصلِ نظم ہے، مبصر سے تنقیدی مقالے میں قابلِ توجہ ہی نہیں ٹھہرا۔ شکست خوردہ ذہنیت اگر ایسے ہی انداز سے اپنا مظاہرہ کرتی ہے تو پھر ایسی شکست خوردہ ذہنیت ہر اک کو مبارک ہو!

مظفر حسین صاحب نے سب سے زیادہ قابلِ گرفت نکتہ یہ نکالا ہے کہ اس نظم میں "ذاتی غم" کی رو میں شاعر بہ گیا اور بڑی دیر بعد جا کے اسے سنبھالا ملا ہے۔ اس سلسلے میں کہنا یہ ہے کہ یہ "ذاتی غم" آخر شاعری میں شجرِ ممنوعہ کیوں ٹھہرا ہے۔ دنیا میں آپ کو کوئی شاعر سورج ہاتھ میں لے کر ڈھونڈنے سے بھی ایسا نہ ملے گا جس نے ذاتی غم کو آرٹ کی روح نہ بنایا ہو۔ عام آدمی کے ذاتی غم کے اظہار کے مقابلے میں کسی صاحبِ فن

کے اظہار کا امتیاز صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کے بیان کردہ ذاتی غم میں ہزاروں افراد اپنا ذاتی غم پڑھ سکتے ہیں۔ شعلۂ خیال کے شاعر نے اگر ذاتی غم کو کسی ایسے ہی انداز میں بیان کیا ہے کہ اس کے اشعار کو پڑھ کر دوسرے بہت سے لوگ بھی یہ محسوس کریں کہ گویا یہ انہی کی رام کہانی ہے تو پھر وہ اپنا فنی فرض ٹھیک سے ادا کر گیا ہے۔ اس بارے میں کوئی فیصلہ کن رائے دینا تو میرا کام نہیں، البتہ اپنی اس نظم کے بارے میں مجھے حُسنِ ظن یہی ہے کہ میں نے جو تصویر مرتب کی ہے اس میں دنیا کا ہر بے گناہ سیاسی نظربند اپنی صورت دیکھ سکے گا۔ میرے ذاتی غم میں مجھ جیسے بے شمار مظلوموں کے ذاتی غم آ کر مدغم ہو گئے ہیں۔

یوں یہ حقیقت بھی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ شخص، اور صرف وہ شخص کسی دوسرے کے غم میں حصہ لے سکتا ہے جو ذاتی غم کا احساس رکھتا ہو۔ جس کو خود زخم کھانے کا تجربہ حاصل ہوگا وہی دوسروں کے زخموں کی ٹیسیں محسوس کر سکتا ہے۔ ہم دوسروں کی تمام کیفیات کو اپنی نفسیاتی کیفیات ہی کے وسیلے سے سمجھتے ہیں اور دوسروں کے تمام ذہنی تجربات کا اپنے ذہنی تجربات کی معرفت اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ ہماری نفسیاتی مجبوری ہے۔ وہ شخص جسے کبھی اپنی قسمت کا ماتم کرنے کا موقع پیش نہ آیا ہو، دوسروں کی بدنصیبیوں پہ فریاد نہیں اٹھا سکتا۔ وہ جس نے ذاتی احوال سے متاثر ہو کر اپنی پلکوں کے نم آلود ہونے کا تجربہ نہ کیا ہو، وہ دوسروں کی ہمدردی میں کبھی خراجِ اشک پیش نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہم دوسروں کے صدموں پہ رنجیدہ ہوتے اسی لئے ہیں کہ ہمارے اندر اسی طرح کے اپنے صدموں کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ ہمارے سامنے ایک حادثہ ہوتا ہے تو معاً وہ سارے حادثات آنکھوں میں پھر جاتے ہیں جو خود ہماری زندگی میں پیش آئے ہوتے ہیں۔ کسی کی موت پہ رونے والوں کی حالت دیکھ کر ہمارا جی اس لئے بھر آتا ہے کہ وہ تمام چوٹیں ہمیں کچوکے دینے لگتی ہیں جن کے صدمے سے براہِ راست ہم دوچار ہو چکے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی جیل کی ڈائری میں اس نفسیاتی تجربے کو بیان کیا ہے کہ مولانا مودودی کے پھانسی کی کوٹھڑی میں چلے جانے کے بعد جب کبھی میں نے پھانسی والوں کے ملاقاتیوں کو اس طرف جاتے دیکھا تو ایک نئی ہمدردانہ دلچسپی ان کے ساتھ وابستہ محسوس کی، حالانکہ اس سے پہلے یہ کیفیت کبھی نہ تھی۔ جب آدمی کو خود کوئی چوٹ لگتی ہے تو پھر وہ دنیا بھر کے زخم خوردہ دلوں کا راز پا لیتا ہے اور ان کے ساتھ اس کا ایک نیا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہی ذاتی غم کی دنیائے فن میں بڑی اہمیت ہے، یہ نہ ہو تو دوسروں کے لئے سرے سے کوئی حس ہی نہ رہے۔ یہ تو عمر بھر میں پہلی بار مجھے ایک ایسے تنقید نگار سے تعارف ہوا ہے جس نے مجھے "ذاتی غم" کے اظہار کے "جرم" پہ شرمندہ و نادم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بھائی! میں پتھر کا مجسمہ نہیں ہوں، میں کوئی تودۂ گِل نہیں ہوں، لوہے یا پیتل کی کوئی سلاخ نہیں ہوں، آدمی ہوں جس کے سینے میں دل دھڑکتا ہے، جس کے اندر نازک احساس کام کرتا ہے، جس کو فطرت نے جذبات ودیعت کئے ہیں، جس کے گھر، اور قلبی علائق دنیا میں ہیں، اور جو کسی شرمندگی کے بغیر اقراری ہے کہ وہ ذاتی غم بھی رکھتا ہے اور اس کے اظہار کو بھی گناہ نہیں سمجھتا۔ آپ آخر شعلۂ خیال کے شاعر سے کیا چاہتے ہیں؟ —— کیا یہ کہ وہ یہ جھوٹ بولے کہ اصلی آرام تو مجھے جیل میں آکر ہی ملا ہے؟ کیا وہ یہ بیان کرے کہ اسے نہ کبھی بیوی کی یاد آئی، نہ بچوں کا دھیان آیا؟ —— وہ ان سارے انسانی احوال و کوائف سے متاثر ہوتا ہے، اس تاثر کا اظہار کرتا ہے، مگر وہ اپنے اصول اور مشن کی خاطر اسے گوارا کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ —

"یہ قید میرے عقیدے بدل نہیں سکتی!"

لیکن اصل حقیقت یہ ہے نہیں کہ شعلۂ خیال کی پہلی نظم محض "ذاتی غم" کی آئینہ دار ہو۔ اس میں مقدمہ کی وضاحت کے مطابق "غمِ جاں"، "غمِ جاناں"، "غمِ دوراں"، "غمِ انساں"، اور "غمِ ایماں" سارے ہی غم ایک ترتیب و تسلسل کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ بات

"علمِ جان" سے شروع ہوتی ہے اور "علمِ ایمان" پر ختم ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے تو یہ نظم ایک خاص قدر و قیمت کی حامل تھی مگر بدقسمتی ہے کہ ناقد کو اس میں صرف ایک علمِ جان ہی ملا ہے!

آخر میں میں یہ کہوں گا کہ "شعلۂ خیال" کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے آپ اطمینان دلاتے ہیں کہ میری نیت نیک ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ نیک نیتی بڑی خطرناک ہوتی ہے جس کے بعد آدمی ساری ذمہ داریوں اور احتیاطوں سے بے نیاز ہو کر جو چاہے بے تکلف کہتا اور کرتا چلا جائے۔ کوئی پلٹ کر بات کرے تو کہہ دے کہ میری نیت تو بڑی نیک ہے۔ تنقید کے کام میں صرف ایک "نیتِ نیک" کا ہونا کافی نہیں۔ زاویۂ نگاہ کی صحت، تنقید کے اصولوں کی مضبوطی اور الفاظ اور اندازِ بیان کا توازن بھی بہت لازمی تقاضے ہیں۔ خالی خولی نیک نیتی تو دنیا میں بڑی تباہیاں لاتی ہے اور بڑے بڑے مفاسد کا موجب بنتی ہے۔

یہ روایت کے خلاف ہے کہ مصنف خود ہی اپنی تصنیف کی حمایت یا اس کی تشریح و توضیح کرنے کی ذمہ داری قبول کر لے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس درجے کا شعری و ادبی شعور پایا جاتا ہے، اسے رہنمائی دینے والے مثبت تنقیدی مقالے تو سامنے آ نہ سکیں، الٹا اس کے شیرازہ کو پریشان کر دینے والی غیر متوازن اور منفی تحریریں شائع ہوں[1]۔ تو اس شعر و ذوق کا بالکل ہی ستیاناس ہو جائے گا۔ اس وجہ سے کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ مجھے یہ اچھا نہ لگا کہ کسی دوست کو اس کام میں استعمال کروں۔ بلکہ میرے پڑوس میں رہنے والے ایک ادبی دوست نے مجھے بتایا بھی کہ وہ مظفر صاحب کے مقالے پر کچھ لکھ رہے ہیں اور انہوں نے مجھ سے اصرار بھی کیا کہ جس طرح آپ نے مظفر صاحب کی تحریر شائع کر دی ہے اسی طرح میری تحریر کو بھی اخلاقاً شائع کر دیجئے لیکن میں نے محسوس کیا کہ مظفر صاحب کے خیالات پر کسی کے قلم سے بھی اگر کوئی تبصرہ چراغ راہ میں شائع ہوگا تو اس میں اور خود میرے لکھنے میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ خود میرا لکھنا تو بلکہ کسی قدر زیادہ بے تکلفانہ صورت ہوگی، لیکن دوسری ہر صورت کے بارے میں کوئی نہ کوئی بدگمانی کی جا سکتی ہے۔ ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے خود ہی شعلۂ خیال کی فریاد کو اپنے قلم سے پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مظفر حسین صاحب سے صرف یہ درخواست ہے کہ وہ ان سطور کو پڑھ لیں اور ان پر غور فرمائیں، یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ وہ شعلۂ خیال یا اس کے مصنف کے بارے میں اپنی رائے بھی ضرور بدل دیں۔ چاہیں تو وہ اسی رائے پر قائم رہیں مگر اس رائے کو زیادہ مضبوط تنقیدی اصولوں اور زیادہ کارگر دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے لائیں۔ تنقید کیجئے چاہے کتنی بے رحمانہ ہو ـــــــ لیکن لوگوں کی نگارشات پر ظلم نہ کیجئے!!

---

[1] اگر کسی دوسرے شخص کی کسی تصنیف کے بارے میں اس طرز کی تنقید موصول ہوتی تو یا تو میں اسے واپس کر دیتا، یا جابجا اختلافی نوٹ لگا کر شائع کرتا، مگر مصیبت یہ ہوئی کہ میری ہی کتاب پر ایسی تحریر لکھ کر مجھی سے باصرار چاہا گیا کہ اپنے رسالے میں شائع کر دوں۔ پوزیشن ایسی تھی کہ تعمیلِ ارشاد کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اَدب اور داخلیت

☆

گوپال مِتّل

اردو تنقید میں پچھلے دس پندرہ سال سے داخلیت کا ذکر بقول محمد حسن عسکری" اس طرح ہوتا رہا ہے جیسے یہ کسی بیماری کا نام ہے" تنقید کے اس رجحان پر مارکسزم کا سایہ تھا۔ مارکسی نقاد یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے ذہنی عوامل کی طرح ادبی تخلیق بھی ماحول کی تابع ہوتی ہے اور اسے ہونا بھی چاہئے۔ دوسری طرف کچھ لوگ ادب اور اس کی تخلیق کو اندرونی لگن کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ جو سراسر ایک داخلی عمل ہے۔ ہر چند کہ ہمیں اس بات میں مسٹر عسکری سے اتفاق ہے کہ "داخلیت اور خارجیت انسانی ذہن کے دو مستقل رجحانات ہیں" لیکن ادبی تنقید میں ان اصطلاحوں کا استعمال چونکہ عام ہو گیا ہے اور اس بنا پر ادب کے دو الگ اسکول بھی بن گئے ہیں اس لئے ان دونوں رجحانوں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے جن کی یہ اصطلاحیں ترجمانی کرتی ہیں۔ یہ بات زیادہ ضروری اس لئے ہے کہ خارجیت کے حامیوں کے نزدیک داخلیت کشی صرف ادبی گالی ہی نہیں بلکہ جرائم کی فہرست میں بھی شامل ہے۔ ابھی پچھلے دنوں چین کے مشہور ادیب ہیو فینگ کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے خلاف یہی داخلیت کیشی کا الزام تھا۔ چینی اخبار دیمین ہیوح پاؤ کے الفاظ میں "اس نے کہا کہ تخلیقی ادب اور فنونِ لطیفہ کا محور داخلی عمل، مضبوط شخصیت اور زندگی کا داخلی پھیلاؤ ہیں۔ ادب اور فنونِ لطیفہ کے متعلق یہ تمام نظریات بنیادی طور پر بورژوا آدرش واد کے نظریات ہیں"۔

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور یہاں کسی ادیب کو کوئی غلط ادبی نظریہ اپنانے کی پاداش میں گرفتار نہیں کیا جا سکتا لیکن ترقی پسند نقادوں کے نزدیک داخلیت پسندی ایک عیب ضرور رہا ہے۔ ان کی گزشتہ پندرہ سال کی تحریریں اس کی گواہ ہیں۔ ہمارا ملک ایک مذہبی ملک ہے اس لئے یہاں داخلیت کے خلاف پرچار آسان نہیں تھا۔ ترقی پسندوں نے خارجیت کو مقبول بنانے کے لئے کامیاب ترین چال یہ چلی کہ خود مذہب کی بھی خارجی تاویلیں کر دیں۔ ہمارے مرحوم دوست باری علیگ نے "محمد عربیؐ" کے نام سے رسولِ پاکؐ پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ حضرت محمدؐ نے جن نظریات کا پرچار کیا وہ عرب کے مخصوص جغرافیائی اور سماجی ماحول کا نتیجہ تھے۔ انہوں نے یہ کتاب مجھے پڑھنے کو دی اور میری رائے دریافت کی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر حضرت کی وحی من اللہ نہیں تھی اور صرف ماحول کا نتیجہ تھی تو یہ صرف انہی پر کیوں نازل ہوئی۔ ماحول تو عرب کے سارے باشندوں پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ میری اس بات کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آج میں اپنا یہ سوال تمام خارجیت کیشوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

تازہ ترین مثال مہاتما گاندھی کی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ماحول نے فتنہ و فساد کو اچھا خاصا مذہبی فریضہ بنا دیا تھا لیکن اسی ماحول کا مہاتما گاندھی پر الٹا اثر ہوا۔ وہ اس فتنہ و فساد کے خلاف لوہے کی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے اور ماحول پر غالب آ کے رہے۔ ان کے طرزِ عمل کا ماخذ ان کی داخلیت میں ہی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اس داخلیت نے ماحول کا تابع ہونے سے انکار کر دیا اور اس کلیے کی از سرِ نو تصحیح کر دی کہ ...

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل

کسی بڑے شاعر یا ادیب کی نگارشات میں اس کے ماحول کی عکاسی تلاش کر لینے سے خارجیت کیشی کی تائید نہیں ہوتی۔ داخلیت کیش نہ تو حواسِ خمسہ سے محروم ہوتے ہیں اور نہ اپنے ماحول سے مکمل طور پر بے نیاز۔ بات صرف اتنی ہے کہ خارجی ماحول کے خلاف ردِ عمل ان کی انفرادیت کے سانچوں میں ڈھل جاتا ہے اور یہ انفرادیت خدا کی دین ہوتی ہے ماحول کا نتیجہ نہیں۔

داخلیت اور خارجیت کی بحث کو آسان بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ادب اور پوسٹر میں جو حدِ فاصل ہے اس کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اشتہاری قسم کا ادب واقعی خارجی ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ بندھے شدہ پروگرام کے ماتحت تیار کیا جا سکتا ہے اور اس صورت میں گرد و پیش کی تمام مصلحتیں بھی پیشِ نظر رکھی جا سکتی ہیں۔ یہ ادب افادی کہلا سکتا ہے۔ لیکن ادبِ عالیہ کی بارگاہ میں بار پانے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ جنگ کے زمانے میں حکومتِ ہند نے سانگ پبلسٹی کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا تھا اس کے انتظام میں مشاعرے کرائے جاتے تھے جہاں اس محکمے کے افسرِ اعلیٰ جناب حفیظ جالندھری اور دوسرے شاعر نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ نظمیں لکھ کر شاعروں نے پیسے ضرور وصول کئے لیکن ان میں سے کسی نے ان نظموں کو اپنے مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ افادی ادب کی حیثیت متعین کرنے میں یہ مثال کافی مدد دے سکتی ہے۔

روس میں انقلاب کے بعد ادیبوں کی جتھہ بندی کی گئی اور ان سے اجتماعی طور پر افادی ادب کا مطالبہ کیا گیا۔ کتابیں وسیع پیمانے پر لکھی گئیں اور وسیع تر پیمانے پر ان کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا لیکن اس اجتماعی کوشش میں بیچارہ ادب بری طرح مجروح ہو گیا اور انقلابِ روس کے آتش نوا شاعر میکافکی کو تو افادی اور اجتماعی ادب کے مطالبے نے اتنا پریشان کیا کہ جب اسے مفر کا اور کوئی راستہ نہ ملا تو اس نے ابد کے اندھیرے ہی میں چھلانگ لگا دی اور خودکشی کر لی۔ اس شخص نے زارشاہی کے جبر کے خلاف بڑے زور کی نظمیں لکھی تھیں لیکن یہ بلا کا داخلیت کیش تھا۔ اس کی انفرادیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے نزدیک "اس کے پاؤں کو جوتے کی کیل چبھنے سے جو تکلیف ہوتی تھی وہ ڈانٹے کے خواب سے زیادہ ہیبت ناک تھی" ظاہر ہے کہ اس قسم کا انفرادیت کیش اشتراکی اجتماعیت کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔

موجودہ چین میں ہیو فینگ کو اس کا ہم قسمت سمجھنا چاہئے۔ بیس سال تک وہ چین میں انقلاب کے گیت گاتا رہا۔ یہ گیت جبرِ ماحول کے خلاف اس کا داخلی ردِ عمل تھے۔ اس نے نئے ماحول میں بھی اپنی روش پر قائم رہنا چاہا لیکن یہ ماحول اس کی داخلیت کیشی کا احترام کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اسے خارجی تقاضوں یعنی حکومت کی پالیسی کے مطابق لکھنے کے لئے کہا گیا اور جب اس نے اس مشورے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا تو اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔

داخلی ادب کے مخالف اس کے غیر افادی ہونے کا لاکھ ڈھنڈورا پیٹیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ چیز اتنی بیکار بھی نہیں ہے اگر یہ ادب، قوموں کو جہاد کے لئے نہیں ابھارتا تو کیا ہوا اس سے جذبات کی تطہیر تو ہوتی ہے۔ اس معاملے میں تو وہ ادب بھی بیکار نہیں جسے عام طور پر مریضانہ ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ انسان فرشتہ ہونے سے تو رہا اگر وہ اپنے جذباتِ سفلی کی تسکین دنیائے عمل میں ڈھونڈنے کی بجائے صرف خواب و خیال میں تلاش کرے تو آخر اس میں کیا برائی ہے۔ اس ادب کی خطرناکیاں افادی ادب سے تو یقیناً کم ہیں۔ افادی ادب آمریت اور جبر کی تائید کرتا ہے، خوں آشامی کا درس دیتا ہے اور نفرت کا پرچار کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں داخلی ادب خواہ وہ مریضانہ ہی کیوں نہ ہو صرف انسان کے ذہنی اور روحانی عوامل کا اظہار کرتا ہے۔ یہ اظہار بے مقصد اور بیکار تو ہو سکتا ہے۔ خطرناک نہیں۔

سمرقند کی ایک شام

ریڈیائی انداز کا ایک تمثیلچہ

سید نظر زیدی

["چراغِ راہ" کی محفل میں ایک نئے رفیق پہلی بار شامل ہو رہے ہیں۔ ہم ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ آپ ایک سنجیدہ طرزِ فکر اور نہایت مہذب فنی ذوق رکھتے ہیں اور فطری ساخت کے لحاظ سے ہم سے ہمیشہ قریب تر تھے ـــــ اگرچہ حالات نے انہیں دور رکھا امید ہے کہ آپ کے آنے سے ہماری طاقت میں قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔] (ادارہ)

افراد

تیمور:	محافظ فوج کا سالار
ہما خانم:	تیمور کی بیوی
گلشن:	ہما خانم کی خادمہ
تورہ تی خاں:	چنگیز خاں کی فوج کا ایک کردار



[ہما خانم کی خادمہ گلشن رباب پر ایک غمناک دھن بجا رہی ہے
ہما خانم طویل سانس لے کر مایوسی بھرے لہجے میں کہتی ہے۔]

ہما خانم۔ گلشن ـــ!

گلشن۔ میں ہمہ تن گوش ہوں خانم۔

ہما خانم۔ معلوم ہوتا ہے آج میری طرح دنیا کی ہر چیز اداس ہے۔ یہاں تک کہ تمہارا رباب بھی۔

گلشن۔ (سراسیمہ سی ہو کر) اوہ معاف فرمائیے خانم۔ معلوم نہیں آج میری انگلیوں کو کیا ہو گیا ہے! مجھے یہ راگ نہیں چھیڑنا چاہئے تھا۔ اداس نغموں سے غم کی خلش اور زیادہ ہو جاتی ہے

ہما خانم۔ (طویل سانس لے کر) نہیں گلشن! اس میں تمہارے ساز اور میری خواہش کسی چیز کو دخل نہیں۔ آج تو یہ ساری کائنات رنج و الم میں ڈوبی ہوئی ہے، سورج کو دیکھ رہی ہو کیسا اداس اور غمزدہ ہے، محسوس ہوتا ہے کئی گھنٹے پہلے غروب ہو رہا ہے، اور یہ شفق، جیسے بے گناہ مسلمانوں کا خون آسمان کی پیشانی پر مل دیا گیا ہو۔

گلشن۔ آہ بخارہ کے بے گناہ مظلوم مسلمان!

ہما خانم۔ صرف ایک بخارہ ہی کیا گلشن؟ کون جانتا ہے سمرقند کی قسمت میں بھی یہی کچھ لکھا ہو۔ جس خونیں طوفان نے تاریخ کی اسی عظیم یادگار کو تاراج کیا ہے اسی کی لہریں تو سمرقند کی دیواروں سے بھی ٹکرا رہی ہیں کس قیامت کی گرج ہے ان ابھری ہوئی موجوں کی۔ آج تو شاید مُردے بھی اپنی قبروں میں بیدار ہو گئے ہوں گے۔ لیکن ـــ!

گلشن۔ جی ـــ؟

ہما خانم۔ لیکن اس قوم کی قسمت کے محافظ ایسی گہری نیند سو رہے ہیں۔

کہ ان کے بیدار ہونے کا کوئی امکان نہیں ۔
گلشن۔ خدا کے لئے اس قدر مایوس نہ ہوں خانم!
ہما خانم۔ میں مایوس نہ ہوں — ! کاش میرے مایوس نہ ہونے سے
سمرقند کی قسمت بدل سکتی! کاش غفلت کی نیند سونے والی قوم
کے محافظ جاگ اٹھتے
گلشن: میں نے سنا ہے تاتاریوں کی یورش کا حال سن کر خلیفہ الناصر
نے جہاد کا فتویٰ دے دیا ہے۔ بلکہ ہماری امداد کے لئے ایک
زبردست فوج بغداد سے روانہ بھی ہو چکی ہے ۔
ہما خانم۔ (طنزیہ انداز میں ہنس کر) امیدوں کے ہوائی قلعے —
گلشن! ان قلعوں میں کسی قوم کو پناہ نہیں مل سکی۔
گلشن۔ یہ خیالی باتیں نہیں خانم۔ ظالم تاتاریوں نے بخارا کے مسلمانوں
پر جو ستم ڈھائے ہیں ان کا حال سن کر ساری دنیا کے مسلمانوں میں
کہرام مچ گیا ہے۔ ساری اسلامی دنیا میں ماتم بپا ہو گیا ہے۔
ہما خانم: کونسی اسلامی دنیا میں۔ کیا تمہارے خیال میں کوئی ایسی دنیا
موجود ہے جسے ہم ایسا مقدس کا نام دے سکیں ۔
گلشن۔ کیوں نہیں خانم! حجاز، شام، مصر، عراق، اندلس، ایران،
ہندوستان۔ خدا کے فضل سے یہ سارے ممالک مسلمانوں کے
زیر نگیں ہیں اور مملکت خوارزم کی تباہی کا حال سن کر ان سب
ملکوں کے مسلمان خون کے آنسو رو رہے ہیں ۔
ہما خانم۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتی گلشن! کہ ہمارے
مصائب کا حال سن کر عام مسلمانوں کے دل خون ہو رہے ہیں۔
ان پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا ہے لیکن
کیا تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ مسلمان سلاطین اور امراء کے
رنگ محلوں میں اسی طرح جہاں کنیزوں کے قہقہوں کی گونج
پیدا ہوتی ہے۔ آخر بے بس اور غریب عوام کے مضطرب ہونے
سے ہمیں کیا فائدہ پہنچ سکے گا۔ ضرورت تو اس بات کی تھی،
کہ ہماری قوم کا یہ اونچا طبقہ ہوش میں آتا۔ یہ لوگ بیدار ہوتے جو
کچھ کر سکتے ہیں۔
گلشن۔ یہ عظیم ابتلا جو تاتاریوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے ممکن ہے
ان لوگوں کو بھی جھنجھوڑ دے، بلکہ میں تو یقین کرتی ہوں کہ یہ
لوگ بھی ضرور مضطرب ہوں گے ۔
ہما خانم۔ خدا کرے تمہارا اندازہ درست نکلے اور دنیا کی تمام اسلامی
حکومتیں اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ چنگیز کی صورت میں جس فتنے نے
سر اٹھایا ہے وہ صرف اہل خوارزم کے لئے ہی نہیں ہے بخارا
اور سمرقند کے مسلمانوں کا خون پی کر یہ اژدہا اور طاقتور
ہو جائے گا اور اگر وہ اسی طرح اس کی طرف سے غافل رہے
اور الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ کر ایک دوسرے کی بوٹیاں
نوچتے رہے تو ان میں سے ایک بھی نہ بچ سکے گا۔
گلشن۔ خدا نہ کرے ایسا ہو۔ اگر خدانخواستہ حضور یہ اندیشہ درست
بھی ہو کہ مسلمان حکومتیں آپس کی رنجشوں کے باعث ہماری
مدد کو نہ پہنچیں گی پھر بھی میری ناچیز رائے میں اس فتنے کے
اور قوی ہونے کا امکان نہیں۔ حضور ملاحظہ فرمائیں گی یہ تو
سمرقند کی دیواروں ہی سے سر ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جائے گا۔
خدا کے فضل سے ہماری فوج اور رضا کار اس قابل ہیں
کہ شیر اسلام جلال الدین کے پہنچنے تک شہر کی حفاظت کر
سکیں۔
ہما خانم۔ امید کی یہی ایک کرن زندگی کا سہارا ہے۔ اگر اس شہر
کے باشندے شیر دل شہزادے کے پہنچنے تک اپنی حفاظت
کر سکے تو خطرہ یقیناً ٹل جائے گا۔ ورنہ ——— !
[کچھ اور کہنا چاہتی ہے۔ ایک بچی اونچی آواز میں امی
امی کہتی ہوئی آتی ہے اور ہما خانم سے لپٹ کر جلدی
جلدی کہتی ہے ۔]
بچی! - امی — امی جان! وہ ابا حضور آگئے۔ ابا حضور
آگئے —!

ہما خانم ۔ (خوشی اور جوش بھری آواز میں) کہاں ــــ کب ۔ کہاں دیکھا تم نے انہیں؟

بچی ۔ وہ وہاں سڑک پر ہیں امّی! میں نے ابھی ابھی کھڑکی میں سے دیکھا ہے انہیں ۔ ان کے ساتھ بہت سارے آدمی ہیں ۔

ہما خانم ۔ (فکرمند سی ہو کر) ان کے ساتھ بہت سے آدمی ہیں؟

بچی ۔ ہاں امّی! اور وہ سب زور زور سے ہنس رہے ہیں ۔ ابا حضور بھی ہنس رہے ہیں ۔ اور اماں جان ــــ !

ہما خانم ۔ (بچی کو روکتے ہوئے) ذرا رکو ننھی! شاید وہ آ رہے ہیں ۔

گلشن ۔ جی ہاں معلوم تو ہوتا ہے، سیڑھیوں پر حضور کے قدموں کی آواز آ رہی ہے ۔

[ذرا فاصلے پر سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آتی ہے ۔ آواز بالکل قریب آ جاتی ہے اور پھر تیمور کی آواز سنائی دیتی ہے]

تیمور ۔ ارے بھئی واہ، تم سب لوگ یہاں ہو ۔

بچی ۔ ابا حضور ــــ ابا حضور! آپ آ گئے ۔ ہم تو کتنے ہی دن سے آپ کا انتظار کر رہے تھے ۔

تیمور ۔ ہاں میری بچی! ہم آ گئے اور انشاءاللہ اب کہیں نہیں جائیں گے

[ذرا کی ذرا رک کر بیوی سے مخاطب ہوتا ہے]

بیگم! دیکھتی ہو ننھی کس قدر ڈر رہی ہے ۔ تم نے اسے تسلی نہیں دی؟

گلشن ۔ اے حضور بیگم صاحبہ ننھی کو اسی وقت تسلی دیتیں جب ان کا اپنا دل قابو میں ہوتا ۔ کئی وقت سے کھانے کو تو ہاتھ لگایا نہیں ۔ حضور ان کا چہرہ ملاحظہ فرما رہے ہیں، خون کی ایک بوند نظر نہیں آتی ۔

تیمور ۔ (فخریہ انداز میں ہنستے ہوئے) ارے واقعی ۔ یہ تو مُردوں سے بھی بدتر نظر آ رہی ہیں ۔

گلشن ۔ بیگم صاحبہ کی پریشانی کا حال کچھ نہ پوچھئے جس دن سے حضور محاذِ جنگ پر تشریف لے گئے ہیں، یہ برابر پریشان ہیں ۔

ہما خانم ۔ (اداس انداز میں ہنستے ہوئے) اسے تو خیر بات کو مبالغے سے بیان کرنے کی عادت ہے، البتہ سمرقند کے مستقبل کے بارے میں ضرور تردد تھا!

تیمور ۔ اور ہم نے تمہیں اطمینان جو دلایا تھا ۔ سمرقند کو تاتاریوں سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ۔

ہما خانم ۔ (حیران ہو کر) تاتاریوں سے کسی قسم کا خطرہ نہیں!!

تیمور ۔ ہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ــــ لیکن تم ان باتوں کو چھوڑو، اس وقت میرے کچھ مہمان آ رہے ہیں ۔ تم لوگ زنانخانے میں جا کر بیٹھو، سنو، شاید وہ لوگ آ ہی گئے ۔

[ذرا فاصلے سے گھوڑوں کے رکنے اور بہت سے آدمیوں کے باتیں کرنے کا شور سنائی دیتا ہے ۔ چند سیکنڈ بعد شور رک جاتا ہے اور تیمور کی آواز سنائی دیتی ہے]

تیمور ۔ میں اپنے معزز مہمان اور فاتح فوج کے بہادر سالار تولائی خاں کو اہلِ سمرقند کی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں ۔

تولائی خان ۔ تیمور خاں! ہم نے تمہاری شرافت اور شائستگی کی جس قدر تعریف سنی تھی تمہیں اس سے بڑھ کر پا رہے ہیں ۔

تیمور ۔ یہ حضور کی ذرہ نوازی ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم ۔

تولائی خان ۔ نہیں تیمور خان تم واقعی تعریف کے قابل ہو ۔ تمہاری دانائی نے اس شہر کو تباہی سے بچا لیا ۔ کاش تمہارے وطن میں تم جیسی سوجھ بوجھ رکھنے والے چند افراد اور ہوتے اور تاتاری سپاہیوں کو بار بار اپنی تلواروں کی دھار تیز نہ کرنی پڑتی ۔

تیمور ۔ میں اپنی ناچیز خدمات کو کسی قابل نہیں سمجھتا ۔ البتہ اپنے ہم وطنوں کی کوتاہ اندیشی کا افسوس ضرور ہے ۔ کاش میں ان سب کو اپنا ہم خیال بنا سکتا ۔ کاش میں انہیں سمجھا سکتا ۔ کہ قدرت نے تمہاری صدیوں کی تباہ حالی پر رحم کھا کر نجات کا سامان پیدا کر دیا ہے ۔

تولائی خاں ۔ تم ٹھیک کہتے ہو تیمور خاں! اس ملک کے غریب عوام ایک مدت سے جابر سلاطین کے مظالم کا شکار ہیں اور پھر بھی جلال الدین اور اس کے وحشی باپ کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے

ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی جہالت کے باوجود ہم تمہاری کوششوں کو کم نہیں سمجھتے۔ سمرقند کی سنگین دیواروں کے پیچھے ہمیں بہت زیادہ کشت و خون کی توقع تھی۔ تمہاری دور اندیشی اور نیک مساعی کے باعث یہ خطرہ ٹل گیا۔

تیمور:۔ میں اپنی خدمات کو تو ہرگز اہمیت نہیں دیتا لیکن یہ فخر ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وطن اور اہل وطن کی اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔ اگر میں حضور کے اوصاف حمیدہ کا اندازہ نہ کر سکتا تو اس وقت شہر کے دروازوں کے سامنے ہزاروں نیم جان تڑپ رہے ہوتے۔

تولائی خان۔ یقیناً۔ بلکہ تمہیں یہ بھی کہنا چاہیے۔ کہ اس خوبصورت شہر کی پوری آبادی شعلوں میں گھری ہوئی ہوتی۔

تیمور۔ خیر یہ تو — کیوں کہ ہم —!!

[بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو جاتا ہے، تولائی خان لہجہ بدل کر کہتا ہے، اس کے لہجے سے حقارت ظاہر ہوتی ہے]

تولائی خان۔ خاموش کیوں ہو گئے، کیا یہ کہنا چاہتے تھے۔ کہ تمہارے بازوؤں میں شہر کی حفاظت کرنے کے لئے کافی قوت موجود تھی!

تیمور۔ (جھجکتے ہوئے) ہاں میں یہی کہنا چاہتا تھا لیکن میرا خیال ہے اب ایسی باتیں بے موقع ہوں گی۔ اب تو یہ سارا قصہ ہی ختم ہو چکا۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔

تولائی۔ (ہنکارہ بھر کر) ہم تمہارے مہمان ہیں — (پھر ہنکارہ بھرتا ہے) اچھا خیر۔ مہمان ہونے کے باوجود ہم تمہاری خدمت کرنا اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ یاد پڑتا ہے، ابتدائی گفتگو میں تم نے اپنے کچھ مخالفین کا ذکر کیا تھا، ہمیں ان کے نام بتاؤ تاکہ ان کا مزاج درست کر دیں۔

تیمور۔ لیکن نہیں تو آپ کے ہاتھوں سزا پا چکے۔

تولائی۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟

تیمور۔ یہی کہ میں نے یہ خدمت کسی ذاتی فائدے کے لئے انجام نہیں دی — میں نیک نیتی سے محسوس کرتا تھا کہ مسلمان قوم ایسے درندوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے جن کی رگوں میں صالح خون کی جگہ گندہ مواد بھرا ہوا ہے اور اس گندگی کی وجہ سے انہیں رحم کرنا آتا ہی نہیں۔ یہ عیاش اور خود غرض لوگ جو آج میری قوم کی قسمت کے مالک بنے ہوئے ہیں میرے نزدیک یہودیوں اور نصرانیوں سے بھی زیادہ اسلام کے دشمن ہیں۔ ان کی بے حمیتی اور بے حسی کی وجہ سے مقدس مذہب اور میری قوم کی عزت کو بٹہ لگ رہا ہے۔

تولائی۔ ٹھیک تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تیمور خاں!

تیمور۔ (پر جوش آواز میں) میں نے محسوس کیا۔ مسلمان قوم کی ذلت اور پستی کی تمام تر ذمہ داری اسی طبقے پر ہے جو اسلام کا نام لے کر عہد جاہلیت کے درندہ صفت شہنشاہوں کی طرح غریبوں کی ہڈیوں سے اپنے لئے شراب نچوڑ رہا ہے، جس نے اپنے رنگ محلوں کو اور روشن، اور روشن کرنے کے لئے غریبوں کی تاریک جھونپڑیوں سے روشنی کی آخری کرن بھی چرا لی ہے، جس نے اپنی لغو سیاست کے بل پر قوم کے احساس اور شعور کی مشعلیں گل کر دی ہیں۔

تولائی۔ (طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے) اوہ، اس قدر برا ہے خوارزم شاہ!

تیمور۔ (اسی جوش سے) شاید حضور میری قوم کے مصائب کا درست اندازہ نہ فرما سکیں۔ یہ بدترین نظام جس نے صرف آرام اور عیاشی کو جنم دیا ہے۔ اسلام کے مقدس دامن پر مکروہ داغ ہے۔ ان لعنتوں نے دین فطرت کی پاکیزگی کو داغدار کر دیا ہے۔ عام مسلمانوں کی زندگیوں کو جہنم کا نمونہ بنا دیا ہے، انسانی شرف کے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔ آج صرف ان چہروں پر سرخی نظر آتی ہے جو ہوس کاروں کے آلۂ کار بن گئے ہیں۔ آج صرف ان ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہے جنہوں نے بے حیائی کی زندگی کو تقدیر کا فیصلہ مان کر گردن جھکا دی ہے۔

تولائی۔ (اکتاہٹ کے انداز میں) ہوں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو تیمور خاں!

تیمور۔ ادھر جناب میں نے ایمانداری سے محسوس کیا کہ جب تک قوم کی تباہی

کا یہ فاسد مواد چھٹ نہیں جاتا۔ جب تک دین کی تقدیس کو داغدار کرنے والے یہ لوگ بے اختیار نہیں ہو جاتے میرے وطن کے سبزہ زار اہلِ وطن کے لئے جہنم کا نمونہ بنے رہیں گے۔ بھوک اور بد چلنی کے عفریت پروان چڑھتے رہیں گے۔ شیطنت کے جبڑوں سے انسانیت کا خون ٹپکتا رہے گا اور یہی سوچ کر میں نے آپ کی مدد کی۔ آپ نے اپنی خارا شگاف تلوار سے یہ فاسد مواد دور کر دیا۔ اس لئے اپنی خدمات کا کوئی انعام طلب کرنے کی جگہ میں اپنی پوری قوم کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں یہ محسوس کرکے میں آج پھولا نہیں سماتا کہ آپکی بدولت غریبوں کی زندگی اور عزت محفوظ ہو گئی ہے۔

تولائی - بیشک، بیشک ہمارے سپاہیوں نے آج ان ظالموں کے سارے بدلے چکا دئے ہیں لیکن عزیز دوست، پھر بھی ہمارا دل چاہتا ہے تم کچھ مانگو، اپنی ذات کے لئے، اپنے خاندان کے لئے کچھ طلب کرو۔

تیمور - (پروقار انداز میں) میں آپ سے اس کے سوا کچھ طلب نہیں کرتا کہ اپنے وعدے کے مطابق ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجئے ہم ان ظالموں کی روندے کچلے ہوئے اپنے بدحال وطن کو پھر سے جنت کا نمونہ بنائیں۔ اس کی شریانوں میں پھر سے زندگی کا خون دوڑا دیں گے آپ — !

[تیمور کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ کہ باہر سے ڈھول کی آواز اور بہت سے آدمیوں کا ملا جلا شور سنائی دیتا ہے۔ تیمور بات ادھوری چھوڑ کر سوال کرتا ہے۔]

غالباً آپ بھی اتفاق فرمائیں گے یہ تاتاری سپاہیوں کی آوازیں ہیں۔ کہیں کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہو گیا؟

تولائی - کوئی غیر معمولی بات نہیں تیمور خاں! شاید تھکے ماندے تاتاری سپاہی اپنا دل بہلا رہے ہیں۔ ہاں تم کیا کہہ رہے تھے؟

تیمور - میں — میں عرض کر رہا تھا، مملکت خوارزم کے عوام نہایت نیک آپکا یہ احسان یاد رکھیں گے، آپ کو اپنا نجات دہندہ سمجھیں گے۔

[باہر سے ایک عورت کے چیخنے کی آواز آتی ہے، شور اور سپاہیوں کے قہقہے اور بلند ہو جاتے ہیں۔]

عورت کی آواز :- کمینے! چھوڑ دے مجھے، ظالمو! چھوڑ دو مجھے، مجھے چھوڑ دو خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو (پوری طاقت سے چلاتی ہے) میں کہتی ہوں مجھے چھوڑ دو ظالمو! (تڑپ کر) خدا کے لئے مجھے برہنہ نہ کرو۔ مجھے میرے بچوں کے سامنے برہنہ نہ کرو ظالمو! میں ناچتی ہوں میں تمہیں گانا بھی سناتی ہوں۔ میں —— میں (عورت کی آواز شور میں ڈوب جاتی ہے)

تیمور - (پریشان ہو کر) آپ سن رہے ہیں۔ وہ لوگ کسی بے گناہ خاتون کو ستا رہے ہیں۔

تولائی - (ہنستے ہوئے) معلوم ہوتا ہے تم ضرورت سے زیادہ نرم دل اور حساس ہو۔ ہم نے کہا نہیں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھکے ماندے سپاہی اپنا دل بہلا رہے ہیں۔ تم اس طرف دھیان مت دو۔ اپنی گفتگو جاری رکھو، ہاں کیا کہہ رہے تھے تم!

تیمور - (رک رک کر) میں - میں — میں کچھ نہیں کہہ رہا تھا، میں کہہ رہا تھا کہ

[ایک بوڑھے آدمی کے زور زور سے چلانے کی آواز آتی ہے شور بڑھ جاتا ہے۔]

بوڑھا - تم میری آنکھیں پھوڑ دو۔ مجھے قتل کر دو۔ میری بوٹیاں نوچ ڈالو لیکن خدا کے لئے اپنے سورج دیوتا کے لئے اسے چھوڑ دو۔ میری بیٹی کو چھوڑ دو۔ میری بیٹی۔ آہ میری بیٹی۔

[ڈھول کی آواز اور تیز ہو جاتی ہے۔ شور بڑھ جاتا ہے اور بوڑھے کی آواز اس شور میں دب کر رہ جاتی ہے]

تیمور - (تیز آواز میں) میں عرض کر رہا ہوں تکلیف فرما کر ان سپاہیوں کو روکئے، یہ تو شہر کی بستی، بے بس رعایا پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔

تولائی - اور ہم نے نہیں بتایا تو ہے، یہ کوئی پریشان ہونے کی بات نہیں۔ شہر میں امن قائم کرنے کے لئے اگر ایک آدھ شخص کو سزا دینی پڑے تو یہ سیاست کا عین تقاضا ہوتا ہے۔

تیمور - لیکن جناب میں تو ان بے بس عورتوں کی طرف توجہ دلا رہا ہوں۔ آپ سماعت نہیں فرما رہے ان کی فریاد۔ (ایک عورت کے زور سے چلانے کی آواز آتی ہے۔)

تولائی ۔ (رک رک کر پُر وقار انداز میں) طویل جنگوں میں تلواروں کی جھنکار سنتے سنتے میرے بہادر سپاہی اکتا چکے ہیں ۔

تیمور ۔ لیکن جناب انہیں عفت مآب خواتین پر ظلم ڈھانے کا تو حق نہیں ۔

تولائی ۔ تمہارے شہر کی جو عورتیں میرے تھکے ماندے سپاہیوں کے لئے مسکرا نہیں سکتیں انہیں جھکنا ہی چاہیئے، میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا ۔

تیمور ۔ لیکن یہ تو ان وعدوں کے سراسر خلاف ہے جو آپ نے شہر میں داخل ہونے سے پہلے کئے تھے ۔

تولائی ۔ تم تو ناحق ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو تیمور خاں! اگر تم اپنے دشمنوں کے نام نہیں بتانا چاہتے تو ہمارے دشمنوں کے نام ہی بتاؤ ۔ ہم چاہتے ہیں کہ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے آگ لگ جائے اور اس سے پہلے ہمیں بہت سے سونے اور خوبصورت مردوں کی ضرورت ہے، خان اعظم عام طور پر فتح کا تحفہ طلب کر لیا کرتے ہیں ۔

تیمور ۔ (چلا کر) لیکن میں کہتا ہوں آپ انہیں روک دیں ۔ آپ سن نہیں رہے ۔ محسوس ہوتا ہے انہوں نے پورے شہر کے مردوں اور عورتوں کو چوک میں اکٹھا کر لیا ہے ۔ انہوں نے اس پوری آبادی کو آگ لگا دی ہے ۔ وہ سنئے شاید مسلمانوں نے مجبور ہو کر تاتاری سپاہیوں پر حملہ کر دیا ۔

(شور بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے، تولائی خاں طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہتا ہے !)

تولائی ۔ اس قدر جذباتی نہ ہو تیمور خاں، میرے سپاہیوں پر اعتماد کرو وہ مشتعل آبادیوں میں امن قائم کرنا اچھی طرح جانتے ہیں ۔

تیمور ۔ اور میں امن قائم کرنے کی بات نہیں کر رہا ۔ ان کے ظلم اور سفاکی کی طرف توجہ دلا رہا ہوں ۔

تولائی ۔ تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟

تیمور ۔ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا بلکہ آپ کو وہ مقدس وعدے یاد دلانا چاہتا ہوں جن سے متاثر ہو کر میں نے اس شہر کی کنجیاں آپ کے قدموں میں ڈال دی تھیں ۔ آپ نے شہر کے لوگوں کی عزت، جان اور مال کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا ۔ آپ نے کہا تھا ہماری یلغار کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بے بس اور مظلوم عوام کو ظالم شہنشاہوں کے پنجے سے نجات دلائی جائے ۔

(قریب سے ہما خانم کی تیز آواز سنائی دیتی ہے)

ہما خانم ۔ اسلامی فوج کے زیرک اور بہادر سپہ سالار آپ کو معلوم ہونا چاہئے، انسانیت کی پوری تاریخ میں یہ وعدے کبھی پورے نہیں کئے گئے ۔ حملہ آور قومیں اپنی زد میں آئی ہوئی بستیوں کے غدار اور کم فہم محافظوں کو یوں ہی سبز باغ دکھایا کرتی ہیں ۔

تولائی ۔ یہ کون گستاخ ہے؟

تیمور ۔ (پوری طاقت سے چلا کر) تم یہاں کیا لینے آئی ہو ہما خانم؟

تولائی ۔ (زور سے ہنس کر) اچھا تو یہ بیگم تیمور ہیں ۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے انہیں آنا ہی چاہئے تھا ۔ ناراض نہ ہو تیمور خاں، تمہاری قوم کے مرد بہادری کے میدان میں بازی ہار چکے ممکن ہے تمہاری عورتیں ہی کوئی کارنامہ انجام دے سکیں (پھر ہنستا ہے)

ہما خانم ۔ خاموش بزدل، تیرا منہ اس قابل نہیں کہ مسلمانوں کو ایسا طعنہ دے سکے ۔

تولائی ۔ اور غالباً اس لئے کہ اس ملک کی تقریباً تمام آبادیوں میں ہم تیری قوم کے بہادروں کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کر چکے ہیں اور تیری لاکھوں بہنیں تاتاری سپاہیوں کے لئے خوبصورت کھلونے بنی ہوئی ہیں ۔

ہما خانم ۔ اگر آج یہ حالت ہے تو اس کا باعث میری قوم کی بزدلی نہیں بلکہ چند بد طینت لوگوں کی غداری ہے، اس کے ذمہ دار نا عاقبت اندیش ہیں جنہوں نے تیرے فریب کا شکار ہو کر اپنی قوم کے ہاتھوں سے تلوار چھین لی اور تجھ جیسے بزدل دشمن کو نہایت حفاظت کے ساتھ اس شہر کے چوک تک پہنچا دیا ۔

تولائی ۔ تو پھر تم اس پر لعنت بھیجو خاتون ۔

تیمور ۔ (دیوانوں کی طرح چلا کر) اس باحمیت خاتون سے پہلے

میں خود اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں تولائی خاں! کاش مجھے پہلے سے اندازہ ہو جاتا کہ تیرے حقیقی خدوخال یہ ہیں انصاف اور انسانیت کا نام لے کر تو محض فریب دے رہا ہے۔

تولائی (خاموش!) تجھے اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ہم خدمات کی قدر کرنے کے ساتھ ساتھ گستاخی کی سزا دینا بھی جانتے ہیں۔

تیمور۔ اور میں سمجھتا ہوں تجھ جیسے بزدل انسانوں کو صرف فریب دینا آتا ہے تو شیر کی کھال اوڑھ کر شیروں کا مذاق اڑانے والی لومڑی ہے۔

تولائی۔ (چلا کر) تیمور!

تیمور۔ ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تو نے مجھے فریب دیا ہے اور فریب دینے والا شخص لومڑی سے بھی زیادہ بزدل ہوتا ہے۔

تولائی۔ (چیخ کر) میں کہتا ہوں یہ بکواس بند کر دو تیمور خاں! میں حیران ہو رہا ہوں اب تک میری تلوار تمہارے سینے کے پار کیوں نہیں ہو گئی۔

تیمور۔ اور مجھے اس سے بھی زیادہ حیرت اس پر ہو گی کہ یہ تلوار تیرے ہاتھ سے کس طرح چھین لی جاتی ہے۔

تولائی۔ (زور سے ہنستے ہوئے) تو میری تلوار چھین لینے کا دعویٰ کر رہا ہے، تو ——؟ (پھر ہنستا ہے)

تیمور۔ (دانت کٹکٹا کر) صرف دعویٰ نہیں بلکہ —— یہ لے (تلوار کھینچنے کی آواز کے ساتھ ہما خانم کی آواز آتی ہے) (تولائی زور سے ہنستا ہے)

ہما خانم۔ اب یہ سب کچھ بیکار ہے معزز سردار! آپ نے آگ کے انگاروں کو پھولوں کی حفاظت کرنے کے لئے بلایا ہے۔ اب اس کا نتیجہ دیکھ کر پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔

تیمور۔ تم ہما خانم! تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ جاؤ زنان خانے میں جاؤ، میں اس کمینے دشمن کو ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں، ابھی،

تولائی۔ (بے پروائی سے ہنستے ہوئے) خاتون تمہارا شوہر ننھے بچوں کی طرح جذباتی اور کم عقل ہے اسے اپنے ساتھ زنان خانے میں لے جاؤ ورنہ ممکن ہے ہم اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکیں۔

ہما خانم۔ واقعی آپ کو اپنی تلوار پھینک دینی چاہیئے سردار تیمور خاں! آپکے

[illegible]

ہے۔ آپ یہ شور سن رہے ہیں معلوم ہوتا ہے تاتاری سپاہیوں نے سارے شہر کو شعلوں کے سپرد کر دیا ہے،

[ذرا دور سے شور کی آواز سنائی دیتی ہے تیمور پوری طاقت سے چلا کر کہتا ہے]

تیمور۔ میں نے کہا تم یہاں سے چلی جاؤ ہما خانم! اور تو ڈرے ہوئے گیدڑ کی طرح میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے بھیڑیے! اپنی تلوار سنبھال اور بہادروں کی طرح میرا مقابلہ کر۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں اس وقت بھی لڑائی کے آداب کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ سنبھال اپنی تلوار۔

تولائی۔ اگر تیری قسمت میں بدنصیبی کی موت ہی لکھی ہے تو لے تیار ہو جا!

[تلوار کھینچنے کی آواز آتی ہے اور اس کے بعد کئی سیکنڈ تک تلواروں کے ٹکرانے اور دونوں کے زور زور سے ہانپنے اور بڑبڑانے کی آوازیں آتی رہتی ہیں پھر تولائی کے زور سے چلانے کی آواز سنائی دیتی ہے]

تولائی۔ آہ —— آہ معبود اعظم! آہ

تیمور۔ (بھیانہ انداز میں ہنستے ہوئے) بزدل اپنے خان اعظم کو بھی مدد کے لئے پکار۔ اپنے سارے سپاہیوں کو بلا لے۔ تجھے اندازہ ہو جائے گا کہ مسلمان کی تلوار کی کاٹ کتنی تیز ہے،

تولائی۔ آہ —— آہ فتح کے دروازے کے سامنے نامرادی کی موت —— آہ۔

تیمور۔ (اسی انداز میں ہنستے ہوئے) ہاں فتح کے دروازے کے سامنے نامرادی کی موت، بلکہ ذلت کی موت اور یقین رکھ تیرے تمام ساتھیوں کی قسمت میں یہی کچھ ہے! اب تمہارے فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔ ہما خانم! اس ذلیل کتے کی لاش اٹھا کر نیچے پھینک دو تاکہ یہ اپنے ساتھیوں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

ہما خانم۔ اب یہ سب کچھ بیکار ہے معزز سردار! اب آپ کی اس شجاعت کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے لائے ہوئے انگاروں نے پھولوں کی نازک پتیوں کو جھلس کر رکھ دیا ہے۔ ویران کر دیا ہے اس ہرے بھرے باغ کو۔ آپ سن نہیں رہے، شہر کے بے بس لوگ کس طرح مدد مدد پکار رہے ہیں اور تاتاری سپاہیوں کے قہقہے کس طرح ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

تیمور۔ نہیں نہیں خانم! ابھی بہت کچھ ہو سکتا ہے، تم دیکھو گی میں تنہا ان سب کے پرخچے اڑا کر رکھ دوں گا۔ میں اکیلا ہی —— ان سب کو ——

جلال حاجی

نعیم صدیقی

میں دیکھتا ہوں — میں سوچتا ہوں!

میں دیکھتا ہوں، مرا پڑوسی، جلال حاجی، وہ کیا تھا، کیا ہے!
یہ ٹھیکہ داری کے وارے نیارے! جو کچھ بھی ہے قدرتِ خدا ہے
حنا لگی چوڑی سرخ ڈاڑھی! ڈراؤنی پیچ کھاتی مونچھیں!
گھنی بھنویں! چکنی چکنی چندیا! خُمامی آنکھوں سے گھورتا ہے!
ہمیشہ تسبیح انگلیوں میں! ہمیشہ ہونٹوں پہ گندی گالی
کو کپن کی خاص لت کا مارا! جو اُبھی راتوں کو کھیلتا ہے!
گھڑی گھڑی ہنس کے چاہتا ہے کہ میرے سونے کے دانت دیکھو
وہ آنکھوں آنکھوں میں نت کہے گا کہ سونا سونے کو کاٹتا ہے!
"قسم خدا کی"! "قسم نبی کی"! کلام کا بن گیا ہے تکیہ
مگر وہ کہتا ہے "یہ ہے بزنس"! "نبی نبی ہے، خدا خدا ہے!"
نئی نویلی بڑی سی گاڑی گزرتی ہے آندھیاں اڑاتی
بشر ہے یا کوئی کالا بھینسا جو نیلی بیوک پہ لد رہا ہے
جہاں بجا گونج دار بھونپو لپکتی ہے نوکروں کی پلٹن!
زمین پہ پاؤں رکھتے رکھتے خدا کا یہ شیر دھاڑتا ہے

حرم کے پنجرے کی تیلیوں میں جلال کی تین بیویاں ہیں
بہاریں انسٹھ گزر چکی ہیں، ابھی کوئی گل نہیں کھلا ہے!
چڑھاوا نوّے ہزار دے کر لیا ہے "بیرج" کا تازہ ٹھیکہ!
چرا کے سیمنٹ بیچ کھایا! بنا میں رب ربیت بھر رہا ہے
محلے کی بن رہی ہے مسجد، ہمارے حاجی نے دے کے چندہ
خدا کی جنت کا، لوگ کہتے ہیں، سستا سودا چکا لیا ہے!
کبھی محرم کی مجلسیں ہیں، کبھی ہے مولود کی قوالی
کبھی کسی پیر جی کی آمد! کبھی طوائف کا غلغلہ ہے!
جلال حاجی کی زندگی میں گلے ملے آکے دین و دنیا
وزیر بھی خوش، عوام بھی خوش! خدا بھی راضی! اب آگے کیا ہے؟
میں دیکھتا ہوں! میں سوچتا ہوں! جو کچھ بھی ہے قدرتِ خدا ہے!

چند اشعار ☆ پیرزادہ جمیل ھاشمی

مے خانۂ عقل و دانش میں سب جذبۂ دل سے خالی ہیں — یاں بادۂ ایماں عنقا ہے، یاں مستیٔ عرفاں کیا ہوگی!
پھولوں کی زبانیں کٹتی ہیں، کلیوں کے لبوں پہ پہرے ہیں — اب اس سے زیادہ خود ہی کہو تحقیرِ بہاراں کیا ہوگی!
آسودۂ ساحل کیا جانے، پروردۂ طوفاں سے پوچھو
کیا حالتِ طوفاں تھی پہلے، اب صورتِ طوفاں کیا ہوگی

افکارِ تازہ

☆ کوثر نیازی

قرارِ عشق کو اک لحظہ بھی نصیب نہیں
قدم بڑھاؤ کہ منزل ابھی قریب نہیں

ہزار طرح کے آزار ہیں مگر دُنیا ——
وہ سخت جاں ہے جسے موت بھی نصیب نہیں

نشانۂ ستمِ روزگار ہیں، ورنہ!!
ترے فقیرِ طبیعت کے کچھ غریب نہیں

بنامِ دورِ ترقی، بفیضِ آزادی،
کوئی بھی بات مرے دیس میں عجیب نہیں

غمِ حیات بہت جانستاں سہی لیکن
وہ دل بھی دل ہے کہ جس میں غمِ حبیب نہیں

جمالِ دوست کے پیدا ہوں چاہنے والے
کہ میرے عشق میں کچھ خطرۂ رقیب نہیں

وہ کم سواد مسرت کے راز کیا جانے؟
جسے نشاطِ غمِ دیگراں نصیب نہیں،

یہ شاعری تقاضائے فرض ہے کوثرؔ — وگرنہ میں کوئی شاعر نہیں، ادیب نہیں

دماغی عملِ تطہیر کا ایک تجربہ

سُرخ چین کی لیبارٹری میں !

مصنف : فریڈرک سانڈرف

مترجم : آباد شاہ پوری

ستمبر ۱۹۵۱ء میں پیکنگ میں چین کی کیمونسٹ حکومت نے یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ اُن امریکن پروٹسٹنٹ مشنریوں کے خلاف فیصلہ کن قدم اٹھانے کا وقت آگیا ہے۔ جن سے وہ اتنا عرصہ ڈرتے اور نفرت کرتے رہے ہیں۔ ایک ہزار سے زائد یہ مرد اور عورتیں جنہوں نے اپنی زندگی خدا کے نام پر وقف کر رکھی تھی۔ اور جو چین کے مختلف حصوں میں میڈیکل اور تعلیمی اداروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ عوام کے ذہنوں پر گہرا اثر رکھتے تھے۔ انہیں کیمونسٹ حکمران زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کیمونسٹوں نے ذہنی تطہیر کے سلسلہ کے لئے اپنا پہلا ہدف جان جمی کو چنا۔ جو کیانگ میں نیشنل ٹیچرز کالج میں پروفیسر تھا۔

اکتوبر کے ابتدائی دن تھے۔ کہ ایک صبح کو پولیس نے ساڑھے پانچ بجے جان جمی کی خواب گاہ کا دروازہ آن کھٹکھٹایا۔ اُس نے جب دروازہ کھولا۔ تو اس کے سامنے وردیوں میں ملبوس پانچ سپاہی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ تریسٹھ برس کا معمر تیز زبان پادری خالص چینی زبان میں بولا! "اوہ! آپ تو بڑی طاقت لے کر آئے ہیں۔ کیا آپ ایک بوڑھے آدمی سے ڈرتے ہیں؟" سپاہیوں کے دستے کے کمانڈر نے حیرت سے اُس بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اُسے ایسے استقبال کی ہرگز توقع نہ تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ غرایا۔ "خاموش رہو۔ اور اپنا لباس بدل لو"۔ جب وہ کپڑے بدل چکا۔ تو انہوں نے جمی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ اور اسے گھر سے نکال باہر کیا۔

عوام میں رُسوا کرنے کے لئے ان کا پہلا قدم یہ تھا۔ کہ امریکن پروفیسر کو کیانگ شہر کی شاہراہوں میں سے پیدل گزار کر جیل لے جایا جائے۔ لیکن جب یہ قافلہ روانہ ہوا۔ تو پولیس کمانڈر کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ حکومت کو توقع تھی۔ کہ قیدی سر جھکائے خجل و شرمندہ سپاہیوں کے پیچھے پیچھے چلے گا۔ اس کے برعکس طویل قامت مشنری کے بشاش چہرے پر مسکراہٹ عیاں تھی۔ اس کا سر بلند تھا۔ اپنے ہاتھوں کی ہتھکڑی کو نمایاں طور پر دکھاتے ہوئے وہ اپنے گرفتار کرنے والوں سے آگے آگے ڈگ بھرتا جا رہا تھا۔ اسی طرح راہگیر بھی حکومت کی توقع کے خلاف اپنے تاثر کا اظہار کر رہے تھے۔ کسی راہگیر نے کیمونسٹ نعرہ نہیں لگایا۔ بلکہ لوگ منہ پھیر کر جلدی جلدی دوسری طرف چلے جاتے تھے۔

اچانک پولیس افسر نے اپنا منصوبہ بدل دیا اور وہ اسے گھما کر دوسرے راستے سے جیل لے گیا۔ اشتراکی حکومت کو صحیح اندازہ نہ تھا کہ جس شخص کا معاملہ درپیش ہے وہ کس عظمت کا مالک ہے اور چین میں اپنے باپ کی طرح جان جمی کتنا اثر و نفوذ رکھتا ہے۔ گزشتہ صدی کے اواخر میں پادری واسٹن جمی مملکت چین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لاؤشی (بوڑھے استاد) کے نام سے مشہور تھا۔ یہ معزز ترین لقب اُسے قوم کے روشن خیال رہنماؤں نے دیا تھا۔ اُس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ چین کی ملکہ امریکیوں اور یورپینوں سے بغض و عناد رکھتی تھی

لیکن اس کے باوجود جان حیٔ نے پیچھے لگ کر اس سے شمالی چین میں پہلا امریکن مشنری کالج قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ بوڑھے استاد نے جو عملی سائنس دان، تقسیم اراضی کی جدید تنظیم کا حامی (AGRARIAN) مورخ اور فلسفی تھا۔ اس کالج نے پہلی مرتبہ چین کے مقامی عیسائیوں کو پادری بنا کر ملک کے طول و عرض میں بھیجا جو نہ صرف دین عیسوی کی اشاعت کرتے تھے بلکہ مغربی تہذیب اور اس کے فوائد کی بھی تبلیغ کرتے تھے۔

بوڑھے استاد کے بیٹے جان حیٔ نے ابتدائی تعلیم چین میں حاصل کی۔ پھر پرنسٹن، آکسفورڈ اور ایڈنبرگ میں۔ تکمیل پرنسٹن تھیولوجیکل سیمنری سے کی۔ تکمیل کے بعد ۲۵ سال تک انقلابات، جنگوں اور وباؤں کی پرواہ کئے بغیر یہ بے باک اور پرجوش پادری ملک کے طول و عرض میں پھرتا رہا اور قحط زدوں کی امداد کا انتظام کیا۔ ونیز شمالی پریسبٹیرین مشنریوں کو تنظیم کی لڑی میں منسلک کرتا رہا۔ چینی عوام کے تمام طبقے دونوں باپ بیٹوں کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ جاپانیوں کو چین پر مسلط ہونے کے بعد ان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے دو سال تک انتظار کرنا پڑا محض اس خوف سے کہ چینیوں پر اس کا ردعمل بہت سخت ہوگا۔ ۱۹۴۴ میں ویہسین کے کنسنٹریشن کیمپ میں واٹسن حیٔ مر گیا، اس کے بیٹے نے بوڑھے استاد کی تجہیز و تدفین کی اور پورے چین نے اس کا سوگ منایا۔

۱۹۴۹ء میں جبکہ کمیونسٹوں نے نظم حکومت سنبھال لیا تھا۔ جان حیٔ نے کمیونسٹوں کے گڑھ نیشنل ٹیچرز کالج کیا نگ میں انگریزی پروفیسری قبول کر لی۔ اس اقدام پر اس کے شریک کار مشنریوں کو بڑا تعجب ہوا۔ دراصل اس فیصلے کے دو محرکات تھے۔ اول اس کے باپ نے برسوں پہلے جو کام شروع کیا تھا وہ اسے جاری رکھنا چاہتا تھا دوم اسے یقین کامل تھا کہ چینیوں کی فطرت اور دانشمندی انہیں روسی کمیونسٹوں کے نظام کو مستقل طور پر قبول کرنے کی اجازت نہ دے گی۔ اس کے خیال میں کیا نگ ہی وہ مناسب مقام تھا جہاں سے نہایت ہوشیاری کے ساتھ آزادی کے تصورات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔

دو سال تک جان حیٔ انگریزی پڑھاتا رہا اور انگریزی ادب پر لیکچر دیتا رہا۔ اس نے سیاسیات کے ذکر سے یکسر احتیاط برتی۔ یہی وہ وقت تھا جب پیکنگ نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ گیا حیٔ کو جیل کی کوٹھڑی میں محبوس کر دیا گیا۔ جس کا کل رقبہ دس مربع فٹ تھا۔ اسی میں نیشنلسٹ پارٹی کے تین عہدیدار بھی محبوس تھے۔ کوٹھڑی میں کسی قسم کا فرنیچر حتیٰ کہ چارپائی بھی نہ تھی۔ حیٔ کا کھانا روزانہ چاول کے ایک پیالے پر مشتمل ہوتا تھا۔ گاہے گاہے شلغم یا گاجر کا چمچہ بھر سالن بھی ہوتا۔ مہینے میں ایک بار سور کی انتڑیاں بھی ملا کرتیں۔ اُسے اپنے پاس کوئی کتاب رکھنے کی اجازت نہ دی گئی۔

ذہنی تطہیر کا یہ پہلا مرحلہ تین مہینے تک رہا۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے بے آرامی، تنہائی، اکتاہٹ اور تذبذب کے ہجوم سے حیٔ کو اپنا دماغ سڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر ایک روز رات گئے اُسے عوامی عدالت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ چھ جج عدالت کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے دو کمیونسٹ پارٹی کی صاف ستھری نیلی وردی میں ملبوس تھے اور باقی فوج، پولیس اور نچلے درجے کے سرکاری عہدیداروں کی معمولی اور بے نشان خاکی وردی پہنے ہوئے تھے۔

ججوں کی میز کے سامنے ایک چھوٹا سا اسٹول رکھا تھا۔ حیٔ اس پر بیٹھ گیا: "تمہیں بیٹھنے کا حکم کس نے دیا؟" ——— عدالت کا صدر گرجا۔ "کھڑے ہو جاؤ" حیٔ کھڑا ہو گیا۔ عدالت کے ارکان بدتمیزی سے ہنس پڑے، "اب تم بیٹھ سکتے ہو۔" صدر نے حکم دیا۔ عدالت کے ارکان نے پھر دانت نکال دیئے۔ حیٔ کو بڑی سبکی محسوس ہوئی۔

"اور پھر" ڈاکٹر حیٔ کہتا ہے "میرے ذہن میں ایک ایسا خیال پیدا ہوا جس سے آنے والے چالیس وحشت ناک دنوں میں میرے ہوش و حواس کسی نہ کسی حد تک برقرار رہے۔ مجھے اپنے ججوں کو دیکھ کر اچانک یاد آگیا کہ یہ آدمی وہی چھوٹے لڑکے تو ہیں جنہیں میں سال ہا سال تک پڑھاتا رہا ہوں۔ بے شک وہ پہلے سے بڑے اور خطرناک ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی وہ چھوٹے لڑکے ہیں جن سے طفلانہ حرکات سرزد ہو رہی ہیں"۔

اس خیال سے اُس میں اخلاقی قوت عود کر آئی وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ دوہرے کر کے گھٹنوں پر رکھ لئے اور ججوں کی طرف دیکھ کر پورے سکون کے ساتھ مسکرانے لگا جو اُسے قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے۔

غصے سے چیختے ہوئے بھاری بھرکم آواز میں صدر نے حیٔ سے پوچھا جانتے ہو تم پر کیا الزامات عاید کئے گئے ہیں؟ "نہیں" قیدی نے اطمینان سے جواب دیا "میں کچھ کہنے سے بالکل قاصر ہوں"۔ "ذرا ذہن پر زور ڈالو" جج چلایا۔ پروفیسر نے بے پروائی سے کندھوں کو جنبش دی۔

"تم سامراجیوں کے جاسوس ہو" جج نے کہا "تم نے اپنے گھر جو خطوط لکھے ہیں، ان میں ہمارے ملک کے حالات بیان کئے ہیں اور یہ قانوناً ممنوع ہے۔ تم روس خط لکھ سکتے ہو کیونکہ وہاں کے لوگ ہمارے دوست ہیں۔ لیکن امریکہ کوئی خط نہیں لکھ سکتے۔ اُس پہ وال اسٹریٹ کی حکمرانی ہے۔ کسی روز ہم امریکہ کو اس کے چنگل سے نجات دلائیں گے"۔

حیٔ نے کہا کہ اُس نے جو خط اپنے وطن لکھے ہیں ان میں چینی عوام کی پوزیشن واضح کی گئی ہے۔

"بکواس مت کرو۔ سامراجی جاسوس!" جج ایک ساتھ چلائے۔

"یہ مقدمہ کی سماعت کا پہلا دن تھا۔ مسلسل چالیس روز تک یہی کچھ پیش آتا رہا۔ جان حیٔ اسٹول پر بیٹھے بیٹھے تھکن کے مارے اکثر جھولنے لگ جاتا۔ عوامی عدالت کے چھ جج نو گھنٹے تک باری باری سوالات کرتے اور دادِ خطابت دیتے رہتے۔

عدالت کا ایک اجلاس اس ضمن میں مثالی نوعیت کا تھا۔ یہ ان دس اجلاسوں میں سے ایک تھا جو عدالت نے جان حیٔ سے یہ اعتراف کرانے کے لئے وقف کئے تھے کہ وہ FBI کا ایجنٹ تھا۔ جب پادری نے بتایا کہ FBI کا کام غیر ملکوں میں جاسوسی کرنا نہیں ہے۔ تو عدالت جھلا کر قہقہے لگانے لگی "مذہب کے نام سے بھیڑ کی کھال جو تم نے پہن رکھی ہے اسے اتار ڈالو" صدر گرجا "تم حقیقت میں سامراجی بھیڑئیے ہو"۔ پھر صدر نے طنزیہ انداز میں کہنے لگا کہ سے ایڈگر ہوور غیر ملکی مشنوں کے نیشنل پریسبیٹرین بورڈ کا ایک ٹرسٹی تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تمام مشنری FBI کے ملازم ہیں۔ حیٔ اگرچہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ پھر بھی ہنستے ہوئے حقیقت حال کی وضاحت کرنے لگا "بکو مت! سامراجی جاسوس" ـــــ صدر چلایا اور اس سیلاب میں اس کی آواز ڈوب کر رہ گئی۔

پھر مختلف ججوں نے پرجوش تقریریں کیں۔ چینی جب زور سے بولتے ہیں تو ان کی آواز تیز اور کرخت ہوتی ہے۔ حیٔ کے لئے یہ لامتناہی چیخیں سخت جسمانی عذاب تھیں اور ان کا مقصد بھی یہی تھا۔ ہر تقریر کے بعد وہی ایک سوال مختلف پیرایوں میں کیا جاتا "تم نے FBI کی طرف سے مخبری کب سے شروع کی؟" حیٔ کہتا کہ وہ کبھی مخبر نہ تھا "تم جھوٹ بولتے ہو" صدر چیخ اٹھتا۔

متواتر کئی روز تک یہی ہوتا رہا حتیٰ کہ حیٔ سوچنے لگا کہ وہ اس عذاب سے چھٹکارا پانے کی خاطر اعتراف جرم کیوں نہ کر لے۔ اس کی قوتِ برداشت ختم ہو رہی تھی۔ اس وقت اس کے ذہن میں جس قسم کے خیالات اٹھ رہے تھے انہیں ڈائری کی صورت میں اس نے ابتلا کے تیس دن گزارنے کے بعد لکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"میں تھک گیا ہوں اور مجھ پر غنودگی کا سا عالم طاری ہے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے یا نہیں تاہم مریضہ

جیکھا میں نے کھایا تھا وہ ایک بلی کو زندہ رکھنے کے لئے بھی ناکافی تھا۔ تیس دن تک گمراہی...... ججوں کے مطلب کی رپورٹیں لکھنا...... گالیوں کی بوچھاڑ...... میں جھوٹا ہوں...... ایک ایسے ملک میں مخبری کر رہا ہوں جس سے مجھے محبت ہے..... میرے دوست میرے حلقۂ مخبری کی کڑیاں ہیں..... آزمائش بڑی سخت ہے........ میں اس کی تاب نہیں لا سکتا......"

حئی جانتا تھا کہ اُس کی قوتِ برداشت اب ختم ہونے کو ہے اور وہ عدالت کے عائد کردہ ہر الزام کو تسلیم کرنے اور جن لوگوں کو وہ اس مقدمے میں لپیٹنا چاہتی ہے، ان میں سے ایک ایک کو لپیٹنے پر آمادہ ہو چکا ہے۔ تاکہ عذاب و اذیت کا سلسلہ ختم ہو۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اپنی مرضی کے یکسر خلاف وہ ان باتوں کو تسلیم کرنے والا ہے، جو جج خدا، مسیحیت، امریکہ اور ہر اُس چیز کے خلاف کہتے تھے جس پر وہ ایمان و یقین رکھتا ہے۔

ایک روز اسے ایک افسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ پیکنگ سے آیا تھا۔ اُسے بتایا گیا کہ اگر وہ کمیونسٹ حکومت کا آلۂ کار بننے کی حامی بھر لے تو مقدمہ واپس لے لیا جائے گا۔ افسر نے کہا تم صاحبِ علم ہو اور ملک کی ایک بلند مرتبہ شخصیت ہو۔ حکومت کے بڑے کام آ سکتے ہو اور اس کا معاوضہ بھی تمہیں اچھا ملے گا۔ ہماری اس پیشکش پر غور کر لو۔ اتنا کہہ کر اُس نے سنتری کو اشارہ کیا کہ اس خمیدہ کمر، پریشان حال اور مریل آدمی کو لے جاؤ" اور مسکرایا۔

جان حئی ہمیشہ سے ایک صادق الایمان شخص تھا اور اپنے خدا سے گہری وابستگی رکھتا تھا۔ لیکن اُس رات اُس نے جس خشوع و خضوع سے دعا مانگی اس سے پہلے کبھی نہ مانگی تھی اور جونہی اُس نے خدا سے التجا کی کہ وہ اسے مقاومت کی قوت بخشے اُس نے اپنے اندر طاقت کے فوّارے ابلتے ہوئے پائے۔ اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے دل و دماغ پھر اپنی جگہ پر آ گئے ہیں: "اب میں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے "خدا مجھے بتا رہا تھا۔ عدالت کے جج ایک مرتبہ پھر چھوٹے لڑکے دکھائی دینے لگے تھے۔ میں نے کہا آمین۔ اے خدا تیرا شکریہ"۔ اور کئی ہفتوں کے بعد جب حئی عدالت میں حاضر ہوا تو ججوں نے اپنے سامنے ایک بالکل نیا آدمی کھڑا پایا۔ اس کا سر بلند تھا۔ شکست خوردگی کے آثار اس کے چہرے سے غائب ہو چکے تھے۔ اُس کی آواز صاف اور متوازن تھی۔

اب تک عدالت جان حئی کو چینی بولنے کی اجازت دینے سے انکار کرتی رہی تھی۔ وہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ حئی امریکی ہے اور چین کے لئے غیر ملکی۔ اس کے جوابات کا ترجمہ ایک ترجمان کیا کرتا تھا۔ وہ اس کی ترجمانی صحیح کرتا تھا یا غلط، حئی نے اس کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب "وہ" اس کا بہت زیادہ خیال کرنے لگا۔ جب بھی ترجمان اس کی غلط ترجمانی کرتا وہ پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ فصیح چینی میں —— جو ججوں کی چینی سے کہیں زیادہ فصیح تھی —— بتاتا کہ اُس نے دراصل کیا کہا تھا۔ صدر نے اُسے پہلی مرتبہ چینی میں بولتے سنا اور ترجمان کو برخاست کر دیا (بعد ازاں اس ترجمان کو اس جرم میں گولی مار دی گئی کہ وہ عوامی عدالت کی سبکی کا باعث بنا تھا) کارروائی چینی زبان میں ہوتی رہی۔

جب عدالت حئی کا تعلق FBI یا مخبروں کے کسی اور خیالی حلقے سے جوڑنے میں ناکام رہی تو اُس نے سابق نیشنلسٹ حکومت کے ساتھ اُس کے تعلقات ثابت کرنے کی طرف توجہ دی۔ "کیا تم نے مقامی نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تھی جس پر کمیونسٹوں نے مقدمہ چلایا تھا اور اُسے گولی مار دی تھی؟" "ہاں" حئی نے کہا "میں نے پڑھی تھی" پھر بولا "اگر عدالت پسند کرے تو میں وہ دعا بھی سنا دوں جو مرنے والے کی نوجوان بیٹی نے اپنے باپ کے ججوں کے حق میں کی تھی"۔ حئی تن کر کھڑا ہو گیا، اُس کی آنکھیں اشک آلود تھیں، اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور اس کی نگاہیں سامنے بیٹھے ہوئے چھ ججوں کا جائزہ لے رہی تھیں: "اے آسمانی باپ، انہیں معاف کر دے"۔ حئی نے لڑکی کی دعا کے الفاظ دہرائے "وہ اسے نہیں جانتے تھے، اے آسمانی باپ! انہیں انصاف کا صحیح احساس عطا کر اور عوام کی سچی محبت بخش تاکہ اس مقدس سرزمین میں امن کا دور دورہ ہو"۔ کمرۂ عدالت میں چند سیکنڈ تک موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ آخر اس شدید سکوت کو صدرِ عدالت نے توڑا۔ "اسے لے جاؤ"۔ اُس سے

سفیری سے آہستہ سے کہا اور جب وہ عظیم امریکی آہستہ آہستہ کمرے سے نکلا تو چھٹوں جج پتھر کی طرح بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے ۔

ڈاکٹر ڈومی لکھتا ہے: "مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے بہت جلد گولی مار دی جائے گی۔ میں نے ناقابل معافی حرکت کی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے
ان کی تندہ بکتر میں شگاف کر دیا تھا، اُسے وہ خود بھی جانتے تھے اور مجھے بھی خبر تھی۔"

لیکن جان جی کو گولی سے اڑایا نہ گیا۔ اس کے بجائے اگلے ہفتے کے دوران میں کمرۂ عدالت کی فضا بتدریج تبدیل ہوتی چلی گئی۔ اب ڈانٹ
ڈپٹ بھی کم ہوتی تھی اور دادِ خطابت بھی کم دی جاتی تھی ۔

اور ایک روز عدالت نے اُسے وہ موقع مہیا کر دیا جس کے لئے وہ خدا سے دعائیں مانگتا رہا تھا۔ "تم یہ کیوں کہتے ہو کہ میں چین کا دوست
ہوں، ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے؟ حالاں کہ تم ان امریکی اساتذہ میں سے ایک ہو جو اپنی سامراجی تعلیمات کے ذریعے ہمارے عوام کو بگاڑنے اور غلام
بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں؟" ایک جج نے پوچھا ۔

جان جی ایک پل کے لئے رکا اور اپنے باپ لاؤ شی کی داستانِ حیات بیان کرنے لگا۔ وہ بتلاتا رہا کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا انسان تھا۔ جب
تک یہ داستان سناتا رہا عدالت خاموش بیٹھی سنتی رہی۔ سب سے پہلے اس نے بوڑھی ملکہ کے "با" کا ذکر کیا اور پھر بوڑھے استاد کی ان بے غرض شفقتوں کا
جو اُس نے چینی عوام کے لئے برداشت کی تھیں۔ اُس نے بتایا کہ "لاؤ شی" نے کس طرح اراضی کی اصلاح کی، غریبوں اور ناداروں کے لئے ہسپتال
بنوائے، وباؤں اور قحط کے زمانے میں ان کی دستگیری کی۔ اور یہ ساری داستان بیان کر چکنے کے بعد وہ بولا "کیا ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ میرے والد میں یا ہم میں سے اور کوئی کسی کو بگاڑنا یا غلام بنانا چاہتا تھا؟" عدالت خاموش تھی۔ جج جانتے تھے کہ اس داستان کا ایک ایک لفظ صداقت
پر مبنی ہے ۔

بعد ازاں ایک جج کی اس رائے پر کہ کسی سوشلسٹ کو صرف طاقت کے بل پر ہی بہتر بنایا جا سکتا ہے، جی کو یہ بتانے کا موقع مل گیا کہ کمیونسٹوں کے اس
فلسفے نے لوگوں کو کمیونسٹ حکومت سے کس طرح متنفر کر دیا ہے: "تم لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر کے انہیں جیت نہیں سکتے۔" پادری نے کہا
اور عدالت خاموش سنتی رہی ۔

اگلے روز ایک جج نے اسے ایک چوٹ اور لگانے کا موقع فراہم کر دیا۔ "پھر تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟" اس نے پوچھا۔
"کیا ہم [illegible] کے آگے سر خم کر دیں؟"

جان جی کھڑا ہو گیا۔ "چین کو کسی کے آگے سر خم نہیں کرنا چاہئے۔ چینی عوام بھلائی کی غیر محدود صلاحیت کے مالک ہیں۔ تم پوچھتے
ہو تو میں کہوں گا۔ چینیوں کو اپنے قدیم نیک اطوار سکھاؤ۔ انہیں مہذب بناؤ اور اس طرح مشرق و مغرب کے درمیان پل کا کام دو۔ اگر تم
آزاد اور خود مختار ہو تو تمہارے پاس وہ طاقت ہے جس سے یہ کام سرانجام دے سکتے ہو۔"

عدالت ایک بار پھر خاموش بیٹھی سنتی رہی۔ جی نے محسوس کیا کہ اسے اپنے محتسبین پر زبردست فتح حاصل ہوئی ہے اور غالباً اس کے لئے اسے
اپنی جان کی قربانی دینا ہو گی۔ تاہم وہ فتحیاب ہو چکا تھا ـــــ اور پھر ایک روز دفعتاً مقدمہ کی سماعت ختم ہو گئی۔ ہفتے گزر گئے۔ ایک صبح سنتریوں کا ایک دستہ
اس کی کوٹھڑی کے باہر نمودار ہوا۔ اس مدت میں وہ اپنے خدا کے ساتھ لو لگائے بیٹھا رہا تھا۔ چنانچہ جب کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تو وہ بدترین حادثہ کا
خیرمقدم کرنے کے لئے تیار تھا۔ "گھر جاؤ اور اپنا سامان لے لو" افسر انچارج تحکمانہ لہجے میں بولا "تمہیں چین سے نکال دیا گیا ہے۔"

دو دن کے بعد جان جی صحیح سلامت امریکہ جانے کے لئے ہانگ کانگ پہنچ چکا تھا۔ بعد میں اسے ساری داستان کا پتہ چل گیا۔
کیانگ کا مقدمہ جس انداز سے چل رہا تھا، اس پر پیکنگ کے ارباب اختیار سخت پریشان تھے۔ چنانچہ ایک اعلیٰ جج کو تفتیش کے لئے خفیہ طور پر

بھیجا گیا۔ اُس نے کمرۂ عدالت میں جو کچھ دیکھا اور سنا، اُس نے اسے بد حواس کر دیا۔ اُس نے حکم دیا کہ مقدمہ روک دیا جائے اور حنی کے پانچ بچوں کو گولی مار دی جائے۔ اور خود حنی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ؟ بوڑھے استاد کو گولی مارنا یا سزائے قید دینا پیکنگ کے نزدیک غیر دانشمندانہ فعل تھے۔

آج ڈاکٹر حنی پھر مشرق بعید کا سفر کر رہا ہے وہاں وہ چینی سرحد کے قریب ایک ایسے مقام پر قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جہاں سے وہ سن اور دیکھ سکے۔ ہزاروں امریکی مشنریوں میں سے صرف سات چین میں باقی ہیں اور سب کے سب قید میں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود لاؤشی کی روح کو چینی حکومت ختم نہیں کر سکی۔

(ریڈرز ڈائجسٹ کے شکریہ کے ساتھ)

اِسلامی دستور ہی کیوں ———— ؟

اِس لئے کہ:-

- ہم مسلمان ہیں اور اسلام ہی ہماری حیاتِ اجتماعیہ کا لائحۂ عمل ہو سکتا ہے۔
- اِسی کے ذریعے ہم تحریکِ پاکستان کو اس کے فطری نتیجے تک پہنچا سکتے ہیں اور قائدِ اعظم کے مواعید کو پورا کر سکتے ہیں۔
- اِسی کے ذریعے ہم اپنے قول و عمل کے مہلک تضاد سے نجات پا سکتے ہیں!
- اِسی کے ذریعے ہمارے اندر زندگی کی رَو پیدا ہو سکتی ہے اور ملی انا میں حرکت آ سکتی ہے۔
- اِسی کے ذریعے جاہلی عصبیتوں کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اتحاد کی بنیانِ مرصوص بن سکتے ہیں۔
- اِسی کے ذریعے حکمراں طاقت اور عوام میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔
- اِسی کے ذریعے جدید طبقوں اور دینی عناصر کو تعاون کے لئے ایک بنیاد مل سکتی ہے۔
- اِسی کے ذریعے ہم اپنے پیچ در پیچ اجتماعی مسائل کا حل کر سکتے ہیں۔
- اِسی کے ذریعے پاکستان میں حقیقی جاذبیت پیدا کر کے حصولِ کشمیر کا معرکہ جیتا جا سکتا ہے۔
- اِسی کے ذریعے ہم پورے عالمِ اسلامی میں حیاتِ نو پیدا کرنے کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔
- اِسی کے ذریعے ہم بین الاقوامی امن و سلامتی اور نوعِ انسانی کے نشو و ارتقاء میں مثبت حصہ لے سکتے ہیں۔

یاد رکھیئے کہ صرف اِسلامی دستور ہی یہاں چل سکتا ہے!

ہماری کتابیں

نعیم صدیقی	قومی ملکیت	قیمت	۱۲ر
	تخریب و تعمیر	〃	۳/-
	اسلامی فلسفہ ملکیت	〃	۲/۴/-
	شعلۂ خیال	〃	۳/۴/-
	دفترِ بے معنی	〃	۲/۸/-
	فکر و نظر	〃	۲/-
	معروف و منکر	〃	۳/-
امین احسن اصلاحی	تدبرِ قرآن	〃	۳/۴
	اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	〃	۱/۱۲
	اقسام القرآن	〃	۱/۸
سید ابوالاعلیٰ مودودی	حدیث اور قرآن	〃	۱۲ر
مسعود عالم ندوی (مرحوم)	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	〃	۲/۸
	دیارِ عرب میں	〃	۴/۸
	التربیۃ العربیہ حصہ اول و دوم	〃	۳/-
	الاخوان المسلمون اور ان کی دعوت		۱/۴
	مکاتیبِ سلیمان		۳/۴
پروفیسر عبدالحمید صدیقی ایم اے	اسلام کا فلسفۂ تاریخ		۱/۱۲
	اسلام اور تھیاکریسی		۲/-/-
	تھیاکریسی اور اسلامی ریاست (انگریزی)		۸ر
افتخار احمد بلخی	فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر (حصہ اول)		۲/۸
	دوم		۴/-
	سوم		زیرِ طبع
مولانا مودودی، مولانا اصلاحی، میاں طفیل محمد	مکاتیبِ زنداں		۳/-/-
اسعد گیلانی	تحریکِ اسلامی اپنے لٹریچر کے آئینے میں		۱/۸/-
ملک غلام علی	سنتِ رسول		۲/۴/-

جیلانی بی اے	اذان اور دوسرے افسانے		قیمت ۳/-/-
	ماؤزے تنگ کے دیس میں		″ ۲/۸/-
ڈاکٹر محمد خالد	اشتراکیت مذہب اور اخلاق	مجلد	″ ۱/۱۰/-
		غیر مجلد	″ ۱/۲/-
کوثر نیازی	منتخب نظمیں		۱/۸/-
ابو ندیم ایم اے	فریب نظر		۳/۱۲/-
علی سفیان آفاقی	کمندیں		۳/-/-
ماہر القادری	فردوس		۳/۸/-

بچوں کی کتابیں

ابن احمد قمرنی ایم اے	[illegible]	-/۵/-
	پہلا خون	-/۵/-
	خوفناک طوفان	-/۷/-
	قہر کی آندھی	-/۶/-
	اللہ میاں کی اونٹنی	-/۶/-
	خدائی معاملہ	-/۱۰/-
	جس کا اللہ نگہبان	-/۱۲/-
اعجاز الحق قدوسی	سراپائے رسولؐ	۱/۱۰/-
	رسول اللہ کے دو محبوب	-/۱۰/-
	رسولؐ پاک کی صاحبزادیاں	-/۱۴/-
	درس گاہِ رسولؐ کے دو طالب علم	۱/۲/-
	ہمارے نبیؐ کے صحابہ	۲/۱۴/-



مکتبہ چراغ راہ

کراچی ——— لاہور

سراپائے رسولؐ

پر

پیش لفظ لکھتے ہوئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے آخر میں تحریر فرمایا ہے

"مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی تمام مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے اس مختصر سے رسالہ میں یہ سراپا اس طرح پیش کر دیا ہے۔ کہ ہر معمولی پڑھا لکھا اردو دان اس کو پڑھ سکتا ہے۔ اور ایک ان پڑھ آدمی بھی اس کو سن کر بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ کیا ہی بہتر ہو۔ کہ ذکرِ رسولؐ میں "مولود" کی غلط اور گمراہ کن کتابوں کی بجائے ایسی کتابوں کو رواج دیا جائے۔ اور ہر مسلمان بچے کو یہ رسالہ پڑھوا کر اس کے ذہن میں یہ بات نقش کر دی جائے کہ یہی وہ نمونہ ہے جس کے مطابق اس کو اپنی زندگی ڈھالنی چاہیئے۔"

مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب

کی تصانیف

مکتبۂ فلاحِ انسانیت ایک پلان کے تحت شائع کر رہا ہے۔ اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

① سراپائے رسولؐ ۱/۱۰
② ہمارے نبیؐ کے صحابہؓ ۱/۴
③ رسولِ پاکؐ کی صاحبزادیاں ۱/۱۴
④ درس گاہِ رسولؐ کے دو طالب علم ۱/۱۲
⑤ رسول اللہؐ کے دو محبوب ۱/۱۰

مکتبۂ فلاحِ انسانیت۔ کراچی

S. No. 1047 JANUARY 1956

Is there any place for theocracy in Islam?

If not

★ What is the difference between Islam

and Theocracy

and

★ [illegible] an

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

THEOCRACY & THE ISLAMIC STATE

By Prof [illegible]

MAKTABA CHIRACH-E-RAH, KARACHI.

[illegible]

چراغِ راہ



فروری ۱۹۵۶

مرتبہ

نعیم صدیقی

-/۸/-

"روشنی ــــ گرمی ــــ حرکت"

ماہنامہ چراغِ راہ کراچی

فروری ۵۶ء

جلد ۹ | شمارہ ۲

فہرست مضامین

چراغِ راہ

چندہ سالانہ: -/۵ روپے ★ فی پرچہ ۸ آنے
دفتر اشاعت و انتظام: ــــ ثریا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی نمبر۱
دفتر ادارۂ تحریر: ــــ ۱۲ - شاہ جمال، اچھرہ، لاہور۔

چودھری غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر چراغِ راہ، آرام باغ روڈ کراچی نمبر۱ سے شائع کیا۔

سوچ بچار

مسودۂ دستور

ادارہ

ایک خوفناک بحرانی دور سے نکلنے کے بعد ہماری سیاسی فضا مختلف مفاد پرست دھڑوں کی کش مکش کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی اور اس کش مکش کی وجہ سے نئی دستور یہ داخلی طور پر مختلف غیر صحت مندانہ رجحانات کے چکر میں پڑ گئی تھی، ان کے ہوتے ہوئے کسی نہ کسی شکل میں ایک مسودۂ دستور کا مرتب ہو کر سامنے آجانا عوام میں نئی امیدیں پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے۔ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ ابھی کچھ دل و دماغ ایسے ہیں جو گروہی سیاست اور ذاتی مفاد کے ہیر پھیر میں رہنے کے باوجود ملک کی اہم ضرورتوں سے یکسر غافل نہیں ہوئے۔ ان گئے گزرے حالات میں جب کہ سیاسی ذہن و کردار ایک ہمہ گیر فساد کا شکار ہے۔ متجانس عناصر کا کسی نقطۂ اشتراک پر جمع ہو جانا قابلِ داد ہے۔

مسودۂ دستور اس لحاظ سے جہاں ایک اچھی علامت ہے، وہاں دوسری طرف اس میں نمایاں طور پر کش مکش مفاہمت کے آثار موجود ہیں اور یہ اگر اسی طرح باقی رہے تو آیندہ کی نسلیں جنہیں اس دستور کے پیدا کردہ مسائل سے دن رات سابقہ پڑے گا، اپنے آبا و اجداد کے کئے ہوئے کام میں ان کی ذہنیت کا عکس دیکھ دیکھ کر شرمسار ہوں گی بلکہ جھلا کر ان کو ملامت کریں گی۔ مسودۂ دستور کے بین السطور میں مرکز اور صوبوں، مشرقی خطے اور مغربی خطے اور حکومت اور عوام کی باہمی کش مکش کی جو مکروہ داستان لکھی ملتی ہے، چاہیئے کہ اس کو کسی نہ کسی طرح مسودہ کو پاس کرنے سے قبل دھو ڈالا جائے۔

مسودۂ دستور کا اس لحاظ سے بھی سارے ملک میں خیر مقدم کیا گیا ہے کہ ہماری اجتماعی سرگرمیوں کے قافلے کی باگ ڈور ہماری ملی آئیڈیالوجی کے ہاتھ میں دی گئی ہے اور اسلامی نظامِ تمدن و معاشرت کو منزلِ مقصود ٹھہرایا گیا ہے۔ اس معاملے میں مشرقی پاکستان کے کچھ ہندوؤں (جو یا تو انڈیا سے اپنی وفاداریاں رکھتے ہیں، یا اسلام کے بارے میں تعصبات اور غلط فہمیوں کا شکار ہیں) اور ان سے سیاسی ساز باز رکھنے والے بعض مسلمانوں (جو بیشتر سہروردی صاحب کے جھنڈے تلے عوامی لیگ کے نام سے جمع ہیں اور جن کو اب اپنی پارٹی کے نام میں لفظِ مسلم تک گوارا نہیں رہا) اور شاید تھوڑے سے کمیونسٹوں کی طرف سے تالی بولیاں سنائی دیتی ہیں۔ قوم بہ حیثیتِ مجموعی اچھی امیدوں کے ساتھ منتظر ہے کہ اسلامی پہلو سے مسودے میں وہ چند ترامیم کردی جائیں جن کی اہمیت ہر حلقے میں محسوس کی جا رہی ہے۔ (اس سلسلے میں "مسودۂ دستور پر تبصرہ" کا مطالعہ مفید رہے گا جو اسی شمارے میں شریک اشاعت کر دیا گیا ہے)۔

اسلام کی طرف فرد ہو یا ملت، کوئی قدم نہیں بڑھایا جا سکتا جب تک ایمان موجود نہ ہو۔ اسلام پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اسے برحق اور باعثِ خیر و برکت اور ذریعۂ ترقی و نجات مانتے ہیں۔ اگر ایمان موجود نہ ہو بلکہ محض سیاسی [illegible]

سرکوئی احسان دھرا جائے تو سارا قرآن وحدیث دستور میں لکھ ڈالنے سے بھی کوئی عملی و واقعی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ پس ہم اس مسودہ کے مصنفین سے پورے حسن ظن کے ساتھ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایک بار پھر اسلام کے لئے پوری جالتِ شرح صدر کے ساتھ نظرثانی کرکے یہ دیکھیں کہ اجتماعی دائرے کے اندر تجدید واحیائے اسلام کے کام میں اس کے کون سے اجزاء رکاوٹ ہو سکتے ہیں اور کسی خود سر اور بگڑی ہوئی حکمران طاقت کو اس میں فرار کے لئے کھلے اور چھپے راستے کہاں کہاں ملتے ہیں۔ ایسی نظرثانی کے بعد انشاء اللہ یہ مسودہ ہر حیثیت سے ہمارے لئے قابلِ فخر بن جائیگا بنیادی اسپرٹ یہ ہونی چاہیے کہ ہمیں اب اسلام کو اختیار کرنا ہے اور اس کی بنیادوں پر زندگی کو اٹھانا ہے، نہ یہ کہ چند الفاظ اور دفعات کو آراستہ کرکے پبلک کا منہ بند کرنا ہے۔

جمہوری پہلو سے بھی بعض اصلاحات کی ضرورت شدید طور پر محسوس کی جا رہی ہے۔ ان میں سے دو بہت ہی اہم ہیں۔ ایک یہ کہ صدر اور گورنروں کو عوام کی منتخب کردہ اسمبلیوں کے برطرف کرنے کا اختیار نہیں ہونا چاہئے۔ نیز صدر کو وزراء کے مشورے کی پابندی میں اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں۔ دوسرے یہ کہ عوام کو شہری حقوق کی بہم رسانی ایک اچھے سیاسی نظام کی بنیادی ضرورت ہے اور اس پہلو سے افسوس ہے کہ مسودہ تشویشناک حد تک کوتاہ بلکہ ناسب ہے۔ اس میں یہ حقوق ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لے لئے گئے ہیں۔ محض خوش نما الفاظ کی بھول بھلیاں میں ڈال کر اپنے عوام کی نظربندی کرنے سے تو کوئی فلاح پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہمیں خوشی ہے کہ حکمران عنصر کی طرف سے سردار امیر اعظم اول الذکر کو کو دُور کرنے کے لئے خود ہی ایک ترمیم لا رہے ہیں۔ اسی فراخ دلی سے بقیہ کوتاہیوں کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔

عام لوگوں کی توقعات یہ ہیں کہ دستور جلد ہی پاس ہو کر نافذ ہو جائے گا۔

مگر محض کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ حیاتِ ملی میں نئی حرکت مشکل ہی سے لا سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خود حکمران طبقہ اپنی طرف سے ذہن و عمل کی تبدیلی کا مظاہرہ کرے اور نئے دستور پر زندگی کا عملاً افتتاح کرتے ہوئے ملکی نظام میں ایک، دو، چار نمایاں تبدیلیوں کا تحفہ اپنی قوم کے سامنے پیش کرے۔ پاکستان بننے پر جس طرح کا تاریخی موقع پیدا ہوا تھا، آزادی کا اسلامی دستور بننے پر ویسا ہی ایک موقع حرکت دفعۃً پھر پیدا ہونے والا ہے۔

کیا اس موقع سے کام لینے والے دل و دماغ موجود ہیں؟

مظفر حسین صاحب کی خدمت میں

آپ کا تازہ گرامی نامہ ملا۔ پتہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً رسید بذریعہ چراغِ راہ بھجوا رہا ہوں۔ معافی چاہتا ہوں کہ اس گرامی نامہ کو اشاعت کے لئے نہیں دے رہا۔ میرا خیال ہے کہ اب اس رنگ کی بحث کا آگے سے چلنا نہ میرے اور آپ کے لئے سودمند ہے، نہ قارئین کے لئے اور نہ خود ادب و شعر کے لئے! البتہ ذاتی طور پر میں کوشش کروں گا کہ آپ کی نصیحتوں اور مشوروں سے فائدہ اٹھاؤں اور آپ کے خیالات سے کوئی مفید سبق لوں۔

(نعیم صدیقی)

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را ——

☆ مرزا احمد علی بیگ

زیاد ابن لبید سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کا ذکر کیا اور فرمایا کہ یہ علم کے چلے جانے کے وقت ہو گی۔

میں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! علم کس طرح جا سکتا ہے جب کہ ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں اور اسے اپنی اولاد کو پڑھائیں گے اور آگے ہماری اولاد یں اسے اپنی اولادوں کو تا قیامت پڑھاتی رہیں گی۔"

آنحضورؐ نے فرمایا:

"اے زیاد! تیری ماں تجھے کھوئے! (یہ بے تکلفانہ اظہار کا ایک محاورہ ہے) میں تو تجھے اس شہر میں بہت سمجھ دار آدمی سمجھتا تھا ——— کیا یہ یہود اور عیسائی توریت و انجیل نہیں پڑھتے؟ ——— مگر وہ ان میں سے کسی چیز پر عمل نہیں کرتے!" (احمد)

سبق ——

قرآن پڑھنا وہی مطلوب ہے جس کے ذریعے دین کے حقائق کو سمجھا جائے اور ان حقائق کے مطابق عملی زندگی کو سنوارا جائے۔

علم (دینی اصطلاح میں) وہی ہے جس کے ساتھ عمل پایا جائے۔

——— علم و حکمت کے ان موتیوں کے بارے میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو دریا برد کر دینا چاہئے!

لہ ہم نے موصوف کی عبارت میں ہلکا سا رد و بدل کیا ہے۔ یوں اصل متن سامنے نہیں۔ خدا کرے کہ کسی طرح کا سہو ترجمہ میں نہ ہوا ہو۔ مفہوم البتہ بالکل صاف ہے۔

جنگِ عظیم کے مصارف اور عالمی معیشت

وحیدالدین خاں

دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹-۴۵ء) میں انسانی ذرائع و وسائل کی جو بربادی ہوئی ہے، اقوامِ متحدہ کے ایک کمیشن نے تفصیل کے ساتھ اس کے اعداد و شمار جمع کئے ہیں۔ اس کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ساری دنیا میں مرنے اور زخمی ہونے والے ساڑھے چھ کروڑ انسانوں کے علاوہ پندرہ کروڑ اشخاص ایسے تھے جن کے گھر جل کر خاک ہوگئے اور ڈھائی کروڑ اشخاص کو اپنے وطن اور اپنی جائدادوں کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جلاوطن ہونا پڑا۔ کمیشن نے لکھا ہے کہ جتنی دولت اس لڑائی میں برباد ہوئی ہے اگر اس کو تعمیری کاموں میں صرف کیا جاتا تو امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا، فرانس، جرمنی، آئرلینڈ، سوویٹ روس اور بلجیم میں بسنے والے ہر ہر خاندان کو حسبِ ذیل اعانتیں بہم پہنچائی جا سکتیں :-

ایک لاکھ اسی ہزار روپیہ کی ایک کوٹھی۔

ساٹھ ہزار روپے کی مالیت کا فرنیچر

تین لاکھ روپے نقد

اس کے علاوہ ہر اس شہر کو جس کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہوتی مندرجہ ذیل نقد اعانت دی جا سکتی :

ساڑھے سینتیس کروڑ روپیہ لائبریریوں کے لئے۔

ساڑھے سینتیس کروڑ روپے اسکولوں کے لئے۔

ساڑھے سینتیس کروڑ روپے ہسپتالوں کے لئے۔

چھ سال کی اس جنگ میں برطانیہ کا خرچ روزانہ پندرہ ملین پونڈ سے زیادہ تھا[1] دوسرے ایک اندازہ کے مطابق اس جنگ میں مختلف قوموں نے جتنا خرچ کیا ہے اگر اس کو پوری دنیا کی ڈھائی ارب آبادی میں برابر برابر تقسیم کیا جاتا تو اس زمین پر بسنے والے ایک ایک شخص کو ۳۰ ہزار روپے ملتے۔ یعنی دس افراد کے ایک خاندان کے لئے تین لاکھ روپے جس میں وہ ڈھائی سو روپیہ مہینہ خرچ کر کے ایک سو سال تک زندگی بسر کر سکتا تھا۔

[ماخوذ اقتباس از "زندگی" (رام پور) ماہ ستمبر ۵۵ء]

---

[1] جنرل نالج انسائیکلوپیڈیا ص ۸۹۹

حاصلِ مطالعہ

قیامت کب آئیگی — اور کیسے؟

اوارہ

(جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے!)

اِن السّاعة لآتية "! ہم اس ارشادِ الٰہی پر چشم و جاں میں پڑے بغیر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارا عقلی و شعوری عقیدہ اور اطمینان بخش دلائل پر مبنی یقین یہ ہے کہ قیامت آکر رہے گی! اگر ہر ابتدا کا کوئی انجام ہے، اگر ہر سفینۂ وجود کا ساحل عدم ہے، اگر ہر تعمیر کا خاتمہ تخریب پر ہوتا ہے، اگر ہر نظم و ترتیب کی آخری منزل پریشانی و انتشار ہے تو پھر عالمِ طبیعی کے تمام اجزا پر چلنے والے اس ہمہ گیر قانون کی مار سے "کُل" بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پورے ہنگامۂ کائنات کے ڈرامے کا بھی کوئی نہ کوئی ڈراپ سین ہو گا، نظامِ کہکشانی کے قصیدے کا بھی کوئی مقطع ہو گا۔ نظامِ مادی کے ساز سے ابلنے والے نغمے کی تان بھی کہیں نہ کہیں جا کر ضرور ٹوٹے گی، اور انسانی زندگی کی کہانی کا کبھی نہ کبھی خاتمہ (END) ضرور آئے گا۔

اتنے بڑے حادثے کا تصور سامنے آتے ہی عقل سوچتی ضرور ہے اور اس کا خوف واہمہ کو بھی حرکت دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک فرد موت کا تصور کرتے ہی سوچتا بھی ہے اور توہمات میں بھی پڑتا ہے، انسانیت کا نوعی ذہن بھی اس "مرگِ انبوہ" کا خیال کر کے سوچ بچار بھی کرتا ہے اور اوہام میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ دور الحاد اور مادہ پرستی کا دور تھا، لیکن جیسے ایک ملحد خدا کا انکار کرنے کے بعد بھی موت کے اندیشے سے آزاد نہیں ہو سکتا، اسی طرح ہمارا یہ دور بھی تصورِ خدا کو بالائے طاق رکھ دینے کے باوجود دنیا اور زندگی کے اچانک خاتمے کے خوف سے بے نیاز نہیں ہو سکا۔ مذہب ہی نے نہیں، فلسفے نے بھی "قیامت" کے امکانات تسلیم کئے ہیں، اور اس سے آگے بڑھ کر سائنس بھی ایمان لانے پر مجبور ہو گئی ہے کہ دنیا اور زندگی کا — خصوصاً کرۂ ارضی اور انسانی زندگی کا — کسی لمحے خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے قیاسات اور حسابی تخمینے ہمارے سامنے ہیں۔

حال ہی میں اس موضوع پر کینتھ ہیور (KENNETH HEUER) کی ایک تازہ (۱۹۵۳ء) اور دلچسپ علمی و تحقیقی کتاب لندن کے ایک ادارۂ اشاعت (VICTOR GOLLANCZ LTD) نے شائع کی ہے جس کا نام ہے: "دنیا کا انجام" (THE END OF THE WORLD) اس کتاب کا حاصلِ مطالعہ ہم اس غرض سے قارئین کے سامنے لا رہے ہیں تاکہ ان کو اس دلچسپ کاوش سے تعارف حاصل ہو۔

مصنف تمہیدی صفحات میں بتاتا ہے کہ موجودہ دور سے پہلے دنیا کے خاتمے کا تصور تمام تر آسمانی نوشتوں پر مبنی تھا اور اس موضوع سے متعلق سراسر صرف مذہبی کتابوں ہی میں ملتا تھا۔ لیکن اب اس موضوع پر ہمارے طبعی اور مادی علوم کے پاس بھی کہنے کو بہت کچھ ہے۔ وہ خاص طور پر اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ کوپرنیکس اور گلیلیو کے زمانے سے قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ زمین مرکزِ کائنات ہے اور باقی جو کچھ بھی ہے وہ

۔ۂ ارضی اور اس کی آبادی کی خاطر ہے، لیکن اب پوزیشن بدل چکی ہے۔ اب زمین سورج کے گرد گھومنے والے بہت سے سیاروں اور اس سورج بنسی خاندان سے تعلق رکھنے والے کروڑوں اجرام کے انبوہ میں ایک ادنیٰ فرد بن کر رہ گئی ہے پس اب زمین کا کلی خاتمہ اس مجموعی تنے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور محض زندگی سے اس کا خالی ہو جانا تو اور بھی ہلکا معاملہ ہے۔ ایسے حادثات اس لمبی چوڑی کائنات میں ہا اجرام کو پیش آچکے ہیں اور روز آتے رہتے ہیں ـــ بغیر اس کے کہ باقی کے نظامِ کائنات میں کچھ بھی فرق آئے یا کمی محسوس ہو۔ زمین آخر کو نسا سرخاب کا پر لگا ہے کہ ایک اسی کو استثنا حاصل رہے۔

آج تو سائنس اس موضوع پر فکر و کاوش کے نئے میدان کے سامنے حیران و ششدر کھڑی ہے۔ انسان پر کائنات کی اساسی ۔ت کا راز فاش ہو گیا ہے۔ وہ ذرات کا سینہ چیر کر ان کے اندر اتر چکا ہے اور انرجی کا بنیادی سرچشمہ اس نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ جوہری ۔انائی کی کلید ہاتھ آجانے کے بعد آدمی تیزی سے ایسے مقام کی طرف بڑھ رہا ہے کہ وہ ایک آن میں اپنے ہاتھوں اپنی کامل تباہی کا سامان ۔سکتا ہے۔ گویا مادی اور طبعی حیثیت سے قیامت کا امکان آج اتنا زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آگیا کہ اس کا انکار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ اندریں صورت سائنس ہمیں یہاں تک تو لے آئی کہ دنیا، زندگی اور انسان کا خاتمہ قابلِ تسلیم ہے، البتہ یہ بات کہ اس حادثے کے ۔مد کیا ہو گا، یا قیامت کے ابتدائی تخریبی عمل کے بعد تعمیری عمل کیا اور کیسے ہو گا، زندگی کا ظہورِ ثانی ہو گا یا نہیں اور ہو گا تو آگے کے مراحل کیا ہوں گے، اس پہلو سے نہ اس کے پاس ذرائع علم ہیں، نہ وہ کوئی دعویٰ کرنے یا کسی دعویٰ کی تردید کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ آگے کے میدانِ فکر میں بجز الہامی روشنی کے اور کوئی ذریعۂ معلومات ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن اگر الہامی حکمت کے ایک معرکہ آرا دعوے کا ایک پہلو ہزاروں صدیوں کی عقلی و تجربی کاوشوں کے بعد آخر کار واجب القبول ثابت ہو گیا ہے تو اس دعوے کے دوسرے لازمی پہلو کو ہمیں اسی الہامی حکمت کے اعتماد پر ماننا ہو گا ـــ تاوقتیکہ تجربی عقل کوئی قطعی دلیل اس کے توڑ کے لئے فراہم نہ کر دے!

کاہنوں اور نجومیوں کے تیر تکّے

مذہبی کاہن اور جوتشی اور نجومی ہمیشہ قیامت کے وقت کا تعین کرنے کے درپے رہے ہیں۔ طرح طرح کے تیر تکّے لڑائے جاتے رہے ہیں۔ صرف ایک اسلام ایسا دین ہے جس نے یوں بھی کہانت اور نجوم اور جوتش کی بھول بھلیاں سے آدمی کو نکال لیا ہے اور خصوصاً قیامت کے موضوع پر قرآن نے بھی واضح کر دیا کہ اس کا وقتِ ظہور مخفی ہے اور مخفی رہے گا اور آں حضرت صلعم نے بھی تعیینِ وقت کرنے سے پرہیز کرتے ہوئے اس طرح زندگی گزاری جیسے کہ قیامت بالکل دروازے پر کھڑی دستک دے رہی ہے۔ کسی مسلمان کا ایمان اس تصور تک کی گنجائش نہیں دیتا کہ امورِ غیب کے متعلق قرآن اور پیغمبر کے دیئے ہوئے علم کی سرحد سے آگے پرواز کرنے کا بھی امکان ہے۔ لیکن دوسرے مذاہب کے پیروؤں نے قیامت کی گھڑی کے بارے میں بار بار پیشین گوئیاں کی ہیں۔ بائیبل کے مندرجات سے حسابی نتائج کا استخراج کر کے طبعی حوادث کی کثرت اور تمدنی فساد کے بڑھ جانے کی صورت میں راہب اور کاہن کچھ وقفوں کے بعد قیامت آنے کی کسی تاریخ کا اعلان کرتے رہے ہیں۔

مصنف نے چند عجیب مثالیں بیان کی ہیں۔ پرانے پادریوں اور راہبوں سے یہ خیال چلا آرہا تھا کہ ہزارویں سال قیامت آئے گی۔ چنانچہ وسطی جرمنی کے ایک راہب برنارڈ (BERNARD) نے ایک قدیم پادری کے حوالے سے اپنے وعظوں کے ذریعے ۹۶۰ء میں یہ اعلان کرنا شروع کیا کہ دنیا کے خاتمے کی گھڑی آپہنچی ہے۔ اس نے بتایا کہ ۹۹۲ء کے گڈ فرائی ڈے کو ظہورِ عیسیٰ کی بشارت کا دن ہو گا۔ اس پیشینگوئی کے زیرِ اثر ۹۹۹ء میں جوق درجوق ہزاروں عیسائی یروشلم پہنچ گئے تاکہ ارضِ مقدس میں آخری فیصلے کا انتظار کریں۔ ان میں

[illegible] اپنی جائدادیں فروخت کر دیں یا راہِ خدا میں لٹا دیں۔ بالآخر قیامت کی تاریخ قطعی طور پہ طے کر دی گئی یعنی ۲۴ مارچ [illegible]
پیشین گوئی ورو تھمار (RRUTHMAR) نامی درویش کے لب مبارک سے صادر ہوئی تھی۔ اس روز اتنی دہشت پھیلی کہ لوگ گرجوں میں جا کر اکٹھے ہو گئے اور اولیاؤں کے مقبروں کے سامنے آدھی رات تک انتظار کرتے رہے کہ صلیب کے زیرِ سایہ جان جانِ آفریں [illegible]رد کریں۔ اس موقع پہ لوگوں نے بے شمار جائدادیں اور اموال گرجوں اور خانقاہوں کو دے دئیے

[illegible]س صدی کے اواخر اور گیارھویں کے اوائل کا زمانہ بڑا دہشت ناک تھا۔ سارے یورپ میں ایک وبا پھیل گئی جس کے اثر سے گوشت گل کر ہڈیوں سے جھڑ جاتا تھا۔ پھر اس کے بعد قحط ٹوٹ پڑا اور ایسا قحط جس کی مثال نہیں ملتی یہاں تک کہ لوگ آدم خور بن گئے۔ ایک ایک انڈے یا پھل کے ایک ایک دانے کے عوض بچے فروخت کر دئیے گئے۔ والدین نے بچوں کو اولاد نے [illegible] کھایا۔ ایک موقع پر تو ایک شخص انسانی گوشت منڈی میں بیچنے کے لئے لے آیا۔

[illegible]ور اضطراب جونہی گزرا اور لوگوں نے چین کی سانس لی تو تمام گرجے اور مذہبی عمارتیں تعمیرِ نو کا جامہ پہننے لگیں، کیوں کہ مذہبی [illegible]ادارات کے پاس بڑی وافر دولت جمع ہو گئی تھی۔ "کالی موت" (BLACK DEATH) کے گزر جانے کے بعد لباس کے لئے فیشن نکلنے لگے، شادیاں کثرت سے ہونے لگیں، قصبات کی آبادیاں بڑھ گئیں۔ گویا زندگی عود کر آئی اور انسان ایک بار پھر اپنی دنیا میں مگن ہو گیا۔ وہی سرسنی کہ "ذلک رجع بعید"!

مصنف بتاتا ہے کہ ۱۹۰۰ء میں پھر ایک انتباہ دیا گیا کہ بابل میں دجال (ANTICHRIST) پیدا ہو چکا ہے اور نسلِ اب نوعِ انسانی کا صفایا ہو جانے والا ہے۔ سینکڑوں برس تسلسل سے یہی پیش گوئی دوہرائی جاتی رہی۔

جرمنی میں سٹوفلر (STOEFFLER) نامی نجومی نے زمانۂ نوحؑ کی طرح کے تباہ کن طوفان کی آمد کی خبر سنائی اور سال ۱۵۲۴ء کو نامزد کر دیا۔ اتنی گھبراہٹ پھیلی کہ صنعت و تجارت کی سرگرمیاں بند ہو گئیں، کسانوں نے زمینیں کاشت کرنا چھوڑ دیں، تمام کام رک گئے اور قرضوں کی ادائی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا اور لوگوں نے زمینیں قریب قریب مفت لٹا دیں۔ بعض لوگ تو پہاڑی علاقوں کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ اونچی چوٹیوں پہ جا کر طوفانی موجوں سے بچاؤ کر سکیں، بعض نے کشتیاں بنانی شروع کر دیں۔ فروری کا مہینہ جس کے بارے میں پیش گوئی تھی، آیا اور بخیریت گزر گیا۔ لوگوں نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن ایک دوسرے درباری نجومی نے حکمرانِ وقت کو آگاہ کیا کہ سٹوفلر سے ایک حسابی غلطی ہو گئی ہے، صحیح تاریخ ۱۵ جولائی ۱۵۲۵ء قرار پائی ہے۔ اسے راز میں رکھا گیا۔ ۱۵ جولائی کو بادلوں کی ایک دھاری افق سے نمودار ہوئی اور اِدھر ایک محل سے گاڑیوں کا ایک لمبا جلوس پورے خاندان کے افراد اور سرکاری عہدہ داروں اور خزانے کو لئے ہوئے نکلا اور انتہائی تیز رفتاری سے ایک چھوٹی سی پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ عوام پہ جب حقیقت کھلی تو سراسیمگی پھیل گئی اور حکمران کے اس رویے کے خلاف لوگوں کو سخت افسوس ہوا۔ رات معمولی سا طوفان آیا اور خفیف سا نقصان بھی ہوا مگر وہ بات نہ ہوئی!

ولیم ملر (WILLIAM MILLER) نے ایسا ہی اضطراب امریکہ میں پیدا کر دیا۔ اس کا کشف یہ تھا کہ ۱۸۴۳ء میں دنیا کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ اس نے بائبل کی رُو سے حساب لگا کر تاریخ بھی مقرر کر دی کہ ۲۱ مارچ کو آدھی رات کے وقت زمین معدوم ہو جائے گی۔ اس کے معتقدین کا ایک فرقہ اٹھ کھڑا ہوا اور یہ لوگ تبلیغی مہم میں لگ گئے کہ لوگ آنے والی گھڑی کے لئے تیاری کر لیں۔ اس تبلیغی مہم کو چلانے کے لئے خوب خوب انفاق مال بھی کیا گیا۔ اس موقع پر بھی لوگوں نے اپنے فرنیچر اٹھا دئیے، زمینیں بیچ ڈالیں، باغ

کے درخت اکھیڑ دیئے اور فصلیں اجاڑ دیں۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ فروری میں دمدار تارے کا ظہور ہوا جو سورج کی طرف سے تیز رفتاری سے اقدام کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے بیس کروڑ میل لمبی دُم تھی۔ ہر طرف چرچا ہونے لگا کہ یہ دُنیا کے خاتمے کی علامت ہے۔ جو پہلے نہ مانتے تھے اب ان کے دل بھی دہل گئے۔ ۲۱ مارچ کی شام کو بوسٹن سے لوگوں کے بڑے بڑے ہجوم کھلے دیہاتی علاقوں کی طرح نکل کھڑے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر اکٹھے ہونے لگے تاکہ عالم بالا کی طرف سہولت سے سدھار سکیں۔ جونہی تارے نکلے تو حمدِ خدا کے ترانے گائے جانے لگے، آدھی رات تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مقررہ گھڑی آئی اور گزر گئی۔ ۲۲ کو لوگ چپ چاپ یا روتے ہوئے گھروں کو لوٹ گئے۔ ویسٹ فورڈ میں تو خوب لطیفہ رہا۔ کریزی ایمس (CROZE AMOS) جو پیشینگوئی پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا چپکے سے باہر کھلے کھیتوں میں نکلا، اور عین اس عالم میں جبکہ ملر کے معتقدین ایک مکان میں بند بیٹھے تھے، اس نے نرسنگا بجانا شروع کیا۔ وہ بچارے مارے گھبراہٹ کے انبوہ کا انبوہ بھاگنے لگے۔ ہر ایک بہترین جائے پناہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دوسری بار اس نے پھر نرسنگا بجایا۔ ملر کے مرید ہاتھ اٹھا اٹھا کر حمد گاتے۔ آخر انکشاف ہو گیا کہ یہ کریزی کی شرارت ہے۔ کریزی نے کہا "احمقو! جاؤ اپنے آرکیٹ سے نکال لو جبرئیل تو ان کو نہیں نکالے گا۔"

ملر کے بہت سے مرید اس دن اس کے حلقے سے ٹوٹ گئے، مگر بہت سے پھر بھی پختہ اعتقاد نکلے۔ اس کی پیشگوئی کے پورا ہونے کے لئے ابھی سال کا ایک بڑا حصہ پڑا تھا۔ چنانچہ یہ چکر چلتا رہا۔

دُمدار تارے

کاہنوں اور نجومیوں کے علاوہ قیامت کے وقوع کے بارے میں ماہرین فلکیات نے بھی ہمیشہ اندازے باندھے ہیں۔ خصوصیت سے آوارہ قسم کے دمدار تاروں کے بارے میں بار بار یہ اندیشہ کیا گیا ہے کہ ان کا زمین کے ساتھ ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ یوں تو کسی دمدار تارے کا ظہور نحوست کی ایک علامت سمجھا جاتا رہا ہے، لیکن ماہرینِ فلکیات عام لوگوں کے اوہام پسندانہ تصورات کے بجائے حسابی نقطۂ نظر سے معاملے کو دیکھتے ہیں۔

۱۷۷۳ء کا واقعہ ہے کہ لالینڈی (LALANDE) کی طرف سے اکیڈیمی آف سائنس کے سامنے ایک مقالہ پڑھنے کا اعلان ہوا جس کا عنوان تھا "ایسے دمدار تاروں کا مطالعہ جو زمین تک پہنچ سکتے ہیں"۔ ایک افواہ اس اعلان کے جلو میں پیرس سے پھیلنے لگی اور پورے فرانس میں سخت سراسیمگی پیدا کرنے کا موجب ہو لی۔ یاروں نے یہ پُر کی اڑا دی کہ ماہرِ ریاضیات لالینڈی کے حساب کے مطابق ۲۰ یا ۲۱ مئی ۱۷۷۳ء کو ایک دمدار تارہ زمین کے مدار پر سے گزرنے والا ہے اور اس کی ٹکر سے زمین تباہ ہو جائے گی۔ مقالے میں سرے سے اس طرح کی کوئی بات نہ تھی، مگر اس کے عنوان اور اخباری سرخیوں کے اندر سے انسانی دماغ نے ساری تفصیلات خود برآمد کر کے ایک مکمل پیشین گوئی پیدا کر لی۔ اضطراب ایسی غیر معمولی حد کو جا پہنچا کہ لالینڈی کو ایک بیان دینا پڑا، لیکن وہ بھی بے نتیجہ رہا۔ بلکہ الٹا چونکہ اس نے مقالہ پڑھنے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا تھا اس لئے لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ مقالہ لازماً ایسے خطرناک انکشافات پر مشتمل ہے کہ عام مطلوب کو دیکھ کر اسے روک لیا گیا ہے۔ بات پھیلی تو کئی دوسرے لوگوں نے اس کے شعلوں کو اور ہوا دے دی۔ گھبراہٹ میں گھرے ہوئے عوام کے ہاتھ پادریوں نے جنت کی ٹکٹیں فروخت کرنا شروع کر دیں۔ لیکن تاریخ گزر گئی اور "تماشا نہ ہوا"۔

مصنف کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ۱۸۳۲ء اور ۱۸۵۷ء میں بھی ایسے ہی ہنگامے بپا ہوتے رہے جو آج ایک مضحکہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ویسے امکانات بدستور رہیں اور بار بار سامنے آتے ہیں۔ خصوصاً ۱۶۹۶ء میں وسٹن (WHISTON) نے "ایک نیا نظریۂ ارضی" (

(A NEW THEORY OF THE EARTH) نامی کتاب میں بڑی تفصیل سے ان امکانات کے بارے میں تخمینے پیش کئے اور سنہ ۱۹۵۰ء میں ایک تازہ کتاب "ٹکراتی دنیائیں" (WORLDS IN COLLISION) نے ایک بار پھر پرانی تشویش کو تازہ کر دی۔

مصنف ان امکانات کے سلسلے میں واضح کرتا ہے کہ دمدار تارے بہرحال آفتابی خاندان کے مستقل ارکان ہیں اور ذرا مختلف قسم کا مدار رکھتے ہیں۔ ان کی تعداد خاصی ہے۔ یہ چونکہ وقتاً فوقتاً مدار ارضی کو قطع کرتے رہتے ہیں اس لئے زمین کے ساتھ ان کا تصادم ممکن الوقوع ضرور ہے۔ کسی دمدار تارے کا مرکزہ (NUCLEUS) جو سورج اور زمین کے درمیانی فاصلے میں سے ہو کر گزرتا ہے، چالیس کروڑ صورتوں میں سے صرف ایک موقع رکھتا ہے کہ وہ زمین سے ٹکرا جائے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کے سامنے ایک مرتبان میں چالیس کروڑ گولیاں بھر کے رکھ دی جائیں جن میں سے صرف ایک زہریلی ہو اور پھر اسے ایک گولی اٹھا کر منہ میں رکھنے کا حکم دیا گیا ہو۔ جتنا امکان اس کے لئے زہریلی گولی پر ہاتھ پڑنے کا ہے، اتنا ہی زمین کے کسی دمدار تارے سے ٹکرا جانے کا ہے۔ ہر سال تقریباً پانچ دمدار تارے سورج اور زمین کے درمیانی فاصلے سے گزرتے ہیں۔ اس لحاظ سے آٹھ کروڑ برس میں ایک بار کسی دمدار تارے کے مرکزہ سے زمین کا تصادم ممکن ہے۔ زمین کو اپنی دو ارب سال کی عمر میں کم سے کم ایسے ۲۵ حوادث سے دوچار ہونا چاہئے۔ دمدار تارے کے سر کے بیرونی حصے سے یا اس کی لمبی دم کے کسی حصے سے زمین کا گزر جانا تو بہت زیادہ مرتبہ ممکن الوقوع ہے۔ لیکن ثابت یہ ہوا ہے کہ دمدار تاروں کا مادی حلقہ اتنا کم ہے کہ وہ زمین یا دوسرے سیاروں کے کشش کے تحت اپنا مدار بدل لیتے ہیں لیکن بہرحال وہ اتنے چھوٹے بھی نہیں کہ ان کو ڈبیہ میں بند کیا جا سکے۔ سب سے کم اندازہ یہ کیا گیا ہے کہ دمدار تارے کا مادی حلقہ زمین کے مقابلے میں ایک دس لاکھواں حصہ ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی اس کا وزن ۶،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ٹن قرار پاتا ہے۔ اس وزن کی ٹکر بڑا حادثہ پیدا کر سکتی ہے، مگر اس کا انحصار اس پر ہے کہ تارے کا مادہ زیادہ ٹھوس ہے یا کھوکھلا۔

ایک چھوٹے سے دمدار تارے کا زمین پر آگرنے کا حادثہ ۲۰ ہزار تا ۵۰ ہزار سال قبل وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ شمالی وسطی آریزونا (ARIZONA) میں اس کا نقش عبرت ایک جوالا مکھی کی صورت میں موجود ہے جس کا گھیر چالیس ہزار فٹ ہے۔ اس کے مطالعہ و مشاہدہ سے اہل علم بہت سے کام کے نتائج اخذ کرتے رہے ہیں۔ مصنف نے خاصی دلچسپ تفاصیل دی ہیں۔

اسی سلسلے میں سائبیریا میں ایک شہابیے کے آگرنے کے حادثہ کا تذکرہ بھی مصنف نے کیا ہے جو ۳۰ر جون ۱۹۰۸ء کو وقوع پذیر ہوا تھا۔ بجلی کے کڑکے سے زیادہ شدید گرج پیدا ہوئی، آگ اور دھوئیں کا ایک بڑا مرغولہ آسمان کی طرف اٹھا اور کالے بادلوں کی شکل میں چاروں طرف پھیل گیا۔ مقام حادثہ سے پندرہ میل کے علاقے تک میں درخت ٹوٹ گئے۔ پچاس میل دور پر رہنے والے ایک کسان نے لو کے ایسے گرم تھپیڑے محسوس کئے کہ اسے اندیشہ ہوا کہ کپڑوں کو آگ لگ جائے گی، بعد میں وہ دھماکے کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر پڑا، ہوش میں آنے پر اس نے دیکھا کہ اس کا گھر تباہ ہو چکا ہے، ایک اور علاقے میں ڈیڑھ ہزار رینڈیر ہلاک ہو گئے اور ایک گاڑی تقریباً لائن سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ تقریباً دو سو جوالا مکھی ایک میل کے دائرے میں پائے گئے۔ روسی پروفیسر کولک (KULIK) نے اندازہ لگایا کہ شہابیہ کا وزن ۴۰ ہزار ٹن ہوگا۔

اب تصور کیجئے کہ کم سے کم وزن (مذکورہ بالا) کا دمدار تارہ اگر زمین سے کبھی ملاقات کر بیٹھے تو اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔

ایک اور خطرہ اور پیدا ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر زمین کسی دمدار تارے کی ہزاروں میل لمبی دم میں سے گزرے تو وہاں ایسی زہریلی گیسوں کے

ہونے کا امکان ہے جن کی وجہ سے نوع انسانی ہلاک ہو سکتی ہے۔ کاربن مونو آکسائیڈ (CARBON MONOXIDE) جو قتل اور
خودکشی کرنے میں بکثرت استعمال ہوتی ہے، اور کیانوجن (CYANOGEN) جیسی زہریلی گیسوں کا دمدار تاروں میں پایا جانا متحقق ہو چکا ہے۔
علاوہ بریں ان میں ہائیڈروجن اور میتھلین وغیرہ آتش پذیر گیسیں بھی دریافت ہو چکی ہیں۔ ایک شرارہ کافی ہے کہ دُم کے احول سے زمین کے
گزرنے کے وقت ہماری ساری خاکی کائنات کو شعلوں میں بدل دے۔

لیکن زمین دمدار تاروں کی دموں سے چند بار بخیریت گزر چکی ہے، اور قریب میں ایسا واقعہ ۳۰ جون ۱۸۶۱ء کو ہو چکا ہے۔
اس وجہ سے خیال کیا جاتا ہے کہ دمدار تاروں کے ذریعے دنیا کے انجام سے دوچار ہونے کے امکانات بہت ہی کم ہیں۔ البتہ اگر کسی تارے
کا سر ٹکرا جائے تو پھر حادثہ تباہ کن ہوگا۔

چاند سے خطرہ

ایک جدید انکشاف یہ ہے کہ ہمارا دن "آہستہ آہستہ درازتر ہو رہا ہے، تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار برس میں ایک سیکنڈ
کی رفتار سے! اس کا سبب جوار بھاٹے کی مزاحمت ہے جس کا محرک چاند ہے۔ جوار بھاٹے کی لہریں اور رویں چونکہ
جانب مغرب حرکت کرتی ہیں اور زمین بجانب مشرق گھومتی ہے، اس تخالف کی وجہ سے جوار بھاٹے کی مزاحمت زمین کی گردش کے حق میں
بریک کا کام کرتی ہے۔ پس زمین کی رفتار میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اور وہ دن کے طویل تر ہوتے جانے کا سبب ہے۔

جوار بھاٹے کی مزاحمت کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چاند سست رفتاری سے زمین سے دور تر ہوتا جا رہا ہے — آج کل یہ رفتار
پانچ فٹ فی صدی ہے۔ دوسرے لفظوں میں چاند کا مدار حرکت وسیع تر ہو رہا ہے اور قمری مہینہ غیر محسوس سی تدریج سے بڑا ہو رہا ہے۔
مصنف بتاتا ہے کہ ایک استخراج کی رُو سے ہمارا دن ابتداءً ۴ر۸ گھنٹے کا تھا جب کہ چاند زمین سے صرف ۹ ہزار میل کی دوری پر
تھا یعنی دن اور قمری مہینہ برابر تھے۔ آج دن ۲۴ گھنٹے کا ہے، قمری مہینہ ½۲۷ دن کا، اور چاند اور زمین کا درمیانی فاصلہ
۲۳۸۸۴۰ میل ہے۔ دن کے طول پکڑنے کی رفتار پہلے بہت تیز تھی، بعد میں آہستہ آہستہ گھٹتی گئی۔

اندازے باندھے گئے ہیں کہ جوار بھاٹے کا یہ عمل ایک دن اس پر منتج ہوگا کہ زمین کی رفتار حرکت گھٹ کر اور چاند کی دوری بڑھ
کر دن اور مہینے کی طوالت کو یکساں کر دے گی۔ ایسا موقع ۔۔۔۔۔۔ء میں آئے گا۔ اس وقت دن اور چاند کا مہینہ ہمارے موجودہ
۴۷ دنوں کے برابر ہوگا اور چاند اور زمین کا فاصلہ ۔۔۔۔۔۴ میل ہو جائے گا۔ اگر اس وقت تک سورج روشن رہا تو لمبے لمبے چلنے والے
دن ہوں گے اور لمبی لمبی یخ بستہ کر دینے والی راتیں ہوں گی۔ دلچسپ تر یہ کہ چاند کے مہینے اور زمین کے دن کے ایک ہونے کے معنی یہ ہیں
کہ چاند اور زمین کا دوران بالکل متوازی ہوگا، اس لئے ظاہر ہے کہ چاند ہمیشہ زمین کے ایک ہی جانب چمکے گا۔ ایسی صورت میں لوگ اگر
باقی رہے تو لمبے سفر کر کے چاند کو دیکھنے جایا کریں گے۔

قمری مدوجزر ہوگا تو سہی، لیکن غیر موثر! البتہ شمسی جوار بھاٹا زمین کی رفتار گردش پر اثر انداز ہوگا۔ وہ مزید گھٹے گی اور چاند سے کم تر
ہو جائے گی۔ اس کے زیر اثر قمری جوار بھاٹا پھر موثر ہو جائے گا کیوں کہ اب زمین اور چاند کی رفتار گردش کے تفاوت کی وجہ سے چاند کی پوزیشن
پھر بدلنے لگے گی۔ کیونکہ چاند کی رفتار کے زیادہ اور زمین کی رفتار کے گھٹ جانے کی وجہ سے چاند مغرب سے نکلا کرے گا۔ اندریں صورت قمری
جوار بھاٹا کا اثر بالکل الٹ جائے گا۔ اب چاند زمین کی طرف پھر کھنچنے لگے گا۔ تا آنکہ ایسی حد میں آ داخل ہو کہ زمین کی کشش کا عمل اس کے
لئے تباہ کن ہو۔ چاند انتہائے بُعد تک جانے میں پچاس ارب سال لے گا اور ابھی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی واپسی کتنی مدت لے گی۔ لیکن

یہ والیسی زندگی کے لئے تباہ کن ہوگی۔ مصنف کا قیاس ہے کہ شاید کچھ مچھلیاں سمندروں میں (اگر بشرطیکہ خود سمندر بچ رہے ہوں) باقی رہ جائیں اور ان کے اندر سے زندگی کی برتر اشکال دوبارہ ارتقائی اصول سے نمودار ہوں۔

ماہر فلکیات جیفریز (JEFFREYS) کا اندازہ یہ ہے کہ چاند زمین سے بیس ہزار میل کے فاصلے پر جب واپس پہنچے گا تو اس میں پھیلاؤ پیدا ہوگا اور وہ کم از کم دگنا ضخیم ہو جائے گا۔ اس وقت یقیناً وہ پھٹ کر دو یا زائد ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ یہ ٹکڑے مزید قریب آنے پر بکھر پھٹیں گے تا آنکہ ننھے ننھے پراگندہ اجرام کا ایک حلقہ زمین کے گرد قائم ہو جائے گا جیسے آج ہم زحل کے گرد دیکھتے ہیں۔ یہ ایک عجیب منظر ہوگا، مگر افسوس کہ اس سے لذت اندوز ہونے کے لئے کوئی انسانی آنکھ باقی نہ رہے گی۔

چاند کو جو طبعی اسباب حوالۂ تباہی کریں گے وہ زمین کی طرف بھی اپنے پنجے بڑھائیں گے۔ اس وقت اگر نوع انسانی موجود ہوئی تو وہ فضا میں تیرنے کے لئے کوئی سفینہ بنائے گی اور پوری نسل کو اس کے ذریعے زمین سے اٹھا کر کسی اور دنیا میں پہنچانے کا انتظام ہو جائے گا۔

چاند کے قریب تر، عظیم تر اور لامع تر ہوتے جانے کی صورت میں زمین شدید زلزلوں سے دوچار ہوگی۔ جوالا مکھی تیزی سے آتش فشانی کریں گے، تمام جانداروں میں ہل چل مچ جائے گی۔ پہاڑ ٹوٹ کر سمندروں کی تہ کے ہم سطح ہو جائیں گے اور نئی خشکیاں پیدا ہو جائیں گی۔ سمندر اگر باقی رہے تو قمری مد و جزر کی لہریں ہر پہ گھنٹوں میں انتہائی طور پر بلند ہوں گی اور ساری زمین کی سطح پر پھیل جائیں گی لیکن پیشتر اس کے کہ چاند آخری حادثے کے مقام تک پہنچے سمندر یخ بستہ ہو جائیں گے اور سرے سے مد و جزر کا عمل ہی ختم ہو جائے گا اور موجودہ اندازوں کے مطابق سورج بھی دس ارب برس سالِ عیسوی میں جا کر بجھ جائے گا۔ اس لئے چاند ایک مدار پر آ کر ہمیشہ کے لئے اس کا پابند ہو جائے گا۔

تاہم چاند کے وجود سے سائنس کے اندیشے وابستہ ضرور ہیں۔

ننھے منّے کرّے مصنف ایک اور خطرے کی نشاندہی کرتا ہے۔ مریخ کے مدار سے باہر ایک مدوّر پٹی ہے جو تقریباً ...... ۲۴ میل چوڑی ہے۔ یہاں بے شمار ننھے منّے کرّے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی دھن میں مست کسی بھی وقت بھاگتے بھاگتے زمین سے آ کر ٹکرا سکتا ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ربوشنر (LEUOGHNER) کا اندازہ ہے کہ ان کرّوں کی تعداد کم از کم ۵۰ ہزار ہے جن میں سے ۵ ہزار مختلف اوقات میں مشاہدۂ انسانی میں آ چکے ہیں۔ ۱۶۰۰ کے مدار تک معلوم ہیں، بقیہ نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ ان کی جسامت بہت ہی کم ہے۔ ان میں سے عظیم ترین سیریس (CERES) پلّاس (PALLAS) ویسٹا (VESTA) اور جونو (JUNO) ہیں جس کا محیط کل ایک میل ہے۔ وزن میں تین ارب ٹن ہے۔ ان کا ٹکراؤ اگر زمین سے ہو جائے تو نتیجہ کا انحصار ان کی جسامت، وزن، صلابت اور رفتار پر ہے، یا اس پر کہ زمین کے کس حصے پر یہ گرتے ہیں۔

کرۂ آتشیں اور سنیئے، دُور اس نیلی فضا میں گیسوں کا ایک بہت عظیم الجثہ شعلہ فشاں گولا پچاس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لپکا چلا آ رہا ہے۔ قیاس کیا گیا ہے کہ یہ کسی مقام سے دو ارب برس سے یونہی پرواز کر رہا ہے۔ سورج اس کی سمت سفر میں پڑتا ہے۔ جوں جوں دونوں کا فاصلہ کم ہوتا جائے گا، سورج بھی اس خیال سے پیشوائی کو آگے بڑھے گا کہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ دونوں طرف سے ہر لحظہ رفتارِ اقدام تیز تر ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ معانقہ تک نوبت آ جائے۔ ایسے حادثہ کی صورت میں نظامِ فلکی تہ و بالا ہو سکتا ہے۔ سیاروں کے مدار بدل سکتے ہیں اور کئی عوالم تباہ ہو کر نئی دنیائیں وجود میں آ سکتی ہیں۔ ابتدائی واقعہ یہ ہوگا کہ ایک دم سورج کی حرارت بڑھ جائے گی اور اس کی وجہ سے زندگی کی تباہی واقعہ ہو جائے گی لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرا ستارہ سورج کے ساتھ اگر مصالحانہ رابطہ قائم کر لے اور

چاند اور زمین کی طرح دونوں زوجیت کے رشتہ میں بندھ جائیں ۔ ایسی صورت میں ہماری دنیا کے لئے بیک وقت دو سورج فراہم ہو جائیں گے اور کبھی دونوں اکٹھے چمکیں گے ۔ کبھی آگے پیچھے باری باری طلوع ہوا کریں گے اور رات کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا ۔

امکان یہ بھی ہے کہ سورج قریب سے ہو کر گزرنے والے کسی مسافر ستارے سے کشتی لڑ جائے ۔ اندازہ یہ ہے کہ سورج جیسے بڑے اجرام کے درمیان کائنات کی عمر میں قریب قریب دو ہزار ایسی کشتیاں ہو چکی ہیں ۔ لیکن سائنس دان کہتے ہیں کہ ایسے حادثے کے امکان کو ہزارہا سال قبل محسوس کیا جا سکتا ہے اور جب کوئی ستارہ نظام شمسی کی جانب اقدام کرے گا تو ہماری دوربینیں حملہ آور کو بہت پہلے سے تاک لیں گی ۔ پھر نسلاً بعد نسل آنے والے حادثے سے بچاؤ کی تیاری کی جا سکے گی ۔ مثلاً ایٹمی طاقت کے بل پر زمین سے ہجرت کی جائے گی یا خود زمین کو کھینچ کر دور بھگا لے جایا جا سکے گا ۔

جب سورج بے نور ہو جائیگا

سورج ۔۔ روشنی حرارت اور انرجی کا سرچشمہ ۔۔ جس سے ہزاروں، لاکھوں برس سے زندگی اور حرکت، قوت کے سرچشمے پر ہر سمت میں پھوٹ رہے ہیں ہلاکی دو طاقت نہیں رکھتا ۔ ایک نہ ایک دن اس کے خزانے خالی ہو جائیں گے اور نظام کہکشانی کے قصر کی یہ قندیل بجھ جائے گی لیکن بجھنے سے قبل اس کی لو ایک بار سنبھالا لے گی تو ایسے لے گی کہ اس کی وجہ سے نصف گھنٹے کے اندر اندر کرۂ ارضی کا ایک نصف جل بھن جائے گا اور سمندروں کا پانی گرم بھاپ میں بدل جائے گا جس کے تھپیڑوں سے دوسرے نصف کرے کی تمام زندگی و مخلوق کا صفایا ہو سکتا ہے ۔ بعد میں نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ خود زمین کی یادگار دُخان کا ایک بڑا مرغولہ رہ جائیگا ۔ جو آہستہ آہستہ تحلیل ہوتا جائے گا ۔ ثبت شدہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ کائنات میں ایسے حوادث پہلے بھی ہو چکے ہیں اور کئی بار ریکایک مشتعل ہو جانے والے اجرام کا مشاہدہ کیا گیا ہے ۔ اب تک متعدد نئے ستارے فضا میں شعلہ فشاں دیکھے ہیں اور ان کے بارے میں قیاس یہی ہے کہ وہ طبعی قوانین کے زیر اثر التہابی کیفیت سے دوچار ہونے کی وجہ سے انسانی نگاہوں کی زد میں اچانک طور پر آگئے سنہ ۱۳۴ ق م، ۴ جولائی ۱۰۵۴ء، ۱۵۷۲ء، ۲۲ فروری ۱۹۰۱ء میں نئے نئے ستارے دائرہ نگاہ میں آتے رہے ہیں ۔

ان ستاروں کے متعلق مصنف نے اجمالاً وہ قیاسات بیان کئے ہیں جو علماء کی طرف سے پیش کئے جاتے رہے ہیں اور ہر قیاس سابق قیاسات کی تردید کر کے ایک نئی توجیہ سامنے لے آتا ہے ۔ ایک تازہ نظریہ یہ ہے کہ دو ستاروں کی مقاربت میں عمل کشش و حرکت کی وجہ سے انرجی نمود و حرارت میں تیزی سے بدلتی ہے اور اس کی وجہ سے التہاب و اشتعال پیدا ہو جاتا ہے ۔ ایک رائے یہ ہے کہ جب کوئی ستارہ فضا میں پائی جانے والی گیسوں اور دخانات کے کسی مرغولے سے گزرتا ہے تو اس کی مزاحمت کی وجہ سے وہ بھڑک اٹھتا ہے ۔۔۔۔ ٹھیک وہی اصول جس کے تحت شہاب جب زمین کے قریبی ماحول میں گھستا ہے تو اس میں لاہیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ آخری توجیہ اس تصور کو سامنے لاتی ہے کہ یہ عمل درحقیقت ایٹمی اصول پر ایک مسلسل داخلی دھماکے کی صورت میں واقع ہوتا ہے ۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس عمل سے ہر ستارہ ایک نہ ایک دن گزرتا ہے ۔ ہمارے نظام کہکشانی کے ماحول میں قریب قریب بیس ستارے ہر سال بھڑک اٹھنے کے حادثے سے دوچار ہوتے ہیں ۔ جان واشنگٹن یونیورسٹی کے عالم طبیعات جارج گیماؤ (GEORGE GAMOW) کے اندازے کے مطابق کائنات کی دو ارب سال کی عمر میں تقریباً ۴ ارب ستارے (تقریباً یہی کل تعداد ہے) اس طبعی حادثے سے گزر چکے ہیں ۔ اس پروفیسر کی رائے یہ ہے کہ سورج پر اس حادثے کے وقوع کا امکان ہزاروں لاکھوں مواقع میں سے صرف ایک کی نسبت سے ہے ۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ سورج اس مصیبت کا نامعلوم ماضی میں کبھی سامنا کر چکا ہو ۔

لیکن اگر کبھی ایسا ہو گیا تو نہ صرف زمین کی پوری آبادی کا صفایا ہو جائے گا بلکہ نظام شمسی میں اور جہاں کہیں بھی زندگی پائی جاتی ہے اس کے

تمام فضا پر خطِ نسخ پھر جائے گا۔ گرمی کا طوفان تند بری طرح سے موجودات کو لپیٹ میں لے گا، لیکن افسوس کہ اس منظر کو دیکھنے کے لئے ذوی العقول میں سے کوئی ہوگا نہیں —— صرف خالق ہوگا!

حیاتِ ارضی کے تمام مظاہر میں سورج ہی کی فراہم کردہ انرجی کارفرما ہے یہی ہمارے لئے سرچشمہ حیات ہے۔ پانی کی طاقت سورج کی گرمی کی مرہونِ منت ہے جو اسے بخارات بنا کر بلندی پر واقع جھیلوں میں ڈالتا ہے، پھر وہاں سے وہ بہ کر زندگی کے کھیتوں کو سیراب کرتا ہوا دوبارہ سمندروں میں پہنچتا ہے اور یہ آبی چکر یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ ہوا کی قوت بھی اسی کے طفیل ہے، کیوں کہ سورج کی گرمی ہی اسے حرکت دیتی ہے، یہ نہ ہو تو ہوائیں بالکل رک جائیں۔ اسی طرح کوئلے، لکڑی اور تیل کی ساری طاقت سورج کے دم قدم سے ہے۔ روشنی کا عمل ہے جو نباتی موجودات میں پائے جانے والے پانی اور کاربن ڈائی آکسائڈ کی ترکیب سے شکر اور نشاستہ بناتا ہے اور اسی مادہ حیات کے طفیل پودوں کا سبز مادہ (CHLOROPHYLL) وجود پاتا ہے۔ پھر وہ سورج ہی کی روشنی سے ماخوذ قوت ہے جو کاربوہائیڈریٹس کو تحلیلی عمل سے گزارتی ہے۔ لکڑی کو جب ہم جلاتے ہیں تو اس میں سے وہی جمع شدہ قوت خارج ہوتی ہے جو درخت نے سورج کی شعاعوں میں سے جذب کی تھی۔ زندہ موجودات کے تغذیے کا تمام تر دارومدار سورج پر ہے۔

مصنف نے سورج کے بارے میں بڑا دلچسپ مواد تحقیق جمع کر دیا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ زمین کے ایک ایک مربع گز قطعے کے حصے میں سورج کی عطا کردہ طاقت ڈیڑھ ہارس پاور آتی ہے۔ یہی طاقت اگر مصنوعی ہوتی تو ڈیڑھ سنٹ فی کیلوواٹ آور کے حساب سے (اور یہ بڑی طاقت بڑے پیمانے پر استعمال ہونے کی صورت میں یہی مروجہ نرخ ہے) نیویارک شہر کے لئے ۲۰۰۰۰۰۰۰۰ ڈالر خرچ ہوں گے۔ پوری زمین کے لئے ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ڈالر کا صرفہ اٹھے گا۔ صرف ریاستہائے متحدہ کو اتنی انرجی ہم پہنچانے کے لئے سالانہ بجٹ ۶۸۶۰۰۰۰۰۰۰۰ ڈالر کا ہوگا۔ (ایک خدا پرست یہ اندازہ کر کے اپنی روح کو اپنے خالق کے سامنے سجدۂ شکر میں ڈال دے گا جو اسے بے پایاں احسانات سے پل پل نواز رہا ہے) اور سورج کی سخاوت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ زمین کے حصے میں اس کی روشنی و حرارت کے دو ارب حصوں میں سے صرف ایک حصہ آتا ہے۔ بقیہ فضا کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتا ہے۔

سورج اور کائنات کے مستقبل کا اندازہ کرنے کا دارومدار اس حقیقت کو سمجھ لینے پر ہے کہ آخر نور و حرارت کا ماخذ کیا ہے۔ یہ خیال پرانا ہو چکا ہے کہ سورج لکڑی یا کوئلے کی طرح جل رہا ہے۔ اب رائے یہ ہے کہ نیوکلیائی کے ایٹمی عمل التہاب سے گزر رہا ہے۔ مختلف نظریات و قیاسات کا مصنف نے تذکرہ کیا ہے۔ انہی میں سے ایک قیاس یہ ہے کہ سورج کی چمک دمک کا راز مادہ کے انرجی میں تبدیل ہونے کے عمل میں مضمر ہے۔ مادہ کے انرجی میں بدلنے اور اسی طرح اس کی برعکس صورت کے واقع ہونے کے سلسلے میں سب سے پہلے سر اسحاق نیوٹن (۱۶۴۲-۱۷۲۷ء) نے اظہارِ رائے کیا تھا۔ بعد میں یہ قیاس ثابت ہو کر سائنٹفک حقیقت بن گیا۔

اب سنئے کہ علماء نے کیا کیا حساب جوڑ رکھے ہیں۔ حسابی اندازہ یہ ہے کہ مادہ کے انرجی میں بدلنے والے اصول کو لیا جائے تو ایک سیکنڈ میں سورج جتنی روشنی و حرارت خارج کرتا ہے اس کے لئے ۴۲ لاکھ ٹن مادہ کی ضرورت ہے۔ اور سورج کی جسامت اور اس کے ٹھوس پن کو سامنے رکھ کر سائنس دان بتاتے ہیں کہ اس کی رفتار سے مادہ کے صرف کے باوجود ۱۵ ارب سال میں سورج کے مادہ کے ذخیرے میں کل ۱/۱۰ فیصدی کمی واقع ہوگی۔ یہ مادہ ہائیڈروجن کی صورت میں کام آ رہا ہے۔

جارج گیماؤ (GEORGE GAMOW) کا دعویٰ ہے کہ ہائیڈروجن کے ایندھن کی یہ آتشبازی ٹھنڈی پڑنے کی بجائے برابر گرم تر ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں موصوف نے سورج کے جلنے کے عمل کا تفصیلی سائنٹفک تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ یہ آہستہ آہستہ سو گنا شدید ہو جانے کا امر

دوران میں سورج کا حجم پہلے کچھ بڑھے گا، اور پھر دھیرے دھیرے کم ہونے لگے گا۔ سابق نظریہ یہ تھا کہ زندگی سورج کے ٹھنڈا ہو جانے کی وجہ سے ایک برفانی دور کی نذر ہو گی، لیکن نیا نظریہ یہ ہے کہ وہ طوفانِ حرارت کی لپیٹ میں آکر ختم ہو گی۔

ایسے عالم میں زندگی کے تین امکانات ہوں گے:

—— ایک یہ کہ آدمی چوہوں کی طرح زمین میں بل بنائے گا اور سطح کے نیچے شہر بسائے گا اور ایک نئی زیرِ زمین تہذیب کی نیو ڈالے گا۔ نہ آسمان ہو گا، نہ تارے دیکھے جائیں گے، نہ دوسرے مناظرِ فطرت سے لذت اندوزی ممکن رہے گی۔

—— دوسرا یہ کہ زمین کو الوداع کہہ کر کسی دوسری جگہ نو آبادکاری کی جائے۔ خصوصاً نپچون (NEPTUNE) جو نظامِ شمسی کا بعید ترین سیارہ ہے سورج کے گرم تر ہو جانے کی وجہ سے نو آبادکاروں کے لئے جنت بن چکے گا۔

—— تیسرا یہ کہ سورج کی حرارت میں چونکہ اضافہ ہلکی تدریج سے ہو گا اس لئے حیاتی موجودات میں اصولِ ارتقاء کے مطابق آہستہ آہستہ مدافعتی تبدیلیاں ہو جائیں گی۔ آدمی کی کھال نہایت سنگین ہو سکتی ہے —— اور کیا بعید کہ کچھوے کی طرح اس کا جسم بھی خول بند ہو جائے۔

لیکن اگر حیاتِ ارضی کا اساسی کیمیاوی نظام آنے والے تغیرات کے مطابق پوری طرح تبدیل نہ ہو سکا تو پھر انسان کی بقا ناقابلِ تصور ہے۔ ممکن ہے کہ حقیر ترین ذی وجود باقی رہ جائیں اور بس وہی سورج کا انجام دیکھنے والے ہوں گے۔

پروفیسر مذکور کہتا ہے کہ ایک بار بھڑکنے کے بعد سورج انحطاط سے گزرتے ہوئے کہیں ۵ لاکھ برس میں اپنی موجودہ حالت تک پسپا ہو جائے گا، آخرکار نور، حرارت اور قوت کے مخزن کی حیثیت سے اس کی کامل موت واقع ہو جائے گی۔

آج ایسے تارے موجود ہیں جن کو موت کے آخری لمحوں میں ہچکیاں لیتے ہوئے دوربینی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔

سورج کا یہ انجام اگرچہ سائنس کا ایک بہت ہی دور کا خواب ہے، لیکن یہ قطعی ہے کہ سورج اور دوسرے تاروں کو ایک نہ ایک دن اپنی موت سے دوچار ہونا ہے۔ کوک بھری ہوئی گھڑیوں کی طرح کوک بھرے ہوئے سورج اور تارے بھی کسی نہ کسی لمحے کام کرنے سے جواب دے دیں گے۔

سورج جب بھی اس انجام سے دوچار ہوا تو سمندر یخ بستہ ہو جائیں گے، پانی کا بہاؤ قطعی طور پر رک جائے گا، زمین کا وجود صرف تاروں کی دھندلی روشنی میں محسوس ہو گا۔ اگر اس وقت تک انسان موجود رہا تو پھر یا تو اسے زیرِ زمین نئی زندگی شروع کرنی ہو گی، یا سورج کے قریب تر سیاروں کی طرف مرحلہ بہ مرحلہ اڑتے چلے جانا ہو گا۔ لیکن جب سورج کا چراغ بالکل گل ہو جائے تو پھر کسی دوسرے نظامِ شمسی کی طرف بھاگنے کی راہ نکالنے کے سوا اور کوئی صورتِ حیات قابلِ تصور نہیں ہو سکتی۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ نئے تاروں کا سلسلۂ تخلیق برابر جاری ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ کل کلاں کوئی نیا منبعِ نور و حرارت یکایک اسٹیج پر آ جائے۔

اور ایک راستہ مصنف اور بھی بتاتا ہے۔ وہ یہ کہ شاید نوعِ انسانی اپنے لئے خود ایک سورج تیار کرنے کا اہتمام کرے۔

ان سب قیاسات کے باوجود یہ حقیقت بہرحال بڑی خوفناک ہے کہ ایک دن سورج بجھ جائے گا۔

(باقی۔ آئندہ)



شاذ عارفی

شکرِ فیضانِ سخن سے کام لوں	رحمتِ باری کا دامن تھام لوں
جام لوں ساقی سے یا انجام لوں	سوچتا ہوں، کفر لوں اسلام لوں
آنکھ سے اوجھل نہ تھی راہِ صواب	جھوٹ کا اک اور کیوں الزام لوں
جس قدر پیتا میں ساری عمر میں	ساقیٔ کوثر سے اتنے جام لوں
دی گئی تھی عقل اس وعدے کے ساتھ	التباسِ نیک و بد میں کام لوں
بات جا نکلی سوئے قول و عمل	شیخ صاحب کا عمامہ تھام لوں
کفر سے زائد یہ کہنا کفر ہے	آج کس مُنہ سے خدا کا نام لوں
یہ مری کج سیرتی ہو گی اگر	آگہی سے نا مناسب کام لوں
یہ حقیقت کے منافی ہے کہ میں	ماسواء کی چھاؤں میں آرام لوں
ان مناظر، ان مظاہر کی قسم	میں جہاں جا ہوں وہاں پیغام لوں

حرف ساری قوم پر آتا ہے شاذ
[illegible] کسی کا نام لوں

[illegible]

☆
انور صدیقی

نگار خانۂ ایّام تک چلیں ہم بھی
کہو تو انجمنِ شام تک چلیں ہم بھی

رہِ حبیب سے ملتی ہے شاہراہِ حیات
اسی سے سلسلۂ عام تک چلیں ہم بھی

دراز دستیٔ گلچیں اگر ہے رازِ ہنوز
تو آؤ نکہتِ بدنام تک چلیں ہم بھی

ہے کتنی تلخ و فسردہ خزاں کی آزادی
بہار آئی چلو دام تک چلیں ہم بھی

سنا ہے وادیٔ غم میکدہ بنی انورؔ
طلوع ہوتے ہوئے جام تک چلیں ہم بھی

کوثر نیازی

قتیلِ عشق، فدائے ہوس بھی ہوتا ہے
خبر نہیں تھی کہ طوفان خس بھی ہوتا ہے

یہ بات کیا ہے کہ فصلِ بہار کے ہوتے
مجھے چمن پہ گمانِ قفس بھی ہوتا ہے

خودی کی موت کو انسان کی موت کہتے ہیں
اگرچہ جسم میں تارِ نفس بھی ہوتا ہے

میں جب یہ کہتا ہوں دنیا تہس نہس ہو جائے
تو اس میں اہلِ جہاں پر ترس بھی ہوتا ہے

کچھ آج کل کے تقدس سے ڈر بھی لازم ہے
کہ یہ برائے ہوا و ہوس بھی ہوتا ہے

میں کیا کروں کہ طبیعت ادھر نہیں آتی،
شراب و شعر میں مانا کہ رس بھی ہوتا ہے

جو روحِ شاعرِ حساس سے اٹھے کوثر
وہ ایک نغمۂ صد نے جرس بھی ہوتا ہے

عبداللہ خاور

●

سحر ہوئی تو، مگر کاش یوں سحر ہوتی
کہ ہم شکستہ دلوں کو بھی کچھ خبر ہوتی!

کچھ اپنی بے خبری کام آ گئی — ورنہ
حریفِ جلوہ، نہ محویتِ نظر — ہوتی!

مذاقِ سہل پسندی ہوئے چلا، تو چلے"
کہاں ہم، اور کہاں ان کی رہ گزر ہوتی!

یہ زندگانی، مئے حادثات پی پی کر،
سنبھل سنبھل سی گئی، ورنہ کیا خبر ہوتی!

کہیں تو جا کے تمنا، نگاہ بن جاتی،
جو بزمِ ناز نہ ہوتی — تو رہگزر ہوتی!

ادائے نیم نگاہی سے تھا گریز محال —
ہوائے شوق نہ بنتی — تو دردِ سر ہوتی!

خراشِ روئے تمنا پہ آ گئی — خاور
نمو جو پاتی — تو ان سے جمیل تر ہوتی!

جمیل ملک

●

ایک دلسوز سماں دیکھا ہے
بزمِ ہستی میں جہاں دیکھا ہے

حسن، پابندِ سلاسل پایا
عشق، مجبورِ فغاں دیکھا ہے

شہرِ مہتاب سے بزمِ گل تک
اڑتا اڑتا سا دھواں دیکھا ہے

چند معصوم تمناؤں کو —!
حاصلِ عمرِ رواں دیکھا ہے

سینۂ حسنِ گل و لالہ پر،
منظرِ رقصِ خزاں دیکھا ہے

نغمہ و رنگ کی رعنائی میں
ایک اندازِ فغاں دیکھا ہے

نادر



اسرار احمد سہاوری

آج نادر کی مسلسل تڑپ [illegible] زندگی کا خاتمہ ہو رہا ہے آج اسے اپنی زندگی کا ایک ایک سنگین واقعہ یاد آ رہا ہے۔ اس [illegible] کے واقعات کی یاد موت کے قریب کا یقین ہوتے ہی نہ معلوم کیوں ذہن انسانی پہ ہجوم کر آتے ہیں۔ جن حادثات کی یاد کو مسلسل تحت الشعور میں دبائے رکھا [illegible] موت کی آمد کا احساس ہوتے ہی وہ سب کے سب [illegible] اس کی نظروں کے سامنے مہیب اور خوفناک بھوتوں کی طرح ناچنے لگتے ہیں۔ پھانسی کا [illegible] ہوا ہے [illegible] صرف جلاد کی آمد کی دیر ہے۔ بہت سے لوگ تماشا دیکھنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ اس غیر معمولی مجرم کو [illegible] جا رہی ہے تاکہ دوسرے لوگ کچھ عبرت حاصل کریں اور اپنی آئندہ زندگی میں احتیاط برتیں۔ نادر گردن جھکائے اپنی گزشتہ زندگی [illegible] یادوں میں غافل ہے اسے اس وقت نہ لوگوں کی تیز تیز نگاہیں ستا رہی ہیں اور نہ پھانسی کا خوفناک پھندا ڈرا رہا ہے بلکہ اس وقت اس [illegible] زندگی بھر کا سب سے بڑا دشمن یعنی اس کا ضمیر [illegible] اس پہ غالب آگیا ہے اور اس کی زندگی بھر کی ایک ایک بدکاری کو اس کے سامنے لا رہا ہے۔

نادر ایک غریب بیوہ کا اکلوتا بیٹا تھا [illegible] کی ماں جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی [illegible] اپنی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنا کر زندگی گزارتی رہی اور اس کو پال پوس [illegible] دوسروں کی خدمت کرتی اور نادر کو تعلیم دلاتی۔ شوہر کے مرنے کے کچھ عرصے کے بعد لوگ بہت پیچھے پڑتے رہے لیکن باوجود جوان العمر اور غیر معمولی طور پہ حسین ہونے کے اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ ایک تو مرحوم شوہر کی محبت اور اس کی یاد [illegible] ہوئی دوسرے نادر [illegible] دامن پکڑا۔ اور دوسری شادی کے خیال کو دل میں جگہ پانے کی اجازت نہ مل سکی۔ اس نے اپنی ساری توجہ نادر کی پرورش اور تربیت پر صرف کر دی۔ نادر بھی بلا کا ذہین نکلا اور تعلیم کے سلسلے میں دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ گیا لیکن باپ کا سایہ سر پہ نہ ہونے کی [illegible] سے خود سر اور بداطوار ہو گیا۔ بہت سی بری باتیں اختیار کر لیں۔ بری صحبت سے کوئی سختی کے ساتھ روکنے والا [illegible] تھا اس لئے برے دوستوں کی صحبت نے جوا۔ شراب نوشی بدکاری سب کچھ سکھا دیا۔ ماں دیکھ دیکھ کر بہت کڑھتی۔ بہت [illegible] واویلا کرتی۔ لیکن نادر اب اس کے قابو کا نہ تھا۔ اس کو بھی آنکھیں دکھاتا اور اکثر بدزبانی کر ڈالتا۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک آدھ مرتبہ شراب کے نشے میں اس کو مارا پیٹا بھی تھا۔

نادر نے شروع [illegible] ایک معمولی سی سرکاری ملازمت کر لی تھی۔ لیکن اپنی عیاری ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے بہت جلد ترقی کر کے ایک اچھے عہدے پہ پہنچ گیا۔ خوب کھاتا اور افسروں کو کھلاتا اس وجہ سے اعلیٰ افسروں کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ جو چاہتا کرتا کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ ماتحتوں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا سوائے ان بدبختوں کے جو اس کو رشوت دیتے یا دلاتے یا پھر ان لوگوں پہ خاص طور سے مہربانی کرتا جو اس کی عیاشانہ خواہشات کی تکمیل کے لئے اپنے ناموس کو قربان کر دیتے۔ ایسے لوگ خوش ہوتے تھے کہ انہوں نے بڑا اچھا اور منفعت بخش سودا کیا ہے یعنی انہیں کچھ نہ دینا پڑا اور ان کو سب کچھ مل گیا گویا ننگ و ناموس کی ان کے نزدیک

کوئی قیمت ہی نہ تھی۔ وہ ملازمت میں ترقی۔ یا صاحب کی خوشنودی کو اس سے کہیں زیادہ گراں مایہ تصور کرتے تھے یہ طرزِ فکر و مائل ہمیں زندگی کے مادی تصور کی بالا دستی نے عطا فرمایا ہے۔ زندگی کو اس زاویۂ نظر سے دیکھنے والے عفت و ناموس کی قیمت چند ٹکوں سے زیادہ نہیں سمجھتے ہیں۔ اس جنسِ گرانمایہ کی ارزانی کا آج یہ عالم ہے کہ رات کا دیڑھ چند میل سیر کرانے یا سینما کا ایک شو دکھانے کے عوض قربان کر دیا جاتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ عوض کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی " اللہ اللہ زندگی کی قدروں میں کیسا انقلاب آگیا ہے۔ وہ غریب ماتحت ملازمین جو اس قسم کی بے غیرتی کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ دن رات برا بھلا سنتے سختی برداشت کرتے۔ اور جرمانے بھرتے۔ ان بیچاروں پر یہ بزعمِ خود کامیاب و کامران لوگ ہنستے اور اکثر ہمدردی کے طور پر ان کو بھی یہ سبق پڑھاتے کہ کیوں بیوقوف بنتے ہو جو ہم نے کیا ہے وہی تم بھی کرو اور صاحب کی ناک کا بال بن کر رہو لیکن ہر شخص کے حلق سے یہ زہر کی گولی کس طرح اتر سکتی تھی

انسان جب اپنے نفس کا شکار اور ہوس کا بندہ ہو جائے تو اس پر نیم دیوانگی سی طاری ہو جاتی ہے ایک ایک خواہش میں سے سینکڑوں دوسری تمنائیں نکل پڑتی ہیں۔ اور یہ خواہشات کا غلام ہر طرف دوڑ دوڑ کر نئی خواہش لیتا ہے چھوٹی سے چھوٹی آرزو کی تکمیل کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ پھر ایسی حالت میں تکمیلِ آرزو کے ذرائع و وسائل کے جائز و ناجائز ہونے کا خیال بھی دل میں نہیں آتا ہے۔ قوتِ برداشت اور صبر کی طاقت بالکل جواب دے جاتی ہے یا انتہائی مغلوب ہو جاتی ہے۔ جو آرزو پوری نہ ہو اس پر سخت صدمہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس قسم کا آدمی معمولی سے معمولی خواہش کے لئے جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔ انجام پر نظر رکھنے کی صلاحیت بالکل مفقود ہو کر رہ جاتی ہے۔ نادر کی بھی بالکل یہی کیفیت تھی۔ حالانکہ ہر چیز اسے مہیا تھی۔ دولت میں ہر وقت کھیلتا۔ لیکن اور زیادہ دولت سمیٹنے کی خواہش بے چین رکھتی اور نئی نئی ترکیبیں اس کے حصول کے لئے سوچتا رہتا

نادر کو کافی سن رسیدہ ہو چکا تھا لیکن اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ شادی کو عیاشی میں خلل ڈالنے والی چیز سمجھتا تھا۔ اسی لئے اس نے بہت اچھے اچھے مواقع حاصل ہونے کے باوجود اس طرف کبھی رغبت نہ کی۔ لیکن جمیلہ کے حسن و جمال نے اس کو خلافِ توقع اور غیر معمولی انداز میں متاثر کیا۔ اور اس کو دیکھتے ہی اس پر قبضہ کر لینے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہو گئی۔ جمیلہ کا شوہر عزیز ایک بیمہ کمپنی کا ایجنٹ تھا۔ ان دونوں کی زندگی بڑی آسودگی اور خوش حالی سے گزر رہی تھی۔ لیکن ایکا یک نادر ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ ہوا یہ کہ عزیز نے جب نادر کی شہرت سنی تو اس کو خیال ہوا کہ کسی طرح اس کی زندگی کا اپنی کمپنی میں بیمہ کرا دیا جائے۔ کافی بڑی پالیسی کا معاملہ ہو جانے کا امکان تھا۔ اس لئے اس کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ اس کے مشاغل اور دلچسپیوں کا پتہ لگایا لوگوں نے بتایا کہ اس کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے۔ اس راستے سے اس پر کامیابی سے حملہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے ایجنٹوں کی مثالیں بھی پیش کی گئیں جنھوں نے اس ذریعہ سے بڑی بڑی پالیسی فروخت کی تھیں۔

عزیز اس میدان میں ابھی نیا نیا آیا تھا۔ کمپنی میں وقار حاصل کرنے کے لئے۔ اپنے اور بیوی کے بے پناہ مسرفانہ اخراجات پورے کرنے کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کو اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی اور اونچی سوسائٹی کی تربیت یافتہ ایسی خواتین و بیگمات سے ابھی تک تعارف حاصل نہ ہو سکا تھا جو کہ بڑی بڑی رقمیں حاصل کرنے کے لئے بیمہ کمپنی کے ایجنٹوں کا آلۂ کار بننے کے لئے آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اس لئے پھر پھرا کر اس کی نظر بیوی جمیلہ ہی پر پڑتی تھیں۔ لیکن جمیلہ کے ناراض ہو جانے کا خوف اور نادر کی حد سے زیادہ بدکرداری کے خیال سے اس کی زبان بندسی ہو جاتی۔

عزیزہ نے بہت سے دوسرے ذرائع سے نادر کو دام میں لانے کی کوشش کی لیکن وہ مرغِ زیرک تہِ دام نہ آیا۔ ادھر عزیزہ اور جمیلہ کے اخراجات دن رات بڑھتے چلے گئے۔ پالیسی حاصل کرنے کے لئے ان لوگوں کو اونچی سے اونچی صحبتوں میں جانا پڑا اور اس وجہ سے ہمیشہ اپنی بساط سے زیادہ خرچ کر کر کے زیر بار ہوتے چلے گئے۔ قیمتی لباس کی ضرورت ہوتی۔ لوگوں کی دعوتیں کرنا پڑتیں۔ پھر اونچی صحبتوں میں شراب چکھنا پڑی اور آہستہ آہستہ اس کی عادت پڑ گئی۔ لوگوں کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے جوا کھیلنا پڑا۔ کرتے کرتے دونوں اس کے بھی عادی ہو گئے۔ غرض کہ خرچ کی زیادتی اور آمدنی کی قلت کی وجہ سے دونوں ہر وقت پریشان رہنے لگے۔ آخر تنگ آکر ایک دن عزیزہ نے جمیلہ سے نادر کی پالیسی کا ذکر کر ہی دیا۔ اسی سلسلے میں نادر کو رام کرنے کا ذکر بھی آگیا تو اس نے اشارتاً جمیلہ کے غیر معمولی حسن۔ خوش کلامی اور دوسری خوبیوں کا بھی نہایت خوشامدانہ طریقے سے ذکر چھیڑ دیا۔

پہلے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کہ جمیلہ کو کسی زہریلے بچھو نے ڈس لیا۔ لیکن فوراً اس کی اپنی سیکڑوں خواہشات آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ ان خواہشات کے مطالبات دن رات شدید تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی پیدا کردہ تشنگی سے حلق سوکھ رہا تھا۔ زبان میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ زندگی میں ایک وسیع قسم کا خلا محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر عزیزہ کی پریشانیوں کا بھی خیال آیا۔ کچھ مستقبل کی درخشانی کی امیدوں نے دستگیری کی۔ نادر کی بے پناہ دولت اور اس کی شاہ خرچی دامنگیر ہوئی۔ غرض کہ عزیزہ کی اس تجویز میں بڑی جاذبیتیں پیدا ہو گئیں اور ان کی کرشمہ سازیوں نے دامن دل کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا اور آخر وہ عزیزہ کا کہنا ماننے پر آمادہ ہو گئی۔

نادر کو عزیزہ اور اس کی خوبصورت بیوی کے متعلق اس کے جاسوسوں نے پوری پوری خبریں پہنچا دی تھیں۔ لیکن عجیب و غریب جب پہلی مرتبہ نادر سے ملنے گیا اور پالیسی کا ذکر کیا تو اس نے دانستہ بے نیازی بلکہ سرد مہری کا رویہ اختیار کیا اور عزیزہ کو زیادہ منہ نہ لگایا۔ جب عزیزہ ناکام واپس جانے لگا تو نادر کے آدمیوں نے جو کہ راستے میں جگہ جگہ پہلے سے لگے ہوئے تھے اس کو روک روک کر تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا کہ پالیسی کے متعلق کیا ہوا اور عزیزہ کی ناکامی کا حال سن کر ہمدردانہ مشورہ دیا کہ کسی دن صاحب کی اپنے مکان پر دعوت کر دیں۔ بیگم صاحبہ سے کچھ بڑھیا قسم کی چیزیں تیار کرائیں۔ آپ کی بیگم یوں بھی ہر صفت موصوف ہیں۔ مہمان نوازی میں بھی پوری دسترس رکھتی ہوں گی۔ دو باتیں کریں گی تو صاحب پانی ہو جائے گا۔ صاحب کے ایک دلال نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آپ تو ہمارے صاحب کی عادت اچھی طرح جانتے ہیں پھر پالیسی کے سلسلے میں تنہا بیکار آتے۔ ہمارا صاحب ایسے لوگوں سے تو بہت چڑتا ہے جو دقیانوسی لوگوں کی طرح ہر جگہ تنہا جائیں اور بیگمات کو ڈبیوں میں بند کر کے رکھیں۔ آپ کی بیگم تو یوں بھی پردہ نہیں کرتیں پھر تنہا آنے کے کیا معنی۔ مختصر یہ کہ عزیزہ کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح جما دی گئی کہ بغیر بیگم کے توسل کے کسی طرح کام نہیں بن سکتا۔ یوں تو عزیزہ بھی ان تمام باتوں کو پہلے سے ہی اچھی طرح سمجھتا تھا لیکن پہلی ملاقات میں جمیلہ کو ساتھ لانے کی اس کی کچھ ہمت نہیں پڑی۔ گھر پہنچ کر جمیلہ کو تمام قصہ تفصیل سے سنایا۔ جمیلہ تھوڑی دیر تک تو سوچ میں پڑی رہی آخر سر اٹھا کر بولی کہ اس سلسلے میں ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے کہ عنقریب تمہاری سالگرہ منائی جائے اور اس بہانے سے نادر کو بھی مدعو کر دیا جائے۔ پھر میں سب انتظام کر لوں گی۔ کامیابی یقینی ہے۔ یہ سنتے ہی عزیزہ کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہو گئی اور فوراً دعوت کے لئے قریب کی ایک تاریخ مقرر کر دی گئی۔ عزیزہ نے نادر کے ایک دلال کے ذریعہ دعوت نامہ بھیج کر اس کو دعوت منظور کرنے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ عزیزہ کے جشنِ سالگرہ پر اور کو بڑی پُرتکلف اور شاندار دعوت دی گئی۔ اکثر چیزیں جمیلہ نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیں۔ شراب کا خاص طور پر انتظام کیا گیا۔ جمیلہ اپنے پورے بناؤ سنگھار کے ساتھ محفل میں آئیں۔ نادر شراب کے سرور میں تھا جمیلہ کے کافر حسن کو دیکھ کر

دیوانہ ہوگیا۔ اور ترنگ میں آکر خود ہی پالیسی کی بات چھیڑ دی۔ جمیلہ کو اپنے گھر آنے کی دعوت پیش کی جس کو انتہائی شکر گزاری کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔ جمیلہ دو چار منٹ میں ہی نادر سے خوب بے تکلف ہوگئی اس کی کامیابی نے اس کی ہمت کو بہت بلند کر دیا تھا۔ نادر اسی محفل میں پچاس ہزار کی پالیسی کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

عزیز اور جمیلہ نادر کی کوٹھی پر گئے تو نادر بالکل بدلا ہوا آدمی نظر آیا۔ کہاں تو پہلی ملاقات میں عزیز سے بات بھی نہ کی تھی اور کہاں اس دفعہ اس کی آمد پر آنکھیں فرشِ راہ کر دیں۔ بلیٹ بلیٹ پڑ بچھا جاتا تھا۔ ادھر جمیلہ بھی خوب ہشیاری سے اداکاری کرتی رہی۔ دعوت کے بعد سینما جانے کا پروگرام بنا اور تینوں مل کر فلم دیکھنے چلے گئے۔ اس دن کافی رات گزرنے کے بعد عزیز اور جمیلہ اپنے گھر پہنچے۔ عزیز پوری طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ نادر نے پچاس ہزار کی پالیسی خرید لی۔ لیکن عزیز کو یہ سودا بڑا مہنگا پڑا۔ اس لئے کہ جمیلہ اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ نادر کی والہانہ قدردانی اور دولت کی فراوانی نے اس کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ مگر دولت، سیم و زر کے طوفان اور قدر افزائی کے عظیم سیلاب کا مقابلہ نہ کر سکی۔ حوصلہ شکن موجیں اس کو ایک تنکے کی طرح بہا کر لے گئیں۔ عزیز جمیلہ کو چھوڑ دینے پر آمادہ نہ ہوسکا۔ نادر نے بہت کچھ دھمکایا۔ بہت سے لالچ دیئے۔ بڑی خوشامد کی لیکن عزیز اس بات پر کسی طرح آمادہ نہ ہوا کہ جمیلہ کو قانونی طور پر نادر کے حوالے کر دے۔ آخر جمیلہ کے مشورے سے اس کو ایک آہستہ آہستہ اثر کرنے والا زہر دے دیا گیا۔ عزیز کو یہ محسوس بھی نہیں ہوا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ وہ غریب یہی سمجھتا رہا کہ کسی مہلک مرض کا قدرتی طور پر شکار ہوگیا ہے۔

عزیز کے مرنے کے کچھ دن بعد نادر نے باقاعدہ جمیلہ سے شادی کر لی۔ شادی کے دن ایک بہترین قسم کی کار جمیلہ کو تحفہ میں دی۔ اس دن جمیلہ خوشی سے جامے میں نہ سماتی تھی۔ وہ خود کو ایک کامیاب ترین عورت اور انتہائی خوش قسمت انسان خیال کر رہی تھی۔ انسان اپنے مستقبل سے کس قدر بے خبر ہوتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ کامیابی ہی اس کے لئے ناکامی اور خوش قسمتی ہی اس کی بدبختی کا سبب بن جائے گی۔ ایک دن جمیلہ اپنی نئی کار میں سینما دیکھنے گئی۔ راستہ میں ایک ٹرک سے اس کی سخت ٹکر ہوگئی اور کار کافی خراب ہوگئی۔ گھر واپس آئی تو تمام ماجرا نادر کو سنایا۔ نادر نے کہا کہ غم نہ کرو۔ کار بیمہ شدہ ہے۔ جو کچھ مرمت پر صرف ہوگا بیمہ کمپنی ادا کرے گی۔ جمیلہ کچھ دیر سوچ کر بڑی خوشی سے بولی کہ اس سے بہتر تو یہ ہوگا کہ ہم خود ہی کسی ترکیب سے اس میں آگ لگوا دیں اور کمپنی سے پوری رقم وصول کریں مرمت ہو کر بھی کار نئی کی مانند تو نہیں ہوسکتی خرابی تو بہرحال باقی ہی رہے گی کمپنی کے پاس کیا ثبوت ہوگا کہ ہم نے کار کو خود آگ لگائی ہے۔ نادر کو یہ مشورہ بہت پسند آیا اور ہنس کر بولا۔ کیوں نہ ہو آخر ایک بیمہ ایجنٹ کی بیگم رہ چکی ہو۔ ایسی ترکیبیں تمہیں نہ سوجھیں گی تو کسے سوجھیں گی۔ کیا دور کی کوڑی لائی ہو۔ نادر نے دوسرے ہی دن ترکیب سے کار میں آگ لگوا دی اور بیمہ کمپنی سے پوری قیمت وصول کر لی لیکن ہماری زندگی کے معاملات بھی کیسے عجیب ہیں۔ یہ مشورہ ہی جمیلہ کے لئے جان لیوا بن گیا۔

عیاش انسان وفادار نہیں ہوتا۔ وہ کسی کے ساتھ زیادہ عرصے تک نباہ نہیں کر سکتا۔ تبدیلی کے لئے ہر شخص کا دل چاہتا ہے لیکن ایک معقول اور انصاف پسند آدمی بعض معاشرتی مصلحتوں کی بنا پر اپنی بعض خواہشات کو خود ہی ختم کر دیتا ہے۔ اسی کو ضبطِ نفس کہتے ہیں۔ ہماری زندگی کا ڈھانچہ بنیادی طور پر اس قسم کا نہیں ہے کہ ہر شخص کی تمام آرزوئیں پوری ہو جائیں۔ ہر شخص کو اپنی کچھ نہ کچھ تمنائیں زیادہ اہم معاملات کی خاطر قربان کرنی پڑتی ہیں اور ہمیں اس قسم کی قربانی کی زیادہ سے زیادہ عادت ڈالنی چاہئے بغیر اس قربانی کے ہماری معاشرتی زندگی میں توازن پیدا نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایک عیاش آدمی کے اعصاب بہت کمزور ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی ناکامی کا ہمت سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اپنی قدرتی مخالفت کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی آرزو کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی مزاجی کیفیت بالکل ایک نادان اور ضدی بچے کی طرح

ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی ضد پر اڑ جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ اس کی ضد کو پورا کرنے کے ذرائع و وسائل بھی موجود ہیں یا نہیں ۔

چنانچہ نادر بھی جمیلہ سے جلدی ہی اکتا گیا ۔ دراصل جمیلہ نے بھی ایک بڑی غلطی یہ کی کہ نادر کو خالصتاً اپنا ہی بنا کر رکھنا چاہا ۔ اس کی ہر چھوٹی
لغزش پر گرفت کرنے لگی ۔ بھلا نادر ایک آوارہ مزاج آدمی اس قسم کی پابندیوں کو کہاں برداشت کر سکتا تھا ۔ دنیا میں خوبصورت اور سہل الحصول
عورتوں کی کمی نہ تھی پھر وہ کیوں جمیلہ کی ضرورت سے زیادہ ناز برداری کرتا ۔ نتیجہ کے طور پر دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے گرہ
سی پڑ گئی ۔ اور خصوصاً نادر جمیلہ سے کسی طرح چھٹکارہ حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا ۔

ایک دن جمیلہ کی اس کار کا ذکر آگیا جس کو ان لوگوں نے خود جلا دیا تھا اور اس کی قیمت بیمہ کمپنی سے وصول کر لی تھی ۔ اس کا ذکر آتے
ہی یکایک نادر کی آنکھوں میں شیطانی چمک پیدا ہو گئی اور وہ بالکل بے معنی اور بے محل طور پر مسکرا دیا ۔ جمیلہ نے نادر کی آنکھوں میں یہ شیطانی ناچ
دیکھ لیا اور سہم سی گئی لیکن پھر سنبھل گئی اور وہم سمجھ کر اس خیال کو دل سے نکال دیا ۔ آج وہ سمجھ نہ پائی کہ نادر نے کا بیمہ کرایا تھا چنانچہ شادی ہوتے ہی اس
نے جمیلہ کی زندگی کا بھی پچاس ہزار کا بیمہ کرا لیا تھا ۔ نادر نے اسی وقت ایک نئی ترکیب سوچ لی جس سے جمیلہ سے بھی عمر بھر کے لئے نجات
مل جائے اور پچاس ہزار روپیہ بھی ہاتھ آ جائے ۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے اپنے ایک انتہائی معتمد آدمی کے ذریعے ایک معمولی قسم کا گھروں
میں رہنے والا سانپ ایک سپیرے سے پکڑوا لیا اور اس کو بڑی احتیاط سے ایک ٹوکری میں بند کر کے رکھ لیا ایک دن موقع پا کر آدھی رات
کو جب کہ جمیلہ بے خبر سو رہی تھی اس سانپ کو اس کے بستر میں چھوڑ دیا ۔ اور پیچھے سے اپنے بستر میں جا کر لیٹ گیا ۔ سانپ نے جمیلہ کو ڈس
لیا ۔ جمیلہ چیختی ہوئی اٹھی تو نادر بھی بستر میں سے اٹھ آیا ۔ جمیلہ نے اپنی آنکھوں سے سانپ کو بستر سے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا ۔ اسی دوران
میں تمام ملازمین موقع پر پہنچ گئے اور سانپ کو گھیر کر مار لیا ۔ اس طرح کسی کو شبہ بھی نہ ہوا کہ نادر نے جمیلہ کو قتل کیا ہے ۔ بلکہ ہر شخص نے یہی خیال
کیا کہ سانپ اتفاق سے جمیلہ کے بستر پر پہنچ گیا اور اس نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ۔

اس طرح نادر کو روپیہ حاصل کرنے کا بڑا اچھا نسخہ ہاتھ آ گیا ۔ اور اس نے جمیلہ کے مرنے کے کچھ دنوں کے بعد ہی ایک نہایت
اعلیٰ اور دولتمند خاندان میں دوسری شادی کر لی گو سسرال سے توقع سے زیادہ سامان اور دولت ملی لیکن نادر اب دولت کے عشق میں اندھا
ہو چکا تھا ۔ اس کی ہوس زر اب قارون کا خزانہ بھی مطمئن نہیں کر سکتا تھا ۔ اس نے اس بیوی کی زندگی کا ایک لاکھ روپیہ کا بیمہ کرایا اور اس کے
ساتھ ساتھ نئی ترکیب سے اس کی جان لینے کی تدبیریں سوچنے لگا ۔ آخر ایک دن ایک تدبیر سمجھ میں آ ہی گئی ۔

ایک دن شام کو وہ اپنی بیوی کو سیر کرانے کے بہانے سے شہر سے باہر نہر کے کنارے لے گیا ۔ اور دونوں پل کی فصیل پر پیر لٹکا کر بیٹھ
گئے ۔ کافی اندھیرا ہو چکا تھا ۔ کسان اپنے کھیتوں سے گھروں کو واپس جا چکے تھے ۔ مسافر بھی بہت کم گزر رہے تھے ۔ چاروں طرف فضا میں خاموشی
چھائی ہوئی تھی ، نہر کا پانی آہستہ آہستہ بڑی بے نیازی سے بہہ رہا تھا ۔ نادر نہایت خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور پل کی فصیل پر کھڑے ہو کر چاروں
طرف نظر ڈالی اور نہایت اطمینان سے بیوی کو نہر میں دھکا دے دیا ۔ اس غریب نے پانی میں گرتے ہی غوطے کھانا شروع کر دیئے ۔ آخری مرتبہ پانی
پانی سے اوپر آئی تو ہلکی سی آواز سے چیخی اور دونوں ہاتھ بڑھا کر بڑی عاجزی سے اشارہ کیا کہ مجھے بچاؤ ۔ لیکن نادر کے ہونٹوں پر صرف ہلکا سا
ظالمانہ تبسم نمودار ہوا اور غائب ہو گیا ۔ نہر کے پانی میں بھی اس جگہ جہاں اس کی بیوی ڈوبی تھی چند بلبلے پیدا ہوئے اور غائب ہو گئے ۔ جب
نادر کو اطمینان ہو گیا کہ بیوی ڈوب کر مر گئی تو مدد کے لئے چیخنا شروع کیا اور جب دو چار آدمی ادھر ادھر سے جمع ہو گئے تو خود نہر میں کود پڑا ۔
اسے دیکھ کر دو ایک آدمی اور بھی نہر میں کود پڑے اور لاش کو تلاش کر کے نکال لیا ۔ پولیس میں نادر نے اپنا بیان لکھا دیا اور چار دوسرے

لوگ جو اس وقت مدد کو آئے تھے اپنا بیان لکھا کر چلے گئے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن بیمہ کمپنی والے اس واقعہ سے کھٹک گئے انہیں یقین ہو گیا کہ نادر کے دل میں بے ایمانی آ گئی ہے اور فریب دے کر روپیہ وصول کرتا ہے۔ انہوں نے پولیس کے اعلیٰ حکام سے بھی خفیہ طریقے سے شکایت کر دی تھی لیکن ثبوت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ نادر نے جلدی ہی ایک تیسری شادی کر ڈالی۔ تیسری بیوی کی زندگی کا بھی بیمہ کرا دیا۔ مجرم ہمیشہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ اس قدر استادی سے ارتکاب جرم کر رہا ہے کہ کوئی اس کی ترکیب کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ خود اعتمادی نہ ہو تو انسان غالباً سنگین جرائم کا بہت کم ارتکاب کرے۔ بہت کم حالات ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان یہ سمجھتے ہوئے جرم کرتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کے جرم کو سمجھ جائیں گے۔ یا وہ جرم کی سزا سے کسی طرح بچ ہی نہ سکے گا۔ نادر کا بھی بعینہٖ یہی حال تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کسی کو اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہے اور وہ ہر شخص کو نہایت کامیابی سے دھوکا دے رہا ہے اور آئندہ بھی اسی طرح دھوکے دیتا رہے گا۔ حالانکہ عام آدمی بھی سمجھ گئے تھے کہ نادر انسانیت سوز حرکتیں کر رہا ہے۔ لیکن دار و گیر اور مکافات کا وقت نہیں آیا تھا۔ اور واضح ثبوت بھی مہیا نہ ہو سکا تھا۔

بیمہ کمپنی والے سو فیصدی تمام معاملات کو صحیح طور پر سمجھ چکے تھے۔ کیوں کہ ان لوگوں کو اس قسم کے حالات سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ انہوں نے بڑی ترکیب سے اپنے ایک خاص آدمی کو نادر کے ذاتی خدمت گاروں میں ملازم کرا دیا اور اس کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ مستقبل کا کوئی ثبوت کسی طرح مہیا کرنا ہے۔ اس ملازم نے اپنی ہوشیاری سے نادر کا پورا پورا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اپنے ذاتی کام اور تمام نجی خدمات اسی سے لینے لگا۔ ادھر وہ شخص جو پہلے نادر کا معتمد بنا ہوا تھا اس کے اس رویے سے سخت تلملایا اور نشہ میں نادر سے انتقام لینے کی فکر کرنے لگا۔ آدمی کا ذہن اس قدر محدود ہے کہ وہ خرابی کے تمام پہلوؤں پر نہ تو دیکھ سکتا ہے نہ ایک ساتھ سب کو پرکھ سکتا ہے۔ نادر کو یہ احساس بھی نہ ہوا کہ وہ اپنے پرانے ملازم کو دیوانگی کی حد تک برہم کر چکا ہے۔ اس ملازم کے دل میں انتقام کا خیال آتے ہی کچھ ایسی کیفیت پیدا ہو گئی کہ اس کو جمیلہ اور نادر کی دوسری بیوی کا خون ناحق خود اپنا جرم نظر آنے لگا اور اس کے ضمیر نے اس کو سخت ملامت کرنا شروع کر دیا۔ ان دونوں مظلوم عورتوں پر جو مظالم ہوئے تھے وہ اس کو اپنے ہی کئے ہوئے مظالم نظر آنے لگے۔ اور وہ سخت بیقرار رہنے لگا۔ پھر اسے دن رات یہ خیال بھی ستانے لگا کہ اس تیسری بیوی کا بھی وہی حشر ہونے والا ہے جو کہ جمیلہ کا ہو چکا ہے اس لئے وہ اس کی جان بچانے کے لئے بھی بہت بے چین ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مختلف جذبات و احساسات نے اس کو مجبور کر دیا کہ وہ خفیہ طریقے سے نادر کی حرکات پولیس میں کر دے۔ جب پولیس والوں نے کہا کہ ہم بغیر کسی واضح ثبوت کے اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو اس نے جان پر کھیل کر نادر کی وہ ڈائری چرا لی جس کو وہ روزانہ بلا ناغہ سوتے وقت لکھا کرتا تھا اور اس کو بڑی حفاظت سے اپنی خاص میز کے خانے میں مقفل کر کے رکھتا تھا اور جس کا علم سوائے اس ملازم کے کسی اور کو نہ تھا۔ یہ ڈائری اس نے پولیس کے حوالے کر دی۔ ادھر نادر تیسری بیوی کی جان لینے کی بھی مکمل تیاریاں کر چکا تھا۔ اس نے یہ ترکیب سوچ لی تھی کہ ایک آتش گیر مادے کا چھوٹا سا بم بنا کر بیوی کی موٹر میں رکھ دے گا جس سے مقررہ وقت پر پٹرول کی ٹینکی میں آگ لگ جائے گی اور اس کی وجہ سے کار اور بیوی دونوں جل کر راکھ ہو جائیں گے اور اس طرح بیوی کی پالیسی کی رقم اور کار کی قیمت بھی انشورنس کمپنی سے وصول کی جا سکے گی۔ لیکن اب اس کا اپنا وقت آ چکا تھا اس لئے اس کو ارتکاب قتل سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا اور آج وہ اپنے تمام اعمال کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔

موج و حباب

سید رضوان بریلوی ایم اے

طلوعِ سحر ہے، وہ پھٹنے لگی پَو
وہ مدھم پڑی چاندنی رات کی ضو
لئے ہاتھ میں وقت کا پرچمِ نَو
نئے دور کا کارواں آ رہا ہے!

زمانے کے ہاتھوں میں پھر ساز دیتا
بلندی سے پستی کو آواز دیتا
خیالوں کو بازو کی پرواز دیتا
نئے دور کا کارواں آ رہا ہے!

زمیں تا فلک عام بیداریاں ہیں
نئی زندگانی کی تیاریاں ہیں
بہارِ طرب زا کی گل باریاں ہیں
نئے دور کا کارواں آ رہا ہے!

شاعر فتحپوری

زمانے کو خبر کیا، سازِ عشرت کی صداؤں میں
صدائے سازِ ایماں کتنی مدھم ہوتی جاتی ہے
اٹھا لائے تھے میخانے سے رندانِ ازل جس کو
وہی مٹی سنور کر ساغرِ جم ہوتی جاتی ہے
زمانے سے جفائے یار کے اسرار کیا کہئے
ہمارے عشق کی بنیاد محکم ہوتی جاتی ہے
مجھے فرصت نہیں دیتا مرا ذوقِ خطا کاری
مگر ان کی عنایت ہے کہ پیہم ہوتی جاتی ہے
زمانے پر اثر انداز ہے جامِ تہی میرا
قمر کا نور، تاروں کی ضیا کم ہوتی جاتی ہے
چمن کی صبح کے جلوے تو دلکش ہیں مگر تاہم
قیامت ہے، جدا پھولوں سے شبنم ہوتی جاتی ہے

محمد نعیم عارفی

بسے ہوئے ہیں خیالوں میں تلخ محسوسات
ہیں دل پہ نقش وہ گزرے ہوئے حسین لمحات
یہ زندگی کے حقائق! یہ تلخیٔ دوراں!
پھر اس پہ واعظ و ساقی کی کشمکش، ہیہات
قیودِ لازم و ملزوم میں رہیں کب تک
کجا وہ دامِ اسیری، کجا یہ راہِ نجات

عرفان غزالی

بس! عیش میں بدمست مسلمان کو عرفاں!
بسری ہوئی اجداد کی باتیں نہ سناؤ!
اس کے لئے بہتر ہے یہ سڑتا ہوا پانی
تالاب کی مچھلی کو سمندر نہ دکھاؤ!

ایمر رنجان

مرے غم سے جو مرے دوست کو حاصل ہو سکوں
عمر بھر میری دعا ہے کہ میں غمگین رہوں

شمع پروانے کی سنتی تو نہیں ہے، پھر بھی
آپ سن کر نہ بھڑک اٹھیں تو اِک بات کہوں!

جی رہا ہوں کہ خیال اس کی رضا کا ہے مجھے
ورنہ ہیں اور یہ اک زندگیٔ خوار و زبوں!

تھم کے پلکوں پہ مری کہتا ہے ہر قطرۂ اشک
ان کے ماتھے کا پسینہ بھی کبھی بن کے بہوں!

باغ میں تجھ کو سکوں ہے، نہ تو صحرا میں قرار
دلِ وحشت زدہ! آرام تجھے یوں ہے، نہ یوں!

ابنِ محمود

آنسو بہائیے، نہ تو نالہ اٹھائیے!
بس دل کے اضطراب کو دل میں دبائیے!

قیدِ قفس میں بھی گئی یادِ گلستاں
اچھا ہے اب قفس پہ بھی بجلی گرائیے!

مانا، بدل گئی ہے نظر وقت کی، مگر
دل کی لگی کو کس طرح دل سے بھلائیے

نواد ظہوری

جو باغِ جنوں میں نئے گل کھلے — بڑھے اور بھی شوق کے سلسلے
تمہاری نگاہوں میں تھا کیا اثر — ملے آرزو کو نئے حوصلے
کسی کا کرم ہے شریکِ جنوں — تو اب کس طرح چاک دامن سلے
ذرا چونکئے خوابِ خرگوش سے — جرس بج گئے، چل پڑے قافلے
کسی میں نہ تھا کار فرما خلوص — کئی ہم سفر تا بہ منزل ملے
بہاریں تو اب کے بھی آئیں مگر — نہ گل مسکرائے، نہ غنچے کھلے

قصۂ زلف و لب و رخسار کیا — دوستو! اب ذکرِ حسنِ یار کیا!
اور بھی کچھ ہیں تقاضے عشق کے — یہ طوافِ کوچۂ دلدار کیا!
آگ سی اک جل اٹھی کیوں ذہن میں — اس قدر بھی گرمیٔ افکار کیا!

جمیل ہاشمی

اے حسنِ ازل کے شیدائی! — مایوس نہ ہو، مایوس نہ ہو!
جلوؤں کی لطافت بکھرے گی! — جذبات کی رنگت بدلے گی
صیاد کی تحریروں پہ نہ جا — گل چیں کے فسانے مبہم ہیں!
لفظوں کے معانی بدلیں گے! — معنوں کی حقیقت بدلے گی!

جسم کیا، جان بیچ دیتا ہے — آبرو، آن بیچ دیتا ہے!
چند سکوں میں یہ خلیفۂ ارض! — دین و ایمان بیچ دیتا ہے!

نہیں بدلا ہنوز وہ ماحول — اب بھی باقی ہیں رہزنوں کے غول
شاعروں نے نظامِ کہنہ پر — ایک رنگین چڑھا دیا ہے خول

مسودۂ دستور پر تبصرہ

[جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی طرف سے مامور شدہ ایک خاص سب کمیٹی نے مسودۂ دستور پر تبصرہ کرتے ہوئے تمام اہم نکات نمایاں کر دئیے ہیں۔ یہ تبصرہ درج ذیل ہے۔]

۱۔ حصہ دوم (بنیادی حقوق) میں حسب ذیل امور سخت قابلِ اعتراض ہیں۔ دفعہ ۷ میں ایسے جابرانہ قوانین بنانے کی پوری گنجائش رکھی گئی ہے جو انتظامی حکومت کو یہ اختیار دیتے ہوں کہ وہ جس شخص کو چاہے مقدمہ چلائے بغیر اور صفائی کا موقع دیئے بغیر قید کر دے اور جب تک چاہے قید رکھے۔ تین مہینے تک کی نظر بندی کے لئے تو اس دفعہ کی رو سے کھلی اجازت ہے جس پر کسی داد فریاد کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں۔ رہی اس سے زیادہ مدت کی نظر بندی، تو اس پر صرف یہ پابندی عائد کی گئی ہے کہ جس شخص کو اس طرح نظر بند کیا جائے اس کا معاملہ ایک مجلس مشاورت کے سامنے پیش کیا جائے گا جو ایسے اشخاص پر مشتمل ہوگا جو ہائی کورٹ کے جج رہ چکے ہوں یا ہائی کورٹ کی ججی کے اہل ہوں۔ یہ مجلس اگر یہ رائے ظاہر کرے کہ اس شخص کو نظر بند رکھنے کے لئے کافی وجوہ موجود ہیں تو پھر حکومت جب تک چاہے اسے نظر بند رکھ سکتی ہے۔ مزید برآں اس دفعہ کی رو سے ایسا قانون بھی بنایا جا سکتا ہے کہ بعض خاص قسم کے لوگوں کو غیر محدود مدت تک نظر بند رکھنے کے لئے مجلس مشاورت سے رائے لینے کی ضرورت بھی نہ ہو۔ ہم افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ دفعہ ہندوستان کے دستور کی دفعہ ۲۲ سے بھی زیادہ ظالمانہ ہے۔ وہاں کم از کم یہ تو لازم کیا گیا ہے کہ جس شخص کو نظر بند کیا جائے اسے نظر بندی کی وجوہ بتائے جائیں اور مجلس مشاورت کے سامنے اس کا جواب بھی پیش ہو۔ مگر یہاں اسے یہ حق بھی نہیں دیا گیا حالانکہ ایک اسلامی ریاست کو غیر مسلم ریاست کی بہ نسبت زیادہ انصاف پسند ہونا چاہئے۔ ہمارے نزدیک کسی شخص کو اس کا قصور ثابت کئے بغیر اور اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر قید کر دینا ہرگز انصاف نہیں ہے اور حق یہ ہے کہ ہمارے دستور میں احتیاطی نظر بندی (PREVENTIVE DETENTION) کے لئے سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ تاہم اگر ارباب حکومت کو اس اختیار پر اصرار ہی ہو تو اسے اس شرط کے ساتھ مشروط ہونا چاہئے کہ جس شخص کو احتیاطی نظر بندی کے کسی قانون کے تحت گرفتار کیا گیا ہو اسے ۱۵ دن کے اندر عدالت کے سامنے پیش کیا جائے، اس پر ایک واضح فرد الزام عائد کی جائے، اسے صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دیا جائے، اور یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہو کہ آیا اسے نظر بند رکھنا مناسب ہے اور کتنی مدت کے لئے رکھنا چاہئے۔ ایک مجلس مشاورت خواہ وہ ہائی کورٹ کے ججوں ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو، اس بات کی ہرگز اہل نہیں ہے کہ ملزم کا بیان سنے بغیر محض پولیس کی رپورٹ پر اس کے خلاف الزامات کی تصدیق کر دے، اور محض اس کا تصدیق کر دینا اس بات کے لئے دلیل نہیں ہو سکتا کہ حکومت جب تک چاہے اسے محبوس رکھے۔

دفعہ ۸، ۹، ۱۰ اور ۱۱ میں ایک طرف اظہار خیال، اجتماع، انجمن سازی، نقل و حرکت اور ملکیت رکھنے کی آزادی دی گئی ہے اور دوسری طرف ایسے قوانین بنانے کی گنجائش بھی رکھ دی گئی ہے جن سے ان آزادیوں پر ہر طرح کی پابندیاں لگا دی جائیں۔ اس سلسلے میں یہ بات باعث حیرت و افسوس ہے کہ یہ چاروں دفعات ہندوستانی دستور کی دفعہ ۱۹ کے مقابلے میں بدتر ہیں۔ وہاں قانون کو ان آزادیوں پر صرف ایسی پابندیاں عائد کرنے کی اجازت دی گئی ہے جو "معقول" (REASONABLE) ہوں، اور یہاں "ہر پابندی" (ANY RESTRICTION) عائد کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔ اس سے جو فرق واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "معقول" کی شرط ایسے قوانین کے معاملے میں عدالتوں کو مداخلت کا موقع بہم پہنچا دیتی ہے اور وہ نامعقول پابندیوں کو ساقط کر سکتی ہیں۔ لیکن "ہر پابندی" کا اختیار عدالتوں کے ہاتھ باندھ دیتا ہے اور ایک وزارت

کے لئے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ اپنے مخالفوں کو دبانے کے لئے ان کی تحریر و تقریر، ان کے جلسوں، ان کی انجمنوں اور ان کی نقل و حرکت پر جیسی چاہے پابندیاں عائد کردے اور ان کی املاک کو ضبط کرنے کی جس طرح چاہے گنجائش پیدا کرلے۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ یہاں بھی ہندوستانی دستور کی طرح ہر پابندی کی بجائے "ہر معقول پابندی" کے الفاظ رکھے جائیں۔

۲۔ حصہ سوم (ریاست کی پالیسی کے رہنما اصول) میں حسب ذیل امور اصلاح طلب ہیں:

دفعہ ۲۵ میں ربوٰ کو بند کرنے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ سابق دستور ساز اسمبلی کے دستوری مسودے میں یہ موجود تھا۔ اسلامی نقطہ نظر سے ربوٰ کی حرمت شراب، جوئے اور زنا کی حرمت سے شدید تر ہے، حتیٰ کہ اس کے مرتکبین کو اللہ اور رسول کی طرف سے جنگ کا نوٹس دیا گیا ہے جو کسی دوسرے جرم کے مرتکبین کو نہیں دیا گیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسے رہنما اصولوں سے دانستہ خارج کر دیا گیا۔

دفعہ ۲۹ میں عدلیہ سے انتظامیہ کی علیحدگی کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی۔ حالانکہ سابق دستور ساز اسمبلی نے اس کے لئے تین سال کی مدت رکھ دی تھی۔

۳۔ حصہ چہارم (وفاقی حکومت) میں حسب ذیل امور نہایت قابلِ اعتراض بلکہ ملک کے لئے خطرناک ہیں اور ہم پورے زور کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کی اصلاح ہونی چاہیے۔

دفعہ ۳۲ کی شق (۳) میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ صدر مملکت اپنی میعادِ صدارت کے ختم ہوجانے پر بھی اس وقت تک صدر رہتا رہے جب تک کہ اس کے جانشین کا انتخاب نہ ہوجائے۔ اگرچہ یہ چیز ہندوستانی دستور کی دفعہ ۵۶ میں بھی پائی جاتی ہے لیکن یہ اس بات کے لئے کوئی حجت نہیں ہے کہ ہم اس کی نقل اتاریں۔ ہمیں اپنے ہی تجربات اور اپنی ہی عقل کی روشنی میں اپنے دستور کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ یہاں یہ چیز خطرے سے خالی نہیں ہے کہ ایک صدر جس کا انتخاب تین اسمبلیوں کو کرنا ہو اور جسے ان میں سے ہر اسمبلی کو توڑ دینے کے اختیارات دئے جارہے ہوں، بلا انتخاب بھی صدر بن کر رہ سکے۔ اس کے بجائے ہونا یہ چاہیئے کہ ایک صدر اپنی مدت ختم ہوتے ہی لازماً صدارت سے الگ ہوجائے، اور اگر صدارت کا انتخاب اس وقت تک مکمل نہ ہوچکا ہو تو نائب صدر اس کی جگہ عارضی طور پر کام کرتا رہے۔ اس غرض کے لئے صدر اور نائب صدر کی میعادوں میں کچھ فرق رکھ دیا جائے تاکہ بیک وقت دونوں عہدوں کے خالی ہوجانے کا امکان نہ رہے۔

دفعہ ۳۵ اور دفعہ ۳۷ اور دفعہ ۴۹ میں صدر کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ نیشنل اسمبلی کو توڑ سکتا ہے اور وزیر اعظم کو برطرف کر سکتا ہے۔ یہ جمہوریت کا نہیں بلکہ ڈکٹیٹرشپ کا راستہ ہے اور ہم کسی ایک شخص کو ایسے اختیارات دینے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ جو شخص براہِ راست عوام کا منتخب کردہ نہیں بلکہ اسمبلیوں کا منتخب کردہ ہو اسے عوام کی منتخب کردہ اسمبلیوں کے توڑ دینے کا مطلق اختیار دے دینا اور یہ موقع بہم پہنچا دینا کہ وہ بطور خود ملک پر حکمرانی کرنا شروع کردے، اصولاً بالکل غلط ہے اور اسے ایک لمحہ کے لئے بھی گوارہ نہیں کیا جاسکتا کجا کہ چھ مہینے کے لئے اس کی کھلی گنجائش چھوڑ دی جائے۔ اس سے شدید خطرہ ہے کہ ملک کسی وقت بھی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن سکتا ہے اور ایک حوصلہ مند صدر سرکاری ملازموں کے چند بااثر افراد کے ساتھ سازباز کرکے ہر وقت اسمبلیوں اور وزارتوں کو کھلونا بنا سکتا ہے۔ ہم اس کے برے نتائج حال ہی میں دیکھ چکے ہیں اور اب بار بار ایسے تجربے کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ دفعہ ۳۴ میں صدر کو الگ کرنے کے لئے قرار داد ملامت کا جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے وہ درحقیقت اس خطرے سے بچاؤ کا کوئی موثر ذریعہ نہیں ہے، بلکہ وہ الٹا اس امر کا محرک ہوسکتا ہے کہ قرار داد ملامت آتی دیکھ کر کوئی صدر خود ہی پیش قدمی کرکے اسمبلی توڑ دے۔ لہٰذا ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ صدر کو اسمبلی توڑنے کا اختیار ہرگز نہ دیا جائے اور وزیر اعظم کے متعلق دفعہ ۳۷ میں یہ تصریح کردی جائے کہ وہ اس وقت تک وزیر اعظم رہے گا جب تک اسے نیشنل اسمبلی کی اکثریت کا اعتماد حاصل رہے۔

دفعہ ۵۶ میں یہ اصلاح ہونی ضروری ہے کہ اگر نیشنل اسمبلی کے پاس کئے ہوئے کسی قانون کو صدر منظور نہ کرنا چاہے تو اسے ۱۵ دن

کے اندر اپنے اس ارادے کا اعلان کر دینا چاہئے۔ اور ایک مہینے کے اندر اپنے پیغام کے ساتھ اسمبلی کے غور و فکر کے لئے واپس بھیج دینا چاہئے نیز یہ بھی تصریح ہونی چاہئے کہ اگر اسمبلی دوبارہ اس قانون کو بلا ترمیم یا بترمیم پاس کر دے تو صدر اس امر کا پابند ہوگا کہ ۱۵ دن کے اندر اس کی منظوری دے دے۔ موجودہ حالت میں یہ دفعہ نیشنل اسمبلی کے پاس کئے ہوئے قوانین کی منظوری کو غیر معین مدت تک ٹالتے رہنے کے مواقع پیدا کر دیتی ہے۔

...... صدر کے اختیارات کے باب میں اس امر کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ وہ اپنے مخصوص اختیارات کے سوا باقی تمام اختیارات مجلس الوزراء کے مشورے سے استعمال کرے گا۔ یہ ایک بڑی فروگذاشت ہے اور اسے رفع کرنا ضروری ہے۔

۴۔ باب پنجم کی حسب ذیل دفعات اصلاح کی محتاج ہیں:-

...... دفعہ ۹۰ کی شق (۲) گورنر کو صوبے کے وزیر اعلیٰ کی برطرفی کے اختیارات دیتی ہے۔ اور دفعہ ۸۱ کی شق اول و دوم اس کو یہ اختیار بھی دیتی ہے کہ وہ صوبائی اسمبلی کو توڑ دے۔ یہ دونوں چیزیں بالکل اسی طرح غلط ہیں ... جس طرح مرکز میں صدر کے لئے وزیر اعظم کی برطرفی اور نیشنل اسمبلی کی برخاستگی کے اختیارات غلط ہیں۔ بلکہ ان سے آمریت کا خطرہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صوبوں کے گورنر کسی ایوان کے منتخب کردہ نہیں بلکہ صدر کے مقرر کردہ ہوں گے۔ پورے دستوری خاکے میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ صدر گورنروں کو مقرر اور معزول کرنے کا اختیار اپنی مجلس الوزراء کے مشورے سے استعمال کرے گا اس طرح صدر کو ان کے عزل و نصب کا کلی اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور گورنر پوری طرح اس کے قابو میں رہتے ہیں۔ اب اگر ایک طرف صدر کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ نیشنل اسمبلی کو برخاست اور وزیر اعظم کو برطرف کر دے، اور دوسری طرف اس کے زیر حکم گورنروں کو بھی یہ اختیار دے دیا جاتا ہے کہ اپنے اپنے صوبوں میں وزرائے اعلیٰ کو برطرف اور اسمبلیوں کو برخاست کر دیں اور اس پر مزید یہ کہ صدر اپنی میعاد گزر جانے کے باوجود اس وقت تک صدر رہ سکتا ہے جب تک یا تو اس کا دوبارہ انتخاب نہ ہو یا اس کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا شخص منتخب نہ ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ملک میں بیک جنبش قلم جمہوریت ختم کی جا سکتی ہے اور چھ مہینے کی مدت میں آمریت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اتنا کچھ کام کیا جا سکتا ہے کہ پورے ملک میں نئے انتخابات خوف اور طمع کے زیر اثر کرائے جا سکیں۔ کیا یہ درست ہوگا کہ ہم ایک شخص کو اس طرح مختار مطلق بن جانے کے مواقع بہم پہنچا دیں؟

...... دفعہ ۱۰۲ میں گورنروں کو اس امر کا پابند نہیں کیا گیا ہے کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کے پاس کئے ہوئے کسی قانون کو اگر منظور کرنا نہیں چاہتے تو ایک مہینے کے اندر اپنے اس ارادے کا اعلان کر کے اسے اپنے پیغام کے ساتھ غور و فکر کے لئے اسمبلی کو واپس بھیج دیں نیز اس امر کی بھی کوئی صراحت نہیں ہے کہ اگر اسمبلی دوبارہ اس قانون کو ترمیم کے ساتھ یا بلا ترمیم پاس کر دے تو گورنر کتنی مدت کے اندر اسے منظور کرنے کا پابند ہوگا۔ اس طرح مرکز کی طرح صوبوں میں بھی قوانین کی منظوری کو بے جا طریقے سے ٹالنے کا موقع نکل آتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس دفعہ میں بھی وہی اصلاح کی جائے جو ہم نے دفعہ ۷۵ میں تجویز کی ہے۔

۵۔ حصہ نہم (عدلیہ) کی دفعہ ۱۶۰ میں اگرچہ سپریم کورٹ کو مجاز کیا گیا ہے کہ وہ پاکستان کی ہر عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کی خاص اجازت دے سکتا ہے لیکن اس سے فوجی عدالتوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات انصاف کے خلاف ہے۔ اگر سپریم کورٹ کو اس ملک میں دادرسی کرنے کے لئے آخری عدالت قرار دیا جا رہا ہے تو اس کے آگے ہر اس شخص کو فریاد لے جانے کا حق ہونا چاہیے جسے کسی ماتحت عدالت سے بے انصافی کی شکایت ہو۔ قطع نظر اس سے کہ یہ شکایت کسی عام شہری کو ہو یا کسی فوجی ملازم کو، اور قطع نظر اس سے کہ یہ شکایت کسی عدالت کے خلاف ہو یا کسی فوجی

عدالت کے خلاف۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے انگلستان اور امریکہ میں ملک کی آخری عدالتِ انصاف کو فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کا اختیار حاصل ہے۔ یہی چیز یہاں بھی ہونی چاہیے اور کسی شخص کے لئے بھی حصولِ انصاف کا آخری دروازہ بند نہ ہونا چاہیئے۔ .... دفعہ ۱۷۲ ہائی کورٹ کے ججوں کے تقرر کی یہ صورت تجویز کرتی ہے کہ صدرِ مملکت ان کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور متعلقہ صوبے کے گورنر کی رائے سے کر مقرر کرے گا۔ ہمیں اس معاملے میں صوبائی گورنروں کی مداخلت پر اعتراض ہے۔ اگر عدلیہ کو انتظامیہ سے آزاد ہونا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ صوبوں کی عدالت عالیہ کے ججوں کا تقرر کرنے میں صوبوں کی انتظامیہ کے حاکم اعلیٰ کسی حیثیت سے بھی دخیل ہوں۔ ورنہ پھر گورنروں کے تقرر میں بھی عدلیہ کے حاکم اعلیٰ دخیل ہونے چاہئیں۔ یہاں ہمیں صریح طور پر عدلیہ کا پلڑا انتظامیہ کے مقابلے میں ہلکا نظر آتا ہے۔ یہ بات نہ صرف اصولاً غلط ہے بلکہ عملاً بھی اس سے ہائی کورٹوں کے وقار اور ان کی قوت انصاف کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ حصہ یازدہم (ہنگامی صورت حال کے اعلان) میں حسب ذیل دفعات قابل اعتراض ہیں۔

...... دفعہ ۲۰۰ صدرِ ریاست کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ ہنگامی صورتِ حال میں تمام یا بعض بنیادی حقوق کو عملاً معطل کر دے۔ اور سپریم کورٹ سمیت تمام عدالتوں کو ان حقوق کے نفاذ سے روک دے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس دستور کی بعض دوسری دفعات کے ساتھ مل کر یہ دفعہ ان ذرائع کی تکمیل کر دیتی ہے جو یہاں ڈکٹیٹر شپ کے قیام کو ہر وقت ممکن بنا سکتے ہیں۔ ذرا تصور کیجئے کہ ایک صدرِ مملکت کسی وقت مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیتا ہے اور تمام وزارتوں کو برخاست کر دیتا ہے۔ اس پر لوگ شور مچاتے ہیں تو وہ ہنگامی حالت کا اعلان کر کے تحریر، تقریر، جلسے، جلوس ہر چیز پر پابندیاں لگا دیتا ہے اور زیادہ "خطرناک" آدمیوں کو، حتیٰ کہ معزول شدہ وزراء تک کو گرفتار کر لیتا ہے۔ ملک میں اگر کچھ طاقتور جماعتیں موجود ہوں تو وہ ان کو خلاف قانون قرار دے کر ان کی جملہ املاک ضبط کر لیتا ہے۔ اور ان کارروائیوں کے خلاف اگر لوگ عدالتوں سے چارہ جوئی کرنے کے لئے جائیں تو صدر کے حکم سے سپریم کورٹ تک کا دروازہ ان کے لئے بند ہو جاتا ہے۔ ایسے میں بھی اگر یہاں آمریت قائم نہ ہو سکے تو یہ کوئی معجزہ ہی ہونا چاہیے۔ کیا ہمارے فاضل دستور سازوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہمارے ہاں صدارت کے لئے ہمیشہ فرشتے منتخب ہوا کریں گے؟ اور کیا انہوں نے یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ صدر کے سوا یہاں اور کوئی اس قابل نہ ہو گا جس پر ہنگامی حالات میں ملک کو خطرات سے بچانے کے لئے اعتماد کیا جا سکے، نہ وزارت، نہ نیشنل اسمبلی کے تین سو ممبر اور نہ سپریم کورٹ کے فاضل جج؟ یہ دونوں مفروضے اگر صحیح ہیں تو یہاں اس فریب جمہوریت کی آخر حاجت ہی کیا ہے۔ بس ایک دفعہ کسی فرشتے کو صدر منتخب کر لیجئے اور پھر پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات اسی پر چھوڑ دیجئے کہ جیسے جی عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کے جملہ اختیارات بخوبی استعمال کرتا رہے اور مرتے وقت اپنی جگہ کسی دوسرے فرشتے کو بٹھا کر چلا جائے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہنگامی معاملات میں شخصی حقوق اور ان کے نفاذ پر کچھ نہ کچھ پابندیاں عائد کرنا ناگزیر ہوتا ہے اور انتظامیہ کو وسیع اختیارات دینے پڑتے ہیں۔ لیکن جب تک ہمارا سابقہ انسانی کمزوریوں سے ہے، ہمیں کسی کو بھی ایسے مطلق اختیارات نہیں دینے چاہئیں جن کا بے جا استعمال باشندگانِ ملک کی آزادی کو خطرے میں ڈال سکتا ہو۔ .... دفعہ ۲۰۳ کی شق (۲) میں تجویز کیا گیا ہے کہ ہنگامی حالات کے اعلان کا جواز ملک کی کسی عدالت میں زیر بحث نہ لایا جا سکے گا۔ ہمارے نزدیک اس سے سپریم کورٹ کو مستثنیٰ ہونا چاہیئے۔ جبکہ دفعہ ۱۹۹ وہ حالات متعین کرتی ہے جن میں ہنگامی حالت کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ تو ملک کی سب سے بڑی عدالت کو یہ تحقیق کرنے کا اختیار ہونا چاہیے کہ ایسا اعلان کے وقت آیا فی الواقع وہ حالات موجود تھے یا نہیں۔ بالفرض اگر کوئی صدرِ مملکت کسی معمولی چیز کو بہانہ بنا کر ہنگامی حالت کا اعلان کر دے تو اس کے خلاف کوئی آئینی چارہ کار تو ہونا چاہیئے خصوصاً جبکہ منتخب اسمبلی بھی موجود نہ ہو۔

۷۔ حصہ دوازدہم کا باب اول اسلامی دفعات پر مشتمل ہے اور اس کی دفعہ ۲۰۵ وہ واحد بنیاد ہے جس پر یہاں اسلامی نظام کے قیام کا دارومدار ہو گا۔ اس لحاظ سے یہ دفعہ خصوصی توجہ کی محتاج ہے اور یہ دیکھنا ہمارا فرض ہے کہ آیا اس سے وہ مقاصد پورے ہو جاتے ہیں یا نہیں جن کے لئے مسلمانانِ پاکستان اسلامی دستور کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس دفعہ کی پہلی شق میں کہا گیا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو قرآن و سنت کے بیان کردہ اسلامی احکام کے خلاف ہو، اور موجودہ قوانین کو بھی ان احکام کے مطابق تبدیل کیا جائے گا۔ یہ چیز بجائے خود نہایت اطمینان بخش ہے۔ لیکن اس کے بعد شق (۲) یہ طے کرتی ہے کہ مذکورہ بالا دونوں امور کو صرف اس طریقے سے عملی جامہ پہنایا جائے گا جو شق (۳) میں بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ شق (۳) یہ ہے: "یومِ دستور کے بعد ایک سال کے اندر صدرِ ریاست ایک کمیشن مقرر کرے گا ... تاکہ وہ ایک موزوں صورت میں نیشنل اور صوبائی اسمبلیوں کی رہنمائی کے لئے ان اسلامی احکام کا ایک مجموعہ مرتب کرے جنہیں قانون کی شکل دی جا سکتی ہو۔

(ب) "اس امر کی سفارش کرے گا (۱) کس تدریج کے ساتھ اسلامی احکام کو نافذ کیا جائے اور (۲) موجودہ قوانین کو ان احکام کے مطابق بنایا جائے۔ یہ کمیشن اپنے تقرر کے بعد پانچ سال کے اندر اپنی آخری رپورٹ پیش کرے گا، اور اس دوران میں کوئی عارضی رپورٹ بھی پیش کر سکے گا۔ یہ رپورٹ، خواہ وہ آخری ہو یا درمیانی، جب وصول ہو تو چھ مہینے کے اندر اسے نیشنل اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، اور اسمبلی اس پر غور کرنے کے بعد اس کے لحاظ سے قوانین بنائے گی۔" اس طریق کار پر جب ہم شق (۲) کی روشنی میں غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ شق (۱) کے اکثر و بیشتر فوائد کا قلع قمع کر دیتی ہے۔ اس کے چار نقصانات بالکل واضح ہیں۔ اول یہ کہ یوم دستور کے بعد کم از کم ابتدائی سات سال تو ہر طرح کی غیر اسلامی قانون سازی کے لئے سازگار رہیں گے اور شق (۱) کی صراحت کے باوجود ہر ایسا قانون بنایا جا سکے گا جو قرآن و سنت کے احکام کے خلاف ہو۔ دوم یہ کہ اس مدت کے بعد بھی کسی قانون کے متعلق کسی عدالت میں یہ سوال نہ اٹھایا جا سکے گا کہ وہ قرآن و سنت کے احکام سے متصادم ہے، کیوں کہ شق (۲) کا لفظ "صرف" اس دروازے کو بند کر دیتا ہے۔ سوم یہ کہ قرآن و سنت کے احکام کا جو مجموعہ ایک دفعہ صدر کا مقرر کردہ کمیشن مرتب کر کے رکھ دے گا بس وہ ہمیشہ کے لئے اسلامی احکام کا واحد ماخذ بن کر رہ جائے گا، اس سے باہر کوئی دلیل و حجت براہ راست قرآن و سنت سے نہ لائی جا سکے گی، کیوں کہ شق (۲) کا لفظ "صرف" اس میں بھی مانع ہے۔ چہارم یہ کہ ساڑھے چھ سال بعد کمیشن کی رپورٹ تو اسمبلی میں پیش ہو جائے گی مگر اس کے بعد یہ بات پھر بھی اسمبلی کی مرضی ہی پر موقوف رہے گی کہ وہ آئندہ قانون سازی میں کہاں تک قرآن و سنت کے احکام کا لحاظ کرے۔ اور سابق قوانین کو کتنی مدت میں اسلام کے مطابق تبدیل کرے۔ ان وجوہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ مجوزہ دفعہ اپنی موجودہ صورت میں اسلامی دستور کے مطالبے کی تکمیل کی بجائے اسے تعویق میں ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔ ہم یہ بدگمانی نہیں کرتے کہ یہ کوشش دانستہ کی گئی ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ اس مسودہ دستور کے ترتیب دینے والوں کی نیت اسلام سے فرار کی نہ ہوگی اور وہ اس کے لئے تیار رہیں گے کہ اگر اسلامی احکام کے نفاذ کی اس سے زیادہ بہتر اور قابل عمل کوئی صورت پیش کی جائے تو اس کا خیر مقدم کریں۔ اس توقع کی بنا پر ہم اس دفعہ کی حسب ذیل صورت تجویز کرتے ہیں:-

دفعہ ۲۰۵ - (۱) کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا جو قرآن و سنت کے احکام، ہدایات اور اصولی تعلیمات کے خلاف ہو۔ (جنہیں اس کے بعد اسلامی احکام کے نام سے یاد کیا جائے گا) اور اگر کسی مسودہ قانون کے متعلق مجلس قانون ساز میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ وہ "یا اس کا کوئی جزء" اسلامی احکام کے خلاف ہے تو اس کا فیصلہ اس مجلس کے مسلمان ارکان کی اکثریت کرے گی۔

(۲) مالی مسودات قانون پر شق (۱) کا اطلاق اس طریقے سے ہوگا جو شق (۴) میں بیان کیا گیا ہے۔

(۳) موجود الوقت قوانین کو اسلام کے احکام کے مطابق تبدیل کیا جائے گا اور اس پر عمل درآمد کی صورت وہ ہوگی جو شق (۴) میں تجویز کی گئی ہے۔

(۴) یوم دستور کے بعد ایک سال کے اندر صدر مملکت ایک کمیشن ماہرین احکام اسلام اور ماہرین قانون و انتظام کی مساوی تعداد پر مشتمل مقرر کرے گا تاکہ وہ:

(ا) اس بارے میں سفارشات پیش کرے (۱) مالی مسودات قانون پر شق (۱) کے اطلاق کے لئے کیا تدابیر کس تدریج کے ساتھ اختیار کی جائیں اور (۲) موجود الوقت قوانین میں اسلامی احکام کے لحاظ سے کیا اصلاحات مطلوب ہیں اور ان کو کس طرح ایسی تدریج کے ساتھ عمل میں لایا جائے کہ یوم دستور سے دس سال کے اندر یہ سب قوانین ان احکام کے مطابق ہو جائیں۔ اور اس میعاد کے اختتام پر تمام قوانین جو اسلام کے خلاف ہوں بقدر اس تناقض کے جو ان کے اور اسلامی احکام کے درمیان پایا جائے کالعدم متصور ہوں گے۔

(ب) نیشنل اور صوبائی اسمبلیوں کی رہنمائی اور مدد کے لئے اسلامی احکام کا ایک مستند مجموعہ مرتب کرے۔

یہ کمیشن ہر سال ایک رپورٹ پیش کرتا رہے گا اور اپنے تقرر کے بعد پانچ سال کے اندر اپنا کام مکمل کر دے گا۔ کمیشن کی سالانہ رپورٹیں وصول ہونے کے بعد چھ مہینے کے اندر نیشنل اسمبلی میں پیش کی جاتی رہیں گی اور اسمبلی ان پر غور کر کے شق (۲) اور (۳) پر عمل درآمد کرنے کے لئے قوانین بناتی رہے گی۔

اند کے بعد موجودہ دفعہ ۲۰۵ کی شق (۴)، کا نمبر تبدیل کرکے (۵) کر دیا جائے اور آخر کا تشریحی فقرہ برقرار رہے)۔
یہ تجویز ایک طرف ان سب مشکلات کو رفع کر دیتی ہے جن سے بچنے کے لئے مسودۂ دستور کے مصنفین نے دفعہ ۲۰۵ کی موجودہ شکل اختیار کی ہے، اور دوسری طرف ان خرابیوں کو بھی دور کر دیتی ہے جو اس کی موجودہ شکل سے پیدا ہوتی ہیں۔ اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کسی قانون کے مطابقِ احکام اسلام ہونے کا آخری فیصلہ کون کرے گا؟ سپریم کورٹ یا خود مجلسِ قانون ساز؟ اس بارے میں ہم کہتے ہیں کہ اس کی صحیح صورت تو وہی ہے جو جنوری ۵۳ء میں علما کی کانفرنس نے تجویز کی تھی یعنی یہ کہ فیصلہ سپریم کورٹ پر چھوڑ دیا جائے اور آئندہ دس یا پندرہ سال کے لئے پانچ ایسے علما مقرر کر دیئے جائیں جو اس نوعیت کے معاملات کا فیصلہ کرنے میں سپریم کورٹ کی مدد کریں۔ لیکن اگر مجلس دستور ساز کے ارکان کے لئے یہ صورت کسی طرح قابلِ قبول نہ ہو تو پھر بدرجہ آخر دوسری صورت یہ اختیار کی جا سکتی ہے کہ یہ فیصلہ مجلس قانون ساز کرے لیکن یہ صورت ہم صرف اس شرط کے ساتھ قبول کر سکتے ہیں کہ مجلس قانون ساز میں اس امر کا فیصلہ بہرحال مسلمان ارکان کی اکثریت کرے۔

۸۔ حصہ دوازدہم کے باب پانچ کی حسب ذیل دفعات قابل اعتراض ہیں اور ان کی اصلاح ضروری ہے۔ دفعہ ۲۱۱ پہلی مرتبہ اس ملک میں مارشل لا کو دستوری جواز عطا کر رہی ہے، ورنہ اس سے پہلے انگریزی دور میں بھی دستور اس معاملہ میں خاموش تھا۔ بہرحال یہ بات بجائے خود قابل اعتراض نہیں ہے کہ ضرورت کے وقت مارشل لا نافذ کرنے کی گنجائش دستور میں رکھی جائے۔ لیکن جو چیز سخت افسوس ناک ہے وہ یہ ہے کہ مجوزہ دفعہ ایک طرف مارشل لا کے نفاذ کے لئے تو کسی قسم کے حدود و قیود مقرر نہیں کرتی مگر دوسری طرف پارلیمنٹ کو یہ مطلق اختیار دے دیتی ہے کہ وہ کسی شخص کو نہ صرف ان تمام کارروائیوں کی ذمہ داری سے بری کر دے جو مارشل لا کے دوران میں اس نے کی ہوں، بلکہ ان تمام سزاؤں اور ضبطیوں کو بھی جائز قرار دے دے جن کا فیصلہ مارشل لا کے حکام نے کیا ہو۔ یہ چیز اس لحاظ سے اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے کہ ہمارے دستور ساز خود اپنی قوم کے ساتھ وہ انصاف بھی نہیں کرنا چاہتے جو انگریزوں نے غیر قوم ہونے کے باوجود اس کے لئے پسند کیا تھا۔ انگریز جس زمانے میں ہندوستان پر آہستہ آہستہ قبضہ کر رہے تھے اور دیسی ریاستوں کے ساتھ ان کی جنگ جاری تھی اس وقت انہوں نے ۱۸۰۴ء کا ریگولیشن ۱۰ جاری کیا تھا جو حکومت کو مارشل لا نافذ کرنے کا اختیار صرف دو صورتوں میں دیتا تھا۔ ایک بحالت جنگ دوسرے جبکہ ملک میں کھلی بغاوت رونما ہو جائے پھر ان دونوں صورتوں میں بھی وہ فوجی عدالتوں کو صرف ان لوگوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا حق دیتا تھا جو یا تو حکومت کے خلاف بالفعل مسلح کارروائی کرتے ہوئے گرفتار ہوں یا علانیہ بیرونی دشمنوں کی مدد کرتے ہوئے پکڑے جائیں۔ ان دو قسم کے مجرموں کے سوا باقی سب ایسے لوگوں کے لئے جن پر بغاوت یا دشمن سے ساز باز کا الزام ہو، لارڈ ولزلی نے صریح ہدایت کی تھی کہ فوجی حکام ان کو صرف گرفتار کر سکتے ہیں، ان پر مقدمہ چلانا دیوانی حکام کا کام ہے۔ علاوہ بریں جتنے قوانین براءت انگریزی دور میں پاس کئے گئے تھے ان سب میں یہ اصول تسلیم کیا گیا تھا کہ سرکاری آدمی صرف ان افعال کی ذمہ داری سے بری کئے جا سکتے ہیں جو انہوں نے نیک نیتی کے ساتھ (IN GOOD FAITH) کئے ہوں لیکن ہمارے مجوزہ دستور میں نہ تو مارشل لا کے نفاذ کے لئے کوئی حد بندی کی گئی ہے، نہ فوجی عدالتوں کے اختیارات کو محدود کیا گیا ہے، اور نہ ان افعال کے لئے جن کی ذمہ داری سے سرکاری آدمیوں کو بری الذمہ کرنا ہو، نیک نیتی کی کوئی شرط لگائی گئی ہے۔ یہ فروگزاشتیں ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں ہیں جو کسی مفتوح ملک کے لئے نہیں بلکہ اپنے ہی وطن کے لئے دستور بنانے بیٹھے ہیں۔ ہم ان سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ براہ کرم اس دفعہ میں حسب ذیل اصلاحات کریں۔

۱۔ صرف ان افعال سے بری الذمہ کرنے کی گنجائش رکھی جائے جو نیک نیتی کے ساتھ کئے گئے ہوں اور جن کا ارتکاب قیامِ امن کی ضرورت کے لئے ناگزیر ہو۔

۲۔ مارشل لاء کے حکام کی عائد کردہ سزاؤں اور ضبطیوں وغیرہ کو برقرار رکھنے کی گنجائش یا تو بالکل نہ رکھی جائے، یا پھر ان کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کی گنجائش بھی لازماً رکھی جائے۔

۳۔ دفعہ کے آخر میں حسب ذیل شقوں کا اضافہ کیا جائے :۔

(ا) مارشل لاء صدر مملکت کے باقاعدہ اعلان کے ذریعے سے صرف ان حالات میں لگایا جاسکے گا جب کہ ملک میں کھلی بغاوت رونما ہو اور دیوانی حکومت اسے رفع کرنے میں ناکام ہو جائے، یا حالت جنگ میں دفاعی اغراض کے لئے اس کی ضرورت ہو۔ (ب) مارشل لاء صرف اس وقت تک نافذ رہ سکے گا جب تک دیوانی حکومت انتظام سنبھالنے کے قابل نہ ہو جائے۔ (ج) مارشل لاء کے حکام کا فرض قیام امن سے زائد کچھ نہ ہو گا۔ (د) مارشل لاء کے حکام کسی غیر فوجی آدمی پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کے مجاز نہ ہوں گے۔ (یا یہ کہ صرف ایسے لوگوں پر فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جاسکے گا جو بالفعل مسلح مزاحمت کرتے ہوئے یا حملہ آور دشمن سے عملاً تعاون کرتے ہوئے گرفتار ہوں) (ہ) مارشل لاء کے احکام کا اطلاق کسی حالت میں مارشل لاء سے پہلے کئے ہوئے افعال پر نہ ہو سکے گا۔

ان اصلاحات کے بغیر یہ دفعہ قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

.... دفعہ ۲۱۶ میں صدر کو یہ مطلق اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی عدالت کی دی ہوئی سزا سے کسی شخص کو معاف کر دے یا اس میں تخفیف کر دے۔ حالانکہ حدود شرعیہ کو اس سے لازماً مستثنےٰ ہونا چاہیے۔

۹۔ حصہ دوازدہم کے باب چھ کی دفعہ ۲۲۴ میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ دستور کے تحت جن لوگوں کو حلف لینا ہو گا وہ حلف کے بجائے صرف اقرار صالح کریں۔ ہمارے نزدیک یہ گنجائش صرف غیر مسلموں کے لئے ہونی چاہیئے۔ کسی مسلمان کو اس کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔

۱۰۔ ضمیمہ ۲ میں جتنے حلف تجویز کئے گئے ہیں وہ نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ ان سے وہ تمام خصوصیات نکال دی گئی ہیں جو سابق دستور ساز اسمبلی کے تجویز کردہ حلف ناموں میں پائی جاتی تھیں۔ ہماری رائے میں مسلمانوں کے لئے وہی حلف نامے موزوں ہیں جو پہلے تجویز کئے گئے تھے۔

۱۱۔ ضمیمہ ۴ کے حصہ دوم میں ہر اس شخص کو اسمبلی کی رکنیت کے لئے نا اہل قرار دیا گیا ہے جسے کسی جرم میں عدالت سے دو سال یا زیادہ کی سزا ہو چکی ہو۔ یہاں یہ تصریح ہونی چاہیئے کہ جرم سے مراد اخلاقی جرم ہے۔

۱۲۔ پورے دستور میں کسی جگہ یہ صراحت نہیں ہے کہ بیرونی ممالک سے جو معاہدات وغیرہ طے کئے جائیں گے ان کے لئے پارلیمنٹ کی توثیق ضروری ہو گی۔ اس فروگذاشت کی تلافی ہونی چاہیئے۔

۱۳۔ دستور میں یہ بھی طے ہونا چاہیئے کہ یوم دستور کے بعد کتنی مدت کے اندر ملک میں عام انتخابات منعقد کئے جائیں گے۔

افیم

☆ فاطمہ صدیقی

آج بازار سے توری ترکاری کون لائے ۔۔ ؟ ویسے تو حبیب روزانہ خود ہی بازار جاتا ہے ۔ مگر آج صبح اُٹھتے ہی وہ کاغذات کا بستہ نکال کہ آفس کا کام کرنے بیٹھ گیا۔ بہرحال پکنے کو کچھ تو آنا ہی ہے ۔آفس ہے، سکول ہے، کالج ہے، سب کچھ ہے مگر کھائے بغیر تو گزارہ نہیں ۔حبیب کو کام میں اتنا معروف دیکھ کر رضیہ کو بڑا ترس آیا ۔ بازار کے بارے میں کچھ کہے بغیر ہی وہ سیدھی اوپر پہنچ گئی ۔چھت کے اوپر کا کمرہ شاھد کے لئے مخصوص ہے تاکہ وہ نیچے کے شور و غل سے محفوظ رہ کر اپنی کالج کی پڑھائی کر سکے ۔شاھد اس وقت تک سو رہا تھا۔ آٹھ بجے سے پہلے کسی دن بھی اس کی آنکھ نہیں کھلتی ۔ پاس ہی لکڑی کی چھوٹی میز پر کتابیں، کاپیاں اور رسالے رکھے تھے بستر پر بھی کچھ کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ سرہانے دیاسلائی کی جلی ہوئی تیلیاں اور سگرٹ کے بجھے ہوئے چند ٹکرے پڑے تھے ۔سگرٹ کی راکھ بستر پر بھی جگہ جگہ بکھری ہوئی تھی ۔

یہ سب ماں کی نظر نہیں پڑا ۔ اتنا بڑا لڑکا اگر سگرٹ پیتا بھی ہے تو کون ایسا گناہ ہو گیا۔ ماں کو صرف شاھد کا گہری نیند سوتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ نہ جانے میرا چاند کتنی رات گئے تک پڑھ کر سویا ہے، آج سے جیسے بھی ہو اس کے لئے دودھ کا انتظام کرنا ہی چاہیے ۔جٹھہ کا دودھ ذرا کم بھی ہو سکتا ہے ۔ایک آدمی افیم کھاتا ہے اس لئے روز بیر بھر دودھ پیئے گا اور اتنی محنت کرنے پر بھی اس کے لڑکے کو ذرا سا دودھ نصیب نہ ہو گا جو لڑکا ایک دن ....

اسی جگہ کھڑے کھڑے رضیہ اپنے لڑکے کے مستقبل، اس کے ساتھ ہی اپنے اور اپنے گھر کے مستقبل کے خواب میں شاید کچھ دیر اور منہمک رہتی مگر شاھد کے ایک انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھنے کی وجہ سے اُسے اپنے خواب سے چونکنا پڑا ۔کل رات جس ناول کو پڑھتے پڑھتے شاھد سویا تھا کمر کے نیچے وہی بہت دیر سے اس کی نیند توڑنے کی کوشش کر رہا تھا ماں کی آہٹ سنتے ہی جاگ پڑا ۔

"چائے پی کر بازار جانا ہوگا" ؟ ایک لمبی سی انگڑائی لیتا ہوا شاھد بولا "مجھ سے نہیں ہوگا ۔!"

رضیہ جانتی ہے شاہد کبھی بازار نہیں جاتا ۔ بازار جانے سے ہی اس کو نفرت سی ہے ۔ترکاری وغیرہ لانے سے اسے الجھن ہوتی ہے۔ پھر بھی رضیہ نے ایک دفعہ اور کوشش کر دیکھی "کس کو بھیجوں ؟ صرف آج لے آ میرے چاند ! وہ آفس کا کام کرنے بیٹھ گئے ہیں ورنہ ۔۔!"

شاھد نے پھر سر ہلایا " اونہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ کچھ اور کہو تو دس بار دکان سے لا دوں۔ مگر توری ترکاری اونہوں۔ یہ مجھ سے نہیں خریدی جاتی۔ گوشت و دشت کی بھی مجھے پہچان نہیں ہے ۔"

رضیہ لوٹ گئی ۔" اللہ کرے ایسا ہی ہو، اس کے لڑکے کو کبھی بازار نہ جانا پڑے ۔ صرف سودا سلف لانے کے لئے اس کے پاس ایک تنخواہ دار ملازم ہو ۔" دل ہی دل میں وہ سوچتی جا رہی تھی ۔

اچھا اس کے ابا بازار کیوں نہیں جاتے ۔ افیم کھاتے ہیں اسی لئے ؟ یہ تو ٹھیک نہیں پہلے جب بڑی نوکری کرتے تھے تب کی بات

اور تھی، لیکن اب جب ایک طرح سے بھائی ہی کی کمائی کھا رہے ہیں تو کیا ضرورت پڑنے پر ایک آدھ دن بھی بازار نہیں جا سکتے۔

اچھی طرح سمجھانے پر حبیب نے بھی حامی تو بھرلی مگر پھر خود ہی مشکوک لہجے میں کہنے لگا۔ "بھیا جائیں گے؟ وہ تو شاید منہ میں گولی دبائے سو رہے ہوں گے اس وقت اٹھانے سے ہی ان کی روح نکل جائے گی — نہ بھیا کو رہنے ہی دو — !"

"اب تو مزاج بھی بہت بگڑ گیا ہے۔"

حبیب نے تائید کرتے ہوئے کہا، "مزاج تو خیر کیا، مگر بھابی کے آنے کے بعد سے ....."

"کیا اس سے پہلے افیم نہیں کھاتے تھے —؟"

"کھاتے تھے مگر ذرا سی۔ اتنا نشہ نہیں تھا — !"

"نشہ کا کیا ہے بڑھانے سے ہی بڑھتا ہے۔ آدمی کوڑھی ہو کر رہ جاتا ہے —— !"

رضیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ رسولن کو بازار بھیج دیا۔ گھر کا کوئی کام بھی تو رسولن نہیں کرتی۔ ذرا سا مسالہ پیسنے کو کہو تو ایک گھنٹہ تک بکتی جھکتی رہتی ہے۔ مگر بازار بھیجنے سے جاتی ہے۔ پیسہ تو چوری کرتی ہی ہے توری ترکاری میں سے بھی تھوڑا بہت رکھ لیتی ہے۔ ایک چھوٹی پوٹلی بازار سے لاکر رضیہ کو دکھا کر کہتی ہے۔ "میں نے سوچا اپنے لئے بھی لیتی چلوں غریب آدمی کا کیا ہے بی بی۔ دو آلو — دو بیگن ....."

رضیہ کو یقین نہیں آتا کہ ان کے سامان سے چرائی ہوئی دو چیزوں سے رسولن کے گھر کا سالن ہو جائے گا مگر، ہاں وہ اور بھی تو تین تین گھروں میں کام کرتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بازار میں سے اس طرح حصہ بٹانے سے البتہ دو وقت کا سالن چل سکتا ہے۔ ادھیڑ عمر کی اس عورت کی ہر بات رضیہ کو ناپسند تھی اور اگر ماماؤں کا اتنا کال نہ ہوتا تو وہ کب کی اسے الگ کر چکی ہوتی۔ کسی نہ کسی طرح عورت، عورت کے گھر کا بھید معلوم کر ہی لیتی ہے۔ اس طرح کرید کرید کر پوچھنے پر رضیہ کو رسولن کے گھر کا سارا حال معلوم ہو گیا تھا۔ کھانے والے اس کے گھر سے رسولن کے گھر دو ایک نفر زیادہ ہی ہوں گے، اس کے علاوہ رسولن کا شوہر خیراتی بھی افیم کھاتا ہے۔

پہلے دن یہ سن کر رضیہ نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ "اوہو افیم کھاتا ہے اسی لئے کوئی کام کاج نہیں کرتا ——؟"

رسولن نے حیرت سے پوچھا۔ "کام کاج کیوں نہیں کرے گا —؟ اس کی طرح محنت کرنے والے منڈی میں کتنے آدمی ہیں۔ مگر —— ہاں بی بی۔ غریب آدمی کے روزگار کا بھی کیا ہے۔ سب کا پیٹ نہیں بھرتا۔"

رضیہ نے بڑی حیرت سے پوچھا تھا —— "افیم بھی کھاتا ہے اور محنت مزدوری بھی کرتا ہے؟"

رسولن نے جواب دیا تھا — "جس دن زیادہ کھا لیتا ہے اس دن پڑا رہتا ہے۔ ویسے روز نہیں کھاتا —— !"

تقریباً دس بجے حبیب رسولن کی لائی ہوئی ترکاری پک جانے پر کسی طرح پیٹ بھر کر آفس جا رہا تھا۔ افیمچی بھیا بلانے میں سن کر ان کے کمرہ میں گیا — تین تکیہ سرہانے رکھ کر اور ایک گاؤ تکیہ بغل میں دبا کر آرام سے مجیب میاں اونگھ رہے تھے۔ چہرہ پر بیزاری کی علامات تھیں ایک جگہ سے پھٹی ہوئی چادر پر پان کے دھبے، بچھونا میلا، گھر کی اور بھی ساری چیزیں تتر بتر —— مگر کیا کہا جائے ——"

مجیب بولے۔ "آفس جا رہے ہو —— ؟"

حبیب بولا — "ہاں — دس بجنے والے ہیں۔"

مجیب — "ایک روپیہ مجھے دیجو —"

مجیب نے سوچا روپیہ پیسہ کی ویسے ہی تنگی ہے مہینہ ختم ہو رہا ہے۔ ان کو نشہ میں اڑانے کے لئے پیسہ چاہئے۔ بہت دن سے وہ بھائی کو روپیہ دیتا آ رہا ہے کبھی دو کبھی چار — مگر اب معاملہ پر ذرا سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا اب کیا بھیا سے پھر کوئی نوکری ممکن ہوگی۔ نا اگر اسی طرح نشہ بڑھاتے رہے تو نوکری سنبھالنی مشکل ہے افیم تو روز ہی مقدار میں بڑھتی چلی جاتی ہے۔ رضیہ ٹھیک کہتی ہے نشہ بڑھانے سے ہی بڑھتا ہے

"روپیہ تو نہیں ہے بھیا — ! مہینہ ختم ہونے کو آیا۔ پھر اتنی سی تنخواہ میں ہوتا ہی کیا ہے —؟"

"نہیں — ؛ دو چار آنے بھی نہیں ہیں —؟"

مجیب سر ہلاتے ہوئے بولا "ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ افیم کے لئے تو — ؟ افیم اب تم چھوڑ ہی دو بھیا۔ ! بڑی خراب چیز ہے"۔

مجیب فوراً ہی راضی ہوگیا — "اچھا چھوڑ دوں گا — لیکن تم جانتے ہو اتنے دن کا نشہ ہے یک لخت تو نہیں چھوڑا جا سکتا — ! دیکھو اگر کسی سے اُدھار دُھار لے کر اگر تھوڑی سی لا سکو — کم کرتے کرتے آخر بالکل چھوڑ دوں گا — واقعی اس نشہ کو چھوڑ ہی دینا چاہئے۔ لیکن آج کے لئے لیتے آنا۔ اچھا —؟

"کوشش کروں گا" — کہتا ہوا مجیب باہر نکل گیا —

مجیب کو جواب سے کچھ تسلی نہیں ہوئی۔ کم سے کم آج کے لئے ہی لے آئے گا یہ امید بھی اس جواب کے بعد نہیں — ! اور شام کو ذرا سی کھائے بغیر گزارہ مشکل ہے۔ اگر مجیب نہ لایا تو پھر — یہ کم بخت نشہ — ..... سوچتے سوچتے بیدم ہو کر لیٹ گیا۔

جب شاہد تیار ہو کر کالج جانے لگا تو اس نے بلایا۔ بڑی محبت سے آواز ملائم کرتے ہوئے اس سے پوچھا "کالج جا رہے ہو — تمہارے پاس ایک روپیہ ہے۔ دینا ذرا —؟

شاہد بولا — "ہے مگر آپ کو نہیں دوں گا — !"

"کیوں —؟"

"آپ تو افیم کھا کھا کر نشہ میں پڑے رہیں گے۔ جانتے ہیں افیم کتنی خراب چیز ہے۔ اگر میں روپیہ دوں تو مجھے بھی گناہ ہوگا — !"

مجیب نیم وا آنکھوں سے بھتیجے کو دیکھتا رہ گیا۔ جیسے پوری آنکھ کھولنے پر بھی وہ قادر نہیں۔ یکایک دونوں آنکھیں بند کر کے بولا — "اچھا خیر رہنے دو — درکار نہیں — !"

کھانا کھا کر ایک پیالی شیر دانی بہن کہ مجیب خود ہی باہر نکل پڑا۔ افیم کھائے بغیر گزارہ مشکل ہے مگر .... !

اُدھر آفس میں کام کرتے کرتے مجیب کو بار بار خیال آ رہا تھا۔ شروع میں مجیب کی بھلائی اور ایک بُری عادت چھڑانے کے لئے اپنے رویہ پر وہ بڑا فخر کر رہا تھا مگر آفس پہنچتے پہنچتے یہ خیال ختم ہوگیا۔ اس کی جگہ اسے اپنے رویہ پر ندامت ہونے لگی۔ صرف چار آنے پیسے مانگے تھے۔ منع نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سمجھو واقعی مجیب اگر کم کرتے کرتے افیم بالکل ہی چھوڑ دے اور کہیں کام کرنے لگے اور آج کے واقعہ کو وہ کبھی معاف نہ کرے تو — ؛ پھر کبھی اسے روپیہ پیسہ نہ دے — ! آفس کے کام میں خیال بٹنے کی وجہ سے غلطیاں ہوتی رہیں۔ مجیب جب "میکو جوٹ کمپنی" کا جنرل منیجر تھا تو اسے کسی چیز کی بھی فکر نہ تھی۔ کماتا تھا اور اڑاتا تھا۔ جب ضرورت پڑی۔ دس بیس مانگ لئے۔ مگر جب سے بھابی کا انتقال ہوا ان کے

نشہ کی عادت بڑھی جس کی وجہ سے کام میں سستی ہونے لگی۔ گودام چیک کئے بغیر دستخط کرنے لگا۔ نوکروں کی بن آئی جیل جانے کی نوبت آگئی تھی، آخر استعفیٰ دے کر جان چھڑائی۔ اور جب سے انہوں نے استعفیٰ دیا اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونے لگا۔ پھر تو ہر وقت پیسے کی تنگی۔ جوٹ کے بارے میں ان کی طرح ماہر آدمی کتنے ہیں۔ آج بھی کسی کمپنی میں بڑی جگہ مل سکتی ہے اگر افیم چھوڑ دیں تو پھر —!

میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے الجھے بالوں والا ایک آدمی ٹفن ٹائم میں حبیب کے پاس آکر بولا، اس مہینہ میں خریدیئے گا تو آپ کے لئے چھانٹ چھانٹ کر جوڑ نمبر والے ٹکٹ رکھے ہیں یہ دیکھئے ۱۲۳۴، ۸۴۶۲، ۳۳۳۳ اور اسی طرح کے لاٹری کے چھ ٹکٹ اس نے حبیب کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر حبیب بولا "لیتا تو ہر مہینہ میں ہی ہوں۔ مگر لگتا کہاں ہے؟" پہلے دو نمبروں کو نیک شگون خیال کرتے ہوئے حبیب نے ایک روپیہ نکالا اور ٹکٹ لے لئے۔

روپیہ اور بقیہ ٹکٹ جیب میں رکھتے ہوئے وہ آدمی بولا "ایک روپیہ والا ایک ٹکٹ ہے خریدیئے گا۔ پہلا انعام چالیس فی صدی گزشتہ مرتبہ میرے ہاتھ ہی سے بکے ہوئے ایک ٹکٹ پر پہلا انعام پینتیس ہزار (۳۵۰۰۰) ملا تھا اس بار تو اور بھی زیادہ کی امید ہے۔!"

ٹکٹ ہاتھ میں مسلتے مسلتے حبیب بولا "کیا لوں روپیہ ہی نہیں۔ مہینہ کے ختم پر آئے، دو چار دن پہلے آتے تو کچھ ہو جاتا —— یا اب پھر دو دن بعد!"

"دو دن بعد کیا آؤں گا جناب۔ آج تو لاسٹ ڈیٹ (LAST DATE) ہے۔ سب ٹکٹ فروخت ہو چکے ایک آپ کے لئے رکھ چھوڑا تھا اس میں امید زیادہ ہے۔ ٹکٹوں کی تعداد تو محدود ہی ہے۔ تیسرا انعام بھی اگر مل گیا تو کم سے کم دس ہزار رکھے ہیں۔"

بٹوہ میں ایک ہی روپیہ اور تھا۔ حبیب نے نکال کر دے دیا۔

اُدھر کالج میں شاہد سوچ رہا تھا۔ نجیب نے جب اسے بلایا تھا اس سے پہلے وہ وطن کے ایک بڑے لیڈر کا ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔ مضمون گو افیم پر تو نہ تھا مگر اس میں بتایا گیا تھا کہ نشہ بھی قوم کی جڑیں کھوکھلی کر دیتا ہے۔ اس کے دل پر اس کا بڑا اثر تھا اس مضمون کو پڑھ کر شاہد کو اپنے تائے میاں کا خیال آیا تھا۔ نجیب کے پاس سے چلے آنے کے بعد وہ اپنے جواب پر بہت خوش تھا مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اسے اپنے رویّہ پر افسوس ہونے لگا۔ اس طرح کی بہادری نہ کرنا ہی شاید بہتر تھا۔ صرف ریحانہ کے گھر پر ہی نہیں۔ اور بھی کئی بڑے گھروں میں اس کی عزت نجیب کے بھتیجے ہونے کی وجہ ہی سے تھی۔ اس کے تائے کے اچھے دن پھر لوٹ آئیں اور ان کی وجہ سے وہ کسی بڑی پوسٹ پر پہنچ جائے تب ہی تو وہ ریحانہ کے بارے میں پر امید تمنائیں کر سکتا ہے۔ ویسے اگر ریحانہ اس کے لئے بیقرار ہی ہو جائے تو دوسری بات ہے۔ اور تائے میاں کیا واقعی ایک دن پھر بڑے آدمی ہو جائیں گے، اس کے بظاہر اسے کوئی آثار نظر نہیں آتے، مگر پھر بھی اسے تائے میاں کو چڑانا نہیں چاہئے تھا —

تین بجے کے قریب شاہد گیٹ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کا کلاس لکچر ایک گھنٹہ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب ریحانہ کا ختم ہوا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ بعد ریحانہ آئی بغیر کسی تمہید کے بولی۔

"آج تو آپ گھر تک نہیں پہنچا سکوں گی —! ذرا ایک جگہ جانا ہے۔"

"کس طرف —؟" شاہد نے پوچھا۔

"ادھر —— دوسری طرف"۔ یعنی مجھے ایک رشتہ دار کے گھر جانا ہے —!

"کتنی دیر وہاں ٹھہریئے گا ——؟"

"کوئی ٹھیک معلوم نہیں ——" مسکراتے ہوئے ریحانہ نے جواب دیا۔

ریحانہ کی موٹر چلے جانے کے بعد شاہد سوچنے لگا۔ اب کیا کیا جائے۔ اس نے بائیں ہاتھ پر بندھی ہوئی قیمتی گھڑی پر نظر ڈالی۔ مجیب نے ایک دفعہ یہ گھڑی خرید کر دی تھی۔ اتنی جلدی گھر جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ نسیمہ کے گھر چلا جائے —! شاید وہ اس کے ساتھ سینما چلی چلے؟ مگر پیسہ —؟ خیر چل کر دیکھا جائے گا۔ مگر بھوک بھی زور سے لگ رہی ہے۔ کچھ کھا لیا جائے ... نسیمہ تو زیادہ سے زیادہ ایک کپ چائے پلائے گی۔

اس دن رات کو نو بجے تک مجیب لوٹ کر نہیں آیا۔ حبیب اور شاہد کو کھانا کھلا کر رضیہ نے دو پیالہ دودھ دونوں کے سامنے رکھ دیا۔

شاہد متعجب ہو کر بولا —" دودھ ——؟"

حبیب نے پوچھا " بھیا کے لئے دودھ ہے نا ——؟"

رضیہ نے کہا " ان کو ضرورت نہیں ہے —"

حبیب کھانا کھا کر کمرہ میں چلا آیا۔ اس کے دوست نے آج اسے ایک برا جرٹ دیا تھا، وہ نکال کر آرام کرسی پر لیٹ کر پینا شروع کیا ہی تھا کہ چھوٹی لڑکی ثریا نے آ کر خبر دی۔ "ابا جان آپ کو نائے میاں بلاتے ہیں۔" حبیب کچھ اور سوچ رہا تھا، اس درمیان میں مجیب کب آیا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ ایک طشتری میں جرٹ رکھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ وہ مجیب کے کمرہ کی طرف چلا —— اتنی رات گئے گھر لوٹنا اور پھر اس وقت بلانا کیا معنی؟

مجیب پندرہ روپے اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہنے لگا " تم نے کہا تھا، پیسہ بالکل نہیں ہے، لو یہ چند روپے رکھ لو اور سنو آج الیاس کمپنی میں بات طے کر آیا ہوں۔ کئی دن سے میرے سر ہو رہے تھے۔ تم تو جانتے ہی ہو حاجی الیاس کو ——؟ جانتے نہیں —— طبیعت بھی آج کل خراب رہتی ہے مگر کیا کیا جائے۔ گھر تو چلانا ہی ہے —— لڑکی کی بھی عمر ہو گئی، دو دن بعد اس کا بیاہ کرنا ہوگا۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے حامی بھر لی۔ نشہ نے کسی کام کے لائق نہیں رکھا —— مگر کام بھی بہرحال کرنا ہی ہے۔ کوشش کروں گا کہ اس بلا سے نجات پاؤں۔ تم ٹھیک ہی کہہ رہے تھے چھوٹنا ہی اچھا ہے ایک لعنت ہے لعنت —— آدمی کو بے دم کر کے چھوڑ دیتی ہے۔ نا میں ضرور چھوڑ دوں گا ——!"

مجیب کی باتوں کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بڑی خجالت محسوس کر رہا ہے، اسے اپنی برائی کا احساس ہے اور حبیب کے سامنے ایک ملزم کی طرح اپنے رویہ کی توجیہہ (EXPLANATION) پیش کر رہا ہے —— یکایک وہ ثریا کو پکار کر بولا —" بیٹی اپنی امی سے کہہ دو مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں صرف دودھ پیوں گا۔"

حبیب خود ہی رضیہ سے کہنے چلا آیا —— مجیب کی نوکری کی خوشی سے زیادہ اسے دودھ کی فکر پڑ گئی۔ دودھ تو آج اس نے بالکل ختم کر دیا —— دیگچی تک دھل گئی۔ اب کیا کروں؟ ...." ذرا —— جلدی سے شاہد کو بلا لو اور کچھ پیسے دیتے جاؤ" —— اس نے حبیب سے کہا۔

حبیب پھر کمرہ میں آ کر لیٹ رہا۔ جرٹ بجھ چکا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر نیند نہ آئی تو ضرورت پڑے گی، اس نے دو سگریٹیں الگ رکھ دی تھیں۔ رات کو جب نیند نہیں آتی تو سگریٹ پینے کی زبردست خواہش نہ جانے کیوں عود کر آتی ہے —— شاہد کو پانچ سگریٹ اور لانے کو کہہ دیا ہے لہذا اطمینان سے اب وہ سگریٹ پی سکتا ہے۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور ہلکے ہلکے کش لگانے شروع کر دیئے۔ جس کی جو عادت ہوتی ہے اس کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ——!

بھیا پھر نوکری کریں گے گھر چلائیں گے۔ تنگی ترشی دور ہوگی۔ اس سے زیادہ اسے ایک اور فکر کھائے جا رہی تھی کہ کل اور پرسوں دو دن ابھی پہلی تاریخ میں باقی ہیں۔ ان دنوں کا خرچہ کہاں سے آئے گا۔ مجیب سے پندرہ روپیہ ملنے پر اسے اس فکر سے نجات مل گئی — گھر کے خرچ کا حساب ختم کر کے اس نے لاٹری کے ٹکٹ خریدے تھے — یہ خیال اسے بار بار ستا رہا تھا۔ مگر اب وہ اطمینان سے ملنے والے انعام کے خواب دیکھ سکتا ہے۔ واقعی کبھی تو ملے گا ہی — مسلسل دس برس سے وہ ڈربی کا ٹکٹ خرید رہا تھا۔ ۴ برس سے کئی رسالوں کے معمے حل کر رہا تھا۔ اور اب ایک برس سے لاٹری کے ٹکٹ بھی خریدنے شروع کر دیئے تھے اس کی وجہ سے رضیہ سے کتنا جھگڑا ہوا تھا آخر اسے سگرٹ کم کرنی پڑی — کپڑے بھی اب وہ بغیر استری کئے ہوئے ہی پہن لیتا ہے۔ رفو بھی ہونے لگا ہے۔ گھر میں کتنی ہی چیزوں کی ضرورت ہے ایک دفعہ ایک لاکھ روپیہ مل جائے۔ اس کے چہرہ پہ ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے جلدی جلدی سگرٹ کے دو کش لگائے اور پھر آنکھ بند کر کے سوچنے لگا۔ ایک لاکھ یعنی ....!

میز کے سامنے بیٹھا ہوا شاہد سوچ رہا تھا اتنی رات گئے اتنی تکلیف کر کے وہ تائے میاں کے لئے دودھ لایا ہے۔ یہ بات ان کے کان میں ڈال دینا ہی بہتر تھا — صبح کے واقعہ سے اگر وہ ناراض ہو گئے ہوں تو یہ سن کر خوش ہو جائیں گے — خوش ہونے سے ہو سکتا ہے کہ ......!

سب کام نمٹا کر رضیہ بستر پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ مجیب تیسری سگرٹ سلگا کر لاٹری کے ٹکٹوں کے نمبر ایک کاغذ پر لکھ کر چوتھی مرتبہ قرعہ ڈال رہا تھا — شاہد کتاب کاپیاں اور پنسل لیکر نیچے ہی رضیہ کے بستر پہ بیٹھ گیا۔ ابھی ابھی اس نے ایک ناول ختم کیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ہیرو کی طرح اگر وہ بھی کسی دن ریحانہ کو جلتے ہوئے گھر سے نکال لائے، خود زخمی ہو تو ہو، ریحانہ پر آنچ نہ آنے دے — تو اس کے پاپا کتنے مشکور ہوں گے، اسے کتنا دلیر خیال کریں گے — ہو سکتا ہے پھر وہ ....!

رضیہ نے کچھ دیر تک کتاب پر نگاہ جمائے ہوئے شاہد کو دیکھ کر سوچا، اب وہ شاہد کو زیادہ رات تک جاگ کر پڑھنے سے منع کر دے گی۔ لیکن پھر خیال آیا۔ نا بڑا آدمی ہونے کے لئے رات کو جاگ کر محنت کرنی ہی پڑے گی — اب تک اس کے امتحان کے نمبر اچھے نہیں رہے اب اگر رات کو پڑھنے کے بعد کوئی تمغہ وغیرہ ملے۔

طبیعت سست ہو رہی تھی۔ مگر نیند نہیں آ رہی تھی ایک پان اور کھا کر شاہد کے پاس ہی لیٹ گئی۔ اور پھر لڑکے کے امتحان تنخواہ نوکری سے گذر کر وہ اس کے مستقبل میں پہنچ گئی — ایک عالی شان کوٹھی۔ ایک چاند سی بہو ......؟

گھر میں افیم کھاتا ہے ایک آدمی — مگر جاگ کر خواب سب ہی دیکھتے ہیں —!

مجیب کی سترہ برس کی لڑکی بھی جو ابھی نویں کلاس میں پڑھ رہی ہے، اتنی رات گئے چھت پر ٹہلتی ہوئی سوچ رہی ہے۔ وہ اگر نرس ہو جائے اور کوئی بانکا سجیلا نوجوان یکایک کسی حادثہ کا شکار ہو کر اس کے ہسپتال میں آئے اور پھر اس فلم کے ہیرو کی طرح ....!

[پلاٹ مانک بنرجی کے ایک بنگلہ افسانے سے ماخوذ]

[redacted]

ایک خط ——— بنام خالد صدیقی

برادرِ محترم، السلام علیکم

آپ کا شکوہ بجا، حلقہ کے باہر کے لوگوں (بلکہ لوگ نہیں فرد) پر میں پہلی ہی بار لکھنے کی ہمت کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ دراصل ہمارے حلقہ میں منٹو کی موت پر "معیار" میں جو ادارتی سطور شائع ہوئی تھیں وہ صرف یک رخی تھیں، اس کے بعد اکتوبر کے "چراغِ راہ" میں مسعود جاوید صاحب کا مضمون تو مجھے سراسر منٹو کی وکالت محسوس ہوا۔ مسعود جاوید صاحب کا خیال ہے کہ منٹو کی تحریروں میں تقسیم کے بعد کافی پاکیزگی آگئی تھی حالانکہ میرا مطالعہ ہے کہ منٹو تقسیم کے بعد فن سے بھی گر کر لکھنے لگے۔ وقارِ عظیم نے تقسیم کے بعد کی منٹو کی تحریروں کو خالص جنسی اور فنی مرتبہ سے گرا ہوا قرار دیا ہے۔ میں اپنے مضمون میں اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ منٹو نے ادب میں جس اخلاقی پستی کی عکاسی کی ہے اس کے لئے نہ انہیں ریاضت اور مجاہدہ کرنا پڑا ہے اور نہ ان کے اندر گرے ہوئے طبقات کے لئے خلوص تھا بلکہ انہوں نے اپنی زندگی کی تمام ولولوں کا نشانہ اس طرح پورا کیا ہے کہ اسے ادب کے قالب میں ڈھال کر عوام کی جیبیں شباب کی تتلیوں کے لئے خالی کرائی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں منٹو کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا ہے، اس لئے یہ ضروری بھی ہے۔

"اذان" پر میں نے تبصرہ لکھ کر نسیم صاحب کو دے دیا تھا۔ وہ اُسے ضبط کر بیٹھے۔ حال میں اُن سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ اُسے اور "شعلۂ خیال" پر تبصرہ جنوری سنہ ۵۶ء کے خاص نمبر میں شائع کر رہے ہیں۔ انہوں نے ان کتابوں کو اہم قرار دیا ہے اس لئے انہیں اہم شمارے میں شامل کرنا مناسب خیال کیا ہے۔ اب وہ دوبارہ "اذان" کو موضوع بنا کر لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، البتہ ایک عرصہ سے ارادہ کر رہا ہوں کہ جیلانی صاحب کی جتنی تحریریں میرے پاس ہیں اُن کا مطالعہ کروں اور پھر اُن پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھوں، لیکن میری مصروفیات اس قدر ہیں کہ ارادے عملی جامہ نہیں پہن پاتے۔ بہرحال اس "ایسٹر" پر گھر جا رہا ہوں، وہ امید کب پوری ہوگی؟ خدا جانے!

اس درمیان "چراغِ راہ" ہی میں مظفر علی سید صاحب کا تبصرہ نظر سے گزرا۔ مجھے اُن کے تبصرہ سے شاید ہی اتفاق ہو۔ لیکن جس چیز نے مجھے اُن کے تبصرہ کا گرویدہ بنا دیا ہے، وہ اُن کا خلوص ہے۔ انہوں نے "اذان" کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور اس کے بعد کوئی رائے قائم کی ہے۔ جہاں تک جیلانی صاحب کے فن کا تعلق ہے یا مقصد اور افسانے کو سنوارنے کا، مظفر علی سید صاحب سے کلیتاً اختلاف کرنے کے باوجود اُن کی بات ماننی ہی پڑے گی، کیوں کہ یہ انفرادی ذوق کا معاملہ ہے۔ تمام تنقید نگار ایک افسانہ کے بارے میں ایک ہی رائے قائم نہ کریں گے، کوئی ایک ہی تخلیق کو بلند ترین اور معیاری قرار دے گا، کوئی اُسے بے اثر اور فنی خامیوں سے پُر قرار دے گا۔ اگر یہ جھگڑا چکانے بیٹھ جائیں تو شاید ہم کسی انجام تک نہ پہنچ سکیں۔ البتہ انہوں نے "اذان" پر تبصرہ کے لئے جو پس منظر تیار کیا ہے اُس میں غلط فہمی کافی حد تک کارفرما نظر آتی ہے۔ اس غلط فہمی نے ان کے اندر جیلانی کی طرف سے ایک جذباتی کھنچاؤ پیدا کر دیا ہے چنانچہ وہ اپنے پورے خلوص سے کام لینے کے باوجود جیلانی کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ مثلاً "چور" میں قلبِ ماہیت سے افسانہ کا جو انجام انہوں نے اخذ کیا ہے وہ جیلانی کے مقصد کے عین منافی محسوس ہوتا ہے۔ جیلانی نے درویشی پر چوٹ ضرور کی ہے لیکن یہ غور کر لینا بھی ضروری تھا کہ وہ کس طرح کی درویشی ہے جو اُس کی زد میں آتی ہے ورنہ بے چارے افسانہ نگار کی ساری محنت ہی رائیگاں جائے گی۔ افسانہ کے آخری فقروں پر اگر غور کیا جائے تو بے چارہ حیرت و حسرت کا مارا ہوا "چور" اپنی نگاہوں سے یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ اس فریب دہی سے خود اُسے کتنے بڑے فریب میں مبتلا ہونا پڑا۔ اس افسانے میں جیلانی نے ایک بہت ہی مشہور لوک کہانی کو موضوع بنایا ہے۔ تعجب ہے کہ مظفر علی سید صاحب کے کانوں تک یہ کہانی نہیں پہنچی، ورنہ وہ محسوس کرتے کہ جس خامی کی طرف وہ اشارہ کر رہے ہیں وہ دراصل اُن

[illegible] کی جان ہے۔ مزید برآں جیلانی صاحب نے کہانی کے سارے محاسن کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی بات کو غیر محسوس طور پر پیش کر دیا ہے۔

اسی طرح "احوبہ" کے ابتدائی حصہ پر موصوف کی گرفت درست ہوتے ہوئے بھی انتہا پسندانہ ہے۔ "احوبہ" کے ابتدائی حصہ میں جھول ضرور ہے۔ افسانہ نگار کے قلم میں نپی تلی بات کہنے کی قدرت نہیں پائی جاتی ہے لیکن یہ سارا ٹکڑا صرف ایک فقرہ ہی کہلانے کے لئے نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ ایک حسین پس منظر بن جاتا ہے اور جب کہانی کے آخر میں عرب نوجوان کے معاملہ میں احوبہ کو شکست ہوتی ہے تو بابل کے بت خانے خجل سے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ کہانی کے آخر میں اسی شکست و ہزیمت کی تکرار ہے لیکن کتنی متنوع اور نیرنگ کہ افسانہ کی روانی کسی چٹان سے سر توڑتی ہوئی نہ محسوس ہو۔

"حادثہ" اور "پروانے" کو موصوف نے پسند کیا ہے لیکن انہیں کوئی ادبی مرتبہ دینا گوارہ نہیں کرتے ہیں، جیلانی کو اس کے لئے اُن سے مصر ہونے کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ جیلانی اس سے بھی بہتر کہانیاں لکھ چکے ہیں۔

جیلانی صاحب کی تمام کہانیاں مجھے بھی پسند نہیں ہیں۔ مثلاً 'اذان' سے اُن کا کیا مقصود ہے، میں اب تک سمجھ نہیں سکا۔ البتہ میں مظفر علی سید صاحب کی طرح یہ استنباط کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ جب تک عیب نہ کٹ جائے اُس وقت تک اذان میں جذب و انجذاب کی کیفیت پیدا نہ ہوگی۔ اس کے برخلاف میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اذان میں اُس وقت تک سوز اور تاثر نہ پیدا ہوگا جب تک انسان اپنے دل کو ہر طرح کی محبت سے پاک کر کے اللہ تعالےٰ کی محبت کو اس میں جگہ نہ دے لے۔ جب تک اس کے تمام سہارے نہ ٹوٹ جائیں اور وہ اللہ تعالےٰ کے سہارے کے لئے مجبور نہ ہو جائے اس وقت تک وہ اپنی کسی بھی التجا میں اثر نہیں پیدا کر سکتا۔ اذان میں میرے لئے جو چیز ناقابلِ فہم ہے وہ قہوہ خانے میں اچانک متعارف ہونے والا کردار ہے۔

مظفر علی سید صاحب نے جیلانی صاحب کے فن کو اس قدر ناپختہ قرار دیا ہے کہ جیسے انہوں نے مقصد کو پوری طرح ہضم نہیں کیا ہے جس کی بنا پر وہ مقصد کو اچھی طرح اپنے افسانوں میں کھپا نہیں سکے ہیں اور انہوں نے مقصد کو ہر افسانے میں اس طرح سمویا ہے جیسے اشتہاری معالج جھوٹی سچی کہانی بیان کرنے کے بعد اپنی دواؤں کو متعارف کرا دیتے ہوں۔ موصوف کی اس رائے سے اختلاف کیا جائے تو کیوں کر کیا جائے۔ ایسا کوئی آلہ نہیں ہے کہ جس سے مختلف محسوسات میں توازن پیدا کیا جا سکے۔ موصوف اپنے اس خیال پر پوری طرح جمے رہ سکتے ہیں خواہ ہم یہ کہتے رہیں کہ جیلانی کے دو ایک افسانوں کو چھوڑ کر کہیں بھی مقصدیت اس طرح کھل کر نہیں پیش کی گئی ہے۔ اگر کسی افسانہ میں کچھ ماورائی کردار یا مسلمانوں کے ماحول آ گئے ہیں تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اسلامی ادب کے مقصد کو علی الاعلان پیش کر دیا گیا ہے۔ جن افسانوں میں اس طرح کے ماورائی کردار پیش کئے گئے ہیں اُن میں جھول پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے برخلاف جہاں مقصد کو پورے افسانے میں پھیلایا گیا ہے۔ وہاں جیلانی کا فن اور افسانے کی تدریجی روانی قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور مقصد کو زبردستی حلق کے نیچے اتروانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے، مثلاً "ایک دن"، "پروانے" اور "گرجوز" وغیرہ اس کی اچھی مثال ہیں۔

جیلانی کے افسانوں میں ایک طرح کی ایمائیت بھی پائی جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ پورا افسانہ کہہ چکتے ہیں اور پھر قاری بیٹھ کر غیر ارادی طور پر سوچنے لگتا ہے اور سوچتے سوچتے وہ اس انجام تک پہنچ جاتا ہے جو جیلانی صاحب کا مقصود ہے۔ "آدمی موت"، "غلطی کا احساس" اور "ایک قوم پرست کا خواب" اس کی اچھی مثالیں ہیں ——

جیلانی صاحب کی ہر چیز ہمیں بھی پسند نہیں آئی خاص طور سے "وردِ سینہ و سیدانِ وطن" پڑھ کر تو بڑی کوفت ہوئی۔ "دیوار دل کے پیچھے" میں بھی اچھا خاصہ

مضمون نویسی کا اندازہ پیدا ہو گیا ہے۔ زبان کی غلطیاں بھی اُن کے یہاں عجیب عجیب ہوئی ہیں مثلاً سانپ کا ڈنک مارنا یا لفظ سرد الاہنا تو مشاہدہ کے بھی خلاف ہے محاورہ کی بات الگ رہی۔

جیلانی صاحب اگر بلند پایہ افسانہ نگار نہیں ہیں تو اس قدر معمولی بھی نہیں کہ اُن کی کوئی تخلیق افسانہ کے معیار پر پوری ہی نہ اترے۔ ہو سکتا ہے اس میں ذاتی پسند کا بھی دخل ہو کہ مظفر علی سید صاحب نے اُن کے بارے میں ایک تصور قائم کر لیا ہو اور اس کی روشنی ہی میں جانچا ہو۔

جیلانی صاحب کے فن پر تنقید کرتے ہوئے موصوف نے اسلامی ادب کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے یہاں ان کی واقفیت سے ناواقفیت غلط فہمی کی وجہ بن گئی ہے۔ محمد حسن عسکری کو وہ اسلامی ادب کا سب سے پہلا داعی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم اسلامی ادب کے پورے ماضی کو نظر انداز کر کے گزشتہ دس پندرہ سال کا ہی جائزہ لیں تو ہم عسکری کی آواز کو ۱۹۴۹ء سے پہلے اٹھتے ہوئے محسوس نہیں کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ساقی کے مستقل عنوان جھلکیاں کے تحت انہوں نے ادب میں بھی مسلم لیگی نظریہ کی تائید کا عہد کیا تھا۔ لیکن اُس وقت بھی انہوں نے جو بات کہی تھی وہ اسلامی ادب کے بارے میں نہ تھی بلکہ مسلم لیگ کی حمایت کے بارے میں تھی۔ اسلامی ادب کا نعرہ تو انہوں نے پاکستان منتقل ہونے کے بعد لگایا تھا۔ جبکہ اسی نام سے دونوں خطوں (یعنی ہندوستان و پاکستان) میں چراغِ راہ، انوار، کوثر، الانصاف اور حیاتِ نو اسلامی ادب کا معتدبہ سرمایہ منظرِ عام پر لا چکے تھے۔ محمد حسن عسکری صاحب نے ادب میں جس اسلام کا نعرہ لگایا تھا وہ قومی تھا، حالانکہ اسلامی ادب، اسلام کو نظری اور عالمگیری نظام کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ محمد حسن عسکری صاحب صرف قوم کی مداحی چاہتے ہیں جبکہ اسلامی ادب، ذہن، فکر، عمل اور کردار کو سنوارنا ضروری سمجھتا ہے۔ عسکری صاحب کا ادب قومی منافرتوں اور فرقہ واریت کو پرورش دینے کا ذریعہ بن سکتا ہے لیکن اسلامی ادب پُرامن طریقہ سے اپنی آواز دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ عسکری صاحب کے نزدیک منٹو ہر لحاظ سے قابلِ فخر ہستی ہے، لیکن اسلامی ادب میں اُس کے کردار اور اس کے کھوٹے سرمایۂ ادب کو دور پھینک دیا جائے گا اور صرف اُسی کو قبول کیا جائے گا جو ادب میں بلند مرتبہ ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کی تعمیر کے لئے بھی مفید ہو۔ بہرحال عسکری صاحب کے اسلامی ادب میں اور جیلانی صاحب کے اسلامی ادب میں یہی فرق ہے جو محدودیت اور آفاقیت میں ہے۔

نقوش میں اسلامی ادب پر جو بحث چلی تھی اُس کو مذکورہ غلط فہمی ہی کی وجہ سے انہوں نے تحریکِ ادبِ اسلامی سے متعلق سمجھ لیا۔ حالانکہ اگر یہ بحث واقعی اسلامی ادب سے متعلق ہوتی تو محمد طفیل صاحب مدیر نقوش اس تحریک کے داعیوں کو بھی اظہارِ خیال کا موقع فراہم کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اس میں سراسر اُن کا خسارہ تھا۔ وہ اسلامی ادب کا نام لے کر تحریکِ ادبِ اسلامی کو بدنام کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے تمام ایسے اہلِ قلم حضرات کو دعوتِ مذاکرات دی، جو یا تو اسلامی ادب کے نام سے بھی واقف نہ تھے اور یا پھر نام سن کر ہی اتنی شدید عصبیت میں گرفتار ہو گئے تھے کہ اسلامی ادب کے مطالعہ ہی کو تضیعِ اوقات سمجھتے تھے۔ چنانچہ جن حضرات نے اسلامی ادب کی موافقت کی ان میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک تو وہ جو قدامت پرستی اور جمود ہی کو اسلام سمجھتے تھے اور دوسرے وہ جن کے کان عسکری صاحب کے نعروں سے مانوس تھے اور وہ اس لئے ادب میں مذہب کو دخیل دیکھنا چاہتے تھے کہ مغرب میں T. S. ELIOT یہی کر رہا ہے۔ اُن کی طرفداری اسلام سے لگاؤ کی وجہ سے نہ تھی بلکہ مغرب سے مرعوبیت کی وجہ سے تھی۔ اگر آج مغرب بتوں کو پوجنے لگے تو بلاشک و شبہ وہ صنم پرستی کی تبلیغ کرنے لگیں گے۔ ایسی صورت میں محمد طفیل صاحب کی "چلائی ہوئی" بحث کو وزن دینا مجھے بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے تو اس بحث سے نقوش کی توسیعِ اشاعت اور تحریکِ ادبِ اسلامی کی مقبولیت میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تھی تاکہ اُن کا کاروبار چلتا رہے۔ بہرحال وہ اپنی اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب رہے لیکن اُن کے اسٹنٹ کو جو مختلف ادیبوں کے نام تار، رجسٹرڈ خطوط، ایکسپریس اور ہوائی ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط کے سہارے چلتا رہا زر پرستی کے علاوہ کسی اور چیز پر محمول کرنا درست نہیں۔

محمد طفیل صاحب نے اس استغفار نے بعض دانشوروں کو اس قدر مسموم کر دیا ہے کہ اب وہ طفیل صاحب ہی کو [illegible] اوڑھنا بچھونا سب کچھ سوچتے ہیں اور نہیں کی نگاہوں سے اسلامی ادب [illegible] مستقل پروان چڑھتے رہنے دیتے ہیں کچھ اسلامی ادب نقادوں کا بھی ہاتھ ہے مجھے حیرت ہے کہ ایک حصے میں سے کوئی اچھا تنقیدی مضمون نہیں پڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا نظریہ مقبول ہوتے ہوئے باوجود صحیح طور پر سمجھا نہیں جاتا۔ نومبر کے شمارہ میں شعلۂ خیال پر مظفر حسین صاحب ایم اے کا [illegible] کا حال [illegible] جس طرح اعتراف کیا ہے کہ وہ فیض کو اپنے سے بلند تر شاعر سمجھتے ہیں اسی طرح اسلام پسند ادیب [illegible] نہیں کر دیا کرتے ہیں۔ فیض اور نعیم میں جو فرق ہے شاید وہی فرق فیض اور اقبال میں ہے۔ [illegible] فیض کا [illegible] کر دیا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ نعیم اور فیض [illegible] حالانکہ [illegible] لیکن اس کے باوجود فیض اور نعیم کو ایک طبع کا خیال رکھنا ضروری ہو کہ ہر شاعر [illegible] فرق ہوتا [illegible] ہے۔ [illegible] دیکھ کر دو شاعر دو [illegible] مشاہدات کریں گے اور ان مشاہدات کو بالکل مختلف [illegible]

دل کا اجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم — بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے (فانی)

کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے — [illegible] (یگانہ)

دونوں شاعروں نے آبادیوں کے برباد ہونے اور پھر بسنے کا مشاہدہ لیتے [illegible] اس نے قنوطیت اور رجائیت کی دو سرحدیں قائم کر دی ہیں۔ بالکل اسی طرح ہمیں نعیم اور فیض [illegible] فیض کے یہاں ایک ٹھہراؤ ہے۔ رجائیت ہے اور روحانیت میں دبی ہوئی قنوطیت بھی ہے ان کا کلام پڑھ [illegible] اس کے برخلاف نعیم کے یہاں [illegible] فیض [illegible] مظفر حسین صاحب نے جو انداز [illegible]

شعلۂ خیال میں [illegible] نعیم کے کلام کی ندرت اور موضوع کو بالکل الوکھے انداز میں TREAT کرنا انہیں ایک عرصہ تک فراموش نہ ہونے دے گا۔ [illegible] کسی ایک صنف کو [illegible] بلند اٹھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں [illegible] کسی ایک شاعر [illegible] دیانت داری کے منافی ہے۔ اسلامی ادب اور شاعری [illegible] مجروح ایسے شاعروں کو سامنے رکھ کر جیسی بھی تنقید کرنی چاہیے کر سکتا ہے۔ [illegible] (مجروح)

معیارِ شعری سے قطع نظر اس [illegible] کیونکہ اس صف میں جذبی اور [illegible] ایسے شاعر بھی ہیں۔

مگر نعیم کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ جہاں [illegible] کام لیتے ہیں وہاں [illegible] اپنائے رکھتے ہیں ؎

وہ بت کا فرنے خنجر پہ کرتا ہے سوال — میرے [illegible] میں مسلمان کون ہے؟

ہم مطمئن [illegible] جہاں ہم ہیں — رونق ہے میکدے ہمارے بغیر بھی

نمائش گل و لالہ پہ مر مٹی بلبل — [illegible] وہ جلوے جو محو قفس میں ہیں

اوہ! [illegible] شعلۂ خیال ہی بھی اس کلام کے لئے آپ ہمارے [illegible] صاحب ہی کو موزوں سمجھیں معلوم نہیں وہ قصد و ارادہ کا اظہار کر کے بھی کیوں خاموش بیٹھے ہیں؟

والسلام ابن فرید

آپ کیا پڑھیں؟

ادارہ

علمی کتابیں اس بار تبصرہ کے لئے جو کتابیں آئی ہیں ان میں بالخصوص اور علمی کتابوں کا تناسب بہت ہی حوصلہ افزا ہے۔ ایک قابلِ خیر مقدم کتاب جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے نکلی ہے جس کا اولین ایڈیشن عربی میں شائع ہوا تھا اور اب اردو ایڈیشن "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ ارادہ تھا کہ اس کتاب کا تفصیلی تعارف لکھا جائے لیکن بدقسمتی سے یہ خدمت سرانجام دینا ممکن نہ ہوا مختصراً اب اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ مؤلف کا علم اور خلوص اور دردِ دل کتاب کی قدر و قیمت نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ ایسی تصنیف ہے کہ جس کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ پڑھا جانا چاہئے۔ چار سو اکتیس صفحات کے ظرف میں فاضل مؤلف نے اس پوری تاریخ کا جائزہ بکمال آراستہ کر دیا ہے جس سے دورِ حاضر کی انسانیت کا قریبی تعلق ہے۔ اور پھر اس تاریخ کے مخصوص پہلو ملتِ اسلامیہ کا اصل منصب متعین کیا ہے کہ وہ کیا تھا، کیا ہونا چاہئے اور اب کیا ہو کر رہ گیا ہے۔ مؤلف نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کا منصب تہذیب انسانی کی امامت ہے اور جب وہ اس منصب پر تھے تو ان کے وجود سے دنیا کو ہر پہلو سے خیر و خوبی حاصل ہوئی اور جب سے یہ منصب ان سے چھن کر خدا ناآشنا اور مادہ پرست طاقتوں کی تحویل میں گیا ہے عالمِ انسانی کو ہزار طرح کے گھاٹے لگے ہیں۔ وسعتِ مطالعہ اور تجزیہ حقائق دونوں پہلوؤں سے یہ کتاب پڑھنے والوں کے ذہن کی تعمیر کرتی ہے اور ایمانی شعور و جذبہ دینی ہے۔

مکتبہ اسلام، گوئن روڈ لکھنؤ کی شائع کردہ یہ کتاب مجلد ساڑھے چار روپے میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ پاکستان میں المکتبۃ العلمیہ ۱۵۔ لیک روڈ۔ لاہور کے پتہ سے حاصل کریں۔

آج اسلامی قانون اور اسلامی دستور سے متعلق مطالعہ و کاوش سے اہم موضوعات بن چکے ہیں لیکن ان موضوعات پر اردو کا جامع مواد بہت کم ہے اور قلت سے زیادہ تر اردو زبان میں۔ انگریزی لٹریچر اس پہلو سے تقریباً تہی داماں ہے۔ ایسے عالم میں اسلامک لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن کے نام سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بلند پایہ تحقیقی مقالات زوردار اور پُر اوبیت انگریزی کا لباس پہن کر اعلیٰ معیار طباعت کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ایک نیا وسیع زاویہ نظر ہاتھ آتا ہے اور فکر و کاوش کی نئی راہیں کھلتی ہیں نیز ان شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے جو ہمارے جدید طبقے پر بعض حقائق اسلامی کو براہِ راست جاننے کی وجہ سے پیدا ہوتے اور پھیلتے رہتے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب و ترجمہ میں جناب خورشید احمد صاحب ایم اے کی محنت بڑی ہی قابلِ قدر ہے۔ مقدمہ میں تحریکِ اسلامی اور دستوری جدوجہد پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اختتامیہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت اور کام کا اجمالی تعارف کرایا گیا ہے۔ جماعت اسلامی کی طرف سے انگریزی ترجمہ کے شعبہ نے اسے شائع کیا ہے اور ساڑھے چار روپے فی جلد کے حساب سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

انسانوں کی اجتماعی و تمدنی زندگی میں قدم قدم پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ "کیا واقعہ کیوں رونما ہوا؟" — اور پھر اس سوال کے بطن سے ایک علم جنم لیتا ہے جس کا نام ہے "فلسفۂ تاریخ"! فلسفۂ تاریخ درحقیقت نتیجہ ہے اس کاوش کا کہ تاریخی حوادث میں اور خصوصیت سے تمدنوں اور قوموں کے عروج و زوال میں کیا قانون کارفرما ہے۔ دنیا کا کوئی نظریۂ حیات اور کوئی تمدنی نظام ایسا نہیں کہ جو اپنا ایک فلسفۂ تاریخ نہ رکھتا ہو۔ خود اسلام ایک نہایت درجہ جامع فلسفۂ تاریخ لے کے آیا ہے لیکن افسوس کہ وہ اس دور کی ضروریات کے مطابق منضبط و مدون نہیں ہے بلکہ بکھرا ہوا ہے۔ اس بحث کو کسی نے کھل کر چھیڑا ہی نہیں۔ مغرب کے قائم کردہ نظریات کو پڑھا جاتا ہے اور ان پر اندھا اعتقاد رکھنے پر فخر کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر پہلی جامع کتاب پیش کرنے کا سہرا پروفیسر عبدالحمید صدیقی ایم اے کے سر ہے۔ موصوف کی کتاب "انٹرپریٹیشن آف ہسٹری" (انگریزی) ایک طرف مروجہ نظریاتِ تاریخ کو تنقید کی روشنی میں پیش کرتی ہے اور دوسری طرف اسلامی فلسفہ کو تقابلاً سامنے لاتی ہے۔ کتاب کے اردو ایڈیشن کا ہم پہلے تعارف کرا چکے ہیں، یہ انگریزی ایڈیشن اس سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ چھوٹی سی یہ کتاب مؤلف کی وسعتِ مطالعہ اور ان کی اجتہادی فکر کی مجسم شہادت ہے۔

الحبیب پبلشرز، لاہور نے ایسے شائع کیا ہے مگر افسوس کہ معیارِ اشاعت کتاب کے شایانِ شان نہیں ہے۔ قیمت درج نہیں۔

وہ ہستی جسے انسانیت کے سامنے مونے کا انسان بنا کر پیش کیا گیا اور جسے تہذیب کا واجب الاطاعت لیڈر ٹھہرایا گیا، اس کا مقام عظمت تقاضا کرتا ہے کہ اس کی شخصیت اور اس کے کردار کو ہر پہلو سے سمجھا جائے۔ اسی وجہ سے مسلم رہنمائی نے اس انسانِ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصی اور اجتماعی زندگی کا پورا پورا ریکارڈ عملی زندگی میں بھی محفوظ رکھا اور لٹریچر میں بھی۔ اس سلسلے کے لٹریچر میں "شمائل ترمذی" نام کی ایک قیمتی کتاب پائی جاتی ہے جو اس تاریخی ہستی کے سراپا کو سامنے لاتی ہے اور آپ کے عادات و خصائل، دلچسپیوں اور خصوصیات کو پیش کرتی ہے۔ حافظ محمد بن موسیٰ بن سورۃ ترمذی کی اس کتاب کو مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور نے عربی سے اردو میں منتقل کیا ہے اور نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ روڈ کراچی نے اسے دیدہ زیب طباعتی معیار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قیمت ۸ روپے۔

فارسی لٹریچر کا دور ہمارے ہاں ختم ہو چکا ہے اور شاعری میں "مثنوی" کی اہمیت بھی گھٹ چکی ہے۔ ایسے عالم میں ہمیں ایک فارسی مثنوی بعنوان "الواح زبور" برائے تبصرہ موصول ہے۔ یہ ابوسعید بدر کا نتیجہ فکر ہے۔ شاعر کا جذبہ قابلِ قدر اور زاویۂ نگاہ صحت مندانہ ہے مگر دوسری طرف شعریت کا جوہر کمزور رہ گیا ہے اور رجحان کا نمود بھی۔ مؤلف سے منڈی بہاؤالدین ضلع گجرات کے پتے پر طلب کریں۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

تہذیب کی ماہیت و تعریف متعین کرنے میں عام طور پر لوگوں کا ذہن بہت الجھتا ہے، اور پھر "اسلامی تہذیب" کا مفہوم سمجھنے میں تو اچھے اچھے ذہین و فطین حضرات ٹھوکریں کھاتے ہیں، چنانچہ پنڈت نہرو تک ایک مرتبہ یہ کہتے پائے گئے تھے کہ مسلمانوں کی تہذیب ایک ٹونٹی دار لوٹے اور ایک خاص وضع کے پاجامے پر مشتمل ہے۔ اس موضوع پر "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" کے عنوان سے ایک علمی و تحقیقی کتاب ہمارے سامنے ہے جسے مولانا سید ابوالاعلیٰ کے قلم نے مرتب کیا ہے۔ یہ سلسلۂ بحث کچھ عرصہ قبل ترجمان القرآن میں شائع ہو رہا تھا۔ اب اسے اسلامی مکتبہ نمبر ۱۴۳ بی کلاتھ مارکیٹ پورہ حیدرآباد (دکن) نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۲ روپے ۸ آنے۔ علاوہ محصول ڈاک۔

مولانا مودودی نے علم و تحقیق اور دعوت و تنظیم کا جو کام گزشتہ چند سال میں کیا ہے اس کی وجہ سے ہر طبقے کے لوگوں میں آپ کی سوانح حیات کو معلوم کرنے کی طلب پائی جاتی ہے۔ اس طلب کے جواب میں ایک کتاب "مولانا مودودی۔ اپنی اور دوسروں کی نظر میں" کے دلچسپ عنوان سے مکتبہ الحبیب لاہور نے شائع کی ہے۔ جناب محمد یوسف صاحب اس کے مرتب ہیں۔ یہ معلوماتی تحریروں کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔ خصوصاً اس میں مولانا کے خود نوشت حالات (جو ۱۹۳۲ء میں سید منظر علی صاحب اشہر کے تقاضے پر لکھے گئے تھے) کا اضافہ بہت ہی مفید ہے۔ علاوہ بریں مولانا کے پیدا کردہ لٹریچر میں سے اقتباس نکال کر ان سے ذہن و کردار کی ایک دلچسپ تصویر بنائی گئی ہے۔ ایک حصہ میں دوسروں کے تاثرات دیئے گئے ہیں۔ بعض جگہ انتخاب یا ترتیب کی کمزوری کھٹکتی ہے۔ قیمت مجلد مع خوبصورت گرد پوش ۵/۱۲ روپے۔

تاریخ کے سمندر میں ایک لمبے وقفے کے بعد "اسلام" بہ حیثیت ایک فکری و تہذیبی طاقت کے تحریکی موج بن کر ابھر رہا ہے اور یہ نئی حرکت پورے عالم اسلامی میں یکساں نمایاں ہے۔ یہ ایک ساز ہے جس کے سارے ہی تار ایک ہی نغمہ اگل رہے ہیں۔ اس وقت ایک مصری پیکرِ فکر و عمل، ایک پرخلوص نوجوان سعید رمضان کی لکھی ہوئی چھوٹی سی کتاب "معالم الطریق" (عربی) ہمارے سامنے ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے عالم اسلامی کے تمام فعال اور ذمہ دار عناصر کو مخاطب کر کے قیمتی موادِ فکر ان کے سامنے رکھا ہے۔ تاریخ پر چھچلتی سی نگاہ ڈال کر اس کشمکش کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس سے مسلمان من حیث المجموع گزر رہے ہیں اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اسلامی فکر اور اسلامی نظام کی علمبرداری کی دعوت دی گئی ہے۔ بڑی خوبی سے ان چند اوراق میں اسلام کے "اعتقادی، سیاسی، معاشرتی اور بین الاقوامی اصول و تصورات کو مرتب کیا گیا ہے۔ مؤلف کی وسعتِ مطالعہ ہر سطر سے جھلکتی ہے۔ طباعتی حسن دادطلب ہے۔ "ادارۃ المسلمون"

دمشق و سوریا — سے طلب کی جا سکتی ہے۔ تفصیلی اظہار رائے کے لئے اسے ہم نے دیر تک روکے رکھا مگر بالآخر بات اجمالی تعارف تک ہی رہ گئی۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی (ایم اے) کے ذہنِ رسا نے ایک بڑا ہی گہرائی دار موضوع بحث پیدا کر کے ایک کتاب "عقیدۂ ختم نبوت کے چند عمرانی پہلو" کے نام سے پیش کی ہے۔ اس میں دکھایا یہ گیا ہے کہ محمد مصطفےٰ صلعم پر سلسلۂ نبوت کے آکر ختم ہو جانے کا عقیدہ اسلام میں بڑی بھاری تمدنی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے ترک و انحیا سے بڑے وسیع نتائج نمودار ہوتے ہیں۔ یہ قادیانیوں کے فتنہ انگیز علم کلام کا علمی توڑ ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کی بعض غلط فہمیوں کے لئے سامانِ ازالہ! مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی (پاکستان)، اچھرہ، لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد ۱۰ آنے۔

ادبیات ؛

علی سفیان آفاقی دائرۂ صحافت میں ایک متعارف شخصیت ہیں۔ آپ کے قلم نے ایک جولانگاہ طنز و مزاح کے میدان میں بھی پیدا کی ہے۔ آپ کی اس سلسلے کی چند تحریروں کا مجموعہ "تکلف برطرف" کے نام سے مکتبہ چراغ راہ لاہور و کراچی نے شائع کیا ہے۔ مختصر رائے ظاہر کرتے ہوئے ہم یہ عرض کریں گے کہ ان تحریروں میں سے زندگی کے مسائل جھانکتے نظر آتے ہیں اور آفاقی صاحب کے مزاح آمیز طنز میں مقصدیت جلوہ گر ہے۔ فنِ طنز کے لحاظ سے یہ تحریریں ایک امید افزا آغاز سے ترقی کی منزلوں کی طرف اچھی رفتار سے بڑھتی نظر آتی ہیں۔ طباعتی معیار اچھا ہے۔ قیمت ۲/- روپے۔

ہمارا حلقۂ قارئین آہستہ آہستہ ایک نئے مقصدی ادیب سے روشناس ہو رہا ہے۔ وہ ہیں سید نظر زیدی! ہم موصوف کی ایک کتاب "وادی" پر انہی اوراق میں پہلے تبصرہ لکھ چکے ہیں۔ اس وقت سید صاحب کا ایک ناول "نئے چراغ" کے نام سے اظہار رائے کے لئے موصول ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم تفصیلی تبصرہ لکھنے کا موقع نہیں رکھتے۔ مجملاً ہمارا تأثر یہ ہے کہ اس ناول کے پلاٹ اور کرداروں کا تعلق شروع سے آخر تک ہماری واقعی زندگی — قومی زندگی اور تاریخ — سے استوار ہے۔ پچھلے دس پندرہ سال کی کانگریس، مسلم لیگ کی سیاسی آویزش کی متحرک تصاویر ہمیں دکھائی دیتی ہیں اور اس آویزش کے مراحل سے ناول کے متنوع کردار اپنی اپنی نفسیات اور اپنے اپنے معاشرتی مرتبے کو لئے ہوئے مختلف انداز سے گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔ خصوصاً عباس (مرکزی کردار) سراسر ایک ٹریجڈی ہے، مگر ساتھ ہی سراسر ایک کامیڈی! خلاف نے "پڑا احمد" کی زبان سے ناول جو جذبہ ہمیں دیتا ہے وہ یہ ہے کہ "وہ میں اس گھروندے تاریکی سے کبھی ہار نہ مانوں گا — کبھی نہیں، قیامت تک نہیں! ایک چراغ احمد ہے جسے احمدؔ! ناول یا اس کا مصنف روشن رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چراغ محبتِ انسانی کا چراغ ہے! اس ناول کو "کتاب منزل" کشمیری بازار، لاہور نے شائع کیا ہے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش ۳/- روپے۔

طوفان نئے نئے ہیں تو پھر بیاں "نئے سفینے" درکار ہیں ہی! اس معنی خیز عنوان سے ادارۂ ادبِ اسلامی، حیدر آباد دکن نے اپنے اجلاس سالانہ میں پیش ہونے والی نظم و نثر نگارشات کا ایک مجموعہ پیش کیا ہے۔ ایک پہلو سے ہم اس کام کو بڑی محبت بھری نگاہ و قدر سے دیکھتے ہیں کہ یہ ایسے دل گردے والے نوجوانوں کا حاصلِ محنت و کاوش ہے جنہوں نے ہمارے کے خلاف نئے سفینے تیرانے کی جسارت کی ہے۔ دوسرے پہلو سے خیر خواہانہ جذبۂ نقد کے تحت ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں اس مجموعے میں جوہرِ تخلیق کے اچھے اچھے مظاہر ملتے ہیں، وہاں بہت سی چیزیں بالکل کچی کچی بھی ہیں — اوپر سے غضب یہ ہوا کہ معیارِ طباعت غیر معمولی حد تک پست رہ گیا۔ ٹائٹل بساغنیمت ہے۔ قیمت ۱۰ آنے۔

جرائد کے خاص نمبر :

• "فاران" کراچی کا ضخیم "سیرت نمبر" (جنوری ۱۹۵۶ء) سامنے ہے۔ اس کے مدیر جناب ماہر القادری کے رگ و پے میں محبت جناب رسالت مآب ﷺ بسی ہے یہ اور نمبر موصوف کی ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل ہے۔ اس کی ترتیب میں ماہر صاحب نے بہت سی علمی و دینی شخصیتوں کا تعاون حاصل کرنے میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ چنانچہ عنوانات میں دلکش تنوع ہے۔ موس تحقیقی مقالات ہی ہیں، ہلکی پھلکی تحریریں بھی، اور رسمیہ نعتیہ شاعری کا قر

جیسے ایک پورا گل کدہ زینتِ اوراق ہے۔ اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دورِ عالم کی عظیم ترین شخصیت کی ایک مکمل تصویر اس اشاعتِ خاص کو پڑھ کر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ سرورق بہت خوشنما۔ صفحات ۳۲۰۔ قیمت سیرت نمبر ڈھائی روپے۔

• خواتین کے لئے ایک جریدہ "حرم" کے نام سے لاہور سے نکلتا ہے۔ اس کا سالنامہ جنوری ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ہے۔ سرسری جائزے یہ ہے کہ اس میں جو مضامین جمع کئے گئے ہیں ان کی زیادہ تعداد معیاری و مقصدی نوعیت رکھتی ہے۔ بمقابلہ فی مواد عام سطح سے تجارتی و بازاری رسائل نے جو سستا چٹخارہ لوگوں میں پیدا کر دیا ہے حرم کی مدیرہ جناب ظہیرہ بیگم اس کی ڈگر پر نہیں چلیں۔ البتہ سرورق پر رنگین زنانہ تصاویر ایسے انداز سے آتی ہیں کہ ہمیں "عورت" کا یہ استعمال پسند نہیں آیا — اور وہ بھی ایک عورت ہی کی ادارت میں! سالنامہ کی قیمت عہ۔ مقامِ اشاعت ۷۵ میکلوڈ روڈ لاہور۔

پندرہ روزہ "قندیل" (حیدرآباد سندھ) کا سالنامہ بھی موصول ہو چکا ہے۔ بچوں کا یہ خاص رسالہ اسلامی فکر و کردار کی آبیاری کا مقصد سامنے رکھتا ہے اور معلومات افزا مواد کو دلچسپ انداز میں پیش کرتا ہے۔ ۱۴۴ صفحات کے اس خاص نمبر میں نظم و نثر کی بہت ساری چیزیں تنوع کی خوبی کے ساتھ ہیں، تعلیمی چیزیں بھی ہیں اور تفریحی بھی۔ قیمت سالنامہ عہ۔

جرائد:

موصول شدہ تازہ جرائد میں سے وجۂ اول پر قابلِ ذکر "البعث الاسلامی" ہے جو عربی زبان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زیرِ نگرانی ۱۹۵۸ء گوئن روڈ لکھنؤ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کا مقصد دین کی بنیادی دعوت کو پیش کرنا اور دلوں میں نئی تحریک پیدا کرنا ہے۔ اداریہ بعنوان "الاخلاص والنظام"۔ مولانا علی میاں کا مقالہ "الکتب التی عشت فیہا"، "الشاعر الفدائی اجنبشہ"، "الادب الاسلامی"، "قراءت لک"، "علم النفس الجنسی"، دلچسپ نگارشات پیشِ نظر شمارے کی زینت ہیں۔ ہم اس جریدے کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ عربی داں حلقوں میں انشاء اللہ یہ مقبول ہوگا اور سرزمینِ ہند و پاک کا ذہنی رشتہ عالمِ عرب سے ملا دے گا۔ قیمت فی شمارہ ۸ آنے، چندہ سالانہ ۵ روپے۔ کاش کہ اس کی اشاعت ٹائپ میں ہو سکے۔ یوں طباعت، کتابت خاصی اچھی ہے۔

— "اسلامک تھاٹ" (انگریزی) انڈیا کے چند بیدار دل اور حساس نوجوانوں نے ایک علمی و تحقیقی ادارہ "اسلامک اسٹڈی سرکل" کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس ادارہ کا منشا یہ ہے کہ اسلامی نظریہ و فکر رکھنے والے نوجوان مختلف علمی میدانوں میں تنقیدی اور اجتہادی ذہن کے ساتھ مطالعہ و تحقیق کا کام کریں اور اسلامی فکر کو مختلف میدانوں میں اجاگر کرنے کے لئے تجربات کریں۔ اسی ادارہ کی نگرانی میں یہ دو ماہی رسالہ شائع ہوتا ہے اور اس کی ہر اشاعت میں علمی و تحقیقی مقالات اور مختصر مباحث پیش کی جاتی ہیں اور پھر ان پر تنقیدی تاثرات بھی شائع ہوتے ہیں۔ مختلف سوالات اور تجاویز اور مشورے بھی سامنے آتے ہیں۔ علمی ذوق رکھنے والے عناصر کے لئے اس کا مطالعہ بہت موجبِ دلچسپی ہوگا۔ نیز پروفیسر صاحبان اور طلبہ کے لئے بھی اس میں بہت افادیت ہے۔ چندہ سالانہ تین روپے فی پرچہ ۸ آنے۔ مسٹر ایف آر فریدی اور ایم ان صدیقی اس کے مدیر ہیں۔ پتہ: منیجر اسلامک تھاٹ رامپور۔ پاکستان میں ترسیلِ زر کا پتہ: مسٹر منظور احمد ۱۳/۱ اسٹیچین روڈ کراچی۔

— "الجامعہ" بادارت جناب صوفی صاحب، مقامِ اشاعت جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ، سالانہ چندہ ۵ روپیہ۔ اسلامی نظامِ تعلیم کا ترجمان ہے۔

— "الارشاد" بادارت [illegible] مقامِ اشاعت [illegible] کراچی۔ چندہ سالانہ ۵ روپیہ۔ اہلِ حدیث مسلک کا ترجمان ہے۔

— "افسانہ" بادارت محمد غفور خاں، مقامِ اشاعت اسلامیہ اسٹریٹ [illegible] لاہور۔ چندہ سالانہ ۴ روپے۔ متنوع افسانوی ادب پیش کرتا ہے۔

— "تبیان" بادارت [illegible] محمد فیض علی فیض، مقامِ اشاعت [illegible] ضلع گوجرانوالہ۔ چندہ سالانہ ۲ روپے۔ مذہب، اخلاق اور تصوف اس کا مرکزی موضوع ہے۔

کتابچے: "تکمیلِ سنتِ اسلام" از جناب فضل احمد [illegible] قیمت عہ۔ پتہ: ادارۂ تبلیغ الاسلام فضل پریس، گاڑی کھاتہ حیدرآباد سندھ۔ — "رسالہ [illegible]" از جناب ابومحمد عبدالستار صاحب دہلوی۔ قیمت کا اندراج نہیں۔ پتہ: دفتر جمعیت تبلیغ غرباء اہلِ حدیث، محمدی مسجد، [illegible] روڈ، کراچی۔ — "کیلنڈر و معلومات کی نرقی" [illegible] از جناب سید پرویز رضوی صاحب۔ بلا قیمت۔ پتہ: مکتبہ تعمیرِ انسانیت، چوک [illegible] لاہور۔ — "جماعتِ اسلامی کے خلاف فتووں پر ایک نظر" از جناب وحید الدین خان صاحب، قیمت ۱۲ء۔ پتہ: اسلامک پبلشنگ ہاؤس، باقی منزل، [illegible] اعظم گڑھ۔ — "جماعتِ اسلامی کے متعلق مولانا رحمانی کے تبصرہ کا جائزہ"

(باقی بر صفحہ ۵۱)

قرآن کا مکمل نصاب از مولانا محفوظ الرحمٰن نامی		مفتاح القرآن	حصہ چہارم	۱/۴
نی قاعدہ عربی ۵ر، اردو ۵ر		مفتاح القرآن	، پنجم	۱/۸
اح القرآن حصہ اول	۵ر	معلم القرآن		۱/۴
اح القرآن ، دوم	۲ر	استاذ العربیہ	عبدالسلام نعمانی	۱/-
اح القرآن ، سوم	۱/-	معلم الانشاء	مولانا عبدالماجد دریابادی	۲/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ چراغ راہ کراچی

بقیہ: آپ کیا پڑھیں ص ۴۸

لدین رام نگری قیمت ۶ر، پتہ: مکتبہ تعمیر انسانیت، فریر روڈ سکھر ۔ ــــ "تجدید و احیائے دین پر شرعی دفقطہ" تبصرہ: شیخ محمد علی حسین مہاجر مدنی ۔ نہیں پتہ محمد احمد رضوان جہانگیر آباد، بھوپال ۔ ــــ "بودری جماعت" از سید احمد علی معتمد بزم ادب، شہداد پور ۔ قیمت ۲ر ۔ ــــ "دستور اسلامی محمد بی اے، ایل ایل بی ۔ قیمت چھ آنے ۔ پتہ نامعلوم ۔ ــــ "حلقہ ہائے متفقین جماعت اسلامی کا تعمیری پروگرام" از جناب محمد سلیم صاحب پتہ مکتبہ جماعت اسلامی سرگودھا ۔ ــــ "نئے عہد کے دروازہ پر" از وحید الدین خاں قیمت ۲ر، پتہ: اسلامک پبلشنگ ہاؤس باقی منزل، بدر قہ اعظم گڑھ فی غلط بیانی از پروفیسر الیاس برنی قیمت نامعلوم پتہ: بیت الاسلام بیف آباد حیدر آباد دکن ۔

ں اور لڑکیوں کے لئے آسان لٹریچر:

پائے رسولؐ" اور "ہمارے نبی کے صحابہ" جناب اعجاز الحق صاحب قدوسی کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں اول الذکر میں نبی اکرمؐ کی شخصیت اور کردار کی تصویر مستند ملکہ پیش کی گئی ہے اور موخر الذکر میں صحابہ کرامؓ کا نقشہ زندگی مختلف دینی و اخلاقی عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں کو مکتبہ فلاح انسانیت اور زیب معیار اشاعت کے ساتھ شائع کیا ہے ۔ قیمت علی الترتیب ۱۲ر و ۳ر ۔

سلسلہ کی ایک کتاب "ہادی اعظم" ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ لکھنے والے ابو خالد ایم اے ہیں ۔ زاویہ نظر، زبان، ترتیب مباحث اور معیار اشاعت، ہر لحاظ ر پیش کش ہے ۔ اسے مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور نے شائع کیا ۔ قیمت حصہ اول ۵ر حصہ دوم ۸ر

جماعت اسلامی (ہند) رام پور ہی کی شائع کردہ ایک کتاب "موتیوں کا ہار" آئی ہے جو افضل حسین ایم اے، بی ٹی کے قلم سے ہے ۔ اس میں لڑکیوں کے یان میں مختلف اخلاقی عنوانات کے تحت اسلامی تاریخ کے موتی جمع کئے گئے ہیں یہ اپنے سلسلہ کا تیسرا حصہ ہے ۔ قیمت ۵ر ۔

کتاب گھر، دار الادب، قصور نے "خوش رنگ پھول" اور "قہقہے" نام کی دو کتابیں نذیر احمد ناظر صاحب کے قلم سے شائع کی ہیں پہلی کتاب میں بچوں کے لئے حمد و نعت ت اور اخلاقیات سے متعلق اچھی نظمیں ہیں ۔ دوسری کتاب منظوم لطیفوں پر مشتمل ہے ۔ قیمت ۶ر اور ۵ر ۔

نی اور جعفر اور عبدالواحد رحیمی کا لکھا ہوا "تعمیری قاعدہ" پہلے متعارف کرایا جا چکا ہے، اب دوسرا ترمیم شدہ اور ترقی یافتہ ایڈیشن آیا ہے ۔ اپنے میدان میں ایک اچھی کوشش ہے ۔ قیمت ۲ر نا صاحب نے عربی سے بچوں کے لئے متعدد کہانیاں ترجمہ کی ہیں ۔ اسی سلسلے کی ایک کہانی "سفید پرندے" ہے زبان آسان ہے، پلاٹ دلچسپ اور معیار اشاعت اچھا المکتبۃ العلمیہ، ۱۵ لیک روڈ، لاہور نے شائع کی ہے ۔

...ted at Nazir Printing Press, McLeod Road, Karachi & Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS, Arambagh Road, K... M... ...ed M. Chaudhri

چراغ راہ



مارچ ۱۹۵۶

مرتبہ

نعیم صدیقی

"روشنی ـــــ گرمی ـــــ حرکت"

ماہنامہ

چراغ راہ

کراچی

مارچ ۱۹۵۶ء

جلد ۹ | شمارہ ۳

مندرجات

چندہ سالانہ :- ۵/- روپے ـــ فی پرچہ :- ۸ آنے

دفتر اشاعت و انتظام :ـــــ ونیا بلڈنگ آرام باغ روڈ ـ کراچی ۱

دفتر ادارہ تحریر :ـــــ ۱۱ ـ شاہ جمال ـ اچھرہ ـ لاہور

چوہدری غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر چراغ راہ ، آرام باغ روڈ کراچی سے شائع کیا ـ

سوچ بچار

دو ذہن ۔۔۔ آمنے سامنے

ادارہ

ہم ایک قوم ہیں مگر ہمارے اندر دو متضاد رجحانات کام کر رہے ہیں۔ عام لوگوں کے لئے اپنی ملی آئیڈیالوجی میں جاذبیت ہے لیکن ان کے ایک مختصر سے ٹولے کے فکر و کردار پر لادینی خیالات کی چھاپ اتنی گہری پڑ گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ذاتی و گروہی مفاد کی بدمستی میں بے اصولے پن اور کردار باختگی کا ایک ایسا کوڑھ لگ گیا ہے کہ انہیں اپنے ملی سرمایۂ معتقدات اور آبائی ورثۂ روایات سے ایک سخت کد ہو گئی ہے۔ عام لوگ اپنے آپ کو اسلام سے ہٹا ہوا پا کر شرمسار اور پشیمان ہوتے ہیں اور ایک ہُڑک ان کے دلوں میں اٹھتی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے شاندار نظام تمدن کی جنتِ گم گشتہ کو واپس حاصل کر سکیں۔ لیکن عوام کے اس جذبے کو دیکھ کر ان کے بعض بگڑے ہوئے سربراہ کار خوش ہونے اور اس سے مفید اثر لینے کی بجائے اُلٹا غیض و غضب کے سخت ہسٹریائی دورے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ عوام کا ساتھ دینے اور ان کو سہارا دینے کی بجائے ان کا منہ نوچنے پر اُتر آتے ہیں اور جو اول فول منہ میں آتا ہے۔ فرفر ارشاد فرماتے چلے جاتے ہیں۔ گویا ہمارے عالمِ افکار کا معاملہ کچھ یک بام و دو ہوا کا سا ہو گیا ہے۔ گویا ہمارے قومی عزائم اور حوصلوں کی ہوئے رواں پھٹ کر دو دھاروں میں منقسم ہو گئی ہے۔ گویا ہمارے خیالات کے سمندر میں گرم اور سرد رو دو رویں متقابلاً چل رہی ہیں۔ ہمارا ذہن، ذہنِ دونا ہو گیا ہے۔ ایک ذہن نہیں رہا ۔ دو ذہن ہو گئے ہیں۔ اور یہ دونوں ذہن ہر جگہ آمنے سامنے دکھائی دیتے ہیں، ہر جگہ ان میں کھچاؤ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ ہماری سب سے اونچی ہیئتِ اجتماعی ۔ دستوریہ ۔ میں بھی یہ دونوں ذہن متصادم دکھائی دیتے ہیں۔ آیئے، ہم دو ایسے لیڈروں کا ذہنی مطالعہ کریں جن کے اندر دو مختلف رجحانات بول رہے ہیں۔ یہ درحقیقت دو اشخاص کے بول نہیں ہیں، یہ دو زاویہ ہائے نظر اور دو اسالیبِ فکر الگ الگ چھنٹ کر نمایاں ہو رہے ہیں۔

ایک ذہنیت کے ملفوظات ملاحظہ ہوں:-

- "اسلام وہ رشتہ نہیں ہے جس نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے جوڑا ہے۔ واحد رابطہ یہ ہے کہ ایک حصہ دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر واقعتہً صرف اسلام ہی وجہ رابطہ ہے تو آخر کیوں نہیں یہ اس خطے کے مسلمانوں کو دوسری مسلم ریاستوں کے مسلمانوں سے جوڑ دکھاتا۔"
- "ہم تہ دل سے اسلام پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن یہ کہنا ایک جھوٹ ہو گا کہ اس (زیرِ بحث) دستور کے نفاذ کے بعد پاکستان اسلامی جمہوریہ یا اسلامی ریاست بن جائیگا۔"
- "یہ بات (یعنی صدر ریاست کے مسلم ہونے کی شرط مقرر کرنا) قطعی طور پر غیر ضروری ہے، نیز عوام کی ذہانت کی توہین ہے۔"
- "پاکستان کو اسلامی ریاستؔ کا نام مت دیجئے، جب کہ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں، جبکہ وہ زندہ رہنے کے لئے اپنے جسموں کو بیچتے

لہ چنانچہ سب سے پہلے تو خود مقرر نے اپنی پارٹی کے نام سے لفظ "مسلم" کو خارج کر دیا ہے، بعید نہیں کہ وہ اپنے آپ کو بھی مسلم کہلانے سے باز آ جائیں۔

پھرتے ہیں اور عجب کہ عیاشی غربت کے پہلو بہ پہلو جاری ہے۔"

"تاوقتیکہ مسودۂ دستور میں یہ دفعات موجود رہیں کہ یہ (پاکستان) ایک اسلامی جمہوریہ ہوگا اور اسلام سے مطابقت رکھنے والے قوانین پاس نہیں کئے جائیں گے، یہ لازماً انتشار پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ سوال اٹھے گا کہ کیا چیز کتاب آئین میں لی جا سکتی ہے اور کیا نہیں؟ اگرچہ یہ پیش بندی کر لی گئی ہے کہ مجلسِ قانون ساز ہی کسی قانون کو منظور کرنے میں آخری مجاز ہوگی لیکن مقننہ کے ارکان تدوین قانون کے لئے بننے والے علماء کے کمیشن کی سفارشات کے خلاف جانے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ مقننہ کے کسی ممبر کے لئے علماء سے اختلاف کرنا ممکن نہ ہوگا کیوں کہ اس صورت میں ملّا[1] اسے کافر یا کافروں کے زیر اثر و تسلط قرار دے گا۔"

"اساسی قوانین (. میں ایک دفعہ یہ ہے کہ پاکستان میں غلامی نہیں ہوگی۔ دوسری طرف اسلام نظامِ غلامی کو تسلیم کرتا ہے اور جنگ میں گرفتار شدہ افراد کو غلام اور لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ یہ صورت، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، شبہات اور انتشار پیدا کرے گی۔ [اس موقع پر میاں جعفر شاہ صاحب نے فاضل مقرر سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "کیا میں فاضل مقرر سے دریافت کر سکتا ہوں کہ آیا غلامی اسلام میں جائز ہے؟" مقرر نے دوران تقریر میں کہا:۔]

"اس کا فیصلہ تو ملّا لوگ کریں گے!"

"اسلامی ریاست تو ایک نصب العین ہے کوئی ریاست اسلامی ریاست نہیں کہلا سکتی جب تک کہ اس کا معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی نظام اسلامی نہ ہو۔ پاکستان ایسی ریاست نہیں ہے۔ پس (وزیر اعظم کو خصوصی توجہ دلاتے ہوئے) یہ ہم سب کا فرض ہے کہ ہم مکاری کا خاتمہ کر دیں۔ مکاری اسلام میں گناہ کبیرہ ہے۔ منافق پر قرآن مقدس میں خصوصی طور پر نفرین بھیجی گئی ہے۔ آؤ ایسا کریں کہ پاکستان ایک ایسی ریاست نہ بنتے جو اسلامی ریاست ہونے کی مدعی ہو کیوں کہ وہ درحقیقت یہ نہیں ہے۔"

"اسلام کو بالعموم پاکستان میں سیاسی اغراض کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ حکمران پارٹی ایسی ترقی دشمن طاقتوں کی حوصلہ افزائی نہ کرے جن کی ہمت اگر بندھائی گئی تو وہ ملک میں ایک متوازی حکومت قائم کر لیں گی ― ایک متوازی عدلیہ، ایک متوازی انتظامیہ ― جس کے زیر سایہ لوگوں کو کوڑے لگائے جائیں گے، ان کے اعضا کٹیں گے اور وہ پتھر مار مار کر ہلاک کر دیئے جائیں گے۔"

"میں نہیں سمجھ سکا کہ مسودۂ دستور کے مصنفین آخر کیوں اسے اسلامی ریاست پکارنے پر اتنا اصرار کر رہے ہیں جبکہ مشکل ہی سے خود اس مسودہ میں اسلام کا کوئی سراغ مل سکتا ہے۔ یہ بات نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونی دنیا میں بھی اسلام کے متعلق بہت برا تاثر پیدا کرے گی۔ اس طرح سرے سے اس کو اسلامی ریاست کہنے کا اعلان کردہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اس سے بچئے۔ اپنے حق میں مخلص بنئے، اپنے ملک کے حق میں مخلص بنئے اور اپنے دین کے حق میں مخلص بنئے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ ملک میں جا کر یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ یہ لوگ اسلام کے علمبردار ہیں۔ اس طرح آپ لوگ عوام کو سبز باغ دکھانے کے قابل ہو سکتے ہیں ― ان سادہ عوام کو جو اسلام میں اندھا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ آپ اسلام کے نام پر کرتے ہیں۔"

"مہربانی فرما کر مجھے بتایئے کہ اس (یعنی صدر اور نائب کے لئے مسلم ہونے کی شرط عاید کرنے والی دفعہ) کی ضرورت کیا ہے؟

[1] مقامِ عبرت یہ ہے کہ جس عنصر کو یہ ذہن اس شان سے گالی دیتا ہے، اسی کے اندر کے کچھ بزرگوں کی طرف سے خود فاضل مقرر کو اشیر باد حاصل ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ملک جس میں مسلمانوں کی آبادی کی غالب اکثریت ہو، اس میں ایک غیر مسلم صدر یا نائب صدر ہو سکتا ہے۔ یہ دفعہ عوام کی ذہانت کی توہین ہے۔ ـــــ اقلیتوں کی خواہ مخواہ کی تذلیل ہے۔ لیکن آپ جب یوں ان کی تذلیل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ان کی ایک تحسین بھی کرتے ہیں ـــــ یہ کہ یہ ریاست جس میں اسلام کا سکہ رائج ہوگا، جہاں نظم و نسق کو اسلامی خطوط پر چلایا جائے گا، وہ سراسر اپنی دیانت، خوبی اور قابلیت کے بل پر ان اونچے عہدوں تک جا پہنچنے کے اہل ہیں۔ کیوں کہ آپ نے اس امکان کا سدِباب کرنے کے لئے ہمارے حق میں ایک تحفظ کا اضافہ کیا ہے۔"

— "میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اسلامی قوانین کی تعبیر کا معاملہ محترم اربابِ مذہب پر چھوڑا گیا تو یہ صورت لاینحل مشکلات پیدا کر دے گی۔ یہ دفعہ سخت خطرناک امکانات سے مملو ہے۔"

[اس مرحلے پر وزیرِ قانون نے مقرر کو توجہ دلائی کہ وہ مسودہ کی جس دفعہ نمبر ۳۲ کا حوالہ دے رہے ہیں وہ ایک مستقل دفعہ ہے اور اس کی تعبیر کو علماء پر نہیں چھوڑا گیا۔ مقرر نے دورانِ تقریر ہی میں جوابی بات کہہ دی۔]

— "مجھے افسوس ہے کہ وزیرِ قانون نے میرا نکتہ اخذ نہیں کیا۔ نکتہ یہ ہے کہ مسودہ میں ایک دفعہ ایسی ہے جو کہتی ہے کہ صدرِ ریاست کو مسلم ہونا چاہئے۔ لیکن کون یہ فیصلہ کرنے والا ہوگا کہ مسلم کون ہے .... مشکل اس وقت پیدا ہوگی جب آپ کو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ صدرِ ریاست کو اسلام کے کس فرقے سے وابستہ ہونا چاہئے۔ کیا اسے حنفی مسلم ہونا چاہئے، ایک وہابی مسلم، ایک شیعہ مسلم، یا ایک قادیانی مسلم؟ تعبیر کی یہ پیچیدگی، جیسا کہ کل یہاں بیان کیا گیا ہے، وہی مشکل پیدا کر دے گی جو پنجاب میں اتنے بڑے خون خرابے کا موجب ہوئی تھی۔"

— "یہ انتہائی مہمل بات ہے کہ جانبِ مقابل کے مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں، ہر طرح کے انتظامی امور کو ان کے ساتھ زیرِ بحث لاتے ہیں، نظم و نسق میں ان کو حصّہ دیتے ہیں اور ان کی مدد سے اسلامی قوانین کو ترتیب دیتے ہیں اور پھر اس سب کچھ کو خالص اسلامی اور مطابقِ معمول قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب ہم مخلوط انتخاب کے سوال پر ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے بحث چھیڑتے ہیں تو ہمیں ہندوؤں اور کمیونسٹوں کے آلہ ہائے کار کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔"

— "ملک کو اسلامی ریاست کا نام دے کر آپ ہندوستان کے مسلمانوں کے مفادات کو سخت خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ کیا ان کی طرف سے آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ ـــــ کیا آپ ان سے اپنے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔"

آپ بھول جائیے اس بات کو کہ یہ الفاظ حسین شہید سہروردی نام کے ایک بزرگ نے جو جناح عوامی لیگ کے لیڈر ہیں، بحیثیت رکنِ دستوریہ ہمارے سب سے بڑے ایوان میں اپنی زبانِ مبارک سے صادر فرماتے ہیں۔ آپ یوں سوچئے کہ یہ ہمارے اندر کا ایک خاص رجحان بول رہا ہے، یہ ایک نظریہ کی آواز ہے، یہ ایک طبقے یا عنصر کا اظہار ہے۔ اس طبقے یا عنصر یا ذہن کا تجزیہ کیجئے تو حسبِ ذیل قابلِ غور پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱۔ یہ ذہن ایک افسوسناک ننگے تضاد کا شکار ہے، یعنی یہ دو ٹکراتی باتیں بیک دم کہتا ہے: ایک یہ کہ ہم تہِ دل سے اسلام پر ایمان رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ پاکستان کو اسلامی ریاست نہیں ہونا چاہئے، اسے ایک غیر اسلامی ریاست ہی کا کام کرنا چاہئے۔

۲۔ یہ پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دیئے جانے کے لئے حسبِ ذیل دلائل پیش کرتا ہے: (ل) ـــــ زیرِ بحث مسودۂ دستور کے نفاذ سے

پاکستان اسلامی ریاست نہیں بن سکتا (اور یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ اس میں کیا ترامیم و اضافے ہونے چاہئیں کہ اس کی بنیاد پر اسلامی ریاست استوار ہوسکے)۔ ب ــــ پاکستان کو اسلامی ریاست کا نام اس وقت تک دینا جائز نہیں جب تک لوگ معاشی مشکلات میں مبتلا ہیں اور جب تک اقتصادی دائرے میں بے جا اونچ نیچ موجود ہے۔ (یعنی پہلے عملاً ایک ریاست کو اسلامی خطوط پر اپنی ساری تعمیر تو مکمل کر لینی چاہئے اور پھر اس کے بعد کہنا چاہئے کہ ہم اسلامی ہوں۔ کیوں نہ اس اصول کو فرد پر بھی چلایا جائے کہ جب تک ایک شخص عملاً معیاری مسلمان نہ بن جائے وہ کلمۂ اسلام پڑھنے اور اپنے آپ کو مسلم کہنے سے باز رہے؟ ــــ کیا یہی صورت خود مقرر یا اس کے طبقے کے دوسرے افراد اپنے لئے اختیار کئے ہوئے ہیں؟ ــــ نہیں بخلاف اس کے وہ تو دھڑلے سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اسلام پر تہ دل سے ایمان رکھتے ہیں) ج ــــ ریاست کو اسلامی قرار دینے سے انتشار پیدا ہوگا (یعنی اسلام آئے تو وہ وجہ انتشار، اور کفر کا دور دورہ ہو تو وہ امن اور شانتی کا ضامن!)۔ د ــــ مسودۂ دستور میں چونکہ اسلام کا نام و نشان موجود نہیں ہے۔ اس لئے جائز نہیں کہ ریاست کو اسلامی کہا جائے۔ (سوال یہ ہے کہ فاضل مقرر اور ان کے ہم فکر عنصر نے اس مسودہ میں اسلام کا نام و نشان پیدا کرنے کے لئے کیا ترامیم و تجاویز دی ہیں؟) ہ ــــ اسلامی ریاست اس لئے بھی نہیں ہونی چاہیے کہ حکمران حضرات اسلام پر اعتقاد رکھنے والی پبلک کو اسلام کے نام پر فریب دیتے پھریں۔ (یہ اعتراض تو ہر اچھی چیز پر اٹھایا جا سکتا ہے، مثلاً جمہوریت کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت نہیں اختیار کی جانی چاہئے اور پاکستان کو جمہوری ریاست نہیں قرار دیا جانا چاہئے، ورنہ حکمران طاقت جمہوریت کا نام لے لے کر عوام کو دھوکا دے گی)۔ و ــــ اسلام اور اسلامی قانون کی تعبیر اور مسلم ہونے کی تعریف میں اختلافات برپا ہوں گے۔ (اور کس چیز میں یا کس نظریے کے تحت اختلافات نہیں ہوتے؟) نیز ان امور میں علمائے اسلام کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ (سوال یہ ہے کہ دنیا میں جو بھی نظام چلتا ہے اس کے نظریہ و قانون کا علم رکھنے والوں کی اہمیت بڑھتی ہے۔ کیا اس سے بچنے کے لئے یہ طے کیا جائے کہ اسلامی امور میں صرف وہی رائے دے گا جو اسلام سے جاہل ہوا کرے۔ ص ــــ اسلامی ریاست بننے میں ہندوستانی مسلمانوں کا مفاد غارت ہو جائے گا (اور اگر کل کلاں ہندوستانی مسلمانوں کا مفاد اس کا تقاضا کرنے لگے کہ ہم سب مرتد ہو جائیں تو؟)

(۳) اس ذہن میں اسلام کی جو ڈراؤنی تصویر سنی سنائی باتوں اور مستشرقین کی تحقیقاتوں نے بھر دی ہے، وہ ان اجزا پر مشتمل ہے: (الف) اسلامی ریاست ہوگی تو جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنایا جائے گا۔ (ب) لوگوں کو کوڑے لگیں گے، ہاتھ کاٹے جایا کریں گے اور پتھر مار مار کر ان کو ہلاک کیا جائے گا (ج) ترقی دشمن طاقتیں زور پکڑ جائیں گی اور وہ متوازی عدلیہ و انتظامیہ قائم کر لیں گی۔ یہ ہیں معلومات اسلام کے متعلق اس ترقی پسند ذہن کی اور یہ ہے مطالعہ اس دین کا جس پر تہ دل سے ایمان رکھنے کا ادعا کیا جاتا ہے۔

(۴) سب سے بڑی الجھن اس ذہن کی یہ ہے کہ یہ اسلامی ریاست قائم ہونے کی صورت میں اس امر کا خطرہ درجۂ اول پر محسوس کرتا ہے کہ اسلام پسند عنصر آگے بڑھے گا اور اقتدار پر دو صدیوں سے قائم شدہ اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اس خطرے کی وجہ سے اس ذہن میں ایک چڑ سی اسلام پسند طاقتوں کے حق میں پیدا ہو گئی ہے اور اس چڑ کا اظہار اس انداز گفتگو سے ہوتا ہے کہ ان طاقتوں کو "ملا" اور "ترقی دشمن" ہونے کی گالی دی جاتی ہے۔ اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ اختلاف اور انتشار کا موجب ہوں گی۔ یہ ایک طرح کا تعصب بول رہا ہے، ایک طرح کی مقدم ضدا، ایک طرح کی رقابت اور ایک طرح کا حریفانہ جذبہ ــــ بلکہ ایک نوع کا احساس کمتری ہے جو نمایاں ہو رہا ہے۔ اس ذہن کی ساخت میں ایک ٹیڑھ ہے جو اسے دوسری طاقتوں کو کھلے دل سے سمجھنے اور ان سے تعاون کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ یہ ذہن کسی بڑے سے بڑے تخریبی اقدام کے لئے غیر مسلموں سے، کمیونسٹوں سے، طاقتوں سے تو ساز باز کر سکتا ہے، لیکن تعمیری کام کے لئے اپنے ہی اندر کے دینی عناصر سے کوئی تعاون نہیں کر سکتا۔

(۵) اس ذہن کے مجہول پن کا عالم یہ ہے کہ اس کے نزدیک (ا) اسلام کسی متعین اصول، ضابطہ یا نظام کا نام نہیں اور اس کے اندر کوئی ایسی بنیادیں نہیں جن پر اتفاق رائے ہو سکے، یہ ایک مبہم تصور اور ایک غیر متعین فکر ہے۔ (ب) "مسلم" کی کوئی تعریف ایسی نہیں کی جا سکتی ہے جس پر ایک ریاست کا کام چلایا جا سکے، یعنی سرے سے وہ شے ہی نامعلوم ہے جو کسی کافر کو مسلم بناتی ہو اور کسی مسلم کو دائرۂ اسلام سے نکال دیتی ہو۔ یہ کسی چیز کے ابہام اور کسی لایعنی پن کی آخری حد ہے جسے اسلام کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔

(۶) یہ ذہن دوسروں کے تصورِ اسلام پر تو کڑی تنقید کرتا ہے، مگر خود کوئی تصورِ اسلام مثبت طور پر پیش نہیں کرتا، نہیں بتاتا کہ اس کا اسلام کون سا ہے اور کیسا ہے جس پر وہ تہِ دل سے ایمان رکھتا ہے۔ اس اسلام کے لئے انفرادی زندگیوں میں کیا کیا جا رہا ہے۔ اور اجتماعی دائرے میں اس کے قیام و نفاذ کے لئے کون سے اقدامات کئے گئے ہیں۔ وہ بس یہ کہتا ہے کہ دوسروں کا تصورِ اسلام چونکہ ناقص ہے اس لئے اسے ترک کر کے لادینیت کو اختیار کر لینا چاہئے۔

(۷) اس ذہن کو اس بات کا پورا پورا شعور ہے کہ ملک کے عوام اسلام پر اعتقاد رکھتے ہیں ــــ اگرچہ وہ بعض بھرے انداز میں اسے اندھا اعتقاد کہتا ہے۔ لیکن وہ عوام کے اس اعتقاد سے ٹکرانا چاہتا ہے اور جو کوئی اس اعتقاد کا کسی قدر بھی لحاظ کرنے پر آمادہ ہو جائے اسے طعنہ دیتا ہے کہ تم عوام کو فریب دے کر اپنا سیاسی مفاد بنانے کے درپے ہو۔

یہ ہے وہ ذہن (مقرر کی انفرادی شخصیت کو درکنار رکھ کر) جو برابر آٹھ سال سے پاکستان کے اسلامی رجحانات کے خلاف برسرِ کشمکش ہے جس نے اسلامی خطوط پر دستور سازی کے کام میں مسلسل روڑے اٹکائے ہیں جس نے سابق دستور ساز کی برطرفی میں بڑا بھاری پارٹ ادا کیا ہے، جو ملک کو جمہوری خطوط سے ہٹا کر آمریت کی طرف لے جانے کے درپے رہا ہے اور جس نے اسلام کے حق میں کبھی کسی پوائنٹ پر دوسروں سے سمجھوتہ کر کے نہیں دیا۔ اس کے نزدیک پاکستانیوں کے اور سارے باہمی رشتے اہم اور محترم ہیں لیکن ایک رشتۂ اسلام ہی ایسا ہے جو اس کی نگاہ میں بے وقعت ہے۔

اب آیئے مقابل کے دوسرے ذہن کا جائزہ لینے کے لئے ایک اور تقریر کے اقتباسات پر غور کیجئے:-

- "پاکستان برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کی اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے لئے ایک ایسا ملک حاصل کریں جس میں انہیں اپنے مخصوص نظریۂ زندگی اور اپنی تہذیبی و تمدنی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکے۔ .... یہ تھا اصل مقصد قیامِ پاکستان کا، اور آج بھی قوم کے اندر اپنے تہذیب و تمدن کو ترقی دینے، اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو نشوونما دینے اور ایسی فضا پیدا کرنے کی خواہش کارفرما ہے جس میں اسلامی روح پروان چڑھ سکتی ہو۔ یہی خواہش پاکستان کے بقا کی ذمہ دار اور پاکستانی عوام کے اندر زندگی و حرارت پیدا کرنے کی محرک ہے۔ اس آزادی اور اس خواہش کی ہر حال میں ہمیں حفاظت کرنی ہے۔ ہم صرف اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ہی اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔"
- "کوئی باعزت اور خود دار آدمی اپنے والدین سے لاتعلقی کا اظہار نہیں کرتا۔ ہر درخت اپنے بیج سے ابھرتا ہے، اسی سے بڑھتا ہے اور برگ و بار لاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا آغاز ایک چھوٹے سے بیج سے ہو۔ لیکن کئی برس بعد اس کی شاخیں پھوٹتی ہیں اور پھل آتا ہے۔ اس وقت لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی اصل قدر و قیمت کیا تھی۔"
- "جناب والا! بیشتر اس کے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کی اصل روح اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اس ملک میں جلوہ گر ہو ہمیں اس کے لئے کئی سال تک جد و جہد کرنی پڑے گی۔"

- "یہ کس طرح ممکن ہوا کہ پندرہ سو میل کے فاصلہ کے باوجود مشرقی اور مغربی دو خطوں میں بسنے والے مسلمان مل کر ایک ملک بن گئے؟ کس طرح ہم نے جغرافیائی حد بندیوں کو مسخر کر لیا؟ اس کی ایک وجہ وہ اسلامی روح ہے جس پر دونوں حصوں کے لوگ ایمان رکھتے ہیں — ہاں وہی اسلام، جو جغرافیائی اور اس نوعیت کے تمام امتیازات سے ارفع و اعلیٰ ہے!"

- "دونوں حصوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنا، اور ایسی باتیں کرنا جن سے دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوں اور بڑھیں، اس قیمتی آزادی کو خطرے میں ڈالنے کے ہم معنی ہے جو ہم نے تاریخ کی عظیم الشان قربانی دے کر حاصل کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ فضا ہم سے چھن جائیگی جسے اپنی تہذیب کی نشو و نما اور اسلامی روح کے پنپنے کے لئے ہم نے فراہم کیا ہے۔"

- "ہمارا نصب العین معاشرت، قانون اور انسانی روابط کے تمام شعبوں میں اسلامی روح اور اسلامی تہذیب و تمدن کا نشو و نما ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اسلام صرف بندے اور خدا کے درمیان ذاتی تعلق تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔ اس کی روح تمام دائروں میں سرائت کرتی ہے۔"

- "اگرچہ ہم ابھی تک اسلام سے بہت دور ہیں اور فی الحقیقت ہم بہت ناقص مسلمان ہیں — اور شاید میں سب سے زیادہ ناقص ہوں — لیکن ہم اس کی اصل روح کو حاصل کرنے کے معاملے میں کبھی جذبہ کبر و تعلی سے کام نہیں لیتے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اس کے لئے کم و بیش جد و جہد کرتا رہتا ہے۔ ہمارے درمیان اختلافات ہوسکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی احکام اسلام کے متعلق کسی خاص فرقے کی تعبیر سے اتفاق نہ کرے۔ لیکن اسلام نے ہم پر صرف مشورہ و تفکر لازم ٹھہرایا ہے، اپنی رائے کو دوسروں پر ٹھونسنا نہیں سکھایا . . . . ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ انتہا پسندی اور بے صبری کا ثبوت دیں۔ ایسی صورت میں سب کا فرض ہے کہ وہ اس چیز سے صرف نظر کر کے اسلامی احکام کو اپنے معاشرے، اپنی قومی زندگی اور اپنے قوانین میں عملاً اختیار کرنے کے لئے کوئی متفقہ راستہ نکالنے کی کوشش کریں۔"

- "خدا کے احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا، امن و سلامتی، صبر و تحمل، خیر سگالی، انصاف اور بھائی چارہ اسلام کے بنیادی اصول ہیں اگر ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو اس نقطۂ نظر سے ادا کرنے کی کوشش کریں تو چاہے ہمارے طریقِ کار میں خامیاں ہوں اور چاہے ہماری ترقی کی رفتار سست ہو۔ پھر بھی ہم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کے مقصد کی جانب بڑھ رہے ہوں گے جو ہمارے موجودہ معاشرے سے بہرحال بہتر ہوگا۔"

- "ہمارا معاشرہ معاشرتی، اقتصادی اور دوسری تمام قسموں کی بے انصافیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں اوپر سے لے نیچے تک ناجائز مفاد رکھنے والے عناصر پائے جاتے ہیں، اور اگر ہم اسلام کے احکام کے مطابق کام کریں گے تو ہمیں متعدد ایسے اقدامات کرنے پڑیں گے جن کو فوری طور پر بہت سے لوگ ناپسند کریں گے۔ دنیا میں کوئی عمدہ نصب العین حاصل کرنے کی کوشش کبھی بھی بغیر اس کے نہیں کی جاسکتی کہ اس میں بعض لوگ مخالفت نہ کریں۔ لیکن ہمیں اس سے بد دل نہیں ہونا چاہئے بلکہ امید رکھنی چاہئے کہ ایک جمہوری ملک میں جہاں لوگوں کو اپنے خیالات کے اظہار کی پوری آزادی ہو، اور ایک ایسے معاشرے میں جو اگرچہ اسلامی نقطۂ نظر سے بہت ناقص ہو مگر پھر بھی اسلامی ہو، اگر ہم نے جد و جہد جاری رکھی تو لامحالہ ہم اپنے آپ کو آہستہ آہستہ ایک بہتر اور زیادہ قابلِ احترام معاشرے میں بدل سکیں گے۔ یہ وہ روح ہے جس کے ساتھ اس کام کو ہم نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اس سے ہمارے پیشِ نظر تعریف کرانا نہیں ہے۔ بلکہ ہم اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے پاکستان قائم ہوا تھا"

"حزبِ اختلاف کے قائد نے کل اپنی تقریر میں اعلیٰ اصول و مقاصد کا ذکر بڑی وضاحت سے کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم ایک صحیح اسلامی معاشرہ سے بہت دور ہیں۔ لیکن ان کی تقریر میں ایک واضح تضاد تھا۔ ایک طرف تو انہوں نے کہا کہ ہم کسی معنی میں اسلامی کہلانے کے مستحق نہیں ہیں لیکن دوسری طرف انہوں نے ایک اسلامی معاشرے کی انتہائی تاریک تصویر کھینچ ڈالی جس میں اقلیتوں کے ساتھ ناانصافیاں کی جاتی ہیں، غلامی عام ہوتی ہے، لوگوں کے اعضا کاٹے جاتے ہیں اور نہ جانے اور کیا کیا ہوتا ہے۔"

"ہمیں اسلام کی صحیح روح کی اطاعت کرنی چاہئے۔ ممکن ہے کہ آج ہم اس کے لئے نااہل ہوں لیکن ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم اس کی اطاعت کرنے کی خواہش کا اظہار کریں۔ آج اگر کسی سے پوچھا جائے کہ آیا وہ مسلمان ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ ہاں میں مسلمان ہوں — باوجودیکہ وہ اپنے دل میں اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ ایک مسلمان ہونے کے لحاظ سے اس میں کتنی خامیاں ہیں۔ وہ اپنے دل میں ڈر سکتا ہے کہ ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم   کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

ہر سچے مسلمان کا دل اسے کہہ سکتا ہے کہ سچا مسلمان ہونے کا جو دعویٰ وہ کر رہا ہے اس میں بہت مبالغہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جب کسی شخص سے پوچھا جائے کہ آیا وہ مسلمان ہے تو وہ اپنے دل میں اس بات پر ندامت محسوس کرے کہ وہ اسلام کے صراطِ مستقیم سے کس قدر ہٹا ہوا ہے اور اس کی زندگی ایک سچے مسلمان سے کس قدر مختلف ہے۔ یہی حال ہمارے معاشرے کا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اس مقصد کے لئے کوشش کرنا ہی دراصل زندگی کا اصلی مقصد ہے۔"

"ہم ایک مشکل راستے پر سفر کر رہے ہیں اور پہلے ہی ہماری راہ کی مشکلات اتنی زیادہ ہیں کہ ہمارا اس میں اظہارِ کبر سے مزید اضافہ کر لینا بہت بڑی حماقت ہوگی۔ اس لئے ہم سب کو عاجزی اور انکسار کے ساتھ ایک بہتر معاشرے کی تعمیر کے کام میں مصروف ہو جانا چاہیے۔"

یہ ہے اس دوسرے ذہن کی خود پیش کردہ تصویر جو ہمارے معاشرے کی اکثریت میں کارفرما ہے۔ ان الفاظ کو اگرچہ ہمارے وزیرِاعظم جناب چودھری محمد علی کی زبان نے ادا کیا ہے، لیکن یہاں سوال موصوف کی ذاتی شخصیت کا نہیں، بلکہ وہ ذریعۂ اظہار بنے ہیں اس اجتماعی ذہن کی ترجمانی کا جو بہ حیثیت ملت ہمارے اندر زندگی کی ایک نئی حرکت پیدا کر رہا ہے۔ اس ذہن کا تجزیہ کریں تو حسبِ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:۔

(۱) پاکستان جس مقصدِ وجود پر قائم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس خطۂ ارضی میں ہم مسلمان اپنے نظریے اور اپنی روایات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اپنے تمدنی و تہذیبی نظام کو استوار کر سکیں۔

(۲) جس طرح کوئی غیور اور حساس فرد اپنے ماں باپ سے تعلق توڑ نہیں سکتا اور جس طرح ایک درخت کا تصور اس کے بیج سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ہم بحیثیت مسلمان قوم کے اپنے نظریۂ حیات اور اپنے نظامِ زندگی سے تعلق توڑ نہیں سکتے۔

(۳) اسلام کے تصور اور اس کی تفصیلی تعبیرات میں ہمارے درمیان اختلافات ہو سکتے ہیں، لیکن چونکہ احیائے اسلام کا کام کرنا ہماری ذمہ داری ہے اس لئے طریقِ کار یہ ہے کہ مشورہ و بحث کے ذریعے ہم ہر معاملے میں متفقہ لائحہ عمل بنا کر آگے بڑھتے جائیں۔

(۴) ہمارا موجودہ معاشرہ اور ہماری ریاست اس وقت بالفعل اسلامی نہیں ہے اور اس میں ہر طرح کے مفاسد بھرے پڑے ہیں لیکن اس کے اندر چونکہ اسلامی اصولوں کے مطابق اپنی اصلاح و تعمیر کرنے کا عزم موجود ہے اور ایک اسلامی معیار کو حاصل کرنے کی خواہش کارفرما ہے اس لئے بجا طور پر اسے حق پہنچتا ہے کہ یہ اپنے مسلم ہونے کا اظہار کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مسلمان ناقص مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنے مسلمان ہونے کا انکار نہیں کر سکتا بلکہ اسلامیت کا ادعا کرنے میں ندامت محسوس کرنے کے باوجود وہ یہی ادعا کرنے پر مجبور ہے۔ یہ چیز فرد میں بھی اور معاشرے میں بھی احساسِ ذمہ داری اور ذوقِ اصلاح پیدا کر سکتی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۲)

ہم سخن

م - نسیم

"اے میاں صاحبزادے ـــ ذرا رُکنا"

"؟"

"بھئی دل نہیں مانا یہ صورت دیکھ کر ـــ کیوں میاں ـــ کیا تم حمیداللہ خاں کے لڑکے ہو؟"

"جی ہاں السلام علیکم"۔

"دیکھنا! دل کہہ رہا تھا میرا۔ وعلیکم سلام وعلیکم سلام۔ جیتے رہو میاں واہ واہ۔ بھئی خوب ملاقات ہوئی۔ مجھے پہچانا؟"

"؟"

"بھلا تم پہچان بھی کیسے سکتے ہو۔ بہت چھوٹے تھے تب تو۔ مگر کیا شباہت پائی ہے۔ عین مین باپ کی صورت ہو۔ میاں، میرا تمہارے والد سے بچپن کا دوستانہ تھا۔ پھر میں ٹھیکے داری کے جھگڑوں میں پڑ گیا۔ ادھر چلا آیا۔ وہ بے چارے وہیں رہے۔ بس ان کے انتقال کی اطلاع ملی ادھر میں دل پکڑ کر رہ گیا ـــ کوئی آٹھ برس تو ہو چکے ہوں گے؟"

"جی ہاں"۔

"مگر صاحب آہاہا بھئی کیا آدمی تھے، اللہ بخشے۔ واہ واہ کیا غیرت تھی، کیا شرافت تھی۔ ایسے وضع دار لوگ اب کہاں۔ کیسے ہی تنگدست رہے، مگر کبھی کسی کی مدد قبول نہ کی۔ میاں میں تو لڑ بیٹھتا تھا۔ اصرار کرتے کرتے تھک جاتا تھا۔ مگر شاباش ہے ان کی وضعداری کو ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کچھ نہ لیا ـــ بھئی تم تو ہو بہو باپ کی جوانی کی تصویر ہو۔ کیا یہیں آ گئے ہو؟"

"جی ہاں"۔

"کب سے؟ کیا کافی دن ہو گئے؟"

"جی ہاں"

"اچھا۔ اِدھر کیسے آئے؟"

"جی، جمعہ کی نماز پڑھنے"۔

"اچھا؟ اِسی مسجد میں پڑھی ہے کیا؟"

"جی ہاں"

"شاباش۔ جیتے رہو۔ میں بھی تو پڑھ کر آ رہا ہوں ابھی۔ ذرا نفلوں میں دیر لگ گئی۔ میاں، آج کل کے نوجوانوں کو تو اللہ رسولؐ کے نام سے کوئی مطلب ہی نہیں رہا۔ جوانی کی عبادت تو بڑی بھاری سعادت ہے ـــ اور میاں، جا کہاں رہے ہو اس وقت؟"

"جی، صدر تک"

"کیوں؟ کوئی کام ہے کیا؟"

"جلسے میں جانا ہے"۔

"کہاں ہے جلسہ؟"

"جہانگیر پارک میں"

"جہانگیر پارک میں؟ ارے میاں یہ وہ "اسلامی دستور" والوں کا جلسہ تو نہیں ہے؟"

"جی"

"بھئی میاں صاحبزادے۔ تم اُن میں کہاں جا رہے ہو بھلا۔ بھائی میرے۔ بڑا بُرا وقت ہے۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ آج کل تو سننے والے بھی دھر لئے جاتے ہیں۔ ہے کہ نہیں؟"

"جی ـــ"

"یہ ا ـــ میاں تم خود سمجھدار ہو۔ ایسے معاملوں میں تو بڑی احتیاط

کی ضرورت ہے۔ اور یہ سیاسی لوگ تو بھائی بڑے بے ڈھب لوگ ہیں بھلا بتاؤ، حکومت سے اُڑ رہے ہیں۔ ان سے تو اور بھی بچ کے رہنا چاہئے ـــــ یہ اتنے کاغذ کیسے ہیں ہاتھ میں؟"

"اشتہار ہیں۔"

"اشتہار؟ کیسے اشتہار"

"جلسے کے"

"کیا اُسی جلسے کے؟"

"جی"

"اتنے اشتہار کیا کرو گے؟ کیا بانٹنے ہیں؟"

"جی ہاں"

"اوہو۔ تو میاں انھوں نے تمہیں بھی بے کار دیکھ کر گانٹھ لیا ہے۔ کیا کوئی کام وام نہیں کرتے آج کل؟ والد صاحب کے انتقال کے بعد پڑھنا تو چھوڑ دیا ہوگا؟"

"جی نہیں"

"کیا دسویں پاس کر لی؟"

"جی"

"اچھا؟ ماشاء اللہ ـــ میاں اُن کے بعد تو تمہارا گزارہ ہونا بھی مشکل تھا۔ بڑی ہمت کی ـــ پھر؟ کوئی کام کاج کیا؟"

"جی نہیں"

"تو؟"

"پڑھتا رہا"

"اچھا؟ پڑھتے رہے؟ کیا انٹر بھی کر لیا؟"

"جی ہاں"

"پھر کیا بی۔ اے بھی کیا؟"

"جی نہیں۔ بی کام"

"اچھا بہت خوب۔ مگر میاں شاباش ہے تم کو۔ بڑی ہمت سے کام لیا۔ آج کل کے لڑکے تو ذرا سی تنگی ترشی سے اتنا گھبرا جاتے ہیں کہ میٹرک کرتے ہی نوکری کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں ـــ پھر میاں کیا کام کیا تم نے؟"

"جی۔ پڑھتا رہا۔"

"پڑھتے رہے! اور پڑھتے رہے؟ تو یعنی ایم اے بھی کر لیا؟"

"جی نہیں۔ ایم کام"

"غضب خدا..... میرا مطلب ہے سبحان اللہ۔ بھئی تم نے تو کمال کر دیا میاں ـــ مگر پھر یہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ ناسمجھ لڑکوں کی طرح اشتہار کیسے لئے پھر رہے ہو؟ یعنی ماشاء اللہ ایم کام ہو کر؟"

"جی، تقسیم کرنے ہیں۔"

"تقسیم کرنے ہیں؟ ارے بھائی کیا تم ہی رہ گئے تھے یہ تقسیم کرنے کو؟"

"جی نہیں۔ دوسرے بھی کر رہے ہیں۔"

"اوہ! میاں، دوسرے کرتے ہیں تو کرنے دو۔ تم کیوں کر رہے ہو، تم تو ایم کام ہو۔ یعنی ماشاء اللہ جو کام چاہو کر سکتے ہو۔ ایک سے ایک بڑی بزنس۔ ہے کہ نہیں؟"

"جی ـــ"

"اور بزنس کے بجائے تم یہ اشتہار بانٹتے پھر رہے ہو؟ اور وہ بھی ایم اے۔ میرا مطلب ہے ایم کام ہو کر! ـــــ اچھا الّو بنایا انہوں نے تم کو۔ آخر کس نے تم کو یہ کام کرنے کا مشورہ دیا تھا؟"

"جی۔ ہم نے خود ہی طے کیا تھا۔"

"ارے بھائی۔ سب نے طے کیا تھا۔ تم کو تو نہیں کرنا چاہیے تھا تم تو ایم کام ہو ـــ بھلا بتاؤ تو، ابھی میں نے ہی دیکھا ہے۔ اگر کوئی اور، اللہ بخشے تمہارے والد کی جان پہچان والا دیکھ لیتا تو کیا کہتا ـــ اچھا، پھر یہ ایم کام ہو کر کہیں اکاؤنٹنٹ وغیرہ کچھ ہوئے یا نہیں؟"

"جی نہیں۔"

"بھئی حد ہو گئی۔ یعنی پھر اس تعلیم کا فائدہ؟ بھائی میرے، یہ اشتہار ہی بانٹنے تھے تو پڑھنے کی دردسری کیوں مول لی تھی آخر؟ ـــ!

"تمہیں دیکھ کر تمہارے والد آنکھوں میں پھر گئے تھے۔ کیسی باتیں ہوتی تھیں تم بچوں سے متعلق۔ کیسی اُمنگیں تھیں دل میں۔ کیا کیا اُمیدیں باندھا کرتے تھے ہم لوگ۔ پھر میں ٹھیکے داری میں پھنس کر بالکل اُسی کا ہو گیا۔ اور وہ بےچارے وہیں رہ گئے۔ سب شادی بیاہ کی باتیں ہوا ہو گئیں۔ کیا زمانے تھے وہ بھی ——— خیر، تو میاں اب تم کوئی کام کاج کرو۔ ماشاءاللہ جوان ہو۔ تندرست ہو۔ ہاتھ پیروں میں طاقت ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایم کام ہو۔ کیا نہیں کر سکتے۔ کیوں کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

"جی نہیں ——"

"یہی تو۔ میاں ویسے تو ایک سے ایک پڑھا لکھا آج کل پڑا پھرتا ہے۔ مگر تم اب تک گورنمنٹ میں کسی کام میں ہوتے تو بہت اُونچے پہنچ گئے ہوتے ——— خیر، اللہ جو کچھ کرتا ہے، بہتر ہی کرتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ انشاءاللہ میں جلد ہی کوئی انتظام کرا دوں گا۔ سپلائی کے محکمے میں اپنی کافی جان پہچان ہے۔ بس ذرا افسر لوگوں کو خوش کرنا ہو گا۔ مگر اس کی بھی فکر نہ کرو۔ سب ہو جائیگا۔ دفتر تو تم نے دیکھا ہی ہو گا۔ صدر ہی میں تو ہے۔ دیکھا ہے نا؟"

"جی ہاں —— مگر"

"بس بس۔ تب ٹھیک ہے۔ اچھا خیر، یہ تو رہا ——— لو آؤ میرے ساتھ چلو۔ تمہاری چچی سے ملا دوں۔ یہ بھی تمہارے والد مرحوم سے تو، خدا انہیں غریقِ رحمت کرے، بالکل بھائیوں کی طرح ملنا جلنا تھا۔ بہت خوش ہوں گی تمہاری چچی تم سے مل کر اور ریحانہ بھی۔ مگر وہ تمہیں بھلا کیا یاد ہو گی بہت بچپن کی بات ہے۔ لیکن میری بچی کو شاید یاد آ جائے۔ ماشاءاللہ بڑی تیز ہے۔ آ گئی ہو گی اب تو کالج سے ——— آؤ میاں۔"

"جی! میں وہ جلسے میں ......"

"ہاں ہاں۔ میں بھولا۔ جلسے میں جا رہے تھے۔ اچھا اچھا۔ مگر دیکھو میاں۔ تھوڑی دیر سُن سنا کر چلے آنا۔ اِن کے جلسے وَلسے سے تو اپنے آپ کو الگ ہی رکھو۔ بے کار حکومت کو شک ہوتا ہے۔ سی آئی ڈی بھی تو ان کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ کیوں کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

"جی نہیں تو ——"

"تو میاں۔ اب ان فضول باتوں کو چھوڑو۔ اور اپنے والد کا نام روشن کرو۔ کوئی کام کر کے ——— تو۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ پورا پتہ وغیرہ سب لکھا ہے۔ ایسا کرنا۔ کل صبح نو بجے میرے پاس آ جانا۔ ملنا ملانا بھی ہو جائے گا۔ وہیں سے دفتر چلے چلیں گے۔ ٹھیک نو بجے —— اور ناشتہ وہیں آ کر کرنا۔"

"جی۔ مگر میں ——"

"اب اگر مگر کچھ نہیں۔ کوئی تکلف ہے کیا۔ تمہارا ہی گھر ہے۔ اور میاں اس طرح پھرتے رہو گے، تو کام سے اور جی اکتائے گا۔ بس تو یہ طے رہا —— اور ہاں میاں ذرا سوٹ وغیرہ پہنا کرو۔ یہ شیروانی اچکن وغیرہ تو ہم بڈھوں کی چیز ہے۔ کل سوٹ پہن کر ہی دفتر چلنا ہو گا تو کوئی تمہارے پاس؟"

"جی، ہیں —— مگر مجھے شیروانی پسند ہے۔"

"ہاں ہاں پسند تو بری نہیں۔ یہ میں کب کہتا ہوں کہ نہ پہنو۔ مگر بھائی دفتروں میں تو سوٹ سے ہی رُعب پڑتا ہے ——— اچھا جلسے میں جا رہے ہو نا؟ صدر۔ چلو میں چھوڑتا چلوں۔ سامنے موٹر کھڑی ہے۔"

"جی نہیں۔ میں ——"

"ارے میاں پھر وہی تکلف۔ ہم تم دو تھوڑا ہی ہیں۔ تم تو اپنے بچے ہو بالکل۔ بے کار پیدل جاؤ گے۔"

"جی نہیں۔ پیدل نہیں۔"

"بھئی تو رکشا، گاڑی پر سواری کے پیسے کیوں بے کار خرچ کرو گے۔"

"رکشا وغیرہ پر نہ جاؤں گا۔"

"ارے بھائی۔ پھر کیا ٹیکسی میں جاؤ گے؟"

"جی نہیں۔ کار میں۔"

"کار میں؟ کونسی کار؟"

"وہ"

"وہ! وہ نئی اسٹوڈی بیکر جو ——— جو میری گاڑی کے آگے کھڑی ہے؟"

"جی"

"کس کی ہے جیپ یہ؟"

"کمپنی کی۔"

"کمپنی کی، کس کمپنی کی؟"

"پاکستان اسٹیم شپ کمپنی کی"

"اچھا! مگر یہ اس میں بیٹھا کون ہے، برقعے میں؟"

"جی میری بیوی ہیں۔"

"ہیں! بیوی؟ تو کیا — کیا شادی ہو چکی تمہاری؟"

"جی ہاں"

"کب"

"سال بھر ہوا"

"اوہ — تو، کیا کمپنی میں لڑکی کے باپ — میرا مطلب ہے کیا لڑکی کے کوئی رشتے دار ہیں کمپنی میں؟"

"جی نہیں۔"

"پھر کیا کمپنی نے گاڑی تم کو دے رکھی ہے؟"

"جی ہاں"

"جی ہاں؟ یعنی تم کو — تم کو کمپنی نے گاڑی دے رکھی ہے — کیوں؟"

"جی، تینوں ڈائریکٹروں کو دی ہوئی ہے۔"

"ڈائریکٹروں کو، ڈائریکٹروں کو! یعنی کیا تم — میرا مطلب ہے کیا آپ، اُس کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں؟"

"جی ہاں"

"اوہ!"

"یہ — یہ آپ کا کارڈ ہے۔"

"اوہ!!"

"اچھا، اب جاتا ہوں — جلسے میں دیر ہو جائے گی۔"

"————"

"سلام علیکم"

"ا — ا — ا"

——— ٭ ———

بقیہ (سوچ بچار) دو ذہن — آمنے سامنے

یہ تصویر ایک صاف اور صحت مند ذہن کی تصویر ہے (واضح رہے کہ پیشِ نظر ایک فرد کی شخصیت نہیں، بلکہ معاشرے کا ایک قومی رجحان اور ایک خاص عوامی عنصر ہے) اس کا جدھر سے بھی اور جس طرح کا بھی تجزیہ کیجئے، اس میں تضاد اور الجھنیں نہیں ملتیں، اس میں کسی کے خلاف کد اور چڑ اور تعصب اور رقابت کے جذبات متحرک نہیں نظر آتے، اس کے اندر تنگ ظرفی نہیں ہے اور تعاون کی اسپرٹ کا افلاس نہیں پایا جاتا۔ یہی ذہن ہے جو پاکستان کو اسلامی نقشے پر استوار دیکھنے کے لئے بے چین اور تعمیری اقدامات کے لئے برسرِ عمل ہے اور اسی کی وجہ سے قوم کے اندر ایک امنگ اور ایک حرکت کام کر رہی ہے۔ لیکن اس ذہن کا راستہ بار بار اور قدم قدم پر دوسرا اوپر والا ذہن روکتا رہا ہے۔ ایک ذہن مثبت نوعیت کا حامل ہے، دوسرا منفی نوعیت کا۔ ایک تعمیری ہے دوسرا تخریبی، ایک تعاون پسند ہے، دوسرا تصادم کیش۔ ایک صحت مند دوسرا مریض۔ ان دونوں ذہنوں کی ترجمانی کرنے والے افراد بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ دونوں ابھی اسی طرح آمنے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور آج دستور ریہ کے ایوان تک ہر آن برسرِ کشمکش ہیں۔

ان دونوں اجتماعی ذہنوں کو سامنے رکھ کر اور باریکی سے ان کا جائزہ لے کر پوری قوم اور اس کے سوچنے سمجھنے والے افراد کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کس کا ساتھ دیں، کس کے ہاتھ مضبوط کریں، کس سے اپنی امیدیں وابستہ کریں۔ دونوں میں سے کسی نہ کسی ایک کا زور توڑے بغیر ہم ترقی و تعمیر کی راہ پر ایک انچ نہیں بڑھ سکتے۔ اب آپ خود یہ رائے قائم کیجئے کہ دونوں میں سے کسے ختم کیا جائے اور کسے پنپنے کا موقع دیا جائے۔

(۹ فروری ۱۹۵۶ء)

نور صد یقی

اب پھر نزاعِ شیشہ و آہن قریب ہے

شبنم سے شعلۂ رُخِ گلشن قریب ہے

دیکھیں تو رنگ لاتی ہیں کیا بے زبانیاں

شعلہ نوائی لبِ سوسن قریب ہے

وارستگی و قید میں اب فرق کم رہا،

اپنا درِ قفس سے نشیمن قریب ہے

پھر کھل رہی ہے زلفِ درازِ غمِ حیات،

پھر کاروانِ نکہتِ گلشن قریب ہے

اے دردِ انتظار! پریدہ ہے رنگِ شب

اے دستِ شوق! صبح کا دامن قریب ہے

اسی ضیائی

◆

اثرِ جنونِ جفا طلب سے مذاقِ زیست بدل گیا
جسے ناگوار تھا خار بھی، وہ برائے دار مچل گیا

جو نہ یاد آ سکا عمر بھر، یہ کرشمہ ہے اسی عہد کا
نہ وفا کی دل سے خلش مٹی، نہ جنوں کا سر سے خلل گیا

ترے دورِ یاس و امید میں یہ دلِ تپاں وہ چراغ ہے
کبھی ظلمتوں سے جو بجھ رہا، کبھی اک شعاع سے جل گیا

وہی ایک بادہ ہے ساقیا، یہ ہے سب کا ظرف جدا جدا
کوئی بچتے بچتے بہک گیا، کوئی گرتے گرتے سنبھل گیا

جو فریضۂ شیخِ حرم نشیں کے لئے تھا داخلِ بندگی
اُسے ٹال، اہلِ ہوس کے سر، یہ غلام صاف نکل گیا؟

ترے وعدے ٹوٹے ہیں اس قدر کہ ہر ایک تازہ شکست پہ
ہمیں یہ گماں ہے کہ وقتِ بد کوئی آ کے خیر سے ٹل گیا!

نشۂ حیاتِ زمانہ سے بہ کلامِ آسی رچا ہوا
کوئی اس کو سن کے دکھا سکے کہ اب ان غزل گیا!

اختر و آحد قاضی

◆

آہ! ناکامیوں کے سائے تلے
کچھ تمناؤں کے چراغ جلے

ہم نے درسِ حیات ان سے لیا!
اب شکستوں پہ کون ہاتھ ملے

سوئے مقتل بھی ہم تو جائیں گے
ساتھ اگر میرِ کارواں بھی چلے

پرورش پا رہا ہے نورِ سحر
چاند تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے

گردشِ وقت کیا ہے اُن کے لئے
غمِ دوراں کی گود میں جو پلے

ولولے زندگی کے اے
دب گئے ہیں غموں کے

محمد محسن

یہ رُشحِ گہر ریز، گھٹائیں یہ سیہ فام
ہے یاس کے سایوں میں درخشانیٔ انجام

تقدیرِ محبت میں کہاں راحت و آرام
مضطر صفتِ شعلہ ہے، گرداں صفتِ جام

جس حُسن کا نظارہ بہ کوشش بھی نہ ہو عام
اُس حُسن کو کیوں کر نہ کہیں حُسنِ سرِ بام

تیوری پہ زمانہ کی شکن آئے تو آئے
حق کے لئے سر دیں گے سن اسے گردشِ ایام!

سینچے جو لہو سے چمنستانِ یقیں کو
رہتا ہی نہیں اُس کی ریاضت کا ثمر خام

گر حق کی سرافرازی کی خاطر ہو تگ و دو
اِک صبحِ دل افروز ہے اے دل تری ہر شام

یہ عطر فشانی ہے گلستانِ جہاں کی،
یا سلسلہ جنبانیٔ گیسوئے دل آرام

ماحولِ مکلّف کی نہیں عشق کو پروا
آرائشِ عالم ہے امیدِ دلِ ناکام

اے مہرِ کرم! اِک نگہِ لطف اِدھر بھی
محسن بھی ہو اِک اخترِ تابندۂ اسلام

شبنم سبحانی

وہ گلستاں نظر میں مری گلستاں نہیں
جو آشنائے لذتِ دورِ خزاں نہیں

اے برق! فکر کیا ہے جو تو مہرباں نہیں
ہم غمزدوں کا آج کوئی آشیاں نہیں

اس دورِ گیرودار سے گزرے گا ہنس کے عشق
لیکن پھر اس کے بعد کوئی امتحاں نہیں

افسوس — وہ قدم جو ہیں منزل سے بے نیاز
اُف! — وہ جبیں کہ جس کا کوئی آستاں نہیں

خود اپنی کجروی سے شکارِ الم ہیں ہم
اس میں قصورِ گردشِ ہفت آسماں نہیں!

شبنم نہیں ہے جس میں نہاں حدِ کائنات
وہ فکر بیکراں! وہ نظر جاوداں نہیں

بیدل میرٹھی

(زیر ترتیب مجموعۂ "خونِ دل" کا ایک ورق)

توہینِ محبت سرِ محفل نہ کریں گے
مرجائیں گے ہم شکوۂ قاتل نہ کریں گے
دیوانے پہنچ جائیں گے خود ہی سرِ منزل
رہبر کو شریکِ غمِ منزل نہ کریں گے
پھیلائیں گے ہم بھی نہ تمناؤں کا دامن
وہ دست کرم جانبِ سائل نہ کریں گے
تڑپائیے جی بھر کے غریبوں کے دلوں کو
فریاد و فغاں آپ کے بسمل نہ کریں گے
پلکوں پہ نہ دیکھیں گے کبھی اشکِ الم آپ
کو ہم کو سپردِ غمِ محفل نہ کریں گے
دل دے کے نگاہوں کے بدلنے کا نتیجہ؟
ظاہر ہے، وہ حل مشکلِ بیدل نہ کریں گے

نظر زیدی

یہ لوگ ان کو غمِ زیست سے ڈراتے ہیں
جو بجلیوں کے تڑپنے پہ مسکراتے ہیں
ہماری تیرہ شبی پر ہوئے ہیں خندہ فروش
بھری دوپہر میں جو مشعلیں جلاتے ہیں
مٹا سکو گے نہ ہم کو عجیب ہیں ہم لوگ
شکستِ دل کی صدا سن کے جھوم جاتے ہیں
عجب سکون ملا بس کے دل کی دنیا میں
بس اک سکوت کے کچھ تار جھنجھناتے ہیں
خزاں میں پھول کھلاؤ تو کوئی بات بھی ہے
بہار آئے تو کانٹے بھی مسکراتے ہیں!
مرا کلام مرے دل کا عکس ہے زیدی
اس آئینے میں مرے نقش جگمگاتے ہیں

بیدل میرٹھی

(زیر ترتیب مجموعۂ خونِ دل کا ایک ورق)

چمن میں دیکھ رہا ہوں ستمگروں کا ہنر — جو پھول پھول تھا کل آج ہے وہ خاکستر
روش روش پہ ہیں خونِ بہار کے چھینٹے — گھٹی گھٹی سی فضا ہے دھواں دھواں منظر
اب اور کیسے حوادث کے رخ کو پہچانوں — ٹپک رہے ہیں مرے آشیاں پہ برق و شرر
حیات و موت نے انداز میں ہوئی تبدیل
اک انقلاب کی زد میں ہے زندگی کا سفر

قیامت کب آئے گی ــــ اور کیسے ؟

نعیم صدیقی

(۲)

تقدیر کائنات ہے کیا ؟

مگر زمین کا انجام پوری کائنات کی تقدیر کا کوئی تصور سامنے رکھ کر ہی سوچا جا سکتا ہے۔ کیا یہ کائنات کسی نقطۂ آغاز سے چل کر کسی دوسرے نقطۂ اختتام پر پہنچ کر عدم کی تاریکی میں ڈوب جانے والی ہے، کیا یہ نظام بہ حیثیت مجموعی فنا کی طرف جا رہا ہے ؟

اس وسیع کائنات میں اپنے علم کی حد تک ہم اکیلے ہیں۔ جاوید نامۂ اقبال کے تمہیدی شعر ذہن میں گونجنے لگے :۔

آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ — ہر زماں گرمِ فغاں مانندِ چنگ
آرزوئے ہم نفس می سوزدش — نالہ ہائے دل نواز آموزدش
آسمان و مہر و ماہ خاموش و کر — ایں جہان کوہ و کاہ خاموش و کر
. . . . — ہم نفس فرزندِ آدم را کجاست

ذرا بلندی سے کھڑے ہو کر کسی رات شفاف شبانہ فضا میں سے دیکھو تو چمکتے ستاروں سے آگے ایک پُر سکون دریائے تیرگی پھیلا ہُوا نظر آئیگا۔ چمکیلے اجرام کی کشتیوں سے خالی! محض چند دھندلے تارے ـــــ خوفناک حد تک دور ـــــ ٹمٹماتے ملیں گے۔ اور دوربین سے دیکھنے پر تو صاف معلوم ہوگا کہ آگے خلا ہی خلا ہے۔ یہ خلا بھی کبھی تاروں کی قندیلوں سے مزین تھا۔ اس میں بھی کبھی نظام ہائے کہکشانی کی انجمنیں آراستہ رہ چکی ہیں۔ ایک وقت میں تاروں کے جو جھمگھٹے آنکھ کی مار کی حد میں تھے، بعد میں وہ اس حد سے باہر جا چکے ہیں۔ اب کچھ پتا نہیں کہ ان جھمگھٹوں پہ کیا بیت رہی ہے۔

یہ اولتی بدلتی کائنات جب بارہ ارب سال کی عمر کو پہنچے گی یا جب ۱۰ اربواں سالِ عیسوی آئے گا تو ہم اس اسٹیج سے غائب ہو چکے ہوں گے۔ "حرکات مکان" کے پورے دائرہ میں درجۂ حرارت یکساں ہو جائے گا اور انرجی کا سلسلۂ حدوث و تغیر رک جائیگا۔ نہ گرمی رہے گی، نہ روشنی اور نہ زندگی! فطرت کی تمام سرگرمیاں ختم جائیں گی۔ اس طرح کی تاریک، جامد اور مردہ کائنات ہمیشہ رہے گی۔ کوئی ہرج نہیں کہ اسے "عدم" کا عنوان دیا جائے۔

تاروں کے بعید ترین جھمگھٹے جو ہمارے نظامِ کہکشانی کی حدود سے دور دراز فضا میں جھلکتے ہیں، ہم سے بھی اور آپس میں بھی لمحہ بہ لمحہ بعید تر ہو رہے ہیں ـــ اور اس تباعد کی رفتار کہیں سیکڑوں اور کہیں ہزاروں میل فی سیکنڈ ہے۔ دوری بڑھنے سے یہ رفتارِ تباعد اور بڑھتی جاتی ہے۔ ماہرین فلکیات کی رائے یہ ہے کہ اس مشاہدہ کو صحیح مانتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کسی وقت یہ سارے جھمگھٹے یکجا تھے۔ اب تک کے حسابی اندازے بتلاتے ہیں کہ اجرام کے سارے قبیلے کی یکجائی کا یہ دور آج سے دو ارب سال پہلے گزرا ہے۔ فضائیات کا ایک بلجینئن عالم (ABBE LAMAITRE) اس بات کا قائل ہے کہ پھیلاؤ کا یہ سارا عمل ایک وسیع اساسی "ایٹم" کے ٹوٹنے سے شروع ہوا اور بس اس اولیں ایٹم بم کے پھٹنے کی وجہ سے حرکت اور

نور وحرارت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ہے ظہورِ کائنات کی ابتدا! اگر آپ اسی عالم سے پوچھیں کہ اس اساسی ہیولیٰ کے پھٹنے کا محرک و سبب کیا تھا تو وہ بجز اس کے کچھ نہیں کر سکتا کہ "لا ادری" سائنس کا جواب اس "لا ادری" کے سوا اور کوئی نہیں۔ البتہ الہامی حکمت بتاتی ہے کہ اس کا محرک ارادۂ الٰہی تھا اور ایک "امرِ کُن" سے اولیں حرکت پیدا ہوئی۔

کائناتی پھیلاؤ کے نظریہ کے علمبرداروں کے قیاسات کے رُو سے "اجزائے وجود" کا شیرازہ جزو و کل میں یکساں طور پر پریشان ہو رہا ہے اور آخر کار کائنات لوٹ کر اسی طرح ازجی کے ایک یخ بستہ سمندر کی شکل اختیار کرے گی جس طرح آغاز سے پہلے کا سماں تھا۔ گویا قیامت زمین ہی کے مقدر میں نہیں بلکہ پوری کائنات کی تقدیر کے نوشتے میں بھی قیامت کا حادثہ لکھا ہے

اس نظریے کے خلاف ایک "تازہ ترین نظریہ" کیمبرج یونیورسٹی کے جوان سال عالمِ فلکیات فریڈ ہائیل (FRED HOYLE) نے ابھی حال ہی میں دسمبر ۱۹۵۰ء میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے نظامِ کہکشانی سے باہر کے تاروں کے جھمگھٹے بلاشبہ دوڑ رہے ہیں اور ایک خاص وقفے میں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن دوسری طرف طرفہ ماجرا یہ ہے کہ جب بھی دیکھو ویسے ہی اور جھمگھٹے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ نئے جھمگھٹے اُس دُخانِ لطیف سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں جو سارے "مکان" میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور یہی دخانِ لطیف مادے کے ظہور کا بنیادی منبع ہے۔ اس دخانِ لطیف کی تخلیق کا تسلسل غیر منقطع ہے۔

صرف حدنگاہ تک پھیلی ہوئی کائنات کے بارے میں اندازہ کیا گیا ہے کہ اس دائرے کے اندر ہر سیکنڈ کے وقفے میں ....۱ ٹن مادہ کی تشکیل ہو رہی ہے (سبحٰن اللہ! کل یوم ھو فی شان!!) اسی مقدار مادہ کے صرف سے کائنات کا یہ ہنگامۂ وجود برقرار ہے۔ نئے مادہ کی تخلیق کا دباؤ ہی دراصل کائنات کے پھیلاؤ کا راز ہے۔

ہائیل کے نظریہ کا گہرا منشا یہ ہے کہ کائنات مشتمل ہے ایک غیر منقطع تخلیقی عمل پر! دوسرے لفظوں میں "نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے" اس کے اجزا فانی ہیں، اس کی تفصیلی اشکال آنی ہیں، مگر بہ حیثیت مجموعی یہ ہنگامہ جاودانی ہے۔ فی الحقیقت ہائیل کے نظریے نے نظریۂ مادیت (MATERIALISM) کو مزید تقویت پہنچائی ہے اور آئن سٹائن اور برگسان وغیرہ کی فکری شاہراہ سے ہٹ کر سوچا ہے۔ یہ کائنات کی تقدیر کا ایک بالکل جدید تصور ہے — مگر ہے ایک قیاس ہی!

اسی سلسلے میں نئے رجائی تصورات کے تحت ہارورڈز فریڈ ایل وہپل (HARVARDS FRED. L. WHIPPLE) نے "ابرک غباری" نامی مفروضہ (DUST-CLOUD HYPOTHESIS) پیش کیا ہے۔ یہ مفروضہ جو ۱۹۴۸ء میں سامنے آیا، کائنات کے ہنگامۂ تخریب و تعمیر کے بارے میں یہ تصور دلاتا ہے کہ ایک طرف اجرام عدم کے سمندر میں ڈوب رہے ہیں، دوسری طرف نئے ستارے زندگی کی بسم اللہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہی اقبال والی بات کہ "پے بہ پے آید جہاں ہا در وجود" مفروضہ کہتا ہے کہ فضا میں گیسوں اور گرد و غبار کے بادل جا بجا پھیلے ہوئے ہیں، ان بادلوں کی صورت میں جو مادہ پھیلا ہوا ہے وہ حسابی اندازوں کی رُو سے اس مادے کی مقدار کے برابر ہے جو ستاروں اور اجرام میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ ابرکِ غباری ستاروں کے درمیانی خلاؤں میں حد درجہ پتلا اور لطیف ہو کر پھیلا ہوا ہے کشش اور روشنی کے دباؤ کا طبعی عمل قریب قریب ایک ارب سال میں ایک ابرکِ غباری سے نئے ستارے کا پیکر تراش لیتا ہے۔ سو اس کائناتی غبار سے فطرت کا آرٹسٹ پے در پے گیندیں بنا بنا کر ان کو لڑھکا رہا ہے۔ گویا ایک تعمیری عمل مسلسل ہو رہا ہے۔ ایک چکر ہے جس پر موجوداتِ فلکی گھومتے ہوئے ابرکِ غباری میں بدل جاتے ہیں اور پھر ابرکِ غبار نیستی کے سمندر سے دوبارہ نئی آب و تاب لے کر ابھرتے ہیں۔ وجود و عدم کا یہ ہنڈولا اسی طرح چل

رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

ہائل اور وہپل کے مفروضے کے مطابق یہ امکان تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہمارے نظامِ کہکشانی کے ماحول میں اور بھی سیارے ایسے ہو سکتے ہیں جن پر "زندگی" رواں دواں ہو اور یہ ہو سکتا ہے کہ متعدد دنیاؤں میں انسانی یا کسی اور طرح کی ذوی العقول مخلوقات موجود ہو۔ اگر "تخلیقِ مسلسل" کے اس مفروضے کی تفصیلات کو برحق مانا جائے تو پھر خود زندگی بھی اس کائنات میں دوام کا مرتبہ پا لیتی ہے اس وسیع عالمِ وجود میں ایک جگہ اگر زندگی کا مقبرہ بنتا ہے تو دوسری جگہ اس کے لئے گہوارے آراستہ کئے جاتے ہیں۔ یہ چمن "غنچہ در آغوش و نعش گل بدوش" کی ایک کھلی تصویر ہے۔

اسی وجہ سے یہ قیاس بھی کیا جاتا ہے کہ زمین کے وجود سے قبل انسانی و عقلی مخلوق سے ردنق افروز دنیائیں گزر چکی ہیں۔ ان دنیاؤں کے اپنے آدم و نوح ہوں گے، اپنے بوعلی سینا ہوں گے، افلاطون اور سقراط ہوں گے۔ چرچل اور روز ویلٹ ہوں گے ہٹلر اور مسولینی ہوں گے لینن اور مارکس ہوں گے —— اور ان کے اپنے اپنے خاتم النبیین ہوں گے، اپنی اپنی امم مسلمہ ہوں گی!

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃٌ للعالمینے ہم بود

اب اگر زمین کسی حادثے سے مٹ بھی جاتی ہے تو زندگی اور عقلی مرتبے کو پہنچی ہوئی زندگی سلطنتِ کائنات کے کچھ نہ کچھ دوسرے شہروں اور محلوں میں باقی رہے گی اور پھلے پھولے گی۔ مل کی زمینیں اور دنیائیں "ابر کی غبار فی" سے تراشی جا رہی ہیں۔

انسان کا امید پرور ذہن عجیب عجیب طریقوں سے سوچتا ہے۔ چنانچہ مصنف نے ایک اور فلسفیانہ دلیل بُعدِ قیامت کی یہ دی ہے کہ نوعِ انسانی ابھی بالکل عالمِ طفلی میں ہے —— بلکہ پنگوڑے میں! وہ کہتا ہے کہ آج سے دس لاکھ برس قبل زندگی کی کوکھ سے انسان نے جنم لیا اور حیاتِ ارضی کے مستقبل کا طول ارب سال محسوب کیا جاتا ہے۔ اب اگر نوعِ انسانی کو ایک فرد مانا جائے اور اس کی پوری طبعی عمر کو ایک سو برس قرار دے کر دیکھا جائے تو گویا ابھی تک یہ فرد صرف اٹھارہ دن کی عمر کا ہوا ہے ایک طفلکِ معصوم جو ابھی پوری طرح اٹھنے بیٹھنے کے بھی قابل نہیں —— وہ بس بھوک اور پیاس کی حالت میں چیخ سکتا ہے، ہر چمکیلی چیز کی طرف لپکتا ہے، اور اسی طفولیت کی وجہ سے وہ حد درجہ خود غرض ہے۔ مصنف کے نقطۂ نظر سے جی نہیں، اتنا کہ یہ غنچہ ناشگفتہ نذرِ گلچیں ہو جائیگا —— گو کتنے ہی غنچہ ہائے ناشگفتہ روزِ حوادث کی نذر ہوتے ہیں اور قانونِ قضا و قدر اس قسم کے جھوٹے رحم نہیں کھایا کرتا۔

اور انسانیت خودکشی کر لے تو ——

مصنف کے مطالعہ و تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ زمین اور انسانی زندگی چاروں طرف سے خطرات میں گھری ہے اور ان خطرات سے مفر نہیں، یہ سب خطرات دُور کے ہیں اور مہلت کا وقفہ بڑا وسیع اور امید کی رسّی بڑی لمبی ہے۔ البتہ قریب ترین خطرہ یہ ہے کہ انسانیت خودکشی نہ کر لے! یہ طفلکِ ناداں اس خنجر کو اپنے پیٹ میں نہ گھونپ لے جو "جوہری توانائی" کے نام سے اس کے ہاتھوں میں چمکتا دکھائی دیتا ہے۔

جوہری توانائی کے انضباط کے لئے اگر انسان کا اخلاقی شعور مضبوط ہو جائے تو یہ ایسی ایسی حیرت انگیز خدمات انجام دے سکتی ہے اور زندگی کو ایک ایسی جنتِ مسرت و نشاط میں پہنچا سکتی ہے کہ جس کا تصور کرکے عقل کا سر چکرا جاتا ہے۔ مصنف نے ان خوش آئند امکانات کا تصور دلانے کے لئے ذیل کی دلچسپ حقیقتیں بیان کی ہیں جن کا ظہور سنہ ۲۰۰۰ء تک ہو سکتا ہے:

—— بحرِ امکان میں سفینے تیرتے نظر آئیں گے جن کے ذریعے چاند تک کا دو لاکھ چالیس ہزار میل کا سفر چند دنوں میں اور مریخ اور زہرہ کی مسافت چند ماہ میں طے ہوگی۔ چنانچہ چاند کے پہلے سفر کے لئے ایک برطانوی تنظیم (BRITISH INTERPLANETARY SOCIETY) نے ابھی

سے سیٹوں کی بکنگ شروع کر دی ہے اور فی الواقع ۲۰ ہزار افراد نے رجسٹریشن کرا لی ہے۔

ــــ ہوائی جہاز زمین کے گرد خطِ استوا پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۲۴ گھنٹے میں بغیر رکے گھوم جائیں گے اور وہ سورج کے ساتھ ساتھ پرواز کریں گے اس لئے اگر وہ کسی جگہ سے دوپہر کو چلیں گے تو دوسری جگہ دوپہر ہی کو پہنچیں گے۔

ــــ مشینی گاڑیاں سال سال بھر تک مٹر کے دانے کے برابر کی ایک ایٹمی گولی کے بل پر چلتی رہیں گی۔

ــــ ساحلی تفریح گاہوں اور پارکوں میں روشنی بہم پہنچانے کے لئے مصنوعی آفتاب اونچے میناروں پر سے نور پاشی کریں گے۔

ــــ سرطان اور دوسرے مزمن امراض کا کلی استیصال ہو جائے گا۔

ــــ کسی کیمیاوی جوہر کی کمی نہ رہے گی، کیوں کہ سمندر جو ہر شے کے وسیع ذخائر کے گودام ہیں سستی جوہری توانائی کے ذریعے کھنگال ڈالے جائیں گے۔

ــــ طلائی معیار دنیا بھر میں مستقل ہو جائے گا، کیوں کہ سائنس لوہے اور سیسے کو بآسانی سونے میں بدل لیں گے۔

ــــ اجتماعی زندگی قومیت کے دائروں کو توڑ کر ایک ہی بین الانسانی حلقے کی صورت اختیار کر لے گی۔

ــــ جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا، سرے سے اس کے وجوہ ہی نہ رہیں گے۔

ــــ ایٹمی طاقت آئندہ معمولی چیزوں سے برآمد کی جائے گی، مثلاً ایک پونڈ پانی کے ایٹموں کو پھاڑنے سے اتنی توانائی حاصل ہو سکے گی جس سے دس کروڑ ٹن پانی کو صفر درجہ حرارت (سنٹی گریڈ) سے ۱۰۰ درجہ حرارت تک پہنچایا جا سکے۔ ایک سانس بھر ہوا سے حاصل شدہ توانائی کسی طاقت ور جہاز کو سال بھر تک پرواز میں رکھ سکے گی۔ ایک مٹھی بھر برف کے ذریعے ایک بڑے گھر کی ضروریات حرارت کو پورا کیا جا سکے گا۔ ریلوے کے ایک ٹکٹ کے ذرا سے کاغذ کے ذریعے ایک بھاری ریل گاڑی کو زمین کے گرد کئی مرتبہ گھمایا جا سکے گا۔

لیکن اگر انسان اپنے آپ کو اتنے اونچے اخلاقی شعور تک نہ لے جا سکا جو جوہری توانائی کے انضباط کا ضامن ہو اور جو اسے تعمیری راستے پر ڈال دے اور اگر اسے ایک خنجرِ ہلاکت کی حیثیت سے استعمال کیا گیا تو ــــ؟ ــــــ تو انسان پر خود اس کے اپنے ہاتھوں قیامت وارد ہو کر رہے گی!

مصنف نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ آٹھواں ایٹمی سال ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ہم سنہ ۹ ایٹمی یا سنہ ۱۰ ایٹمی تک سلامت رہ جائیں گے؟

ایک معمولی ایٹم بم کے پھٹنے سے اتنی ہی انرجی کا اخراج ہوتا ہے جتنا "T.N.T" (ایک انتہائی آتش گیر مادہ) کے بیس ہزار ٹن سے۔ برقی توانائی کے حساب سے دیکھیں تو یہ طاقت اتنی ہے جتنی ہوور کے عظیم بند (HOOVER DAM) سے ایک دن میں حاصل ہوتی ہے۔ یا پھر مصنف یوں سمجھاتا ہے کہ اتنی بجلی جس سے ایک ۶۰ واٹ کا بلب دو لاکھ پچاس ہزار برس تک جلتا رکھا جا سکے۔

ایٹم بم پھٹتا ہے تو اس کی لابیت (RADIATION) اور حرارت کے زیر اثر ہوا ایک آگ بن جاتی ہے۔ ایک سیکنڈ کے دس ہزارویں حصے میں ہوا کے اس آتشیں کرے کا قطر تقریباً ۹۰ فٹ ہوتا ہے اور درجہ حرارت ۳ لاکھ درجہ سنٹی گریڈ ــــ یا سورج کی سطح کے مقابلے میں پچاس گنا زائد۔ ۶ میل کی دوری سے مشاہدہ کرنے والے ایک شخص کے لئے اس کی چمک سورج سے سو گنا زائد محسوس ہوگی۔ ایک سیکنڈ پورا ہونے کے بعد اس آتشیں کرے کا قطر ۹۰۰ فٹ ہو جاتا ہے اور یہ غبارے کی طرح اوپر اٹھتا ہے۔ دس سیکنڈ کے اندر اندر اس کے کھولتے ہوئے دھاکے

کے اندر ان اثرات کا دور ختم ہوتا ہے۔ لیکن اثرات مابعد جاری رہتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ شام کے دو بجے ہمارے شہر پر معمولی درجے کا ایٹم بم پھٹتا ہے۔ سورج سے سو گنا زائد تیز روشنی پیدا ہوگی، سامنے عمارات کا منظر عجیب ہوگا لیکن وہ تو سب آناً فاناً گر چکیں گی۔ ایک شخص جو توجہ سے نصف میل کی دوری پر ہے اس پر ایٹمی اشعاعیت کا مہلک اثر ہوگا اور وہ دو ہفتے میں دم توڑ دے گا۔ چند گھنٹوں میں اسے اشعاعیت زدگی کا پہلا اثر ایک اضطراب کی صورت میں محسوس ہوگا۔ دو ایک روز میں اس پر متلی اور قے کا حملہ ہوگا اور اسہال شروع ہو جائیں گے ساتھ ہی بخار بھی آ جائے گا۔ چند روز میں یہ علامات بالکل ہٹ جائیں گی۔ لیکن نظامِ جسمانی میں زیادہ گہرے تغیرات واقع ہونے لگیں گے۔ اب ہذیان اور غنودگی کا دور شروع ہوگا جس کا انجام موت ہوگا۔ اس دوران میں تمام جسم سمیت زدہ ہو جائے گا، داخلی طور پر جریانِ خون شروع ہو جائے گا۔ گلا متورم ہو جائے گا، تمام بال گر جائیں گے اور صنفی نظام اعضا مختل ہو جائے گا۔ وہ بدنصیب رقبہ جو براہ راست اصل ہدف بنتا ہے اس میں نہ کوئی عمارت رہے گی، نہ زمین پر نہ انسانوں اور حیوانوں کے وجود کی کوئی یادگار باقی رہ جائے گی ۔۔۔ سب کچھ گرمی اور قدرت کے بگولے میں دھواں بن کر اڑ جائے گا۔ آدھے میل کے دائرے میں تمام عمارتیں تباہ ہو کر رہیں گی بجز ان کے جو فولادی پایوں یا آہنی ہتھیر یا کنکریٹ کی بنی ہوں۔ دو میل کے دائرے میں ایسی گرم رو چلے گی کہ زندہ اجسام کی کھالیں جل جائیں گی اور خود یہی سبب بے شمار موتوں کے لئے کافی ہوگا۔ دس منٹ بعد ایک طوفانِ آتش اٹھ کھڑا ہوگا اور تیس چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چاروں طرف پھیلے گا۔ اس طوفان کے ساتھ گاما ریز حملہ آور ہوتی ہیں جو ہڈیوں کے گودے، خون کے ذرات اور حیاتی خلیات کو نشانہ بناتی ہیں۔ گاما ریز کے اس حملے سے جانبر ہونا مشکل ہے۔۔۔ دو میل تک کے انسانوں کا صفایا ہو کر رہتا ہے۔ بلکہ تیرہ ہزار فٹ کی دوری پر بھی خیر نہیں، یہاں تک کہ جو لوگ کنکریٹ کی ۱۲ موٹی دیواروں کے پیچھے ہوں وہ بھی دوسروں کے مقابلے میں صرف بقدر ۵۰٪ محفوظ ہو سکتے ہیں۔ یہ ہوگا نتیجہ ایک ویسے جوہری بم کا جیسا ہیروشیما میں ۸۰۰۰۰ افراد کے لئے قیامت بن گیا۔ اور سنئے ۔۔۔ ایٹمی دھماکے کا ایک خوفناک اثر تناسلی جرثوموں اور جنینوں پر بھی پڑتا ہے۔ ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ افرادِ انسانی کے صلب و بطن سے آیا انسانی پیکر ہی نمودار ہوں گے یا بھتنے اور چڑیلیں اور انہی وحشی بلائیں!

جائزہ بتاتا ہے کہ ناگاساکی پر پھٹنے والے ایک بم سے پورے دس مربع میل پر قیامت گزر گئی۔ ایسے ہزار بم گویا دس ہزار مربع میل علاقے کی کامل بربادی کے لئے کافی ہیں۔ مصنف مثال دے کر بتاتا ہے کہ نیویارک کا عظیم شہر تین سو مربع میل کے رقبے میں واقع ہے۔ گویا وہی ایک ہزار بم ایسے ۳۳ عظیم شہروں کا خاکہ اڑا دیں گے۔ اور ما کا شہ جو تین ہزار سال سے انسانی جد و جہد، آرٹ اور قربانیوں کا مظہر چلا آ رہا ہے پلک جھپکنے میں روشنی اور گرمی کے طوفان میں بہ جائے گا۔ یورینیم بم تو خیر پھر بھی "چھوٹے میاں" تھے، لیکن ہائیڈروجن بم تو وہ "بڑے میاں" ہیں کہ آدمی بس "سبحان اللہ" ہی پکار اٹھتا ہے۔

اور پھر ۔۔۔ ایک پیرا اور آنے والا ہے، "ریگِ مرگ" یا "موت کی بالو"! اشعاعیت وار مادوں کے ذرات کی بارش شہروں پر برسائی جائے گی اور وہ تمام گلی کوچوں میں بکھر جائے گی۔ تھوڑی تھوڑی کر کے یہ ہواؤں میں اڑتی رہے گی اور لوگ سانس کے ذریعے اسے اندر لینے کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے۔

اب تک جو ایٹمی بم بنے ہیں وہ بہت معمولی چیزیں ہیں۔ ہائیڈروجن بم، یورینیم بموں کے مقابلے میں سو سے اور ہزار گنا زیادہ ہلاکت انگیز ہو سکتے ہیں۔ اب سائنس دانوں کے سامنے سوال یہ ہے کہ کیا ہائیڈروجن بم خود زمین کے ذراتِ ترکیبی کے اندر جوہری رد عمل پیدا کر سکتا ہے؟ اور اسے ایک جگمگاتے ستارے میں بدل سکتا ہے؟ ہینس بیتھ (HANS A. BETHE) کا جواب یہ ہے جوہری رد عمل پیدا ہوگا لیکن بم کا مادی تناسب چونکہ

کے مقابلے میں اتنا کم ہے کہ وہ شروع ہوکر از خود ختم ہو جائے گا۔ مصنف خاص طور پر واضح کرتا ہے کہ یہ جواب محض نظریاتی ہے، عملی تجربہ بالکل دوسرا نتیجہ سامنے لا سکتا ہے — یعنی زمین پھٹ کر چھوٹے چھوٹے منتشر کروں کا ایک انبوہ بن سکتی ہے — اور اس وقت سرے سے یہ تجربی علم بے کار ہو گا۔

سوچئے کہ ہیروشیما کے بم نے کامل تباہی دو میل کے دائرے میں مچائی تھی، لیکن ہائیڈروجن بم ہزار گنا طاقت کا حامل ہو گا۔ ایک بم کی حرارت اور لامعیت کا دائرۂ اثر ۱۲۵۹ مربع میل تک وسیع ہو گا۔ بم کی اشعاعیت کے زہریلے پن کے بارے میں جوہری بم سازی میں کام کرنے والے ایک عالم (LEO SZILARD) کا اندازہ یہ ہے کہ ۵۰ تا ۱۰۰ اٹن وزنی ہائیڈروجن بم کا زہر پوری ارضی فضا کو مسموم کر دیگا۔ اور اس فضا میں پوری نوعِ انسانی دم توڑ دے گی۔ ایک پروفیسر (ARNOLD) جس نے اس سے اختلاف کیا ہے کہ پوری نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ بھی یہ ضرور مانتا ہے کہ اکثریت کا صفایا ہو سکتا ہے اور آئندہ دس سال میں اٹیمی آلاتِ تباہی موجودہ اندازوں سے اتنے آگے بھی جا سکتے ہیں کہ پوری نوعِ انسانی کی بقا خطرے میں پڑ جائے۔

اٹیمی اسلحہ کے استعمال کو بین الاقوامی قانون اور معاہدوں کے ذریعے روکنے کی جو تدبیر سامنے ہے وہ بھروسے کی چیز نہیں۔ ہر تی ہوئی قوم ہٹلر کی طرح ایسے قانون اور معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر کسی بھی وقت تباہی کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ عالمی کنٹرول بھی زیادہ کارگر نہیں ہو گا — جیسے کہ امتناعِ شراب کی قانونی تدابیر کا حشر بعض ممالک میں دیکھا جا چکا ہے۔ شراب کی ناجائز کشید اور خرید و فروخت کی طرح اٹیمی اسلحہ کی تیاری بھی خلافِ قانون طور پر ہو سکتی ہے۔ تاہم مصنف کی نگاہ میں یہ اقدام بھی محدود طور پر اثر افزا ہو سکتا ہے۔ اصل چارۂ کار مدرسین کی نگاہ میں صرف یہ ہے کہ ریاست کے وجود کو "قومیت" کی موجودہ سطح سے اٹھا کر اقوام کو ایک عالمی وفاق میں لایا جائے۔

مصنف کا اس معاملے میں حرفِ آخر خوب ہے:

"اصل قضیہ ایٹم بم کا نہیں، انسانی قلوب سے متعلق ہے!"

— اور یاد آتا ہے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سنہری قول کہ گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، اس میں بگاڑ آ جائے تو پورے بدن میں فساد آ جاتا ہے اور وہ اگر درست ہو جائے تو سارا نظام درست ہو جاتا ہے۔ (او کما قال)

لیکن دل دنیا کے انجام کے بارے میں سائنس کی ان مادی و طبعی توضیحات کے ذریعے جہانی نظام چلانے کے لئے اونچا اخلاقی شعور نہیں حاصل کر سکتے، اس کے لئے تو عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کیا کہتا ہے:

قرآن میں جن بنیادی معتقدات پر سب سے زیادہ گفتگو کی گئی ہے ان میں سے ایک عقیدۂ آخرت بھی ہے۔ اس سلسلے میں قیامت کے حادثے پر اتنا معلوماتی مواد قرآن نے دیا ہے کہ اس سے کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں اور اس کی روشنی میں سائنس کے نظریاتِ انجام کو جانچا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم تفصیل میں نہیں جا سکتے، اجمالاً چند حقائق سامنے لاتے ہیں۔

قرآن نے منظرِ قیامت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے ایک طرف یہ دکھایا ہے کہ انسانی عالمِ انفس پر کیا گزرے گی اور دوسری طرف یہ منظر بھی کھینچا ہے کہ آفاق پر کیا بیتے گی۔ یہاں ہم اسی دوسرے پہلو سے متعلق چند اشارات دیئے جاتے ہیں۔

— "اور جس روز کہ ہم چلا دیں گے پہاڑوں کو اور تو دیکھے کہ زمین کھل گئی ہے ......" (کہف ۴۷)

"جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جیسے کاغذ کو طومار میں لپیٹ لیا جاتا ہے" (انبیاء - ۱۰۴)

"جس دن پھٹ جائے گا آسمان بدلیوں کے ساتھ" (فرقان - ۲۵)

"جس دن مارے کپکپاہٹ کے آسمان لرز رہا ہوگا اور پہاڑ رواں دواں پھریں گے" (طور - ۹، ۱۰)

"جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا، اور پہاڑ دھنکے ہوئے رنگدار اون کی طرح ہوں گے" (معارج - ۸، ۹)

"جس دن کانپیں گے زمین اور پہاڑ، اور پہاڑ بھر بھرا تی ریت کی طرح ہو جائیں گے" (مزمل - ۱۴)

"وہ کھڑکھڑا دینے والی (آفت)! - کیا ہے وہ کھڑکھڑا دینے والی (آفت)؟ - تم کیا جانو کہ کھڑکھڑا دینے والی (آفت) کیا ہے؟

وہ دن جب کہ لوگ (سوختہ پر) پتنگوں کی طرح بکھرے پڑے ہوں گے، اور پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دھنی ہوئی رنگ شدہ اون!" (قارعہ ۱ تا ۵)

ان چند اشارات کو سامنے رکھنے سے جو تصور ملتا ہے وہ بتاتا ہے کہ پوری کائنات، یا کم سے کم ہمارے نظام کہکشانی، اور یہ بھی نہیں تو خود زمین کے قریبی ماحول میں قیامت کوئی سخت ترین حادثہ بن کر وارد ہوگی جو اجرام اور کروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گی، فضا کو زیروزبر کر دے گی۔ اور موجوداتِ مادی کا ذرہ ذرہ کپکپا اٹھے گا۔

دوسری حقیقت قرآن یہ سامنے لاتا ہے کہ اس کے وقتِ آمد سے بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی آگاہ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں قیامت کسی ایسے طبعی سلسلۂ عمل (PROCESS) کا نتیجہ نہیں ہوگی جس کا علم انسانی احاطہ کر سکے اور جس کے بارے میں پہلے سے صحیح اندازے باندھے جا سکیں۔ ملاحظہ ہوں چند آیات:-

"آپ سے (اے محمد صلعم) قیامت کے بارے میں لوگ پوچھتے ہیں کہ اس کا وقتِ ورود کیا ہے؟ کہئے کہ اس کا علم تو بس میرے آقا ہی کو ہے وہی ہے جو اسے کھول دکھائے گا اپنے وقت پر! زمین و آسمان کے لئے وہ ایک سخت شاق گزرنے والا حادثہ ہے۔ وہ جب تم کو آلے گی تو بس ناگہانی طور پر آلے گی!" (اعراف - ۱۸۰)

"آپ سے (اے محمد صلعم!) لوگ قیامت کے بارے میں استفسار کرتے ہیں۔ کہئے کہ اس کی خبر صرف اللہ ہی کو ہے! ---- اور آپ کیا جانیں کہ وہ گھڑی نزدیک ہی آ لگی ہو!" (احزاب - ۶۳)

"اور (یہ لوگ) کہتے ہیں کہ کب تک کے لئے ہے یہ (قیامت کا) وعدہ۔ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو! کہیے کہ یہ علم تو صرف اللہ ہی کو ہے اور میں تو بس ایک کھلا کھلا متنبہ کرنے والا آدمی ہوں" (الملک - ۲۵، ۲۶)

بلکہ کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے خود اس راز کو پوری طرح مخفی رکھا ہے اور آخر تک یہ انسان اور دوسری مخلوق سے مخفی ہی رہے گا۔ ملاحظہ ہو: "اکادُ اُخفیھا" (طٰہٰ - ۱۵)

پس تیسری حقیقت اسی کے نتیجے میں یہ سامنے آتی ہے کہ قیامت اچانک ٹوٹ پڑے گی۔ قرآن سے اس بارے میں بھی پوری تصریح کر دی گئی ہے:-

"یہاں تک کہ جب ان پر ٹوٹ پڑے قیامت بے خبری کے عالم میں!" (انعام - ۳۱)

"وہ تم کو آئے گی تو بس ناگہانی طور پر آئے گی!" (اعراف - ۱۸۷)

"اور قیامت کا معاملہ تو بس نگاہ کی ایک لپک کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ اقرب!" (نحل - ۷۷)

وہ اچانک پردۂ غیب سے یکایک نکلے گی اور برقِ درخشاں کی طرح ٹوٹ پڑے گی، وہ گھات میں بیٹھا ہوا ایک شیر ہے جو مادہ و روح کے گلے پر بے خبری کے عالم میں ہلّہ بولے گا! کوئی پیش بینی نہیں، کوئی پیش بندی نہیں! وہ ایسے عالم میں وارد ہوگی کہ تم اپنی اسمبلیوں اور

پارلیمنٹوں اور ریڈیو ان اور کے ایوانوں میں بحثیں لڑ رہے ہوں گے ۔ تم کرکٹ اور ہاکی اور ٹینس کے میچوں میں مشغول ہو گئے تم ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنا رہے ہو گے ، تم رصد گاہوں سے کائنات کا جائزہ لے رہے ہو گے ، تم رقص گاہوں اور میکدوں میں دادِ عیش دے رہے ہو گے ، اور تم علمی مجالس میں مقالے پڑھ رہے ہو گے کہ قیامت آنے کا امکان ہے یا نہیں اور ہے تو وہ کتنا قریب یا بعید ہے

راقم الحروف کا تصور یہ ہے کہ قیامت ایک طبعی (PHYSICAL) حادثے کی نوعیت نہیں رکھتی ، بلکہ وہ ایک ماورائے طبعی (SUPERNATURAL) امرِ الٰہی کے طور پر کائنات پر بیتے گی - اس کا وقت طبعی یا مادی اسباب کے تحت متعین نہیں ، بلکہ وہ اس اخلاقی قانون کے تحت ہے جس کے رو سے ایک خاص حد سے گر جانے والے معاشروں کو عذاب ملیا میٹ کر دیتا ہے اور اسی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ جب پوری انسانیت کا اخلاقی مرتبہ کم سے کم درجے کے مقررہ معیار سے نیچے گر جائے تو اس عالمگیر معاشرے کو ختم کر دیا جائے ۔ باغبان کسی زمین کو اسی وقت تک پانی دیتا ہے جب تک وہ برگ و بار لانے والے پودے اگاتی ہے لیکن اگر وہ خاردار جھاڑیاں ہی اگلنے لگے تو پھر وہ ایک دن کدال لے کر —— بلکہ ٹریکٹر چلا کر —— اس کی مٹی کو زیر و زبر کر دیتا ہے ۔ انسانیت کی کھیتی جب تک خیر و فلاح کے پھل پھول لا رہی ہے ، مالک اسے سنبھالے گا ، جب یہ اُجاڑ ہو جائے گی تو وہ اس کو کھود ڈالے گا !!

یہ تسلیم کہ چونکہ اس حادثے کو عالمِ مادی پہ واقع ہونا ہے اس لئے آخر کار یہ کسی نہ کسی قانونِ مادی کے دروازے سے داخل ہو گا اور ایسے دروازے ہمارے وجود کے ہر چار طرف موجود ہیں ، اور نئے پیدا ہو سکتے ہیں ۔ اور آدمی جو اپنی ساری علمی ترقیوں کے باوجود ابھی تک اس قدر نا واقف ہے کہ قریب ترین جانے پہچانے ماحول میں جس میں وہ پوری طرح تصرف کرتا ہے ، نت نئے ناگہانی حادثات رونما ہو کر تباہی پھیلاتے ہیں جن کا پہلے سے اندازہ نہیں ہوتا - یا ہوتا ہے تو غلط نکلتا ہے ، اور صحیح بھی ہو تو اس سے بچاؤ نہیں ہو پاتا —— (بقول مصنف "فطرت کا یہ طفلکِ معصوم" مبہوت کر دینے والی وسیع کائنات کے اندر کام کرنے والے قوٰی و عناصر پر اس درجہ کیوں کر حاوی ہو سکتا ہے کہ وہ پیشگی اندازے کر سکے ، اس کے اندازے لازماً صحیح نکلیں اور پھر وہ کسی آنے والے حادثے سے پورا بچاؤ بھی کر لے جائے !

انسانی عقل کے پردے میں اس کا فریبِ نفس بھی پوری طرح کام کرتا ہے ، وہ اپنے لئے طفل تسلیاں پیدا کرتا ہے ، مُوہوم سہاروں پر نئی نئی امیدوں کی نئی نئی دنیائیں تعمیر کرتا ہے —— اور پھر وہ زندگی کے میکدے میں جام چڑھا چڑھا کر بدمست ہو جاتا ہے - اسی عالمِ بدمستی میں ایک دن وہ آنے والی گھڑی آ لے گی - جیسے ایک فرد زندگی کی ہماہمی میں محو ہوتا ہے کہ موت آ کر گلا دبوچ لیتی ہے ، اسی طرح نوعِ انسانی بھی نشۂ حیات میں بہک کر بھول رہی ہو گی کہ اچانک قیامت اس کا ٹینٹوا دبا لے گی - !

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ۝

بقیہ : آپ کیا پڑھیں - سفینۃ ، صندوق ، جمعہ وغیرہ تصویر بنے ہوئے چارٹوں کی افادیت بڑھ گئی ہے - مگر تصویریں دینے میں فقہی احتیاط کو بے جا طور پر بڑھا دیا گیا ہے ، حالانکہ حضرت عائشہ پردوں والے گھوڑوں سے کھیل سکتی تھیں تو بچوں کی تعلیمی ضرورت کے لئے تصویر کو استعمال کیا جا سکتا ہے - ان تنقیدی اشاروں کا مطلب سلسلہ کی افادیت کی نفی کرنا نہیں ہے - انہیں مدرسوں اور گھروں میں ذرا بڑی عمر کے بچوں کی تعلیم کے لئے بخوبی تجربہ میں لایا جا سکتا ہے - "الف" کی قیمت ۵ روپے ہے - بقیہ چیزوں کی قیمت درج نہیں -

میرا فن!

نعیم صدیقی

دورِن در آ، قریب تر! ابرونِ در سے نہ جھانک ہمدم!
عجیب احساس کی فضائیں! عجیب تر میرے فن کا عالم!
مری حقیقت سے آشنائی! میں زندگانی کا خاص محرم!
بگڑتا بنتا ہُوا زمانہ، یہ میرا پیارا جہانِ آدم!
گھنے اندھیروں نے اس کو گھیرا، کہیں کہیں تو دیوں کی مدھم
کہیں پہ محنت کشوں کے لشکر غلام بن بن کے بک رہے ہیں
کہیں پہ عصیاں کے دوش پہ ہے نگاہ عصمت کی زلف برہم
ہر ایک ٹہنی کی آستیں میں ہزار کانٹے تنے ہوئے ہیں،
اُداس ہیں آرزو کی کلیاں! گلوں کے خندہ کی رُوح ماتم
شرارے سینوں کو پھونکتے ہیں کنارے پلکوں کے بھیگتے ہیں
جُھلستی ہے لُو چمن کو دن بھر، برستی ہے شب کو غم کی شبنم
غموں کی شبنم کا قطرہ قطرہ کہاں کہاں سے سمیٹتا ہوں!
کبھی تو طوفاں اٹھا سکوں گا! ——————

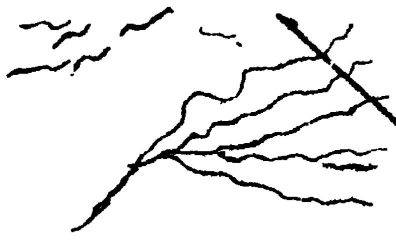
مری نگاہوں میں ہیں وہ راہی اکیلے تھے جو اپنے گھر لٹا کر
قدم قدم بڑھتے آ رہے ہیں جو کانٹے کانٹے کو خوں پلا کر

ہے دور دھندلی سی ایک منزل جو ان کی آنسوؤں کی جانِ جاں ہے
عجیب کاوش میں لگ گیا ہوں میں ان کے جذبوں پہ رحم کھا کر
خیال کو پے بہ پے دھنک کر بٹے ہیں برسوں میں کچھ فتیلے
بہم کیا بوند بوند روغن دل و جگر کو گھلا گھلا کر

دل و جگر کو گھلا گھلا کر، دیوں میں روغن نچوڑتا ہوں!
———— دیئے کبھی تو جلا سکوں گا!

قریب آ میرے روٹھے جیون! یہ موت کے خوفناک سائے!
ترے لئے گیت گا رہا ہوں! کبھی کوئی بول تجھ کو بھائے!
بہت سی تصویریں تیری کھینچیں! بہت فسانے ترے سنائے!
ترے لئے نالہ کش رہا ہوں، کسی گھڑی تجھ کو رحم آئے
کہاں نہ دی جا کے میں نے دستک، کہاں نہ پھیلایا جا کے دامن
نہ جانے کس کس سے التجا کی، نہ جانے کس کس کے ناز اٹھائے
گلی گلی، دربدر پھروں گا، کبھی تو مڈبھیڑ تجھ سے ہو گی!
کبھی تو اے میرے روٹھے جیون! تو میری آنسوؤں میں لوٹ آئے

کبھی کا تجھ کو بلا رہا ہوں! میں تیری یاد میں منا رہا ہوں!
———— کبھی تو تجھ کو منا سکوں گا!



"پنج ند" کا گیت

ذکی زکانی

گر جانے دو ڈھے جانے دو ہر چیز کو اب بہہ جانے دو
یہ کچی پکی دیواریں گرتی ہیں تو ان کو گرنے دو
سیلاب کا پانی آنگن میں بھرتا ہے تو اس کو بھرنے دو
مت روکو اس طوفان کو اب
ناخواستہ یہ مہمان سہی
آنے دو اس مہمان کو اب

چھا جانے دو اب لہروں کو
سیلاب کی چڑھتی موجوں کو
بہہ جانے دو اب شہروں کو
یہ شہر جہاں پر ہوتی ہے انسان کی عزت پیسوں سے
یہ شہر جہاں پر اہلِ ہوس کرتے ہیں حکومت گیسوں سے
یہ شہر جہاں پر بکتی ہیں افلاس کے ماروں کی لاشیں
یہ شہر جہاں پر بکتی ہیں رنگین بہاروں کی لاشیں
یہ شہر جہاں کی گلیوں پر قبضہ ہے عشرت کاروں کا
یہ شہر جہاں کی راہوں پر بہتا ہے خون بہاروں کا
چھا جانے دو اب لہروں کو
بہہ جانے دو ان شہروں کو

یہ شہر نہیں ہیں مسکن ہیں بے کاری کے بدکاری کے
یہ شہر نہیں ہیں اڈے ہیں مکاری کے عیاری کے
یہ شہر نہیں مے خانے ہیں
دھن دولت کے کاشانے ہیں
بکتا ہے یہاں انسان کا خوں
افلاس کی عزت لٹتی ہے
اپنوں میں دولت لٹتی ہے
غیروں کی عصمت لٹتی ہے

یہ گاؤں یہ قریے، یہ ڈیرے
یہ خواب نہیں انسانوں کی
نقشے یہ پرانی دنیا کے
یہ تصویریں ویرانوں کی!
یہ گاؤں جہاں کی دھرتی پر افلاس کی بارش ہوتی ہے
یہ گاؤں جہاں کے کھیتوں میں دہقان کی قسمت سوتی ہے
یہ گاؤں جہاں کی گلیوں سے اٹھتے ہیں ہلاکت کے طوفاں
یہ گاؤں یہ قریے یہ ڈیرے مردہ ہے جہاں نوعِ انساں
یہ گاؤں نہیں یہ گاؤں نہیں یہ مقتل ہیں انسانوں کے
یہ مقتل ہیں انسانوں کے، یہ ڈیرے ہیں حیوانوں کے
یاں اہلِ دولت مل جل کر پیتے ہیں خون کسانوں کا
بے قیمت ہے انسان یہاں ہے مول بڑا حیوانوں کا

یہ گاؤں جہاں کی مٹی سے اُگتا نہیں کچھ دہقاں کے لئے
یہ گاؤں جہاں کی دولت سے بچتا نہیں کچھ انساں کے لئے
یہ ڈیرے جن کی ہر شے پہ اِک موت کا عالم رہتا ہے
یہ ڈیرے جن کے ہر گھر میں دُکھ پلتا ہے غم رہتا ہے
اِن ڈیروں میں بھر جانے دو
بھر جانے دو اب پانی کو
چڑھ آنے دو دریاؤں کو
چھا جانے دو ویرانی کو

مت روکو اِس طوفاں کو اب
ناخواستہ یہ مہمان سہی،
آنے دو اس مہمان کو اب

یہ پانی ہے اِس پانی کو پیغامِ تباہی مت سمجھو
یہ پانی ہے اِس پانی کو تم قہرِ الٰہی مت سمجھو
یہ پانی خون کے داغوں کو دھرتی سے دھونے آیا ہے
مجبوروں پر مظلوموں پہ یہ پانی رونے آیا ہے
یہ پانی توڑ کے رکھ دے گا اب جسم کے رشتے کو جاں سے
یہ پانی اب دھو ڈالے گا ہر داغ کو قلبِ انساں سے
پانی کا یہ طوفاں اب ہر اک تنکے کو بہا لے جائیگا
یہ پانی ایک زمانے کو کندھوں پہ اُٹھا لے جائیگا
آشیانوں کے تن بہہ جائیں گے
دُھل جائیگا دل دھرتی کا

سب بیخ و بن بہہ جائیں گے
دُھل جائیں گے سب دشت و دمن تطہیرِ جہاں ہو جائیگی
اِک تازہ سحر سے رنگیں تر تصویرِ جہاں ہو جائیگی
مت روکو اِس طوفان کو اب
ناخواستہ یہ مہمان سہی
آنے دو اس مہمان کو اب

تقدیرِ جہاں جس محفل کی تجدید کا ساماں کرتی ہے
ڈھا دیتی ہے اُس محفل کو اُس بزم کو ویراں کرتی ہے
اربابِ ہوس کی چالوں کے سب شیش محل گر جاتے ہیں
رک جاتی ہے گردش ساغر کی رندوں کے سر پھر جاتے ہیں
تخریبِ جہاں کا واویلا تعمیر کا نغمہ بنتا ہے
تدبیر کا ہر نوحہ مٹ کر تقدیر کا نغمہ بنتا ہے

دیکھو وہ اُفق کے پردے سے خورشید نکلنے والا ہے
ہر چیز بدلنے والی ہے ہر رنگ بدلنے والا ہے
عالم کی فضائے تیرہ پر "تنویرِ نظر" چھا جائے گی!
مٹ جائیں گے سب نقشِ کہن اِک تازہ سحر چھا جائیگی
مت روکو اس طوفان کو اب
ناخواستہ یہ مہمان سہی
آنے دو اس مہمان کو اب

اعتذار

مجھ پہ ہے لطفِ گردشِ ایام
آج کل میں ہوں محورِ آلام
میرا ماحول مجھ سے بدظن ہے
میری ہستی ہے موردِ الزام
میری تقدیر مجھ سے برگشتہ
میری تدبیر کوشش ناکام
میری لیل و نہار سے اَن بن
مجھ سے برہم مزاجِ صبح و شام
میری ہر آہ زندگی کا ثبوت
میری ہر سانس موت کا پیغام
نذرِ افکار زندگی میری
ہونٹ محرومِ ساغرِ گلفام
ہوں غرض اس جہانِ تیرہ کا
ایک بے مایہ شاعرِ گمنام
جس کا مشرب ہے بات سچ کہنا
جس کا مذہب ہے مذہبِ اسلام
جس کے ساغر میں آفتابِ فکر
جس کے اشعار دور از ابہام
جس کی ہر نظم جس کی ہر اک بات
صاحبِ فہم کے لئے الہام

بیتاب زیبخی

(ایک مہربان بزرگ کے خیر خواہانہ مشورے کے جواب میں)

یہ بھی کچھ بجا سہی، حضرت!
آپ کو میری ذات سے کیا کام
دیں کسی اور کو یہ لالچ آپ
جس کو ہو خواہشِ نمود و نام
میں نہیں چاہتا کہ دنیا میں
نام میرا بھی ہو زبان زدِ عام
مال و زر کی ہوس نہیں مجھ کو
تشنگی میری بے نیازِ جام
مجھ کو جبر و ستم گوارا ہیں،
مجھ کو منظور تلخیٔ دشنام
عیش کوشی سے سخت نفرت ہے
غمِ ہستی ہے باعثِ آرام
میری نیت بدل نہیں سکتا،
اسی طرح کا کوئی خیالِ خام
شکریہ آپ کی محبت کا،
دیں کسی مستحق کو یہ انعام
رات کو دن نہیں کہوں گا حضور
تختۂ دار کیوں نہ ہو انجام

خطوط

(۱)

نعیم بھائی ۔ سلام و رحمت !

کچھ عرصہ قبل میں نے "چراغ راہ" کے لئے چند غزلیں بھیجی تھیں ۔ وہ کب کی شائع ہو گئیں ۔ اُن غزلوں پر آپ نے اپنی رائے بھی تحریر فرمائی تھی ۔ اُن رایوں سے مجھے بڑی مدد دی ۔ غزلوں کے سلسلے میں میں روایت اور بغاوت کو سمونے کا قائل ہوں یعنی غزل کی مانوس اشاریت میں عصری اور فکری رجحانات کو سمونے کی کوشش کرتا ہوں ۔ میں غزل کے لہجے میں اس دور کے تقاضوں ۔۔ تحریکی تقاضوں کے پیش نظر ایک خوش آہنگ تبدیلی کا خواہاں ہوں میں کلاسکی دور کے اس لہجے کو تحریکی نقطۂ نگاہ سے اس دور کے لئے تخریبی سمجھتا ہوں جو اقبال کی زبان میں روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرتا ہے ۔۔ اقبال کی غزلوں میں آپ کو لہجے کی تیزی اور بلند آہنگی ملے گی ۔ میں اس دور ۔م سے تھوڑا سا بلند آہنگ لہجہ پسند کرتا ہوں ۔ لیکن لہجہ اتنا بلند اور تیز بھی نہ ہو جائے کہ خوانچہ والوں کی پکار بن جائے یا سامع سن کر نعرہ زنی شروع کر دے ۔ میں غزل میں ایک تخلیقی کرب اور درد مانوسیت کو بڑی اہمیت دیتا ہوں غزل میں جذبے اور وجدان کو انتہائی ضروری خیال کرتا ہوں یہاں اگر فکر بھی آتی ہے تو جذبے کے ملبوس آتشیں میں ۔۔۔۔ ہماری ادبی تحریک میں ابھی تک فکر غالب ہے ۔ اس فکر کو جذبہ بننا چاہئے ۔ عقل کی اس آمریت نے ہماری غزلوں سے اثر انگیزی چھین لی ہے ۔ وہ منظوم اداریہ بن کر رہ گئی ہیں ۔ ہمارے اکثر غزل گو شعراء کا کلاسیکی ادب کا شعور انتہائی ناپختہ ہے اسی وجہ سے ان کے یہاں زبان و بیان کی بے راہ روی عام ہے ۔ اس صورت حال کو جلد ختم ہونا چاہئے ورنہ ہمارا ادب آپ اپنی موت مر جائیگا ۔ اور کوئی اس کا ماتم کرنے والا بھی نہ ملے گا ۔ آپ کا مجموعۂ کلام "شعلۂ خیال" میری نظر سے گزرا ۔ میں نے اسے اردو ادب کے پس منظر میں رکھ کر پڑھا تو مجھے نا امیدی بھی ہوئی اور اُمید بھی پیدا ہوئی ۔ نا امیدی تو اس وجہ سے ہوئی کہ آپ نے زبان و فن کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا اور آپ نے اپنا سخت انتخاب بھی نہیں کیا ۔ امید اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ آپ کے اندر ایک غزل گو کے دل کی تپش اور آتشِ سیالی ہے ۔ میں آپ کی بعض غزلوں کی داخلی فضا کو بہت پسند کرتا ہوں ۔۔۔ ہندوستان کے اکثر اہل نظر نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ آپ کے اندر جذب و دروں موجود ہے مگر ساتھ ساتھ اس کی بھی شکایت کی ہے کہ آپ فن و فارم کا متوازی احساس نہیں رکھتے ۔ اس سلسلے میں میری بھی یہی رائے ہے ۔ ادب میں ہئیت پرست ہونا تو اچھا نہیں ہے مگر ہئیت کا حسین استعمال بہرحال ایک اعلیٰ ادب کے لئے ضروری ہے ۔ فکر خواہ کتنی ہی بلند ہو اگر اس کے ساتھ فن نہیں ہے تو وہ ادب نہیں ہے ۔ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہئے ۔ "برائے" کا سوال بعد میں آتا ہے ۔ ادھر چند مہینوں سے آپ کی جو غزلیں آ رہی ہیں اُن میں مجھے بڑا توازن نظر آ رہا ہے ۔۔۔ خدا کرے یہ چیز دیرپا ثابت ہو ۔ آپ کی غزلوں کے سلسلے میں میرا ایک ناچیز مشورہ یہ ہے کہ آپ منتخب اشعار ہی اشاعت کے لئے دیا کیجئے ۔ ہر اچھی غزل مختصر ہوتی ہے ۔ اور غزل کا اختصار ہی اس کا حُسن ہے ۔ سات شعر سے زیادہ کی غزلیں اکثر بے کیف ہو جایا کرتی ہیں ۔ اقبال ہی کو دیکھئے انہوں نے کبھی طویل غزلیں نہیں کہیں ۔ طویل غزلوں میں وحدتِ تاثر بھی دم توڑ دیتی ہے اور غنائیت طویل ہوتا جا رہا ہے ۔ مگر کیا کروں خیالات امنڈتے ہی چلے آ رہے ہیں ۔

آپ کا
انور صدیقی

---

(۲)

مکرمی نعیم صاحب

میں "چراغِ راہ" پچھلے چار پانچ سال سے مسلسل پڑھ رہا ہوں واقعہ یہ ہے کہ اب میں یہ رسالہ پڑھ کر لذت محسوس کرتا ہوں۔ اس رسالے میں ایسے افسانے ملتے ہیں جن میں حل شدہ مسائل کو میں اپنے اوپر منطبق کر کے اپنے حالات میں تبدیلی کرتا ہوں۔ اسی طرح سوچ بچار اور دوسرے مقالات پڑھ کر سیاسیاتِ حاضرہ پر اپنے حلقے میں مضبوطی سے بولتا ہوں "چراغِ راہ" کو پڑھنے کے لئے جن کو دیتا ہوں وہ بھی اس میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض بعض فقرے مجھے سنا کر اس کی مزید تشریح چاہتے ہیں۔ اور یہ تشریح محض ذائقہ کو شوخ کرنے کے لئے وہ پوچھتے ہیں ورنہ فقرے عموماً سادہ ہی ہوتے ہیں جس کا مطلب بادی النظر میں سمجھ آجاتا ہے۔

"چراغِ راہ" میں پہلے پہل میں ایڈیٹوریل کو دیکھتا ہوں، اور اگر "کسی نے کہا" کا مضمون ہو تو ایڈیٹوریل سے پہلے وہ پڑھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ عنوان ہر پرچے میں ہو۔ آج تک مجھے ایسا اداریہ نظر نہیں آیا جس کو دیکھ کر معمولی سی ناپسندیدگی بھی میرے دل میں آئی ہو۔ بلکہ ہمیشہ ایک عجیب سی مسرت حاصل کرتا ہوں۔ ایک دفعہ چراغِ راہ کا اداریہ جیلانی بی اے نے لکھا تھا۔ اُس دفعہ میرا خیال تھا کہ شاید اچھا نہ ہو کیونکہ شروع کچھ ایسے طریقے ہوا تھا جس سے میری طبیعت مانوس نہ تھی۔ لیکن پڑھ کر میں صاحبِ مضمون کی قابلیت کا معترف ہوا کہ اپنا مقصد کیسی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور کیسے مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے۔ ایڈیٹوریل پڑھنے کے بعد فہرست مضامین پر نظر ڈالتا ہوں اور جیلانی کا نام دیکھ کر فوراً وہ مقالہ یا افسانہ دیکھنا شروع کرتا ہوں۔ (یہ ذرا افسوس کی بات ہے کہ نزدیکی وقفے میں انہوں نے چراغِ راہ میں کوئی نئی چیز نہیں پیش کی) اس کے بعد کتابوں پر تبصرہ اور باقی مضامین۔ زیرِ نظر شمارہ میں "ادب اور دواخلیت" کو سرسری نظر سے دیکھ کر چھوڑ دیا لیکن دوسرے مرحلے میں جب ذرا فرصت پا کر دیکھا تو وہی مضمون پڑھ کر بہت پسند کیا۔ "سمرقند کی ایک شام" اور "دماغی حل تطہیر کا ایک تجربہ" پسند آئے۔

میں ابھی تک شعر کو جانچنے، اس کی قدر کرنے اور اس سے محظوظ ہونے کا مذاق نہیں رکھتا۔ تاہم چراغِ راہ میں دیئے ہوئے شعر پڑھ لیتا ہوں۔ چراغِ راہ ۱۹۵۳ء کے اشاعتِ خاص میں ترقی پسند ادب کا جائزہ اور اسلامی ادب پہ مضامین بڑی تکلیف کے ساتھ پڑھے تھے۔ (یعنی مضامین خشک سے تھے جن میں میں اپنے کو خیال نہیں کرتا) اس پرچے میں "شعلۂ خیال فریادی ہے" کا مضمون پڑھا، اور پسند آیا۔ اور جس اشاعتِ خاص کا میں نے ذکر کیا ہے اس میں ایک افسانہ "تعلیم بالغوں" تھا جس کو میں نے پڑھ کر یہ تاثر قائم کیا تھا کہ اس افسانے کا کوئی مقصد نہیں۔ لیکن بعد میں کسی کے اعتراض پر آپ نے جب تشریح کی تو میں نے اس افسانے کو دوبارہ پڑھا اور واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ تشریح نہ کرتے تو میں یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ واقعہ کیا ہے اور لکھنے والا قاری کو بتانا کیا چاہتا ہے۔

میرے سب سے زیادہ پسندیدہ اداریئے "اے قوم"، "کشمیر" اور "مسلم بلاک" ہیں۔

---

(۳)

میں چراغِ راہ کا ایک نیا خریدار ہوں اور ابھی تک صرف دو پرچے ہی ہاتھ آئے ہیں۔ مگر ان دو پرچوں ہی نے مجھ میں کافی اثر اور دلچسپی پیدا کر دی ہے۔

دسمبر کے پرچہ میں جناب عامی کرنالی کی نظم "جادہ پیمائے سر زمینِ مغرب سے!" آج کل کے نوجوانوں کے لئے ایک بہت اونچے پیمانے

کی مثالی چیز تھی۔ اور جنوری کے پرچہ میں سمرقند کی ایک شام عقلمندوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہے۔
"مخلوط انتخاب" کا مضمون پاکستان کے مسلمانوں کی گری ہوئی ذہنیت کا واضح طور پر ثبوت دیتا ہے۔ اس وقت بھی اگر مسلمانوں کو ہوش نہ آئی تو نہ جانے خدا اُن پر قیامت تک بھی مہربان نہ ہو۔

---

(۴)

ایک دوست کے نام

نظم کو تفصیلاً تو میں پھر دیکھوں گا۔ ایک نظر ڈالے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس کے نتیجے میں جو کچھ سمجھا عرض کرتا ہوں۔
پہلی بات تو یہ ہے کہ "مسدس حالی" محض ایک نظم نہیں۔ بلکہ اپنے دور کی ایک زور دار فکری طاقت تھی۔ اور اس نے مسلمانوں کو ایک بار خوب اچھی طرح جھنجوڑ دیا تھا۔ وہ ایک نئے ذہنی دور کا مقدمہ بن گئی۔ اب اس رنگ کی کوئی چیز آئے۔ تو پھر اسے ویسی ہی فکری طاقت بن کر آنا چاہئے۔ پیرایہ ہی بالکل نیا ہو۔
مسدس حالی کی دو خوبیاں ہیں: ایک اس کے علمی پس منظر کی وسعت اور گہرائی۔ یعنی آپ اس مسدس کو پڑھ کر اپنی ساری تاریخ کا ایک جائزہ لے سکتے ہیں۔ اور ماضی و حال کا بالکل موازنہ کر سکتے ہیں۔ دوسری یہ کہ اس کی زبان کی سادگی ایک اعجازی شان رکھتی ہے۔ یعنی بول سادہ ہیں اور معنی گہرے۔
اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں۔ کہ بس حالی جیسے لوگ ہی ان کو یکجا کر سکتے ہیں۔ دوسری گزارش یہ ہے۔ کہ شعر و ادب میں جب تک کسی اصول نظریے اور نظام کو لے کر کاوش کی جاتی ہے۔ تو آرٹ قائم رہتا ہے۔ لیکن اگر کسی جماعت اور گروہ اور پارٹی (چاہے وہ کتنی ہی برسرِحق ہو) کو موضوع بنا کر تخلیقی صلاحیتوں کو صرف کیا جائے۔ تو ہزار احتیاطوں کے باوجود وہ چیز پیدا ہوتی ہے۔ جس کا مزاج پروپیگنڈے کا ہوتا ہے۔ آرٹ اور پروپیگنڈے میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں عمومی جاذبیت ہوتی ہے۔ اور اس کے اندر اوسط درجے کے ہر دل و دماغ کے لئے سامانِ دلچسپی ہوتا ہے۔ اور پروپیگنڈے سے ساری دلچسپی ایک خاص گروہ کو ہوتی ہے۔ سائنس کا دامن ہر کسی کو اپنے سائے میں لے لیتا ہے۔ مگر اس کا دامن اتنا وسیع نہیں ہوتا۔ اُدھر ظرف بہت بڑا ہوتا ہے۔ اِدھر چھوٹا! آرٹ سے ہر کوئی محبت کرتا ہے۔ لیکن پروپیگنڈے کے مزاج سے آپ وہ نگارش سے ایک گروہ کا رابطہ عامیانہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے گروہوں کا ردِعمل اس پر مخالفانہ ہوتا ہے۔ پروپیگنڈہ ایک محدود حلقے میں تو مثبت اثر دکھاتا ہے۔ لیکن اس سے باہر اس کا اثر ہمیشہ منفی ہوتا ہے۔ پروپیگنڈہ بہت سے دائروں میں تعصب کو ابھارتا ہے۔ اور دوسروں کے دروازے اپنے لئے بند کر دیتا ہے۔
علاوہ ازیں ایسی موثر چیز لکھنے کے لئے لمبے غور و فکر اور گہرے مطالعۂ زندگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے بہت ٹھہر ٹھہر کر لکھنا چاہئے۔ ایک مدت صرف کرنی چاہئے۔

ایک بات اور ۔۔۔!

وہ باتیں جو ہم نثر میں بہت خوبی اور وضاحت اور زورِ بیان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ ان کو عروض و قافیہ کا جامہ پہنا دینے سے آرٹ پیدا نہیں ہوتا۔ آپ جب کوئی شعر یا نظم لکھیں تو اس کی جانچ کرنے کے لئے یہ دیکھیں کہ اگر یہی بات نثر میں بیان کر دی جائے تو کیا معاملہ یکساں رہتا ہے؟ اگر ایسی کیفیت پائی جائے تو سمجھ لیجئے کہ شعریت اور آرٹ کے لحاظ سے ایک شعری نگارش ناکام رہی ہے۔ وہ ایک شے ہے جسے ہم کسی عام بات میں اپنے اندر سے ملاتے ہیں تو آرٹ پیدا ہوتا ہے۔

(نعیم صدیقی)

منٹو کا فن —

شخصیت کے آئینہ میں

ابن فرید، بی اے

پھر سمجھ لیجئے ـــ کہ ہم جس ماحول میں اب تک نئے چراغ جلا رہے ہیں اس میں پہلے سے جن لوگوں کا کوئی فنی مقام بن چکا ہے ان کو ہم آنکھیں بند کر کے معدوم نہیں فرض کر سکتے، وہ ہیں تو ان کا ہونا حس ماسا ہوگا۔ ان کے مقام کو سمجھنا ہوگا اور ان کے فنی اور فکری صلاح و فساد کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ ادب میں یہ تنگ نظری نہیں چل سکتی کہ جس کے خیالات سے آپ کو اختلاف ہو اس کا نام نہ لیا جائے یا اس پر بحث نہ کی جائے۔ ایسی بحثوں ہی کے ذریعے ہم اپنے ادبی و تنقیدی نظریے کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ منٹو پر ایک مضمون مسعود جاوید کے قلم سے ہمارے ہاں شائع ہو چکا ہے۔ اب ذرا مختلف زاویہ نظر سے لکھا ہوا ابن فرید کا مقالہ پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

"شخصیت کا آئینہ فن کے بہت سے آئینوں میں سے ایک ہے۔ اس کے علم کے بغیر ہمیں فن کے آئینہ خانہ میں بار نہیں ملتا" آل احمد سرور کا یہ قول اپنے اندر بڑی صداقت رکھتا ہے، کیوں کہ انسانی فطرت اپنے ماحول سے بلند ہونے کے لئے سخت ترین مطالبات کرتی ہے، اور جب یہ مطالبے پورے نہیں ہوتے ہیں تو یہ لابدی ہو جاتا ہے کہ ایک فرد اپنے ذاتی تجربات، تاثرات، اور ذہنی کیفیات کو ہر اس فعل میں دخیل رکھے جو اس سے سرزد ہو رہا ہے اور ادب میں تو ایسی حالت میں قطعاً لازمی ہے کہ ادیب الفاظ کی نشست سے لے کر ان کے پس پردہ کے معنی تک اپنے ماحول سے مستعار لے۔ وہ جس انداز سے سوچتا ہے اور جس طرح کسی شے، فعل یا عمل سے متاثر ہوتا ہے ایک طرح سے اس کے ماحول کا پرتو ہی ہوتا ہے۔ مجرد فکر یا تصور (IMAGERY) سے ماورا تخئیل (IMAGINATION) انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بات منٹو کے بارے میں بھی بالکل صحیح ہے جب ہم اس کے فن پر غور کرتے ہیں تو اس کے افسانوں کی ہیئت اور ان کے مواد کے لئے اس کے اپنے ماحول اور ذہن کا جائزہ لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ یہی عوامل اس کی تصوریت اور تخئیل کی اساس بنتے ہیں۔

منٹو کے فن کی بلندی سے یہ حقیقت ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے افسانہ نگاری کو مغربی طرز تحریر سے کافی نزدیک کر دیا ہے اور موپاساں، ٹالسٹائی اور گورکی کی فنیت کو بڑی چابکدستی سے اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اس نے مشرقی تصورات اور کرداروں کو اساس بنا کر افسانوں میں ماحول کی ماورسیت کو خوشگوار حد تک ابھارا ہے۔ بعض اوقات اس نے تحریر میں بغیر کسی زور سادہ ادبیت کو پیدا کئے ہوئے اثرانگیزی کو تحریک کے ذریعہ درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ دراصل منٹو کے افسانوں کا کمال بھی یہی تھا:-

"ایسے لوگوں کو بیس سال سے یہی اعتراض رہا ہے کہ منٹو نوجوان ایسی باتیں کرتا ہے جس سے ان کو چونکا پڑتا ہے۔ شاید یہ کوئی غیر شعوری غیر ارادی یا غیر ادبیانہ بات ہو۔ لیکن میں نے جو تھوڑا بہت ادب پڑھا ہے اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو چونکانا ادب کا ایک مقدس فریضہ رہا ہے بلکہ میل ڈول نے تو ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جو چونکانے سے ڈرتے ہیں۔ منٹو کو چھوڑیئے، والٹیر

بیسے عظیم شاعر کو کیا کہئے گا جس کا ایک ادبی اصول ہی یہ تھا کہ متوسط طبقہ کو چونکا یا جائے ۔"

(منٹو کا مقام ——— محمد حسن عسکری)

منٹو نے چونکانے کے لئے اپنے فن میں جن ذرائع کو استعمال کیا ہے ان میں جنس اور گرے ہوئے ماحول کو اولیت حاصل ہے۔ اس حقے دونوں اسباب کے مارے ہوئے روگیوں کے ماحول کو ادب میں زندہ کرکے پیش کیا ہے۔ اُن کی گفتگو، اُن کا رہن سہن، اُن کا طرزِ معاشرت اور ان کے اخلاق و عادات ہر چیز کو اس نے اس طرح ادب کے صفحات پر ثبت کیا ہے کہ جیسے اُس ماحول سے اس کو قریبی تعلق رہا ہو۔ منٹو نے اس ماحول کو کیوں منتخب کیا ؟ ——— عبادت بریلوی کا خیال ہے۔

"سماجی زندگی کے ایسے معاملات کی ترجمانی جن سے افراد کی زندگی براہ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوتی ہے، منٹو نے بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ان مظالم کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے جو زندگی کے غلط نظام اقدار نے تاریخ کے مختلف ادوار میں افراد پر روا رکھے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے انسانیت کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے ——— زندگی کو جس سانچے میں ڈھلنا چاہئے تھا، نہیں ڈھل سکی ہے ——— اور اس کی رفتار ارتقا کا جو اندازہ ہونا چاہئے تھا، وہ اُسے میسر نہیں آ سکا ہے ——— اس میں گندگی اور تاریکی ہے۔ اور منٹو اس گندگی اور تاریکی پر کڑھتا ہے۔ اس پر خون کے آنسو بہاتا ہے۔ اس طرح اس کے تمام پہلو افراد پر روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن خود منٹو ان کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ ان حالات کو ٹھیک کرنے کے لئے کوئی واضح لائحہ عمل منٹو کے یہاں موجود نہیں ہے ——— وہ ان کو دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے ——— اسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی۔ کہ ان حالات کو ٹھیک کس طرح کیا جائے ——— بہتر کس طرح بنایا جائے ——— لیکن اس کی تحریروں میں ان حالات سے بے زاری ضرور محسوس ہوتی ہے ———"

(منٹو کی حقیقت نگاری ——— ڈاکٹر عبادت بریلوی)

منٹو کے اندر جس اضطراب اور بے چینی کی طرف ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اشارہ کیا ہے وہ ایک تاریخی کو بڑا اہم اور مبارک جذبہ محسوس ہوتا ہے۔ ایک فرد اگر کسی ناسور پر مرہم نہیں رکھ سکتا ہے تو دوسروں کو اس طرف متوجہ کرا دینا بھی اس کے لئے بڑی کریڈٹ کی بات ہے۔ کم از کم اس سے کائنات انسانی کے گوشوں میں سڑتی ہوئی غلاظتوں کی طرف بے خبر انسانوں کی توجہ تو مرکوز ہو جائے گی اور کوئی نباض اُن پر مرہم رکھ سکے گا۔ منٹو میں یہی انسان دوستی دکھانے کی عبادت بریلوی نے پوری پوری کوشش کی ہے۔ پروفیسر وقار عظیم بھی یہی خیال رکھتے ہیں۔

"منٹو کی نظر میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق ——— معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بین نکتہ رس نگاہ ہر ایک کے حُسن و قبح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و ہنر پر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ اُن میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو دھوکے میں رکھتی ہیں کن سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کن سے انسانی زندگی اس سکون و مسرت سے محروم ہوتی ہے جو فطرت کا منشا ہے۔ منٹو انسانی زندگی ——— اس کے سب اجتماعی ادارے یعنی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق میں فطرت کے تقاضے سمجھ راستہ اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق پوری طرح ہموار دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس پہلو سے زندگی کو

تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ ناانصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون ناانصافی کر رہا ہے اور کس طرح کر رہا ہے۔ منٹو نے اس ناانصافی کو مٹانے، اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کو اپنے فن کا مقصود بنایا ہے۔"

(منٹو کا فن — پروفیسر وقار عظیم)

وقار عظیم نے تو منٹو کی مثبت مقصدیت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے حالانکہ عبادت بریلوی نے منٹو کو واضح اور مثبت مقصدیت سے قطعاً محروم قرار دیا ہے۔ منٹو کے فن کا اگر ہم غائر نظر سے مطالعہ کریں تو ہمیں خود عبادت بریلوی کے متعین کردہ مقصد سے بھی اختلاف کرنا پڑے گا اور حسن عسکری کی بات کو غلط قرار دینا پڑے گا۔ منٹو نے جو کچھ اپنے ادب میں پیش کیا ہے۔ وہی کچھ اُس نے اپنی عملی زندگی میں جائز رکھا ہے۔ اس نے ادب میں جو گند اچھالنے کا فن محض اس خیال سے نہیں اختیار کیا ہے کہ منٹو اس گندگی پر کڑھتا ہے۔ اُس پر خون کے آنسو بہاتا ہے جبکہ وہ خود اپنی زندگی کے بہت سے کمزور پہلوؤں پر پردہ ڈالنا اور بہت سے "بدنام" افعال کے لئے عذر لنگ اور وجہ جواز فراہم کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود اپنی عملی زندگی میں جس پستی میں گرا ہوا ہے۔ اس پر شرمندہ ہونے کی بجائے لنڈورے گیدڑ کی طرح دوسروں کو ان کی "دم" سے محروم کرانا چاہتا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ برائی اور معائب کو جب تک حسین محمل میں اٹھا کر سوسائٹی کے بازار سے نہ گزارا جائے گا۔ اس وقت تک انسان اُسے اپنانے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ ازل سے ابد تک انسانی ضمیر کبھی یہ گوارا نہ کرے گا کہ وہ باطل کو باطل سمجھتے ہوئے اختیار کرے یا اس میں ملوث ہو جائے ماسوائے یہ کہ اس میں محاسن، تفاخر اور حق کی حلاوت نہ پیدا کر دی جائے۔ جب ایسا ممکن ہو جاتا ہے۔ تو انسان اس "ملمع" شدہ کھوٹی چیز کو کھری سمجھ کر ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ لیکن جب حقیقتِ حال اس پر کھلتی ہے۔ اور اپنے آپ کو سراسر فریب میں مبتلا پاتا ہے۔ تو یا تو وہ اُسے ترک کر دیتا ہے یا پھر دوسروں کو بھی اس خندق کی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ منٹو نے اپنی زندگی میں خود کو فریب میں مبتلا پایا۔ اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بجائے، اُس نے دوسروں کو بھی اس گراوٹ میں گھسیٹ لینے کی کوشش کی۔ اُس کے سامنے سرے سے کوئی مثبت یا منفی مقصد تھا ہی نہیں۔ وہ لکھتا تھا۔ تاکہ شراب پیئے اور بدمست رہے۔ لیکن اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ کہ وہ دوسروں کی نکتہ چینی کو برداشت کر سکے۔ چنانچہ اُس نے اپنی خداداد صلاحیت کے ذریعے اپنے قبیح سے قبیح فعل کے سلسلے میں دوسروں کو خوش گمان کر لیا۔

منٹو کے فن کی یہ تصویر ممکن ہے عجیب محسوس ہو لیکن ہمیں جو کچھ کہنا ہے۔ اُس سے ہم جو نکالنے کا کام لینے کے بجائے ایک مشہور ادیب کا صحیح مقام متعین کرنا چاہتے ہیں۔ منٹو اپنے اندر اگر واقعی سماج کی اصلاح کا درد رکھتا تھا۔ اس کا سینہ اگر غلط تمام اقدار کے رواج سے چھلنی ہو رہا تھا تو اس کے دل و دماغ کے لئے ہم آہنگی لازمی تھی یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے، کہ ایک فرد گندگی اور تاریکی پر اس قدر مضطرب ہو اور زندگی کو فطرت کے بناتے ہوئے راستے پر اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق پوری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہو۔ لیکن خود عملاً اس کی طرف سے بے نیاز ہو۔ بلکہ اس ڈگر پر چل پڑا ہو جس سے وہ دوسروں کو ہٹانا چاہتا ہو۔ یہاں وہ عقدہ ہے۔ جو اپنے حل کے لئے دلائل اور تجزیہ و موازنہ طلب کرتا ہے۔

اس امر کے لئے ہمیں منٹو کے افسانوی ادب میں جس طرح کے کردار ملتے ہیں[1] اُن کے مجموعی اوصاف کا جائزہ لینا ہوگا اور ایک ایک وصف

---

[1] منٹو کے کرداروں کے مجموعی اوصاف کا جائزہ لینے کے لئے ضرورتاً مقالہ نگار نے جو اقتباسات دیئے ہیں اور ان پر جو نوٹ لکھے ہیں افسوس ہے کہ ہم ان کو چراغ راہ کے اوراق میں نہیں دے سکتے، کیوں کہ یہ پاکستان کے شریف اور مہذب طبقوں میں جانے والا جریدہ ہے۔ "گھن کا احساس" پیدا کرنے والی چیزیں ہم خوشی سے نہیں کر سکتے۔ (چراغ راہ)

کے بارے میں الگ الگ بحث کرنی ہوگی۔ مثلاً:

"اس کے یہاں طوائف کی زندگی سے متعلق تاریک پہلو نسبتاً زیادہ نظر آتے ہیں ــــ منٹو ان پہلوؤں کی وضاحت بہت تفصیل سے کرتا ہے۔ یہ تفصیل ایک طرف تو گھن کا احساس پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف اُس سے ہمدردی کا خیال بیدار ہوتا ہے۔"

(منٹو کی حقیقت نگاری ــــ عبادت بریلوی)

لیکن جب ہم "کالی شلوار" اور "گوپی ناتھ" کا مطالعہ کرتے ہیں تو طوائف کے ساتھ ہمدردی کہاں اس کے پیشہ کی تمام کراہتوں کو نظر سے دور کرا دیتی ہے۔ افسانہ "مرکزی نقطۂ نظر" کے لحاظ سے طوائف کی زبوں حالی دور کرنے کی طرف ضرور متوجہ کراتا ہے لیکن ایک ضمنی تقاضہ بھی کیا جا رہا ہوتا ہے کہ اُس کو اس کے اپنے ہی پیشہ میں مطمئن رکھا جائیے۔ اور یہ ضمنی تقاضا ہی دراصل اس لغزش کی طرف بڑھاتا ہے جو سماج کو تباہی کے گڑھے میں جا گراتی ہے۔ منٹو اپنی انفرادی زندگی میں اس "بازار" کا محتاج تھا۔ اس کی بقا اس کی نجی زندگی کے لئے ضروری تھی۔

"وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخریہ سنایا کرتا۔ ایک دن میں نے جلانے کو کہہ دیا یہ جھوٹ بولتے ہیں.......
....[1] اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا کہ یہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کہتے ہیں اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

"..

....

....

....[2]"

(میرا دوست میرا دشمن ــــ عصمت چغتائی)

یہ اقتباس کسی قدر طویل ہو گیا ہے، لیکن اس امر کی وضاحت کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ منٹو کے دل میں طوائفوں کے لئے کوئی خلوص نہیں تھا بلکہ جہاں وہ ایک طرف اُن کے کوٹھوں پہ دام وصول کرنے گیا ہے وہاں دردمندی کی چاشنی دے کر اُس نے لذتیت کے طویل تذکروں کے ذریعہ اپنے کھوئے ہوئے پیسوں کو دوسروں کی جیب سے اچک لینا چاہا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے جہاں ایک طرف محترمہ عصمت چغتائی بے نقاب ہو جاتی ہیں وہاں منٹو کا وہ خلوص جس کے بارے میں دوسرے ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ڈھونگ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور جب یہ حریری ملبوس تار تار ہونے لگتا ہے اور جذام زدہ کردار سامنے آنے لگتا ہے تو سہارا دینے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔

"..... اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ منٹو صاحب نے ان گرے ہوئے لوگوں کو پہلی بار پوری ایمانداری کے ساتھ پیش کیا

ــــ اسی سلسلے میں منٹو صاحب پر الزام رکھا جاتا ہے کہ عریانی پر اتر آئے تھے ــــ اب یہ الگ بحث ہے کہ عریانی کیا ہے اور کیا عریانی نہیں

البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ آرٹ اور ادب کے بڑے بڑے شاہکاروں پر بھی یہ الزام عائد ہوتا ہے ــــ مگر اللہ کوئی اتنا تو بتائے کہ کیا عریانی میں ایک دلکشی، ایک بے داغ سی معصومیت، ایک رنگ، ایک دلکش سا نہیں ہوتا جو تخلیق اور نسلِ انسانی کی بقا کے لئے [illegible] کو قائم رکھنے کے لئے ضروری[3]

[1] چند الفاظ مجبوراً حذف کر دیئے گئے۔ (چراغِ راہ) [2] یہ طویل اقتباس حذف کر دیا گیا ہے۔ (چراغِ راہ) [3] کیا خوب استدلال ہے، یعنی چونکہ عریانی میں دلکشی ہے، لہٰذا وہ بے داغ معصومیت کی شان رکھتی ہے۔ حکیم صاحبہ کو شاید یہ شعور نہیں کہ لذتیت ہر برائی میں ہوتی ہے اور اسی لذتیت کی کشش سے انسانیت [illegible] برائی کی طرف لپکتے ہیں۔ جیسے ایک چور اپنے پیشے میں ایک لذت محسوس کرتا ہے جس کا نام چوری والے نے [illegible] رکھا ہوا ہے۔ (چراغِ راہ)

کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اب یہ تو محض ضد کی بات ہے کہ کوئی محترم یا محترمہ دس بچوں کے ماں باپ بن کر بھی لذتیت اور عریانی کے نام سے بھڑکیں اور اپنے جگر گوشوں کو "سفلی جذبات" یا دوسرے اس قسم کے نجس الفاظ کا نتیجہ قرار دیں۔[1]"

(جو کہہ نہ سکا ——— ہاجرہ مسرور)

ہاجرہ مسرور ہی کے الفاظ میں یہ الگ بحث ہے کہ جس جائز اور صحت مند ذریعۂ تخلیق اور نسلِ انسانی کی بقا کے مقدس تسلسل کو قائم رکھنے کی فطرت کو وہ لذتیت اور عریانی سے تعبیر کرتی ہیں، وہ واقعی لذتیت ہے یا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور واضح کروں گا کہ اس فطرت کی تسکین کے لئے آج بھی انسان سڑکوں کے چوراہوں کو منتخب نہیں کرتا ہے۔ پھر ادب بے چارے نے کیا قصور کیا ہے جو وہ سڑکوں کے چوراہوں سے بھی زیادہ سفلہ بنا ڈالا گیا ہے۔

یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، اصل موضوعِ گفتگو منٹو کی لذتیت پرستی تھا۔ مندرجہ بالا اقتباس سے لذتیت کے لئے جو جواز تلاش کیا گیا ہے وہ پھر بھی منٹو کی افتادِ طبع کی پردہ پوشی نہیں کر سکتا۔ اس نے خود کہا ہے:-

"...... منٹو بھڑک کر بولا "تم کیا جانو .... (الفاظ حذف کئے گئے ۔ چراغِ راہ) تم نے تو ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم نے تو شراب تک نہیں چکھی۔ تم تو اس روز چاوڑی بازار میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے راج ہنسوں کے ہجوم میں کوا گھس آئے"......"

(منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط ——— احمد ندیم قاسمی)

اس کی نگاہ میں یہ حرکت اپنے ہی لئے پسندیدہ ہی نہیں تھی بلکہ جو بھی "چاوڑی بازار" کی معصیت سے محروم تھا وہ راج ہنس نہیں کوا تھا۔ اسی تصور اور نظریہ نے اس کو اس طبقہ کی طرف پوری طرح مائل اور متوجہ کیا۔ وہ ان کے رستے ہوئے ناسوروں پر مرہم رکھنے کا بہانہ کر کے اپنے اسفل ترین تاثرات کو دوسروں تک منتقل کرتا رہا کیوں کہ اس کے ادب کا تصور یہی ہے کہ وہ عریاں ہو، راگ رنگ کا حامل ہو اور معصومیت کو "معصیت" میں تبدیل کر دینے والا ہے۔

ایسا ادب جو براہِ راست سفلی جذبات کو متحرک کر دیتا ہے وہ پڑھنے والے کی توجہ کو فن کے دوسرے لوازمات کی طرف سے قطعاً ہٹا دیتا ہے۔ قاری سفلی جذبات کی رَو میں اس قدر تیزی کے ساتھ بہنے لگتا ہے کہ عقل و ہوش کے پتوار اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتے ہیں۔ اور پھر خاص طور سے جنس کی چاشنی دے کر انسان کے انتہائی زود اشتعال پذیر جذبات کو جب بھی بھڑکایا جاتا ہے تو دامانِ تمکین و ہوش تو بالکل ہی پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ ناظر اس کی تصوری لذت میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے عوض افسانہ نگار سے اور کچھ بھی مطالبہ نہیں کرتا۔ منٹو اس گُر سے اچھی طرح واقف تھا چنانچہ عبادت بریلوی کے قول کے برخلاف؛

"........ منٹو کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کا کون سا افسانہ جنسی نہیں ہے ذرا مشکل ہی ہے۔ کم از کم اس دور کے تقریباً آدھے افسانوں میں جنسی میلان اس درجہ رچا ہوا ہے کہ افسانے کے باقی پہلو اس کے نیچے دب کر رہ گئے ہیں۔ منٹو نے اس دور میں جتنی جنسی کہانیاں لکھی ہیں ان میں سے بعض کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نفسیاتی یا تجزیاتی ہیں لیکن اکثر کا مقصد سوائے جنسی ہیجان پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی اس بے حد اہم فطری جبلت نے ان افسانوں میں ایک غیر صحت مند اور مضر عریاں میلان کی شکل اختیار کر لی ہے۔ منٹو کے ان افسانوں کا ہر کردار، بوڑھا

---

[1] یعنی تم چاہو کہ دس بچوں کے ماں اور باپ خواہ چوراہوں پر ننگے ہو کر ناچنے کو بھی مقدس فریضہ تسلیم کر لو!! (چراغِ راہ)

جوان بچہ، عورت، مرد کسی نہ کسی طرح اسی مرض کا مریض معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس اعتراض کا جواب افسانہ نگار کے
پاس یہ ہو کہ جس چیز کو دوسرے مرض کہتے ہیں یا سمجھتے ہیں وہ جائز طور پر فطرت کا ایک ناگزیر تقاضا کہتا ہے اور اسی لئے اس کے
ہر پہلو کی عکاسی کرنے کو اپنا فنی منصب جانتا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ فطرت کے ضروری سے ضروری اور رسیلے سے رسیلے
تقاضے بھی جب اعتدال کی حد سے گزر جائیں تو ترقی اس کا علاج ہے۔ ایک غلط راہ پر پڑے ہوئے فطری ہیجان کو بار بار ابھارنا
نہ اس فرد کے لئے مفید ہے جس کے لئے یہ خدمت انجام دی جا رہی ہے اور نہ اس معاشرے کے لئے جس پر اس طرح کے افراد
کی صحیح تربیت کا بار ہے۔ (تقسیم کے بعد منٹو کے افسانے —— وقار عظیم)

لیکن منٹو نے معاشرے کی تربیت اور تعمیر کی ذمہ داری کو اپنے کندھوں سے بالکل ہی اتار پھینکا۔ صالح معاشرے کے لئے ضروری ہے کہ ادب کے ذریعے عوام کے سامنے وہ نصب العین پیش کیا جائے جو ان کی توجہات کا مرکز بن جائے جو ہر طبقہ کے لئے اپنے محاسن کی وجہ سے کشش کا باعث بنا رہے۔ لیکن منٹو کے یہاں جو نظریہ ہے وہ جراثیم پیدا کرنے کے بجائے عوام کو صحیح راستے سے ہٹا دینے والا ہی ہے۔ وہ عوام کے جذبات کو ترفع کرنے کے بجائے تنزل کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس کے یہاں گرے ہوئے کرداروں کے حرکات و سکنات میں حسن دکھانے کی سعی ہے۔ حالانکہ اس سعی سے اس کا مقصود جیسا کہ اس نے بارہا کہا یہ عیاں کرنا تھا کہ عمدہ اوصاف گرے ہوئے لوگوں میں بھی ہوتے ہیں۔ ان میں بھی انسانیت کی رمق پائی جاتی ہے۔ وہ بھی اپنے اندر ایسی خوبیاں رکھتے ہیں جن پر نام نہاد پارسا اور شریف لوگ رشک کریں۔ لیکن صرف اسی اظہار سے افسانہ نگار اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے یہ مشاہدہ کرنا بھی ضروری ہو گا کہ کہیں حد سے زیادہ یہ اظہار دور تو نہیں دے رہا ہے جس کی وجہ سے اس خرابی کے فروغ پانے کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ کہ گرے ہوئے طبقہ کے دوسرے معائب بھی آئیڈیل بن جائیں۔ مثلاً موذیل کا کردار لیجئے۔ اس کی قربانی اور بے لوث محبت قابلِ رشک ہے۔ انسانیت کے لئے کتنے ہی زبانی جمع خرچ کرنے والوں کو وہ مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے گریبان میں منہ چھپا لیں۔ لیکن جب خود وہ اپنی ناک صاف کرنے کے لئے فراک کا دامن استعمال کرتی ہے اور برہنگی کے ذریعہ جذباتی ہیجان کو دعوت دیتی ہے تو نہ معلوم کتنے ہی مفاسد کو راہ دے جاتی ہے۔ موذیل کی قربانی کے لئے برہنگی کی طرف سے یہ بے پروائی ضروری تھی لیکن افسانہ نگار کو یہ کہاں تک زیب دیتا تھا کہ اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہ ہر دو چار قدم پر قاری کے جذبات سے کھیلتا چلے۔ اسی طرح "ممی" میں ممی کے کردار میں محبت، شفقت اور غم گساری کی صفات کو جس طرح پیش کیا گیا ہے، وہ اس شخص کے لئے ضرور اثر انگیز ہو سکتی ہیں جو بردہ فروشی کے جواز کے لئے دنیا کی عریانی و پستی کو دلیل نہ بنائے، ورنہ طبیعت میں ایسا شعر پیدا ہوتا ہے کہ افسانہ اپنے تمام جنسی اور جذباتی ہیجانات کے باوجود قاری سے اپنی بات نہیں منوا پاتا۔ ممی کے تمام محاسن اس کی ایک ہی خباثت کے نیچے بالکل ہی دب کر رہ جاتے ہیں اور شراب پینے والے پیڈا اور ان کے (افسانوی ساتھی) منٹو کے آنسو گر کر کے آنسو بن جاتے ہیں۔ منٹو کے بیشتر کرداروں میں فنکار کے جنسی انتشار کی وجہ سے ایسے ہی بڑے بڑے خلا پائے جاتے ہیں مگر اس کی طرف سے یوں وکالت کی جاتی ہے۔

"منٹو کی کردار نگاری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ سارے کردار محض اس کے تخیل کی پیداوار نہیں،
اس نے اپنے مطالعہ اور مشاہدے سے انہیں اچھے برے انسانوں کی اس بھیڑ میں چھانٹ لیا ہے جس میں ہم سب کھو جاتے
ہیں۔ کردار ناٹک کی اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کی طرح اپنے منہ پر نقلی چہرے چڑھائے نظر نہیں آتے، بلکہ وہ تو
اپنے جسم پر سے لباس بھی اتار پھینکتے ہیں کہ ہم ان کے خد و خال (ان کے داغ) پر منطوطا اور انجانا یا سمپر لٹتے ہوئے ناسور

وہ سرشتہ ہوئے زخم بھی دیکھ لیں، ان کی گفتگو بھی ایسی ہی بے تکلف اور برجستہ ہوتی ہے۔ گالی بکنے والا کردار گالی ہی بکتا ہے، موقع بے موقع اقبال کا شعر نہیں پڑھ سکتا، اور معلوم نہیں کیوں منٹو کو اپنے افسانوں میں شعر استعمال کرنے سے ایک طرح کی چڑ سی معلوم ہوتی ہے، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ منٹو کے کرداروں کی دنیا میں زندگی کے تلخ حقائق شعر و شاعری پر غالب آ گئے ہیں۔

(منٹو ـــ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

دراصل ہمیں شکایت بھی منٹو کے مشاہدے اور مطالعے سے ہے۔ اُس نے گرے ہوئے کرداروں کا جس رُخ سے مطالعہ کیا ہے اُس میں اس نے مصائب کو مسترد کرنے کے بجائے آئیڈیل بنا کر پیش کیا ہے۔ ایک ناخواندہ جاہل سے اشعار پڑھنے کا مطالبہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ توقع تو ہر ایک کر سکتا ہے کہ یہ ساری دنیا منٹو کے گھنونے کیڑوں سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ انتہائی پست ماحول میں ایسے مضبوط کردار موجود ہیں جو ستون بن کر اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالے ہوئے ہیں، اور اس کا ثبوت منٹو کو اپنے افسانے "منظور" سے مل سکتا ہے، مگر اُس نے ایسے کرداروں کی طرف زیادہ کیا، ذرا بھی توجہ نہ دی، بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ناپسندیدہ کردار منظرِ عام پر لاتا رہا کیونکہ اُس کا خیال تھا۔

"زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اُس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے ـــ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں ـــ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے ـــ میں ہنگامہ پسند نہیں ہوں۔ لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب اور تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی ـــ میں اُسے کپڑے پہنانے کی بھی کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ میرا کام نہیں، درزیوں کا ہے۔"

(پیش لفظ "منٹو کے افسانے" ـــ منٹو)

کتنی خوبصورتی کے ساتھ منٹو نے اپنی ذمہ داری کو معاشرے کے سر منڈھ دیا ہے۔ حالانکہ اس کے اس قول کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایسی بات بھی وزنی نہیں معلوم ہوتی۔ اس عہد کی برائیاں ہر ایک پر واضح ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ صدی مستقبل کے لئے جس قدر فکرمند بن گئی ہے اُس کا اندازہ ہر ذی ہوش کو ہے۔ زمانہ جس قدر مادی ترقی کر رہا ہے اسی قدر اخلاقی حیثیت سے تنزل کر رہا ہے۔ ایک بلندی ہے دوسری پستی میں گر رہی ہے۔ لیکن کیا شدہ حالت میں ہوتے چلے جاتے رہنے سے نیکی دریا میں ڈوب جانے والا سفینہ بچ جائے گا؟ مان لیا، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کوئی متوجہ ہو جائے۔ لیکن وہ کون ہوگا؟ سب تو اس چینی اور سکتے طوفان میں ڈبکیاں لگا رہے ہوں گے۔ ایسی صورت میں ذمہ داری دوگنی ہو جاتی ہے ـــ ایک طرف معاشرے کی خرابیوں سے آگاہ کرنا اور دوسری طرف ان کو دور کرنے کے لئے کسی مثبت صورت کی طرف اشارہ کرنا۔ لیکن منٹو اپنی زندگی کے آخری لمحے تک فیصلہ ہی نہ کر پایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"بات یہ ہے کہ اب میری ذہنی حالت میں بہت بڑا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ سینکڑوں چیزیں بیک وقت سوچنے سے میں ایک فکری کے عالم میں رہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں میں کوئی قابلِ قدر چیز نہیں لکھ سکا۔"

(خط بنام احمد ندیم قاسمی مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء ـــ منٹو)

"منٹو کہتا تھا کہ وہ ایک ایسی پہیلی بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔"

(منٹو ـــ سعادت حسن منٹو)

یہی وہ کمی تھی جس نے اُسے مجبور کیا کہ وہ افسانے کے لئے ایسے کردار تلاش کرے جو معاشرے کے ان حصوں سے تعلق رکھتے ہوں جو مدتوں سے کرب و اذیت میں مبتلا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ مطمئن نہ ہو سکا تو اُس نے اپنی تحریر کی خرابی کو موجودہ نظام کی خرابیوں کے سر چپک دیا۔ وہ خرابیاں جو وہ اپنے کرداروں میں دکھاتا ہے اور جن کو وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کا ماحصل قرار دیتا ہے خود اُس کے اپنے اندر موجود تھیں۔ اُس کے کردار اکثر فحش گالیاں بکتے ہوئے پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں وہ کہتا ہے۔

"گالی منٹو نے نہیں بکی، اس سپاہی نے بکی ہے جہاں آپ کو ہاتھ لگے آپ اُس کی تواضع کریں۔ منٹو نے تو صرف اُسے اپنے افسانے میں پیش کر دیا ہے۔ اس افسانے میں اور کئی باتیں بھی ہیں، آپ اُس گالی کے پیچھے پڑ گئے۔ ان باتوں کو دیکھنے اور سننے کے لئے آمادہ نہیں، آپ کا جی چاہے آپ گالی دے لیں لیکن افسانے کو ضرور سمجھنے کی کوشش کریں۔"

(منٹو ——— ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

اس سپاہی کی تلاش میں ہمیں دور نہیں جانا پڑتا۔ یہ ہمیں خود منٹو کی شخصیت ہی میں چھپا ہوا مل جاتا ہے۔

"منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اسے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کوشش کر کے ایک آدھ غلیظ گالی دے (سالے والے تو وہ کہتا ہی رہتا تھا) لیکن کرشن کبھی ایسا موقع نہ آنے دیتا تھا۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا چاہتا۔ دو موقعوں کا میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اُس نے اور مجھے گالی دی۔"

(منٹو میرا دشمن ——— اوپیندر ناتھ اشک)

اور وہ موقع یہ تھا ———

اوپیندر ناتھ اشک نے منٹو کو زچ کرنے کے لئے ایک بار اس کی کہانیاں "دھواں" اور "روح کا ناٹک" کو انتہائی پست قرار دیا جواب میں ....

"اُسی شام وشو متر عادل اپنے دوست اور بمبئی مسٹر مدن موہن بھلہ کے ساتھ منٹو سے ملنے گیا۔ اُس نے آ کر بتایا کہ منٹو نے انہیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں دیں کہ اشک سالا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ اس کو افسانے کے فن کی ابجد کا بھی علم نہیں۔ ادبِ لطیف میں اس نے افسانے کے فن پر جو مضمون لکھا تھا وہ کیا بکواس ہے وغیرہ وغیرہ۔

تین دن تک منٹو مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا وہ سب سنتا رہا۔ کیوں کہ تماشائی بڑے خوش تھے۔ اور منٹو کیا کہتا ہے، وہ مجھے رائی رتی بتا نا نہ بھولتے تھے۔ لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا، اور افسوس کرتا رہا کہ بادلِ ناخواستہ مجھے وہ سب کرنا پڑ رہا ہے جس کی دوستوں کو توقع تھی۔"

(منٹو، میرا دشمن ——— اوپیندر ناتھ اشک)

صرف اتنا ہی نہیں۔ بعض اوقات عورتوں کو بھی گالی دینے کے لئے اس کی زبان بے طرح مچلنے لگتی تھی ———

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ دوستی ٹوٹتی معلوم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا جھگڑا کہ منٹو گھونسوں میں ترش اتر آیا دانت پیس کر بولا:

"آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹے ہو جاتے۔"
"دل کا ارمان نکال لیجئے مروت کی ضرورت نہیں۔" میں نے چڑایا۔
"اب جانے بھی دیجئے کوئی مرد ہوتا تو بتاتے۔"
"بتا بھی دیجئے۔ ایسے کون کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں نکال بھی دیجئے۔"
"آپ جھینپ جائیں گی۔"
"قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی۔"
"تو آپ عورت نہیں۔"
"کیوں گویا عورت کے لئے جھینپنا اشد ضروری ہے۔ چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے۔ بڑا افسوس ہے منٹو صاحب آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ اصول بناتے ہیں۔ میں سمجھی تھی آپ تمام لوگوں کی سطح سے بلند ہیں۔" میں نے مسکہ لگایا۔
"قطعی نہیں ...... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا۔"
"تو پھر کہئے نا وہ جھینپا دینے والی بات۔"
"نہیں اب غصہ اتر گیا۔" وہ ہنس کر بولا۔
"اچھا دوستی ہی میں سہی، بتائیے وہ کون سی خطرناک بات تھی۔"
"کچھ نہیں ...... اب کچھ یاد نہیں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید کوئی موٹی سی گالی دیتا۔"
"بس۔" میں نے نا امید ہو کر کہا۔
"یا شاید کس کر چھانپڑ مارتا۔" نادم ہو کر بولا۔
"مجھ پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا ایسی لحیم شحیم گالیاں سنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے تھپڑ بھی خاصے زور کے پڑ چکے ہیں مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت سمجھ کر رعایت کی۔ میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار۔" اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

(میرا دوست میرا دشمن ـــ عصمت چغتائی)

گالیوں کی یہ بھرمار، اور گالیوں کا یہ بے باکی کے ساتھ استعمال جب منٹو کی اپنی انفرادی زندگی میں تھا تو پھر اُس کے کرداروں میں کیوں نہ ہوتا؟ ہر فن کار کی شخصیت اُس کے فن پر اثر انداز ہوتی ہے اور اُس کی جھلک اُس کے فن میں غیر محسوس طور پر آیا کرتی ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک فن ہے اپنی تعمیر جس بنیاد پر کی ہے، اُس پر اُٹھنے والی دیواریں ایک بالکل ہی مختلف قصر کو وجود میں لائیں۔ غالب نے بھی جب اپنی زندگی میں شراب اور طوائف کو دخل اندازی کا موقع دیا تو اُس کے یہاں بھی باوجود کڑے انتخاب کے دیوان میں ایسے اشعار آہی گئے ؎

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

بالکل ایسی ہی "پیش دستی" منٹو کی طرف سے بھی ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

عورت کا بہترین کردار

از ڈاکٹر ایمیلی ہارٹ شورن مڈ
ترجمہ سید لطف اللہ - ایم - اے

موجودہ زمانے میں بھی بہت سی خواتین ایسی ہیں جو محسوس کرتی ہیں کہ وہ شادی، امومت اور مردوں کی تحقیقی مساعی سے مطابقت ہی کے ذریعہ بہترین خدمت انجام دے سکتی ہیں۔

اسی زمانے کی ایک نامور خاتون اسے یوں بیان کرتی ہیں: "ایک کامیاب بیوی بننا بذاتِ خود ایک طرفہ زندگی ہے جس میں دوسری خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک مدبرہ، ایک کاروباری، ایک عمدہ باورچن، ایک تربیت یافتہ نرس، ایک معلمہ، ایک سیاست دان اور ایک جاذبِ نظر دوشیزہ کی صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جن خواتین نے یہ خوبیاں پیدا کر لیں ان کی زندگیاں کامیاب ترین ہیں۔"

عظیم سائنس دان چارلس ڈارون (CHARLES DARWIN) کی بیوی ایما ویجوڈ ڈارون (EMMA WEDGWOOD DARWIN) سے زیادہ بہتر مثال اور کیا دی جا سکتی ہے۔ ڈارون جسمانی طور پر ہمیشہ کمزور رہا اور یہ ممکن نہ تھا کہ تخلیقی تحقیقات سے قطع نظر اپنی اور اپنے خاندان کی پیچیدہ ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہو سکتا۔ اگر اسے اس حیرت انگیز خاتون کی غیر متزلزل رفاقت حاصل نہ رہتی۔ تحقیقات ڈارون کی زندگی کے اجزاء لاینفک بن چکے تھے۔ لیڈی ڈارون کو اپنے خاوند کی تحقیقات پر مکمل اعتماد اور اعتقاد تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ڈارون کی بافت، گھر اور بچوں کا انتظام اپنے ذمہ رکھا۔ اس نے اس بڑے سائنس دان کو ان مزاحمتوں اور تفکرات سے بالکل محفوظ رکھا جو اس کے عزائم کی پرسکون تکمیل کی راہ میں مخل ہو سکتے تھے۔ ان مشاغل کے باوجود اس نے دس بچے بھی دیئے جن میں سے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ڈارون کے بعد بھی زندہ رہیں۔ یہ اسی رفاقت کا نتیجہ تھا کہ بیٹوں میں سے تین کو ممتاز کارناموں کے صلے میں اعلیٰ خطابات ملے۔

مادام پاسچر (MADAME PASTEUR) ہی کو دیکھئے۔ ایک قابل گمنام کیمیا داں کے ساتھ وفاداری اور [illegible] نے اسے تضحیک اور تعذیب کا نشانہ بنایا مگر اس کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ ہوئی۔ اس کی وفاداری کی مزید آزمائش اس کے دو بچوں کی علالت اور پھر میعادی بخار میں موت سے بھی ہوئی۔ مادام پاسچر نے ہر موقع پر اپنے خاندان کی پریشانیوں کو ہنس ہنس کے قبول کیا۔ اس کی ساری زندگی ایک دار التجربہ کے اجنبی ماحول اور غیر متوقع حادثات کے گرد گردش کرتی رہی تاہم وہ اپنے خاوند کے تخلیقی دماغ کے نتائج پر یقین رکھتی تھی۔ اس باہمت اور مستقل مزاج خاتون نے اپنی عزیز بیٹی کی نگہداشت اور اس کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جب کہ اس کی بیٹی ماں بننے والی تھی اور اس کا عزیز شوہر ایک عرصے سے اس سے علیحدہ تھا کیونکہ وہ پاسچر کے دار التجربہ کے مقفل دروازوں کے اندر منہمک تھا۔ مادام پاسچر اپنی بیٹی کو سمجھاتی کہ ایک بڑے آدمی کی بیوی اور بیٹی کی زندگی کا یہ بھی ایک رخ ہے۔

کاسیما لزٹ واگنر (COSIMA LISXT WAGNER) نے اس فلسفے کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے: "خواتین کو اس دنیا میں بڑے آدمیوں کی امداد کے لئے بھیجا گیا ہے۔" خواتین کی کثرت نے بالکل دانستہ طور پر اپنی اس حیثیت کو قبول کر لیا ہے اور ان کی بہت بڑی تعداد نہایت کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔ یعنی متوقع اور فطری نتیجہ ہے کہ ان خواتین کے نام شاذ و نادر ہی اپنے خاندان یا دوستوں کے حلقے سے باہر سنے جاتے ہیں جب تک کہ ان کے خاوند مشہور نہ ہو جائیں تاہم ایسی خواتین ہماری تہذیب کی ریڑھ کی ہڈی ہی تسلیم کی جاتی ہیں۔

(ریڈرز ڈائجسٹ بابت ستمبر [illegible] سے ماخوذ)

موج و حباب

◆ —— بیتاب زبیری

کچھ اہلِ جبہ و دستار ہم سے اُلجھے ہیں
غضب ہے بر سرِ بازار ہم سے اُلجھے ہیں

یہ کس خطا کی سزا ہے نہیں کبھی ہو معلوم
حضور! آپ تو بیکار ہم سے اُلجھے ہیں

یہ بات اب بھی ہمارے لئے معمہ ہے
وہ کس بنا پہ کئی بار ہم سے اُلجھے ہیں

زمانہ راہِ ترقی پہ گامزن ہے، مگر
ہمارے قافلہ سالار ہم سے اُلجھے ہیں

خدایا ہم تو تری راہ میں بڑھے جائیں
مگر یہ تیرے پرستار ہم سے اُلجھے ہیں

یہ چھیڑ چھاڑ یونہی تو نہیں ہے اے بیتاب
بلا سبب کبھی سرکارِ ہسلم سے اُلجھے ہیں

◆ —— محبوب خاں نصرت

لہو کا قطرہ قطرہ اک بہارِ جلوہ ساماں ہے
کہ صد رشکِ چمن ہوتا ہے جب گرتا ہے داماں پہ

حوادث سے گزر کر منزلِ مقصود ملتی ہے
وہی ساحل کو پا لیتے ہیں جو ہنستے ہیں طوفاں پہ

گلستاں میں نہیں معلوم! کس کی آمد آمد ہے!!
کہ ہے اک کیف سا چھایا ہوا سارے گلستاں پہ

ہر اک نغمہ میں غم تھا، درد تھا، فریاد کی لے تھی
کئی نغمے چھیڑے نصرت! مرے سازِ رگِ جاں پہ

◆ —— ابنِ محمود

جانے کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے
برق سے بڑھ کے کہیں تیز اثر ہوتی ہے

چاہیئے کس کو بتانے غمِ ہستی کا علاج
اس زمانہ میں کہاں قدرِ ہنر ہوتی ہے

مژۂ غم پہ مچل جاتے ہیں لاکھوں تارے
دل میں کچھ ایسی خلش وقتِ سحر ہوتی ہے

چھائے چھائے ہیں قدم پھر بھی ترے عاشق کو
جاں سے محبوب تری راہگزر ہوتی ہے

◆ —— ظفر ہاشمی

کیا دور ہے جس میں ہر ساعت انسان بدلتے رہتے ہیں
سلطان بدلتے رہتے ہیں، فرمان بدلتے رہتے ہیں

رندوں سے بھلا کیا ممکن ہو، پابندیٔ عہدِ مے خانہ؟
جب خود ساقی کی جانب سے پیمان بدلتے رہتے ہیں

اے ذوقِ یقیں! فیضان ترا! — ماحول سے کچھ ٹکرا یا
اس کفر کی نگری میں ورنہ ایمان بدلتے رہتے ہیں

ہر لحظہ کسی کی چشمِ کرم اسلوب بدلتی رہتی ہے!
ہر لحظہ ظفر کی ہستی کے عنوان بدلتے رہتے ہیں

آپ کیا پڑھیں!

علمی و تحقیقی کتابیں

اسلامی نظریۂ زندگی اس دور میں تیزی سے تحریکی صورت اختیار کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لٹریچر کے دائرے میں اس موضوع پر ذہنی پیاس بہت بڑھ گئی ہے اور اچھی چیزوں کی مانگ ہے۔ درجۂ اول کی ایک کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" کے نام سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے نکلی ہے اور بلاشبہ ۱۹۵۵ء کی چند قیمتی ترین مطبوعات میں سے ایک ہے۔ ایسی کتاب کا تعارف چند سطروں میں کرانا کسی کے بس میں نہیں، یوں سمجھئے کہ محض تبرکاً ہم اس کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

فاضل مولف کا مرکزی مدعا یہ دکھانا ہے کہ نظریۂ اسلامی کی دعوت کوئی ایسی وقتی دعوت نہ تھی کہ جو ایک بار اپنے برگ و بار لانے کے بعد خزاں کا شکار ہو گئی ہو، بلکہ کلمۂ حق کا یہ سدابہار پودا لووں کے جھکڑوں میں بھی نت نئی کونپلیں نکالتا رہا ہے۔ دعوتِ حق کا تسلسل کبھی نہیں منقطع ہوا: بگاڑ آئے، فساد رونما ہوئے، فتنوں نے یورشیں کیں، حوادث نے حالات کو تہ و بالا دیا، لیکن تاریخ کا ورق ورق گواہ ہے کہ ہر فتنہ و حادثہ جو اسلام اور مسلم سوسائٹی پر آیا اس کے ردِ عمل نے کسی نہ کسی صاحبِ عزم و ہمت ہستی کو تعمیر و اصلاح اور تجدید و احیاء کے محاذ پر اٹھا کھڑا کیا۔ جیسی جیسی خرابی آئی اس کے توڑ کے لئے ویسے ویسے چارہ گر پیدا ہوتے رہے۔ یعنی اسلام کے اندر ہر قسم کے حالات میں رہنمائی دینے اور ہر قسم کے حملوں کی روک تھام کرنے کی صلاحیت موجود رہی ہے اور وہ رواں دواں زندگی کے بدلتے ہوئے احوال اور تقاضوں کے درمیان کبھی عاجز نہیں ہوا یہی شانِ اکملیت ہے۔ اس لحاظ سے یہ علمی و تحقیقی کتاب بڑی عزم پرور اور حوصلہ افزا ہے۔

یہ کتاب کی جلد اول ہے جس میں چھ صدیوں کی داستانِ تجدید و اصلاح کے بعض نمایاں کردار پیش کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت حسن بصری، گروہ محدثین، معتزلہ، ائمہ اربعہ (خصوصاً امام احمد بن حنبل)، امام ابوالحسن اشعری، جماعت اخوان الصفاء، باطنیہ، امام غزالی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، علامہ ابن جوزی، نورالدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی، شیخ عزالدین عبدالسلام اور مولانا جلال الدین نے ہماری تاریخ کے ابتدائی نصف حصے میں جو جو پارٹ ادا کیا ہے اسے فاضل مولف نے مورخانہ تحقیق اور ضروری حوالوں کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ داعیانِ تجدید و اصلاح کی سیرت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فکر کے تمام اہم پہلو خود ان کی اپنی تحریروں سے اخذ کر کے زیبِ اوراق کر دیئے ہیں۔ ہر دور کے تمام بیرونی اور تخریبی اور منفی فتنے اور تمدن و سیاست کے بگاڑ کے مختلف پہلو نگاہوں میں پھر جاتے ہیں۔ یہ گویا ہمارے ملی عالمِ افکار کی تاریخ ہے اور اس میدان میں اب تک اس درجے کا ٹھوس کام نہیں ہوا۔

مولف نے شخصیتوں کا جو معیارِ انتخاب ذہن میں رکھا ہے وہ بڑی وسعت رکھتا ہے یعنی کسی بھی علمی، روحانی، اخلاقی یا سیاسی پہلو میں اسلام کے حق میں کچھ کر دکھانے والوں کے لئے اس کتاب کی محفل میں جگہ ہے۔ اس وسیع معیار کو لے کر چلیں تو چھ صدیوں میں بے شمار قابلِ ذکر نمایاں ہستیاں مل سکتی ہیں حالانکہ مولف ان سب کا تذکرہ نہیں کر سکے۔ دوسری طرف نادانستہ نقطۂ نظر غائب ہے، یعنی جن شخصیتوں کو لیا گیا ہے نہیں

بتایا گیا کہ ان کے کام میں کیا ضروری چیزیں شامل نہیں رہیں یا کیا پہلو نظر انداز ہو گئے یا کن تدبیروں سے زیادہ بہتر نتائج پیدا کئے جا سکتے تھے۔ بدقسمتی سے تنقیدی زاویۂ نگاہ ہمارے ہاں سوئے ادب اور گستاخی اور عیب چینی بلکہ توہین کو مستلزم قرار دیا گیا ہے۔ اب یہ لازم ہو گیا ہے کہ زمانی ترتیب کے لحاظ سے جو لوگ پہلے گزرے ہیں ان کو بے خطا اور معصوم اور ان کے کام کو کوتاہیوں سے بالاتر ثابت کیا جائے۔ حالانکہ تنقید کا مدعا اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ ہم اپنی تاریخ کے سابق تجربات سے فائدہ اٹھا کر دعوت میں زیادہ بہتر راستہ اختیار کر سکیں۔ مولانا ابوالحسن علی کے بارے میں بھی یہ سوئے ظن نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تنقید کے بارے میں دور زوال و فساد کا یہ غلط تصور رکھتے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی صفحہ ۴۰۵ پر جو نقطۂ نظر ذیل کے الفاظ میں انہوں نے پیش فرمایا ہے وہ صحت مندانہ نہیں ہے:

"کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر، اپنے ماحول میں لا کر، اپنے زمانے کے پیمانوں اور تقاضوں اور اپنے ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے جس سے کتاب سطحی النظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیع بن جاتی ہے۔ لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی ناانصافی اور کوتاہ نظری ہے۔ ...." "ورنہ ہر عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جا سکتی ہے، اور نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ انسانی تاریخ کی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جا سکتی۔"

ان سطور کے کمزور پہلو یہ ہیں کہ ایک تو یہ دکھایا گیا ہے کہ تنقید کرنے کا لازمی اسلوب یہی ہے کہ کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر کسی دوسرے ماحول میں جانچا جائے اور پھر پیمانہ بھی ذاتی رجحانات اور خواہشات کا استعمال کیا جائے۔ حالانکہ اسے اس کے اپنے ماحول میں کتاب و سنت اور مسلمہ اصولوں کے پیمانے سے بھی جانچا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تنقید کا مقصود بس یہی ہو سکتا ہے کہ "بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہو" اور "کتاب سطحی النظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیع" بن جائے۔ حالانکہ مخلص ناقد خود سبق حاصل کرنے اور دوسروں کو صحیح رہنمائی دینے کے لئے تنقید کرے گا۔ تیسرے غلط فہمی ہوتی ہے کہ گویا ہر تنقید کے بارے میں "اہل نظر" "بے انصافی اور کوتاہ نظری" کا فتویٰ صادر کریں گے۔ چوتھے یہ کہ تنقید (کم سے کم اس نوع کی تنقید) کے بارے میں اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ "کوئی شخصیت کامل اور معیاری" نہ قرار دی جا سکے گی۔ سوال یہ ہے کہ مورخ اور تاریخ کا ناقد یہ فرض اپنے ذمے لے ہی کیوں کہ وہ شخصیتوں کو "کامل اور معیاری" ثابت کرے گا۔ کمال اور معیار تو ہمارے لئے محمد صلعم کی ہستی میں رکھا گیا ہے۔ باقی بزرگوں اور اکابر کو ہم اپنا بزرگ، اپنا امام اور اپنا محبوب تو قرار دے سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان کو ہر ہر پہلو سے کامل اور معیاری بھی مانا جائے، کیونکہ کسی انسانی ہستی کے وسیع کارناموں میں کسی ایک آدھ کمزور پہلو یا کسی اکا دکا کوتاہی کے سامنے آنے سے اس کی عزت و عظمت میں فرق نہیں آسکتا۔ اس طرح کے رجحانات سے فکری توازن برقرار نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ یہ درجۂ اول کی افادی و مقصدی کتاب قاری کو معلومات اور جذبات دیتی ہے، لیکن فکر و نظر کی تربیت نہیں کرتی۔

فاضل مؤلف کے علم و تقویٰ کے پیش نظر یہ سطور لکھنے کی جرأت ہم نہ کرتے، لیکن "ناقد" اپنے فرض سے مجبور رہے۔

کتاب مطبع معارف اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے آخر میں اسماء و کتب کا انڈکس شامل ہے۔ بڑے سائز کے ۴۰۰ سے زائد صفحات کی قیمت بلا جلد چھ روپے ہے۔

نہ علامہ محمد اسد کی ذات ہمارے قارئین کے لئے اجنبی ہے اور نہ موصوف کی تاریخی کتاب "اسلام ایٹ دی کراس روڈز" (یا "اسلام دو راہے پر") محتاجِ تعارف ہے ۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں نمودار ہوا اور آج اس کا ساتواں ایڈیشن ہمارے سامنے ہے ۔ اس کتاب نے عالم اسلام کو فکری اور جذباتی طور پر بروقت جھنجھوڑا اور احیائے اسلام کی رَو کو ابھارنے میں خاصی مدد دی ہے ۔ ہم مسلمان بحیثیت ایک ملت کے ساری دنیا کے لئے ایک نمونۂ عبرت ہیں ۔ ساڑھے ستر کروڑ افراد کے اس انبوہِ عظیم کا متعدد حکومتوں اور سلطنتوں کے ساتھ کرۂ ارضی پر بلحاظ قوت محض کا ایک ڈھیر بن کے رہ جانا اور زندگی کا بہترین فلسفہ و ضابطہ بغل میں رکھتے ہوئے زندگی سے محروم ہو جانا ایک ایسا تاریخی مسئلہ ہے جس پر اپنے ہی نہیں پرائے بھی حیران ہو ہو کر کاوش کرتے ہیں ۔ علامہ اسد نے ایک اخباری نمائندے کی حیثیت سے اول اول بکائی کے مقام سے ہمارا جائزہ لیا اور پھر جب دلچسپی بڑھتی گئی تو موصوف کے اندر رحم اور ہمدردی کے جذبات ابھرے اور ان جذبات نے آہستہ آہستہ اس ذہین شخصیت کو "ہمارا" اپنا بنا دیا ۔

حیرت ہوتی ہے کہ وہ سرچشمۂ قوت و حیات جس کے ہم وارث بنائے گئے ہیں ، اس کے عین کنارے پڑے ہم مارے پیاس کے بے حال ہو رہے ہیں اور باہر سے ایک تماشائی آتا ہے اور وہ ہمارے سرچشمۂ قوت و حیات کا راز پا لیتا ہے ۔ اور اس سے جام بھر بھر کر ہمارے ہونٹوں سے لگاتا ہے ۔ مصنف عالم اسلام کے موجودہ تمدنی ماحول سے مغربی تمدن کو ٹکراتے دیکھتا ہے ۔ اور اس تصادم کی وجہ سے مسلمانوں میں جو سراسیمگی اور شکست خوردگی کی کیفیت پائی جاتی ہے اس کا عمیق نفسیاتی تجزیہ کرتا ہے ۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ ہم مسلمان ——— ہمارے اندر کا کارفرما ذہین طبقہ ——— کس ذہنی کیفیت سے دوچار ہے ۔ یہ طبقہ اپنی موجودہ حالتِ زوال اور مغربی تمدن میں سے ایک کے انتخاب کا سوال سامنے رکھ کر اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ اسے اپنی زندگی کے قلعوں کی کنجیاں مغربی فکر و تمدن کے فاتح لشکر کے حوالے کر دینی چاہئیں ۔ وہ زندگی کے چوک سے ایک غلط موڑ مڑنے کے لئے متحرک ہو چکا ہے ۔ اس عالم میں "اسلام ایٹ دی کراس روڈز" کا مصنف اس کا بازو تھام کر اسے بتاتا ہے کہ زندگی اور ترقی کی راہ یہ نہیں ، دوسری ہے ۔ وہ اس کے سامنے کتاب و سنت کے اصل اسلام کو نمایاں کرتا ہے ——— وہ اسلام جو ایک مذہب نہیں ، تحریک ہے ، ایک نظامِ حیات ہے ، ایک تہذیب اور ایک تمدن ہے !

مصنف کے پاس شعور کی روشنی بھی ہے اور جذبہ کی گرمی بھی ، اور یہ روشنی و گرمی اس کتاب کا ہر پڑھنے والا حاصل کر سکتا ہے ۔ افکار اور تمدنوں کے ٹکراؤ کے اس دور میں یہ کتاب ایک مسلمان کو بہت مفید رہنمائی بہم پہنچاتی ہے اور اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کر کے اسے تجدید و احیائے اسلام کے لئے متحرک کرنے والی ہے ۔ ضمناً اسلامی نظام میں حدیث و سنت کی اہمیت کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے

کتاب کا معیارِ طباعت اچھا ہے ، مگر اس درجہ شاندار نہیں جس کا تقاضا کتاب کا مرتبہ کرتا ہے ۔ اسے عرفات پبلیکیشنز ، ۱۵ عمر دین روڈ ، وسن پورہ ، لاہور نے شائع کیا ہے ۔ قیمت مجلد تین روپے بارہ آنے

فیروز سنز ——— لاہور ، کراچی ، پشاور ——— کا وسیع اشاعتی ادارہ مختلف میدانوں میں جو علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے ، ان میں سے ایک کڑی "جدید شعرائے اردو" کے نام سے ہمارے سامنے ہے ۔ مجموعی طور پر ساڑھے گیارہ سو صفحے کی اس بھاری بھرکم کتاب سے آدمی مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے ۔ پھر یہ کہ اسے بہت ہی خوبصورت اردو ٹائپ میں اچھے کاغذ پر شائع کیا گیا ہے ۔ جلد اور گرد پوش بھی پسندیدہ ہے ۔ یہ تذکرہ و تعارف ہے حالی اور آزاد سے لے کر اب تک کے مستند اور صاحبِ طرز شعرائے اردو کا تعارفی سطور میں ڈاکٹر عبدالوحید صاحب نے فرمایا ہے

کہ اس کتاب میں صرف ان شعراء کو لیا گیا ہے جو "سنگِ میل" کی حیثیت رکھتے ہوں۔ ہماری رائے میں کتاب اس معیار کو نہیں مانتی۔ اس میں تو ہر اچھے اور شہرت یافتہ شاعر کو جگہ مل ہے۔ اور دوسری طرف ایسے شعراء چھوٹ بھی گئے ہیں کہ جن کے ہم پلہ حضرات کو لیا گیا ہے۔ سنگِ میل تو پوری تاریخِ شاعری میں انگلیوں پر گنی جانے والی ہستیاں ہو سکتی ہیں۔ بہرحال ہر شاعر کی مختصر سوانح کے ساتھ اس کے فنی مقام اور فکری فیضج کا مجمل تعارف اور کلام کا تھوڑا سا انتخاب دیا گیا ہے۔ بالعموم تعارف میں رنگِ ستائش ہے، اصولی و مقصدی تنقید کہیں نمایاں نہیں۔ شعراء کا انتخاب کلام جو دیا گیا اس کے بارے میں اگرچہ یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ معیار یہ ہے کہ اس سے شاعر کے مخصوص رجحانات اور اس کے ذاتی اسلوب کا اندازہ ہو سکے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ اسے طے کرنے والی اتھارٹی کون سی ہے۔ آیا کوئی وسیع بورڈ اہلِ نظر کا تھا، یا کسی ایک شخص (غالباً ڈاکٹر وحید صاحب) نے معیار مقرر بھی کیا اور اس پر اپنی پسند کے مطابق انتخاب کی خدمت بھی سرانجام دی۔ بظاہر یہی دوسری صورت سمجھ میں آتی ہے۔ اس صورت میں ایک سو بارہ شعراء کو ایک فرد کا اپنے نقطۂ نظر سے پیش کر دینا کچھ عجیب ہے۔ مگر عجیب ہونے کے ساتھ یہ اتنا بڑا کام بھی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

اس کتاب کی ایک کوتاہی یہ ہے کہ اس میں ایک مستقل مکتبِ فکر کو — عین ممکن ہے کہ نادانستہ — نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہمارا اشارہ شعر و ادب کے تعمیر پسند اور اسلام پسند حلقہ کی طرف ہے۔ اس مکتبِ فکر کی ترجمانی متعدد جرائد چند سال سے کر رہے ہیں اور اس میں ملک نصر اللہ خاں عزیز، عاصی کرنالی، اسد ملتانی، کوثر نیازی، انور صدیقی، حفیظ میرٹھی اور بعض دوسرے نمایاں افراد شریک ہیں جن کی نگارشات برابر شائع ہوتی ہیں۔ لیکن بجز ایک ماہر القادری کے باقی سب کا بلیک آؤٹ ہو گیا ہے۔ یہ کوتاہی بجا طور پر بہت سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرے گی کہ شاید کسی طرح کا تعصب کارفرما ہے۔ بہتر ہوتا کہ مرتب مختلف حلقوں سے مشورے لے لیتے۔

ان کوتاہیوں سے قطع نظر، یہ کتاب اپنے موضوع اور مقصد کے لحاظ سے بہت مفید ہے۔ نہ صرف اردو ادب کے اونچے درجوں کے طلبہ بلکہ ادیب، شعراء اور تنقید نگار اصحاب اور عام اہلِ ذوق ایک کتاب پڑھ کر شعری ارتقاء کی تاریخ کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی قابلِ قدر خدمت ہے۔
قیمت اٹھارہ روپے۔

ایک مسلمان قوم کے فکر و عمل کا اصل اور برتر سرچشمہ قرآن مجید ہے اور اسی سرچشمے سے نئی زندگی مل سکتی ہے۔ لیکن زوال آیا تو قرآن کو سمجھ کر پڑھنا گیا۔ اب نوجوان نسل میں پھر قرآن کی طرف رجوع پیدا ہوا ہے۔ فہمِ قرآن کی یہ پیاس جدید انداز کا تفسیری لٹریچر مانگتی ہے۔ ہمارے سامنے اس ضرورت کو پورا کرنے والی ایک چیز "مجموعۂ تفسیرِ فراہی" حال ہی میں آئی جس کے اصل مؤلف تو مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور مرتب مولانا امین احسن اصلاحی جیسا عالم ہے کہ جو مولانا فراہی کے قرآنی ذوق اور اسلوبِ فہم کا وارث ہے۔ فراہی مکتبِ تفسیر دو مرکزی اصولوں پر مبنی ہے، ایک یہ کہ قرآن میں نظمِ کلام اور ترتیبِ گفتگو فصاحت و بلاغت کے بلند ترین معیار پر ہے اور اس نظم و ترتیب کا شعور فہمِ قرآن کی شاہ کلید ہے، دوسرے یہ کہ قرآن کو سمجھنے کے ذرائع کی صف میں خود قرآن کا مقام اولیں ہے، یعنی ایک مقام کی توضیح قرآن کے دوسرے مقامات سے ہوتی ہے۔ اس مجموعہ میں "مقدمہ نظام القرآن" (جو فراہی مکتبِ تفسیر کے مرتب کردہ اصولِ تفسیر پر مشتمل ہے) آیت بسم اللہ، سورۂ فاتحہ، سورۂ ذاریات، سورۂ تحریم، سورۂ قیامہ، سورۂ مرسلات، سورۂ عبس، سورۂ شمس، سورۂ تین، سورۂ عصر، سورۂ فیل، سورۂ کوثر، سورۂ کافرون، سورۂ لہب، سورۂ اخلاص، کے تفسیری مباحث شامل ہیں۔ فاضل مرتب نے مختصر دیباچہ کے علاوہ مصنف کے حالاتِ زندگی کو شاملِ مجموعہ کر کے ایک بڑی ضرورت پوری کر دی ہے۔ بعثت، ادب، فصاحت و بلاغت، صرف و نحو، تاریخ، حدیث، سیرت اور بائبل سے متعلق بہت سی کارآمد بحثیں کتاب میں شامل ہیں۔ مجموعہ کے بیشتر اجزاء پہلے علیحدہ پمفلٹوں کی صورت میں شائع

ہوئے تھے۔ اب اضافوں کے ساتھ ساری چیزیں جمع ہوکر ایک قابلِ قدر کتاب مرتب ہوگئی ہے۔ اصلاحی صاحب نے مؤلف کے اس سارے کام کو عربی سے اردو میں منتقل کرتے ہوئے بہت اچھی جاندار ادبی زبان استعمال کی ہے۔ مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی (اچھرہ لاہور) نے اسے شائع کیا ہے۔ قیمت مجلد چودہ روپے رکھی ہے، مگر اتنی اہم اور قیمتی کتاب کو جس "عمومی جلد" سے نوازا گیا ہے وہ مرکزی مکتبہ کے شایانِ شان نہیں۔

قرآن کا مطالعہ کرنے والے اردو داں حضرات عام استعمال کے لغت کے ضرورت مند ہیں۔ اس ضرورت کو نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب (مقابل آرام باغ۔ فریئر روڈ۔ کراچی) نے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولوی شہید الدین صاحب کی مرتبہ لغات القرآن ہمارے سامنے ہے۔ حروفِ تہجی کے لحاظ سے قرآن کے تمام مستعمل الفاظ (مع مشتقات) اس لغت میں لئے گئے ہیں۔ اس میں نہ تو مطالعہ کنندہ کو "مادہ" کے چکر میں ڈالا گیا ہے، نہ لغت کی پیچیدہ بحثوں میں گھمایا گیا ہے بلکہ الفاظ کے دو ایک سیدھے سادے عام مفہوم درج کر دیئے گئے ہیں۔ گویا یہ اہلِ علم کے لئے نہیں، عام لوگوں کے لئے ہے اور اس ضرورت کے لحاظ سے مفید! قیمت مجلد مع گرد پوش چار روپے۔

جرائد

ماہنامہ "نئی نسلیں" (نظیر آباد۔ لکھنو) سے آپ متعارف ہوں گے۔ اس مرتبہ خاص نمبر (جنوری فروری ۵۶ء) شائع ہوا ہے۔ سرورق اور عام طباعتی معیار دلکش ہے۔ اداریہ کی "پہلی بات" میں طیب عثمانی کے قلم سے تعمیری ادب کی مرکزی روح کے طور پر خدا کے تصور کو پیش کیا گیا ہے، مگر خدا کے تصور کو لایا گیا ہے صرف کائناتی اور کسی قدر اخلاقی پہلو سے، حالانکہ ادب کے ساتھ خدا کے تصور کا ربط واضح کرنے میں یہ پہلو کافی نہیں۔ خدا کے تصور کا سیاسی و تمدنی پہلو، اور اس انقلابی و تحریکی پہلو سامنے لایا جانا چاہئے تھا۔ بحث میں کوتاہی اور ابہام ہے۔ "دوسری بات" خاصی وقیع ہے یعنی اربابِ فن "فن ہی کو نہ دیکھو، بلکہ مقصدیت و افادیت کا جائزہ لو"۔ ذوق کا مسئلہ — ادب میں "شمسی فاروقی ایم اے کا مضمون ہے اور بہت مفید اور خیال انگیز۔ گویا یہ ٹیکنیک اپنے وقت ضرورت پر نمودار ہوا ہے۔ "ماہر اپنی نظر میں" بہت دلچسپ نگارش ہے جس کے ذریعے ماہر کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے نئی شعری و ادبی قدروں کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ تین افسانے "پھوڑنگی، ہزہینڈ" (قیصر قیصری) "مساوات" (اسعد گیلانی) "چھاتا کلاز" (ابن فرید بی اے) شاملِ اشاعت ہیں۔ ان میں تخلیق، مطالعہ اور فن ہے، لیکن بہ حیثیتِ مجموعی جب ہم ادب اور مقصد دونوں کے تقاضوں کو دیکھتے ہیں تو اس میدان میں کام ترقی طلب نظر آتا ہے۔ نظموں اور غزلوں کی تعداد خاصی ہے جن میں چند چیزیں بہت اچھی اور بیشتر متوسط ہیں، گر کٹ بہر حال نہیں ہے۔ اس دوماہی شمارے کی قیمت آٹھ آنے ہے۔

درسیات

مدرسہ تفہیم القرآن گھیانہ نے جس کا سلوگن ہے "قرآن کو پڑھو، قرآن کو سمجھو، قرآن پر عمل کرو" — عربی زبان کی تعلیم کے لئے کچھ نصابی مواد شائع کیا ہے۔ اس میں مبادی "شرف اللسان" (حصہ اول) "الاصطلاحات" اور چار مصور چارٹ شامل ہیں۔ اس خدمت کا سہرا حافظ محمد عظمت اللہ صاحب تفہیمی کے سر ہے۔ محنت و کاوش اور جذبہ و عزم بہت قابلِ قدر ہے اور غالباً ان چیزوں کے طبع کرانے میں مالی بار بھی خاصا اٹھایا گیا ہے۔ ہم ایسی کوشش کا خیر مقدم کرتے ہوئے تعلیمی نقطۂ نظر سے چند تنقیدی اشارات بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ہمارے ہاں جہاں اصل مادری زبان تعلیمی زبان نہیں ہے بلکہ تعلیمی زبان بچے کو الگ سے سیکھنی پڑتی ہے، عربی کی تعلیم کا درجۂ اول سے شروع کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے جو ذخیرۂ الفاظ تجویز کیا گیا ہے۔ وہ بلحاظ ہجا اور بلحاظ مقدار اس ذہنی عمر پر بوجھ ہے جس کے لئے "اللسان" کو مرتب کیا گیا ہے۔ علی الخصوص اس درجے کے بچوں کے سامنے گرامر کے مباحث کا دیباچہ بالکل و نیا فنی لحاظ سے صحیح نہیں۔ پھر "الاصطلاحات" کا پڑھانا تو گویا پھول کی پتیوں پر چٹانیں لادنا ہے۔ چارٹ بہت خوبصورت و رنگین ہیں۔ کافی ذخیرۂ الفاظ پر مشتمل ہیں لیکن ہجا میں بھی ہجا اور مفہوم کے لحاظ سے بھاری بھر کم لغت موجود ہے — مثلاً ضویعٌ، طلحٌ، دہاظٌ، عضدہٌ، ذمبلہٌ

(باقی برصفحہ: ۲۴)

● مشرق میں نئی ابھرتی ہوئی طاقت
● جسے مغربی طاقتیں نظرانداز نہیں کرسکتیں

چین!

○ اس کے انقلاب کی کہانی!!
● ایک پادری کی زبانی!!
○ ایک سچی آپ بیتی

معلومات افروز　　　　عبرت آموز

ماؤزے تنگ کے دیس میں!

مصنف: کارلوسیگو

ترجمہ: جیلانی بی اے

قیمت: دو روپے آٹھ آنے

مکتبہ چراغ راہ

آرام باغ روڈ۔ کراچی　　　　بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

○ ایک بامقصد ادیب

● ایک شعلہ بیاں شاعر

○ ایک دردمند مسلمان

● ایک حساس انسان

ماہرالقادری

کے آٹھ سالہ کلام

کا

مجموعہ

فردوس

اعلیٰ کتابت
معیاری طباعت

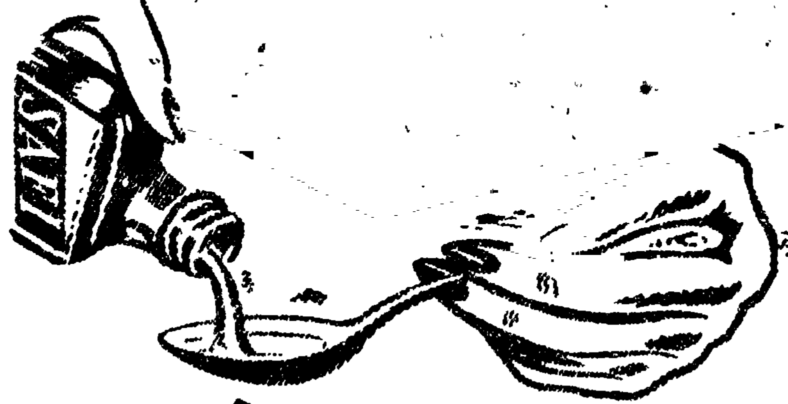
دیدہ زیب سرورق
حسین وجمیل جلد

قیمت تین روپے آٹھ آنے

مکتبہ "چراغ راہ"

○ آرام باغ روڈ ـــ کراچی نمبر ۱

○ بیرون لوہاری دروازہ ـ لاہور



چمچہ بھر صافی

● صافی کا صرف ایک چمچہ موسم کی تبدیلی کے دنوں میں استعمال کرنے سے آپ نہ صرف خرابیٔ خون سے پیدا ہونے والے امراض سے محفوظ رہینگے بلکہ صافی آپکے دورانِ خون میں توازن پیدا کر کے آپ کے جسم میں تازہ خون کی لہر دوڑا دے گی۔ صافی آپکے معدہ کے فعل کو درست بنائے گی۔ قبض سے محفوظ رکھے گی، اور بھوک بڑھائے گی۔

موسم کی تبدیلی کے دنوں میں اپنے ساتھ بچوں کو بھی صافی پینے کی عادت ڈالئے۔ اس سے وہ پھوڑے پھنسیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔

نوٹ:۔ بیرونی استعمال کے لئے ہمدرد مرہم بے حد مفید ہے



ہمدرد دواخانہ، کراچی

Hamdard

Printed at Nazir Printing Press, McLeod Road, Karachi
Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS, Arambagh Road, Karachi.
Printer & Publisher Ghulam Mohammed M. Chaudhri

چراغ راہ



مرتبہ

نعیم صدیقی

-/8/-

نئی ـــ گروہی ـــ حرکت

ماہنامہ

چراغ راہ کراچی

اپریل سنہ ۱۹۵۶ء

شمارہ ۳ ـــ جلد ۱۰

فہرست

چندہ سالانہ ۵/- روپے ـ فی پرچہ ۸ آنے

دفتر اشاعت و انتظام ـــ ۹ ثریا بلڈنگ رام باغ روڈ ـ کراچی نمبر ۱

دفتر ادارہ تحریر ـــ ۱۲ شاہ جمال ـ اچھرہ ـ لاہور

چوہدری غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر چراغ راہ رام باغ روڈ کراچی سے شائع کیا۔

ادارہ

سوچ بچار

اسلامی رجحان کی فتح!

آخر دستور بن گیا ہے اور قبل اس کے کہ یہ سطور چھپ کر قارئین تک پہنچیں "یوم جمہوریہ اسلامیہ" کی تقریب گزر چکے گی اور نیا دستور نافذ ہو چکے گا! نصب العین کو دیکھیے تو وہ بڑا بلند ہے، آخری معیار کا خیال کیجئے تو ابھی اس تک رسائی نہیں۔ لیکن آج جس درجے کا عالمگیر تسلط الحاد اور مادہ پرستی کو فکر اور تہذیب اور سیاست کے میدانوں میں حاصل ہے اور اسلامی رجحانات کے خلاف جس درجے کے تنفر و تعصب کے ساتھ بڑی بڑی طاقتیں زور صرف کر رہی ہیں، اور پھر جو شدید مزاحمت مغربی فرنگیت مآب طبقہ خود اندرون پاکستان دکھا رہا ہے۔ اس کا لحاظ رکھ کر جائزہ لیں تو نئے دستور میں اسلامی جمہوریت کے علمبرداروں کو بہت بڑی فتح حاصل ہوئی ہے۔

ہمارے عوام نے تعلیم کی کمی کے باوجود دستور جیسے خشک مسئلے میں جتنی گہری دلچسپی گرم جوشی کے یکساں تسلسل کے ساتھ آٹھ برس تک دکھائی ہے اس کی مثال شاید دنیا بھر کی تاریخ میں نہ ملے گی۔ اور پھر جمہوری لحاظ سے حالات کے سخت ناقص اور ناسازگار رہنے کے باوجود رائے عام کو پے در پے جو فتوحات اس مسئلے میں حاصل ہوئی ہیں وہ بڑی حوصلہ افزا ہیں۔ سخت مزاحمتوں کے باوجود قرار داد مقاصد ملت کے مطالبے کے مطابق پاس ہوئی، پہلی دستوری رپورٹ جو خان لیاقت مرحوم کی زیر دست قیادت میں لائی گئی تھی وہ عوام کے فیصلۂ استرداد کے تحت ردی کی ٹوکری میں ڈالی گئی، دوسری رپورٹ ٹھیک ان نکات کے مطابق مرتب ہو کر آئی جن کا مطالبہ علمائے پاکستان نے کیا، پھر "عارضی سیکولر دستور" کا فتنہ ابھرا اور اسے رائے عام نے شکست دے دی۔ پھر دستوریہ ٹوٹی اور ایک غیر منتخب دستوری کنونشن بلا کر اس کے ذریعے ایک خفیہ مسودۂ دستور کو نافذ کر دینے کا منصوبہ بنا، لیکن یہ ناکام ہوا اور منتخب دستوریہ کی تشکیل ہوئی، اس منتخب دستوریہ میں جناح عوامی لیگ اور ہندوؤں نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا کہ دستور میں اسلامی رنگ نہ آنے پائے لیکن عوامی دباؤ نے ان تخریبی طاقتوں کو ناکام کر دیا۔

آج جو دستور مرتب ہو کر ہمارے سامنے ہے وہ بعض خامیوں کے باوجود بیشتر ان اسلامی ضروریات اور تقاضوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے جن کو منوانے کے لئے ملک گیر مطالبے کئے جاتے رہے ہیں۔ دینی جماعتوں کے مطالبوں میں دس بارہ کے قریب وہ ہیں کہ جو لفظ بہ لفظ اسی شکل میں تسلیم کئے گئے ہیں اور کچھ چیزیں ذرا مختلف صورت میں لی گئی ہیں۔ کچھ چیزیں ساقط بھی ہوئی ہیں، لیکن فی الجملہ اس دستور کے بننے میں سیکولرازم پر اسلامی رجحان کو فتح حاصل ہوئی ہے۔ جمہوری پہلو سے یہ دستور کم سے کم اندیا سے بعض پہلوؤں میں بہتر اور بعض میں مساوی ہے۔ موجودہ حالات میں یہ ایک اچھی قابل عمل شکل اختیار کر گیا ہے آئندہ اس کی خامیوں کی اصلاح کر کے آہستہ آہستہ اسے ایک معیاری درجے تک لے جایا جا سکتا ہے۔ اس دستور کے آ جانے سے ہم اس مجہول حالت سے نکل آئے ہیں جس کے اندر سے طرح طرح کے خطرات و مہالک سر اٹھاتے رہے ہیں اور اب منزل اسلام کی طرف ہمارے کاروانِ حیات نے استقبال قبلہ کر لیا۔ سچی مبارکباد کے مستحق ہیں وہ خواص و عوام جنہوں نے اخلاص کے ساتھ اس دستور کی تشکیل کے لئے ہشت سالہ جدوجہد میں کسی درجے کا کوئی حصہ لیا اور اسی

طرح بجی مبارک باد کے مستحق ہیں ۔ ایسے حکمران اور نمائندگان ملت کہ جنہوں نے ایمانداری سے قومی امنگوں اور مطالبوں کو پورا کرنے کا اہتمام کیا اور مخالف
طاقتوں کی مزاحمت کے سامنے جم کر کھڑے رہے ۔ اور حیف ہے ان افراد اور جماعتوں پر جنہوں نے عوام کی دستوری جدوجہد کو پیچھے سے یا آگے سے ظاہر طور
پر یا خفیہ تدبیروں سے نقصان پہنچانے کے جتن کئے ۔
اب اس دستور کو لے کر ۲۳ مارچ سے اگر حکمراں اور عوام دونوں فکر و عمل کی صحیح تبدیلیوں کا آغاز کریں اور اپنی اپنی جگہ خدا سے نیا عہد استوار
کر کے نئی زندگی کی تعمیر میں لگ جائیں تو انشاء اللہ اس دستور کے روشن پہلو اس کے کمزور پہلوؤں پر چھا جائیں گے ۔ نہ اگر ذہن و کردار کا انداز وہی پہلے کا سا رہا
تو پھر اندیشہ ہے کہ اس کے نقائص ابھر کر اس کے روشن پہلوؤں کو بھی غارت کر دیں گے ۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو ۔

ہندو اور عوامی لیگ

نئے دستور کے بن جانے پر سب سے بڑھ کر برافروختہ ہندو ہیں اور ان کے بعد پھر اگر کوئی ناراض ہے تو وہ کمیونسٹ اور سیکولرسٹ عنصر ہے اور ان
میں سے ممتاز ہیں جناح عوامی لیگ اور اس کے لیڈر جناب سہروردی صاحب !
مشرقی پاکستان کے ہندوؤں نے دستور کے اسلامی اجزا کے خلاف ہر اقدام کر ڈالا ہے ۔ وہ خود لڑے ہیں ، انہوں نے جناح عوامی لیگ کے اکابر اور
افراد کو آلۂ کار بنایا ہے ، انہوں نے جوڑ توڑ اور سازش کی صورتیں اختیار کی ہیں ، انہوں نے دستور ساز سے واک آؤٹ کیا ہے ، انہوں نے سرکار وزارت کو
توڑنے کے لئے اپنے آدمیوں سے استعفے دلوائے ہیں (جو منظور ہو چکے ہیں) اور اب انہوں نے ہندو عوام کو مشرقی پاکستان سے ترک وطن کرنے کی راہ
پر ڈال دیا ہے ، نیز مشرقی پاکستان میں اس دستور کے خلاف اظہار نفرت کے لئے "ڈے" منانے کی تیاریاں اپنے خاص "مسلمانوں" کی مدد سے کر لی ہیں ۔
ان کے روٹھنے کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی اکثریت نے ان کی مرضی کا دستور کیوں نہیں بنایا ۔ ان کے جذبوں کے سب سے بڑے مسلم ترجمان سہروردی صاحب
ہیں جن کا ایک اعتراض دستور پر یہ ہے کہ اس میں اسلامی اجزا کیوں لئے گئے ہیں ۔ دوسرا یہ ہے کہ اس دستور نے بنگالیوں کے مطالبات پورے
نہیں کئے ۔ ان بزرگ سے تو صرف ایک گزارش کرنا کافی ہے اور وہ یہ کہ ذرا آپ اپنے قلم سے مرتب کردہ پر اسرار مسودۂ دستور پبلک کے سامنے لے
آئیں تاکہ موازنہ کر کے پبلک دیکھ سکے کہ آپ مغربی اور مشرقی پاکستان کو کیا کیا کچھ دے رہے تھے اور موجودہ دستور نے کس پہلو سے کوتاہی کی ہے ۔
رہے ہندو ، تو ان کے سامنے ہم انہی کے ایک بھائی کامنی کمار دتہ کی وہ تقریر رکھتے ہیں جو موصوف نے ۱۲ مارچ کو کومیلا کے قریب منعقد ہونے والے
ایک بڑے جلسے میں کی ہے ۔ وہ اس دستور کو بعض پہلوؤں سے انڈیا کے دستور پر فوقیت دیتے ہیں ۔ ان کی نگاہ میں یہ صوبوں کو وسیع اختیارات دیتا ہے
اور تمام عناصر آبادی کو نسل ، مذہب اور طبقے کے امتیاز کے بغیر مساویانہ حقوق و مراعات دیتا ہے اور یہ فطری تصور انصاف پر مبنی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ
یہ دستور اسلام کے اصولوں پر مبنی ہے ، لہٰذا اقلیتوں کے لئے اس میں کوئی وجہ تشویش نہیں ہے ۔ یہ بھی فرمایا کہ لفظ "اسلام" کے معنی امن کے ہیں ، سو ایسا دستور
تمام گروہوں میں برادرانہ روابط پیدا کرنے کا وسیلہ ہوگا ۔ مسٹر دتہ نے بڑی سختی سے ملک چھوڑنے کے پروپیگنڈے کے سدباب پر زور دیا ہے ۔ موصوف نے
اپنی مثال دی کہ اگرچہ خود میں نے ریاست کے اسلامی نام اور صدر ریاست کے مسلمان ہونے کی شرط والی دونوں دفعات کے خلاف ووٹ دیا ہے
لیکن جب جمہوری اصول کے مطابق اکثریت نے ان کو پاس کر دیا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ لوگوں کو انہیں قبول کر لینا چاہئے ۔ حاضرین جلسہ نے مسٹر دتہ
کے موقف کی تائید کی اور خواہش کی کہ وہ اپنے عوام کے موجب ہرگز مستعفی نہ ہوں ۔
دنیا کا یہ عجائب ترین غیر جمہوری مطالبہ ہے کہ اقلیت اکثریت پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کرے اور پھر اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لئے

زہریلا پروپگنڈہ کیے، باشندوں کے [illegible] سرزمین وطن سے روٹھ کر باہر چلے جانے کی تحریک چلائے اور خود اکثریت کے عناصر کو سازشی طریقوں سے باہم [illegible] یہاں عیسائی بھی بطور اقلیت بستے ہیں مگر ان کی طرف سے ایسی نامعقول حرکت نہیں کی گئی۔ مشرقی پاکستان کے [illegible] جذبات کے ساتھ اس میں اصلاح کر لیں۔ ورنہ اکثریت سے اس طرح کا برتاؤ کسی صورت میں [illegible] اور آج تک ان پر کوئی دست درازی اکثریت نے عملاً نہیں کی تو پھر وہ خواہ مخواہ معاندانہ روش [illegible]

دو اقدامات

نئے "اسلامی [illegible] اقدامات ہوئے ہیں۔

ایک [illegible] کرتے ہوئے ایک انتباہ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک گندا فلمی ماحول کی پیداوار ہی میں [illegible] اشاعت فحش اس کے اشتہار اور پروپیگنڈے کے ذریعے ہوتی ہے۔ نہایت گندے مناظر [illegible] سڑکوں پر چلتے ہوئے بچیاں سب ان کو دیکھتے ہیں اور دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ آنکھ جدھر بھی اٹھے [illegible] ان مناظر سے [illegible] آتے ہیں۔ یوں تو کوئی بھی فلمی اشتہار ہو اس کی تصاویر اور اس کی عبارت [illegible] ایک انگریزی روزنامے میں ایک دیو سائز کا اشتہار دیا گیا جس میں ایک افسانوی جوڑے کو [illegible] عورتوں اور بچوں کی نگاہیں اس پر پڑی ہوں گی تو انہوں نے کیا تاثر لیا ہو گا [illegible] سوال یہ ہے کیا ایک طرح کی غداری نہیں ہے؟ غالباً سرمایہ داری اور نفع پرستی کی بدترین صورت [illegible] عصمت قلب و نظر کو خطرے میں ڈال دیا جائے۔ اس بارے میں حکومت نے [illegible] حکومت سے ہم ایسے تساہل کی توقع نہیں کرتے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ [illegible] انسداد کے لئے موجود ہیں ان کو دیانت داری [illegible] اور ریڈیو کے گانوں اور بازاری جرائد کو فحاشی سے پاک کیے [illegible] لکھنے سے کام نہ چلے گا۔ چاہیے کہ اشتہارات میں اور عمل [illegible] درماں تجارت بنا لیا گیا ہے بنیادی طور پر اس منصوبے کا تدارک کیا جائے۔

[illegible] کے اڈوں کو اکھیڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے یہ بھی عین مطلوب اور دستوری مقاصد کے مطابق [illegible] ہو سکتا جب تک بدکاری کا مستقل ماحول نہ بدل دیا جائے۔ یہ فاسد ماحول [illegible] کے ذریعے شہوانی ہوس میں مبتلا کرتا ہے اور دوسری طرف ان کا [illegible] ازدواجی زندگی کی راہ میں رسم و رواج کے بھاری پتھر حائل کیے ہوئے ہے اور [illegible] اس پورے ماحول کو سامنے رکھ کر اس کی اصلاح کا کوئی جامع منصوبہ بنانا چاہیے جسے مناسب تدریجی اقدامات کے ساتھ عمل [illegible] ایک بازار معصیت کے معاشرتی پھوڑے کا منہ بند کر دینے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بدن پر

لیے کئی پھوڑے دوسری جگہ نکل آئیں گے، یا ان کا زہر خون میں مل کر رگ رگ کو روگی بنا دے گا۔

عصمت سوز ماحول!

اخبار دں میں المیۂ گجرات اتفاقاً نمایاں ہو کر آ گیا ورنہ حسین بی بی کے سے ابتلاء سے خدا جانے روز کتنی دختران ملت گزرتی ہیں، اور یا تو جان سے ہاتھ دھوتی ہیں یا عزت مندانہ زندگی سے محروم کر دی جاتی ہیں۔ اب ایک المیۂ لاہور کے ابواب زینتِ اخبارات بن رہے ہیں اور یہ المیہ بھی روزمرہ ہوتے رہتے والے بے شمار واقعات میں سے ایک ہے۔ ہمارا اشارہ ایک اسکول کی طالبہ مسماۃ خالدہ کی طرف ہے۔ معاملہ چونکہ عدالت کے سامنے ہے اس لئے نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحیح واقعات کیا ہیں اور کہاں تک دن کی ترجمانی غلط کی جا رہی ہے اور نہ یہی رائے قائم کر سکتے ہیں کہ کون کتنا قصوروار ہے اور کون نہیں ہے۔ ان امور کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی ہم تو یہاں صرف ماحول کے اس فسادِ مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جس کے تحت کوئی لڑکی سکول سے گھر آتے ہوئے راستے سے اپنی مرضی سے یا کسی غنڈے کی عیاری سے یکایک غائب ہو سکتی ہے، پھر وہ کسی کے ہتھے چڑھ سکتی ہے، وہ شیطنت و بہیمت کا شکار ہو سکتی ہے، اسے در در پھرایا جا سکتا ہے اور اسے پستیٔ اخلاق کے ایسے کوچوں میں گھمایا جا سکتا ہے جن کی گشت کر لینے کے بعد مراجعت عزت مندی اور حیاداری کی زندگی کی بحالی مشکل ہی سے قابلِ تصور ہو سکتی ہے۔

اس عصمت سوز ماحول کے اندر مس قریشی ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن گورنمنٹ کالج فار ویمن منٹگمری کے جلسہ تقسیم اسناد میں خطاب کرتے ہوئے طالبات کو یہ مشورہ دیتی ہیں کہ شادی شدہ خواتین کے لئے تو خیر گھر ہی موزوں ترین محل ہے، لیکن کنواری لڑکیوں کو گھر سے باہر کی سوشل سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہئے۔ بس یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہی مکتب ہے اور یہی ملّا تو پھر کارِ طفلاں تمام خواہد شد! اسی طرح کا فاسد مغربی ذہن ہے جو ہمارے نظامِ تعلیم اور جدید کلچر کے اندر کام کر رہا ہے اور اسی کے زیرِ اثر ہمارے ہزارہا خاندانوں کو کسی نہ کسی دردناک ٹریجیڈی سے گزرنا پڑتا ہے۔ تعلیم ان کو گندے فلموں اور گندے ناولوں اور افسانوں کے دروازے پر جا کر چھوڑ دیتی ہے، پھر وہ ایک طرف بناؤ سنگار کا جدید فاسقانہ آرٹ سیکھتی ہیں اور دوسری طرف معاشقوں کی چاٹ پڑتی ہے اور تیسری طرف بے پردگی و آوارگی اور معاشرے میں گھومنے پھرنے کا ذوق ان کے اندر پروان چڑھتا ہے۔ اس طرح ان کی ذہنی دنیا میں شیاطین اپنے مستقل کیمپ کھول دیتے ہیں۔ پھر ان کے ایک ایک ذہنی رخنے کو تاک کر ہمارا غنڈہ عنصر ان پر شبخون مارتا ہے اور آبروؤں کے بستے بستے شہر اجڑ جاتے ہیں اور یہ روشن خیال بنانے والی تعلیم اپنے متعلمین میں اتنی استعداد بھی تو پیدا نہیں کر سکتی کہ غنڈوں کے نرغے میں آئی ہوئی کوئی جان اپنا بچاؤ کر سکے یا اپنے لئے کوئی راہِ فرار نکال سکے۔

سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہم کروڑوں روپیہ سالانہ پولیس اور سی آئی ڈی پر خرچ کر رہے ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ غنڈہ عناصر پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ مثلاً خالدہ ہی کے معاملے سے بہت سے افراد کا تعلق معلوم ہوتا ہے اور فرض کیجئے کہ وہ تمام یا ان کا بیشتر حصہ موجودہ ناقص قانون کی گرفت میں نہ آ سکے یا شہادت کے تقاضے عدالت کے سامنے پورے نہ ہو سکیں، لیکن پولیس کے علم میں تو ان کی فہرست آ گئی اور اس طرح کے دوسرے سیکڑوں واقعات میں ہمیشہ آتی رہتی ہے۔ کیوں نہیں اس امر کا انتظام کیا جا سکتا کہ ایسے لوگوں کی نقل و حرکت پر سی آئی ڈی کی مستقل نگرانی قائم کر دی جائے۔ بجائے سیاسی اور دینی جماعتوں کے سربراہ کاروں اور کارکنوں کی حدِ مبالغہ تک نگرانی کرنے کے، سوسائٹی کے غنڈہ عناصر (اور خصوصاً شریفوں کے بھروپ میں رہنے والے اور دولت کے زور سے بڑے آدمی بننے والے غنڈہ عناصر) پر پوری پوری توجہ صرف کی جائے۔ ان کی نقل و حرکت پر وقتاً فوقتاً پابندیاں لگائی جاتی رہیں، ان کو بوقتِ ضرورت انتباہ اور وارننگ دے کر سیدھا رکھا جائے۔ یہ صورت اختیار کی جائے تو یقیناً حالات میں فرق واقع ہو سکتا ہے۔

اس کے ساتھ پرانے قوانین کو اسلامی تقاضوں کے مطابق نئی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً دائرۂ نکاح کے باہر واقع ہونے والے صنفی تعلقات (چاہے وہ جبری ہوں یا رضا کے ساتھ) کو سنگین فوجداری جرم ٹھہرایا جائے۔ کسی خاتون یا لڑکی کو جو اپنے شرعی اولیا کی تحویل میں ہو سرے سے قانوناً یہ حق نہ ہونا چاہئے کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر کسی جگہ آجا سکے یا کسی غیر مرد سے کسی طرح کے دوستانہ روابط رکھ سکے اور دوسری طرف اگر اس کا بغیر اذن اولیا کسی غیر گھر میں یا کسی غیر مرد کے ساتھ رہنا یا سفر کرنا یا کسی طرح کے تعلقات رکھنا ثابت ہو تو اس غیر مرد اور غیر گھر کے لوگوں کو بہ حیثیت مجرم سزا ملنی چاہئے۔ البتہ غیاب کا جو حق شریعت نے ظالم اولیا کے مقابلے میں عورت کو دیا ہے اس کے استعمال کا قانونی راستہ متعین ہو جانا چاہئے اور وہ یہ ہو کہ عورت یا لڑکی بالغ ہونے پر عدالت میں درخواست دے اور اس درخواست کے قبول کرنے پر جج اس کا ولی مجاز قرار پائے۔ اس نہج پر قانونی تبدیلی ہو جائے تو پھر کسی کو جرأت نہ ہوگی کہ وہ کسی لڑکی کو راہ چلتے بھگا لے جائے اور جدھر چاہے گھماتا پھرے۔

علاوہ بریں اگر بدکاری کو واقعی روکنا مطلوب ہو تو سفلی جذبات کو بھڑکانے والے عوامل کا سدِ باب ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں ایک قانون "انسدادِ ترغیباتِ زنا" کی غرض سے بننا چاہئے۔ اس کے ذریعے ان فلموں، گانوں، تصاویر، اشتہارات اور حرکات و سکنات کو فوجداری جرم ٹھہرایا جائے جو کھلے کھلے طریق سے اپنے اندر سفلی جذبات کی غیر معمولی تحریک کا سامان رکھتے ہوں۔ ورنہ بدکاری کوئی کمزور طاقت نہیں ہے کہ جس کا ازالہ محض ایک خیالی خواہش سے ہو جائے۔

حسین بی بی جیسی سینکڑوں خواتین اور خالدہ جیسی ہزاروں نوعمر بچیاں فریادی ہیں کہ ان کو فاسد ماحول کے بھڑکائے ہوئے بہیمانہ جذبات سے بچائیے!

پاکستان، انڈیا اور اقوامِ مغرب

ہندوستانی امپیریلزم کا اژدہا کشمیر کو نگلنے کے بعد حیدرآباد، جونا گڑھ اور مناور کو یکے بعد دیگرے ہڑپ کرتا چلا گیا۔ کشمیر نسبتاً زیادہ ثقیل تھا، اس وہ جلدی سے ہضم نہ ہو سکا بلکہ اس نے بھارت کے معدے میں خاصی گڑبڑ مچا رکھی ہے یہاں بار بار اسے درد و کرب کے دورے پڑتے رہے ہیں۔ پاکستان جس کے بدن کا یہ ایک عضو تھا، عرضی لکھ کر یو۔ این۔ او کے سامنے لے گیا۔ آزاد کشمیر کے عوام اور کچھ قبائلیوں نے اپنے کشمیری بھائیوں کی نجات کے لئے اپنے جتن کئے، مگر پاکستان کی امن پسندی نے ان کے ہاتھ بھی باندھ دیئے اور بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ یو۔ این۔ او نے ڈھیلی ڈھالی سی پالیسی اختیار کی تاکہ اس عرصے میں انڈیا اس لقمۂ تر کو ہضم کر لے اور پھر جب اس کا کیلوس بن کر خون کی شکل اختیار کر جائے تو عرضی کو اٹھا کر داخل دفتر کر دیا جائے۔ اسی پالیسی کے تحت مسئلۂ کشمیر آہستہ آہستہ سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ اسی دوران میں روسی لیڈر ہندوستان آئے اور ان کو کشمیر لے جایا گیا تو مارشل بلگانن نے اپنے بیان میں کشمیر کو انڈیا کا حصہ قرار دیا۔ اس کی وجہ سے پاکستان میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی لیکن پاکستان کے مغربی دوست دم سادھے پڑے رہے۔ اسی دوران اواخر ۵۵ء کی کشمیر کانفرنس میں پاکستان اور آزاد کشمیر کے نازک جذبات ایک بار پھر اُمڈ کر سامنے آ گئے۔ اِدھر سیٹو کا حالیہ اجلاس کراچی میں منعقد ہونا طے پایا۔ انڈیا نے پورا زور صرف کیا کہ مسئلۂ کشمیر اس میں نہ چھڑنے پائے۔ لیکن مسئلۂ کشمیر چھڑا اور کانفرنس نے اس کی اہمیت کو بالاتفاق تسلیم کیا اور اس کے حل کے لئے اقوامِ متحدہ کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ اس واقعہ پر نئی دہلی کا چہرہ لال پیلا ہو گیا۔ چنانچہ امریکی وزیر خارجہ ڈلس پیکے ہوئے پہنچے اور انہوں نے سیٹو کے کئے کرائے کو غارت کر کے رکھ دیا۔ پاکستان اپنے موقف پر چند گز آگے بڑھا ہو گا، لیکن ڈلس نہرو ساز باز نے اسے اٹھا کر میل بھر پیچھے پھینک دیا۔ ڈلس نے دور رس اثرات رکھنے والی باتیں کہی ہیں:

— یہ کہ پاکستان کو جو دفاعی امداد دی جا رہی ہے وہ کسی طرح کے جارحانہ اقدام کے لئے نہیں ہے اور ایسی شرائط کے تحت دی جا رہی ہے کہ

پاکستان کسی ملک ــــ خصوصاً انڈیا ــــ کے خلاف جنگی قدم اٹھانے کے قابل نہیں ہے ۔

ــــ اگر پاکستان انڈیا کے خلاف کبھی تلوار اٹھائے تو امریکہ بھارت کے ساتھ ہو کر اس سے لڑے گا ۔

ان باتوں سے ہماری سابق خارجہ پالیسی کی ناکامی پوری طرح سامنے آجاتی ہے کہ نہایت حقیر اور ناکافی امداد کے لئے ہم نے اپنے آپکو ایسے معاہدات میں جکڑ لیا ہے کہ اب ہم اپنا حق بچانے کے لئے بھی کسی کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کر سکتے، اور ہر معاملے میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ امریکہ ہمارے اقدام کو "جارحانہ" تو قرار نہیں دیتا ۔ دوسرے یہ تلخ حقیقت بھی ہم پر پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ مغربی طاقتیں پوری طرح ساتھ دینے والے ممالک کے مقابلے میں آزاد اور خوددار پالیسی رکھنے والے ممالک کو اہمیت دیتی ہیں، نیز وہ دنیا بھر میں مسلمان طاقتوں کے خلاف کسی نہ کسی غیر مسلم طاقت کو مضبوط بنائے رکھنا چاہتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ ان طاقتوں کا کوئی اصول بجز افادیت پرستی اور موقع شناسی کے نہیں ہے کہ جس کی بنا پر ان پر اعتماد کیا جا سکے۔ نتیجہ کہ انڈیا کے ظالمانہ اقدام کے حق میں اور پاکستان کے خلاف روس اور امریکہ دونوں نے اپنا پورا وزن ڈال دیا ہے۔ اس موقع پر ڈلس نے سیاسی یارانے کی پینگیں بڑھانے کے لئے پنڈت نہرو کو امریکہ آنے کی خاص دعوت بھی دی ہے ۔

اب انڈیا کی جسارت اور بڑھ گئی ہے ۔ چنانچہ حال ہی میں چاڈ بٹ کے معاملے میں اس نے دراز دستی کی ہے اور اب تو پوری دو ڈویژن فوج لاکے ڈال دی ہے ۔ ابھی ۱۰ مارچ کو روہی وال کے قریب ہندوستانی سرحدی دستوں نے سرحد کا خط پار کر کے پاکستانی علاقے میں اگر مورچہ بندی اور فائرنگ کی ہے ۔ ادھر مشرقی پاکستان کی سرحد پر حکومت آسام کی سرحدی پولیس نے ۲۴ فروری اور یکم مارچ کے درمیان متعدد بار پاکستانی نگرانوں پر گولیاں برسائی ہیں اور گفت و شنید سے طے شدہ سمجھوتے کی خود ہی خلاف ورزی کی ۔ اور ہمارا جواب ــــ احتجاج ! احتجاج !! احتجاج !!! ۔

کشمیر حاصل کرنا تو آگے کی چیز ہے، مجرد زندہ و آزاد کے لئے ناگزیر ہے کہ ہم اپنے اندر زندگی کی نئی روح پیدا کریں، اپنے قومی گھر کے ایک ایک ذرۂ خاک کی حفاظت کے لئے مضبوط جذبات کو بر سر عمل لائیں، من رمق کر کے اپنے اندر سے قوت سمیٹیں اور اپنے جزوی اختلافات کے علی الرغم بنیادی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے قطعی طور پر متحد اور ہم آہنگ ہوں !

چند باتیں

۱۔ کچھ اہم تر مصروفیات کے تسلسل کی وجہ سے چند ہفتوں سے خطوط کے جواب نہیں دیئے جا سکے اور ڈاک جمع پڑی ہے، مزید چند روز اس ادائے فرض کا موقع نہیں ملے گا ۔ البتہ ان خطوط میں سے ضروری قابلِ اشاعت مواد لے لیا گیا ہے ۔ متعلقہ احباب مطلع رہیں ۔

۲۔ "آپ کیا پڑھیں" کے صفحات اس مرتبہ جگہ نہیں پا سکے ۔ آئندہ ماہ جمع شدہ کتب و جرائد پر اظہارِ رائے کر دیا جائے گا ۔

۳۔ مضمون نگار حضرات براہ کرم صاف اور جلی لکھائی کا اہتمام کریں، سطروں کے درمیان جگہ چھوڑیں اور کم سے کم ایک طرف کھلا حاشیہ بھی رکھیں ۔ علاوہ بریں اوقاف لگانے اور دوسری علامات استعمال کرنے میں خاص احتیاط فرمائیں ۔ نئے لکھنے والے احباب مشورہ لے کر عبارت کی ترتیب الفاظ کو معیاری بنانے کے بعد مضامین بھیجا کریں ۔

عبداللہ خاور

نسیمِ مہر و وفا کا بدل گیا ہے چلن !
مشامِ جاں سے اُلجھتی ہے لُوٹے پیراہن !
محیط وادیٔ دل پہ ہے ایک سنّاٹا
کہاں تھمی ہے رہِ انتظار میں دھڑکن !
اُلجھ رہا ہوں شفق کے حسیں نظاروں سے
کہ مجھ سے چھوٹ گیا ہے کہیں ترا دامن !
ہجومِ یاس میں آہنگِ نو بدلتا ہے
ترے خیال کا نغمہ ہے کس قدر پُرفن !
بڑے مزے سے سرِ رہگذار گزرے گی
نہ بجلیوں ہی کا ڈر ہے، نہ اب غمِ خرمن !
دلِ حزیں نے ہزاروں فریب کھائے مگر
نظر سے چھٹ نہ سکا اعتبار کا دامن
یہ کائنات ہے، عنواں اِسی فسانے کا
کسی نظر میں تمنّا ! کسی جبیں پہ شکن !!
وہیں ہے مسئلۂ ترک و اختیارِ وفا !
شعور و قلب و نظر میں بہت ہی اَن بن
یہ صبح بھی نہ بہت دور ہو کہیں، خاور !
کہ شام ہی سے ہے دل میں عجیب سی اُلجھن !

نعیم صدیقی

مئے تو ہے، مئے کا وہ معیار نہیں ہے ساقی
اس میں وہ نور نہیں، نار نہیں ہے ساقی
دردِ دل ملتا ہے، دارو نہیں بکتے ہیں یہاں !
جاؤ، جاؤ ! کوئی عطّار نہیں ہے ساقی
ذہنِ رندی کی روایات پہ طاری ہے زوال
تجھ میں ساقی کا سا کردار نہیں ہے ساقی !
خالیٔ صہبا سے بھر کیا ! چاہیے کچھ فیضِ نگاہ
بزم بے ہوش ہے، سرشار نہیں ہے ساقی !
ہم تو آئے ہیں یہاں تیری کشش کے مارے
خاکِ مے خانہ سے کچھ پیار نہیں ہے ساقی !
شعر و نغمہ بھی ہے، صہبا بھی ہے، معشوق بھی ہے
اور ہر چیز ہے ! تلوار نہیں ہے ساقی !
مئے عصیاں کہ جو غارت گرِ ایماں ٹھہری
دل اب اس مئے کا طلبگار نہیں ہے ساقی !
اور جو کچھ ہُوا، سوداگرِ تقویٰ نہ ہُوا
شیخ ! صد شکر ! ریاکار نہیں ہے ساقی !

انور صدیقی

نگاہِ غیر میں گر دانۂ سپند رہے
تمہارے عشق میں ہم لوگ سربلند رہے

فرازِ دار ملی یا قفس کی تنہائی
راہِ وفا میں بہر گام قید و بند رہے

جنوں اُٹھے گا ابھی شوخیٔ حیات لئے
کچھ اور دیر بس یہ وعظ و پند رہے

پتا نہ تھا کہیں اہلِ ہوس کا کوسوں تک
رہے تو بزم میں تیرے ہی دردمند رہے

تمہارے غم سے جلائیں ہیں کتنی قندیلیں
تمہارے حرفِ محبت پہ کاربند رہے

شعور بدایونی

میں جو دُور اُفتادۂ منزل رہا
رہنما ہی راہ میں حائل رہا

سوزِ ایماں کا نہ جو حامل رہا
کون کہتا ہے کہ وہ دل دل رہا

خار و خس کو دیکھتے، کیا دیکھتے
یہ گلستاں ہی کب اس قابل رہا

اپنا پیماں دیکھ اے پیماں شکن
میرا دل تو ٹوٹ کر بھی دل رہا

لوگ میلوں پیش قدمی کر گئے
ہائے کتنی دیر میں غافل رہا

بس ذرا سی اور ہمت اے شعور
وہ رہا۔ وہ دیکھ۔ وہ ساحل رہا

منظر کلیمی

قاتل کو دیکھتا ہوں سوئے دار دیکھ کر — خوش ہو رہا ہوں آگ کو گلزار دیکھ کر
واقف نہ تھا حضور رہ و رسمِ عشق سے — مَیں کھا گیا فریبِ نگہِ پیار دیکھ کر
آئیں گے اب تو آپ کئی بار خواب میں — ہم جا رہے ہیں آپ کو اک بار دیکھ کر
ساقی بھی میکدہ بھی مئے و جام بھی مرے — حیران ہوں جسارتِ اغیار دیکھ کر
اے چاند آج چاندنی اپنی سمیٹ لے — مَیں آ رہا ہوں حُسن کا شہکار دیکھ کر
ہر قتل گاہِ عشق میں آیا ہوں شوق سے — اِک اک قدم پہ زیست کے آثار دیکھ کر
مجبور ہو کے اہلِ جفا ہوں گے مہرباں — منظرؔ جفا سے اِتنا تو اِیثار دیکھ کر

کیفی جام پوری

رہ نہیں سکتے کبھی ناکام ہم — ہیں حریفِ گردشِ ایّام ہم
مسکراتے ہیں تہِ شمشیر بھی — اس قدر ہیں خوگرِ آلام ہم
دہر سے ہم کو مٹائے کوئی کیا! — دہر کا آغاز ہم! انجام ہم
بزمِ عالم میں ہماری گونج ہے — ہیں خدا کا آخری پیغام ہم
دشمنوں کے واسطے قہرِ خدا — دوستوں کے حق میں لطفِ عام ہم
سرکشوں کی گردنیں خم ہو گئیں — جب اُٹھے لے کر خدا کا نام ہم
زیست اپنی ہے سراپا جستجو — ہر گھڑی رہتے ہیں بے آرام ہم
ڈھونڈتے ہیں مشکلاتِ تازہ ہم — مرتے ہیں بہرِ حیاتِ تازہ ہم

عارف حسین عارفؔ

میرے دامن میں ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں — زندگی بھر تخم ہائے معصیت بوتا رہا
آ گیا تھا اپنے اعمالِ سیہ کا کچھ خیال — تیرا عارف منہ چھپائے رات بھر روتا رہا

ابنِ فرید بی اے

منٹو کا فن شخصیّت کے آئینہ میں

(۲)

صرف گالیاں ہی نہیں اُس کی شخصیت کی اور دوسری کمزوریاں اُس کے ادب میں نمایاں ہو گئی ہیں جنہوں نے اُس کے ادبی مقام کو بری طرح مجروح کیا ہے اور خود اُسی سے اُس چولی کے اتارنے کا بھی ارتکاب کرا دیا ہے۔ جس کے پہنانے کے سلسلے میں وہ اپنے آپ کو معذور پاتا ہے۔ کیوں کہ جس طرح منٹو شراب کا بُری طرح عادی تھا بالکل اسی طرح اُس کے افسانوی کردار بھی بے دھڑک اور بے پناہ شراب پیتے ہوئے ملتے ہیں۔ اور شراب سے وہ اپنا غم غلط کرنا چاہتے ہیں۔ "ممی" کے کردار چڈا کی طرح انہیں کون میسر نہیں آتا۔ شراب کی طرف سے ان کے اندر کسی طرح کی کراہیت نہیں ہے۔ وہ اسے اپنے لئے مضر سمجھتے ہوئے بھی ناگزیر سمجھتے ہیں کیوں کہ اُن کا خالق منٹو بھی تمام عمر اسی خوش گمانی میں مبتلا رہا۔

"بہت زیادہ شراب پینے لگا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ کچھ لکھوں۔ پی کر میں لکھ ہی نہیں سکتا۔"

(خط بنام احمد ندیم قاسمی مورخہ ۱۲ فروری ۳۹ء — منٹو)

"وہ اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ شراب پی کر کبھی نہیں بہکتے۔ ان کی اس جسمانی معذوری کا ان کے سامنے مبہم سا بھی اشارہ کر دیا جائے تو ان کے پندار کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ کاش وہ محسوس کر سکتے کہ شراب ان کے لئے کتنی مضر ثابت ہو رہی ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ان کی صحت کے مقابلے میں اُن کی شخصیت کو اس نے کہیں زیادہ برباد کیا ہے۔"

"بسترِ مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔"

(منٹو ماموں کی موت — حامد جلال)

"ایمبولنس جیسے ہی دروازے پر آکر کھڑی ہوئی انہوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک چمچہ وسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی۔ لیکن شاید ایک قطرہ مشکل سے اُن کے حلق سے نیچے اتر سکا ہوگا۔ باقی شراب اُن کے منہ سے گر گئی اور اُن پر غشی طاری ہو گئی۔"

(منٹو ماموں کی موت — حامد جلال)

شراب نوشی اور شراب نوشی سے غم غلط کرنے کی کوشش دراصل زندگی سے فرار اختیار کرنے کی سب سے بڑی کوشش ہے۔ ایک راہب آبادیوں کو چھوڑ دیتا ہے لیکن اپنے ہوش و حواس سے مستغنی نہیں ہو پاتا۔ اُس کا فرار پھر بھی نامکمل رہتا ہے لیکن ایک شرابی آبادیوں میں رہتے ہوئے بھی دنیا کے جھمیلوں سے حسّی طور پر بے تعلق ہو جاتا ہے۔ اُس کی شکست خوردگی اُسے دنیا کی آغوش میں بے حس و ٹھٹھرا ہوا کر چھوڑ دیتی ہے۔ چنانچہ یہ شکست خوردگی ہمیں منٹو کے اندر پوری طرح کار فرما نظر آتی ہے۔

"باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے رنچھوڑ قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو جیسا کہ میں نے دیکھا، میرا خیال ہے باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو۔ جن حالات میں اچانک

ایک دن منٹو دہلی سے غائب ہوگیا۔ تقریباً انہیں حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اُس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے نذیر اجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود بھی اُس فرار کا باعث تھا۔ کیوں کہ لڑائی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا، خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اُسی کے حربوں کو اُس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔

(منٹو: میرا دشمن — اوپندر ناتھ اشک)

اس شکست خوردگی ہی کی وجہ تھی کہ اس نے کا سنیس اور خوشامد بھی اچھی خاصی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے تحفظ کے لئے اس ذلیل ترین طریقے کو بھی استعمال کرنے سے باز نہ آتا تھا۔

منٹو کو خوشامد کرنے سے عار نہیں تھا۔ مکرجی کے پاس بیٹھ کر اُن کی خوشنودی کے لئے منٹو کو غالب کے اشعار سناتے ہوئے میں نے دیکھا ہے (حالانکہ میں سمجھتا ہوں۔ مکرجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکرجی کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ اپنے فن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں لیکن غالب کو سمجھنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ اور پھر بنگالی ہونے کے ناتے بنگال کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر اُن کے نزدیک غالب سے بڑا ہے!) اشوک اور رواجا کی محفل میں بیٹھ کر سو قیانہ لطیفے سناتے دیکھا ہے، اَن پڑھ ایکٹروں اور میوزک ڈائرکٹروں کی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے بکواس کرتے سنا ہے (جسے منٹو بکواس اور دوسرے بذلہ سنجی کا نام دیتے تھے)۔

(منٹو میرا دشمن — اوپندر ناتھ اشک)

اُس کی یہ گراوٹ اُس کے کتنے ہی کردار وں میں پائی جاتی ہے، لیکن مقام فکر ہے جس طرح اس نے "بانجھ" "نعرہ" اور "اُس کا پتی" میں کمتر درگی خودکشی، دیوانہ پن اور جنون کو افسانہ کا موضوع اور عروج (CLIMAX) بناکر پیش کیا ہے اُس طرح اس نے مذموم صفت کو علاوہ سوقیانہ مکالمات اور لطائف کے اپنے کرداروں میں نمایاں طور پر پیش نہیں کیا ہے بلکہ شعوری طور پر اس کو دبانے ہی کی کوشش کی ہے۔

بہر حال شکست خوردگی اور جنون کو خود اس کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ ذہنی اور دماغی توازن سے محرومی کی وجہ سے ہسپتال پہنچا دیے جانے کے لئے مجبور ہوا۔ اس کی اپنی زندگی بڑی تلخ تھی۔ اس کے گھر والے اُس کی عادات کی وجہ سے اُس سے خوش نہیں رہتے تھے۔ اپنی بیوی کے بارے میں اُس کا بیان ہے

اس کی بیوی اُس سے ہر لحاظ سے نالاں ہے۔ وہ اُس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو۔۔۔ کوئی دکان کھول لو۔

(منٹو ۔۔۔ سعادت حسن منٹو)

اور منٹو کے بھانجے نے اس طرح اُن کی بیوی کے تاثرات کو پیش کیا ہے۔

اُن (منٹو) کی بیوی کو جب معلوم ہوا کہ میں بھی ادب کا سودائی بنتا ہوں اور کچھ لکھنے بھی لگا ہوں تو میری بیوی سے جو ان کی سب سے چھوٹی بہن بھی ہیں کہا "خدا کرے یہ خبر غلط ہو۔ دعا کرو وہ کبھی مصنف نہ بنیں ورنہ تمہیں بھی عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔" جب ان کے اس قول کا مجھے علم ہوا تو میں نے اس پر حیرت و استعجاب کا بالکل اظہار نہیں کیا۔

(منٹو ماموں — حامد جلال)

چنانچہ یہی الجھنیں تھیں جنہوں نے منٹو کی زندگی کو اجیرن کر دیا۔ اُس نے اپنی زندگی کے اس گرداب سے آخری وقت میں نکلنے کی کوشش کرنی چاہی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

انہوں نے شراب نوشی کی انتہا کرکے اپنی موت کو دعوت کیوں دی؟ یہ سوال اس بار راولپنڈی سے لاہور آتے ہوئے میرے ذہن میں بار بار آرہا تھا۔ رنجیدہ ہونے کے بجائے مجھے غصہ آرہا تھا۔ یہ انتہا پسندی اپنے اہل و عیال کی محبت اور شرافت کی منافقانہ طبیعت کی کشمکش عرصے سے جاری تھی، درمیان اتنا عرصہ شراب نے ہاتھ رہا۔ مجھے شک تھا کہ چند مہینوں سے وہ خودکشی کے اسی قصے سے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرار کا یہ آسان ترین راستہ تھا۔ یا پھر وہ اپنے خاندان والوں کو منفعل کرنا چاہتے تھے جنہوں نے ان سے مایوس ہو کر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا ۔

(نقوش، نمبر — حامد جلال)

فنکار نمبر ۳ ، ۲ کے لئے اپنا افسانہ بھیجتے ہوئے سعادت حسن منٹو نے مجھے لکھا تھا کہ جس طرح جس قدر کی اور جس مقدار میں شراب وہ ان دنوں پی رہا ہے اس سے تعجب ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ مرا کیوں نہیں۔ پھر انہی دنوں اس کی ایک تحریر میری نظر سے گزری جس میں اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ اس کی بڑی آرزو ہے کہ افسانہ نگاری چھوڑ کر کوئی چھوٹی موٹی دکان کھول لے۔ چنانچہ جب اچانک اس کی موت کی خبر مجھے ملی۔ تو میرا یقین پختہ ہو گیا کہ منٹو اپنی آئی سے نہیں مرا اپنے ہاتھوں اس نے اپنی جان لی ہے ۔

(دوسری بات ادارہ نگارندہ — پرکاش پنڈت)

دراصل زندگی کو اس نے جس طرح سے برتا اس واقعہ نے یہ ثابت کر دیا کہ آغاز کے غلط ہونے کی وجہ سے ہی اس کا انجام ہوا۔ زندگی کی تلخیوں سے بہت ہی عاجز آکر جان چھڑانی چاہی، تو خود اس کی اپنی زندگی اس منصب سے دور جان اپنی ۔ اس لئے اپنے اندر ایک ایسی بزدلی کو راہ دی جس نے خود اس کا خاتمہ ہی جلد کر دیا ۔ اگر منٹو نے پہلے سے کوئی اور بہتر راہ تجویز کی ہوتی تو شاید اس کا یہ حشر نہ ہوتا۔ مگر اس کی ابتدا ہی شروع ہی سے ہوئی تھی ۔

منٹو کی اوپری اٹھان یہی تھی ، زمین آسمان کا فرق تھا — وہ لڑکپن ہی سے ہونہار ۔ کمال کی دولت سے اوپر چوباروں میں جگہ والی دوستی کی محفلوں میں شامل ہوتا تھا اور رات گئے تک جوئے کی لاش پر کئے دیکھتا تھا۔ ان سے کبھی ناسٹل کو ہاتھ نہیں لگایا ۔ وہ شدید نوشی تھا اور مدت سے شراب تو وہ بہی تکبر سے پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا ۔ جس میں مسٹر گاندھی تھے۔ اس نے کئی کہانیاں بھی یہ اسمگلنگ دیا فارس روڈ — اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور جس کو اپنا تک کر لیا میں دیکھا۔

(منٹو نمبر — ادشن — اوپندرناتھ اشک)

پھر وہ کیوں نہ اپنی زندگی کے لئے اس بدروحی موثرانہ مخالف کو سطح نظر بنا لے ۔ اور وہ کیوں نہ کہے کہ ۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی کو اپنا موضوع بنا لیا ہے میں سب کی طرف سے جواب نہیں دوں گا — اپنے متعلق اتنا کہوں گا کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے — کیوں ہے؟ — بس ہے — سمجھ لیجئے کہ مجھ میں PERVERSION ہے اور اگر آپ عقلمند ہیں ، نیز دل کے عواقب و عواطف اچھی طرح جانچ سکتے ہیں تو سمجھ لیں کہ یہ بیماری مجھے کیوں لگی ہے ۔

(پیش لفظ "منٹو کے افسانے" — منٹو)

اس PERVERSION اور انتخابِ موضوع کی وجہ دراصل وہی ہے جس کی طرف اوپندر ناتھ اشک نے اشارہ کیا ہے۔ زندگی میں انسان اپنے لئے جو ماحول اختیار کرتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اُس کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ اس کے ذہن و فکر کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ دن رات کی پست یا بلند مصروفیات دماغ کو انہیں کوائف کے بارے میں سوچنے کے لئے مجبور کر دیتی ہیں۔ ثانیاً فرد کو جس میدان میں عملی تجربات ہوتے ہیں اُسی کے بارے میں وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے بلکہ غیر اختیاری طور پر تمام مثالیں اور تمام موضوعات وہیں سے وارد ہوتے ہیں۔ چنانچہ میدان کا رہنے والا پہاڑوں کی چوٹیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور پہاڑوں کی چٹانوں پر سکونت اختیار کرنے والا پستیوں کے بارے میں زبان نہ کھولے گا۔ منٹو نے جس پست ترین میدان کو اپنے لئے منتخب کیا تھا اور جس میں اُس کی دن رات کی دوڑ رہتی تھی اُس نے اس سے صرف جنس ہی کے بارے میں لکھوایا اور اس کے وہی افسانے مقبول بھی ہو سکے۔ موجودہ دور میں جوشؔ اور شفیق الرحمٰن کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ جوشؔ اس دور میں شاعرِ انقلاب ہونے کے باوجود جب تب "عشقیہ نظمیں" لکھنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اب کیوں ہے؟

میرے اٹھارہ بڑے بڑے عشقوں میں سے سترہ عشق ایسے رہے ہیں جن کا محبوبوں کی طرف سے بھرپور جواب پا گیا ہے۔

(خط بنام پروفیسر احتشام حسین ——— جوشؔ)

اور اسی طرح شفیق الرحمٰن بھی "رومانی کہانیاں" لکھنے کے لئے مجبور رہیں۔

شفیق کے "رومانس" اس کے دوستوں میں ایک مذاق بن چکے ہیں۔ وہ متعدد اور دلچسپ ہیں۔ چند ایک سے عبرت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ وہ ایک "مستقل" عاشق ہے یعنی پچھلے سترہ اٹھارہ سال میں شاید ہی کوئی ایسا موسم اس کی زندگی میں آیا ہوگا جب وہ کسی بت طناز کے دامِ زلف میں اسیر نہ تھا۔ وہ اپنے محبوبوں کو اس کثرت سے بدلتا ہے جس کثرت سے لوگ اپنی قمیص یا اپنے ہیٹ بدلتے ہیں۔ ایک رومان ابھی بیچ میں ہوتا ہے کہ وہ دوسرا شروع کر چکتا ہے۔ "ترک شدہ محبوب" کا نام تک اس کے ہونٹوں سے نہیں سنا جاتا۔

(شفیق الرحمٰن ——— محمد خالد اختر)

منٹو کے ساتھ یہی ایک وجہ نہیں تھی کہ اس نے اس ماحول میں مانوس ہو گئی اور اس کی نجاست اور خباثت پر اُس کا ضمیر نہیں کڑھتا تھا بلکہ ان دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن چندر کھل کر نہ لکھتے تھے لیکن انہوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولا بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور آبرو ریزی کے علاوہ بھی سینکڑوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت ترقی پسند عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں نعیم یا غفنفر جوانوں کا مارے مارے پھرنا ہی واحد موضوع سمجھتا تھا۔

(منٹو، میرا دشمن ——— اوپندر ناتھ اشک)

اس رجحان کے پسِ پشت وہی PERVERSION کام کر رہا تھا جس کی طرف منٹو نے خود اشارہ کیا ہے۔ پھر جب اس طرح کی کاوشوں نے لذتیت کا بازار بنا دیا تھا تو یہ تجارتی ضرورت کے تحت لازمی ہو گیا کہ وہ جنس پرستی سے ہٹ کر کسی اور موضوع کے لئے قلم کو شاذ و نادر ہی استعمال کرے۔ اور خود اپنی اس پستی کو حسین قالب میں پیش کرے اور ایسی توجیہات سے قابلِ قبول بنائے جو لذتیت پرست ذہن کے لئے عین فطری ہوں۔ خود انسان انسانیت کے مرتبے سے اتر کر کبوتر کبوتری، بلا کتے، بلی اور دوسرے حقیر ترین جانوروں کی صف میں کیوں نہ شامل ہو جائے۔

...... یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک مرد کے اعصاب پر

عورت سوار رہی ہے اور کیوں نہ رہے۔ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہئے۔ جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ کر ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں۔ عورتیں، کبوتریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ، خوبصورت اور فکر خیز ہیں ـــ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟

(پیش لفظ "منٹو کے افسانے" ـ منٹو)

لیکن پھر جلد ہی منٹو کو محسوس ہو گیا کہ اُس کا یہ فیصلہ اور دعویٰ بڑا جذباتی ہے۔ اُس کا اپنے PORVERSION کا اعلان کر دینا اُس کے فنی مرتبہ کو گرا دے گا چنانچہ اُس نے اپنے جنسی افسانوں کی وقعت کو خود ہی کم کر دینا چاہا۔

مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں ـــ میں اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں سے ملا ہوں ـــ وہ افسانے جو میں نے عورتوں سے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے ہیں یا محض دماغی عیاشی کے لئے ـــ میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے، اسی لئے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا ـــ ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں اور ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں۔ مگر وہ رومانی نہیں۔"

(افسانہ "بانجھ" ـــ منٹو)

اس کے باوجود جن افسانوں نے منٹو کو بے حد مشہور کیا وہ اُس کے وہی افسانے ہیں جو جنسی موضوعات کے حامل ہیں۔ حالانکہ یہ مشہور ترین افسانے ہی خام اور مہمل یا مضر ہیں خواہ ان کے مرتبہ کو کتنا ہی اونچا اٹھایا جائے۔ مثلاً "دھواں" کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں کہ اس کی نفسیاتی حقیقت پسندی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پروفیسر عزیز احمد کے نزدیک ـــ

دھواں کسی کچی لکڑی کا دھواں نہ سہی، لیکن میرے خیال میں یہ ڈی، ایچ لارنس کو اچھی طرح ہضم نہ کر سکنے کی وجہ سے بدہضمی کی ڈکار ہے۔ اس قسم کے افسانوں کی سماجی نقطۂ نظر سے ایک ہی وجہ جواز ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ بچوں کو شروع سے جنسی تعلیم ملنی چاہیئے لیکن اس خامی کو دور کرنے کے لئے ایسے ترغیب انگیز افسانے لکھنا، جن کو پڑھ کے ہی بچے جنس کو اور زیادہ مریضانہ نظر سے دیکھیں، انقلابی نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں۔

(ترقی پسند ادب ـــ عزیز احمد)

"ٹھنڈا گوشت" بھی منٹو کا ایک بہت ہی مشہور افسانہ ہے اور اس کے متعلق بھی ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ہاجرہ مسرور وغیرہ کا خیال وہی ہے جو دھواں کے بارے میں ہے مگر یہ افسانہ بھی اپنے اندر پورے فنی لوازمات رکھنے کے باوجود ویسی ہی مریضانہ جنسیت رکھتا ہے جیسی دوسرے افسانوں میں ہے ـــ "پھاہا" اور "بلاؤز" میں واقعہ نگاری کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اور یہ دونوں واقعے زندگی کے ایسے مشاہدات پر مبنی ہیں کہ جن کے بارے میں افسانہ نگار خود بھی نہیں بتلا سکتا کہ ان کو ضبط تحریر میں لانے کے بعد وہ سماج سے کیا چاہتا ہے۔ اس طرح کے جنسی واقعات کا اظہار عین فطرت ہے لیکن ان کا علاج ترفع اور تہذیب ہے لیکن افسانہ پڑھ جانے کے بعد اس طرح کی کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ "بو" ایسے افسانوں سے جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے وہ تو اور بھی گھناؤنی اور پست ہے، کہ جنسی تعلقات کے لئے رندھیروں کو اونچی سوسائٹی کی لڑکیوں کی تمنا کرنے کے بجائے گھاٹنوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسانا چاہئے۔ یہی تشویش ہے جس نے "خوشیا" کو بردہ فروشی کرنے کے باوجود جذبات میں براہ راست ہیجان محسوس کرنے کی وجہ سے بے تکان اسی سمندر میں چھلانگ لگوا دی جس میں وہ دوسروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر غرق کرتا رہا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ـــ ...... جنسی مسائل کی عکاسی بھی زندگی کے ایک بنیادی مسئلے کی عکاسی ہے۔ یہ ادب بھی ہے اور زندگی کی بھی لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ ساری زندگی نہیں ہے۔ بڑی زندگی بھی نہیں ہے۔ اور بڑی زندگی اور صالح زندگی کے ہر تصور میں جنسی

میلانات کی تہذیب ضروری ہے۔ اس لئے افسانوں کی کثرت اور اس قسم کے افسانوں کی کثرت جو فنی نقطۂ نظر سے بلند سہی اور اعلیٰ ادبی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے ایک خطرہ ضرور ہیں۔

(ترقی پسند تحریک ۔۔۔ آل احمد سرور)

مگر منٹو اس حقیقت سے ہمیشہ گریزاں رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے اپنے فن کو جدت پسندی پر کلیتاً قربان کر دیا۔ اور اس کے افسانے ایک وقتی ہنگامہ آرائی اور گرمیٔ محفل کے علاوہ کوئی دیرپا اثر نہ چھوڑ سکے۔ اور بقول پروفیسر وقار عظیم "یہ چیز افسوس ہے کہ اُس کے فنی انحطاط کی واضح دلیل ہے۔" کیونکہ

منٹو کو غالباً اس بات کا احساس اور اندازہ ہے کہ زندگی پر اور اُس سے بھی زیادہ فن پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ اُس کے اختیار میں خیالات اور جذبات پورے خلوص کی قوت اور شدت باقی نہیں رہی اس لئے اُسے یہ کمی کسی اور طرح پوری کرنی چاہیے۔ یا ممکن ہے کہ یہ کمی اس کے ارادہ اور کوشش کے دخل کے بغیر ہی پوری ہو رہی ہے۔ فطرت نے ایک قوت سلب کر کے دوسری کو زیادہ ابھارنے میں اپنے ایک قانون کی پیروی کی ہے۔

(تقسیم کے بعد منٹو کے افسانے ۔۔۔ پروفیسر وقار عظیم)

بہرحال اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اُس نے گرے ہوئے لوگوں کو کثرت سے اپنا موضوع کیوں بنایا؟ ۔۔۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو لذتیت اور عریانی کے ان طول طویل تذکروں کے لئے کوئی موقع فراہم نہ ہوتا جن سے وہ اپنی نجی زندگی میں لطف اندوز ہوتا رہا، اور جن کو وہ اس لئے اختیار کئے رہا کہ وہ سماج کی برائیاں ہیں۔ اُسے یقین تھا کہ جس طرح وہ ان برائیوں کو پیش کر رہا ہے اُس طرح اُن کا قلع قمع نہیں ہو سکتا ہے چنانچہ خود وہ بھی ہر طرح کی گرفت سے آزاد ہو جائے گا۔ اس نے اس لئے اپنے کرداروں کے لئے پست زبان، گندہ طبیعت، مریضانہ جذبات اور ناپسندیدہ عادات کو منتخب کیا کہ اس طرح نہ تو اس کو اپنے فن کے لئے ریاض کرنا پڑے گا اور نہ کسی صنعت یا وصف کے لئے اُسے کوئی ایسا تجربہ کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے معمولات کو تبدیل کرنے کے لئے مجبور ہو جائے۔ فن میں اُس نے جو کچھ کمایا ہے وہ سب اس کی نجی زندگی سے مکتسب تھا چنانچہ وہ فن کا بھی پورا حق ادا نہ کر سکا۔ اُسے جب یہ محسوس ہوا کہ اب توجہات اُس کی طرف سے ہٹنے والی ہیں تو اُس نے اپنے اندر کشش پیدا کرنے کے لئے تمام حقیقتیں کر ڈالیں۔ یہاں تک کہ ہیجان انگیز اور جذبات کو پراگندہ کرنے والے موضوعات کو اختیار کر کے اُس نے انتہائی فکری گراوٹ کو بھی قبول کر لیا۔

منٹو کی موجودہ دور کی افسانہ نگاری فن کے نقطۂ نظر سے باتیں بنانے یا زیادہ سے زیادہ ایسی بازی گری اور شعبدہ بازی کی افسانہ نگاری ہے جس میں ایک تجربہ کار کھلاڑی اپنے کرتب دکھا دکھا کر دوسروں کو خوش کرنے میں مصروف ہے۔ اس بازی گری اور شعبدہ بازی میں وہ اکثر ایسا مدہوش ہوتا ہے کہ اُس کا سارا جسم حرکت میں ہوتا ہے اور وہ کرتب دکھاتا رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی جب وہ اپنے آپ کو عارضی کشش کے ان پھندوں سے چھڑا لیتے تو اس کی ذہانت، تخیل اور تصور کے جوہر ابھر کر ہر چیز پر چھا جاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسے لمحے کم آتے ہیں اور دیر دیر میں آتے ہیں اور بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شخصیت کے متضاد عناصر کی اس کشمکش میں وہ عنصر آہستہ آہستہ مغلوب ہو رہا ہے جو فن میں ٹھہراؤ اور استقلال پیدا

(باقی پر ص ۲۴)

ڈاکوؤں کی بستی

اسعد گیلانی

۲۴ اکتوبر ۵۴ء کو اتوار کے روز صبح نو بجے لئی ندی کے کنارے ایک جھلسے ہوئے بڑے کہن سال درخت کے ٹہنے سے لٹکی ہوئی ایک نوجوان لڑکی کی لاش پائی گئی۔

شہر سے نکل کر بستی کی طرف جاتے ہوئے ایک چرواہے کی نظر اس پر سب سے پہلے پڑی۔ اس نے اپنی بھیڑ بکریوں کو اس درخت کی طرف جانے سے روک دیا اور اپنے لمبے لٹھ سے جلدی جلدی ہانک کر دوسری طرف لے گیا۔ اسے خوف تھا کہ کسی نے اسے وہاں دیکھ لیا تو نہ جانے بعد میں بڑی زبردست پٹائی ہوگی اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ ہو جائے۔ اس طرح نو بجے تک بیسیوں راہگیروں نے اسے دیکھا لیکن ہر شخص وحشت زدگی کے عالم میں کن انکھیوں سے آسمان و زمین کے درمیان اس نوشتۂ اجل کو معلق دیکھتے ہوئے پہلو بچا کر دھڑکتے دل کے ساتھ گزر جاتا رہا۔ یہاں تک کہ اسکول کے کچھ بچوں نے اسے دیکھ کر وہاں جمگھٹا لگا دیا اور پھر تو پولیس کا ایک سپاہی بھی ٹہلتا ٹہلتا وہاں آ نکلا۔ پہلے تو اس نے بھی دل دہل جانے کے انداز سے آگے کی طرف قدم بڑھا دیئے لیکن اچانک نہ معلوم اسے کیا خیال آیا کہ اس نے زور زور سے سیٹی بجائی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہاں سپاہیوں اور راہگیروں کے ہجوم میں وہ نامعلوم لڑکی جس نے کرۂ ارض کو اپنے نیچے سے پرے دھکا دیا تھا زمین کی سنگین چھاتی پر پڑی تھی۔ ریشمی دوپٹے سے کھنچ کر گردن کافی لمبی ہو گئی تھی۔ آنکھیں باہر ابل آئی تھیں اور جسم اکڑ کر تختہ بن گیا تھا۔

درخت کے پاس [illegible] کا ایک چھوٹا سا اٹیچی پڑا تھا۔ ایک ٹارچ تھی، ایک شال اور چند کتابیں تھیں جن پر یہ لکھا ہوا تھا۔

"زرینہ خداداد۔ تھرڈ ایئر سٹوڈنٹ۔ محافظ ملت کالج جہلم"

اٹیچی کے اوپر کتابیں رکھ کر کتابوں پر ایک لفافہ نمایاں طور پر رکھا ہوا تھا۔ جسے پیپر ویٹ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ خط رکھنے والے نے اسے یوں رکھا تھا کہ جیسے اس سارے المیہ ڈرامے کا راز اس خط کے سینے میں بند تھا اور جسے اس راز کو سمجھنا ہو کہ اس درخت کے ساتھ وہ لڑکی کیوں معلق تھی اور اس نے زندگی کے اکیس سال گن گن کر گزار دینے کے بعد اچانک یہ فیصلہ کیوں کیا تھا کہ اس ظلمت کدۂ دہر سے اپنا دامن جھاڑ کر اُٹھ جائے تو وہ اس خط کو احتیاط سے کھولے۔ اطمینان سے پڑھے اور اس لٹکتی ہوئی لاش پر حیرت کی نظر ڈالنے کی بجائے سنجیدگی سے سوچے۔ زندگی جس رُخ پر بھی چلی جا رہی ہے اس کے متعلق کچھ فیصلہ کرے کہ کیا اسے بھی یہی رُخ پسند ہے۔ وہ جو اکڑی ہوئی لاش بڑے درخت کے ٹہنے کے ساتھ معلق ہو گئی تھی تو در اصل وہ فضائے کائنات میں اس انسانی معاشرے کے سامنے ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑی تھی۔ وہ معاشرہ جس نے اسے پیدا کیا پالا۔ پوسا۔ بڑا اور سمجھدار کیا۔ بھلے بُرے کی تمیز پیدا کی اور جب وہ بھلے برے کو سمجھنے کے قابل ہوئی تو اسے ناگن کی طرح نگل لیا۔

پولیس کے ہاتھ میں سب سے پہلے وہ خط ہی آیا۔ جس نے ساری کہانی پر سے پردہ اٹھا دیا لیکن وہ خط شائع نہیں ہوا۔ صرف اس خودکشی کی ایک مختصر سی خبر اخبارات میں آ گئی۔ اور لاش پوسٹ مارٹم کے بعد زمین کے کسی گوشے میں دفن کر دی گئی۔

موقعہ پر آنے والے سپاہی نے اس وقت جائے وقوعہ کے پاس ذرا رک جانے والے ایک شناسا راہگیر کو وہ خط سنایا جو اس لڑکی کے درخت کے

ساتھ لکھنے سے پہلے اپنے ملک کے بلند ترین آدمی کے نام لکھا گیا تھا لیکن جس خط کا مخاطب اس کے ملک کا ہر شہری تھا۔ سپاہی نے اپنے پنجابی آبزرور لئے ملی جو خط درج کیا وہ یہ تھا۔

صدر جی

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے آپ کو کسی درخت کے ٹہنے سے دوپٹے کے ساتھ لٹکا کر مار دوں گی اس لئے کہ میری زندگی اب میرے بھائیوں اور میرے ماں باپ کے لئے ایک زندگی بھر کا ناسور ہو گی۔ میں مر جاؤں گی تو وہ رو دھو کر چند دن کے بعد مجھے بھول جائیں گے اور جو کلنک کا ٹیکہ میری ذات کے [illegible] ان کے [illegible] ہے میں نے وہ فوجی آدمی ہیں لیکن اگر زندہ رہوں گی تو میں ان کے لئے اور ان سب کے لئے جو مجھ سے [illegible] وابستہ ہوں کے چلتا پھرتا عذاب ہوں گی۔ لوگ میری طرف انگلیاں اٹھائیں گے۔ سرگوشیاں ہوں گی۔ میں نے یہ سب کچھ [illegible] کر لیا ہے۔ موت کو [illegible] دیتے ہیں کوئی جذباتی [illegible] ہے۔ میں نے ٹھنڈے دل سے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے میں [illegible] اس [illegible] سے جس پر ہمارا [illegible] ہے یا اس نظام کے جس کے آپ سربراہ کار ہیں

آپ [illegible] اور اس [illegible] آپ اپنی قوم کے نوجوانوں کے لئے باپ کی جگہ ہیں میں آپ کو [illegible] مخاطب کر رہی ہوں [illegible] میرے مخاطب [illegible] آپ [illegible] غیرت و حمیت کا خون اسی طرح کھولے جس طرح ایک باپ کا [illegible] مجھے آپ کی ذات سے نہ کوئی حسن ظن ہے اور نہ سوئے ظن ہے [illegible] آپ کو [illegible] اس لئے یہ خط آپ کو ایک بیٹی کی حیثیت سے لکھ رہی ہوں۔ [illegible] اس لئے [illegible] آپ کے [illegible] آپ کے سینے پر چمکے اور آپ [illegible] آپ کی اپنی بیٹیوں کی عزت پر بھی ہاتھ ڈالنے شروع [illegible]۔

اب [illegible] اپنی [illegible]۔

[illegible] میرے باپ کا نام خدا داد خاں ہے اس سے زیادہ [illegible] اس کے [illegible] وہ کس نسل سے تھی۔

میں [illegible] اس ماحول میں رہی کہ جس میں شرافت اور شرافت نسب کی بڑی اہمیت تھی [illegible] اور اگرچہ ظاہری دینداری کا [illegible] تھا لیکن ایک عام مسلمان گھرانے کی طرح [illegible] شرافت [illegible] پوری موجود تھی [illegible] کا احترام اور برائی سے دوری اور اس سے نفرت خود بخود موجود ہوتی ہے اور یہ احتمال ہے کہ ہمارے ملک کی ہر لڑکی ایسے ہی ماحول میں اپنے ابتدائی ایام گزارتی ہے۔

مجھے دسویں تک اپنی سوسائٹی کی برائیوں کی سن گن بھی نہ تھی۔ مجھے یہ تک خبر نہ تھی کہ ہمارے معاشرے کی اونچی سطح پر عورتوں میں خود نمائی ایک بیماری کی طرح گھس گئی ہے اور ہوسناکی مردوں کے سینوں میں متعفن سانس کی طرح چل رہی ہے۔ ماحول سے بالکل بے خبر اور حالات کی حقیقی صورت سے قطعی ناواقف میں نے کالج میں قدم رکھا۔

میرے والد ملٹری سروس میں اونچی جگہ پر تھے۔ انہیں مجھے کالج تک پڑھانے کا بہت شوق تھا چنانچہ مجھے انٹرمیڈیٹ کالج برائے مستورات میں داخل

کر دیا گیا۔ یہاں آکر مجھے بعض باتیں بہت کھٹکیں۔ نہ صرف کھٹکیں بلکہ میرے دل میں کانٹے سے چبھ گئے۔ میری روح بے چین [illegible] اور مجھے لڑکیوں کے اس کالج میں آکر اچانک محسوس ہوا جیسے چلتے چلتے سربازار میرا نقاب الٹ گیا ہو۔ میرا لباس میرے جسم پر نا کافی رہ گیا ہو۔ یہ ساری کیفیت خالص لڑکیوں کے اس کالج میں پہلے ہی ہفتے میں میں نے محسوس کی اور میں بڑی بُری طرح پریشان رہی۔ عجیب عجیب باتوں کا انکشاف ہوا۔ مجھے معلوم ہوا کہ لڑکیاں باہم کچھ عجیب عجیب رومانٹک ناموں سے بلاتی ہیں اور ان کے بلانے کا انداز بڑا ہی معیوب اور [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] عجیب عجیب انداز سے پیش آتی ہیں۔ بعض لڑکیاں [illegible] اس طرح ایک دوسرے کے لئے جذبات محبت کا اظہار کرتی ہیں جیسے [illegible] یہ عجیب سی صورت حال تھی جس سے مجھے سابقہ پیش آیا۔ ان دو سالوں میں میں نے اندازہ لگایا کہ ان تعلیم گاہوں میں [illegible] اخلاق کا [illegible] اس طرح توڑ پھوڑ دیا جاتا ہے کہ جو کردار وہاں سے ڈھل کر نکلیں ان سے کسی [illegible] ہی افعال سرزد ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں اس ماحول سے اپنی کم گوئی اور کم آمیزی کی وجہ سے زیادہ متاثر نہ ہوئی۔ ایک اور بات ہے کہ دو سال کے [illegible] نے مجھے اپنے ماحول کا عادی بنا دیا لیکن میں نے اسے قبول نہ کیا۔ یہ غنیمت ہے کہ میں ہوسٹل میں نہیں رہتی تھی [illegible] ہوسٹل میں جانے سے [illegible] اور جو باتیں میں نے سنیں وہ ایسی تھیں کہ ایک غیرت مند [illegible] شریف [illegible] زیادہ پسند کرے۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد لڑکیوں کا کوئی ڈگری کالج نہ تھا [illegible] استعمال کیا کہ لڑکیوں کا انٹرمیڈیٹ کالج ہی [illegible] گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے مخلوط تعلیم کے لئے لڑکوں کے کالج میں ہی داخل کرا دیا جائے [illegible] گھر بیٹھا کر کیا کریں۔ پڑھنی رہو اپنی باری سے۔

اور پھر میں مخلوط تعلیم کالج میں داخل ہو گئی

کہ یا کوئی سیاہ جانور جیسے گھر میں آ گیا [illegible] اور تین لڑکیاں [illegible] ایک [illegible] وہ تو جیسے [illegible] تھے۔ [illegible] سے جھکی جھکی ہوئی آنکھیں [illegible] کی طرح چہروں پر [illegible] ہوئی محسوس ہوتیں [illegible] بہت محدود نہ تھیں [illegible] ایک مخصوص ذہنی [illegible] کرتے۔ [illegible] لیکن گھر والوں نے ترقی اور تعلیم کے شوق میں میری ایک نہ سنی [illegible] آپ کو بے لباس محسوس [illegible] گویا کچھ ہو ہی نہ گیا ہو۔ جن باتوں کے تصور سے مجھے [illegible] محسوس ہوتی تھی وہ باتیں یہاں روز ملتی تھیں [illegible] آپ کو [illegible] سینما کے گانے ہیں [illegible] جاتے اور بات کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی بے وجہ بہانہ [illegible] جاتا [illegible] کیا کہ ہماری کیفیت ایسی تھی جیسے بھوکے کتوں کے آگے چند ہڈیاں پڑی تھیں۔ بلیوں کے سامنے چند چھیچھڑے پڑے تھے [illegible] کے سامنے بندھی ہوئی چند [illegible] پڑی تھیں۔ بے زبان خاموش اور مسلسل کچوکے دیتا ہوا سارا ماحول۔

تیسرے سال کے پانچویں مہینے مشاہدہ ڈگمگا گئی۔ اس پر نگاہیں اٹھنے لگیں اور وہ بھی اتنی بیباک ہو گئی کہ کسی معمولی طالب علم کے لئے اس کے منہ لگنا آسان نہ رہا۔ نسرین کی شادی ہو گئی اور وہ چھوڑ کر چلی گئی۔ میں ماحول کے خلاف مسلسل کشمکش کرتی رہی البتہ میں نے اندازہ لگایا کہ اس ترقی یافتہ زمانے میں پردہ میں رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور جب مردوں کے دوش بدوش [illegible] کشمکش حیات میں [illegible] پردہ محض ایک رکاوٹ

ہے جو باقی نہیں رکھی جا سکتی۔ البتہ اخلاقی اقدار کی ہمیشہ سختی سے قائل ہی بلکہ پابند رہی۔ میں نے اس دوران میں یہ اندازہ لگایا کہ اگر کوئی لڑکی موم کی گڑیا بن کر رہے اور کسی نہ کسی صورت خود نمائی کے مرض میں مبتلا ہو جائے تو پھر اس کے لئے صفائی سے چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ سادگی، کم آمیزی اور دلچسپی بہت کچھ ڈھال کا کام دیتی ہیں۔

اب میں آپ کو اپنی زندگی کا اختتامی منظر دکھاتی ہوں!

پرسوں امی نے بتایا کہ خالہ جان کا پشاور سے خط آیا ہے۔ وہ بیمار ہیں اور انہوں نے ملاقات کے لئے ہمیں بلایا تھا۔ امی نے مجھے کہہ دیا کہ میں ہی پشاور جا کر خیریت معلوم کر آؤں۔ بڑے بھائی کسی امتحان کی تیاری میں مصروف ہونے کی وجہ سے موجود نہ تھے اور چھوٹا بھائی اپنی کچھ دوسری مصروفیتیں رکھتا تھا۔ میں تنہا پشاور جانے کے لئے تیار ہو گئی اگرچہ بچپن ہی سے میں کئی مرتبہ پشاور اپنے والدین اور بھائیوں کے ساتھ خالہ کے ہاں گئی تھی البتہ تنہا میرا یہ پہلا سفر تھا۔

امی نے بھی نہ روکا۔ وہ بھی آپا کی طرح تنہا سفر کو ترقی کا لازمی جزو سمجھتی تھیں۔ میں چھوٹا اٹیچی اور چند کتابیں لے کر بعد دوپہر روانہ ہو گئی شدید گرمی میرے سر پر منڈلا رہی تھی جس گاڑی پر روانہ ہوئی وہ راولپنڈی تک آ کر ختم ہو جاتی تھی اور اسٹیشن پر دو گھنٹے کے انتظار کے بعد دوسری گاڑی ملتی تھی۔

اب مجھے دو گھنٹے تک پلیٹ فارم نمبر ۲ پر پشاور کی گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ میں اپنا سامان اٹھا کر ایک کونے میں بچھے ہوئے بنچ پر آ کر بیٹھ گئی اور اٹیچی پاس رکھتے ہوئے ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ہی سارا پلیٹ فارم آنے والی گاڑی کے مسافروں سے خالی ہو گیا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ اور بتیاں جلنے لگی تھیں۔ میں بالکل تنہا تھی۔ ایک ویران پلیٹ فارم پر بیٹھی ہوئی اپنے دل میں ایک عجیب گھٹن سی محسوس کر رہی تھی۔ تنہائی، اداسی اور [illegible] انتظار کی لامتناہی گھڑیاں۔ ایک عجیب سا سناٹا پن میرے چاروں طرف فضا میں منڈلا رہا تھا۔

مجھے بیٹھے ہوئے پون گھنٹہ ہوا تھا جب ایک بوڑھیا عورت میرے قریب آئی اور کھڑی ہو کر میرے اٹیچی کو گھورنے لگی۔ پھر اس نے اسے ہاتھ سے چھوا اور ذرا اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور اسے بتایا کہ اماں یہ اٹیچی میرا ہے۔

"اے ہے بیٹی ابھی تو ایسا ہی ہے۔ ابھی ابھی میرے پاس سے کھو گیا ہے" اس نے تنک کر کہا۔

"مجھے آپ کے اٹیچی کی خبر نہیں ہے۔ یہ تو میرا ہے" میں نے ذرا نرمی سے کہا

"اری میرے اٹیچی کو اٹھا لائی ہے اور اب بن ٹھن کے بیٹھی ہے" بڑھیا نے چیخ کر کہا

اتنے میں ایک سفید پوش شخص جو بالکل پولیس کے سپاہی جیسا نہیں ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔

"کیا ہے بڑی بی کیا بات ہے؟" اس نے کہا۔

"یہ میرا اٹیچی اٹھا لائی ہے۔ اب جب سے پکڑ لیا ہے تو شوخی آنکھ سے ٹر ٹر بولتی ہے"

بڑھیا نے آنکھیں نکالیں۔ اتنے میں ایک اور شخص وہیں جو سفید لباس میں آ گیا

"ہاں یہ تو تمہارا ہی اٹیچی نظر آتا ہے۔ میں نے بھی تمہیں کچھ دیر پہلے تمہارے پاس دیکھا تھا" اس نے کہا بس میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

میں نے محسوس کیا جیسے یہ آپس میں ملے ہوئے ہیں

"دیکھئے صاحب یہ سوٹ کیس میرا ہے۔ میں جہلم سے آئی ہوں پشاور جا رہی ہوں۔ گاڑی کا انتظار ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پورے مہذب اور سنجیدہ انداز میں جواب دیا اس پر بڑھیا نے چیخ کر گالی دی اور وہ سوٹ کیس اٹھا لیا اور تھوڑی دیر میں شور و غل سن کر ایک باوردی سپاہی بھی وہاں آ گیا۔

"کیوں بے کیا شور مچا رکھا ہے" اس نے ڈانٹ کر کہا

"یہ چھوکری میرا اٹیچی اٹھا لائی ہے اور اب دیتی نہیں۔ دھونس جماتی ہے" بڑھیا نے کہا۔

"معاملہ تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے" سفید پوش آدمیوں نے بیک زبان کہا۔

"یہاں کسی کے باپ کی دھونس نہیں چلے گی۔ چلو سیدھی طرح تھانے میں فیصلہ ہو جائے گا" سپاہی نے چٹک کر کہا۔

اور سفید پوش آدمیوں نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔ بڑھیا نے میرا بازو پکڑ لیا اور سپاہی ڈنڈا ہلاتا ہوا [illegible] چل پڑا۔

"دیکھئے صاحب مجھے گاڑی پر جانا ہے۔ میں نے کسی کا سوٹ کیس نہیں چرایا۔ یہ میرا اٹیچی ہے۔ آپ لوگ میرا یقین کیجئے" میں نے گھبرا کر لجاجت سے کہا۔

"گاڑی واڑی دیکھی جائے گی۔ لوگوں کے سوٹ کیس اڑا کر گاڑی پر نہیں بیٹھا جا سکتا۔ تھانے میں سب معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے ایسے بہت کیس پکڑے ہیں۔ یہ بدمعاش گاڑیوں میں چوریاں کرتی ہیں۔ یہ نیا دھندہ نکالا ہے" سپاہی نے پھر کہا۔

میں جیسے رو دیتی۔ آنسو میرے حلق میں آکر رک گئے۔ میرا وہاں کوئی نہ تھا۔ میرا واقف نہ تھا اور چند منٹ میں لوگوں نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ وہ کشاں کشاں مجھے تھانے میں لے گئے۔

"کیوں بے نظام کے بچے یہ کیا معاملہ ہے" تھانے کے اندر بیٹھے ہوئے خوفناک مونچھوں والے تھانیدار نے کہا

"حضور یہ ایک نیا کیس ہے" نظام نے بھی تیز انداز میں کہا۔

"لاؤ تو اس نئے کیس کو ادھر۔ سب بل نکل جائیں گے" اس نے کہا۔

اور بڑھیا نے دھکیل کر مجھے تھانیدار کے سامنے کر دیا۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ پھر ایک شیطانی مسکراہٹ سے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں مبہوت انداز میں بیٹھ گئی۔

"بتاؤ اب تک کتنے اٹیچی چرا چکی ہو" تھانیدار نے میری طرف شیطانی آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں ایک بناوٹی غصہ تھا۔

"میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں جناب۔ پشاور جا رہی ہوں۔ جہلم سے آئی ہوں۔ یہ لوگ سازش کر کے مجھے دھوکا دینا چاہتے ہیں" میں نے عاجزی سے کہا۔

"یہاں سب سازشیں کھل جاتی ہیں۔ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوتا۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ [illegible] نظام تم ڈیوٹی پر جاؤ"

اور نظام چلا گیا۔ تھانیدار صاحب نے میز پر سر جھکا کر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ وحشت اور اضطراب سے میرے حواس باختہ ہو رہے تھے۔

"یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں کس چکر میں پھنس گئی ہوں۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں چرایا ہے۔ میں تنہا ہوں۔ اب آٹھ بج رہے ہیں۔ میری گاڑی آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ میری گاڑی نکل گئی تو کیا ہوگا" میں اپنے دل میں سوچتی رہی اور کانپتی رہی۔

اتنے میں وہ دونوں سفید پوش صاحب بھی سگریٹ سلگا کر پیچھے برآمدے میں تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر باہر نکل گئے اور پھر بڑھیا بھی کھانستی ہوئی اٹھی اور باہر نکل گئی۔

"تھانیدار صاحب خدا کے لئے میری بات سنیے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں چرایا ہے۔ میں تنہا ہوں۔ اب آٹھ بج رہے ہیں۔ میری گاڑی آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ میری گاڑی نکل گئی تو بہت مشکل ہو گی۔ آپ مجھے جانے دیجئے" میں نے پوری لجاجت سے کہا۔

تھانیدار صاحب نے یونہی سر ہلایا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ میں کانپ اٹھی۔

"ٹھہرو" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئے۔ میں نے احاطے کے دروازے کی چٹخنی لگنے کی آواز سنی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں آ گئے۔

"اچھا بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے بتا دیا۔ کہنے لگے نام تو اچھا ہے کام ایسے کرتی ہو۔

میں نے کہا "میں نے چوری نہیں کی۔ یہ سب جھوٹا الزام ہے۔ میں کالج کی سٹوڈنٹ ہوں۔ آپ میرے کالج میں لکھ کر پوچھ سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے جانے دیں۔"

"چوری تو کی ہے۔ [illegible] نہیں تو کسی اور چیز کی کی ہو گی۔"

"کسی چیز کی نہیں" میں نے وثوق سے کہا۔ مجھے کمرے کی فضا بوجھل محسوس ہو رہی تھی کھڑکی کی سلاخیں پنجرے کی تیلیوں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں اور میرے سامنے تھانیدار صاحب [illegible] اور نازیبا مسکراہٹ چہرے پر لئے کھڑے تھے۔

پھر اچانک وہ میرے قریب آ گیا۔

اس کی سانس میں نے اپنے رخساروں کے پاس محسوس کی۔

"[illegible] کوئی شخص اپنا جرم چھپا کر نہیں جا سکتا۔"

اور یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ [illegible] کر دیا۔ میں تھر تھر کانپ رہی تھی اور میری ٹانگوں میں دم نہ رہا تھا۔ وہ [illegible] کی طرح آنکھیں جھپکا جھپکا کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میرا جی چاہا کہ چیخوں مگر [illegible]

"[illegible] کو مال حوالے [illegible] دیا جائے گا۔"

اس سے [illegible] آنکھیں [illegible] ہاتھ [illegible]

[illegible]

[illegible] اس کا ہاتھ میرے منہ پر آہنی شکنجے کی طرح [illegible] میری زبان [illegible] میری گردن پر ایک [illegible] آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے۔ پھر [illegible] مجھے محسوس [illegible]

صرف یوں محسوس ہوا کہ [illegible] ایک [illegible] میں [illegible] جا رہی تھی وہ آگ سے بھرا ہوا تھا۔ آگ میرے [illegible] میرے جسم کو [illegible] رہے تھے۔ میں جیسے مرگئی تھی۔ میری [illegible] ناچ رہے تھے۔ میرے دل [illegible] زمین اور آسمان کے درمیان معلق تھی اور میرے نیچے [illegible] آتشیں گڑھے میں جلایا جا رہا تھا۔

کیسے کیسے خوفناک خواب میرے سینے پر ٹھوکریں مارتے رہے۔

میری جب آنکھ کھلی تو میں ایک بستر پر پڑی تھی۔ ایک تنگ سا کمرہ تھا جس کا ایک ہی دروازہ تھا اور وہ بھی بند تھا۔ میرا اٹیچی اور میرے کپڑے

نے تپائی پر پڑے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ میرے جسم پر کوئی دوسرا لباس تھا۔ آہستہ آہستہ میرے حواس ٹھکانے آنے لگے۔ واقعات منڈلا منڈلا کر
ے دل و دماغ میں ناچنے لگے اور تب مجھے پتہ چلا کہ میں لٹ گئی تھی، میں تباہ ہو گئی تھی اور میری زندگی میں سے پاکیزگی کا موتی جھلک کر ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے اٹھنا چاہا لیکن نقاہت سے جسم میں شدید درد محسوس ہوا — — لیکن میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے اندر گویا تیزاب بھر گیا تھا اور
میرے اعصاب کی جگہ گرم لوہے کے تار آ گئے تھے۔ ایک دیوانگی سی میرے اوپر طاری ہونے لگی

اچانک وہ دروازہ کھلا اور دوسرے کمرے سے وہ شیطان مسکراتا ہوا سامنے آ گیا۔

وہ شیطان۔ وہ بھیڑیا۔ وہ ظالم۔ وہ اچکا۔ وہ اوباش۔ وہ ڈاکو — حضور والا وہ آپ کا کارندہ۔ میرے سامنے آ گیا۔ گندی مسکراہٹ لئے ہوئے۔

میرا جی چاہا کہ اس پر پل پڑوں۔ اسے مار دوں یا خود مر جاؤں لیکن میں شل ہو گئی۔ میرے حواس بجا نہ رہے۔ میرا صرف یہ جی چاہا کہ زمین میں دھنس جاؤں۔

وہ میرے قریب آیا۔ اس نے میرا اٹیچی اٹھا کر میرے ہاتھ میں دیا۔ میرے کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دی اور کہا۔

" دیکھو زرینہ میرا نام عنایت شاہ ہے۔ راولپنڈی کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے۔ جب کبھی راولپنڈی آؤ تو میرا غریب خانہ نہ بھولنا۔ میرے علاقے میں کوئی مشکل پیش آئے تو بس عنایت شاہ کا نام لے دینا۔ اتنا ہی کافی ہوگا — جاؤ "

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور منہ اندھیرے جب کہ آسمان پر تارے ابھی چمک رہے تھے مجھے بازو سے پکڑ کر دروازے سے باہر کر دیا۔
اور اب میرے سامنے کوئی منزل نہ تھی۔

زمین پر میرا کوئی گھر نہ تھا اور آسمان پر اس فانی جسم کے ساتھ جانا ممکن نہ تھا۔ جدھر میرے قدم اٹھ گئے میں چلتی رہی اور سوچتی رہی۔

" خودکشی اچھی چیز نہیں ہے۔" یہ میں سوچتی رہی لیکن میں کہاں جاؤں۔ اب اس دنیا میں مجھے کون جانتا تھا۔ کون پہچانتا تھا۔ میں کس کو جانتی تھی۔ سبھی کچھ تو میرے لئے اچانک بدل گیا تھا۔ کیا گھر چلی جاؤں تاکہ بھائیوں کے سینے پر ایک گہرا ناسور بن جاؤں۔ وہ جب میری طرف دیکھیں تو انہیں احساس ہو کہ وہ غلاظت کے گندے گڑھے میں گر گئے ہیں۔ مجھ میں ان کا جنت جہاں تو دیکھنے کی ہمت نہ ہو۔ باپ کے ماتھے پر ایک مستقل کلنگ کا ٹیکہ بن کر لگ جاؤں۔ ماں کی راتوں کی نیند اور دنوں کا چین اڑا دوں۔ محلہ والوں کے لئے ایک تہمت بن جاؤں۔ عزیزوں کے لئے ایک گالی بن جاؤں۔ ایک چلتی پھرتی لاش بن کر تعفن پھیلاتی پھروں۔ کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ ڈاکوؤں کی اس بستی میں اب کیسے زندہ رہوں۔ درندوں کے اس جنگل میں کیسے سانس لوں جہاں میں اب کسی کی نہ بہن ہوں نہ بیٹی ہوں۔ نہ ماں ہوں — میں آخر کیا ہوں۔

جناب والا۔ آپ ہوتے تو میں خود آپ سے پوچھتی اور اب نہیں تو خدا کے ہاں جب یہ مقدمہ کھڑا ہو گا تب پوچھوں گی کہ آپ نے اپنی مظلوم قوم کو ڈاکوؤں کے حوالے کیا۔ ان کی عزتیں چوروں کے حوالے کیں اور ان کی آبروئیں اپنے اقتدار کے ترازوؤں میں تول تول کر بیچیں۔

میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب بھائیوں اور ماں باپ کو منہ نہ دکھاؤں۔ صبح ہونے والی ہے اور میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ جس زندگی پر ایک رات نے ڈائن کی طرح چھاپا مارا اب وہ زندگی سورج کی کرن نہ دیکھے۔ مجھے سورج کی شعاعوں سے بھی شرم آتی ہے جو صبح میرے باپ کے معصوم چہرے پر بھی کھیلیں گی اگر انہوں نے مجھے اس حال میں زندہ دیکھ لیا تو وہ کیا کہیں گی۔ یہ رات اگر اپنی تاریکی کا لبادہ سمیٹ کر آگے نکل گئی تو سورج کی درخشاں روشنی میں میں اپنی برہنگی کیسے چھپاؤں گی۔ یہ تارے اگر ڈوب گئے تو پھر میرا کون ساتھی رہ جائے گا۔

جناب والا! میں آپ سے صرف یہ پوچھتی ہوں کہ کیا آپ کی بھی کوئی بیٹی ہے۔ کیا آپ کی بھی کوئی بہن ہے۔ کوئی ماں ہے۔ اگر ہے تو ذرا سوچئے کہ اس ڈاکوؤں کی بستی میں جس کے سردار آپ ہیں وہ کیسے محفوظ ہیں اور اگر ان کے لٹ جانے کی خبر آپ کو کوئی آکر دے تو آپ کے سینے پر کیسے سانپ لوٹیں گے۔ کیسے خون کھولے گا۔ تب آپ کو اندازہ ہوگا کہ آبرو کا زخم کتنا گہرا ہوتا ہے —— میرے باپ نے تلوار کے زخم بارہا کھائے ہیں لیکن یہ زخم جو آپ کے ہاتھوں نے ان کو دیا ہے یہ ان کی برداشت سے باہر ہے۔ اس سے وہ جانبر نہ ہوں گے۔ اس لئے میرا ٹھکانا اب نہ زمین ہے کہ وہ ناپاک اور ذلیل لوگوں سے بھر گئی اور نہ آسمان ہے کہ اس کے پٹ میرے لئے بند ہیں اور وہاں تک میری پہنچ نہیں۔ صرف اس کہنہ سال اور رحمت کا ناتا ہے جس کے نیچے بیٹھ کر یہ خط لکھ رہی ہوں اور مجھے امید ہے کہ یہ کہنہ سال درخت جس نے بہت سے طوفان دیکھے ہیں ایک درد مند زندگی کو ضرور سہارا دے گا۔

اب میں اپنی داستان ختم کرتی ہوں اور اس وقت کے لئے جب یہ مقدمہ دوبارہ خدا کے حضور پیش ہو میں کائنات کے وسیع خلا میں اپنے بال کھیلائے اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتی رہوں گی۔

الوداع ... میرے ... ہمارے ... تمہاری گنہگار زرّیں سورج نکلنے سے قبل ہی تاریکی میں منہ چھپا کر ہمیشہ روپوش ہو جائے گی ... الوداع۔

زرینہ خداداد

یہ خط ... کو ملا تھا اور زرینہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد پرانے قبرستان میں انجمن اہل سنت والجماعت کے اہتمام میں دفنا دی گئی۔

آسمانِ ہستی سے ایک تارہ ڈوب گیا

منٹو کا فن شخصیت کے آئینہ میں

(تقسیم کے بعد منٹو کے افسانے — وقار عظیم)

... اب یہ بات کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے کہ منٹو کی فکری بےعملی اور ذہنی پراگندگی نے اُسے ٹھہراؤ اور استقلال سے یکسر محروم ہی رکھا۔ اُس کے پیش کردہ ادب کا سارا حصہ محض بیان انگیز اور جذباتی ہو کر رہ گیا۔ اس لئے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں اس نے اپنی شخصیت کے مختلف روپ بڑی بےباکی سے پیش کئے ہیں، لیکن اُس نے کوئی افادی ادب بلند تر اور اعلیٰ ادب بھی پیش کیا ہے محل نظر ہے۔ اور محمد حسن عسکری کے اس قول میں کہ منٹو ... کا اثر ہی اتنا تصور خود منٹو کا نہ تھا جتنا اُس ادبی روائت کا جس میں وہ پیدا ہوا ... معلوم ہونے لگتا ہے ... تصور تھا کہ وہ ... سال کے برابر پہنچنے کے بجائے اُس کی بدروح بن گیا۔"

انور ڈیرہ دوف

یہ نوجوان!

پرستارِ فلموں کا زینت کا عاشق — حیا کا عدو، بدشعاری کا حامی
سُدھیر اور سنتوش کا روپ دھارا — سراپا بنا معصیت کا پیامی
بہت خوش گلو فلمی گیتوں کا راگی — ہے روداد فرہاد و مجنوں بھی از بر
صبیحہ کے حسنِ دل آرا کی باتیں! — سناتا ہے جوشِ محبت میں آکر
تصاویرِ عریاں کا البم بغل میں — بڑی تمکنت سے دبائے ہوئے ہے
بد اندیشِ ابلیسیت کے جنوں میں — شرافت کے پرزے اڑائے ہوئے ہے
مئے عیش و عشرت میں مدہوش ہو کر — خراباتِ دنیا کو اپنا رہا ہے
بڑے ذوق سے رقص کی محفلوں میں — وہ اجداد کا نام چمکا رہا ہے
یہ تہذیبِ مغرب کی گل کاریاں ہیں — بزرگوں کو احمق بتانے لگا ہے
جنھیں کچھ عقیدت ہے مذہب سے ان کو — سبق دہریت کا پڑھانے لگا ہے
حریفِ صداقت! طرفدارِ باطل! — حمیت سے محروم، غیرت سے خالی
وہ دین و شریعت کا قائل نہیں ہے — سرِ بزم واعظ کو دیتا ہے گالی
گناہ گارِ تہذیب و آداب ہو کر — بلندیٔ کردار سے گر چکا ہے!
نکل کر تقدس کی حدِ یقیں سے — ہجومِ خرافات میں کھو گیا ہے
نہیں علم قومی پریشانیوں کا — وطن کی حقیقت سے ناآشنا ہے
مگن ہو کے دنیا کی رنگینیوں میں — تعیش کی تانیں اڑانے لگا ہے
جسے ذوقِ شمشیر کا چاہیے تھا — چلاتا ہے میداں میں کرکٹ کا بلّا
وطن فکرِ آئین میں گھل رہا ہے — مگر اس کے نزدیک ہے خیر صلّا

شبنم سبحانی

غزل میں اشاریت

(ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں ادارۂ ادبِ اسلامی ٹانڈہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے ایک سمپوزیم میں جس میں غزل میں اشاریت کے مسئلے پر تحریری و تقریری طور سے روشنی ڈالنے کے لئے اہم تعمیر پسند فنکار شریک ہوئے تھے، یہ مقالہ پیش کیا گیا۔)

اشاروں میں بات کرنا انسان کی فطرت میں روزِ ازل سے داخل رہا ہے۔ وہ دورِ وحشت و بربریت سے لے کر آج تک اس متمدن اور ترقی یافتہ عہد تک اپنی تحریر و تقریر اور گفت و شنید میں اس کا سہارا لیتا آیا ہے۔ قدرت نے یہ وہ فطری وسیلہ انسان کو عنایت کیا جس کے ذریعے وہ اپنے ماحصل کو پُراثر لہجے اور مختصر انداز میں ادا کر سکے۔ آج ہم اپنی سماجی اور اجتماعی زندگی کا جائزہ لے کر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری روزانہ کی زندگی میں قدم قدم پر لمحہ بہ لمحہ اشاروں اور رمز و کنایہ کا کیا رول ہے۔ آج تو وقت کی بڑھتی ہوئی اہمیت و قیمت کے پیشِ نظر اس کی افادیت، مقبولیت اور اہمیت اور بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری اجتماعی اور شہری زندگی SYMBOLS اور TOKENS پر کتنی زیادہ منحصر ہو گئی ہے۔ یہ اشارے اور کنایے ہماری ذہنی اور فکری زندگی کے اہم اجزاء بن گئے ہیں جن کے بغیر انسان اس میدان میں مفلوج اور بے دست و پا بن کر رہ جائے۔

اشاریت سے کلام میں ایک گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اشارے بات کو جاندار اور گفتگو کو پُرلطف، مؤثر اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ پردہ پوشی اور رمز و ابہام سے انسان کو فطری طور سے لگاؤ رہا ہے[1]۔ انسان نے ہمیشہ اپنے جسم کی سجاوٹ، مکانوں کی تعمیر اور زندگی کی دوسری اشیا کی تخلیق کے سلسلے میں اس ذوق کا مظاہرہ کیا۔ فنِ تعمیر، فنِ رقص و موسیقی اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں یہ پردہ آرائی اور اشاروں اشاروں میں ایک پوری داستان کہہ جانا رائج رہا ہے۔ ہم آج بھی اپنی روزمرہ گفت و شنید اور خط و کتابت پر نظر ڈال کر یہ جان سکتے ہیں کہ بات کو ادھورا[2] کہنا ہمیں کتنا بھاتا ہے ——— اشارے کنائے اس کے دل میں ایک حرکت، تلملاہٹ اور گدگدی سی پیدا کر دیتے ہیں۔ آسمانِ نطق پر ٹمٹمانے والے یہ تارے عجیب چیز ہیں، جو کبھی اس کی راہنمائی کرتے ہیں، کبھی اسے پیچ و تاب کا شکار بناتے ہیں۔ کبھی ان اشاروں نے زندگی کی کسی تلخ حقیقت سے انسان کو روشناس کرایا ہے اور کبھی اس کے سونے سنسار میں سنہری کرن بن کر چمکے ہیں۔ کبھی یہ تیرِ نیم کش اور کبھی خنجرِ بے نیام بن کر پیوست ہوئے ہیں۔ کبھی انہوں نے انسان کو مخمور بنا دیا ہے اور کبھی بیدار تر۔ کبھی اسے ذہنی و فکری بھول بھلیوں میں ڈال دیا ہے اور کبھی ایک روشن اور درخشاں شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے۔

---

[1] اشاریت و رمزیت ایک ایسا سمندر ہے جس میں مخاطب کو خود غواصی کر کے موتی نکالنا پڑتے ہیں اور جن موتیوں کے حصول میں اس کی اپنی محنت صرف ہوتی ہے .... ان کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں میں بڑھ جاتی ہے۔ (ن۔ص)

[2] ادھورا پن: رمزیت و اشاریت ادھورے پن کا نام نہیں بلکہ وہ ایک ایسا اسلوب ہے جس میں کسی معنی کی چند اہم ترین کڑیاں اس طرح سامنے لائی جاتی ہیں کہ مخاطب آسانی سے باقی کڑیوں کو جوڑ کر ایک سلسلۂ معنی کی تکمیل کر لیتا ہے۔ ادھوری بات وہ ہوتی ہے جس کو سن کر مخاطب محسوس کرتا ہے کہ متکلم کے ذمے قول کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے۔ اشاریت میں یہ احساس نہیں ہوتا۔ (ن۔ص)

انسان کی اعلیٰ فکری اور ذہنی کاوشیں جو صفحہ قرطاس پر آتی رہی ہیں ان کا جائزہ لے کر آپ دیکھیں گے کہ ان پر ان کے فطری اور نفسیاتی رجحانات کا ایک گہرا عکس پڑا ہے۔ دنیا کے تمام ادبی اور فکری کارناموں میں اشاروں اور کنایوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ کہیں بھی ان کا فقدان نہیں یہ مخصوص اشارے اور کنایے جو زیب تحریر و تقریر بنتے ہیں مختلف حالات، مختلف آب و ہوا، مختلف قدرتی، تمدنی، اجتماعی فضاؤں کے زیر اثر مختلف قوموں اور ملکوں کے گہواروں میں الگ الگ انداز سے پروان چڑھتے ہیں ـــ ان پر تہذیب و تمدن اور کلچر کا گہرا رنگ چڑھتا ہے۔ یہ قوم و ملک کے ذہنی، فکری اور عملی میلانات TENDENCIES کی طرف غمازی کرتے ہیں۔ یہ کسی ادب اور زبان کے تمام نشیب و فراز اور پورے تاریخی زیر و بم پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ آج دنیا کی ہر زبان، دنیا کا ہر ملک اپنے چند مخصوص اشارے اور کنائے رکھتا ہے۔ یہ اسی وقت سمجھے جا سکتے ہیں جب کہ اس ملک کی تہذیبی اور روحانی تاریخ میں غوطہ زنی کی جائے، وہاں کی ماسبق تاریخ کا جائزہ لیا جائے، وہاں کے مذاہب اور سیاسی انقلابات پر نظر ڈالی جائے۔

اشارے اور کنایے غیر ارادی طور پر جنم لیتے ہیں اور غیر شعوری طور پر مٹ جاتے ہیں۔ ان کو مقبول عام بنانے میں کسی ایک فرد کا ہاتھ نہیں ہوتا۔ صدیوں کی تراش خراش کے بعد یہ زبانوں پر چڑھتے اور کسی ملک و قوم کے تہذیبی سوگن بنتے ہیں۔ ایک فلم کار، ایک فنکار اور ایک خطیب ہی انہیں اپنی تحریر و تقریر میں نہیں اپناتا بلکہ یہ بازاروں میں، گھروں میں، دفتروں میں اور دوکانوں پر جا بجا بولے جاتے ہیں۔ یہ اپنے اندر معنی کا ایک طوفان پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ان کو اختصار اور تراش خراش کا جمال ان ترشے ہوئے ہیروں کی مانند کر دیتا ہے جو ہر مقام پر اپنی تابانی اور حسن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

شاعری کی بنیاد سراسر انہی اشاروں اور کنایوں پر ہے۔ جذبات کی عکاسی میں اور ما فی الضمیر کی ادائیگی میں یہ بے مثال سہارا بنتے ہیں۔ بالخصوص غزل کی تو ساری عمارت انہیں پر استوار ہے۔ غزل کی دنیا میں اب تک رمز و ایما کے ان گنت پھول کھلے ہیں اور اشاریت و کنائیت کے بے حساب موتی برسے ہیں۔ غزل جیسا کہ عام طور پر کہا اور سمجھا جاتا رہا ہے، ایک پُر اسرار آرٹ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی رہی ہے کہ دریا کو ... ... دیا جائے، یعنی ایک شعر کی محدود فضا میں سارے عالم رنگ و بو کی جھلک دکھائی جائے۔ الفاظ و معنی کے حسین امتزاج کے ساتھ زندگی کی کسی اہم حقیقت کو اجاگر کرنا اور انسان کے تہذیبی، جذباتی اور فطری رجحانات کی عکاسی کرنا بہت نازک اور سنجیدہ کام ہے۔ غزل کے لئے ان وسیع موضوعات کو اپنے تنگ دامن میں لینا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے اور وادی میں رمزیت، ایمائیت اور اشاریت و کنائیت شاعر کو سہارا فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں غزل نے اپنے مزاج کے موافق اشارے اور کنائے ڈھالے ہیں جس نے ایک مخصوص عمارت ان کے ذریعے سے تعمیر کی ہے۔ اس نے ایک وسیع ذخیرہ مہیا کیا ہے۔ غزل نے اپنی امتیازی مقناطیسی قوت کی مدد سے انسانی سوسائٹی میں رائج اشاروں اور کنایوں کو اپنی طرف کھینچ لیا جو اس کے لئے قابلِ استعمال تھے۔ اس نے جو بھی خاکہ تیار کیا انہیں کی مدد سے! اس نے جو بھی پیغام دنیا کو دیا انہیں کے ذریعے! ان کے ذریعے غزل نے اپنے اندر وسعتِ بیکراں، سوزِ لاجواب اور کیفِ جادواں پیدا کیا۔ غزل کی ریزہ کاری اور مینا کاری کو اگر قدر و قیمت بخشی ہے تو انہیں اشاروں نے ہی ـــ غزل میں نشتریت، سوز و گداز اور حرارت کی صفات انہیں کے اثر سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ ہمارے لئے دل کی وادیوں میں گونجنے والے نغمات کے اظہار میں وسیلہ بنتے ہیں۔ یہ ہمارے ذہنی تجسس اور فکری پرواز کے ذوق کو جلا بخشتے ہیں۔

ویسے اب تک غزلوں میں اکثر رمز و ابہام اور اشاروں کے ذریعے ڈاکٹر یوسف حسین کے الفاظ میں زندگی کے ایک طلسماتی عنصر کی تلاش کی گئی ہے اور لاشعور کی دور دراز وادیوں کی سیر کی گئی ہے۔ اس جہان رنگ سے دور اور اس انسانی پیکرِ خاکی سے ماورا ایک نئی کائناتِ عشق و محبت بسائی گئی ہے بات کو پیچیدہ اور الجھی ہوئی بنا کر پیش کرنے میں بڑی خوبی محسوس کی گئی ہے اور اکثر بقول بشیر انور کے الفاظ میں حسن کاروں نے اپنی فکری

کمی کو اشاریت کے دامن میں چھپانا چاہا ہے اور ایک گونہ ذہنی بے راہ روی کا مظاہرہ کیا ہے، بلکہ زندگی کو ایک طلسم ہوش ربا بنا کر رکھ دیا ہے — پھر بھی غلطی اشاریت کی نہیں، ہمارے فن کاروں کے فکری خلا اور نظریاتی دیوالیہ پن ہی کا سارا قصور ہے۔ دراصل جب بھی کسی خاص مقصد نظریہ، اور دل کی لگن اور جستجو کے بغیر قلم حرکت میں آئے ہیں تو اسی قسم کے کاغذی بے روح پیکر صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوئے ہیں — جب بھی شاعری اظہارِ فن کا ذریعہ بنی، جب بھی فن کار محض ذہنی تعیش، حصولِ شہرت و عزت اور مظاہرۂ اہلیت کے مقاصد کے لئے تخلیقِ ہنر کرنے بڑھا تو آرٹ اور فن کا یہی حشر ہوا اور شاعری لال بجھکڑوں کا ایک تفریحی مشغلہ بن گئی۔ اردو شاعری کے ماضی پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خوشامدانہ ذہنیت، فرمائشی پابندیوں اور خلعت و جاگیر کی ہوس کے تحت جو کچھ بھی لکھا گیا وہاں پر اشاریت کی مٹی پلید ہوئی ہے۔ وہ بجائے ایک لطیف نشتر کے ایک کند ہتھیار بن گئی ہے۔ اصلیت صداقت اور حقیقت ایک مثالی شاعری کی بنیاد ہے اور اس لئے اشاریت و رمزیت کا حسن بھی انہیں خوبیوں پر منحصر ہے — اشاریت میں جب نثر کی سی وضاحت پیدا ہوتی نظر آتی ہے یا ابہام کی طرف وہ مائل ہوتی ہے تو اس کا جوہر ختم ہو جاتا ہے۔ زبان کا ایک کامیاب نبض شناس اور سوسائٹی کے فنی ذوق و روزمرہ کی بول چال کا تجربہ رکھنے والا فنکار ہی اشاروں اور کنایوں کے مقام اور موزونیت کو سمجھ سکتا ہے — ان میں توازن اور اعتدال پیدا کرنا بھی بڑی وسیع اور گہری نظر کا کام ہے۔ یہ وہ جواہر ریزے ہیں جو اگر ترتیب اور موزونیت سے نہ جڑے گئے ہوں تو ان کا حسن بالکل پھیکا پڑ جاتا ہے —

اردو غزل کی ایک مخصوص زبان ہے۔ اس کا ایک مخصوص طرزِ ادا ہے۔ عشق و محبت، ہجر و وصال اور داستانِ گل و بلبل، ذکرِ چمن و دست، یہ سب مخصوص اشارے ہیں جو اپنے پیچھے ایک وسیع معنی رکھتے ہیں۔ انہیں ذروں کو فنکار سورج اور انہیں قطروں کو دریا میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہی وہ اشاروں کی زبان ہے جس کے پردے میں شاعر حیات و کائنات کے مسائل اور زندگی کے اہم حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حالی نے لکھا ہے ؎

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

غزل جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، انسان کے لطیف روحانی اور جذباتی تاثرات کی ترجمان ہے اور اس مقصد کے لئے علامتوں کا ایک ذخیرہ اردو شاعری نے فراہم کیا ہے — ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں :—

"وہ حقائق جن کا تعلق جذباتی یا روحانی لطائف سے ہے انہیں منطقی قضایا کے ذریعہ نہیں ظاہر کیا جا سکتا، ان حقائق کی روح کو صرف علامتوں سے ظاہر کیا جا سکتا ہے، یہ علامتیں بھی رنگ و خطوط کی شکل اختیار کرتی ہیں، کبھی لے اور آہنگ کی، کبھی موزوں لفظوں کی، اس قسم کے تجربوں میں علم و تاثر ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں —"

غزل کا دامن انسان کی جذباتی و روحانی زندگی سے کہاں تک وابستہ ہے اس کی بھی تشریح ضروری ہے۔ غزل کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی دروں بینی کی خوبی اور داخلیت ہے۔ مگر یہ خصوصیت اس کی ہمہ گیری کو محدود نہیں کرتی۔ یہاں پر اندرون ایک جامِ جہاں نما کی حیثیت میں ہمارے سامنے آتا ہے جس میں ساری کائنات کی عکاسی ملتی ہے اور ساری انسانیت کا نقشہ نظر آتا ہے — محبوب کی ذات اور عاشق کی شخصیت سارے انسانوں کے جذبات، خیالات، عقائد، توہمات کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہاں دروں بینی میں اگرچہ انفرادی تجربات و جذبات کا عکس ہوتا ہے مگر اس کے پرتو میں ایک اجتماعیت اور خارجیت کار فرما نظر آتی ہے۔ حیات و کائنات کا یہ داخلی نقطۂ نگاہ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے — غزل آج انسان کے کن جذبات سے اپیل کرتی ہے — جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ابھی تک بازاری عشق و محبت کی فراوانی اور جذبات انگیز و ہیجان پرور قسم کے سطحی مضامین کا زور ہے۔ عشق و محبت یا یوں کہئے کہ جنس کا پہلو انسانی زندگی کا بڑا اہم اور نازک پہلو رہا ہے۔ انسانی زندگی کو نشیب و فراز سے

روشناس کرانے اور باعمل، پُرحرکت، حرارت آمیز یا ساکت و جامد اور تلون زدہ بنانے میں جنسی عوامل کا بڑا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ یہ انسانی زندگی کی وہ اہم قوتیں ہیں جو حقیقت میں اس کی راہِ عمل کے تعین پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اس کی کامیابی و ناکامی میں دخل رکھتی ہیں۔ عشق و محبت کے جذبے اپنے اندر بڑی وسعت بھی رکھتے ہیں۔ اور بڑی تنگی بھی! کہیں سمٹ کر ایک قطرہ اور کہیں پھیل کر ایک بحرِ بیکراں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ زندگی کو تیرگی زدہ بھی کر دیتے ہیں اور درخشاں بھی بنا سکتے ہیں۔ اس کا موزوں استعمال انسان سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دلواتا ہے اور غلط استعمال اس کے لئے بڑا خطرناک بھی ثابت ہوتا ہے۔ غرض عشق و محبت کا رجحان انسان کی جذباتی و روحانی رگوں میں دوڑنے والا خون ہے۔ اور یہی جذبۂ محبت و عشق نطق کے سانچے میں ڈھل کر جب موسیقی کی چاشنی لئے ہوئے نمودار ہوتا ہے تو غزل کی تخلیق ہوتی ہے لہٰذا بنیادی طور پر غزل کا جذبہ محبت ہے اور رمز و ابہام کا معدن یہی جذبۂ عشق ہے۔

غرض غزل کا جو موضوع ہے، غزل کا جو مزاج ہے اور غزل کا جو میلان ہے اس میں منطقی اور استدلالی اندازِ بیان یا طریقہ راست (DIRECT METHOD) کام آ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر اسے کام میں لایا جائے تو غزل کی نشتریت، اثر انگیزی اور حرارت کو مٹا دیتا ہے۔ غزل کا معاملہ نظم و نثر کے دوسرے اصناف سے بالکل علیحدہ نوعیت کا ہے۔

جس طرح قوموں ملکوں اور طبقوں کی ایک تہذیب، ایک ادب، ایک مربوط مائتھالوجی اور چند مفروضے اور واہمے ہوتے ہیں اور یہ اس سرزمین سے نیز وہاں کے رہنے والوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور وہیں کی فضا، حالات اور آب و ہوا کے مطابق پروان چڑھتے ہیں اسی طرح اردو غزل اپنے وسیع ذخیرۂ رمز و اشارہ کے ساتھ ہندوستان کی تہذیب، مائتھالوجی، واہموں اور مفروضوں کی عکاس ہے۔ اس پر اگرچہ ایرانی اثرات کافی پڑے اور اس نے ایران سے بہت سے اشارے، کنارے مستعار لئے ہیں مگر وہ یہاں آکر جیحون کے نیتوں باقی نہ رہے۔ ان میں کافی تراش خراش ہوئی اور وادیٔ گنگ و جمن میں ان کے مطالب و معانی اور طریقِ استعمال میں کافی تبدیلی ہوئی۔ یہ اشارے اپنے اندر تاریخی حقائق پوشیدہ رکھتے ہیں اور ایک قوم کے نشیب و فراز کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کے پردوں میں۔ کبھی مذہبیت، کبھی تصوف، کبھی اخلاق نوازی، کبھی رنگینی و عیاشی کبھی پژمردگی و یاس زدگی، کبھی عشرت پسندی و ناکارگی، کبھی دلیری و بہادری، کبھی عقل پسندی و خرد پرستی، کبھی جنون نوازی و عشق طرازی جھلکتی ہے۔ غرض جن جن وادیوں سے یہاں کا فکری اور عملی کارواں گزرا سارے مراحل کی کامیاب عکاسی غزل نے اپنے ہر دور کے بدلتے، ڈھلتے اور مٹتے اشاروں کے ذریعہ کی ہے۔

غزل کے اشارے بھی تہذیبی و معاشرتی اقدار کے ساتھ بدلتے اور ڈھلتے رہے ہیں اور غیر شعوری طور پر جنم لیتے اور پروان چڑھتے رہتے ہیں یہ جامد نہیں، وقت کی رفتار کے ساتھ ان میں بھی انقلابات آتے رہتے ہیں۔ دراصل ان کی تبدیلی میں نظریۂ زندگی اور فلسفۂ حیات کا بڑا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ جب زندگی کی تہذیبی و اخلاقی قدریں بدلی ہیں تو عوام اور ان کے ساتھ ہی ساتھ فنکاروں کے سوچنے سمجھنے کے معیار بدلتے رہے ہیں۔ ان کے نقاطِ نظر (POINTS OF WIEW) میں بھی انقلابات آتے رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ طرزِ اظہارِ مطالب اور اندازِ بیانِ مقاصد بھی شدت کے ساتھ متاثر ہوتے رہے ہیں۔ کبھی رزم اور کبھی بزم کے اشارے عام ہوئے، کبھی عیش و عشرت کے ذوق نے میکدہ و میخانہ، جام و ساغر، رند و ساقی کو اپنا لیا۔ کبھی غلامی، پریشاں حالی، اضطراب و کلفت کی وجہ سے زنجیر و طوق، صیاد و زنداں، دار و رسن، دشت و بیاباں، جنوں و سودا اور زنجیر و سناں کا ذکر چھڑا۔ کبھی اخلاقی قدروں کے بندھن کمزور پڑنے پر محبوب کی پردہ کشائی کی گئی اور محمل و نقاب کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ کبھی محبت کو زندگی کا اصل مقصد سمجھ کر حیات کی راہِ عمل بہت فرار کی راہ ڈھونڈھی گئی اور محرومی و رسوائی، دیوانگی و آشفتگی کے اشارے عام ہوئے۔ کبھی تصوف کا چرچا ہوا۔ اور اسی طرح اشارات

بدلتی رہتی ہے۔

غرض انسان کی پروازِ تخیل اور فکر و نظر کی وسعت و بلندی کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کے طرزِ عمل کے مطابق علامتیں اور اشارے، رمز و ایما بنتے اور پروان چڑھتے رہے۔ جہاں یاس زدہ، بے بس، فلاکت زدہ اور نحیف تخیل کارفرما ہوا وہاں اشاروں نے کچھ نیا روپ اختیار کیا، وہاں ان کی پرواز محدود اور اڑان مفقود ہو گئی۔ غمِ جہاں، غمِ زماں اور غمِ جاناں کا ماتم ہونے لگا، زندگی سے فرار کی راہیں نکالی گئیں، اور یاس و تفکر کے بادل افکار پر چھا گئے۔ وہاں ایسے اشعار کہے گئے جن میں ایک غم زدہ اور الم نصیب اشاریت کارفرما ہے۔ —— وہ تخیل جس کی پرواز عیش و عشرت اور دولت و اقتدار تک محدود ہو گئی وہاں اشارے کچھ اور بن گئے۔ یہاں رمز و ایما چند حسین ریشمی ڈوروں کی مانند ہو گئے جن کے ذریعے فنکار نے طائرِ فکر و نظر کو اسیر کرنے کی کوشش کی ہے کہ: ؏

رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

زندگی کی ایک طلسماتی تعبیر پیش کی گئی۔ یہاں اشارے محض دلفریب، نظر فریب اور ہاتھ کی صفائی بن گئے —— ہم لطف اندوز ہو سکتے ہیں مگر اس لطف میں بے خبری رہتی ہے اور ہم اس کی نوعیت و حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے جذبات بغیر روشنیٔ شعور و خرد نغمہ زن ہوتے ہیں۔ ادب برائے ادب کے علمبرداروں کے دامن میں ایسے ہی اشاروں کا انبار لگا ہوا ہے۔ زندگی کی حسین تعبیریں، عشق و محبت کی بے معنی داستانیں اور لذتیت و جنسیت سے بھرپور رنگین عیش و عشرت کے ترانے چھیڑے گئے —— وہ تخیل جس کے پیشِ نظر زندگی کا ایک خاص نظریہ ہے۔ ایک روشن شاہراہِ عمل ہے اور ایک درخشاں فلسفۂ حیات ہے بڑی معنویت و مقصدیت کے ساتھ ہی ساتھ لطافت کا حامل ہوتا ہے اور دراصل ایسے ہی اشاروں کو حیاتِ جاوید ملی ہے، یہی وقت کے سرد و گرم کو برداشت کر سکے ہیں یہی حقیقت و اصلیت کے قریب آئے ہیں اور انہوں نے انسان کو کچھ دیا ہے اور اسے کچھ بخشا ہے۔ ان میں نشتریت، اثر انگیزی، کشش اور سوز ہے کیوں کہ ان میں خونِ جگر کی کارفرمائی ہے۔ یہ انسان کے خون اور پسینہ سے خلق ہوئے ہیں، یہیں پر لفظی و معنوی وحدت پیدا ہوتی ہے اور اجمال و اختصار نیز تفصیل و وسعت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوئے ہیں۔

غزل کی ان رمزی علامتوں کی اہمیت مسلّم ہے، البتہ کہیں کہیں بلکہ اکثر و بیشتر ان علامتوں کے استعمال اور معنی آفرینی میں بڑی بے راہ روی ملتی ہے۔ گر یہ رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں "ان رمزی علامتوں کا قصور نہیں بلکہ اس راہرو کا قصور ہے جو اپنی کم نگہی یا کم ظرفی سے فریبِ رہگزر کو منزلِ مقصود سمجھ بیٹھا۔ ادنیٰ درجہ کے لوگوں نے زندگی کی عظیم قدروں کی اسی طرح بے حرمتی کی ہے۔" —— وہ مزید لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک اعلیٰ انسانی قدریں وہ ہیں جو زندگی کے برگزیدہ و بامراد ہونے پر دلالت کرتی ہیں —— اور دراصل غزل گو کے جذبۂ ذوق اور تخیل پر لگام لگانے کے لئے حیات و کائنات کے ایک ہمہ گیر، روشن اور مربوط نظریے کی اشد ضرورت رہی ہے اور آج بھی ہے۔

"رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

ایسی کیفیت پیدا ہونے پر یہ رمزی علامات اور اشارے بلکہ ساری شاعری انسان کے لئے نہیں رہتی بلکہ انسان انہیں کے لئے ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے رمزیت و اشاریت کو غزل کی جان کہا ہے اور غزل کے بے پناہ اختصار کو اسی پر منحصر بتایا ہے نیز ان کے نزدیک غزل کو بتِ ہزار شیوہ بنانے والی صفت اشاریت ہی نے پیدا کی ہے مگر میں اس صفت کو رمزیت و اشاریت کا جوہر نہیں سمجھتا ہوں۔ انسان کی عیش کوشی، لطافت و دلچسپی کے لئے سامان رنگا رنگ مہیا کر دینا یا انداز گوناگوں اختیار کرنا غزل کی معراج نہیں —— غزل نے زندگی کے حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے، [illegible] کائنات پر لطیف انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ انسان کو غمِ جہاں کے تلخابے ہنس ہنس کر پی جانے کا عزم عطا کیا ہے —— اور اس فریضہ کے انجام دینے میں یہ رمزیہ اشارے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ ذرا [illegible] کرتا ہوں۔

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں (مجروح)

کس کو معلوم ہے ہم حسن شناسانِ ازل — کتنے اوہام سے گزرے تو یقیں تک پہنچے (روشن)
جو ہو سکے تو غمِ دل کو لازوال بنا — یہ صورتِ غمِ دوراں رہی رہی نہ رہی "

کشاکشِ خس و دریا ہے دیدنی کوثر
الجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے (کوثر)

اشاریت کا جواب تک کا رول رہا ہے اُس سے ہم سمجھنے لگے ہیں کہ یہ خاص قسم کی دروں بینی اور داخلیت و انفرادیت کی ایک محدود فضا میں عکاسی کا فریضہ تو انجام دے سکتی ہے مگر آج کے اس اجتماعیت پسند اور خارجیت نواز دور میں جبکہ OBJECTIVEISM کا دور دورہ ہے یہ ایک کند اسلحہ بن کر رہ جائے گی اور اس نقطۂ نظر کے بعض لوگ اپنی قناعت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو کچھ ہے بس اسی پر اکتفا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ انہیں جو کچھ پرانا سرمایہ ملا ہے اسی کو بغیر کسی تبدیلی کے سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ مکمل تغیر پسندی کے حامل ہیں اور اشاریت و رمزیت کو بھول بھلیاں بنا کر اسے ڈھا دینا چاہتے ہیں۔ میں ان سے عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح آج زندگی کی بیشتر تہذیبی و اخلاقی قدروں میں تغیر رونما ہوا ہے، جذبات و خیالات میں انقلاب آگیا ہے۔ زبان و فن میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اسی طرح ان رمزی علامتوں کے معانی و مفہوم میں تبدیلی اور ان کے محلِ استعمال میں تغیر رونما ہو گا اور ہو رہا ہے۔ اور بہت کچھ ہو چکا ہے آج وہ پہلے کی داخلیت و محدود بینی ختم ہو چکی ہے — آج رہرو و منزل، رہبر و راہزن، گل و خار، بہار و خزاں، موج و گرداب کے معنی و مفہوم میں بڑا انقلاب آگیا ہے۔ زندگی، حقائق، مقاصدِ حیات و کائنات، انسان کی منزلِ مقصود اور راہ کی دشوار گذار وادیاں —— غرض زندگی کے ان بامراد و اعلیٰ مقاصد کا غزل کو آلۂ کار اور آماجگاہ بنایا جا رہا ہے۔ اور آج وہی اشارے جو کل تک انسان کو ایک بدمست بھنورا یا زندگی سے فرار حاصل کرنے والا مجنوں بنا رہے تھے، اسے راہ گزرِ زیست کا ایک باعمل و باحرکت جانباز مجاہد بننے کا عزم عطا کر رہے ہیں۔ آج نگہِ یار میں غمِ دوراں کی جھلک دیکھی جا رہی ہے۔ مجروح نے لکھا ہے —

میں نے دیکھی ہے اسی میں غمِ دوراں کی جھلک — بے خبر رنگِ جہاں سے نگہِ یار سہی

مجروح اور فیض نے دورِ حاضر کے غزل گو شعرا میں سب سے زیادہ کامیاب تجربے اشاریت کے موضوع و مواد کو بدلنے کے سلسلے میں کئے ہیں۔ انہوں نے ایک خاص مقصد، نظریہ کا شعور اور سوز و گداز لے کر (چاہیے وہ مقصد و نظریہ کیسا ہی ہو۔ اس سے یہاں بحث نہیں) اشاریت کی رگوں میں گرم خون دوڑایا ہے۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں —

(فیض) گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے — تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے
" اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک — اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے
" کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب — آج تم یاد بے حساب آئے۔
(مجروح) شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے — میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو
" دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو — مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

دیکھ کلیوں کا چٹکنا سرِ گلشن صیاد — زمزمہ سنج مرا خونِ جگر ہے کہ نہیں

ان کاوشوں نے غزل کے میدان کو اور رمزیت و اشاریت کی حدود کو بہت کچھ وسیع کر دیا ہے — زندگی کے سارے مسائل کی سمائی ان میں داخلی اور خارجی انداز سے ہونے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی غزل ایک مقبول صنفِ ادب، ہر خاص و عام کی نگاہ میں بنی ہوئی ہے۔

اب رہ گیا اسلامی نقطۂ نظر سے اشاروں کا جائزہ لینا — یعنی ایک تعمیری غزلگو شاعر ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا۔ اب تک کے سرمایۂ رمز و ابہام سے متعلق ان کا کیا ATTITUDE ہو گا اور مستقبل میں اس نوعیت کے تجربوں کی بابت وہ کیا نقطۂ نظر رکھے گا — ایک اسلامی فنکار یا شاعر اپنی تمام تخلیقات میں اسلامی نظریہ کا مثبت پہلو اس حسن و خوبی سے اجاگر کرنا چاہتا ہے کہ طرزِ بیان اور اندازِ نگارش سے مقصد اور نظریہ کو کسی قسم کی ٹھیس نہ پہنچے یا وہ مقصد و نظریہ پر غالب نہ آجائیں۔ وہ اصل مقصد اور فن کی ایک متوازن شاہراہ پر چلنے کی پیہم کوشش کرتے ہیں۔ انہیں نہ تو رمز و ابہام کا جوہر دکھانا مقصود ہے اور نہ اشاریت و ایمائیت کا کوئی طلسمی پیکر پیش کرنا ہے۔ اشارے جہاں تک ابہام و پیچیدگی اور مظاہرۂ فن سے متعلق ہیں ان کے لئے ناقابلِ قبول ہوں گے۔ اسلامی فکر کو محورِ شعر و سخن بنانے والے فنکار کو اس سلسلے میں بڑی ہوشمندی اور شعور سے کام لینا ہے اور اس بحرِ زخار سے تعمیری اور صحت مند اشاروں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا ہے — انہیں رمز و ایما کو اپنی تخلیقات میں اس انداز سے ٹانکنا اور فٹ کرنا ہے جس سے ان کے معنی اور مطلب میں ایک تعمیری جھلک آ جائے ان کو جنسی تلذذ، فکری بے راہروی، اور ذہنی عیاشی کا مجموعہ بنا کر ایک صالح اور صحت مند حرارت ان میں سمو دینی ہے۔ یہاں پر داخلیت برائے انفرادیت اور خارجیت برائے اجتماعیت نہ ہو کر ساری تگ و دو، ساری جہدِ حیات، سارا غم و الم، ساری قربانیاں اور کلفتیں، ساری کوہکنی و بیاباں نوردی، ساری اسیری و بیقراری، سارا عشق و لگاؤ اس عظیم مقصد کے لئے ہو گا، اس آفاقی نظریہ کے لئے ہو گا جس کے لئے حیات وقف ہو چکی ہے —

جب غزلیں اس احساس کے ساتھ لکھی جائیں گی تو شاید اشاریت کا مسئلہ ہی نہ رہ جائے — اشارے فکر و نظر کے سانچے میں ڈھلتے ہیں اگر ان اینٹوں سے آپ نے خانہ تعمیر کرنا چاہا ہے تو وہ بھی ہو سکتا ہے اور اگر دیوارِ حرم اٹھانا چاہتے ہیں تو وہ بھی ممکن ہے — فکری نظر فریبی، لفظی بازی گری اور ادبی مکاری کے مظاہرے میں بھی یہ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں — جس طرح اسلامی ادیبوں نے ہر ادبی عمارت جس کی بنیاد ٹیڑھی و کج ہے اسے درست کرنے کا عزم کیا ہے اسی طرح اشاروں کنایوں کو بھی ایک تعمیری جذبہ کے ساتھ اپنایا جائے گا اور انہیں صالح اور صحتمند بنایا جائے گا۔ ہم ان سے اظہارِ متنفر کر کے ایک بہت بڑے ہتھیار سے محروم رہ جائیں گے۔ سادگیٔ بیان اور راست اندازی کی اہمیت مسلم ہے مگر غزل کے میدان میں یہ کام نہیں کر سکتے ہیں۔ میں نعیم صدیقی صاحب کی اس رائے سے پوری طور پر متفق ہوں کہ ہم نئے اسالیب اور نئے موضوعات کی بے لاگ تلاش اور پرانے تشبیہہ و استعارات کے سانچوں کو یک بیک توڑنے پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔ نئے تجربات و نئے اسالیبِ بیان کی تلاش اور ذوق کی تبدیلی تراش خراش نیز تغیر کی بھی ضرورت ہے۔ قناعت پسندی ایک قسم کا جمود ہے پھر بھی تبدیلی میں اعتدال ضروری ہے۔ آج کل کچھ اشارے تو اس قسم کے ہیں کہ انہیں ہمیں چھوڑ دینا ہی نہیں بلکہ احتراز کا اہتمام کرنا ہے، ان سے اسلامی وقار، سنجیدگی، اسلامی مزاج کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ مثلاً رہزنِ ایمان کا ذکر۔ شراب و ساغر، رندی و سرشاری کے مضامین، زاہد سے چھیڑ چھاڑ و رندمشی کی ترغیب، دیوانگی، وحشت، نوردی و کوچہ گردی پر فخریہ مضامین، آہ و فغاں اور واویلا کا مظاہرہ، سراپائے محبوب کی رمزیہ علامات مثلاً نرگسی آنکھیں، صندلی بانہیں، سرو قامتی وغیرہ۔ امرد پرستی ذکرِ رقیب و مقاصد وغیرہ وغیرہ میں نے چند کی طرف اشارہ کر دیا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی اس قسم کی غیر سنجیدہ اور کسی نظریہ کو ٹھیس پہنچانے والی رمزیہ علامات ہیں جن کا استعمال نہیں کیا جا سکتا[1]

---

[1] جن اشاروں کو آپ چھوڑ دینے کا مشورہ دے رہے ہیں، دراصل مرعوب کرا ہت ان کا مروجہ غلط استعمال ہے لیکن اگر آپ انکو نئے استعارات میں لے آئیں تو نفس میں ان میں کوئی خرابی نہیں۔ باقی حاشیہ ص

آج عام طور پر تعمیر پسندوں کی غزلوں میں دو انتہا پسندانہ رنگ نظر آتے ہیں ایک طرف یا تو بالکل سیدھے سادے انداز سے صاف صاف اپنا مقصد رکھ دیا جاتا ہے یا پھر .... دوسری طرف بعض لوگ رمز و ابہام کے طلسم میں الجھ کر اپنے مقصد تک کو فراموش کر جاتے ہیں پہلی صف میں مجھے نعیم صدیقی، ابولبیان حماد، کوثر نیازی، ماہر، احمد پرویز وغیرہ نظر آتے ہیں - دوسری طرف انور صدیقی، اکبر زمزم، افتخار اعظمی، عمران انصاری وغیرہ دکھائی پڑتے ہیں۔ اعتدال و توازن بہت کم لوگوں کے یہاں ہے - پھر بھی حفیظ میرٹھی، عرشی بھوپالی، عامر کرنالی وغیرہ نے بہت کچھ تعمیری غزلوں کا ایک پیمانہ بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے - ان کی غزلیں بہت کچھ مقصدی آب و تاب کے ساتھ ہی ساتھ تغزل، اشاریت و رمزیت کے حسن میں رچی بسی نظر آتی ہیں - پھر بھی غزل کے میدان میں ابھی اسلامی فنکاروں کو بہت کچھ کرنا ہے، ابھی مقصد کے کتنے پہلوؤں اور فن کے کتنے گوشوں کی ان کی تخلیقات کو ہوا تک نہیں لگی ہے —— علامہ اقبال مرحوم اس سلسلے میں ہمارے لئے جو مشعل جلا گئے ہیں اور جو بنیاد فراہم کر چکے ہیں اس کی مدد سے ہم بہت کچھ آگے بڑھ سکتے ہیں اور بہت کچھ تجربات کر سکتے ہیں —— ہمیں اشاروں کو ایک ایسی زندہ حقیقت بنانا ہے اور انہیں ایسے سانچوں میں ڈھال دینا ہے کہ ان میں ایک تعمیری آب و تاب پیدا ہو جائے جو زمانے کے لئے نا بہ ثابت ہو ——

بقیہ شیطان

حضرت کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے چہرہ پر شرم و غصہ کی علامات ہیں اگر دن کی رگیں پھولی ہوئی ہیں۔
شیخ صاحب حقہ ان کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں -
سیٹھ : پیر قسم چودھویں صدی ہے چودھویں -
شیخ صاحب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑاتے ہیں - دلی کے گھر میں شیطان !

(حلقۂ ادب اسلامی ڈھاکہ کی ایک نشست میں پڑھا گیا)

بقیہ حاشیہ برص ۲۲

مثلاً "رہزن ایمان" آپ ہر اس مفسدے کو کہہ سکتے ہیں جو اپنے اندر خواہشاتی جاذبیت رکھتا ہو مگر روح اور ضمیر کے لئے تیتہ کے لحاظ سے ہلاک ہو۔ شراب و ساغر و مینا اور ساقی کے استعارے اگر کسی اسلامی فلسفۂ زندگی اور ایمان اور عقیدے اور مقصد کے لئے استعمال کریں، درست خانے اور بزم سے مراد وہ نظم ہیں جو منتشر افراد کو ایک مقصد کے لئے مربوط کرتا ہو تو اس میں کیا ہرج ہے - آخر شراب "طہور" بھی تو ہو سکتی ہے! "زاہد" اور "شیخ" اور "واعظ" سے آپ ایک ایسا مذہبی کردار مراد لیں گے جو دین کے اصل مقصد اور اس کی روح سے خالی ہے لیکن پھر بھی وہ مذہب کا اجارہ دار بنا پھرتا ہے اور جو کوئی دین کو اس کی اصل شکل میں لے کر اٹھتا ہے اس پر کفر کے فتوے لگاتا ہے "دیوانگی" سے مراد حصول مقصد کے لئے وہ والہانہ پن ہو سکتا ہے جس کے تحت آدمی ذاتی مفاد سے بے نیاز ہو کر مال اور جان کی بازیاں لگائے - دشت نوردی اور کوچہ گردی کا نیا تصور یہ ہو سکتا ہے کہ کارِ دعوت کے لئے آدمی مارا مارا پھرے "قاصد" اور "رازداں" اور "ندیم" مقصد کے حامی اور ہمدرد ہوتے ہیں اور "رقیب" اس کردار کو کہیں گے جو محض حاسدانہ اور منفی اور تخریبی رد عمل دکھاتا ہے - غرض یہ کہ غزلیہ اشاروں اور استعاروں کے مزاج اور ان کے استعمال کو بدلنا ہے نہ کہ ان کی لفظی ساخت کو! (ن - ص)

حلقۂ یاراں

برادرِ محترم! اسلام و رحمت۔ مارچ کے چراغِ راہ میں خطوط کا کالم پاکر مجھے بہت مسرت ہوئی، اگر آپ نے میری حقیر گذارش کو شرفِ پذیرائی بخشتے ہوئے اس سلسلہ کو چراغِ راہ میں مستقلاً قائم فرما دیا ہے، تو میں اس پر ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں، اور اگر یہ حسبِ سابق ایک وقتی فیچر ہے، تو میں بڑے ادب کے ساتھ پھر یہ عرض کروں گا، کہ براہ کرم اپنے رفیقانِ قلم کی نگارشات میں حسن اور نکھار پیدا کرنے کی خاطر نیز ان میں ذوقِ تحریر کو زندہ و متحرک رکھنے کی خاطر عملی تنقید اور براہِ راست نقد و نظر پر مشتمل خطوط کی اشاعت کو چراغِ راہ کا ایک مستقل شعار بنا دیجئے، خدا نے چاہا تو یہ سلسلہ افادیت کے لحاظ سے بہت کامیاب رہے گا، آپ نے اس ضمن میں جو یہ تجویز پیش کی تھی، کہ عام قارئین کے خطوط کی بجائے ہر ماہ گذشتہ مہینہ کے علمی و ادبی پیرائے میں سے فنی یا مقصدی لحاظ سے بلند پایہ اور کامیاب نگارشات کا ایک تعارفی تجزیہ پیش کیا جائے، سو یہ کام مقابلۃً بہت زیادہ موزوں و مفید ہونے کے باوصف بڑا دقت طلب بھی ہے، لہٰذا سر دست ایک نسبتاً آسان اور سہل اقدام اختیار کیجئے، کیوں کہ جہاں ثانی الذکر صورت میں ذمہ داری کا بوجھ صرف چند ایک احباب پر پڑے گا۔ وہاں اول الذکر صورت میں ذمہ داریاں تمام قارئین میں بٹ رہیں گی، اور اسی نسبت سے اُن سب کے لئے ان سے عہدہ برآ ہونا بھی آسان ہو گا۔

اگر آپ خطوط کے کالم کو چراغِ راہ کے مستقل فیچر کے طور پر شائع فرمانے کے لئے رضامند ہوں، تو پھر اس کے لئے ایک مناسبِ حال مستقل عنوان کا قیام بھی ناگزیر ہو گا، اس ضمن میں چند عنوانات میں بھی منسوبۃً پیش کرتا ہوں، اور وہ یہ ہیں:- لمعات، تنویرین، بزمِ خیال، حلقۂ یاراں، انجمنِ فکر، دامانِ نگاہ

اس مرتبہ کے خطوط میں مجھے انور صدیقی صاحب کا خط بہت پسند آیا، اس خط میں انہوں نے غزل کی فنی و ادبی حیثیت کے بارے میں بڑے گہرے اور حقیقت رس اشارے کئے ہیں، اور اس باب میں ان کا مطالعہ اور ذوق قابلِ داد ہے۔ میں اُن کی اس نشان دہی سے کامل اتفاق کا اظہار کروں گا کہ "ہماری ادبی تحریک میں ابھی تک فکر غالب ہے، اس قدر کو ... چاہئے" اگرچہ ہمارے شعراء کی اکثریت انور صدیقی صاحب کے اس ارشاد کی صحیح مصداق نظر آتی ہے، تاہم یہ حقیقت بھی بڑی خوش آئند ہے، کہ کچھ عرصہ سے ہمارے حلقۂ ادب میں بھی مقصد کی بلندی اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ فن، ادب اور زبان کے حسن، گھلاوٹ اور رچاؤ کا خیال پیدا ہونے لگا ہے، اور ہمارے حلقہ کے شعرا بھی اپنے کلام میں فن اور ندرتِ فکر نیز جذبہ انگیز حلاوتِ شعری کا اضافہ کرنے کی کوششیں کرنے لگے ہیں۔ یہ کوششیں اکثر خاصی کامیاب نظر آتی ہیں، چنانچہ اس ضمن میں آپ کی، حفیظ میرٹھی، عرشی بھوپالی، ماہر القادری اور خود انور صدیقی صاحب کی تازہ غزلوں کی داد نہ دینا شاید ہر با ذوق قاری کے نزدیک بدذوقی ہو گی۔ خدا کرے کہ ہمارے شعراء کا یہ فکری و فنی ارتقاء جلد از جلد ان بلند و رفیع درجات سے ہمکنار ہو جن تک پہنچے بغیر کسی سلیم الطبع اور بالغ نظر نقاد کی توجہ یا کسی باذوق قاری کی دلچسپی کو اخذ کرنا ہمارے لئے بڑا مشکل ہو گا۔ انور صدیقی صاحب کا یہ ارشاد بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہئے۔ بے رُخے کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے، واقعی اگر ایک نظم چند سپاٹ سے خیالات کی حامل ہے، اور ایک

معمولی سی تک بندی کا نتیجہ ہے، تو اسے نظم کی بجائے ایک منظوم اداریہ ہی کہنا صحیح ہوگا۔ اور ایسا کلام کسی سچی شاعری کے دلدادہ قاری کے لئے کوئی کشش نہیں رکھے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ہمارا راستہ فن کی حسین وادی، اور مقصد کے کوہِ عظیم کے بین درمیان واقع ہوا ہے، اور ہمارے لئے فن اور مقصد دونوں کے تقاضوں کو برابر کی اہمیت دینا ضروری ہے، ہونا تو یہ چاہیئے کہ ہماری نگارشات پڑھتے وقت جہاں قارئین کا ذوقِ نظر آسودہ ہو، وہاں اُن کی روح بھی ایک نئی لطافت اور بالیدگی محسوس کرے، ہمارے فن کا طلسم اُن کے دل و نگاہ کو مسخر کرے تو ہمارے مقصد کی حقانیت اور رفعت و پاکیزگی ان کے نفس و جاں کو مجلا و مطہر کر دے۔ یہ کام جس قدر مشکل ہے، اسی قدر ولولہ انگیز بھی ہے، اور جس قدر کٹھن ہے، اس سے کہیں زیادہ دلکش ہے۔ لہذا اگر خدا کا فضل اور ہمارا جذبۂ خلوص شاملِ حال ہو، تو اس کو انجام دینے ہی سے ہمیں سچی راحت و تسکین مل سکتی ہے، ہمارے شعراء یہ کوشش کریں کہ اُن کی نگارشِ فکر نہ تو کوئی منظوم اداریہ ہو۔ اور نہ ہی کسی فراری کی پکار، بلکہ وہ درحقیقت ایک رجز ہو، اور آپ جانتے رجز میں مقصد اور شعریت دونوں ہم آغوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے افسانہ نگاروں کو یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ اُن کی کہانیاں نہ تو ہمارے جلسوں کی رودادوں پر مشتمل ہوں، نہ اخباری واقعات کا افسانوی تجزیہ ہوں، اور ان کے برعکس نہ ہی محض مغربی افسانہ نگاروں کے فن کی اندھا دھند نقالی کا مظاہرہ ہوں، اپنی تخلیقات میں فن کو اس لئے سموئیے کہ ان میں پنہاں مقصد اور زیادہ دلکشی کے ساتھ اُجاگر ہو جائے اور ان میں مقصد کو اس اعتقاد کے ساتھ داخل کیجئے کہ آپ کے نزدیک بے مقصد تحریریں یاوہ گوئی بن کر رہ جاتی ہیں :

فن اور مقصد کو یک جان کرنے کی یہ بحث ذرا مسلسل گفتگو کی درازی کا تقاضا کرتی ہے، لہذا میں اسے ختم کرتے ہوئے اب چند اشارات مارچ کے چراغِ راہ کی نگارشات کے متعلق پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔

اس ضمن میں سب سے پہلے میں ایک حقیر سا مشورہ جناب انور صدیقی کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ میں نے جہاں ان کی غزلوں میں فکر کی گہرائی اور گیرائی اور جذب و شوق کا ایک دلگدازانہ انداز پایا ہے۔ وہاں میں نے یہ اکثر محسوس کیا ہے کہ موصوف اپنے اشعار میں اضافتوں اور لواحق الفاظ کی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بھرمار فرما دیتے ہیں۔ ایسا پیرایۂ بیان قاری کے ذہن کو اولین گرفت میں مطلب پا لینے کی سہولت سے محروم کر دیتا ہے، ادھر آپ جانیئے، غزل کے ترکش کا سب سے بڑا تیر سہلِ ممتنع ہے، جو چھوٹتے ہی سیدھا قاری کے دل میں جا کر پیوست ہوتا ہے، اشعار میں اضافت کا استعمال کسی شجرِ ممنوعہ کی حیثیت تو نہیں رکھتا، تاہم اہلِ نظر ان کے مسلسل استعمال کو پسندیدہ نہیں سمجھتے، خصوصاً چھوٹی بحروں کی غزلوں میں تو اسے بار پانے کی اجازت شاذ ہی دی جاتی ہے، انور صدیقی صاحب کی جو غزل مارچ کے چراغِ راہ میں شائع ہوئی ہے، وہ یوں تو نغز گوئی کی عمدہ مثال ہے، اس میں بلندئ فکر اور سوز و گداز دونوں ایک حد تک موجود ہیں، لیکن اس کے ہر مصرعے میں اضافتوں اور لواحق کے پے بہ پے استعمال نے اس کا حسنِ تاثیر کجلا کر رکھ دیا ہے۔ اس غزل کے اشعار کا مطلب پانے کے لئے ایک اوسط درجہ کے قاری کے ذہن کو خاص کاوش سے کام لینا پڑتا ہے، اور ظاہر ہے، کہ یہ کاوش تاثیر کی قوت کو کمزور کر دیتی ہے۔

اسی شمارے میں آپ کی نظم "میرا فن" کافی تفکر اور گہرے تاثر کی حامل ہے، اور اس میں آپ نے ہر بند کے آخیر والے چھوٹے سے ٹکڑے کو خوب نبھایا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ نظم آپ نے کسی خاص ذہنی کیفیت کے زیرِ اثر لکھی ہے، اور حقیقتاً شاعری ہے بھی دل و دماغ کی خاص کیفیات کی عکاسی ہی کا دوسرا نام!

ذکی زاکانی صاحب کی طویل نظم "بیج ندی کا گیت"، اپنی روانی اور تسلسلِ شعری کے اعتبار سے خوب ہے، اس کے اندر مجھے ایک سی کمی محسوس ہوتی ہے، اور وہ یہ، کہ شاعر اپنے ذہن میں پنہاں مقصد کی صالحیت اور "تعمیریت" کو قاری کے ذہن میں پوری طرح اجاگر

نہیں کرتا۔ طویل نظموں کو کسی بھی لحاظ سے تشنہ نہیں ہونا چاہیئے۔

اس معاملہ میں جناب زیبی صاحب کی نظم "داستانِ الفت" ستحسان ایک کامیاب کوشش ہے۔ جناب صاحب اگر اپنے ہاں بندش کی چستی، اور فکر کی گہرائی کا مزید اہتمام بھی فرمالیا کریں تو اُن کے کلام کا حسن انشاءاللہ مزید بڑھ سکتا ہے۔

اس شمارہ کے مضامین اور افسانوں کے اندر مجھے نسیم صاحب کا "خاکہ کم سخن" بہت پسند آیا۔ نسیم صاحب ہمارے حلقہ کے نوخیز ادیبوں میں سے ہیں، اور مجھے ان سے بڑی توقعات ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "انتخاب سینئے" میں نے حال ہی میں ہمعیار کے نوری نمبر میں پڑھا تھا، اور میں اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ افسانہ جو ایک مفصل تبصرہ کا محتاج ہے۔ میرے نزدیک فنی اعتبار سے اردو کے صفِ اوّل کے افسانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، اور مقصدی نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے، تو یہ ہمارے ہاں کے معدودے چند کامیاب افسانوں میں سے نظر آتا ہے۔ الحمدللہ کہ ہمیں ایسے ایسے جوہر قابل میسر آنے لگے ہیں۔ یہ نسیم صاحب کا تازہ "خاکہ کم سخن" بھی صاحب تحریر کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک عمدہ مظہر ہے۔ البتہ اس کا عنوان مجھے کچھ زیادہ بلیغ نظر نہیں آیا۔ میرے خیال میں اگر اس خاکہ کا عنوان "دہجی" ہوتا، تو زیادہ بہتر تھا۔

میں سمجھتا ہوں، کہ کسی افسانے کا عنوان قائم کرتے وقت بڑی دقت اور غور وفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اور کوشش یہی کی جائے، کہ عنوان صنعتِ ایجاز کا ایک شہ کار ہو۔ عنوان افسانے کی اصل تعبیر کا ایک بلیغ استعارہ بنا کر پیش کیا جائے، نہ کہ اس کا کوئی تشریحی جملہ بنا کر، اس طرح قاری کی توجہ آخر دم تک [عنوان کو ڈھونڈ لینے کی] طرح قائم رہتی ہے۔

یہ چند گزارشات محض درست حال معلوم کرنے کی ایک جسارت ہی ہیں، ان کا مقصد ادب وفن کے بارے میں علمیت کی بجائے اس تخصص۔۔۔ اور مخلص سے محبت کا دعوےٰ ہے، اور ان سطور کا محرک بھی یہی جذبہ محبت ہے، اگر بنا بریں اس باب میں مجھ سے زیادہ کوتاہ علم شاید ہی کوئی اور ہو گا۔ والسلام و رحمت۔ (شمس اللہ صحرائی)

ضروری اعلان

مولانا ... کی کتاب ... کی حیثیت پر کافی مفصل تنقید تجلی دیوبند ماہ اپریل ۱۹۶۴ء میں آرہی ہے ... اعتراضات پر تنقید ... پاکستانی حضرات اگر اپریل کا تجلی حاصل کرنا چاہیں تو سالانہ قیمت پانچ روپیہ ... دیوبند کو بھیج دیں رسالہ جاری ہو جائے گا۔

... ناظم آباد کراچی

تجلی کا یہ شمارہ ...

تجلی دیوبند یو۔پی انڈیا

مذکورہ تنقید کا مطالعہ ہر موافق و مخالف کے لئے مفید ہوگا۔

گلی کے موڑ پر

اعظم ادیب جلالی

"ہم یہ کہتے ہیں تمہیں نوٹ عطا کر دیں گے — تم یہ کہتی ہو کہ ہم پیسے ہی دے دیں دو چار
دیکھو یہ نوٹ، یہ رنگین، دمکتا ہوا نوٹ — تم عطا کر دو ہمیں اپنے یہ گدر سے انار

تمہیں پیسوں سے غرض ہم کو اناروں سے غرض
بولو منظور ہے کیا تم کو یہ سیدھا بیوپار"

"مجھ بھکارن کو بناتے ہو، ستاتے ہو عبث — کون سے آ گئے از غیب مرے پاس انار"
"کون سے آ گئے از غیب" یہ کیا خوب کہی — کیا ستم ڈھاتی ہو اس رمز سے اے جانِ بہار

ساتھیو، اب اسے کھل کر ہی بتانا ہوگا،
لو سنو ——"

"چپ رہو ظالمو، خاموش، زباں مت کھولو!" — "قبلہ کیا بات ہے کیسی ہے یہ گالی گفتار؟"

"کس قدر شرم سے خالی ہیں تمہاری باتیں
ایک عبرت کا تماشا ہیں تمہاری گھاتیں

اپنی بہنوں سے یہ دستور روا رکھا ہے — آدمیت کا شرف تم نے گنوا رکھا ہے
تم میں خالد بھی ہے، طارق بھی ہے، مسعود بھی ہے — تم میں فاروق بھی، حامد بھی ہے، محمود بھی ہے

اپنے اسلاف کے ناموں کو ڈبویا تم نے
موتیوں جیسے ان الفاظ کو کھویا تم نے

آؤ — اس غمزدہ خاتون کی امداد کریں — اس کی ناشاد امنگوں کو نہ برباد کریں

شیطان

ایک گفتگو

فاطمہ صدیقی

افراد

حضرت جی: شیخ سید علی درگاہ جلالی کے سجادہ نشین

شیخ صاحب: امام و قاضی قصبہ

سیٹھ: ایک ٹھیکیدار

اسلم: حضرت جی کا نوجوان لڑکا، میڈیکل کالج کا طالب علم

وقت: حال ہی میں، بعد مغرب۔

مقام: ہندوستان کے ایک قصبہ میں درگاہ کے نزدیک حضرت جی کا دیوان خانہ

(پس منظر میں دور سے آتی ہوئی ہلکے سازوں اور قوالی کی دھن میں تالیوں کی آواز، کبھی کبھی کوئی تان بھی سنائی دیتی ہے۔)

دیوان خانہ میں ایک طرف گاؤ تکیہ سے لگے ہوئے حضرت صاحب بیٹھے ہیں۔ پیچوان سامنے رکھا ہے۔ نے ہاتھ میں ہے۔ کبھی کبھی کش لگا لیتے ہیں۔ ایک طرف ایک صوفہ رکھا ہوا ہے۔ پاس ہی اگالدان، عطردان، پاندان رکھا ہوا ہے۔ تھوڑی دور برابر برآمدہ میں مریدان [illegible]۔ سیٹھ صاحب باہر سے تشریف لاتے ہیں۔

حضرت جی: کہئے سیٹھ صاحب خیریت۔ اس بار بڑی دیر سے پہنچے؟ آیئے بیٹھئے۔

سیٹھ: (بیٹھتے ہوئے) سب دعا ہے حضور کی۔ ایک کام اٹکا رہ گیا تھا اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔ ورنہ تو قصبہ میں تو پہلے دن سلامی دینے والوں میں سے ہوں۔

حضرت جی: میں بھی سوچ رہا تھا کہ کیا بات ہوئی۔ سیٹھ تو غیر حاضر رہنے والوں میں سے نہیں۔ کہئے کام بن گیا؟

سیٹھ: بس حضور کی دعا چاہئے۔ کام تو بڑا اٹکنے آن پڑا تھا۔ ملٹری میں ٹھیکہ نہیں برسوں سے لیتا آیا ہوں اس بار ایک بدمعاش افسر آ گیا تھا۔ میں نے کہا ہزار کی تھیلی بندھی ہوئی ہے آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہے۔ اس پر بگڑ گیا۔ کہ تمہارا کام ہی خراب ہے رشوت دینے سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے جانا بیٹھے بڑا بنتا ہے۔ رقم دگنی کر دی وہ تو سمرا اور اکڑ گیا۔ لگا پولیس کی دھونس جمانے۔ میں نے کہا پیر تمہارا ٹھیکہ تو مجھے ہی ملے گا البتہ تم پریشان کروائے گا۔ میں نے بھی پیر قسم وہ جوڑ توڑ لگائے کہ اوپر سے اور الٹی ڈانٹ بھی پڑی اور ٹھیکہ بھی دینا پڑا۔ البتہ تین ہزار خرچ ہو گئے مگر اس کی پرواہ نہیں پیر نے لاج رکھ لی۔ بس کام بنا کہ دوڑا چلا آ رہا ہوں۔ کل دو دیگ میری طرف سے پکوا دیجئے گا۔

حضرت جی: آپ پر درگاہ کی خاص نظر ہے۔

سیٹھ: (جیب سے نکالتے ہوئے) میں تو غلام ہوں۔

حضرت: عرس دیکھا ؟

سیٹھ: جی دوپہر پہنچا تھا۔ گھوم پھر کر آ رہا ہوں

حضرت جی: کیا خیال ہے ؟

سیٹھ: پیر قسم عرس میں اب وہ لطف نہیں رہا۔ دو چار گانے والیاں آ گئیں، دو چار قوال آ گئے۔ اور دو چار ہزار آدمی۔ کہاں وہ دن تھے کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ پیر قسم لاکھوں آدمی دور دور سے آتے تھے کتنی ہی باعزت طوائفیں جنہوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا سر کے بل سلام کرنے حاضر ہوتی تھیں !

حضرت جی (حقہ کا کش لیتے ہوئے) اماں سیٹھ صاحب ہمیں تو اس ہندوستان پاکستان کے رگڑے نے مار دیا۔ !

(عقب سے گانے کی زنانہ آواز اور پھر تالیوں کا شور سنائی دیتا ہے۔

سیٹھ: ہاہا پیر قسم کیا سوز بھری آواز تھی زہرہ بائی کی۔ خدا جانے جیتی ہے کہ مر گئی۔ اس کے مقابلے کی گانے والی میں نے نہیں دیکھی۔

حضرت جی: سنا ہے اب فلمی لائن میں بھرتی ہو گئی ہے۔ موٹروں میں اڑی پھرتی ہے۔

سیٹھ: ہو! پیر قسم سب درگاہ کے طفیل ہے۔ دو چار بار جس نے سلامی دے دی ہیرا بن گیا ہیرا!

حضرت جی: مگر اب کوئی نہیں آتا۔ ورنہ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان بھر کے لوگ سال بھر پیسے جمع کرتے تھے اور ایک بار آ کر لٹا جاتے تھے (ٹھنڈا سانس لے کر) اب تو عزت پر بن آئی ہے۔ شاہ قلندر ہندے علی کے عرس کا کوئی نام تک نہ جانتا تھا اب اس کے لئے اسپیشلیں چھٹتی ہیں اسپیشلیں اور یہاں اُلو بولتا ہے۔

سیٹھ: اجی حضرت۔ پیسہ پیسہ کو کھینچتا ہے تھوڑا خرچ کر کے اچھی گانے والیوں کو بلوائیے پھر دیکھئے پیر قسم چاندی ہی چاندی ہے۔

حضرت جی: اماں سیٹھ صاحب۔ اگر پیسہ ہی ہوتا تو پھر رونا کیا تھا۔ یہاں تو خانہ داری کا صرف نکلنا دشوار ہو رہا ہے۔ ادھر صاحبزادے آئے ہوئے ہیں۔ امتحان وغیرہ کی فیس داخل کرنی ہے۔ سوچا تھا عرس سے نکل آئے گا مگر کہاں؛ جو آتا ہے چار پیسہ کے الائچی دانے چڑھا کر چلتا بنتا ہے۔ کپڑے پیسہ کا نام نہیں —!

(پشت کے دروازہ سے اسلم داخل ہوتا ہے)

اسلم: ابا حضور چلئے کھانا تیار ہے۔ پھر میری ٹرین کا وقت بھی ہو چلا۔

حضرت جی: چلتے ہیں بیٹا ابھی گاڑی میں دیر ہے۔ آؤ بیٹھو تمہارا ہی تذکرہ ہو رہا تھا۔ کہ ان کو ڈیڑھ سو روپیہ کی ضرورت ہے کہاں سے دوں؟

سیٹھ: پیر قسم بڑا برا زمانہ آ گیا ہے۔ ہاں حضرت ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔

حضرت جی: کیا۔ ؟

سیٹھ: اجی وہ درگاہ کی مسجد والا پیسہ رکھا تھا نا؟

حضرت جی: وہ تو اب بھی رکھا ہے۔ اللہ چاہے تو اگلے برس اس کام میں بھی ہاتھ لگاؤں گا۔

سیٹھ: تو پھر اس پیسہ کو گھی کی تجارت میں لگا دیجئے۔ پیر قسم نفع ہی نفع ہے۔

(حضرت جی خاموشی سے حقہ کے کش لیتے ہیں)

اسلم: مگر وہ تو امانت کا روپیہ ہے۔

سیٹھ: تو میں کب غبن کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ ارے بھئی اصل کا اصل واپس منافع اپنا۔ یا حضور لگائیے میری ذمہ داری پہ۔ آج کل چربی اور مونگ پھلی بھی سستی ہے۔ سیکڑہ میں سیکڑہ منافع۔

حضرت جی: آپ بھی کیا بات کرتے ہیں سیٹھ صاحب۔ اگر اُلٹا گھاٹا ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

(اسلم خاموشی سے پہلو بدل کر رہ جاتا ہے)

سیٹھ: گھاٹا؟ ابھی پار سال ہی میں نے خود اسی گھی کے کام میں پچیس ہزار لگایا تھا۔ پیر قسم ساڑھے چوبیس ہزار منافع ہوا۔

اسلم: (ضبط نہ کر سکتے ہوئے) اچھا سیٹھ صاحب آپ تو خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔ قرآن بھی پڑھتے ہوں گے!

سیٹھ: پیر قسم اگر صبح کو سویرے آنکھ کھل گئی تو جب تک پاکستان ریڈیو والا قرآن پڑھتا رہتا ہے۔ لیٹا لیٹا سنتا رہتا ہوں پھر اٹھ کر منہ ہاتھ دھوتا ہوں۔ نماز بھی اپنی کوشش پھر جمعہ کے جمعہ پڑھ ہی لیتا ہوں۔

اسلم: جب ایک مسلمان کے لئے دھوکے کی تجارت منع ہے تو پھر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں! یہ تو گناہ ہے!

سیٹھ: گناہ ۔۔۔ پیر قسم آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ مجھے گناہ کیوں ہو گا؟ تجارت کرتا ہے قاسم علی، میں رہتا ہوں بمبئی میں گھی بنتا ہے ہاپوڑ میں میں نے نہ آنکھ سے دیکھا نہ ناک سے سونگھا۔ پیر قسم میں تو صرف مہاجن ہوں روپیہ دے کر خلاص۔ جو سود ہوا سود اور منافع میں آدھا آدھا بس۔ اگر ہم روپیہ نہ دیں تو وہ کسی اور سے لے لے گا۔ گناہ ہو گا تو سالے قاسم علی کو ہو گا میرا کیا۔ اور اگر تھوڑا بہت ہوا بھی تو نیکیاں بھی کم نہیں کرتا ہوں نذر۔ نیاز۔ دان۔ خیرات۔ میلاد۔ چڑھاوے بھی کرتا ہی رہتا ہوں کئی مسجدیں بنوادیں۔ رسولا پور۔ جلال آباد۔ پیر گاؤں۔۔۔۔

اسلم: پیر گاؤں کی مسجد تو سیٹھ حاجی قادر نے بنوائی تھی؟

سیٹھ: بنوائی تھی تو کیا ہوا سب ہی تو اس نے بنوائیں تھیں مگر تیار کس نے کرائیں۔ سیٹھ قادر حج کر کے آیا تو میں نے کہا اب دو چار مسجدیں اور بنوا دے نیک نام رہے گا۔

اسلم: (مسکراتے ہوئے) خوب مسجدیں بنوائیں حاجی قادر نے اور ثواب ہو گا آپ کو!

سیٹھ: کیوں نہیں ہو گا۔ اس کا ایک لاکھ لگا ہے جوڑیئے تو کم از کم پانچ روپیہ سیکڑہ دستوری کے حساب سے میرا کتنا ہوا۔ میں نے ایک پیسہ نہیں لیا۔ پھر لوہے کا پرمٹ نکلوا کر میں نے جس کو بیچا تھا اس سے تھوڑا لوہا۔ سیمنٹ بھی لے کر مسجدوں میں لگا دیا۔

(پس منظر میں ہارمونیم اور تالیوں کی آواز کے ساتھ قوالی کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ اے ہے وا۔۔۔۔ مسجد میں نہیں مندر میں نہیں ۔۔۔۔ آں ۔۔ ں ۔۔۔ مسجد میں نہیں مندر میں نہیں۔ مسجد میں نہیں مندر میں نہیں۔ ہاں۔۔۔۔ لینا ہے تو لے لے خواجہ سے اے ہے وا (تالیوں کا شور) باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے کوئی گنگناتا ہوا آ رہا ہے ۔ "لینا ہے تو لے لے خواجہ سے"۔ دروازہ پر کھنکارنے کی آواز کے بعد کوئی پکارتا ہے۔ میں نے کہا اندر آ سکتا ہوں۔

حضرت جی: آئیے شیخ صاحب تشریف لائیے۔

(شیخ صاحب تشریف لاتے ہیں ۔۔۔ نقدی ان کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔

شیخ صاحب: (دو چار کش لے کر) لطف آگیا۔ کیا دودھری آواز میں ... گایا ہے ... سنایا ہے۔

سیٹھ: (اٹھتے ہوئے) اچھا حضور مجھے اجازت دیجئے۔ تجارت کے بارے میں سوچ لیجئے گا۔ مجھے کل واپس جانا ہے۔

اسلم: اجی بس معاف رکھئے۔ ایسی تجارت آپ ہی کو مبارک۔

سیٹھ: (بیٹھتے ہوئے) ہیں۔؟ حضور سنتے ہیں صاحبزادے کیا فرما رہے ہیں؟

حضرت جی: ابھی بچے ہیں.....

اسلم: خیر یہ تو بچنے کی بات نہیں۔ میں تو ایسی تجارت کو دھوکہ دے کر روپیہ کمانا سمجھتا ہوں.....

شیخ صاحب: بھئی کیا بات ہے کچھ میں بھی تو سنوں کیسی تجارت؟

حضرت جی: اماں یہ سیٹھ صاحب مجھ گھی کی تجارت کرنے کو کہہ رہے تھے۔

اسلم: جی گھی نہیں گھی کے نام پر چربی اور مونگ پھلی کے تیل کی تجارت!

شیخ صاحب: بھئی تجارت تو آج کل اسی کا نام ہے! تجارت میں آج کل ایمان داری کہاں رکھی ہے۔

اسلم: مگر مسلمان کو تو ایسی تجارت میں حصہ نہیں لینا چاہیئے۔ کیوں کہ اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

شیخ صاحب: اجی تجارت میں آج کل اسلام کہاں چلتا ہے، سود لینا۔ سود دینا۔ جعلی کھاتے رکھنا۔ رشوت دینا۔ بلیک کرنا۔ تجارت تو آجکل اسی کا نام ہے

اسلم: اگر اسی کا نام تجارت ہے تو اسلام میں حرام ہے۔ مسلمان جب اسلام کو مانتا ہے تو اس کے دیئے ہوئے اصولوں کو بھی ماننا ہوگا چاہے
وہ عبادت کے بارے میں ہوں چاہے سیاست اور تجارت کے بارے میں!

شیخ صاحب: سنتے ہیں حضور۔ یہ سیاست جیسی پیچیدہ چیز میں بھی اسلام کو گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ واللہ بس آپ جیسے دو چار اور مل جائیں تو ہندوستان کے مسلمانوں کا بیڑا پار ہے۔ نوکری حکومت نہیں دیتی۔ تجارت تم نہیں کرنے دیتے۔ ہم لوگ کیا گھاس کھا کر زندہ رہیں گے۔

حضرت جی: اسلم تم خاموش رہو۔

اسلم: میں خاموش ہوئے جاتا ہوں مگر جو بات سچ تھی وہ کہدی تو اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے۔

حضرت جی: ارے بھئی پھر پیسہ کہاں سے آئے۔ تمہیں پڑھائیں کیسے۔ گھر کا خرچ کیسے چلے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ عرس کا اب کیا حال ہے۔ اس سے تو سال بھر کیا دو مہینہ کا خرچ نکلنا مشکل ہے۔

اسلم: میں درگاہ کی آمدنی کے کھانے کو بھی غلط سمجھتا ہوں.....

شیخ صاحب: (آنکھیں پھاڑ کر) ایں یک نہ شد دو شد!

حضرت جی: (جلال میں آتے ہیں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے) کیا بک رہا ہے۔ یہ غلط ہے؟ اور تیرے باپ دادا جو اسی کو کھا کھا کر پلے بڑھے وہ گویا حرام کھاتے رہے؟

اسلم: میں یہ کب کہہ رہا ہوں۔

حضرت جی: (طیش میں آکر) نہیں کہا تو اب کہہ لے۔ نمک حرام۔ ذلیل۔ دیکھیں تو خود کونسا پیسہ کھاتا ہے۔ آیا بڑا مسلمان کہیں کا۔!

اسلم: مجھے ایسے پیسہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ٹیوشن کر کر کے پڑھوں گا۔

حضرت جی: جا پڑھ جا کے۔ نکل۔ جا ابھی نکل جا اس گھر سے۔ کمینہ۔ مردود، جا منہ کالا کر!

اسلم: جی میری گاڑی کا وقت بھی ہو گیا میں چلا جاتا ہوں سلام علیکم (چلا جاتا ہے)

(باقی بر صفحہ ۴۳)

شاہدہ پروین - ایم اے

اقبالؒ کی نگاہ میں عورت کا مقام

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ　　　اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں!
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن　　　اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں!

انسان کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ جب بھی اپنے دینی نظامِ حیات سے علیحدگی اختیار کی ہے، اس کے افکار و اعمال باطل کے راستے پر چل نکلے ہیں اور اس کے عقل و تدبر کے چراغ ہمیشہ باطل کے تصور کو روشن کرتے رہتے ہیں۔ عورت جو کائنات کی ایک اہم، پاکیزہ، نازک اور مقدس ہستی ہے۔ وہ ایک لادینی سرمایہ دارانہ طریقہ حیات میں ہمیشہ ایک کھلونے کی حیثیت سے کھیلی گئی ہے۔ قدیم تاریخِ انسانیت سے لے کر آج تک اگر ہم عورت کی حیاتِ مجموعی پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا کہ کسی غیر اسلامی سرمایہ دارانہ نظامِ حیات میں عورت کو ایک کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں دی گئی۔ قدیم بابل و نینوا کی تاریخ سے لے کر موجودہ بیسویں صدی تک اگر ہم عورت کے افکار و اعمال اور اس کی مساعی کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ نظر آجائے گا کہ عورت ہمیشہ مرد کے سفلی خواہشات کا نشانہ رہی ہے۔ سوائے ان عورتوں کے جنہوں نے سلیم الطبع انسانوں کے ساتھ زندگی بسر کی۔ عورت کو تاریخ کے کسی دور میں جب بھی کوئی صحیح اور صالح درجہ دیا گیا ہے تو وہ دینِ الٰہی نے دیا ہے۔ خواہ وہ کسی شکل میں رہا ہو اور کسی نام سے موسوم ہوا ہو، اس کی شکل ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ لیکن اسی دین کے ماننے والوں نے جب اس الٰہی نظریہ حیات کو بدل کر اپنی خواہشات کے مطابق کیا ہے تو عورت پھر ایک کمتر اور ذلیل درجے پر آگئی ہے۔ اور اسے نفس کی تکمیل کا ایک ذریعہ سمجھا گیا ہے۔

قدیم بابل میں عورتوں کو مذہبی حیثیت سے ایک مقام حاصل تھا اور وہ مذہبی دیوداسیاں سمجھی جاتی تھیں، جن کا کام اپنے رقص و سرود سے دیوتاؤں کو خوش کرنا اور اپنی نسوانی حسن و رعنائی سے ان کے دلوں کو موم کرنا ہوتا تھا، تاکہ وہ اس مذہبی سرمایہ دارانہ نظامِ حیات پر اپنے جوش و غضب کی بجلیاں نہ گرا سکیں۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان دیوداسیوں کے رقص و سرود اور ان کی حسن و رعنائی ان پتھر کے فرضی دیوتاؤں کے بجائے مندروں کے پجاریوں اور مہنتوں کو زیادہ خوش رکھتی تھیں اور وہ ان کے چشم و ابرو کا نشانہ بنتی تھیں!

ہندوستان جو عورتوں کی عزت اور ان کی برتری کو تسلیم کرنے میں بہت پیش پیش رہا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ وہاں عورتوں کو بہ حیثیت دیگر ممالک کے ایک باوقار درجہ دیا گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہاں بھی ان عورتوں پر برہمنوں، مندر کے پجاریوں اور پروہتوں کا زیادہ اثر تھا۔ انہیں جو بھی مذہبی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی حقوق دیئے گئے تھے وہ سب ان کے لئے ناکافی اور باعثِ تحقیر تھے!

عورتوں کو جو مذہبی درجہ دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ ان برہمنوں کو پوجیں اور ان سے زیادہ ان کا خیال رکھیں! معاشرتی اور سماجی حیثیت سے جو درجہ انہیں عطا کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ شوہر کی غلام بن کر رہیں اور صرف شوہر ہی کی نہیں بلکہ پورے سسرال والوں کی!

چودہ سالہ دوشیزہ کی شادی ایک ساٹھ سالہ بڈھے سے ہو سکتی تھی اور اگر وہ مر جاتا تھا تو پھر اس غریب کو اپنی پوری زندگی سسرال والوں کی غلامی میں
بسر کرنی پڑتی تھی اور خود اس کے لئے اس کے والدین کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے تھے یا پھر وہ اپنی تمام آرزوؤں کا خون کرکے
آگ کی نذر ہو جاتی تھی۔ ہندی سماج میں عورتوں پر اس سے بڑھکر اور زیادہ ظلم کیا ہو سکتا تھا کہ اپنے شوہر کے مرجانے کے بعد زندہ اس کے
ساتھ آگ میں جل جانا پڑتا تھا، اس ظلم کو برہمنوں نے ایک مذہبی شکل دیدی تھی۔

یہ ستی کی رسم برہمنوں کی خود ساختہ ایجاد تھی ورنہ دنیا کے کس دینِ ربانی نے کسی انسان کو خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ جلانے کی اجازت کبھی
نہیں دی ہے۔ مگر یہ برہمن تھے جنہوں نے اپنے وقار کے لئے ستی کی ظالمانہ رسم کو ایجاد کیا تھا۔ عورت کو اپنے والدین کی ملکیت میں کوئی
حق حاصل نہیں تھا۔ ان مثالوں سے یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ قدیم ہندی سماج میں عورتوں کو کون سا مقام حاصل تھا اور اب بھی جو مقام دیا گیا ہے
وہ کہاں تک صحیح ہے!

مسیحی دنیا کی ایک علیحدہ نرالی شان تھی۔ جس پر مذہب کے پہلے در پئے، بیزیدوے پڑے ہوئے تھے۔ عیسائی پادریوں نے روزِ ازل سے
عورت پر یہ الزام لگایا تھا کہ جنت میں حضرتِ آدم کو شجرِ ممنوعہ کھلانے یا اس کے نزدیک لے جانے کی ذمہ داری بھی اسی (ذات بزرگ) یعنی عورت
پر تھی! اس طرح پوری صنفِ عورت کو مردود قرار دے دیا گیا تھا اور اسے مردوں کے لئے باعثِ گناہ سمجھا جاتا تھا۔ (اگرچہ یہ ایک علیحدہ بات ہے
کہ یورپ کے اطارقہ پادری اور قسیس کہاں تک اس گناہ کو چھونے کے لئے تیار تھے) چنانچہ پندرھویں صدی تک مسیحی دنیا میں عورتوں کو وہ حقوق نہیں دیئے
گئے جو انہیں دینا چاہئے تھا۔ اس کے بعد اسلامی اثرات کی وجہ سے جو حقوق انہیں عطا بھی کئے گئے وہ ناکافی تھے۔ عربوں کی جو حالت تھی وہ معلوم
ہی ہے۔ زردشتیوں کے یہاں بھی عورتوں کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں تھا۔ غرض چھٹی صدی عیسوی تک عورتوں کی یہ حالت تھی کہ وہ مذہبی اور
سرمایہ دارانہ طریقوں پر مردوں کی غلام تھیں اور ان کے پنجۂ ظلم میں جکڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ اسلام کی منور کرنیں کوہِ فاران سے
چمکیں اور انقلابِ اسلامی کی چنگاریوں نے حیاتِ انسانی کو نئی روشنی بخشی۔ اسلام نے جہاں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں انقلاب لایا وہاں
اس نے عورتوں کے حقوق بھی محفوظ کر دیئے۔ اور یہ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق عطا کئے وہ دنیا کی کوئی دوسری قوم
یا کوئی دوسرا نظریۂ انقلاب اب تک نہ دے سکا ہے اور نہ دے سکتا ہے جب تک کہ وہ اسلامی نظریۂ حیات کی خوشہ چینی نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو
حقوق بھی عورتوں کو دیئے گئے وہ اس کی خودداریوں کو بڑھانے کے لئے نہیں بلکہ اس کی نسوانیت سے کھیلنے کے لئے۔ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق
دیئے اس میں سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ اس نے عورتوں پر سے اس الزام کو رد کیا جو مسیحی دنیا نے اس پر لگایا تھا اور قرآن نے یہ اعلان کر دیا کہ شجرِ
ممنوعہ کھانے یا اس جانے کی ذمہ داری مرد اور عورت دونوں پر تھی۔ شیطان نے دونوں کو بہکایا تھا۔ قرآن شریف میں ذاتِ باری نے کئی مقام پر
اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (خیر یہ تو ایک دینی مسئلہ ہے جس کے وضاحت کا یہ موقع نہیں) اس کے علاوہ بھی اسلام نے عورتوں کو جو
حقوق عطا کئے اس میں عورتوں کو سماج اور سوسائٹی میں ایک بلند اور باعزت مرتبہ دیا۔ اسے ملکیت میں حصہ دار قرار دیا۔ مردوں پر عورتوں کی
ذمہ داری مقرر کی۔ عورتوں کو شادی کے معاملہ میں پسند اور ناپسند کا حق دیا۔ شوہر اور بیوی دونوں کے حقوق یکساں مرتب کئے۔ اگر مرد کو طلاق کی اجازت
دی تو عورتوں کو بھی خلع کا حق دیا۔ عورتوں کو پردے کا حکم دے کر انہیں گھر کی مالکہ قرار دیا اور ایک باعزت مقام عطا کرکے سوسائٹی کے ہاتھوں
میں کھلونا بننے سے بچا لیا۔ عورتوں پر ہر اس قسم کی پابندی لگائی جو انہیں شمعِ مجلس بننے سے بچائے۔ عورتوں پر رقص وسرور اور
بے پردگی کا امتناعی حکم لگا کر اسے سرمایہ داروں اور نفس پرست امراء کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے بچا لیا۔ یہاں پر ایک بات قابلِ ذکر ہے۔

مسیحی دنیا کی طرف سے مسلمانوں کی چار شادیوں پر تیر و نشتر کے جتنے حملے کئے گئے ہیں، شاید ہی کسی دوسرے مسئلے پر کئے گئے ہوں اور عیسائیوں کے نزدیک مسلمانوں کی چار شادیاں ایک ہوّا معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان کو یہ نہیں معلوم کہ اسلام نے مسلمانوں کو چار شادیوں کی اجازت دے کر (جو مختلف شرائط کے ساتھ مشروط ہے، اور ہر مسلمان کے لئے ضروری نہیں) جن خطرات کے دروازے بند کر دیئے تھے، مسیحی دنیا نے اپنے پیروؤں کو ایک شادی کی اجازت دے کر ان سارے خطرات کے دروازے کھول دیئے۔ اور کیا مسیحی دنیا آج اس بات کا جواب دے سکتی ہے کہ اس کی سوسائٹی اور سماج میں کتنے فیصدی لوگ ایک پاکیزہ اور باعصمت زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر ان کی پاکیزہ زندگی کا مطالعہ کرنا ہو تو HISTORY OF CRIMES IN AMERICA یا PROSTITUTION IN ENGLAND پڑھئے، اس سے پتہ چل جائے گا کہ دنیا کی ان سب سے بڑی مہذب قوموں کی اخلاقی حالت کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں برطانیہ کی مشہور ناول نگار خاتون مارگریٹا لاسکی نے برطانیہ میں جنسی بے راہ روی کے متعلق جو بیان دیا ہے اس سے وہاں کی اخلاقی حالت کا اندازہ ہو سکے گا۔ ملاحظہ ہو روزنامہ جنگ مورخہ ۳ دسمبر ۵۵ء۔ اسلام نے ان سارے چور دروازوں کو بند کر دیا تھا لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے، خود مسلمانوں کے ایک سرمایہ پرست طبقے نے اسلامی سیاست کی ساری بساط الٹ دی اور اسلامی خلافت کو پارہ پارہ کر کے اسے نسلی شہنشاہیت میں تبدیل کر دیا پھر رفتہ رفتہ اسلام میں وہ سارے فتنے نفوذ کرتے چلے گئے جو دور جہالت کا خاصہ تھے! شراب و کباب کا دور شروع ہوا اور رقص و سرود کی مجلسیں جمیں اور اس طرح جمیں جس کی مثال دنیا کے ہر سرمایہ دار طبقہ میں ملتی رہی ہے۔ شراب نوشی کا لازمی نتیجہ عورت کی تذلیل ہے چنانچہ مسلمانوں میں بھی شراب نوشی کے ساتھ ساتھ رقص و سرود کی گھٹائیں اٹھیں، برسیں اور سارے سماج پر چھا گئیں۔ یہاں تک کہ آج تک اس کے اثرات باقی ہیں اور اپنے عروج کے لئے کوشاں ہیں! غیر مسلم ممالک کا تو ذکر ہی فضول ہے، اس لئے کہ ان کے یہاں تو رقص و سرود روز اوّل ہی سے ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور انہیں ایک مذہبی فنکارانہ اور آرٹ کا رنگ دے دیا گیا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں رقص و سرود اور ناچ گانے کو جو عروج حاصل ہوا وہ شاید ہی کسی اور زمانہ میں ہوا ہو۔ سارے ہندوستان میں رقص و سرود کی محفلیں برپا ہوتیں اور طوائفوں کا جمگھٹا ہوتا۔ اس کے لئے ہمیں کسی تاریخی شہادت کی ضرورت نہیں بلکہ صرف ان شعراء کا کلام کافی ہے جو ان ادوار میں پیدا ہوتے رہے۔ ملا وجہی سے لے کر اکبر الہ آبادی تک ہمیں ان طوائفوں کے متعلق اتنے واضح ثبوت ملتے ہیں جس سے انکار کسی صورت بھی ممکن نہیں۔ دوسری طرف ہمارے شعراء نے عورتوں کو جس نظر سے دیکھا وہ صرف معشوق کا درجہ تھا اور یہ معشوق زیادہ تر یہی بازاری عورتیں ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سفلی جذبات سے بھرے پڑے ہیں۔ خود علامہ اقبال نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! ان بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

طوالت کی وجہ سے میں صرف چند اشعار پر اکتفا کروں گا ورنہ ہمارے شعراء کے پورے دواوین ان حقائق سے بھرے پڑے ہیں۔ مومن کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں ؎

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو — ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو!
مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ — بدنامی عشاق کا اعزاز تو دیکھو!
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو!
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو!

اس غزل کی عقبی زمین خود اس بات کی غمازہ ہے کہ اشعار کن حقائق کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ خصوصاً آخری شعر "اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک" سے تو یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف اس ایک شعر میں شاعر نے حالتِ رقص و سرود کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے! آتش کی غزل دو اشعار ہیں ؎

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا
بناوٹ کیفِ مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ آتش کا معشوق بھی کوئی شاہد بازاری ہے جو شہ نشیں کا بیٹھنے والا ہے ورنہ منہ چڑانا اور گالیاں دینا کسی شریف کا پیشہ نہیں اور نہ کوئی شریف عورت شراب کا استعمال کر سکتی ہے! غالب کا ایک شعر ہے ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!

بزم، ساقی، دورِ جام اور شراب، اہلِ نظر خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ الفاظ کن حقائق کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ ان حقیقتوں کو صحیح طریقے پر جاننے کے لئے میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اور مرزا رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں مصنف نے بے نظیر کی پیدائش اور بدر منیر کے ساتھ اس کی شادی پر رقص و سرود کا جو سماں پیش کیا ہے اور مرزا رسوا نے "امراؤ جان ادا" کے پردے میں ہندوستانی طوائفوں کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ سرتاسر لکھنؤ کے ماحول کی ترجمانی ہے۔ اور یہ صرف لکھنؤ ہی نہیں تھا بلکہ کم و بیش تمام ہندوستان میں رقص و سرود کی مجلسیں برپا ہوتی تھیں اور شراب و شاہد کا دور چلتا تھا! جنوری ۱۹۳۲ء کے نگار میں نیاز فتح پوری غالب نمبر میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں "ایامِ شباب میں مرزا کو شراب و شاہد سے گہرا تعلق تھا، اس لئے عیش پرست سمجھے جاتے تھے"۔ عبد المنان بیدل عظیم آبادی عصرِ غالب کے متعلق لکھتے ہوئے فرماتے ہیں: "لکھنؤ میں ان دنوں تصنع، تکلف اور رعایت لفظی وغیرہ شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی۔ شعرائے لکھنؤ کا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے معرا نظر آتا ہے۔ اس کی کھلی ہوئی وجہ تو یہ ہے کہ لکھنؤ میں اس وقت دولت و مال کی فراوانی تھی۔ امرا لہو و لعب میں منہمک تھے اور نوابین رہینِ شراب و شاہد۔ لکھنؤ کا بچہ بچہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا شعرا کیوں کر بچے رہتے" نواب واجد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کے متعلق کسے نہیں معلوم۔ ان مثالوں سے کسی کی تحقیر و تذلیل مقصود نہیں بلکہ میں ان حقائق کو بتا کر یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس وقت کے ماحول میں عورت کا کیا مقام تھا اور مسلم سرمایہ پرستوں نے اس کو کیا درجہ دے رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعرا کے تمام کلام گل و بلبل، زلف و سنبل، خط و لب، زلف و کمر اور شراب و شاہد کی ترکیبوں سے بھرے پڑے ہیں اور ان سبھوں کا مرکزی کردار عورت ہے اور صرف عورت! اگرچہ کبھی کبھی مردوں پر بھی چوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس وقت کے سماج میں عورتوں کا کیا مرتبہ تھا۔ لیکن ہاں! یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اس وقت کے سماج میں بھی عورتوں کے دو طبقے تھے، ایک تو سرمایہ دار عورتوں کا طبقہ تھا جس میں شاہی خاندان، امرائے دولت اور نوابانِ مملکت کی بیگمات ہوتی تھیں اور جن کی برتری اور بزرگی سرمایہ دارانہ اور خاندانی حیثیت سے سماج پر حاوی تھی اور تسلیم کی جاتی تھی، اگرچہ وہ بھی مسلم سرمایہ داروں کے جسم و دل کا نشانہ تھیں! دوسرا طبقہ غریب عورتوں اور طوائفوں کا تھا، جو درحقیقت سرمایہ پرستوں کی غلام تھیں اور معاشی حیثیت سے ان کی دستِ نگر تھیں۔

یہ ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک کی حالت تھی۔ لیکن یورپ کی حالت بھی کچھ اس سے زیادہ بہتر نہیں تھی۔ وہاں بھی عورتیں سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھیں اور سرمایہ پرستوں نے سماج اور سوسائٹی کو جس رنگ میں ڈھالا تھا عورتیں بھی اسی رنگ میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ بلکہ یورپ کی حالت مشرقی ممالک سے کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ مشرقی ممالک میں یہ تو تھا کہ وہ عورتیں جو جائز طریقہ پر اپنے شوہر کی زوجہ تھیں ان کی بزرگی اور برتری سماج میں مسلّم تھی اور وہ باعزت نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ انہیں کسی ایسے کام کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا تھا، جو ان کے وقارِ نسوانی کو گرانے والا ہو۔ لیکن یورپ میں حالات اسکے بالکل برعکس تھے۔

سترھویں صدی کے صنعتی انقلابات کے بعد یورپ والوں نے اور خصوصاً انگلینڈ نے نئی تہذیب و تمدن کی بنیاد خالص مادہ پرستی پر رکھی اور مذہب کے خلاف انتقامی جوش میں سارے مذہبی اور دینی روایات کو ختم کر دیا۔ مذہبی اعتقادات ختم کر دیئے گئے۔ اور تہذیب و تمدن اور معاشرہ و سماج کی پوری عمارتیں ڈھا دی گئیں اور اسکی بنیاد پر ایک نئی عمارت کھڑی کی گئی جو اپنی فطرت اور اصلیت میں بالکل الحادی اور مادہ پرستانہ تھی۔ اخلاق و معاشرت کے نئے نئے نام دیئے گئے اور وہ چیزیں جو مذہبی حیثیت سے بری سمجھی جاتی تھیں، اچھی سمجھی جانے لگیں اور جو اچھی سمجھی جاتی تھیں بری اور وحشیانہ سمجھی جانے لگیں۔ یورپ میں الحادی مادہ پرستانہ تہذیب کے جو نئے سیلاب آئے انہوں نے دورِ گذشتہ کی پوری روایات کو اپنے ساتھ بہا ڈالا۔ سیاست کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی انہوں نے سماج اور سوسائٹی، تہذیب و تمدن اور تعلیم و معاشرت کی تخلیق اس حیثیت سے کی کہ عورت جو پہلے گھر کی ملکہ اور زینت تھی۔ اب شمعِ مجلس بن کر رہ گئی۔ عورتوں میں آزادی اور مساویانہ حقوق کی جو پُر فریب روح پھونکی گئی اسکے پیچھے دراصل ایک نفسیاتی بحران کا جذبہ شامل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے ہر پہلو میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش چلنے لگیں اور چونکہ تہذیب و تمدن کی اساس مادہ پرستی پر رکھی گئی تھی۔ اسلئے اخلاق و معاشرت کے وہ سارے نظریات جو پہلے بے حیائی اور بے شرمی میں داخل تھے اب عین باحیا اور باشرم سمجھے گئے۔ تعلیم و معاشرت کی ایک نئی تخلیق کے ساتھ عورتوں میں بے باکی پیدا ہوئی جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ عورتیں رقص و سرود، تھیٹر، سرکس، گھوڑ دوڑ، کلب اور زندگی کے ہر شعبہ میں بے باکانہ حصہ لینے لگیں ان کے لئے شرم و حیا کی اب کوئی قید نہیں تھی۔ اسلئے کہ انہیں اخلاق کے نئے فلسفہ کے ساتھ عین باحیا سمجھا جانے لگا۔ اب یورپ کی نگاہ میں بے حیائی، بے شرمی، عریانیت، فحاشی، مے نوشی، قمار بازی اور تمام دوسری اخلاقی برائیاں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں اور انہیں بالکل آزادانہ طریقہ پر سماج میں برتا جاتا تھا۔ یورپ نے عورتوں کو پروپگنڈہ کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا اور ان سے ہر طرح کا کام لے رہا تھا۔ علامہ اقبال نے انہی حقائق کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات!

بیسویں صدی تک یہ ساری باتیں درجۂ کمال کو پہنچ گئیں۔ ہندوستان بھی چونکہ انگریزوں کا غلام تھا۔ اور انکے ظالمانہ پنجے اسکی نس نس رگ رگ کو جکڑے ہوئے تھے اسلئے وہ ساری باتیں جو یورپ میں ظہور پذیر ہو رہی تھیں۔ ہندوستان کو بھی متاثر کر رہی تھیں۔ انگریزوں نے ہندوستان کو سیاسی طور پر غلام بنا لیا تھا اور اپنی حکومت عیاری، ظلم اور سنگین کے زور سے قائم کی تھی لیکن اس حکومت کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لئے ایک ایسی بات کی ضرورت تھی جو مستقل طور پر ان کی حکومت کی جڑ کو یہاں استوار اور گہرا کرے۔ خوش قسمتی سے یہ پالیسی لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کی شکل میں ظاہر

ہوئی۔ جس کی طرف خود علامہ نے بھی اشارہ کیا ہے ؎

اک روز فرنگی نے کہا اپنے پسر سے — منظر وہ طلب کر کہ تیری آنکھ نہ ہو سیر
بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم — برّے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

تعلیم کی یہی تیزابی کیفیت تھی جو ہندوستانی نوجوانوں کے اخلاق و کردار کو زنگ کی طرح چاٹ رہی تھی!

اقبال کی نگاہ میں عورت کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ عورت کو کائنات کا سب سے حسین پھول سمجھتا تھا۔ اس کی نظر میں عورت انسانیت کا تاج اور کائنات کی عزت بھی۔ عورت کائنات کا وہ حسین پھول ہے جس کی حفاظت مرد کے ذمہ ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔ دنیا کے سارے انسان سوا حضرت آدمؑ کے عورت ہی کی گود میں پلے، بڑھے اور پروان چڑھے! ہم مردوں کی اس صف میں بڑے بڑے پیغمبر، بڑے بڑے فاتح اور عظیم مدبرانِ قوم و ملک کو پاتے ہیں جنہوں نے اپنی بقائے حیات کے لئے عورت ہی کے دامن عاطفت میں پناہ لی۔ ہمیں مردوں کی اس صف میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ و موسیٰؑ اور محمد مصطفیٰؐ جیسے جلیل القدر پیغمبران کرام بھی ملتے ہیں۔ سکندر ذوالقرنین، حضرت خالدؓ، ابوعبیدہؓ، موسیٰ بن النصر اور طارق ابن زیاد جیسے فاتح اعظم بھی نظر آتے ہیں۔ ہمیں اس صف میں سکندر، چنگیز، ہلاکو اور تیمور جیسے ہلاکت آفریں انسان بھی دکھائی دیتے ہیں ہم اس صف میں بقراط، افلاطون، ارسطو، ابوجافس کمی، ابنِ رشد اور امام رازی جیسے فلسفی بھی پاتے ہیں! ہمیں اس صف میں جالینوس، بقراط، بوعلی سینا اور ضیا ابن بیطار جیسے حکما بھی نظر آتے ہیں! ہم اس صف میں نیوٹن، ہرشل، ہیکسول اور آئنسٹائین جیسے سائنسدانوں کو بھی دیکھتے ہیں۔ ہمیں اس صف میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عمر بن عبدالعزیز اور اورنگ زیب جیسے مدبرانِ مملکت اور فاتحِ انسانیت بھی نظر آتے ہیں۔

غرض کہ ہم زندگی کے جس شعبے میں جلیل القدر انسانوں کی فہرست پر نظر ڈالیں ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ سارے انسان عورت ہی کے گود میں پلے، بڑھے اور پروان چڑھے! یہی وجہ تھی کہ اقبال یورپ کی اس مادہ پرستانہ تہذیب اور عورت کی عیارانہ تذلیل پر بے چین ہو گیا اور بے اختیار پکار اٹھا ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں!
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں!
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن! — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اقبال کی نگاہ میں عورت تصویرِ کائنات کا رنگ ہے اور شرف کی بلندی میں اس کا مقام ثریا کی بلندی سے بھی زیادہ ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہر وہ دُر جس کی تفصیل ہمیں حیاتِ انسان کی فہرست میں ملتی ہے اور جس کا ایک ہلکا سا خاکہ میں ابھی اوپر دے چکا ہوں عورت کا درِ مکنوں ہے اور اس کی تخلیق اسی کے خونِ جگر کی رہینِ منت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عورت اپنے اس فطری حق اور بزرگی کو نہ دیکھے یا اس غریب کو سمجھایا نہ گیا ہو!

اقبال ان معنوں میں بھی عورت کو ملزم نہیں گردانتا، بلکہ اس کی فطری معصومیت کا قائل ہے اور اس کی شرافت کا گواہ! قصور دراصل اس فرنگی معاشرت اور سرمایہ دارانہ نظامِ حیات کا ہے جس کی بنیاد ملحدانہ تصورِ حیات پر اٹھ گئی ہے اور جس کو بڑھانے والے یہ عیارانِ افرنگ اور ان کے

غلام نفس پرست سرمایہ دار ہیں۔ چنانچہ اقبال خود کہتا ہے!

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں!

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں!

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں!

اقبال کی نظر میں عورت کی شرافت مہ و پرویں سے بڑھ کر ہے اور اس کی شرافت پر شبنم کے موتی نچھاور ہیں۔ اس کی نگاہ میں عورت کی یہ عزت اس لئے نہیں ہے کہ عورت حسن کی ایک دیوی ہے، یا تکمیلِ نفس کا ایک ذریعہ اور خواہشاتِ نفسانی کے پورا کرنے کا ایک آلہ۔ بلکہ یہ اس لئے ہے کہ عورت عالمِ انسانیت کی ماں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ تمام انسان عورت ہی کی گود میں پلے۔ اقبال کا یہ تصور در اصل اسلامی تصور ہے اور اسی تصور نے اس کو یہ جذبۂ بلند عطا کیا ہے۔ لیکن در اصل تصور یہ اس غیر اسلامی نظریہ حیات اور فرنگی معاشرت کا ہے جس کی بنیادیں لادینی فلسفۂ حیات پر رکھی گئی ہیں، اور اسی فلسفہ کے مطابق اسے ایک لادینی تعلیم دی جا رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ، اپنے وجود کے مقصد کو نہ سمجھنا اور اپنے فطری حقوق سے محروم رہنا ہے۔ فطری حقوق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت کو خواہ مخواہ میدانِ جنگ میں گھسیٹ لایا جائے (گو یہ بعض خاص حالات کے لحاظ سے عورت کو بھی جنگی تعلیم دی جا سکتی ہے اور اسے میدانِ جنگ میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن عیاشی اور نفس پرستی کے لئے نہیں، بلکہ قومی دفاع اور دین و مذہب کے بچاؤ کے لئے) یا اسے سیاسی بازی گری کا مہرہ بنا لیا جائے۔ بلکہ فطری حقوق کا مطلب یہ ہے کہ عورت کو وہ تمام حقوق دیئے جائیں جو دین نے انہیں دیئے ہیں اور قدرت نے اسے جس مقصدِ حیات کے لئے تخلیق کیا ہے اسے ایک باعزت طریقے پر برتا جائے اور سوسائٹی میں ایک باعزت مقام دیا جائے جو اس کی ذاتی بڑائی کو بڑھانے والا ہو نہ کہ گرانے والا۔ لیکن ہمارے یورپی فلاسفروں نے دانستہ یا نادانستہ تعلیم کا جو درس مقرر کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عورت سے قوتِ نسوانی اور اس کے صالح جذبات کو چھین لیا جائے اور اسے اسٹیج کی ایک تتلی بنا کر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اقبال اس طرزِ تعلیم کے خلاف پر زور طریقہ پر احتجاج کرتا ہے ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت!

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت!

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت!

لادینی تعلیم کا لازمی نتیجہ خودی کی موت ہے۔ اور ایسی تعلیم معاشرۂ انسانی کے لئے زوال کا باعث ہے۔ لیکن یورپ کے اربابِ ہنر اور ان کے ساختہ پرداختہ ہندوستانی فلاسفروں نے تعلیم کا جو طریقہ رائج کیا تھا وہ عورتوں کی خودداری اور ان کے وقار کو گرانے والا تھا۔ در حقیقت ہندوستان میں انگریزوں نے تعلیم کا جو نصاب تیار کیا تھا اس کے پیچھے ایک گہری سیاسی چال تھی۔ اقبال نے خود انگریزی تعلیم سے گزر کر اس چال کو پا لیا۔

اور یہ پیرانِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف!

انگریزوں نے ہندوستان کو عیاری، سیاست اور سنگین کے زور سے حاصل کیا تھا۔ وہ ان کے جسموں پر قابض ہو گئے تھے لیکن ہندوستانیوں کے دماغ ابھی آزاد تھے، ان کے خیالات اور افکار آزاد تھے اور ان کے دماغ میں حکومت کا نشہ باقی تھا۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو ذہنی طور پر غلام بنانے کے لئے انگریزی تعلیم کا طریقہ رائج کیا اور اس کا نصاب جس طرح منتخب کیا وہ ہندوستانیوں کو دماغی حیثیت سے غلام بنانے کے

لے عیاری' انگلش کے لفظ کو زیادہ موزوں سمجھتا ہوں۔ شاہد پرویز)

کے لئے تھا۔ چنانچہ اس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوا۔ دوسری طرف اس تعلیم کا مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی ادب اور تعلیم سے روشناس کرا کے انگریزی تہذیب کا رعب بٹھایا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے اور نہایت کامیاب ہوئے۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے عملی حیثیت سے بھی ہندوستان میں بے حیائی اور بے شرمی کو رواج اور فروغ دیا۔ چنانچہ ڈرامہ، تھیٹر، ناٹک، سرکس اور سینما کے ذریعے ملک میں بے حیائی اور بے شرمی کو عام کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نصاب تعلیم میں رقص و سرود اور موسیقی کو بھی داخل کیا گیا۔ کالجوں میں اکثر ڈرامے بھی کھیلے جانے لگے۔ اس طرح ملک میں ایک عام بے حیائی اور بے شرمی کے ماحول کو پیدا کیا گیا۔ اور اسے ترقی پسندی اور روشن خیالی سمجھا جانے لگا۔ مسلمان گھرانوں کی وہ شریف لڑکیاں جن کی شرافت کی گواہی دی جاتی تھی اب بے پردہ اور بے حیا پھرنے لگیں اور اسٹیج پر تو کتنی ناچتی اور کودتی نظر آئیں۔ انگریز عیاروں اور ان کے غلاموں نے اسے ترقی پسندی کے نام سے موسوم کیا۔ ہندوؤں کے بعض طبقوں میں یہ باتیں پہلے سے موجود تھیں ان کے رقص و سرود کو مذہبی درجہ حاصل تھا لیکن انگریزوں کے آنے سے پہلے ان کے یہاں بھی بے حیائی اور بے شرمی نہیں تھی اور ہندوؤں کے شریف گھرانوں میں یہ باتیں معیوب سمجھی جاتی تھیں لیکن یہ انگریزی تعلیم کا اثر تھا کہ ان کے یہاں بھی بے حیائی اور بے شرمی داخل ہو گئی اور اب اپنے عروج پر ہے۔

اقبال کی نگاہ میں یہ تمام باتیں موت سے بدتر تھیں۔ وہ عورتوں کا اپنی خودداری اور اپنی عزت کے لئے مر جانا پسند کر سکتا تھا لیکن یہ پسند نہیں کر سکتا تھا کہ عورت مرد کے سامنے عریاں اور ذلیل ہو جائے۔ چنانچہ وہ دردناک حیثیت سے نوا پیرا ہوا ہے

چھوڑ یورپ کے لئے رقصِ بدن کے خم و پیچ روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی!
صلہ اس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی!

اقبال یہ پسند نہیں کر سکتا تھا کہ ایک عورت مرد کے سامنے ناچے اور اپنے وجود اور اپنی خودداری کو ذلیل کرے، اپنی نسوانیت کو کھو دے اور اپنے وقار کو گنوا دے! وہ عورت کا مر جانا پسند کر سکتا تھا کہ عورت اپنے آپ کو ذلیل کر دے اور سرمایہ داروں کے تیر ہوس کا نشانہ بنے۔ کیوں؟ اس لئے کہ عورت انسان کی ماں ہے۔ کائنات کی شرم ہے اور زمین کی لاج ہے۔ قومیں اسی وجہ سے ذلیل اور گمراہ ہو جاتی ہیں اور بالآخر فنا ہو جاتی ہیں۔

اقبال اگرچہ ذاتی طور پر پوری صنف عورت کی بزرگی اور بڑائی کا قائل تھا۔ اس لئے کہ تمام عورتیں اس کی نگاہ میں یکساں اور مساوی درجہ رکھتی تھیں۔ وہ تمام عورتوں کی تکلیف، دکھ درد اور مصیبت کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا ؎

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود!

لیکن ایک مومن عورت کا مقام اس کی نگاہ میں چاند اور سورج سے بھی بلند تھا۔ وہ ایک مومن عورت کو اپنی بزرگی، بڑائی اور خودداری کی حیثیت سے ثریا سے بھی بلند دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غیر مسلموں کے یہاں رقص و سرود کو ایک مذہبی درجہ دے دیا گیا تھا۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں تھا اسلام میں رقص و سرود اور موسیقی شرعاً ممنوع ہیں۔

اس کے علاوہ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ مومن عورتیں جن کی مثال حضرت مریمؑ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت خولہؓ اور حضرت رابعہ بصریؒ کی ذات گرامی میں ملتی ہے، وہ آج یورپ کے بتائے ہوئے طریق زندگی کے مطابق رہتا ہو رقص، مرتھا گراہم، جون ویکلے، این فرانسس اور نرگس و ثریا کی مثال پیش کریں! اس کے نزدیک یہ حالات موت سے بدتر تھے۔

تیسری وجہ یہ بھی تھی کہ عورتیں دنیائے نسائیت کے ان مقام پر بڑے بڑے ہیرو زکو پیدا کرتی رہی ہیں جن کی ایک مختصر فہرست میں اوپر دے چکا ہوں!

اقبال عورت کو ایک بلند مقام دینا چاہتا تھا۔ ایک ایسا مقام جو اسے سماج یا سوسائٹی میں بلند اور فائق مرتبہ دے، ایک ایسا مرتبہ جو اس کی خودداری اور نسوانیت کو بڑھانے والا ہو۔ وہ عورت کو عصمت و عفت کی دیوی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ عورت اپنے اصل مقام کو پہچانے اور کائنات میں جو فرائض اس پر عائد کئے گئے ہیں اسے پورا کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں اسی وقت ہو سکتی تھیں جب کہ عورت کو صحیح تعلیم دی جائے اور اسے اس کے اصل مقام سے روشناس کرایا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عورت کی تعلیم کا مخالف نہیں تھا۔ لیکن وہ ایسی تعلیم نہیں چاہتا تھا جس سے عورت ایک شمعِ محفل یا اسٹیج کی تتلی بن جائے بلکہ وہ ایسی تعلیم چاہتا تھا جو اس کے جذبۂ نسوانیت کو بڑھانے والی، اس کو اپنی عصمت و عفت کی حفاظت پر مجبور کرنے والی، اس کی خودداری اور عظمت کو بڑھانے والی، اور اس کے منصب و وقار کو بلند کرنے والی ہو۔ اور یہ تمام باتیں اسی وقت پیدا ہو سکتی تھیں جب کہ عورت کے اندر دین کو سمجھنے کا صحیح جذبہ پیدا ہو۔

لیکن عورت کی تمام خرابیوں کے لئے وہ مرد ہی کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ مرد ہی سماج اور سوسائٹی کا وہ عنصر ہے جو اپنے نظریات اور فلسفۂ اخلاق کی بنا پر سوسائٹی اور سماج کی تشکیل کرتا ہے اور اگر وہ دینی نظریۂ حیات کو چھوڑ دے تو پھر اس کے لئے لادینی فلسفۂ حیات ناگزیر ہو جاتا ہے جس کا لازمی اور آخری نتیجہ تباہی و بربادی اور فنائیت ہے۔ لہٰذا اقبال اس حقیقت کی ذمہ داری بھی مردوں پر ڈالتا ہوا یہ بتلاتا ہے کہ ؎

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد!
نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد!
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد!

اقبال کے سینے میں یہی حقیقت پوشیدہ تھی کہ عورت کی حفاظت خود اس عورت کی حفاظت نہیں ہے بلکہ ایک قوم کی حیات و موت بھی اسی ایک حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ ؎

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد!

اس ایک شعر میں اقبال نے قوموں کے عروج و زوال کی حقیقت افروز مثال بیان فرمائی ہے۔ یونانیوں سے پوچھ لیجئے کہ ان کے زوال کا باعث کون سی چیزیں ہوئیں۔ رومن یہ بتا دیں گے کہ ان کے زوال کی کیا وجہیں تھیں۔ بنو عباس یہ پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم تاتاریوں کی تلوار کا نشانہ اس لئے بنے کہ ہمارے محلات سے رقص و سرود کی جھنکاروں کی صدائیں آتی تھیں اور شراب و کباب کے شیشے آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ خود مغل اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کا وجود اس لئے مٹ گیا کہ انہوں نے عورت کو شراب اور شراب کو عورت جانا۔ فرنگیوں کا یہی عیش پرستانہ ماحول تھا جس کے بڑھتے ہوئے اثرات میں، رزق کی کمی پر ضبطِ تولید کا اصول مرتب ہوا اور جس نے عیش و عشرت کی دوسری نئی راہ دکھائی۔ علامہ اقبال نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ؎

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے — ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش!
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بیکار و زن تہی آغوش!

عصمت کی تہی آغوشی یورپ کے صنعتی تمدن کا ایک لازمی نتیجہ تھی اور آج بھی یہ موضوع اربابِ یورپ کے لئے اتنا ہی ناقابلِ حل ہے، جتنا ہلاکس کے وقت میں تھا!

اقبال کے نزدیک ان ساری خرابیوں کی جڑ وہ لادینی تعلیم ہے جس کا درس یورپ نے ساری قوموں کو دیا اور اب تک دے رہا ہے اور جسے حاصل کر کے ان کے اندر بے باکی، بے حیائی اور بے شرمی پیدا ہو رہی ہے۔ جسے حاصل کر کے عورتیں اپنے مقصدِ وجود کو بھول گئی ہیں اور ان کے سامنے انسانیت کی صحیح منزل گم ہو گئی ہے! ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انسان کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

اس لادینی تعلیم کا یہ لازمی نتیجہ تھا اور ہے کہ عورتوں میں مردانہ پن کے جذبات پیدا ہوں جو بالکل ایک غیر فطری عمل ہے اور جس کا اتباع کرنا ان کے وقارِ نسوانی کی تذلیل ہے۔ لیکن یورپ کے ان سیاسی بازیگروں نے جن کا مقصد ہمیشہ سے مکارانہ تجارت رہی انہوں نے دیکھا کہ وہ قوموں کو اس وقت تک ذہنی حیثیت سے غلام نہیں بنا سکتے جب تک کہ ان کو تعلیم کا زہر شکر کے ساتھ گھول کر نہ دیا جائے، جس کے پیتے ہی ان کی ساری خودداری اور غیرت و حمیت مردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور آج اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارا کیا حشر ہو رہا ہے اور وہ اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہیں!

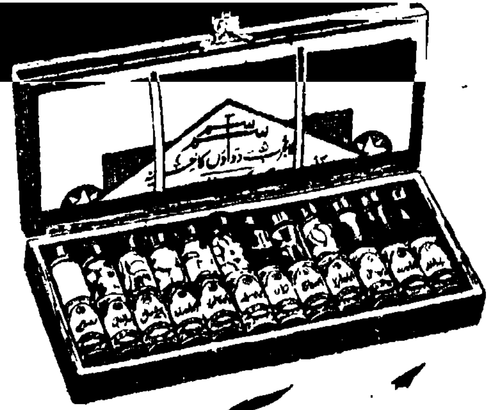
اقبال کے نزدیک یہ تمام باتیں سخت عبرت انگیز تھیں، اس لئے کہ وہ ایک سچا مومن تھا جس کے دل میں اسلامی خون موجزن تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلمانوں میں بھی وہ تمام باتیں رواج پا جائیں جو آج یورپ کا خاصہ ہیں اور جسے یہ دانایانِ فرنگ ساری دنیا میں نافذ کرنا چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں، اس لئے کہ ایک قوم اپنی حفاظتِ ناموس اور غیرتِ دینی کے لئے مر سکتی ہے اور جب تک اس کے اندر اپنی بقا کے لئے مرنے کا جذبہ پیدا نہ ہو وہ زندہ نہیں رہ سکتی، اور اگر وہ اپنے نظریۂ حیات، اپنی غیرت و حمیت اور اپنی حریتِ فکر کو کھو کر زندہ بھی رہتی ہے تو اس کی یہ زندگی ایک غلامانہ زندگی ہے، جو موت سے بدتر ہے!

بہرحال ان سارے حقائق کو مدنظر رکھ کر دیکھیں تو یہ نظر آجائے گا کہ اقبال کی نگاہ میں عورت کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ عورت کو کائنات کی عزت تصور کرتا تھا۔ اس کے نزدیک صرف کائنات کی وہ عزیز ترین ہستی ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری مردوں کے سر ہے اور جس کی حفاظت پر قوموں کا عروج و زوال منحصر ہے ــــ جس قوم نے عورت کے وجود کے صحیح مقصد کو نہیں سمجھا اور اسے صرف عیش کا ایک ذریعہ سمجھا تو وہ قوم بہت جلد فنا کے گھاٹ اتر جائے گی اور اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ دنیا کی تاریخ اپنی حقائق کو واضح کرتی رہی ہے اور اپنے آپ کو دہرانے میں کبھی پیچھے نہیں رہی!

لیکن اقبال اپنے اس نظریہ میں کہاں تک کامیاب ہوا اس کا جواب ہمیں اپنی موجودہ سوسائٹی سے معلوم کرنا چاہیئے۔ کیا اقبال کا نظریہ پورا ہوا اور کیا ہم نے اس کی پیشین گوئی سے کوئی فائدہ حاصل کیا؟ اس کی نفی پر مجھے ڈر ہے کہ ہم پر بھی پھر وہی مثل صادق نہ آئے کہ ؎

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد!

آپ بھی ڈاکٹر کا بل ۸۰ فیصدی کم کرسکتے ہیں



سفر حج کے لئے بہترین تحفہ

بارہ مجرّب دواؤں کا خزینہ

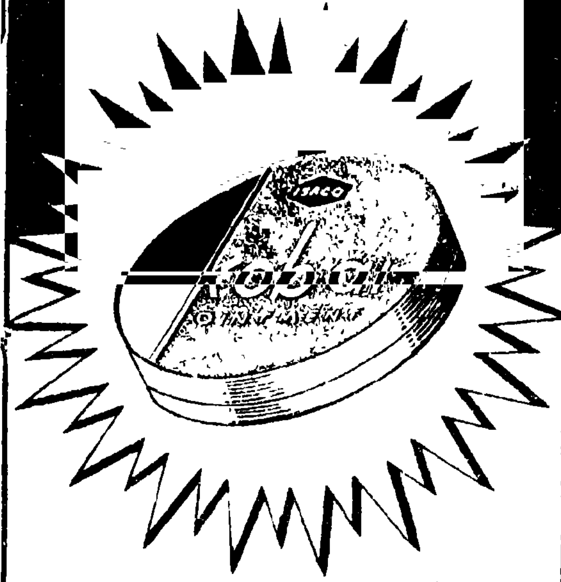
گھریلو علاج اور اہل خانہ کی طبی خدمت کا آسان اور قابل اعتماد ذریعہ

یہ بارہ دوائیں بڑی حد تک آپکی طبی ضروریات کو پورا کردینگی
مثلاً بخار کھانسی۔ درد نمونیہ اختلاج قلب خفقان گھبراہٹ ملیریا قبض
اسہال پیچش درد شکم خرابی جگر ترمتلی بدہضمی ہیضہ درد سر نزلہ زکام۔
نکسیر بواسیر خونی درد دنداں۔ درد گوش حاملہ کی شکایات بچوں کی جملہ
شکایات خارش فساد خون چوٹ اور زخم وغیرہ تکالیف کا خاطر خواہ علاج
محض ان ہی مختصر دواؤں سے کیا جاسکیگا۔ قیمت بارہ روپے فی بکس

آئی ساکو (پاکستان) کراچی

تیارکنندگان ادویہ

گارڈن ٹرام ٹرمینس ، کراچی ۳



کوبائی

داد، اکزیما اور دیگر جلدی امراض کا بہترین مرہم

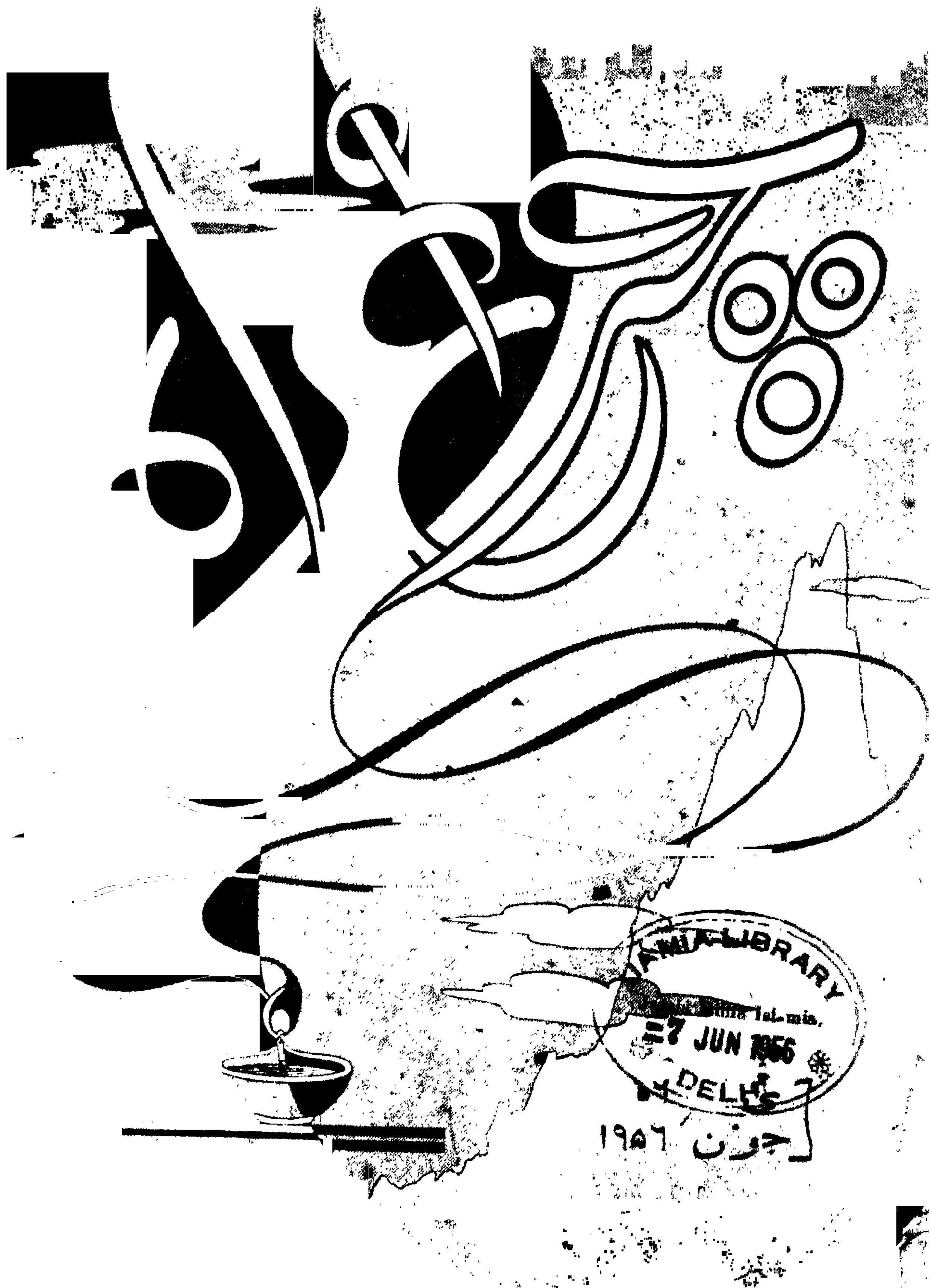
مہاسوں اور چہرے کے دانوں کا موثر ترین علاج

قیمت :- ایک روپیہ فی ڈبیہ

آئی ساکو (پاکستان) کراچی

(تیارکنندگان ادویہ)

روڈ۔ گارڈن۔ ٹرام ٹرمینس۔ کراچی ۳


جون ۱۹۵۶
AMIA LIBRARY
7 JUN 1956
DELHI

ہماری

کتابیں

ثریا صادق



مکتبۂ چراغِ راہ

آرام باغ روڈ۔ کراچی ——— بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

نعیم صدیقی	قومی ملکیت	-/۱۲/-
	تخریب و تعمیر	۳/-/-
	اسلامی فلسفۂ ملکیت	۲/۴/-
	شعلۂ خیال	۳/۴/-
	دفتر بے معنی	۲/۸/-
	معروف و منکر	۳/-/-
	فکر و نظر	۳/-/-
امین احسن اصلاحی	تدبر قرآن	۳/۴/-
	اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	۱/۱۲/-
	اقسام القرآن	۱/۸/-
سید ابوالاعلیٰ مودودی	حدیث اور قرآن نیا ایڈیشن	زیر طبع
مسعود عالم ندوی	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	۲/۸/-
	الترجمۃ الحبیبیہ (حصہ اول) نیا ایڈیشن	زیر طبع
	" " (حصہ دوم)	۱/۸/-
	مکاتیب سلیمان	۳/۴/-
پروفیسر عبدالحمید صدیقی	اسلام کا فلسفۂ تاریخ (حصہ اول)	۱/۱۲/-
	" " " (حصہ دوم)	۲/-/-
	اسلام اور تھیاکریسی (انگریزی) ریاست	-/۸/-
افتخار احمد بلخی	فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر (حصہ اول)	۲/۸/-
	" " (حصہ دوم)	۴/-/-
	" " (حصہ سوم)	زیر طبع
مولانا مودودی، اصلاحی وغیرہ	مکاتیب زنداں	۱/-/-
کوثر نیازی	منتخب نظمیں	۱/۴/-

اسعد گیلانی	تحریک اسلامی اپنے لٹریچر کے آئینے میں		1/8/-
	آدم کے تین بیٹے		1/12/-
	تصویریں		3/8/-
جیلانی بی اے	اذان اور دوسرے افسانے		3/-/-
	ماؤزے تنگ کے دیس میں		2/8/-
ملک غلام علی	سنتِ رسولؐ	نیا ایڈیشن زیر طبع	
نذیر محمد خالد	اشتراکیت، مذہب اور اخلاق	غیر مجلد	1/2/-
چوہدری محمد اکبر	اور لیڈرز (انگریزی)	مجلد	2/-/-
ابو نادیم ایم اے	فریب نظر		3/12/-
علی سفیان آفاقی	کمندیں		3/-/-
ماہر القادری	فردوس		2/8/-
حلقہ ادب اسلامی	صبح آ رہی ہے		-/8/-

بچوں کی کتابیں

اعجاز الحق قدوسی

سراپائے رسولؐ	1/10/-
رسول اللہ کے دو محبوب	-/10/-
رسول پاک کی صاحبزادیاں	-/14/-
درس گاہ رسول کے دو طالب علم	1/2/-
ہمارے نبی کے صحابہ	1/6/-

ابن احمد قرنی ایم اے

جنت سے زمین پہ	-/5/-
پہلا خون	-/5/-
خوفناک طوفان	-/4/6
قہر کی آندھی	-/6/-
اللہ میاں کی اونٹنی	-/6/-
خدائی معمار	-/10/-
جس کا اللہ نگہبان	-/12/-



چالیسہ

مشرق میں نئی ابھرتی ہوئی طاقت
جسے مغربی طاقتیں نظر انداز نہیں کر سکتیں!

چین!

اس کے انقلاب کی کہانی!!

ایک پادری کی زبانی!!

ایک سچی آپ بیتی

معلومات افروز — عبرت آموز

ماؤزے تنگ کے دیس میں

مصنف کارلو سیگو

ترجمہ: جیلانی بی اے

قیمت: دو روپے آٹھ آنے

مکتبہ چراغ راہ
آرام باغ روڈ — کراچی
بیرون بھاٹی دروازہ لاہور

الجیریا

— زخموں سے چور چور ہے

— لہولہان ہے

— کے انچ انچ سے خون رس رہا ہے!

— نڈھال ہو کر کراہ رہا ہے

— مسلمانانِ عالم کی غیرت کو آواز دیتا ہے

— پوری انسانیت سے انسانی ہمدردی کا حق مانگتا ہے!

جہاں

ایک مسلمان قوم موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے!

اس کا جہادِ حریت انیسویں مہینے میں داخل ہو چکا ہے!

اس کے ایک لاکھ جانباز فرانسیسی استعمار کے عفریت کے شکار ہو چکے ہیں!

اس کے پانچ لاکھ افراد گھربار اور املاک سے محروم کئے جا چکے ہیں!

فرانس نے عظیم فوجی طاقت اور جدید ترین مشینی اسلحہ ظلم کے اس معرکے میں جھونک دیا ہے!

الجیریائی مسلمان

ہمارے بھائی ہیں! — ان کی زندگی ہماری زندگی ہے — ان کی آزادی ہماری آزادی ہے — ان کی عزت ہماری عزت ہے!

کسی نہ کسی طرح فرانس کی گولیوں کا شکار ہونے والے بھائیوں کی مدد کیجئے!

احتجاج کیجئے — جماعتوں کے اجتماعات اور جلسوں میں قراردادیں پاس کیجئے!

اپنی حکومت پر دباؤ ڈالیے کہ وہ بین الاقوامی سطح پر الجیریا کی حمایت میں فرانس کے خلاف آواز اٹھائے۔

اور —

فرانس کے مال کا بائیکاٹ کیجئے!

— ادارۂ چراغ راہ

روشنی ـــ گرمی ـــ حرکت

ماہنامہ
چراغِ راہ
کراچی

مئی - جون ۱۹۵۶ء

شمارہ ۵-۶ ـــ جلد ۱۰

فہرست

چندہ سالانہ: ۵/- روپے ـــ فی پرچہ: ۸ آنے
دفتر اشاعت و انتظام: ـــ ۹ نوشابہ بلڈنگ آرام باغ روڈ - کراچی نمبر ۱
دفتر ادارۂ تحریر: ـــ ۲۵ - غلام نبی اسٹیم پور چوہدری ہاؤس آباد لاہور

چوہدری غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر چراغ راہ ۹ آرام باغ روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا

سوچ بچار

اشتراکی روس کی تاریخ میں نیا مد و جزر

جرمنی، فرانس اور اٹلی میں ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد اشتراکیت نے روس کو اپنی تجربہ گاہ کی حیثیت سے چن لیا۔ پہلی مارکسی نظریات کے مطابق ۱۹۱۷ء میں انقلاب واقع ہوا۔ اور مزدور طبقہ کی آمریت قائم ہو گئی۔ اس انقلاب کا سہرا لینن کے سر بندھا جس نے نیم عسکری دستوں کی تنظیم کی جن کو سوویٹس (Soviets) کا نام دیا گیا۔ لینن نے انقلاب کی سربراہ کاری کرنے کے لئے کمیونسٹ پارٹی کو بھی نئے خطوط پر منظم کیا۔ بڑی جد و جہد اور قربانیوں کے بعد اس پر کامیابی کے دروازے کھلے۔ لینن اپنا فرض ادا کر کے ۱۹۲۴ء میں راہی عدم ہوا۔ لینن کی جانشینی اسٹالن کے حصے میں آئی۔ اسٹالن نے لینن کے بین الاقوامی نظریۂ انقلاب کو خیرباد کر کر اشتراکیت کو قومی و ملکی تصور کے دائرے میں محدود کر دیا۔ مارکسزم اور لینن ازم سے یہ ایک کھلا ہوا اور وسیع الاثر انحراف تھا۔ اس انحراف سے اشتراکیت کی اصولی قدر و قیمت کو بڑا نقصان پہنچا۔ اس اصولی و نظریاتی انحراف سے بخیریت گزر جانے کے لئے اسٹالن کو تشدد کی پالیسی اور زیادہ سنگین بنا دینی پڑی۔ پارٹی اور ورکرز کے نام پر شخصی آمریت کا سکہ چلانا پڑا۔ آمریت کیسی، وہ تو ایک خدائی تھی جو لوہے کے اس آدمی نے کرۂ ارض کے چھٹے حصے پر نافذ کی۔ اس کی تصویریں دفتر دفتر، دکان دکان، کارخانے کارخانے اور گھر گھر آویزاں کی گئیں۔ اس کا نام حلف لینے کے لئے استعمال ہوا۔ اس کے سامنے انسانی شرف کی گردن خم ہوتی رہی، اس کے حضور حمد و ثنا کے ترانے گائے جاتے رہے۔ اس کے ہر لفظ پر آمنا و صدقنا کہا جاتا رہا۔ اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اسٹالن کے حق میں کوئی حرفِ تنقید و اختلاف زبان پر لاسکے۔ اشتراکی دنیا کا یہ خدا انجام کار ۵ مارچ ۱۹۵۳ء پیکِ اجل کے ہاتھوں خدائی کے تخت سے اتر کر لحد میں جا پہنچا۔

اسٹالن کی خدائی کے دور میں روس درجۂ اول کی بین الاقوامی طاقتوں کی صف میں جا پہنچا۔ گزشتہ جنگِ عظیم اقوام کو ملیا کر اور اوپر والوں کو نیچے اور نیچے والوں کو اوپر کر کے جب رخصت ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ اشتراکی روس عالم انسانی کی پانچ بڑی طاقتوں میں سے ایک ہے۔ مشرقی یورپ کی ریاستیں روس کی فاتح افواج کے قدموں میں آگریں۔ چین میں ماؤزے تنگ کا ڈنکا بجنے لگا۔ دنیا بھر میں کمیونسٹ تحریک اور اس کی پارٹیاں زور پکڑ گئیں۔ اور سرمایہ دار ممالک کو ایک پریشان کن صورتِ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان ترقیوں اور کامیابیوں کے باوجود بعض وجوہ سے بین الاقوامی حالات میں اشتراکی روس کے لئے ناسازگاری کے پہلو نمایاں ہوتے گئے۔ اشتراکیت کے توسیعی عمل نے اس کے اصولی استحکام کو بری طرح متاثر کیا۔ نئے ممالک میں نئے حالات کے اندر جگہ بنانے کے لئے سرخ نظام کو اپنی

فطرت اور اپنے مزاج میں ایسے تغیرات کرنے پڑے جنہوں نے اس کے پائے اصولیت کو متزلزل کر دیا۔ اشتراکی نظام کے تاریک پہلو جو روس کے آہنی پردے میں کسی حد تک مخفی تھے وہ اس پردے سے باہر آنے کے بعد دنیا بھر کے سامنے آشکارا ہو گئے۔ یورپ میں ــــــ خصوصاً جرمنی کے تقسیم شدہ علاقے میں اشتراکیت جب مغربی جمہوریت کے آمنے سامنے آ کر برسرِ عمل ہو گئی تو دونوں نظاموں کا ایک ایسا کھلا کھلا موازنہ ہونے لگا جس پر پروپیگنڈے کی لیپا پوتی اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر مصیبت یہ ہوئی کہ قدم قدم پر یو، ان، او اور اس کے ضمنی اداروں کے ایوانوں میں نت نئے مسائل پر اشتراکی اور مغربی ذہن کا آمنا سامنا ہونے لگا اور دونوں طرف سے ڈپلومیسی کھلے میدان میں دست و گریباں ہونے لگی۔ بین الاقوامیت کے اس ڈپلومیٹک دنگل میں روس کو اسٹالن کی جس پالیسی نے سب سے بڑھ کر نقصان پہنچایا وہ علیحدگی پسندی اور ہٹ دھرمی تصادم کی پالیسی تھی۔ کوئی نقطہ اور خط ایسا نہیں تھا جس پر روس دنیا کی کسی بھی دوسری طاقت کے ساتھ کسی دائرے میں تعاون یا سمجھوتہ کر سکے اشتراکی ریاست و نظام کا بنیادی مزاج ہی تصادم پسندانہ بنا دیا گیا تھا۔ اس مزاج کے ساتھ جب جارحانہ عزائم لے کر یورپ کی سرزمین پر روس کی فوجی قوت نے اپنے قدم بڑھائے تو پورا عالم مغرب چوکنا ہو گیا۔ اور اشتراکی رجحانات کے متعلق سخت تر نقطۂ نظر اختیار کیا گیا حد یہ کہ امریکہ جیسے جمہوری ملک میں اشتراکیت کو دبانے کے لئے ایسے سنگین اقدامات کئے گئے جو برسوں کی قائم شدہ روایاتِ آزادی کے بالکل خلاف تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مارشل پلان کا محاذ قائم کیا گیا۔ جس پر ڈالروں کو بطور اسلحہ استعمال کیا جا رہا ہے۔

اشتراکیت کی تقدیر بہر حال پوری طرح اسٹالن کے قبضے میں تھی۔ کوئی عنصر اور کوئی شخص ایسا نہ تھا۔ جو اس کے اقدامات اور فیصلوں پر چوں و چرا کرتا۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ وہ اس اشتراکی خداوند کو ٹوکتا اور اس کے مقابلے میں کوئی دوسری رائے سامنے لاتا جس کسی نے ذرا جنبش بھی کی اس کو یا تو زندگی سے محروم کر دیا گیا، یا آزادوں کی دنیا سے نکال کر اسے اسیری اور غلامی کے تحت الثریٰ میں پھینک دیا گیا۔

چھوٹے موٹے افسروں اور عہدہ داروں اور عوام الناس اور مزدوروں پر جو کچھ گذری ہوگی اس کا حساب تو در کنار رکھئے۔ چوٹی کے لیڈروں اور بڑے بڑے افراد کا جو حشر ہوا ہے۔ صرف اس کو دیکھئے اور سوچئے کہ اسٹالین کا دور کس درجہ قیامت خیز تھا۔ اس سلسلے میں حسب ذیل معلومات بڑی عبرتناک ہیں:-

۱- لینن کے قائم کردہ مابعدِ انقلاب کے پہلے پولٹ بیورو کے تمام کے تمام ارکان ــــ صرف اسٹالین کے استثنا کے ساتھ غداری اور سرمایہ دارانہ طاقتوں کی جاسوسی کے الزاموں میں پھانسے گئے۔ یہ وہ افراد ہیں جن کے ہاتھوں روس میں انقلاب رونما ہوا۔ حد یہ کہ لینن کی بیوہ تک کو سنگین شبہات کے تحت گھر میں نظر بند کر دیا گیا اور اسے دھمکیاں دی گئیں۔ کہ اگر وہ اسٹالین کی مرضی کے تابع ہو کر نہ چلے گی تو اسے قانوناً لینن کی بیوہ تسلیم نہیں کیا جائے گا اور کسی دوسری عورت کو اس کی بیوہ کی حیثیت دے دی جائے گی۔ اسی طرح لینن کی موت کے بعد پارٹی کا جو پولٹ بیورو قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بھی تمام کے تمام ارکان کا بغیر اسٹالین کے یہی حشر ہوا۔

۲- نئے دستور کے تحت ۱۹۳۶ء کی سوویٹ حکومت کے گیارہ میں سے دس ارکان کو جاسوسی کے الزام میں گولی مار دی گئی۔

۳- سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی (جس کی حیثیت سوویٹ پارلیمنٹ کی تھی) کے سات صدور میں سے پانچ کو شکنجۂ استبداد میں کسا گیا۔

۴- ۱۹۳۶ء کے دستور کی تدوین کرنے والے ستائیس افراد میں سے پندرہ کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

۵- اسٹالین کی موت کے بعد بھی یہ چکا اسی طرح چلتا رہا۔ روس میں اب تین نمایاں افراد قیادت کے سزاوار باقی تھے۔ مالنکوف، بیریا اور مولوٹوف۔ بیریا کو سرمایہ داروں اور امپیریلسٹوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے گولی مار دی گئی۔ مالنکوف کو معزول کر دیا گیا۔ مولوٹوف کو پس منظر میں دھکیل دیا گیا

یہ تو تھا قیادت کی اعلیٰ صفوں کا حال! اب ذرا سول اور فوجی عہدہ داروں کے خون خرابے کی سرگزشت ملاحظہ فرمائیے:۔

۱- پارٹی کی مرکزی تنظیم کے ۵۳ میں سے ۴۴ سیکرٹریوں کو بغاوت کے الزام میں گولی مار دی گئی۔

۲- مرکزی سیکرٹریوں کے پیچھے پیچھے صوبائی تنظیموں کے تقریباً کل سیکرٹری پھانسی چڑھا دئے گئے۔

۳- سوویٹ وار کونسل کے ۸۰ ارکان میں سے ۷۰ کو بعد کے مرحلوں میں دشمن کے ایجنٹ قرار دیا گیا۔

۴- سوویٹ فوج کے ۵ میں سے ۳ مارشل تخریب کاری کے مجرم قرار پائے اور "کیفر کردار" کو پہنچا دئے گئے

۵- سوویٹ جرنیلوں میں تقریباً ۶۰ فیصد افراد اور اندازاً تیس ہزار افسروں کے جاسوس اور غدار ہونے کا انکشاف کیا گیا۔

۶- گورنمنٹ کی ٹریڈ یونینوں کے ۸۰ فیصد سیکرٹریوں کو مخالفِ ریاست سرگرمیوں کے الزام میں یا تو گولی مار دی گئی یا انہیں غلامی کے کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔

۷- پارٹی کے ڈیڑھ دو کروڑ ارکان کو صرف دو سال کے تطہیری اقدامات کے تحت خارج کیا گیا۔ پہلا تطہیری اقدام ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ جبکہ ۵۸۵۰۰۰ ارکان میں سے ۱۷۵۰۰۰ کو پارٹی سے نکال باہر کیا گیا۔ ۱۹۲۸ء کے دوسرے بڑے عمل تطہیر کے تحت تیرہ لاکھ میں سے ۲۰۰۰۰۰ ارکان کا صفایا کر دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء تا ۳۹ء کے درمیان کے عظیم ترین عمل تطہیر کے ذریعے قریباً ۲۰۰۰۰۰ ارکان سالانہ خارج کئے گئے چنانچہ ۱۹۳۹ء میں آ کر پارٹی کے موجودہ ارکان ۲۵۰۰۰۰۰ تھے۔ اور خارج شدہ ارکان کی میزان ۲۰۰۰۰۰۰ تھی۔[1]

انسانیت کا قتلِ عام ہوتا رہا۔ اور برسوں ظلم کی یہ چکی چلتی رہی۔ دنیا میں ان مظالم کا چرچا بھی رہا۔ لیکن خود روس کی سرحدوں کے اندر کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو آہ و فغاں کر سکے۔ جو باہر جو کچھ چرچا رہا اسے سرمایہ داروں کے پروپیگنڈے کا نام دیا گیا۔

اب اسٹالین کی موت کے بعد تین سال گزرنے پر جب یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ خداوند آہنی اب قبر سے اٹھ کے آنے کا نہیں

---

[1] یہ اعداد و شمار انگریزی ماہنامہ "ایشیا" نے ضروری حوالوں کے ساتھ مورخہ ۵۶ء فروری کی اشاعت میں جمع کئے ہیں۔

اور اب اس کا قابو نہیں چلتا تو پہلی مرتبہ ظلم کی اس گھناؤنی تاریخ سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اس خدمت کے انجام دینے کے لئے بہترین موقع کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس نے پیدا کر دیا۔ یہ کانگریس آٹھ دن برابر جاری رہی۔ اور اس میں کمیونسٹ تحریک کے اقدام کے لئے خطوط کھینچے گئے۔ نئے خطوط کیا سوچے گئے۔ بہت بڑی نظریاتی اور عملی تبدیلیاں پیدا کی گئی ہیں۔ اس موقع پر اسٹالین کے رفقائے کار نے کھلے بندوں کو اسے "انحراف پسند" قرار دیا۔ اور اس کے دور کو "آمریت اور دور رخ باقی کے دور" کا عنوان دیا جن لوگوں کو اسٹالین نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ ان میں سے بھی ایک شخص اس کے دفاع کے لئے نہیں کھڑا ہوا۔ مکوئن نے اسے کھلم کھلا "مستبد آمر" کا لقب دیا۔ بے انصافی کا مظہر قرار دیا۔ اور اسے ایک ایسا شخص شمار کیا۔ جس نے تاریخ کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

نظریاتی لحاظ سے قرار دیا گیا کہ تاریخ نے مارکس اور لینن کے معاشرتی تجزیہ کو فرسودہ کر دیا ہے۔ اور صورت حالات کا از سر نو جائزہ لینا ناگزیر ہے۔ قرار دیا گیا ہے کہ کمیونزم کے فروغ کے لئے جنگ ہرگز ضروری نہیں ہے۔ اور یہ کہ سرمایہ داری اور کمیونزم پہلو بہ پہلو پنپ سکتے ہیں۔ قرار دیا گیا۔ کہ تبدیلی کے لئے تشدد ہی کا راستہ ضروری نہیں۔ بلکہ کمیونسٹ پارٹیوں کو دنیا میں پارلیمنٹری اور جمہوری طریقوں سے پوری طرح کام لینا چاہیئے۔ اور سوشلسٹ پارٹیوں سے تعاون کرنا چاہیئے۔ قرار دیا گیا کہ بین الاقوامی دائرے میں غیر جانب داری کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرنی چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ پرامن ذرائع سے بین الاقوامی دائرے میں نفوذ کی نئی پالیسی اختیار کی گئی ہے[1] جس نے اشتراکیت کے بعض بنیادی نظریات پر بھی خط نسخ کھینچ دیا ہے۔ اور اسٹالن ازم کو تو بالکل مسترد کر دیا ہے۔ داخلی حیثیت سے اجتماعی قیادت کے تصور کو مضبوط کرنے، بھاری صنعتوں کو زیادہ اہمیت دینے، مزدوری کے معاوضوں کی نظرثانی کرنے اور اوقات کار کو گھٹانے، تعلیمی ترقی کی حوصلہ افزائی اور اسکولوں اور کالجوں کی فیسوں کو ختم کرنے کے فیصلے کئے گئے۔

اس موقع پر خروشچیف کی تقریر اسٹالین کے خلاف ایک خوفناک چارج شیٹ کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ساڑھے تین گھنٹے کی اس تقریر میں مقرر نے اسٹالین کے کارناموں کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ تقریر میں کہا گیا کہ اسٹالین کا دور حکومت خوف و ہراس، دہشت پسندی اور شکوک و شبہات کا دور تھا۔ جس میں روس کے نمایاں اور سرکردہ لیڈر مظالم کا شکار ہوئے۔ مقرر نے گذشتہ جنگ عظیم میں روس کی ابتدائی ناکامی کی ذمہ داری بھی اسٹالن کے سر ڈالی۔ اور بیان کیا کہ اسٹالن ہر الٹی میٹم کا مذاق اڑاتا تھا۔ اور بے پروائی کے عالم میں پڑا رہتا تھا۔ انکشاف کیا گیا کہ ۳۸-۱۹۳۶ء میں تقریباً ۵ ہزار روسی افسر اسٹالین کے مظالم کا شکار ہوئے۔ ان مظالم کی وجہ سے جنگ کے خاتمے پر روس کی اقتصادی حالت بگڑ گئی۔ مارشل ٹکیتاچیف پر جاسوسی کے الزام لگائے گئے۔ اور خفیہ مقدمہ چلایا گیا۔ مسٹر بوگر واکے ایسے ہی بہانے کے تحت قتل کر دیا گیا۔ دو برس بعد مسٹر پینوف کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ لینن گراڈ پارٹی چیف کی موت کا بھی انکشاف

---

[1] اسی نئی پالیسی کے تحت روس کی موجودہ لیڈر شپ نے بین الاقوامی دائرے میں تعلقات کی طرح نو ڈالنے کے لئے ایک تیز رفتار مہم شروع کی ہے ہندوستان کا دورہ بھی اسی مہم کا ایک جزو تھا۔ اور اب برطانیہ سے دوستانہ روابط پیدا کرنے کے لئے روسی رہنما اسی نئی پالیسی کے تحت سفر پر نکلے ہیں لیکن برطانیہ کا دورہ مقصد کے لحاظ سے بالکل ناکام ہو گیا ہے۔

ہی ذمہ دار تھا۔ اسٹالین کے ایک قریبی دوست مسٹر جو کو حکم دیا گیا کہ وہ رضاکارانہ طور پر خودکشی کر لیں ورنہ انہیں قتل کر دیا جائے گا چنانچہ مسٹر سرجو نے خودکشی کر لی۔ اور اس کا جنازہ سرکاری طور پر تزک و احتشام سے اٹھایا گیا۔ نکولائی مارشنسکی کو بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ سترھویں کانگریس کے تقریباً تین چوتھائی ارکان بھی اسٹالین کی جارحیت کے کولہو میں پیل دیے گئے۔ لینن کی بیوہ نے جب اسٹالین پر اعتراضات کئے تو اسے دھمکی دی گئی۔ کہ اسے لینن کی بیوہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ۱۹۴۱ء کے جرمن حملے کے پس منظر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے۔ خروشچیف نے الزام لگایا۔ کہ جاسوسوں نے جرمن حملے کی ٹھیک ٹھیک تاریخ بھی بتا دی تھی لیکن اسٹالین کو ہٹلر پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اصرار کرتا رہا کہ لڑائی نہیں ہو سکتی۔ خروشچیف نے بتایا کہ میں اس وقت یوکرین میں پارٹی لیڈر تھا۔ وہاں بندوقیں نہیں تھیں ٹیلیفون پر میں نے اسٹالین سے بات کرنی چاہی۔ مگر اس نے ٹیلیفون کے پاس بیٹھے ہونے کے باوجود نہیں سنا۔ اور مالنکوف کے ذریعے جواب دلوایا کہ بندوقیں نہیں مل سکتیں، جیسے چاہو کام چلاؤ۔ خروشچیف نے انکشاف کیا۔ کہ اسٹالین جنگی نقشے تک کا استعمال نہیں جانتا تھا۔ وہ محض اسکول کے گلوب کو سامنے رکھ کر جنگی ہدایات دیتا تھا۔ جنگ کے بعد اسٹالین کی بے اعتمادی اپنے ساتھیوں سے اس حد تک بڑھ گئی تھی۔ کہ اگر کوئی شخص آنکھ ملا کر بات کرتا تو اسے گستاخ قرار دیتا۔ اور اگر کوئی نگاہ نیچی رکھتا تو کہتا کہ تمہارا ضمیر مجرم ہے پولٹ بیورو کے تمام ممبر اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ مارشل وارشیلوف تک کو وہ برطانوی جاسوس سمجھنے لگا تھا۔ اور اسے پولٹ بیورو میں کام کرنے سے روک دیا تھا۔ اسی طرح اس نے ایک بار مولوٹوف اور اس کی بیوی کو قید میں ڈال دیا۔ آخری دور میں اس کا منصوبہ یہ تھا کہ خروشچیف اور مولوٹوف اور دوسرے لیڈروں کو راستہ سے جلد از جلد ہٹا دے۔ خروشچیف نے بتایا کہ ایک مرتبہ غیر ملکی مہمانوں کے سامنے اس نے مجھے "کھوکھول" کے نام سے پکارا (یوکرین کے باشندوں کے لئے اہانت آمیز نام) اور حکم دیا کہ میں گوپک ناچ ناچوں نوجوانوں کے اس ناچ پر بوڑھے آدمی کو مجبور کرنا محض برائے تذلیل تھا۔ خروشچیف نے اسٹالن کو متعدد ڈاکٹروں کے قتل کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا۔ آخر میں مقرر نے حاضرین کے سوالات کے جواب میں تصریح کی کہ ان مظالم کے سامنے ہم لوگ بالکل بے بس تھے بلکہ خود ہمیں اسٹالین کا آلۂ کار بننا پڑتا تھا۔

یہ ہے مزدور طبقہ کی ڈکٹیٹرشپ کی اندرونی تصویر! —— اس اندرونی تصویر کا جو عکس بھی دنیا میں کسی نے پیش کیا۔ اسے سرمایہ داروں کا پروپیگنڈہ قرار دیا جاتا رہا۔ لیکن اب تو خود روس کا چوٹی کا ایک لیڈر اس تصویر کو خود پیش کر رہا ہے۔ یہ تھی مارکس کے خواب کی تعبیر!

اسے پیش کرتے ہوئے روس کی نئی قیادت نے دعوت دی کہ شخصی آمریت کے اس دور کے خاتمہ کے بعد اب اجتماعی قیادت کے دور کا آغاز ہوا ہے۔ اجتماعی قیادت کا یہ تصور جس وجہ سے سامنے لایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسٹالین کے بعد اب روس میں کوئی ایک شخصیت ایسی باقی نہیں رہی۔ جو اسی کی طرح مرد آہن بن کر خالی جگہ کو پُر کر دے۔ انقلاب کی وہ دہشت کی فضا بھی اب موجود نہیں ہے۔ جس کے اندر سے کوئی اسٹالین ابھر سکتا۔ اب ناگزیر ہے کہ کچھ لوگ مل جل کر متحدہ طاقت سے اس خلاء کو پر کریں، ورنہ اگر ایک دوسرے کی مار دھاڑ کا سابق سلسلہ جاری رہے تو کسی کی خیر نہیں۔ خروشچیف اور بلگانن اور دوسرے اکابرین سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ

وہ اپنے آپ کو اس محفوظ اور بالاتر مقام پر نہیں لے جا سکتا جس پر اسٹالن براجمان رہا ہے۔ ورنہ ایسا اگر ممکن ہوتا تو اب تک ایک نیا خداوند اپنی خدائی جما چکا ہوتا۔ اور مخالفین کے خون سے اس کے ہاتھ رنگین ہو چکے ہوتے۔

اسٹالن کے خلاف یہ طوفانی حملہ ایک دلچسپ نتیجہ پر منتج ہوا۔ روس میں پہلی بار ان تقریروں کے زیر اثر حکومت و قیادت کے خلاف احتجاج کا طوفان اٹھا اور قانون کی حدود سے باہر ہو گیا۔ جارجیا اسٹالن کا زاد بوم تھا۔ اسٹالن نے اس علاقے کے لوگوں کو خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ اور جارجیوں کا حکومت اور فوج میں خاص حصہ تھا۔ چنانچہ اس علاقے میں اسٹالن کو ایک پیکر رحمت مانا جاتا تھا۔ علاوہ بریں جو لوگ سوشلزم کے سچے معتقد ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ سوشلزم ظلم و تشدد اور آمریت کے بغیر چل نہیں سکتا اس نظریہ کی وجہ سے وہ اسٹالن کی شخصیت کو روشنی کا مینار مانتے تھے۔ ان دو اثرات کے تحت جدید قیادت کے رجحانات کا خیر مقدم تلخ جذبات سے کیا گیا۔ ہنگامہ یوں اٹھا کہ جارجیا والے اسٹالن کا یوم پیدائش منانا چاہتے تھے مگر نئی حکومت اس پر تیار نہیں تھی۔ اسٹالن کے ہم وطنوں نے بجائے خود جلوس نکالے۔ خروشچیف کی تصویروں کو اتار کر پھاڑ دیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر پر عوام نے قبضہ کر لیا۔ "اسٹالن زندہ باد" اور "خروشچیف مردہ باد" کے نعرے لگائے گئے۔ طالب علم، کارخانوں کے مزدور اور عام لوگ ہزاروں کی تعداد میں سڑکوں پر آ گئے۔ جارجیا کی پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا گیا۔ تو اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا گیا۔ آخر فوج کو بلانا پڑا۔

واقعات کے اس مد و جزر کو جب ہم ذرا گہری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تو اس سے بڑے دور رس نتائج نکل کر سامنے آتے ہیں ——— ایسے نتائج کہ مارکسزم کے اساسی تصورات کی دھجیاں اڑا دینے والے ہیں۔ اور ان کی روشنی میں تاریخ کا مادی فلسفہ باطل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ نتائج حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اب تک مارکسزم نے ہمیں یہ تصور دلایا تھا۔ کہ تاریخ اضداد کے تصادم سے تشکیل پاتی ہے۔ اور اس کے ارتقاء کے لئے واحد محرک طبقاتی کشمکش ہے۔ اور یہ کہ مزدور طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ کے مفاد میں کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ دونوں کے تصادم کو شدید تر ہوتے ہوئے مستقبل میں سرمایہ داری کے کامل انہدام پر جا کر دم لینا ہے۔ اس سے از خود یہ نتیجہ نکلا کہ اشتراکی نظام حیات جو مزدور طبقہ کے مفاد پر مبنی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ صرف جنگ و آویزش کا تعلق رکھ سکتا ہے۔ اور کسی ایک ملک سے شروع ہو کر اس جنگ و آویزش کو پورے بین الاقوامی دائرے میں پھیل جانا ہے۔ اور اس کا انجام سرمایہ دارانہ نظام کے دنیا بھر سے ختم ہو جانے پر ہوتا ہے۔ چنانچہ سوویٹ روس اور کمیونسٹ پارٹیوں کی پالیسی اب تک ایسی فلاسفی پر مبنی تھی۔ لیکن اب روس کی نئی قیادت نے اس فلاسفی کا دامن چاک کر دیا ہے۔ اب جنگ اور تصادم اور تشدد کے بجائے امن پسندانہ جمہوری اور پارلیمانی ذرائع سے کام کرنے کا نیا راستہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کیا گیا ہے۔ کہ اشتراکی نظام کو بین الاقوامی دائرے میں سرمایہ دارانہ نظام کے پہلو بہ پہلو صلح و مسالمت گذاری سے رہنا ہے۔ اب یہ اضداد تصادم کے بجائے مصالحت کے اصول پر باہم دگر معاملہ کریں گے۔ یہ تبدیلی پالیسی کی اوپری ہی تبدیلی نہیں ہے۔ بلکہ یہ مارکسزم کو جڑوں سے ہلا دینے والی ہے اس پالیسی کے اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے کونے کونے میں جس فلسفہ تاریخ و تمدن کی ڈونڈی پیٹی گئی تھی۔ وہ ناکام

ہوگیا ہے۔ اور اس پر ایمان رکھتے ہوئے آگے چلنا سوویٹ یونین اور کمیونزم کے لئے ممکن نہیں رہا۔ نظام فکر کی وہ پوری عمارت اس تبدیلی سے گر پڑی ہے جسے برسوں کی کاوشوں سے کھڑا کیا گیا تھا۔

۲۔ تاریخ کے مادی تصور نے اب تک یہ اپدیش دیا تھا۔ کہ تمدنی ارتقا میں کسی فرد کا پارٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ تاریخی جبریت مختلف مراحل ارتقاء کی ضرورت کے مطابق مناسب افراد از خود پیدا کر لیتی ہے۔ اور ان سے آلہ کار کے طور پر مطلوبہ کام لیتی ہے۔ یعنی افراد تاریخ کو بنانے بگاڑنے والے نہیں ہوتے۔ بلکہ افراد کو تاریخ بناتی ہے۔ لیکن اسٹالین کے کردار کو اس کے جانشینوں نے جس طرح بے نقاب کیا ہے اس سے یہ مارکسی نظریۂ تاریخ باطل ہو جاتا ہے۔ اسٹالین کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ اگر صحیح ہے تو یہ مانے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ کہ اسٹالین نے کمیونزم سے اور سوویٹ روس کی تاریخ سے غدارانہ سلوک کیا ہے۔ اسٹالین نے آمریت کے تخت پر بیٹھ کر پوری قوت تنہا اپنے ہاتھ میں لی اور اس قوت کے بل پر انقلاب کی گاڑی کو بالکل غلط پٹڑی پر ڈال دیا۔ دوسرے لفظوں میں ایک فرد کے غلط پارٹ نے تاریخ کا رخ نامطلوب سمت میں پھیر دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسٹالین مزدوروں کی طبقاتی آمریت کا صحیح نمائندہ تھا۔ تو پھر یہ ماننا پڑے گا۔ کہ اب اس کے جانشین تاریخ کو ایک غلط موڑ سے گزار رہے ہیں۔ بہر حال ایک نہ ایک طرف تاریخ کے ساتھ غداری کرنے کا الزام عائد ہوتا ہے اور جدھر بھی وہ عاید ہو اس کی ذمہ داری ایک یا دو چار افراد پر آتی ہے۔ فرد کی تاریخ کے مقابلہ میں یہ بالا دستی مارکسی نظریۂ تاریخ کی دیوار میں خوفناک دراڑیں پیدا کر رہی ہے۔

۳۔ پرولتاری ڈکٹیٹرشپ یا مزدوروں کی طبقاتی آمریت کا دور مارکسی نظریہ کے مطابق قطعی طور پر ایک عبوری دور ہے جس کا منشا یہ ہے۔ کہ سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے جنم لینے والے اشتراکی نظام معاشرہ کے ان مفاسد کا ازالہ کیا جا سکے جو جبری طور پر اسے وراثت میں ملتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سرمایہ دارانہ اثرات کے خلاف تشدد کے ہتھیاروں سے ایک جنگ لڑ کر طبقاتی امتیازات کو کلیتہً ختم کرنا اس عبوری دور کا اصل پروگرام ہے۔ اسٹالین کے دور پر جو تبصرہ روس کی نئی قیادت کی طرف سے کیا گیا ہے اسے اگر صحیح مانیں ـــــ اور اسے غلط قرار دینا بھی مشکل ہے ـــــ تو ماننا پڑے گا۔ کہ یہ دور سرے سے اس معنی میں پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کا دور نہیں تھا۔ جس کے قیام کی ضرورت مارکسزم سے واضح کی گئی تھی بلکہ جس کے بارے میں قطعی طور پر پیش گوئی کی گئی تھی کہ ایسا اور ایسا ہوگا ہم دیکھتے ہیں۔ کہ مزدوروں کی طبقاتی آمریت کے نام سے اسٹالین کی شخصی ڈکٹیٹرشپ نافذ ہوئی جس کے تحت تشدد کی چکی میں سرمایہ داروں کے ایجنٹ نہیں، بلکہ سوویٹ روس کے خادم اور کمیونزم کے سچے مومن پسے۔ اسٹالین ساری عمر اپنے ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لئے اختلاف کرنے والوں کو کچلتا رہا اور اپنے ہر مظلوم کے گلے پر تیغ جفا کی دھار رکھتے ہوئے اس نے انہیں سرمایہ داروں کے ایجنٹ، دشمنوں کے جاسوس اور تخریب کار قرار دیا۔ گویا پرولتاری آمریت یا تو سرے سے قائم ہی نہیں ہوئی۔ یا قائم ہو کر معاً شخصی استبداد میں بدل گئی۔ ان میں سے جو بھی شکل واقع ہوئی ہو۔ مارکسزم کے اندازے اور پیشگوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں تاریخ کی مادی تعبیر باطل ٹھہرتی ہے۔

۴ - اجتماعی قیادت کا جو نیا نعرہ روس میں بلند ہوا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ اب کوئی ایک شخصیت اتنے بڑے ملک اور اس کی کثیر التعداد آبادی کا اعتماد حاصل کرنے یا اس پر حکم چلانے کے قابل نہیں رہی۔ اور اس وجہ سے چند نمایاں شخصیتوں کو مل جل کر ایک طاقت بننا ہوگا۔ چند شخصیتوں کے مل جل کر ایک طاقت بننے کا راستہ ہمیشہ جوڑ توڑ اور سودا بازی اور سمجھوتے کا راستہ ہے۔ اس راستے پر چلنے سے اولین مرحلے پر گروپ اور جتھے پیدا ہو سکتے ہیں۔ جو ٹوٹتے بنتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اولاً ایک ہی گروپ یا جتھا بنے، لیکن گروہ بندی جب سیاست کے دائرے میں ایک بار پیدا ہو جاتی ہے۔ تو ایک گروپ اپنے مقابلے میں آہستہ آہستہ کسی نہ کسی دوسرے گروپ کو سامنے لے آتا ہے۔ اور یہی تاریخ کے جدلی نظریہ کا تقاضا ہونا چاہئے۔ گروپ اور جتھے اپنی طاقت قائم رکھنے کے لئے عوامی حلقوں کی حمایت و تائید کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہ جب عوامی حمایت و تائید حاصل کرنے کے لئے مسابقت کرتے ہیں۔ تو آہستہ آہستہ پارٹیاں وجود میں آتی ہیں۔ پس اجتماعی قیادت کے نعرہ کے بلند ہونے کا دوسرا مطلب یہ ہے۔ کہ روس کی داخلی سیاست پارٹی پالٹیکس کی طرف سے جانے والی ہے۔ خروشچیف اور ان کے چند نمایاں ساتھیوں میں سے اگر کوئی فردِ واحد دوسروں کو روند پچھاڑ کر اسٹالین کی خالی کردہ مسندِ خداوندی پر قابض ہو جاتا ہے۔ تو پھر تو اجتماعی قیادت کا نعرہ ایک پردۂ فریب کے طور پر چند روزہ استعمال ہونے کے بعد مر جائے گا۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہو پاتا —— اور بظاہر احوال یہ ہے مشکل! —— تو پھر اجتماعی قیادت کا نعرہ جمہوری و پارلیمانی نظام اور پارٹی سسٹم کے بند دروازے کو کھولنے والی کلید ثابت ہوگا۔ بین الاقوامی ماحول کا دباؤ بھی ہمارے اسی قیاس کے حق میں ہے۔ آمریت اور تشدد کی حکومت کے ساتھ عالمی رائے عامہ کو روس مغربی طاقتوں کے مقابلے پر لاکر اپنے حق میں جیت نہیں سکتا۔ اور آئندہ جنگ جس کے بگل کی آواز مستقبل کی دوری سے سنائی دے رہی ہے فتح مند ہونے کے لئے کسی بھی فریق کو ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی طاقت سے بڑھ کر پروپیگنڈہ اور رائے عام کی حمایت کی طاقت کی ضرورت ہے۔ اس پہلو سے روس اب تک کمزور رہا ہے اور شاید موجودہ حالات میں اس کمزوری کو روسی قیادت نے پوری طرح محسوس بھی کر لیا ہے۔ اگر ابتک محسوس نہ کیا ہو تو وقت کی چند گردشیں بہرحال اس کمزوری کا احساس دلا دیں گی۔ کمیونسٹ نظام اور جمہوریتوں کے درمیان اثر و تاثر اور عمل و ردعمل کا جو سلسلہ جاری ہے۔ وہ اب روس کو اس حالت پر رکا نہیں رہنے دے گا۔ جس پر وہ ۱۹۱۷ء سے چلا آ رہا ہے۔ اگر وہ رکا رہا تو آنے والی جنگ اس کا خاتمہ کر دے گی۔ اندریں حالات ہماری رائے میں "اجتماعی قیادت" کا یہ نعرہ بڑے اہم سیاسی تغیرات کے دروازے کھولنے والا ہے۔

لیکن ان نئے دروازوں کے کھلنے سے مارکسزم کے نظریات کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا۔ مارکسزم گزشتہ نصف صدی سے ہمیں یہ یقین دلا رہا ہے۔ کہ روس پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کے جس عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ اس کے بعد کمیونزم کا وہ نصب العینی دور آنا لازم ہے جس میں ریاست کا وجود سرے سے ختم ہو جانے والا ہے۔ لیکن اگر تاریخ مزید آمریت سے الٹے قدموں چل کر جمہوری و پارلیمانی نظام کی طرف پسپا ہو جاتی ہے تو مارکسزم کی سرے سے جڑ کٹ جاتی ہے۔

ہمارے اس قیاس کے حق میں جارجیا کے فسادات بھی وزنی استدلال مہیا کرتے ہیں جیسے کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ روس کے اشتراکی دور میں یہ پہلا موقع ہے۔ کہ حکومت کے خلاف ایک کھلا کھلا مظاہرہ ہوا۔ اور عوام نے ایک اجتماعی احتجاج کیا اور بات یہاں تک بڑھی کہ پولیس نے گولی چلانے سے انکار کر دیا یہ غیر منظم صورت میں اپوزیشن کا پہلا ظہور ہے۔ گویا اب اسٹالن کے حامیوں اور اسٹالین کے مخالفوں کے دو گروہ رجحانات آمنے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ دو گونہ رجحانات سیاست میں گروہ بندی پیدا کرنے والی فضا بنائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۵۔ یہ بات اب پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ کہ کمیونزم انسانیت کو اور جو چاہے عنایت کر دے، لیکن وہ انسان کو حقوقِ آزادی نہیں دلوا سکتا اور وہ اسے آمریت کی جباریوں سے بچانے کے لئے کوئی راستہ نہیں بتا سکتا۔ حد یہ کہ خود خروشچیف کے بیان کے مطابق تو سردار ترین لیڈروں کو آمریت کی چیرہ دستیوں کے خلاف دم مارنے کی مجال نہیں ہو سکتی۔ بلکہ الٹا وہ اسکے آلۂ کار بن کر ان سارے مظالم میں سرگرم حصہ دار بنتے ہیں۔ جن پر خود ان کا ضمیر بھی چھی چھی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے۔ جو روٹی چاہے دلوائے لیکن آدمی سے شرفِ انسانیت سلب کر لیتا ہے۔

یہ ہیں وہ اہم نتائج۔ جو روس کی تاریخ کے تازہ اتار چڑھاؤ سے اخذ ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر جزو اس قابل ہے کہ اس پر پوری طرح غور و خوض کیا جائے۔

بقیہ: کوئٹہ قلات ڈویژن کی صحافت پر ایک نظر

آخر میں ایک اور تلخ حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں کے بعض اخبارات تو عوام میں محض اس لئے مشہور ہیں کہ ان میں ضرور کسی کے خلاف زہر اگلا جاتا ہے۔ اس قسم کے اخبارات میں ہفت روزہ "ارتقا" کا خصوصیت سے نام لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ مصرع ذہن میں ابھر آتا ہے ؎

"بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا"

آخر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں کے اخبارات کی ناکامی کی دو ایک موٹی موٹی وجوہات بھی بیان کر دوں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہاں کے اکثر اخبارات والے مالی مشکلات کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتے اور جو بڑے بڑے سردار یا ملک ہیں وہ اس طرف قطعاً توجہ نہیں دیتے۔ دوم یہ کہ یہاں آج بھی تعلیم کا فقدان ہے۔ حکومت پاکستان نے آٹھ سال کی قلیل مدت میں تعلیم پر خاص توجہ دی ہے اور کافی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ پھر بھی یہ مدت اتنی کم ہے کہ اخبارات کی صنعت کی کامیابی کے لئے ناکافی ہے۔ میں نے تقسیم سے پہلے بھی دیکھا تھا اور آج بھی تمام صوبہ میرے سامنے ہے۔ اس لئے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ تقسیم ملک کے بعد سے اب تک یہاں بہت کچھ ہو چکا ہے۔ کیا یہ کم ہے کہ انگریزوں کے آخری دور میں یہاں تمام صوبہ میں [illegible] اخبارات نکلتے تھے اور وہ بھی مقامی باشندوں کے نہیں تھے لیکن اس کے برعکس آج یہاں کے اکثر اخبارات مقامی باشندے ہی نکالتے ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کی اخباری صنعت کا مستقبل بہت روشن ہے بشرطیکہ (?) [illegible] حکومت نے بھی ہمدردانہ [illegible]۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را —

اسلامی معاشرہ کے سات مطلوبہ کردار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ کا یہ قول ہم تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں کہ:
"سات انسانی گروہ ایسے ہیں کہ جنہیں خداوند تعالیٰ اپنے سایۂ رحمت میں اس دن جگہ دے گا جس دن اس کے سایۂ رحمت کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔

ایک: انصاف کیش حکمران۔
دوسرا: وہ نوجوان جو (جوانی کے عالم میں گھٹیا خواہشات کا شکار ہونے کے بجائے) اللہ عزوجل کی عبادت کے لئے اُٹھا۔
تیسرا: وہ شخص جس کا دل (تفریح گاہوں کے بجائے) مساجد میں اٹکا رہتا ہے۔
چوتھے: وہ دو آدمی جو باہم وگر اللہ کی محبت کی وجہ سے محبت کریں اور اسی کیفیت کے ساتھ ملیں اور اسی کیفیت کے ساتھ جدا ہوں۔
پانچواں: وہ شخص جسے مرتبہ وجمال رکھنے والی کوئی عورت خود پیش کی دعوت دے اور وہ اس دعوت کو رد کرتے ہوئے یہ کہے کہ "میں خدا سے ڈرتا ہوں"!
چھٹا: وہ شخص جس نے کوئی صدقہ دیا اور پھر اسے اس حد تک مخفی رکھا کہ اس کے بائیں ہاتھ تک کو پتا نہ چل سکا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔
ساتواں: وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں مارے رقت کے پرنم ہو گئیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ علم و حکمت کے ان موتیوں کو مٹی میں ملا دینا چاہئے!

مخلوط جنس

مخلوط نسل

مخلوط قوم

مخلوط تعلیم

مخلوط کلب

مخلوط وزارت

—— جو کچھ بھی مخلوط ہو، ہمیشہ وجہِ فساد ہوتا ہے!

"مخلوط انتخاب"

کے

فتنے

سے

پاکستان کو بچائیے!

(دونوں خطّوں کی اسمبلیوں میں یہ مسئلہ عنقریب آنے والا ہے!)



تاثرات

ادارہ

تہذیب اور انسانیت کے لئے خطرۂ عظیم!

بھارت ایک لمبا چوڑا ملک ہے، اس کی آبادی تیس پینتیس کروڑ ہے۔ اس کے معاشی تعمیر کے منصوبے نتیجہ خیز ہیں، وہ دنیا کے نقشے کے امن پر ایک سیاہ دھبہ ہے جس کی سیاہی روز بروز گہری ہو رہی ہے۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جو ایک پڑوسی ملک کی سرحدوں پر نت نئی شرانگیزیاں کرتا ہے اور ظلم ڈھانے کے بعد پھر اپنے مظالم کی قیمت مانگنے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جو انسانی دنیا کی بھری مجلس میں کشمیر میں رائے شماری کرانے کا پیمان باندھنے کے بعد کھلم کھلا اسے توڑ دیتا ہے اور بغیر رائے شماری کرائے کشمیر کو اپنا جزو بدن قرار دے لیتا ہے۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جس میں بسنے والی مسلم اقلیت کا خون بہایا جاتا ہے، مسلم خواتین کی عزت پر حملے کئے جاتے ہیں، ان کو جائیدادوں سے محروم کیا جاتا، ان پر معاش کا دائرہ تنگ سے تنگ تر کیا جاتا ہے ان پر جھوٹے مقدمات چلائے جاتے ہیں۔ آئے دن ان کو جلسہ ہائے عام میں دھمکایا جاتا ہے، ان کے مذہبی فرائض کی ادائی میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں، ان کی مسجدوں کی توہین کی جاتی ہے اور ان کو تبدیلیٔ مذہب پر مجبور کیا جاتا ہے۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں کی ہندو اکثریت کی بعض مسلمہ منظم پارٹیوں کے اونچے رہنما کھلے بندوں یہ کہتے پھرتے ہیں کہ بھارت میں کسی کو مسلمان بن کر رہنے کا حق نہیں رہے جسے یہاں رہنا ہو اسے عادات و اطوار، معاشرت، کلچر اور اعتقاد کے لحاظ سے ہندو بننا ہوگا۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جس میں اس روشن دور میں نہایت جاہلانہ عقیدے اور نہایت احمقانہ رسوم رائج ہیں، جس میں ایک مضحکہ انگیز دیومالا کا آج بھی دور دورہ ہے جس میں گائے اور گھوڑے اور پیپل اور تلسی اور سورج اور ہوا اور آگ اور پانی کی پوجا ہوتی ہے۔

پس یہ ملک تہذیب اور انسانیت کے لئے ایک عظیم ترین خطرہ ہے اور جوں جوں اس کی معاشی و عسکری اور سیاسی و بین الاقوامی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے یہ خطرہ مہلک تر بنتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بیرونی دنیا خصوصاً مغرب کو اس خطرے سے پوری طرح آگاہ کیا جائے اس سرزمین وحشت و بربریت کی اندرونی تصویر پیش کرنے کے لئے اعلیٰ درجہ کا لٹریچر تیار کیا جائے اور اسے باہر پھیلایا جائے خصوصاً آزادی کے گذشتہ سالوں میں تہذیب و انسانیت کو جو چرکے اس ملک کے اندر لگائے گئے ہیں، انہیں یکجا [illegible] سے ان کی پوری تفصیل اخذ کر کے بغرض [illegible] انگریزی زبان میں مرتب کر دی جانی چاہئے۔ کچھ صحافی، ادیب اور [illegible] یہ خدمت سرانجام دے سکیں تو اس سے بڑے [illegible] نکلیں گے۔

سینما ـــــ جرائم کی درسگاہ

"ٹیکسی ڈرائیور کے مشہور مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ اس فیصلہ میں جرائم آموز فلموں کے تباہ کن اثرات پر جو اظہار رائے کیا گیا ہے اس پر
ہمارے ملک کے اکابر اور وزراء اور لیڈروں اور اسمبلیوں کے ارکان کو خاص طور پر متوجہ ہونا چاہیئے۔ اس مقدمہ کے ملزمین نے اپنے مجرمانہ کارنامہ
کا پورا پورا حصہ ایک فلم سے اخذ کیا اور جو کچھ پردۂ سیمیں پر دیکھا تھا اس کا تجربہ عالم واقعہ میں کر ڈالا۔ فیصلہ میں فاضل جج نے درد مندانہ اپیل کی
ہے کہ ان فلموں کا سدِباب کیا جائے اور قومی اخلاق کو ان کی زد سے بچایا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ جرائم اور معاشقے کے فلم نہایت تیزی سے ہمارے نوجوانوں کے اخلاق کو گھن لگا رہے ہیں۔ جرائم کے فلموں کے زیرِ اثر
قتل، چوری، فریب دہی اور لوٹ مار کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے اور معاشقے کے فلموں کی وجہ سے نظر بازی، بدکاری اور اغوا کی وارداتیں
بڑھ رہی ہیں۔ وہ نظام بھی کیسا عجیب نظام ہوگا جو ایک طرف بعض جرائم کو روکنے کے لئے قانون اور پولیس اور عدالت کی طاقتوں کو حرکت میں لاتا
ہو اور دوسری طرف انہی جرائم کی تربیت کے لئے شہر شہر میں درسگاہوں اور تربیت گاہوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہو۔

ٹیکسی ڈرائیور کے واقعہ جرم اور اس طرح کی دوسری تمام وارداتوں میں حقیقت کے اعتبار سے مجرم صرف وہی لوگ نہیں ہوتے جن پر
قانون کا تقاضا نافذ ہو جاتا ہے بلکہ فلم ساز کمپنیاں، سینماؤں کے مالک، فلمی اشتہارات مرتب کرنے والے آرٹسٹ اور ان کو شائع کرنے والے اخبارات
اور پریس سب کے سب گندے اور بدراہ کرنے والے فلموں کے اثراتِ بد میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے مجرم ہوتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں قوم کے وہ لیڈر
اور سربراہ کار بھی اس ہمہ گیر اخلاقی فساد کی ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں جو ان کے اذن کے تحت دکھائے جانے والی فلموں سے پھیلتا ہے۔ چاہئے کہ سینما کے نام سے
جرائم کی جو درسگاہیں شہر شہر اور قریہ قریہ کھلی ہیں ان کو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے نظریاتی مقاصد کے مطابق ایک انقلاب سے گزارا جائے۔ چاہیے کہ ہمارے
اکابر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔ ورنہ قیامت میں جب ان کو ہزارہا نوجوانوں کی زندگیوں کی بربادی، ہزاروں گھرانوں کی تباہی اور پوری قوم کی اخلاقی پستی کا حساب
دینا پڑیگا۔ تو اس وقت کوئی راہ نجات نہ ہوگی۔

تھیٹر، ریکارڈ، گانے!

کمیوڑہ کے عوام کی طرف سے اخبارات میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ وہ پہلے ہی ایک تھیٹر کے وجود سے نالاں تھے جس کے زیرِ اہتمام رات
گئے تک روزمرہ گندے گانوں کے ریکارڈ لاوڈ اسپیکروں پر بجتے رہتے ہیں اور نہ صرف لوگوں کی نیندیں حرام ہوتی ہیں بلکہ زبردستی شریف مردوں،
عورتوں اور بچوں کے کانوں میں خاسقانہ صدائیں ڈالی جاتی ہیں، اب ایک اور تھیٹر قائم ہو رہا ہے۔ یک شد دو شد والا معاملہ ہوا۔
یہ پہلی شکایت نہیں جو کمیوڑہ سے بس اسی مرتبہ آئی ہو، پاکستان کے بے شمار شہروں اور قصبوں اور دیہاتی علاقوں سے اس طرح کی
فریادیں بار بار اخباری دنیا کے ایوانوں میں گونجتی سنائی دیتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تھیٹروں، اور گانے کے اکھاڑوں میں آخر قومی تعمیر و ترقی کا کونسا
پہلو ایسا ہے کہ جس کی وجہ سے ان وباؤں کو ایک ایک بستی تک پھیلا دینا ضروری ہے۔ کیوں اس میدان میں قومی دولت و محنت کو جھونکا جائے نقصانات
البتہ نہایت واضح اور نمایاں ہیں۔ یہ وبا جہاں پہنچی ہے وہاں کی معیشت پر اس کا تباہ کن اثر پڑا ہے۔ شہروں میں میدانِ مقابلہ تنگ پاکر سرمایہ دار اور
نفع پرست لوگ قصبوں اور دیہاتی علاقوں کا رخ کرتے ہیں تاکہ وہاں سے نوجوان طبقہ کے لئے رنگ رلیاں منانے کے سامان فراہم کرکے ان کی
جیبوں سے پیسہ نکالیں۔ ہماری دیہی معیشت پہلے ہی کمزور ہے اس پر سے جب فاسد جذبات کا برگ جنبش بلا کر روپے کھینچنے والے مہذب طریقے

عوام پر حملہ آور ہو جاتے ہیں تو معاشی توازن خراب سے خراب تر ہو جاتا ہے۔ معاش سے بڑھ کر سرمایہ پرست طبقہ کی یہ کاروباری سرگرمیاں ہمارے قومی اخلاق کو تباہ کرتی ہیں جس کی حالت دیہات میں اب بھی کسی قدر بہتر ہے اور اگر توجہ سے اسے سنبھالا جائے، تو کچھ مدت میں بہت بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

حکومت لوگوں کی جسمانی صحتوں کو طاعون اور ہیضے اور چیچک اور ٹائیفائڈ اور ملیریا سے بچانے کے لئے جتنی کاوش کرتی ہے چاہیے کہ وہ قوم کی اخلاقی صحت کو سرمایہ دار اور نفع پرست جرثوموں سے بچانے کے لئے اس سے دس گنا زیادہ سرگرمی دکھلائے۔ جسمانی وبائیں تو قوم کو افراد کی ایک تعداد سے محروم کرتی ہیں، لیکن اخلاقی وبائیں تو سرے سے ایک قوم ہی کو ختم کر دیتی ہیں۔ اور اب تو نیا دور شروع ہو رہا ہے، اب تو یہ سرزمین اسلام کے نام پر وقف ہو چکی، اب تو یہاں کتاب و سنت کے تقاضے پورے ہوتے ہیں، اب تو یہاں مسلمانوں کی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے، اب حکومت کو زراندوزی کے ایسے فاسد طریقوں پر پابندیاں عائد کرنی چاہئیں جن سے دستوری طور پر طے شدہ ملی مقاصد صریحاً تباہی کی زد میں آتے ہیں۔ جس اصول کے تحت آپ عوام الناس کو جعل سازوں، جیب کتروں اور قلب سازوں سے بچانے کے لئے قانون بناتے ہیں، ٹھیک اسی اصول کے تحت اخلاق سوز سرگرمیوں کے بل پر کمائی کرنے والوں کے شر سے اپنی قوم کو بچانے کے لئے قانون و اختیار کی طاقت کو استعمال کیجئے۔ علی الخصوص جہاں کے عوام الناس خود چیخ پکار کر رہے ہوں اور ایک مصیبت سے نجات پانے کے لئے حکومت سے فریاد کریں، جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت ان کی فریاد سنے اور ان کو مصیبت سے نجات دلائے۔

سرزمینِ فراعنہ میں

ترکی میں جو کچھ کمالی اصلاحات ہوئی تھیں وہ تو سب کو معلوم ہیں۔ اب سرزمینِ فراعنہ میں جو جمالی اصلاحات ہو رہی ہیں، ان کو بھی جانئے۔

جمال ناصر صاحب نے پچھلے دنوں اعلان فرمایا تھا کہ تین سال کے اندر اندر سارے باشندوں کو عربی لباس ترک کر کے انگریزی لباس میں ملبوس ہو جانا چاہیے، ورنہ کوتاہی کے مجرموں کو سزائیں دی جائیں گی۔ پروگرام کا دوسرا جز یہ تھا کہ جامعہ ازہر میں لڑکیوں کے لئے ناچ گانے کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ اور تیسرا مژدہ یہ سنایا گیا تھا کہ مسجدوں کے ساتھ فلمی اسٹوڈیو یا سینما گھر قائم کئے جائیں گے۔

اب ایک تازہ اطلاع یہ ملی ہے کہ قلوپطرہ کی یاد میں ایک تقریب محکمۂ سیاحت کے زیرِ اہتمام منائی جائے گی۔ آئندہ سال فروری میں انتھونی اور قلوپطرہ کا جلوس، رومن رتھوں کے ساتھ نکالا جائے گا۔ یہ جلوس قاہرہ کے چوک آزادی پر آ کر ختم ہوگا۔ جلوس کے آگے آگے بینڈ ہوگا اور اس کے پیچھے دو ہزار سال پہلے کے روایتی لباس میں ملبوس درباریوں کا ایک گروہ مارچ کرے گا۔ شام کو دریائے نیل میں قلوپطرہ کے مخصوص بجرے کا مظاہرہ کیا جائے گا اور اس عیاش اور عاشق ملکہ کے دورِ حکومت کے واقعات ڈراموں کی صورت میں پیش کئے جائیں گے۔

مبارک ہو ہمارے ان تمام مذہبی بزرگوں کو جو جمال ناصر کی حکومت کو اپنی آشیرباد دے چکے ہیں۔ مبارک ہو ان علمائے ازہر کو جنہوں نے جمال ناصر کی خوشنودی کے لئے اخوان کی تکفیر کی تھی، مبارک ہو سلہری صاحب کو جنہوں نے جمال ناصر کی حمایت اور اخوان کی مخالفت میں پہلا ازوۂ قلم صرف کر کے ایک تند و تیز اداریہ لکھا تھا۔

یاد رکھو، جہاں کہیں اسلامی رجحانات کو دبایا جائے گا وہاں ایسی ہی "اصلاحات" عمل میں آئیں گی۔

اب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ انگریزی لباس پہننے، ناچ گانوں اور فلموں اور سینماؤں سے دلچسپی لینے اور قلوپطرہ کی یاد منانے سے ایک قوم کے خیالات و کردار میں کونسا تعمیری انقلاب آجائے گا۔ کیا ان چیزوں کو کبھی کسی تہذیب کی بنیاد بنایا جا سکا ہے؟ کیا ان چیزوں کے بل پر کوئی ملک ترقی کے مراحل طے کر سکا ہے؟

آہ! کیسے بے بصیرت لوگ مسلمان قوموں کے رہنما بنتے ہیں۔

یہ جوڑ توڑ:

پاکستان جب سے بنا ہے، ہمارے اوپر کے سیاسی بزرگوں کی صفوں میں پے در پے جوڑ توڑ کے چکر چلتے رہے ہیں۔ کسی اصولی محرک کے بغیر یہ لوگ آپس میں جڑتے اور کٹتے رہے ہیں۔ کسی اصولی محرک کے بغیر پارٹیاں اور پارٹیوں کے اندر گروپ بنے اور ٹوٹے۔ کسی اصولی محرک کے بغیر وزارتیں قائم ہوئیں اور برطرف ہوئیں۔ سیاسی تغیرات ہمیشہ عوام سے بالا بالا ہی واقع ہوتے رہے اور ان کے لئے سودا بازی کا طریقہ استعمال میں لایا جاتا رہا۔ تین چار درجن افراد ہیں جن سے سیاسی دنگل کی مختلف ٹیمیں بنتی رہتی ہیں۔ پارٹیوں کے نام کچھ بھی ہوں، یہی افراد کھیل کرتب دکھانے والے ہیں۔ آج ایک ٹیم میں، کل اس میں! آج حکومت کی گدی پر، کل اپوزیشن کے بنچوں پر! آج مسلم لیگ میں، کل عوامی لیگ میں، پرسوں متحدہ محاذ میں!

عوام آس لگائے بیٹھے تھے کہ ان کے اکابر کم سے کم اسلامی دستور کے یوم نفاذ سے اپنے گھناؤنے ماضی کو دفن کر کے دور نو کا آغاز کریں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ نئے دستور کے نافذ ہوتے ہی مغربی پاکستان میں اقتدار کی چوگان سیاست اسی پرانے گندے انداز سے شروع ہو گئی اور اس کی گندگی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ بیانات، تردیدوں، توضیحوں اور پروپیگنڈے کا ایک گندا ڈھیر لگ گیا ہے، اس ڈھیر سے ایک نئی پارٹی (ریپبلکن پارٹی) اُگ آئی ہے۔ لیکن اس پارٹی کی ترکیب انہی فرسودہ افراد سے ہو رہی ہے جنہوں نے مسلم لیگ کو غارت کیا اور ملک کے نظام سیاسی کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔ پھر یہ نئی پارٹی بھانت بھانت کے عناصر کا ایک ویسا ہی مجموعہ بنتی جا رہی ہے جیسا مشرقی پاکستان میں متحدہ محاذ تھا۔ یہ نیا اسٹیج جلد جلد محض اس لئے تعمیر کیا جا رہا ہے کہ آئندہ انتخابات میں اسے استعمال کیا جا سکے۔

لیکن نہ ریپبلکن پارٹی کے پاس کوئی نیا اصول و نظریہ ہے، نہ کوئی نیا تنظیمی نقشہ ہے نہ کوئی انقلابی نصب العین ہے، نہ نئے دستور کے مطابق قوم کے لئے کوئی تعمیری پروگرام ہے، اسی طرح اس کی رکنیت قبول کرنے والے افراد کی کوئی علامت امتیاز نہیں۔ بلکہ الٹا یہ پارٹی بے اصولے پن کے بیج سے اُگی ہے۔ اس کے داعی اول ڈاکٹر خان صاحب اصولاً جماعت یا پارٹی بنانے کے خلاف تھے، مگر اب وہ اصول نسیاً منسیا ہو گیا ہے۔ پھر آپ کا ایک فیصلہ یہ تھا کہ پارلیمنٹری سیکرٹری نہیں بنائے جائیں گے، اگر لئے بھی گئے تو بس دو چار کی تعداد کافی ہو گی، مگر تازہ اطلاع یہ ہے کہ پندرہ پارلیمنٹری سیکرٹری ہوں گے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

پس مسلم لیگ اور ریپبلکن پارٹی میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ ملک کو جو کچھ اُس سے ملا تھا وہی کچھ اس سے ملے گا۔ بلکہ شائد نتائج اور بھی زیادہ مایوس کن نکلیں گے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے تو بس ـــ "سلطانی بھی عیاری ہے، درویشی بھی عیاری!" ـــ عوام سے ہم خیر خواہانہ جذبات کے ساتھ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اسلام کو کسوٹی بنا کر جانچیں اور پرکھیں جو افراد خیالات و اعمال کے لحاظ سے اور جو پارٹیاں نظریہ اور پروگرام کے لحاظ سے اس کسوٹی پر کھوٹی نکلیں ان کی جلیت پھرتی سے مرعوب نہ ہوں بلکہ ان سب کو راستے سے ہٹا کر آگے بڑھیں اور اپنی خدمت کے لئے صحیح اوصاف اور بلند کردار کے لوگوں کو اپنے اندر سے سربراہی کے لئے خود ابھاریں۔ مفاد پرستانہ جوڑ توڑ اور سودا بازیوں کی کبھی حوصلہ افزائی نہ کی جانی چاہئے۔ ٭

منزل منزل

سید نظر زیدی

[اب سے بہت دن پہلے جب انسان تہذیبی طور پر گھٹنوں چلنا ہی سیکھ رہا تھا ایک ویرانے میں دو تنومند انسان دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں میں کسی کے پاس بھی ہتھیار نہیں لیکن دونوں ہی بری طرح زخمی ہو چکے ہیں ۔

گیدڑ، لومڑیاں اور جنگلی کتے وغیرہ بہت سے ایسے گوشت خور جانور جو عام طور پر دوسروں کے بچے کھچے شکار پر زندگی بسر کرتے ہیں جھاڑیوں کی آڑ میں چھپے ہوئے لڑنے والے انسانوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ان سب کی نظروں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے۔ کہ وہ سب ان کے مرنے کے منتظر ہیں ۔

تھوڑی دیر بعد دونوں انسان نڈھال ہو کر زمین پر گر جاتے ہیں اور گھات میں لگے ہوئے درندے لپک کر انہیں بھنبھوڑ ڈالتے ہیں ۔ انسانوں کے کراہنے اور جانوروں کے غرانے اور لڑنے کی آوازوں سے نہایت ہی بھیانک قسم کا شور مچ جاتا ہے، درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے خوفزدہ ہو کر چیختے ہوئے ادھر اُدھر اُڑ جاتے ہیں۔ کچھ دیر تک فضا میں یہی ارتعاش رہتا ہے ۔ آخر سکون چھا جاتا ہے کبھی کبھی کسی جانور کے دانتوں سے ہڈی ٹوٹنے کی آواز گونج اٹھتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت بھی زیادہ دیر باقی نہیں رہتی ۔ لاشوں کے آس پاس والے درختوں کے پتے زور زور سے ہلتے ہیں اور دو انسانی روحیں اچھلتی کودتی لاشوں کے پاس آ کھڑی ہوتی ہیں۔ گوشت خور جانور انسانی لاشوں کو قریب قریب ختم کر چکے ہیں لیکن ان دونوں ہی کے چہرے ابھی تک درست حالت میں ہیں۔ ایک روح لاشوں کی طرف غور سے دیکھ کر کہتی ہے]

نمبر ۱ ۔ کیوں بھوت! کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم دونوں ابھی ابھی مر گئے تھے ؟

نمبر ۲ ۔ قطعی! اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ گوشت خور سفاک درندے ہم دونوں کی لاشوں ہی کو بھنبھوڑ رہے ہیں ۔ وہ دیکھو! وہ دہنی طرف والی لاش جسے جنگلی کتوں نے سنبھال رکھا ہے تمہاری ہے، تم اپنا چہرہ تو پہچانتے ہو نا ؟

نمبر ۱ ۔ ہاں چہرہ تو میرا ہی لگتا ہے ۔

نمبر ۲ ۔ لگتا کیا ہے قطعی تمہارا ہی چہرہ ہے۔ تمہارا جس کی کھوپری میں یہ غرور سمایا ہوا تھا، کہ مجھ جیسا دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں ہا ہا ۔ (ہنستا ہے) کیسا شاندار انجام ہوا ہے اس شاندار انسان کا! ہا ہا ہا! ——— اور کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ تمہارا انجام مجھ سے مختلف ہوا ہے ؟ شاید اپنی شکل و صورت تمہیں یاد ہی نہیں رہی ورنہ معلوم ہوتا۔ کہ جس لاش کو مکار لومڑیاں اور بزدل گیدڑ بھنبھوڑ رہے ہیں وہ تمہاری اور صرف تمہاری ہے

نمبر ۱ ۔ چلو یونہی سہی ۔ اس سے تمہاری شان تو نہیں بڑھ جاتی تمہارا یہ دعویٰ تو بہرحال باطل ہو گیا۔ کہ انسانی برادری میں تمہی سب سے زیادہ شان والے ہو۔ کیوں کہ تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوا جو میرا!

نمبر ۲۔ کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میرا انجام یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ تمہاری طرح بھولی بسری کہانی بن جاؤں۔ میں نے اپنی طاقت اور صلاحیتوں کی بنا پر بڑائی کا دعویٰ کیا تھا اور میرا یہ دعویٰ پورا ہو کر رہے گا۔ میں مرنے کے بعد بھی تم سے اپنی برتری کا لوہا منواؤں گا۔ سمجھے!!

نمبر ۱۔ لیکن اب تمہاری یہ باتیں صرف حماقت ہے۔ اب ہم دونوں ہی کے جسم ایسے لطیف ہیں۔ کہ نہ تم مجھے نقصان پہنچا سکتے ہو نہ میں تمہیں۔ پھر تم مجھ پر کس طرح برتری حاصل کر سکو گے!

نمبر ۲۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اگر اب میں تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا تو۔ یہ فرض میرے بچے انجام دیں گے۔ میرے شان والے بہادر بچے جن کی رگوں میں میرا جوشیلا اور پاک خون دوڑ رہا ہے، وہ تیری بزدل اور مکروہ نسل سے آل بھوث کا لوہا منوا کر رہیں گے۔ اس بنا پر حکومت میری ہی اولاد کی ہو گی کیوں کہ میں ہی سب سے زیادہ اس اعزاز کا حقدار ہوں!

نمبر ۱۔ حماقت، صرف حماقت۔ اگر تیرے دماغ سے اب بھی یہ خناس نہیں نکلا تو تجھے اس دن کا انتظار کرنا چاہیئے جب تو شیطان کی طرح اپنے اس غرور کا انجام دیکھے گا، بے بسی اور شرمندگی کے آنسو بہائے گا۔ شریر، بزدل بچوں کی طرح چیخنے چلائے گا اور کائنات میں ایک دل بھی نہ ہو گا جس میں تیرے لئے پیار اور ہمدردی ہو گی۔

نمبر ۲۔ یہ تیرا انجام ہے بزدل انسان، تیرا اور تیری پوری نسل کا۔

نمبر ۱۔ میرا نہیں تیرا بھی، ہٹ دھرمی اور مکاری کا نتیجہ ہمیشہ ذلت اور تباہی ہی نکلا ہے، پھر تو اس سے کس طرح بچ جائے گا!

نمبر ۲۔ تو اب بھی اس بدتمیزی اور منہ زوری سے باز نہیں آتا! اچھا ٹھہر تو! (دوسری روح کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن اس کا ہاتھ دوسری روح کے جسم میں سے یوں گذر جاتا ہے جیسے سورج کی شعاع میں سے کوئی چیز گزر جاتی ہے۔ پہلی روح زوردار قہقہہ لگاتی ہے۔)

۲

[وہی جنگل لیکن اب یہاں پہلے کی طرح ویرانی نہیں۔ مناسب کاٹ چھانٹ کے بعد درختوں کو باغوں کی شکل دے دی گئی ہے اور زمین کو ہموار کر کے بڑے بڑے کھیت بنا دیئے گئے ہیں۔ باغ پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے ہیں اور کھیتوں میں اناج کے گہرے سبز پودے بہار دکھا رہے ہیں۔ لیکن جس جگہ بھوث اور سمارہ کی لڑائی ہوئی تھی اسے پہلی صورت میں رکھا گیا ہے۔ وہاں کے درخت اور دوسری چیزیں بالکل پہلے کی طرح ہیں، صرف اس قدر فرق واقع ہوا ہے۔ کہ یہ جگہ کچھ مختصر سی لگنے لگی ہے۔ اس مقام پر کھڑے ہوئے درختوں کے پتے زور زور سے ہلتے ہیں اور بھوث اور سمارہ کی روحیں فخریہ انداز میں ہنستی ہوئی زمین پر اتر آتی ہیں۔ بھوث، سمارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے)

نمبر ۱۔ کیوں میں نے نہ کہا تھا ایک دن تیری پوری نسل کو ذلت کی خاک چاٹنی ہو گی۔ وہ دیکھ میرے بہادر، سجیلے بیٹے اور پوتے تیری ناپاک اولاد کو سزا دینے کے لئے کس سج دھج سے چلے آ رہے ہیں؟

نمبر ۲۔ اور میں کہتا ہوں یہ خود تیرا انجام ہے۔ ذرا دوسری طرف بھی تو نظر اٹھا اور میری اولاد کی آن بان دیکھ۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے تیرے شیخی خورے کپوت میرے صابر و شاکر اور بہادر سپوتوں پر فتح پا سکیں گے اور اگر تو سچ مچ ہی اس غلط فہمی کا شکار ہے تو تیری یہ غلط فہمی بہت جلد دور ہو جائے گی۔ تو چند ساعت بعد ہی ان سب کو ذلت کی خاک چاٹتے دیکھے گا۔

نمبر ۱ - اچھا دیکھا جائے گا - ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے! وہ دیکھو میرے بیٹے جوان اپنے ذلیل دشمنوں سے نمٹنے کے لئے پرے باندھ کر کھڑے ہو گئے -

[دو مختلف سمتوں سے انسانوں کے دو گروہ آکر کھلے میدان میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں کچھ دیر تک فخریہ اشعار اور پرجوش نعروں سے فضا جھنجھناتی رہتی ہے اس کے بعد ایک طرف سے ایک تنومند نوجوان آگے بڑھتا ہے اور اپنی تلوار فضا میں لہرا کر مقابلے کے لئے للکارتا ہے - دوسری طرف سے بھی ایک نوجوان آگے بڑھتا ہے اور دونوں میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے، ان دونوں کے لڑنے کا انداز پرجوش تو ضرور ہے لیکن جنگی اخلاق و آداب کا پورا پورا لحاظ رکھ رہے ہیں -

دونوں کے ساتھی حیرت اور انتظار کی ملی جلی کیفیت کے زیر اثر لڑائی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں - لڑنے والوں میں کوئی خاص بہادری دکھاتا ہے تو صفوں میں تھوڑی دیر کے لئے ہلچل مچ جاتی ہے - یہ لڑائی تقریباً آدھا گھنٹہ تک جاری رہتی ہے - پھر اچانک ہی ایک نوجوان کی تلوار دوسرے کے شانے پر پڑتی ہے اور وہ تیورا کر گر پڑتا ہے - ہزیمتی ہونے والے کے ساتھی کچھ دیر سراسیمہ سے کھڑے رہتے ہیں اس کے بعد نعرے لگاتے ہوئے مخالف گروہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں - دست بدست لڑائی شروع ہو جاتی ہے، ہتھیاروں کے ٹکرانے اور زخمیوں کے چیخنے چلانے سے قیامت کا سا شور مچ جاتا ہے - یہ لڑائی بھی آدھا پونا گھنٹہ تک جاری رہتی ہے اس کے بعد ایک طرف کے آدمی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں - غالب آنے والے ان کا تعاقب کرتے ہیں اور میدان میں زخمیوں اور لاشوں کے سوا ایک متنفس بھی باقی نہیں رہتا - پہلی روح بلند آواز میں نغمہ لگا کر کہتی ہے]

نمبر ۱ - دیکھا، میں نہ کہتا تھا، آخر جیت میری ہی ہو گی - میرے بیٹے ہی فتح پائیں گے کیوں کہ ان کی رگوں میں کچھ جیسے شاندار انسان کا خون گردش کر رہا ہے -

نمبر ۲ - اور تو اب بھی یوں کہہ رہا ہے شیخی خورے! دیکھتا نہیں میدان میں یہ سب سے پہلے کس کے شاندار بیٹے کی لاش گری تھی؟

نمبر ۱ - اور اب تو یہ نہیں دیکھ رہا کہ اس میدان میں کس کے بیٹوں پوتوں کی لاشیں زیادہ ہیں، اور بھاگنے والے سورما کس کی نسل سے ہیں؟

نمبر ۲ - لیکن یہ کوئی بہادری کی جیت نہیں - یہ تو بے اصولی اور کثرت تعداد کی جیت ہے - مزہ تو تب تھا - یہ تیرا بیٹا میرے بیٹے کو دست بدست لڑائی میں ہرا دیتا -

نمبر ۱ - اب اگر تو شرمندگی مٹانے کے لئے باتیں بنائے تو اور بات ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ آج تیری نسل پر میری نسل کا تفوق ثابت ہو گیا، آج بہادری نے بزدلی کو شکست دے دی -

نمبر ۲ - تو اور سب کچھ کہہ بہادری کا نام نہ لے - مجھے تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اب دنیا سے بہادری کا خاتمہ ہی ہو گیا ہے - کیا تو اسے بہادری قرار دے گا کہ انسان اپنے بازوؤں کی قوت اور دل کے حوصلے کی جگہ بہتے کے دھارے اور جھگڑوں پر بھروسہ کرے - اصول اور استقلال کے بجائے چالاکی اور دھوکے کو اپنا لے؟

نمبر ۱ - اور یہ باتیں تیرے ذہن میں یوں آرہی ہیں - کہ تو کبھی بہادری کی روح سے آشنا ہی نہیں ہوا - کیا تیرا خیال ہے بہادری اور عبادت کے بغیر کوئی ہتھیار کارگر ہو سکتا ہے؟

نمبر ۲۔ (بے بسی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے) نہیں نہیں بھوت! یہ بہادری نہیں ہو سکتی۔ بہادری وہی تھی جب انسان اپنے ذاتی اوصاف کے بل پر اپنے دشمنوں کو نیچا دکھاتا تھا۔

نمبر ۱۔ (ہنستے ہوئے) خیر تو اب اس ذہنی بھول بھلیاں میں بھٹکنا رہ، جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ آج اس کائنات کے ذرے ذرے نے محسوس کر لیا میری نسل ہی اس قابل ہے کہ دنیا پہ حکومت کرے۔

نمبر ۱۔ اور اس سے بڑا جھوٹ کوئی شاید ہی ہو۔

نمبر ۲۔ یہ ڈھیٹ پنے کی انتہا ہے۔

نمبر ۱۔ ہرگز نہیں۔ جب تو نے ہار جیت کا یہ عجیب فلسفہ ہی اپنا لیا ہے تو پھر میں یہ یقین کیوں نہ رکھوں کہ میرے جو بیٹے آج میدان سے پسپا ہوئے ہیں کل اپنی طاقت مجتمع کر کے پھر مقابلے پر نکلیں گے اور تیرے غرور کے پرخچے اڑا دیں گے۔

نمبر ۱۔ کیا ــــ؟

نمبر ۲۔ میں نے کسی ایسی زبان میں بات نہیں کی جو تیری سمجھ میں نہ آئی ہو!

نمبر ۱۔ اچھا اگر یہی بات ہے تو دیکھا جائے گا۔

نمبر ۲۔ ہاں دیکھا جائے گا۔

(دونوں روحیں پھر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں)

(۳)

[روئے زمین کا وہی خطہ۔ باغوں اور کھیتوں کی جگہ اب یہاں زیادہ تر اونچی اونچی عمارتیں بنی ہوئی ہیں، عبادت گاہوں کے اونچے مینار اور کلس اور کارخانوں کی بلند چمنیاں اس بستی کی خوشحالی کا اعلان کر رہے ہیں، آبادی سے کافی دور ایک کھلے میدان میں فوجیوں کے خیمے اور عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہوائی میدان میں لڑاکا طیارے تیار کھڑے ہیں۔ مناسب مکانوں پر توپیں نصب ہیں۔ بکتر بند گاڑیاں، ٹینک اور جیپ کاریں ادھر ادھر دوڑ رہی ہیں۔ مسلح سپاہی اپنی اپنی جگہ چوکنے کھڑے ہیں۔

دونوں انسانی روحیں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک محفوظ سی جگہ کھڑی ہو جاتی ہیں پہلی روح مسرت میں ڈوبا ہوا طویل سانس لے کر کہتی ہے)

نمبر ۱۔ اب تو ہمارے بیٹوں نے قابلِ رشک ترقی کر لی ہے۔ اگر اس جگہ سے اس قدر گہرا لگاؤ نہ ہوتا تو میں تو اسے کوئی اور ہی دنیا سمجھتا!

نمبر ۲۔ بیشک ان لوگوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ غالباً ہم دونوں کچھ زیادہ عرصہ تو عالمِ برزخ میں نہ رہے ہوں گے؟

نمبر ۱۔ اچھا خیر یہ فیصلے تو پھر بھی ہوتے رہیں گے، ہمیں وہ کام انجام دینا چاہیے جس کے لئے رب العزت کی اجازت سے کہ دنیا میں آئے ہیں۔

نمبر ۲۔ عجیب بات ہے تمہارے ذہن سے ابھی تک وہ خلش دور نہیں ہوئی! اگر میرے دل کی بات پوچھو تو میں تو اپنے بچوں کی یہ فاتحانہ زندگی دیکھ کر معبودِ حقیقی کا شکر ادا کرنے کے سوا سب کچھ بھول چکا ہوں۔ کیا یہ اچھا نہیں، کہ اب ہم تمام تلخ یادوں کو بھلا دیں!

نمبر ۱۔ واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اپنی عظمت اور برتری کا اعتراف کرانے کا ٹھیک وقت تو ابھی آیا ہے، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ روئے زمین

کی یہ ساری رونق میرے بچوں کی بخشی ہوئی ہے۔ انہی میں ایسی صلاحیت تھی۔ اور تمہارا فرض ہے۔ کہ اس حقیقت کو مان لو۔

نمبر ۲۔ مجھے تمہاری ذات سے اس قسم کی حماقت اور جہالت کی توقع تھی۔ اگر تم نہیں مانتے تو آؤ مل کر تحقیق کریں۔ ہم دونوں میں سے کس کے خاندان نے اپنی بزرگی اور قابلیت کا لوہا منوایا ہے! آؤ!

نمبر ۱۔ ہاں چلو!

نمبر ۲۔ لیکن دور دور تک پھیلی ہوئی اس آبادی میں ہم یہ بات کس طرح انجام دے سکیں گے؟

نمبر ۱۔ اپنی ذہانت کی مدد سے۔ کیا تم اندازہ نہیں کر رہے کہ جس جگہ ہم کھڑے ہیں اسے میرے بچوں نے، میری نسل نے رونق بخشی ہے۔ اگر خدا نے تمہیں آنکھیں دی ہیں تو ان کے چہروں میں میرے نقوش کی جھلک دیکھ سکتے ہو۔

نمبر ۲۔ اچھا چلو یونہی سہی۔ آخر اس میں شیخی بگھارنے کی کیا بات ہے۔ جب ہم بستی کے اس حصے میں جائیں گے جس پر میرے بچے آباد ہیں تو تم اسے اس جگہ سے بڑھ کر حسین پاؤ گے۔

نمبر ۱۔ ہر احمق اپنے بارے میں ایسی ہی خوش فہمی کا شکار ہوتا ہے۔ بہرحال آؤ۔ اب ہمیں مزید وقت برباد نہیں کرنا چاہئے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنا کام اس جگہ سے شروع کریں۔ میرے خیال میں تو سب سے پہلے اس مکان میں جا کر حالات کا اندازہ کرنا چاہئے جو سب سے زیادہ خوب صورت اور بلند و بالا نظر آ رہا ہے۔

نمبر ۲۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

[دونوں روحیں خاموشی سے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ اور تھوڑی دیر میں اس مکان کے اندر پہنچ جاتی ہیں جس کا پہلی روح نے حوالہ دیا تھا یہ واقعی ایک حد درجہ خوبصورت مکان ہے۔ اس کے کمرے کچھ اس طرح آراستہ ہیں۔ کہ دونوں روحیں کچھ دیر کے لئے حیران و ششدر رہ جاتی ہیں۔ جب وہ اس کا ہوتے ہیں تو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہوتی ہیں جس میں سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی ہے۔ باتیں کرنے والوں میں سے ایک نے نہایت بڑھیا فوجی وردی پہن رکھی ہے۔ دوسرا شہری لباس میں ہے لیکن وہ بھی ذی حیثیت معلوم ہوتا ہے۔ کمرے میں داخل ہو کر دونوں روحیں ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں اور ان کی باتوں کی طرف کان لگا دیتی ہیں۔ فوجی کہہ رہا ہے]

فوجی۔ یقیناً اب وقت آگیا ہے کہ ساری دنیا سے آل جنوث کی برتری اور سیادت کا لوہا منوایا جائے، اور میرا خیال ہے یہ کام کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں۔

شہری۔ جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ اگر کمبخت سامنے اپنی ضد چھوڑ دیں۔

فوجی۔ [illegible] پڑ جائے گا۔ ان کا دماغ درست کرنے کے لئے ہمارے پاس معقول فوجی طاقت فراہم ہے۔

شہری۔ لیکن مصیبت تو یہی ہے۔ کہ فوجی طاقت کے لحاظ سے وہ کمبخت بھی کمزور نہیں اور اسی بنا پر ایسی اکڑ دکھا رہے ہیں۔

فوجی۔ (سوچتے ہوئے) ہوں۔ اچھا تو یہ بات ہے (خوش ہو کر) لیکن میں اس کے باوجود [illegible] طاقت میں برتری بہرحال

یہ ہمیں کو حاصل رہے گی۔ ذرا ٹھہرو میں اس وقت اس کا بندوبست کرتا ہوں۔

شہری۔ جی ۔۔۔؟

فوجی۔ تم یوں کرو محکمہ سراغرسانی کے افسر اعلیٰ کو بھیج دو اور باہر ٹھہر کر میرے فیصلے کا انتظار کرو۔

[شہری افسر باہر چلا جاتا ہے۔ اور چند ساعتیں گزرنے کے بعد ایک اور شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ آنے والے کے چہرے سے ذہانت اور بہادری ظاہر ہو رہی ہے۔ روحیں اس کی طرف دیکھتی ہیں اور باتیں سننے کے لئے اپنی پوری توجہ اس طرف مرکوز کر دیتی ہیں۔ فوجی افسر آنے والے کا پرجوش استقبال کرتا ہے اور رازداری کے انداز میں کہتا ہے]

فوجی۔ یہ بات تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ انسانوں کی اس منحوس نسل آلِ سمارہ کو ہم اپنی فوجی قوت کے بل پر بھی زیر کر سکتے ہیں لیکن اس کوشش میں خود ہمارا بھی کچھ نہ کچھ نقصان ہوگا۔ اسی لئے میں دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم اپنے آدمیوں کے ذریعے آلِ سمارہ کے خاص خاص آدمیوں کو خود ان کے گھروں میں قتل کرا دو۔ اگر یہ کام بطریقِ احسن انجام پا گیا تو یہ پوری نسل قیادت سے محروم ہو جائے گی اور پھر اسے لامحالہ ہمارے قدموں میں سر جھکانا پڑے گا۔

نووارد۔ آپ بالکل اطمینان رکھئے۔ ہمارے لئے یہ کچھ بھی مشکل بات نہیں، اگرچہ ان کے اور ہمارے مابین کافی عرصے سے جنگ کی سی کیفیت طاری ہے لیکن اس کے باوجود میرا ہاتھ ان سب کے حلقوم تک پہنچتا ہے۔ کل کا سورج نکلنے سے پہلے آپ یہ خبر سنیں گے کہ اس قوم کے تمام قابلِ ذکر رہنما اور عہدے دار دائمی نیند کی آغوش میں پہنچ چکے

فوجی۔ شاباش! مجھے یہی امید تھی۔ کہ تم ایسا ہی جواب دو گے۔ اچھا اب تم جا سکتے ہو۔ اب مجھے وہ نقشہ مکمل کرنا ہے جس طریقے سے انکی آبادیوں اور مراکز پر قبضہ کیا جائے گا۔

[نووارد سلام کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔ فوجی افسر اپنی میز پر جھک کر کچھ لکھنے لگتا ہے اور دونوں روحیں حیران ہو کر ایک دوسری کی طرف دیکھنے لگتی ہیں۔]

نمبر ۲۔ کیوں دیکھ لی اپنے بیٹوں کی وہ مہارت اور بہادری جس پر تمہیں ناز تھا۔ کیا شریف لوگ اپنے دشمنوں کو یونہی نقصان پہنچایا کرتے ہیں۔

نمبر ۱۔ (شرمندہ سا ہو کر) ہاں یہ تو واقعی عجیب بات ہے، مجھے تو یہ سوچ کر ہی شرم آ رہی ہے کہ میری نسل سے ہو کر یہ لوگ کس انداز فکر کو اپنا رہے ہیں۔ میں تمہارے سامنے کھلے لفظوں میں اعتراف کرتا ہوں۔ کہ اب یہ لوگ بہادری اور شرافت کے بلند معیار سے گر چکے ہیں۔ انہوں نے وہ جوہر برباد کر دیا ہے جس پر میں آج تک فخر کر رہا تھا۔ افسوس آہ۔ اب میں یہ دعویٰ کبھی نہ کروں گا۔

[دوسری روح کچھ کہنا چاہتی ہے کہ فوجی افسر کے قریب والے دریچے کا پردہ ہلتا ہے۔ اور ایک پھرتیلا سا نوجوان ہاتھ میں پستول لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ افسر گھبرا کر اس کی طرف دیکھتا ہے تو وہ پستول کی نالی اس کے سینے کی طرف سیدھی کر دیتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے]

نوجوان۔ ہمیں تم لوگوں کی تمام سرگرمیوں کا علم ہے اور انہی کی بنا پر ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی شرارت کا آغاز ہونے سے پہلے تم سب کو موت کی نیند سلا دیا جائے، تو مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس سلسلے میں تمہیں جو سب سے اچھی خبر سنائی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس طویل سفر

(باقی ص ۴۸)

صبح کا بھولا

(سی، ای، ایم جوڈ کی معرکۃ الآرا کتاب "ایمان کی بازیافت" کا ایک جائزہ)

نعیم صدیقی

مسئلۂ شر (Evil)

زندگی میں شر (بمعنی معصیت نہیں بلکہ موجبات کرب و اضطراب) کے مظاہر کو دیکھ دیکھ کر انسان ہمیشہ گہرے تفکر میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ شر کا وجود کیوں ہے؟ اس کا سرچشمہ کہاں واقع ہے، اس کا محرک کون ہے؟ اس کی ذمہ داری کس پر ڈالی جانی چاہئے؟ یہ سوالات اسے ہمیشہ پریشان کرتے رہے ہیں اور طرح طرح کے اوہام اور قیاسات اور نظریات کی وادیوں میں وہ آوارہ گردیاں کرتا رہا ہے۔ کتاب فلسفہ میں بجائے خود خیر و شر کا ایک علیحدہ باب مدون ہو گیا لیکن مسئلہ اب بھی وہیں ہے جہاں تھا۔

جوڈ کے نزدیک بھی اس مسئلہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے جیسا کہ وہ اپنی کتاب کی تمہید میں بیان کر چکا ہے کہ اس مسئلے کی وجہ سے وہ بار بار الجھنوں میں پڑتا ہے۔ وہ اسی مسئلے کا کھوج لگاتے لگاتے فلسفے کے صحرائے جانکاہ کو پار کر کے مذہب کے شہر میں آ وارد ہوا۔ چنانچہ اس نے ایک مستقل باب اس موضوع پر اسی لئے لکھا ہے کہ اس کے ذہنی سفر کی داستان اس کے بغیر پوری طرح سامنے نہیں آ سکتی۔

جوڈ خود بیان کرتا ہے کہ اس کی الجھن کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔ وہ جب بچپن میں سنڈے اسکول جاتا تھا تو وہاں روز یہ سنتا تھا کہ انسان گناہ میں پیدا ہوا اور اس کا دل سرتا سر دلِ خانہ خراب واقع ہوا ہے۔ مجھے کتابِ دعا کی روشنی میں بتایا جاتا تھا کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہئے وہ میں نے نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں میری روح صحت مند نہیں ہے اور میں ایک بدنصیب گنہگار ہوں۔ گرجا کی عبادت کے ذریعے مجھے ترغیب دلائی جاتی کہ میں خیال، قول اور عمل کی صورت میں ہونے والے گناہوں کا اعتراف کروں اور ان کا ازالہ کروں اور اس کے لئے خدا سے رحم اور مدد کی درخواست کروں۔ اس دور کے اہم تاثرات یہ ہیں جو اب تک باقی ہیں:-

— اپنی مدد کرنے کے لئے میں اپنے اندر قوت نہیں رکھتا۔

— خدا کی مدد کے بغیر انسان گناہ کی پستیوں میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جاتا ہے۔

— مجھے خدا سے مدد مانگنی چاہئے۔

لیکن وہ ذہنی آب و ہوا جس میں جوڈ نے جنم لیا وہ کتابِ دعا کے خلاف ایک دوسرا ہی مزاج رکھتی تھی۔ انیسویں صدی کا ابتدائی دور ترقیات کا دور تھا اور سنہ ۱۹۱۴ء تک اس کا ایک خاص رنگ جما رہا۔ اس دورِ ترقی کے مزاج کو سمجھانے کے لئے اس کے چند اہم پہلوؤں کو جوڈ وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔

"میں ہی میں"

تخلیقی ارتقا کا فلسفہ جس کے داعی برنارڈ شا اور برگساں تھے اور الگزینڈر جیسے اکابر بھی، یہ تصور دے گیا کہ آدمی اپنی قسمت کا آپ ہی مختار ہے۔ دنیا اس کی ہے، مستقبل کا دارومدار اس کے ارادے پر ہے اور اس کی عظمت اس کے اپنے ہاتھ ہے۔ یہ تصور دراصل نتیجہ تھا کسی فوق الفطری ضابطہ و نظام کے انکار کا۔ اگر ہم مذہبی تعلیمات کے مطابق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ طبعی قوانین کے علاوہ کوئی اخلاقی قانون بھی کائنات اور زندگی اور تمدن میں دخل رکھتا ہے اور یہ اخلاقی قانون بھی علت و معلول کے سسٹم کی صورت میں نتائج پیدا کرتا ہے تو پھر انسانی امنگوں اور ترقیوں اور کامرانیوں کی کوئی نہ کوئی حد ذہن میں اُبھر آتی ہے۔ فلسفہ ارتقا نے کسی فوق الفطری طاقت یا قانون کے تصور پر پوری طرح جھاڑو پھیر دی اور یہ تاثر دیا کہ آدمی سے بالاتر کوئی طاقت موجود نہیں ہے جو اس کا راستہ روکے، اس کی کوتاہیوں کی سزا دے، اس کی امنگوں کی تحدید کرے یا بالفاظ دیگر اس کی ساخت کو زبردستی توڑے موڑے۔ بس جو کچھ ہے وہی وہ ہے۔

فلسفہ ارتقا نے یہ سبق بھی دیا کہ وہ روحانی طاقت — اگر اسے "روحانی" کہنا جائز ہو تو — جس کا ظہور انسان میں ہو رہا تھا ایک متحرک طاقت ہے۔ برنارڈ شا اس کو "قوتِ حیات" (LIFE FORCE.) کا نام دیتا ہے اور یہ اس کی نگاہوں میں مادہ پر اثر انداز ہونے کے لئے تخلیقی صلاحیتیں رکھتی ہے۔ اس کے اپنے لفظوں میں "وہ ایک متعین رُخ رکھنے والی متحرک طاقت ہے جو مادہ کی تخلیق و تشکیل کرنے کے لئے اپنے آپ کو ارادہ کے پیرائے میں لاتی ہے۔" برگساں اسی خیال کو "EBAN VILAT" کے عنوان سے پیش کرتا ہے جو ارتقاء کی گاڑی کو آگے دھکیلتی جا رہی ہے۔

ان فلسفیانہ تصورات کا مجموعی ماحصل یہ ہے کہ:

— آدمی کے علاوہ یہاں کوئی اور ایسی بالاتر طاقت نہیں ہے کہ جس کا وہ تابع اور جس کے زیرِ انضباط ہو۔ جس کے سامنے وہ اپنے آپ کو ذمہ دار و جوابدہ محسوس کرے یا جس کی محبت و عبادت کے چکر میں پڑے۔

— آدمی کے اندر کوئی ایسی قوت کارفرما نہیں ہے جو اس کے اپنے بس سے باہر ہو۔ دوسرے لفظوں میں جو کچھ بھی اس کا ہے وہ عملِ ارتقاء کا حاصل ہے۔ کائنات انسان کے لئے ہے اور ابھی زیرِ تشکیل ہے اور اسی طرح انسان خود بھی زیرِ تشکیل ہے۔ آدمی میں اگر کوتاہیاں، کمزوریاں اور خرابیاں ہیں تو اسی عملِ ارتقاء کے ذریعے آگے چل کر وہ محو ہو جائیں گی جس نے انسان کی تشکیل کی ہے۔ انسان اس عملِ ارتقاء کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر اسے جس رُخ چاہے موڑ سکتا ہے اور اس طرح اپنی فلاح و بہبود کا کمال اپنے ارادے کے زور سے حاصل کر سکتا ہے۔

جوڈ اس سلسلے میں ہربرٹ اسپنسر کا یہ قول حوالے میں لاتا ہے کہ:

"معیاری انسان کا مرتبہ کمال کے ساتھ ظہور آنا ہی قطعی ہے جتنا کہ کوئی بھی عقلی نتیجہ جس پر انسان گہرا اعتقاد رکھتے ہیں — مثلاً یہ کہ سب آدمی مرتے ہیں۔ کیونکہ ترقی اتفاقی امر نہیں ہے بلکہ ایک لازمی ضرورت ہے۔ ہم جسے شر اور معصیت کا نام دیتے ہیں اسے لازماً مٹ جانا چاہئے۔ یہ قطعی ہے کہ انسان کو بہر حال مرتبہ کمال پر پہنچ کے رہنا ہے۔"

سائنس کی فتوحات

یہ نقطہ نظر درحقیقت سائنس کی فتوحات اور کامرانیوں کے نشہ میں پیدا ہوا۔ تاریخ میں انسان جن بلاؤں کے رحم و کرم پر پڑا رہا تھا — آگ، سیلاب، زلزلے، پلیگ، قحط، فاقہ — ان پر انیسویں صدی کے اوائل میں

انسان قابو پانے کے قابل ہو گیا۔ انسانی فلاح و بہبود کے یہ دشمن سائنس کے اسلحہ سے شکست کھانے لگے۔ نظامِ فطرت کے مقابلے میں انسان نئی قوتوں سے مسلح ہو کر اٹھا۔ کوئلہ، لوہا، فولاد، ایٹم اور بجلی کی طاقتیں مسخر ہونے لگیں۔ اور تو چھوڑیئے محض ایک کپاس کے عام اور ارزاں ہو جانے سے آدمی کو ایسے چرمی لباسوں سے نجات مل گئی ہے جو دُھلنے کے قابل نہیں ہوتے تھے اور اس وجہ سے گندے ہو ہو کر جُوؤں کے اوپر ہی پھٹ جاتے تھے۔ شہروں کی گلیاں سائنس نے پکی کر دیں، ان میں لیمپ جگمگانے لگے۔ اس طرح گندگی اور تاریکی کے شر کا توڑ ہونے لگا۔

انسانی عمر کے اوسط طول میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح وقتِ کارکردگی ۱۲ گھنٹے (۱۹۱۴ء) سے گھٹ کر ۶ گھنٹے یومیہ (۱۹۳۲ء) تک آ گیا۔ چیچک اور طاعون جیسی مہلک وباؤں کو پوری طرح کھدیڑ دیا گیا۔ بیہوش کرنے والی دواؤں کی ایجاد غالباً اس لحاظ سے اہم ترین تھی کہ اس کی وجہ سے آپریشنوں اور زچگیوں کے تڑپا دینے والے دردوں سے اولادِ آدم کو نجات مل گئی۔ یہ سب سائنس اور مادی علم کے کرشمے تھے۔

سائنس کے اس دورِ فتوحات نے کائنات اور انسانی زندگی کے متعلق بالکل ایک نیا نقطۂ نظر ابھار دیا۔ سابق تصوّر یہ تھا کہ حقیقت ایک متعیّن، ایک غیر متغیر امرِ واقعہ ہے اور مسئلہ یہ تھا کہ انسانی زندگی کو کیسے اس کے مطابق بنایا جائے۔ اب ترتیب اُلٹ گئی، یعنی حقیقت کو انسانی مرضی اور ضرورت کے مطابق کیسے ڈھالا جائے۔ بجائے اس کے ایک اٹل ضابطہ انسانی زندگی پر تسلط پائے اب پرابلم یہ پیدا ہو گیا کہ انسان اپنی پسند کے مطابق کیسے اخلاقی ضابطے کو مرتب کرے۔ پہلے فلسفہ اور سائنس دونوں کا مدعا یہ تھا کہ دنیا کی حقیقت کو سمجھا جائے، اب سائنس کا منتہا یہ ٹھہرا کہ دنیا پر اور اس کی حقیقتوں پر قدرت کیسے حاصل کی جائے۔ قرار پایا کہ آدمی اپنے فطری ماحول اور اپنی سلطنتِ زندگی کا کارمختار ہے۔ یہی زاویۂ نظر اس دور کے فلسفے میں منعکس ہوتا چلا گیا۔

آدمی کے اندر ترقی کے ان فاتحانہ اقدامات نے ایک نشۂ استکبار پیدا کر دیا کہ شر کے کتنے ہی مظاہر ختم ہو کے رہ گئے جن کے ہاتھوں زندگی اجیرن تھی۔ مثلاً جادوگری، ہیضہ، خونی دنگل، غلامی اور تشدّد و عقوبت جیسے مفاسد سے زندگی کو نجات مل گئی۔ اس سے ایک عمومی امید پیدا ہو گئی کہ سائنس اور طبعی و مادی علوم کے ہتھیاروں سے شر کے بقیہ تمام مظاہر و محرکات کا توڑ بھی آہستہ آہستہ ہو کے رہے گا۔

دو نظریات کا ظہور

اس فضا میں انسان کے مسلسل ترقی کی راہ پہ بڑھنے اور سائنس کی مدد سے شر سے نجات پا کر ایک صالح زندگی تک جا پہنچنے کے حق میں دو نظریے نمودار ہوئے۔

ایک تھا مارکسی نظریہ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں شر او رمعصیت جو کچھ بھی ہے وہ اس کے طبعی اور تمدنی ماحول کے مفاسد کی وجہ سے ہے اور سائنٹیفک طریقے سے ماحول کو بدلا جا سکتا ہے اور اسے شر سے خالی کیا جا سکتا ہے۔ تمدنی ماحول کی اصلی ساخت چونکہ معاشی سسٹم پر مبنی ہے اس لئے جب اسے درست کر دیا جائے گا تو سارا تمدنی ماحول درست ہو جائے گا اور جب انسان کی معاشی ضروریات ٹھیک سے پوری ہونے لگیں تو وہ جرم و معصیت سے پاک ہو جائے گا کیونکہ محرومی ہی جرم و معصیت کا اصل باعث ہے۔ درحقیقت شر کا دارو وہی ہے جو دارو ئے افلاس ہے ـــــ یعنی دولت۔ روپیہ!

چنانچہ برنارڈ شا کہتا ہے:

"قوم کی اصل ضرورت بہتر اخلاق، ارزاں روٹی، انسدادِ مسکرات، آزادی، کلچر، عصمت باختہ بہنوں اور بدکردار

بھائیوں کی بھالی نہیں ہے، نہ نظریۂ تثلیث کی خوبی اور اُسکی رفاقت و محبت ہے، بلکہ وہ محض وافر روپے کی محتاج ہے۔"

دوسرا نظریہ علم النفس کے دائرے میں فرائڈ، ایڈلر اور ینگ کے ہاتھوں استوار ہوا۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ شر زندگی کے غلط ترتیب احوال میں نصب ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ آدمی کی اساسی جبلتیں فی نفسہٖ نہ اچھی ہیں نہ بُری۔ ناموزوں ماحول یا بچپن کی غلط ترتیب کے سبب وہ بُری شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ مثلاً بچے کی کسی جبلت کو جب والدین جبر سے دباتے ہیں تو اس کے غیر شعوری ذہن میں اس جبر کے خلاف ایک نفرت یا ذوقِ جرم کا لاوہ بھرنے لگتا ہے اور پھر یہ لاوہ اپنے بہاؤ کے لئے کوئی مجرمانہ یا باغیانہ راستہ پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ احساسِ کہتری (INFERIORITY COMPLEX) کا روگ لگ جاتا ہے اور پھر ساری عمر اسی احساس کا ردِّ عمل دکھانے میں گذر جاتی ہے۔ نفس اور ماحول کی ناسازگاری بے شمار مختلف فاسد اشکال میں ظہور کرتی ہے اور یہ سب شر کے مظاہر ہوتے ہیں۔

شر کے اس تصور کے مطابق راہِ نجات یہ ہے کہ ماحول کو بدل دو، بچہ کو بہتر فضا مہیا کرو، اسے محبت اور آزادی سے بہرہ ور کرو، اسے مناسب حد تک اہمیت کا احساس دلاؤ، تشدد اور دباؤ سے اثر انداز ہونے سے پرہیز کرو، احساسِ کہتری، احساسِ جرم اور انتقام کے جذبات کی پیدائش کا موجب نہ ہو۔ اس اہتمام کے نتیجے میں بچہ ذہنی طور پر تندرست، خوش و خرم، با اثر، متوازن اور زندہ رہ کر پروان چڑھے گا۔

یہ نظریہ بچوں کی تربیت تک ہی محدود نہیں، بلکہ بڑے بڑے تمدنی مسائل کو اپنے سامنے رکھتا ہے اور اپنے ڈھب پر ان کا حل پیش کرتا ہے مثلاً جوڈ بتاتا ہے کہ ایک امریکی ڈاکٹر (DR: BROCK CHISHOLM) مسئلہ جنگ پر کاوش کر رہا ہے۔ اس کی رائے میں جنگ کا اصل سرچشمہ انسانی قلب میں واقع ہے۔ انسان جب غلط انداز سے کوئی خواہش کرتا ہے، غلط ڈھنگ سے ارادے باندھتا ہے تو بد راہ رجحانات پیدا کر لیتا ہے اور انہی کا مظاہرہ جنگ ہے۔ پس اصل ضرورت ان بد راہ رجحانات کے سدِّباب کی ہے۔ گویا ڈاکٹر مذکور کی رائے میں جنگ کا مسئلہ ایک سائنٹیفک یا ایک نفسیاتی علاج چاہنے والا مسئلہ ہے۔ اس بحث میں متعدد اختلافی نکات پر اظہارِ رائے کیا گیا ہے لیکن ایک چیز پر بالعموم اتفاق پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی میں جو کوئی پہلو بھی تکلیف دہ ہے وہ سائنس کا میدانِ کار ہے۔ ہنری ؤالیس (HENRY WALLACE) زندگی کے تمام مفاسد کا راز ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"انسانیت کی موجودہ نسلوں کی دردناک صورتِ حالات کا راز کہتری، گناہ اور خوف کے احساسات میں مضمر ہے۔"

لیکن جوڈ جس نے شر کے متعلق یہ نظریہ نوعمری میں بغیر سوچے سمجھے ذہن میں جذب کر لیا تھا اب بنیادی طور پر وہ اس کا انکار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

جوڈ کا عیسائی نقطۂ نظر

جوڈ ان دونوں چھائے ہوئے ہم آہنگ نظریات پر اولین نگاہِ تنقید ڈالتے ہوئے پوچھتا ہے کہ کیا ہمارے دور کے وہ تمام رجالِ عظیم جو بے شکوں طاقتوں اور فاتحانہ عزائم سے مسلح ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے قوت و اقتدار کی راہوں پر بڑھے ہیں کیا ان کے کارناموں کی توجیہہ احساسِ کہتری سے کی جا سکتی ہے جسے ان کے اندر مکتب کے زمانۂ تعلیم نے

پیدا کر دیا تھا؟ کیا روسی انقلاب، روس پر جرمنی کے حملے اور اس کی ناکام بازگشت اور اس سلسلے میں ہونے والے مظالم اور قیدی کیمپوں کے دردناک واقعات کی علت یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ انسان ان صورتوں میں اپنے کچھ داخلی تقاضوں کی تسکین کرتا ہے؟ کیا یہ بالکل واضح نہیں ہے کہ ایسے تمام دردناک حوادث جن سے تاریخ بھری پڑی ہے وہ انسان کے خلاف انسان کے جذبۂ استکبار اور ذوقِ اقتدار پر مبنی ہیں؟

جوڈ ان حوادث کو ایک ذہنی تبدیلی سے گزرنے کے بعد اب جس بدلے ہوئے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے وہ اس کی نگاہ میں وہی پرانا نقطۂ نظر ہے جو سنڈے اسکول میں اس کے سامنے رکھا گیا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ میں پوری عمر احساسِ گناہ سے بالاتر رہا ہوں۔ میں نے خوب بڑھ چڑھ کر اخلاقی تقاضوں کو پامال کیا ہے لیکن میں نے اپنے ضمیر میں احساسِ جُرم کا کبھی کوئی اثر محسوس نہیں کیا۔ میں خواہش اور فرض کی کشمکش کے بارے میں بالکل انجان رہا ہوں۔ میں نے کبھی اپنے لئے یہ محسوس نہیں کیا کہ مجھ سے کسی "چاہیئے" کا بھی کوئی تقاضا ہو سکتا ہے اندریں حالات یہ دونوں نظریات بتائیں کہ میرے کردار میں شر کہاں سے آیا؟

جوڈ بیان کرتا ہے کہ مجھے کتابِ دعا کا مفہوم اس دن سمجھ میں آیا جس دن میں نے یہ محسوس کیا کہ نیکی کے کم سے کم معیار پر بھی اکساہٹوں کا مقابلہ کر کے ٹکے رہنا کتنا مشکل ہے۔ اب وہ یہ نظریہ سامنے لاتا ہے کہ زمین پر خالص نیکی اور کامل خیر کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہر حال میں خیر و شر اور نیکی و بدی باہم آمیختہ پائے جاتے ہیں۔ یہاں پھول کے ساتھ کانٹا ناگزیر ہے۔ قرآن کی بولی میں کہنا چاہیئے کہ "ان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا"۔ زندگی کی نوعیت ایک امتحان یا ایک چیلنج کی سی ہے۔ "عرصۂ عالم میں تیرا امتحاں ہے زندگی"۔ یہ جدوجہد اور سرگرمی کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ قربانی اور خود فراموشی کا درس دیتی ہے، یہ ایک رضاکارانہ خودسپردگی کی محرک ہے۔ یہاں بغیر جدوجہد کے طمانیت کا مرحلہ ہی نہیں سکتا۔ دن بھر کوہ پیمائیوں کے بغیر یہاں انگیٹھی کے پاس آرام کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے اور کیک کھانے میں کوئی لذت نہیں آ سکتی یہاں بغیر ضبطِ نفس اور ایثار میں پڑے خوشی کا جو جام چڑھایا جائے گا وہ جتنا جلد نشہ دے گا اتنا ہی جلد خمار اور خمیازہ تک بھی پہنچا دے گا۔ جسے خمار اور خمیازہ سے بچنا ہو اسے چاہیئے کہ وہ پیاس بھر جام چڑھانے سے پہلے ہی ضبط و ایثار سے کام لے۔

جوڈ اپنا پورا مطالعہ چند لفظوں میں سمیٹ کر کہتا ہے کہ یہاں عمل و جستجو کی کوئی صورت ایسی نہیں جس میں کوتاہیاں نہ رہ جائیں، کوئی نظامِ زندگی ایسا نہیں جس میں اپنی کچھ کمزوریاں نہ ہوں۔ کوئی کردار ایسا نہیں جس کے اچھے پہلوؤں کے ساتھ کوئی نہ کوئی مفسدہ نہ لگا ہوا ہو خیر کے ساتھ شر کے یہ متقابل پہلو اتفاقی طور پر نہیں پیدا ہو گئے بلکہ اچھائیوں کی تلاش اور ان سے شادکامی حاصل کرنے کے راستے کے فطری سنگِ میل ہیں۔ مثلاً بخشاوری اور دولتمندی بڑی چیز ہے لیکن اس کے ساتھ بھی تاریک پہلو چھپا ہوا ہے۔ دنیوی نعمتوں کا وفور ان سے استفادہ کرنے میں ہمارے پیمانۂ لذت و سرور کو گھٹا دیتا ہے۔ نیز دولت و املاک کی کثرت کی صورت میں بہترین مسرت بخش اسباب اور سرگرمیوں کا انتخاب ایک اُلجھن بن جاتا ہے۔ ان وجوہ سے وہ لذت و تسکین جو مطلوب ہوتی ہے عنقا ہو جاتی ہے۔ اس بحث میں جوڈ فلاطونی نظریۂ مسرت سے اپنے حق میں شہادت لیتا ہے۔

ایک سیدھا سا سوال ہے۔ آپ سوچئے کہ پورے انسانی لٹریچر کی دنیا میں کیا کوئی ایک دن بھی ایسا آیا ہو جو حقیقی معنوں میں یومِ مسرت ہو۔ جوڈ عمر کے مطالعہ پر نگاہِ بازگشت ڈال کر بتاتا ہے کہ مجھے صرف ایک ایسا موقع نظر آتا ہے — ٹالسٹائی کے ناول "جنگ و امن" میں

جب نکولسن اور نطاشہ راسٹوف چھوٹے چچا اور آنیلا جین کے ساتھ شکار کو نکلتے ہیں اور جوانی اور صحت و تنومندی کے عالم میں ایک جذبۂ پر سوز مسابقت میں دن گذارتے ہیں، رات کے کھانے پر ناچ گانا ہوتا ہے۔ پھر وہ برف پوش راستوں پر تاروں کی چھاؤں میں واپس لوٹتے ہیں اور بھائی بہن اپنی محبت میں قریب، قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس بزم مسرت کے دامن پر ٹوٹی ہوئی امیدوں اور تلخ ناکامیوں کے دھبے موجود ہیں۔ ذرا کارڈوا کے ایک عرب خلیفہ کا بیان تو پڑھئے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ "اپنے پچاس سالہ دور حکومت میں میں ہمیشہ فتح مند رہا، ہمیشہ خوش نصیبی نے میرا ساتھ دیا، اپنی رعایا کا محبوب رہا، ان کے دشمنوں کے لئے خطرہ بنا رہا اور چاروں طرف سے ادب و احترام میں گھرا رہا۔ وہ سب کچھ جس کی بنی آدم تمنا کر سکتے ہیں مجھ پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس کی بارش ہوتی رہی ہے ——— عظمت، حکمت، اعزازات، خزانے، اموال، تفریحات اور محبت ا——— میں ان سب سے خوب لذت اندوز ہوا۔" لیکن یہ خلیفہ موت کی سرحد پر کھڑے ہو کر جب جائزہ لیتا ہے تو بتاتا ہے کہ "میں نے وہ دن گنے ہیں جن میں میں صحیح معنوں میں مسرت اندوز رہا، مجھے عمر بھر میں ایسے دن صرف گیارہ مل سکے۔" پھر وہ وصیت کرتا ہے کہ فانی مخلوق بہ حیاتِ ارضی کی حقیقی قدر و قیمت کو میرے اس تجربے سے سمجھ۔

بہت سارے دوسرے حوالے بھی جوڑ سامنے لاتا ہے مثلاً گبن کا مقولہ کہ "تاریخ انسانیت کے جرائم، اس کی حماقتوں اور بدنصیبیوں کا ریکارڈ ہے۔" یا جان اسٹوارٹ مل کے الفاظ کہ "بہ حیثیتِ مجموعی نسلِ انسانی غلامی اور اسیری کی زندگی بسر کر رہی ہے۔" یا جسٹنگ کا نقطۂ نظر کہ "تاریخ ناقابلِ بیان آلام کا ایک بھیانک دفتر ہے۔" ان مثالوں کو سامنے رکھ کر وہ پوچھتا ہے کہ کیا مطلب رہا ان تصوراتِ ترقی کا جو جوانی میں میرے ذہن میں رچے بسے؟ کیا مطلب ہوا انسانیت کے تکمیل کی طرف بڑھنے کا؟

مزید اشکال | کیا یہ توجیہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ تمام مفاسد جنہوں نے انسانی زندگی کو پریشان کیا ہے وہ سیاسی و اقتصادی نوعیت رکھتے ہیں۔ کیا کسی باپ کا اپنے معصوم بچے کو تازیانے لگانا، کسی ظالم مالک کا اپنے غلام کو ہمیشہ زنجیروں میں جکڑے رکھنا، کسی برافروختہ نوجوان کا اپنی محبوبہ پر بدگمانی کر کے اس کے چہرے کو تیزاب سے جھلس دینا، ان ساری حرکات کی بنا ایک غلط سسٹم پر رکھی جا سکتی ہے جس میں ذرائع و وسائل کی ملکیت اور اجارہ داری ایک طبقے کی محنت سے دوسرے طبقے کو انتفاع کرنے کا موقع دیتی ہو۔ گناہ اور بدی اور جرائم کو اگر افلاس کا نتیجہ قرار دیا جائے تو ان برائیوں کی توجیہ کیا ہوگی۔ جو امارت و دولت مندی سے پیدا ہوتی ہیں؟ ——— مثلاً استکبار، خود بینی، تعیش، سفلہ پن اور فسق و فجور کے مظاہرے؛ پھر قابلِ غور یہ بھی ہے کہ انسانی داستانِ درد و کرب کا بہت بڑا حصہ تو نتیجہ ہے۔ جوعِ قوت و اقتدار کا؛ معاشی حالات کی تبدیلی سے یہ سارے محرکاتِ شر کیسے محو ہو جائیں گے۔

نفسیاتی نظریے کا بودا پن :- بتایا جاتا ہے کہ علم النفس کی روشنی سے انسانی زندگی کے تاریک ماحول کو منور کیا جا سکتا ہے۔ جوڈ دریافت کرتا ہے کہ اگر علم النفس کوئی ایسی ہی معجزانہ قوت ہے۔ تو ذرا اس کے ماہرین ارشاد فرمائیں۔ کہ وہ جو دوسروں کی نفسیاتی الجھنیں حل کرتے پھرتے ہیں۔ جو دوسروں کی ذہنی صحت کی بحالی میں مصروف ہیں۔ ان کا اپنا حال کیا ہے؟ کیا وہ خود نفسیاتی الجھنوں سے پاک ہیں؟ کیا ان کے ذہن احساسِ جرم اور احساسِ کمتری سے بالاتر ہیں؟ کیا وہ اپنے متشددانہ رجحانات کو صالح تر راستوں پر ڈالنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟ کیا وہ اپنے عام برادرانِ انسانیت سے جو نفسیاتی علم سے خالی ہیں۔ ذہن یا کردار کے لحاظ سے برتر ہیں؟

جب علم النفس کی مکمل روشنی ساتھ رکھنے والے بزرگ خود اپنی ذات کی محدود سی دنیا کو منور نہیں کر سکتے ۔ تو وہ کسی دوسرے کا کیا بنائیں گے ۔ کیا سنواریں گے ۔ ہم جب کسی نیک آدمی سے ملتے ہیں تو ہم سب محسوس کرتے ہیں ۔ کہ یہ نیک آدمی ہے ۔ کیا نفسیات والوں سے مل کر ایسا تاثر ہوتا ہے ؟

جوڈ اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہتا ہے ۔ کہ میں نفسیاتی طریقِ اصلاح کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کرتا ۔ لیکن انکار اس سے کرتا ہوں کہ عالمِ انسانی کے اخلاقی فساد کی کوئی اساسی توجیہ ان علوم سے مل سکتی ہے ۔

اور سائنس ـــ بہ حیثیت مجموعی ۔ جوڈ پوری سائنس کو علم النفس کی سی پوزیشن پر رکھتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ عجیب مغالطہ اس دور کے لوگوں کو چمٹ گیا ہے ۔ کہ سائنس مادہ ہی کو نہیں ، زندگی کو بھی کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ وہ زندگی کو بنا سنوار کر ایسے مرتبے تک لے جا سکتی ہے ۔ کہ وہ شر کی دست رس سے بالاتر ہو جائے ۔

لیکن باوجود اس کے کہ سائنس نے زندگی کو کچھ بہت مفید خدمات انجام دی ہیں ۔ زندگی کو بہ حیثیت مجموعی لیا جائے ۔ تو انسان کا نصیبہ جتنا تاریک پہلے تھا اتنا ہی آج بھی ہے مشینوں کی اس بھرمار کے باوجود ہم اہلِ مغرب کی اکثریت ماضی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ مشقت کرتی ہے حد یہ کہ آج ہم اپنی عورتوں کو محنت کشی کے میدان میں جھونکنے کے بعد اس قابل ہوئے ہیں ۔ کہ کرنے کے کام کر سکیں ۔ دنیا کے اکثر حصوں میں سائنس انسانی دل و دماغ کو قید میں ڈالنے اور قید خانے کی کنجیاں وقت کی حکومت یا حکمران پارٹی یا کسی ڈکٹیٹر کے سپرد کرنے کی خدمات میں مصروف ہے ۔ مختصر یہ کہ سائنس نے ہماری تباہ کاری کی طاقت کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے ۔ اور آئندہ جنگ کے ہاتھوں پورے تمدن کا صفایا ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔

سائنس بہرحال نصب العین نہیں ۔ ذریعہ ہے ۔ ذریعہ بجائے خود نہ برا ہوتا ہے ۔ نہ اچھا ۔ اچھے مقصد میں لگاؤ تو وہ اچھا ہو جاتا ہے اور برے مقصد میں استعمال کرو تو وہ برا ہو جاتا ہے ۔ اب اگر انسانی نصب العین اور مقاصد اچھے ہوں ۔ تو سائنس تمام تر خیر ہے ۔ وہ برے ہوں تو سائنس تمام تر شر ہے ۔ سائنس نصب العین اور مقاصد کو بدلنے یا ان کو بہتر بنانے کے لحاظ سے بالکل ناکارہ ہے ۔ سائنس انسانی مداخلتوں اور رجحانات کا رخ نہیں بدل سکتی ۔

اس گفتگو کی وضاحت کے لئے جوڈ ایک مفروضہ سامنے رکھتا ہے ۔ فرض کیجئے کہ سائنس اپنی حدِ کمال تک جا پہنچتی ہے ، یعنی وہ براہِ راست انسانی فطرت کے انضباط پر قادر ہو جاتی ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کون اس انتہائی قوت کو استعمال کرے گا ۔ اور کس کے مفاد کیلئے استعمال کرے گا ؟ مثلاً اگر علم نسلیات (EUGENICS) کے بل پر انضباطِ تناسل کے ذریعے بہترین ساخت کو حاصل کرنا چاہئیں تو قطع نظر اس سے ـــ کہ اس میدان میں نتائج حوصلہ افزا نہیں ہیں ـــ آخر مطلوبہ ساخت کونسی ہو گی ؟ کیا وہ جو حکومتوں کو پسند ہو ۔ کیونکہ وہی تو زندگی کی آخری باگ ڈور تھامے ہوئے ہوتی ہیں ۔ وہ تو ایسی ساخت کی نسل کو پسند کریں گی ۔ جو اطاعت گزار اور فرماں بردار ہو ۔

ضمناً اس مقام پر جوڈ نے تمدن مغرب کی ایک اور اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے ۔ وہ یہ نسل کو بہتر بنانے کے لئے بالائی اور متوسط طبقوں میں برتھ کنٹرول کو رائج کرنے کا تجربہ ہوا ہے ۔ کہ اچھے معیار کے افراد کی تعداد سوسائٹی کی ضرورت سے کم پڑتی ہے ۔ اعلیٰ جسم و ذہن

کے لحاظ سے ناقص افراد کی کثیر تعداد سے سوسائٹی کے کل پرزے فراہم کئے جاتے ہیں۔ دریں حالات ناممکن ہے۔ کہ انسانیت کا ذہن اور اخلاقی معیار کسی مناسب حد پر قائم رکھا جائے۔

جوڈ کی رائے میں بعض بیماریوں کے ازالہ سے غلط نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے، ان کے بجائے دوسری ویسی ہی شدید بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مثال کے طور پر سرطان چھوٹی آنتوں کے ناسور، دماغی شریانوں میں انجماد خون وغیرہ کی روز افزوں کرب انگیزی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ سائنس نے عمروں میں طول پیدا کر دیا ہے لیکن زندگی کا بوجھ زوال پذیر جسموں پر آ پڑا ہے معاشرتی لحاظ سے ایسے بے کار افراد کی بہت بڑی تعداد کی ذمہ داری سوسائٹی کے سر پڑتی ہے جنہیں ماضی کے تمدن بخوشی رخصت کرنے پر تیار رہتے تھے۔

سائنس کی زریں خدمت کی افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک تو سائنس کی ہر ایجاد ایک دو دھاری تلوار ہے دوسرے سائنس نے انسان کی قوت تو بڑھا دی لیکن اس کے ساتھ حکمت و اخلاق کے لحاظ سے مساویانہ ترقی نہ دے سکی۔

"ہے" اور "ہونا چاہیئے"! خارجی شر سے گزر کر جب ہم عالمِ انسانی کے داخلی شر کی طرف آتے ہیں، جو عبارت ہے اخلاقی فساد سے تو جوڈ چاہتا ہے۔ کہ یہاں ہم مسئلہ کو ذرا گہرے غور و خوض سے لیں۔

جب یہ ہمیں تسلیم ہے کہ کچھ چیزیں اور ذہن کی حالتیں ایسی ہیں جو مثبت طور پر موجبِ شر ہیں تو یہ تسلیم کرنا اس بات کی شعوری تحریک بھی پیدا کرتا ہے کہ فلاں چیزیں عمل میں نہ لائی جانی چاہئیں اور ذہن کی فلاں کیفیات کی روک تھام کر لی جانی چاہئے اور یہ "چاہیئے" اور "نہ چاہیئے" کا شعور کانٹ کی تصریحات کے مطابق ہمارے اخلاقی مقامِ "اختیار" سے ہمیں آگاہ کرتا ہے۔ کسی ایسے معاملے میں یہ کہنا کہ "یوں ہونا چاہیئے" جب کہ چار و ناچار صرف وہی کچھ آدمی کرنے پر مجبور ہو، یا یہ کہنا کہ "یوں نہیں کرنا چاہیئے" درآں حالیکہ انسان یوں کرنے پر سرے سے قادر ہی نہ ہو، قطعاً بے معنی ہے۔ گویا انسان کا مقام جبر و شر کے دورا ہے پر انتخاب و اختیار اور ارادہ و فیصلہ کا مقام ہوا۔

وہ کانٹ کے فکری نقشِ قدم پر اور آگے چلتا ہے۔ اور واضح کرتا ہے۔ کہ اخلاقی شعور کے حقائق کو ـــــــ خصوصاً "ہے" اور "چاہیئے" یا "فرض" اور "خواہش" کی کش مکش کو فطری استدلال کے ذریعے جانچا پرکھا اور سمجھا سمجھایا نہیں جا سکتا۔ مثلاً نفسیاتی جبریت کو ہم نظامِ فطرت کے ایک شعبہ کی حیثیت سے لے کر اگر سوچیں تو انسانی ذہن کی کسی بھی حالت کے بارے میں تمام مؤثر عوامل کا جائزہ لے کر ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ "کیا ہے" اور یہ جو کچھ ہے۔ یہ کن اسباب کا جبری تقاضا ہے۔ لیکن ہم نفسیاتی جبریت کی روشنی میں اس "چاہیئے" کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتے۔ جو انسان کی روحِ اخلاقی کا ایک اظہار ہے۔ ہم یہ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ کوئی خواہش کسی خاص عالم میں آدمی کے اندر کن عوامل کے تحت ابھرتی ہے۔ لیکن اس خواہش کے بالمقابل فرض کی جو پکار سنائی دیتی ہے اس کی ہم تعلیل نہیں کر سکتے۔ آدمی نظری قانون کے اندر یہ تو جان سکتا ہے۔ کہ میں کیا ہوں۔ اور میں کیا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے اندر جب یہ حس ابھرتی ہے کہ مجھے کیا ہونا چاہیئے۔ اور مجھے کیا چاہنا چاہیئے۔ تو اس کا مفہوم مجرد نظامِ فطرت اسے معین کر کے نہیں دے سکتا۔

آدمی زندگی میں بہر حال اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ میں بر سرِ غلط ہوں، میں گناہ میں مبتلا ہوں، میں ٹیڑھی راہ پر جا رہا ہوں، میں وہ کچھ نہیں ہوں۔ جو مجھے ہونا چاہیئے۔ وہ کچھ نہیں کر رہا جو مجھے کرنا چاہیئے۔ اور یہ کہ مجھے اپنی کردار کے اجزا کو درست کرنا چاہیئے۔ جن قوتوں کے

زیرِ اثر میں کام کر رہا ہوں ان کے خلاف کشمکش کرنی چاہیئے۔ یہ احساس و شعور آخر مجرد مادّی نظامِ فطرت کے ذریعے کیسے توجیہ پا سکتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگی میں بے شمار مواقع آتے ہیں کہ ہمارے اندر دوسروں کی مدد کرنے کا میلان ابھر آتا ہے۔ اور یہ میلان تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے مفاد اور آرام کی قربانی دے کر دوسروں کو آرام اور فائدہ پہنچائیں تو پھر کیا یہاں آ کر سہولت عمل کے فطری تقاضے سے یہ میلان ٹکرانے نہیں لگتا۔ اس میلان میں نفسِ انسانی یہ اظہار نہیں کرتا کہ وہ کس بات کی خواہش رکھتا ہے بلکہ یہ اظہار کرتا ہے کہ اس کا فرض کیا ہے۔ یہ اپنے ذاتی مفاد کے خلاف کچھ کرنے کا تقاضا اگر ایک حقیقت ہے تو پھر سوچنا چاہیئے کہ فطری سلسلۂ استدلال و تعلیل کی کوئی کڑی گم کر دی گئی ہے۔

فوق الفطری نظامِ حقیقت پس کوئی چارہ کار اس کے سوا نہیں کہ ان حقائق کی توجیہ ہم مادّی نظامِ فطرت سے ماوراء کسی اور نظام میں تلاش کریں۔ ماننا پڑے گا کہ کائنات کے فطری نظام سے اوپر ایک فوق الفطری نظام ہے۔ اس نظام کو مانے بغیر انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو کی کوئی توجیہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ فطری کائنات کی حقیقت کی توجیہ اس کائنات سے باہر ہی تلاش کی جا سکتی ہے اور اسی طرح زندگی کے اخلاقی تقاضوں کو کسی حقیقتِ ماوراء کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

طبعی و فطری علم و حکمت کے ذریعے ہم زندگی کے بارے میں یہ تو جان سکتے ہیں کہ وہ جو جو حرکات کرتی ہے، کیسے کرتی ہے مثلاً ایک چیتا کیسے اپنے شکار کو چیرتا پھاڑتا ہے لیکن یہ کسی طرح نہیں سمجھ سکتے کہ کوئی جاندار کیوں اپنی فطرت کے کسی خواہشاتی تقاضے کے خلاف عمل کرتا ہے! مثلاً ایک آدمی کیوں اپنی ایک واضح اور دباؤ ڈالنے والی خواہش کے خلاف احساسِ فرض کے تحت کش مکش کرتا ہے اور کیوں وہ "چاہیئے" کی اہمیت کو تسلیم کر کے حیوانی فطرت کی ایک کھلی پکار کو مسترد کر دیتا ہے۔ فوق الفطری نظام کی ضرورت کا یہ احساس یہیں مذہب کے دروازے پر لا کھڑا کرتا ہے دنیا کے تمام مذاہب نے اخلاقی تقاضے کو اہمیت دی ہے اور اس کی توضیح حقیقت کے فوق الفطری تصور سے کی ہے۔

جوڈ کا نقطۂ نظر شر کے متعلق عیسائی رنگ میں یہ ہے کہ :

ا۔ آدمی اپنی حیاتِ ارضی میں بہت بڑی اور مسلسل مسرت حاصل نہیں کر سکتا۔

ب۔ اس کی فطرت بعض اجزا کے لحاظ سے مستقلاً شر آمیز ہے

ج۔ لہذا مسئلۂ شر اس زندگی میں کلی طور پر علاج پذیر نہیں ہو سکتا۔

اس نقطۂ کو وہ عیسائیت اور قدیم یونانی تصورِ مذہبی پر استوار کرتا ہے۔ یونانی مذہب کی ایک مرکزی کی تعلیم یہ تھی کہ انسان جب بھی کسی نمایاں رعونت یا کامیابی میں ایک حد سے آگے بڑھتا ہے تو دیوتا بگڑ جاتے ہیں۔ اور اس جسارت کی سزا دیتے ہیں۔ اور عیسائیت کی تعلیم کا خلاصہ جوڈ یوں سامنے لاتا ہے کہ آدمی گناہ میں پیدا ہوا۔ یہ دنیا آنسوؤں اور مصیبتوں کی دنیا ہے، ہم خدا کی مدد کے بغیر کوئی بھلا نہیں کر سکتے۔ عظیم اور مستقل خوشی کا حصول ناممکن ہے، جو کچھ تھوڑا بہت ہمیں ملے اس کے لئے شکر گزار ہونا چاہیئے۔ یہ نتیجہ ہے جرمِ آدم کا؛ یا اس وجہ سے ہے کہ آدمی فطرت میں برائی لے کر آیا ہے اور فطری برائی کی وجہ سے وہ پوری طرح اچھا بن ہی نہیں سکتا۔

واضح ہے کہ اس اساسی عیسائی تخیل میں خود جبر بھی ہے بلکہ جوڈ جیسا ذہین آدمی جب الحاد کی کوچہ گردیوں سے اکتا کر پلٹتا ہے۔ اس تخیل کو جوں کا توں قبول کر دیتا ہے لیکن وہ اپنے فلسفیانہ ذہن کے زور سے اس تخیل میں سے ایک بہتر تصور اخذ کر لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دراصل یہ زندگی تربیت اور تیاری کی زندگی ہے جس میں ہم بہتر بننے کا درس لے سکتے ہیں۔ اور سبق اور تربیت حاصل کرنے کا ذریعہ ارضی زندگی کی مصیبتیں اور آفتیں ہیں۔ ہم نہ یہاں بہت زیادہ مسرت حاصل کر سکتے ہیں۔ نہ بہت زیادہ نیک بن سکتے ہیں۔ جوڈ کی رائے میں یہ تصور زندگی کے حقائق کو زیادہ اچھی طرح اپنے دامن میں سمیٹتا ہے اس کے ذریعے یہ شعور حاصل ہوتا ہے۔ کہ اس زندگی کی کوششوں اور سرگرمیوں کے لئے کچھ جبری سرحدیں مقرر ہیں۔ اور ہمیں ان سرحدوں کے اندر ہی تگ و دو کرنی ہے۔

جوڈ بیان کرتا ہے کہ جب میں نوعمر تھا تو اپنے معاصرانہ انداز پر یہ سوچا کرتا تھا۔ کہ دنیا کو اپنی خواہشات کے مطابق کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اب جب آنکھیں کھلی ہیں۔ تو اس کے برعکس اس فکر میں ہوں۔ کہ خدا کی اس دنیا کے مطابق کیسے میں اپنی خواہشوں کو بدلوں۔ وہ عیسائیت کو اسی مہم میں بطور رہنما ساتھ لیتا ہے وہ بتاتا ہے کہ ۱۹۱۴ء سے پہلے کی ہماری رجائیت پسند نسل انسانی فطرت کا ایک غلط تصور لے کر ابھری اور بری طرح ناکام رہی۔

”اصحاب الشمال“ ([illegible]) کی بنائی ہوئی سیاسی و عقلی فلسفے کی فضا میں ”بہبودِ انسانی“ اور ”گناہ اولیٰ“ کے نظریے سے سخت درجے کی بغاوت کرتے ہوئے ذہنی زندگی کے عجیب و غریب رجائی نقشے باندھتے تھے۔ لیکن یہ نقشے بار بار تباہ ہوئے اور اصحاب الشمال کی رجائیت کو بار بار منہ کی کھانی پڑی۔ ایک مستقل نامرادی کا سامنا تھا۔ نامرادی! —— عوام کے معقولیت اختیار کرنے سے انکار کے سبب، عقلیت کے مقابلے میں جذباتیت کی بالادستی کے سبب، حقیقی سوشلزم کے عدم ظہور کے سبب، قوموں اور سیاسی لیڈروں کے طرزِ عمل کے سبب، عوام میں شیکسپیئر سے زیادہ ایلی ووڈ کی قدر افزائی کے سبب، اور جنگ کے بار بار کے ظہور کے سبب!!

اور اب —— جوڈ آپ کے سامنے بیان کرتا ہے —— کہ عقل پرستانہ رجائیت کے خواب چکنا چور ہو چکے ہیں۔ وہ ایک بے جوڑ کا پودا تھا۔ جو ہوا کے چند جھونکوں میں اکھڑ گیا۔ پس میں نے اس سارے سرمایہ فکر و خیال کا ٹاٹ لپیٹ دیا اور نتیجہ یہ کہ اب میں ایک عیسائی ہوں!

بقیہ: یارانِ حلقہ

ان کے لئے بہتر سے بہتر فضا اور ان کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کیجئے۔ جو چیزیں شعر و ادب کے ترقی کرنے کے لئے ضروری ہیں وہ پیدا کر دیجئے۔ اور جو وجوہ و اسباب اس سلسلے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ان کا ازالہ کر دیجئے۔ فکر ادبی تحریک کی کیجئے، نہ کہ افراد کی!

کوثر نیازی

جمہوریہ اسلامیہ کی پہلی عید

ہلالِ عید! سوادِ وطن میں جھانک کے دیکھ
کہ ارضِ پاک میں ہے کن مسرتوں کا ہجوم
زباں پہ عظمتِ باری کا ذکر جاری ہے
دلوں میں عزمِ نوی کے چمک رہے ہیں نجوم

ہر ایک ذرہ میں تاباں ہیں سینکڑوں خورشید
ہر ایک راہگزر ہے مثیلِ کاہکشاں
بلند و پست گلے مل گئے محبت سے
خوشا یہ اوجِ مقدر، خوشا یہ بختِ جواں

یہ دینِ حق کے محافظ، یہ عظمتوں کے امیں
یہ جن کے چہروں سے ایماں کا جلال عیاں
بڑے خلوص سے تجھ کو سلام کہتے ہیں،
دعا کو ہاتھ اٹھائے ہوئے یہ پیر و جواں

دعا کو ہاتھ اٹھائے ہوئے یہ پیر و جواں
جو تیری دید کو بصد التزام سے آئے
یہ چاہتے ہیں کہ دستور کے نفاذ کے بعد
یہ پہلی عید بڑے اہتمام سے آئے

رواں دواں ہوں پئے منزلِ رضائے خدا
نہ یاس ہی کی تھکن ہو نہ خطرۂ رہزن
سرودِ عظمتِ رفتہ کی یاد تازہ ہو
نفس نفس ہو وہ مےخانۂ نشاطِ کہن

ہلالِ عید! سوادِ وطن میں جھانک کے دیکھ
کہ ارضِ پاک میں ہے کن مسرتوں کا ہجوم
زباں پہ عظمتِ باری کا ذکر جاری ہے
دلوں میں عزمِ نوی کے چمک رہے ہیں نجوم

رُباعیات و قطعات

[illegible]

[illegible]

"عصمت" ہیں قائل نہ کشنگی ہے شراب
عقبیٰ کا تصور ہے نہ پروائے عذاب
مانوس دف و چنگ ہے فریادِ ضمیر
ظالم کی حکومت کا زمانہ ہے "شباب"

[illegible]

[illegible]

شاہ عارفی

حاصل نہیں ترجیح تصور کو عمل پر
طے کیسے منزل نہ خیالات کے بل پر
خوش فہمی اندیشہ فردا کی بدولت
ہر "فرصتِ امروز" کو مت ٹالیے کل پر

[illegible]

[illegible]

اے-ایم عبداللہ ملّا الصدیق

اے ملّتِ ابرار!

آزاد ہے ملّت مگر افراد گرفتار
آزادیٔ گفتار نہ آزادیٔ کردار
سینے میں تو دم ہے نہیں لیکن دلِ بیدار
وہ ہمّتِ پرکار نہ وہ جذبۂ ایثار
اے ملّتِ ابرار

کیوں جوہرِ ایماں نہیں وہ تجھ میں مسلمان
خاموش ترے بحر کے کیوں ہو گئے طوفان
آئینۂ کردار میں خود کو کبھی پہچان
خالی ہے عمل سے تو وہ اقرار بھی انکار
اے ملّتِ ابرار

جس ہیبت و قوّت سے لرزتا تھا زمانہ
تیری وہ حقیقت ہوئی یونہی فسانہ
دنیا ترے مٹنے کا تراشےگی بہانہ
ہرچند ابھرنے کے ہیں اب تک ترے آثار
اے ملّتِ ابرار

اٹھتے نہیں صد حیف مسافر کے قدم تیز
رہزن کے چمکتے ہیں الگ دشنۂ خوں ریز
ہے راہبرِ دل ہی میں ہلاکو کوئی چنگیز
اے وائے ترا قافلہ و قافلہ سالار
اے ملّتِ ابرار

کیوں غیر کی نادان تو کرتا ہے گدائی
بخشی تھی حرم نے کبھی تجھ کو وہ خدائی
دنیا تو یہ دنیا ہے فلک تک تھی رسائی
اے فاتحِ عالم وہ تری کیا ہوئی تلوار
اے ملّتِ ابرار

پوشیدہ تری خاک میں اب بھی ہیں شرارے
جذبات میں بہتے ہیں ترے آگ کے دھارے
اے آتشِ پُرسوز سمجھ میرے اشارے
جس آگ میں شعلے نہ ہوں وہ آگ ہے بیکار
اے ملّتِ ابرار

تو سربکف اے غازیٔ جانباز اتر جا
تلوار کی حاجت نہیں بے تیغ و سپر جا
نمرود کی آتش سے کھیلا نہ گذر جا
بن جائےگی تیرے لئے آتشِ گل و گلزار
اے ملّتِ ابرار



اختر واحد قاضی

محبِ وطن

براؤننگ سے معذرت کے ساتھ

آج سے ایک برس پہلے بھی میں گزرا تھا — انہی پُرپیچ ضیا پاش گزرگاہوں سے
اور لوگوں نے عقیدت کا کیا تھا اظہار — میرے رتبہ کو بڑھایا تھا شہنشاہوں سے

چار اطراف نظر آتا تھا لوگوں کا ہجوم — مسکراتی ہوئی گلیاں تھیں کہ ہنستے در و بام
میری ہر بات تھی ہم پلۂ قرآن و حدیث — میرے ہاتھوں میں تھی بیمار زمانے کی زمام

سر کٹاتا تھا میرے ایک اشارے پہ جہاں — میری گفتار کا انداز حکیمانہ تھا!!
باعثِ فخر تھا ملت کے لئے میرا وجود — اتنا اونچا مرے معیار کا پیمانہ تھا!

لیکن افسوس کہ اک سال ابھی گزرا ہے — پابجولاں مجھے لائے ہیں انہی راہوں پر
آج کوئی نہیں جو ہار گلے میں ڈالے — آج امیدیں امنگیں ہیں مری خاک بسر

میں نے چاہا تھا جبینوں کی سیاہی دھلتی — مرے افکار نے انساں کا ہیولیٰ ڈھالا
لیکن افسوس کسی کام نہ آیا یہ خلوص — تا بہ کوزہ دجلۂ پیمان کا پرتو ڈالا

کل تلک میرے اشاروں پہ تھے یہ رقص کناں
آج مجھ کو لئے جاتے ہیں جو سوئے مقتل!!
مطمئن ہوں کہ مجھے میرا صلہ دے گا خدا
نہ مری روح ہے زخمی نہ مرا دل گھائل



کیفی جام پوری

مردِ مومن

اک نڈر ملاح جو طوفان میں
اپنی کشتی بے خطر کھیتا رہے
اک جری جو سایۂ شمشیر میں
زندہ رہنے کا سبق دیتا رہے

جس کے اخلاق و خصائل دہر میں
اجلے اجلے ہوں ستاروں کی طرح
صرصر جور و حوادث میں مدام
لہلہاتے سبزہ زاروں کی طرح

جس کا بے پروا تبسم دیکھ کر
جھینپ جائیں وقت کی ناسازیاں
گردشِ چشمِ حیا آلود سے
جو کرے تقدیر کی غمازیاں

جس کے ڈر سے ظلم کا سر خم رہے
جس کے بل پر عدل ہو گردن فراز
روبروئے حق سراپا بندگی!
اور بندوں کے لئے بندہ نواز

بزمِ گل میں بے نیازِ رنگ و بو
اور کانٹوں کے لئے پیکِ بہار
اجڑے اجڑے جھونپڑوں کی روشنی
اونچی اونچی بارگاہوں کا وقار

دو تصویریں

محبوب خاں نصرت

مرے محبوب! ذرا دیکھ یہ تصویر تو دیکھ!
دامنِ نقش میں طوفان لئے آتی ہے
دل کو تڑپانے کا سامان لئے آتی ہے
کچھ مچلتے ہوئے ارمان لئے آتی ہے
مرے محبوب! ذرا دیکھ یہ تصویر تو دیکھ!
اس میں کچھ لوگ ہیں مایوس و پریشاں مجبور
جن کے سینے ہیں فقط رنج و الم سے معمور
ان میں نے گرمیٔ افکار ہے نے عقل و شعور
اور وہ بھی ہیں جنہیں صاحبِ ثروت کہئے
وہ جنہیں دامنِ آدم کی کثافت کہئے
وہ جنہیں سینۂ گیتی کی غلاظت کہئے
میں نے مانا کہ یہ تصویر نہیں دل کا قرار
پھر بھی اے دوست! یہ تصویر ہے ہنگامہ شکار
میرے نوخیز تخیل کی قسم! بس اک بار
مرے محبوب! ذرا دیکھ! یہ تصویر تو دیکھ!!

ثاقب انور

معذرت

میرے خوابوں کے حسیں شیش محل میں آکر
مجھ کو شرمندۂ الطاف کیا ہے تو نے
پھر بھی اے جانِ چمن جانِ بہار
تجھ کو کیوں کر مرے ویران کھنڈر یاد پڑے
میری ہستی یونہی محبوسِ شبِ تار رہی
میں نے تاروں کی حسیں چھاؤں میں دن کاٹ لئے
میں نے تاریک فضاؤں کا جگر چیر دیا
میں نے انگڑائیاں لیتی کئی صبحیں دیکھیں
جن میں رقصاں ہے مری فطرتِ سادہ کی عروس
جن میں رقصاں مرے خوابوں کی حسیں تعبیریں
میری محبوب بتا ایسے اندھیروں کے عوض
میری خودداروفا تیرے سویرے لے گی؟
تیری صبحوں سے مجھے خون کی بو آتی ہے
تیری نصرت مجھے دیتی ہے تشدد کا پتا
تیرے مفروضہ سویروں کے حسیں شعلوں میں
میرے افلاس کا خاشاک جلے گا لیکن
میری محبوب! میری روح جھلس جائیگی
میری ہمدم! میرے جھلسے ہوئے پھولوں کی نسیم!
مجھ کو ظلمات کی آغوش میں کھو جانے دے
تاکہ ظلمت کا ابھی اور جگر چیر سکوں
میرے خوابوں کے حسیں شیش محل میں آکر
مجھ کو شرمندۂ الطاف کیا ہے تو نے
مجھ کو افسوس ہے میں تیرے سویرے لے کر
تجھ کو صبحوں سے بھری رات نہیں دے سکتا۔

ٹیگور ـــــ ترجمہ: میاں فضل القادر

تحفہ

میرے لال!
میں تجھے ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں
اس لئے کہ ہماری زندگی تو وقت کے دریا میں بہتی ہی چلی جا رہی ہے۔
ہم جدا ہو کر بہت دور چلے جائیں گے۔
ہماری محبت بھلا دی جائے گی
لیکن، میں اتنی بے وقوف نہیں کہ ان چھوٹے موٹے تحفوں کے بدلے
تمہارا دل موہ لینے کی اُمید رکھوں
تم نے جوانی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے
تمہاری زندگی کی راہیں نہایت طویل ہیں
جب ہم اپنی محبت تم پر نچھاور کرتے ہیں تو تم محبت کا جام ایک ہی سانس میں خالی کر دیتے ہو
اور منہ موڑ کر ہم سے دور چلے جاتے ہو
ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں
تم ہمیں یاد نہیں کرتے تو اس میں تو کوئی ہرج نہیں
کیوں کہ تم اپنے ہجولیوں کے ساتھ کھیل ہی میں تو مصروف رہتے ہو
اور ہم؟ ہم تو اب بوڑھے ہو چکے ہیں
فراغت ہی فراغت رہتی ہے
اسی لئے تو ہم ماضی کے ایک ایک لمحہ کو یاد کرتے ہیں
ان قیمتی لمحات کو اپنے دل سے لگائے بیٹھے ہیں
جنہیں خود ہی اپنے ہاتھوں کھو چکے ہیں
جو کبھی بھی واپس لوٹ کر نہیں آئیں گے۔۔
دریا سحر کن گیت گاتا اپنی مستی میں سرشار تیزی سے بہتا ہی رہتا ہے
مشکلات کی حدوں کو پھلانگتا رواں دواں ہی رہتا ہے
لیکن پہاڑ؟
پہاڑ اپنی جگہ پہ قائم ہی رہتا ہے
اُسے کچھ بھولی بسری کہانیاں ہی یاد آتی ہیں
لیکن اس کی محبت
اس کی محبت دریا کی روانی کے ساتھ ساتھ سدا جوان رہتی ہے۔

نیرنگ تاریخ

اسرار احمد سیوہاروی

تاریخ انسان کی اجتماعی فطرت کا آئینہ ہے۔ تاریخ انسانی زندگی کے ارتقا، معاشرتی اصلاح اور روایات کے تحفظ کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ تاریخ آدمی کی قوت حافظہ کا شاہکار ہے۔ آجکل کے ماہرین نفسیات کا قول ہے کہ اگر حافظہ نہ ہوتا تو شاید انسان افضل المخلوقات بھی نہ ہوتا کیونکہ اس کی ساری ذہنی اور جسمانی فتوحات اسی قوت حافظہ کی مرہون منت ہیں۔ اگر یہ غیر معمولی قوت اس کو ودیعت نہ کی گئی ہوتی تو انسان "حیوان ناطق" بھی نہ ہو سکتا تھا بلکہ دوسرے جانوروں کی طرح حیوان صامت ہی رہتا۔ انسان پچھلی باتوں کو یاد رکھ کر اور ان یادوں کو بنیاد بنا کر آگے بڑھتا ہے اور اسی بنیاد پر اپنی حسب منشا عمارت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری دنیا میں جتنی ترقیاں ہوئی ہیں وہ پچھلی باتوں کو حافظے میں محفوظ رکھنے کی وجہ سے ہی ہوئی ہیں۔ اگر انسان ماضی کو بالکل فراموش کر دے تو مستقبل میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہمارا ماضی ایک زینہ ہے جو ہمیں درجہ بدرجہ بلندیوں تک پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔ اسی ماضی کی یاد کو تاریخ کا نام دیا گیا ہے۔ تاریخ انسان کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی ایک یادداشت ہے۔ اس یادداشت سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کہاں کہاں اور کب کب ہم سے لغزشیں ہوئیں اور ان لغزشوں کے اسباب کیا تھے۔ یہ یادداشت ہمیں اس بات کا موقعہ فراہم کرتی ہے کہ ہم ان گذشتہ ٹھوکروں سے اپنے قدموں کو محفوظ رکھ سکیں اور ان تدابیر کو اس کے اوراق میں محفوظ کر جائیں جن سے ہم نے اپنی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے میں کامیابی سے مدد حاصل کی تاکہ ہماری آنے والی نسلیں بھی اگر چاہیں تو ان غلطیوں سے دامن بچا کر نکل جائیں اور ہمارے تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں انہیں مدد مل سکے۔ اس طرح اسلاف کے نقش قدم اخلاف کے لئے راہنما کا کام دیتے ہیں اور وہ آسانی سے کم سے کم وقت میں منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انہیں از سر نو وہ تمام راستہ طے نہیں کرنا پڑتا جس کو انکے اسلاف نے بہزار دشواری طے کیا تھا۔ بسمارک نے کیا خوب کہا ہے "بے وقوفوں کا قول ہے کہ وہ ذاتی تجربے سے ہی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں! میں تو ہمیشہ دوسرے لوگوں کے تجربے سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور اسی طریقے کو پسند کرتا ہوں۔"

تاریخ کا علم ایک ایسا علم ہے جو تمام دیگر علوم میں بھی کم و بیش دخل انداز ہے۔ یہ علم زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے بغیر اس کے دنیا کے کسی علم کی بنیاد ہی قائم نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے کسی نے خوب کہا ہے کہ "لوگ تو ستر یا اسی برس کی عمر پا کر فخریہ کہتے ہیں کہ ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر انہوں نے دو ہزار برس کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا تو ان کے تجربے اور آگاہی کی عمر اسی برس سے بڑھ کر دو ہزار برس کی ہو جاتی۔" تاریخ کے واقعات میں ایک قسم کی ہم آہنگی اور تسلسل رہتا ہے۔ یہ واقعات منتشر اور بے ربط نہیں ہوتے۔ جو واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ تنہا اور بغیر کسی سلسلے کے نہیں ہوتا بلکہ کسی پہلے واقعے کا

ہے اور کسی گذشتہ وقوع کی تکمیل کرتا ہے۔ اسی طرح ہر واقعہ کسی خاص سبب کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے یہاں کے ہر کام کے لئے جہاں آفرین نے کوئی نہ کوئی سبب مقرر کر دیا ہے۔ یہ علت و معلول کا فطری اصول آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا۔ یوں بعض ایسے واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں جن کا بظاہر کوئی سبب نظر نہیں آتا لیکن یہ معمولات نہیں مستثنیات ہوتے ہیں۔ اول تو خداوند تعالیٰ معمول کے خلاف کام کرنے سے عاجز نہیں پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے حادثے کا کوئی سبب فی الواقع موجود ہو اور ہماری عقل کی گرفت سے باہر ہو اس لئے مافوق الادراک حادثات کا وقوع بھی محال نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ہمیں ان پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے ان پر گفتگو کرنا تحصیل حاصل ہو گا۔ ہم انہیں معاملات پر غور و خوض کریں جو ہمارے ادراک کی گرفت آ سکتے ہوں۔

تاریخ کو ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیئے "عالم تاریخ کے واقعات انسان کی اجتماعی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انسانی فطرت کے قوانین کا ہمیں صحیح علم ہو تو تاریخی واقعات کی توجیہہ صحیح طریقے سے کر سکتے ہیں۔ اور اگر انسانی فطرت کی خصوصیات کے متعلق ہمارے تصورات غلط یا ناقص ہوں تو ہم اجتماعی واقعات اور تاریخی انقلابات کی جو توجیہہ کریں گے وہ بھی اسی درجہ میں ناقص اور غلط ہو گی۔ چنانچہ انسان کی اجتماعی فطرت کے بارے میں جس قوم کا تصور حقیقت سے جتنا قریب ہوتا ہے واقعات کے اسباب و نتائج پر اس کی نظر بھی اتنی ہی صحیح ہوتی ہے اور اسی درجہ میں اس کو یہ قدرت بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اجتماعی افعال کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح کرے۔ اس طرح تاریخی انقلاب کا تار و پود قوموں کے اجتماعی اعمال سے بنتا ہے اور ان اعمال کا دار و مدار اس پر ہے کہ قوم کا طرزِ تفکر حقیقت ٹھیک ہو۔ انسان کی اجتماعی فطرت کے بارے میں وہ صحیح نقطۂ نظر اختیار کرے"۔[1]

تاریخ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کے مطابق ہمارے سامنے توجیہہ کائنات پیش کرے۔ انسان کی پیدائش ہی کی تاریخ مقرر نہ کرے بلکہ اس کی آفرینش کا مقصد بھی بتائے۔ اس کے پیدا کرنے والے کو معین کر کے اس کا رشتہ انسان کے ساتھ واضح کرے۔ انسان نے درجہ بدرجہ تہذیب و تمدن میں جو ترقیاں کی ہیں یا انسانی معاشرت میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ان کو محفوظ کرلے۔ مختلف واقعات سے جو معاشرتی سیاسی۔ لسانی۔ ثقافتی اور مذہبی نتائج مرتب ہوتے ہیں ان کو مختلف شعبوں میں درجہ بدرجہ تقسیم کرے۔ اقوام کی مختلف ادوار کی اخلاقی حالت کا تجزیہ کرے۔ اخلاق کے اتار چڑھاؤ اور اخلاقی اقدار کی تبدیلیوں سے جو اثرات اقوام و افراد کی زندگیوں پر پڑے ہوں ان کو واضح کرے۔ مختلف ادوار کے طرزِ معیشت۔ طرزِ حکومت اور طرزِ معاشرت کا صحیح نقشہ پیش کرے۔ مختلف اقوام کی فتوحات کا ذکر کرے اور ان کے صحیح واقعات کو محفوظ رکھے۔ مختلف زمانوں کا طریقۂ جنگ، اقسام اسلحہ، صلح کے اصول وغیرہ کی ایک مفصل یادداشت پیش کرے۔ طریقۂ جنگ میں جو مختلف زمانوں میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ان کو بتائے۔ مختصر یہ کہ تاریخ تقریباً ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ ایسے ہمہ گیر علم کی صحت میں اگر دانستہ آمیزش اور غلط بیانی کو دخل دے دیا جائے تو میرے خیال سے اس سے زیادہ قومی یا بین الاقوامی جرم کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اور اب جبکہ دنیا بین الاقوامیت کے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ تاریخ میں کسی قسم کی آمیزش

---

[1] اسلام کا نظریۂ تاریخ ۔۔۔۔ مظہر الدین صدیقی

ناقابلِ برداشت ہے۔ آج کے دور میں تاریخ قومی نہیں رہی بلکہ بین الاقوامی ہو گئی ہے۔

تاریخ کا ایک اہم ترین فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ گذشتہ واقعات کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کا ایک مستقل فلسفہ تیار کرے۔ وہ بتائے کہ قومیں کس طرح عظمت و وقار کے میدان میں آگے بڑھتی ہیں اور کس طرح بدرنگی و اقبال مندی کی بلندیوں سے نیچے پھینک دی جاتی ہیں۔ یہ کیونکر ہوتا ہے کہ کبھی ایک قوم اولوالعزم بن جاتی ہے اور کبھی نامرد۔ کیا یہ اہم اور انقلابی تبدیلیاں محض حوادثات اور اتفاقات کی بنا پر رونما ہوتی ہیں۔ یا بعض معاشی اور اخلاقی حالات کی بنا پر یہ تحولات رونما ہوتے ہیں۔ کیا ان انقلابات و تحولات کو کسی تدبیر سے یا گذشتہ تجربات کی روشنی میں متاثر کیا جا سکتا ہے یا اس معاملے میں انسان مجبور محض اور بے بس تماشائی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی تحقیقات کا میدان یہ بھی ہے کہ آیا جو ایک تہذیب ایک دفعہ دنیا میں پیدا ہو کر پھل پھول چکی ہو اور کچھ مدت کے بعد انحطاط پذیر ہو گئی ہو وہ پھر کبھی اقوام یا افراد کی مساعی سے واپس آ سکتی ہے یا نہیں یعنی مختصراً یہ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے یا نہیں۔ یا کبھی دہرا سکتی ہے یا نہیں۔ یہ مسائل تاریخ کے بڑے اہم مسائل ہیں۔ ان کے اثرات انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بڑے دور رس ہیں۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ایک تہذیب واپس آ سکتی ہے یا یہ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر تاریخ میں کوئی دور انسانیت کے لئے درخشاں گذر چکا ہے تو انسانی مساعی اس طرف لگائی جائیں گی اور حالات کو اس کے لئے ساز گار بنانے کی کوشش کی جائے گی کہ اس دور کو مکمل طریقے سے بالکل طور پر واپس لایا جائے۔ اور اس تصور کی بنا پر انسان حتی المقدور اس بات پر آمادہ ہو سکتا ہے کہ اپنی ساری قوتیں اس دورِ تاباں کو واپس لانے کے لئے صرف کر دے خواہ اس جدوجہد میں اسے اپنی جان کی بازی لگانی پڑے۔ لیکن اگر اس کے برخلاف یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جو گذر چکا سو گذر چکا۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان اپنے ماضی کی طرف سے مایوس ہو جائے گا اور اپنی پہلی فرصت میں ماضی سے رشتہ توڑ لینے کی فکر کرے گا۔ ماضی کی زندگی کی تمام قدروں کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ خواہ یہ قدریں انسانی معاشرت میں کتنی ہی بنیادی اہمیت کیوں نہ رکھتی ہوں۔ مثلاً ایک دور تھا کہ مذہبی خیالات اور زندگی کی مذہبی قدروں کا دنیا بھر میں دور دورہ تھا لیکن آہستہ آہستہ مذہبی قدروں کو اور مذہب کی پیدا کردہ اخلاقی قدروں کو زوال ہونا شروع ہوا اور ابھی وہ زوال پذیر ہیں۔ لیکن بعض لوگ اس بات کی کاوش کر رہے ہیں کہ زندگی کی مذہبی قدروں کو پھر اجاگر کیا جائے اور ان کو دوبارہ زندگی کے مختلف شعبوں میں جاری و ساری کیا جائے کیونکہ بے پناہ مادی ترقی کے باوجود دنیا ذہنی و قلبی طور پر سخت بیقرار ہے اور بڑی تیزی سے مکمل تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی اس تیز گامی کو مذہبی تصورات اور پرانی اخلاقی قدریں ہی روک سکتی ہیں۔ لیکن یہ حضرات اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیں کہ تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی تو وہ یقیناً اپنی تمام مساعی اور کاوشات کو ترک کر دیں گے اور ہماری زندگی اسی طرح بے لگام منہ زور گھوڑے کی طرح تباہی کی طرف تیزی سے دوڑتی چلی جائے گی۔ لیکن اگر یہ حضرات اس نظریے کو اپنا لیں کہ ہم تاریخ کو پھر واپس لا سکتے ہیں تو ان کی ہمتیں بلند اور ولولے قوی ہو جائیں گے اور وہ بڑے سکونِ قلب کے ساتھ اور روحانی طمانیت کے ساتھ ہی اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کوشش کرتے رہیں گے۔

تاریخ کی مختصر سی تعریف لکھ دینے کے بعد غالباً یہ بے جا نہ ہوگا کہ اس کا بھی تذکرہ کر دیا جائے کہ یہ کس طرح وجود میں آئی اور کس طرح اس کا ارتقا ہوا۔ گویا علمِ تاریخ کی تاریخ بیان کر دی جائے۔ علم تاریخ کی سرگزشت بیان کرنا بھی تاریخ کا ایک اہم فرض ہے اس لئے یہ چیز ہمارے موضوع

سے خارج نہیں ہے۔

تحریر کی ایجاد سے بہت پہلے انسان نے کسی ایسی چیز کی ضرورت محسوس کی جس کے ذریعے سے وہ اپنے فرصت کے اوقات خوشی سے گزار سکے اور جب وہ کسی دشمن سے نبرد آزما ہو تو وہی چیز اس کے جوش و غضب کو ابھارنے کا کام دے۔ اس ضرورت کو ان اشعار نے پورا کر دیا جو کہ بہادری کے قصے بیان کرنے کے لیے موزوں کئے گئے۔ اس قسم کے قصے تمام دنیا کی وحشی اقوام میں پائے گئے ہیں اور آج بھی جہاں تہذیب و تمدن کی روشنی نہیں پہنچی وہاں یہ چیز اپنی پوری اہمیت اور ہر دلعزیزی کے ساتھ موجود ہے۔ یہ اشعار ہر قبیلے اور قوم کا ایک مخصوص گروہ یاد رکھتا ہے اور مخصوص لہجوں میں خاص خاص مواقع پر ان کو گا کر سناتا ہے۔ یہ گروہ قبیلے کی تمام روایات کو بلکہ لوگوں کے حسب و نسب کو یاد رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی سواری کے جانوروں اور شکاری درندوں تک کے خاندانی سلسلے کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے اور ضرورت کے وقت سینے سے باہر اگل دیتا ہے۔ یہی لوگ قوم کے ہر دلعزیز شاعر، ماہر انساب اور قابل اعتماد مورخ ہوتے ہیں۔ ان کو قبیلے کے تمام جھگڑوں میں حکم بنایا جاتا ہے۔ ان کے متعلق یہ مشہور ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی قوتوں کے حامل ہیں۔ اور یہ کہ خدا یا کسی دیوی دیوتا سے ان کا براہ راست تعلق ہے اور وہ انہیں دیوتاؤں کے حکم کے مطابق گفتگو اور عمل کرتے ہیں۔ ان کا حافظہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ ان سے غلطی کا بہت کم امکان ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ جب اس قسم کے وحشی قبائل میں تمدن کی روشنی پھیلتی ہے تو لکھنے کا فن ایجاد ہو جاتا ہے اور پھر بجائے زبانی یاد رکھنے کے تاریخ کو کاغذ پر لکھ کر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اور عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تاریخ کو غلطی اور اتلاف سے بچا لیا گیا ہے۔ حالانکہ بہت سے لوگ اس اصول سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کسی قوم کی تاریخ اس وقت تک زیادہ صحیح رہتی ہے جب تک کہ وہ سینوں میں محفوظ رہے اور جب وہ سینوں سے کاغذ پر منتقل ہونے لگے تو اس میں بہت سی کمزوریاں اور خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ بحث بڑی دلچسپ سی ہے اس لئے اسے ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے تو غالباً گراں نہ گزرے گی۔

سب سے پہلی دلیل جو اکثر مورخین نے اس سلسلے میں دی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر قوموں نے اپنی مذہبی کہانیوں کے متعلق بڑی بے احتیاطی سے کام لیا ہے اور ان کی عجائب پرست طبیعتوں نے ایسے ایسے افسانے گھڑ کر تاریخی کتابوں میں درج کر دیئے ہیں جو محض کہانیوں کے طور پر بھی قبول نہیں کئے جا سکتے۔ مذہبی مبلغوں نے وقتی مفاد کے خیال سے ان خیالی بلکہ وہمی باتوں کو تاریخ کا درجہ دے دیا اور مقصد کی پاکیزگی کا سہارا لے کر جھوٹ کو سچ بنا کر علی الاعلان خوب مشہور بھی کیا۔ اس جھوٹ کو مذہبی راہنماؤں کی تصدیق اور تائید حاصل ہو جانے کی وجہ سے کسی کو اس پر اعتراض کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ جن ممالک میں ابتدائے آفرینش سے ایک ہی مذہب کا دور دورہ رہا، وہاں تو اس قسم کی غلطیوں کا امکان نسبتاً کم ہے لیکن جن ممالک میں مذہب کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں وہاں کی تاریخ میں اکثر اس قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

دوسرا سبب تاریخ میں غلطیاں شامل ہو جانے کا یہ ہوا کہ جب تاریخی کتابیں لکھی جانے لگیں تو یہ ضروری محسوس کیا گیا کہ تاریخ کو حضرت آدم کے ہبوط سے شروع کیا جائے ورنہ تاریخ غیر مکمل رہ جائے گی۔ بعض لوگوں نے حضرت آدم تک تو پہنچنے کی کوشش نہیں کی [illegible]

ح سے تاریخ کو شروع کرنا مناسب خیال کیا۔ ایسی صورت میں لامحالہ غیر تاریخی دور کی تاریک گھڑیاں تخیل سے پُر کرنی پڑیں اور تاریخ میں بہت سی فرضی کہانیاں تاریخی واقعات کی حیثیت سے شامل ہو گئیں۔

خیر یہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں انہیں تو جانے دیجئے۔ اب ذرا اپنے زمانے کی تاریخ سازی اور تاریخ نویسی کی آنکھوں دیکھی داستان بھی سن لیجئے۔ یہ داستان میں محض اس لئے سنانا چاہتا ہوں کہ آپ کو یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ لوگ جنہوں نے صدیوں سے ہماری قومی اور ملی تاریخ لکھنے کا فرض سنبھال رکھا ہے وہ اپنی تاریخ کس طرح بناتے ہیں۔ اور پھر جب اپنی تاریخ میں یہ کرشمہ سازیاں فرماتے ہیں تو ہماری تاریخ لکھنے میں انہوں نے کیا کیا گل نہ کھلائے ہوں گے اور ہماری زندگی کے ہر ہر پہلو کو کس طرح اپنے مفاد کے مطابق متاثر نہ کیا ہوگا۔ پھر میں ان سطور میں ان لوگوں کو بھی مخاطب کر رہا ہوں جو کہ مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو دیانت اور امانت کا کامل ترین نمونہ سمجھتے ہیں اور ان مغربی مؤرخوں نے ہمارے آباؤاجداد کے متعلق جو کچھ لکھ دیا ہے اس کو پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں اور اس سے سرمو تجاوز کرنا نہیں چاہتے۔ پھر میں اس طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ ہمارے اسلاف کی لکھی ہوئی تاریخوں کو مستند ماننے سے گریز کرتے ہیں۔ اور ان بزرگوں کی دیانت پر شبہ کرتے ہیں جنہیں بہرحال ان حضرات سے زیادہ خدا کا خوف تھا۔ حد یہ ہے کہ صحابہ و تابعین کے بیان کئے ہوئے واقعات کو، احادیث کے مجموعوں کو اسماء الرجال کو ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں وہ بھی ذرا مہذب ترین دور کی مغربی تاریخ سازی اور تاریخ نویسی کے دیانت دارانہ فن پر ذرا نظر ڈالیں اور پھر ذرا ٹھنڈے دل سے موجودہ تاریخ کا ہمارے اسلاف کی لکھی ہوئی تاریخوں سے مقابلہ فرمائیں۔ امید ہے کہ انشاءاللہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور ہر چیز کی صحیح قیمت متعین ہو کر نظروں کے سامنے آجائے گی۔ پھر دیانت داری سے جو فیصلہ کیا جائے گا صحیح ہوگا۔

ایک جرمن جنرل ہاف مین اپنے ذاتی جنگی تجربات کی بنا پر لکھتا ہے "میں نے اپنی پہلی زندگی میں پہلی مرتبہ تاریخ کو بنتے ہوئے قریب سے دیکھا ہے اور اب میں سمجھ گیا ہوں کہ اصلی تاریخ اس تاریخ سے بہت مختلف ہوتی ہے جو بعد میں آنے والی نسلوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے"۔ اس کے بعد میں ایک اور کتاب سے اقتباس پیش کروں گا تاکہ آپ کو موجودہ تاریخ سازی کا ذرا زیادہ واضح اندازہ ہو جائے "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے بہت قریب سے تاریخ کو بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ تجربے نے مجھے یہ بتایا ہے کہ تاریخ بالکل مصنوعی ہوتی ہے۔ میں اس ضمن میں سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی مثال پیش کر سکتا ہوں۔ اس وقت حکومت نے جنگ کی یادداشت سرکاری طور پر لکھوانا شروع کر دی تھی۔ مجھے اس کام کے بیس سالہ تجربے نے بتایا ہے کہ سرکاری قسم کی تاریخیں بالکل اساطیر الاولین یا فرضی قصے کہانیوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان تاریخوں کی تیاری کے دوران میں بہت سے دستاویزات اس لئے جلا ڈالے جاتے ہیں تاکہ کسی کمانڈر کی شہرت میں فرق نہ آئے۔ انگریزوں نے تو اس دوران میں صرف اتنا کیا تھا کہ دستاویزات کی تاریخیں بدل دی تھیں۔ لیکن فرانسیسی اس معاملے میں زیادہ تیز نکلے۔ ایک فرانسیسی کمانڈر اپنی شہرت اور سپاہیوں کی جان اس طرح بچا لیتا تھا کہ وہ ان حالات کے لئے احکام جاری کرتا جو در حقیقت کبھی واقع ہی نہیں ہوئے تھے۔ اور ایسے حملوں کے متعلق تحریر میں لکھ کر محفوظ کر لیتا جو کسی نے کبھی پرزور کئے ہوتے۔ اس طرح ہر شخص کی سنت میں عزت افزائی ہو جاتی کیونکہ یہ تحریریں کاغذی یادداشتوں میں محفوظ کر دی جاتیں۔ مجھے اس زمانے میں بڑا تعجب ہوتا تھا کہ آخر لڑائی کس طرح لڑی جاتی ہے جبکہ کمانڈر لوگ اپنا زیادہ تر وقت تاریخ

تیار کرنے میں صرف کر رہے ہیں تاکہ اصلی جنگ میں۔*

جرمن قوم نے تو اس معاملے میں بالکل حد ہی کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے قانونِ فوجداری میں جو کہ ۱۹۳۹ء میں تیار ہوا تھا یہ واضح طور پر درج کر دیا تھا کہ وہ واقعات جو جرمنی کی عزت و وقار کے لئے ضرر رساں ہوں تاریخوں میں ہرگز بیان نہ کئے جائیں خواہ بالکل سچے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اگر کوئی شخص اس قسم کے حالات تاریخ میں بیان کرے تو اسے قید با مشقت کی سزا دی جائے۔ اس غلط قسم کی تاریخ سازی کے خلاف موجودہ دور کے مشہور فلسفی اور ادیب رسل نے بھی اپنی بعض تحریروں میں سخت احتجاج کیا ہے اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ مغربی ممالک کے چوٹی کے لوگ اپنی تاریخ نویسی کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔" تاریخ ہر ملک میں اس طرح سے پیش کی جاتی ہے جس سے اس ملک کے وقار میں اضافہ ہو۔ بچوں کو تاریخ میں پڑھایا جاتا ہے کہ ان کے ملک نے کبھی کسی معاملے میں غلط راستہ اختیار نہیں کیا۔ اور یہ کہ ان کے ملک کو ہر معرکے میں فتح حاصل ہوئی ہے۔ کبھی شکست سے واسطہ نہیں پڑا۔ دنیا میں جتنے چوٹی کے لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ وہ ان کے اپنے ملک میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ غرضکہ ہر لحاظ سے ان کا وطن دنیا کے دوسرے ممالک پر فوقیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر واٹرلو کی لڑائی کو لیجیے۔ اس لڑائی کے واقعات انگلستان، فرانس اور جرمنی میں بالکل مختلف حالات کے تحت پڑھائے جاتے ہیں۔ ایک انگریز بچے کو یہ بتایا جائے گا کہ پروشیا والوں نے اس جنگ میں کوئی کارنامہ نمایاں نہیں کیا بلکہ لارڈ ولنگٹن لڑائی کو جیت چکا تھا اس وقت جنرل بلوشر میدانِ جنگ میں پہنچا ہے اس نے لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس کے خلاف ایک جرمن بچے کو تاریخ میں یہ بتایا جائے گا کہ لارڈ ولنگٹن کو مکمل شکست ہو چکی تھی اور نپولین جیت چکا تھا۔ جنرل بلوشر نے جا کر میدانِ جنگ کا نقشہ بالکل بدل دیا۔ اور نتیجہ کے طور پر نپولین کو زبردست شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔*

اب آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ لوگ وطن پرستی کے جذبے سے مغلوب ہو کر تاریخ پر کس قدر ظلم کرتے ہیں۔ اور یہ اندازہ بھی ہو گیا ہوگا کہ جو تاریخی کتابیں آئندہ اس جذبے کے تحت لکھی جائیں گی وہ کس حد تک قابلِ اعتماد اور مستند ہو سکتی ہیں۔ اور آپ نے یہ اندازہ بھی لگا لیا ہوگا کہ ان وطن پرست حضرات نے جو اپنے دشمن مسلمانوں کی تاریخیں لکھی ہوں گی ان میں کس حد تک آمیزش کا امکان ہوگا۔ اور ان بزرگوں نے جو مسلمانوں کی معاشرت، مذہب، سیاست اور ثقافت وغیرہ کا نقشہ کھینچا ہے وہ کس قدر قابلِ اعتماد ہوگا اور اس میں کس حد تک حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہوگا۔ تاریخ کو وطنی تعصبات کا شکار بنا دینا ایک بین الاقوامی جرم بھی ہے اور قومی بھی۔ اس غلط قسم کی تاریخ نویسی کی وجہ سے دوسری قومیں ہمیں غلط انداز میں سمجھ سکتی ہیں اور ہمارے ساتھ سلوک کرنے میں انہیں بڑی حد تک غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کی ملت فریبی ہمیں خود اندرونی طور پر بہت بڑے نقصانات اور مصائب کا شکار بنا سکتی ہے مثلاً نا روا خود ستائی سے ہمارے اندر ایک غلط قسم کی خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے اور اگر کسی وقت حالات کی ناسازگاری اور زمانے کی ناموافقت کی وجہ سے ہمیں شکست کا منہ دیکھنا پڑے تو ہم اس کو برداشت نہ کر سکیں گے اور ہمارے قوائے ایسے صدمے سے فوراً مضمحل اور شل ہو کر رہ جائیں گے۔ ہم کسی



* "Why we don't learn from history" — By Liddell Hart.
Principles of Social Reconstruction — P. 144

غیر متوقع مصیبت کا ہمت سے مقابلہ نہ کر سکیں گے۔

دوسرا بڑا نقصان اس قسم کی خود فریبی سے یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی قوت کا غلط اندازہ کر کے اور دوسرے ملکوں کی طاقت کا درست اندازہ نہ کر کے اس کے خلاف جارحانہ اقدام کی طرف مائل ہو سکتے ہیں اور اس قسم کا غلط اقدام ہماری ملی اور وطنی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ کس قدر غیر ذمہ دارانہ اور طفلانہ حرکت ہے کہ ہم سیاہ کو سفید کہیں اور پھر مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کہ سیاہی دور ہو گئی اور سفیدی چھا گئی۔ حالانکہ سیاہی اسی طرح اپنی جگہ مسلط ہو۔ کیا ہماری غلط بیانی سے حقائق میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم اگر رات کو دن کہنے لگیں تو رات تو اپنی جگہ رات ہی رہے گی لیکن ہم اس کو دن سمجھ کر عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگیں گے کہیں ٹھوکر کھائیں گے کسی سے ٹکرائیں گے۔ کچھ دوسری چیزوں کو توڑیں گے کچھ اپنا جسم لہولہان کریں گے۔ غرضکہ ایک تماشا بن جائے گا۔ اور ایسی حالت میں دماغی توازن قائم رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا اور اس طرح دماغی توازن تباہ کرنے والی مثال ہٹلر کی جرمنی نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے جرمن کا اجتماعی توازن دماغی ضائع کرنے والی سب سے بڑی چیز ان کی یہ غلط قسم کی خود ستائی ہی تھی۔ ان کے خیال میں جرمن قوم دنیا کی تمام اقوام سے اعلیٰ وارفع تھی۔ اور وہ تمام دنیا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ آج آپ نے بزعم خود بین الاقوامی حاکم قوم کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور آئندہ کے لئے بھی ایسی خود فریب اور عالم فریب اقوام کے لئے اس قسم کے نتائج مقدر ہو چکے ہیں اگر ہم چیزوں کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں حقائق کو صحیح روشنی میں دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے اور ہر انسان کو فرد کی حیثیت سے اور ہر قوم کو قوم کی حیثیت سے ہر چیز کا صحیح اندازہ کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے قومی اور بین الاقوامی معاملات میں صحیح فیصلے کر سکے اور ہر مسئلہ کو درست پس منظر میں دیکھ سکے۔

تاریخ میں غلطیاں داخل ہونے کا ایک اور راستہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ اپنی تنظیموں کے متعلق کسی قسم کی مخالف تنقید، تبصرہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اسی طرح وہ اپنی معاشرتی اعتقادی۔ سیاسی۔ ادبی روایات کے خلاف بھی کچھ سننا پسند نہیں کرتے اس وجہ سے تاریخ نویس وقتی روایات کے دباؤ سے مجبور ہو کر بہت سے حقائق پر پردہ ڈالنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے یا پھر کم از کم ان حقائق کو ان رواج یافتہ روایات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ بعض روایات کو اس قدر مقدس سمجھتے ہیں کہ ان پر تنقید برداشت نہیں کر سکتے تاریخ کو حقیقت سے دور لے جانے میں سب سے زیادہ اہمیت ان لوگوں کو حاصل ہے جو تاریخ کو قومیت اور وطنیت کے زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں وہ ہر غلطی کو قومیت اور وطنیت کے نام پر صرف برداشت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کو رواج دینے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ وطنیت کے بت کی پہلے مغربی ممالک میں پرستش شروع ہوئی اور اب یہ وبا مشرقی ممالک میں بھی پوری طرح مسلط ہو گئی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال مرحوم کو گھبرا کر یہ کہنا پڑا کہ "ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے"۔ میں یہاں ایران کے ایک فاضل ڈاکٹر رضا زادہ شفق کے ایک مضمون "کیا تعصب خوب است" میں سے چند سطور کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ اس کے مطالعے سے آپ یہ اندازہ کریں کہ مشرق کے ایک نسبتاً پسماندہ ملک میں وطنی تعصب کا کیا عالم ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون میں اپنے طبقہ کی اس بات کی شکایت کر رہے ہیں کہ یہ لوگ وطن کے متعلق کسی ایسی تحقیقی بات کو بھی سننا گوارا نہیں کرتے جس کو تاریخی طور پر ثابت کر دیا گیا

سوچ بچار

دو ذہن ـــــ آمنے سامنے

اداره

ہم ایک قوم ہیں مگر ہمارے اندر دو متضاد رجحانات کام کر رہے ہیں۔ عام لوگوں کے لئے اپنی ملی آئیڈیالوجی میں جاذبیت ہے لیکن ان کے ایک مختصر سے ٹولے کے فکر و کردار پر پرائے خیالات کی چھاپ اتنی گہری پڑ گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ذاتی و گروہی مفاد کی بدمستی میں بے اصولے پن اور کردار باختگی کا ایک ایسا کوڑھ لگ گیا ہے کہ انہیں اپنے ملی سرمایہ معتقدات اور آبائی ورثہ روایات سے ایک سخت کد ہو گئی ہے۔ عام لوگ اپنے آپ کو اسلام سے ہٹا ہوا پا کر شرمسار اور پشیمان ہوتے ہیں اور ایک ہُوک ان کے دلوں میں اٹھتی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے شاندار نظامِ تمدن کی جنتِ گم گشتہ کو واپس حاصل کر سکیں۔ لیکن عوام کے اس جذبے کو دیکھ کر ان کے بعض بگڑے ہوئے سربراہ کار خوش ہونے اور اس سے مفید اثر لینے کی بجائے اُلٹا غیض و غضب کے سخت ہسٹریائی دورے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ عوام کا ساتھ دینے اور ان کو سہارا دینے کی بجائے ان کا منہ نوچنے پر اُتر آتے ہیں اور جو اول فول منہ میں آتا ہے فر فر ارشاد فرماتے چلے جاتے ہیں۔ گویا ہمارے عالمِ افکار کا معاملہ کچھ یک بام و دو ہوا کا سا ہو گیا ہے۔ گویا ہمارے قومی عزائم اور حوصلوں کی جوئے رواں پھٹ کر دو دھاروں میں منقسم ہو گئی ہے۔ گویا ہمارے خیالات کے سمندر میں گرم اور سرد رو رویں متقابلاً چل رہی ہیں۔ ہمارا ذہن، ذہنِ دوتا ہو گیا ہے۔ ایک ذہن نہیں رہا۔ دو ذہن ہو گئے ہیں۔ اور یہ دونوں ذہن ہر جگہ آمنے سامنے دکھائی دیتے ہیں، ہر جگہ ان میں کھچاؤ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ ہماری سب سے اونچی ہیئتِ اجتماعی۔ دستوریہ۔ میں بھی یہ دونوں ذہن متصادم دکھائی دیتے ہیں۔ آیئے ۔۔ وا ایسے لیڈروں کا ذہنی مطالعہ کریں جن کے اندر دو مختلف رجحانات بول رہے ہیں۔ یہ درحقیقت دو اشخاص کے بول نہیں ہیں، یہ دو زاویہ ہائے نظر اور دو اسالیبِ فکر الگ الگ چھنٹ کر نمایاں ہو رہے ہیں۔

ایک ذہنیت کے ملفوظات ملاحظہ ہوں:-

- "اسلام وہ رشتہ نہیں ہے جس نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے جوڑا ہے۔ واحد رابطہ یہ ہے کہ ایک حصہ دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر واقعتہً صرف اسلام ہی وجہِ ربط ہے تو آخر کیوں نہیں یہ اس خطے کے مسلمانوں کو دوسرے مسلم ریاستوں کے مسلمانوں سے جوڑ دکھاتا"
- "ہم تہِ دل سے اسلام پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن یہ کہنا ایک جھوٹ ہوگا کہ اس (زیرِ بحث) دستور کے نفاذ کے بعد پاکستان اسلامی جمہوریہ یا اسلامی ریاست بن جائیگا"
- "یہ بات (یعنی صدرِ ریاست کے مسلم ہونے کی شرط مقرر کرنا) قطعی طور پر غیر ضروری ہے، نیز عوام کی ذہانت کی توہین ہے"
- "پاکستان کو اسلامی ریاست[1] کا نام مت دیجئے، جب کہ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں، جبکہ وہ زندہ رہنے کے لئے اپنے جسموں کو بیچتے

---

[1] چنانچہ سب سے پہلے تو خود مقرر نے اپنی پارٹی کے نام سے لفظ "مسلم" کو خارج کر دیا ہے، بعید نہیں کہ وہ اپنے آپ کو بھی مسلم کہلانے سے باز آجائیں۔

پھرتے ہیں اور حجب کہ عیاشی غربت کے پہلو بہ پہلو جاری ہے۔"

"تا وقتیکہ مسودۂ دستور میں یہ دفعات موجود رہیں کہ یہ (پاکستان) ایک اسلامی جمہوریہ ہوگا اور اسلام سے مطابقت رکھنے والے قوانین پاس نہیں کئے جائیں گے، یہ لازماً انتشار پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ سوال اُٹھے گا کہ کیا چیز کتاب آئین میں لی جا سکتی ہے اور کیا نہیں؟ اگرچہ یہ پیش بندی کر لی گئی ہے کہ مجلس قانون ساز ہی کسی قانون کو منظور کرنے میں آخری مجاز ہوگی لیکن مقننہ کے ارکان تدوین قانون کے لئے بننے والے علماء کے کمیشن کی سفارشات کے خلاف جانے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ مقننہ کے کسی ممبر کے لئے علماء سے اختلاف کرنا ممکن نہ ہوگا کیوں کہ اس صورت میں ملّا[1] سے کافر یا کافروں کے زیرِ اثر و تسلط قرار دے گا۔"

"اساسی قوانین (. میں ایک دفعہ یہ ہے کہ پاکستان میں غلامی نہیں ہوگی۔ دوسری طرف اسلام نظامِ غلامی کو تسلیم کرتا ہے اور جنگ میں گرفتار شدہ افراد کو غلام اور لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ یہ صورت، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، شبہات اور انتشار پیدا کرے گی۔ [اس موقع پر میاں جعفر شاہ صاحب نے فاضل مقرر سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "کیا میں فاضل مقرر سے دریافت کر سکتا ہوں کہ آیا غلامی اسلام میں جائز ہے؟" مقرر نے دورانِ تقریر میں کہا:-]

"اس کا فیصلہ تو ملّا لوگ کریں گے۔"

"اسلامی ریاست تو ایک نصب العین ہے کوئی ریاست اسلامی ریاست نہیں کہلا سکتی جب تک کہ اس کا معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی نظام اسلامی نہ ہو۔ پاکستان ایسی ریاست نہیں ہے، پس (وزیرِ اعظم کو خصوصی توجہ دلاتے ہوئے) یہ ہم سب کا فرض ہے کہ ہم مکاری کا خاتمہ کر دیں۔ مکاری اسلام میں گناہ کبیرہ ہے۔ منافق پر قرآنِ مقدس میں خصوصی طور پر نفرین بھیجی گئی ہے۔ آؤ ایسا کریں کہ پاکستان ایک ایسی ریاست نہ بنے جو اسلامی ریاست ہونے کی مدعی ہو کیوں کہ وہ درحقیقت یہ نہیں ہے۔"

"اسلام کو بالعموم پاکستان میں سیاسی اغراض کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ حکمران پارٹی ایسی ترقی دشمن طاقتوں کی حوصلہ افزائی نہ کرے جن کی ہمت اگر بندھائی گئی تو وہ ملک میں ایک متوازی حکومت قائم کر لیں گی — ایک متوازی عدلیہ، ایک متوازی انتظامیہ — جس کے زیرِ سایہ لوگوں کو کوڑے لگائے جائیں گے، ان کے اعضا کاٹیں گے اور وہ پتھر مار مار کر ہلاک کر دئیے جائیں گے۔"

میں نہیں سمجھ سکا کہ مسودۂ دستور کے مصنفین آخر کیوں اسے اسلامی ریاست پکارنے پر اتنا اصرار کر رہے ہیں جبکہ مشکل ہی سے خود اس مسودہ میں اسلام کا کوئی سراغ مل سکتا ہے۔ یہ بات نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونی دنیا میں بھی اسلام کے متعلق بہت برا تاثر پیدا کرے گی۔ اس طرح سرے سے اس کو اسلامی ریاست کہنے کا اعلان کردہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اس سے بچئے۔ اپنے حق میں مخلص بنئے، اپنے ملک کے حق میں مخلص بنئے اور اپنے دین کے حق میں مخلص بنئے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ ملک میں جا کر یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ یہ لوگ اسلام کے علمبردار ہیں۔ اس طرح آپ لوگ عوام کو سبز باغ دکھانے کے قابل ہو سکتے ہیں — ان سادہ عوام کو جو اسلام میں اندھا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ آپ اسلام کے نام پر کرتے ہیں۔

"مہربانی فرما کر مجھے بتائیے کہ اس (یعنی صدر اور نائب کے لئے مسلم ہونے کی شرط عاید کرنے والی دفعہ) کی ضرورت کیا ہے؟

---

[1] مقامِ عبرت یہ ہے کہ جس عنصر کو یہ ذہن اس شان سے گالی دیتا ہے، اسی کے اندر سے کچھ بزرگوں کی طرف سے خود فاضل مقرر کو اشیرباد حاصل ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ملک جس میں مسلمانوں کی آبادی کی غالب اکثریت ہو، اس میں ایک غیر مسلم صدر یا نائب صدر ہو سکتا ہے۔ یہ دفعہ عوام کی ذہانت کی توہین ہے۔ ــــ اقلیتوں کی خواہ مخواہ کی تذلیل ہے۔ لیکن آپ عجب یوں ان کی تذلیل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ان کی ایک تحسین بھی کرتے ہیں ــــ یہ کہ یہ ریاست جس میں اسلام کا بول بالا ہو گا، جہاں نظم و نسق کو اسلامی خطوط پر چلایا جائے گا، وہ سراسر اپنی دیانت، خوبی اور قابلیت کے بل پر ان اونچے عہدوں تک جا پہنچنے کے اہل ہیں۔ کیوں کہ آپ نے اس امکان کا سدِباب کرنے کے لئے ہمارے حق میں ایک تحفظ کا اضافہ کیا ہے۔"

"میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اسلامی قوانین کی تعبیر کا معاملہ محترم اربابِ مذہب پر چھوڑا گیا تو یہ صورت لاینحل مشکلات پیدا کر دے گی۔ یہ دفعہ سخت خطرناک امکانات سے مملو ہے۔"

[اس مرحلے پر وزیرِ قانون نے مقرر کو توجہ دلائی کہ وہ مسودہ کی جس دفعہ نمبر ۱۹۳ کا حوالہ دے رہے ہیں وہ ایک مستقل دفعہ ہے اور اس کی تعبیر کو علماء پر نہیں چھوڑا گیا۔ مقرر نے دورانِ تقریر ہی میں جوابی بات کہہ دی۔]

"مجھے افسوس ہے کہ وزیرِ قانون نے میرا نکتہ اخذ نہیں کیا۔ نکتہ یہ ہے کہ مسودہ میں ایک دفعہ ایسی ہے جو کہتی ہے کہ صدرِ ریاست کو مسلم ہونا چاہئے۔ لیکن کون یہ فیصلہ کرنے والا ہو گا کہ مسلم کون ہے .... مشکل اس وقت پیدا ہو گی جب آپ کو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ صدرِ ریاست کو اسلام کے کس فرقے سے وابستہ ہونا چاہئے۔ کیا اسے حنفی مسلم ہونا چاہئے، ایک وہابی مسلم، ایک شیعہ مسلم، یا ایک قادیانی مسلم؟ تعبیر کی یہ پیچیدگی، جیسا کہ کل یہاں بیان کیا گیا ہے، وہی مشکل پیدا کرے گی جو پنجاب میں اتنے بڑے خون خرابے کا موجب ہوئی تھی۔"

"یہ انتہائی مہمل بات ہے کہ جانبِ مقابل کے مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں، ہر طرح کے انتظامی امور کو ان کے ساتھ زیرِ بحث لاتے ہیں، نظم و نسق میں ان کو حصہ دیتے ہیں اور ان کی مدد سے اسلامی قوانین کو ترتیب دیتے ہیں اور پھر اس سب کچھ کو خالص اسلامی اور مطابقِ معمول قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب ہم مخلوط انتخاب کے سوال پر ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے بحث چھیڑتے ہیں تو ہمیں ہندوؤں اور کمیونسٹوں کے آلۂ کار کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔"

"ملک کو اسلامی ریاست کا نام دے کر آپ ہندوستان کے مسلمانوں کے مفادات کو سخت خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ کیا ان کی طرف سے آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ ــــ کیا آپ ان سے اپنے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔"

آپ بھول جائیے اس بات کو کہ یہ الفاظ حسین شہید سہروردی نام کے ایک بزرگ نے جو جناح عوامی لیگ کے لیڈر ہیں، بحیثیت رکنِ دستور یہ ہمارے سب سے بڑے ایوان میں اپنی زبانِ مبارک سے صادر فرماتے ہیں۔ آپ یوں سوچئے کہ یہ ہمارے اندر کا ایک خاص رجحان بول رہا ہے، یہ ایک نظریہ کی آواز ہے، یہ ایک طبقے یا عنصر کا اظہار ہے۔ اس طبقے یا عنصر یا ذہن کا تجزیہ کیجئے تو حسبِ ذیل قابلِ غور پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱۔ یہ ذہن ایک افسوس ناک ننگے تضاد کا شکار ہے۔ یعنی یہ دو ٹکراتی باتیں بیک دم کہتا ہے: ایک یہ کہ "ہم تہ دل سے اسلام پر ایمان رکھتے ہیں"، دوسرے یہ کہ "پاکستان کو اسلامی ریاست نہیں ہونا چاہئے، اسے ایک غیر اسلامی ریاست بن کر کام کرنا چاہئے"۔

۲۔ یہ پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دیئے جانے کے لئے حسبِ ذیل دلائل پیش کرتا ہے: (ا) ــــ زیرِ بحث مسودۂ دستور کے نفاذ سے

پاکستان اسلامی ریاست نہیں بن سکتا (اور یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ اس میں کیا ترامیم و اضافے ہونے چاہئیں کہ اس کی بنیاد پر اسلامی ریاست استوار ہوسکے)۔ ب — پاکستان کو اسلامی ریاست کا نام اسوقت تک دینا جائز نہیں جب تک لوگ معاشی مشکلات میں مبتلا ہیں اور جب تک اقتصادی دائرے میں بے جا اونچ نیچ موجود ہے۔ (یعنی پہلے عملاً ایک ریاست کو اسلامی خطوط پر اپنی ساری تعمیر تو مکمل کر لینی چاہئے اور پھر اس کے بعد کہنا چاہئے کہ ہم "اسلامی" ہوں، کیوں نہ اس اصول کو فرد پر بھی چلایا جائے کہ جب تک ایک شخص عملاً معیاری مسلمان نہ بن جائے وہ کلمۂ اسلام پڑھنے اور اپنے آپ کو مسلم کہنے سے باز رہے؟ — کیا یہی صورت خود مقرر یا اس کے طبقے کے دوسرے افراد اپنے لئے اختیار کئے ہوئے ہیں؟ — نہیں بخلاف اس کے وہ تو دھڑلے سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اسلام پر تہِ دل سے ایمان رکھتے ہیں) ج — ریاست کو اسلامی قرار دینے سے انتشار پیدا ہوگا (یعنی اسلام آئے تو وہ وجہ انتشار، اور کفر کا دور دورہ ہو تو وہ امن اور شانتی کا ضامن!)۔ د — مسودۂ دستور میں چونکہ اسلام کا نام و نشان موجود نہیں ہے۔ اس لئے جائز نہیں کہ ریاست کو اسلامی کہا جائے۔ (سوال یہ ہے کہ فاضل مقرر اور ان کے ہم فکر عنصر نے اس مسودہ میں اسلام کا نام و نشان پیدا کرنے کے لئے کیا ترامیم و تجاویز دی ہیں؟) ر — اسلامی ریاست اس لئے بھی نہیں ہونی چاہیے کہ حکمران حضرات اسلام پر اعتقاد رکھنے والی پبلک کو اسلام کے نام پر فریب دیتے پھریں۔ (یہ اعتراض تو ہر اچھی چیز پر اٹھایا جا سکتا ہے، مثلاً جمہوریت کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت نہیں اختیار کی جانی چاہئے اور پاکستان کو جمہوری ریاست نہیں قرار دیا جانا چاہئے، ورنہ حکمران طاقت جمہوریت کا نام لے کر عوام کو دھوکا دے گی)۔ س — اسلام اور اسلامی قانون کی تعبیر اور مسلم ہونے کی تعریف میں اختلافات برپا ہوں گے۔ (اور کس چیز میں یا کس نظریے کے تحت اختلافات نہیں ہوتے؟) نیز ان امور میں علمائے اسلام کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ (سوال یہ ہے کہ دنیا میں جو بھی نظام چلتا ہے اس کے نظریہ و قانون کا علم رکھنے والوں کی اہمیت بڑھتی ہے۔ کیا اس سے بچنے کے لئے یہ طے کیا جائے کہ اسلامی امور میں صرف وہی رائے دے گا جو اسلام سے جاہل ہوا کرے۔ ص — اسلامی ریاست بننے میں ہندوستانی مسلمانوں کا مفاد غارت ہو جائے گا (اور اگر کل کلاں ہندوستانی مسلمانوں کا مفاد اس کا تقاضا کرنے لگے کہ ہم سب مرتد ہو جائیں تو؟)

(۳) اس ذہن میں اسلام کی جو ڈراؤنی تصویر سنی سنائی باتوں اور مستشرقین کی تحقیقاتوں نے بھر دی ہے، وہ ان اجزا پر مشتمل ہے: (ل) اسلامی ریاست ہوگی تو جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنایا جائے گا۔ (ب) لوگوں کو کوڑے لگیں گے، ہاتھ کاٹے جایا کریں گے اور پتھر مار مار کر ان کو ہلاک کیا جائے گا (ج) ترقی دشمن طاقتیں زور پکڑیں گی اور وہ متوازی عدلیہ و انتظامیہ قائم کر لیں گی۔ یہ ہیں معلومات اسلام کے متعلق اس ترقی پسند ذہن کی اور یہ ہے مطالعہ اس دین کا جس پر تہِ دل سے ایمان رکھنے کا ادعا کیا جاتا ہے۔

(۴) سب سے بڑی الجھن اس ذہن کی یہ ہے کہ یہ اسلامی ریاست قائم ہونے کی صورت میں اس امر کا خطرہ درجۂ اول پر محسوس کرتا ہے کہ اسلام پسند عنصر آگے بڑھے گا اور اقتدار پر دو صدیوں سے قائم شدہ اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اس خطرے کی وجہ سے اس ذہن میں ایک چڑ سی اسلام پسند طاقتوں کے حق میں پیدا ہو گئی ہے اور اس چڑ کا اظہار اس انداز گفتگو سے ہوتا ہے کہ ان طاقتوں کو "ملا" اور "ترقی دشمن" ہونے کی گالی دی جاتی ہے۔ اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ اختلاف اور انتشار کا موجب ہوں گی۔ یہ ایک طرح کا تعصب بول رہا ہے، ایک طرح کی منفی ضد، ایک طرح کی رقابت اور ایک طرح کا حریفانہ جذبہ — بلکہ ایک نوع کا احساس کمتری ہے جو نمایاں ہو رہا ہے۔ اس ذہن کی ساخت میں ایک ٹیڑھ ہے جو اسے دوسری طاقتوں کو کھلے دل سے سمجھنے اور ان سے تعاون کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ یہ ذہن کسی بڑے سے بڑے تخریبی اقدام کے لئے غیر مسلموں سے، کمیونسٹوں سے، غیر ملکی طاقتوں سے تو ساز باز کر سکتا ہے، لیکن تعمیری کام کے لئے اپنے ہی اندر کے دینی عناصر سے کوئی تعاون نہیں کر سکتا۔

(۵) اس ذہن کے مجہول پن کا عالم یہ ہے کہ اس کے نزدیک (ا) اسلام کسی متعین اصول، ضابطہ یا نظام کا نام نہیں اور اس کے اندر کوئی ایسی بنیادیں نہیں، جن پر اتفاقِ رائے ہو سکے، یہ ایک مبہم تصور اور ایک غیر متعین فکر ہے۔ (ب) "مسلم" کی کوئی تعریف ایسی نہیں کی جا سکتی ہے جس پر ایک ریاست کا کام چلایا جا سکے، یعنی سرے سے وہ شے ہی نامعلوم ہے جو کسی کافر کو مسلم بناتی ہو اور کسی مسلم کو دائرۂ اسلام سے نکال دیتی ہو۔ یہ کسی چیز کے ابہام اور کسی لایعنی پن کی آخری حد ہے جسے اسلام کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔

(۶) یہ ذہن دوسروں کے تصورِ اسلام پر تو کڑی تنقید کرتا ہے، مگر خود کوئی تصورِ اسلام مثبت طور پر پیش نہیں کرتا، نہیں بتاتا کہ اس کا اسلام کون سا ہے اور کیسا ہے جس پر وہ تہِ دل سے ایمان رکھتا ہے۔ اس اسلام کے لئے انفرادی زندگیوں میں کیا کیا جا رہا ہے۔ اور اجتماعی دائرے میں اس کے قیام و نفاذ کے لئے کون سے اقدامات کئے گئے ہیں۔ وہ بس یہ کہتا ہے کہ دوسروں کا تصورِ اسلام چوں کہ ناقص ہے اس لئے اسے ترک کر کے لادینیت کو اختیار کر لینا چاہئے۔

(۷) اس ذہن کو اس بات کا پورا پورا شعور ہے کہ ملک کے عوام اسلام پر اعتقاد رکھتے ہیں —— اگرچہ وہ بغض بھرے انداز میں اسے "اندھا اعتقاد" کہتا ہے۔ لیکن وہ عوام کے اس اعتقاد سے ٹکرانا چاہتا ہے اور جو کوئی اس اعتقاد کا کسی قدر بھی لحاظ کرنے پر آمادہ ہو جائے اسے طعنہ دیتا ہے کہ تم عوام کو فریب دے کر اپنا سیاسی مفاد بنانے کے درپے ہو۔

یہ ہے وہ ذہن (مقرر کی انفرادی شخصیت کو درکنار رکھ کر) جو برابر آٹھ سال سے پاکستان کے اسلامی رجحانات کے خلاف برسرِ کشمکش ہے جس نے اسلامی خطوط پر دستور سازی کے کام میں مسلسل روڑے اٹکائے ہیں جس نے سابق دستوریہ کی برطرفی میں بڑا بھاری پارٹ ادا کیا ہے، جو ملک کو جمہوری خطوط سے ہٹا کر آمریت کی طرف لے جانے کے درپے رہا ہے اور جس نے اسلام کے حق میں کبھی کسی پوائنٹ پر دوسروں سے سمجھوتہ کر کے نہیں دیا۔ اس کے نزدیک پاکستانیوں کے اور سارے باہمی رشتے اہم اور محترم ہیں، لیکن ایک رشتۂ اسلام ہی ایسا ہے جو اس کی نگاہ میں بے وقعت ہے۔

اب آیئے مقابل کے دوسرے ذہن کا جائزہ لینے کے لئے ایک اور تقریر کے اقتباسات پر غور کیجئے:۔

- "پاکستان برصغیرِ ہند و پاک کے مسلمانوں کی اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے لئے ایک ایسا ملک حاصل کریں جس میں انہیں اپنے مخصوص نظریۂ زندگی اور اپنی تہذیبی و تمدنی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکے۔ .... یہ تھا اصل مقصد قیامِ پاکستان کا، اور آج بھی قوم کے اندر اپنے تہذیب و تمدن کو ترقی دینے، اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو نشو و نما دینے اور ایسی فضا پیدا کرنے کی خواہش کارفرما ہے جس میں اسلامی روح پروان چڑھ سکتی ہو۔ یہی خواہش پاکستان کے بقا کی ذمہ دار اور پاکستانی عوام کے اندر زندگی و حرارت پیدا کرنے کی محرک ہے۔ اس آزادی اور اس خواہش کی ہر حال میں ہمیں حفاظت کرنی ہے۔ ہم صرف اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ہی اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔"
- "کوئی باعزت اور خوددار آدمی اپنے والدین سے لاتعلقی کا اظہار نہیں کرتا۔ ہر درخت اپنے بیج سے ابھرتا ہے، اسی سے بڑھتا ہے اور برگ و بار لاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا آغاز ایک چھوٹے سے بیج سے ہو، لیکن کئی برس بعد اس کی شاخیں پھوٹتی ہیں اور پھل آتا ہے۔ اس وقت لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی اصل قدر و قیمت کیا تھی۔"
- "جناب والا! پیشتر اس کے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کی اصل روح اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اس ملک میں جلوہ گر ہو ہمیں [illegible]"

"یہ کس طرح ممکن ہوا کہ پندرہ سو میل کے فاصلے کے باوجود مشرقی اور مغربی دو خطوں میں بسنے والے مسلمان مل کر ایک ملک بن گئے؟ کس طرح ہم نے جغرافیائی حد بندیوں کو مسخر کر لیا؟ اس کی ایک وجہ وہ اسلامی روح ہے جس پر دونوں حصوں کے لوگ ایمان رکھتے ہیں — ہاں وہی اسلام، جو جغرافیائی اور اس نوعیت کے تمام امتیازات سے ارفع و اعلیٰ ہے!"

"دونوں حصوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنا، اور ایسی باتیں کرنا جن سے دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوں اور بڑھیں، اس قیمتی آزادی کو خطرے میں ڈالنے کے ہم معنی ہے جو ہم نے تاریخ کی عظیم الشان قربانی دے کر حاصل کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ فضا ہم سے چھن جائیگی جسے اپنی تہذیب کی نشوونما اور اسلامی روح کے پنپنے کے لئے ہم نے فراہم کیا ہے۔"

"ہمارا نصب العین معاشرت، قانون اور انسانی روابط کے تمام شعبوں میں اسلامی روح اور اسلامی تہذیب و تمدن کا نشوونما ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اسلام صرف بندے اور خدا کے درمیان ذاتی تعلق تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔ اس کی روح تمام دائروں میں سرائت کرتی ہے۔"

"اگرچہ ہم ابھی تک اسلام سے بہت دور ہیں اور فی الحقیقت ہم بہت ناقص مسلمان ہیں — اور شاید میں سب سے زیادہ ناقص ہوں — لیکن ہم اس کی اصل روح کو حاصل کرنے کے معاملے میں کبھی جذبۂ کبر و تعلّی سے کام نہیں لیتے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اس کے لئے کم و بیش جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ ہمارے درمیان اختلافات ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم یہ ... احکام اسلام کے متعلق کسی خاص فرقے کی تعبیر سے اتفاق نہ کرے۔ لیکن اسلام نے ہم پر صرف مشورہ و تفکر لازم ٹھہرایا ہے، اپنی رائے کو دوسروں پر ٹھونسنا نہیں سکھایا .... ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ انتہا پسندی اور بے صبری کا ثبوت دیں۔ ایسی صورت میں سب کا فرض ہے کہ وہ اس چیز سے صرف نظر کر کے اسلامی احکام کو اپنے معاشرے، اپنی قومی زندگی اور اپنے قوانین میں عملاً اختیار کرنے کے لئے کوئی متفقہ راستہ نکالنے کی کوشش کریں۔"

"خدا کے احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا، امن و سلامتی، صبر و تحمل، خیر سگالی، انصاف اور بھائی چارہ اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ اگر ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو اس نقطۂ نظر سے ادا کرنے کی کوشش کریں تو چاہے ہمارے طریقِ کار میں خامیاں ہوں اور چاہے ہماری ترقی کی رفتار سست ہو۔ پھر بھی ہم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کے مقصد کی جانب بڑھ رہے ہوں گے جو ہمارے موجودہ معاشرے سے بہرحال بہتر ہوگا۔"

"ہمارا معاشرہ معاشرتی، اقتصادی اور دوسری تمام قسموں کی بے انصافیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں اوپر سے لے نیچے تک ناجائز مفاد رکھنے والے عناصر پائے جاتے ہیں، اور اگر ہم اسلام کے احکام کے مطابق کام کریں گے تو ہمیں متعدد ایسے اقدامات کرنے پڑیں گے جن کو فوری طور پر بہت سے لوگ ناپسند کریں گے۔ دنیا میں کوئی عمدہ نصب العین حاصل کرنے کی کوشش کبھی بھی بغیر اس کے نہیں کی جا سکتی کہ اس میں بعض لوگ مخالفت نہ کریں۔ لیکن ہمیں اس سے بددل نہیں ہونا چاہئے بلکہ امید رکھنی چاہئے کہ ایک جمہوری ملک میں جہاں لوگوں کو اپنے خیالات کے اظہار کی پوری آزادی ہو، اور ایک ایسے معاشرے میں جو اگرچہ اسلامی نقطۂ نظر سے بہت ناقص ہو مگر پھر بھی اسلامی ہو، اگر ہم نے جدوجہد جاری رکھی تو لامحالہ ہم اپنے آپ کو آہستہ آہستہ ایک بہتر اور زیادہ قابلِ احترام معاشرے میں بدل سکیں گے۔ یہ وہ روح ہے جس کے ساتھ اس کام کو ہم نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اس سے ہمارے پیشِ نظر تعریف کرانا نہیں ہے۔ بلکہ ہم اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے پاکستان قائم ہوا تھا"

"حزبِ اختلاف کے قائد نے کل اپنی تقریر میں اعلیٰ اصول و مقاصد کا ذکر بڑی وضاحت سے کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم ایک صحیح اسلامی معاشرے سے بہت دور ہیں۔ لیکن ان کی تقریر میں ایک واضح تضاد تھا۔ ایک طرف تو انہوں نے کہا کہ ہم کسی معنی میں اسلامی کہلانے کے مستحق نہیں ہیں، لیکن دوسری طرف انہوں نے ایک اسلامی معاشرے کی انتہائی تاریک تصویر کھینچ ڈالی جس میں اقلیتوں کے ساتھ ناانصافیاں کی جاتی ہیں، غلامی عام ہوتی ہے، لوگوں کے اعضا کاٹے جاتے ہیں اور نہ جانے اور کیا کیا ہوتا ہے۔"

"ہمیں اسلام کی صحیح روح کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ ممکن ہے کہ آج ہم اس کے لئے نااہل ہوں لیکن ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم اس کی اطاعت کرنے کی خواہش کا اظہار کریں۔ آج اگر کسی سے پوچھا جائے کہ آیا وہ مسلمان ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ ہاں میں مسلمان ہوں — باوجودیکہ وہ اپنے دل میں اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ ایک مسلمان ہونے کے لحاظ سے اس میں کتنی خامیاں ہیں۔ وہ اپنے دل میں ڈر سکتا ہے کہ ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم   کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

ہر سچے مسلمان کا دل اسے کہہ سکتا ہے کہ سچا مسلمان ہونے کا جو دعویٰ وہ کر رہا ہے اس میں بہت مبالغہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جب کسی شخص سے پوچھا جائے کہ آیا وہ مسلمان ہے تو وہ اپنے دل میں اس بات پر ندامت محسوس کرے کہ وہ اسلام کے صراطِ مستقیم سے کس قدر ہٹا ہوا ہے اور اس کی زندگی ایک سچے مسلمان سے کس قدر مختلف ہے۔ یہی حال ہمارے معاشرے کا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اس مقصد کے لئے کوشش کرنا ہی دراصل زندگی کا اصل مقصد ہے۔"

"ہم ایک مشکل راستے پر سفر کر رہے ہیں اور پہلے ہی ہماری راہ کی مشکلات اتنی زیادہ ہیں کہ بھلا اس میں اظہارِ کبر سے مزید اضافہ کر لینا بہت بڑی حماقت ہوگی۔ اس لئے ہم سب کو عاجزی اور انکسار کے ساتھ ایک بہتر معاشرے کی تعمیر کے کام میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔"

یہ ہے اس دوسرے ذہن کی خود پیش کردہ تصویر جو ہمارے معاشرے کی اکثریت میں کارفرما ہے۔ ان الفاظ کو اگرچہ ہمارے وزیرِ اعظم جناب چودھری محمد علی کی زبان نے ادا کیا ہے، لیکن یہاں سوال موصوف کی ذاتی شخصیت کا نہیں، بلکہ وہ ذریعۂ اظہار بنے ہیں اس اجتماعی ذہن کی ترجمانی کا جو بہ حیثیت ملت ہمارے اندر زندگی کی ایک نئی حرکت پیدا کر رہا ہے۔ اس ذہن کا تجزیہ کریں تو حسبِ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:-

(۱) پاکستان جس مقصدِ وجود پر قائم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس خطۂ ارضی میں ہم مسلمان اپنے نظریے اور اپنی روایات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اپنے تمدنی و تہذیبی نظام کو استوار کر سکیں۔

(۲) جس طرح کوئی غیور اور حساس فرد اپنے ماں باپ سے تعلق توڑ نہیں سکتا اور جس طرح ایک درخت کا تصور اس کے بیج سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ہم بہ حیثیت مسلمان قوم کے اپنے نظریۂ حیات اور اپنے نظامِ زندگی سے تعلق توڑ نہیں سکتے۔

(۳) اسلام کے تصور اور اس کی تفصیلی تعبیرات میں ہمارے درمیان اختلافات ہو سکتے ہیں، لیکن چونکہ احیائے اسلام کا کام کرنا ہماری ذمہ داری ہے اس لئے طریقِ کار یہ ہے کہ شورہ و بحث کے ذریعے ہم ہر معاملے میں متفقہ لائحہ عمل بنا کر آگے بڑھتے جائیں۔

(۴) ہمارا موجودہ معاشرہ اور ہماری ریاست اس وقت بالفعل اسلامی نہیں ہے اور اس میں ہر طرح کے مفاسد بھرے پڑے ہیں، لیکن اس کے اندر چونکہ اسلامی اصولوں کے مطابق اپنی اصلاح و تعمیر کرنے کا عزم موجود ہے اور ایک اسلامی معیار کو حاصل کرنے کی خواہش کارفرما ہے اس لئے بجا طور پر اسے حق پہنچتا ہے کہ یہ اپنے مسلم ہونے کا اظہار کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مسلمان ناقص مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنے مسلمان ہونے کا انکار نہیں کر سکتا بلکہ اسلامیت کا ادعا کرنے میں ندامت محسوس کرنے کے باوجود وہ یہی ادعا کرنے پر مجبور ہے۔ یہ چیز فرد میں بھی اور معاشرے میں بھی احساسِ ذمہ داری اور ذوقِ اصلاح پیدا کر سکتی ہے۔

(باقی بر صفحہ ۱۲)

"کم سُخن"

م ۔ نسیم

"ارے میاں صاحبزادے ۔۔۔ ذرا رُکنا"

"؟"

"بھئی دل نہیں مانا یہ صورت دیکھ کر ۔۔۔ کیوں میاں ۔۔۔ کیا تم حمید اللہ خاں کے لڑکے ہو؟"

"جی ہاں السلام علیکم"۔

"دیکھنا! دل کہہ رہا تھا میرا۔ وعلیکم سلام وعلیکم سلام۔ جیتے رہو بیٹا واہ واہ ۔ بھئی خوب ملاقات ہوئی ۔ مجھے پہچانا؟"

"؟"

"بھلا تم پہچان بھی کیسے سکتے ہو ۔ بہت چھوٹے تھے تب تو مگر کیا شباہت پائی ہے ۔ عین مین باپ کی صورت ہو۔ میاں، میرا تمہارے والد سے بچپن کا دوستانہ تھا ۔ پھر میں ٹھیکے داری کے جھگڑوں میں پڑ گیا۔ ادھر چلا آیا۔ وہ بے چارے وہیں رہے۔ بس ان کے انتقال کی اطلاع ملی ادھر میں دل پکڑ کر رہ گیا ۔۔۔ کوئی آٹھ برس تو ہو چکے ہوں گے؟"

"جی ہاں"۔

"مگر صاحب آہا ہا بھئی کیا آدمی تھے، اللہ بخشے ۔ واہ واہ کیا غیرت تھی، کیا شرافت تھی ۔ ایسے وضع دار لوگ اب کہاں کیسے ہی تنگ دست رہے، مگر کبھی کسی کی مدد قبول نہ کی ۔ میاں میں تو لڑ بیٹھتا تھا۔ اصرار کرتے کرتے تھک جاتا تھا ۔ مگر شاباش ہے ان کی وضعداری کو ۔ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے ۔ کبھی کچھ نہ لیا ۔۔۔ بھئی تم تو ہو بہو باپ کی جوانی کی تصویر ہو۔ کیا، یہیں آ گئے ہو؟"

"جی ہاں"۔

"کب سے؟ کیا کافی دن ہو گئے؟"

"جی ہاں"

"اچھا ۔۔۔ ادھر کیسے آئے؟"

"جی، جمعہ کی نماز پڑھنے"۔

"اچھا؟ اسی مسجد میں پڑھی ہے کیا؟"

"جی ہاں"

"شاباش ۔ جیتے رہو ۔ میں بھی تو پڑھ کر آ رہا ہوں ابھی ۔ ذرا نفلوں میں دیر لگ گئی ۔ میاں، آج کل کے نوجوانوں کو تو اللہ رسولؐ کے نام سے کوئی مطلب ہی نہیں رہا ۔ جوانی کی عبادت تو بڑی بھاری سعادت ہے ۔۔۔ اور میاں، جا کہاں رہے ہو اس وقت؟"

"جی، صدر تک"

"کیوں؟ کوئی کام ہے کیا؟"

"جلسے میں جانا ہے"۔

"کہاں ہے جلسہ؟"

"جہانگیر پارک میں"

"جہانگیر پارک میں؟ ارے میاں یہ وہ "اسلامی دستور" والوں کا جلسہ تو نہیں ہے؟"

"جی"

"بھئی میاں صاحبزادے ۔ تم اُن میں کہاں جا رہے ہو بھلا ۔ بھائی میرے ۔ بڑا بُرا وقت ہے ۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا ۔ آج کل تو سننے والے بھی دھر لئے جاتے ہیں ۔ ہے کہ نہیں؟"

"جی ۔۔۔"

"یہ! ۔۔۔ میاں تم خود سمجھدار ہو ۔ ایسے معاملوں میں تو بڑی احتیاط

کی ضرورت ہے۔ اور یہ سیاسی لوگ تو بھائی بڑے بے ڈھب لوگ ہیں بھلا بتاؤ، حکومت سے اُڑ رہے ہیں۔ ان سے تو اور بھی بچ کے رہنا چاہئے ——— یہ اتنے کاغذ کیسے ہیں ہاتھ میں؟"

"اشتہار ہیں"

"اشتہار؟ کیسے اشتہار"

"جلسے کے"

"کیا اُسی جلسے کے؟"

"جی"

"اتنے اشتہار کیا کرو گے؟ کیا بانٹنے ہیں؟"

"جی ہاں"

"اوہو۔ تو میاں انہوں نے تمہیں بھی بے کار دیکھ کر گانٹھ لیا ہے۔ کیا کوئی کام دام نہیں کرتے آج کل؟ والد صاحب کے انتقال کے بعد پڑھنا تو چھوڑ دیا ہوگا؟"

"جی نہیں"

"کیا دسویں پاس کرلی؟"

"جی"

"اچھا؟ ماشاءاللہ ——— میاں اُن کے بعد تو تمہارا گزارہ ہونا بھی مشکل تھا۔ بڑی ہمت کی۔ پھر؟ کوئی کام کاج کیا؟"

"جی نہیں"

"تو؟"

"پڑھتا رہا"

"اچھا؟ پڑھتے رہے؟ کیا انٹر بھی کرلیا؟"

"جی ہاں"

"پھر کیا بی۔اے بھی کیا؟"

"جی نہیں۔ بی کام"

"اچھا بہت خوب۔ مگر میاں شاباش ہے تم کو۔ بڑی ہمت سے کام لیا۔ آج کل کے لڑکے تو ذرا سی تنگی ترشی سے اتنا گھبرا جاتے ہیں کہ میٹرک کرتے ہی نوکری کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں ——— پھر میاں کیا کام کیا تم نے؟"

"جی۔ پڑھتا رہا"

"پڑھتے رہے! اور پڑھتے رہے؟ تو یعنی ایم اے بھی کرلیا؟"

"جی نہیں۔ ایم کام"

"غضب خدا..... میرا مطلب ہے سبحان اللہ۔ بھئی تم نے تو کمال کر دیا میاں ——— مگر پھر یہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ ناسمجھ لڑکوں کی طرح اشتہار کیسے لئے پھر رہے ہو؟ یعنی ماشاءاللہ ایم کام ہو کر؟"

"جی، تقسیم کرنے ہیں"

"تقسیم کرنے ہیں؟ ارے بھائی کیا تم ہی رہ گئے تھے یہ تقسیم کرنے کو؟"

"جی نہیں۔ دوسرے بھی کر رہے ہیں"

"افوہ! میاں، دوسرے کرتے ہیں تو کرنے دو۔ تم کیوں کر رہے ہو، تم تو ایم کام ہو۔ یعنی ماشاءاللہ جو کام چاہو کر سکتے ہو۔ ایک سے ایک بڑی بزنس۔ ہے کہ نہیں؟"

"جی ———"

"اور بزنس کے بجائے تم یہ اشتہار بانٹتے پھر رہے ہو؟ اور وہ بھی ایم اے۔ میرا مطلب ہے ایم کام ہو کر! ——— اچھا الّو بنایا انہوں نے تم کو۔ آخر کس نے تم کو یہ کام کرنے کا مشورہ دیا تھا؟"

"جی۔ ہم نے خود ہی طے کیا تھا"

"ارے بھائی۔ سب نے طے کیا تھا۔ تم کو تو نہیں کرنا چاہیے تھا تم تو ایم کام ہو ——— بھلا بتاؤ تو، ابھی میں نے ہی دیکھا ہے۔ اگر کوئی اور، اللہ بخشے تمہارے والد کی جان پہچان والا دیکھ لیتا تو کیا کہتا۔ اچھا، پھر یہ ایم کام ہو کر کہیں اکاؤنٹنٹ وغیرہ کچھ ہوئے یا نہیں؟"

"جی نہیں"

"بھئی حد ہو گئی۔ یعنی پھر اس تعلیم کا فائدہ؟ بھائی میرے، یہ اشتہار ہی بانٹنے تھے تو پڑھنے کی دردسری کیوں مول لی تھی آخر؟ ——— !!

تمہیں دیکھ کر تمہارے والد آنکھوں میں پھر گئے تھے۔ کیسی باتیں ہوتی تھیں تم بچوں سے متعلق۔ کیسی اُمنگیں تھیں دل میں کیا کیا اُمیدیں باندھا کرتے تھے ہم لوگ۔ پھر بہن ٹھیکے داری میں پھنس کر بالکل اُسی کا ہو گیا۔ اور وہ بے چارے وہیں رہ گئے۔ سب شادی بیاہ کی باتیں ہوا ہو گئیں۔ کیا زمانے تھے وہ بھی ——— خیر، تو میاں اب تم کوئی کام کاج کرو۔ ماشاء اللہ جوان ہو۔ تندرست ہو۔ ہاتھ پیروں میں طاقت ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایم کام ہو۔ کیا نہیں کر سکتے۔ کیوں کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

"جی، نہیں —"

"یہی تو۔ میاں ویسے تو ایک سے ایک پڑھا لکھا آج کل پڑا پھرتا ہے۔ مگر تم اب تک گورنمنٹ میں کسی کام میں ہوتے تو بہت اونچے پہنچ گئے ہوتے ——— خیر۔ اللہ جو کچھ کرتا ہے، بہتر ہی کرتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ میں جلد ہی کوئی انتظام کرا دوں گا۔ سپلائی کے محکمے میں اپنی کافی جان پہچان ہے بس ذرا افسر لوگوں کو خوش کرنا ہو گا۔ مگر اس کی بھی فکر نہ کرو۔ سب ہو جائیگا۔ دفتر تو تم نے دیکھا ہی ہو گا۔ صدر ہی میں تو ہے۔ دیکھا ہے نا؟"

"جی ہاں — مگر"

"بس بس۔ تب ٹھیک ہے۔ اچھا خیر، یہ تو رہا ——— لو آؤ میرے ساتھ چلو۔ تمہاری چچی سے ملا دوں۔ بھئی تمہارے والد مرحوم سے تو، خدا انہیں غریقِ رحمت کرے، بالکل بھائیوں کی طرح ملنا جلنا تھا۔ بہت خوش ہوں گی تمہاری چچی تم سے مل کر۔ اور ریحانہ بھی۔ مگر وہ تمہیں بھلا کیا یاد ہو گی بہت بچپن کی بات ہے۔ لیکن میری بچی کو شاید یاد آ جائے۔ ماشاء اللہ بڑی تیز ہے۔ آ گئی ہو گی اب تو کالج سے ——— آؤ میاں۔"

"جی، میں وہ جلسے میں ......"

"ہاں ہاں۔ میں بھولا۔ جلسے میں جا رہے تھے۔ اچھا اچھا۔ مگر دیکھو میاں۔ تھوڑی دیر سُن سُنا کر چلے آنا۔ اِن کے جلسے وَلسے سے تو اپنے آپ کو الگ ہی رکھو۔ بے کار حکومت کو شک ہوتا ہے۔ سی آئی ڈی بھی دُم کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ کیوں۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

"جی نہیں تو ———"

"تو میاں۔ اب ان فضول باتوں کو چھوڑو۔ اور اپنے والد کا نام روشن کرو۔ کوئی کام کر کے ——— تو۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ پورا پتہ وغیرہ سب لکھا ہے۔ ایسا کرنا۔ کل صبح نو بجے میرے پاس آ جانا، ملنا ملانا بھی ہو جائے گا۔ وہیں سے دفتر چلے چلیں گے۔ ٹھیک نو بجے — اور ناشتہ وہیں آ کر کرنا۔"

"جی۔ مگر میں —"

"اب اگر مگر کچھ نہیں۔ کوئی تکلف ہے کیا۔ تمہارا ہی گھر ہے۔ اور میاں اِس طرح پھرتے رہو گے، تو کام سے اور جی اُکتائے گا۔ بس تو یہ طے رہا — اور ہاں میاں ذرا سوٹ وغیرہ پہنا کرو۔ یہ شیروانی اچکن وغیرہ تو ہم بڈھوں کی چیز ہے۔ کل سوٹ پہن کر ہی دفتر چلنا ہو گا۔ تو کوئی تمہارے پاس ہے؟"

"جی، ہیں ——— مگر مجھے شیروانی پسند ہے۔"

"ہاں ہاں پسند تو بُری نہیں۔ یہ میں کب کہتا ہوں کہ نہ پہنو۔ مگر بھائی دفتروں میں تو سوٹ سے ہی رُعب پڑتا ہے ——— اچھا جلسے میں جا رہے ہو نا؟ صدر؟ چلو میں چھوڑتا چلوں۔ سامنے موٹر کھڑی ہے۔"

"جی نہیں۔ میں —"

"ارے میاں چھوڑو بھی تکلف ہم تم دو تھوڑا ہی ہیں۔ تم تو اپنے بچے ہو بالکل۔ بے کار پیدل جاؤ گے۔"

"جی نہیں۔ پیدل نہیں۔"

"بھئی تو رکشا، گاڑی پر سواری کے پیسے کیوں بے کار خرچ کرو گے۔"

"رکشا وغیرہ پر نہ جاؤں گا۔"

"ارے بھائی۔ پھر کیا ٹیکسی میں جاؤ گے؟"

"جی نہیں۔ کار میں۔"

"کار میں؟ کونسی کار؟"

"وہ"

"وہ! وہ نئی اسٹوڈی بیکر جو ——— جو میری گاڑی کے آگے کھڑی ہے؟"

"جی"
"کس کی ہے بھئی یہ؟"
"کمپنی کی۔"
"کمپنی کی؟ کس کمپنی کی؟"
"پاکستان اسٹیم شپ کمپنی کی"
"اچھا! مگر یہ اس میں بیٹھا کون ہے برقعے میں؟"
"جی میری بیوی ہیں"
"ہیں! بیوی؟ تو کیا ۔ کیا شادی ہو چکی تمہاری؟"
"جی ہاں"
"کب"
"سال بھر ہوا"
"اوہ ۔ تو کیا کمپنی میں لڑکی کے باپ ۔ میرا مطلب ہے کیا لڑکی کے کوئی رشتے دار ہیں کمپنی میں؟"
"جی نہیں۔"
"پھر کیا کمپنی نے گاڑی تم کو دے رکھی ہے؟"

"جی ہاں"
"جی ہاں! یعنی تم کو ۔ تم کو کمپنی نے گاڑی دے رکھی ہے ۔ کیوں؟"
"جی تینوں ڈائریکٹروں کو دی ہوئی ہے۔"
"ڈائریکٹروں کو! ڈائریکٹروں کو! یعنی کیا تم ۔ میرا مطلب ہے کیا آپ، اس کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں؟"
"جی ہاں"
"اوہ!"
"یہ ۔ یہ آپ کا کارڈ ہے۔"
"اوہ!!"
"اچھا۔ اب جاتا ہوں ۔ جلسے میں دیر ہو جائے گی"
"۔۔۔۔۔"
"سلام علیکم"
"ا۔ا۔ا"

۔۔۔۔ ×× ۔۔۔۔

بقیہ (سوچ بچار) دو ذہن ۔ آمنے سامنے

یہ تصویر ایک صاف اور صحت مند ذہن کی تصویر ہے (واضح رہے کہ پیش نظر ایک فرد کی شخصیت نہیں، بلکہ معاشرے کا ایک قومی رجحان اور ایک خاص عوامی عنصر ہے) اس کا جدھر سے بھی اور جس طرح کا بھی تجزیہ کیجئے، اس میں تضاد اور الجھنیں نہیں ملتیں، اس میں کسی کے خلاف کد اور چڑ اور تعصب اور رقابت کے جذبات متحرک نہیں نظر آتے، اس کے اندر تنگ ظرفی نہیں ہے اور تعاون کی اسپرٹ کا افلاس نہیں پایا جاتا۔ یہی ذہن ہے جو پاکستان کو اسلامی نقشے پر استوار دیکھنے کے لئے بے چین اور تعمیری اقدامات کے لئے برسر عمل ہے اور اسی کی وجہ سے قوم کے اندر ایک امنگ اور ایک حرکت کام کر رہی ہے۔ لیکن اس ذہن کا راستہ بار بار اور قدم قدم پر دوسرا اوپر والا ذہن روکتا رہا ہے۔ ایک ذہن مثبت نوعیت کا حامل ہے، دوسرا منفی نوعیت کا۔ ایک تعمیری ہے دوسرا تخریبی، ایک تعاون پسند ہے دوسرا تصادم کیش۔ ایک صحت مند دوسرا مریض۔ ان دونوں ذہنوں کی ترجمانی کرنے والے افراد بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ دونوں ابھی ابھی تک ان سے آمنے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور آج دستوریہ کے ایوان میں ہر آن برسر کشمکش ہیں۔

ان دونوں اجتماعی ذہنوں کو سامنے رکھ کر اور باریکی سے ان کا جائزہ لے کر پوری قوم اور اس کے سوچنے سمجھنے والے افراد کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کس کا ساتھ دیں، کس کے ہاتھ مضبوط کریں، کس سے اپنے آپ کو وابستہ کریں۔ دونوں میں سے کسی نہ کسی ایک کا زور توڑے بغیر ہم ترقی و تعمیر کی راہ پر ایک انچ نہیں بڑھ سکتے۔ اب آپ خود یہ رائے قائم کیجئے کہ دونوں میں سے کسے ختم کیا جائے اور کسے پنپنے کا موقع دیا جائے۔

(۹ فروری ۱۹۵۶ء)

نعتیہ
انورِ صد

اب پھر نزاعِ شیشہ و آہن قریب ہے
شبنم سے شعلۂ رُخِ گلشن قریب ہے

دیکھیں تو رنگ لاتی ہیں کیا بے زبانیاں
شعلہ نوائی لبِ سوسن قریب ہے

وارستگی و قید میں اب فرق کم رہا،
اپنا درِ قفس سے نشیمن قریب ہے

پھر کھل رہی ہے زلفِ درازِ غمِ حیات،
پھر کاروانِ نکہتِ گلشن قریب ہے

اے دردِ انتظار! پریدہ ہے رنگِ شب
اے وسعتِ شوق! صبح کا دامن قریب ہے

اسی ضیائی

◆

اثرِ جنونِ جفا طلب سے مذاقِ زیست بدل گیا
جسے ناگوار تھا خار بھی، وہ برائے دامن مچل گیا

جو نہ یاد آسکا عمر بھر، یہ کرشمہ ہے اسی عہد کا
نہ وفا کی دل سے خلش مٹی، نہ جنوں کا سر سے خلل گیا

ترے دورِ یاس و امید میں یہ دلِ تپاں وہ چراغ ہے
کبھی ظلمتوں سے جو بجھ رہا، کبھی اک شعاع سے جل گیا

وہی ایک بادہ ہے ساقیا، یہ ہے سب کا ظرف جدا جدا
کوئی بچتے بچتے بہک گیا، کوئی گرتے گرتے سنبھل گیا

جو فریضہ شیخِ حرم نشیں کے لئے تھا داخلِ بندگی
اُسے ٹال، اہلِ ہوس کے سر، بہ غلام صاف نکل گیا؟

ترے وعدے ٹوٹے ہیں اس قدر کہ ہر ایک تازہ شکست پہ
ہمیں یہ گماں ہے کہ وقتِ بد کوئی آکے خیر سے ٹل گیا!

نئے واعیاتِ زمانہ سے ہے کلامِ آسی رچا ہوا
کوئی اس کو سن کے نہ کہہ سکے گا کہ اب مانِ غزل گیا!

اختر واحد قاضی

◆

آہ! ناکامیوں کے سائے تلے
کچھ تمناؤں کے چراغ جلے

ہم نے درسِ حیات ان سے لیا
اب شکستوں پہ کون ہاتھ ملے

سوئے مقتل بھی ہم تو جائیں گے
ساتھ اگر میرِ کارواں بھی چلے

پرورش پا رہا ہے نورِ سحر
چاند تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے

گردشِ وقت کیا ہے اُن کے لئے
غمِ دوراں کی گود میں جو پلے

ولولے زندگی کے اے واحد
دب گئے ہیں غموں کے بوجھ تلے

محمد محسن

یہ رُتیح گھر ریز، گھٹائیں یہ سیہ فام — ہے یاس کے سایوں میں درخشانیٔ انجام
تقدیرِ محبت میں کہاں راحت و آرام — مضطر صفتِ شعلہ ہے، گرداں صفتِ جام
جس حُسن کا نظارہ بہ کوشش بھی نہ ہو عام — اُس حُسن کو کیوں کر نہ کہیں حُسنِ سرِ بام
تیوری پہ زمانہ کی شکن آئے تو آئے — حق کے لئے مر دیں گے سن اسے گردشِ ایام!
سینچے جو لہو سے چمنستانِ یقیں کو — رہتا ہی نہیں اُس کی ریاضت کا ثمر خام
گر حق کی سرافرازی کی خاطر ہو تگ و دو — اِک صبحِ دل افروز ہے اے دل تری ہر شام
یہ عطر فشانی ہے گلستانِ جہاں کی، — یا سلسلہ جنبانیٔ گیسوئے دل آرام
ماحولِ مکلّف کی نہیں عشق کو پروا — آرائشِ عالم ہے امیدِ دلِ ناکام
اے مہر کرم! اِک نگہِ لطف اِدھر بھی — محسن بھی ہو اک اخترِ تابندۂ اسلام

شبنم سبحانی

وہ گلستاں نظر میں مری گلستاں نہیں — جو آشنائے لذّتِ دورِ خزاں نہیں
اے برق! فکر کیا ہے جو تو مہرباں نہیں — ہم غمزدوں کا آج کوئی آشیاں نہیں
اس دورِ گیرودار سے گزرے گا ہنس کے عشق — لیکن پھر اس کے بعد کوئی امتحاں نہیں
افسوس — وہ قدم جو ہیں منزل سے بے نیاز — اُف! — وہ جبیں کہ جس کا کوئی آستاں نہیں
خود اپنی کجروی سے شکارِ الم ہیں ہم — اس میں قصورِ گردشِ ہفت آسماں نہیں!
شبنم نہیں ہے جس میں نہاں رمزِ کائنات — وہ فکرِ بیکراں! وہ نظر جاوداں نہیں

بیدل میرٹھی

(زیرِ ترتیب مجموعہ "خونِ دل" کا ایک ورق)

توہینِ محبت سرِ محفل نہ کریں گے
مر جائیں گے ہم شکوۂ قاتل نہ کریں گے

دیوانے پہنچ جائیں گے خود ہی سرِ منزل
رہبر کو شریکِ غمِ منزل نہ کریں گے

پھیلائیں گے ہم بھی نہ تمناؤں کا دامن
وہ ہمت ہے کہ ہم جانبِ سائل نہ کریں گے

تڑپایئے چرکوں سے غریبوں کے دلوں کو
فریاد و فغاں آپ کے بسمل نہ کریں گے

پلکوں پہ نہ دیکھیں گے کبھی اشکِ الم آپ
کو ہم کو [illegible] نہ کریں گے

دل لے کے نگاہوں کے بدلنے کا نتیجہ؟
ظاہر ہے، وہ حلِ مشکلِ بیدل نہ کریں گے

نظر زیدی

یہ لوگ ان کو غمِ زیست سے ڈراتے ہیں
جو بجلیوں کے تڑپنے پہ مسکراتے ہیں

ہماری تیرہ شبی پر ہوئے ہیں خندہ فروش!
بھری دوپہر میں جو مشعلیں جلاتے ہیں

مٹا سکوگے نہ ہم کو عجیب ہیں ہم لوگ
شکستِ دل کی صدا سن کے جھوم جاتے ہیں

عجب سکون ملا بس کے دل کی دنیا میں
بس اک سکوت کے کچھ تار جھنجھلاتے ہیں

خزاں میں پھول کھلاؤ تو کوئی بات بھی ہے
بہار آئے تو کانٹے بھی مسکراتے ہیں!

مرا کلام مرے دل کا عکس ہے زیدی
اس آئینے میں مرے نقش جگمگاتے ہیں

بیدل میرٹھی

(زیرِ ترتیب مجموعہ "خونِ دل" کا ایک ورق)

چمن میں دیکھ رہا ہوں ستمگروں کا ہنر — جو پھول پھول تھا کل آج ہے وہ خاکستر
روش روش پہ ہیں خونِ بہار کے چھینٹے — گھٹی گھٹی سی فضا ہے دھواں دھواں منظر
اب اور کیسے حوادث کے رخ کو پہچانوں — لپک رہے ہیں مرے آشیاں پہ برق و شرر

حیات و موت کے انداز میں ہوئی تبدیل
اک انقلاب کی زد میں ہے زندگی کا سفر

قیامت کب آئے گی ــــ اور کیسے؟

نعیم صدیقی

(۲)

تقدیرِ کائنات ہے کیا؟

مگر زمین کا انجام پوری کائنات کی تقدیر کا کوئی تصور سامنے رکھ کر ہی سوچا جا سکتا ہے۔ کیا یہ کائنات کسی نقطۂ آغاز سے چل کر کسی دوسرے نقطۂ اختتام پر پہنچ کر عدم کی تاریکی میں ڈوب جانے والی ہے؟ کیا یہ نظام بہ حیثیتِ مجموعی فنا کی طرف جا رہا ہے؟

اس وسیع کائنات میں اپنے علم کی حد تک ہم اکیلے ہیں۔ جاوید نامۂ اقبال کے تمہیدی نغمے ذہن میں گونجنے لگے:

آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ — ہر زماں گرمِ فغاں مانندِ چنگ
آرزوئے ہم نفس می سوزدش — نالہ ہائے دل نواز آموزدش
آسمان و مہر و ماہ خاموش و کر — ایں جہاں کوہ و کاہ خاموش و کر
. . . . — ہم نفس فرزندِ آدم را کجاست

ذرا بلندی سے کھڑے ہو کر کسی رات شفاف شبانہ فضا میں سے دیکھو تو چمکتے ستاروں سے آگے ایک پُرسکون دریائے تیرگی پھیلا ہوا نظر آئیگا۔ چمکیلے اجرام کی کشتیوں سے خالی! محض چند دھندلے تارے ــــ خوفناک حد تک دُور ــــ ٹمٹماتے ملیں گے۔ اور دوربین سے دیکھنے پر تو صاف معلوم ہو گا کہ آگے خلا ہی خلا ہے۔ یہ خلا بھی کبھی تاروں کی قندیلوں سے مزین تھا۔ اس میں بھی کبھی نظام ہائے کہکشانی کی انجمنیں آراستہ رہ چکی ہیں۔ ایک وقت میں تاروں کے جو جھمگھٹے آنکھ کی مار کی حد میں تھے، بعد میں وہ اس حد سے باہر جا چکے ہیں۔ اب کچھ پتا نہیں کہ ان جھمگھٹوں پر کیا بیت رہی ہے۔

یہ اولتی بدلتی کائنات جب بارہ ارب سال کی عمر کو پہنچے گی یا جب ۱۰ اربواں سالِ عیسوی آئے گا تو ہم اس اسٹیج سے غائب ہو چکے ہوں گے۔ "حرکاتِ مکان" کے پورے دائرہ میں درجۂ حرارت یکساں ہو جائے گا اور ازجی کا سلسلۂ حدوث و تغیر رک جائیگا۔ نہ گرمی رہے گی، نہ روشنی اور نہ زندگی! فطرت کی تمام سرگرمیاں ختم جائیں گی۔ اس طرح کی تاریک، جامد اور مردہ کائنات ہمیشہ رہے گی۔ کوئی ہرج نہیں کہ اسے "عدم" کا عنوان دیا جائے۔

تاروں کے بعید ترین جھمگٹے جو ہمارے نظامِ کہکشانی کی حدود سے دور دراز فضا میں جھلکتے ہیں، ہم سے بھی اور آپس میں بھی لمحہ بہ لمحہ بعید تر ہو رہے ہیں ــــ اور اس تباعد کی رفتار کہیں سیکڑوں اور کہیں ہزاروں میل فی سیکنڈ ہے۔ دوری بڑھنے سے یہ رفتار تباعد اور بڑھتی جاتی ہے۔ ماہرین فلکیات کی رائے یہ ہے کہ اس مشاہدہ کو صحیح مانتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کسی وقت یہ سارے جھمگھٹے یکجا تھے۔ اب تک کے حسابی اندازے بتاتے ہیں کہ اجرام کے سارے قبیلے کی یکجائی کا یہ دور آج سے دو ارب سال پہلے گزرا ہے۔ فضائیات کا ایک بلجیئن عالم (ABBE LAMAITRE) اس بات کا قائل ہے کہ پھیلاؤ کا یہ سارا عمل ایک وسیع اساسی "ایٹم" کے ٹوٹنے سے شروع ہوا اور بس اس اولین ایٹم بم کے پھٹنے کی وجہ سے حرکت اور

نور و حرارت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ہے ظہورِ کائنات کی ابتدا! اگر آپ اسی عالم سے پوچھیں کہ اس اساسی ہیئت بننے کا محرک و سبب کیا تھا تو وہ بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ "لا ادری" سائنس کا جواب اس "لا ادری" کے سوا اور کوئی نہیں۔ البتہ الٰہی حکمت بتاتی ہے کہ اس کا محرک ارادۂ الٰہی تھا اور ایک "امرِ کن" سے اولیں حرکت پیدا ہوئی۔

کائناتی پھیلاؤ کے نظریہ کے علمبرداروں کے قیاسات کے رو سے "اجزائے وجود" کا شیرازہ جزو و کل میں یکساں طور پریشان ہو رہا ہے اور آخر کار کائنات ٹوٹ کر اسی طرح انرجی کے ایک یخ بستہ سمندر کی شکل اختیار کرے گی جس طرح آغاز سے پہلے کا سماں تھا۔ گویا قیامت زمین ہی کے مقدر میں نہیں بلکہ پوری کائنات کی تقدیر کے نوشتے میں بھی قیامت کا حادثہ لکھا ہے۔

اس نظریہ کے خلاف ایک "تازہ ترین نظریہ" کیمبرج یونیورسٹی کے جوان سال عالمِ فلکیات فریڈ ہائیل (FRED HOYLE) نے ابھی حال ہی میں (سنہ ۱۹۵۰ء) پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے نظام کہکشانی سے باہر کے تاروں کے جھمگھٹے بلاشبہ دور تر ہو رہے ہیں اور ایک خاص وقفے میں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن دوسری طرف طرفہ ماجرا یہ ہے کہ جب بھی دیکھو ویسے ہی "جھمگھٹے" دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ نئے جھمگھٹے اس دخانِ لطیف سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں جو سارے "مکان" میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور یہی دخانِ لطیف مادے کے نئے ظہور کا بنیادی منبع ہے۔ اس دخانِ لطیف کی تخلیق کا تسلسل غیر منقطع ہے۔

صرف حادثہ تک پھیلی ہوئی کائنات کے بارے میں اندازہ کیا گیا ہے کہ اس دائرے کے اندر ہر سیکنڈ کے وقفے میں .... ۱ ٹن مادہ کی تشکیل ہو رہی ہے۔ یعنی [illegible] یوم [illegible] کی مقدار مادہ کے صرف سے کائنات کا یہ ہنگامۂ وجود برقرار ہے۔ نئے مادہ کی تخلیق کا دباؤ ہی دراصل کائنات کے پھیلاؤ کا باعث ہے۔

ہائیل کے نظریہ کا کہنا یہ ہے کہ کائنات مشتمل ہے ایک غیر منقطع تخلیقی عمل پر! دوسرے لفظوں میں "نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے" اس کے اجزا فانی ہیں، اس کی تفصیلی اشکال آنی ہیں، مگر بہ حیثیت مجموعی یہ ہنگامہ جاودانی ہے۔ فی الحقیقت ہائیل کے نظریہ نے نظریۂ مادیت (MATERIALISM) کو مزید تقویت پہنچائی ہے اور آئن سٹائن اور برگسان وغیرہ کی فکری شاہراہ سے ہٹ کر سوچا ہے۔ یہ کائنات کی تقدیر کا ایک بالکل جدید تصور ہے — مگر ہے ایک قیاس ہی!

اسی سلسلے میں نئے رجائی تصورات کے تحت ہارورڈ فریڈ ایل وہپل (HARVARDS FRED L. W HIPPLE) نے "ابرکِ غباری" نامی مفروضہ (DUST-CLOUD HYPOTHESIS) پیش کیا ہے۔ یہ مفروضہ جو ۱۹۴۸ء میں سامنے آیا، کائنات کے ہنگامۂ تخریب و تعمیر کے بارے میں یہ تصور دلاتا ہے کہ ایک طرف اجرام عدم کے سمندر میں ڈوب رہے ہیں، دوسری طرف نئے ستارے زندگی کی بسم اللہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہی اقبال والی بات کہ "پے بہ پے آید جہاں ہا در وجود"! مفروضہ کہتا ہے کہ فضا میں گیسوں اور گرد و غبار کے بادل جا بجا پھیلے ہوئے ہیں، ان بادلوں کی صورت میں جو مادہ پھیلا ہوا ہے وہ حسابی اندازوں کی رو سے اس مادے کی مقدار کے برابر ہے جو ستاروں اور اجرام میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ ابرکِ غباری ستاروں کے درمیانی خلاؤں میں حد درجہ پتلا اور لطیف ہو کر پھیلا ہوا ہے۔ کشش اور روشنی کے دباؤ کا طبعی عمل قریب قریب ایک ارب سال میں ایک ابرکِ غباری سے نئے ستارے کا پیکر تراش لیتا ہے۔ سو اس کائناتی غبار سے فطرت کا آرٹسٹ پے در پے گیندیں بناتا، ان کو توڑتا رہتا ہے۔ گویا ایک تعمیری عمل مسلسل ہو رہا ہے۔ ایک چکر ہے جس پر موجوداتِ فلکی گھومتے ہوئے ابرکِ غباری میں بدل جاتے ہیں اور پھر ابرکِ غباری سے دوبارہ نئی آب و تاب سے ابھرتے ہیں۔ وجود و عدم کا یہ ہنڈولا اسی طرح چل

رہا ہے اور چلتا رہے گا ۔

ہائیل اور ڈمپیل کے مفروضے کے مطابق یہ امکان تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہمارے نظامِ کہکشانی کے ماحول میں اور بھی سیارے ایسے ہوسکتے ہیں جن پر "زندگی" رواں دواں ہو اور ہو سکتا ہے کہ متعدد دنیاؤں میں انسانی یا کسی اور طرح کی ذوی العقول مخلوقات موجود ہو۔ اگر "تخلیقِ مسلسل" کے اس مفروضے کی تفصیلات کو برحق مانا جائے تو پھر خود زندگی بھی اس کائنات میں دوام کا مرتبہ پا لیتی ہے اس وسیع عالمِ وجود میں ایک جگہ اگر زندگی کا مقبرہ بنتا ہے تو دوسری جگہ اس کے لئے گہوارے آراستہ کئے جاتے ہیں۔ یہ "چمن ز غنچہ در آغوش و نعشِ گل بدوش" کی ایک کھلی تصویر ہے ۔

اسی وجہ سے یہ قیاس بھی کیا جاتا ہے کہ زمین کے وجود سے قبل انسانی و عقلی مخلوق سے ، دقیق اندوز دنیائیں گزر چکی ہیں۔ ان دنیاؤں کے اپنے آدم و نوح ہوں گے، اپنے بو علی سینا ہوں گے ، افلاطون اور سقراط ہوں گے ۔ چرچل اور روز ویلٹ ہوں گے ہٹلر اور مسولینی ہوں گے لینن اور مارکس ہوں گے ــــ اور ان کے اپنے اپنے خاتم النبیین ہوں گے ، اپنی اپنی امم مسلمہ ہوں گی !

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃً للعالمینے ہم بود

اب اگر زمین کسی حادثے سے مٹ بھی جاتی ہے تو زندگی اور عقلی مرتبے کو پہنچی ہوئی زندگی سلطنتِ کائنات کے کچھ نہ کچھ دوسرے شہروں اور محلوں میں باقی رہے گی اور پھلے پھولے گی۔ کل کی زمینیں، اور دنیائیں "ابر کی غبار" سے تراشی جا رہی ہیں ۔

انسان کا امید پرور دانہ ذہن عجیب عجیب طریقوں سے سوچتا ہے۔ چنانچہ مصنف نے ایک اور فلسفیانہ دلیل بعدِ قیامت کی یہ دی ہے کہ نوعِ انسانی ابھی بالکل عالمِ طفلی میں ہے ــــ بلکہ پنگوڑے میں! وہ کہتا ہے کہ آج سے دس لاکھ برس قبل زندگی کی کوکھ سے انسان نے جنم لیا اور حیاتِ ارضی کے مستقبل کا طول، دو ارب سال محسوب کیا جاتا ہے۔ اب اگر نوعِ انسانی کو ایک فرد مانا جائے اور اس کی پوری طبعی عمر کو ایک سو برس قرار دے کر دیکھا جائے تو گویا ابھی تک یہ فرد صرف اٹھارہ دن کی عمر کا ہوا ہے ایک طفلکِ معصوم جو ابھی پوری طرح اُٹھنے بیٹھنے کے بھی قابل نہیں ــ وہ بس بھوک اور پیاس کی حالت میں چیخ سکتا ہے ، ہر چمکیلی چیز کی طرف لپکتا ہے اور اسی طفولیت کی وجہ سے وہ حد درجہ خود غرض ہے مصنف کے نقطۂ نظر سے جی نہیں۔ اتنا کہ یہ غنچہ نا شگفتہ نذرِ گلچیں ہو جائیگا ــــ مگر کتنے ہی غنچہ ہائے نا شگفتہ روز حوادث کی نذر ہوتے ہیں اور قانونِ قضا و قدر اس قسم کے جھوٹے رحم نہیں کھایا کرتا ۔

اور انسانیت خودکشی کر لے تو ــــ

مصنف کے مطالعہ و تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ زمین اور انسانی زندگی چاروں طرف سے خطرات میں گھری ہے اور ان خطرات سے مفر نہیں، پر یہ سب خطرات دُور کے ہیں اور مہلت کا وقفہ بڑا وسیع اور امید کی رسّی بڑی لمبی ہے ۔ البتہ قریب ترین خطرہ یہ ہے کہ انسانیت خودکشی نہ کر لے! یہ طفلکِ ناداں اس خنجر کو اپنے پیٹ میں نہ گھونپ لے جو "جوہری توانائی" کے نام سے اس کے ہاتھوں میں چمکتا دکھائی دیتا ہے۔

جوہری توانائی کے انضباط کے لئے اگر انسان کا اخلاقی شعور مضبوط ہو جائے تو یہ ایسی ایسی حیرت انگیز خدمات انجام دے سکتی ہے اور زندگی کو ایک ایسی جنتِ مسرت و نشاط میں پہنچا سکتی ہے کہ جس کا تصور کر کے عقل کا سر چکرا جاتا ہے۔ مصنف نے ان خوش آئند امکانات کا تصور دلانے کے لئے ذیل کی دلچسپ حقیقتیں بیان کی ہیں جن کا ظہور سنہ ۲۰۰۰ء تک ہو سکتا ہے :

ــــ بحرِ مکان میں سفینے تیرتے نظر آئیں گے جن کے ذریعے چاند تک کا دو لاکھ چالیس ہزار میل کا سفر چند دنوں میں، اور مریخ اور زہرہ کی مسافت چند ماہ میں طے ہو گی۔ چنانچہ چاند کے پہلے سفر کے لئے ایک برطانوی تنظیم (BRITISH INTERPLANETARY SOCIETY) نے ابھی

ے سیٹوں کی بکنگ شروع کر دی ہے اور فی الواقع ۲۰ ہزار افراد نے رجسٹریشن کرالی ہے۔

ـــ ہوائی جہاز زمین کے گرد خطِ استوا پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۲۴ گھنٹے میں بغیر رکے گھوم جائیں گے اور وہ سورج کے ساتھ ساتھ پرواز کریں گے اس لئے اگر وہ کسی جگہ سے دوپہر کو چلیں گے تو دوسری جگہ دوپہر ہی کو پہنچیں گے۔

ـــ مشینی گاڑیاں سال سال بھر تک مٹر کے دانے کے برابر کی ایک ایٹمی گولی کے بل پر چلتی رہیں گی۔

ـــ ساحلی تفریح گاہوں اور پارکوں میں روشنی بہم پہنچانے کے لئے مصنوعی آفتاب اونچے میناروں پر سے نور پاشی کریں گے۔

ـــ سرطان اور دوسرے موذی امراض کا کلی استیصال ہو جائے گا۔

ـــ کسی کیمیاوی جوہر کی کمی نہ رہے گی، کیونکہ سمندر جو ہر شے کے وسیع ذخائر ہیں کو ارزاں سستی جوہری توانائی کے ذریعے کھنگال ڈالے جائیں گے۔

ـــ طلائی معیار دنیا بھر میں مستقل ہو جائے گا، کیونکہ سائنس لوہے اور سیسے کو بآسانی سونے میں بدل لیں گے۔

ـــ اجتماعی زندگی قومیت کے دائروں کو توڑ کر ایک ہی بین الانسانی حلقے کی صورت اختیار کرے گی۔

ـــ جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا، سرے سے اس کے وجوہ ہی نہ رہیں گے۔

ـــ ایٹمی طاقت آئندہ معمولی چیزوں سے برآمد کی جائے گی، مثلاً ایک پونڈ پانی کے ایٹموں کو پھاڑنے سے اتنی توانائی حاصل ہو سکے گی جس سے دس کروڑ ٹن پانی کو صفر درجہ حرارت (سنٹی گریڈ) سے ۱۰۰ درجہ حرارت تک پہنچایا جا سکے۔ ایک سانس بھر ہوا سے حاصل شدہ توانائی کی طاقت ہوائی جہاز کو سال بھر تک پرواز میں رکھ سکے گی۔ ایک مٹھی بھر برف کے ذریعے ایک بڑے گھر کی ضروریاتِ حرارت کو پورا کیا جا سکے گا۔ ریلوے کے ایک ٹکٹ کے ذرا سے کاغذ کے ذریعے ایک بھاری ریل گاڑی کو زمین کے گرد کئی مرتبہ گھمایا جا سکے گا۔

لیکن اگر انسان اپنے آپ کو اتنے اونچے اخلاقی شعور تک نہ ابھار سکا جو جوہری توانائی کے انضباط کا ضامن ہو اور جو اسے تعمیری راستے پر ڈال دے اور اگر اسے ایک خنجرِ ہلاکت کی حیثیت سے استعمال کیا گیا تو ـــ؟ ـــــــ تو انسان پر خود اس کے اپنے ہاتھوں قیامت وارد ہو کر رہے گی!

مصنف نے کیا خوب کہا ہے کہ یہ آٹھواں ایٹمی سال ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ہم سنہ ۹ ایٹمی یا سنہ ۱۰ ایٹمی تک سلامت رہ جائیں گے؟

ایک معمولی ایٹم بم کے پھٹنے سے اتنی ہی انرجی کا اخراج ہوتا ہے جتنا "T.N.T" (ایک انتہائی آتش گیر مادہ) کے بیس ہزار ٹن سے۔ برقی توانائی کے حساب سے دیکھیں تو یہ طاقت اتنی ہے جتنی ہوور کے عظیم بند (HOOVER DAM) سے ایک دن میں حاصل ہوتی ہے یا پھر مصنف یوں سمجھاتا ہے کہ اتنی بجلی جس سے ایک ۶۰ واٹ کا بلب دو لاکھ اسٹھ ہزار برس تک جلتا رکھا جا سکے۔

ایٹم بم پھٹتا ہے تو اس کی لاسبیت (RADIATION) اور حرارت کے زیرِ اثر ہوا آتش ہو جاتی ہے۔ ایک سیکنڈ کے دس ہزارویں وقفے میں ہوا کے اس آتشیں گولے کا قطر تقریباً ۹۰ فٹ ہوتا ہے اور درجۂ حرارت ۳ لاکھ درجہ سنٹی گریڈ ـــ یا سورج کی سطح کے مقابلے میں پچاس گنا زائد۔ ۵ میل کی دوری سے مشاہدہ کرنے والے ایک شخص کے لئے اس کی چمک سورج سے سو گنا زائد محسوس ہو گی۔ ایک سیکنڈ پورا ہونے کے بعد اس آتشیں گولے کا قطر ۹۰۰ فٹ ہو جاتا ہے اور یہ غبارے کی طرح اوپر اٹھتا ہے۔ دس سیکنڈ کے اندر اندر اس کے طوفانی دھماکے

کے دوران اثرات کا دور ختم ہوتا ہے لیکن اثرات مابعد جاری رہتے ہیں۔

فرض کیجئے کہ شام کے وقت ہمارے شہر پر معمولی درجے کا ایٹم بم پھٹتا ہے۔ سورج سے سو گنا زیادہ تیز روشنی پیدا ہوگی سامنے عمارات کا منظر عجیب ہوگا لیکن وہ تو سب آناً فاناً گر چکیں گی۔ ایک شخص جو توجہ سے نصف میل کی دوری پر ہے اس پر ایٹمی اشعاعیت کا مہلک اثر ہوگا اور وہ دو ہفتے میں دم توڑ دے گا چند گھنٹوں میں اسے اشعاعیت زدگی کا پہلا اثر ایک اضطراب کی صورت میں محسوس ہوگا۔ دو ایک روز میں اس پر متلی اور قے کا حملہ ہوگا اور اسہال آئیں گے ساتھ ہی بخار بھی آ دبوچے گا چند روز میں یہ علامات بالکل ہٹ جائیں گی۔ لیکن نظامِ جسمانی میں زیادہ گہرے تغیرات واقع ہونے لگیں گے۔ اب ہذیان اور غنودگی کا دور شروع ہوگا جس کا انجام موت ہوگا۔ اس دوران میں تمام جسم سمیت زدہ ہو جائے گا، داخلی طور پر جریانِ خون شروع ہو جائے گا۔ گلا متورم ہو جائے گا، تمام بال گر جائیں گے اور عضوی نظام اعضا مختل ہو جائے گا۔ وہ پُرہیب رقبہ جو براہِ راست اصلی ہدف بنتا ہے اس میں نہ کوئی عمارت رہے گی نہ زندگی بچ سکے گی نہ انسانوں اور حیوانوں کے وجود کی کوئی یادگار باقی رہ جائے گی۔ ۔۔۔ سب کچھ گرمی اور تڑت کے بگولے میں دھواں بن کر اڑ جائے گا۔ آدھے میل کے دائرے میں تمام عمارتیں تباہ ہو کر رہیں گی بجز ان کے کہ فولادی یا آہنی ہوں یا آہنی ستونوں پر کھڑی ہوں نظر آ جائیں۔ دو میل کے دائرے میں ایسی گرم رَو چلے گی کہ زندہ اجسام کی کھالیں جل جائیں گی اور خود یہی سبب بے شمار موتوں کے لئے کافی ہوگا۔ دھماکے کے ۲ منٹ بعد ایک دونانِ آتشں اٹھ کھڑا ہوگا اور تیس یا چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چاروں طرف پھیلے گا۔ اس طوفان کے ساتھ گاما ریز حملہ آور ہوتی ہیں جو ہڈیوں کے گودے۔ خون کے ذرات اور سیالی خلیات کو نشانہ بناتی ہیں۔ گاما ریز کے اس حملے سے جانبر ہونا ہرگز ۔۔۔ ٹ دوری تک کے انسانوں کا صفایا ہو کر رہتا ہے۔ بلکہ تین ہزار فٹ کی دوری پر بھی خیر نہیں، یہاں تک کہ جو لوگ کنکریٹ کی ۱۲ موٹی دیواروں کے پیچھے ہوں وہ بھی دوسروں کے مقابلے میں صرف بقدر ۵۰٪ محفوظ ہو سکتے ہیں۔ یہ ہوگا نتیجہ ایک ویسے جوہری بم کا جیسا ہیروشیما میں ۰۰۰،۷۸ افراد کے لئے قیامت بن گیا۔ اور سنئے! ۔۔۔ ایٹمی دھماکے کا ایک خوفناک اثر تناسلی جرثوموں اور جینوں پر بھی پڑتا ہے۔ ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ایٹم زدہ افرادِ انسانی کے صلب و بطن سے آیا انسانی پیکر ہی نمودار ہوں گے یا بھتنے اور چڑیلیں اور اجنبی وحشی بلائیں!

اندازہ کیا جاتا ہے کہ ناگاساکی پر پھٹنے والے ایک بم سے پورے دس مربع میل پر قیامت گزر گئی۔ ایسے ہزار بم گویا دس ہزار مربع میل علاقے کی کامل بربادی کے لئے کافی ہیں۔ مصنف مثال دے کر بتاتا ہے کہ نیویارک کا عظیم شہر تین سو مربع میل کے رقبے میں واقع ہے۔ گویا وہی ایک ہزار بم ایسے ۳۳ عظیم شہروں کا خاکہ اڑا دیں گے۔ ۔۔ ماکاشتہ جو تین ہزار سال سے انسانی جدوجہد آرٹ اور قربانیوں کا مظہر چلا آ رہا ہے پلک جھپکنے میں روشنی اور گرمی کے طوفان میں بہ جائے گا۔ یورینیم بم تو خیر پھر بھی "چھوٹے میاں" تھے، لیکن ہائیڈروجن بم تو وہ "بڑے میاں" ہیں کہ آدمی بس "سبحان اللہ" ہی پکار اٹھتا ہے۔

اور پھر ۔۔۔ ایک چیز اور آنے والی ہے "ریگِ مرگ" یا "موت کی بالو"! اشعاعیت دار مادوں کے ذرات کی بارش شہروں پر برسائی جائے گی اور وہ تمام گلی کوچوں میں بچھ جائے گی۔ تھوڑی تھوڑی کرکے یہ ہوا میں اڑتی رہے گی اور لوگ سانس کے ذریعے اسے اندر لینے کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے۔

اب تک جو ایٹمی بم بنے ہیں وہ بہت معمولی چیز ہیں۔ ہائیڈروجن بم یورینیم بموں کے مقابلے میں سو سے ایک ہزار گنا زیادہ ہلاکت انگیز ہو سکتے ہیں۔ اب سائنس دانوں کے سامنے سوال یہ ہے کہ کیا ہائیڈروجن بم خود زمین کے ذراتِ ترکیبی کے اندر جوہری ردِعمل پیدا کر سکتا ہے، زمین ایک جگمگاتے ستارے میں بدل سکتا ہے؟ ہینس بیتھ (HANSA BETHE) کا جواب یہ ہے کہ جوہری ردِعمل پیدا ہوگا لیکن بم کا مادی تناسب ۔۔۔

کے مقابلے میں اتنا اہم ہے کہ وہ شروع ہو کر از خود ختم ہو جائے گا۔ مصنف خاص طور پر واضح کرتا ہے کہ یہ جواب محض نظریاتی ہے، عملی تجربہ بالکل دوسرا نتیجہ سامنے لا سکتا ہے ـــ یعنی زمین پھٹ کر چھوٹے چھوٹے منتشر کروں کا ایک انبوہ بن سکتی ہے ـــ اور اس وقت سرے سے یہ تجربی علم بے کار ہو گا۔

سوچئے کہ ہیروشیما کے بم نے کامل تباہی دو میل کے دائرے میں مچائی تھی، لیکن ہائیڈروجن بم ہزار گنا طاقت کا حامل ہو گا۔ ایک بم کی حرارت اور لاشعاعیت کا دائرۂ اثر ۱۲۵۶ مربع میل تک وسیع ہو گا۔ بم کی اشعاعیت کے زہریلے پن کے بارے میں جوہری بم سازی میں کام کرنے والے ایک عالم (LEO SZILARD) کا اندازہ یہ ہے کہ ۵۰ تا ۱۰۰ ٹن وزنی ہائیڈروجن بم کا زہر پوری ارضی فضا کو سمیت زدہ کر دیگا۔ اور اس فضا میں پوری نوعِ انسانی دم توڑ دے گی۔ ایک پروفیسر (ARNOLD) جس نے اس سے اختلاف کیا ہے کہ پوری نوع انسانی کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ بھی یہ ضرور مانتا ہے کہ اکثریت کا صفایا ہو سکتا ہے اور آئندہ دس سال میں ایٹمی آلاتِ تباہی موجودہ اندازوں سے اتنے آگے بھی جا سکتے ہیں کہ پوری نوعِ انسانی کی بقا خطرے میں پڑ جائے۔

ایٹمی اسلحہ کے استعمال کو بین الاقوامی قانون اور معاہدوں کے ذریعے روکنے کی جو تدبیر سامنے ہے وہ بھروسے کی چیز نہیں، ابھرتی ہوئی قوم ہٹلر کی طرح ایسے قانون اور معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر کسی بھی وقت تباہی کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ عالمی کنٹرول بھی زیادہ کارگر نہیں ہو گا ـــ جیسے کہ امتناعِ شراب کی قانونی تدابیر کا حشر بعض ممالک میں دیکھا جا چکا ہے۔ شراب کی ناجائز کشید اور خرید و فروخت کی طرح ایٹمی اسلحہ کی تیاری بھی خلاف قانون طور پر ہو سکتی ہے۔ تاہم مصنف کی نگاہ میں یہ اقدام بھی محدود طور پر اثر افزا ہو سکتا ہے۔ اصل چارۂ کار مصنف کی نگاہ میں صرف یہ ہے کہ ریاست کے وجود کو "قومیت" کی موجودہ سطح سے اٹھا کر اقوام کو ایک عالمی وفاق میں لایا جائے۔

مصنف کا اس معاملے میں حرفِ آخر خوب ہے:-

"اصل قضیہ ایٹم بم کا نہیں، انسانی قلوب سے متعلق ہے!"

ـــ اور یاد آتا ہے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سنہری قول کہ گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، اس میں بگاڑ آ جائے تو پورے جسم میں فساد آ جاتا ہے اور وہ اگر درست ہو جائے تو سارا نظام درست ہو جاتا ہے۔ (او کما قال)

لیکن دل دنیا کے انجام کے بارے میں سائنس کی ان مادی و طبعی توضیحات کے ذریعے جہاں نظام چلانے کے لئے اونچا اخلاقی شعور نہیں حاصل کر سکتے، اس کے لئے تو عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کیا کہتا ہے:

قرآن میں جن بنیادی معتقدات پر سب سے زیادہ گفتگو کی گئی ہے ان میں سے ایک عقیدۂ آخرت بھی ہے۔ اس سلسلے میں قیامت کے حادثے پر اتنا معلوماتی مواد قرآن نے دیا ہے کہ اس سے کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں اور اس کی روشنی میں سائنس کے نظریاتِ انجام کو جانچا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم تفصیل میں نہیں جا سکتے، اجمالاً چند حقائق سامنے لاتے ہیں۔

قرآن نے حادثۂ قیامت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے ایک تو یہ دکھایا ہے کہ انسانی عالمِ انفس پر کیا گزرے گی، اور دوسری طرف یہ منظر بھی کھینچا ہے کہ آفاق پر کیا بیتے گی۔ یہاں اسی دوسرے پہلو سے متعلق چند اشارات دیئے جاتے ہیں:-

ـــ "اور جس روز کہ ہم چلائیں گے پہاڑوں کو اور تو دیکھے کہ زمین کھل گئی ہے ......" (کہف ۴۷)

—— "جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جیسے کاغذ کو طومار میں لپیٹ لیا جاتا ہے" (انبیاء - ۱۰۴)

—— "جس دن پھٹ جائے گا آسمان بدلیوں کے ساتھ" (فرقان — ۲۵)

—— "جس دن مارے کپکپاہٹ کے آسمان لرز رہا ہوگا اور پہاڑ رواں دواں ہوں گے"۔ (طور - ۹، ۱۰)

—— "جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا، اور پہاڑ دھنے ہوئے رنگدار اُون کی طرح ہوں گے"۔ (معارج — ۸، ۹)

—— "جس دن کانپیں گے زمین اور پہاڑ، اور پہاڑ بھربھراتی ریت کی طرح ہو جائیں گے"۔ (مزمل - ۱۴)

—— "وہ کھڑکھڑا دینے والی (آفت)! - کیا ہے وہ کھڑکھڑا دینے والی (آفت)؟ — تم کیا جانو کہ کھڑکھڑا دینے والی (آفت) کیا ہے، وہ دن جب کہ لوگ (سوختہ پَر) پتنگوں کی طرح بکھرے پڑے ہوں گے، اور پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دُھنی ہوئی رنگ شدہ اُون"! (قارعہ ۱ تا ۵)

ان چند اشارات کو سامنے رکھنے سے جو تصور ملتا ہے وہ بتاتا ہے کہ پوری کائنات، یا کم سے کم ہمارے نظام کہکشانی اور یہ بھی نہیں تو خود زمین کے قریبی ماحول میں قیامت کوئی سخت ترین حادثہ بن کر وارد ہوگی جو اجرام اور کروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گی، فضا کو زیر و زبر کر دے گی۔ اور موجوداتِ مادّی کا ذرہ ذرہ کپکپا اُٹھے گا۔

دوسری حقیقت قرآن یہ سامنے لاتا ہے کہ اس کے وقت آمد سے بجز اللہ تعالےٰ کے کوئی آگاہ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں قیامت کسی ایسے طبعی سلسلۂ عمل (PROCESS) کا نتیجہ نہیں ہوگی جس کا علم انسانی احاطہ کر سکے اور جس کے بارے میں پہلے سے صحیح اندازے باندھ سکے۔ ملاحظہ ہوں چند آیات:-

—— "آپ سے (اے محمد صلعم!) قیامت کے بارے میں لوگ پوچھتے ہیں کہ اس کا وقتِ ورود کیا ہے؟ کہئے کہ اس کا علم تو بس میرے آقا ہی کو ہے وہی ہے جو اسے کھول دکھائے گا اپنے وقت پر! زمین و آسمان کے لئے وہ ایک سخت شاق گزرنے والا حادثہ ہے۔ وہ جب تم کو آلے گی تو بس ناگہانی طور پر آلے گی!" (اعراف — ۱۸۰)

—— "آپ سے (اے محمد صلعم!) لوگ قیامت کے بارے میں استفسار کرتے ہیں۔ کہئے کہ اس کی خبر صرف اللہ ہی کو ہے! —— اور آپ کیا جانیں کہ وہ گھڑی نزدیک ہی آ لگی ہو!" (احزاب — ۶۳)

—— "اور (یہ لوگ) کہتے ہیں کہ کب تک کے لئے ہے یہ (قیامت کا) وعدہ۔ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو! کہیے کہ یہ علم تو صرف اللہ ہی کو ہے اور میں تو بس ایک کھلا کھلا متنبہ کرنے والا آدمی ہوں"۔ (الملک — ۲۵، ۲۶)

بلکہ کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے خود اس راز کو پوری طرح مخفی رکھا ہے اور آخر تک یہ انسان اور دوسری مخلوق سے مخفی ہی رہے گا۔ ملاحظہ ہو: "اکادُ اُخفیھا" (طٰہٰ - ۱۵)

پس تیسری حقیقت اسی کے نتیجے میں یہ سامنے آتی ہے کہ قیامت اچانک ٹوٹ پڑے گی۔ قرآن نے اس بارے میں بھی پوری تصریح کر دی ہے:-

—— "یہاں تک کہ جب ان پر ٹوٹ پڑے قیامت بے خبری کے عالم میں!" (انعام — ۳۱)

—— "وہ تم کو آلے گی تو بس ناگہانی طور پر آلے گی!" (اعراف — ۱۸۷)

—— "اور قیامت کا معاملہ تو بس نگاہ کی ایک لپک کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ اقرب!" (نحل — ۷۷)

وہ پردۂ غیب سے یکایک نکلے گی اور برقِ درخشاں کی طرح ٹوٹ پڑے گی، وہ گھات میں بیٹھا ہوا ایک شیر ہے جو مادہ و روح کے گلہ پر بے خبری کے عالم میں ہلّہ بولے گا! کوئی پیش بینی نہیں، کوئی پیش بندی نہیں! وہ ایسے عالم میں وارد ہوگی کہ تم اپنی امیلیوں اور

پارلیمنٹوں اور یو۔این۔او کے ایوانوں میں بحثیں لڑ رہے ہوں گے۔ تم کرکٹ اور ہاکی اور ٹینس کے میچوں میں مشغول ہوں گے۔ تم ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنا رہے ہوں گے، تم رصد گاہوں سے کائنات کا جائزہ لے رہے ہوں گے، تم رقص گاہوں اور میکدوں میں دادِ عیش دے رہے ہوں گے، اور تم علمی مجالس میں مقالے پڑھ رہے ہوں گے کہ قیامت آنے کا امکان ہے یا نہیں اور ہے تو وہ کتنا قریب یا بعید ہے۔

راقم الحروف کا تصور یہ ہے کہ قیامت ایک طبعی (PHYSICAL) حادثے کی نوعیت نہیں رکھتی، بلکہ وہ ایک مافوق طبعی (SUPERNATURAL) امرِ الٰہی کے طور پر کائنات پر بیتے گی۔ اس کا وقت بطور بھی مادی اسباب کے تحت معین نہیں بلکہ وہ اس اخلاقی قانون کے تحت ہے جس کے رُو سے ایک خاص حد سے گر جانے والے معاشروں کو عذاب ملیامیٹ کر دیتا ہے اور اسی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ جب پوری انسانیت کا اخلاقی مرتبہ کم سے کم درجے کے مقررہ معیار سے نیچے گر جائے تو اسے عالمگیر عذاب سے ختم کر دیا جائے۔ باغبان کسی زمین کو اسی وقت تک پانی دیتا ہے جب تک وہ برگ و بار لانے والے پودے اُگاتی ہو، لیکن اگر وہ خار دار جھاڑیاں ہی اگلنے لگے تو پھر وہ ایک دن کدال لے کر —— بلکہ ٹریکٹر چلا کر —— اس کی مٹی کو زیر و زبر کر دیتا ہے۔ انسانیت کی کھیتی جب تک خیر و فلاح کے پھل پھول لا رہی ہے، مالک اسے سنبھالے گا، جب یہ اجیل ہو جائے گی تو وہ اس کو کھود ڈالے گا!

یہ تسلیم لیجئے کہ اس حادثے کو عالمِ مادی پر واقع ہونا ہے اس لئے آخر کار یہ کسی نہ کسی قانونِ مادی کے دروازے سے داخل ہو گا اور ایسے دروازے ہمارے وجود کے ہر چار طرف موجود ہیں جو پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور آدمی جو اپنی ساری علمی ترقیوں کے باوجود ابھی تک اس قدر نابلد ہے کہ قریب ترین جانے پہچانے ماحول میں جس میں وہ پوری طرح تصرف کرتا ہے، ایسے ناگہانی حادثات رونما ہو کر رہتے ہیں جن کا پہلے سے اندازہ نہیں ہوتا۔ یا ہوتا ہے تو غلط نکلتا ہے، اور صحیح بھی ہو تو اس سے بچاؤ نہیں ہو پاتا —— (بقول مصنف) فطرت کا یہ طفلکِ معصوم مبہوت کر دینے والی وسیع کائنات کے اندر کام کرنے والے قویٰ و عناصر پر اس درجہ کیوں کر حاوی ہو سکتا ہے کہ وہ پیشگی اندازے کر سکے، اس کے اندازے لازماً صحیح نکلیں اور پھر وہ کسی آنے والے حادثے سے پورا بچاؤ بھی کر لے جائے!

انسانی عقل کے پردے میں اس کا فریبِ نفس بھی پوری طرح کام کرتا ہے، وہ اپنے لئے طفل تسلیاں پیدا کرتا ہے، موہوم بناتا ہے، امیدوں کی نت نئی دنیائیں تعمیر کرتا ہے —— اور پھر وہ زندگی کے میکدے میں جام چڑھا چڑھا کر بدمست ہو جاتا ہے۔ اسی عالمِ بدمستی میں ایک دن وہ آنے والی گھڑی آ لے گی۔ جیسے ایک فرد زندگی کی ہماہمی میں محو ہوتا ہے کہ موت آ کر گلا دبوچ لیتی ہے، اسی طرح نوعِ انسانی بھی نشۂ حیات میں بہک کر بھٹک رہی ہو گی کہ اچانک قیامت اس کا ٹینٹوا دبا لے گی!

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ ۝ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ۝

بقیہ آپ کیا پڑھیں:- سُنْبُلَۃ، ضُدُعْ، جُمجمۃ وغیرہ تصویر دینے سے چارٹوں کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ مگر تصویریں دینے میں فقہی احتیاط کو بے جا طور تک پہنچا دیا گیا ہے، حالانکہ اگر حضرت عائشہ پردوں والے گھوڑوں سے کھیل سکتی تھیں تو بچوں کی تعلیمی ضرورت کے لئے تصویر کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان تنقیدی اشاروں کا مطلب سلسلہ کی افادیت کی نفی کرنا نہیں ہے۔ انہیں مدرسوں اور گھروں میں ذرا بڑی عمر کے بچوں کی تعلیم کے لئے بخوبی تجربہ میں لایا جا سکتا ہے۔ "الف با" کی قیمت ۵ روپے ہے۔ بقیہ چیزوں کی قیمت درج نہیں۔

میرا فن!

نعیم صدیقی

دورِ ن در آ، قریب تر آ، برونِ در سے نہ جھانک ہمدم!
عجیب احساس کی فضائیں! عجیب تر میرے فن کا عالم!
مری حقیقت سے آشنائی! یہی زندگانی کا خاص محرم!
بگڑتا بنتا ہُوا زمانہ، یہ میرا پیارا جہانِ آدم!
گھنے اندھیروں نے اس کو گھیرا کہیں کہیں تو دیوں کی مدھم
کہیں پہ محنت کشوں کے لشکر غلام بن بن کے بک رہے ہیں
کہیں پہ عصیاں کے دوش پہ ہے نگاہِ عصمت کی زلف برہم
ہر ایک ٹہنی کی آستیں میں ہزار کانٹے تنے ہوئے ہیں،
اُداس ہیں آرزو کی کلیاں! گلوں کے خندہ کی رُوح ماتم
شرارے سینوں کو پھونکتے ہیں، کنارے پلکوں کے بھیگتے ہیں
جُھلستی ہے تو چمن کو دن بھر! برستی ہے شب کو غم کی شبنم
غموں کی شبنم کا قطرہ قطرہ کہاں کہاں سے سمیٹتا ہوں!
کبھی تو طوفاں اٹھا سکوں گا!

مری نگاہوں میں ہیں وہ راہی اکیلے تھے جو اپنے گھر لٹا کر
قدم قدم بڑھتے آ رہے ہیں جو کانٹے کانٹے کو خوں پلا کر

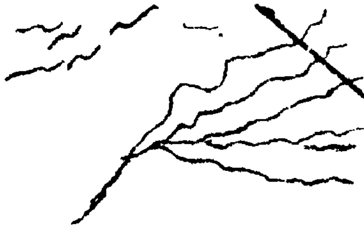
ہے دور دھندلی سی ایک منزل جو ان کی آنسوں کی جان جاں ہے
عجیب کاوش میں لگ گیا ہوں میں ان کے جذبوں پہ رحم کھاکر
خیال کو پے بہ پے دھنک کر بٹے ہیں برسوں میں کچھ فتیلے
بہم کیا بوند بوند روغن دل و جگر کو گھلا گھلا کر

دل و جگر کو گھلا گھلا کر، دیوں میں روغن نچوڑتا ہوں!
————— دیے کبھی تو جلا سکوں گا!

قریب آ میرے روٹھے جیون! یہ موت کے خوفناک سائے!
ترے لئے گیت گا رہا ہوں! کبھی کوئی بول تجھ کو بھائے!
بہت سی تصویریں تیری کھینچیں! بہت فسانے ترے سنائے!
ترے لئے نالہ کش رہا ہوں، کسی گھڑی تجھ کو رحم آئے
کہاں نہ دی جاکے میں نے دستک، کہاں نہ پھیلایا جاکے دامن
نہ جانے کس کس سے التجا کی، نہ جانے کس کس کے ناز اٹھائے
گلی گلی، در بدر پھروں گا، کبھی تو مڈبھیڑ تجھ سے ہو گی!
کبھی تو اے میرے روٹھے جیون! تو میری آنسوں میں لوٹ آئے

کبھی کا تجھ کو بلا رہا ہوں! میں تیری یادیں منا رہا ہوں!
————— کبھی تو تجھ کو منا سکوں گا!

"پنج ند" کا گیت



ذکی دراصل

گر جانے دو ڈھے جانے دو ہر چیز کو اب بہہ جانے دو
یہ کچی پکی دیواریں گرتی ہیں تو ان کو گرنے دو
سیلاب کا پانی آنگن میں بھرتا ہے تو اس کو بھرنے دو
مت روکو اس طوفان کو اب
ناخواستہ یہ مہمان سہی
آنے دو اس مہمان کو اب

چھا جانے دو اب لہروں کو
سیلاب کی چڑھتی موجوں کو
بہہ جانے دو اب شہروں کو
یہ شہر جہاں پر ہوتی ہے انسان کی عزت پیسوں سے
یہ شہر جہاں پر اہلِ ہوس کرتے ہیں حکومت کیسوں سے
یہ شہر جہاں پر بچتی ہیں افلاس کے ماروں کی لاشیں
یہ شہر جہاں پر بکتی ہیں رنگین بہاروں کی لاشیں
یہ شہر جہاں کی گلیوں پر قبضہ ہے عشرت کاروں کا
یہ شہر جہاں کی راہوں پر بہتا ہے خون بہاروں کا
چھا جانے دو اب لہروں کو
بہہ جانے دو ان شہروں کو

یہ شہر نہیں ہیں مسکن ہیں بے کاری کے بدکاری کے
یہ شہر نہیں ہیں اڈے ہیں مکاری کے عیاری کے
یہ شہر نہیں مے خانے ہیں
دھن دولت کے کاشانے ہیں
بکتا ہے یہاں انسان کا خوں
افلاس کی عسرت لٹتی ہے
اپنوں میں دولت لٹتی ہے
غیروں کی عصمت لٹتی ہے

یہ گاؤں یہ قریئے یہ ڈیرے
یہ خواب کہیں انسانوں کی
نقشے یہ پرانی دنیا کے
یہ تصویریں ویرانوں کی!
یہ گاؤں جہاں کی دھرتی پر افلاس کی بارش ہوتی ہے
یہ گاؤں جہاں کے کھیتوں میں دہقان کی قسمت سوتی ہے
یہ گاؤں جہاں کی گلیوں سے اٹھتے ہیں ہلاکت کے طوفاں
یہ گاؤں یہ قریئے یہ ڈیرے مردہ ہے جہاں نوعِ انساں
یہ گاؤں نہیں یہ گاؤں نہیں یہ مقتل ہیں انسانوں کے
یہ مقتل ہیں انسانوں کے، یہ ڈیرے ہیں حیوانوں کے
یاں اہلِ دولت مل جل کر پیتے ہیں خون کسانوں کا
بے قیمت ہے انسان یہاں ہے مول بڑا حیوانوں کا

یہ گاؤں جہاں کی مٹی سے اُگتا نہیں کچھ دہقاں کے لئے
یہ گاؤں جہاں کی دولت سے بچتا نہیں کچھ انساں کے لئے
یہ ڈیرے جن کی ہر چھت پر اک موت کا عالم رہتا ہے
یہ ڈیرے جن کے ہر گھر میں دُکھ پلتا ہے غم رہتا ہے
ان ڈیروں میں بھر جانے دو
بھر جانے دو اب پانی کو
چڑھ آنے دو دریاؤں کو
چھا جانے دو ویرانی کو

مت روکو اس طوفان کو اب
ناخواستہ یہ مہماں سہی،
آنے دو اس مہمان کو اب

یہ پانی ہے اس پانی کو پیغامِ تباہی مت سمجھو
یہ پانی ہے اس پانی کو تم قہرِ الٰہی مت سمجھو
یہ پانی خون کے داغوں کو دھرتی سے دھونے آیا ہے
مجبوروں پر مظلوموں پر یہ پانی رونے آیا ہے
یہ پانی توڑ کے رکھ دے گا اب جسم کے رشتے کو جاں سے
یہ پانی اب دھو ڈالے گا ہر داغ کو قلبِ انساں سے
پانی کا یہ طوفاں اب ہر اک تنکے کو بہا لے جائیگا
یہ پانی ایک زمانے کو کندھوں پہ اٹھا لے جائیگا
اونچے محل بہہ جائیں گے
دھل جائیگا دل دھرتی کا

سب تخت و محل بہہ جائیں گے
دھل جائیں گے سب دشت و دمن تطہیرِ جہاں ہو جائیگی
اک تازہ سحر سے رنگیں تر تصویرِ جہاں ہو جائیگی
مت روکو اس طوفان کو اب
ناخواستہ یہ مہمان سہی
آنے دو اس مہمان کو اب

تقدیرِ جہاں جس محفل کی تجدید کا ساماں کرتی ہے
ڈھا دیتی ہے اُس محفل کو اُس بزم کو ویراں کرتی ہے
اربابِ ہوس کی چالوں کے سب شیش محل گر جاتے ہیں
رک جاتی ہے گردش ساغر کی رندوں کے سر پھر جاتے ہیں
تخریبِ جہاں کا واویلا تعمیر کا نغمہ بنتا ہے
تدبیر کا ہر نوحہ مٹ کر تقدیر کا نغمہ بنتا ہے

دیکھو وہ اُفق کے پردے سے خورشید نکلنے والا ہے
ہر چیز بدلنے والی ہے ہر رنگ بدلنے والا ہے
عالم کی فضائے تیرہ پر "تنویرِ نظر" چھا جائے گی!
مٹ جائیں گے سب نقشِ کہن اک تازہ سحر چھا جائیگی
مت روکو اس طوفان کو اب
ناخواستہ یہ مہمان سہی
آنے دو اس مہمان کو اب

اعتذار

بیتاب زیبی

(ایک مہربان بزرگ کے خیرخواہانہ مشورے کے جواب میں)

مجھ پہ ہے لطفِ گردشِ ایام
آج کل میں ہوں محورِ آلام
میرا ماحول مجھ سے بدظن ہے
میری ہستی ہے موردِ الزام
میری تقدیر مجھ سے برگشتہ
میری تدبیر کوشش ناکام
میرے لیل و نہار سے اَن بَن
مجھ سے برہم مزاجِ صبح و شام
میری ہر آہ زندگی کا ثبوت
میری ہر سانس موت کا پیغام
نذرِ افکار زندگی میری
ہونٹ محرومِ ساغرِ گلفام
ہوں غرض اس جہانِ تیرہ کا
ایک بے مایہ شاعرِ گمنام
جس کا مشرب ہے بات سچ کہنا
جس کا مذہب ہے مذہبِ اسلام
جس کے مغز میں آفتابِ فکر
جس کے اشعار دور از ابہام
جس کی یہ نظم جس کی ہر اک بات
صاحبِ فہم کے لئے الہام

یہ بھی کچھ بجا سہی حضرت!
آپ کو میری ذات سے کیا کام
دیں کسی اور کو یہ لالچ آپ
جس کو ہو خواہشِ نمود و نام
میں نہیں چاہتا کہ دنیا میں
نام میرا بھی ہو زبان زدِ عام
مال و زر کی ہوس نہیں مجھ کو
تشنگی میری بے نیازِ جام
مجھ کو جبر و ستم گوارا ہیں
مجھ کو منظور تلخیٔ دشنام
عیش کوشی سے سخت نفرت ہے
غمِ ہستی ہے باعثِ آرام
میری نیت بدل نہیں سکتا
اس طرح کا کوئی خیالِ خام
شکریہ آپ کی محبت کا
دیں کسی مستحق کو یہ انعام
رات اور دن نہیں کہوں گا حضور
تختۂ دار کیوں نہ ہو انجام

خطوط

(۱)

نعیم بھائی ۔ سلام و رحمت!

کچھ عرصہ قبل میں نے "چراغِ راہ" کے لئے چند غزلیں بھیجی تھیں ۔ وہ کب کی شائع ہو گئیں ۔ اُن غزلوں پر آپ نے اپنی رائے بھی تحریر فرمائی تھی ۔ اُن رایوں نے مجھے بڑی مدد دی ۔ غزلوں کے سلسلے میں میں روایت اور بغاوت کو سمونے کا قائل ہوں یعنی غزل کی مانوس اشاریت میں عصری اور فکری رجحانات کو سمونے کی کوشش کرتا ہوں ۔ میں غزل کے لہجے میں اس دور کے تقاضوں ۔۔ تحریکی تقاضوں کے پیشِ نظر ایک خوش آہنگ تبدیلی کا خواہاں ہوں میں کلاسیکی دور کے اس لہجے کو تحریکی نقطۂ نگاہ سے اس دور کے لئے تخریبی سمجھتا ہوں جو اقبال کی زبان میں روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرتا ہے ۔۔ اقبال کی غزلوں میں آپ کو لہجے کی تیزی اور بلند آہنگی ملے گی ۔ میں اس دور سے تھوڑا سا بلند آہنگ لہجہ پسند کرتا ہوں ۔ لیکن لہجہ اتنا بلند اور تیز بھی نہ ہو جائے کہ خوانچہ والوں کی پکار بن جائے یا سامع سن کر نعرہ زنی شروع کر دے ۔ میں غزل میں لیک تخلیقی کرب اور درد مانوسیت کو بڑی اہمیت دیتا ہوں غزل میں جذبے اور وجدان کو انتہائی ضروری خیال کرتا ہوں یہاں اگر فکر بھی آتی ہے تو جذبے کے ملبوس آتشیں میں ۔۔۔۔ ہماری ادبی تحریک میں ابھی تک فکر غالب ہے ۔ اس فکر کو جذبہ بننا چاہئیے ۔ عقل کی اس آمریت نے ہماری غزلوں سے اثر انگیزی چھین لی ہے ۔ وہ منظوم اداریہ بن کر رہ گئی ہیں ۔ ہمارے اکثر غزل گو شعراء کا کلاسیکی ادب کا شعور انتہائی ناپختہ ہے اسی وجہ سے ان کے یہاں زبان و بیان کی بے راہ روی عام ہے ۔ اس صورتِ حال کو جلد ختم ہونا چاہئیے ورنہ ہمارا ادب آپ اپنی موت مر جائیگا ۔ اور کوئی اس کا ماتم کرنے والا بھی نہ ملے گا ۔ آپ کا مجموعۂ کلام "شعلۂ خیال" میری نظر سے گزرا میں نے اسے اردو ادب کے پس منظر میں رکھ کر پڑھا تو مجھے نا امیدی بھی ہوئی اور اُمید بھی پیدا ہوئی ۔ نا امیدی تو اس وجہ سے ہوئی کہ آپ نے زبان و فن کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا اور آپ نے اپنا سخت انتخاب بھی نہیں کیا ۔ امید اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ آپ کے اندر ایک غزل گو کے دل کی تپش اور آتشِ سیال ہے ۔ میں آپ کی بعض غزلوں کی داخلی فضا کو بہت پسند کرتا ہوں ۔۔۔ ہندوستان کے اکثر اہلِ نظر نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ آپ کے اندر جذب و دروں موجود ہے مگر ساتھ ساتھ اس کی بھی شکایت کی ہے کہ آپ فن و خارم کا متوازی احساس نہیں رکھتے ۔ اس سلسلے میں میری بھی یہی رائے ہے ۔ ادب میں ہیئت پرست ہونا تو اچھا نہیں ہے مگر ہیئت کا حسین استعمال بہرحال ایک اعلیٰ ادب کے لئے ضروری ہے ۔ تخلیق خواہ کتنی ہی بلند ہو اگر اس کے ساتھ فن نہیں ہے تو وہ ادب نہیں ہے ۔ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہئیے ۔ برائے کا سوال بعد میں آتا ہے ۔ ادھر چند مہینوں سے آپ کی جو غزلیں آ رہی ہیں اُن میں مجھے بڑا توازن نظر آ رہا ہے ۔۔۔ خدا کرے یہ چیز دیرپا ثابت ہو ۔ آپ کی غزلوں کے سلسلے میں میرا ایک ناچیز مشورہ یہ ہے کہ آپ منتخب اشعار ہی اشاعت کے لئے دیا کیجئے ۔ ہر اچھی غزل مختصر ہوتی ہے ۔ اور غزل کا اختصار ہی اس کا حسن ہے ۔ سات شعر سے زیادہ کی غزلیں اکثر بے کیف ہو جایا کرتی ہیں ۔ اقبال ہی کو دیکھئے انہوں نے کبھی طویل غزلیں نہیں کہیں ۔ طویل غزلوں میں وحدتِ تاثر بھی دم توڑ دیتی ہے خط بہت طویل ہوتا جا رہا ہے ۔ مگر کیا کروں خیالات امنڈے ہی چلے آ رہے ہیں ۔

آپ کا

انور سدید

---

(۲)

مکرمی نعیم صاحب

میں چراغِ راہ پچھلے چار، پانچ سال سے مسلسل پڑھ رہا ہوں واقعہ یہ ہے کہ اب میں یہ رسالہ پڑھ کر لذت محسوس کرتا ہوں۔ اس رسالے میں ایسے افسانے ملتے ہیں جن میں حل شدہ مسائل کو میں اپنے اوپر منطبق کر کے اپنے حالات میں تبدیلی کرتا ہوں۔ اسی طرح سوچ بچار اور دوسرے مقالات پڑھ کر سیاسیاتِ حاضرہ پر اپنے حلقے میں مضبوطی سے بولتا ہوں "چراغِ راہ" کو پڑھنے کے لئے جن کو دیتا ہوں وہ بھی اس میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض بعض فقرے مجھے سنا کر اس کی مزید تشریح چاہتے ہیں۔ اور یہ تشریح محض ذائقہ کو شوخ کرنے کے لئے وہ پوچھتے ہیں ورنہ فقرے عموماً سادہ ہی ہوتے ہیں جس کا مطلب بادی النظر میں سمجھ آجاتا ہے۔

"چراغِ راہ" میں پہلے پہل میں ایڈیٹوریل کو دیکھتا ہوں، اور اگر "کسی نے کہا" کا مضمون ہو تو ایڈیٹوریل سے پہلے وہ پڑھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ عنوان ہر پرچے میں ہو۔ آج تک مجھے ایسا اداریہ نظر نہیں آیا جس کو دیکھ کر معمولی سی ناپسندیدگی بھی میرے دل میں آئی ہو۔ بلکہ ہمیشہ ایک عجیب سی مسرت حاصل کرتا ہوں۔ ایک دفعہ چراغِ راہ کا اداریہ جیلانی بی اے نے لکھا تھا۔ اس دفعہ میرا خیال تھا کہ شاید اچھا نہ ہو کیوں کہ شروع کچھ ایسے طریقے سے ہوا تھا جس سے میری طبیعت مانوس نہ تھی۔ لیکن پڑھ کر میں صاحبِ مضمون کی قابلیت کا معترف ہوا کہ اپنا مقصد کیسی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور کیسے مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے۔ ایڈیٹوریل پڑھنے کے بعد فہرست مضامین پر نظر ڈالتا ہوں اور جیلانی کا نام دیکھ کر فوراً وہ مقالہ یا افسانہ دیکھنا شروع کرتا ہوں۔ (یہ ذرا افسوس کی بات ہے کہ نزدیکی وقفے میں انہوں نے چراغِ راہ میں کوئی نئی چیز نہیں پیش کی) اس کے بعد کتابوں پر تبصرہ اور باقی مضامین۔ زیرِ نظر شمارہ میں "ادب اور داخلیت" کو سرسری نظر سے دیکھ کر چھوڑ دیا لیکن دوسرے مرحلے میں جب ذرا فرصت پا کر دیکھا تو وہی مضمون پڑھ کر بہت پسند کیا۔ "سمرقند کی ایک شام" اور "دماغی عمل تطہیر کا ایک تجربہ" پسند آئے۔

میں ابھی تک شعر کو جانچنے، اس کی قدر کرنے اور اس سے محظوظ ہونے کا مذاق نہیں رکھتا۔ تاہم چراغِ راہ میں دیئے ہوئے شعر پڑھ لیتا ہوں۔ چراغِ راہ ۱۹۵۳ء کے اشاعتِ خاص میں ترقی پسند ادب کا جائزہ اور اسلامی ادب پر مضامین بڑی تکلیف کے ساتھ پڑھے تھے۔ (یعنی مضامین خشک سے تھے جن میں میں اپنے کو خیال سیکس کرتا) اس پرچے میں "شعلۂ خیال فریادی ہے" کا مضمون پڑھا، اور پسند آیا۔ اور جس اشاعتِ خاص کا میں نے ذکر کیا ہے اس میں ایک افسانہ "تعلیم بن یعوز" تھا جس کو میں نے پڑھ کر یہ تاثر قائم کیا تھا کہ اس افسانے کا کوئی مقصد نہیں لیکن بعد میں کسی کے اعتراض پر آپ نے جب تشریح کی تو میں نے اس افسانے کو دوبارہ پڑھا اور واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ تشریح نہ کرتے تو میں یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ واقعہ کیا ہے اور لکھنے والا قاری کو بتانا کیا چاہتا ہے۔

میرے سب سے زیادہ پسندیدہ اداریئے "اے قوم"، "کشمیر" اور "مسلم بلاک" ہیں۔

---

(۳)

میں "چراغِ راہ" کا ایک نیا خریدار ہوں اور ابھی تک صرف دو پرچے ہی ہاتھ آئے ہیں۔ مگر ان دو پرچوں ہی نے مجھ میں کافی اثر اور دلچسپی پیدا کر دی ہے۔

دسمبر کے پرچہ میں جناب عاصی کرنالی کی نظم "جادہ پیمائے سرزمینِ مغرب سے!" آج کل کے نوجوانوں کے لئے ایک بہت اونچے پیمانے

کی مثالی چیز تھی۔ اور جنوری کے پرچہ میں سمرقند کی ایک شام "عقلمندوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہے۔

"مخلوط انتخاب" کا مضمون پاکستان کے مسلمانوں کی گری ہوئی ذہنیت کا واضح طور پر ثبوت دیتا ہے۔ اس وقت بھی اگر مسلمانوں کو ہوش نہ آئی تو نہ جانے خدا اُن پر قیامت تک بھی مہربان نہ ہو۔

---

(۴)

ایک دوست کے نام

نظم کو تفصیلاً تو میں پھر دیکھوں گا۔ ایک نظر ڈالے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس کے نتیجے میں جو کچھ سمجھا عرض کرتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ "مسدس حالی" محض ایک نظم نہیں۔ بلکہ اپنے دور کی ایک زور دار فکری طاقت تھی۔ اور اس نے مسلمانوں کو ایک بار تو خوب اچھی طرح جھنجوڑ دیا تھا۔ وہ ایک نئے ذہنی دور کا مقدمہ بن گئی۔ اب اس رنگ کی کوئی چیز آئے۔ تو پھر اسے ویسی ہی فکری طاقت بن کر آنا چاہئے۔ ورنہ پیرایہ ہی بالکل نیا ہو۔

مسدس حالی کی دو خوبیاں ہیں ایک اس کے علمی پس منظر کی وسعت اور گہرائی۔ یعنی آپ اس مسدس کو پڑھ کر اپنی ساری تاریخ کا ایک جائزہ لے سکتے ہیں۔ اور ماضی و حال کا بالکل موازنہ کر سکتے ہیں۔ دوسری یہ کہ اس کی زبان کی سادگی ایک اعجازی شان رکھتی ہے۔ یعنی بول سادہ ہیں اور معنی گہرے۔

اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں۔ کہ بس حالی جیسے لوگ ہی ان کو یکجا کر سکتے ہیں۔ دوسری گزارش یہ ہے۔ کہ شعر و ادب میں جب تک کسی اصول نظریے اور نظام کو لے کر کاوش کی جاتی ہے۔ تو آرٹ قائم رہتا ہے۔ لیکن اگر کسی جماعت اور گروہ اور پارٹی (چاہے وہ کتنی ہی برسرِحق ہو) کو موضوع بنا کر تخلیقی صلاحیتوں کو صرف کیا جائے۔ تو ہزار احتیاطوں کے باوجود وہ چیز پیدا ہوتی ہے۔ جس کا مزاج پروپیگنڈے کا ہوتا ہے۔ آرٹ اور پروپیگنڈے میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں عمومی جاذبیت ہوتی ہے۔ اور اس کے اندر اوسط درجے کے ہر دل و دماغ کے لئے سامانِ دلچسپی ہوتا ہے۔ اور پروپیگنڈے سے ساری دلچسپی ایک خاص گروہ کو ہوتی ہے۔ اُس کا دامن ہر کسی کو اپنے سائے میں لے لیتا ہے۔ مگر اس کا دامن اتنا وسیع نہیں ہوتا۔ اُدھر ظرف بہت بڑا ہوتا ہے۔ اِدھر چھوٹا! آرٹ سے ہر کوئی محبت کرتا ہے۔ لیکن پروپیگنڈے کے مزاج سے آلودہ نگارش سے ایک گروہ کا ربط عامیانہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے گروہوں کا ردِ عمل اس پر مخالفانہ ہوتا ہے۔ پروپیگنڈہ ایک محدود حلقے میں تو مثبت اثر دکھاتا ہے۔ لیکن اس سے باہر اس کا اثر ہمیشہ منفی ہوتا ہے۔ پروپیگنڈہ بہت سے دائروں میں تعصب کو ابھارتا ہے۔ اور دوسروں کے دروازے اپنے لئے بند کر دیتا ہے۔

علاوہ ازیں ایسی مؤثر چیز لکھنے کے لئے لمبے غور و فکر اور گہرے مطالعہ زندگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے بہت ٹھہر ٹھہر کر لکھنا چاہئے۔ اور ایک مدت صرف کرنی چاہئے۔

ایک بات اور ------!

وہ باتیں جو ہم نثر میں بہت خوبی اور وضاحت اور زورِ بیان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ ان کو عروض و قافیہ کا جامہ پہنا دینے سے آرٹ پیدا نہیں ہوتا آپ جب کوئی شعر یا نظم لکھیں تو اس کی جانچ کرنے کے لئے یہ دیکھیں کہ اگر یہی بات نثر میں بیان کر دی جائے تو کیا معاملہ یکساں رہتا ہے؟ اگر ایسی کیفیت پائی ہوئے تو سمجھ لیجئے کہ شعریت اور آرٹ کے لحاظ سے ایک شعری نگارش ناکام رہی ہے۔ وہ ایک شے ہے جسے ہم کسی عام بات میں اپنے اندر سے ملاتے ہیں تو آرٹ پیدا ہوتا ہے۔

(نعیم صدیقی)

منٹو کا فن ـــــ

شخصیت کے آئینہ میں

ابن فرید، بی اے

پھر سمجھیے ـــــ کہ ہم لوگ جس ماحول میں ادب کے نئے چراغ جلا رہے ہیں اس میں پہلے سے جن لوگوں کا کوئی فنی مقام بن چکا ہے ان کو ہم آنکھیں بند کر کے معدوم نہیں فرض کر سکتے، وہ ہیں تو ان کا ہونا ہمیں ماننا ہوگا۔ ان کے مقام کو سمجھنا ہوگا اور ان کے فنی اور فکری صلاح و فساد کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ ادب میں یہ تنگ نظری نہیں چل سکتی کہ جس کے خیالات سے اپنے کو اختلاف ہو اس کا نام نہ لیا جائے یا اس پر بحث نہ کی جائے۔ ایسی بحثوں ہی کے ذریعے ہم اپنے ادبی و تنقیدی نظریے کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ منٹو پر ایک مضمون مسعود جاوید کے قلم سے ہمارے ہاں شائع ہو چکا ہے۔ اب ذرا مختلف زاویۂ نظر سے لکھا ہوا ابن فرید کا مقالہ پیش خدمت ہے۔

(ادارہ)

"شخصیت کا آئینہ فن کے بہت سے آئینوں میں سے ایک ہے۔ اس کے علم کے بغیر ہمیں فن کے آئینہ خانہ میں بار نہیں ملتا۔" آل احمد سرور کا یہ قول اپنے اندر بڑی صداقت رکھتا ہے، کیوں کہ انسانی فطرت اپنے ماحول سے بلند ہونے کے لئے سخت ترین مطالبات کرتی ہے، اور جب یہ مطالبے پورے نہیں ہوتے ہیں تو یہ لابدی ہو جاتا ہے کہ ایک فرد اپنے ذاتی تجربات، تاثرات، اور ذہنی کیفیات کو ہر اُس فعل میں دخیل رکھے جو اُس سے سرزد ہو رہا ہے ادب میں تو ایسی حالت میں قطعاً لازمی ہے کہ ادیب الفاظ کی نشست سے لے کر اُن کے پس پردہ کے معنی تک اپنے ماحول سے مستعار لے۔ وہ جس انداز سے سوچتا ہے اور جس طرح کسی شے، فعل یا عمل سے متاثر ہوتا ہے ایک طرح سے اُس کے ماحول کا پرتو ہی ہوتا ہے۔ مجرد فکر یا تصورہ (IMAGERY) سے ماوراء تخیل (IMAGINATION) انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بات منٹو کے بارے میں بھی بالکل صحیح ہے جب ہم اس کے فن پر غور کرتے ہیں تو اُس کے افسانوں کی ہیئت اور ان کے مواد کے لئے اس کے اپنے ماحول اور ذہن کا جائزہ لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ یہی عوامل اس کی تصوریت اور تخیل کی اساس بنتے ہیں۔

منٹو کے فن کی بلندی سے یہ حقیقت ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُس نے افسانہ نگاری کو مغربی طرز تحریر سے کافی نزدیک کر دیا ہے اور موپاساں، ٹالسٹائی اور گورکی کی فنیت کو بڑی چابکدستی سے اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اُس نے مشرقی تصورات اور کرداروں کو اساس بنا کر افسانوں میں ماحول کی ماورئیت کو خوشگوار حد تک ابھارا ہے۔ بعض اوقات اُس نے تحریر میں بغیر کسی زور نادرہ ادبیت کو پیدا کئے ہوئے اثر انگیزی کو تحریر کے ذریعہ درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ دراصل منٹو کے افسانوں کا کمال بھی یہی تھا:-

"ایسے لوگوں کو بیس سال سے یہی اعتراض رہا ہے کہ منٹو تو بس ایسی باتیں کرتا ہے جس سے لوگ چونک پڑیں۔ شاید یہ کوئی غیر شہریانہ یا غیر ادیبانہ بات ہو۔ لیکن میں نے جو تھوڑا بہت ادب پڑھا ہے اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو چونکانا ادب کا ایک مقدس فریضہ رہا ہے بلکہ میل ول نے تو ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جو چونکانے سے ڈرتے ہیں۔ منٹو کو چھوڑیئے، بودلیر

جیسے عظیم شاعر کو کیا کہئے گا جس کا ایک ادبی اصول ہی یہ تھا کہ متوسط طبقہ کو چونکایا جائے۔"

(منٹو کا مقام ——— محمد حسن عسکری)

منٹو نے چونکانے کے لئے اپنے فن میں جن ذرائع کو استعمال کیا ہے اُن میں جنس اور گرے ہوئے ماحول کو اولیت حاصل ہے۔ اُس نے ان دونوں اسباب کے مارے ہوئے رنڈیوں کے ماحول کو ادب میں زندہ کر کے پیش کیا ہے۔ اُن کی گفتگو، اُن کا رہن سہن، اُن کا طرزِ معاشرت اور ان کے اخلاق و عادات ہر چیز کو اُس نے اس طرح ادب کے صفحات پر ثبت کیا ہے کہ جیسے اُس ماحول سے اُس کو قریبی تعلق رہا ہو۔ منٹو نے اس ماحول کو کیوں منتخب کیا؟ ——— عبادت بریلوی کا خیال ہے:

"سماجی زندگی کے ایسے معاملات کی ترجمانی جن سے افراد کی زندگی براہ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوتی ہے منٹو نے بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں اُس نے اُن مظالم کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے جو زندگی کے غلط نظامِ اقدار نے تاریخ کے مختلف ادوار میں افراد پر روا رکھے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے انسانیت کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے ——— زندگی کو جس سانچے میں ڈھلنا چاہئے تھا، نہیں ڈھل سکی ہے ——— اور اس کی نشو و نما یا ارتقاء کا جو اندازہ ہونا چاہئے تھا، وہ اُسے میسر نہیں آ سکا ہے ——— اس میں گندگی اور تاریکی ہے۔ اور منٹو اس گندگی اور تاریکی پر کڑھتا ہے۔ اُس پر خون کے آنسو بہاتا ہے۔ اس طرح اس کے تمام پہلو افراد پر روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن خود منٹو ان کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ ان حالات کو ٹھیک کرنے کے لئے کوئی واضح لائحہ عمل منٹو کے یہاں موجود نہیں ہے ——— وہ ان کو دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے ——— اُسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی۔ کہ ان حالات کو ٹھیک کس طرح کیا جائے ——— بہتر کس طرح بنایا جائے۔ لیکن اس کی تحریروں میں ان حالات سے بیزاری ضرور محسوس ہوتی ہے ———"

(منٹو کی حقیقت نگاری ——— ڈاکٹر عبادت بریلوی)

منٹو کے اندر جس اضطراب اور بے چینی کی طرف ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اشارہ کیا ہے وہ ایک قاری کو بڑا اہم اور مثبت جذبہ محسوس ہوتا ہے۔ ایک فرد اگر کسی ناسور پر مرہم نہیں رکھ سکتا ہے تو دوسروں کو اس طرف متوجہ کرا دینا بھی اُس کے لئے بڑی کریڈٹ کی بات ہے۔ کم از کم اس سے کائناتِ انسانی کے گوشوں میں سڑتی ہوئی غلاظتوں کی طرف بے خبر انسانوں کی توجہ تو مرکوز ہو جائے گی اور کوئی نباض اُن پر مرہم رکھ سکے گا۔ منٹو میں یہی انسان دوستی دکھانے کی عبادت بریلوی نے پوری پوری کوشش کی ہے۔ پروفیسر وقار عظیم بھی یہی خیال رکھتے ہیں۔

"منٹو کی نظر میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق ——— معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بین نکتہ رس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و ہنر پر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ اُن میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو دھوکے میں رکھتی ہیں کن سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کن سے انسانی زندگی اس سکون و مسرت سے محروم ہوئی ہے جو فطرت کا منشا ہے۔ منٹو انسانی زندگی ——— اس کے سب اجتماعی اداروں یعنی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کو فطرت کے بتائے ہوئے راستے پر اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق پوری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس راہ سے زندگی کا

تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ ناانصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون ناانصافی کر رہا ہے اور کس طرح کر رہا ہے۔ منٹو نے اس ناانصافی کو مٹانے، اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کو اپنے فن کا مقصود بنایا ہے۔"

(منٹو کا فن ـــــ پروفیسر وقار عظیم)

وقار عظیم نے تو منٹو کی مثبت مقصدیت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے حالانکہ عبادت بریلوی نے منٹو کو واضح اور مثبت مقصدیت سے قطعاً محروم قرار دیا ہے۔ منٹو کے فن کا اگر ہم غائر نظر سے مطالعہ کریں تو ہمیں خود عبادت بریلوی کے متعین کردہ مقصد سے بھی اختلاف کرنا پڑے گا اور حسن عسکری ہی کی بات کو فیصلہ کن قرار دینا پڑے گا۔ منٹو نے جو کچھ اپنے ادب میں پیش کیا ہے۔ وہی کچھ اُس نے اپنی عملی زندگی میں جائز رکھا ہے۔ اُس نے ادب میں جونک لگانے کا فن محض اس خیال سے نہیں اختیار کیا ہے کہ منٹو اس گندگی پر کڑھتا ہے۔ اُس پر خون کے آنسو بہاتا ہے بلکہ وہ خود اپنی زندگی کے بہت سے کمزور پہلوؤں پر پردہ ڈالنا اور بہت سے بدنام" افعال کے لئے عذرِ لنگ اور وجہ جواز فراہم کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود اپنی انفرادی زندگی میں جس پستی میں گرا ہوا ہے۔ اس پر شرمندہ ہونے کی بجائے لنڈورے گیدڑ کی طرح دوسروں کو ان کی "دم" سے محروم کرانا چاہتا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ برائی اور معائب کو جب تک حسین محمل میں اٹھا کر سوسائٹی کے بازار سے نہ گزارا جائے گا۔ اس وقت تک انسان اُسے اپنانے کے لئے تیار نہ ہو گا۔ ازل سے ابد تک انسانی ضمیر کبھی یہ گوارا نہ کرے گا کہ وہ باطل کو باطل سمجھتے ہوئے اختیار کرے یا اس میں ملوث ہو جائے۔ الّا یہ کہ اس میں محاسن، تفاخر اور حق کی حلاوت نہ پیدا کر دی جائے۔ جب ایسا ممکن ہو جاتا ہے۔ تو انسان اس "ملمّع" شدہ کھوٹی چیز کو کھری سمجھ کر ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ لیکن جب حقیقتِ حال اس پر کھلتی ہے۔ اور اپنے آپ کو سراسر فریب میں مبتلا پاتا ہے۔ تو یا تو وہ اُسے ترک کر دیتا ہے۔ یا پھر دوسروں کو بھی اسی خندق کی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔ منٹو نے اپنی زندگی میں خود کو فریب میں مبتلا پایا۔ اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بجائے: اُس نے دوسروں کو بھی اس گراوٹ میں گھسیٹ لینے کی کوشش کی۔ اُس کے سامنے سرے سے کوئی مثبت یا منفی مقصد تھا ہی نہیں۔ وہ لکھتا تھا۔ تاکہ شراب پیئے اور بدمست رہے۔ لیکن اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ کہ وہ دوسروں کی نکتہ چینی کو برداشت کر سکے۔ چنانچہ اُس نے اپنی خداداد صلاحیت کے زور پر اپنے قبیح سے قبیح فعل کے سلسلے میں دوسروں کو خوش گمان کر لیا۔

منٹو کے فن کی یہ تصویر ممکن ہے عجیب محسوس ہو، لیکن ہمیں جو کچھ کہنا ہے اُس سے ہم جونک لگانے کا کام لینے کے بجائے ایک مشہور ادیب کا صحیح مقام متعین کرنا چاہتے ہیں۔ منٹو اپنے اندر اگر واقعی سماج کی اصلاح کا درد رکھتا تھا۔ اُس کا سینہ اگر غلط نظام اقدار کے رواج سے پھنک رہا تھا تو اس کے دل و دماغ کے لئے ہم آہنگی لازمی تھی یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے، کہ ایک فرد گندگی اور تاریکی پر اس قدر مضطرب ہو اور زندگی کو فطرت کے بنائے ہوئے راستے پر اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق پوری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہو۔ لیکن خود عملاً اس کی طرف سے بے نیاز ہو۔ بلکہ اس ڈگر پر چل پڑا ہو جس سے دوسروں کو ہٹانا چاہتا ہو۔ یہی وہ عقدہ ہے۔ جو اپنے حل کے لئے دلائل اور تجزیہ و موازنہ طلب کرتا ہے۔

اس امر کے لئے ہمیں منٹو کے افسانوی ادب میں جس طرح کے کردار ملتے ہیں[1] اُن کے مجموعی اوصاف کا جائزہ لینا ہوگا اور ایک ایک وصف

---

[1] منٹو کے کرداروں کے مجموعی اوصاف کا جائزہ دینے کے لئے ضرورۃً مقالہ نگار نے جو اقتباسات دیئے ہیں اور ان پر جو نوٹ لکھے ہیں افسوس ہے کہ ہم ان کو چراغ راہ کے اوراق میں نہیں دے سکتے، کیوں کہ یہ پاکستان کے شریف اور مہذب طبقوں میں جانے والا جریدہ ہے۔ "پس گھٹن کا احساس" پیدا کرنے والی چیزیں ہم خوشی سے پیش نہیں کر سکتے۔ (چراغ راہ)

کے بارے میں الگ الگ بحث کرنی ہوگی۔ مثلاً :-

"اس کے یہاں طوائف کی زندگی سے متعلق تاریک پہلو نسبتاً زیادہ نظر آتے ہیں ۔۔۔ منٹو ان پہلوؤں کی وضاحت بہت تفصیل سے کرتا ہے۔ یہ تفصیل ایک طرف تو گھن کا احساس پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف اُس سے ہمدردی کا خیال بیدار ہوتا ہے"

(منٹو کی حقیقت نگاری ۔۔۔ عبادت بریلوی)

لیکن جب ہم "کالی شلوار" اور "گوپی ناتھ" کا مطالعہ کرتے ہیں تو طوائف کے ساتھ ہمدردی ہمیں اس کے پیشہ کی تمام کراہتوں کو نظر سے اوجھل کرا دیتی ہے۔ افسانہ، مرکزی نقطۂ نظر کے لحاظ سے، طوائف کی زبوں حالی دور کرنے کی طرف ضرور متوجہ کراتا ہے لیکن ایک مخفی تقاضہ بھی کیا جا رہا ہوتا ہے کہ اُس کو اس کے اپنے ہی پیشہ میں مطمئن دکھا جائے۔ اور یہ مخفی تقاضا ہی دراصل اس لغزش کی طرف بڑھاتا ہے جو سماج کو تباہی کے گڑھے میں جا گراتی ہے۔ منٹو اپنی انفرادی زندگی میں اس "بازار" کا محتاج تھا۔ اس کی بقا اس کی نجی زندگی کے لئے ضروری تھی۔

"وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخریہ سنایا کرتا۔ ایک دن میں نے جلانے کو کہہ دیا یہ جھوٹ بولتے ہیں .... [1] اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا کہ یہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کرتے ہیں اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ"

....

....

....

.... [2]"

(میرا دوست میرا دشمن ۔۔۔ عصمت چغتائی)

یہ اقتباس کسی قدر طویل ہو گیا ہے، لیکن اس امر کی وضاحت کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ منٹو کے دل میں طوائفوں کے لئے کوئی خلوص نہیں تھا بلکہ جہاں وہ ایک طرف اُن کے کوٹھوں پر دام وصول کرنے گیا ہے وہاں ذرو مندی کی چاشنی دے کر اُس نے لذتیت کے طویل تذکروں کے ذریعہ اپنے کھوئے ہوئے پیسوں کو دوسروں کی جیب سے اچک لینا چاہا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے جہاں ایک طرف محترمہ عصمت چغتائی بے نقاب ہو جاتی ہیں وہاں منٹو کا وہ خلوص جس کے بارے میں دوسرے ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ڈھونگ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور جب یہ حریری ملبوس تار تار ہونے لگتا ہے اور جذام زدہ کردار سامنے آنے لگتا ہے تو سہارا دینے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔

"..... اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ منٹو صاحب نے ان گرے ہوئے لوگوں کو پہلی بار پوری ایمان داری کے ساتھ پیش کیا ۔۔۔۔ اس سلسلے میں منٹو صاحب پر الزام رکھا جاتا ہے کہ عریانی پر اتر آئے تھے ۔۔۔ اب یہ الگ بحث ہے کہ عریانی کیا ہے اور کیا عریانی نہیں البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ آرٹ، ادب کے بڑے بڑے شاہکاروں پر بھی یہ الزام عائد ہوتا ہے ۔۔۔ مگر اللہ کوئی اتنا تو بتلائے کہ کیا عریانی میں ایک تیکھی دلکشی، ایک بے داغ سی معصومیت، ایک رنگ، ایک آگ سا نہیں ہوتا جو تخلیق اور نسل انسانی کی بقا کے مقدس عمل کو قائم رکھنے کے لئے [3] ...

[1] چند الفاظ مجبوراً حذف کر دیئے گئے۔ (چراغ راہ) [2] یہ طویل اقتباس حذف کر دیا گیا ہے۔ (چراغ راہ) [3] کیا خوب استدلال ہے، یعنی چونکہ عریانی میں [illegible] وہ بے داغ معصومیت کی شان رکھتی ہے [illegible] ہیں کہ لذتیت ہر عریانی میں ہوتی ہے اور اسی لذتیت کی کشش سے نفسانیت [illegible] اس طرف لپکتے ہیں۔ جیسے ایک جنور ابچہ پیشہ دے کر اس [illegible] کا نام خواجہ والے نے مٹھائی رکھا ہوا ہے۔ (چراغ راہ)

کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اب یہ تو محض ضد کی بات ہے کہ کوئی محترم یا محترمہ دس بچوں کے ماں باپ بن کر بھی لذتیت اور عریانی کے نام سے بھڑکیں اور اپنے جگر گوشوں کو "سفلی جذبات" یا دوسرے اس قسم کے نجس الفاظ کا نتیجہ قرار دیں[1]"

(جو کہہ نہ سکا ——— ہاجرہ مسرور)

ہاجرہ مسرور ہی کے الفاظ میں یہ الگ بحث ہے کہ جس جائز اور صحت مند ذریعۂ تخلیق اور نسلِ انسانی کی بقا کے مقدس تسلسل کو قائم رکھنے کی فطرت کو وہ لذتیت اور عریانی سے تعبیر کرتی ہیں، وہ واقعی لذتیت ہے یا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور واضح کروں گا کہ اس فطرت کی تسکین کے لئے آج بھی انسان سڑکوں کے چوراہوں کو منتخب نہیں کرتا ہے۔ پھر ادبِ بے حیا سے کیا تصور کیا ہے جو وہ سڑکوں کے چوراہوں سے بھی زیادہ سفلہ بنا ڈالا گیا ہے۔

یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، اصل موضوعِ گفتگو منٹو کی لذتیت پرستی تھا۔ مندرجہ بالا اقتباس سے لذتیت کے لئے جو جواز تلاش کیا گیا ہے وہ پھر بھی منٹو کی افتادِ طبع کی پردہ پوشی نہیں کر سکتا۔ اس نے خود کہا ہے :۔

"...... منٹو بھڑک کر بولا "تم کیا جانو .... (الفاظ حذف کئے گئے ــ چراغِ راہ) تم نے تو ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم نے تو شراب تک نہیں چکھی۔ تم تو اس روز چاوڑی بازار میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے راج ہنسوں کے ہجوم میں کوا گھس آئے ......"   (منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط ——— احمد ندیم قاسمی)

اس کی نگاہ میں یہ حرکت اپنے ہی لئے پسندیدہ و تنہا نہیں تھی بلکہ جو بھی "چاوڑی بازار" کی معصیت سے محروم تھا وہ راج ہنس نہیں کوا تھا۔ اسی تصور اور نظریہ نے اس کو اس طبقہ کی طرف پوری طرح مائل اور متوجہ کیا۔ وہ اُن کے رستے ہوئے ناسوروں پر مرہم رکھنے کا بہانہ کر کے اپنے اسفل ترین تاثرات کو دوسروں تک منتقل کرتا رہا کیوں کہ اُس کے ادب کا تصور یہی ہے کہ وہ عریاں ہو، راگ رنگ کا حامل ہو اور معصومیت کو "معصیت" میں تبدیل کر دینے والا ہے۔

ایسا ادب جو براہِ راست سفلی جذبات کو متحرک کر دیتا ہے وہ پڑھنے والے کی توجہ کو فن کے دوسرے لوازمات کی طرف سے قطعاً ہٹا دیتا ہے۔ قاری سفلی جذبات کی رَو میں اس قدر تیزی کے ساتھ بہنے لگتا ہے کہ عقل و ہوش کے پتوار اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتے ہیں۔ اور پھر خاص طور سے جنس کی چاشنی دے کر انسان کے انتہائی زود اشتعال پذیر جذبات کو جب بھی بھڑکایا جاتا ہے تو دامانِ تمکین و ہوش تو بالکل ہی پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ ناظر اس کی تصوری لذت میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے عوض افسانہ نگار سے اور کچھ بھی مطالبہ نہیں کرتا۔ منٹو اس گُر سے اچھی طرح واقف تھا چنانچہ عبادت بریلوی کے دعوؤں کے برخلاف :

"........ منٹو کے بارے میں یہ کہنا کہ اُن کا کون سا افسانہ جنسی نہیں ہے ذرا مشکل ہی ہے۔ کم از کم اس دور کے تقریباً آدھے افسانوں میں جنسی میلان اس درجہ رچا ہوا ہے کہ افسانے کے باقی پہلو اس کے نیچے دب کر رہ گئے ہیں۔ منٹو نے اس دور میں جتنی جنسی کہانیاں لکھی ہیں ان میں سے بعض کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نفسیاتی یا تجزیاتی ہیں لیکن اکثر کا مقصد سوائے جنسی ہیجان پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی اس بے حد اہم فطری جبلت نے ان افسانوں میں ایک غیر صحت مند اور مضر عریاں میلان کی شکل اختیار کر لی ہے۔ منٹو کے ان افسانوں کا ہر کردار بوڑھا

[1] یعنی تم چاہو کہ دس بچوں کے ماں اور باپ ہو لہٰذا چوراہوں پر ننگے ہو کر ناچنے کو بھی مقدس فریضہ تسلیم کر لو۔ (چراغِ راہ)

جوان بچہ، عورت، مرد کسی نہ کسی طرح اسی مرض کا مریض معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس اعتراض کا جواب افسانہ نگار کے پاس یہ ہو کہ جس چیز کو دوسرے مرض کہتے ہیں؟ بے شک وہ جائز طور پر فطرت کا ایک ناگزیر تقاضا کہتا ہے اور اسی لئے اس کے ہر پہلو کی عکاسی کرنے کو اپنا فنی منصب جانتا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ فطرت کے ضروری سے ضروری اور بڑے سے بڑے تقاضے بھی جب اعتدال کی حد سے گزر جائیں تو ترنت اس کا علاج ہے۔ ایک غلط راہ پر پڑے ہوئے فطری میلان کو بار بار ابھارنا نہ اس فرد کے لئے مفید ہے جس کے لئے یہ خدمت انجام دی جا رہی ہے اور نہ اس معاشرے کے لئے جس پر اس طرح کے افراد کی صحیح تربیت کا بار ہے۔ (تقسیم کے بعد منٹو کے افسانے ——— وقار عظیم)

لیکن منٹو نے معاشرے کی تربیت اور تعمیر کی ذمہ داری کو اپنے کندھوں سے بالکل ہی اتار پھینکا۔ صالح معاشرے کے لئے ضروری ہے کہ ادب کے ذریعے عوام کے سامنے وہ نصب العین پیش کیا جائے جو اُن کی توجہات کا مرکز بن جائے جو ہر لحاظ اُن کے لئے اپنے محاسن کی وجہ سے کشش کا باعث بنا رہے۔ لیکن منٹو کے یہاں جو نصب العین ہے وہ برائیں کرنے کے بعد بھی عوام کو صحیح راستے سے ہٹا دینے والا ہی ہے۔ وہ عوام کے جذبات کا ترفع کرنے کے بجائے تنزل کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس کے یہاں گرے ہوئے کرداروں کے حرکات و سکنات میں حسن دکھانے کی سعی ہے۔ حالانکہ اس سعی سے اس کا مقصود جیسا کہ اُس نے بارہا کہا یہ عیاں کرنا تھا کہ عمدہ اوصاف گرے ہوئے لوگوں میں بھی ہوتے ہیں۔ اُن میں بھی انسانیت کی رمق پائی جاتی ہے۔ وہ بھی اپنے اندر ایسی خوبیاں رکھتے ہیں جن پر نام نہاد پارسا اور شریف لوگ رشک کریں۔ لیکن صرف اسی اظہار سے افسانہ نگار اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو جاتا، اس کے لئے یہ مشاہدہ کرنا بھی ضروری ہو گا کہ کہیں وہ ان خوبیوں پر بے انتہا زور تو نہیں دے رہا ہے جس کی وجہ سے اس خرابی کے فروغ پانے کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ کہ گرے ہوئے طبقہ کے دوسرے معائب بھی آئیڈیل بن جائیں۔ مثلاً موذیل کا کردار لے لیجئے۔ اُس کی قربانی اور بے لوث محبت قابلِ رشک ہے۔ انسانیت کے لئے کتنے ہی زبانی جمع خرچ کرنے والوں کو وہ مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے گریبان میں منہ چھپا لیں۔ لیکن جب خود وہ اپنی ناک صاف کرنے کے لئے فراک کا دامن استعمال کرتی ہے اور برہنگی کے ذریعہ جذباتی ہیجان کو تحریک دیتی ہے تو نہ معلوم کتنے ہی مفاسد کو راہ دے جاتی ہے۔ موذیل کی قربانی کے لئے برہنگی کی طرف سے یہ بے پروائی ضروری تھی، لیکن افسانہ نگار کو یہ کہاں تک زیب دیتا تھا کہ اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہ ہر دو چار قدم پر قاری کے جذبات سے کھیلتا چلے۔ اسی طرح "ممی" میں ممی کے کردار میں محبت شفقت اور غم گساری کی صفات کو جس طرح پیش کیا گیا ہے، وہ اُس شخص کے لئے ضرور اثر انگیز ہو سکتی ہیں جو بردہ فروشی کے جواز کے لئے دنیا کی عریانی و پستی کو دلیل بنائے، ورنہ طبیعت میں ایسا شعر پیدا ہوتا ہے کہ افسانہ اپنے تمام جنسی اور جذباتی ہیجانات کے باوجود قاری سے اپنی بات نہیں منوا پاتا۔ ممی کے تمام محاسن اس کی ایک ہی خباثت کے نیچے بالکل ہی دب کر رہ جاتے ہیں اور شراب پینے والے بیڈا اور اس کے (افسانوی ساتھی) منٹو کے آنسو گر پڑ کے آنسو بن جاتے ہیں۔ منٹو کے بیشتر کرداروں میں فنکار کے طبعی انتشار کی وجہ سے ایسے ہی بڑے بڑے خلاء پائے جاتے ہیں مگر اس کی طرف سے یوں وکالت کی جاتی ہے۔

"منٹو کی کردار نگاری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ سارے کردار محض اس کے تخیل کی پیداوار نہیں، اس نے اپنے مطالعہ اور مشاہدے سے انہیں اچھے برے افسانوں کی اس ڈھیر میں چھانٹ لیا ہے جس میں اہم سب کھو جاتے ہیں۔ یہ کردار ناٹک کی اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کی طرح اپنے منہ پر نقلی چہرے چڑھائے نظر نہیں آتے، بلکہ وہ تو اپنے جسم پر سے لباس بھی اتار پھینکتے ہیں کہ ہم اُن کے خد و خال، اُن کے دلآویز خطوط اور ابھار یا ابھرتے ہوئے ناسور

اور سڑتے ہوئے زخم بھی دیکھے ہیں، ان کی گفتگو بھی ایسی ہی بے تکلف اور برجستہ ہوتی ہے۔ گالی بکنے والا کیردار گالی ہی بکتا ہے، موقع بے موقع اقبال کا شعر نہیں پڑھ سکتا، اور معلوم نہیں کیوں منٹو کو اپنے افسانوں میں شعر استعمال کرنے سے ایک طرح کی چڑ سی معلوم ہوتی ہے، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ منٹو کے کرداروں کی دنیا میں زندگی کے تلخ حقائق شعر و شاعری پر غالب آ گئے ہیں۔

(منٹو —— ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

دراصل ہمیں شکایت بھی منٹو کے مشاہدے اور مطالعے سے ہے۔ اُس نے گرے ہوئے کرداروں کا جس رُخ سے مطالعہ کیا ہے اُس میں اس نے معائب کو مستور کرنے کے بجائے آئیڈیل بنا کر پیش کیا ہے۔ ایک ناخواندہ جاہل سے اشعار پڑھنے کا مطالبہ کوئی بھی نہیں کر سکتا، لیکن یہ توقع تو ہر ایک کو ہو سکتی ہے کہ یہ ساری دنیا صرف سڑنے گلنے کیڑوں سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ انتہائی پست ماحول میں ایسے مضبوط کردار موجود ہیں جو ستون بن کر اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالے ہوئے ہیں اور اس کا ثبوت منٹو کو اپنے افسانے "منکو ڑے" سے مل سکتا ہے، مگر اُس نے ایسے کرداروں کی طرف زیادہ کیا، ذرا بھی توجہ نہ دی، بلکہ وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ناپسندیدہ کردار منظر عام پر لاتا رہا کیوں کہ اُس کا خیال تھا۔

"زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اُس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے —— مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں —— میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔ —— میں ہنگامہ پسند نہیں ہوں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب اور تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی —— میں اُسے کپڑے پہنانے کی بھی کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ میرا کام نہیں، درزیوں کا ہے۔"

(پیش لفظ "منٹو کے افسانے" —— منٹو)

کتنی خوبصورتی کے ساتھ منٹو نے اپنی ذمہ داری کو معاشرے کے سر منڈھ دیا ہے۔ حالانکہ اس کے اس قول کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایک بات بھی وزنی نہیں معلوم ہوتی۔ اس عہد کی برائیاں ہر ایک پر واضح ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ صدی مستقبل کے لئے جس قدر فکرمند بن گئی ہے اُس کا اندازہ ہر ذی ہوش کو ہے۔ زمانہ جس قدر مادی ترقی کر رہا ہے اُسی قدر صفاتی حیثیت سے تنزّل کر رہا ہے۔ ایک بلندی اُسے دوسری پستی میں گرا رہی ہے لیکن کیا صرف کھڑے ہوئے چلاتے رہنے سے بیچ دریا میں ڈوبنے والا سفینہ بچ جائے گا؟ مان لیا، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کوئی متوجہ ہو جائے۔ لیکن وہ کون ہوگا جو سب تو اس جنبی اور بپھرے طوفان میں ڈبکیاں لگا رہے ہوں گے۔ ایسی صورت میں ذمہ داری دوگونہ ہو جاتی ہے —— ایک طرف معاشرے کی خرابیوں سے آگاہ کرنا اور دوسری طرف ان کو دور کرنے کے لئے کسی مثبت صورت کی طرف اشارہ کرنا۔ لیکن منٹو اپنی زندگی کے آخری لمحے تک فیصلہ ہی نہ کر پایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"بات یہ ہے کہ اب میری دماغی حالت میں بہت بڑا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ سینکڑوں چیزیں بیک وقت سوچنے سے میں افراتفری کے عالم میں رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں میں کوئی قابلِ قدر چیز نہیں لکھ سکا۔"

(خط بنام احمد ندیم قاسمی مورخہ ۱۲ فروری ۳۹ء —— منٹو)

"منٹو کیا بلا ہے، وہ ایک ایسی پہیلی بن گیا ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ بعض اوقات ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے کہ مجھے ہنسی آتی ہے۔"

(منٹو —— سعادت حسن منٹو)

یہی وہ کمی تھی جس نے اُسے مجبور کیا کہ وہ افسانے کے لئے ایسے کردار تلاش کرے جو مداریوں کے سے کرتب دکھاتے رہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ مطمئن نہ ہو سکا تو اُس نے اپنی تحریر کی خرابی کو موجودہ نظام کی خرابیوں کے سر چپک دیا۔ وہ خرابیاں جو وہ اپنے کرداروں میں دکھاتا ہے اور جن کو وہ اپنے مشاہدے اور تجربے کا ماحصل قرار دیتا ہے خود اُس کے اپنے اندر موجود تھیں۔ اُس کے کردار اکثر فحش گالیاں بکتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ جن کے بارے میں وہ کہتا ہے۔

"وہ گالی منٹو نے نہیں بکی، اس سپاہی نے بکی، یہ جہاں آپ کو ہاتھ لگے آپ اُس کی تواضع کریں۔ منٹو نے تو صرف اُسے اپنے افسانے میں پیش کر دیا ہے۔ اس افسانے میں اور کئی باتیں بھی ہیں، آپ اُس گالی کے پیچھے پڑ گئے۔ ان باتوں کو دیکھنے اور سننے کے لئے آمادہ نہیں، آپ کا جی چاہے آپ گالی دے لیں لیکن افسانے کو ضرور سمجھنے کی کوشش کریں۔"

(منٹو — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

اس سپاہی کی تلاش میں ہمیں دور نہیں جانا پڑتا۔ یہ ہمیں خود منٹو کی شخصیت ہی میں چھپا ہوا مل جاتا ہے۔

"منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اسے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غلیظ گالی دے (سالے وائے تو وہ کہتا ہی رہتا تھا) لیکن کرشن کبھی ایسا موقع نہ آنے دیتا تھا۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا چاہتا۔ دو موقعوں کا میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اُس نے اور مجھے گالی دی۔"

(منٹو میرا دشمن — اوپندر ناتھ اشک)

اور وہ موقع یہ تھا —

اوپندر ناتھ اشک نے منٹو کو زچ کرنے کے لئے ایک بار اس کی کہانیاں نیوں "دھواں" اور "روح کا ناٹک" کو انتہائی پست قرار دیا جواب میں ....

"اُسی شام وشو امتر عادل اپنے دوست اور بہنوئی مسٹر مدن موہن بھلہ کے ساتھ منٹو سے ملنے گیا۔ اُس نے آ کر بتایا کہ منٹو نے انہیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں دیں کہ اشک سالا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ اُس کو افسانے کے فن کی ابجد کا بھی علم نہیں۔ ادبِ لطیف میں اس نے افسانے کے فن پر جو مضمون لکھا تھا وہ کیا بکواس ہے وغیرہ وغیرہ۔

تین دن تک منٹو مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا وہ سب سنتا رہا۔ کیوں کہ تماشائی بڑے خوش تھے۔ اور منٹو کیا کہتا ہے، وہ مجھے رائی رتی بتانا نہ بھولتے تھے۔ لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا۔ اور افسوس کرتا رہا کہ بادلِ ناخواستہ مجھے وہ سب کرنا پڑ رہا ہے جس کی دوستوں کو توقع تھی۔"

(منٹو، میرا دشمن — اوپندر ناتھ اشک)

صرف اتنا ہی نہیں، بعض اوقات عورتوں کو بھی گالی دینے کے لئے اس کی زبان بے طرح چلنے لگتی تھی: —

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ دوستی ٹوٹتی معلوم ہوتی۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اتر آیا، دانت پیس کر بولا:

"آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹے ہو جاتے۔"
"دل کا ارمان نکال لیجئے مروت کی ضرورت نہیں"۔ میں نے چڑایا۔
"اب جانے بھی دیجئے کوئی مرد ہوتا تو بتلاتے۔"
"بتا بھی دیجئے۔ ایسے کون کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں نکال بھی دیجئے۔"
"آپ جھینپ جائیں گی۔"
"قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی۔"
"تو آپ عورت نہیں۔"
"کیوں کیا عورت کے لئے جھینپنا اشد ضروری ہے۔ چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے۔ بڑا افسوس ہے منٹو صاحب آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ اصول بناتے ہیں۔ میں سمجھی تھی آپ تمام لوگوں کی سطح سے بلند ہیں۔" میں نے مسکہ لگایا۔
"قطعی نہیں...... میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا۔"
"تو پھر کہئے نا وہ جھینپا دینے والی بات۔"
"نہیں اب غصہ اتر گیا۔" وہ ہنس کر بولا۔
"اچھا دوستی ہی میں سہی، بتائیے وہ کون سی خطرناک بات تھی۔"
"کچھ نہیں........ اب کچھ یاد نہیں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید کوئی موٹی سی گالی دیتا۔"
"بس!" میں نے ناامید ہو کر کہا۔
"یا شاید کس کر چھانپڑ مارتا۔" نادم ہو کر بولا۔
"مجھ پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا ایسی لحیم شحیم گالیاں سنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے تھپیڑ بھی خاصے زور کے پڑ چکے ہیں مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت سمجھ کر رعایت کی۔ میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار۔" اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

(میرا دوست میرا دشمن — عصمت چغتائی)

گالیوں کی یہ بھرمار، اور گالیوں کا یہ بے باکی کے ساتھ استعمال جب منٹو کی اپنی انفرادی زندگی میں تھا تو پھر اس کے کرداروں میں کیوں نہ ہوتا؟ ہر فن کار کی شخصیت اس کے فن پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کی جھلک اس کے فن میں غیر محسوس طور پر آجایا کرتی ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک فن نے اپنی تعمیر جس بنیاد پر کی ہے، اس پر اٹھنے والی دیواریں ایک بالکل ہی مختلف نقش کو وجود میں لائیں۔ غالب نے بھی جب اپنی زندگی میں شراب و طوائف کو دخل اندازی کا موقع دیا تو اس کے یہاں بھی باوجود کڑے انتخاب کے دیوان میں ایسے اشعار آہی گئے ؎

وصول دعا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

بالکل ایسی ہی "پیش دستی" منٹو کی طرف سے بھی ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

عورت کا بہترین کردار

از ڈاکٹر ایملی ہارٹ شورن مڈ
ترجمہ سید لطف اللہ - ایم - اے

موجودہ زمانے میں بھی بہت سی خواتین ایسی ہیں جو محسوس کرتی ہیں کہ وہ شادی، امومت اور مردوں کی تخلیقی مساعی سے مطابقت ہی کے ذریعہ بہترین خدمت انجام دے سکتی ہیں۔

اسی زمانے کی ایک نامور خاتون اسے یوں بیان کرتی ہیں "ایک کامیاب بیوی بذاتِ خود ایک طرزِ زندگی ہے جس میں دوسری خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک مدبرہ، ایک کارہ بازی، ایک عمدہ باورچن، ایک تربیت یافتہ نرس، ایک معلمہ، ایک سیاست دان اور ایک جاذبِ نظر دوشیزہ کی صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جن خواتین نے یہ خوبیاں پیدا کر لیں ان کی زندگیاں کامیاب ترین ہیں۔"

عظیم سائنس دان چارلس ڈارون (CHARLES DARWIN.) کی بیوی ایما ویجوڈ ڈارون (EMMA WEDGWOOD DARWIN) سے زیادہ بہتر مثال اور کیا دی جا سکتی ہے۔ ڈارون جسمانی طور پر ہمیشہ کمزور رہا اور عین ممکن تھا کہ تخلیقی تحقیقات سے قطع نظر اپنی اور اپنے خاندان کی پیچیدہ ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ نہ ہو سکتا۔ اگر اسے اس حیرت انگیز خاتون کی غیر متزلزل رفاقت حاصل نہ رہتی۔

تحقیقات ڈارون کی زندگی کے اجزاء لاینفک بن چکے تھے۔ لیڈی ڈارون کو اپنے خاوند کی تحقیقات پر مکمل اعتماد اور اعتقاد تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ڈارون کی بافت، گھر اور بچوں کا انتظام اپنے ذمہ رکھا۔ اس نے اس بڑے سائنس دان کو ان مزاحمتوں اور تفکرات سے بالکل محفوظ رکھا جو اس کے عزائم کی پرسکون تکمیل کی راہ میں مخل ہو سکتے تھے۔ ان مشاغل کے باوجود اس نے دس بچے بھی دیئے جن میں سے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ڈارون کے بعد بھی زندہ رہیں۔ یہ اسی رفاقت کا نتیجہ تھا کہ بیٹوں میں سے تین کو ممتاز کارناموں کے صلے میں اعلیٰ خطابات ملے۔

مادام پاسچیر (MADAME PASTEUR.) ہی کو دیکھئے۔ ایک قابل مگر بدنام کیمیا داں کے ساتھ وفاداری اور ... نے اسے تضحیک اور تعذیب کا نشانہ بنایا۔ مگر اس کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ ہوئی۔ اس کی وفاداری کی مزید آزمائش اس کے وزیر کی عدالت اور پھر میعادی بخار میں موت سے بھی ہوئی۔ مادام پاسچیر نے ہر موقع پر اپنے خاندان کی پریشانیوں کو ہنس ہنس کے قبول کیا۔ اس کی ساری زندگی ایک دارالتجربہ کے اجنبی ماحول اور غیر متوقع حادثات کے گرد گردش کرتی رہی تاہم وہ اپنے خاوند کے تخلیقی دماغ کے نتائج پر یقین رکھتی تھی۔

اس باہمت اور مستقل مزاج خاتون نے اپنی عزیز بیٹی کی نگہداشت اور اس کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جب اس کی بیٹی ماں بننے والی تھی اور اس کا عزیز شوہر ایک عرصے سے اس سے علیحدہ تھا کیوں کہ وہ پاسچیر کے دارالتجربہ کے مقفل دروازوں کے اندر منہمک تھا۔ مادام پاسچیر اپنی بیٹی کو سمجھاتی کہ ایک بڑے آدمی کی بیوی اور بیٹی کی زندگی کا یہ بھی ایک رخ ہے۔

کاسیما لسٹ واگنر (COSIMA LISXT WAGNER) نے اس فلسفے کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے "خواتین کو اس دنیا میں بڑے آدمیوں کی امداد کے لئے بھیجا گیا ہے" خواتین کی اکثریت نے بالکل دانستہ طور پر اپنی اس حیثیت کو قبول کر لیا ہے اور ان کی بہت بڑی تعداد نہایت کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔

یہ عین متوقع اور فطری نتیجہ ہے کہ اُن خواتین کے نام شاذ و نادر ہی اپنے خاندانوں اور دوستوں کے حلقے سے باہر سنے جاتے ہیں۔ جب تک ان کے خاوند مشہور نہ ہو جائیں تاہم ایسی خواتین ہماری تہذیب کی ریڑھ کی ہڈی ہی تسلیم کی جاتی ہیں۔ (ریڈرز ڈائجسٹ ستمبر ۵۵ء سے ماخوذ)

موجِ وحباب

بیتاب زہنی

کچھ اہلِ جبہ و دستار ہم سے اُلجھے ہیں
غضب ہے بر سرِ بازار ہم سے اُلجھے ہیں

یہ کس خطا کی سزا ہے نہیں ہمیں بھی ہو معلوم
حضور! آپ تو بیکار ہم سے اُلجھے ہیں

یہ بات اب بھی ہمارے لئے معمہ ہے
وہ کس بنا پہ کئی بار ہم سے اُلجھے ہیں

زمانہ راہِ ترقی پہ گامزن ہے، مگر
ہمارے قافلہ سالار ہم سے اُلجھے ہیں

خدایا ہم تو تری راہ میں بڑھے جائیں
مگر یہ تیرے پرستار ہم سے اُلجھے ہیں

یہ چھیڑ چھاڑ یونہی تو نہیں ہے اے بیتاب
بلا سبب کبھی سرکارؐ ہم سے اُلجھے ہیں

محبوب خاں نصرت

لہو کا قطرہ قطرہ اک بہارِ جلوہ ساماں ہے
کہ صد رشکِ چمن ہوتا ہے جب گرتا ہے داماں پہ

حوادث سے گزر کر منزلِ مقصود ملتی ہے
وہی ساحل کو پا لیتے ہیں جو ہنستے ہیں طوفاں پہ

گلستاں میں نہیں معلوم! کس کی آمد آمد ہے!!
کہ ہے اک کیف سا چھایا ہوا سارے گلستاں پہ

ہر اک نغمہ میں غم تھا، درد تھا، فریاد کی لے تھی
کئی نغمے چھیڑے نصرتؔ! مرے سازِ رگِ جاں پہ

ابنِ محمود

جانے کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے
برق سے بڑھ کے کہیں تیز اثر ہوتی ہے

جائیے کس کو بتانے غمِ ہستی کا علاج
اس زمانہ میں کہاں قدرِ ہنر ہوتی ہے

مژۂ غم پہ مچل جاتے ہیں لاکھوں تارے
دل میں کچھ ایسی خلش وقتِ سحر ہوتی ہے

چھالے چھالے ہیں قدم پھر بھی ترے عاشق کو
جاں سے محبوب تری راہگزر ہوتی ہے

ظفر ہاشمی

کیا دور ہے جس میں ہر ساعت انسان بدلتے رہتے ہیں
سلطان بدلتے رہتے ہیں، فرمان بدلتے رہتے ہیں

رندوں سے بھلا کیا ممکن ہو، پابندیٔ عہدِ میخانہ؟
جب خود ساقی کی جانب سے پیمان بدلتے رہتے ہیں

اے ذوقِ یقیں! فیضان ترا! — ماحول سے کوئی ٹکرایا
اس کفر کی نگری میں ورنہ ایمان بدلتے رہتے ہیں

ہر لمحہ کسی کی چشمِ کرم اسلوب بدلتی رہتی ہے!
ہر لحظہ ظفر کی ہستی کے عنوان بدلتے رہتے ہیں

آپ کیا پڑھیں!

علمی و تحقیقی کتابیں

اسلامی نظریۂ زندگی اس دور میں تیزی سے تحریکی صورت اختیار کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لٹریچر کے دائرے میں اس موضوع پر ذہنی پیاس بہت بڑھ گئی ہے اور اچھی چیزوں کی مانگ ہے۔ درجۂ اول کی ایک کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" کے نام سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے نکلی ہے اور بلاشبہ ۱۹۵۵ء کی چند قیمتی ترین مطبوعات میں سے ایک ہے۔ ایسی کتاب کا تعارف چند سطروں میں کرانا کسی کے بس میں نہیں۔ یوں سمجھئے کہ محض تبرکاً ہم اس کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

فاضل مؤلف کا مرکزی مدعا یہ دکھانا ہے کہ نظریۂ اسلامی کی دعوت کوئی ایسی وقتی دعوت نہ تھی کہ جو ایک بار اپنے برگ و بار لانے کے بعد خزاں کا شکار ہو گئی ہو، بلکہ کلمۂ حق کا یہ سدا بہار پودا لوؤں کے جھکڑوں میں بھی نت نئی کونپلیں نکالتا رہا ہے۔ دعوتِ حق کا تسلسل کبھی نہیں منقطع ہوا۔ بگاڑ آئے، فساد رونما ہوئے، فتنوں نے یورشیں کیں، حوادث نے حالات کو تہ و بالا دیا، لیکن تاریخ کا ورق ورق گواہ ہے کہ ہر فتنہ وحادثہ جو اسلام اور مسلم سوسائٹی پر آیا اس کے ردِ عمل نے کسی نہ کسی صاحبِ عزم و ہمت ہستی کو تعمیر و اصلاح اور تجدید واحیاء کے محاذ پر اٹھا کھڑا کیا۔ جیسی جیسی خرابی آئی اس کے توڑ کے لئے ویسے ویسے چارہ گر پیدا ہوتے رہے۔ یعنی اسلام کے اندر ہر قسم کے حالات میں رہنمائی دینے اور ہر قسم کے حملوں کی روک تھام کرنے کی صلاحیت موجود رہی ہے اور وہ رواں دواں زندگی کے بدلتے ہوئے احوال اور تقاضوں کے درمیان کبھی عاجز نہیں ہوا یہی شانِ اکملیت ہے۔ اس لحاظ سے یہ علمی و تحقیقی کتاب بڑی عزم پرور اور حوصلہ افزا ہے۔

یہ کتاب کی جلد اول ہے جس میں چھ صدیوں کی داستانِ تجدید و اصلاح کے بعض نمایاں کردار پیش کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت حسن بصری، گروہ محدثین، معتزلہ، ائمہ اربعہ (خصوصاً امام احمد بن حنبل)، امام ابوالحسن اشعری، جماعتِ اخوان الصفا، باطنیہ، امام غزالی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، علامہ ابن جوزی، نورالدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی، شیخ عزالدین عبدالسلام اور مولانا جلال الدین نے ہماری تاریخ کے ابتدائی نصف حصے میں جو جو پارٹ ادا کیا ہے اسے فاضل مؤلف نے مورخانہ تحقیق اور ضروری حوالوں کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ داستانِ تجدید و اصلاح کی سیرت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فکر کے تمام اہم پہلو خود ان کی اپنی تحریروں سے اخذ کر کے زیبِ اوراق کر دیئے ہیں۔ ہر دور کے تمام بیرونی اور تخریبی اور ذہنی فتنے اور تمدن و سیاست کے بگاڑ کے مختلف پہلو نگاہوں میں پھر جاتے ہیں۔ یہ گویا ہمارے ملی عالم افکار کی تاریخ ہے اور اس میدان میں اب تک اس درجے کا ٹھوس کام نہیں ہوا۔

مؤلف نے شخصیتوں کا جو معیارِ انتخاب ذہن میں رکھا ہے وہ بڑی وسعت رکھتا ہے، یعنی کسی بھی علمی، روحانی، اخلاقی یا سیاسی پہلو میں اسلام کے حق میں کچھ کر دکھانے والوں کے لئے اس کتاب کی محفل میں جگہ ہے۔ اس وسیع معیار کو لے کر چلیں تو چھ صدیوں میں ہمیں بے شمار قابلِ ذکر و تعارف ہستیاں مل سکتی ہیں حالانکہ مؤلف ان سب کا تذکرہ نہیں کر سکے۔ دوسری طرف ناقدانہ نقطۂ نظر غائب ہے، یعنی جن شخصیتوں کو لیا گیا ہے نہیں

بتایا گیا کہ ان کے کام میں کیا ضروری چیزیں شامل نہیں رہیں یا کیا پہلو نظر انداز ہو گئے یا کن تدبیروں سے زیادہ بہتر نتائج پیدا کئے جا سکتے تھے۔ بدقسمتی سے تنقیدی زاویۂ نگاہ ہمارے ہاں سوئے ادب اور گستاخی اور عیب چینی بلکہ توہین کو مستلزم قرار دیا گیا ہے۔ اب یہ لازم ہو گیا ہے کہ زمانی ترتیب کے لحاظ سے جو لوگ پہلے گزرے ہوں ان کو بے خطا اور معصوم اور ان کے کام کو کوتاہیوں سے بالاتر ثابت کیا جائے۔ حالانکہ تنقید کا مدعا اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ ہم اپنی تاریخ کے سابق تجربات سے فائدہ اٹھا کر کارِ دعوت میں زیادہ بہتر راستہ اختیار کر سکیں۔ مولانا ابوالحسن علی کے بارے میں بھی یہ سوئے ظن نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تنقید کے بارے میں دورِ زوال و فساد کا یہی غلط تصور رکھتے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی صفحہ ۴، ۵ پر جو نقطۂ نظر ذیل کے الفاظ میں انہوں نے پیش فرمایا ہے وہ صحت مندانہ نہیں ہے:

> "کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر، اپنے ماحول میں لا کر، اپنے زمانے کے پیمانوں اور تقاضوں اور اپنے ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے جس سے کتاب سطحی النظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیع بن جاتی ہے۔ لیکن اہلِ نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی ناانصافی اور کوتاہ نظری ہے۔ .... ورنہ ہر عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جا سکتی ہے، اور نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ انسانی تاریخ کی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جا سکتی۔"

ان سطور کے کمزور پہلو یہ ہیں کہ ایک تو یہ دکھایا گیا ہے کہ تنقید کرنے کا لازمی اسلوب یہی ہے کہ کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر کسی دوسرے ماحول میں جانچا جائے اور پھر پیمانہ بھی ذاتی رجحانات اور خواہشات کا استعمال کیا جائے۔ حالانکہ اسے اس کے اپنے ماحول میں کتاب و سنت اور مسلمہ اصولوں کے پیمانے سے بھی جانچا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تنقید کا مقصود بس یہی ہو سکتا ہے کہ "بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہو" اور "کتاب سطحی النظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیع" بن جائے۔ حالانکہ مخلص ناقد خود سبق حاصل کرنے اور دوسروں کو صحیح رہنمائی دینے کے لئے تنقید کرے گا۔ تیسرے غلط فہمی ہوتی ہے کہ گویا ہر تنقید کے بارے میں "اہلِ نظر" "بے انصافی اور کوتاہ نظری" کا فتویٰ صادر کریں گے۔ چوتھے یہ کہ تنقید (کم سے کم اس نوع کی تنقید) کے بارے میں اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ "کوئی شخصیت کامل اور معیاری" نہ قرار دی جا سکے گی۔ سوال یہ ہے کہ مورخ اور "تاریخ کا ناقد" بہ فرض اپنے ذمے لے ہی کیوں کہ وہ شخصیتوں کو "کامل اور معیاری" ثابت کرے گا۔ کمال اور معیار تو ہمارے لئے محمد صلعم کی ہستی میں رکھا گیا ہے۔ باقی بزرگوں اور اکابر کو ہم اپنا بزرگ، اپنا امام اور اپنا محبوب تو قرار دے سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان کو ہر ہر پہلو سے کامل اور معیاری بھی مانا جائے، کیونکہ کسی انسانی ہستی کے وسیع کارناموں میں کسی ایک آدھ کمزور پہلو یا کسی اکا دکا کوتاہی کے سامنے آنے سے اس کی عزت و عظمت میں فرق نہیں آ سکتا۔ اس طرح کے رجحانات سے فکری توازن برقرار نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ یہ درجۂ اول کی افادی و مقصدی کتاب قاری کو معلومات اور جذبات دیتی ہے، لیکن فکر و نظر کی تربیت نہیں کرتی۔

فاضل مؤلف کے علم و تقویٰ کے پیشِ نظر یہ سطور لکھنے کی جرأت ہم نہ کرتے، لیکن "ناقد" اپنے فرض سے مجبور رہے۔

کتاب مطبع معارف اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے آخر میں اسماء و کتب کا انڈکس شامل ہے۔ بڑے سائز کے ۸۰۰ سے زائد صفحات کی قیمت بلا جلد چھ روپے ہے۔

نہ علامہ محمد اسد کی ذات ہمارے قارئین کے لئے اجنبی ہے اور نہ موصوف کی تاریخی کتاب "اسلام ایٹ دی کراس روڈز" (دیا —— "اسلام دوراہے پر") محتاجِ تعارف ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں نمودار ہوا اور آج اس کا ساتواں ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔ اس کتاب نے عالمِ اسلام کو فکری اور جذباتی طور پر بروقت جھنجھوڑا اور احیائے اسلام کی رَو کو ابھارنے میں خاصی مدد دی ہے۔ ہم مسلمان بہ حیثیت ایک ملت کے ساری دنیا کے لئے ایک نمونۂ عبرت ہیں۔ ساٹھ ستر کروڑ افراد کے اس انبوہِ عظیم کا متعدد حکومتوں اور سلطنتوں کے ساتھ کرۂ ارضی پر پھیلا ہونا، قوتِ بے حس کا ایک ڈھیر بن کے رہ جانا اور زندگی کا بہترین فلسفہ و ضابطہ بغل میں رکھتے ہوئے زندگی سے محروم ہو جانا ایک ایسا تاریخی مسئلہ ہے جس پر اپنے ہی نہیں پرائے بھی حیران ہو ہو کر کاوش کرتے ہیں۔ علامہ اسد نے ایک اخباری نمائندے کی حیثیت سے اول اول بیگانگی کے مقام سے ہمارا جائزہ لیا اور پھر جب دلچسپی بڑھتی گئی تو موصوف کے اندر رحم اور ہمدردی کے جذبات ابھرے اور ان جذبات نے آہستہ آہستہ اس ذہین شخصیت کو "ہمارا" اپنا بنا دیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ وہ سرچشمۂ قوت و حیات جس کے ہم وارث بنائے گئے ہیں، اس کے عین کنارے پڑے ہم مارے پیاس کے بے حال ہو رہے ہیں اور باہر سے ایک تماشائی آتا ہے اور وہ ہمارے سرچشمۂ قوت و حیات کا راز پا لیتا ہے۔ اور اس سے جام بھر بھر کر ہمارے ہونٹوں سے لگاتا ہے۔ مصنف عالمِ اسلام کے موجودہ تمدنی ماحول سے مغربی تمدن کو ٹکراتے دیکھتا ہے۔ اور اس تصادم کی وجہ سے مسلمانوں میں جو سراسیمگی اور شکست خوردگی کی کیفیت پائی جاتی ہے اس کا عمیق نفسیاتی تجزیہ کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ ہم مسلمان —— ہمارے اندر کا کار فرما ذہین طبقہ —— کس ذہنی کیفیت سے دوچار ہے۔ یہ طبقہ اپنی موجودہ حالتِ زوال اور مغربی تمدن میں سے ایک کے انتخاب کا سوال سامنے رکھ کر اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ اسے اپنی زندگی کے قلعوں کی کنجیاں مغربی فکر و تمدن کے فاتح لشکر کے حوالے کر دینی چاہئیں۔ وہ زندگی کے چوک سے ایک غلط موڑ مڑنے کے لئے متحرک ہو چکا ہے۔ اس عالم میں "اسلام ایٹ دی کراس روڈز" کا مصنف اس کا بازو تھام کر اسے بتاتا ہے کہ زندگی اور ترقی کی راہ یہ نہیں، دوسری ہے۔ وہ اس کے سامنے کتاب و سنت کے اصل اسلام کو نمایاں کرتا ہے —— وہ اسلام جو ایک مذہب نہیں، تحریک ہے، ایک نظامِ حیات ہے، ایک تہذیب اور ایک تمدن ہے!

مصنف کے پاس شعور کی روشنی بھی ہے اور جذبہ کی گرمی بھی، اور یہ روشنی و گرمی اس کتاب کا ہر پڑھنے والا حاصل کر سکتا ہے۔ افکار اور تمدنوں کے ٹکراؤ کے اس دور میں یہ کتاب ایک مسلمان کو بہت مفید رہنمائی بہم پہنچاتی ہے اور اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کر کے اسے تجدید و احیائے اسلام کے لئے متحرک کرنے والی ہے۔ ضمناً اسلامی نظام میں حدیث و سنت کی اہمیت کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے

کتاب کا معیارِ طباعت اچھا ہے، مگر اس درجہ شاندار نہیں جس کا تقاضا کتاب کا مرتبہ کرتا ہے۔ اسے عرفات پبلیکیشنز، ۱۵ عمر دین روڈ، وسن پورہ، لاہور نے شائع کیا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے بارہ آنے

فیروز سنز —— لاہور، کراچی، پشاور —— کا وسیع اشاعتی ادارہ مختلف میدانوں میں جو علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے، ان میں سے ایک کڑی "جدید شعرائے اردو" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ مجموعی طور پر ساڑھے گیارہ سو صفحے کی اس بھاری بھرکم کتاب سے آدمی مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اسے بہت ہی خوب صورت اردو ٹائپ میں اچھے کاغذ پر شائع کیا گیا ہے۔ جلد اور گرد پوش بھی پسندیدہ ہے۔ یہ تذکرہ و تعارف ہے حالی اور آزاد سے لے کر اب تک کے مستند اور صاحبِ طرز شعرائے اردو کا، تعارفی سطور میں ڈاکٹر عبدالوحید صاحب نے فرمایا ہے

کہ اس کتاب میں صرف ان شعراء کو لیا گیا ہے جو "سنگ میل" کی حیثیت رکھتے ہوں۔ ہماری رائے میں کتاب اس معیار کو نہیں مانتی۔ اس میں تو بہر اچھے اور شہرت یافتہ شاعر کو جگہ ملی ہے۔ اور دوسری طرف ایسے شعراء چھوٹ بھی گئے ہیں کہ جن کے ہم پلہ حضرات کو لیا گیا ہے۔ سنگ میل تو پوری تاریخ شاعری میں انگلیوں پر گنی جانے والی ہستیاں ہو سکتی ہیں۔ بہرحال ہر شاعر کی مختصر سوانح کے ساتھ اس کے فنی مقام اور فکری نہج کا مجمل تعارف اور کلام کا تھوڑا سا انتخاب دیا گیا ہے۔ بالعموم تعارف میں رنگ ستائش ہے، اصولی و مقصدی تنقید کہیں نمایاں نہیں۔ شعراء کا انتخاب کلام جو دیا گیا اس کے بارے میں اگرچہ یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ معیار یہ ہے کہ اس سے شاعر کے مخصوص رجحانات اور اس کے ذاتی اسلوب کا اندازہ ہو سکے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ اسے طے کرنے والی اتھارٹی کون سی ہے۔ آیا کوئی وسیع بورڈ اہلِ نظر کا تھا، یا کسی ایک شخص (غالباً ڈاکٹر وحید صاحب) نے معیار مقرر بھی کیا اور اس پر اپنی پسند کے مطابق انتخاب کی خدمت بھی سرانجام دی۔ بظاہر یہی دوسری صورت سمجھ میں آتی ہے۔ اس صورت میں ایک سو بلوہ شعراء کو ایک فرد کا اپنے نقطۂ نظر سے پیش کر دینا کچھ عجیب ہے۔ مگر عجیب ہونے کے ساتھ یہ اتنا بڑا کام بھی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

اس کتاب کی ایک کوتاہی یہ ہے کہ اس میں ایک مستقل مکتبِ فکر کو — عین ممکن ہے کہ نادانستہ — نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہمارا اشارہ شعر و ادب کے تعمیر پسند اور اسلام پسند حلقہ کی طرف ہے۔ اس مکتبِ فکر کی ترجمانی متعدد جرائد چند سال سے کر رہے ہیں اور اس میں ملک نصر اللہ خاں عزیز، عامی کرنالی، اسد ملتانی، کوثر نیازی، انور صدیقی، حفیظ میرٹھی اور بعض دوسرے نمایاں افراد شریک ہیں جن کی نگارشات برابر شائع ہوتی ہیں۔ لیکن بجز ایک ماہر القادری کے باقی سب کا بلیک آؤٹ ہو گیا ہے۔ یہ کوتاہی بجا طور پر بہت سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرے گی کہ شاید کسی طرح کا تعصب کارفرما ہے۔ بہتر ہوتا کہ مرتب مختلف حلقوں سے مشورے لے لیتے۔

ان کوتاہیوں سے قطع نظر، یہ کتاب اپنے موضوع اور مقصد کے لحاظ سے بہت مفید ہے۔ نہ صرف اردو ادب کے اونچے درجوں کے طلبہ بلکہ ادیب، شعرا اور تنقید نگار اصحاب اور عام اہلِ ذوق ایک کتاب پڑھ کر شعری ارتقاء کی تاریخ کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی قابلِ قدر خدمت ہے۔ قیمت اٹھارہ روپے۔

ایک مسلمان قوم کے فکر و عمل کا اصل اور بڑا سرچشمہ قرآن مجید ہے اور اسی سرچشمے سے نئی زندگی مل سکتی ہے۔ لیکن زوال آیا تو قرآن کو سمجھ کر پڑھنا گیا۔ اب نوجوان نسل میں پھر قرآن کی طرف رجوع پیدا ہوا ہے۔ فہمِ قرآن کی یہ پیاس جدید انداز کا تفسیری لٹریچر مانگتی ہے۔ ہمارے سامنے اس ضرورت کو پورا کرنے والی ایک چیز "مجموعۂ تفسیر فراہی" حال ہی میں آئی جس کے اصل مؤلف تو مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور مرتب مولانا امین احسن اصلاحی جیسا عالم ہے کہ جو مولانا فراہی کے قرآنی ذوق اور اسلوبِ فہم کا وارث ہے۔ فراہی مکتبِ تفسیر دو مرکزی اصولوں پر مبنی ہے، ایک یہ کہ قرآن میں نظمِ کلام اور ترتیبِ گفتگو فصاحت و بلاغت کے بلند ترین معیار پر ہے اور اس نظم و ترتیب کا شعور فہمِ قرآن کی شاہ کلید ہے، دوسرے یہ کہ قرآن کو سمجھنے کے ذرائع کی صف میں خود قرآن کا مقام اولین ہے، یعنی ایک مقام کی توضیح قرآن کے دوسرے مقامات سے ہوتی ہے۔ اس مجموعہ میں "مقدمہ نظام القرآن" (جو فراہی مکتبِ تفسیر کے مرتب کردہ اصولِ تفسیر پر مشتمل ہے) آیت بسم اللہ، سورۂ فاتحہ، سورۂ ذاریات، سورۂ تحریم، سورۂ قیامہ، سورۂ مرسلات، سورۂ عبس، سورۂ شمس، سورۂ تین، سورۂ عصر، سورۂ فیل، سورۂ کوثر، سورۂ کافرون، سورۂ لہب، سورۂ اخلاص کے تفسیری مباحث شامل ہیں۔ فاضل مرتب نے مختصر دیباچہ کے علاوہ مصنف کے حالاتِ زندگی کو شاملِ مجموعہ کر کے ایک بڑی ضرورت پوری کر دی ہے۔ بلاغت، ادب، فصاحت، بلاغت، صرف و نحو، تاریخ، حدیث، سیرت اور بائبل سے متعلق بہت سی کارآمد بحثیں کتاب میں شامل ہیں۔ مجموعہ کے بیشتر اجزا پہلے علیحدہ پمفلٹوں کی صورت میں شائع

ہوئے تھے۔ اب اضافوں کے ساتھ ساری چیزیں جمع ہو کر ایک قابلِ قدر کتاب مرتب ہوگئی ہے۔ اصلاحی صاحب نے مؤلف کے اس سارے کام کو عربی سے اردو میں منتقل کرتے ہوئے بہت اچھی جاندار ادبی زبان استعمال کی ہے۔ مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی (اچھرہ لاہور) نے اسے شائع کیا ہے۔ قیمت مجلد چودہ روپے رکھی ہے، مگر اتنی اہم اور قیمتی کتاب کو جس "عمومی جلد" سے نوازا گیا ہے وہ مرکزی مکتبہ کے شایانِ شان نہیں۔

قرآن کا مطالعہ کرنے والے اردو دان حضرات عام استعمال کے متن کے ضرورت مند ہیں۔ اس ضرورت کو نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب (مقابل آرام باغ۔ فریر روڈ۔ کراچی) نے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولوی شہید الدین صاحب کی مرتبہ لغات القرآن ہمارے سامنے ہے۔ حروفِ تہجی کے لحاظ سے قرآن کے تمام مستعمل الفاظ (مع جملہ مشتقات) اس لغت میں لئے گئے ہیں۔ اس میں نہ تو مطالعہ کنندہ کو "مادہ" کے چکر میں ڈالا گیا ہے، نہ لغت کی پیچیدہ بحثوں میں گھمایا گیا ہے بلکہ الفاظ لکھ کر ایک سیدھے سادے عام مفہوم درج کر دیئے گئے ہیں۔ گویا یہ اہلِ علم کے لئے نہیں، عام لوگوں کے لئے ہے اور اس ضرورت کے لحاظ سے مفید! قیمت مجلد مع گرد پوش چار روپے۔

جائزہ ——

ماہنامہ "نئی نسلیں" (نظیر آباد ۔لکھنو) سے آپ متعارف ہوں گے۔ اس مرتبہ خاص نمبر (جنوری فروری ۶۵ء) شائع ہوا ہے۔ سرورق اور عام طباعتی معیار دلکش ہے۔ اداریہ کی "پہلی بات" میں طلیب عثمانی کے قلم سے تعمیری ادب کی مرکزی روح کے طور پر خدا کے تصور کو پیش کیا گیا ہے، مگر خدا کے تصور کو لایا گیا ہے صرف کائناتی اور کسی قدر اخلاقی پہلو سے، حالانکہ ادب کے ساتھ خدا کے تصور کا ربط واضح کرنے میں یہ پہلو کافی نہیں۔ خدا کے تصور کا سیاسی و تمدنی پہلو، اور اس انقلابی و تحریکی پہلو سامنے لایا جانا چاہیئے تھا۔ بحث میں کوتاہی اور جھول ہے۔ "دوسری بات" خاصی وقیع ہے یعنی اربابِ فن کو فن ہی کو نہ دیکھو، بلکہ مقصدیت و افادیت کا جائزہ لو۔ ذوق کا مسئلہ — ادب میں" شمس فاروقی ایم اے کا مضمون ہے اور بہت مفید اور خیال انگیز۔ گویا یہ ٹیکنیک اپنے وقت ضرورت پر نمودار ہوا ہے۔ "ماہر اپنی نظر میں" بہت دلچسپ نگارش ہے جس کے ذریعے ماہر کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر نئی شعری و ادبی قدروں کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ تین افسانے "پگڈنڈی" ہریندر "(قیصر نصری)" "مساوات" (اسعد گیلانی) "جھاتا کالانہ" (ابن فرید بی اے) شامل اشاعت ہیں۔ ان میں تخلیقی مطالعہ اور فن ہے، لیکن بہ حیثیتِ مجموعی جب ہم ادب اور مقصد دونوں کے تقاضوں کو دیکھتے ہیں تو اس میدان میں کام ترقی طلب نظر آتا ہے۔ نظموں اور غزلوں کی تعداد خاصی ہے جن میں چند چیزیں بہت اچھی اور بیشتر متوسط ہیں، کرکٹ بہر حال نہیں ہے۔ اس دو ماہی شمارے کی قیمت آٹھ آنے۔

درسیات —— مدرسہ تفہیم القرآن گھسیانہ نے جس کا سلوگن ہے "قرآن کو پڑھو، قرآن کو سمجھو، قرآن پر عمل کرو" — عربی زبان کی تعلیم کے لئے کچھ نصابی مواد شائع کیا ہے، اس میں مبادی "شرف اللسان" (حصہ اول) "الاصطلاحات" اور چار مصور چارٹ شامل ہیں۔ اس خدمت کا سہرا حافظ محمد عظمت اللہ صاحب تفہیمی کے سر ہے۔ محنت و کاوش اور جذبہ و عزم بہت قابلِ قدر ہے اور غالباً ان چیزوں کے طبع کرانے میں مالی بار بھی خاصا اٹھایا گیا ہے۔ ہم ایسی کوشش کا خیر مقدم کرتے ہوئے تعلیمی نقطۂ نظر سے چند تنقیدی اشارات بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ہمارے ہاں جہاں اصل مادری زبان تعلیمی زبان نہیں ہے بلکہ تعلیمی زبان سیکھنے کو انگریزی سے سیکھنی پڑتی ہے، عربی کی تعلیم کا درجۂ اول سے شروع کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے جو ذخیرۂ الفاظ تجویز کیا گیا ہے۔ وہ بلحاظ ہجا اور بلحاظ مقدار اس ذہنی عمر پر بوجھ ہے جس کے لئے "اللسان" کو مرتب کیا گیا ہے۔ علی الخصوص اس درجے کے بچوں کے سامنے گرامر کے مباحث کا وسیع باب کھول دینا فنی لحاظ سے صحیح نہیں۔ پھر "الاصطلاحات" کا پڑھانا تو گویا پھول کی پتیوں پر چٹانیں لادنا ہے۔ چارٹ بہت خوبصورت و رنگین ہیں۔ کافی ذخیرۂ الفاظ پر مشتمل ہیں، لیکن یہاں بھی ہجا اور صرفیت کے لحاظ سے بھاری بھرکم لغت موجود — مثلاً ضویع، طلح، وعائز، عضد، ذبلہ"

(باقی صفحہ ۲۴)

● مشرق میں نئی ابھرتی ہوئی طاقت

● جسے مغربی طاقتیں نظر انداز نہیں کرسکتیں

چین!

○ اس کے انقلاب کی کہانی!!

● ایک پادری کی زبانی!!

○ ایک سچی آپ بیتی

معلومات افروز عبرت آموز

ماؤزے تنگ کے دیس میں!

مصنف: کارلو سیگو

ترجمہ: جیلانی بی اے

قیمت: دو روپے آٹھ آنے

مکتبہ چراغ راہ

آرام باغ روڈ - کراچی۔ بیرون لوہاری دروازہ - لاہور

○ ایک بامقصد ادیب

● ایک شعلہ بیاں شاعر

○ ایک دردمند مسلمان

● ایک حساس انسان

ماہر القادری

کے آٹھ سالہ کلام

کا

مجموعہ

فردوس

اعلیٰ کتابت
معیاری طباعت

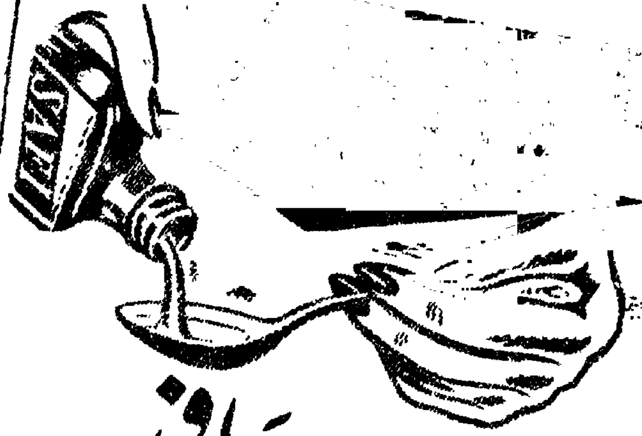
دیدہ زیب سرورق
حسین وجمیل جلد

قیمت تین روپے آٹھ آنے

مکتبہ "چراغ راہ"

○ آرام باغ روڈ ــــ کراچی ۱

○ بیرون لوہاری دروازہ ـ لاہور



چمچہ بھر صافی

موسم کی تبدیلی کے دنوں میں استعمال کرنے
● صافی کا صرف ایک چمچہ موسم کی تبدیلی کے دنوں میں استعمال کرنے سے آپ نہ صرف خرابیٔ خون سے پیدا ہونے والے امراض سے محفوظ رہیں گے بلکہ صافی آپ کے دورانِ خون میں توازن پیدا کرکے آپ کے جسم میں تازہ خون کی لہر دوڑا دے گی۔ صافی آپ کے معدے کے فعل کو درست بنائے گی۔ قبض سے محفوظ رکھے گی اور بھوک بڑھائے گی۔

موسم کی تبدیلی کے دنوں میں اپنے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی صافی پینے کی عادت ڈالئے۔ اس سے وہ پھوڑے پھنسیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔

نوٹ:۔ بیرونی استعمال کے لئے ہمدرد مرہم بے حد مفید ہے

ہمدرد دواخانہ، کراچی

Hamdard



Printed at Nazir Printing Press, McLeod Road, Karachi
Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS, Arambagh Road, Karachi.
Printer & Publisher Ghulam Mohammed M. Chaudhri

چراغِ راہ



اپریل ۱۹۵۶

مرتبہ

نعیم صدیقی

-/۸/-

روشنی ——— گرمی ——— حرکت

ماہنامہ

چراغِ راہ

کراچی

اپریل سنہ ۱۹۵۶ء

شمارہ ۳ ——— ☆ ——— جلد ۱۰

فہرست

چندہ سالانہ: ۵/- روپے، قیمت فی پرچہ: ۸ آنے
دفتر اشاعت و انتظام ——— ۹ دنیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ ۔ کراچی نمبر ۱
دفتر ادارہ تحریر ——— ۱۲ شاہ جمال، اچھرہ ۔ لاہور

چوہدری غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر چراغِ راہ، آرام باغ روڈ کراچی سے شائع کیا۔

ادارہ

سوچ بچار

اسلامی رجحان کی فتح!

آخر دستور بن گیا ہے اور قبل اس کے کہ یہ سطور چھپ کر قارئین تک پہنچیں "یومِ جمہوریہ اسلامیہ" کی تقریب گزر چکے گی اور نیا دستور نافذ ہو چکے گا!
نصب العین کو دیکھئے تو وہ بڑا بلند ہے، آخری معیار کا خیال کیجئے تو ابھی اس تک رسائی نہیں۔ لیکن آج جس درجے کا عالمگیر تسلط الحاد اور مادہ پرستی کو فکر اور تہذیب اور سیاست کے میدانوں میں حاصل ہے اور اسلامی رجحانات کے خلاف جس درجے کے تنفر و تعصب کے ساتھ بڑی بڑی طاقتیں زور صرف کر رہی ہیں، اور پھر جو شدید مزاحمت مٹھی بھر فرنگیت مآب طبقہ خود اندرونِ پاکستان دکھا رہا ہے۔ اس کا لحاظ رکھ کر جائزہ لیں تو نئے دستور میں اسلامی جمہوریت کے علمبرداروں کو بہت بڑی فتح حاصل ہوئی ہے۔

ہمارے عوام نے تعلیم کی کمی کے باوجود دستور جیسے خشک مسئلے میں جتنی گہری دلچسپی گرم جوشی کے یکساں تسلسل کے ساتھ آٹھ برس تک دکھائی ہے اس کی مثال شاید دنیا بھر کی تاریخ میں نہ ملے گی۔ اور پھر جمہوری لحاظ سے حالات کے سخت ناقص اور ناسازگار رہنے کے باوجود رائے عام کو پے در پے جو فتوحات اس مسئلے میں حاصل ہوئی ہیں وہ بڑی حوصلہ افزا ہیں۔ سخت مزاحمتوں کے باوجود قرار دادِ مقاصد ملت کے مطالبے کے مطابق پاس ہوئی، پہلی دستوری رپورٹ جو خان لیاقت مرحوم کی زیر دست قیادت میں لائی گئی تھی وہ عوام کے فیصلۂ استرداد کے تحت ردی کی ٹوکری میں ڈالی گئی، دوسری رپورٹ ٹھیک ان نکات کے مطابق مرتب ہو کر آئی جن کا مطالبہ علماء پاکستان نے کیا، پھر "عارضی سیکولر دستور" کا فتنہ ابھرا اور اسے رائے عام نے شکست دے دی۔ پھر دستوریہ ٹوٹی اور ایک غیر منتخب دستوری کنونشن بلا کر اس کے ذریعے ایک خفیہ مسودۂ دستور کو نافذ کر دینے کا منصوبہ بنا، لیکن یہ ناکام ہوا اور منتخب دستوریہ کی تشکیل ہوئی، اس منتخب دستوریہ میں جناح عوامی لیگ اور ہندوؤں نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا کہ دستور میں اسلامی رنگ نہ آنے پائے لیکن عوامی دباؤ نے ان تخریبی طاقتوں کو ناکام کر دیا۔

آج جو دستور مرتب ہو کر ہمارے سامنے ہے وہ بعض خامیوں کے باوجود بیشتر ان اسلامی ضروریات اور تقاضوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے جن کو منوانے کے لئے ملک گیر مطالبے کئے جاتے رہے ہیں۔ دینی جماعتوں کے مطالبوں میں دس بارہ کے قریب وہ ہیں کہ جو لفظ بہ لفظ اسی شکل میں تسلیم کئے گئے ہیں اور کچھ چیزیں ذرا مختلف صورت میں لی گئی ہیں۔ کچھ چیزیں ساقط بھی ہوئی ہیں، لیکن فی الجملہ اس دستور کے بننے میں سیکولرازم پر اسلامی رجحان کو فتح حاصل ہوئی ہے۔ جمہوری پہلو سے یہ دستور کم سے کم انڈیا سے بعض پہلوؤں میں بہتر اور بعض میں مساوی ہے۔ موجودہ حالات میں یہ ایک اچھی قابلِ عمل شکل اختیار کر گیا ہے آئندہ اس کی خامیوں کی اصلاح کر کے آہستہ آہستہ اسے ایک معیاری درجے تک لے جایا جا سکتا ہے۔ اس دستور کے آ جانے سے ہم اس مجہول حالت سے نکل آئے ہیں جس کے اندر سے طرح طرح کے خطرات و مہالک سر اٹھاتے رہے ہیں اور اب منزلِ اسلام کی طرف ہمارے کاروانِ حیات نے استقبال قبلہ کر لیا۔
یہی مبارکباد کے مستحق ہیں وہ خواص و عوام جنہوں نے اخلاص کے ساتھ اس دستور کی تشکیل کے لئے ہشت سالہ جدوجہد میں کسی درجے کا کوئی حصہ لیا اور اسی

طرح بھی مبارک باد کے مستحق ہیں ایسے حکمران اور نمائندگان ملت کہ جنہوں نے ایمانداری سے قومی امنگوں اور مطالبوں کو پورا کرنے کا اہتمام کیا اور مخالف طاقتوں کی مزاحمت کے سامنے جم کر کھڑے رہے۔ اور حیف ہے ان افراد اور جماعتوں پر جنہوں نے عوام کی دستوری جدوجہد کو پیچھے سے یا اوپر سے بظاہر علیحدہ رہ کر یا خفیہ تدبیروں سے نقصان پہنچانے کے جتن کئے۔

اب اس دستور کو لے کر ۲۳ مارچ سے اگر حکمران اور عوام دونوں طرز عمل کی صحیح تبدیلیوں کا آغاز کر دیں اور اپنی اپنی جگہ خدا سے نیا عہد استوار کر کے نئی زندگی کی تعمیر میں لگ جائیں تو انشاء اللہ اس دستور کے روشن پہلو اس کے کمزور پہلوؤں پر چھا جائیں گے، ورنہ اگر ذہن و کردار کا انداز وہی پہلے کا سا رہا تو پھر اندیشہ ہے کہ اس کے نقائص ابھر کر اس کے روشن پہلوؤں کو بھی غارت کر دیں گے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔

ہندو اور عوامی لیگ

نئے دستور کے بن جانے پر سب سے بڑھ کر برافروختہ ہندو ہیں اور ان کے بعد پھر اگر کوئی ناراض ہے تو وہ کمیونسٹ اور سیکولرسٹ عنصر ہے اور ان میں سے ممتاز ہیں جناح عوامی لیگ اور اس کے لیڈر جناب سہروردی صاحب!

مشرقی پاکستان کے ہندوؤں نے دستور کے اسلامی اجزا کے خلاف ہر اقدام کر ڈالا ہے۔ وہ خود لڑے ہیں، انہوں نے جناح عوامی لیگ کے اکابر اور افراد کو آلۂ کار بنایا ہے، انہوں نے جوڑ توڑ اور سازش کی صورتیں اختیار کی ہیں، انہوں نے دستوریہ سے واک آؤٹ کیا ہے، انہوں نے مرکزی وزارت کو توڑنے کے لئے اپنے آدمیوں سے استعفا دلوائے ہیں (جو منظور ہو چکے ہیں)، اور اب انہوں نے ہندو عوام کو مشرقی پاکستان سے ترک وطن کرنے کی راہ پر ڈال دیا ہے، نیز مشرقی پاکستان میں اس دستور کے خلاف اظہار نفرت کے لئے "ڈے" منانے کی تیاریاں اپنے خاص "مسلمانوں" کی مدد سے کر لی ہیں۔

ان کے روٹھنے کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی اکثریت نے ان کی مرضی کا دستور کیوں نہیں بنایا۔ ان کے جذبوں کے سب سے بڑے مسلم ترجمان سہروردی صاحب ہیں جن کا ایک اعتراض دستور پر یہ ہے کہ اس میں اسلامی اجزا کیوں لئے گئے ہیں، دوسرا یہ ہے کہ اس دستور نے بنگالیوں کے مطالبات پورے نہیں کئے۔ ان بزرگ سے تو صرف ایک گزارش کرنا کافی ہے اور وہ یہ کہ ذرا آپ اپنے قلم سے مرتب کردہ پراسرار مسودۂ دستور پبلک کے سامنے لے آئیں تاکہ موازنہ کر کے پبلک دیکھ سکے کہ آپ مغربی اور مشرقی پاکستان کو کیا کیا کچھ دے رہے تھے اور موجودہ دستور نے کس پہلو سے کوتاہی کی ہے۔

رہے ہندو، تو ان کے سامنے ہم انہی کے ایک بھائی کامنی کمار دتہ کی وہ تقریر رکھتے ہیں جو موصوف نے ۱۲ مارچ کو کومیلا کے قریب منعقد ہونے والے ایک بڑے جلسے میں کی ہے۔ وہ اس دستور کو بعض پہلوؤں سے انڈیا کے دستور پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں یہ صوبوں کو وسیع اختیارات دیتا ہے اور تمام عناصر آبادی کو نسل، مذہب اور طبقے کے امتیاز کے بغیر مساویانہ حقوق و مراعات دیتا ہے اور یہ فطری تصور انصاف پر مبنی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ دستور اسلام کے اصولوں پر مبنی ہے، لہٰذا اقلیتوں کے لئے اس میں کوئی وجہ تشویش نہیں ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ فقط "اسلام" کے معنی امن کے ہیں، سو ایسا دستور تمام گروہوں میں برادرانہ روابط پیدا کرنے کا وسیلہ ہوگا۔ مسٹر دتہ نے بڑی سختی سے ملک چھوڑنے کے پروپیگنڈے کے انسداد پر زور دیا ہے۔ موصوف نے اپنی مثال دی کہ اگرچہ خود میں نے ریاست کے اسلامی نام اور صدر ریاست کے مسلمان ہونے کی شرط والی دونوں دفعات کے خلاف ووٹ دیا ہے لیکن جب جمہوری اصول کے مطابق اکثریت نے ان کو پاس کر دیا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ لوگوں کو انہیں قبول کر لینا چاہئے۔ حاضرین جلسہ نے مسٹر دتہ کے موقف کی تائید کی اور خواہش کی کہ وہ اپنے عوام کے بموجب مرکز سے مستعفی نہ ہوں۔

دنیا کا یہ عجیب ترین غیر جمہوری مطالبہ ہے کہ اقلیت اکثریت پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کرے اور پھر اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لئے

زہریلا پروپگنڈہ کیے [illegible] سے روٹھ کر باہر چلے جانے کی تحریک چلائے اور خود اکثریت کے عناصر کو سازشی طریقوں سے باہم [illegible] یہاں عیسائی بھی بطور اقلیت بستے ہیں مگر ان کی طرف سے ایسی نامعقول حرکت نہیں کی گئی۔ مشرقی پاکستان [illegible] اور اچھے جذبات کے ساتھ اس میں اصلاح کر لیں۔ ورنہ اکثریت سے اس طرح کا دنگا کسی صورت [illegible] ہے اور آج تک ان پر کوئی دست درازی اکثریت نے عملاً نہیں کی تو پھر وہ خواہ مخواہ معاندانہ [illegible]

دو اقدامات

[illegible] اقدامات [illegible] ہیں۔

ایک [illegible] اور کرتے ہوئے ایک انتباہ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک گندا علم ہال کی پیداوار [illegible] اس کے اشتہار اور پروپگنڈے کے ذریعے ہوتی ہے۔ [illegible] سب ان کو دیکھتے ہیں اور دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ آنکھ جدھر [illegible] مناظر سامنے چلے آتے ہیں۔ یوں تو کوئی بھی فلمی اشتہار ہو اس کی تصاویر [illegible] انگریزی روزنامے میں ایک اتنا بڑے سائز کا اشتہار دیا گیا جس میں ایک فسانی جوڑے کو [illegible] عورتوں اور بچوں کی نگاہیں اس پر پڑی ہوں گی تو انہوں نے کیا تاثر لیا ہو گا [illegible] ایک طرح کی غداری نہیں ہے؟ غالباً سرمایہ داری اور نفع پرستی کی [illegible] قلب و نظر کو خطرے میں ڈال دیا جائے۔ اس بارے میں حکومت [illegible] سے ہم ایسے اقدام کی توقع نہیں کرتے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ [illegible] پبلسٹی اور نمائش پن کے انسداد کے لئے موجود ہیں ان کو دیانت داری سے استعمال [illegible] اور ریڈیو کے گانوں اور بازاری جرائد کو فحاشی سے پاک کرنے کا اہتمام [illegible] سے کام نہ چلے گا۔ چاہیے کہ اشتہارات میں اور کھیل تماشوں [illegible] اور مال تجارت بنایا گیا ہے بنیادی طور پر اس منفسدے کا سدباب کیا جائے۔

دوسرا [illegible] کو اکھیڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے یہ بھی عین مطلوب اور دستوری مقاصد سے مطابق [illegible] جب تک بدکاری کا مستقل ماحول نہ بدل دیا جائے۔ یہ ناسد ماحول [illegible] شہوانی تو نس میں مبتلا کرتا ہے اور دوسری طرف ان کا کیریکٹر [illegible] زندگی کی راہ میں رسم و رواج کے بھاری پتھر حائل کئے ہوئے ہیں [illegible] ماحول کو سامنے رکھ کر اس کی اصلاح کا کوئی جامع منصوبہ بننا چاہئے [illegible] ایک بازار معصیت کے معاشرتی پھوڑے کا منہ بند کر دینے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بدن پر

ایسے کئی پھوڑے دوسری جگہ نکل آئیں گے، یا ان کا زہر خون میں مل کر رگ رگ کو روگی بنا دے گا۔

یہ عصمت سوز ماحول!

اخباروں میں البتہ کچھ واقعات اتفاقاً نمایاں ہو کر آ گیا ورنہ نہ معلوم کتنی بی بی کے سے ابتلاء سے خدا جانے روزانہ کتنی دخترانِ ملت گزرتی ہیں، اور یا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں یا عزت مندانہ زندگی سے محروم کر دی جاتی ہیں۔ اب ایک المیہ لاہور کے اہوا ب زینتِ اخبارات بن رہے ہیں اور یہ المیہ بھی روزمرہ ہوتے رہنے والے بے شمار واقعات میں سے ایک ہے۔ ہمارا اشارہ ایک اسکول کی طالبہ مسماۃ خالدہ کی طرف ہے۔ معاملہ چونکہ عدالت کے سامنے ہے اس لئے نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحیح واقعات کیا ہیں اور کہاں تک ان کی ترجمانی غلط کی جا رہی ہے اور نہ یہی رائے قائم کر سکتے ہیں کہ کون کتنا قصوروار ہے اور کون نہیں ہے۔ ان امور کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی ہم تو یہاں صرف ماحول کے اس فسادِ مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جس کے تحت کوئی نو عمر لڑکی سکول سے گھر آتے ہوئے راستے سے اپنی مرضی سے یا کسی غنڈے کی عیاری سے یکا یک غائب ہو سکتی ہے، پھر وہ کسی کے ہتھے چڑھ سکتی ہے، وہ نفسانیت و بہیمیت کا شکار ہو سکتی ہے، اسے در در پھرایا جا سکتا ہے اور اسے پستیٔ اخلاق کے ایسے کوچوں میں گھمایا جا سکتا ہے جن کی گشت کر آنے کے بعد پھر آبرومندی اور حیاداری کی زندگی کی بحالی مشکل ہی سے قابلِ تصور ہو سکتی ہے۔

اس عصمت سوز ماحول کے اندر مس قریشی ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن گورنمنٹ کالج فار ویمن منٹگمری کے جلسہ تقسیم اسناد میں خطاب کرتے ہوئے طالبات کو یہ مشورہ دیتی ہیں کہ شادی شدہ خواتین کے لئے تو خیر گھر ہی موزوں ترین محل ہے لیکن کنواری لڑکیوں کو گھر سے باہر کی سوشل سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہئے۔ اس پر کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہی مکتب ہے اور یہی ملا تو پھر کارِ طفلاں تمام خواہد شد! اسی طرح کا فاسد مغربی ذہن ہے جو ہمارے نظامِ تعلیم اور جدید کلچر کے اندر کام کر رہا ہے اور اسی کے زیرِ اثر ہماری ہزار ہا خالداؤں کو کسی نہ کسی دردناک ٹریجیڈی سے گزرنا پڑتا ہے۔ تعلیم ان کو گندے فلموں اور گندے ناولوں اور افسانوں کے دروازے پر جا کر چھوڑ دیتی ہے، پھر وہ ایک طرف بناؤ سنگار کا جدید فاسقانہ آرٹ سیکھتی ہیں اور دوسری طرف معاشقوں کی چاٹ پڑتی ہے اور تیسری طرف بے پردگی و آوارگی اور معاشرے میں گھومنے پھرنے کا ذوق ان کے اندر پروان چڑھتا ہے۔ اس طرح ان کی ذہنی دنیا میں شیاطین اپنے مستقل کیمپ کھول دیتے ہیں۔ پھر ان کے ایک ایک ذہنی رخنے کو تاک کر ہمارا غنڈہ عنصر ان پر شبخون مارتا ہے اور آبروؤں کے بستے رستے شہر اجڑ جاتے ہیں اور یہ روشن خیال بنانے والی تعلیم اپنے مفتوحین میں اتنی استعداد بھی تو پیدا نہیں کر سکتی کہ غنڈوں کے نرغے میں آئی ہوئی کوئی جان اپنا بچاؤ کر سکے یا اپنے لئے کوئی راہِ فرار نکال سکے۔

سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ ہم کروڑوں روپیہ سالانہ پولس اور سی آئی ڈی پر خرچ کر رہے ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ غنڈہ عناصر پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ مثلاً خالدہ ہی کے معاملے سے بہت سے افراد کا تعلق معلوم ہوتا ہے اور فرض کیجئے کہ وہ تمام یا ان کا بیشتر حصہ موجودہ ناقص قانون کی گرفت میں نہ آ سکے یا شہادت کے تقاضے عدالت کے سامنے پورے نہ ہو سکیں، لیکن پولیس کے علم میں تو ان کی فہرست آ گئی اور اس طرح کے دوسرے سیکڑوں واقعات میں ہمیشہ آتی رہتی ہے۔ کیوں نہیں اس امر کا انتظام کیا جا سکتا کہ ایسے لوگوں کی نقل و حرکت پر سی آئی ڈی کی مستقل نگرانی قائم کر دی جائے۔ بجائے سیاسی اور دینی جماعتوں کے سربراہ کاروں اور کارکنوں کی حدِ مبالغہ تک نگرانی کرنے کے، سوسائٹی کے غنڈہ عناصر (اور خصوصاً شریفوں کے بہروپ میں رہنے والے اور دولت کے زور سے بڑے آدمی بننے والے غنڈہ عناصر) پر پوری پوری توجہ صرف کی جائے۔ ان کی نقل و حرکت پر وقتاً فوقتاً پابندیاں لگائی جاتی رہیں، ان کو بوقتِ ضرورت انتباہ اور وارننگ دے کر سیدھا رکھا جائے۔ یہ صورت اختیار کی جائے تو یقیناً حالات میں فرق واقع ہو سکتا ہے۔

اس کے ساتھ پرانے قوانین کو اسلامی تقاضوں کے مطابق نئی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً دائرۂ نکاح کے باہر واقع ہونے والے صنفی تعلقات (چاہے وہ جبری ہوں یا رضا کے ساتھ) کو سنگین فوجداری جرم ٹھہرایا جائے۔ کسی خاتون یا لڑکی کو جو اپنے شرعی اولیا رکھتی ہو سرے سے قانوناً یہ حق نہ ہونا چاہئے کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر کسی جگہ آجا سکے یا کسی غیر مرد سے کسی طرح کے دوستانہ روابط رکھ سکے اور دوسری طرف اگر اس کا بغیر اذن اولیا کسی غیر گھر میں یا کسی غیر مرد کے ساتھ رہنا یا سفر کرنا یا کسی طرح کے تعلقات رکھنا ثابت ہو تو اس غیر مرد اور غیر گھر کے لوگوں کو بہ حیثیت مجرم سزا ملنی چاہئے۔ البتہ خیارِ بلوغ کا جو حق شریعت نے ظالم اولیا کے مقابلے میں عورت کو دیا ہے اس کے استعمال کا قانونی راستہ معین ہو جانا چاہئے اور وہ یہ ہو کہ عورت یا لڑکی بالغ ہونے پر عدالت میں درخواست دے اور اس درخواست کے قبول کرنے پر ہی اس کا ولی مجاز قرار پائے۔ اس نہج پر قانونی تبدیلی ہو جائے تو پھر کسی کو جرأت نہ ہوگی کہ وہ کسی لڑکی کو راہ چلتے بہکالے جائے اور جدھر جی چاہے گھماتا پھرے۔

علاوہ بریں اگر بدکاری کو واقعی روکنا مطلوب ہو تو سفلی جذبات کو بھڑکانے والے عوامل کا سدِباب ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں ایک قانون "انسداد ترغیباتِ زنا" کی غرض سے بننا چاہئے۔ اس کے ذریعے ان فلموں، گانوں، تصاویر، اشتہارات اور حرکات و کنایات کو فوجداری جرم ٹھہرایا جائے جو کھلے کھلے طریق سے اپنے اندر سفلی جذبات کی غیر معمولی تحریک کا سامان رکھتے ہوں۔ ورنہ بدکاری کوئی کمزور طاقت نہیں ہے کہ جس کا ازالہ محض ایک خیالی خواہش سے ہو جائے۔

حسین بی بی جیسی سیکڑوں خواتین اور خالدہ جیسی ہزارہا نوجوان بچیاں فریادی ہیں کہ ان کو فاسد ماحول کے بھڑکائے ہوئے بہیمانہ جذبات سے بچائیے!

پاکستان، انڈیا اور اقوامِ مغرب

ہندوستانی امپیریلزم کا اژدہا کشمیر کو نگلنے کے بعد حیدرآباد، جوناگڑھ اور مناوَدر کو یکے بعد دیگرے ہڑپ کرتا چلا گیا۔ کشمیر نسبتاً زیادہ ثقیل تھا اس لئے وہ جلدی سے ہضم نہ ہو سکا بلکہ اس نے بھارت کے معدے میں خاص گڑبڑ مچا رکھی ہے بلکہ بار بار اسے درد و کرب کے دورے پڑتے رہے ہیں۔ پاکستان جس کے بدن کا یہ ایک عضو تھا، عرضی لکھ کر یو۔ این۔ او کے سامنے لے گیا۔ آزاد کشمیر کے عوام اور کچھ مجاہدوں نے اپنے کشمیری بھائیوں کی نجات کے لئے بے جتن کئے، مگر پاکستان کی امن پسندی نے ان کے ہاتھ بھی باندھ دیئے اور بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ یو۔ این۔ او نے ڈھیلی ڈھالی سی پالیسی اختیار کی تاکہ اس عرصے میں انڈیا اس لقمۂ تر کو ہضم کرلے اور پھر جب اس کا کیموس بن کر خون کی شکل اختیار کر جائے تو عرضی کو اٹھا کر داخل دفتر کر دیا جائے۔ اسی پالیسی کے تحت مسئلۂ کشمیر آہستہ آہستہ سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ اسی دوران میں روسی لیڈر ہندوستان آئے اور ان کو کشمیر لے جایا گیا تو مارشل بلگانن نے اپنے بیان میں کشمیر کو انڈیا کا حصہ قرار دیا۔ اس کی وجہ سے پاکستان میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی لیکن پاکستان کے مغربی دوست دم سادھے پڑے رہے۔ انہی حالات میں اواخر ۵ کی کشمیر کانفرنس میں پاکستان اور آزاد کشمیر کے نازک جذبات ایک بار پھر ابھر کر سامنے آگئے۔ ادھر سیٹو کا حالیہ اجلاس کراچی میں منعقد ہونا طے پایا۔ انڈ پورا زور صرف کیا کہ مسئلۂ کشمیر اس میں نہ چھڑنے پائے۔ لیکن مسئلۂ کشمیر چھڑا اور کانفرنس نے اس کی اہمیت کو بالاتفاق تسلیم کیا اور اس کے حل کے لئے اقوامِ متحدہ کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ اس واقعہ پر نئی دہلی کا چہرہ لال پیلا ہو گیا۔ چنانچہ امریکی وزیرِ خارجہ ڈلس لپکے ہوئے پہنچے اور انہوں نے سیٹو کے کئے کرائے کو غارت کر کے رکھ دیا۔ پاکستان اپنے موقف پر چند گز آگے بڑھا ہوگا لیکن ڈلس نہرو سازباز نے اسے اٹھا کر میل بھر پیچھے پھینک دیا۔ ڈلس دور رس اثرات رکھنے والی باتیں کہی ہیں:

... یہ کہ پاکستان کو جو دفاعی امداد دی جا رہی ہے وہ کسی طرح کے جارحانہ اقدام کے لئے نہیں ہے اور ایسی شرائط کے تحت دی جا رہی ہے

ستان کسی ملک — خصوصاً انڈیا — کے خلاف جنگی قدم اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔

— اگر پاکستان انڈیا کے خلاف کبھی تلوار اٹھائے تو امریکہ بھارت کے ساتھ ہوکر اس سے لڑے گا۔

ان باتوں سے ہماری سابق خارجہ پالیسی کی ناکامی پوری طرح سامنے آجاتی ہے کہ نہایت حقیر اور ناکافی امداد کے بدلے ہم نے اپنے آپکو ایسے معاہدات میں جکڑ لیا ہے کہ اب ہم اپنا حق بچانے کے لئے بھی کسی کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کر سکتے، اور ہر معاملے میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ امریکہ ہمارے اقدام کو "جارحانہ" تو قرار نہیں دیتا۔ دوسرے یہ تلخ حقیقت بھی ہم پر پوری طرح آشکارا ہوجاتی ہے کہ مغربی طاقتیں پوری طرح ساتھ دینے والے ممالک کے مقابلے میں آزاد اور خوددار پالیسی رکھنے والے ممالک کو اہمیت دیتی ہیں، نیز وہ دنیا بھر میں مسلمان طاقتوں کے خلاف کسی نہ کسی غیر مسلم طاقت کو مضبوط بنائے رکھنا چاہتی ہیں تیسرے یہ کہ ان طاقتوں کا کوئی اصول بجز افادیت پرستی اور موقع شناسی کے نہیں ہے کہ جس کی بنا پر ان پر اعتماد کیا جاسکے۔ نتیجہ یہ کہ انڈیا کے ظالمانہ اقدام کے حق میں اور پاکستان کے خلاف روس اور امریکہ دونوں نے اپنا پورا وزن ڈال دیا ہے۔ اس موقع پر ڈلس نے سیاسی یارانے کی پینگیں بڑھانے کے لئے پنڈت نہرو کو امریکہ آنے کی خاص دعوت بھی دی ہے۔

اب انڈیا کی جسارت اور بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں چاڈبٹ کے معاملے میں اس نے دراندستی کی ہے اور اب تو پوری دو ڈویژن فوج لاکے ڈال دی ہے۔ ابھی ۱ار مارچ کو روہی وال کے قریب ہندوستانی سرحدی دستوں نے سرحد کا خط پار کرکے پاکستانی علاقے میں آکر مورچہ بندی اور فائرنگ کی ہے۔ اُدھر مشرقی پاکستان کی سرحد پر حکومت آسام کی سرحدی پولیس نے ۲۴ فروری اور یکم مارچ کے درمیان متعدد بار پاکستانی نگرانوں پر گولیاں برسائی ہیں اور گفت و شنید سے طے شدہ سمجھوتے کی خود ہی خلاف ورزی کی۔ اور ہمارا جواب — احتجاج! احتجاج!! احتجاج!!!۔

کشمیر حاصل کرنا تو آگے کی چیز ہے امجرد زندہ و آزاد کے لئے ناگزیر یہ ہے کہ ہم اپنے اندر زندگی کی نئی روح پیدا کریں، اپنے قومی گھر کے ایک ایک ذرۂ خاک کی حفاظت کے لئے مضبوط جذبات کو بروئے عمل لائیں، ہرتن رفق کرکے اپنے اندر سے قوت سمیٹیں اور اپنے جزوی اختلافات کے علی الرغم بنیادی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے قطعی طور پر متحد اور ہم آہنگ ہوں!

چند باتیں

۱- کچھ اہم تر مصروفیات کے تسلسل کی وجہ سے چند ہفتوں سے خطوط کے جواب نہیں دیئے جاسکے اور ڈاک جمع پڑی ہے، مزید چند روز اس ادائے فرض کا موقع نہیں ملے گا۔ البتہ ان خطوط میں سے ضروری قابلِ اشاعت مواد لے لیا گیا ہے۔ متعلقہ احباب مطلع رہیں۔

۲- "آپ کیا پڑھیں" کے صفحات اس مرتبہ جگہ نہیں پاسکے۔ آئندہ ماہ جمع شدہ کتب و جرائد پر اظہارِ رائے کر دیا جائے گا۔

۳- مضمون نگار حضرات براہ کرم صاف اور جلی لکھائی کا اہتمام کریں، سطروں کے درمیان جگہ چھوڑیں اور کم سے کم ایک طرف کھلا حاشیہ بھی رکھیں۔ علاوہ بریں اوقاف لگانے اور دوسری علامات استعمال کرنے میں خاص احتیاط فرمائیں نئے لکھنے والے احباب کا مشورہ ہے کہ عبارت کی ترتیب الفاظ کو معیاری بنانے کے بعد مضامین بھیجا کریں۔

عبداللہ خاور

نسیمِ مہر و وفا کا بدل گیا ہے چلن!
مشامِ جاں سے اُلجھتی ہے بوئے پیراہن!

محیطِ وادیٔ دل پہ ہے ایک سناٹا
کہاں تھمی ہے رہِ انتظار میں دھڑکن!

اُلجھ رہا ہوں شفق کے حسیں نظارے سے
کہ مجھ سے چھوٹ گیا ہے کہیں ترا دامن!

ہجومِ یاس میں آہنگِ نو بدلتا ہے
ترے خیال کا نغمہ ہے کس قدر پُرفن!

بڑے مزے سے یہ رہگذار گزرے گی
نہ بجلیوں ہی کا ڈر ہے، نہ اب غمِ خرمن!

دلِ حزیں نے ہزاروں فریب کھائے مگر
نظر سے چھٹ، نہ سکا اعتبار کا دامن

یہ کائنات ہے عنواں اسی فسانے کا
کسی نظر میں تمنا! کسی جبیں پہ شکن!!

وہیں ہے مسئلۂ ترک و اختیارِ وفا!
شعور و قلب و نظر میں بہت رہی اَن بَن

یہ صبح بھی نہ بہت دور ہو کہیں، خاور!
کہ شام ہی سے ہے دل میں عجیب سی الجھن!

نعیم صدیقی

مئے تو ہے، مئے کا وہ معیار نہیں ہے ساقی
اس میں وہ نور نہیں، نار نہیں ہے ساقی

دردِ دل ملتا ہے، دارو نہیں بکتے ہیں یہاں!
جاؤ، جاؤ! کوئی عطار نہیں ہے ساقی

دینِ رندی کی روایات پہ طاری ہے زوال
تجھ میں ساقی کا سا کردار نہیں ہے ساقی!

خالی صہبا سے ہو گیا! اچا ہے کچھ فیضِ نگاہ
بزم بے ہوش ہے، سرشار نہیں ہے ساقی!

ہم تو آتے ہیں یہاں تیری کشش کے مارے
خاکِ مے خانہ سے کچھ پیار نہیں ہے ساقی!

شعر و نغمہ بھی ہے، صہبا بھی ہے، معشوق بھی ہے
اور ہر چیز ہے! "تلوار" نہیں ہے ساقی!

مئے عصیاں کہ جو غارت گرِ ایماں ٹھہری
دل اب اس مئے کا طلبگار نہیں ہے ساقی!

اور جو کچھ ہوا، سو وا گرِ تقویٰ نہ ہوا
شیخ! صد شکر ریاکار نہیں ہے ساقی!

انور صدیقی

نگاہِ غیر میں گو دانۂ سپند رہے
تمہارے عشق میں ہم لوگ سربلند رہے

فرازِ دار ملی یا قفس کی تنہائی
راہِ وفا میں بہر گام قید و بند رہے

جنوں اُٹھے گا ابھی شوخیٔ حیات لئے
کچھ اور دیر ... ہر پہ وعظ و پند رہے

پتا نہ تھا کہیں اہلِ ہوس کا کوسوں تک
رہے تو بزم میں تیرے ہی دردمند رہے

تمہارے غم سے جلائیں ہیں کتنی قندیلیں
تمہارے حرفِ محبت پہ کاربند رہے

شعور بدایونی

میں جو دُور اُفتادۂ منزل رہا
رہنما ہی راہ میں حائل رہا

سوزِ ایماں کا نہ جو حامل رہا
کون کہتا ہے کہ وہ دل دل رہا

خار و خس کو دیکھئے، کیا دیکھئے
یہ گلستاں ہی کب اِس قابل رہا

اپنا پیماں دیکھ اے پیماں شکن
میرا دل تو ٹوٹ کر بھی دل رہا

لوگ میلوں پیش قدمی کر گئے
ہائے کتنی دیر میں غافل رہا

بس ذرا سی اور ہمت اے شعورؔ
وہ رہا، وہ دیکھ، وہ ساحل رہا

منظرِ کلیمی

قاتل کو دیکھتا ہوں سوئے دار دیکھ کر ۔۔۔ خوش ہو رہا ہوں آگ کو گلزار دیکھ کر
واقف نہ تھا حضور ! رہ و رسمِ عشق سے ۔۔۔ مَیں کھا گیا فریبِ نگہِ پیار دیکھ کر
آ بیٹھے اب تو آپ کئی بار خواب میں ۔۔۔ ہم جا رہے ہیں آپ کو اِک بار دیکھ کر
ساقی بھی میکدہ بھی مئے و جام بھی مرے ۔۔۔ حیران ہوں جسارتِ اغیّار دیکھ کر
اے چاند آج چاندنی اپنی سمیٹ لے ۔۔۔ مَیں آ رہا ہوں حُسن کا شہکار دیکھ کر
میں قتل گاہِ عشق میں آیا ہوں شوق سے ۔۔۔ اِک اک قدم پہ زیست کے آثار دیکھ کر
مجبور ہو کے اہلِ جفا ہوں گے مہرباں ۔۔۔ منظرؔ جفا سے اتنا ترا پیار دیکھ کر

کیفی جام پوری

رہ نہیں سکتے کبھی ناکام ہم ۔۔۔ ہیں حریفِ گردشِ ایّام ہم
مسکراتے ہیں تہِ شمشیر بھی ۔۔۔ اس قدر ہیں خوگرِ آلام ہم
دہر سے ہم کو مٹائے کون کیا ! ۔۔۔ دہر کا آغاز ہم ! انجام ہم
بزمِ عالم میں ہماری گونج ہے ۔۔۔ ہیں خدا کا آخری پیغام ہم
دشمنوں کے واسطے قہرِ خدا ۔۔۔ دوستوں کے حق میں لطفِ عام ہم
سرکشوں کی گردنیں خم ہو گئیں ۔۔۔ جب اُٹھے لے کر خدا کا نام ہم
زیست اپنی ہے سراپا جستجو ۔۔۔ ہر گھڑی رہتے ہیں بے آرام ہم
ڈھونڈتے ہیں مشکلاتِ تازہ ہم ۔۔۔ مرتے ہیں بہرِ حیاتِ تازہ ہم

عارف حسین عارف

میرے دامن میں ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں ۔۔۔ زندگی بھر تخم ہائے معصیت بوتا رہا
آ گیا تھا اپنے اعمالِ سیہ کا کچھ خیال ۔۔۔ تیرا عارف منہ چھپائے رات بھر روتا رہا

ابنِ فرید بی اے

منٹو کا فن شخصیت کے آئینہ میں

(۲)

صرف کمزوریاں ہی نہیں اُس کی شخصیت کی اور دوسری کمزوریاں اُس کے ادب میں نمایاں ہوگئی ہیں جنہوں نے اُس کے ادبی مقام کو بری طرح مجروح کیا ہے اور خود اُسی سے اُس چولی کے اتارنے کا بھی ارتکاب کرا دیا ہے۔ جس کے پہنانے کے سلسلے میں وہ اپنے آپ کو معذور پاتا ہے۔ کیوں کہ جس طرح منٹو شراب کا بُری طرح عادی تھا بالکل اسی طرح اُس کے افسانوی کردار بھی بے دھڑک اور بے پناہ شراب پیتے ہوئے ملتے ہیں۔ اور شراب سے وہ اپنا غم غلط کرنا چاہتے ہیں۔ "ہی" کے کردار جیڈا کی طرح انہیں کوئی میسر نہیں آتا۔ شراب کی طرف سے ان کے اندر کسی طرح کی کراہیت نہیں ہے۔ وہ اسے اپنے لئے مضر سمجھتے ہوئے بھی ناگزیر سمجھتے ہیں کیوں کہ اُن کا خالق منٹو بھی تمام عمر اسی خوش گمانی میں مبتلا رہا۔

"بہت زیادہ شراب پینے لگا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ کچھ لکھوں۔ پی کر میں لکھ ہی نہیں سکتا۔"

(خط بنام احمد ندیم قاسمی مورخہ ۱۲ فروری ۳۹ء — منٹو)

"وہ اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ شراب پی کر بہکتے نہیں۔ ان کی اس جسمانی معذوری کا ان کے سامنے مبہم سا بھی اشارہ کر دیا جائے تو ان کے پندار کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ کاش وہ محسوس کر سکتے کہ شراب ان کے لئے کتنی مضر ثابت ہو رہی ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ان کی صحت کے مقابلے میں اُن کی شخصیت کو اس نے کہیں زیادہ برباد کیا ہے۔"

"بسترِ مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔"

(منٹو ماموں کی موت — حامد جلال)

"ایمبولنس جیسے ہی دروازے پر آکر کھڑی ہوئی انہوں نے شراب کا پھر مطالبہ کیا۔ ایک چمچہ وسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی۔ لیکن شاید ایک قطرہ مشکل سے اُن کے حلق سے نیچے اتر سکا ہوگا۔ باقی شراب اُن کے منہ سے گر گئی اور اُن پر غشی طاری ہوگئی۔"

(منٹو ماموں کی موت — حامد جلال)

تو دراصل غم غلط کرنے کی کوشش دراصل زندگی سے فرار اختیار کرنے کی سب سے بڑی کوشش ہے۔ ایک راہب آبادیوں کو چھوڑ دیتا ہے لیکن اپنے ہوش و حواس سے مستغنی نہیں ہو پاتا۔ اُس کا فرار پھر بھی نامکمل رہتا ہے لیکن ایک شرابی آبادیوں میں رہتے ہوئے بھی دنیا کے جھمیلوں سے حسّی طور پر بے تعلق ہو جاتا ہے۔ اُس کی شکست خوردگی اُسے دنیا کی آغوش میں بے حس رہنے کا ایک بہانہ دیتی ہے۔ چنانچہ یہ شکست خوردگی ہمیں منٹو کے اندر پوری طرح کارفرما نظر آتی ہے۔

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے بھگوڑے قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو جیسا کہ میں نے دیکھا۔ میرا خیال ہے باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو۔ جن حالات میں اچانک

ایک دن منٹو دہلی سے غائب ہو گیا۔ تقریباً انہیں حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اُس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے نذیر اجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود بھی اُس فرار کا باعث تھا۔ کیوں کہ لڑائی میں، جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا، خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اُسی کے حربوں کو اُس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔

(منٹو میرا دشمن — اوپندر ناتھ اشک)

اس شکست خوردگی ہی کی وجہ تھی کہ اس میں کاسہ لیسی اور خوشامد بھی اچھی خاصی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے تحفظ کے لئے اس ذلیل ترین طریقے کو بھی استعمال کرنے سے باز نہ آتا تھا۔

منٹو کو خوشامد کرنے سے عار نہیں تھا۔ مکرجی کے پاس بیٹھ کر اُن کی خوشنودی کے لئے منٹو کو غالب کے اشعار سناتے ہوئے میں نے دیکھا ہے (حالانکہ میں سمجھتا ہوں، مکرجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکرجی کی عظمت کم نہیں ہوتی۔ اپنے فن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں لیکن غالب کو سمجھنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ اور چونکہ بنگالی ہونے کے ناتے بنگال کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر اُن کے نزدیک غالب سے بڑا ہے!) اشوک اور واچا کی محفل میں بیٹھ کر سوقیانہ لطیفے سناتے دیکھا ہے اُن بڑے ایکٹروں اور پروڈیوسروں ڈائرکٹروں کی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے بکواس کرتے سنا ہے (جسے منٹو بکواس اور دوسرے بذلہ سنجی کا نام دیتے تھے)۔

(منٹو میرا دشمن — اوپندر ناتھ اشک)

اُس کی یہ گراوٹ اُس کے کتنے ہی کرداروں میں پائی جاتی ہے، لیکن مقامِ شکر ہے جس طرح اُس نے "بانجھ" "نعرہ" اور "اُس کا پتی" میں شکست خوردگی، خودکشی، دیوانہ پن اور جنون کو افسانہ کا موضوع اور عروج (CLIMAX) بنا کر پیش کیا ہے اُس طرح اس نے مذموم صفت کو علاوہ سوقیانہ مکالمات اور لطائف کے اپنے کرداروں میں نمایاں طور پر پیش نہیں کیا ہے بلکہ شعوری طور پر اس کو چھپانے ہی کی کوشش کی ہے۔

بہر حال شکست خوردگی اور جنون کو منٹو کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ دو تین بار وہ دماغی توازن سے محرومی کی وجہ سے ہسپتال بھی بھیجے جانے کے لئے مجبور ہوا۔ اسی لئے اُن کی زندگی بڑی تلخ تھی۔ اُن کے گھر والے اُن کی عادات کی وجہ سے اُن سے خوش نہیں رہتے تھے۔ اپنی بیوی کے بارے میں اُس کا بیان ہے

اُس کی بیوی اُس سے بہت نالاں ہے۔ وہ اُس سے اکثر کہا کرتی ہے کہ تم افسانہ نگاری چھوڑ دو۔ کوئی دکان کھول لو۔

(منٹو — سعادت حسن منٹو)

اور منٹو کے بھانجے نے اس طرح اُن کی بیوی کے تاثرات کو پیش کیا ہے۔

اُن (منٹو) کی بیوی کو جب معلوم ہوا کہ میں بھی ادیب بنا ہوں اور کچھ لکھنے بھی لگا ہوں تو میری بیوی سے جو اُن کی سب سے چھوٹی بہن تھی یہ کہا "خدا کرے یہ پڑھا ہو۔ ورنہ کہہ دو کہیں مصنف نہ بنیں ورنہ انہیں بھی عمر بھر پچھتانا پڑے گا" جب ان کے اس قول کا مجھے علم ہوا تو میں نے اس پر حیرت و استعجاب کا بالکل اظہار نہیں کیا۔

(منٹو ماموں — حامد جلال)

چنانچہ یہی شکست خوردگی تھی جنہوں نے منٹو کی زندگی کو ویران کر دیا۔ اُس نے اپنی زندگی کے اس گرداب سے آخری وقت میں نکلنے کی کوشش کرنی چاہی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

انھوں نے شراب نوشی کی انتہا کرکے اپنی موت کو دعوت کیوں دی؟ یہ سوال اس بیمار [illegible] ہوئے میرے ذہن میں بار بار آرہا تھا۔ رنجیدہ ہونے کے بجائے مجھے غصہ آ رہا تھا۔ یہ انتہا پسندی اپنے اہل و عیال کی محبت اور [illegible] طبیعت میں کشمکش عرصے سے جاری تھی اور میدان بالآخر شراب کے ہاتھ رہا تھا۔ مجھے شک تھا کہ چند دنوں سے وہ [illegible] سے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرار کا یہ آسان [illegible] راستہ تھا۔ یا پھر وہ اپنے خاندان والوں کو [illegible] نے ان سے مایوس ہو کر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

(منٹو [illegible] — حامد جلال)

فنکار نمبر ۳ [illegible] اپنا افسانہ بھیجتے ہوئے [illegible] منٹو نے مجھے لکھا [illegible] شراب وہ ان دنوں پی رہا ہے اس سے تعجب ہوا ہے کہ ابھی تک وہ مرا کیوں نہیں۔ [illegible] ان دنوں [illegible] جس میں اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ اس کی [illegible] ہے کہ افسانہ نگاری چھوڑ کر کوئی چھوٹی موٹی دکان کھول دوں [illegible] ملی۔ تو میرا یقین پختہ ہو گیا کہ منٹو اپنی آئی سے نہیں مرا [illegible]

(دوسری بات [illegible] — [illegible])

دراصل زندگی کو اس نے [illegible] کی تنخیوں سے ربط میں منہ چھپا کر جان [illegible] ایسی بزدلی کو [illegible] اگر منٹو کے [illegible] ہوتی تو شاید اس کا یہ حشر نہ ہوتا مگر اس کی [illegible] تھی۔

منٹو کی اور میری [illegible] اور یہ چار دل [illegible] ہو گیا تھا [illegible] وہ [illegible] ۱۹۴۸ [illegible] تھا۔ اس نے [illegible] دیکھا۔

(منٹو [illegible] — [illegible])

پھر وہ لیوں نہ اپنی زندگی سے کے لئے [illegible]

اعتراض کیا جاتا ہے کہ منٹو لکھنے والوں [illegible] کی طرف سے جواب نہیں دوں گا — اپنے متعلق [illegible] کہہ رہا ہوں [illegible] ان سے — سمجھ لیجئے کہ مجھ میں PERVERSION ہے اور اگر آپ [illegible] جانچ سکتے ہیں تو سمجھ میں کہ یہ بیماری مجھے کیوں لگی ہے —

(پیش لفظ "منٹو کے افسانے" — منٹو)

اس PERVERSION اور انتخابِ موضوع کی وجہ دراصل وہی ہے جس کی طرف اوپندر ناتھ اشک نے اشارہ کیا ہے۔ زندگی میں انسان اپنے لئے جو ماحول اختیار کرتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اُس کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ اس کے ذہن و فکر کا ایک جز بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ دن رات کی پست یا علیٰ مصروفیات دماغ کو انہیں کوائف کے بارے میں سوچنے کے لئے مجبور کردیتی ہیں۔ ثانیاً فرد کو جس میدان میں عملی تجربات ہوتے ہیں اُسی کے بارے میں وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے بلکہ غیر اختیاری طور پر تمام مثالیں اور تمام موضوعات وہیں سے وارد ہوتے ہیں۔ چنانچہ میدان کا رہنے والا پہاڑوں کی چوٹیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور پہاڑوں کی چٹانوں پہ سکونت اختیار کرنے والا پستیوں کے بارے میں زبان نہ کھولے گا۔ منٹو نے جس پست ترین میدان کو اپنے لئے منتخب کیا تھا اور جس میں اُس کی دن رات کی دوڑ رہتی تھی اُس نے اس سے صرف جنس ہی کے بارے میں لکھوایا اور اس کے وہی افسانے مقبول بھی ہو سکے۔ موجودہ دور میں جوش اور شفیق الرحمٰن کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ جوش اس دور میں شاعرِ انقلاب ہونے کے باوجود جب تب "عشقیہ نظمیں" لکھنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

میرے اٹھارہ بڑے بڑے عشقوں میں سے سترہ عشق ایسے رہے ہیں جن کا محبوبوں کی طرف سے بھرپور جواب پایا گیا ہے۔
(خط بنام پروفیسر احتشام حسین ـــــ جوش)

اور اسی طرح شفیق الرحمٰن بھی "رومانی کہانیاں" لکھنے کے لئے مجبور رہیں۔

شفیق کے "رومانس" اس کے دوستوں میں ایک مذاق بن چکے ہیں۔ وہ متعدد اور دلچسپ ہیں۔ چند ایک سے عبرت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ وہ ایک "مستقل" عاشق ہے یعنی پچھلے سترہ اٹھارہ سال میں شاید ہی کوئی ایسا لمحہ اس کی زندگی میں آیا ہوگا، جب وہ کسی بتِ طناز کے دامِ زلف میں اسیر نہ تھا۔ وہ اپنے محبوبوں کو اس کثرت سے بدلتا ہے جس کثرت سے لوگ اپنی قمیص یا اپنے ہیٹ بدلتے ہیں۔ ایک رومان ابھی بیچ میں ہوتا ہے کہ وہ دوسرا شروع کر سکتا ہے۔ "ترک شدہ محبوب" کا نام تک اُس کے ہونٹوں سے نہیں سنا جاتا۔
(شفیق الرحمٰن — محمد خالد اختر)

منٹو کے ساتھ یہی ایک وجہ نہیں تھی کہ اُس نے اس ماحول میں سانس لی تھی اور اس کی نجاست اور خباثت پر اُس کا خمیر نہیں گندھا تھا بلکہ ان دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن کھل کر نہ لکھتے تھے لیکن انہوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولا بنا رکھا تھا جس پر وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور اس پر روزی کے سوا دوسرے بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت ترقی پسندوں کو عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے مارے پھرنا ہی واحد موضوع معلوم ہوتا تھا۔
(منٹو: میرا دشمن ـــ اوپندر ناتھ اشک)

اس رجحان کے پسِ پشت وہی PERVERSION کام کر رہا تھا جس کی طرف منٹو نے خود اشارہ کیا ہے۔ پھر جب اس طرح کی کاوشوں سے لذیت کا بازار بنا لیا تھا تو یہ تجارتی ضرورت کے تحت لازمی ہو گیا کہ وہ جنس پرستی سے ہٹ کر کسی اور موضوع کے لئے قلم کو شاذ و نادر ہی استعمال کرے۔ اور خود اپنی اس پستی کو حسین قالب میں پیش کرے اور ایسی توجیہات سے قابلِ قبول بنائے جو لذتیت پرست ذہن کے لئے عین فطری ہوں۔ خواہ انسان انسانیت کے مرتبے سے اتر کر کبوتر کبوتری، بلا بلی اور دوسرے حقیر ترین جانوروں کی صف میں کیوں نہ شامل ہو جائے۔

.... یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حوا آدم سے لے کر اب تک مرد کے اعصاب پر

عورت سوار رہی ہے اور کیوں نہ رہے۔ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہئے۔ جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ کر ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں۔ عورتیں، کبوتریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ، خوب صورت اور فکر خیز ہیں —— کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟ (پیش لفظ "منٹو کے افسانے" - منٹو)

لیکن پھر جلد ہی منٹو کو محسوس ہو گیا کہ اُس کا یہ فیصلہ اور دعویٰ بڑا جذباتی ہے۔ اُس کا اپنے PORVERSION کا اعلان کر دینا اُس کے فنی مرتبہ کو گھٹائے گا چنانچہ اُس نے اپنے جنسی افسانوں کی وقعت کو خود ہی کم کر دینا چاہا۔

مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں —— میں اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں سے ملا ہوں —— وہ افسانے جو میں نے عورتوں سے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے ہیں یا محض دماغی عیاشی کے لئے —— میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے، اسی لئے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا —— ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں اور ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں۔ مگر وہ رومانی نہیں ہیں۔"

(افسانہ "بانجھ" —— منٹو)

اس کے باوجود جن افسانوں نے منٹو کو بے حد مشہور کیا وہ اُس کے وہی افسانے ہیں جو جنسی موضوعات کے حامل ہیں۔ حالانکہ یہ مشہور ترین افسانے ہی خام اور مہمل یا مضر ہیں خواہ ان کے مرتبہ کو کتنا ہی اونچا اُٹھایا جائے۔ مثلاً "دھواں" کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں کہ اس کے نفسیاتی حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پروفیسر عزیز احمد کے نزدیک ؎ ——

دھواں کسی کچی لکڑی کا دھواں نہ سہی، لیکن میرے خیال میں یہ ڈی۔ ایچ لارنس کو اچھی طرح ہضم نہ کر سکنے کی وجہ سے بد ہضمی کی ڈکار ہے۔ اس قسم کے افسانوں کی سماجی نقطۂ نظر سے ایک ہی وجہ جواز ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ بچوں کو شروع سے جنسی تعلیم ملنی چاہیے لیکن اس خامی کو واضح کرنے کے لئے ایسے ترغیب انگیز افسانے لکھنا، جن کو پڑھ کے ہی بچے جنس کو اور زیادہ مریضانہ نظر سے دیکھیں، انقلابی نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں۔ (ترقی پسند ادب —— عزیز احمد)

"ٹھنڈا گوشت" بھی منٹو کا ایک بہت ہی مشہور افسانہ ہے اور اس کے متعلق بھی ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ہاجرہ مسرور وغیرہ کا خیال وہی ہے جو "دھواں" کے بارے میں ہے مگر یہ افسانہ بھی اپنے اندر پورے فنی لوازمات رکھنے کے باوجود ویسی ہی مریضانہ جنسیت رکھتا ہے جیسی دوسرے افسانوں میں ہے —— "پھاہا" اور "بلاؤز" میں واقعہ نگاری کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اور یہ دونوں واقعے زندگی کے ایسے مشاہدات پر مبنی ہیں کہ جن کے بارے میں افسانہ نگار خود بھی نہیں بتلا سکتا کہ ان کو ضبط تحریر میں لانے کے بعد وہ سماج سے کیا چاہتا ہے۔ اس طرح کے جنسی داعیات کا ابھرنا عین فطرت ہے لیکن ان کا علاج ترفع اور تہذیب ہے لیکن افسانہ پڑھ جانے کے بعد اس طرح کی کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ "بو" ایسے افسانوں سے جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے وہ تو اور بھی گھناؤنی اور پست ہے، کہ جنسی تعلقات کے لئے رندھیروں کو اونچی سوسائٹی کی لڑکیوں کی تمنا کرنے کے بجائے گھاٹنوں کو اپنے دامِ محبت میں پھنسانا چاہئے۔ یہی تشویش ہے جس نے "خوشیا" کو بردہ فروشی کرنے کے باوجود جذبات میں براہ راست ہیجان محسوس کرنے کی وجہ سے بے تکان اسی سمندر میں چھلانگ لگوا دی جس میں وہ دوسروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر غرق کرتا رہا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ —— ...... جنسی مسائل کی عکاسی بھی زندگی کے ایک بنیادی مسئلے کی عکاسی ہے۔ یہ ادب بھی ہے، زندگی کی سی بھی لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ ساری زندگی نہیں ہے۔ بری زندگی بھی نہیں ہے۔ اور بڑی زندگی اور صالح زندگی کے برتصور میں جنسی

میلانات کی ترجمانی ضروری ہے۔ اس لئے انہوں کی کثرت اور اس قسم کے افسانوں کی کثرت جو فنی نقطۂ نظر سے بلند سہی، اور اعلیٰ ادبی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے ایک خطرہ ضرور ہیں۔

(ترقی پسند تحریک ۔ آل احمد سرور)

مگر منٹو اس حقیقت سے ہمیشہ لرزاں رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے فن کو جدت پسندی پر کلیتہً قربان کر دیا۔ اور اس کے افسانے ایک ذہنی ہنگامہ آرائی اور کریہہ منظر کے علاوہ کوئی دیرپا اثر نہ چھوڑ سکے۔ اور بقول پروفیسر وقار عظیم "یہ چیز افسوس ہے کہ اس کے فنی انحطاط کی واضح دلیل ہے" کیونکہ

منٹو کو غالباً اس بات کا احساس اور اندازہ ہے کہ زندگی پر اور اس سے بھی زیادہ فن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ اس کے انتشار میں جو بات ہو ... اس لئے اسے یہ کمی کسی اور طرح پوری کرنی چاہیے یا ممکن ہے نہ ... فطرت نے ایک قوت سلب کر کے دوسری کو زیادہ ابھار دیا ... قانون کی پیروی کی ہے۔

(تقسیم کے بعد منٹو کے افسانے ۔ پروفیسر وقار عظیم)

بہرحال اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے گرے ہوئے لوگوں کو کثرت سے اپنا موضوع کیوں بنایا؟ ۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو لذتیت اور عریانی کے ان طول طویل تذکروں کے لئے کوئی ذریعہ فراہم نہ ہوتا جن سے وہ اپنی نجی زندگی میں طف اندوز ہوتا رہا، اور جن کو وہ اس لئے اختیار نہ کر سکا کہ وہ سماج کی برائیاں ہیں۔ اسے یقین تھا کہ جس طرح وہ ان برائیوں کو پیش کر رہا ہے اس طرح ان کا قلع قمع نہیں ہو سکتا ہے چنانچہ خود وہ بھی ... ان نے ان ... کرداروں کے لئے پست زبان، گندہ طبیعت، مریضانہ جذبات اور ناپسندیدہ عادات کو منتخب کیا کہ اس طرح نہ تو اس کو اپنے فن کے لئے ریاض کرنا پڑے گا اور نہ کسی صنعت یا وصف کے لئے اسے کوئی ایسا تجربہ کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے معمولات کو ... کرنے سے ... ہو جائے۔ فن میں اس نے جو کچھ کمایا ہے وہ سب اس کی نجی زندگی سے مکتسب تھا چنانچہ وہ فن کا بھی ... جب ... اس کی طرف سے ہٹنے والی ہیں تو اس نے اپنے اندر کشش پیدا کرنے کے لئے تمام جتن کر ڈالے۔ جہاں ... ہیجان انگیز اور جذبات کو پراگندہ کرنے والے موضوعات کو اختیار کر کے اس نے انتہائی فکری گراوٹ کو بھی قبول کر لیا۔

منٹو کی موجودہ دور کی افسانہ نگاری فن کے نقطۂ نظر سے باتیں بنانے یا زیادہ سے زیادہ ایسی بازی گری اور شعبدہ بازی کی افسانہ نگاری ہے جس میں ایک تجربہ کار کھلاڑی اپنے کرتب دکھا دکھا کر دوسروں کو خوش کرنے میں مصروف ہے۔ اس بازی گری اور شعبدہ بازی میں وہ اکثر ایسا مدہوش ہوتا ہے کہ اس کا سارا جسم ... اور وہ کرتب دکھاتا رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی جب وہ اپنے آپ کو عارضی کشش کے ان چند ... سے ... ایسے لوازم ... تخیل اور تصور کے جو سر ابھر کر ہر چیز پر چھا جاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے ... کم آتے ہیں اور دیر ... اور بظاہر یوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شخصیت کے متضاد عناصر کی اس کشمکش میں وہ عنصر آہستہ آہستہ مغلوب ہو رہا ہے ... میں ٹھہراؤ اور استقلال پیدا

(باقی ص ۲۴)

اسعد گیلانی

ڈاکوؤں کی بستی

۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو اتوار کے روز صبح نو بجے لئی ندی کے کنارے ایک جھکے ہوئے بڑے کہن سال درخت کے تنے سے لٹکی ہوئی ایک نوجوان لڑکی کی لاش پائی گئی۔

شہر سے نکل کر بستی کی طرف جانے والے ایک چرواہے کی نظر اس پر سب سے پہلے پڑی۔ اس نے اپنی بھیڑ بکریوں کو اس درخت کی طرف جانے سے روک دیا اور اپنے لمبے لٹھ سے جلدی جلدی ہانک کر دوسری طرف لے گیا۔ اسے خوف تھا کہ کسی نے اسے وہاں دیکھ لیا تو تھانے میں بڑی زبردست پٹائی ہوگی اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ ہو جائے۔ اس طرح نو بجے تک بیسیوں راہگیروں نے اسے دیکھا لیکن ہر شخص وحشت زدگی کے عالم میں کن انکھیوں سے آسمان و زمین کے درمیان اس نوشتۂ اجل کو معلق دیکھتے ہوئے پہلو بچا کر دھڑکتے دل کے ساتھ گزر جاتا رہا۔ یہاں تک کہ اسکول کے کچھ بچوں نے اسے دیکھ کر وہاں جمگھٹا لگا دیا اور پھر تو پولیس کا ایک سپاہی بھی ٹہلتا ٹہلتا وہاں آ نکلا۔ پہلے تو اس نے بھی [illegible] جانے کے انداز سے آگے کی طرف قدم بڑھا دیئے لیکن اچانک نہ معلوم اسے کیا خیال آیا کہ اس نے زور زور سے سیٹی بجائی اور تھوڑی دیر میں وہاں سپاہیوں اور راہگیروں کے ہجوم میں وہ نامعلوم لڑکی جس نے کرۂ ارض کو اپنے نیچے سے پرے دھکیل دیا تھا زمین کی سنگین چھاتی پر پڑی تھی۔ لیکن رسّے سے کھنچ کر گردن کافی لمبی ہو گئی تھی۔ آنکھیں باہر ابل آئی تھیں اور جسم اکڑ کر تختہ بن گیا تھا۔

درخت کے پاس [illegible] کا ایک چھوٹا سا اٹیچی پڑا تھا۔ ایک [illegible] میں ایک شال اور چند کتابیں تھیں جن پر یہ لکھا ہوا تھا۔

”زرینہ خداداد۔ تھرڈ ایئر سٹوڈنٹ۔ محافظ ملت کالج جہلم“

اٹیچی کے اوپر کتابیں رکھ کر کتابوں پر ایک لفافہ نمایاں طور پر رکھا ہوا تھا۔ جسے پیپر ویٹ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ خط رکھنے والے نے اسے یوں رکھا تھا کہ جیسے اس سارے المیہ ڈرامے کا راز اس خط کے سینے میں بند تھا اور جسے اس راز کو سمجھنا ہو کہ اس درخت کے ساتھ وہ لڑکی کیوں معلق تھی اور اس نے زندگی کے اکیس سال گن گن کر گزار دینے کے بعد اچانک یہ فیصلہ کیوں کیا تھا کہ اس ظلمت کدۂ دہر سے اپنا دامن جھاڑ کر اٹھ جائے تو وہ اس خط کو احتیاط سے کھولے۔ اطمینان سے پڑھے اور اس لٹکتی ہوئی لاش پر حیرت کی نظر ڈالنے کی بجائے سنجیدگی سے سوچے۔ زندگی جس رخ پر بھی چلی جا رہی ہے اس کے متعلق کچھ فیصلہ کرے کہ کیا اسے بھی یہی رخ پسند ہے۔ وہ جو اکڑی ہوئی لاش کپڑے درخت کے تنے کے ساتھ معلق ہو گئی تھی تو دراصل وہ فضائے کائنات میں اس انسانی معاشرے کے سامنے ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑی تھی۔ وہ معاشرہ جس نے اسے پیدا کیا پالا۔ پوسا۔ بڑا اور سمجھدار کیا۔ بھلے برے کی تمیز پیدا کی اور جب وہ بھلے برے کو سمجھنے کے قابل ہوئی تو اسے ناگن کی طرح نگل لیا۔

پولیس کے ہاتھ میں سب سے پہلے وہ خط ہی آیا۔ جس نے ساری کہانی پر سے پردہ اٹھا دیا لیکن وہ خط شائع نہیں ہوا۔ صرف اس خودکشی کی ایک مختصر سی خبر اخبارات میں آگئی۔ اور لاش پوسٹ مارٹم کے بعد زمین کے کسی گوشے میں دفن کر دی گئی۔

موقعہ پر آنے والے سپاہی نے اس وقت جائے وقوعہ کے پاس ذرا رک جانے والے ایک شناسا راہگیر کو وہ خط سنایا جو اس لڑکی کے درخت کے

ساتھ لکھنے سے پہلے اپنے ملک کے بلند ترین آدمی کے نام لکھا گیا تھا لیکن اس خط کا مخاطب اس کے ملک کا ہر شہری تھا۔ سپاہی نے اپنے پنجابی آمیز اردو لہجے میں جو خط [illegible] کر سنایا وہ یہ تھا۔

صاحب عالی

[illegible] میں اپنے آپ کو [illegible] کے ساتھ لٹکا کر مار دوں گی اس لئے کہ میری زندگی [illegible] بیٹھنے پر ایک [illegible] کا ناسور بن گئی ہے۔ اگر مر جاؤں گی تو وہ رو دھو کر چند دن کے بعد مجھے بھول جائیں گے اور [illegible] کہ میری ذات [illegible] ان کے [illegible] نہ کہے [illegible] وہ فوجی آدمی ہیں لیکن اگر زندہ رہوں گی تو میں ان کے لئے اور ان سب کے لئے جو مجھ سے [illegible] ہوں گے پلنا پھرتا عذاب ہوں گی۔ لوگ میری طرف انگلیاں اٹھائیں گے۔ سرگوشیاں ہوں گی۔ میں نے سب کچھ [illegible] موت کو [illegible] دعوت دیتے ہیں [illegible] میں نے ٹھنڈے دل سے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے [illegible] اس نظام کے جس کے آپ سربراہ کار ہیں

آپ [illegible] اپنی قوم کے نوجوانوں کے لئے باپ کی جگہ ہیں میں آپ کو ابا سمجھ کر [illegible] نہیں [illegible] اسی طرح کھولے جس طرح ایک باپ کا [illegible] مجھے آپ کی ذات سے نہ کوئی حسن ظن ہے اور نہ سوئے ظن ہے جب آپ کو [illegible] اس لئے یہ خط آپ کو ایک بیٹی کی حیثیت سے لکھ رہی ہوں۔ [illegible] رسوائی کا داغ آپ کے دامن پر لگے۔ آپ کے سینے پر چمکے اور آپ [illegible] پہلے آپ کی اپنی بیٹیوں کی عزت پر بھی ہاتھ ڈالنے [illegible]

[illegible]

[illegible] میرے باپ کا نام خدا داد خان ہے [illegible] نسل سے تھی۔

[illegible] ماحول میں رہی کہ جس میں شرافت [illegible] لیکن ایک عام مسلمان گھرانے [illegible] اور اس سے شرافت خود بخود موجود ہوتی [illegible] ابتدائی ایام گزارتی ہے۔

مجھے [illegible] کہ ہمارے معاشرے کی اونچی سطح پر عورتوں میں خود نمائی ایک بیماری [illegible] مردوں کے ذہنوں میں [illegible] سانس کی طرح چل رہی ہے۔ ماحول سے بالکل بے خبر اور حالات کی حقیقی صورت سے قطعی [illegible]

[illegible] کا بہت شوق تھا چنانچہ مجھے انٹرمیڈیٹ کالج برائے مستورات میں داخل

کر دیا گیا۔ یہاں آکر مجھے بعض باتیں بہت کھٹکیں۔ نصرت کھٹکیں لگا مجھے [illegible] میں کالج [illegible] سے پہلے [illegible]
کے اس کالج میں آکر اچانک محسوس ہوا جیسے چلتے چلتے سر بازار میرا [illegible] سب الٹ گیا ہو اور میرا [illegible]
لڑکیوں کے اس کالج میں پہلے ہی ہفتے میں میں نے محسوس کیا اور [illegible] پریشان [illegible] لڑکیاں [illegible]
عجیب عجیب رومانٹک ناموں سے بلاتی ہیں اور ان کے بلانے کا انداز [illegible]
آتی ہیں۔ بعض لڑکیاں [illegible] اس طرح ایک دوسری کے لئے جذبات [illegible] جیسے [illegible]
حالت تھی جس سے مجھے سابقہ پیش آیا۔ ان دو سالوں میں میں نے اندازہ لگایا کہ ان [illegible]
دیا جاتا ہے کہ جو کر مار رہاں سے ڈھل [illegible] ان کے نزدیک [illegible]
کم گوئی اور کم آمیزی کی وجہ سے زیادہ [illegible] اور بات ہے کہ دو سال کے [illegible] لیکن میں نے
اسے قبول نہ کیا۔ یہ غنیمت ہے کہ میں [illegible]
سکیں وہ ایسی تھیں کہ ایک عورت [illegible]
زیادہ پسند کرتے۔

انٹرمیڈیٹ کے بعد لڑکیوں کا کوئی ڈگری کالج نہ تھا۔ [illegible] منتقل کیا
کہ لڑکیوں کا انٹرمیڈیٹ کالج [illegible] گھر والوں
نے فیصلہ کیا کہ مجھے مخلوط تعلیم کے لئے لڑکوں کے کالج میں [illegible]
کر کیا کریں۔ پڑھنی رہو [illegible]

اور پھر میں [illegible] کالج میں داخل ہو گئی
گویا کوئی نیا جانور پڑا پا کھڑ میں آ گیا [illegible]
تھا۔ چار دن [illegible] جھجکتی اور جھجکتی ہوئی [illegible]
ہی محدود نہ تھیں۔ پروفیسر تک ایک مخصوص [illegible]
لیکن گھر والوں نے ترقی اور تعلیم کے شوق میں [illegible]
گویا کچھ موتی ہوں [illegible] باتوں کے تصور سے مجھے [illegible]
آپ کو نکو بنا [illegible] جینا کے گانے [illegible]
کیا کہ ہماری کیفیت ایسی تھی جیسے بھوکے [illegible]
پڑی تھیں۔ بے زبان خاموش اور مسلسل [illegible]
تیسرے سال کے پانچویں مہینے مشاہدہ [illegible] لڑکیاں [illegible]
کتنا آسان نہ رہا۔ نسرین کی شادی ہو گئی اور وہ چھوڑ کر چلی گئی [illegible] مسلسل کشمکش [illegible]
میں پردہ جینا کوئی آسان کام نہیں ہے اور [illegible]

بے جو باقی نہیں رکھی جا سکتی۔ البتہ اخلاقی اقدار کی پابندی سے قائل رہی بلکہ پابند رہی ہیں۔ میں نے اس دوران میں یہ اندازہ لگایا کہ اگر کوئی لڑکی موم کی گڑیا بن کر رہے اور کسی نہ کسی صورت خود نمائی کے مرض میں مبتلا ہو جائے تو پھر اس کے لئے صفائی سے چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ سادگی، کم آمیزی اور دلکشی بہت کچھ ڈھال کا کام دیتی ہیں۔

اب میں آپ کو اپنی زندگی کا [illegible]

پرسوں امی نے بتایا کہ خالہ جان کا [illegible] وہ بیمار ہیں اور انہوں نے ملاقات کے لئے ہمیں بلایا تھا۔ امی نے مجھے کہہ دیا کہ میں ہی پشاور جا کر خیریت معلوم کر آؤں۔ بڑے بھائی [illegible] کی وجہ سے [illegible] اور چھوٹا بھائی اپنی کچھ دوسری مصروفیتیں رکھتا تھا۔ میں تنہا پشاور جانے کے لئے تیار ہو گئی [illegible] والدین اور بھائیوں [illegible] خالہ کے ہاں گئی تھی البتہ تنہا میرا یہ پہلا سفر تھا۔

امی نے [illegible] اپنی اٹیچی اور چند کتابیں لے کر بعد دوپہر روانہ ہو گئی [illegible] اسٹیشن پر دو گھنٹے کے انتظار کے بعد دوسری گاڑی ملتی تھی۔ اب مجھے دو گھنٹے [illegible] پلیٹ فارم نمبر [illegible] پر پشاور کی گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ میں اپنا سامان اٹھا کر ایک کونے میں بچھے ہوئے بنچ پر آ کر بیٹھ گئی اور اٹیچی پاس رکھے ہوئے ایک کتاب [illegible] پلیٹ فارم آنے والی گاڑی کے مسافروں سے خالی ہو گیا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ اور بتیاں جلنے لگی تھیں۔ [illegible] ایک عجیب گھٹن سی محسوس کر رہی تھی۔ تنہائی، اداسی اور [illegible] انتظار کی [illegible] چاروں طرف فضا میں منڈلا رہا تھا۔

مجھے بیٹھے ہوئے [illegible] ایک [illegible] عورت [illegible] میرے قریب آئی اور کھڑی ہو کر میرے اٹیچی کو گھورنے لگی۔ پھر اس نے اسے ہاتھ سے چھوا اور [illegible] اٹھانے کی کوشش کی [illegible] اسے بتایا کہ اماں یہ اٹیچی میرا ہے۔

[illegible]

[illegible] کہا

[illegible] کر کہا

[illegible] پاس آ کھڑا ہوا۔

[illegible]

یہ میرا اٹیچی [illegible] بولتی ہے

[illegible] آ گیا

[illegible] اس لئے کہ اس میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

میں نے [illegible]

دیکھئے [illegible] کیس میرا ہے [illegible] گاڑی کا انتظار ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" میں نے ڈرتے ہوئے دل کے ساتھ پورے تہذیب اور سنجیدہ انداز میں جواب دیا [illegible] چیخ کر گالی دی اور وہ سوٹ کیس اٹھا لیا اور تھوڑی دیر میں شور و غل سن کر ایک باوردی سپاہی بھی وہاں آ گیا۔

"کیوں بے کیا شور مچا رکھا ہے" اس نے ڈانٹ کر کہا

"یہ چھوکری میرا اٹیچی اٹھا لائی ہے اور اب دیتی نہیں۔ دھونس جماتی ہے" [illegible] نے کہا۔

"معاملہ تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے" سفید پوش آدمیوں نے بیک زبان کہا۔

"یہاں کسی کے باپ کی دھونس نہیں چلے گی۔ چلو سب ہی طرح تھانے میں۔ فیصلہ ہو جائے گا" سپاہی نے [illegible]

اور سفید پوش آدمیوں نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔ سپاہی نے میرا بازو پکڑ لیا اور [illegible]

"دیکھئے صاحب مجھے گاڑی پر جانا ہے۔ میں نے کسی کا سوٹ کیس نہیں چرایا۔ یہ میرا اٹیچی ہے۔ آپ لوگ میرا [illegible] میں نے گھبرا کر ملتجیانہ لہجے سے کہا۔

"گاڑی وا ڑی دیکھی جائے گی۔ لوگوں کے سوٹ کیس اڑا کر گاڑی پر نہیں بیٹھا جا سکتا۔ تھانے میں سب معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے ایسے بہت کیس پکڑے ہیں۔ یہ بدمعاش گاڑیوں میں چوریاں کرتی ہیں۔ نیا طریقہ نکالا ہے" سپاہی نے جھڑکا

میں جیسے رو دیتی۔ آنسو میرے حلق میں آ کر رک گئے۔ میرا وہاں کوئی نہ تھا۔ میرا واقف نہ تھا اور چند منٹ [illegible] لوگوں سے گھیرا ہوا تھا۔ وہ کشاں کشاں مجھے تھانے میں لے گئے۔

"کیوں بے انتظام کے بچے یہ کیا معاملہ ہے" تھانے کے اندر بیٹھے ہوئے خوفناک مونچھوں والے تھانیدار نے کہا

"حضور یہ ایک نیا کیس ہے" انتظام نے کسی قدر [illegible]

"لاؤ تو اس نئے کیس کو ادھر۔ سب ہاں نکل جائیں [illegible]"

اور ڈھیل کرکے مجھے تھانیدار کے سامنے کر دیا۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا [illegible] ایک شیطانی [illegible] کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں مبہوت انداز میں بیٹھ گئی۔

"بتایئے آپ نے کتنے اٹیچی چرائے ہیں" [illegible] شیطانی [illegible]

"میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں جناب [illegible]" میں نے عاجزی سے کہا۔

"یہاں سب سازشیں کھل جاتی ہیں [illegible]"

اور انتظام چلا گیا۔ تھانیدار صاحب نے میز پر سر جھکا کر کچھ لکھنا [illegible]

"یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں کس چکر میں پھنس گئی ہوں۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں چرایا [illegible] میری گاڑی آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ میری گاڑی نکل گئی تو کیا ہوگا" میں اپنے دل میں سوچتی رہی [illegible]

اتنے میں وہ دونو سفید پوش صاحب بھی سگریٹ سلگا کر [illegible] میں تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر باہر نکل گئے اور پھر [illegible] جلتی ہوئی اٹھی اور باہر نکل گئی۔

"تھانیدار صاحب خدا کے لئے میری بات سنیے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں چرایا ہے۔ میں [illegible] میری گاڑی آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ میری گاڑی نکل گئی تو بہت مشکل ہو گی آپ مجھے جانے دیجئے" میں نے پوری لجاجت سے کہا۔

تھانیدار صاحب نے یونہی سر ہلایا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ میں کانپ اٹھی۔

"ٹھہرو" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئے۔ میں نے احاطے کے دروازے کی چٹخنی لگنے کی آواز سنی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں آ گئے۔

"اچھا بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے بتا دیا۔ کہنے لگے نام تو اچھا ہے کام ایسے کرتی ہو۔

میں نے کہا "میں نے چوری نہیں کی۔ یہ سب جھوٹا الزام ہے۔ میں کالج کی سٹوڈنٹ ہوں۔ آپ میرے کالج میں لکھ کر پوچھ سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے جانے دیں۔"

"چوری تو کی ہے۔ انگوٹھی کی نہیں تو کسی اور چیز کی کی ہو گی۔"

"کسی چیز کی نہیں۔" میں نے وثوق سے کہا۔ مجھے کمرے کی فضا بوجھل محسوس ہو رہی تھی کھڑکی کی سلاخیں پنجرے کی تیلیوں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں اور میرے سامنے تھانیدار صاحب ایک ذلیل مکروہ اور معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر لئے کھڑے تھے۔

پھر اچانک وہ میرے قریب آ گیا۔

اس کی سانس میں نے اپنے سر کے بالوں کے پاس محسوس کی۔

"دیکھو سچ سچ بتا دو۔ ہم سے کوئی شخص اپنا جرم چھپا کر نہیں لے جا سکتا۔"

اور یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ میں تھر تھر کانپ رہی تھی اور میری ٹانگوں میں دم نہ رہا تھا وہ کتے کی طرح آنکھیں جھپکا جھپکا کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میرا جی چاہا کہ چیخوں لیکن میں چیخ نہ سکی۔

"دیکھو آج تم یہیں رہو۔ صبح کی گاڑی سے تم کو جہاں جانا ہے بھیج دیا جائے گا۔"

اس نے شیطانی انداز میں دانت نکالتے اور آنکھیں ذرا میچتے ہوئے میرے ہاتھ کو تھام کر کہا۔

ساری سازش مجھ پر کھل گئی۔

"پیچھے ہٹو۔ کمینے۔ ذلیل۔ کتے۔ میں نے چیخ کر کہا۔ میں نے زور سے چیخنا چاہا لیکن اچانک اس کا ہاتھ میرے منہ پر آہنی ہتھوڑے کی طرح آ کر لگا۔ میری زبان لڑکھڑائی۔ پھر ایک زور کا طمانچہ میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا اور میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے۔ پھر میری گردن پر ایک شدید ضرب پڑی اور پھر مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔

صرف یوں محسوس ہوا کہ میں کسی پہاڑ کی بلند چوٹی سے ایک گہرے کھڈ میں گری چلی جا رہی تھی وہ کھڈ آگ سے بھرا ہوا تھا۔ آگ میرے چاروں طرف ناچ رہی تھی۔ آگ کے شرارے میرے جسم پر رقص کر رہے تھے۔ میرے جسم کو جیسے کتے جھنجھوڑ رہے تھے۔ میں جیسے مر گئی تھی۔ میری لاش کو جیسے گدھ نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ میری روح کو آگ کی سلاخوں پر کھینچا جا رہا تھا میرے دماغ پر جیسے ناچ رہے تھے۔ میرے دل پر برف کی سل رکھ دی گئی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں کو تپتی ہوئی زنجیروں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ میں زمین اور آسمان کے درمیان معلق تھی اور میرے نیچے ایک دہکتا ہوا الاؤ بھڑک بھڑک کر جل رہا تھا۔ جیسے میں خشک لکڑی کا ایک کندہ تھی جسے آتش نمرود میں جلایا جا رہا تھا۔

کیسے کیسے خوفناک خواب میرے سینے پر ہتھوڑے مارتے رہے۔

میری جب آنکھ کھلی تو میں ایک بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک تنگ سا کمرہ تھا جس کا ایک ہی دروازہ تھا اور وہ بھی بند تھا۔ میرا انگی اور میرے کپڑے

سامنے تپائی پر پڑے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ میرے جسم پر کوئی دوسرا لباس تھا۔ آہستہ آہستہ میرے حواس ٹھکانے آنے لگے واقعات سنڈامنڈ کر میرے دل و دماغ میں ناچنے لگے اور تب مجھے پتہ چلا کہ میں لٹ گئی تھی میں تباہ ہو گئی تھی اور میری زندگی میں سے پاکیزگی کا موتی جھلک کر ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے اٹھنا چاہا لیکن نقاہت سے جسم میں شدید درد محسوس ہوا — لیکن میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے اندر گویا تیزاب بھر گیا تھا اور میرے اعصاب کی جگہ گرم لوہے کے تار آ گئے تھے۔ ایک دیوانگی سی میرے اوپر طاری ہونے لگی

اچانک وہ دروازہ کھلا اور دوسرے کمرے سے وہ شیطان مسکراتا ہوا سامنے آگیا۔

وہ شیطان۔ وہ بھیڑیا۔ وہ ظالم۔ وہ اچکا۔ وہ اوباش۔ وہ ڈاکو — حضور والا وہ آپ کا کارندہ۔ میرے سامنے آگیا۔ گندی مسکراہٹ لئے ہوئے۔

میرا جی چاہا کہ اس پر پل پڑوں۔ اسے مار دوں یا خود مر جاؤں لیکن میں شل ہو گئی۔ میرے حواس بجا نہ رہے۔ میرا صرف یہ جی چاہا کہ زمین میں دھنس جاؤں۔

وہ میرے قریب آیا۔ اس نے میرا اٹیچی اٹھا کر میرے ہاتھ میں دیا۔ میرے کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دی اور کہا۔

"دیکھو زرینہ میرا نام عنایت شاہ ہے۔ راولپنڈی کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے۔ جب کبھی راولپنڈی آؤ تو میرا غریب خانہ نہ بھولنا۔ میرے علاقے میں کوئی مشکل پیش آئے تو بس عنایت شاہ کا نام لے دینا۔ اتنا ہی کافی ہوگا — جاؤ"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور منہ اندھیرے جب کہ آسمان پر تارے ابھی چمکتے ہوئے تھے مجھے بازو سے پکڑ کر دروازے سے باہر کر دیا۔ اور اب میرے سامنے کوئی منزل نہ تھی۔

زمین پر میرا کوئی گھر نہ تھا اور آسمان پر اس فانی جسم کے ساتھ جانا ممکن نہ تھا۔ جدھر میرے قدم اٹھ گئے۔ میں چلتی رہی اور سوچتی رہی۔

"خودکشی اچھی چیز نہیں ہے۔ یہ میں سوچتی رہی۔ لیکن میں کہاں جاؤں۔ اب اس دنیا میں مجھے کون جانتا تھا۔ کون پہچانتا تھا۔ میں کس کو جانتی تھی۔ سبھی کچھ تو میرے لئے اچانک بدل گیا تھا۔ کیا گھر چلی جاؤں تاکہ بھائیوں کے سینے پر ایک گہرا ناسور بن جاؤں وہ جب میری طرف دیکھیں تو انہیں احساس ہو کہ وہ غلاظت کے گندے گڑھے میں گر گئے ہیں۔ مجھ میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ کیا ماں باپ کے ماتھے پر ایک مستقل کلنک کا ٹیکہ بن کر لگ جاؤں۔ ماں کی راتوں کی نیند اور دنوں کا چین اڑا دوں۔ محلہ والوں کے لئے ایک تہمت بن جاؤں۔ عزیزوں کے لئے ایک گالی بن جاؤں ایک چلتی پھرتی لاش بن کر تعفن پھیلاتی پھروں۔ کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ ڈاکوؤں کی اس بستی میں اب کیسے زندہ رہوں۔ درندوں کے اس جھنڈ میں کیسے سانس لوں جہاں میں اب کسی کی نہ بہن ہوں نہ بیٹی ہوں۔ نہ ماں ہوں — میں اب آخر کیا ہوں۔

جناب والا۔ آپ ہوتے تو میں خود آپ سے پوچھتی اور اب نہیں تو خدا کے ہاں جب یہ مقدمہ کھڑا ہو گا تب پوچھوں گی کہ آپ نے اپنی مظلوم قوم کو ڈاکوؤں کے حوالے کیا۔ ان کی عزتیں چوروں کے حوالے کیں اور ان کی آبروئیں اپنے اقتدار کے ترازوؤں میں تول تول کر بیچیں۔

میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب بھائیوں اور ماں باپ کو منہ نہ دکھاؤں۔ صبح ہونے والی ہے اور میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ جس زندگی پر ایک رات نے ڈائن کی طرح چھاپا مارا اب وہ زندگی سورج کی کرن نہ دیکھے۔ مجھے سورج کی شعاعوں سے بھی شرم آتی ہے جو صبح میرے باپ کے معصوم چہرے پر بھی کھیلیں گی اگر انہوں نے مجھے اس حال میں زندہ دیکھ لیا تو وہ کیا کہیں گی۔ یہ رات اگر اپنی تاریکی کا لبادہ سمیٹ کر آگے نکل گئی تو سورج کی درخشاں روشنی میں میں اپنی برہنگی کیسے چھپاؤں گی۔ یہ تارے اگر ڈوب گئے تو پھر میرا کون ساتھی رہ جائے گا۔

جنابِ والا! میں آپ سے صرف یہ پوچھتی ہوں کہ کیا آپ کی بھی کوئی بیٹی ہے - کیا آپ کی بھی کوئی بہن ہے - کوئی ماں ہے - اگر ہے تو ذرا سوچئے کہ اس ڈاکوؤں کی بستی میں جس کے سردار آپ ہیں وہ کیسے محفوظ ہیں اور اگر ان کے لٹ جانے کی خبر آپ کو کوئی آکر دے تو آپ کے سینے پر کیسے سانپ لوٹیں گے - کیسے خون کھولے گا - تب آپ کو اندازہ ہوگا کہ آبرو کا زخم کتنا گہرا ہوتا ہے ——— میرے باپ نے تلوار کے زخم بارہا کھائے ہیں لیکن یہ زخم جو آپ کے کارندے نے ان کو دیا ہے یہ ان کی برداشت سے باہر ہے - اس سے وہ جانبر نہ ہوں گے - اس لئے میرا ٹھکانہ اب نہ زمین ہے کہ وہ تنگ ہوگئی، ناپاک ہوگئی اور ڈاکوؤں سے بھر گئی اور نہ آسمان ہے کہ اس کے پٹ میرے لئے بند ہیں اور وہاں تک میری پہنچ نہیں صرف اس کہنہ سال اکیلے درخت کا آسرا ہے جس کے نیچے بیٹھ کر میں یہ خط لکھ رہی ہوں اور مجھے امید ہے کہ یہ کہنہ سال درخت جس نے بے شمار پت جھڑ دیکھے ہیں ایک دردمند زندگی کو ضرور سہارا دے گا -

اب میں اپنی داستان ختم کرتی ہوں اس دن کے لئے جب یہ مقدمہ دوبارہ خدا کے حضور پیش ہو میں کائنات کے وسیع خلا میں اپنے بازو پھیلائے اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتی رہوں گی -

الوداع میری پیاری امی - میرے عزیز ابا اور میرے پیارے بھائی تمہاری گنہگار زری سورج نکلنے سے قبل ہی تاریکی میں منہ چھپا کر ہمیشہ روپوش ہو جائے گی تاکہ آپ کے پاکیزہ دامن پر وہ بدنما داغ نہ بن سکے - الوداع -

زرینہ خداداد

یہ خط مکتوب الیہ تک کبھی نہ پہنچ سکا اور زرینہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد پرانے قبرستان میں انجمن اہل سنت والجماعت کے اہتمام میں دفنا دی گئی -

آسمانِ ہستی سے ایک ستارہ ڈوب گیا

بقیہ: منٹو کا فن شخصیت کے آئینہ میں

کرتا ہے -

(تقسیم کے بعد منٹو کے افسانے ——— وقار عظیم)

اور اب یہ بات کہنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی ہے کہ منٹو کی فکری، عملی اور ذہنی پراگندگی نے اُسے ٹھہراؤ اور استقلال سے یکسر محروم ہی رکھا - اُس کے پیش کردہ ادب کا غالب ترین حصہ محض ہیجان انگیز اور جذباتی ہو کر رہ گیا - اس لئے یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ ادب میں اس نے اپنی شخصیت کے مختلف روپ بڑی بیباکی سے پیش کئے ہیں، لیکن اُس نے کوئی افادی ادب بلند تر اور اعلیٰ ادب بھی پیش کیا ہے محل نظر ہے - اور محمد حسن عسکری کے اس قول میں کہ "منٹو موپاساں کے پایہ تک نہ پہنچ سکا تو اس میں اتنا قصور خود منٹو کا نہ تھا جتنا اُس ادبی روایت کا جس میں وہ پیدا ہوا - یہ ٹکڑا ضروری معلوم ہونے لگتا ہے کہ "... منٹو کا قصور تھا کہ وہ موپاساں کے برابر پہنچنے کے بجائے اُس کی بدروح بن گیا"

یہ نوجوان!

انور ڈیوڈوف

پرستارِ فلموں کا زینت کا عاشق　　حیا کا عدو اور بدشعاری کا حامی
سُد حیرا اور سنتو شش کا روپ دھارا　　سراپا بنا معصیت کا پیامی
بہت خوش گلو فلمی گیتوں کا راگی　　ہے ردِ دادِ فرہاد و مجنوں بھی از بر
صبیحہ کے حسنِ دل آرا کی باتیں!　　سناتا ہے جوشِ محبت میں آکر
تصاویرِ عریاں کا البم بغل میں　　بڑی تمکنت سے دبائے ہوئے ہے
بداندیش البیسیت کے جنوں میں　　شرافت کے پرزے اڑائے ہوئے ہے
مئے عیش و عشرت میں مدہوش ہو کر　　خراباتِ دنیا کو اپنا رہا ہے
بڑے ذوق سے رقص کی محفلوں میں　　وہ اجداد کا نام چمکا رہا ہے
یہ تہذیبِ مغرب کی گل کاریاں ہیں　　بزرگوں کو احمق بتانے لگا ہے
جنھیں کچھ عقیدت ہے مذہب سے ان کو　　سبق دہریت کا پڑھانے لگا ہے
حریفِ صداقت! طرفدارِ باطل!　　حمیت سے محروم غیرت سے خالی
وہ دین و شریعت کا قائل نہیں ہے　　سرِ بزم واعظ کو دیتا ہے گالی
گناہ گارِ تہذیب و آداب ہو کر　　بلندیِ کردار سے گر چکا ہے!
نکل کر تقدس کی حدِ یقیں سے　　ہجومِ خرافات میں کھو گیا ہے
نہیں علم قومی پریشانیوں کا　　وطن کی حقیقت سے ناآشنا ہے
مگن ہو کے دنیا کی رنگینیوں میں　　تعیش کی تانیں اڑانے لگا ہے
جسے ذوقِ شمشیر کا چاہیے تھا　　چلاتا ہے میداں میں کرکٹ کا بلّا
وطن فکرِ آئین میں گھل رہا ہے　　مگر اس کے نزدیک ہے خیر صلّا

شبنم سبحانی

غزل میں اشاریت

(ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں ادارۂ ادب اسلامی ٹانڈہ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک سمپوزیم میں جس میں غزل میں اشاریت کے مسئلے پر تحریری و تقریری طور سے روشنی ڈالنے کے لئے اہم تعمیر پسند فنکار شریک ہوئے تھے، یہ مقالہ پیش کیا گیا۔)

اشاروں میں بات کرنا انسان کی فطرت میں روزِ ازل سے داخل رہا ہے۔ وہ دورِ وحشت و بربریت سے لے کر آج تک کے اس متمدن اور ترقی یافتہ عہد تک اپنی تحریر و تقریر اور گفت و شنید میں اس کا سہارا لیتا آیا ہے۔ قدرت نے یہ وہ فطری وسیلہ انسان کو عنایت کیا جس کے ذریعے وہ اپنے ماحصل کو پر اثر لہجے اور مختصر انداز میں ادا کر سکے۔ آج ہم اپنی سماجی اور اجتماعی زندگی کا جائزہ لے کر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری روزانہ کی زندگی میں قدم قدم پر لمحہ بہ لمحہ اشاروں اور رمز و کنایہ کا کیا رول ہے۔ آج تو وقت کی بڑھتی ہوئی اہمیت و قیمت کے پیشِ نظر اس کی افادیت، مقبولیت اور اہمیت اور بڑھتی جا رہی ہے۔ ہماری اجتماعی اور شہری زندگی SYMBOLS اور TOKENS پر کتنی زیادہ منحصر ہو گئی ہے۔ یہ اشارے اور کنایے ہماری ذہنی اور فکری زندگی کے اہم اجزاء بن گئے ہیں جن کے بغیر انسان اس میدان میں مفلوج اور بے دست و پا بن کر رہ جائے —

اشاریت سے کلام میں ایک گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اشارے بات کو جاندار اور گفتگو کو پر لطف، موثر اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ پردہ پوشی اور رمز و ابہام سے انسان کو فطری طور سے لگاؤ رہا ہے[1]۔ انسان نے ہمیشہ اپنے جسم کی سجاوٹ، مکانوں کی تعمیر اور زندگی کی دوسری اشیا کی تخلیق کے سلسلے میں اس ذوق کا مظاہرہ کیا۔ فنِ تعمیر، فنِ رقص و موسیقی اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں پردہ آرائی اور اشاروں اشاروں میں ایک پوری داستان کہہ جانا رائج رہا ہے۔ ہم آج بھی اپنی روز کی گفت و شنید اور تبادلۂ خیال پر نظر ڈال کر یہ جان سکتے ہیں کہ بات کو ادھورا[2] کہنا ہمیں کتنا بھاتا ہے — اشارے کنائے اس کے دل میں ایک حرکت، کلبلاہٹ اور گدگدی سی پیدا کر دیتے ہیں۔ آسمانِ نطق پر ٹمٹمانے والے یہ تارے عجیب چیز ہیں جو کبھی اس کی راہنمائی کرتے ہیں، کبھی اسے پیچ و تاب کا شکار بناتے ہیں۔ کبھی ان اشاروں نے زندگی کی کسی تلخ حقیقت سے انسان کو روشناس کرایا ہے اور کبھی اس کے سونے سنسار میں سنہری کرن بن کر چمکے ہیں۔ کبھی یہ تیرِ نیم کش اور کبھی خنجرِ بے نیام بن کر عیاں ہوئے ہیں۔ کبھی انہوں نے انسان کو مخمور بنا دیا ہے اور کبھی بیدار تر، کبھی اسے ذہنی و فکری بھول بھلیوں میں ڈال دیا ہے اور کبھی ایک روشن اور درخشاں شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے —

---

[1] اشاریت و رمزیت ایک ایسا سمندر ہے جس میں مخاطب کو خود غواصی کر کے موتی نکالنا پڑتے ہیں اور جن موتیوں کے حصول میں اس کی اپنی محنت صرف ہوتی ہے .... ان کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں میں بڑھ جاتی ہے۔ (ش۔س)

[2] ادھورا پن، توضیح کے رمزیت و اشاریت ادھورے پن کا نام نہیں بلکہ وہ ایک ایسا اسلوب ہے جس میں کسی مدعا کی چند اہم ترین کڑیاں اس طرح سامنے لائی جاتی ہیں کہ مخاطب آسانی سے باقی کڑیوں کو جوڑ کر ایک سلسلۂ معنی کی تکمیل کر لیتا ہے۔ ادھوری بات وہ ہوتی ہے جس کو سن کر مخاطب محسوس کرتا ہے کہ متکلم کے ذمے قول کا کچھ حساب باقی رہ گیا ہے۔ اشاریت میں یہ احساس نہیں ہوتا۔ (ش۔س)

انسان کی اعلیٰ فکری اور ذہنی کاوشیں جو صفحۂ قرطاس پر آتی رہی ہیں ان کا جائزہ لے کر آپ دیکھیں گے کہ ان پر ان کے فطری اور نفسیاتی رجحانات کا ایک گہرا عکس پڑا ہے۔ دنیا کے تمام ادبی اور فکری کارناموں میں اشاروں اور کنایوں کی ایک دنیا آباد ہے کہیں بھی ان کا فقدان نہیں یہ مخصوص اشارے اور کنایے جو زیب تحریر و تقریر بنتے ہیں مختلف حالات، مختلف آب و ہوا، مختلف قدرتی، تمدنی، اجتماعی فضاؤں کے زیر اثر مختلف قوموں اور ملکوں کے گہواروں میں الگ الگ انداز سے پروان چڑھتے ہیں — ان پر تہذیب و تمدن اور کلچر کا گہرا رنگ چڑھتا ہے۔ یہ قوم و ملک کے ذہنی، فکری اور عملی میلانات TENDENCIES کی طرف غمازی کرتے ہیں۔ یہ کسی ادب اور زبان کے تمام نشیب و فراز اور پورے تاریخی زیر و بم پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ آج دنیا کی ہر زبان، دنیا کا ہر ملک اپنے چند مخصوص اشارے اور کنائے رکھتا ہے۔ یہ اسی وقت سمجھے جا سکتے ہیں جب کہ اس ملک کی تہذیبی اور روحانی تاریخ میں غوطہ زنی کی جائے، وہاں کی مائتھالوجی کا جائزہ لیا جائے، وہاں کے مذاہب اور سیاسی انقلابات پر نظر ڈالی جائے۔

اشارے اور کنایے غیر ارادی طور پر جنم لیتے ہیں اور غیر شعوری طور پر پنپ جاتے ہیں۔ ان کو مقبول عام بنانے میں کسی ایک فرد کا ہاتھ نہیں ہوتا۔ صدیوں کی تراش خراش کے بعد یہ زبانوں پر چڑھتے اور کسی ملک و قوم کے تہذیبی سوگن بنتے ہیں۔ ایک فلم کار، ایک فنکار اور ایک خطیب ہی انہیں اپنی تحریر و تقریر میں نہیں اپناتا بلکہ یہ بازاروں میں، گھروں میں، دفتروں میں اور دوکانوں پر جا بجا بولے جاتے ہیں۔ یہ اپنے اندر معنی کا ایک طوفان پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ان کو اختصار اور تراش خراش کا جمال اُن ترشے ہوئے ہیروں کی مانند کر دیتا ہے جو ہر مقام پر اپنی تابانی اور حسن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

شاعری کی بنیاد سر اسر انہی اشاروں اور کنایوں پر ہے۔ جذبات کی عکاسی میں اور ما فی الضمیر کی ادائیگی میں یہ بے مثال سہارا بنتے ہیں۔ بالخصوص غزل کی تو ساری عمارت انہیں پر استوار ہے۔ غزل کی دنیا میں اب تک رمز و ایما کے اَن گنت پھول کھلے ہیں اور اشاریت و کنایت کے بے حساب موتی برسے ہیں۔ غزل جیسا کہ عام طور پر کہا اور سمجھا جاتا رہا ہے، ایک پُر اسرار آرٹ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی رہی ہے کہ دریا کو [illegible] دیا جائے، یعنی ایک شعر کی محدود فضا میں سارے عالم رنگ و بو کی جھلک دکھائی جائے۔ الفاظ و معنی کے حسین امتزاج کے ساتھ زندگی کی کسی اہم حقیقت کو اجاگر کرنا اور انسان کے تہذیبی، جذباتی اور فطری رجحانات کی عکاسی کرنا بہت نازک اور سنجیدہ کام ہے۔ غزل کے لئے ان وسیع موضوعات کو اپنے تنگ دامن میں لینا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے اور وادی میں رمزیت، ایمائیت اور اشاریت و کنائت شاعر کو سہارا فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں غزل نے اپنے مزاج کے موافق اشارے اور کنائے ڈھالے ہیں۔ اُس نے ایک مخصوص عمارت ان کے ذریعے سے تعمیر کی ہے۔ اس نے ایک وسیع ذخیرہ مہیا کیا ہے۔ غزل نے اپنی امتیازی مقناطیسی قوت کی مدد سے انسانی سوسائٹی میں رائج اشاروں اور کنایوں کو اپنی طرف کھینچ لیا جو اس کے لئے قابلِ استعمال تھے۔ اس نے جو بھی خاکہ تیار کیا انہیں کی مدد سے! اس نے جو بھی پیغام دنیا کو دیا انہیں کے سہارے! ان کے ذریعے غزل نے اپنے اندر وسعتِ بیکراں، سوزِ لاجواب اور کیفِ جاوداں پیدا کیا۔ غزل کی ریزہ کاری اور مینا کاری کو اگر قدر و قیمت بخشی ہے تو انہیں اشاروں نے ہی — غزل میں فشتریت، سوز و گداز اور حرارت کی صفات انہیں کے اثر سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ ہمارے لئے دل کی وادیوں میں گونجنے والے نغمات کے اظہار میں وسیلہ بنتے ہیں۔ یہ ہمارے ذہنی تجسس اور فکری پرواز کے ذوق کو جلا بخشتے ہیں۔

ویسے اب تک غزلوں میں اکثر رمز و ابہام اور اشاروں کے ذریعے ڈاکٹر یوسف حسین کے الفاظ میں زندگی کے ایک طلسماتی عنصر کی تلاش کی گئی ہے اور لاشعور کی دور دراز وادیوں کی سیر کی گئی ہے۔ اس جہانِ رنگ سے دور اور اس انسانی پیکرِ خاکی سے ماورا ایک نئی کائناتِ عشق و محبت بسائی گئی ہے بات کو پیچیدہ اور الجھی ہوئی بنا کر پیش کرنے میں بڑی خوبی محسوس کی گئی ہے اور اکثر بقول بشیر انور کے الفاظ میں حسن کاروں نے اپنی فکری

کچھ اشاریت کے دامن میں چھپایا جاتا ہے اور ایک گونہ ذہنی بے راہ روی کا مظاہرہ کیا ہے، بلکہ زندگی کو ایک طلسم ہوش ربا بنا کر رکھ دیا ہے —— پھر بھی غلطی اشاریت کی نہیں، ہمارے فن کاروں کے فکری خلا اور نظریاتی دیوالیہ پن ہی کا سارا قصور ہے۔ دراصل جب بھی کسی خاص مقصد، نظریہ، اور دل کی لگن اور جستجو کے بغیر قلم حرکت میں آئے ہیں تو اسی قسم کے کاغذی بے روح پیکر صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوئے ہیں —— جب بھی شاعری اظہارِ فن کا ذریعہ بنی، جب بھی فن کار محض ذہنی تعیش، حصولِ شہرت و عزت اور مطالبۂ اہلیت کے تقاضے کو تخلیق ہنر کرنے بڑھا تو آرٹ اور فن کا یہی حشر ہوا اور شاعری لال بجھکڑوں کا ایک تفریحی مشغلہ بن گئی۔ اردو شاعری کے ماضی پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خوشامدانہ ذہنیت، فرمائشی پابندیوں اور خلعت و جاگیر کی ہوس کے تحت جو کچھ بھی لکھا یا کہا گیا وہاں پر اشاریت کی مٹی پلید ہوئی ہے — وہ بجائے ایک لطیف نشتر کے ایک کند ہتھیار بن گئی ہے۔ اصلیت صداقت اور حقیقت ایک مثالی شاعری کی بنیاد ہے اور اس لئے اشاریت و رمزیت کا حسن بھی انہیں خوبیوں پر منحصر ہے —— اشاریت میں جب نثر کی سی وضاحت پیدا ہوتی نظر آتی ہے یا ابہام کی طرف وہ مائل ہوتی ہے تو اس کا جوہر ختم ہو جاتا ہے۔ زبان کا ایک کامیاب نبض شناس اور سوسائٹی کے فنی ذوق اور روزمرہ کی بول چال کا تجربہ رکھنے والا فنکار ہی اشاروں اور کنایوں کے مقام اور موزونیت کو سمجھ سکتا ہے —— ان میں توازن اور اعتدال پیدا کرنا بھی بڑی وسیع اور گہری نظر کا کام ہے۔ یہ وہ جواہر ریزے ہیں جو اگر ترتیب اور موزونیت سے نہ جڑے گئے ہوں تو ان کا حسن بالکل پھیکا پڑ جاتا ہے ——

اردو غزل کی ایک مخصوص زبان ہے۔ اس کا ایک مخصوص طرزِ ادا ہے۔ عشق و محبت، ہجر و وصال اور داستانِ گل و بلبل، ذکرِ چمن و دشت، یہ سب مخصوص اشارے ہیں جو اپنے پیچھے ایک وسیع معنی رکھتے ہیں۔ انہیں ذروں کو فنکار سورج اور انہیں قطروں کو دریا میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہی وہ اشاروں کی زبان ہے جس کے پردے میں شاعر حیات و کائنات کے مسائل اور زندگی کے اہم حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حالی نے لکھا ہے ؎

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

غزل جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، انسان کے لطیف روحانی اور جذباتی تاثرات کی ترجمان ہے اور اس مقصد کے لئے علامتوں کا ایک ذخیرہ اردو شاعری نے فراہم کیا ہے —— ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں :——

"وہ حقائق جن کا تعلق جذباتی یا روحانی لطائف سے ہے انہیں منطقی قضایا کے ذریعہ نہیں ظاہر کیا جا سکتا، ان حقائق کی روح کو صرف علامتوں سے ظاہر کیا جا سکتا ہے، یہ علامتیں بھی رنگ و خطوط کی شکل اختیار کرتی ہیں، کبھی لے اور آہنگ کی، کبھی موزوں لفظوں کی، اس قسم کے تجربوں میں علم و تاثر ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں ——"

غزل کا دامن انسان کی جذباتی و روحانی زندگی سے کہاں تک وابستہ ہے اس کی بھی تشریح ضروری ہے۔ غزل کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی دروں بینی کی خوبی اور داخلیت ہے۔ مگر یہ خصوصیت اس کی ہمہ گیری کو محدود نہیں کرتی۔ یہاں پر اندروں ایک جامِ جہاں نما کی حیثیت میں ہمارے سامنے آتا ہے جس میں ساری کائنات کی عکاسی ملتی ہے اور ساری انسانیت کا نقشہ نظر آتا ہے —— محبوب کی ذات اور عاشق کی شخصیت سارے انسانوں کے جذبات، خیالات، عقائد، توہمات کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہاں دروں بینی میں اگرچہ انفرادی تجربات و جذبات کا عکس ہوتا ہے مگر اس کے پرتو میں ایک اجتماعیت اور خارجیت کارفرما نظر آتی ہے۔ حیات و کائنات کا یہ داخلی نقطۂ نگاہ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے —— غزل آج انسان کے کن جذبات سے اپیل کرتی ہے —— جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ابھی تک بازاری عشق و محبت کی فراوانی اور جذبات انگیز و بیجا پرورش قسم کے سطحی مضامین کا زور ہے۔ عشق و محبت، یا یوں کہئے کہ جنس کا پہلو انسانی زندگی کا بڑا اہم اور نازک پہلو رہا ہے۔ انسانی زندگی کو نشیب و فراز —

روشناس کرانے اور باعمل، پُرحرکت، حرارت آمیز یا ساکت وجامد اور تلوّن زدہ بنانے میں جنسی عوامل کا بڑا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ یہ انسانی زندگی کی وہ اہم قوتیں ہیں جو حقیقت میں اس کی راہِ عمل کے تعین پہ اثر انداز ہوتی ہیں اور اس کی کامیابی و ناکامی میں دخل رکھتی ہیں۔ عشق ومحبت کے جذبے اپنے اندر بڑی وسعت بھی رکھتے ہیں اور بڑی تنگی بھی! کہیں سمٹ کر ایک قطرہ اور کہیں پھیل کر ایک بحرِ بیکراں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔ یہ زندگی کو تیرگی زدہ بھی کر دیتے ہیں اور درخشاں بھی بنا سکتے ہیں ۔ اس کا موزوں استعمال انسان سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دلواتا ہے اور غلط استعمال اس کے لئے بڑا خطرناک بھی ثابت ہوتا ہے ۔ غرض عشق ومحبت کا رجحان انسان کی جذباتی وروحانی رگوں میں دوڑنے والا خون ہے ۔ اور یہی جذبۂ محبت و عشق تغزل کے سانچے میں ڈھل کر جب موسیقی کی چاشنی لئے ہوئے نمودار ہوتا ہے تو غزل کی تخلیق ہوتی ہے لہٰذا غزل کا منبع یہی جذبۂ محبت ہے اور رمز وایہام کا معدن یہی جذبۂ عشق ہے ۔

غرض غزل کا جو موضوع ہے، غزل کا جو مزاج ہے اور غزل کا جو میدان ہے اس میں منطقی اور استدلالی اندازِ بیان یا طریقہ راست (DIRECT METHOD) کام آہی نہیں سکتا۔ اور اگر اسے کام میں لایا جائے تو غزل کی نشتریت، اثرانگیزی اور حرارت کو مٹا دیتا ہے ۔ غزل کا معاملہ نظم ونثر کے دوسرے اصناف سے بالکل علیحدہ نوعیت کا ہے ۔

جس طرح قوموں ملکوں اور طبقوں کی ایک تہذیب، ایک ادب، ایک مربوط مائتھالوجی اور چند مفروضے اور واہمے ہوتے ہیں اور یہ اس سرزمین سے نیز وہاں کے رہنے والوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور وہیں کی فضا، حالات اور آب وہوا کے مطابق پروان چڑھتے ہیں۔ اسی طرح اردو غزل اپنے وسیع ذخیرۂ رمز واشارہ کے ساتھ ہندوستان کی تہذیب، مائتھالوجی، واہموں اور مفروضوں کی عکاس ہے ۔ اس پر اگرچہ ایرانی اثرات کافی پڑے اور اس نے ایران سے بہت سے اشارے، کنایے مستعار لئے ہیں مگر وہ یہاں آکر جیحون کے تیور باقی نہ رہے۔ ان میں کافی تراش خراش ہوئی اور وادیٔ گنگ وجمن میں ان کے مطالب ومعانی اور طریقِ استعمال میں کافی تبدیلی ہوئی ۔ یہ اشارے اپنے اندر تاریخی حقائق پوشیدہ رکھتے ہیں اور ایک قوم کے نشیب وفراز کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کے پہلوؤں میں ۔ کبھی مذہبیت، کبھی تصوّف، کبھی اخلاق نوازی، کبھی رنگینی وعیاشی کبھی پژمردگی ویاس زدگی، کبھی عشرت پسندی وناکارگی، کبھی دلیری وبہادری، کبھی عقل پسندی وخرد پرستی، کبھی جنون نوازی وعشق طرازی جھلکتی ہے۔ غرض جن جن وادیوں سے یہاں کا فکری اور عملی کارواں گزرا سارے مراحل کی کامیاب عکاسی غزل نے اپنے ہر دور کے بدلتے، ڈھلتے اور مٹتے اشاروں کے ذریعہ کی ہے ۔

غزل کے اشارے بھی تہذیبی ومعاشرتی اقدار کے ساتھ بدلتے اور ڈھلتے رہے ہیں اور غیر شعوری طور پر جنم لیتے اور پروان چڑھتے رہتے ہیں یہ جامد نہیں، وقت کی رفتار کے ساتھ ان میں بھی انقلابات آتے رہتے ہیں ۔ دراصل ان کی تبدیلی میں نظریۂ زندگی اور فلسفۂ حیات کا بڑا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ جب زندگی کی تہذیبی واخلاقی قدریں بدلی ہیں تو عوام اور ان کے ساتھ ہی ساتھ فنکاروں کے سوچنے سمجھنے کے معیار بدلتے رہے ہیں۔ ان کے نقاطِ نظر (POINTS OF VIEW) میں بھی انقلابات آتے رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ طرزِ اظہارِ مطالب اور اندازِ بیان مقاصد بھی شدت کے ساتھ متاثر ہوتے رہے ہیں۔ کبھی رزم اور کبھی بزم کے اشارے عام ہوئے، کبھی عیش وعشرت کے ذوق نے میکدہ ومیخانہ، جام وساغر، رند وساقی کو اپنا لیا۔ کبھی غلامی، پریشاں حالی، اضطراب وکلفت کی وجہ سے زنجیر وطوق، صیاد وزنداں، دار ورسن، دشت وبیاباں، جنوں وسودا اور زنجیر وسناں کا ذکر چھڑا۔ کبھی اخلاقی قدروں کے بندھن کمزور پڑتے ہی محبوب کی پردہ کشائی کی گئی اور محمل ونقاب کی دھجیاں اڑائی گئیں کبھی محبت کو زندگی کا اصل مقصد سمجھ کر حیات کی راہِ عمل بہت مقصد کی راہ ڈھونڈی گئی اور محرومی ورسوائی، دیوانگی وآشفتگی کے اشارے عام ہوئے۔ کبھی تصوف کا چرچا ہوا۔ اور اسی طرح اشار

بدلتی رہتی ہے ۔

غرض انسان کی پروازِ تخیل اور فکر و نظر کی وسعت و بلندی کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کے طرزِ عمل کے مطابق علامتیں اور اشارے، رمز و ایما بنے اور پروان چڑھتے۔ جہاں یاس زدہ، بے بس، فلاکت زدہ اور نحیف تخیل کارفرما ہوا وہاں اشاروں نے کچھ نیا روپ اختیار کیا، وہاں ان کی پرواز محدود اور اڑان مفقود ہو گئی۔ غمِ جہاں، غمِ زماں اور غمِ جاناں کا ماتم ہونے لگا، زندگی سے فرار کی راہیں نکالی گئیں، اور یاس و تفکر کے بادل افکار پر چھا گئے، وہاں ایسے اشعار کہے گئے جن میں ایک غم زدہ اور الم نصیب اشاریت کارفرما ہے ـــــ وہ تخیل جس کی پرواز عیش و عشرت اور دولت و اقتدار تک محدود ہوئی وہاں اشارے کچھ اور بن گئے۔ یہاں رمز و ایما چند حسین ریشمی ڈوروں کی مانند ہو گئے جن کے ذریعے فنکار نے طائرِ فکر و نظر کو اسیر کرنے کی کوشش کی جیسے کہ: ؏

رگِ گل سے بلبل کے پَر باندھتے ہیں

زندگی کی ایک طلسماتی تعبیر پیش کی گئی۔ یہاں اشارے محض دلفریب، نظر فریب اور ہاتھ کی صفائی بن گئے ـــ ہم لطف اندوز ہو سکتے ہیں مگر اس لطف میں بے خبری رہتی ہے اور ہم اس کی نوعیت و حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے جذبات بغیر روشنیٔ شعور و خرد نغمہ زن ہوتے ہیں۔ اصحاب برائے ادب کے علمبرداروں کے دامن میں ایسے ہی اشاروں کا انبار لگا ہوا ہے۔ زندگی کی حسین تعبیریں عشق و محبت کی بے معنی داستانیں اور لذتیت و جنسیت سے لبریز عیش و عشرت کے ترانے چھیڑے گئے ـــــــ وہ تخیل جس کے پیشِ نظر زندگی کا ایک خاص نظریہ ہے۔ ایک روشن شاہراہِ عمل ہے اور ایک درخشاں فلسفۂ حیات ہے بڑی معنویت و مقصدیت کے ساتھ ہی ساتھ لطافت کا حامل ہوتا ہے اور دراصل ایسے ہی اشاروں کو حیاتِ جاوید ملی ہے، یہی وقت کے سرد و گرم کو برداشت کر سکے ہیں یہی حقیقت و اصلیت کے قریب آئے ہیں اور انہوں نے انسان کو کچھ دیا ہے اور اسے کچھ بخشا ہے۔ ان میں نشتریت، اثر انگیزی کشش اور سوز ہے کیوں کہ ان میں خونِ جگر کی کارفرمائی ہے۔ یہ انسان کے خون اور پسینہ سے خلق ہوئے ہیں۔ یہیں پر لفظی و معنوی وحدت پیدا ہوئی ہے اور اجمال و اختصار نیز تفصیل و وسعت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوئے ہیں۔

غزل کی ان رمزی علامتوں کی اہمیت مسلّم ہے۔ البتہ کہیں کہیں بلکہ اکثر و بیشتر ان علامتوں کے استعمال اور معنی آفرینی میں بڑی بے راہ روی ملتی ہے گر یہ رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں، ان رمزی علامتوں کا قصور نہیں بلکہ اس راہرو کا قصور ہے جو اپنی کم نگہی یا کم ظرفی سے فریبِ رہگزر کو منزلِ مقصود سمجھ بیٹھا۔ ادنیٰ درجہ کے لوگوں نے زندگی کی عظیم قدروں کی اسی طرح بے حرمتی کی ہے ـــ وہ مزید لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک اعلیٰ انسانی قدریں وہ ہیں جو زندگی کے برگزیدہ و بامراد ہونے پر دلالت کرتی ہیں ـــ اور دراصل غزل گو کے جذبہ ذوق اور تخیل پر لگام لگانے کے لئے حیات و کائنات کے ایک ہمہ گیر روشن اور مربوط نظریے کی اشد ضرورت رہی ہے اور آج بھی ہے ۔

”رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں“

ایسی کیفیت پیدا ہونے پر یہ رمزی علامات اور اشارے بلکہ ساری شاعری انسان کے لئے نہیں رہتی بلکہ انسان انہیں کے لئے ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے رمزیت و اشاریت کو غزل کی جان کہا ہے اور غزل کے بے پناہ اختصار کو اسی پر منحصر بتایا ہے نیز ان کے نزدیک غزل کو بت ہزار شیوہ بنانے والی صنعت اشاریت ہی نے پیدا کی ہے مگر میں اس صنعت کو رمزیت و اشاریت کا جوہر نہیں سمجھتا ہوں۔ انسان کی عیش کوشی، لطافت و دلچسپی کے لئے سامانِ رنگا رنگ مہیا کر دینا یا اندازِ گوناگوں اختیار کرنا غزل کی معراج نہیں ـــ غزل نے زندگی کے حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے، ... کائنات پر لطیف انداز سے روشنی ڈالی ہے اور انسان کو غمِ جہاں کے تلخابے ہنس ہنس کر پی جانے کا عزم عطا کیا ہے ـــ اور اس فریضہ کے انجام دینے میں یہ رمزیہ اشارے ساتھ ساتھ رہے ہیں ـــ ... زراشہ! ملش کرتا ہوں ۔

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں (مجروح)

کس کو معلوم ہے ہم حسن شناسانِ ازل — کتنے اوہام سے گزرے تو یقیں تک پہنچے (روشن)
جو ہو سکے تو غمِ دل کو لازوال بنا — یہ صورتِ غمِ دوراں رہی رہی نہ رہی "

کشاکشِ خس و دریا ہے دیدنی کوثر
الجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے (کوثر)

اشاریت کا جواب تک کا رول رہا ہے اُس سے ہم سمجھنے لگے ہیں کہ یہ خاص قسم کی دروں بینی اور داخلیت و انفرادیت کی ایک محدود فضا میں عکاسی کا فریضہ تو انجام دے سکتی ہے مگر آج کے اس اجتماعیت پسند اور خارجیت نواز دور میں جبکہ OBJECTIVEISM کا دور دورہ ہے یہ ایک کند اسلحہ بن کر رہ جائے گی اور اِس نقطۂ نظر کے بعض لوگ اپنی قناعت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو کچھ ہے بس اسی پر اکتفا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ انہیں جو کچھ پرانا سرمایہ ملا ہے اسی کو بغیر کسی تبدیلی کے سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ مکمل تغیر پسندی کے حامل ہیں اور اشاریت و رمزیت کو بھول بھلیاں بنا کر اسے ڈھا دینا چاہتے ہیں میں ان سے عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح آج زندگی کی بیشتر تہذیبی و اخلاقی قدروں میں تغیر رونما ہوا ہے، جذبات و خیالات میں انقلاب آگیا ہے۔ زبان و فن میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اسی طرح ان رمزی علامتوں کے معانی و مفہوم میں تبدیلی اور ان کے محلِ استعمال میں تغیر رونما ہو گا اور ہو رہا ہے۔ اور بہت کچھ ہو چکا ہے آج وہ پہلے کی داخلیت و دروں بینی ختم ہو چکی ہے ــــ آج رہرو و منزل، رہبر و راہزن، گل و خار، بہار و خزاں، موج و گرداب کے معنی و مفہوم میں بڑا انقلاب آگیا ہے۔ زندگی، حقائق، مقاصدِ حیات و کائنات، انسان کی منزلِ مقصود اور راہ کی دشوار گذار وادیاں ــــ غرض زندگی کے ان بامراد و اعلیٰ مقاصد کا غزل کو آلۂ کار اور آماجگاہ بنایا جا رہا ہے۔ اور آج وہی اشارے جو کل تک انسان کو ایک بدمست بھنورا یا زندگی سے فرار حاصل کرنے والا مجنوں بنا رہے تھے اسے راہ گزرِ زیست کا ایک باعمل و باحرکت جانباز مجاہد بننے کا عزم عطا کر رہے ہیں۔ آج نگہہِ یار میں غمِ دوراں کی جھلک دیکھی جا رہی ہے۔ مجروح نے لکھا ہے ــ

میں نے دیکھی ہے اسی میں غمِ دوراں کی جھلک — بے خبر رنگِ جہاں سے نگہہِ یار سہی

مجروح اور فیض نے دورِ حاضر کے غزل گو شعراء میں سب سے زیادہ کامیاب تجربے اشاریت کے موضوع و مواد کو بدلنے کے سلسلے میں کیے ہیں۔ انہوں نے ایک خاص مقصد، نظریہ کا شعور اور سوز و گداز لے کر (چاہیے وہ مقصد و نظریہ کیسا بھی ہو۔ اس سے یہاں بحث نہیں) اشاریت کی رگوں میں گرم خون دوڑایا ہے۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں ــ

(فیض) گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے — تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے
" اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک — اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے
" کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب — آج تم یاد بے حساب آئے۔
(مجروح) شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے — میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو
" دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو — مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

دیکھ کلیوں کا چٹکنا سرِ گلشن صیاد　　　　زمزمہ سنج مرا خونِ جگر ہے کہ نہیں

ان کاوشوں نے غزل کے میدان کو اور رمزیت و اشاریت کی حدود کو بہت کچھ وسیع کر دیا ہے ـــــ زندگی کے سارے مسائل کی سمائی ان میں داخلی اور خارجی انداز سے ہونے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی غزل ایک مقبول صنفِ ادب، ہر خاص و عام کی نگاہ میں بنی ہوئی ہے۔

اب رہ گیا اسلامی نقطۂ نظر سے اشاروں کا جائزہ لینا ـــــ یعنی ایک تعمیری غزلگو شاعر ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا۔ اب تک کے سرمایۂ رمز و ابہام سے متعلق ان کا کیا ATTITUDE ہوگا اور مستقبل میں اس نوعیت کے تجربوں کی بابت وہ کیا نقطۂ نظر رکھے گا ـــــ ایک اسلامی قلمکار یا شاعر اپنی تمام تخلیقات میں اسلامی نظریہ کا مثبت پہلو اس حسن و خوبی سے اجاگر کرنا چاہتا ہے کہ طرزِ بیان اور اندازِ نگارش سے مقصد اور نظریہ کو کسی قسم کی ٹھیس نہ پہنچے یا وہ مقصد و نظریہ پر غالب نہ آجائیں۔ دراصل مقصد اور فن کی ایک متوازن شاہراہ پر چلنے کی پیہم کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں نہ تو رمز و ابہام کا جوہر دکھانا مقصود ہے اور نہ اشاریت و ایمائیت کا کوئی طلسمی پیکر پیش کرنا ہے۔ اسلئے جہاں تک ابہام و پیچیدگی اور مظاہرِ فن سے متعلق ہیں ان کے لئے ناقابلِ قبول ہوں گے۔ اسلامی فکر کو محورِ شعر و سخن بنانے والے فنکار وں کو اس سلسلے میں بڑی ہوشمندی اور شعور سے کام لینا ہے اور اس بحرِ ذخار سے تعمیری اور صحت مند اشاروں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا ہے ـــــ انہیں رمز و ایما کو اپنی تخلیقات میں اس انداز سے ٹانکنا اور فٹ کرنا ہے جس سے ان کے معنی اور مطلب میں ایک تعمیری جھلک آجائے ان کو جنسی تلذذ، فکری بے راہروی۔ اور ذہنی عیاشی کا مجموعہ بنا کر ایک صالح اور صحت مند حرارت ان میں سمو دینی ہے۔ یہاں پہ ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے انفرادیت اور خارجیت برائے اجتماعیت نہ ہو کر ساری تگ و دو، ساری جہدِ حیات، سارا غم و الم، ساری قربانیاں اور کلفتیں، ساری کوہکنی و بیاباں نوردی، ساری اسیری و بیقراری، سارا عشق و لگاؤ اُس عظیم مقصد کے لئے ہوگا، اُس آفاقی نظریہ کے لئے ہوگا جس کے لئے حیات وقف ہو چکی ہے ـــــ

جب غزلیں اس احساس کے ساتھ لکھی جائیں گی تو شاید اشاریت کا مسئلہ ہی نہ رہ جائے ـــــ　　اشارے فکر و نظر کے سانچے میں ڈھلتے ہیں اگر ان اینٹوں سے آپ مے خانہ تعمیر کرنا چاہیں تو وہ بھی ہو سکتا ہے اور اگر دیوارِ حرم اٹھانا چاہتے ہیں تو وہ بھی ممکن ہے ـــــ فکری نظر فریبی، لفظی بازی گری اور ادبی مکاری کے مظاہرے میں بھی یہ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں ـــــ جس طرح اسلامی ادیبوں نے ہر ادبی عمارت جس کی بنیاد ٹیڑھی و کج ہے اسے درست کرنے کا عزم کیا ہے اسی طرح اشاروں کنایوں کو بھی ایک تعمیری جذبہ کے ساتھ اپنایا جائے گا اور انہیں صالح اور صحتمند بنایا جائے گا۔ ہم ان سے اظہارِ تنفر کر کے ایک بہت بڑے ہتھیار سے محروم رہ جائیں گے۔ سادگیِ بیان اور راست اندازی کی اہمیت مسلم ہے مگر غزل کے میدان میں یہ کام نہیں کر سکتے ہیں۔ میں نعیم صدیقی صاحب کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہوں کہ ہم نئے اسالیب اور نئے موضوعات کی بے لاگ تلاش اور پرانے تشبیہہ و استعارات کے سانچوں کو یک بیک توڑ دینے　　پہ کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔ نئے تجربات و نئے اسالیبِ بیان کی تلاش اور تدریجی تبدیلی تراش خراش نیز تغیر کی بھی ضرورت ہے۔ قناعت پسندی ایک قسم کا جمود ہے پھر بھی تبدیلی میں اعتدال ضروری ہے۔ آج کل کچھ اشارے تو اس قسم کے ہیں کہ انہیں ہمیں چھوڑ دینا ہی نہیں بلکہ احتراز کا اہتمام کرنا ہے، ان سے اسلامی وقار، سنجیدگی، اسلامی مزاج کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ مثلاً۔ رہزنِ ایمان کا ذکر۔ شراب و ساغر، رندی و سرشاری کے مضامین، زاہد سے چھیڑ چھاڑ و رندمشی کی ترغیب، دیوانگی، دشت نوردی و کوچہ گردی پر فخریہ مضامین، آہ و فغاں اور واویلا کا مظاہرہ، سراپائے محبوب کی رمزیہ علامات مثلاً نرگسی آنکھیں، صندلی باہیں، سروقامتی وغیرہ۔ امردپرستی ذکرِ رقیب و نامہ بر و قاصد وغیرہ وغیرہ میں سے چند کی طرف اشارہ کر دیا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی اس قسم کی غیر سنجیدہ اور کسی نظریہ کو ٹھیس پہنچانے والی رمزیہ علامات ہیں جن کا استعمال نہیں کیا جا سکتا[1]

---

[1] جن اشاروں کو آپ چھوڑ دینے کا مشورہ دے رہے ہیں، دراصل مرعیب کرابہت ان کا مروجہ غلط استعمال ہے لیکن اگر آپ نکو [illegible] استعارات ہیں [illegible]

آج عام طور پر تعمیر پسندوں کی غزلوں میں دو انتہا پسندانہ رنگ نظر آتے ہیں ایک طرف یا تو سیدھے سادے انداز سے صاف صاف اپنا مقصد رکھ دیا جاتا ہے یا پھر .... دوسری طرف بعض لوگ رمز و ابہام کے طلسم میں الجھ کر اپنے مقصد تک کو فراموش کر جاتے ہیں پہلی صف میں مجھے نعیم صدیقی، ابو لبیب آل حماد، کوثر نیازی، ماہر، احمد پرویز وغیرہ نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف انور صدیقی۔ اکبر زمزم، افتخار اعظمی، عمران انصاری وغیرہ دکھائی پڑتے ہیں۔ اعتدال و توازن بہت کم لوگوں کے یہاں ہے۔ پھر بھی حفیظ میرٹھی، عرشی بھوپالی، عاصی کرنالی وغیرہ نے بہت کچھ تعمیری غزلوں کا ایک پیمانہ بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کی غزلیں بہت کچھ مقصدی آب و تاب کے ساتھ ہی ساتھ تغزل، اشاریت و رمزیت کے حسن میں رچی بسی نظر آتی ہیں۔ پھر بھی غزل کے میدان میں ابھی اسلامی فنکاروں کو بہت کچھ کرنا ہے، ابھی مقصد کے کتنے پہلوؤں اور فن کے کتنے گوشوں کی ان کی تخلیقات کو ہوا تک نہیں لگی ہے ـــــ علامہ اقبال مرحوم اس سلسلے میں ہمارے لئے جو مشعل جلا گئے ہیں اور جو بنیاد فراہم کر چکے ہیں اس کی مدد سے ہم بہت کچھ آگے بڑھ سکتے ہیں اور بہت کچھ تجربات کر سکتے ہیں ـــــ ہمیں اشاروں کو ایک ایسی زندہ حقیقت بنانا ہے اور انہیں ایسے سانچوں میں ڈھال دینا ہے کہ ان میں ایک تعمیری آب و تاب پیدا ہو جائے جو زمانے کے لئے رہبر ثابت ہو ـــــ

بقیہ شیطان

حضرت کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے چہرہ پر شرم و غصہ کی علامات ہیں، گردن کی رگیں پھولی ہوئی ہیں۔
شیخ صاحب حقہ ان کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔

سیٹھ: پیر قسم چودھویں صدی ہے چودھویں۔

شیطان: داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑاتے ہیں۔ دلی کے گھر میں شیطان!

(حلقۂ ادب اسلامی ڈھاکہ کی ایک نشست میں پڑھا گیا)

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۲

مثلاً "رہزن ایمان" آپ ہر اس مقصد کو کہہ سکتے ہیں جو اپنے اندر خواہشاتی جاذبیت رکھتا ہو مگر روح اور ضمیر کے لئے تباہی کے لحاظ سے مہلک ہو۔ شراب و ساغر و مینا اور ساقی کے استعارے اگر کسی اسلامی فلسفۂ زندگی اور ایمان اور عقیدے اور مقصد کے لئے استعمال کریں اور مے خانے اور بزم سے مراد وہ نظم لیں جو منتشر افراد کو ایک مقصد کے لئے مربوط کرتا ہو تو اس میں کیا حرج ہے۔ آخر شراب "طہور" بھی تو ہو سکتی ہے! "زاہد" اور "شیخ" اور "واعظ" سے آپ ایک ایسا مذہبی کردار مراد لیں گے جو دین کے اصل مقصد اور اس کی روح سے خالی ہے لیکن پھر بھی وہ مذہب کا اجارہ دار بنا پھرتا ہے اور جو کوئی دین کو اس کی اصل شکل میں لے کر اٹھتا ہے اس پر کفر کے فتوے لگاتا ہے۔ "دیوانگی" سے مراد حصول مقصد کے لئے وہ والہانہ پن ہو سکتا ہے جس کے تحت آدمی ذاتی مفاد سے بے نیاز ہو کر مال اور جان کی بازیاں لگائے۔ دشت نوردی اور کوچہ گردی کا نیا تصور یہ ہو سکتا ہے کہ کارِ دعوت کے لئے آدمی مارا مارا پھرے "قاصد" اور "دلدار" اور "ندیم" مقصد کے حامی اور ہمدرد ہوتے ہیں اور "رقیب" اس کردار کو کہیں گے جو محض حاسدانہ اور منفی اور تخریبی رد عمل دکھاتا ہے۔ غرض یہ کہ غزلیہ اشاروں اور استعاروں کے مزاج اور ان کے استعمال کو بدلنا ہے نہ کہ ان کی لفظی ساخت کو! (ن۔ ص)

حلقۂ یاراں

برادرِ محترم! اسلام و رحمت! مارچ کے چراغِ راہ، میں خطوط کا کالم پاکر مجھے بہت مسرت ہوئی، اگر آپ نے میری حقیر گذارش کو شرف پذیرائی بخشتے ہوئے اس سلسلہ کو چراغِ راہ میں مستقلاً قائم فرما دیا ہے، تو میں اس پہ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں، اور اگر یہ حسبِ سابق ایک وقتی فیچر ہے، تو میں بڑے ادب کے ساتھ پھر یہ عرض کروں گا، کہ براہ کرم اپنے رفیقانِ قلم کی نگارشات میں حسن اور نکھار پیدا کرنے کی خاطر نیز ان میں ذوقِ تحریر کو زندہ و متحرک رکھنے کی خاطر عملی تنقید اور براہِ راست نقد و نظر پر مشتمل خطوط کی اشاعت کو چراغِ راہ کا ایک مستقل شعار بنا دیجئے، خدا نے چاہا تو یہ سلسلہ افادیت کے لحاظ سے بہت کامیاب رہے گا، آپ نے اس ضمن میں جو یہ تجویز پیش کی تھی، کہ عام قارئین کے خطوط کی بجائے ہر ماہ گذشتہ مہینے کے علمی و ادبی جرائد میں سے فنی یا مقصدی لحاظ سے بلند پایہ اور کامیاب نگارشات کا ایک تعارفی تجزیہ پیش کیا جائے، سو یہ کام مقابلۃً بہت زیادہ سود مند ہونے کے باوصف بڑا دقت طلب بھی ہے، لہٰذا سردست ایک نسبتاً آسان اور سہل اقدام اختیار کیجئے، کیوں کہ جہاں ثانی الذکر صورت میں ذمہ داری کا بوجھ صرف چند ایک اصحاب پر پڑے گا، وہاں اول الذکر صورت میں ذمہ داریاں تمام قارئین میں بٹ رہیں گی، اور اسی نسبت سے اُن سب کے لئے ان سے عہدہ برآ ہونا بھی آسان ہو گا۔

اگر آپ خطوط کے کالم کو چراغِ راہ کے مستقل فیچر کے طور پر شائع فرمانے کے لئے رضامند ہوں، تو پھر اس کے لئے ایک مناسبِ حال مستقل عنوان کا قیام بھی ناگزیر ہو گا، اس ضمن میں چند عنوانات میں بھی مشورۃً پیش کرتا ہوں، اور یہ ہیں:- لمعات، تنویریں- بزمِ خیال، حلقۂ یاراں، انجمنِ فکر، دامانِ نگاہ

اس مرتبہ کے خطوط میں مجھے انور صدیقی صاحب کا خط بہت پسند آیا، اس خط میں انہوں نے غزل کی فنی و ادبی حیثیت کے بارے میں بڑے گہرے اور حقیقت رس اشارے کئے ہیں، اور اس باب میں ان کا مطالعہ اور ذوق الٔق داد ہے، میں اُن کی اس نشان دہی سے کامل اتفاق کا اظہار کروں گا کہ "ہماری ادبی تحریک میں ابھی تک فکر غالب ہے، اس فکر کو ... جانا چاہئے" اگرچہ ہمارے شعراء کی اکثریت انور صدیقی صاحب کے اس ارشاد کی صحیح مصداق نظر آتی ہے، تاہم ادھر یہ حقیقت بھی بڑی خوش آئند ہے، کہ کچھ عرصہ سے ہمارے حلقۂ ادب میں بھی مقصد کی بلندی اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ فن، ادب اور زبان کے حسن، گھلاوٹ اور رچاؤ کا خیال پیدا ہونے لگا ہے، اور ہمارے حلقہ کے شعرا بھی اپنے کلام میں فن اور ندرتِ فکر نیز جذبہ انگیز حلاوتِ شعری کا اضافہ کرنے کی کوششیں کرنے لگے ہیں۔ یہ کوششیں اکثر خاصی کامیاب نظر آتی ہیں، چنانچہ اس ضمن میں آپ کی، حفیظ میرٹھی، عرشی بھوپالی، ماہر القادری اور خود انور صدیقی صاحب کی تازہ غزلوں کی داد نہ دینا شاید ہر با ذوق قاری کے نزدیک بدذوقی ہو گی۔ خدا کرے کہ ہمارے شعراء کا یہ فکری و فنی ارتقاء جلد از جلد اُن بلند و رفیع درجات سے ہمکنار ہو جن تک پہنچے بغیر کسی سلیم الطبع اور بالغ نظر نقاد کی توجہ یا کسی باذوق قاری کی دلچسپی کو اخذ کرنا ہمارے لئے بڑا مشکل ہو گا، انور صدیقی صاحب کا یہ ارشاد بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہئے۔ برائے کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے، واقعی اگر ایک نظم چند سپاٹ سے خیالات کی حامل ہے، اور ایک

معمولی سی تُک بندی کا نتیجہ ہے، تو اسے نظم کی بجائے ایک منظوم ادارئیہ ہی کہنا صحیح ہوگا۔ اور ایسا کلام کسی سچی شاعری کے دلدادہ قاری کے لئے کوئی کشش نہیں رکھے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ہمارا راستہ فن کی حسین وادی، اور مقصد کے کوہِ عظیم کے مین درمیان واقع ہوا ہے، اور ہمارے لئے فن اور مقصد دونوں کے تقاضوں کو برابر کی اہمیت دینا ضروری ہے، ہونا تو یہ چاہیئے کہ ہماری نگارشات پڑھتے وقت جہاں قارئین کا ذوقِ نظر آسودہ ہو، وہاں اُن کی روح بھی ایک نئی لطافت اور بالیدگی محسوس کرے، ہمارے فن کا طلسم اُن کے دل و نگاہ کو مسخر کرے۔ تو ہمارے مقصد کی حقانیت اور رفعت و پاکیزگی ان کے نفس و جاں کو مجلا و مطہر کر دے، یہ کام جس قدر مشکل ہے، اسی قدر ولولہ انگیز بھی ہے، اور جس قدر کٹھن ہے اس سے کہیں زیادہ دلکش ہے، لہذا اگر خدا کا فضل اور ہمارا جذبۂ خلوص شاملِ حال ہو، تو اس کو انجام دینے ہی سے ہمیں سچی راحت و تسکین مل سکتی ہے، ہمارے شعراء یہ کوشش کریں کہ اُن کی تراوشِ فکر نہ تو کوئی منظوم اداریہ ہو۔ اور نہ ہی کسی فراری کی پکار، بلکہ وہ درحقیقت ایک رجز ہو، اور آپ جانئے رجز میں مقصد اور شعریت دونوں ہم آغوش ہوتے ہیں، اسی طرح ہمارے افسانہ نگاروں کو یہ کوشش کرنا چاہئے کہ اُن کی کہانیاں نہ تو ہمارے جلسوں کی رودادوں پر مشتمل ہوں، نہ اخباری واقعات کا افسانوی چربہ ہوں، اور ان کے برعکس نہ ہی محض مغربی افسانہ نگاروں کے فن کی اندھا دھند نقالی کا مظاہرہ ہوں، اپنی تخلیقات میں فن کو اس لئے سمو دیجئے کہ ان میں پنہاں مقصد اور زیادہ دلکشی کے ساتھ اُجاگر ہو جائے اور ان میں مقصد کو اس اعتقاد کے ساتھ داخل کیجئے کہ آپ کے نزدیک بے مقصد تحریریں یاوہ گوئی بن کر رہ جاتی ہیں!

فن اور مقصد کو یک جان کرنے کی یہ بحث ذرا سلسلۂ گفتگو کی درازی کا تقاضا کرتی ہے، لہذا میں اسے ختم کرتے ہوئے اب چند اشارات مارچ کے چراغ راہ کی نگارشات کے متعلق پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔

اس ضمن میں سب سے پہلے میں ایک حقیر سا مشورہ جناب انور صدیقی کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ میں نے جہاں ان کی غزلوں میں فکر کی گہرائی اور گیرائی اور جذب و شوق کا ایک دل گداز انداز پایا ہے۔ وہاں میں نے یہ اکثر محسوس کیا ہے کہ انور صاحب اپنے اشعار میں اضافتوں اور لواحق الفاظ کی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بھرمار فرما دیتے ہیں، ایسا پیرایۂ بیان قاری کے ذہن کو اولین گرفت میں مطالب پا لینے کی سہولت سے محروم کر دیتا ہے، ادھر آپ جانیئے، غزل کے ترکش کا سب سے بڑا تیر سہلِ ممتنع ہے، جو چھوٹتے ہی سیدھا قاری کے دل میں جاکر پیوست ہوتا ہے، اشعار میں اضافت کا استعمال کسی شجرِ ممنوعہ کی حیثیت تو نہیں رکھتا، تاہم اہلِ نظر ان کے مسلسل استعمال کو پسندیدہ نہیں سمجھتے خصوصاً چھوٹی بحروں کی غزلوں میں تو اسے بار پانے کی اجازت شاذ ہی دی جاتی ہے، انور صدیقی صاحب کی جو غزل مارچ کے چراغ راہ میں شائع ہوئی ہے، وہ یوں تو نغز گوئی کی عمدہ مثال ہے، اس میں بلندیٔ فکر اور سوز و گداز دونوں ایک حد تک موجود ہیں، لیکن اس کے ہر مصرعے میں اضافتوں اور لواحق کے پے بہ پے استعمال سے اس کا حسنِ تاثیر گہنا کر رہ گیا ہے۔ اس غزل کے اشعار کا مطلب پانے کے لئے ایک اوسط درجہ کے قاری کے ذہن کو خاص کاوش سے کام لینا پڑتا ہے، اور ظاہر ہے، کہ یہ کاوش تاثیر کی قوت کو کمزور کر دیتی ہے۔

اسی شمارے میں آپ کی نظم "میرا فن" کافی تفکر اور گہرے تاثر کی حامل ہے، اور اس میں آپ نے ہر بند کے آخیر والے چھوٹے سے ٹکڑے کو خوب نبھایا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم آپ نے کسی خاص ذہنی کیفیت کے زیرِ اثر لکھی ہے، اور حقیقتاً شاعری بھی دل و دماغ کی خاص کیفیات کی عکاسی ہی کا دوسرا نام!

ذکی کاکانی صاحب کی طویل نظم "ہیج مد کا گیت" اپنی روانی اور تسلسلِ شعری کے اعتبار سے خوب ہے، اس کے اندر مجھے ایک ہی کمی محسوس ہوتی ہے، اور وہ یہ، کہ شاعر اپنے ذہن میں پنہاں مقصد کی صالحیت اور "تعمیریت" کو قاری کے ذہن میں پوری طرح اجاگر

نہیں کرتا۔ طویل نظموں کو کسی بھی لحاظ سے تشنہ نہیں ہونا چاہیئے۔

اس معاملہ میں جناب زینی صاحب کی نظم "داستانِ زندگی" اللہ بہت حد تک ایک کامیاب کوشش ہے، جناب صاحب اگر اپنے ہاں بندش کی چستی، اور فکر کی گہرائی کا مزید اہتمام بھی فرمالیا کریں تو اُن کے کلام کا حسن انشاءاللہ مزید بڑھ سکتا ہے،

اس شمارہ کے مضامین اور افسانوں کے اندر مجھے م۔ نسیم صاحب کا "خاکہ کم سخن" بہت پسند آیا، م۔ نسیم صاحب ہمارے حلقہ کے نوخیز ادیبوں میں سے ہیں، اور مجھے ان سے بڑی توقعات ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "انتہا سے پہلے" میں نے حال ہی میں "معیار" کے فروری نمبر میں پڑھا تھا، اور میں اس کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ افسانہ جو ایک مفصل تبصرہ کا محتاج ہے، میرے نزدیک فنی اعتبار سے اردو کے صف اوّل کے افسانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، اور مقصدی نکتۂ نگاہ سے دیکھا جائے، تو یہ ہمارے ہاں کے معدودے چند کامیاب افسانوں میں سے نظر آتا ہے۔ الحمدللہ کہ ہمیں ایسے ایسے جوہر قابل میسر آنے لگے ہیں۔ م۔ نسیم صاحب کا تازہ "خاکہ کم سخن" بھی صاحب تحریر کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک عمدہ مظہر ہے، البتہ اس کا عنوان مجھے کچھ زیادہ بلیغ نظر نہیں آیا۔ میرے ناچیز خیال میں اگر اس خاکہ کا عنوان "دو جی!" ہوتا، تو زیادہ بہتر تھا،

میں سمجھتا ہوں، کہ کسی افسانے کا عنوان قائم کرتے وقت بڑی دقت اور غور و فکر سے کام لینے کی ضرورت ہے، اور کوشش یہی کی جائے، کہ عنوان صنعتِ ایجاز کا ایک شہ کار ہو۔ عنوان کو افسانے کی اصل تفہیم کا ایک بلیغ استعارہ بنا کر پیش کیا جائے، نہ کہ اس کا کوئی تشریحی جملہ بنا کر، اس طرح قاری کی توجہ آخر دم تک (عنوان کو ڈھونڈ لینے کی سعی لاحاصل قائم رہتی ہے۔

یک وضاحت ضروری ہے۔ ان سطور کا راقم ایک بہت ہی ہیچمداں قسم کا شخص ہے، ادب و فن کے بارے میں علمیت کی بجائے اسے محض ۔۔۔ اور محض! ۔۔۔ محبت کا دعوٰے ہے، اور ان سطور کا محرک بھی یہی جذبۂ محبت ہے، اگرنہ اس باب میں مجھ سے زیادہ کوتاہ علم شاید ہی کوئی اور ہوگا! خدا کرے آپ مع الخیر ہوں، والسلام ورحمت۔ (مخلص لالۂ صحرائی)

ضروری اعلان

مولانا سید [illegible] صاحب [illegible] مودودی [illegible] کی حیثیت پر مکمل و مفصل تنقید تجلی دیوبند ماہ اپریل [illegible] میں آرہی ہے۔ تحریر جماعت پر لگائے گئے تمام اعتراضات پر تنقید [illegible] شکوک و ابہام کے تمام بادل چھٹ جائیں گے۔ [illegible] پاکستانی حضرات اگر اپریل کا تجلی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سالانہ قیمت پانچ روپیہ ذیل کے پتہ پر منی آرڈر دفتر تجلی دیوبند کو بھیج دیں رسالہ جاری ہوجائے گا۔

منی آرڈر کا پتہ: شیخ [illegible] صاحب، ۴ بی ۵/۱۰ ناظم آباد کراچی

تجلی کا پتہ صرف اتنا کافی ہے:

تجلی دیوبند۔ یو پی۔ انڈیا۔

مذکورہ تنقید کا مطالعہ ہر موافق و مخالف کے لئے مفید ہوگا۔

گلی کے موڑ پر

اعظم ادیب جلالی

"ہم یہ کہتے ہیں تمہیں نوٹ عطا کر دیں گے — تم یہ کہتی ہو کہ ہم پیسے ہی دے دیں دو چار
دیکھو یہ نوٹ، یہ رنگین، دمکتا ہوا نوٹ — تم عطا کر دو ہمیں اپنے یہ گدڑ سے انار
تمہیں پیسوں سے غرض ہم کو اناروں سے غرض
بولو منظور ہے کیا تم کو یہ سیدھا بیوپار"

"مجھ بھکارن کو بناتے ہوئے ستاتے ہو عبث — کون سے آ گئے از غیب مرے پاس انار"
"کون سے آ گئے از غیب یہ کیا خوب کہی — کیا ستم ڈھاتی ہو اس رمز سے اوجان بہار
ساتھیو، اب اسے کھل کر ہی بتانا ہو گا،
لو سنو ——————"

"چپ رہو ظالمو، خاموش، زباں مت کھولو!" — "قبلہ کیا بات ہے کیسی ہے یہ گالی گفتار؟"
"کس قدر شرم سے خالی ہیں تمہاری باتیں
ایک عبرت کا تماشا ہیں تمہاری گھاتیں
اپنی بہنوں سے یہ دستور روا رکھا ہے — آدمیت کا شرف تم نے گنوا رکھا ہے
تم میں خالد بھی ہے، طارق بھی ہے مسعود بھی ہے — تم میں فاروق بھی، حامد بھی ہے، محمود بھی ہے
اپنے اسلاف کے ناموں کو ڈبویا تم نے
موتیوں جیسے ان الفاظ کو کھویا تم نے
آؤ — اس غمزدہ خاتون کی امداد کریں — اس کی ناشاد امنگوں کو نہ برباد کریں

شیطان

ایک گفتگو

فاطمہ صدیقی

افراد

حضرت جی: شیخ سید علی درگاہ جلالی کے سجادہ نشین

شیخ صاحب: امام و قاضی قصبہ

سیٹھ: ایک لکھ پتی

اسلم: حضرت جی کا نوجوان لڑکا، میڈیکل کالج کا طالب علم

زمانہ: حال، وقت: بعد مغرب۔

مقام: ہندوستان کے ایک قصبہ میں درگاہ کے نزدیک حضرت جی کا دیوان خانہ

(پس منظر میں زور سے آتی ہوئی ہلکے سازوں اور قوالی کی دھن میں تالیوں کی آواز۔ کبھی کبھی گانے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔)

دیوان خانہ میں ایک طرف گاؤ تکیہ سے لگے ہوئے حضرت صاحب بیٹھے ہیں پیچوان سامنے رکھا ہے۔ نے ہاتھ میں ہے کبھی کبھی کش لگا لیتے ہیں۔ ایک طرف ایک صوفہ رکھا ہوا ہے۔ پاس ہی اگلدان، عطردان، پاندان رکھا ہوا ہے۔ تھوڑی دور پر ایک برتن میں لوبان سلگ رہا ہے۔ سیٹھ صاحب باہر سے تشریف لاتے ہیں۔

حضرت جی: کہئے سیٹھ صاحب خیریت۔ اس بار بڑی دیر سے پہنچے۔ آیئے بیٹھئے۔

سیٹھ: (بیٹھتے ہوئے) سب دعا ہے حضور کی۔ ایک کام اٹک رہ گیا تھا اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔ ورنہ ہر عرس میں تو پہلے دن سلامی دینے والوں میں سے ہوں۔

حضرت جی: ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ کیا بات ہوئی۔ سیٹھ تو غیر حاضر رہنے والوں میں سے نہیں۔ کہئے کام بن گیا؟

سیٹھ: بس حضور کی دعا چاہئے۔ کام تو بڑا سخت آن پڑا تھا۔ مٹی ہیں ٹھیکہ تین برس سے لیتا آیا ہوں اس بار ایک بدمعاش افسر آ گیا تھا۔ پانچ ہزار کی تھیلی بندھی ہوئی ہے آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہے۔ اس پر بگڑ گیا۔ کہ تمہارا کام ہی خراب ہے رشوت دینے سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے سمجھا پیٹ بڑا ہے۔ رقم دگنی کر دی وہ تو سر ہوا او اکڑ گیا۔ لگا پولس کی دھونس جمانے۔ میں نے کہا پیر کی قسم ٹھیکہ تو مجھے ہی ملے گا البتہ تو ذرا پریشان کروائے گا۔ میں نے بھی پیر کی قسم وہ جوڑ توڑ لگائے کہ اوپر سے اور الٹی ڈانٹ بھی پڑی اور ٹھیکہ بھی دینا پڑا۔ البتہ تین ہزار خرچ ہو گئے مگر اس کی پرواہ نہیں پیر نے لاج رکھ لی۔ بس کام نمٹا کر دوڑا چلا آ رہا ہوں۔ کل دو دیگ میری طرف سے پکوا دیجئے گا۔

حضرت جی: آپ پر درگاہ کی خاص نظر ہے۔

سیٹھ: (کھیسیں نکالتے ہوئے) میں تو غلام ہوں۔

حضرت: عرس دیکھا ؟

سیٹھ: جی دوپہر پہنچا تھا۔ گھوم پھر کر آ رہا ہوں

حضرت جی: کیا خیال ہے ؟

سیٹھ: پیر قسم عرس میں اب وہ لطف نہیں رہا۔ دو چار گانے والیاں آ گئیں، دو چار قوال آ گئے۔ اور دو چار ہزار آدمی۔ کہاں وہ دن تھے کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ پیر قسم لاکھوں آدمی دور دور سے آتے تھے۔ کتنی ہی باعزت طوائفیں جنہوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا سر کے بل سلام کرنے حاضر ہوتی تھیں !

حضرت جی (حقہ کا کش لیتے ہوئے) اماں سیٹھ صاحب ہمیں تو اس ہندوستان، پاکستان کے رگڑے نے مار دیا۔ !

(عقب سے گانے کی زنانہ آواز اور پھر تالیوں کا شور سنائی دیتا ہے۔

سیٹھ: ہا ہا پیر قسم کیا سوز بھری آواز تھی زہرہ بائی کی۔ خدا جانے جیتی ہے کہ مر گئی۔ اس کے مقابلے کی گانے والی میں نے نہیں دیکھی۔

حضرت جی: سنا ہے اب فلمی لائن میں بھرتی ہو گئی ہے۔ موٹروں میں اڑی پھرتی ہے۔

سیٹھ: ہوں! پیر قسم سب درگاہ کے طفیل ہے۔ دو چار بار جس نے سلامی دے دی ہیرا بن گیا ہیرا!

حضرت جی: مگر اب کوئی نہیں آتا۔ ورنہ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان بھر کے لوگ سال بھر پیسے جمع کرتے تھے اور ایک بار آ کر لٹا جاتے تھے (ٹھنڈا سانس لے کر) اب تو عزت پر بن آئی ہے۔ شاہ قلندر بندے علی کے عرس کا کوئی نام تک نہ جانتا تھا اب اس کے لئے اسپیشلیں چھٹتی ہیں اسپیشلیں اور یہاں اُلّو بولتا ہے۔

سیٹھ: جی حضرت۔ پیسہ پیسہ کو کھینچتا ہے۔ تھوڑا خرچ کرکے اچھی گانے والیوں کو بلوائیے پھر دیکھئے پیر قسم چاندی ہی چاندی ہے۔

حضرت جی: اماں سیٹھ صاحب۔ اگر پیسہ ہی ہوتا تو پھر رونا کیا تھا۔ یہاں تو خانہ داری کا صرفہ نکلنا دشوار ہو رہا ہے۔ ادھر صاحبزادے آئے ہوئے ہیں۔ امتحان وغیرہ کی فیس داخل کرنی ہے۔ سوچا تھا عرس سے نکل آئے گا مگر کہاں؟ جو آتا ہے، چار پیسہ کے الائچی دانے چڑھا کر چلتا بنتا ہے۔ کپڑے پیسہ کا نام نہیں۔ !

(پشت کے دروازہ سے اسلم داخل ہوتا ہے)

اسلم: ابا حضور چلئے کھانا تیار ہے۔ پھر میری ٹرین کا وقت بھی ہو چلا۔

حضرت جی: چلتے ہیں بیٹا ابھی گاڑی میں دیر ہے۔ آؤ بیٹھو تمہارا ہی تذکرہ ہو رہا تھا۔ کہ ان کو ڈیڑھ سو روپیہ کی ضرورت ہے کہاں سے دوں؟

سیٹھ: پیر قسم بڑا برا زمانہ آ گیا ہے۔ ہاں حضرت ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔

حضرت جی: کیا۔ ؟

سیٹھ: ابھی وہ درگاہ کی مسجد والا پیسہ رکھا تھا نا؟

حضرت جی: وہ تو اب بھی رکھا ہے۔ اللہ چاہے تو اگلے برس اس کام میں بھی ہاتھ لگاؤں گا۔

سیٹھ: تو پھر اس پیسہ کو گھی کی تجارت میں لگا دیجئے۔ پیر قسم نفع ہی نفع ہے۔

(حضرت جی خاموشی سے حقے کے کش لیتے ہیں)

اسلم: مگر وہ تو امانت کا روپیہ ہے۔

سیٹھ: تو میں کب غبن کرنے کو کہہ رہا ہوں - ارے بھئی اصل کا اصل واپس، منافع اپنا - یا حضور لگایئے میری ذمہ داری پہ - آج کل چربی اور مونگ پھلی بھی سستی ہے - سیکڑہ میں سیکڑہ منافع -

حضرت جی: آپ بھی کیا بات کرتے ہیں سیٹھ صاحب - اگر اُلٹا گھاٹا ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے -

(اسلم خاموشی سے پہلو بدل کر رہ جاتا ہے)

سیٹھ: گھاٹا ؟ ابھی پار سال میں نے خود اسی گھی کے کام میں پچیس ہزار لگایا تھا - پیر قسم ساڑھے چوبیس ہزار منافع ہوا -

اسلم: (ضبط نہ کر سکتے ہوئے) اچھا سیٹھ صاحب آپ تو خدا کے فضل سے مسلمان ہیں - قرآن بھی پڑھتے ہوں گے !

سیٹھ: پیر قسم اگر صبح کو سویرے آنکھ کھل گئی تو جب تک پاکستان ریڈیو والا قرآن پڑھتا رہتا ہے - لیٹا لیٹا سنتا رہتا ہوں پھر اُٹھ کر منہ ہاتھ دھوتا ہوں - نماز بھی اپنی کوشش بھر جمعہ کے جمعہ پڑھ ہی لیتا ہوں -

اسلم: جب ایک مسلمان کے لئے دھوکے کی تجارت منع ہے تو پھر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں ! یہ تو گناہ ہے !

سیٹھ: گناہ ـــــ پیر قسم آپ بھی کیا بات کرتے ہیں - مجھے گناہ کیوں ہو گا ؟ تجارت کرتا ہے قاسم علی، میں رہتا ہوں بمبئی میں گھی بنتا ہے ہاپوڑ میں میں نے نہ آنکھ سے دیکھا نہ ناک سے سونگھا - پیر قسم میں تو صرف مہاجن ہوں روپیہ دے کر خلاص - جو سُود ہوا سو وہ اور منافع میں آدھا آدھا بس - اگر ہم روپیہ نہ دیں تو وہ کسی اور سے لے لے گا - گناہ ہو گا تو سالے قاسم علی کو ہو گا میرا کیا - اور اگر تھوڑا بہت ہوا بھی تو نیکیاں بھی کم نہیں کرتا ہوں نذر - نیاز، دان - خیرات - میلاد - چڑھاوے بھی کرتا ہی رہتا ہوں کئی مسجدیں بنوا دیں رضولا پور - جلال آباد - پیر گاؤں ...

اسلم: پیر گاؤں کی مسجد تو سیٹھ حاجی قادر نے بنوائی تھی ؟

سیٹھ: بنوائی تھی تو کیا ہوا سب ہی تو اس نے بنوائیں تھیں مگر تیار کس نے کرائیں - سیٹھ قادر حج کر کے آیا تو میں نے کہا اب دو چار مسجدیں اور بنوا دے نیک نام رہے گا -

اسلم: (مسکراتے ہوئے) خوب مسجدیں بنوائیں حاجی قادر نے اور ثواب ہو گا آپ کو - !

سیٹھ: کیوں نہیں ہو گا - اس کا ایک لاکھ لگا ہے جوڑیئے تو کم از کم پانچ روپیہ سیکڑہ دستوری کے حساب سے میرا کتنا ہوا - میں نے ایک پیسہ نہیں لیا - پھر لوہے کا پرمٹ نکلوا کر میں نے جس کو بیچا تھا اس سے تھوڑا لوہا - سیمنٹ بھی لے کر مسجدوں میں لگا دیا -

(پس منظر میں ہارمونیم اور تالیوں کی آواز کے ساتھ قوالی کی آواز بھی سنائی دیتی ہے - اے دل .... مسجد میں نہیں مندر میں نہیں ...... آں - ں ... مسجد میں نہیں، مندر میں نہیں، مسجد میں نہیں مندر میں نہیں - ہاں .... لینا ہے تو لے لے خواجہ سے اے دل تالیوں کا شور) باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے کوئی گنگناتا ہوا آ رہا ہے --- "لینا ہے تو لے لے خواجہ سے" - دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز کے بعد کوئی پکارتا ہے - میں نے کہا اندر آ سکتا ہوں -

حضرت جی: آیئے شیخ صاحب تشریف لایئے -

(شیخ صاحب تشریف لا [illegible] ان کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں -

شیخ صاحب: (دو چار کش لے کر) لطف آ گیا [illegible] بنایا ہے -

سیٹھ: (اٹھتے ہوئے) اچھا حضور مجھے اجازت دیجئے۔ تجارت کے بارے میں سوچ لیجئے گا۔ مجھے کل واپس جانا ہے۔

سلیم: اجی بس معاف رکھئے۔ ایسی تجارت آپ ہی کو مبارک۔

سیٹھ: (بیٹھتے ہوئے) ہیں۔ ؟ حضور سنتے ہیں صاحبزادے کیا فرما رہے ہیں؟

حضرت جی: ابھی بچے ہیں.....

سلیم: خیر یہ تو بچپنے کی بات نہیں۔ میں تو ایسی تجارت کو دھوکہ دے کر روپیہ کمانا سمجھتا ہوں.....

شیخ صاحب: بھئی کیا بات ہے کچھ میں بھی تو سنوں کیسی تجارت؟

حضرت جی: اماں یہ سیٹھ صاحب مجھے گھی کی تجارت کرنے کو کہہ رہے تھے۔

اسلم: جی گھی نہیں گھی کے نام پر چربی اور مونگ پھلی کے تیل کی تجارت!

شیخ صاحب: بھئی تجارت تو آج کل اسی کا نام ہے! تجارت میں آج کل ایمان داری کہاں رکھی ہے۔

اسلم: مگر مسلمان کو تو ایسی تجارت میں حصہ نہیں لینا چاہئے۔ کیوں کہ اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

شیخ صاحب: اجی تجارت میں آج کل اسلام کہاں چلتا ہے، سود لینا۔ سود دینا۔ جعلی کھاتے رکھنا۔ رشوت دینا، بلیک کرنا تجارت تو آجکل اسی کا نام ہے

اسلم: اگر اسی کا نام تجارت ہے تو اسلام میں حرام ہے۔ مسلمان جب اسلام کو مانتا ہے تو اس کے دیئے ہوئے اصولوں کو بھی ماننا ہوگا چاہے وہ عبادت کے بارے میں ہوں چاہے سیاست اور تجارت کے بارے میں!

شیخ صاحب: سنتے ہیں حضور۔ یہ سیاست جیسی پلید چیز میں بھی اسلام کو گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ واللہ بس آپ جیسے دو چار اور مل جائیں تو ہندوستان کے مسلمانوں کا بیڑا پار ہے۔ نوکری حکومت نہیں دیتی۔ تجارت تم نہیں کرنے دیتے۔ ہم لوگ کیا گھاس کھا کر زندہ رہیں گے۔

حضرت جی: اسلم تم خاموش رہو۔

اسلم: میں خاموش ہوئے جاتا ہوں مگر جو بات سچ تھی وہ کہدی تو اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے۔

حضرت جی: ارے بھئی پھر پیسہ کہاں سے آئے۔ تمہیں پڑھائیں کیسے۔ گھر کا خرچ کیسے چلے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ عرس کا اب کیا حال ہے۔ اس سے تو سال بھر کیا دو مہینہ کا خرچ نکلنا مشکل ہے۔

اسلم: میں درگاہ کی آمدنی کے کھانے کو بھی غلط سمجھتا ہوں.....

شیخ صاحب: (آنکھیں پھاڑ کر) ایں یک نہ شد دو شد!

حضرت جی: (جلال میں آتے ہیں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے) کیا بک رہا ہے۔ یہ غلط ہے؟ اور تیرے باپ دادا جو اسی کو کھا کھا کر پلے بڑھے وہ گویا حرام کھاتے رہے؟

اسلم: میں یہ کب کہہ رہا ہوں۔

حضرت جی: (طیش میں آکر) نہیں کہا تو اب کہہ لے۔ نمک حرام۔ ذلیل۔ دیکھیں تو خود کونسا پیسہ کھاتا ہے۔ آیا بڑا مسلمان کہیں کا۔!

اسلم: مجھے ایسے پیسہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ٹیوشن کر کر کے پڑھوں گا۔

حضرت جی: جا پڑھ جا کے۔ نکل۔ جا ابھی نکل جا اس گھر سے۔ کمینہ۔ مردود، جا منہ کالا کر!

اسلم: جی میری گاڑی کا وقت بھی ہو گیا میں چلا جاتا ہوں سلام علیکم (چلا جاتا ہے)

(باقی بر صـ۴۳)

شاہدہ پروین۔ ایم اے

اقبالؒ کی نگاہ میں عورت کا مقام

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں!

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں!

انسان کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ جب بھی اپنے دینی نظامِ حیات سے علیحدگی اختیار کی ہے، اس کے افکار و اعمال باطل کے راستے پر چل نکلے ہیں اور اس کے عقل و تدبیر کے چراغ ہمیشہ باطل کے تصور کو روشن کرتے رہے ہیں۔ عورت جو کائنات کی ایک اہم، پاکیزہ، نازک اور مقدس ہستی ہے۔ وہ ایک لادینی سرمایہ دارانہ طریقۂ حیات میں ہمیشہ ایک کھلونے کی حیثیت سے کھیلی گئی ہے۔ قدیم تاریخ انسانیت سے لے کر آج تک اگر ہم عورت کی حیات مجموعی پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا کہ کسی غیر اسلامی سرمایہ دارانہ نظامِ حیات میں عورت کو ایک کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں دی گئی۔ قدیم بابل و نینوا کی تاریخ سے لے کر موجودہ بیسویں صدی تک اگر ہم عورت کے افکار و اعمال اور اس کی مساعی کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ نظر آجائے گا کہ عورت ہمیشہ مرد کے سفلی خواہشات کا نشانہ رہی ہے۔ سوائے ان عورتوں کے جنہوں نے سلیم الطبع انسانوں کے ساتھ زندگی بسر کی۔ عورت کو تاریخ کے کسی دور میں جب بھی کوئی صحیح اور صالح درجہ دیا گیا ہے تو وہ دینِ الٰہی نے دیا ہے۔ خواہ وہ کسی شکل میں رہا ہو اور کسی نام سے موسوم ہوا ہو، اس کی شکل ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ لیکن اسی دین کے ماننے والوں نے جب اس الٰہی نظریۂ حیات کو بدل کر اپنی خواہشات کے مطابق کیا ہے تو عورت پھر ایک کمتر اور ذلیل درجے پر آگئی ہے۔ اور اسے نفس کی تکمیل کا ایک ذریعہ سمجھا گیا ہے۔

قدیم بابل میں عورتوں کو مذہبی حیثیت سے ایک مقام حاصل تھا اور وہ مذہبی دیوداسیاں سمجھی جاتی تھیں، جن کا کام اپنے رقص و سرود سے دیوتاؤں کو خوش کرنا اور اپنی نسوانی حسن و رعنائی سے ان کے دلوں کو موم کرنا ہوتا تھا، تاکہ وہ اس مذہبی سرمایہ دارانہ نظامِ حیات پر اپنے جوش و غضب کی بجلیاں نہ گرا سکیں۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان دیوداسیوں کے رقص و سرود اور ان کی حسن و رعنائی ان پتھر کے فرضی دیوتاؤں سے کہیں زیادہ مندروں کے پجاریوں اور مہنتوں کو زیادہ خوش رکھتی تھیں اور وہ ان کے چشم و ابرو کا نشانہ بنتی تھیں!

ہندوستان جو عورتوں کی عزت اور ان کی برتری کو تسلیم کرنے میں بہت پیش پیش رہا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ وہاں عورتوں کو بہ حیثیت دیگر ممالک کے ایک باوقار درجہ دیا گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہاں بھی ان عورتوں پر برہمنوں، مندر کے پجاریوں اور پروہتوں کا زیادہ اثر تھا۔ انہیں جو بھی مذہبی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی حقوق دیئے گئے تھے وہ سب ان کے لئے ناکافی اور باعثِ تحقیر تھے!

عورتوں کو جو مذہبی درجہ دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ ان برہمنوں کو پوجیں اور ان سے زیادہ ان کا خیال رکھیں۔ معاشرتی اور سماجی حیثیت سے جو درجہ انہیں عطا کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ شوہر کی غلام بن کر رہیں اور صرف شوہر ہی کی نہیں بلکہ پورے سسرال والوں کی!

چودہ سالہ دوشیزہ کی شادی ایک ساٹھ سالہ بڈھے سے ہو سکتی تھی اور اگر وہ مرجاتا تھا تو پھر اس غریب کو اپنی پوری زندگی سسرال والوں کی غلامی میں بسر کرنی پڑتی تھی اور خود اس کے لئے اس کے والدین کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے تھے یا پھر وہ اپنی تمام آرزوؤں کا خون کر کے آگ کی نذر ہو جاتی تھی۔ ہندی سماج میں عورتوں پر اس سے بڑھکر اور زیادہ ظلم کیا ہو سکتا تھا کہ اپنے شوہر کے مرجانے کے بعد زندہ اس کے ساتھ آگ میں جل جانا پڑتا تھا، اس ظلم کو برہمنوں نے ایک مذہبی شکل دیدی تھی۔

یہ ستی کی رسم برہمنوں کی خود ساختہ ایجاد تھی ورنہ دنیا کے کس دین ربانی نے کسی انسان کو خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ جلانے کی اجازت کبھی نہیں دی ہے۔ مگر یہ برہمن تھے جنہوں نے اپنے وقار کے لئے ستی کی ظالمانہ رسم کو ایجاد کیا تھا۔ عورت کو اپنے والدین کی ملکیت میں کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ ان مثالوں سے یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ قدیم ہندی سماج میں عورتوں کو کون سا مقام حاصل تھا اور اب بھی جو مقام دیا گیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے!

مسیحی دنیا کی ایک علیحدہ نرالی شان تھی جس پر مذہب کے پے در پے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ عیسائی پادریوں نے روز ازل سے عورت پر یہ الزام لگایا تھا کہ جنت میں حضرت آدم کو شجر ممنوعہ کھلانے یا اس کے نزدیک لے جانے کی ذمہ داری بھی اسی (ذات بزرگ یعنی عورت) پر تھی! اس طرح پوری صنف عورت کو مردود قرار دے دیا گیا تھا اور اسے مردوں کے لئے باعث گناہ سمجھا جاتا تھا۔ (اگرچہ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ یورپ کے بطارقہ، پادری اور قسیس کہاں تک اس گناہ کو سہنے کے لئے تیار تھے) چنانچہ پندرھویں صدی تک مسیحی دنیا میں عورتوں کو وہ حقوق نہیں دیئے گئے جو انہیں دینا چاہئے تھا۔ اس کے بعد اسلامی اثرات کی وجہ سے جو حقوق انہیں عطا بھی کئے گئے وہ ناکافی تھے۔ عربوں کی جو حالت تھی وہ معلوم ہی ہے۔ زردشتیوں کے یہاں بھی عورتوں کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں تھا۔ غرض چھٹی صدی عیسوی تک عورتوں کی یہ حالت تھی کہ وہ مذہبی اور سرمایہ دارانہ طریقوں پر مردوں کی غلام تھیں اور ان کے پنجۂ ظلم میں جکڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ اسلام کی منور کرنیں کوہ فاران سے چمکیں اور انقلاب اسلامی کی چنگاریوں نے حیات انسانی کو نئی روشنی بخشی۔ اسلام نے جہاں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں انقلاب لایا وہاں اس نے عورتوں کے حقوق بھی محفوظ کر دیئے۔ اور یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق عطا کئے وہ دنیا کی کوئی دوسری قوم یا کوئی دوسرا نظریۂ انقلاب اب تک نہ دے سکا ہے اور نہ دے سکتا ہے جب تک کہ وہ اسلامی نظریۂ حیات کی خوشہ چینی نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو حقوق بھی عورتوں کو دیئے گئے وہ اس کی خودداریوں کو بڑھانے کے لئے نہیں بلکہ اس کی نسوانیت سے کھیلنے کے لئے۔ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے اس میں سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ اس نے عورتوں پر سے اس الزام کو رد کیا جو مسیحی دنیا نے اس پر لگایا تھا اور قرآن نے یہ اعلان کر دیا کہ شجر ممنوعہ کے پاس جانے کی ذمہ داری مرد اور عورت دونوں پر تھی شیطان نے دونوں کو بہکایا تھا۔ قرآن شریف میں ذات باری نے کئی مقام پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (خیر یہ تو ایک دینی مسئلہ ہے جس کے وضاحت کا یہ موقع نہیں) اس کے علاوہ بھی اسلام نے عورتوں کو جو حقوق عطا کئے اس میں عورتوں کو سماج اور سوسائٹی میں ایک بلند اور باعزت مرتبہ دیا۔ اسے ملکیت میں حصہ دار قرار دیا۔ مردوں پر عورتوں کی ذمہ داری مقرر کی۔ عورتوں کو شادی کے معاملہ میں پسند اور ناپسند کا حق دیا۔ شوہر اور بیوی دونوں کے حقوق یکساں مرتب کئے۔ اگر مرد کو طلاق کی اجازت دی تو عورتوں کو بھی خلع کا حق دیا۔ عورتوں کو پردے کا حکم دے کر انہیں گھر کی مالکہ قرار دیا اور ایک باعزت مقام عطا کر کے سوسائٹی کے ہاتھوں

عورتوں پر رقص و سرود اور

میں کھلونا بننے سے بچا لیا۔ عورتوں پر ہر اس قسم کی پابندی لگائی جو انہیں شمع مجلس بننے سے بچا ہے۔

بے پردگی کا امتناعی حکم لگا کر اسے سرمایہ داروں اور نفس پرست امراء کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے بچا لیا۔ یہاں پر ایک بات قابل ذکر ہے۔

مسیحی دنیا کی طرف سے مسلمانوں کی چار شادیوں پر تیر و نشتر کے جتنے حملے کئے گئے ہیں، شاید ہی کسی دوسرے مسئلے پر کئے گئے ہوں اور عیسائیوں کے نزدیک مسلمانوں کی چار شادیاں ایک ہوا معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان کو یہ نہیں معلوم کہ اسلام نے مسلمانوں کو چار شادیوں کی اجازت دے کر (جو مختلف شرائط کے ساتھ مشروط ہے، اور ہر مسلمان کے لئے ضروری نہیں) جن خطرات کے دروازے بند کر دیئے تھے، مسیحی دنیا نے اپنے پیروؤں کو ایک شادی کی اجازت دے کر ان سارے خطرات کے دروازے کھول دیئے۔ اور کیا مسیحی دنیا آج اس بات کا جواب دے سکتی ہے کہ اس کی سوسائٹی اور سماج میں کتنے فیصدی لوگ ایک پاکیزہ اور باعصمت زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر ان کی پاکیزہ زندگی کا مطالعہ کرنا ہو تو HISTORY OF CRIMES IN AMERICA یا PROSTITUTION IN ENGLAND پڑھئے، اس سے پتہ چل جائے گا کہ دنیا کی ان سب سے بڑی مہذب قوموں کی اخلاقی حالت کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں برطانیہ کی مشہور ناول نگار خاتون مارگریٹا لاسکی نے برطانیہ میں جنسی بے راہ روی کے متعلق جو بیان دیا ہے اس سے وہاں کی اخلاقی حالت کا اندازہ ہو سکے گا۔ ملاحظہ ہو روزنامہ جنگ مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۵۵ء۔ اسلام نے ان سارے دروازوں کو بند کر دیا تھا لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے، خود مسلمانوں کے ایک سرمایہ پرست طبقے نے اسلامی سیاست کی ساری بساط الٹ دی اور اسلامی خلافت کو پارہ پارہ کر کے اسے نسلی شہنشاہیت میں تبدیل کر دیا پھر رفتہ رفتہ اسلام میں وہ سارے فتنے نفوذ کرتے چلے گئے جو دورِ جہالت کا خاصہ تھے! شراب و کباب کا دور شروع ہوا اور رقص و سرود کی مجلسیں جمیں اور اس طرح جمیں جس کی مثال دنیا کے ہر سرمایہ دار طبقہ میں ملتی رہی ہے۔ شراب نوشی کا لازمی نتیجہ عورت کی تذلیل ہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں بھی شراب نوشی کے ساتھ ساتھ رقص و سرود کی گھٹائیں اٹھیں، برسیں اور سارے سماج پر چھا گئیں۔ یہاں تک کہ آج تک اس کے اثرات باقی ہیں اور اپنے عروج کے لئے کوشاں ہیں! غیر مسلم ممالک کا تو ذکر ہی فضول ہے، اس لئے کہ ان کے یہاں تو رقص و سرود روزِ اوّل ہی سے ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور انہیں ایک مذہبی فنکارانہ اور آرٹ کا رنگ دے دیا گیا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں رقص و سرود اور ناچ گانے کو جو عروج حاصل ہوا وہ شاید ہی کسی اور زمانہ میں ہوا ہو۔ سارے ہندوستان میں رقص و سرود کی محفلیں برپا ہوتیں اور طوائفوں کا جمگھٹا ہوتا۔ اس کے لئے ہمیں کسی تاریخی شہادت کی ضرورت نہیں بلکہ صرف ان شعراء کا کلام کافی ہے جو ان ادوار میں پیدا ہوتے رہے۔ ملا وجہی سے لے کر اکبرالہ آبادی تک ہمیں ان طوائفوں کے متعلق اتنے واضح ثبوت ملتے ہیں جس سے انکار کسی صورت بھی ممکن نہیں۔ دوسری طرف ہمارے شعراء نے عورتوں کو جس نظر سے دیکھا وہ صرف معشوق کا درجہ تھا اور یہ معشوق زیادہ تر یہی بازاری عورتیں ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سفلی جذبات سے بھرے پڑے ہیں۔ خود علامہ اقبال نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ! ان بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

طوالت کی وجہ سے میں صرف چند اشعار پر اکتفا کروں گا ورنہ ہمارے شعراء کے پورے دواوین ان حقائق سے بھرے پڑے ہیں۔ مومن کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں ؎

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو — ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو!

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ — بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو!

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو!

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو!

اس غزل کی حقیقی زمین خود اس بات کی غماز ہے کہ اشعار کن حقائق کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ خصوصاً آخری شعر "اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک" سے تو یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف اس ایک شعر میں شاعر نے حالتِ رقص و سرود کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے! آتش کی غزل کے دو اشعار ہیں ؎

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا
بناوٹ کیفِ مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ آتش کا معشوق بھی کوئی شاہدِ بازاری ہے جو شیشہ کا بیٹھنے والا ہے ورنہ منہ چڑانا اور گالیاں دینا کسی شریف کا پیشہ نہیں اور نہ کوئی شریف عورت شراب کا استعمال کر سکتی ہے! غالب کا ایک شعر ہے ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!

بزم، ساقی، دورِ جام اور شراب، اہلِ نظر خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ الفاظ کن حقائق کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ ان حقیقتوں کو صحیح طریقے پر جاننے کے لئے میر حسن کی مثنوی سحرالبیان اور مرزا رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں مصنف نے بے نظیر کی پیدائش اور بدرِ منیر کے ساتھ اس کی شادی پر رقص و سرود کا جو سماں پیش کیا ہے اور مرزا رسوا نے "امراؤ جان ادا" کے پردے میں ہندوستانی طوائفوں کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ سرتا سر لکھنؤ کے ماحول کی ترجمانی ہے۔ اور یہ صرف لکھنؤ ہی نہیں تھا بلکہ کم و بیش تمام ہندوستان میں رقص و سرود کی مجلسیں برپا ہوتی تھیں اور شراب و شاہد کا دور چلتا تھا! جنوری ۱۹۳۲ء کے نگار میں نیاز فتح پوری غالب نمبر میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں "ایامِ شباب میں مرزا کو شراب و شاہد سے گہرا تعلق تھا، اس لئے عیش پرست سمجھے جاتے تھے"۔ عبدالمنان بیدل عظیم آبادی عصرِ غالب کے متعلق لکھتے ہوئے فرماتے ہیں "لکھنؤ میں ان دنوں تصنع، تکلف اور رعایتِ لفظی وغیرہ شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی۔ شعرائے لکھنؤ کا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے مبرا نظر آتا ہے۔ اس کی کھلی ہوئی وجہ تو یہ ہے کہ لکھنؤ میں اس وقت دولت و مال کی فراوانی تھی۔ امراء لہو و لعب میں منہمک تھے اور نوابین رہینِ شراب و شاہد۔ لکھنؤ کا بچہ بچہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا شعراء کیوں کر پیچھے رہتے" نواب واجد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کے متعلق کسے نہیں معلوم۔ ان مثالوں سے کسی کی تحقیر و تذلیل مقصود نہیں بلکہ میں ان حقائق کو بتا کر یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس وقت کے ماحول میں عورت کا کیا مقام تھا اور مسلم سرمایہ پرستوں نے اس کو کیا درجہ دے رکھا تھا یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعراء کے تمام کلام گل و بلبل، زلف و سنبل، خط و لب، زلف و کمر اور شراب و شاہد کی ترکیبوں سے بھرے پڑے ہیں اور ان سبھوں کا مرکزی کردار عورت ہے اور صرف عورت! اگرچہ کبھی کبھی مردوں پر بھی چوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس وقت کے سماج میں عورتوں کا کیا مرتبہ تھا۔ لیکن ہاں! یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اس وقت کے سماج میں بھی عورتوں کے دو طبقے تھے، ایک تو سرمایہ دار عورتوں کا طبقہ تھا جس میں شاہی خاندان، امرائے دولت اور نوابانِ مملکت کی بیگمات ہوتی تھیں اور جن کی بڑائی اور بزرگی سرمایہ دارانہ اور خاندانی حیثیت سے سماج پر حاوی تھی اور تسلیم کی جاتی تھی، اگرچہ وہ بھی مسلم سرمایہ داروں کے چشم و ابرو کا نشانہ تھیں! دوسرا طبقہ غریب عورتوں اور طوائفوں کا تھا، جو درحقیقت سرمایہ پرستوں کی غلام تھیں اور معاشی حیثیت سے ان کی دستِ نگر تھیں۔

یہ ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک کی حالت تھی۔ لیکن یورپ کی حالت بھی کچھ اس سے زیادہ بہتر نہیں تھی۔ وہاں بھی عورتیں سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھیں اور سرمایہ پرستوں نے سماج اور سوسائٹی کو جس رنگ میں ڈھالا تھا عورتیں بھی اسی رنگ میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ بلکہ یورپ کی حالت مشرقی ممالک سے کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ مشرقی ممالک میں یہ تو تھا کہ وہ عورتیں جو جائز طریقہ پر اپنے شوہر کی زوجہ تھیں انکی بزرگی اور برتری سماج میں مسلّم تھی اور وہ باعزت نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ انہیں کسی ایسے کام کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا تھا۔ جو انکے وقارِ نسوانی کو گرانے والا ہو۔ لیکن یورپ میں حالات اسکے بالکل برعکس تھے۔
سترھویں صدی کے صنعتی انقلابات کے بعد یورپ والوں نے اور خصوصاً انگلینڈ نے اپنی تہذیب و تمدن کی بنیاد خالص مادہ پرستی پر رکھی اور مذہب کے خلاف انتقامی جوش میں سارے مذہبی اور دینی روایات کو ختم کر دیا۔ مذہبی اعتقادات ختم کر دیئے گئے۔ اور تہذیب و تمدن اور معاشرہ و سماج کی پوری عمارتیں ڈھا دی گئیں اور اسکی بنیاد پر ایک نئی عمارت کھڑی کی گئی جو اپنی فطرت اور اصلیت میں بالکل الحادی اور مادہ پرستانہ تھی۔ اخلاق و معاشرت کے نئے نئے نام کئے گئے اور وہ چیزیں جو مذہبی حیثیت سے بری سمجھی جاتی تھیں، اچھی سمجھی جانے لگیں اور جو اچھی سمجھی جاتی تھیں بری اور دقیانوسی سمجھی جانے لگیں۔ یورپ میں الحادی مادہ پرستانہ تہذیب کے جو نئے سیلاب آئے انہوں نے دورِ گذشتہ کی پوری روایات کو اپنے ساتھ بہا ڈالا۔ سیاست کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی انہوں نے سماج اور سوسائٹی۔ تہذیب و تمدن اور تعلیم و معاشرت کی تخلیق اس حیثیت سے کی کہ عورت جو پہلے گھر کی ملکہ اور زینت تھی۔ اب شمعِ محفل بنکر رہ گئی۔ عورتوں میں آزادی اور مساویانہ حقوق کی جو پُرفریب روح پھونکی گئی اسکے پیچھے دراصل ایک نفسیاتی بحران کا جذبہ شامل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے ہر پہلو میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش چلنے لگیں اور چونکہ تہذیب و تمدن کی اساس مادہ پرستی پر رکھی گئی تھی۔ اسلئے اخلاق و معاشرت کے وہ سارے نظریات جو پہلے بے حیائی اور بے شرمی میں داخل تھے اب عین باحیا اور باشرم سمجھے گئے۔ تعلیم و معاشرت کی ایک نئی تخلیق کے ساتھ عورتوں میں بے باکی پیدا ہوئی جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ عورتیں رقص و سرود، تھیٹر، سرکس، گھوڑ دوڑ، کلب اور زندگی کے ہر شعبہ میں بے باکانہ حصہ لینے لگیں، انکے لئے شرم و حیا کی اب کوئی قید نہیں تھی۔ اسلئے کہ انہیں اخلاق کے نئے فلسفہ کے ساتھ عین باحیا سمجھا جانے لگا۔ اب یورپ کی نگاہ میں بے حیائی بے شرمی عریانیت، فحاشی، مے نوشی، قمار بازی اور تمام دوسری اخلاقی برائیاں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں اور انہیں بالکل آزادانہ طریقہ پر سماج میں برتا جاتا تھا۔ یورپ نے عورتوں کو پروپگنڈہ کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا اور ان سے ہر طرح کا کام لے رہا تھا۔ علامہ اقبال نے انہی حقائق کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات!

بیسویں صدی تک یہ ساری باتیں درجۂ کمال کو پہنچ گئیں۔ ہندوستان بھی چونکہ انگریزوں کا غلام تھا۔ اور انکے غلامانہ پنجے اسکی شہ رگ کو پکڑے ہوئے تھے اسلئے وہ ساری باتیں جو یورپ میں ظہور پذیر ہو رہی تھیں۔ ہندوستان کو بھی متاثر کر رہی تھیں۔ انگریزوں نے ہندوستان کو سیاسی طور پر غلام بنا لیا تھا اور اپنی حکومت عیاری ظلم اور سنگین کے زور سے قائم کی تھی لیکن اس حکومت کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لئے ایک ایسی پالیسی کی ضرورت تھی جو مستقل طور پر ان کی حکومت کی جڑ کو یہاں استوار اور گہرا کرے۔ خوش قسمتی سے یہ پالیسی لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کی شکل میں ظاہر

ہوئی۔ جس کی طرف خود علامہ نے بھی اشارہ کیا ہے ؂

اک روز فرنگی نے کہا اپنے پسر سے — منظر وہ طلب کر کہ تیری آنکھ نہ ہو سیر
بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم — بَرّے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

تعلیم کی یہی تیزابی کیفیت تھی جو ہندوستانی نوجوانوں کے اخلاق و کردار کو زنگ کی طرح چاٹ رہی تھی!

اقبال کی نگاہ میں عورت کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ عورت کو کائنات کا سب سے حسین پھول سمجھتا تھا۔ اس کی نظر میں عورت انسانیت کا تاج اور کائنات کی عزت تھی۔ عورت کائنات کا وہ حسین پھول ہے جس کی حفاظت مرد کے ذمہ ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔ دنیا کے سارے انسان سوا حضرت آدمؑ کے عورت ہی کی گود میں پلے، بڑھے اور پروان چڑھے! ہم مردوں کی اس صف میں بڑے بڑے پیغمبر، بڑے بڑے فاتح اور عظیم مدبرانِ قوم و ملک کو پاتے ہیں جنہوں نے اپنی بقائے حیات کے لئے عورت ہی کے دامن عاطفت میں پناہ لی۔ ہمیں مردوں کی اس صف میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ و موسیٰؑ اور محمد مصطفیٰؐ جیسے جلیل القدر پیغمبران کرام بھی ملتے ہیں۔ سکندر، ذو القرنین، حضرت خالدؓ، ابو عبیدہؓ، موسیٰ بن النصر اور طارق ابن زیاد جیسے فاتح اعظم بھی نظر آتے ہیں۔ ہمیں اس صف میں سکندر، چنگیز، ہلاکو اور تیمور جیسے ہلاکت آفریں انسان بھی دکھائی دیتے ہیں ہم اس صف میں بقراط، افلاطون، ارسطو، بو علی سینا، ابن رشد اور امام رازی جیسے فلسفی بھی پاتے ہیں! ہمیں اس صف میں جالینوس، بقراط، بو علی سینا اور ضیا ابن بیطار جیسے حکما بھی نظر آتے ہیں! ہم اس صف میں نیوٹن، ہرشل، ہیکسول اور آئنسٹائین جیسے سائنسدانوں کو بھی دیکھتے ہیں۔ ہمیں اس صف میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، عمر بن عبد العزیزؒ اور اورنگ زیب جیسے مدبرانِ مملکت اور فاتحِ انسانیت بھی نظر آتے ہیں۔

غرض کہ ہم زندگی کے جس شعبے میں جلیل القدر انسانوں کی فہرست پر نظر ڈالیں ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ سارے انسان عورت ہی کی گود میں پلے، بڑھے اور پروان چڑھے! یہی وجہ تھی کہ اقبال یورپ کی اس مادہ پرستانہ تہذیب اور عورت کی عیارانہ تذلیل پر بے چین ہو گیا اور بے اختیار پکار اٹھا ؂

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں!
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں!
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن! — اس کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اقبال کی نگاہ میں عورت تصویرِ کائنات کا رنگ ہے اور شرف کی بلندی میں اس کا مقام ثریا کی بلندی سے بھی زیادہ ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہر وہ دُر جس کی تفصیل ہمیں حیاتِ انسان کی فہرست میں ملتی ہے اور جس کا ایک ہلکا سا خاکہ میں ابھی اوپر دے چکا ہوں عورت کا درِ مکنوں ہے اور اس کی تخلیق اسی کے خونِ جگر کی رہینِ منت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عورت اپنے اس فطری حق اور بزرگی کو نہ سمجھے یا اس فریب کو سمجھایا نہ گیا ہو!

اقبال ان معنوں میں بھی عورت کو ملزم نہیں گردانتا، بلکہ اس کی فطری معصومیت کا قائل ہے اور اس کی شرافت کا گواہ! قصور دراصل اس فرنگی معاشرت اور سرمایہ دارانہ نظامِ حیات کا ہے جس کی بنیاد ملحدانہ تصورِ حیات پر اٹھ گئی ہے اور جس کو بڑھانے والے یہ عیارانِ افرنگ اور ان کے

غلام نفس پرست سرمایہ دار ہیں۔ چنانچہ اقبال خود کہتا ہے!

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں!
قصورِ زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں!
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں!

اقبال کی نظر میں عورت کی شرافت مہ و پرویں سے بڑھ کر ہے اور اس کی شرافت پر شبنم کے موتی نچھاور ہیں۔ اس کی نگاہ میں عورت کی یہ عزت اس لئے نہیں ہے کہ عورت حسن کی ایک دیوی ہے، یا تکمیلِ نفس کا ایک ذریعہ اور خواہشاتِ نفسانی کے پورا کرنے کا ایک آلہ۔ بلکہ یہ اس لئے ہے کہ عورت عالمِ انسانیت کی ماں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ تمام انسان عورت ہی کی گود میں پلے۔ اقبال کا یہ تصور دراصل اسلامی تصور ہے اور اسی تصور نے اس کو یہ جذبۂ بلند عطا کیا ہے۔ لیکن دراصل قصور یہ اس غیر اسلامی نظریۂ حیات اور فرنگی معاشرت کا ہے جس کی بنیادیں لادینی فلسفۂ حیات پر رکھی گئی ہیں، اور اسی فلسفہ کے مطابق اسے ایک لادینی تعلیم دی جا رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ، اپنے وجود کے مقصد کو نہ سمجھنا اور اپنے فطری حقوق سے محروم رہنا ہے۔ فطری حقوق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت کو خواہ مخواہ میدانِ جنگ میں گھسیٹ لایا جائے (گو یہ بعض خاص حالات کے لحاظ سے عورت کو بھی جنگی تعلیم دی جا سکتی ہے اور اسے میدانِ جنگ میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن عیاشی اور نفس پرستی کے لئے نہیں، بلکہ قومی وقار اور دین و مذہب کے بچاؤ کے لئے) یا ایسے سیاسی بازی گری کا مہرہ بنا لیا جائے۔ بلکہ فطری حقوق کا مطلب یہ ہے کہ عورت کو وہ تمام حقوق دیئے جائیں جو دین نے انہیں دیئے ہیں اور قدرت نے اسے جس مقصدِ حیات کے لئے تخلیق کیا ہے اسے ایک باعزت طریقے پر برتا جائے اور سوسائٹی میں ایک باعزت مقام دیا جائے جو اس کی ذاتی بڑائی کو بڑھانے والا ہو نہ کہ گرانے والا لیکن ہمارے یورپی فلاسفروں نے دانستہ یا نادانستہ تعلیم کا جو درس مقرر کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عورت سے قوتِ نسوانی اور اس کے صالح جذبات کو چھین لیا جائے اور اسے اسٹیج کی ایک تتلی بنا کر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اقبال اس طرزِ تعلیم کے خلاف پرزور طریقہ پر احتجاج کرتا ہے ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت ہے حضرتِ انسان کے لئے اس کا ثمر موت!
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن[1] کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت!
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت!

لادینی تعلیم کا لازمی نتیجہ خودی کی موت ہے۔ اور ایسی تعلیم معاشرۂ انسانی کے لئے زوال کا باعث ہے۔ لیکن یورپ کے اربابِ ہنر اور ان کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فلاسفروں نے تعلیم کا جو طریقہ رائج کیا تھا وہ عورتوں کی خودداری اور ان کے وقار کو گرانے والا تھا۔ درحقیقت ہندوستان میں انگریزوں نے تعلیم کا جو نصاب تیار کیا تھا اس کے پیچھے ایک گہری سیاسی چال تھی۔ اقبال نے خود انگریزی تعلیم سے گزر کر اس چال کو پا لیا۔

اور یہ پیرانِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف!

انگریزوں نے ہندوستان کو عیاری، سیاست اور سنگین کے زور سے حاصل کیا تھا۔ وہ ان کے جسموں پر قابض ہو گئے تھے لیکن ہندوستانیوں کے دماغ ابھی آزاد تھے، ان کے خیالات اور افکار آزاد تھے اور ان کے دماغ میں حکومت کا نشہ باقی تھا۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو دائمی طور پر غلام بنانے کے لئے انگریزی تعلیم کا طریقہ رائج کیا اور اس کا نصاب جس طرح منتخب کیا وہ ہندوستانیوں کو دماغی حیثیت سے غلام بنانے کے

[1] میں یہاں [illegible] کے بجائے لا کو زیادہ موزوں سمجھتا ہوں ۔ شاہد پرویز)

کے لئے تھا۔ چنانچہ اس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوا۔ دوسری طرف اس تعلیم کا مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی ادب اور تعلیم سے روشناس کرا کے انگریزی تہذیب کا رعب بٹھایا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے اور نہایت کامیاب ہوئے۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے عملی حیثیت سے بھی ہندوستان میں بے حیائی اور بے شرمی کو رواج اور فروغ دیا۔ چنانچہ ڈرامہ، تھیٹر، ناٹک، سرکس اور سینما کے ذریعے ملک میں بے حیائی اور بے شرمی کو عام کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نصاب تعلیم میں رقص و سرود اور موسیقی کو بھی داخل کیا گیا۔ کالجوں میں اکثر ڈرامے بھی کھیلے جانے لگے۔ اس طرح ملک میں ایک عام بے حیائی اور بے شرمی کے ماحول کو پیدا کیا گیا۔ اور اسے ترقی پسندی اور برتری سمجھا جانے لگا۔ مسلمان گھرانوں کی وہ شریف لڑکیاں جن کی شرافت کی گواہی دی جاتی تھی اب بے پردہ اور بے حیا پھرنے لگیں اور اسٹیج پر تو کتنی ناچتی اور کودتی نظر آئیں۔ انگریز عیاروں اور ان کے غلاموں نے اسے ترقی پسندی کے نام سے موسوم کیا۔ ہندوؤں کے بعض طبقوں میں یہ باتیں پہلے سے موجود تھیں ان کے رقص و سرود کو مذہبی درجہ حاصل تھا لیکن انگریزوں کے آنے سے پہلے ان کے یہاں بھی بے حیائی اور بے شرمی نہیں تھی اور ہندوؤں کے شریف گھرانوں میں یہ باتیں معیوب سمجھی جاتی تھیں لیکن یہ انگریزی تعلیم کا اثر تھا کہ ان کے یہاں بھی بے حیائی اور بے شرمی داخل ہو گئی اور اب اپنے عروج پر ہے۔

اقبال کی نگاہ میں یہ تمام باتیں موت سے بدتر تھیں۔ وہ عورتوں کا اپنی خودداری اور اپنی عزت کے لئے مرجانا پسند کر سکتا تھا لیکن یہ پسند نہیں کر سکتا تھا کہ عورت مرد کے سامنے عریاں اور ذلیل ہو جائے۔ چنانچہ وہ دردناک حیثیت سے نواپیرا ہوا ؎

چھوڑ یورپ کے لئے رقص بدن کے خم و پیچ   روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللہی!
صلہ اس رقص کا ہے تشنگی کام و دہن   صلہ اس رقص کا ہے درویشی و شاہنشاہی!

اقبال یہ پسند نہیں کر سکتا تھا کہ ایک عورت مرد کے سامنے ناچے اور اپنے وجود اور اپنی خودداری کو ذلیل کرے۔ اپنی نسوانیت کو کھو دے اور اپنے وقار کو گنوا دے! وہ عورت کا مرجانا پسند کر سکتا تھا کہ عورت اپنے آپ کو ذلیل کر دے اور سرمایہ داروں کے تیر ہوس کا نشانہ بنے۔ کیوں؟ اس لئے کہ عورت انسان کی ماں ہے۔ کائنات کی شرم ہے اور زمین کی لاج ہے۔ قومیں اسی وجہ سے ذلیل اور گمراہ ہو جاتی ہیں اور بالآخر فنا ہو جاتی ہیں۔

اقبال اگرچہ ذاتی طور پر پوری صنف عورت کی بزرگی اور بڑائی کا قائل تھا۔ اس لئے کہ تمام عورتیں اس کی نگاہ میں یکساں اور مساوی درجہ رکھتی تھیں۔ وہ تمام عورتوں کی تکلیف، دکھ درد اور مصیبت کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا ؎

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت   نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود!

لیکن ایک مومن عورت کا مقام اس کی نگاہ میں چاند اور سورج سے بھی بلند تھا۔ وہ ایک مومن عورت کو اپنی بزرگی، بڑائی اور خودداری کی حیثیت سے ثریا سے بھی بلند دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غیر مسلموں کے یہاں رقص و سرود کو ایک مذہبی درجہ دے دیا گیا تھا۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں تھا اسلام میں رقص و سرود اور موسیقی شرعاً ممنوع ہیں۔

اس کے علاوہ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ مومن عورتیں جن کی مثال حضرت مریمؑ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت خولہؓ اور حضرت رابعہ بصریؒ کی ذات گرامی میں ملتی ہے، وہ آج یورپ کے بتائے ہوئے طریق زندگی کے مطابق رہتا ہو، مرتا گراہم، جون دیکلے، این فرانسس اور نرگس و ثریا کی مثال پیش کریں! اس کے نزدیک یہ حالات موت سے بدتر تھے۔

تیسری وجہ یہ بھی تھی کہ عورتیں ونیلے، نسائیت کے اہتمام بڑے بڑے ہیرو پیدا کرتی رہی ہیں جن کی ایک مختصر فہرست میں اوپر دے چکا ہوں!

اقبال عورت کو ایک بلند مقام دینا چاہتا تھا۔ ایک ایسا مقام جو اسے سماج یا سوسائٹی میں بلند اور فائق مرتبہ دے، ایک ایسا مرتبہ جو اس کی خودداری اور نسوانیت کو بڑھانے والا ہو۔ وہ عورت کو عصمت و عفت کی دیوی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ عورت اپنے اصل مقام کو پہنچانے اور کائنات میں جو فرائض اس پر عائد کئے گئے ہیں اسے پورا کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں اسی وقت ہو سکتی تھیں جب کہ عورت کو صحیح تعلیم دی جائے اور اسے اس کے اصل مقام سے روشناس کرایا جائے! یہی وجہ تھی کہ وہ عورت کی تعلیم کا مخالف نہیں تھا، لیکن وہ ایسی تعلیم نہیں چاہتا تھا جس سے عورت ایک شمع محفل یا اسٹیج کی تتلی بن جائے بلکہ وہ ایسی تعلیم چاہتا تھا جو اس کے جذبۂ نسوانیت کو بڑھانے والی، اس کو اپنی عصمت و عفت کی حفاظت پر مجبور کرنے والی، اس کی خودداری اور عظمت کو بڑھانے والی، اور اس کے منصب و وقار کو بلند کرنے والی ہو۔ اور یہ تمام باتیں اسی وقت پیدا ہو سکتی تھیں جب کہ عورت کے اندر دین کو سمجھنے کا صحیح جذبہ پیدا ہو۔

لیکن عورت کی تمام خرابیوں کے لئے وہ مرد ہی کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ مرد ہی سماج اور سوسائٹی کا وہ عنصر ہے جو اپنے نظریات اور فلسفۂ اخلاق کی بنا پر سوسائٹی اور سماج کی تشکیل کرتا ہے اور اگر وہ دینی نظریۂ حیات کو چھوڑ دے تو پھر اس کے لئے لادینی فلسفۂ حیات ناگزیر ہو جاتا ہے جس کا لازمی اور آخری نتیجہ تباہی و بربادی اور فنائیت ہے۔ لہٰذا اقبال اس حقیقت کی ذمہ داری بھی مردوں پر ڈالتا ہوا یہ بتلاتا ہے کہ ؎

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد!
نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد!
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد!

اقبال کے سینے میں یہی حقیقت پوشیدہ تھی کہ عورت کی حفاظت خود اس عورت کی حفاظت نہیں ہے بلکہ ایک قوم کی حیات و موت بھی اسی ایک حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ ؎

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا!
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد!

اس ایک شعر میں اقبال نے قوموں کے عروج و زوال کی حقیقت افروز مثال بیان فرمائی ہے۔ یونانیوں سے پوچھیے کہ ان کے زوال کا باعث کون سی چیزیں ہوئیں۔ رومن یہ بتا دیں گے کہ ان کے زوال کی کیا وجہیں تھیں۔ بنو عباس یہ پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم تباہیوں کی تلوار دن کا نشانہ اس لئے بنے کہ ہمارے محلات سے رقص و سرود کی جھنکاروں کی صدائیں آتی تھیں اور شراب و کباب کے شیشے آپس میں ٹکرانے تھے" اخود مغل اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کا وجود اس لئے مٹ گیا کہ انہوں نے عورت کو شراب اور شراب کو عورت جانا۔ فرنگیوں کا یہی عیش پرستانہ ماحول تھا جس کے بڑھتے ہوئے اثرات میں۔ رزق کی کمی پر ضبط تولید کا اصول مرتب ہوا اور جس نے عیش و عشرت کی دوسری نئی راہ دکھائی۔ علامہ اقبال نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ؎

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش!
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال مرد بیکار و زن تہی آغوش!

حجت کی تہی آغوشی یورپ کے صنعتی تمدن کا ایک لازمی نتیجہ تھی اور آج بھی یہ موضوع اربابِ یورپ کے لئے اتنا ہی ناقابلِ حل ہے، جتنا ہاملٹس کے وقت میں تھا!

اقبال کے نزدیک ان ساری خرابیوں کی جڑ وہ لادینی تعلیم ہے جس کا درس یورپ نے ساری قوموں کو دیا اور اب تک دے رہا ہے اور جسے حاصل کر کے ان کے اندر بے باکی بے حیائی اور بے شرمی پیدا ہو رہی ہے۔ جسے حاصل کر کے عورتیں اپنے مقصدِ وجود کو بھول گئی ہیں اور ان کے سامنے انسانیت کی صحیح منزل گم ہو گئی ہے! ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

اس لادینی تعلیم کا یہ لازمی نتیجہ تھا اور ہے کہ عورتوں میں مردانہ پن کے جذبات پیدا ہوں جو بالکل ایک غیر فطری عمل ہے اور جس کا اتباع کرنا ان کے وقارِ نسوانی کی تذلیل ہے۔ لیکن یورپ کے ان سیاسی بازیگروں نے جن کا مقصد ہمیشہ سے مکارانہ تجارت رہی انہوں نے دیکھا کہ وہ قوموں کو اس وقت تک ذہنی حیثیت سے غلام نہیں بنا سکتے جب تک کہ ان کو تعلیم کا زہر شکر کے ساتھ گھول کر نہ دیا جائے، جس کے پیتے ہی ان کی ساری خودداری اور غیرت و حمیت مردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور آج اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارا کیا حشر ہو رہا ہے اور وہ اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہیں!

اقبال کے نزدیک یہ تمام باتیں سخت عبرت انگیز تھیں، اس لئے کہ وہ ایک سچا مومن تھا جس کے دل میں اسلامی خون موجزن تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلمانوں میں بھی وہ تمام باتیں رواج پا جائیں جو آج یورپ کا خاصہ ہیں اور جسے یہ دانایانِ فرنگ ساری دنیا میں نافذ کرنا چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں، اس لئے کہ ایک قوم اپنی حفاظتِ ناموس اور غیرتِ دینی کے لئے مر سکتی ہے اور جب تک اس کے اندر اپنی بقا کے لئے مرنے کا جذبہ پیدا نہ ہو وہ زندہ نہیں رہ سکتی، اور اگر وہ اپنے نظریۂ حیات، اپنی غیرت و حمیت اور اپنی حریتِ فکر کو کھو کر زندہ بھی رہتی ہے تو اس کی یہ زندگی ایک غلامانہ زندگی ہے، موت سے بدتر ہے!

بہر حال ان سارے حقائق کو مدِ نظر رکھ کر دیکھیں تو یہ نظر آ جائے گا کہ اقبال کی نگاہ میں عورت کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ عورت کو کائنات کی روح تصور کرتا تھا۔ اس کے نزدیک عورت کائنات کی وہ عزیز ترین ہستی ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری مردوں کے سر ہے اور جس کی حفاظت پر قوموں کا عروج و زوال منحصر ہے۔ جس قوم نے عورت کے وجود کے صحیح مقصد کو نہیں سمجھا اور اسے صرف عیش کا ایک ذریعہ سمجھا تو وہ قوم بہت جلد فنا کے گھاٹ اتر جائے گی اور اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ دنیا کی تاریخ اپنی حقائق کو واضح کرتی رہی ہے اور اپنے آپ کو دہرانے میں کبھی پیچھے نہیں رہی؛

لیکن اقبال اپنے اس نظریہ میں کہاں تک کامیاب تھا اس کا جواب ہمیں اپنی موجودہ سوسائٹی سے معلوم کرنا چاہیئے۔ کیا اقبال کا نظریہ پیدا ہوا اور کیا ہم نے اس کی پیشین گوئی سے کوئی فائدہ حاصل کیا؟ اس کی نفی پر مجھے ڈر ہے کہ ہم پر بھی پھر وہی مثل صادق نہ آئے کہ ؎

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد!

آرٹ

چمن زارِ حقیقت میں

بالعموم ——— پتوں اور کونپلوں میں کھویا رہتا ہے!

اس کی نگاہ اگر بہت بلند ہوتی ہے تو وہ پھولوں کی نازک پتیوں سے کھیلتا ہے!

لیکن کوثر نیازی کے آرٹ کی نگاہ زرِ گل تک پہنچی!

زرِ گل

کوثر نیازی کا ——— پہلا مجموعۂ کلام

دیباچہ: مولانا امین احسن اصلاحی کے قلم سے

- زندگی سے مالا مال فکر
- حقیقت کی ترجمانی کرتا ہوا تخیل
- متحرک شعریت
- بامقصد فن
- نظریۂ اسلامی سے فیض یافتہ ذوقِ نگاہ

مکتبہ تعمیرِ انسانیت لاہور

عنقریب پیش کر رہا ہے!

آزما کر اطمینان کر لیجئے

بناول

کھانا پکانے کا بہترین روغن ہے

لذیذ

صحت بخش

خوشگوار

ہاتھوں سے چھوئے بغیر تیار کیا جاتا ہے



بنولے کی قوت بخش خصوصیات مدت سے مسلم ہیں
اس کا روغن توانائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ مانا گیا ہے۔
صحیح اصولوں کے مطابق تیار کیا ہوا بنولے کا روغن صحت
کے لئے مفید ترین اور بے ضرر چکنائی کا کام دیتا ہے۔

ہمارا تیار کردہ "بناول" بنولے کا پاک صاف روغن
ایک معیاری پیداوار ہے۔ جدید اصولوں کے مطابق بنایا ہوا
یہ روغن ملک بھر میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے



۳۵ پاؤنڈ۔ ۱۰ پاؤنڈ اور ۵ پاؤنڈ کے مہر بند ڈبوں میں ملتا ہے

بنگال آئل ملز لمیٹڈ۔ بنگال ہاؤس۔ کراچی فون ۳۲۵۳۰
جہانگیری بلڈنگ میکلوڈ روڈ۔ لاہور


LIBRARY
JUN
DEL

ہماری کتابیں

ثریا صادق



مکتبہ چراغِ راہ

آرام باغ روڈ ۔ کراچی ـــــــ بیرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور

نعیم صدیقی	قومی ملکیت	-/۱۲/-
	تخریب و تعمیر	۳/-/-
	اسلامی فلسفۂ ملکیت	۲/۴/-
	شعلۂ خیال	۳/۴/-
	دفترِ بے معنی	۲/۸/-
	معروف و منکر	۳/۱۲/-
	فکر و نظر	۳/-/-
امین احسن اصلاحی	تدبرِ قرآن	۳/۴/-
	اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	۱/۱۲/-
	اقسام القرآن	۱/۸/-
سید ابوالاعلیٰ مودودی	حدیث اور قرآن نیا ایڈیشن	زیرِ طبع
مسعود عالم ندوی	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	۲/۸/-
	[illegible] (حصہ اول، نیا ایڈیشن)	زیرِ طبع
	[illegible] (حصہ دوم)	۱/۸/-
	مکاتیبِ سلیمان	۳/۴/-
پروفیسر عبدالحمید صدیقی	اسلام کا فلسفۂ تاریخ (حصہ اول)	۱/۱۲/-
	" " " (حصہ دوم)	۲/-/-
	اسلام اور تھیاکریسی (انگریزی) ریاست	-/۸/-
افتخار احمد بلخی	فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر (حصہ اول)	۲/۸/-
	" " (حصہ دوم)	۴/-/-
	" " (حصہ سوم)	زیرِ طبع
مولانا مودودی، اصلاحی وغیرہ	مکاتیبِ زنداں	۲/-/-
کوثر نیازی	منتخب نظمیں	[illegible]

اسعد گیلانی	تحریکِ اسلامی اپنے لٹریچر کے آئینے میں		۱/۸/-
	آدم کے تین بیٹے		۱/۱۲/-
	تصویریں		۳/۰/-
جیلانی بی اے	اذان اور دوسرے افسانے		۳/-/-
	ماؤزے تنگ کے دیس میں		۲/۸/-
ملک غلام علی	سنتِ رسولؐ	نیا ایڈیشن	زیرِ طبع
نذر محمد خالد	اشتراکیت، مذہب اور اخلاق	غیر مجلد	۱/۲/-
چوہدری محمد اکبر	اور لیڈرز (انگریزی)	مجلد	۲/-/-
ابو ندیم ایم اے	فریبِ نظر		۳/۱۲/-
علی سفیان آفاقی	کندن		۳/-/-
ماہر القادری	فردوس		۲/۸/-
حلقہ ادبِ اسلامی	صبح آ رہی ہے		-/۸/-

بچّوں کی کتابیں

اِعجاز الحق قدوسی

سراپائے رسولؐ	۱/۱۰/-
رسول اللہ کے دو محبوب	-/۱۰/-
رسول پاک کی صاحبزادیاں	-/۱۴/-
درس گاہ رسول کے دو طالبِ علم	۱/۲/-
ہمارے نبی کے صحابہ	۱/۶/-



ابنِ احمد قرنی ایم اے

جنت سے زمین پر	-/۵/-
پہلا خون	-/۵/-
خوفناک طوفان	-/۷/۶
قہر کی آندھی	-/۶/-
اللہ میاں کی اونٹنی	-/۶/-
خدائی مہمان	-/۱۰/-
جس کا اللہ نگہبان	-/۱۲/-

مشرق میں نئی [illegible]

جسے مغربی طاقتیں [illegible] نہیں کر سکیں!

چین!

اس کے انقلاب کی کہانی!!

ایک پادری کی زبانی!!

ایک سچی آپ بیتی

معلومات افروز　　　عبرت آموز

ماؤزے تنگ کے دیس میں

مصنف کارلو سیگو

ترجمہ: جیلانی بی اے

قیمت: دو روپے آٹھ آنے

مکتبہ چراغ راہ

—— آرام باغ روڈ —— کراچی

—— بیرون لوہاری دروازہ لاہور

الجیریا

ــــ زخموں سے چُور چُور ہے

ــــ لہولہان ہے

ــــ کے انچ انچ سے خون رِس رہا ہے!

ــــ نڈھال ہو کر کراہ رہا ہے

ــــ مسلمانانِ عالم کی غیرت کو آواز دیتا ہے

ــــ پوری انسانیت سے انسانی ہمدردی کا حق مانگتا ہے!

جہاد

ایک مسلمان قوم موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے!

اس کا جہادِ حریت انیسویں مہینے میں داخل ہو چکا ہے!

اس کے ایک لاکھ جانباز فرانسیسی استعمار کے عفریت کے شکار ہو چکے ہیں!

اس کے پانچ لاکھ افراد گھر بار اور املاک سے محروم کئے جا چکے ہیں!

فرانس نے عظیم فوجی طاقت اور جدید ترین مشینی اسلحہ ظلم کے اس معرکے میں جھونک دیا ہے!

الجیریائی مسلمان

ہمارے بھائی ہیں! ــــ اُن کی زندگی ہماری زندگی ہے ــــ ان کی آزادی ہماری آزادی ہے ــــ ان کی عزت ہماری عزت ہے!

کسی نہ کسی طرح فرانس کی گولیوں کا شکار ہونے والے بھائیوں کی مدد کیجئے!

احتجاج کیجئے، جمعہ کے اجتماعات اور جلسوں میں قراردادیں پاس کیجئے!

اپنی حکومت پر دباؤ ڈالیے کہ وہ بین الاقوامی سطح پر الجیریا کی حمایت میں فرانس کے خلاف آواز اٹھائے۔

اور

فرانس کے مال کا بائیکاٹ کیجئے!

ــــ ادارۂ چراغِ راہ

روشنی ـــ گہرائی ـــ حرکت

ماہنامہ

چراغ راہ کراچی

مئی ۔ ۵۶

جون ۱۹۵۶ء

شمارہ ۶ ـــ ۱۲ ـــ جلد ۱۰

فہرست

چندہ سالانہ ۵/ روپے ـــ فی پرچہ ۸ آنے

دفتر اشاعت و انتظام ـــ ۹ ریگل چیمبر ابراہیم باغ روڈ ۔ کراچی نمبر ۱

دفتر ادارۂ تحریر ـــ ۲۵ ... لاہور

چوہدری ... پرنٹر و پبلشر نے ناظر ... سے چھپوا کر دفتر چراغ راہ ابراہیم باغ روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع کیا

شیخ بجاد

اشتراکی روس کی تاریخ میں نیا مدوجزر

جرمنی، فرانس اور اٹلی میں ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد اشتراکیت نے روس کو اپنی تجربہ گاہ کی حیثیت سے چن لیا یہاں مارکسی نظریات کے مطابق ۱۹۱۷ء میں انقلاب واقع ہوا۔ اور مزدور طبقہ کی آمریت قائم ہوگئی اس انقلاب کا سہرا لینن کے سر بندھا جس نے نیم عسکری دستوں کی تنظیم کی جن کو سوویٹس ([illegible]) کا نام دیا گیا لینن نے انقلاب کی سربراہ کاری کرنے کے لئے کمیونسٹ پارٹی کو بھی نئے خطوط پر منظم کیا۔ بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد اس پر کامیابی کے دروازے کھلے لینن اپنا فرض ادا کر کے ۱۹۲۴ء میں راہیِ عدم ہوا۔ لینن کی جانشینی اسٹالن کے حصے میں آئی۔ اسٹالن نے لینن کے بین الاقوامی نظریۂ انقلاب کو خیرباد کر کر اشتراکیت کو قومی و ملکی تصور کے دائرے میں محدود کر دیا۔ مارکسزم اور لینن ازم سے یہ ایک کھلا ہوا اور وسیع الاثر انحراف تھا۔ اس انحراف سے اشتراکیت کی اصولی قدر و قیمت کو بڑا نقصان پہنچا۔ اس اصولی و نظریاتی انحراف سے بخیریت گزر جانے کے لئے اسٹالن کو تشدد کی پالیسی اور زیادہ سنگین بنا دینی پڑی۔ پارٹی اور عوام دونوں کے نام پر شخصی آمریت کا سکہ چلانا پڑا۔ آمریت کیسی، وہ تو ایک خدائی تھی جو لوہے کے اس آدمی نے کرۂ ارض کے چھٹے حصے پر نافذ کی۔ اس کی تصویریں، دفتر دفتر، دکان دکان، کارخانے کارخانے اور گھر گھر آویزاں کی گئیں اس کا نام حلف لینے کے لئے استعمال ہوا۔ اس کے سامنے انسانی شرف کی گردن خم ہوتی رہی، اس کے حضور حمد و ثنا کے ترانے گائے جاتے رہے۔ اس کے ہر لفظ پر آمنا و صدقنا کہا جاتا رہا۔ اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اسٹالن کے حق میں کوئی حرفِ تنقید و اختلاف زبان پر لائے اشتراکی دنیا کا یہ خدا انجام کار ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو پیکِ اجل کے ہاتھوں خدائی کے تخت سے اتر کر لحد میں جا پہنچا۔

اسٹالن کی خدائی کے دور میں روس درجۂ اول کی بین الاقوامی طاقتوں کی صف میں جا پہنچا۔ گذشتہ جنگِ عظیم اقوام کو بلکہ اوپر والوں کو نیچے اور نیچے والوں کو اوپر کر کے جب رخصت ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ اشتراکی روس عالمِ انسانی کی پانچ بڑی طاقتوں میں سے ایک ہے مشرقی یورپ کی ریاستیں روس کی فاتح افواج کے قدموں میں آگریں چین میں ماؤزے تنگ کا ڈنکا بجنے لگا دنیا بھر میں کمیونسٹ تحریک اور اس کی پارٹیاں زور پکڑ گئیں۔ اور سرمایہ دار ممالک کو ایک پریشان کن صورتِ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان تمام اور کامیابیوں کے باوجود بعض وجوہ سے بین الاقوامی حالات میں اشتراکی روس کے لئے ناسازگاری کے پہلو نمایاں ہوتے گئے۔ اشتراکیت کے ترمیمی عمل نے اس کے اصولی استحکام کو جس طرح متاثر کیا تھا مختلف ممالک میں وہاں کے حالات کے اندر جگہ بنانے کے لئے سرخ نظام کو اپنی

فطرت اور اپنے مزاج میں ایسے تغیرات کرنے پڑے جنہوں نے اس کے پائے اصولیت کو متزلزل کر دیا۔ اشتراکی نظام کے تاریک پہلو جو روس کے آہنی پردے میں کسی حد تک مخفی تھے وہ اس پردے سے باہر آنے کے بعد دنیا بھر کے سامنے آشکارا ہو گئے۔ یورپ میں —— خصوصاً جرمنی کے تقسیم شدہ علاقے میں اشتراکیت جب مغربی جمہوریت کے آمنے سامنے آ کر برسرِ عمل ہو گئی تو دونوں نظاموں کا ایک ایسا کھلا موازنہ ہونے لگا جس پر پروپیگنڈے کا پیدا کردہ اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر صورت یہ ہوئی کہ قدم قدم پر یو این او اور اس کے ضمنی اداروں کے ایوانوں میں مختلف معاملات پر اشتراکی اور مغربی ذہن کا آمنا سامنا ہونے لگا اور دونوں طرف سے ڈپلومیسی کھلے میدان میں دست و گریباں ہونے لگی۔ بین الاقوامیت کے اس ڈپلومیٹک دنگل میں روس کو اسٹالن کی جس پالیسی نے سب سے بڑھ کر نقصان پہنچایا وہ علیحدگی پسندی اور ہٹ دھرمی تصادم کی پالیسی تھی۔ کوئی نقطہ اور خط ایسا نہیں تھا جس پر روس دنیا کی کسی بھی دوسری طاقت کے ساتھ کسی دائرے میں تعاون یا سمجھوتہ کر سکے۔ اشتراکی ریاست و نظام کا بنیادی مزاج ہی تصادم پسندانہ بنا دیا گیا تھا۔ اس مزاج کے ساتھ جب جارحانہ عزائم سے کر یورپ کی سرزمین پر روس کی فوجی قوت نے اپنے قدم بڑھائے تو پورا عالم مغرب چوکنا ہو گیا۔ اور اشتراکی رجحانات کے متعلق سخت ترین نقطۂ نظر اختیار کیا گیا حتیٰ کہ امریکہ جیسے جمہوری ملک میں اشتراکیت کو دبانے کے لئے ایسے سنگین اقدامات کئے گئے جو برسوں کی قائم شدہ روایاتِ آزادی کے بالکل خلاف تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مارشل پلان کا محاذ قائم کیا گیا جس پر ڈالروں کو بطور اسلحہ استعمال کیا جا رہا ہے۔

اشتراکیت کی تقدیر بہر حال پوری طرح اسٹالن کے قبضے میں تھی کہ کوئی عنصر اور کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو اس کے اقدامات اور فیصلوں پر چوں و چرا کرتا۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ وہ اس اشتراکی خداوند کو ٹوکتا اور اس کے مقابلے میں کوئی دوسری رائے سامنے لاتا جس کسی نے ذرا جنبش بھی کی اس کو یا تو زندگی سے محروم کر دیا گیا، یا آزادوں کی دنیا سے نکال کر اسے اسیری اور غلامی کے تحت الثریٰ میں پھینک دیا گیا۔

چھوٹے موٹے افسروں اور عہدہ داروں اور عوام الناس اور مزدوروں پر جو کچھ گزری ہوگی اس کا حساب تو درکنار رکھئے۔ پارٹی کے لیڈروں اور بڑے بڑے افراد کا جو حشر ہوا ہے۔ صرف اس کو دیکھئے اور سوچئے کہ اسٹالین کا دور کس درجہ قیامت خیز تھا۔ اس سلسلے میں حسب ذیل معلومات بڑی عبرتناک ہیں:

1- لینن کے قائم کردہ مابعدِ انقلاب کے پہلے پولٹ بیورو کے تمام کے تمام ارکان —— صرف اسٹالین کے استثنا کے ساتھ غداری اور سرمایہ دارانہ طاقتوں کی جاسوسی کے الزامات میں پھانسی دئیے گئے۔ یہ وہ افراد ہیں جن کے ہاتھوں روس میں انقلاب رونما ہوا۔ حتیٰ کہ لینن کی بیوہ تک کو سنگین شبہات کے تحت گھر ہی میں نظر بند کر دیا گیا اور اسے دھمکیاں دی گئیں کہ اگر وہ اسٹالین کی مرضی کے تابع ہو کر نہ چلے گی تو اسے تاریخ میں لینن کی بیوہ تسلیم نہ کیا جائے گا اور کسی دوسری عورت کو ان کی بیوہ کی حیثیت دے دی جائے گی۔ اسی طرح لینن کی موت کے بعد پارٹی کا جو پولٹ بیورو قائم کیا گیا تھا اس کے بھی تمام کے تمام ارکان ماسوائے خود اسٹالین کے یہی حشر ہوا۔

۳۔ نئے دستور کے تحت ۱۹۳۶ء کی سوویٹ حکومت کے گیارہ میں سے دس ارکان کو جاسوسی کے الزام میں گولی مار دی گئی۔
۴۔ سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی (جس کی حیثیت سوویٹ پارلیمنٹ کی تھی) کے سات صدروں میں سے پانچ کو ٹھکانے لگا دیا گیا یا جلا وطن کر دیا گیا۔ (بعض کو آتشزدگی میں بھسم کر دیا گیا۔)

۴۔ ۱۹۳۶ء کے دستور کی تدوین کرنے والے ستائیس افراد میں سے پندرہ کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

۵۔ اسٹالین کی موت کے بعد بھی یہ چکر اسی طرح چلتا رہا۔ روس میں اب تین نمایاں افراد قیادت کے منزل دار باقی تھے۔ مالنکوف، بیریا اور مولوٹوف۔ بیریا کو سرمایہ داروں اور امپیریلسٹوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے گولی مار دی گئی۔ مالنکوف کو معزول کر دیا گیا۔ مولوٹوف کو پس منظر میں دھکیل دیا گیا۔

یہ تو تھا قیادت کی اعلیٰ صفوں کا حال۔ اب ذرا سول اور فوجی عہدہ داروں کے خون خرابے کی سرگزشت ملاحظہ فرمائیے :۔

۱۔ پارٹی کی مرکزی تنظیم کے ۷۵ میں سے ۴۴ سیکرٹریوں کو بغاوت کے الزام میں گولی مار دی گئی۔

۲۔ مرکزی سیکرٹریوں کے پیچھے پیچھے صوبائی تنظیموں کے تقریباً کل سیکرٹری پھانسی چڑھا دئے گئے۔

۳۔ سوویٹ وار کونسل کے ۸۰ ارکان میں سے ۷۰ کو بعد کے مرحلوں میں دشمن کے ایجنٹ قرار دیا گیا۔

۴۔ سوویٹ فوج کے ۵ میں سے ۳ مارشل تخریب کاری کے مجرم قرار پائے اور "کیفر کردار" کو پہنچا دئے گئے۔

۵۔ سوویٹ جرنیلوں میں تقریباً ۶۰ فیصد افراد اور اندازاً تیس ہزار افسروں کے جاسوس اور غدار ہونے کا انکشاف کیا گیا۔

۶۔ گورنمنٹ کی ٹریڈ یونینوں کے ۸۰ فیصد سیکرٹریوں کو مخالفِ ریاست سرگرمیوں کے الزام میں یا تو گولی مار دی گئی یا انہیں غلامی کے کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔

۷۔ پارٹی کے ڈیڑھ کروڑ ارکان کو صرف دو سال کے تطہیری اقدامات کے تحت خارج کیا گیا۔ پہلا تطہیری اقدام ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ جبکہ ۵۸۵۰۰۰ ارکان میں سے ۱۷۵۰۰۰ کو پارٹی سے نکال باہر کیا گیا۔ ۱۹۲۹ء کے دوسرے بڑے عمل تطہیر کے تحت تیرہ لاکھ میں سے ۱۷۰۰۰۰ ارکان کا صفایا کر دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۷ء کے درمیان کے عظیم ترین عمل تطہیر کے ذریعے تقریباً ۲۰۰۰۰۰ ارکان سالانہ خارج کئے گئے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں اگر پارٹی کے موجودہ ارکان ۲۵۰۰۰۰۰ تھے، اور خارج شدہ ارکان کی میزان ۲۰۰۰۰۰۰ تھی۔ [1]

کمیونزم کا قتل عام ہوتا رہا۔ اور یہ ستم ظلم کی یہ چکی چلتی رہی۔ دنیا میں ان مظالم کا چرچا بھی رہا۔ لیکن خود روس کی سرحدوں کے اندر کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو آہ و فغاں کر سکے۔ باہر جو کچھ چرچا رہا اسے سرمایہ داروں کے پروپیگنڈے کا نام دیا گیا۔

اب اسٹالین کی موت کے بعد تین سال گزرنے پر جب یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ خداوند آہنی اب قبر سے اٹھ کے آنے کا نہیں

---

[1] یہ اعداد و شمار انگریزی ماہنامہ "ایشیا" نے فرودی ۱۹۵۶ء کے شمارے میں ۔۔۔ کی اشاعت میں جمع کئے ہیں۔

[illegible] اعتماد نہیں رہا۔ تیسرے مرحلہ [illegible] تاریخ سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ [illegible] بہترین مرقع [illegible] کانگریس نے پیدا کیا۔ [illegible] جاری رہی۔ [illegible] کمیونسٹ تحریک کے اقدام کے لئے خطوط کھینچے گئے۔ نئے خطوط کیا سوچے گئے۔ بہت بڑی نظریاتی اور عملی تبدیلیاں پیدا کی گئی ہیں۔ اس موقع پر اسٹالین کے رفقائے کار نے کھلے بندوں اسے انحراف پسند قرار دیا۔ اور اس کے دور کو "آمریت اور مطلق العنانی کے دور" کا عنوان دیا جن لوگوں کو اسٹالین نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ ان میں سے بھی ایک شخص اس کے دفاع کے لئے نہیں کھڑا ہوا۔ خروشچیف نے اسے کھلم کھلا "مستبد آمر" کا لقب دیا۔ بے انصافی کا مظہر قرار دیا۔ اور اسے ایک ایسا شخص سمجھا گیا۔ جس نے تاریخ کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

نظریاتی لحاظ سے قرار دیا گیا کہ تاریخ نے مارکس اور لینن کے معاشرتی تجزیہ کو فرسودہ کر دیا ہے۔ اور موجودہ حالات کا از خود جائزہ لینا ناگزیر ہے۔ قرار دیا گیا ہے کہ کمیونزم کے فروغ کے لئے جنگ ہرگز ضروری نہیں ہے۔ اور یہ کہ سرمایہ داری اور کمیونزم پہلو بہ پہلو پنپ سکتے ہیں۔ قرار دیا گیا کہ تبدیلی کے لئے تشدد ہی کا راستہ ضروری نہیں۔ بلکہ کمیونسٹ پارٹیوں کو دنیا میں پارلیمنٹری اور جمہوری طریقوں سے پوری طرح کام لینا چاہیے۔ اور سوشلسٹ پارٹیوں سے تعاون کرنا چاہیے۔ قرار دیا گیا کہ بین الاقوامی دائرے میں غیر جانب داری کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرنی چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ اندرونی دائرے سے بین الاقوامی دائرے میں نفوذ کی نئی پالیسی اختیار کی گئی ہے[1] جس نے اشتراکیت کے بعض بنیادی نظریات پر بھی خطِ نسخ کھینچ دیا ہے۔ اور اسٹالن ازم کو تو بالکل مسترد کر دیا ہے۔ داخلی حیثیت سے اجتماعی قیادت کے تصور کو مضبوط کرنے، بھاری صنعتوں کو زیادہ اہمیت دینے، مزدوروں کے معاوضوں کی نظرثانی کرنے اور اوقات کار کو گھٹانے، تعلیمی ترقی کی حوصلہ افزائی اور اسکولوں اور کالجوں کی فیسوں کو ختم کرنے کے فیصلے کئے گئے۔

اس موقع پر خود خروشچیف کی تقریر اسٹالین کے خلاف ایک خوفناک چارج شیٹ کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ساڑھے تین گھنٹے کی اس تقریر میں مقرر نے اسٹالین کے کارناموں کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ تقریر میں کہا گیا کہ اسٹالین کا عہدِ حکومت خوف و ہراس، دہشت پسندی اور شکوک و شبہات کا دور تھا۔ جس میں روس کے نمایاں اور سرکردہ لیڈر مظالم کا شکار ہوئے۔ مقرر نے گزشتہ جنگ عظیم میں روس کی ابتدائی ناکامی کی ذمہ داری بھی اسٹالن کے سر ڈالی اور بیان کیا کہ اسٹالن ہراس عظیم کا مذاق اڑاتا تھا۔ اور سب بدحواسی کے عالم میں پڑا رہتا تھا۔ انکشاف کیا گیا کہ ۱۹۳۶-۳۸ء میں تقریباً ۵ ہزار روسی افسر اسٹالین کے مظالم کا شکار ہوئے۔ ان مظالم کی وجہ سے جنگ کے خاتمے پر روس کی اقتصادی حالت بگڑ گئی۔ مارشل نکیتا چیف پر جاسوسی کے الزام لگائے گئے۔ اور خفیہ مقدمہ چلایا گیا۔ مسٹر [illegible] کو ایسے ہی شبہات کے تحت قتل کر دیا گیا۔ دو برس بعد مسٹر [illegible] کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ [illegible] پارٹی چیف کی موت کا بھی اسٹالن

---

[1] اس نئی پالیسی کے تحت روس کی مرحوم [illegible]

ہی ذمہ دار تھا۔ اسٹالین نے ایک قریبی دوست سرجو کو حکم دیا کہ وہ رضاکارانہ طور پر خودکشی کر لیں ورنہ انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سرجو نے خودکشی کر لی۔ اور اس کا جنازہ سرکاری طور پر تزک و احتشام سے اٹھایا گیا۔ بجولائی مارشنسکی کو بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ سترھویں کانگریس کے تقریباً تین چوتھائی ارکان بھی اسٹالین کی جباریت کے کولہو میں پیل دیئے گئے۔ لینن کی بیوہ نے جب اسٹالین پر اعتراضات کئے تو اسے دھمکی دی گئی کہ اسے لینن کی بیوہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ۱۹۴۱ء کے جرمن حملے کے پس منظر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے خروشچیف نے الزام لگایا کہ جاسوسوں نے جرمن حملے کی ٹھیک ٹھیک تاریخ بھی بتا دی تھی لیکن اسٹالین کو ہٹلر پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اصرار کرتا رہا کہ لڑائی نہیں ہو سکتی۔ خروشچیف نے بتایا کہ میں اس وقت یوکرین میں پارٹی لیڈر تھا۔ وہاں بندوقیں نہیں تھیں میں نے ٹیلیفون پر میں نے اسٹالین سے بات کرنی چاہی۔ مگر اس نے ٹیلیفون کے پاس بیٹھے ہونے کے باوجود خود نہیں سنا۔ اور مالنکوف کے ذریعے جواب دلوایا کہ بندوقیں نہیں مل سکتیں، جیسے چاہو کام چلاؤ۔ خروشچیف نے انکشاف کیا کہ اسٹالین جنگی نقشے تک کا استعمال نہیں جانتا تھا۔ وہ محض اسکول کے گلوب کو سامنے رکھ کر جنگی ہدایات دیتا تھا۔ جنگ کے بعد اسٹالین کی بے اعتمادی اپنے ساتھیوں سے اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اگر کوئی شخص آنکھ ملا کر بات کرتا تو اسے گستاخ قرار دیتا۔ اور اگر کوئی نگاہ نیچی رکھتا تو کہتا کہ تمہارا ضمیر مجرم ہے پولٹ بیورو کے تمام ممبر اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ مارشل وار شیلوف تک کو وہ برطانوی جاسوس سمجھنے لگا تھا۔ اور اسے پولٹ بیورو میں کام کرنے سے روک دیا تھا۔ اسی طرح اس نے ایک بار مولوٹوف اور اس کی بیوی کو قید میں ڈال دیا۔ آخری دور میں اس کا منصوبہ یہ تھا کہ خروشچیف اور مولوٹوف اور دوسرے لیڈروں کو راستہ سے جلد از جلد ہٹا دے۔ خروشچیف نے بتایا کہ ایک مرتبہ غیر ملکی مہمانوں کے سامنے اس نے مجھے "کموکھرل" کے نام سے پکارا (یوکرین کے باشندوں کے لئے اہانت آمیز نام) اور حکم دیا کہ میں گوپک ناچ ناچوں۔ نوجوانوں کے اس ناچ پر بوڑھے آدمی کو مجبور کرنا محض بر بنائے تذلیل تھا۔ خروشچیف نے اسٹالن کو متعدد ڈاکٹروں کے قتل کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا۔ آخر میں مقرر نے حاضرین کے سوالات کے جواب میں تصریح کی کہ ان مظالم کے سامنے ہم لوگ بالکل بے بس تھے بلکہ خود ہمیں اسٹالین کا آلۂ کار بننا پڑتا تھا۔

یہ ہے مزدور طبقہ کی ڈکٹیٹر شپ کی اندرونی تصویر — اس اندرونی تصویر کا جو عکس بھی دنیا میں کسی نے پیش کیا۔ اسے سرمایہ داروں کا پروپیگنڈا قرار دیا جاتا رہا۔ لیکن اب تو خود روس کی پارٹی کا ایک لیڈر اس تصویر کو خود پیش کر رہا ہے۔ یہ تھی مارکس کے خواب کی تعبیر!

اسے پیش کرتے ہوئے روس کی نئی قیادت نے دعوت دی کہ شخصی آمریت کے اس دور کے خاتمے کے بعد اب اجتماعی قیادت کے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ اجتماعی قیادت کا یہ تصور جس وجہ سے سامنے لایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اسٹالین کے بعد اب روس میں کوئی ایک شخصیت ایسی باقی نہیں رہی۔ جو اس کی طرح سربراہ بن کر خالی جگہ کو پر کر دے۔ انقلاب روس کی وہ دہشت کی فضا بھی اب موجود نہیں ہے۔ جس کے تحت کوئی اسٹالن ابھر سکتا۔ اب ناگزیر ہے کہ یہ لوگ مل جل کر متحدہ طاقت سے اس خلاء کو پر کریں اور نہ اگر ایک دوسرے کی مدد و حمایت کا سلسلہ جاری نہ رہے تو کسی کی خیر نہیں۔ خروشچیف اور بلگانن اور دوسرے اکابرین سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ

وہ اپنے آپ کو اس محفوظ اور بالاتر مقام پر نہیں لے جا سکتا جس پر اسٹالن براجمان رہا ہے۔ وہ خدا تھا اگر ممکن ہوتا تو اب تک وہ ایک نیا خدا ہوتا اپنی خدائی جما چکا ہوتا۔ اور مخالفین کے خون سے اس کے ہاتھ رنگین ہو چکے ہوتے۔

اسٹالین کے خلاف یہ طوفانی حملہ ایک دلچسپ نتیجہ پر منتج ہوا۔ روس میں پہلی بار ان تقریروں کے زیر اثر حکومت و قیادت کے خلاف احتجاج کا طوفان اٹھا اور قانون کی حدود سے باہر ہو گیا۔ جارجیا اسٹالین کا زاد بوم تھا۔ اسٹالین نے اس علاقے کے لوگوں کو خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ اور جارجیوں کا حکومت اور فوج میں خاص حصہ تھا۔ چنانچہ اس علاقے میں اسٹالین کو ایک پیکر رحمت مانا جاتا تھا۔ علاوہ بریں یہ لوگ سوشلزم کے سچے معتقد ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں۔ کہ سوشلزم ظلم و تشدد اور آمریت کے بغیر چل نہیں سکتا اس نظریہ کی وجہ سے وہ اسٹالین کی شخصیت کو روشنی کا مینار مانتے تھے۔ ان دو اثرات کے تحت جدید قیادت کے رجحانات کا خیر مقدم تلخ جذبات سے کیا گیا۔ ہنگامہ یوں اٹھا کہ جارجیا والے اسٹالین کا یوم پیدائش منانا چاہتے تھے مگر نئی حکومت اس پر تیار نہیں تھی اسٹالین کے ہم وطنوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ خروشچیف کی تصویروں کو اتار کر پھاڑ دیا گیا، کمیونسٹ پارٹی کے دفتر پر عوام نے قبضہ کر لیا۔ "اسٹالین زندہ باد" اور "خروشچیف مردہ باد" کے نعرے لگائے گئے۔ طالب علم، کارخانوں کے مزدور اور عام لوگ ہزاروں کی تعداد میں شریک ہو گئے۔ جارجیا کی پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا گیا تو اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا گیا۔ آخر فوج کو بلانا پڑا۔

واقعات کے اس مد و جزر کو جب ہم ذرا گہری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تو اس سے بڑے دور رس نتائج نکل کر سامنے آتے ہیں ——— ایسے نتائج کو مارکسزم کے اساسی تصورات کی دھجیاں اڑا دینے والے ہیں۔ اور ان کی روشنی میں تاریخ کا مادی فلسفہ باطل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ نتائج حسب ذیل ہیں۔

(۱) اب تک مارکسزم نے ہمیں یہ تصور دے رکھا تھا۔ کہ تاریخ اضداد کے تصادم سے تشکیل پاتی ہے۔ اور اس کے ارتقا کے لئے واحد محرک طبقاتی کشمکش ہے۔ اور یہ کہ مزدور طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ کے مفاد میں کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ دونوں کے تصادم کو شدید تر ہوتے ہوتے مستقبل میں سرمایہ داری کے کامل انہدام پر جا کر دم لینا ہے۔ اس سے از خود یہ نتیجہ نکلا کہ اشتراکی نظام حیات جو مزدور طبقہ کے مفاد پر مبنی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ صرف جنگ و آویزش کا تعلق رکھ سکتا ہے۔ اور کسی ایک ملک سے شروع ہو کر اس جنگ و آویزش کو پھیلتے پھیلتے بین الاقوامی دائرے میں پھیل جانا ہے۔ اور اس کا انجام سرمایہ دارانہ نظام کے دنیا بھر سے ختم ہو جانے پر ہوتا ہے۔ چنانچہ سوویٹ روس اور کمیونسٹ پارٹیوں کی پالیسی اب تک اسی فلاسفی پر مبنی تھی۔ لیکن اب روس کی نئی قیادت نے اس فلاسفی کو [illegible] کر دیا ہے۔ اب جنگ اور تصادم اور تشدد کے بجائے امن پسندانہ جمہوری اور پارلیمانی ذرائع سے کام کرنے کا [illegible] اختیار کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کیا گیا ہے۔ کہ اشتراکی نظام کو بین الاقوامی دائرے میں سرمایہ دارانہ نظام کے پہلو بہ پہلو [illegible] رہنا ہے۔ اب بین الاقوامی تصادم کے بجائے مصالحت کے اصول پر باہم [illegible] کریں گے۔ یہ تبدیلی پالیسی کا [illegible] نہیں ہے۔ بلکہ [illegible] والی ہے [illegible] کے اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ دنیا کے [illegible] فلسفہ تاریخ [illegible] تمدن کی [illegible] نظام

ہو گیا ہے۔ اور اس پر ایمان رکھتے ہوئے آگے چلنا سوویٹ روس اور کمیونزم کے لئے ممکن نہیں رہا۔ نظامِ فکر کی وہ پوری عمارت اس تبدیلی سے گر پڑی ہے جسے برسوں کی کاوشوں سے کھڑا کیا گیا تھا۔

۲۔ تاریخ کے مادی تصور نے اب تک یہ اپدیش دیا تھا۔ کہ تمدنی ارتقا میں کسی فرد کا پارٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ تاریخی جبریت مختلف مراحلِ ارتقاء کی ضرورت کے مطابق مناسب افراد از خود پیدا کر لیتی ہے۔ اور ان سے آلۂ کار کے طور پر مطلوبہ کام لیتی ہے۔ یعنی افراد تاریخ کو بنانے بگاڑنے والے نہیں ہوتے۔ بلکہ افراد کو تاریخ بناتی ہے۔ لیکن اسٹالین کے کردار کو اس کے جانشینوں نے جس طرح بے نقاب کیا ہے اس سے یہ مارکسی نظریۂ تاریخ باطل ہو جاتا ہے۔ اسٹالین کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ اگر صحیح ہے تو یہ مانے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ کہ اسٹالین نے کمیونزم سے اور سوویٹ روس کی تاریخ سے غدارانہ سلوک کیا ہے۔ اسٹالین نے آمریت کے تخت پر بیٹھ کر پوری قوت تنہا اپنے ہاتھ میں لی اور اس قوت کے بل پر انقلاب کی گاڑی کو بالکل غلط پٹڑی پر ڈال دیا۔ دوسرے لفظوں میں ایک فرد کے غلط پارٹ نے تاریخ کا رخ نامطلوب سمت میں پھیر دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسٹالین مزدوروں کی طبقاتی آمریت کا صحیح نمائندہ تھا۔ تو پھر یہ ماننا پڑے گا۔ کہ اب اس کے جانشین تاریخ کو ایک غلط موڑ سے گذار رہے ہیں۔ بہر حال ایک نہ ایک طرف تاریخ کے ساتھ غداری کرنے کا الزام عائد ہوتا ہے اور جدھر بھی وہ عائد ہو اس کی ذمہ داری ایک یا دو چار افراد پر آتی ہے۔ فرد کی تاریخ کے مقابلہ میں یہ بالادستی مارکسی نظریۂ تاریخ کی دیوار میں خوفناک دراڑیں پیدا کر رہی ہے۔

۳۔ پرولتاری ڈکٹیٹر شپ یا مزدوروں کی طبقاتی آمریت کا دور مارکسی نظریہ کے مطابق قطعی طور پر ایک عبوری دور ہے جس کا منشا یہ ہے۔ کہ سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے جنم لینے والے اشتراکی نظامِ معاشرہ کے ان مفاسد کا ازالہ کیا جاسکے جو جبری طور پر اسے وراثت میں ملتے ہیں یعنی دوسرے لفظوں میں سرمایہ دارانہ اثرات کے خلاف تشدد کے ہتھیاروں سے ایک جنگ لڑ کر طبقاتی امتیازات کو کلیۃً ختم کرنا اس عبوری دور کا اصل پروگرام ہے۔ اسٹالین کے دور پر جو تبصرہ روس کی نئی قیادت کی طرف سے کیا گیا ہے اسے اگر صحیح مانیں ـــــ اور اسے غلط قرار دینا بھی مشکل ہے ـــــ تو ماننا پڑے گا۔ کہ یہ دور سرے سے اس معنی میں پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کا دور نہیں تھا۔ جس کے قیام کی ضرورت مارکسزم نے واضح کی تھی بلکہ جس کے بارے میں قطعی طور پر پیش گوئی کی تھی کہ ایسا اور ایسا ہوگا ہم دیکھتے ہیں۔ کہ مزدوروں کی طبقاتی آمریت کے نام سے اسٹالین کی شخصی ڈکٹیٹر شپ نافذ ہوئی جس کے تحت تشدد کی چکی میں سرمایہ داروں کے ایجنٹ نہیں، بلکہ سوویٹ روس کے خادم اور کمیونزم کے سچے مومن پسے۔ اسٹالین ساری عمر اپنے ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لئے اختلاف کرنے والوں کو کچلتا رہا اور اپنے ہر مظلوم کے گلے پر تیغِ جفا کی دھار رکھتے ہوئے اس نے انہیں سرمایہ داروں کے ایجنٹ، دشمنوں کے جاسوس اور تخریب کار قرار دیا۔ گویا پرولتاری آمریت یا تو سرے سے قائم ہی نہیں ہوئی۔ یا قائم ہو کر معاً شخصی استبداد میں بدل گئی۔ ان میں سے جو بھی شکل واقع ہوئی ہو۔ مارکسزم کے اندازے اور پیشگوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں تاریخ کی مادی تعبیر باطل ٹھہرتی ہے۔

۴ - اجتماعی قیادت کا جو نیا نعرہ روس میں بلند ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب کوئی ایک شخصیت اتنے بڑے ملک اور اس کی کثیر التعداد آبادی کا اعتماد حاصل کرنے یا اس پر حکم چلانے کے قابل نہیں رہی۔ اور اس وجہ سے چند نمایاں شخصیتوں کو مل جل کر ایک طاقت بننا ہوگا۔ چند شخصیتوں کے مل جل کر ایک طاقت بننے کا راستہ ہمیشہ جوڑ توڑ اور سودا بازی اور سمجھوتے کا راستہ ہے۔ اس راستے پر چلنے سے اولین مرحلے پر گروپ اور جتھے پیدا ہو سکتے ہیں۔ جو ٹوٹتے بنتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اولاً ایک ہی گروپ یا جتھا بنے۔ لیکن گروہ بندی جب سیاست کے دائرے میں ایک بار پیدا ہو جاتی ہے۔ تو ایک گروپ اپنے مقابلے میں آہستہ آہستہ کسی نہ کسی دوسرے گروپ کو لے آتا ہے۔ اور یہی تاریخ کے جدلی نظریہ کا تقاضا ہونا چاہئے۔ گروپ اور جتھے اپنی طاقت قائم رکھنے کے لئے عوامی حلقوں کی حمایت و تائید کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہ جب عوامی حمایت و تائید حاصل کرنے کے لئے مسابقت کرتے ہیں۔ تو آہستہ آہستہ پارٹیاں وجود میں آتی ہیں۔ پس اجتماعی قیادت کے نعرہ کے بلند ہونے کا دوسرا مطلب یہ ہے۔ کہ روس کی داخلی سیاست پارٹی پالیٹکس کی طرف سے جانے والی ہے۔ خروشچیف اور ان کے چند نمایاں ساتھیوں میں سے اگر کوئی فرد واحد دوسروں کو روند پچھاڑ کر اسٹالین کی خالی کردہ مسندِ خداوندی پر قابض ہو جاتا ہے۔ تو پھر تو اجتماعی قیادت کا نعرہ ایک پردۂ فریب کے طور پر چند روزہ استعمال ہونے کے بعد مر جائے گا۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہو پاتا ——— اور بظاہر احوال یہ ہے مشکل ! ——— تو پھر اجتماعی قیادت کا نعرہ جمہوری و پارلیمانی نظام اور پارٹی سسٹم کے بند دروازے کو کھولنے والی کلید ثابت ہوگا۔ بین الاقوامی ماحول کا دباؤ بھی ہمارے اسی قیاس کے حق میں ہے۔ آمریت اور تشدد کی حکومت کے ساتھ عالمی رائے عامہ کو روس مغربی طاقتوں کے مقابلے پر اپنے حق میں جیت نہیں سکتا۔ اور آئندہ جنگ جس کے بگل کی آواز مستقبل کی دوری سے سنائی دے رہی ہے فتح مند ہونے کے لئے کسی بھی فریق کو ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی طاقت سے بڑھ کر پروپیگنڈہ اور رائے عام کی حمایت کی طاقت کی ضرورت ہے۔ اس پہلو سے روس اب تک کمزور رہا ہے اور شاید موجودہ حالات میں اس کمزوری کو روسی قیادت نے پوری طرح محسوس بھی کر لیا ہے۔ اگر اب تک محسوس نہ کیا ہو تو وقت کی چند گردشیں بہرحال اس کمزوری کا احساس دلا دیں گی۔ کیمونسٹ نظام اور جمہوریتوں کے درمیان اثر و تاثر اور عمل و ردعمل کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ وہ اب روس کو اس حالت پر رکا نہیں رہنے دے گا۔ جس پر وہ ۱۹۱۷ء سے چلا آ رہا ہے۔ اگر وہ رکا رہا تو آنے والی جنگ اس کا خاتمہ کر دے گی۔ ان میں حالات ہماری رائے میں "اجتماعی قیادت" کا یہ نعرہ بڑے اہم سیاسی تغیرات کے دروازے کھولنے والا ہے۔

لیکن ان نئے دروازوں کے کھلنے سے مارکسزم کے نظریات کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا۔ مارکسزم گزشتہ نصف صدی سے ہمیں یہ یقین دلا رہا ہے کہ روس پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کے جس عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ اس کے بعد کمیونزم کا وہ تصوراتی دور آنا لازم ہے جس میں ریاست کا وجود سرے سے ختم ہو جانے والا ہے۔ لیکن اگر تاریخ مزید آمریت سے اپنے قدموں چل کر جمہوری و پارلیمانی نظام کی طرف پسپا ہو جائے تو مارکسزم کی سرے سے جڑ کٹ جاتی ہے۔

ہمارے اس قیاس کے حق میں جا رجیا کے فسادات بھی وزنی استدلال مہیا کرتے ہیں جیسے کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ روس کے اشتراکی دور میں یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت کے خلاف ایک کھلا کھلا مظاہرہ ہوا اور عوام نے ایک اجتماعی احتجاج کیا اور بات یہاں تک بڑھی کہ پولیس نے گولی چلانے سے انکار کردیا یہ غیر منظم صورت میں اپوزیشن کا پہلا ظہور ہے۔ گویا اب اسٹالین کے حامیوں اور اسٹالین کے مخالفوں کے دو گروہ رجحانات آمنے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ دو گروہ رجحانات سیاست میں گروہ بندی پیدا کرنے والی فضا بنائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۵۔ یہ بات اب پوری طرح کھل کر سامنے آگئی ہے۔ کہ کمیونزم انسانیت کو اور جو چاہے عنایت کرے، لیکن وہ انسان کو حقوق آزادی نہیں دلا سکتا اور وہ اسے آمریت کی جباریوں سے بچانے کے لئے کوئی راستہ نہیں بتا سکتا۔ حد یہ کہ خود خروشچیف کے بیان کے مطابق ذمہ دار ترین لیڈروں کو آمریت کی چیرہ دستیوں کے خلاف دم مارنے کی مجال نہیں ہو سکتی۔ بلکہ الٹا وہ اسکے آلہ کار بن کر ان سارے مظالم میں سرگرم حصہ دار بنتے ہیں۔ جن پر خود ان کا ضمیر بھی چیخ کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے۔ جو روٹی چاہے دلوائے لیکن آدمی سے شرفِ انسانیت سلب کر لیتا ہے۔

یہ ہیں وہ اہم نتائج۔ جو روس کی تاریخ کے تازہ اتار چڑھاؤ سے اخذ ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر جز اس قابل ہے کہ اس پر پوری طرح غور و خوض کیا جائے۔

بقیہ: کوئٹہ قلات ڈویژن کی صحافت پر ایک نظر

آخر میں ایک اور تلخ حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں کے بعض اخبارات تو عوام میں محض اس لئے مشہور ہیں کہ ان میں ضرور کسی کے خلاف زہر اگلا جاتا ہے۔ اس قسم کے اخبارات میں ہفت روزہ "ارتقا" کا خصوصیت سے نام لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ مصرعہ ذہن میں ابھر آتا ہے ؎

"بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا"

آخر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں کے اخبارات کی ناکامی کی دو ایک موٹی موٹی وجوہات بھی بیان کر دوں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہاں کے اکثر اخبارات والے مالی مشکلات کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتے اور جو بڑے بڑے سردار یا ملک ہیں وہ اس طرف قطعاً توجہ نہیں دیتے۔ دوم یہ کہ یہاں آج بھی تعلیم کا فقدان ہے جو حکومت پاکستان نے آٹھ سال کی قلیل مدت میں تعلیم پر خاص توجہ دی ہے اور کافی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ پھر بھی یہ مدت اتنی کم ہے کہ اخبارات کی صنعت کی کامیابی کے لئے ناکافی ہے۔ میں نے تقسیم سے پہلے بھی دیکھا تھا اور آج بھی تمام صوبہ میرے سامنے ہے۔ اس لئے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ تقسیم ملک کے بعد سے اب تک یہاں بہت کچھ ہو چکا ہے۔ کیا یہ کم ہے کہ انگریزوں کے آخری دور میں تمام جو اخبارات نکلتے تھے وہ بھی مقامی باشندوں کے نہیں تھے لیکن اس کے برعکس آج یہاں کے اکثر اخبارات مقامی باشندے ہی نکالتے ہیں اس سے ثابت ہے کہ یہاں کی صنعت کا مستقبل بہت روشن دکھائی دینے لگا ہے اور اس سلسلے میں حکومت نے بھی اخبار نویسوں کو مراعات دے رکھی ہیں۔

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را —

اسلامی معاشرے کے سات مطلوبہ کردار

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ رسول اللہؐ کا یہ قول ہم تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں کہ:
"سات انسانی کردار ایسے ہیں کہ جنہیں خداوند تعالیٰ اپنے سایۂ رحمت میں اس دن جگہ دے گا جس دن اس کے سایۂ رحمت کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔

ایک: انصاف کیش حکمران۔
دوسرا: وہ نوجوان جو (جوانی کے عالم میں گھٹیا خواہشات کا شکار ہونے کے بجائے) اللہ عزوجل کی عبادت کے لئے اٹھا۔
تیسرا: وہ شخص جس کا دل (تفریح گاہوں کے بجائے) مساجد میں اٹکا ہوا ہے۔
چوتھے: وہ دو آدمی جو باہم وگرہ اللہ کی محبت کی وجہ سے محبت کریں اور اسی کیفیت کے ساتھ ملیں اور اسی کیفیت کے ساتھ جدا ہوں۔
پانچواں: وہ شخص جسے مرتبہ وجمال رکھنے والی کوئی عورت خواہش کی دعوت دے اور وہ اس دعوت کو رد کرتے ہوئے یہ کہے کہ "میں خدا سے ڈرتا ہوں"!
چھٹا: وہ شخص جس نے کوئی صدقہ دیا اور پھر اسے اس حد تک مخفی رکھا کہ اس کے بائیں ہاتھ تک کو پتا نہ چل سکا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔
ساتواں: وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں مارے رقت کے پرنم ہو گئیں۔
کچھ لوگ کہتے ہیں کہ علم و حکمت کے ان موتیوں کو مٹی میں ملا دینا چاہئے!

مخلوط جنس

مخلوط نسل

مخلوط قوم

مخلوط تعلیم

مخلوط کلب

مخلوط وزارت

——— جو کچھ بھی مخلوط ہو، ہمیشہ وجہِ فساد ہوتا ہے!

"مخلوط انتخاب"

کے

فتنے

سے

پاکستان کو بچائیے!

(موزوں خطوط کی اسمبلیوں میں یہ مسئلہ عنقریب آنے والا ہے!)

ادارۃ



تاثرات

ادارہ

تہذیب اور انسانیت کے لئے خطرۂ عظیم!

بھارت ایک لمبا چوڑا ملک ہے، اس کی آبادی تیس پینتیس کروڑ ہے، اس کے معاشی تعمیر کے منصوبے نتیجہ خیز ہیں، وہ دنیا کے نقشے کے دامن پر ایک سیاہ دھبہ ہے جس کی سیاہی روز بروز گہری ہو رہی ہے۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جو ایک پڑوسی ملک کی سرحدوں پر نت نئی شرانگیزیاں کرتا ہے اور ظلم ڈھانے کے بعد پھر اپنے مظالم کی قیمت مانگنے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جو انسانی دنیا کی بھری مجلس میں کشمیر میں رائے شماری کرانے کا پیمان باندھنے کے بعد کھلم کھلا اسے توڑ دیتا ہے اور بغیر رائے شماری کرائے کشمیر کو اپنا جزوِ بدن قرار دے لیتا ہے۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جس میں بسنے والی مسلم اقلیت کا خون بہایا جاتا ہے، مسلم خواتین کی عزت پر حملے کئے جاتے ہیں، ان کو جائداد سے محروم کیا جاتا، ان پر معاش کا دائرہ تنگ سے تنگ تر کیا جاتا ہے ان پر جھوٹے مقدمات چلائے جاتے ہیں۔ آئے دن ان کو جلسہ ہائے عام میں دھمکایا جاتا ہے، ان کے مذہبی فرائض کی ادائی میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں، ان کی مسجدوں کی توہین کی جاتی ہے اور ان کو تبدیلِ مذہب پر مجبور کیا جاتا ہے۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں کی ہندو اکثریت کی بعض مسلّمہ منظم پارٹیوں کے اونچے رہنما کھلے بندوں یہ کہتے پھرتے ہیں کہ بھارت میں کسی کو مسلمان بن کر رہنے کا حق نہیں، جسے یہاں رہنا ہو اسے عادات و اطوار، معاشرت، کلچر اور اعتقاد کے لحاظ سے ہندو بننا ہوگا۔

یہ ایک ایسا ملک ہے جس میں اس روشن دور میں نہایت جاہلانہ عقیدے اور نہایت احمقانہ رسوم رائج ہیں، جس میں ایک مضحکہ انگیز دیومالا کا آج بھی دور دورہ ہے جس میں گائے اور گھوڑے اور پیپل اور تلسی اور سورج اور مہادیو اور آگ اور پانی کی پوجا ہوتی ہے۔

پس یہ ملک تہذیب اور انسانیت کے لئے ایک عظیم ترین خطرہ ہے اور جوں جوں اس کی معاشی و عسکری اور سیاسی و بین الاقوامی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے یہ خطرہ مہلک تر بنتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بیرونی دنیا، خصوصاً مغرب کو اس خطرے سے پوری طرح آگاہ کیا جائے۔ اس سرزمین وحشت و بربریت کی اندرونی تصویر پیش کرنے کے لئے اعلیٰ درجہ کا لٹریچر تیار کرایا جائے اور اسے باہر پھیلایا جائے خصوصاً آزادی کے بعد سالوں میں تہذیب و انسانیت کو جو چرکے اس ملک کے اندر لگائے گئے ہیں، اخبارات کے ذریعہ سے ان کی پوری تفصیل اخذ کر کے بہترین ترتیب کے ساتھ انگریزی زبان میں مرتب کر دی جانی چاہئے۔ کچھ صحافی، ادیب اور مصنفین مل کر اس خدمت کو سرانجام دے سکیں تو اس سے بڑے اہم نتائج نکلیں گے۔

سینما ـــــ جرائم کی درسگاہ

ٹیکسی ڈرائیور کے مشہور مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ اس فیصلہ میں جرائم آموز فلموں کے تباہ کن اثرات پر جو اظہار رائے کیا گیا ہے اس پر ہمارے ملک کے اکابر اور وزراء اور لیڈروں اور اسمبلیوں کے ارکان کو خاص طور پر متوجہ ہونا چاہئے۔ اس مقدمہ کے ملزمین نے اپنے مجرمانہ فعل کا پورا پورا چربہ ایک فلم سے اخذ کیا اور جو کچھ پردۂ سیمیں پر دیکھا تھا اس کا تجربہ عالم واقعہ میں کر ڈالا۔ فیصلہ میں فاضل جج نے دردمندانہ اپیل کی ہے کہ ان فلموں کا سدباب کیا جائے اور قومی اخلاق کو ان کی زد سے بچایا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ جرائم اور معاشقے کے فلم نہایت تیزی سے ہمارے نوجوانوں کے اخلاق کو گھن لگا رہے ہیں۔ جرائم کے فلموں کے زیر اثر قتل، چوری، فریب دہی اور لوٹ مار کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے اور معاشقے کے فلموں کی وجہ سے نظربازی، بدکاری اور اغوا کی وارداتیں بڑھ رہی ہیں۔ وہ نظام بھی کیسا عجیب نظام ہوگا جو ایک طرف بعض جرائم کو روکنے کے لئے قانون اور پولیس اور عدالت کی طاقتوں کو حرکت میں لاتا ہو اور دوسری طرف انہی جرائم کی تربیت کے لئے شہر شہر میں درسگاہوں اور تربیت گاہوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہو۔

ٹیکسی ڈرائیور کے واقعہ میں اور اس طرح کی دوسری تمام وارداتوں میں حقیقت کے اعتبار سے مجرم صرف وہی لوگ نہیں ہوتے جن پر قانون کا تقاضا نافذ ہو جاتا ہے بلکہ فلم ساز کمپنیاں، سینماؤں کے مالک، فلمی اشتہارات مرتب کرنے والے آرٹسٹ اور ان کو شائع کرنے والے اخبارات اور پریس سب کے سب گندے اور بدراہ کرنے والے فلموں کے اثراتِ بد میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے مجرم ہوتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں قوم کے وہ لیڈر اور سربراہ کار بھی اس ہمہ گیر اخلاقی فساد کی ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں جو ان کے اذن کے تحت دکھائے جانے والی فلموں سے پھیلتا ہے۔ چاہیئے کہ سینما کے نظام سے جرائم کی جو درسگاہیں شہر شہر اور قریے قریے کھلی ہیں ان کو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے نظریات و مقاصد کے مطابق ایک انقلاب سے گزارا جائے۔ چاہیئے کہ جلد اکابر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔ ورنہ قیامت میں جب ان کو ہزارہا نوجوانوں کی زندگیوں کی بربادی، ہزاروں گھرانوں کی تباہی اور پوری قوم کی اخلاقی پستی کا حساب دینا پڑیگا۔ تو اس وقت کوئی راہ نجات نہ ہوگی۔

تھیٹر، ریکارڈ، گانے!

کھیوڑہ کے عوام کی طرف سے اخباروں میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ وہ پہلے ہی ایک تھیٹر کے وجود سے نالاں تھے جس کے زیر اہتمام رات گئے تک روزمرہ گندے گانوں کے ریکارڈ لاؤڈ اسپیکروں پر بجتے رہتے ہیں اور نہ صرف لوگوں کی نیندیں حرام ہوتی ہیں بلکہ زبردستی شریف مردوں عورتوں اور بچوں کے کانوں میں فاسقانہ صدائیں ڈالی جاتی ہیں، اب ایک اور تھیٹر قائم ہو رہا ہے۔ یک شد دو شد والا معاملہ ہوا۔

یہ پہلی شکایت نہیں جو کھیوڑہ سے بس اسی مرتبہ آئی ہو، پاکستان کے بے شمار شہروں اور قصبوں اور دیہاتی علاقوں سے اس طرح فریادیں بار بار اخباری دنیا کے ایوانوں میں گونجتی سنائی دیتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تھیٹروں اور گانے کے اکھاڑوں میں آخر قومی تعمیر و ترقی کا پہلو ایسا ہے کہ جس کی وجہ سے ان جہانوں کو ایک ایک بستی تک پھیلا دینا ضروری ہے۔ کیوں اس میدان میں قومی دولت و محنت کو جھونکا جائے۔ نقصانات البتہ نہایت واضح اور نمایاں ہیں۔ یہ وبا جہاں پہنچتی ہے وہاں کی معیشت پر اس کا تباہ کن اثر پڑتا ہے۔ شہروں میں میدانِ مقابلہ تنگ پاکر سرمایہ نفع پرست لوگ قصبوں اور دیہاتی علاقوں کا رخ کرتے ہیں تاکہ وہاں سے نوجوان طبقہ کے لئے رنگ رلیاں منانے کے سامان فراہم کر کے جیبوں سے پیسہ نکالیں۔ ہماری دیہی معیشت پہلے ہی کمزور ہے سو اوپر سے جب فاسد جاذبیات کا برگ حشیش بنا کر روپے اینٹھنے والے

عوام پر مسلط ہوجاتے ہیں تو معاشی توازن خراب سے خراب تر ہوجاتا ہے۔ معاش سے بڑھ کر سرمایہ پرست طبقہ کی یہ کاروباری سرگرمیاں ہمارے قومی اخلاق کو تباہ کرتی ہیں جس کی حالت دیہات میں اب بھی کسی قدر بہتر ہے اور اگر توجہ سے اسے سنبھالا جائے تو کچھ مدت میں بہت بہتر نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

حکومت لوگوں کی جسمانی صحتوں کو طاعون اور ہیضے اور چیچک اور ٹائیفائڈ اور ملیریا سے بچانے کے لئے جتنی کاوش کرتی ہے چاہیے کہ وہ قوم کی اخلاقی صحت کو سرمایہ دار اور نفع پرست جرثوموں سے بچانے کے لئے اس سے دس گنا زیادہ سرگرمی دکھلائے۔ جسمانی وبائیں تو قوم کو افراد کی ایک تعداد سے محروم کرتی ہیں، لیکن اخلاقی وبائیں تو سرے سے ایک قوم ہی کو ختم کر دیتی ہیں۔ اور اب تو نیا دور شروع ہو رہا ہے، اب تو یہ سرزمین اسلام کے نام پر وقف ہو چکی ہے۔ اب تو یہاں کتاب و سنت کے تقاضے پورے ہوتے ہیں، اب تو یہاں مسلمانوں کی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ اب حکومت کو زراندوزی کے ایسے فاسد طریقوں پر پابندیاں عائد کرنی چاہئیں جن سے دستوری طور پر طے شدہ مقاصد صریحاً تباہی کی زد میں آتے ہیں۔ جس اصول کے تحت آپ عوام الناس کو جعل سازوں، جیب کتروں اور نقب زنوں سے بچانے کے لئے قانون بناتے ہیں، ٹھیک اسی اصول کے تحت اخلاق سوز سرگرمیوں کے بل پر کمائی کرنے والوں کے شر سے اپنی قوم کو بچانے کے لئے قانون و اختیار کی طاقت کو استعمال کیجئے۔ علی الخصوص جہاں کے عوام الناس خود چیخ پکار کر رہے ہوں اور ایک مصیبت سے نجات پانے کے لئے حکومت سے فریاد کریں، جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت ان کی فریاد سنے اور ان کو مصیبت سے نجات دلائے۔

سرزمین فراعنہ میں

ترکی میں جو کچھ کمالی اصلاحات ہوئی تھیں وہ تو سب کو معلوم ہیں۔ اب سرزمین فراعنہ میں جو جمالی اصلاحات ہو رہی ہیں ان کو بھی جانئے۔

جمال ناصر صاحب نے پچھلے دنوں اعلان فرمایا تھا کہ تین سال کے اندر اندر سارے باشندوں کو عربی لباس ترک کر کے انگریزی لباس میں ملبوس ہوجانا چاہئے، ورنہ کوتاہی کے مجرموں کو سزائیں دی جائیں گی۔ پروگرام کا دوسرا جزیہ تھا کہ جامعہ ازہر میں لڑکیوں کے لئے ناچ گانے کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ اور تیسرا مژدہ یہ سنایا گیا تھا کہ مسجدوں کے ساتھ فلمی اسٹوڈیو یا سینما گھر قائم کئے جائیں گے۔

اب ایک تازہ اطلاع یہ ملی ہے کہ قلوپطرہ کی یاد میں ایک تقریب محکمۂ سیاحت کے زیر اہتمام منائی جائے گی۔ آئندہ سال فروری میں انطونی اور قلوپطرہ کا جلوس رومن رتھوں کے ساتھ نکالا جائے گا۔ یہ جلوس قاہرہ کے چوک آزادی پر جاکر ختم ہوگا۔ جلوس کے آگے آگے بینڈ ہوگا اور اس کے پیچھے دو ہزار سال پہلے کے روائتی لباس میں ملبوس درباریوں کا ایک گروہ مارچ کرے گا۔ شام کو دریائے نیل میں قلوپطرہ کے مخصوص بجرے کا مظاہرہ کیا جائے گا اور اس عیاش اور فاسق ملکہ کے دور حکومت کے واقعات ڈراموں کی صورت میں پیش کئے جائیں گے۔

مبارک ہو ہمارے ان تمام مذہبی بزرگوں کو جو جمال ناصر کی حکومت کو اپنی آشیرباد دے چکے ہیں۔ مبارک ہو ان علمائے ازہر کو جنہوں نے جمال ناصر کی خوشنودی کے لئے اخوان کی تکفیر کی تھی، مبارک ہو تسلیم صاحب کو جنہوں نے جمال ناصر کی حمایت اور اخوان کی مخالفت میں پہلے ادارتی قلم صرف کر کے ایک تند و تیز اداریہ لکھا تھا۔

یاد رکھو، جہاں کہیں اسلامی رجحانات کو دبایا جائے گا وہاں ایسی ہی اصلاحات عمل میں آئیں گی۔

اب ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ انگریزی لباس پہننے، ناچ گانوں اور فلموں اور سینماؤں سے دلچسپی لینے اور قلوپطرہ کی یاد منانے سے ایک قوم کے خیالات و کردار میں کونسا تعمیری انقلاب آجائے گا۔ کیا ان چیزوں کو کبھی کسی تہذیب کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے؟ کیا ان چیزوں کے بل پر کوئی ملک ترقی کے مراحل طے کر سکتا ہے؟

آہ! کیسے بے بصیرت لوگ مسلمان قوموں کے رہنما بنتے ہیں۔

یہ جوڑ توڑ:

پاکستان جب سے بنا ہے، ہمارے اوپر کے سیاسی بزرگوں کی صفوں میں پے در پے جوڑ توڑ کے چکر چلتے رہے ہیں۔ کسی اصولی محرک کے بغیر یہ لوگ آپس میں جڑتے اور کٹتے رہے ہیں۔ کسی اصولی محرک کے بغیر پارٹیاں اور پارٹیوں کے اندر گروپ بنے اور ٹوٹے۔ کسی اصولی محرک کے بغیر وزارتیں قائم ہوئیں اور برطرف ہوئیں۔ سیاسی تغیرات ہمیشہ عوام سے بالا بالا ہی واقع ہوتے رہے اور ان کے لئے سودا بازی کا طریقہ استعمال میں لایا جاتا رہا۔ تین چار درجن افراد ہیں جن سے سیاسی دنگل کی مختلف ٹیمیں بنتی رہتی ہیں۔ پارٹیوں کے نام کچھ بھی ہوں، یہی افراد کھیل کرتب دکھانے والے ہیں۔ آج اس حصے میں کل اُس میں بیٹھتے ہیں! آج حکومت کی گدی پر، کل اپوزیشن کے بنچوں پر! آج مسلم لیگ میں، کل عوامی لیگ میں، پرسوں متحدہ محاذ میں!

عوام آس لگائے بیٹھے تھے کہ ان کے اکابر کم سے کم اسلامی دستور کے یومِ نفاذ سے اپنے گھناؤنے ماضی کو دفن کر کے دورِ نو کا آغاز کریں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ نئے دستور کے نافذ ہوتے ہی مغربی پاکستان میں اقتدار کی چوگانِ سیاست اسی پرانے گندے انداز سے شروع ہو گئی اور اس کی گندگی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ بیانات، تردیدوں، توضیحوں اور پروپیگنڈے کا ایک گندا ڈھیر لگ گیا ہے، اس ڈھیر سے ایک نئی پارٹی (ریپبلکن پارٹی) اُگ آئی ہے۔ لیکن اس پارٹی کی ترکیب انہی فرسودہ افراد سے ہو رہی ہے جنہوں نے مسلم لیگ کو غارت کیا اور ملک کے نظامِ سیاسی کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔ پھر یہ نئی پارٹی بھانت بھانت کے عناصر کا ایک ویسا ہی مجموعہ بنتی جا رہی ہے جیسا مشرقی پاکستان میں متحدہ محاذ تھا۔ یہ نیا اسٹیج جلد جلد محض اس لئے تعمیر کیا جا رہا ہے کہ آئندہ انتخابات میں اسے استعمال کیا جا سکے۔

لیکن نہ ریپبلکن پارٹی کے پاس کوئی نیا اصول و نظریہ ہے، نہ کوئی نیا تنظیمی نقشہ ہے، نہ کوئی انقلابی نصب العین ہے، نہ نئے دستور کے مطابق قوم کے لئے کوئی تعمیری پروگرام ہے۔ اسی طرح اس کی رکنیت قبول کرنے والے افراد کی کوئی علامتِ امتیاز نہیں۔ بلکہ اصلاً یہ پارٹی بے اصولے پن کے بیج سے اُگی ہے۔ اس کے داعیٔ اول ڈاکٹر خان صاحب اصولاً جماعت یا پارٹی بنانے کے خلاف تھے، مگر اب وہ اصول نسیاً منسیاً ہو گیا ہے۔ پھر آپ کا ایک فیصلہ یہ تھا کہ پارلیمنٹری سیکرٹری نہیں بنائے جائیں گے، اگر بنائے بھی گئے تو بس دو چار کی تعداد کافی ہو گی، مگر تازہ اطلاع یہ ہے کہ پندرہ پارلیمنٹری سیکرٹری ہوں گے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

پس مسلم لیگ اور ریپبلکن پارٹی میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ ملک کو جو کچھ اُس سے ملتا رہا ہی کچھ اس سے ملے گا۔ بلکہ شاید نتائج اور بھی مایوس کن نکلیں گے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے تو بس "سلطانی بھی عیاری ہے اور درویشی بھی عیاری!" —— عوام سے ہم خیرخواہانہ جذبات کے ساتھ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اسلام کو کسوٹی بنا کر جانچیں اور پرکھیں جو افراد خیالات و اعمال کے لحاظ سے اور جو پارٹیاں نظریہ اور پروگرام کے لحاظ سے اس کسوٹی پر کھوٹی ہیں، ان کی چلت پھرت سے مرعوب نہ ہوں بلکہ ان سب کو راستے سے ہٹا کر آگے بڑھیں اور اپنی خدمت کے لئے صحیح اوصاف اور بلند کردار کے لوگوں کو اپنے اندر سے سربراہی کے لئے ابھاریں۔ مفاد پرستانہ جوڑ توڑ اور سودا بازیوں کی کبھی حوصلہ افزائی نہ کی جانی چاہئے۔

منزل منزل

سید نظر زیدی

(اب سے بہت دن پہلے جب انسان تہذیبی طور پر گھٹنوں چلنا ہی سیکھ رہا تھا ایک ویرانے میں دو تنومند انسان دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں میں کسی کے پاس بھی ہتھیار نہیں لیکن دونوں ہی بری طرح زخمی ہو چکے ہیں۔

گیدڑ، لومڑیاں اور جنگلی کتے وغیرہ بہت سے ایسے گوشت خور جانور جو عام طور پر دوسروں کے بچے کھچے شکار پر زندگی بسر کرتے ہیں جھاڑیوں کی آڑ میں چھپے ہوئے لڑنے والے انسانوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ان سب کی نظروں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ سب ان کے مرنے کے منتظر ہیں۔

تھوڑی دیر بعد دونوں انسان نڈھال ہو کر زمین پر گر جاتے ہیں اور گھات میں لگے ہوئے درندے لپک کر انہیں گھونٹ ڈالتے ہیں۔ انسانوں کے کراہنے اور جانوروں کے غرانے اور لڑنے کی آوازوں سے نہایت ہی بھیانک قسم کا شور مچ جاتا ہے، درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے خوفزدہ ہو کر چیختے ہوئے ادھر ادھر اڑ جاتے ہیں۔ کچھ دیر تک فضا میں یہی ارتعاش رہتا ہے۔ آخر سکون چھا جاتا ہے کبھی کبھی کسی جانور کے دانتوں سے ہڈی ٹوٹنے کی آواز گونج اٹھتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت بھی زیادہ دیر باقی نہیں رہتی۔ لاشوں کے آس پاس والے درختوں کے پتے زور زور سے ہلتے ہیں اور دو انسانی روحیں اچھلتی کودتی لاشوں کے پاس آ کھڑی ہوتی ہیں۔ گوشت خور جانور انسانی لاشوں کو تقریباً ختم کر چکے ہیں لیکن ان دونوں ہی کے چہرے ابھی تک درست حالت میں ہیں۔ ایک روح لاشوں کی طرف غور سے دیکھ کر کہتی ہے]

نمبر ۱۔ کیوں بھوت! کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم دونوں ابھی ابھی مر گئے تھے؟

نمبر ۲۔ قطعی! اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ گوشت خور سفاک درندے ہم دونوں کی لاشوں ہی کو بھنبھوڑ رہے ہیں۔ وہ دیکھو وہ دہنی طرف والی لاش جسے جنگلی کتوں نے سنبھال رکھا ہے تمہاری ہے۔ تم اپنا چہرہ تو پہچانتے ہو نا؟

نمبر ۱۔ ہاں چہرہ تو میرا ہی لگتا ہے۔

نمبر ۲۔ لگتا کیا ہے قطعی تمہارا ہی چہرہ ہے۔ تمہارا جس کی کھوپڑی میں یہ غرور سمایا ہوا تھا کہ مجھ جیسا دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں ہا ہا۔ (ہنستا ہے) کیسا شاندار انجام ہوا ہے اس شاندار انسان کا! ہا ہا ہا! —— اور کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تمہارا انجام مجھ سے مختلف ہوا ہے؟ شاید اپنی شکل و صورت تمہیں یاد ہی نہیں رہی ورنہ معلوم ہوتا کہ جس لاش کو مکار لومڑیاں اور بزدل گیدڑ بھنبھوڑ رہے ہیں وہ تمہاری اور صرف تمہاری ہے۔

نمبر ۱۔ چلو یونہی سہی۔ اس سے تمہاری شان تو نہیں بڑھ جاتی تمہارا یہ غرور تو ہر حال باطل ہو گیا کہ انسانی برادری میں تم سب سے زیادہ شان والے ہو۔ کیوں کہ تمہارا انجام بھی وہی ہوا جو میرا!

نمبر ۲۔ کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میرا انجام یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہاری طرح بھولی بسری کہانی بن جاؤں۔ میں نے اپنی طاقت اور صلاحیتوں کی بنا پر بڑائی کا دعویٰ کیا تھا اور میرا یہ دعویٰ پورا ہو کر رہے گا۔ میں مرنے کے بعد بھی تم سے اپنی برتری کا لوہا منواؤں گا سمجھے!!

نمبر ۱۔ لیکن اب تمہاری یہ باتیں صرف حماقت ہے۔ اب ہم دونوں ہی کے جسم ایسے لطیف ہیں۔ کہ نہ تم مجھے نقصان پہنچا سکتے ہو نہ میں تمہیں۔ پھر تم مجھ پر کس طرح برتری حاصل کر سکو گے!

نمبر ۲۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اگر اب میں تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا تو۔ یہ فرض میرے بچے انجام دیں گے۔ میرے شان والے بہادر بچے جن کی رگوں میں میرا جوشیلا اور پاک خون دوڑ رہا ہے، وہ تیری بزدل اور مکروہ نسل سے آل بعوث کا لوہا منوا کر رہیں گے۔ اسی بنا پر حکومت میری ہی اولاد کی ہوگی کیوں کہ میں ہی سب سے زیادہ اس اعزاز کا حقدار ہوں!

نمبر ۱۔ حماقت، صرف حماقت۔ اگر تیرے دماغ سے اب بھی یہ خناس نہیں نکلا تو تجھے اس دن کا انتظار کرنا چاہئے جب تو شیطان کی طرح اپنے اس غرور کا انجام دیکھے گا، بے بسی اور شرمندگی کے آنسو بہائے گا۔ شریر، بزدل بچوں کی طرح چیخے چلائے گا اور کائنات میں ایک دل بھی نہ ہوگا جس میں تیرے لئے پیار اور ہمدردی ہوگی۔

نمبر ۲۔ یہ تیرا انجام ہے بزدل انسان، تیرا اور تیری پوری نسل کا۔

نمبر ۱۔ میرا نہیں تیرا بھی، ہٹ دھرمی اور مکاری کا نتیجہ ہمیشہ ذلت اور تباہی ہی نکلا ہے، پھر تو اس سے کس طرح بچ جائے گا!

نمبر ۲۔ تو اب بھی اس بدتمیزی اور منہ زوری سے باز نہیں آتا! اچھا ٹھہر تو! (دوسری روح کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن اس کا ہاتھ دوسری روح کے جسم میں سے یوں گزر جاتا ہے جیسے سورج کی شعاع میں سے کوئی چیز گزر جاتی ہے۔ پہلی روح زوردار قہقہہ لگاتی ہے۔)

۲

[وہی جنگل لیکن اب یہاں پہلے کی طرح ویرانی نہیں۔ مناسب کاٹ چھانٹ کے بعد درختوں کو باغوں کی شکل دے دی گئی ہے اور زمین کو ہموار کر کے بڑے بڑے کھیت بنا دیئے گئے ہیں۔ باغ پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے ہیں اور کھیتوں میں اناج کے گہرے سبز پودے بہار دکھا رہے ہیں۔ لیکن جس جگہ بعوث اور سمار کی لڑائی ہوئی تھی اسے پہلی صورت میں رکھا گیا ہے۔ وہاں کے درخت اور دوسری چیزیں بالکل پہلے کی طرح ہیں۔ صرف اس قدر فرق واقع ہوا ہے۔ کہ یہ جگہ کچھ مختصر سی لگنے لگی ہے۔ اس مقام پر کھڑے ہوئے درختوں کے پتے زور زور سے ہلتے ہیں اور بعوث اور سمار کی روحیں فخریہ انداز میں ہنستی ہوئی زمین پر اتر آتی ہیں۔ بعوث، سمار کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے)

نمبر ۱۔ کیوں میں نے نہ کہا تھا ایک دن تیری پوری نسل کو ذلت کی خاک چاٹنی ہوگی۔ وہ دیکھ میرے بہادر، سجیلے بیٹے اور پوتے تیری ناپاک اولاد کو سزا دینے کے لئے کس سج دھج سے چلے آرہے ہیں؟

نمبر ۲۔ اور میں کہتا ہوں یہ خود تیرا انجام ہے۔ ذرا دوسری طرف بھی تو نظر اٹھا اور میری اولاد کی آن بان دیکھ۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے تیرے شیخی خورے پیرو میرے صابر و شاکر اور بلند ہمت سپوتوں پر فتح پا سکیں گے اور اگر تو بھی اس غلط فہمی کا شکار ہے تو تیری یہ غلط فہمی بہت جلد دور ہو گی۔ تو چند ساعت بعد ہی ان سب کو ذلت کی خاک چاٹتے دیکھے گا۔

نمبر ۱۔ اچھا دیکھا جائے گا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے! وہ دیکھو میرے چھیلے جوان اپنے ذلیل دشمنوں سے نمٹنے کے لئے پرے باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

[دو مختلف سمتوں سے انسانوں کے دو گروہ آ کر کھلے میدان میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں کچھ دیر تک فخریہ اشعار اور پرجوش نعروں سے فضا جھنجھناتی رہتی ہے اس کے بعد ایک طرف سے ایک تنومند نوجوان آگے بڑھتا ہے اور اپنی تلوار فضا میں لہرا کر مقابلے کے لئے للکارتا ہے۔ دوسری طرف سے بھی ایک نوجوان آگے بڑھتا ہے اور دونوں میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے، ان دونوں کے لڑنے کا انداز پرجوش تو ضرور ہے لیکن جنگی اخلاق و آداب کا پورا پورا لحاظ رکھ رہے ہیں۔

دونوں کے ساتھی حیرت اور انتظار کی ملی جلی کیفیت کے زیر اثر لڑائی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ لڑنے والوں میں کوئی خاص بہادری دکھاتا ہے تو صفوں میں تھوڑی دیر کے لئے ہلچل مچ جاتی ہے، یہ لڑائی تقریباً آدھا گھنٹہ تک جاری رہتی ہے، پھر اچانک ہی ایک نوجوان کی تلوار دوسرے کے شانے پر پڑتی ہے اور وہ تیورا کر گر پڑتا ہے۔ مضروب ہونے والے کے ساتھی کچھ دیر سراسیمہ سے کھڑے رہتے ہیں اس کے بعد نعرے لگاتے ہوئے مخالف گروہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دست بدست لڑائی شروع ہو جاتی ہے، ہتھیاروں کے ٹکرانے اور زخمیوں کے چیخنے چلانے سے قیامت کا سا شور مچ جاتا ہے۔ یہ لڑائی بھی آدھا پونا گھنٹہ تک جاری رہتی ہے اس کے بعد ایک طرف کے آدمی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ غالب آنے والے ان کا تعاقب کرتے ہیں اور میدان میں زخمیوں اور لاشوں کے سوا ایک متنفس بھی باقی نہیں رہتا۔ پہلی روح بلند آواز میں قہقہہ لگا کر کہتی ہے]

نمبر ۱۔ دیکھا! میں نہ کہتا تھا، آخر جیت میری ہی ہو گی۔ میرے بیٹے ہی فتح پائیں گے کیوں کہ ان کی رگوں میں مجھ جیسے شاندار انسان کا خون گردش کر رہا ہے۔

نمبر ۲۔ اور تو اب بھی یہی کہہ رہا ہے شیخی خورے! دیکھتا نہیں میدان میں سب سے پہلے کس کے شاندار بیٹے کی لاش گری تھی؟

نمبر ۱۔ اور اب تو یہ نہیں دیکھ رہا کہ اس میدان میں کس کے بیٹوں پوتوں کی لاشیں زیادہ ہیں۔ اور بھاگنے والے سورما کس کی نسل سے ہیں؟

نمبر ۲۔ لیکن یہ کوئی بہادری کی جیت نہیں۔ یہ تو بے اصولی اور کثرت تعداد کی جیت ہے۔ مزہ تو تب تھا۔ یہ تیرا بیٹا میرے بیٹے کو دست بدست لڑائی میں ہرا دیتا۔

نمبر ۱۔ اب اگر تو شرمندگی مٹانے کے لئے باتیں بنائے تو اور بات ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ آج تیری نسل پر میری نسل کا تفوق ثابت ہو گیا۔ آج بہادری نے بزدلی کو شکست دے دی۔

نمبر ۲۔ تو اور سب کچھ کہہ بہادری کا نام نہ لے۔ مجھے تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اب دنیا سے بہادری کا خاتمہ ہی ہو گیا ہے، کیا تو اسے بہادری کہے گا کہ انسان اپنے بازوؤں کی قوت اور دل کے حوصلے کی جگہ لوہے کے دھار دار ٹکڑوں پر بھروسہ کرے۔ اصول اور استقلال کے بجائے چالاکی اور دھوکے کو اپنا لے؟

نمبر ۱۔ اور یہ باتیں تیرے ذہن میں یوں آ رہی ہیں۔ کہ تو کبھی بہادری کی روح سے آشنا ہی نہیں ہوا۔ کیا تیرا خیال ہے بہادری اور مہارت کے بغیر کوئی ہتھیار کارگر ہو سکتا ہے؟

نمبر۲- (بے بسی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے) نہیں نہیں بھوت! یہ بہادری نہیں ہو سکتی۔ بہادری وہی تھی جب انسان اپنے ذاتی اور معاشرہ کے بل پر اپنے دشمنوں کو نیچا دکھاتا تھا۔

نمبر۱- (ہنستے ہوئے) خیر تو اب اس ذہنی بھول بھلیاں میں بھٹکتا رہ، جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ آج اس کائنات کے ذرے ذرے نے محسوس کر لیا ہے کہ میری نسل ہی اس قابل ہے کہ دنیا پر حکومت کرے۔

نمبر۱- اور اس سے بڑا جھوٹ کوئی شاید ہی ہو۔

نمبر۲- یہ ڈھیٹ پنے کی انتہا ہے۔

نمبر۱- ہرگز نہیں۔ جب تو نے ہار جیت کا یہ عجیب فلسفہ ہی اپنا لیا ہے تو پھر میں یہ یقین کیوں نہ رکھوں کہ میرے جو بیٹے آج میدان سے پسپا ہوئے ہیں کل اپنی طاقت مجتمع کر کے پھر مقابلے پر نکلیں گے اور تیرے غرور کے پرخچے اڑا دیں گے۔

نمبر۱- کیا ——؟

نمبر۲- میں نے کسی ایسی زبان میں بات نہیں کی جو تیری سمجھ میں نہ آئی ہو!

نمبر۱- اچھا اگر یہی بات ہے تو دیکھا جائے گا۔

نمبر۲- ہاں دیکھا جائے گا۔

(دونوں روحیں پھر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں)

(۳)

[روئے زمین کا وہی خطہ۔ باغوں اور کھیتوں کی جگہ اب یہاں زیادہ تر اونچی اونچی عمارتیں بنی ہوئی ہیں، عبادت گاہوں کے اونچے مینار اور کلس اور کارخانوں کی بلند چمنیاں اس بستی کی خوشحالی کا اعلان کر رہے ہیں۔ آبادی سے کافی دور ایک کھلے میدان میں فوجیوں کے خیمے اور عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہوائی میدان میں لڑاکا طیارے تیار کھڑے ہیں۔ مناسب مکانوں پر توپیں نصب ہیں۔ بکتر بند گاڑیاں، ٹینک اور جیپ کاریں ادھر ادھر دوڑ رہی ہیں۔ مسلح سپاہی اپنی اپنی جگہ چوکنے کھڑے ہیں۔

دونوں انسانی روحیں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک محفوظ سی جگہ کھڑی ہو جاتی ہیں۔ پہلی روح مسرت میں ڈوبا ہوا طویل سانس لے کر کہتی ہے)

نمبر۱- اب تو ہمارے بیٹوں نے قابلِ رشک ترقی کر لی ہے۔ اگر اس جگہ سے اس قدر گہرا لگاؤ نہ ہوتا تو میں تو اسے کوئی اور ہی دنیا سمجھتا! شاید ہم دونوں کچھ زیادہ عرصہ تو عالم برزخ میں نہ رہے ہوں گے؟

نمبر۲- بیشک ان لوگوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ غالباً ہم دونوں کچھ زیادہ عرصہ تو عالم برزخ میں نہ رہے ہوں گے؟

نمبر۱- اچھا خیر یہ فیصلے تو پھر بھی ہوتے رہیں گے، ہمیں وہ کام انجام دینا چاہئے جس کے لئے رب العزت کی اجازت سے کر دنیا میں آئے ہیں۔

نمبر۲- عجیب بات ہے تمہارے ذہن سے ابھی تک وہ خناس دور نہیں ہوئی! اگر میرے دل کی بات پوچھو تو میں تو اپنے پچھلی کی پر فتنا غار زندگی سے بھی چھٹی کا شکر ادا کرنے کے سوا سب کچھ بھول چکا ہوں۔ کیا یہ اچھا نہیں، کہ اب ہم تمام تلخ یادوں کو بھلا دیں!

نمبر۱- واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اپنی عظمت اور برتری کا اعتراف کرانے کا ٹھیک وقت تو ابھی آیا ہے، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ روئے زمین

کی یہ ساری رونق میرے بچوں کی بخشی ہوئی ہے۔ انہی میں ایسی صلاحیت تھی۔ اور تمہارا فرض ہے۔ کہ اس حقیقت کو مان لو۔

نمبر ۲ - مجھے تمہاری ذات سے اس قسم کی حماقت اور جہالت کی توقع تھی۔ اگر تم نہیں مانتے تو آؤ مل کر تحقیق کریں۔ ہم دونوں میں سے کس کے خاندان نے اپنی بزرگی اور قابلیت کا لوہا منوایا ہے! آؤ!

نمبر ۱ - ہاں چلو!

نمبر ۲ - لیکن دور دور تک پھیلی ہوئی اس آبادی میں ہم یہ بات کس طرح انجام دے سکیں گے؟

نمبر ۱ - اپنی ذہانت کی مدد سے۔ کیا تم اندازہ نہیں کر رہے کہ جس جگہ ہم کھڑے ہیں اسے میرے بچوں نے، میری نسل نے رونق بخشی ہے۔ اگر خدا نے تمہیں آنکھیں دی ہیں تو ان کے چہروں میں میرے نقوش کی جھلک دیکھ سکتے ہو۔

نمبر ۲ - اچھا چلو یونہی سہی۔ آخر اس میں شیخی بگھارنے کی کیا بات ہے۔ جب ہم بستی کے اس حصے میں جائیں گے جس پر میرے بچے آباد ہیں تو تم اسے اس جگہ سے بڑھ کر حسین پاؤ گے۔

نمبر ۱ - ہر احمق اپنے بارے میں ایسی ہی خوش فہمی کا شکار ہوتا ہے۔ بہرحال آؤ۔ اب ہمیں مزید وقت برباد نہیں کرنا چاہئے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنا کام اس جگہ سے شروع کریں۔ میرے خیال میں تو سب سے پہلے اس مکان میں جا کر حالات کا اندازہ کرنا چاہئے جو سب سے زیادہ خوب صورت اور بلند و بالا نظر آ رہا ہے۔

نمبر ۱ - مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

[دونوں روحیں خاموشی سے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ اور تھوڑی دیر میں اس مکان کے اندر پہنچ جاتی ہیں جس کا پہلی روح نے حوالہ دیا تھا یہ واقعی ایک حد درجہ خوب صورت مکان ہے۔ اس کے کمرے کچھ اس طرح آراستہ ہیں۔ کہ دونوں روحیں کچھ دیر کے لئے حیران و ششدر رہ جاتی ہیں۔ جب حواس بحال ہوتے ہیں تو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہوتی ہیں جس میں سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی ہے۔ باتیں کرنے والوں میں سے ایک نے نہایت بڑھیا فوجی وردی پہن رکھی ہے۔ دوسرا شہری لباس میں ہے لیکن وہ بھی ذی حیثیت معلوم ہوتا ہے۔ کمرے میں داخل ہو کر دونوں روحیں ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں اور ان کی باتوں کی طرف کان لگا دیتی ہیں۔ فوجی کہہ رہا ہے]

فوجی - یقیناً اب وقت آگیا ہے کہ ساری دنیا سے آلِ جنوث کی برتری اور سیادت کا لوہا منوایا جائے، اور میرا خیال ہے یہ کام کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں۔

شہری - جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ اگر یہ کمبخت سائے اپنی ضد چھوڑ دیں۔

فوجی - لیکن اگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہیں تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ ان کا دماغ درست کرنے کے لئے ہمارے پاس معقول فوجی طاقت فراہم ہے۔

شہری - لیکن مصیبت تو یہی ہے۔ کہ فوجی طاقت کے لحاظ سے وہ کمبخت بھی کمزور نہیں اور اسی بنا پر ایسی اکڑ دکھا رہے ہیں۔

فوجی - (سوچتے ہوئے) ہوں۔ سچ پوچھو تو یہ بات ہے تو خوش ہو کر لیکن میں اس کے باوجود مایوس نہیں ہوں۔ ذہنی اور دماغی طاقت میں برتری بہرحال

یہ ہمیں کیا حاصل ہو سکے گی۔ ذرا ٹھہرو میں اس وقت ان کا بندوبست کرتا ہوں۔

شہری۔ جی ؟

فوجی۔ تم یوں کرو محکمہ سراغرسانی کے افسر اعلیٰ کو بھیج دو اور باہر ٹھہر کر میرے فیصلے کا انتظار کرو۔

[شہری افسر باہر چلا جاتا ہے۔ اور چند ساعتیں گزرنے کے بعد ایک اور شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ آنے والے کے چہرے سے ذہانت اور ہوشیاری ظاہر ہو رہی ہے، روحیں اس کی طرف دیکھتی ہیں اور باتیں سننے کے لئے اپنی پوری توجہ اس طرف مرکوز کر دیتی ہیں۔ فوجی افسر آنے والے کا پرجوش استقبال کرتا ہے اور رازداری کے انداز میں کہتا ہے]

فوجی۔ یہ بات تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ انسانوں کی اس منحوس نسل آلِ سمارہ کو ہم اپنی فوجی قوت کے بل پر بھی زیر کر سکتے ہیں لیکن اس کوشش میں خود ہمارا بھی کچھ نہ کچھ نقصان ہوگا۔ اسی لئے میں دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم اپنے آدمیوں کے ذریعے آلِ سمارہ کے خاص خاص آدمیوں کو خود ان کے گھروں میں قتل کرا دو۔ اگر یہ کام بطریقِ احسن انجام پا گیا تو یہ پوری نسل قیادت سے محروم ہو جائے گی اور پھر اسے لامحالہ ہمارے قدموں میں سر جھکانا پڑے گا۔

نووارد۔ آپ بالکل اطمینان رکھئے۔ ہمارے لئے یہ کچھ بھی مشکل بات نہیں، اگرچہ ان کے اور ہمارے مابین کافی عرصے سے جنگ کی سی کیفیت طاری ہے لیکن اس کے باوجود میرا ہاتھ ان سب کے حلقوم تک پہنچتا ہے۔ کل کا سورج نکلنے سے پہلے آپ یہ خبر سنیں گے کہ اس قوم کے تمام قابلِ ذکر رہنما اور علمبردار دائمی نیند کی آغوش میں پہنچ چکے

فوجی۔ شاباش! مجھے یہی امید تھی۔ کہ تم ایسا ہی جواب دو گے۔ اچھا اب تم جا سکتے ہو۔ اب مجھے وہ نقشہ مکمل کرنا ہے جس طریقے سے ان کی آبادیوں اور مراکز پر قبضہ کیا جائے گا۔

[نووارد سلام کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔ فوجی افسر اپنی میز پر جھک کر کچھ لکھنے لگتا ہے اور دونوں روحیں حیران ہو کر ایک دوسری کی طرف دیکھنے لگتی ہیں۔]

نمبر ۲۔ کیوں دیکھ لی اپنے بیٹوں کی وہ مہارت اور بہادری جس پر تمہیں ناز تھا۔ کیا شریف لوگ اپنے دشمنوں کو یونہی نقصان پہنچایا کرتے ہیں۔

نمبر ا۔ (شرمندہ سا ہو کر) ہاں یہ تو واقعی عجیب بات ہے، مجھے تو یہ سوچ کر ہی شرم آ رہی ہے کہ میری نسل سے ہو کر یہ لوگ کس انداز فکر کو اپنا رہے ہیں۔ میں تمہارے سامنے کھلے لفظوں میں اعتراف کرتا ہوں۔ کہ اب یہ لوگ بہادری اور شرافت کے بلند معیار سے گر چکے ہیں۔ انہوں نے وہ جوہر برباد کر دیا ہے جس پر میں آج تک فخر کر رہا تھا۔ افسوس آہ۔ اب میں یہ دعویٰ کبھی نہ کروں گا۔

[دوسری روح کچھ کہنا چاہتی ہے کہ فوجی افسر کے قریب والے دریچے کا پردہ ہلتا ہے۔ اور ایک پھرتیلا سا نوجوان ہاتھ میں پستول لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ افسر گھبرا کر اس کی طرف دیکھتا ہے تو وہ پستول کی نالی اس کے سینے کی طرف سیدھی کر دیتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔]

نوجوان۔ ہمیں تم لوگوں کی تمام سرگرمیوں کا علم ہے اور انہی کی بنا پر ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی شرارت کا آغاز ہونے سے پہلے تم سب کو موت کی نیند سلا دیا جائے، تو مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس سلسلے میں تمہیں جو سب سے اچھی خبر سنائی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس طویل سفر

(باقی ص ۴۸)

صبح کا بھولا

(رسی ای ایم جوڈ کی معرکہ آرا کتاب "ایمان کی بازیافت" کا ایک جائزہ)

نعیم صدیقی

مسئلۂ شر (Evil)

زندگی میں شر (بمعنی معصیت نہیں بلکہ موجباتِ کرب و اضطراب) کے مظاہر کو دیکھ دیکھ کر انسان ہمیشہ گہرے تفکر میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ شر کا وجود کیوں ہے؟ اس کا سرچشمہ کہاں واقع ہے؟ اس کا محرک کون ہے؟ اس کی ذمہ داری کس پر ڈالی جانی چاہئے؟ یہ سوالات اسے ہمیشہ پریشان کرتے رہے ہیں اور طرح طرح کے اوہام اور قیاسات اور نظریات کی وادیوں میں وہ آوارہ گردیاں کرتا رہا ہے۔ کتاب فلسفہ میں بجائے خود خیر و شر کا ایک علیحدہ باب مدوّن ہو گیا لیکن مسئلہ اب بھی وہیں ہے جہاں تھا۔

جوڈ کے نزدیک بھی اس مسئلہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے جیسا کہ وہ اپنی کتاب کی تمہید میں بیان کر چکا ہے کہ اس مسئلے کی وجہ سے وہ بار بار الجھنوں میں پڑتا ہے۔ وہ اسی مسئلے کا کھوج لگاتے لگاتے فلسفے کے صحرائے جانکاہ کو پار کر کے مذہب کے شہر میں آوارد ہوا۔ چنانچہ اس نے ایک مستقل باب اس موضوع پر اسی لئے لکھا ہے کہ اس کے ذہنی سفر کی داستان اس کے بغیر پوری طرح سامنے نہیں آسکتی۔

جوڈ خود بیان کرتا ہے کہ اس کی الجھن کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔ وہ جب بچپن میں سنڈے اسکول جاتا تھا تو وہاں روز یہ سنتا تھا کہ انسان گناہ میں پیدا ہوا اور اس کا دل سرتاسر دل خانۂ خراب واقع ہوا ہے۔ مجھے کتاب دعا کی روشنی میں بتایا جاتا تھا کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہئے وہ میں نے نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں میری روح صحت مند نہیں ہے اور میں ایک بدنصیب گنہگار ہوں۔ گرجا کی عبادت کے ذریعے مجھے ترغیب دلائی جاتی کہ میں خیال، قول اور عمل کی صورت میں ہونے والے گناہوں کا اعتراف کروں اور ان کا ازالہ کروں اور اس کے لئے خدا سے رحم اور مدد کی درخواست کروں۔ اس دور کے اہم تاثرات یہ ہیں جو اب تک باقی ہیں:-

—— اپنی مدد کرنے کے لئے میں اپنے اندر قوت نہیں رکھتا۔

—— خدا کی مدد کے بغیر انسان گناہ کی پستیوں میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جاتا ہے۔

—— مجھے خدا سے مدد مانگنی چاہئے۔

لیکن وہ ذہنی آب و ہوا جس میں جوڈ نے جنم لیا وہ کتاب دعا کے خلاف ایک دوسرا ہی مزاج رکھتی تھی۔ انیسویں صدی کا ابتدائی دور ترقیات کا دور تھا اور ۱۹۱۴ء تک اس کا ایک خاص رنگ جما رہا۔ اس دورِ ترقی کے مزاج کو سمجھانے کے لئے اس کے چند اہم پہلوؤں کو جوڈ وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔

[illegible] کا المیہ

تخلیقی ارتقاء کا فلسفہ جس کے داعی برنارڈ شا اور برگساں اور الگزینڈر جیسے لوگ ہیں یہ تصور دیتا ہے کہ آدمی اپنی قسمت کا آپ ہی خالق ہے۔ دنیا اس کی ہے۔ مستقبل کا انحصار اس کے ارادے پر ہے اور اس کی عظمت اس کے اپنے ہاتھ ہے۔

یہ تصور در اصل نتیجہ تھا کسی فوق الفطری ضابطہ و نظام کے انکار کا۔ اگر ہم مذہبی تعلیم کے مطابق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ طبعی قوانین کے علاوہ کوئی اخلاقی قانون بھی کائنات اور زندگی اور تمدن میں دخل رکھتا ہے اور یہ اخلاقی قانون بھی علت و معلول کے سسٹم کی صورت میں نتائج پیدا کرتا ہے تو پھر انسانی امنگوں اور ترقیوں اور کامرانیوں کی کوئی نہ کوئی حد ذہن میں ابھر آتی ہے۔ فلسفہ ارتقاء نے کسی فوق الفطری طاقت یا قانون کے تصور پر پوری طرح جھاڑو پھیر دی اور یہ تاثر دیا کہ آدمی سے بالاتر کوئی طاقت موجود نہیں ہے جو اس کا راستہ روکے، اس کی کوتاہیوں کی سزا دے، اس کی امنگوں کی تحدید کرے یا بالفاظ دیگر اس کی ساخت کو زبردستی توڑے مروڑے۔ بس جو کچھ ہے وہی وہ ہے۔

فلسفہ ارتقاء نے یہ سبق بھی دیا کہ وہ روحانی طاقت ۔۔۔ اگر اسے "روحانی" کہنا جائز ہو تو ۔۔۔ جس کا ظہور انسان میں ہو رہا تھا ایک متحرک طاقت ہے۔ برنارڈ شا اس کو "قوت حیات" (LIFE FORCE.) کا نام دیتا ہے اور اس کی نگاہوں میں مادہ پر اثر انداز ہونے کے لئے تخلیقی صلاحیتیں رکھتی ہے۔ اس کے اپنے لفظوں میں "وہ ایک متعین رخ رکھنے والی متحرک طاقت ہے جو مادہ کی تخلیق و تشکیل کرنے کے لئے اپنے آپ کا آلہ کے پیرائے میں لاتی ہے۔" برگساں اسی خیال کو "EBAN VILAT" کے عنوان سے پیش کرتا ہے جو ارتقاء کی گاڑی کو آگے دھکیلتی جا رہی ہے۔

ان فلسفیانہ تصورات کا مجموعی ماحصل یہ ہے کہ:

۔۔۔ آدمی کے علاوہ یہاں کوئی اور ایسی بالاتر طاقت نہیں ہے کہ جس کا وہ تابع ہو اور جس کے زیر انضباط ہو، جس کے سامنے وہ اپنے آپ کو ذمہ دار و جوابدہ محسوس کرے یا جس کی محبت و عبادت کے چکر میں پڑے۔

۔۔۔ آدمی کے اندر کوئی ایسی قوت کار فرما نہیں ہے جو اس کے اپنے بس سے باہر ہو۔ دوسرے لفظوں میں جو کچھ بھی اس کا ہے وہ عمل ارتقاء کا ماحصل ہے۔ کائنات انسان کے لئے ہے اور ابھی زیر تشکیل ہے اور اسی طرح انسان خود بھی زیر تشکیل ہے۔ آدمی میں اگر کوتاہیاں، کمزوریاں اور خرابیاں ہیں تو اسی عمل ارتقاء کے ذریعے آگے چل کر وہ محو ہو جائیں گی۔ بس نئے انسان کی تشکیل کی ہے۔ انسان اس عمل ارتقاء کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر اسے جس رخ چاہے موڑ سکتا ہے اور اس طرح اپنی فلاح و بہبود کا کمال اپنے ارادے کے زور سے حاصل کر سکتا ہے۔

جوڈ اس سلسلے میں ہربرٹ اسپنسر کا یہ قول حوالے میں لاتا ہے کہ:

"معیاری انسان کا مرتبہ کمال کے ساتھ ظہور اتنا ہی قطعی ہے جتنا کہ کوئی بھی قطعی نتیجہ جس پر انسان کامل اعتماد رکھتے ہیں ۔۔۔ خلاف کے سب کا ارمی رہتے ہیں۔ کیونکہ ترقی اتفاقی امر نہیں ہے بلکہ ایک لازمی ضرورت ہے۔ ہم جسے شر اور معصیت کا نام دیتے ہیں وہ سب لازماً مٹ جانا چاہئے۔ یہ قطعی ہے کہ انسان کو بہر حال مرتبہ کمال پر پہنچ کے رہنا ہے۔"

سائنس کی فتوحات

یہ فلسفہ در حقیقت سائنس کی فتوحات اور کامرانیوں کے نشہ میں پیدا ہوا۔ تاریخ میں انسان جن طاقتوں کے [illegible] ان پر انیسویں صدی کے اوائل میں

انسان قابو پانے کے قابل ہو گیا۔ انسانی فلاح و بہبود کے یہ دشمن سائنس کے اسلحہ سے شکست کھانے لگے۔ نظامِ فطرت کے مقابلے میں انسان نئی قوتوں سے مسلح ہو کر اٹھا۔ کوئلہ، لوہا، فولاد، ایٹم اور بجلی کی طاقتیں مسخر ہونے لگیں۔ اور تو چھوڑیئے محض ایک کپاس کے عام اور ارزاں ہو جانے سے آدمی کو ایسے چرمی لباسوں سے نجات مل گئی ہے جو دُھلنے کے قابل نہیں ہوتے تھے اور اس وجہ سے گندے ہو ہو کر جسموں کے اوپر ہی پھٹ جاتے تھے۔ شہروں کی گلیاں سائنس نے پکی کر دیں، ان میں لیمپ جگمگانے لگے۔ اس طرح گندگی اور تاریکی کے شر کا توڑ ہونے لگا۔

انسانی عمر کے اوسط طول میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح وقتِ کارکردگی ۱۲ گھنٹے (۱۹۱۴ء) سے گھٹ کر ۶ گھنٹے یومیہ (۱۹۳۲ء) تک آ گیا۔ چیچک اور طاعون جیسی مہلک وباؤں کو پوری طرح کھدیڑ دیا گیا۔ بیہوش کرنے والی دواؤں کی ایجاد غالباً اس لحاظ سے اہم ترین تھی کہ اس کی وجہ سے آپریشنوں اور زچگیوں کے تڑپا دینے والے دردوں سے اولادِ آدم کو نجات مل گئی۔ یہ سب سائنس اور مادی علم کے کرشمے تھے۔

سائنس کے اس دور فتوحات نے کائنات اور انسانی زندگی کے متعلق بالکل ایک نیا نقطۂ نظر ابھار دیا۔ سابق تصوّر یہ تھا کہ حقیقت ایک متعین، ایک غیر متغیر امرِ واقعہ ہے اور مسئلہ یہ تھا کہ انسانی زندگی کو کیسے اس کے مطابق بنایا جائے۔ اب ترتیب اُلٹ گئی، یعنی حقیقت کو انسانی رخ اور ضرورت کے مطابق کیسے ڈھالا جائے۔ بجائے اس کے ایک اٹل ضابطہ انسانی زندگی پر تسلط پائے اب پرابلم یہ پیدا ہو گیا کہ انسان اپنی پسند کے مطابق کیسے اخلاقی ضابطے کو مرتب کرے۔ پہلے فلسفہ اور سائنس دونوں کا مدعا یہ تھا کہ دنیا کی حقیقت کو سمجھا جائے، اب سائنس کا منتہا یہ ٹھہرا کہ دنیا پر اور اس کی حقیقتوں پر قدرت کیسے حاصل کی جائے۔ قرار پایا کہ آدمی اپنے فطری ماحول اور اپنی سلطنتِ زندگی کا کارمختار ہے۔ یہی نقطۂ نظر اس دور کے فلسفے میں منعکس ہوتا چلا گیا۔

آدمی کے اندر ترقی کے ان فاتحانہ اقدامات نے ایک نشۂ استکبار پیدا کر دیا کہ شر کے کتنے ہی مظاہر ختم ہو کے رہ گئے جن کے ہاتھوں زندگی اجیرن تھی۔ مثلاً جادوگری، ہیضہ، خونی دنگل، غلامی اور تشدّد و عقوبت جیسے مفاسد سے زندگی کو نجات مل گئی۔ اس سے ایک عمومی امید پیدا ہو گئی کہ سائنس اور طبعی و مادی علوم کے ہتھیاروں سے شر کے بقیہ تمام مظاہر و محرکات کا توڑ بھی آہستہ آہستہ ہو کے رہے گا۔

دو نظریات کا ظہور

اس فضا میں انسان کے مسلسل ترقی کی راہ پر بڑھنے اور سائنس کی مدد سے شر سے نجات پا کر ایک صالح زندگی تک جا پہنچنے کے حق میں دو نظریے نمودار ہوئے۔

ایک تھا مارکسی نظریہ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں شر اور معصیت جو کچھ بھی ہے وہ اس کے طبعی اور تمدنی ماحول کے مفاسد کی وجہ سے ہے اور سائنٹیفک طریقے سے ماحول کو بدلا جا سکتا ہے اور اسے شر سے خالی کیا جا سکتا ہے۔ تمدنی ماحول کی اصلی ساخت چونکہ معاشی سسٹم پر مبنی ہے اس لئے جب اسے درست کر دیا جائے گا تو سارا تمدنی ماحول درست ہو جائے گا اور جب انسان کی معاشی ضروریات ٹھیک سے پوری ہونے لگیں تو وہ جرم و معصیت سے پاک ہو جائے گا کیونکہ محرومی ہی جرم و معصیت کا اصل باعث ہے۔ درحقیقت شر کا دار و مدار ہی ہے جو اِملاقِ افلاس ہے ـــــ یعنی دولت، روپیہ!

چنانچہ برنارڈ شا کہتا ہے:

"قوم کی اصل ضرورت بہتر اخلاق، انداز روش، انسداد مشکلات، آزادی فکر، عصمت، اخلاص [illegible]

بھائیوں کی بحالی نہیں ہے، نہ نظریۂ تثلیث کی خوبی اور باہمی رفاقت و محبت ہے، بلکہ وہ محض وافر روپے کی محتاج ہے"

دوسرا نظریہ علم النفس کے دائرے میں فرائڈ، ایڈلر اور ینگ کے ہاتھوں استوار ہوا۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ شر زندگی کے غلط ترتیب احوال میں نصب ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ آدمی کی اساسی جبلتیں فی نفسہٖ نہ اچھی ہیں نہ بُری۔ ناموزوں ماحول یا بچپن کی غلط ترتیب کے سبب وہ بُری شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ مثلاً بچے کی کسی جبلت کو جب والدین جبر سے دباتے ہیں تو اس کے غیر شعوری ذہن میں اس جبر کے خلاف ایک نفرت یا ذوقِ جُرم کا لاوہ بھرنے لگتا ہے اور پھر یہ لاوہ اپنے بہاؤ کے لئے کوئی مجرمانہ یا باغیانہ راستہ پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ احساسِ کہتری (INFERIORITY COMPLEX) کا روگ لگ جاتا ہے اور پھر ساری عمر اسی احساس کا ردِّ عمل دکھانے میں گذر جاتی ہے۔ نفس اور ماحول کی ناسازگاری بے شمار مختلف فاسد اشکال میں ظہور کرتی ہے اور یہ سب شر کے مظاہر ہوتے ہیں۔

شر کے اس تصور کے مطابق راہِ نجات یہ ہے کہ ماحول کو بدل دو، بچہ کو بہتر فضا مہیا کرو، اسے محبت اور آزادی سے بہرہ ور کرو، اسے مناسب حد تک اہمیت کا احساس دلاؤ، تشدّد اور دباؤ سے اثر انداز ہونے سے پرہیز کرو، احساسِ کہتری، احساسِ جُرم اور انتقام کے جذبات کی پیدائش کا موجب نہ بنو۔ اس اہتمام کے نتیجے میں بچہ ذہنی طور پر تندرست، خوش و خرم، با اثر، متوازن اور نڈر ہو کر پروان چڑھے گا۔

یہ نظریہ بچوں کی تربیت تک ہی محدود نہیں، بلکہ بڑے بڑے تمدنی مسائل کو اپنے سامنے رکھتا ہے اور اپنے ڈھب پر ان کا حل پیش کرتا ہے مثلاً جوڈ بتاتا ہے کہ ایک امریکی ڈاکٹر (DR: BROCK CHISHOLM.) مسئلہ جنگ پر کاوش کر رہا ہے۔ اس کی رائے میں جنگ کا اصل سرچشمہ انسانی قلب میں واقع ہے۔ انسان جب غلط انداز سے کوئی خواہش کرتا ہے، غلط ڈھنگ سے ارادے باندھتا ہے تو بدراہ رجحانات پیدا کر لیتا ہے اور انہی کا مظاہرہ جنگ ہے۔ پس اصل ضرورت ان بدراہ رجحانات کے سدِ باب کی ہے۔ گویا ڈاکٹر مذکور کی رائے میں جنگ کا مسئلہ ایک سائنٹیفک یا ایک نفسیاتی علاج چاہنے والا مسئلہ ہے۔ اس بحث میں متعدد اختلافی نکات پر اظہارِ رائے کیا گیا ہے لیکن ایک چیز پر بالعموم اتفاق پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی میں جو کوئی پہلو بھی تکلیف دہ ہے وہ سائنس کا میدانِ کار ہے۔ ہنری والیس (HENRY WALLACE) زندگی کے تمام مفاسد کا راز ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"انسانیت کی موجودہ نسلوں کی دردناک صورتِ حالات کا راز کہتری، گناہ اور خوف کے احساسات میں مضمر ہے۔"

لیکن جوڈ جس نے شر کے متعلق یہ نظریہ نوعمری میں بغیر سوچے سمجھے ذہن میں جذب کر لیا تھا اب بنیادی طور پر وہ اس کا انکار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

جوڈ کا عیسائی نقطۂ نظر | جوڈ ان دونوں جدید نظریات سے ہم آہنگ نظریات پر اولین تنقید ڈالتے ہوئے پوچھتا ہے کہ کیا ہمارے دور کے وہ تمام رجالِ عظیم جو بے سکون طاقتوں اور فاتحانہ عزائم سے مسلح ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے قوت و اقتدار کی راہوں پر بڑھے ہیں کیا ان کے کارناموں کی توجیہ احساسِ کہتری سے کی جا سکتی ہے جسے ان کے اندر مکتب کے زمانۂ تعلیم نے

پیدا کیا گیا تھا کیا ہوتی ہے؟ انقلاب روس پر جوڈ کے تجزیے اور اس کی ناکامی [illegible] اور اس سلسلے میں ہونے والے مطالعات [illegible] کی روشنی میں [illegible] حد تک [illegible] یہ فرض کی جا سکتی ہے کہ انسان اپنی ضرورت کے مطابق اپنے مقاصد کی تشکیل کرتا ہے۔ کیا یہ بالکل واضح نہیں ہے کہ ایسے تمام حادثات جن سے تاریخ انسانی بھری پڑی ہے اور انسان کے خلاف انسان کے جذبۂ انتقام اور [illegible] پر مبنی ہیں؟ جو ایسے حادثات کو ایک ذہنی تبدیلی سے گزرنے کے بعد اب جس [illegible] نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے وہ اس کی نگاہ میں وہی پرانا نقطۂ نظر ہے جو بچپن سے [illegible] اس کے سامنے رکھا گیا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ میں اپنی عمر احساسِ گناہ سے بالاتر رہا ہوں۔ میں نے خوب جم کر اخلاقی تقاضوں کو پامال کیا ہے لیکن میں نے اپنے ضمیر میں احساسِ جرم کا کبھی کوئی اثر محسوس نہیں کیا۔ میں خواہش اور ضمیر کی کشمکش کے بارے میں بالکل انجان رہا ہوں۔ میں نے کبھی اپنے لئے یہ محسوس نہیں کیا کہ مجھ سے کسی "چاہئے" کا بھی کوئی تقاضا ہو سکتا ہے۔ اندریں حالات یہ دونوں نظریات بتائیں کہ میرے کردار میں شر کہاں سے آیا؟

جوڈ بیان کرتا ہے کہ مجھے کتابِ دعا کا مفہوم اس وقت سمجھ میں آیا جس دن میں نے یہ محسوس کیا کہ نیکی کے کم سے کم معیار پر بھی اکساہٹوں کا مقابلہ کر کے پورا اترنا کتنا مشکل ہے۔ اب وہ یہ نظریہ سامنے لاتا ہے کہ زمین پر خالص نیکی اور کامل خیر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہر حال میں خیر و شر اور نیکی و بدی باہم آمیختہ پائے جاتے ہیں۔ یہاں پھول کے ساتھ کانٹا ناگزیر ہے۔ قرآن کی زبان میں کہنا چاہئے کہ "ان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا" زندگی کی نوعیت ایک امتحان یا ایک چیلنج کی سی ہے۔ "یہ عالم میں تیرا امتحان ہے زندگی" یہ جد و جہد اور سرگرمی کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ قربانی اور خود فراموشی کا درس دیتی ہے، یہ ایک رضاکارانہ خود سپردگی کی محرک ہے۔ یہاں بغیر جد و جہد کے طمانیت کا حصول ہی نہیں ہو سکتا۔ دن بھر کوہ پیمائیوں کے بغیر یہاں انگیٹھی کے پاس آرام کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے اور کیک کھانے میں کوئی لذت نہیں آ سکتی۔ یہاں بغیر ضبطِ نفس اور ایثار [illegible] خوشی کا جو جام چڑھایا جائے گا وہ جتنا جلد نشہ دے گا اتنا ہی جلد خمار اور خمیازہ تک بھی پہنچا دے گا۔ جسے خمار اور خمیازہ سے بچنا ہو اسے چاہئے کہ وہ پیاس بھر جام چڑھانے سے پہلے ہی ضبط و ایثار سے کام لے۔

جوڈ اپنا پورا مطالعہ چند لفظوں میں سمیٹ کر کہتا ہے کہ یہاں عمل و جستجو کی کوئی صورت ایسی نہیں جس میں کوتاہیاں نہ رہ جائیں۔ کوئی نظامِ زندگی ایسا نہیں جس میں اپنی کچھ کمزوریاں نہ ہوں۔ کوئی کردار ایسا نہیں جس کے اچھے پہلوؤں کے ساتھ کوئی نہ کوئی مفسدہ لگا ہوا ہو۔ خیر کے ساتھ شر کے یہ متقابل پہلو اتفاقی طور پر نہیں پیدا ہو گئے بلکہ اچھائیوں کی تلاش اور ان سے شادکامی حاصل کرنے کے راستے کے فطری سنگِ میل ہیں۔ مثلاً سخاوت اور دولتمندی بڑی چیز ہے لیکن اس کے ساتھ بھی تاریک پہلو چھپا ہوا ہے۔ دنیوی نعمتوں کا فراوانی سے استفادہ کرنے میں ہمارے پیمانۂ لذت و سرور کو گھٹا دیتا ہے۔ نیز دولت و املاک کی کثرت کی صورت میں بہترین مسرت بخش اسباب اور سرگرمیوں کا انتخاب ایک الجھن بن جاتا ہے۔ ان وجوہ سے وہ لذت و تسکین جو مطلوب ہوتی ہے مفقود ہو جاتی ہے۔ اس بحث میں جوڈ افلاطونی نظریۂ مسرت سے اپنے حق میں شہادت لیتا ہے۔

ایک سیدھا سا سوال ہے۔ آپ سوچئے کہ پورے انسانی تاریخ کی دنیا میں کیا کوئی ایک دن بھی ایسا آیا [illegible] ہو۔ جوڈ [illegible] کے مطالعہ پر نگاہِ بازگشت ڈال کر بتاتا ہے کہ مجھے صرف ایک ایسا [illegible] نظر آتا ہے [illegible]

جب گبن یہ نقشہ [illegible] پیش کیا ہے کہ [illegible] ... [illegible] کے عالم میں ایک

بلند بہ مناقب [illegible] میں ہو گزرتے ہیں، آخر کے کمانے پر تاؤ کا آتا ہے۔ پھر وہ [illegible] راستوں پر [illegible]

لوٹتے ہیں اور بھائی بھی اپنی محبت میں قریب سے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس بزم مسرت کے دامن پر [illegible] امیدوں

اور تلخ ناکامیوں کے دھبے موجود ہیں۔ ذرا کارڈووا کے ایک عرب خلیفہ کا بیان تو پڑھئے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ "اپنے پچاس سالہ دور حکومت

میں میں ہمیشہ فتح مند رہا، ہمیشہ خوش نصیبی نے میرا ساتھ دیا، اپنی رعایا کا محبوب رہا، ان کے دشمنوں کے لئے خوفناک رہا اور چاروں طرف

سے ادب و احترام میں گھرا رہا۔ وہ سب کچھ جس کی بنی آدم تمنا کر سکتے ہیں مجھ پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس کی بارش ہوتی رہی ہے ـــ

عظمت، حکمت، اعزازات، خزانے، اموال، تفریحات اور محبت ـــــ میں ان سب سے خوب لذت اندوز ہوا۔ لیکن یہ خلیفہ موت کی

سرحد پر کھڑے ہو کر جب جائزہ لیتا ہے تو بتاتا ہے کہ "میں نے وہ دن گنے ہیں جن میں میں صحیح معنوں میں مسرت اندوز رہا، مجھے عمر بھر میں

ایسے صرف گیارہ دن مل سکے۔" پھر وہ وصیت کرتا ہے کہ فانی مخلوق یہ حیاتِ ارضی کی حقیقی قدر و قیمت کو میرے اس تجربے سے سمجھو۔

بہت سا ہے دوسرے حوالے بھی جوڑ سامنے لاتا ہے مثلاً گبن کا مقولہ کہ "تاریخ انسانیت کے جرائم، اس کی حماقتوں اور بدنصیبیوں کا ریکارڈ ہے۔" یا جان اسٹوارٹ مل کے الفاظ کہ "بہ حیثیتِ مجموعی نسلِ انسانی غلامی اور اسیری کی زندگی بسر کر رہی ہے۔" یا جسٹنگ کا نقطۂ نظر کہ "تاریخ ناقابلِ بیان آلام کا ایک بھیانک دفتر ہے۔" ان مثالوں کو سامنے رکھ کر وہ پوچھتا ہے کہ کیا مطلب رہا ان تصوراتِ ترقی کا جو جوانی میں میرے ذہن میں رچے بسے ؟ کیا مطلب ہوا انسانیت کے تکمیل کی طرف بڑھنے کا ؟

مزید اشکال | کیا یہ توجیہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ تمام مفاسد جنہوں نے انسانی زندگی کو پریشان کیا ہے وہ سیاسی و اقتصادی نوعیت رکھتے ہیں، کیا کسی باپ کا اپنے معصوم بچے کو تازیانے لگانا، کسی ظالم مالک کا اپنے غلام کو ہمیشہ زنجیروں میں جکڑے رکھنا، کسی برافروختہ نوجوان کا اپنی محبوبہ پر بدگمانی کر کے اس کے چہرے کو تیزاب سے جھلس دینا، ان ساری حرکات کی بنا ایک غلط سسٹم پر رکھی جا سکتی ہے جس میں ذرائع و وسائل کی ملکیت اور اجارہ داری ایک طبقہ کی محنت سے دوسرے طبقہ کو استفادہ کرنے کا موقع دیتی ہو۔ گناہ اور بدی اور جرائم کو اگر افلاس کا نتیجہ قرار دیا جائے تو ان برائیوں کی توجیہ کیا ہو گی۔ جو امارت و دولت مندی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ؟ ـــــ مثلاً استکبار، خود بینی، تعیش، سفلہ پن اور ذوقِ حماقت کے مظاہرے، پھر قابلِ غور یہ بھی ہے کہ انسانی داستانِ درد و کرب کا بہت بڑا حصہ تو نتیجہ ہے۔ ہوسِ قوت و اقتدار کا! معاشی حالات کی تبدیلی سے یہ سارے محرکاتِ شر کیسے محو ہو جائیں گے۔

نفسیاتی نظریے کا بودا پن | بتایا جاتا ہے کہ علم النفس کی روشنی سے انسانی زندگی کے تاریک ماحول کو منور کیا جا سکتا ہے۔ جوڈ دریافت کرتا ہے کہ اگر علم النفس کوئی ایسی ہی معجزانہ قوت ہے۔ تو ذرا اس کے ماہرین ارشاد فرمائیں۔ کہ وہ جو دوسروں کی نفسیاتی الجھنیں حل کرتے پھرتے ہیں۔ جو دوسروں کی ذہنی صحت کی بحالی میں مصروف ہیں ان کا اپنا حال کیا ہے ؟ کیا وہ خود نفسیاتی الجھنوں سے پاک ہیں ؟ کیا ان کے ذہن احساسِ جرم اور احساسِ کمتری سے پاک تر ہیں ؟ کیا وہ اپنے متشددانہ رجحانات کو معاشرتی راستوں پر ڈالنے میں کامیاب ہوئے ہیں ؟ کیا وہ اپنے عام سادہ برادرانِ انسانیت سے [illegible] خالی ہیں۔ ذہنی [illegible] کے لحاظ سے بہتر ہیں ؟

- جب علم النفس کی کمل روشنی سا تھ رکھنے والے ینگ خود اپنی ذات کی محدود سی دنیا کو منور نہیں کر سکتے۔ تو وہ کسی دوسرے کا کیا بنائیں گے۔ کیا سنواریں گے۔ ہم جب کسی نیک آدمی سے ملتے ہیں تو ہم سب محسوس کرتے ہیں۔ کہ یہ نیک آدمی ہے۔ کیا نفسیات دانوں سے مل کر ایسا تاثر ہوتا ہے؟

جوڈ اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ میں نفسیاتی طریق اصلاح کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن انکار اس سے کرتا ہوں کہ عالم انسانی کے اخلاقی فساد کی کوئی اساسی توجیہ ان علوم سے مل سکتی ہے۔

اور سائنس ـــــ بہ حیثیت مجموعی - جوڈ پوری سائنس کو علم النفس کی سی پوزیشن پر رکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ عجیب مغالطہ اس دور کے لوگوں کو چمٹ گیا ہے۔ کہ سائنس مادہ ہی کو نہیں، زندگی کو بھی کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ زندگی کو بنا سنوار کر ایسے مرتبے تک لے جا سکتی ہے۔ کہ وہ شر کی دست رس سے بالاتر ہو جائے۔

لیکن باوجود اس کے کہ سائنس نے زندگی کو کئی بہت مفید خدمات انجام دی ہیں۔ زندگی کو بہ حیثیت مجموعی لیا جائے۔ تو انسان کا نصیبہ جتنا تاریک پہلے تھا اتنا ہی آج بھی ہے۔ مشینوں کی اس بھرمار کے باوجود اہل مغرب کی اکثریت ماضی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ مشقت کرتی ہے حد یہ کہ آج ہم اپنی عورتوں کو محنت کشی کے میدان میں جھونکنے کے بعد اس قابل ہوئے ہیں۔ کہ کرنے کے کام کر سکیں۔ دنیا کے اکثر حصوں میں سائنس انسانی دل و دماغ کو قید میں ڈالنے اور قید خانے کی کنجیاں وقت کی حکومت یا حکمران پارٹی یا کسی ڈکٹیٹر کے سپرد کرنے کی خدمات میں مصروف ہے مختصر یہ کہ سائنس نے ہماری تباہ کاری کی طاقت کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اور آئندہ جنگ کے ہاتھوں پورے تمدن کا صفایا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

سائنس بہر حال نصب العین نہیں، ذریعہ ہے۔ ذریعہ بجائے خود نہ برا ہوتا ہے۔ نہ اچھا۔ اچھے مقصد میں لگاؤ تو وہ اچھا ہو جاتا ہے اور برے مقصد میں استعمال کرو تو وہ برا ہو جاتا ہے۔ اب اگر انسانی نصب العین اور مقاصد اچھے ہوں۔ تو سائنس تمام تر خیر ہے۔ وہ برے ہوں تو سائنس تمام تر شر ہے سائنس نصب العین اور مقاصد کو بدلنے یا ان کو بہتر بنانے کے لحاظ سے بالکل ناکارہ ہے۔ سائنس انسانی مداخلتوں اور رجحانات کا رخ نہیں بدل سکتی۔

اس گفتگو کی وضاحت کے لئے جوڈ ایک مفروضہ سامنے رکھتا ہے۔ فرض کیجئے کہ سائنس اپنی حد کمال تک جا پہنچتی ہے، یعنی وہ براہ راست انسانی فطرت کے انضباط پر قادر ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کون اس انتہائی قوت کو استعمال کرے گا۔ اور کس کے مفاد کیلئے استعمال کرے گا۔؟ مثلاً اگر علم نسلیات (EUGENICS) کے بل پر انضباط تناسل کے ذریعے بہترین ساخت کو حاصل کرنا چاہیں، تو قطع نظر اس سے ـــ کہ اس میدان میں نتائج حوصلہ افزا نہیں ہیں ـــ آخر مطلوبہ ساخت کونسی ہو گی؟ کیا وہ جو حکومتوں کو پسند ہو۔ کیونکہ وہی تو زندگی کی آخری باگ ڈور تھامے ہوئے ہوتی ہیں۔ وہ تو ایسی ساخت کی نسل کو پسند کریں گی۔ جو اطاعت گزار اور فرماں بردار ہو۔

ضمناً اس مقام پر جوڈ نے تمدن مغرب کی ایک اور اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ یہ نسل کو بہتر بنانے کے لئے بالائی اور متوسط طبقوں میں برتھ کنٹرول کو رائج کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ اچھے معیار کے افراد کی تعداد سوسائٹی کی ضرورت سے کم پڑتی ہے۔ اور جسم و ذہن

کے لحاظ سے ناقص افراد کی کثیر تعداد سے سوسائٹی کے کل پرزے فراہم کئے جاتے ہیں۔ ایسی حالات ناممکن ہے۔ کہ انسانیت کا ذہن اور
اخلاقی معیار کسی مناسب حد پر قائم رکھا جائے۔

جوڈ کی رائے میں بعض بیماریوں کے ازالہ سے غلط نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے، ان کے خدا کو دوسری ویسی ہی شدید بیماریاں پیدا کر رہی ہیں
مثال کے طور پر سرطان چھوٹی آنتوں کے ناسور، دماغی شریانوں میں انجماد خون وغیرہ کی روز افزوں کرب انگیزی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ سائنس
نے عمروں میں طول پیدا کر دیا ہے لیکن زندگی کا بوجھ زوال پذیر جسموں پر آ پڑا ہے معاشرتی لحاظ سے ایسے بے کار افراد کی بہت بڑی تعداد کی
ذمہ داری سوسائٹی کے سر پڑتی ہے جنہیں ماضی کے تمدن خوشی رخصت کرنے پر تیار رہتے تھے۔

سائنس کی زریں خدمات کی افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ایک تو سائنس کی ہر ایجاد ایک دو دھاری تلوار ہے
دوسرے سائنس نے انسان کی قوت تو بڑھا دی لیکن اس کے ساتھ حکمت و اخلاق کے لحاظ سے مساویانہ ترقی نہ دے سکی۔

"ہے" اور "ہونا چاہیئے"! | خارجی شر سے گزر کر جب ہم عالم انسانی کے داخلی شر کی طرف آتے ہیں، جو عبارت ہے اخلاقی فساد سے تو
جو دو چار ہوتا ہے۔ کہ یہاں ہم مسئلہ کو ذرا گہرے غور و خوض سے لیں۔

جب یہ ہمیں تسلیم ہے کہ کچھ چیزیں اور ذہن کی حالتیں ایسی ہیں۔ جو مثبت طور پر موجب شر ہیں تو یہ تسلیم کرنا اس بات کی شعوری تحریک
بھی پیدا کرتا ہے۔ کہ فلاں چیزیں عمل میں نہ لائی جانی چاہئیں اور ذہن کی فلاں کیفیات کی روک تھام کر لی جانی چاہئے اور یہ "چاہیئے" اور "نہ چاہیئے"
کا شعور کانٹ کی تصریحات کے مطابق ہمارے اخلاقی مقام "اختیار" سے ہمیں آگاہ کرتا ہے۔ کسی ایسے معاملے میں یہ کہنا کہ "یوں ہونا چاہیئے"
جب کہ چار و ناچار صرف وہی کچھ آدمی کرنے پر مجبور ہو، یا یہ کہنا کہ "یوں نہیں کرنا چاہیئے" درآں حالیکہ انسان یوں کرنے پر سرے سے قادر
ہی نہ ہو، قطعاً بے معنی ہے۔ گویا انسان کا مقام خیر و شر کے دوراہے پر انتخاب و اختیار اور ارادہ و فیصلہ کا مقام ہوا۔

وہ کانٹ کے فکری نقش قدم پر اور آگے چلتا ہے۔ اور واضح کرتا ہے۔ کہ اخلاقی شعور کے حقائق کو ——— خصوصاً "ہے" اور
"چاہیئے" یا "فرض" اور "خواہش" کی کش مکش کو فطری استدلال کے ذریعے جانچا پرکھا اور سمجھا سمجھایا نہیں جا سکتا۔ مثلاً نفسیاتی جبریت کو ہم نظام
فطرت کے ایک شعبہ کی حیثیت سے لے کر اگر سوچیں تو انسانی ذہن کی کسی بھی حالت کے بارے میں تمام موثر عوامل کا جائزہ لے کر ہم یہ تو کہہ
سکتے ہیں۔ کہ "کیا ہے" اور یہ جو کچھ ہے۔ یہ کن اسباب کا جبری تقاضا ہے۔ لیکن ہم نفسیاتی جبریت کی روشنی میں اس "چاہیئے" کی کوئی توجیہ
نہیں کر سکتے۔ جو انسان کی روح اخلاقی کا ایک اظہار ہے۔ ہم یہ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ کوئی خواہش کسی خاص عالم میں آدمی کے اندر کن عوامل کے
تحت ابھرتی ہے۔ لیکن اس خواہش کے بالمقابل فرض کی جو پکار سنائی دیتی ہے اس کی ہم تعلیل نہیں کر سکتے۔ آدمی فطری قانون کے اندر یہ تو جان
سکتا ہے۔ کہ میں کیا ہوں۔ اور میں کیا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے اندر جب یہ حس ابھرتی ہے کہ مجھے کیا ہونا چاہیئے۔ اور مجھے کیا چاہنا چاہیئے۔ تو اس
کا مفہوم مجرد نظام فطرت اسے متعین کر کے نہیں دے سکتا۔

آدمی زندگی میں بہرحال اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ میں بر سر غلط ہوں، میں گناہ میں مبتلا ہوں، میں ٹیڑھی راہ پر جا رہا ہوں، میں
وہ کچھ نہیں ہوں۔ جو مجھے ہونا چاہیئے۔ وہ کچھ نہیں کر رہا جو مجھے کرنا چاہیئے۔ اور یہ کہ مجھے اپنی کردار کے اجزا کو درست کرنا چاہیئے۔ جن قوتوں کے

زیرِ اثر میں کام کر رہا ہوں ان کے خلاف کشمکش کرنی چاہیئے۔ یہ احساس جو شعور کو مجرد مادّی نظامِ فطرت کے ذریعے کیسے توجیہ پا سکتا ہے اُبھرتا ہے کہ ہماری زندگی میں بے شمار مواقع آتے ہیں کہ ہمارے اندر دوسروں کی مدد کرنے کا میلان اُبھر آتا ہے۔ اور یہ میلان تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے مفاد اور آرام کی قربانی دے کر دوسروں کے کام آئیں۔ فلسفہ چاہئیں تو پھر کیا یہاں اگر سہولت حل کے فطری تقاضے سے یہ میلان ٹکرانے نہیں لگتا۔ اس میلان میں نفسِ انسانی یہ اظہار نہیں کرتا کہ وہ کسی بات کی خواہش رکھتا ہے بلکہ یہ اظہار کرتا ہے کہ اس کا فرض کیا ہے۔ یہ اپنے ذاتی مفاد کے خلاف کچھ کرنے کا تقاضا اگر ایک حقیقت ہے تو پھر سوچنا چاہیئے کہ فطری سلسلۂ استدلال و تعلیل کی کوئی کڑی گم کر دی گئی ہے۔

فوق الفطری نظامِ حقیقت پس کوئی چارہ کار اس کے سوا نہیں کہ ان حقائق کی توجیہ ہم مادّی نظامِ فطرت سے ماوراء کسی اور نظام میں تلاش کریں۔ ماننا پڑے گا کہ کائنات کے فطری نظام سے اوپر ایک فوق الفطری نظام ہے۔ اس نظام کو مانے بغیر انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو کی کوئی توجیہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ فطری کائنات کی حقیقت کی توجیہ اس کائنات سے باہر ہی تلاش کی جا سکتی ہے اور اسی طرح زندگی کے اخلاقی تقاضوں کو کسی حقیقتِ ماوراء کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے

طبیعی و فطری علم و حکمت کے ذریعے ہم زندگی کے بارے میں یہ تو جان سکتے ہیں کہ وہ جو جو حرکات کرتی ہے 'کیسے' کرتی ہے مثلاً ایک چیتا کیسے اپنے شکار کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے۔ لیکن یہ کسی طرح نہیں سمجھا سکتے کہ کوئی جاندار 'کیوں' اپنی فطرت کے کسی خواہشاتی تقاضے کے خلاف عمل کرتا ہے، مثلاً ایک آدمی 'کیوں' اپنی ایک واضح اور دباؤ ڈالنے والی خواہش کے خلاف احساسِ فرض کے تحت کشمکش کرتا ہے اور 'کیوں' وہ "چاہیئے" کی اہمیت کو تسلیم کر کے حیوانی فطرت کی ایک کھلی پکار کو مسترد کر دیتا ہے۔ فوق الفطری نظام کی ضرورت کا یہ احساس یہاں مذہب کے دروازے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب نے اخلاقی تقاضے کو اہمیت دی ہے اور اس کی توضیح حقیقت کے فوق الفطری تصور سے کی ہے۔

جوڈ کا نقطۂ نظر شر کے متعلق عیسائی رنگ میں یہ ہے کہ:

ا۔ آدمی اپنی حیاتِ ارضی میں بہت بڑی اور مسلسل مسرت حاصل نہیں کر سکتا۔

ب۔ اس کی فطرت بعض اجزاء کے لحاظ سے مستقلاً شر آمیز ہے

ج۔ لہٰذا مسئلۂ شر اس زندگی میں کلی طور پر علاج پذیر نہیں ہو سکتا۔

اس نقطہ کو وہ عیسائیت اور قدیم یونانی تصورِ مذہب پر استوار کرتا ہے۔ یونانی مذہب کی ایک مرکزی تعلیم یہ تھی کہ انسان جونہی کسی حد تک خوشی یا کامیابی میں ایک حد سے آگے بڑھتا ہے تو دیوتا بگڑ جاتے ہیں۔ اور اس جسارت کی سزا دیتے ہیں۔ اور عیسائیت کی تعلیم کا خلاصہ وہ یوں سامنے لاتا ہے کہ آدمی گناہ میں پیدا ہوا۔ یہ دنیا آنسوؤں اور مصیبتوں کی دنیا ہے۔ ہم خدا کی مدد کے بغیر کوئی بھلائی نہیں کر سکتے۔ اس تعلیم اور مستقل خوشی کا حصول ناممکن ہے اور جو کچھ تھوڑا بہت ہمیں ملے اس کے لئے شکر گزار ہونا چاہیئے۔ یہ تعجب ہے ہم آدم کا بیٹا اس وجہ سے ہے کہ آدمی فطرت میں برائی لے کر آیا ہے اور فطری برائی کی وجہ سے وہ پوری طرح اچھا نہیں بن سکتا۔

واضح ہے کہ یہ احساس عیسائی تخیل میں خود جبلی ہے۔ اور یہ طبیعیاتی ذہین آدمی جب الحاد کی گرد و گرد سے الگ ہو کر پلٹتا ہے تو اس تخیل کو جوں کا توں قبول نہیں کر دیتا ہے لیکن وہ اپنے فلسفیانہ ذہن کے ذریعے اس تخیل میں سے ایک بہتر تصور اخذ کر لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دراصل یہ زندگی تربیت اور تیاری کی زندگی ہے جس میں ہم بہتر بننے کا درس لے سکتے ہیں۔ اور سبق اور تربیت حاصل کرنے کا ذریعہ ارضی زندگی کی صعوبتیں اور اذیتیں ہیں۔ ہم نہ یہاں بہت زیادہ مسرت حاصل کر سکتے ہیں، نہ بہت زیادہ نیک بن سکتے ہیں۔ جوڈ کی رائے میں یہ تصور زندگی کے حقائق کو زیادہ اچھی طرح اپنے دامن میں سمیٹتا ہے۔ اس کے ذریعے یہ شعور حاصل ہوتا ہے۔ کہ اس زندگی کی کوششوں اور سرگرمیوں کے لئے کچھ جبری سرحدیں مقرر ہیں۔ اور ہمیں ان سرحدوں کے اندر ہی تگ و دو کرنی ہے۔

جوڈ بیان کرتا ہے کہ جب میں نوعمر تھا تو اپنے معاصرانہ انداز پر یہ سوچا کرتا تھا۔ کہ دنیا کو اپنی خواہشات کے مطابق کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اب جب آنکھیں کھلی ہیں۔ تو اس کے برعکس اس فکر میں ہوں۔ کہ خدا کی اس دنیا کے مطابق کیسے میں اپنی خواہشوں کو بدلوں۔ وہ عیسائیت کو اسی مہم میں بطور رہنما ساتھ لیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ۱۹۱۴ء سے پہلے کی ہماری رجائیت پسند نسل انسانی فطرت کا ایک غلط تصور لے کر ابھری اور بری طرح ناکام رہی۔

”اصحاب الشمال“ ([illegible]) کی بنائی ہوئی سیاسی و عقلی فلسفے کی فضا میں ”بہبود انسانی“ اور [illegible] کے نظریے سے سخت درجے کی بغاوت کرتے ہوئے ذہنی زندگی کے عجیب و غریب رجائی نقشے باندھتے تھے۔ لیکن یہ نقشے بار بار تباہ ہوئے اور اصحاب الشمال کی رجائیت کو بار بار منہ کی کھانی پڑی۔ ایک مستقل نامرادی کا سامنا تھا۔ نامرادی! — عوام کے معقولیت اختیار کرنے سے انکار کے سبب، عقلیت کے مقابلے میں [illegible] کی بالادستی کے سبب، حقیقی سوشلزم کے عدم ظہور کے سبب، قوموں اور سیاسی لیڈروں کے طرز عمل کے سبب، عوام میں پہلے سے زیادہ مالی فوائد کی قدر افزائی کے سبب، اور جنگ کے بار بار کے ظہور کے سبب!!

اور اب — جوڈ آپ کے سامنے بیان کرتا ہے — کہ عقل پرستانہ رجائیت کے خواب چکنا چور ہو چکے ہیں۔ وہ ایک بے بوٹ کا پودا تھا۔ جو ہوا کے چند جھونکوں میں اکھڑ گیا۔ پس میں نے اس سارے سرمایہ فکر و خیال کا ٹاٹ لپیٹ دیا اور نتیجہ یہ کہ اب میں ایک عیسائی ہوں!

بقیہ: یاران حلقہ

ان کے لئے بہتر سے بہتر فضا اور ان کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کیجئے۔ جو چیزیں شعر و ادب کے ترقی کرنے کے لئے ضروری ہیں وہ پیدا کر دیجئے۔ اور جو وجوہ و اسباب اس سلسلے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ان کا ازالہ کر دیجئے۔ فکر ادبی تحریک کی کیجئے، نہ کہ افراد کی!

کوثر نیازی

جمہوریہ اسلامیہ کی پہلی عید

ہلالِ عید! سوادِ وطن میں جھانک کے دیکھ
کہ ارضِ پاک میں ہے کن مسرتوں کا ہجوم
زباں پہ عظمتِ باری کا ذکر جاری ہے
دلوں میں عزمِ نوی کے چمک رہے ہیں نجوم

ہر ایک ذرہ میں تاباں ہیں سینکڑوں خورشید
ہر ایک رہگذر ہے تمثیل کاہکشاں
بلند و پست گلے مل گئے محبت سے
خوشا یہ اوجِ مقدر خوشا یہ بختِ جواں

یہ دینِ حق کے محافظ، یہ عظمتوں کے امیں
یہ جن کے چہروں سے ایمان کا جلال عیاں
بڑے خلوص سے تجھ کو سلام کہتے ہیں
دعا کو ہاتھ اٹھائے ہوئے یہ پیر و جواں

دعا کو ہاتھ اٹھائے ہوئے یہ پیر و جواں
جو تیری دید کو سو التزام سے آئے
یہ چاہتے ہیں کہ دستور کے نفاذ کے بعد
یہ پہلی عید بڑے اہتمام سے آئے

رواں دواں ہوں پئے منزلِ رضائے خدا
نہ یاس ہی کی تھکن ہو نہ خطرۂ رہزن
سرودِ عظمتِ رفتہ کی یاد تازہ ہو
نفس نفس ہو دمِ نغمۂ نشاطِ کہن

ہلالِ عید! سوادِ وطن میں جھانک کے دیکھ
کہ ارضِ پاک میں ہے کن مسرتوں کا ہجوم
زباں پہ عظمتِ باری کا ذکر جاری ہے
دلوں میں عزمِ نوی کے چمک رہے ہیں نجوم

رباعیات و قطعات

"عصمت" میں تامل نہ کشمکش ہے شراب
عقبیٰ کا تصور ہے نہ پروائے عذاب
مانوس دف و چنگ ہے فریادِ ضمیر
ظالم کی حکومت کا زمانہ ہے "شباب"

شاہ عارفی

حاصل نہیں ترجیح تصور کو عمل پر
طے کیجے منزل نہ خیالات کے بل پر
خوش فہمی اندیشہ فردا کی بدولت
[illegible]

اے۔ایم۔عبدالقسطلانی صدیق

اے ملّتِ ابرار!

آزاد ہے ملت مگر افراد گرفتار
آزادیٔ گفتار نہ آزادیٔ کردار
سینے میں تو دم ہے نہیں لیکن دلِ بیدار
وہ ہمتِ پیکار نہ وہ جذبۂ ایثار
اے ملتِ ابرار

کیوں جوہرِ ایماں نہیں وہ تجھ میں مسلمان
خاموش ترے بحر کے کیوں ہو گئے طوفان
آئینۂ کردار میں خود کو کبھی پہچان
خالی ہو عمل سے تو وہ اقرار بھی انکار
اے ملتِ ابرار

جس ہیبت و قوت سے لرزتا تھا زمانہ
تیری وہ حقیقت ہوئی یونہی فسانہ
دنیا ترے مٹنے کا تراشیگی بہانہ
ہر چند ابھرتے گئے ہیں اب تک ترے آثار
اے ملتِ ابرار

اٹھتے نہیں صد حیف مسافر کے قدم تیز
رہزن سے کے چھکتے ہیں الگ دشنۂ خوں ریز
ہے راہبروں ہی میں بلا کو کوئی چنگیز
اے وائے ترا قافلہ و قافلہ سالار
اے ملتِ ابرار

کیوں غیر کی ناداں تو کرتا ہے گدائی
بخشی تھی حرم نے کبھی تجھ کو وہ خدائی
دنیا تو یہ دنیا ہے فلک تک تھی رسائی
اے فاتحِ عالم وہ تری کیا ہوئی تلوار
اے ملتِ ابرار

پوشیدہ تری خاک میں اب بھی ہیں شرارے
جذبات میں بہتے ہیں ترے آگ کے دھارے
اے آتشِ پُرسوز سمجھ میرے اشارے
جس آگ میں شعلے نہ ہوں وہ آگ ہے بیکار
اے ملتِ ابرار

تو سر بکف اے غازیٔ جانباز اتر جا
تلوار کی حاجت نہیں بے تیغ و سپر جا
نمرود کی آتش سے خلیلانہ گزر جا
بن جائیگی تیرے لئے آتش گل و گلزار
اے ملتِ ابرار

اختر احمد قاضی

محبِ وطن

براؤننگ سے معذرت کے ساتھ

آج سے ایک برس پہلے یہیں میں گزرا تھا — انہی پرپیچ ضیا پاش گزرگاہوں سے
اور لوگوں نے عقیدت کا کیا تھا اظہار — میرے رتبہ کو بڑھایا تھا شہنشاہوں سے

چار اطراف نظر آتا تھا لوگوں کا ہجوم — مسکراتی ہوئی گلیاں تھیں کہ ہنستے در و بام
میری ہر بات تھی ہم پلۂ قرآن و حدیث — میرے ہاتھوں میں تھی بیدار زمانے کی زمام

سر کٹاتا تھا میرے ایک اشارے پہ جہاں — میری گفتار کا انداز حکیمانہ تھا!!
باعثِ فخر تھا ملت کے لئے میرا وجود — اتنا اونچا مرے معیار کا پیمانہ تھا!

لیکن افسوس کہ اک سال ابھی گزرا ہے — پابجولاں مجھے لائے ہیں انہی راہوں پہ
آج کوئی نہیں جو ہار گلے میں ڈالے — آج امیدیں امنگیں ہیں مری خاک بسر

میں نے چاہا تھا جبینوں کی سیاہی دھلتی — مرے افکار نے انساں کا ہیولیٰ ڈھالا
لیکن افسوس کسی کام نہ آیا یہ خلوص — تاہم کوزہ دہن پیماں کا پرتو ڈالا

کل تلک میرے اشاروں پہ تھے یہ رقص کناں
آج مجھ کو لئے جاتے ہیں جو سوئے مقتل!!
مطمئن ہوں کہ مجھے میرا صلہ دے گا خدا
نہ مری روح ہے زخمی نہ مرا دل گھائل



کیفی جام پوری

مردِ مومن

اک نڈر ملاح جو طوفان میں — اپنی کشتی بے خطر کھیتا رہے
اک جری جو سایۂ شمشیر میں — زندہ رہنے کا سبق دیتا رہے

جس کے اخلاق و خصائل دہر میں — اجلے اجلے ہوں ستاروں کی طرح
صرصرِ جور و حوادث میں مدام — لہلہاتے سبزہ زاروں کی طرح

جس کا بے پردا تبسم دیکھ کر — جھینپ جائیں وقت کی ناسازیاں
گردشِ چشمِ حیا آلود سے — جو کرے تقدیر کی غمازیاں

جس کے ڈر سے ظلم کا سر خم رہے — جس کے بل پر عدل ہو گردن فراز
روبروئے حق سراپا بندگی! — اور بندوں کے لئے بندہ نواز

بزمِ گل میں بے نیازِ رنگ و بو — اور کانٹوں کے لئے پیکِ بہار
اجڑے اجڑے جھونپڑوں کی روشنی — اونچی اونچی بارگاہوں کا وقار

دو تصویریں

محبوب خاں نصرت

میرے محبوب! ذرا دیکھ یہ تصویر تو دیکھ!

دامنِ نقش میں طوفان لئے آتی ہے
دل کو تڑپانے کا سامان لئے آتی ہے
کچھ مچلتے ہوئے ارمان لئے آتی ہے

میرے محبوب! ذرا دیکھ یہ تصویر تو دیکھ!

اس میں کچھ لوگ ہیں مایوس و پریشاں مجبور
جن کے سینے ہیں فقط رنج و الم سے معمور
ان میں نے گرمیٔ افکار ہے نے عقل و شعور

اور وہ بھی ہیں جنہیں صاحبِ ثروت کہئے
وہ جنہیں دامنِ آدم کی کثافت کہئے
وہ جنہیں سینۂ گیتی کی غلاظت کہئے

میں نے مانا کہ یہ تصویر نہیں دل کا قرار
پھر بھی اے دوست! یہ تصویر ہے اپنا شہکار
میرے ذوقِ تخیل کی قسم! بس اک بار

میرے محبوب! ذرا دیکھ! یہ تصویر تو دیکھ!!

ثاقب انور

معذرت

میرے خوابوں کے حسیں شیش محل میں آ کر
مجھ کو شرمندۂ الطاف کیا ہے تو نے
پھر بھی اے جانِ چمن جانِ بہار
تجھ کو کیوں کر مرے ویران کھنڈر یاد پڑے
میری ہستی یونہی محبوسِ شبِ تار رہی
میں نے تاروں کی حسیں چھاؤں میں دن کاٹ لئے
میں نے تاریک فضاؤں کا جگر چیر دیا
میں نے انجم اجیالا اتنی کئی صبحیں دیکھیں
جن میں رقصاں ہے مری فطرتِ سادہ کی عروس
جن میں رقصاں مرے خوابوں کی حسیں تعبیریں
میری محبوب بتا ایسے اندھیروں کے عوض
میری خودداروفا تیرے سویرے لے گی؟
تیری صبحوں سے مجھے خون کی بو آتی ہے
تیری نصرت مجھے دیتی ہے تشدد کا پتا
تیرے مغموم سویروں کے حسیں شعلوں میں
میرے افلاس کا خاشاک جلے گا لیکن
میری محبوب! میری روح جھلس جائیگی
میری ہمدم! میرے جلتے ہوئے پھولوں کی نسیم!
مجھ کو ظلمات کی آغوش میں کھو جانے دے
تاکہ ظلمت کا ابھی اور جگر چیر سکوں
میرے [illegible]
[illegible]
[illegible]
تجھ کو [illegible]

ٹیگور — ترجمہ: میاں فدا القادر

تحفہ

میرے لال!
میں تجھے ایک تحفہ دینا چاہتی ہوں
اس لئے کہ ہماری زندگی تو وقت کے دریا میں بہتی ہی چلی جا رہی ہے۔
ہم جدا ہو کر بہت دور چلے جائیں گے۔
ہماری محبت بھلا دی جائے گی
لیکن: میں اتنی بے وقوف نہیں کہ ان چھوٹے موٹے تحفوں کے بدلے
تمہارا دل موہ لینے کی اُمید رکھوں
تم نے جوانی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے
تمہاری زندگی کی راہیں نہایت طویل ہیں
جب ہم اپنی محبت تم پر نچھاور کرتے ہیں تو تم محبت کا جام ایک ہی سانس میں خالی کر دیتے ہو
اور منہ موڑ کر ہم سے دور چلے جاتے ہو
ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں
تم ہمیں یاد نہیں کرتے تو اس میں تو کوئی ہرج نہیں
کیوں کہ تم اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کھیل ہی میں تو مصروف رہتے ہو
اور ہم؟ ہم تو اب بوڑھے ہو چکے ہیں
فراغت ہی فراغت رہتی ہے
اسی لئے تو ہم ماضی کے ایک ایک لمحہ کو یاد کرتے ہیں
ان قیمتی لمحات کو اپنے دل سے لگائے بیٹھے ہیں
جنہیں خود ہی اپنے ہاتھوں کھو چکے ہیں
جو کبھی بھی واپس لوٹ کر نہیں آئیں گے
دریا شور کرتا گیت گاتا اپنی مستی میں سرشار تیزی سے بہتا ہی رہتا ہے
مشکلات کی حدوں کو پھلانگتا رواں دواں ہی رہتا ہے
لیکن پہاڑ؟
پہاڑ اپنی جگہ پہ قائم ہی رہتا ہے
اُسے کچھ بھولی بسری کہانیاں ہی یاد آتی ہیں
لیکن اس کی محبت
اس کی [illegible] جاتی ہے

نیرنگِ تاریخ

اسلم [illegible]

تاریخ انسان کی اجتماعی فطرت کا آئینہ ہے۔ تاریخ انسانی زندگی کے تمام معاشرتی [illegible] روایات کے تحفظ کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ تاریخ آدمی کی قوت حافظہ کا شاہکار ہے۔ اگر یہ کہا جائے [illegible] تو غلط نہ ہوگا [illegible] نہ ہوتا تو شاید انسان افضل المخلوقات نہ ہوتا کیونکہ اس کی ساری ذہنی اور جسمانی فتوحات اسی قوت حافظہ کی مرہون منت ہیں۔ اگر یہ غیر معمولی قوت اس کو ودیعت نہ کی گئی ہوتی تو انسان "حیوان ناطق" بھی نہ ہو سکتا تھا بلکہ دوسرے جانوروں کی طرح حیوان صامت ہی رہتا۔ انسان پچھلی باتوں کو یاد رکھ کر اور ان یادوں کو بنیاد بنا کر آگے بڑھتا ہے اور اسی بنیاد پر [illegible] مستقبل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری دنیا میں جتنی ترقیاں ہوئی ہیں وہ پچھلی باتوں کو حافظہ میں محفوظ رکھنے کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ اگر انسان ماضی کو بالکل فراموش کر دے تو مستقبل میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہمارا ماضی ایک زینہ ہے جو ہمیں [illegible] بلندیوں تک پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔ اسی ماضی کی یاد کو تاریخ کا نام دیا گیا ہے۔ تاریخ انسان کی کامرانیوں اور ناکامیوں کی ایک یادداشت ہے۔ اس یادداشت سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کہاں کہاں اور کب کب ہم سے لغزشیں ہوئیں اور ان لغزشوں کے اسباب کیا تھے۔ یہ یادداشت ہمیں اس بات کا موقع فراہم کرتی ہے کہ ہم ان گزشتہ غلطیوں سے اپنے قدموں کو محفوظ رکھ سکیں [illegible] اور ان آفتوں میں محفوظ رہ جائیں جن سے ہم نے اپنی مشکلات سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیابی سے مدد حاصل کی تاکہ ہماری آنے والی نسلیں بھی اگر چاہیں تو ان غلطیوں سے دامن بچا کر نکل جائیں اور ہمارے تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں انہیں مدد مل سکے۔ اس طرح اسلاف کے نقش قدم اخلاف کے لئے راہنما کا کام دیتے ہیں اور وہ آسانی سے کم سے کم وقت میں منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انہیں ان پر خطر راستوں سے نہیں گزرنا پڑتا جس کو ان کے اسلاف [illegible] کیا خوب کہا ہے [illegible] کا قول ہے کہ وہ ذاتی تجربے سے ہی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں! [illegible] پسند کرتا ہوں۔

میں ترجیحاً دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھانا [illegible] تاریخ کا علم [illegible] زندگی کے تمام پہلوؤں پر [illegible] اثر انداز ہوتا ہے [illegible] اسی برس کی عمر پا کر فخریہ کہتے ہیں [illegible] تاریخ کا [illegible] مطالعہ [illegible] ایک قسم کی ہم آہنگی اور تسلسل [illegible] پہلے فاتح کا [illegible]

ہے اور کسی گذشتہ وقوع کی تکمیل کرتا ہے۔ اسی طرح ہر واقعہ کسی خاص سبب کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے یہاں کے ہر کام کے لئے جہاں آفریں نے کوئی نہ کوئی سبب مقرر کر دیا ہے۔ یہ علت و معلول کا فطری اصول آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا۔ یوں بعض ایسے واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں جن کا بظاہر کوئی سبب نظر نہیں آتا لیکن یہ معمولات نہیں مستثنیات ہوتے ہیں۔ اول تو خداوند تعالیٰ معمول کے خلاف کام کرنے سے عاجز نہیں پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے حادثے کا کوئی سبب فی الواقع موجود ہو اور ہماری عقل کی گرفت سے باہر ہو۔ اس لئے مافوق الادراک حادثات کا وقوع بھی محال نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ہمیں ان پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے ان پر گفتگو کرنا تحصیل حاصل ہوگا۔ ہم انہیں معاملات پر غور و خوض کریں جو ہمارے ادراک کی گرفت آ سکتے ہوں۔

تاریخ کو ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیئے "عالم تاریخ کے واقعات انسان کی اجتماعی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انسانی فطرت کے قوانین کا ہمیں صحیح علم ہو تو تاریخی واقعات کی توجیہہ صحیح طریقے سے کر سکتے ہیں۔ اور اگر انسانی فطرت کی خصوصیات کے متعلق ہمارے تصورات غلط یا ناقص ہوں تو ہم اجتماعی واقعات اور تاریخی انقلابات کی جو توجیہہ کریں گے وہ بھی اسی درجہ میں ناقص اور غلط ہوگی۔ چنانچہ انسان کی اجتماعی فطرت کے بارے میں جس قوم کا تصور حقیقت سے جتنا قریب ہوتا ہے واقعات کے اسباب و نتائج پر اس کی نظر بھی اتنی ہی صحیح ہوتی ہے اور اسی درجہ میں اس کو یہ قدرت بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اجتماعی افعال کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح کرے۔ اس طرح تاریخی انقلاب کا تار و پود قوموں کے اجتماعی اعمال سے بنتا ہے اور ان اعمال کا دارومدار اس پر ہے کہ قوم کا فکر حقیقت ٹھیک ہو۔ انسان کی اجتماعی فطرت کے بارے میں وہ صحیح نقطۂ نظر اختیار کرے"۔ لہ

تاریخ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کے مطابق ہمارے سامنے توجیہہ کائنات پیش کرے۔ انسان کی پیدائش ہی کی تاریخ مقرر نہ کرے بلکہ اس کی آفرینش کا مقصد بھی بتائے۔ اس کے پیدا کرنے والے کو متعین کرکے اس کا رشتہ انسان کے ساتھ واضح کرے۔ انسان نے درجہ بدرجہ تہذیب و تمدن میں جو ترقیاں کی ہیں یا انسانی معاشرت میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ان کو محفوظ کرلے۔ مختلف واقعات سے جو معاشرتی سیاسی۔ لسانی۔ ثقافتی اور مذہبی نتائج مترتب ہوتے ہیں ان کو مختلف شعبوں میں درجہ بدرجہ تقسیم کرے۔ اقوام کی مختلف ادوار کی اخلاقی حالت کا تجزیہ کرے۔ اخلاق کے اتار چڑھاؤ اور اخلاقی اقدار کی تبدیلیوں سے جو اثرات اقوام و افراد کی زندگیوں پر پڑے ہوں ان کو واضح کرے۔ مختلف ادوار کے طرزِ معیشت۔ طرزِ حکومت اور طرزِ معاشرت کا صحیح نقشہ پیش کرے۔ مختلف اقوام کی فتوحات کا ذکر کرے اور ان کے صحیح واقعات کو محفوظ رکھے۔ مختلف زمانوں کا طریقۂ جنگ، اقسام اسلحہ، صلح کے اصول وغیرہ کی ایک مفصل یادداشت پیش کرے۔ طریقۂ جنگ میں جو مختلف زمانوں میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ان کو بتائے۔ مختصر یہ کہ تاریخ تقریباً ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ ایسے ہمہ گیر علم کی صحت میں اگر خیانت آمیزش اور غلط بیانی کو دخل دے دیا جائے تو میرے خیال سے اس سے زیادہ قومی یا بین الاقوامی جرم کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اب جبکہ دنیا بین الاقوامیت کے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ تاریخ میں کسی قسم کی آمیزش

ناقابلِ برداشت ہے۔ آج کے دور میں تاریخ قومی نہیں رہی بلکہ بین الاقوامی ہو گئی ہے۔

تاریخ کا ایک اہم ترین فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ گذشتہ واقعات کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کا ایک مستقل فلسفہ تیار کرے۔ وہ بتائے کہ قومیں کس طرح عظمت و وقار کے میدان میں آگے بڑھتی ہیں اور کس طرح پسماندگی و اضمحلال پستی کی بلندیوں سے نیچے پھینک دی جاتی ہیں۔ یہ کیونکر ہوتا ہے کہ کبھی ایک قوم ابھر جاتی ہے اور کبھی دوسری۔ کیا یہ اہم اور انقلابی تبدیلیاں محض حوادثات اور اتفاقات کی بنا پر رونما ہوتی ہیں۔ یا بعض معاشی اور اخلاقی حالات کی بنا پر یہ تحولات رونما آتے ہیں۔ کیا ان انقلابات و تحولات کو کسی تدبیر سے یا گذشتہ تجربات کی روشنی میں متاثر کیا جا سکتا ہے یا اس معاملے میں انسان مجبورِ محض اور بے بس تماشائی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی تحقیقات کا میدان یہ بھی ہے کہ آیا جو ایک تہذیب ایک دفعہ دنیا میں پیدا ہو کر پھل پھول چکی ہو اور کچھ مدت کے بعد انحطاط پذیر ہو گئی ہو وہ پھر کبھی اقوام یا افراد کی مساعی سے واپس آ سکتی ہے یا نہیں یعنی مختصراً یہ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے یا نہیں۔ یا کبھی دہرا سکتی ہے یا نہیں۔ یہ مسائل تاریخ کے بڑے اہم مسائل ہیں۔ ان کے اثرات انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بڑے دور رس ہیں۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ایک تہذیب واپس آ سکتی ہے یا یہ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگر تاریخ میں کوئی دور انسانیت کے لئے درخشاں گذر چکا ہے تو انسانی مساعی اس طرف لگائی جائیں گی اور حالات کو اس کے لئے ساز گار بنانے کی کوشش کی جائے گی کہ اس دور کو مکمل طریقے سے یا نامکمل طور پر واپس لیا جائے۔ اور اس تصور کی بنا پر انسان حتی المقدور اس بات پر آمادہ ہو سکتا ہے کہ اپنی ساری قوتیں اس دورِ تاباں کو واپس لانے کے لئے صرف کر دے خواہ اس جدوجہد میں اسے اپنی جان کی بازی لگانی پڑے۔ لیکن اگر اس کے برخلاف یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جو گذر چکا سو گذر چکا۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان اپنے ماضی کی طرف سے مایوس ہو جائے گا اور اپنی پہلی فرصت میں ماضی سے رشتہ توڑ لینے کی فکر کرے گا۔ ماضی کی زندگی کی تمام قدروں کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ خواہ یہ قدریں انسانی معاشرت میں کتنی ہی بنیادی اہمیت کیوں نہ رکھتی ہوں۔ مثلاً ایک دور تھا کہ مذہبی خیالات اور زندگی کی مذہبی قدروں کا دنیا بھر میں دور دورہ تھا لیکن آہستہ آہستہ مذہبی قدروں کو اور مذہب کی پیدا کردہ اخلاقی قدروں کو زوال ہونا شروع ہوا اور ابھی وہ زوال پذیر ہیں۔ لیکن بعض لوگ اس بات کی کاوش کر رہے ہیں کہ زندگی کی مذہبی قدروں کو پھر اجاگر کیا جائے اور ان کو دوبارہ زندگی کے مختلف شعبوں میں جاری و ساری کیا جائے۔ کیونکہ بے پناہ مادی ترقی کے باوجود دنیا ذہنی و قلبی طور پر سخت بیقرار ہے اور بڑی تیزی سے مکمل تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی اس تیز گامی کو مذہبی تصورات اور پرانی اخلاقی قدریں ہی روک سکتی ہیں۔ لیکن یہ حضرات اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیں کہ تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی تو وہ یقیناً اپنی تمام مساعی اور کاوشات کو ترک کر دیں گے۔ اور ہماری زندگی اسی طرح بے لگام منہ زور گھوڑے کی طرح تباہی کی طرف تیزی سے دوڑتی چلی جائے گی لیکن اگر یہ حضرات اس نظریئے کو اپنا لیں کہ ہم تاریخ کو پھر واپس لا سکتے ہیں تو ان کی ہمتیں بلند اور حوصلے قوی ہو جائیں گے اور وہ بڑے سکونِ قلب کے ساتھ اور روحانی طمانیت کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کوشش کرتے رہیں گے۔

تاریخ کی مختصر سی تعریف کر دینے کے بعد غالباً یہ بے جا نہ ہوگا کہ اس کا بھی تذکرہ کر دیا جائے کہ یہ کس طرح وجود میں آئی اور کس طرح ارتقاء پذیر ہوا گویا علم تاریخ کی تاریخ بیان کر دی جائے۔ علم تاریخ کی سرگذشت بیان کرنا بھی تاریخ کا ایک اہم فرض ہے اس لئے یہ چیز ہمارے مرتبہ

سے خارج نہیں ہے۔

تحریر کی ایجاد سے بہت پہلے انسان نے کسی ایسی چیز کی ضرورت محسوس کی جس کے ذریعے سے وہ اپنے فرصت کے اوقات خوشی سے گزار سکے اور جب وہ کسی دشمن سے نبرد آزما ہو تو وہ اس کے جوش و غضب کو ابھارنے کا کام دے۔ اس ضرورت کو ان اشعار نے پورا کر دیا جو کہ بہادری کے قصے بیان کرنے کے لیے موزوں کیے گئے۔ اس قسم کے قصے تمام دنیا کی وحشی اقوام میں پائے گئے ہیں اور آج بھی جہاں تہذیب و تمدن کی روشنی نہیں پہنچی وہاں یہ چیز بڑی اہمیت اور ہر دلعزیزی کے ساتھ موجود ہے یہ اشعار ہر قبیلے اور قوم کا ایک مخصوص گروہ یاد رکھتا ہے اور مخصوص لہجوں میں خاص خاص مواقع پر ان کو گا کر سناتا ہے۔ یہ گروہ قبیلے کی تمام روایات کو بزرگوں کے حسب و نسب کو یاد رکھتا ہے، حتیٰ کہ ان کی سرداری کے جانشینوں اور شکاری زمینوں تک کے خاندانی جھگڑے کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے اور ضرورت کے وقت سینے سے باہر اگل دیتا ہے۔ یہی لوگ قوم کے ہر دلعزیز شاعر و ماہر انساب اور قابل اعتماد مورخ ہوتے ہیں۔ ان کو قبیلے کے تمام جھگڑوں میں حکم بنایا جاتا ہے۔ ان کے متعلق یہ مشہور ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی قوتوں کے حامل ہیں۔ اور یہ کہ خدا یا کسی دیوی دیوتا سے ان کا براہ راست تعلق ہے اور وہ انہیں دیوتاؤں کے حکم کے مطابق گفتگو اور عمل کرتے ہیں۔ ان کا حافظہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ ان سے غلطی کا بہت کم امکان ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ جب اس قسم کے وحشی قبائل میں تمدن کی روشنی پھیلتی ہے تو لکھنے کا فن ایجاد ہو جاتا ہے اور پھر بجائے زبانی یاد رکھنے کے تاریخ کو کاغذ پر لکھ کر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اور عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تاریخ کو غلطی اور اتلاف سے بچا لیا گیا ہے۔ حالانکہ بہت سے لوگ اس اصول سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کسی قوم کی تاریخ اس وقت تک زیادہ صحیح رہتی ہے جب تک کہ وہ سینوں میں محفوظ ہے اور جب وہ سینوں سے کاغذ پر منتقل ہو گئے تو اس میں بہت سی کمزوریاں اور خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ بحث بڑی دلچسپ سی ہے اس لیے اسے ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے تو غالباً گراں نہ گزرے گی۔

سب سے پہلی دلیل جو اکثر مورخین نے اس سلسلے میں دی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر قوموں نے اپنی مذہبی کہانیوں کے متعلق بڑی بے احتیاطی سے کام لیا ہے اور ان کی بجائے بعض مستشرقین نے ایسے ایسے افسانے گھڑ کر تاریخی کتابوں میں درج کر دیے ہیں جو محض کہانیوں کے طور پر بھی قبول نہیں کیے جا سکتے۔ [illegible] بعض نے ذاتی مفاد کے خیال سے ان خیالی بلکہ مذہبی باتوں کو تاریخ کا درجہ دے دیا اور مقصد کی پاکیزگی کا سہارا لے کر جھوٹ کو سچ بنا دیا اور ان کو خوب مشہور کیا۔ اس جھوٹ کو مذہبی راہنماؤں کی تصدیق اور تائید حاصل ہو جانے کی وجہ سے کسی کو اس پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ جن ممالک میں ہزاروں برس سے ایک ہی مذہب کا دور دورہ رہا۔ وہاں تو اس قسم کی غلطیوں کا امکان بہت کم ہے لیکن جن ممالک میں مذہب کی تبدیلیاں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں وہاں کی تاریخ میں اکثر اس قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

دوسرا سبب تاریخی غلطیوں کا یہ ہو جاتا ہے کہ [illegible] تاریخی کتابیں لکھی جاتی ہیں [illegible] حضرت آدم کے [illegible] سے شروع کیا [illegible] بعض لوگوں نے حضرت آدم تک تو پہنچنے کی کوشش [illegible]

[illegible] وقت سے قائم ہے کہ جو [illegible] منصب خیال کیا گیا تھا [illegible] تاریخی [illegible] کتابیں [illegible] پڑیں اور تاریخ میں
واقعات کی حیثیت سے شامل ہو گئیں۔

بہت سی فرضی کہانیاں تاریخی [illegible] خیر یہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں انہیں تو جانے دیجئے اب خود اپنے زمانے کی تاریخ سازی اور تاریخ نویسی کی آنکھوں
دیکھی داستان [illegible] سنانا چاہتا ہوں کہ آپ کو یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ لوگ جنہوں نے صدیوں
سے ہماری قومی اور ملی تاریخ لکھنے کا فرض سنبھال رکھا ہے وہ اپنی تاریخ کس طرح بناتے ہیں۔ اور پھر [illegible]
یہ لوگ ہماری تاریخ لکھنے بیٹھے انہوں نے کیا کیا گل نہ کھلائے ہوں گے اور ہماری زندگی کے ہر ہر پہلو کو کس طرح اپنے مفاد کے مطابق متاثر
کیا ہوگا۔ پھر میں ان سطور میں ان لوگوں کو بھی مخاطب کر رہا ہوں جو کہ مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو دیانت اور امانت کا کامل ترین
نمونہ سمجھتے ہیں اور ان مغربی مورخوں نے ہمارے آباؤ اجداد کے متعلق جو کچھ لکھ دیا ہے اس کو پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں اور اس سے سر مو تجاوز
کرنا نہیں چاہتے۔ پھر میں اس طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ ہمارے اسلاف کی لکھی ہوئی تاریخوں کو مستند ماننے سے گریز کرتے
ہیں اور ان چند لوگوں کی دیانت پر شبہ کرتے ہیں جنہیں بہر حال ان حضرات سے زیادہ خدا کا خوف تھا۔ حد یہ ہے کہ صحابہ و تابعین کے بیان کئے
ہوئے واقعات کو احادیث کے مجموعوں کو اسماء الرجال کو ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں وہ بھی ذرا مہذب ترین ملک کی مغربی تاریخ سازی
اور تاریخ نویسی کے دیانت دارانہ فن پر ذرا نظر ڈالیں اور پھر ذرا ٹھنڈے دل سے موجودہ تاریخ کا ہمارے اسلاف کی لکھی ہوئی تاریخوں سے
مقابلہ فرمائیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور ہر چیز کی صحیح قیمت متعین ہو کر نظروں کے سامنے آ جائے گی۔ پھر
دیانت داری سے جو فیصلہ کیا جائے گا صحیح ہوگا۔

ایک جرمن جنرل [illegible] اپنے ذاتی جنگی تجربات کی بنا پر لکھتا ہے: میں نے اپنی پہلی زندگی میں پہلی مرتبہ تاریخ کو بنتے ہوئے قریب سے
دیکھا ہے اور اب میں سمجھ گیا ہوں کہ اصلی تاریخ اس تاریخ سے بہت مختلف ہوتی ہے جو بعد میں آنے والی نسلوں کے سامنے پیش کی
جاتی ہے۔ اس کے بعد میں ایک اور کتاب سے اقتباس پیش کروں گا تاکہ آپ کو موجودہ تاریخ سازی کا زیادہ واضح اندازہ ہو جائے
[illegible] خوش قسمتی ہے کہ میں نے بہت قریب سے تاریخ کو بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ تجربے نے مجھے یہ بتایا ہے کہ تاریخ بالکل مصنوعی ہوتی ہے۔
میں اس ضمن میں ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی مثال پیش کر سکتا ہوں۔ اس وقت حکومت نے جنگ کی یادداشت سرکاری طور پر لکھنا شروع کر
دی تھی۔ مجھے اس کام کے بیس سالہ تجربے نے بتایا ہے کہ سرکاری قسم کی تاریخیں بالکل اساطیر الاولین یا فرضی قصے کہانیوں کا درجہ رکھتی ہیں۔
ان تاریخوں کی تیاری کے وقت بہت سے دستاویزات اس لئے جلا ڈالے جاتے ہیں تاکہ کسی کمانڈر کی شہرت میں فرق نہ آئے اگر [illegible]
تو اس معاملہ میں [illegible] دستاویزات کی تاریخیں بدل دی گئیں۔ لیکن فرانسیسی اس معاملے میں زیادہ تیز نکلے۔ ایک فرانسیسی کمانڈر [illegible]
شہرت اور ساکھ [illegible] اس طرح بچا لیا تھا کہ وہ ان حالات کے لئے احکام جاری کرتا جو در حقیقت کبھی واقع ہی نہیں ہوئے [illegible]
[illegible] جو کسی بھی کسی پر نہ کئے ہوتے اس طرح ہر شخص کی [illegible] میں [illegible]
[illegible] مجھے اس زمانے میں تعجب ہوتا تھا کہ [illegible]

تیار کرنے میں صرف کر رہے ہیں تاکہ اصلی جنگ میں۔*

جرمن قوم نے تو اس معاملے میں بالکل حد ہی کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے قانونِ فوجداری میں جو کہ ۱۹۳۹ء میں تیار ہوا تھا یہ واضح طور پر درج کر دیا تھا کہ وہ واقعات جو جرمنی کی عزت و وقار کے لئے ضرر رساں ہوں تاریخوں میں ہرگز بیان نہ کئے جائیں خواہ بالکل ٹھیک ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اگر کوئی شخص اس قسم کے حالات تاریخ میں بیان کرے تو اسے قید با مشقت کی سزا دی جائے۔ اس غلط قسم کی تاریخ سازی کے خلاف موجودہ دور کے مشہور فلسفی اور ادیب رسل نے بھی اپنی بعض تحریروں میں سخت احتجاج کیا ہے اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ مغربی ممالک کے چوٹی کے لوگ اپنی تاریخ نویسی کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔** تاریخ ہر ملک میں اس طرح سے پیش کی جاتی ہے جس سے اس ملک کے وقار میں اضافہ ہو۔ بچوں کو تاریخ میں پڑھایا جاتا ہے کہ ان کے ملک نے کبھی کسی معاملے میں غلط راستہ اختیار نہیں کیا۔ اور ان کے ملک کو ہر معرکے میں فتح حاصل ہوتی ہے۔ کبھی شکست سے واسطہ نہیں پڑا۔ دنیا میں جتنے چوٹی کے لوگ پیدا ہوئے ہیں وہ ان کے اپنے ملک میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ غرضیکہ ہر لحاظ سے ان کا وطن دنیا کے دوسرے ممالک پر فوقیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر واٹرلو کی لڑائی کو لیجئے۔ اس لڑائی کے واقعات انگلستان، فرانس اور جرمنی میں بالکل مختلف حالات کے تحت پڑھائے جاتے ہیں۔ ایک انگریز بچے کو یہ بتایا جائے گا کہ پرشیا والوں نے اس جنگ میں کوئی کارنمایاں نہیں کیا بلکہ لارڈ ویلنگٹن لڑائی کو جیت چکا تھا اس وقت جنرل بلوشر میدانِ جنگ میں پہنچا ہے اس نے لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس کے خلاف ایک جرمن بچے کو تاریخ میں یہ بتایا جائے گا کہ لارڈ ویلنگٹن کو بالکل شکست ہو چکی تھی اور نپولین جیت چکا تھا۔ جنرل بلوشر نے جا کر میدان جنگ کا نقشہ بالکل بدل دیا۔ اور نتیجہ کے طور پر نپولین کو زبردست شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔*

اب آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ لوگ وطن پرستی کے جذبے سے مغلوب ہو کر تاریخ پر کس قدر ظلم کرتے ہیں۔ اور یہ اندازہ بھی ہو گیا ہوگا کہ جو تاریخی کتابیں آئندہ اس جذبے کے تحت لکھی جائیں گی وہ کس حد تک قابلِ اعتماد اور مستند ہو سکتی ہیں۔ اور آپ نے یہ اندازہ بھی لگا لیا ہوگا کہ ان وطن پرست حضرات نے جو اپنے دشمن مسلمانوں کی تاریخیں لکھی ہوں گی ان میں کس حد تک آمیزش کا امکان ہوگا۔ اور ان ہندوؤں نے جو مسلمانوں کی معاشرت، مذہب، سیاست اور ثقافت وغیرہ کا نقشہ کھینچا ہے وہ کس قدر قابلِ اعتماد ہوگا اور اس میں کس حد تک حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہوگا۔ تاریخ کو وطنی تعصبات کا شکار بنا دینا ایک بین الاقوامی جرم بھی ہے اور قومی بھی۔ اس غلط قسم کی تاریخ نویسی کی وجہ سے دوسری قومیں ہمیں غلط انداز میں سمجھ سکتی ہیں اور ہمارے ساتھ سلوک کرنے میں انہیں بڑی حد تک غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کی ملت فریبی ہمیں خود اندرونی طور پر بہت بڑے نقصانات اور مصائب کا شکار بنا سکتی ہے مثلاً ناروا خود ستائی سے ہمارے اندر ایک غلط قسم کی خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے اور اگر کسی وقت حالات کی ناسازگاری اور زمانے کی نامساعدت کی وجہ سے ہمیں شکست کا منہ دیکھنا پڑے تو ہم اس کو برداشت نہ کر سکیں گے اور ہمارے قویٰ ایسے صدمے سے فوراً مضمحل اور شل ہو کر رہ جائیں گے۔ ہم کسی

---

* WHY WE DON'T LEARN FROM HISTORY — By LIDEL HART.

PRINCIPLES OF SOCIAL RECONSTRUCTION — P. 144

متوقع مصیبت کا ہمت سے مقابلہ کر سکیں گے۔

دوسرا بڑا نقصان اس قسم کی خود فریبی سے یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی قوت کا غلط اندازہ کر کے اور دوسرے ملکوں کی طاقت کا درست اندازہ نہ کر کے اس کے خلاف جارحانہ اقدام کی طرف مائل ہو سکتے ہیں اور اس قسم کا غلط اقدام ہماری ملی اور وطنی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ کس قدر غیر ذمہ دارانہ اور طفلانہ حرکت ہے کہ ہم سیاہ کو سفید کہیں اور پھر مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کہ سیاہی دور ہو گئی اور سفیدی چھا گئی۔ حالانکہ سیاہی اسی طرح اپنی جگہ مسلط ہو۔ کیا ہماری غلط بیانی سے حقائق میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم اگر رات کو دن کہنے لگیں تو رات تو اپنی جگہ رات ہی رہے گی لیکن ہم اس کو دن سمجھ کر عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگیں گے کہیں ٹھوکر کھائیں گے کسی سے ٹکرائیں گے۔ کچھ دوسری چیزوں کو توڑیں گے کچھ اپنا جسم لہولہان کریں گے۔ غرضکہ ایک تماشا بن جائے گا۔ اور ایسی حالت میں دماغی توازن قائم رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا اور اس طرح دماغی توازن تباہ کرنے والی مثال ہٹلر کی جرمنی نے آپ کے سامنے پیش کر دی ہے جرمن کا اجتماعی توازن دماغی ضائع کرنے والی سب سے بڑی چیز ان کی یہ غلط قسم کی خود ستائی ہی تھی۔ ان کے خیال میں جرمن قوم دنیا کی تمام اقوام سے اعلیٰ وارفع تھی۔ اور وہ تمام دنیا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ آج آپ نے بزعم خود بین الاقوامی حاکم قوم کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور آئندہ کے لئے بھی ایسی خود فریب اور عالم فریب اقوام کے لئے اس قسم کے نتائج مقدر ہو چکے ہیں اگر ہم چیزوں کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں حقائق کو صحیح روشنی میں دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے اور ہر انسان کو فرد کی حیثیت سے اور ہر قوم کو قوم کی حیثیت سے ہر چیز کا صحیح اندازہ کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے قومی اور بین الاقوامی معاملات میں صحیح فیصلے کر سکے اور ہر مسئلہ کو درست پس منظر میں دیکھ سکے۔

تاریخ میں غلطیاں داخل ہونے کا ایک اور راستہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ اپنی تنظیموں کے متعلق کسی قسم کی مخالف تنقید و تبصرہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اسی طرح وہ اپنی معاشرتی اعتقادی۔ سیاسی۔ ادبی روایات کے خلاف بھی کچھ سننا پسند نہیں کرتے اس وجہ سے تاریخ نویس وقتی معلومات کے دباؤ سے مجبور ہو کر بہت سے حقائق پر پردہ ڈالنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے یا پھر کم از کم ان حقائق کو ان رواج یافتہ معلومات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ بعض روایات کو اس قدر مقدس سمجھتے ہیں کہ ان پر تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔ تاریخ کو حقیقت سے دور لے جانے میں سب سے زیادہ اہمیت ان لوگوں کو حاصل ہے جو تاریخ کو قومیت اور وطنیت کے زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں وہ ہر غلطی کو قومیت اور وطنیت کے نام پر صرف برداشت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کو رواج دینے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ وطنیت کے بت کی پہلے مغربی ممالک میں پرستش شروع ہوئی اور اب یہ مشرقی ممالک میں بھی پوری طرح مسلط ہو گئی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال مرحوم کو گھبرا کے کہنا پڑا کہ "ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے" میں یہاں ایران کے ایک فاضل ڈاکٹر رضا زادہ شفق کے ایک مضمون "تعصب مذہب است" سے چند سطور کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ اس کے مطالعے سے آپ بہ آسانی اندازہ کر لیں گے کہ مشرق کے ایک نسبتاً پسماندہ ملک میں وطنی تعصب کا کیا عالم ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون میں اپنے مخاطب کی اس بات کی شکایت کر رہے ہیں کہ یہ لوگ وطن کے متعلق کسی ایسی تحقیقی بات کو بھی سننا گوارا نہیں کرتے جس کو تاریخی طور پر ثابت کر دیا گیا

ہر ملکی [illegible] کی کمی کمزوری کی شکایت بھی ہوتی ہے۔ ہماری قلمی دنیا میں ایسے [illegible] کی فضا ہونی چاہئے کہ اگر کوئی شخص [illegible] تحقیقات کرے [illegible]
اس قسم کے نتائج پیش کر رہے ہیں [illegible] ہماری [illegible] ثابت ہوتا ہے اور دوسری اقوام کا [illegible]
پڑھیں اور گالیاں دینا شروع نہ کر دیں۔

بعض اوقات متعدد لوگوں کی انداز ہی سے تاریخ میں غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں [illegible] کہ ان کے اعمال [illegible] جائے [illegible] وہ اپنی زندگی کے کمزور پہلوؤں اور ان کے اثرات کو آنے والی نسلوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ [illegible] کا سب سے ذکر ہی نہ کیا جائے اور اگر ذکر آئے تو [illegible] کر کے پیش کیا جائے۔ یہ لوگ ہر طرح سے تاریخ [illegible] کی کوشش کرتے ہیں چونکہ تمام ذرائع وسائل ان کے قبضہ قدرت میں ہوتے ہیں اس لئے [illegible] اپنا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ [illegible] اپنے اعمال کی حمایت میں [illegible] کوشش کرتے ہیں اور [illegible] کے بعد میں آنے والے [illegible] کوشش کرتے ہیں [illegible] ہیں کہ تاریخ اظہار حقیقت کا نام ہے نہ کہ [illegible] اور قیاس آرائی کا۔ فقط

بقیہ [illegible]

میں تم تنہا نہیں ہو گے [illegible] شیطان بھی ساتھی [illegible] اچھا ہوشیار۔ مگر میرے پاس [illegible]
[illegible] ہوتا ہے [illegible]
[illegible] پھر اس کمرے میں خاموشی چھا جاتی ہے [illegible]

نمبر ۲ - خدا کی پناہ، یہ آج کے انسان کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت [illegible] اب تو ان کے اور شیطان کے ملک میں رتی برابر فرق بھی محسوس نہیں ہوتا۔

نمبر ۱ - بیشک شیطان مردود کا طریقہ یہی تو ہے کہ وہ [illegible]

نمبر ۲ - [illegible]

نمبر ۱ - [illegible]

نمبر ۲ - [illegible]

رسمی باتیں

علی سفیان آفاقی

کچھ دن ہوئے میں ایک صاحب کے پاس ملنے کے لئے گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک ہفتے سے بیمار پڑے ہیں۔ سخت بخار ہے۔ گردوں میں پتھری پیدا ہو گئی ہے۔ آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں۔ دانتوں میں پائیوریا کی شکایت ہے۔ آنتوں میں چکناہٹ کم ہو گئی ہے۔ معدہ اپنا فعل اچھی طرح سرانجام نہیں دیتا۔ سر میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ بھوک بالکل نہیں لگتی۔ کچھ کھاتے ہیں تو ہضم نہیں ہوتا۔ پیتے ہیں تو جی متلانے لگتا ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ مگر جب سوتے ہیں تو نقاہت کے باعث گھنٹوں سوتے رہتے ہیں۔ غرض ان کی بیماریوں کی تفصیل اتنی درد ناک تھی کہ ان کے مکان پہنچ کر جب ملازم اندر خبر کرنے گیا تو جی میں آئی کہ الٹے پیروں واپس بھاگ جاؤں۔ ایسے نیم مردہ آدمی کو دیکھنے سے نہ دیکھنا بہتر ہے۔ ابھی میں بھاگنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اندر طلبی ہوئی۔ کشاں کشاں اندر پہنچے۔ ایک بستر پہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ قریب پہنچ کر حسب ذیل مکالمہ ہوا۔

السلام علیکم۔

وعلیکم السلام

(ڈرتے ڈرتے) کہئے۔ مزاج شریف؟

(خندہ پیشانی سے) خدا کا فضل اور آپ کی دعا ہے۔

(رک رک کر) طبیعت اب کیسی ہے؟

آپ کی مہربانی ہے۔

گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟

(مسکرا کر) بس بزرگوں کی دعا ہے۔

ان ابتدائی باتوں کے بعد انہوں نے اپنی بیماریوں کی تفصیل بتائی۔ معلوم ہوا بیک وقت چھ سات وبائی امراض میں گرفتار ہیں۔ دفتر میں بیوی کو ہیضہ ہو گیا تھا۔ بچے کے دانت نکل رہے ہیں اس لئے بیمار ہے۔ ملازم کوئی نہیں تھا۔ ہوٹل سے کھانا آتا ہے۔ قرضہ کا بوجھ بے انتہا ہو چکا ہے۔ مکان کی چھتیں بارش میں ٹپکتی ہیں اور ہر دم دھڑکا رہتا ہے کہ کہیں پورا مکان ہی نہ زمین پر آن رہے۔ غرض مصائب کا ایک طویل سلسلہ تھا جو ان پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ابھی یہ ذکر جاری ہی تھا کہ ایک اور ملنے والے تشریف لے آئے۔

علیک سلیک کے بعد انہوں نے پوچھا "مزاج کیسا ہے"۔ جواب ملا "بس آپ کی دعا ہے"۔

آج بھی یہ گفتگو یاد آتی ہے تو مجھے ان حضرات کی وضعداری پہ حیرت ہوتی ہے جو مستقل مزاجی سے رسمی باتیں جیت کی روایت نبھاتے ہیں۔ حالات کتنے ہی نازک کیوں نہ ہوں مزاج پوچھے جانے کے جواب میں یہ کہنا چاہئے ہاں آداب مجلس میں داخل ہو چکا ہے کہ آپ کی دعا سے سب

ٹھیک ہے۔ میں نے ایسے وضعدار بزرگ بھی دیکھے ہیں جو حکیموں کے پاس علاج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ اور جب وہ پوچھتے ہیں کہ مزاج کیسا ہے تو خواہ طبیعت دم ہی کیوں نہ ہو، پہلی بار مسکرا کر یہی کہتے ہیں کہ آپ کی دعا ہے۔ دعا کا یہ تصور نہ جانے کس طرح رائج ہو گیا!

رسمی گفتگو اور آداب محفل بعض اوقات خاصے مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتے ہیں لیکن لوگوں کی وضعداری دیکھئے کہ ان رسمی باتوں کا دامن کسی طرح ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ دو آدمیوں کی ملاقات میں عام طور پر اس قسم کا مکالمہ سننے میں آتا ہے۔

السلام علیکم

وعلیکم السلام

کہئے خیریت؟

آپ کی دعا ہے!

اور سنائیے کیا حال ہے؟

مہربانی ہے آپ کی۔

اس کے بعد چند لمحے کے لئے وقفہ ہوتا ہے اور ملنے والے دوبارہ مسکرا کر دریافت کرتے ہیں۔

"اور پھر کیا حال چال ہے؟"

"جی۔ بس مہربانی ہے۔"

(وقفہ۔ کچھ دیر بعد) "اچھا تو اور سنائیے پھر!"

"بس آپ کی مہربانی ہے۔"

: اور سب تو خیریت سے ہے نا!

جی ہاں، مہربانی۔ کرم۔

اچھا تو پھر اجازت دیجئے۔

خدا حافظ۔

خدا حافظ۔

جاتے جاتے ایک صاحب اچانک رک جاتے ہیں جیسے کوئی بہت ضروری بات یاد آ گئی ہو۔ اور نہایت سنجیدگی اور خلوص سے ہاتھ اٹھا کر دریافت کرتے ہیں "اور تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

دوسرے صاحب چند لمحے سوچ کر جواب دیتے ہیں "جی ہاں، نوازش کرم۔"

اس بے معنی ملاقات اور گفتگو کا میں آج تک کوئی مطلب نہ سمجھ سکا۔

رسمی گفتگو اس وقت سخت تکلیف دہ صورت اختیار کر لیتی ہے جب ملنے والوں کی آپس میں بے تکلفی نہ ہو اور صرف رسمی ملاقات ہو۔ پچھلے دنوں ایک ایسے ہی بزرگ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ نہایت تپاک سے ملے اور ایک سانس میں [illegible] تک پہنچ گئے۔

"اور سنایئے کیا حال چال ہے" جواب دیا "جی۔ خدا کا شکر ہے"۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے نا" نہایت سرپرستانہ انداز میں اس طرح پوچھا جیسے اگر ٹھیک ٹھاک نہیں ہے تو ابھی ٹھیک ٹھاک کر دیں گے۔

جواب دیا "بالکل خدا کا فضل ہے"۔

"ذرا ایک منٹ کی اجازت چاہتا ہوں" اور یہ کہہ کر وہ کام میں مصروف ہو گئے۔ نصف گھنٹہ بعد اچانک انہیں احساس ہوا کہ میں ان کی خاموشی سے شاید بیزار ہو رہا ہوں چنانچہ انہوں نے قلم میز پر رکھ دیا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر بولے "اور سنایئے پھر؟"

جی بس کوئی خاص بات نہیں،

اور (ادھر ادھر دیکھ کر) ۔۔۔ تو سب خیریت ہے نا؟

جی۔ خدا کا شکر ہے۔

اس کے بعد چند منٹ سناٹا رہا۔ میں نے ان سے اجازت طلب کی۔ وہ شاید اسی کے منتظر تھے لیکن منہ سے بولے "اچھا۔ تو پھر چلے؟"

"جی ہاں"۔۔۔

وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے مصافحہ کیا اور ہاتھ کو گرمجوشی سے دبا کر بولے "اور تو سب (سب پر زور دے کر) خیریت ہے نا؟"

اب بتایئے میں اس کا کیا جواب دیتا؟

اخلاق کے کچھ اور پہلو بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ نہایت ضروری کام کر رہے ہیں۔ ہر منٹ آپ کے لئے انتہائی قیمتی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ بالکل یکسوئی سے کام کرتے رہیں۔ اچانک ایک ملاقاتی آ دھمکتے ہیں۔ اور پرشور انداز میں علیک سلیک کرنے کے بعد دریافت کرتے ہیں "معاف کیجئے گا۔ میں مخل تو نہیں ہوا آپ کے کام میں؟" جی چاہتا ہے کہا جائے کہ یقیناً آپ نے مخل پیدا کیا ہے مجھے لیکن آپ خندہ پیشانی سے رسمی طور پر کہتے ہیں "جی نہیں۔ میں تو بس ایسے ہی کچھ کام کر رہا تھا"۔

انہیں یقیناً علم ہے کہ آپ نے یہ بات ازراہِ تکلف کہی ہے لیکن وہ اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں چنانچہ نہایت بے تکلفی سے بیٹھ جاتے ہیں سگریٹ جلاتے ہیں اور ادھر اُدھر کی فضول باتیں شروع کر دیتے ہیں۔

ایک گھنٹے بعد وہ رخصت ہوتے ہیں اور مسکرا کر نہایت خلوص سے کہتے ہیں "معاف کیجئے۔ میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا"۔ اس وقت آپ کو جواب دینا چاہئے کہ بیشک آپ نے میرا بہت وقت ضائع کیا لیکن آپ وانت پیس کر ازراہِ تکلف کہتے ہیں:۔

"جی نہیں۔ بالکل نہیں۔ بلکہ آپ کا وقت میں نے بے کار ضائع کیا"

وہ مسکراتے ہوئے چل دیتے ہیں اور آپ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

ایک یہ بات بھی رسمیات میں داخل ہو چکی ہے کہ ملنے والے سے مسکرا کر کہا جائے کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ خواہ آپ ان سے مل کر ذہنی اذیت میں کیوں نہ مبتلا ہو گئے ہوں۔

تکلفات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہر بات "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو" سے شروع کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سننے والے کو سخت اعتراض ہے لیکن رسمی گفتگو کے آداب اسے مجبور کر رہے ہیں کہ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جائے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری

ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ بعد دریافت کیا جاتا رہے۔ "دیکھئے میں آپ پر بار تو نہیں ہو گیا، میں آپ کا وقت ضائع تو نہیں کر رہا۔" دوسرا آدمی خواہ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ کر رہا ہو خندہ پیشانی سے مسکرا کر یہی کہے گا "ابی آپ بھی کمال کرتے ہیں آپ کی موجودگی تو میرے لئے عین راحت ہے"۔ راحت کے لفظ کا اتنا غلط استعمال بھی بہت کم ہو سکتا ہے۔

جو لوگ رسمی باتوں کے عادی ہوتے ہیں وہ ایک خود بخود چلنے والی مشین کی طرح رسمی جملے بولتے رہتے ہیں۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ چابی سے بولنے والے کھلونے ہیں۔ رسمی تکلفات کے یہ حضرات اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ ناٹک کے ایکٹر کی طرح وہ کوئی بات کہتے وقت چہرے پر مناسب تاثر بھی پیدا نہیں کر سکتے اور نہ یہ ضروری سمجھتے ہیں۔ مثلاً آپ سے مل کر وہ خندہ پیشانی سے کہیں گے "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" لیکن ساتھ ہی ایسے خشمگیں انداز سے گھوریں گے جیسے بس چلے تو کچا ہی چبا جائیں آپ کو۔ آپ سے وہ محض اخلاقاً کہیں گے "اتنے دن آپ کہاں رہے۔ کئی ہفتے بعد ملاقات ہوئی ہے۔"

آپ جواب میں اپنی غیر حاضری کی تفصیل پیش کریں گے تو وہ اس گفتگو کو سننے کی ضرورت سے بے نیاز ہو کر کوئی اور سوال کر دیں گے۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ سن کر وہ فرمائیں گے "بہت افسوس ناک بات سنائی یہ تو آپ نے"۔

یہ جملہ کہتے ہوئے وہ کسی اور کی بات پر فلک شگاف قہقہہ لگائیں گے اور اپنے افسوس کا اظہار محض لفظی طور پر کر کے مطمئن ہو جائیں گے۔

پوری گفتگو کے دوران میں ان کا چہرہ ریڈیو سیٹ کی طرح سپاٹ اور غیر مؤثر رہے گا جو ہر قسم کا پروگرام سناتا ہے لیکن چہرہ پر کوئی تاثر پیدا نہیں کر سکتا۔

اس مشینی دور نے انسانوں کو بھی مشینی بنا دیا ہے۔

بعض الفاظ عموماً ایسے موقعوں پر بولے جاتے ہیں جو اپنے الٹے مطلب ادا کرتے ہیں مثلاً آپ کسی شخص کے پاس کسی ضروری کام سے جاتے ہیں۔ وہ آپ کا کام کرنے سے قاصر ہے چنانچہ معذوری کا اظہار کر دیتا ہے۔ کچھ دیر وہ انتظار کرتا ہے کہ آپ چلے جائیں، جب آپ کسی طرح ٹس سے مس نہیں ہوتے تو وہ نہایت خشک منہ بنا کر کہتا ہے "—— اور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"؟ ایسے موقعوں پر اس جملے کا مطلب عموماً یہ ہوتا ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اب آپ چلتے پھرتے نظر آئیے۔

کتبِ سماوی پر ایک نظر

جن کتابوں کو منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ ہے، وہ حقیقت میں منزل من اللہ ہیں بھی یا نہیں۔ اور اگر ہیں تو کیا آج بھی وہ اپنی اصلی اور ابتدائی صورت میں محفوظ ہیں؟

مولانا سید [illegible] شاہ صاحب نے اس موضوع پر ایک علمی و تحقیقی مقالہ لکھا تھا جو ماہنامہ ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ جسے بعد میں ایک صاحب نے کتابی صورت میں شائع کیا تھا اس عمدہ کتاب کے چند نسخے ہمارے پاس موجود ہیں۔ اہلِ علم کے مطالعہ کی چیز ہے۔ [illegible] صفحات ۱۰۰۔ قیمت [illegible]

[illegible]

علامہ شبلی کے کارناموں کا ایک جائزہ

عبدالکریم عابد

[ہماری ذہنی و فکری تاریخِ ارتقا میں علامہ شبلی کی شخصیت کا مقام بہت ہی اہم ہے۔ ذیل کا معلومات افزا مقالہ اسی گراں قدر شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ مقالہ نگار کے اندر جو مقصدی جذبہ کام کر رہا ہے اس سے دلی ہمدردی رکھنے کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کی ہر کڑی فکر یا ان کی مختلف ناقدانہ آرا سے متفق بھی ہوں۔ البتہ ہم ان کے لئے علمی دائرے میں آزادیِ رائے کا حق بہرحال تسلیم کرتے ہیں۔ ـــ ادارہ]

موجودہ دور میں جن لوگوں نے ہندوستانی مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں، ان میں علامہ شبلی نعمانی کی ذات کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ بلاشبہ ان سے پیشتر سرسید نے مذہبی، تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی اصلاح کی تحریک شروع کی تھی، مگر چونکہ بنیادی طور پر ان کا طرزِ فکر غلط تھا۔ لہٰذا ان کی سعیِ اصلاح کا نتیجہ فقط اتنا رہا کہ مذہبی و تہذیبی اعتبار سے آزاد خیالوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا، مگر یہ مذہبی و معاشرتی آزاد خیالی ایسی تھی کہ جس کی بنیاد ٹھوس حقائق پر نہیں تعمیر ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس آزاد خیالی نے ایک طرح کی حرکتِ معکوس کر کے سیاسی رجعت پسندی کے مسلک کو اختیار کیا، اور بحیثیت مجموعی یہ حریتِ فکر مسلم معاشرہ میں فراخیِ اعتماد کی پیدا کر کے برطانوی استعمار کے آگے گھٹنوں کے بل جھکے رہنے کا درس دیتی رہی۔

سرسید کی اس تحریک کے مقابلہ میں علامہ شبلی کی جدوجہد کا انداز و طریقہ بالکل دوسرا تھا۔ انہوں نے نہ صرف اسلامی تاریخ، قرآن، حدیث، فقہ، تصوف وغیرہ اسلامی علوم کو باقاعدہ سیکھا تھا، بلکہ پروفیسر آرنلڈ، سرسید اور ہندوستان کے دوسرے خاص حد تک آزاد خیال لوگوں کی صحبت میں رہ کر جدید یورپ سے بھی واقفیت پیدا کی تھی۔ اور پھر مصر سے لے کر قسطنطنیہ تک کی سرزمین کو خوب اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ اور خوب سوچ سمجھ کر موجودہ حالات و مسائل کے اثرات و نتائج کو جانچنے کی کوشش کی۔ ـــــ ان کو شبلی نظر یہ لاحق تھی کہ جدید افکار کا ربط اور علوم اسلامیہ سے ناواقفیت کہیں مستقبل کے ہندوستانی مسلمان کو مذہب و دین سے بیگانہ نہ کر دے۔ ان کی نگاہوں نے اندازہ قائم کر لیا تھا کہ آج مختلف مذہبی فتنوں کی عام حمل طرح طرح سے رکھی جاری ہے۔ اور کل کو ان فتنوں کا قتل پھیل کر معاشرہ میں جڑ پکڑنا لازمی ہے۔ لہٰذا ان کے مقابلے کے لئے یہ وقت [illegible] ہو گئے اور ایک عظیم لٹریچر [illegible] کے محققین میں ہمارے لئے رہنما ہے۔

مثلاً وہ دیکھ رہے تھے کہ دشمنانِ اسلام ہندوستان کے مسلم سماج میں رسالت کے مقام کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے سازشوں میں معروف ہیں۔ اور ان سازشوں کا نتیجہ آئندہ چل کر فتنۂ انکارِ حدیث اور فتنۂ انکارِ ختم نبوت وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ علامہ شبلی کو اس حقیقت کا خوب احساس تھا کہ قرآن مجید کو محمد صلعم کی رسالت و نبوت کے ساتھ مربوط کئے بغیر سمجھنے کی کوشش محض بے کار ہی نہیں، بلکہ مضر اور تباہ کن بھی ہے ——— یورپ میں ہر سال ہزاروں آدمی قرآن مجید کا ترجمہ پڑھتے ہیں۔ اور ان پر نہ صرف یہ کہ اسلام کی سچائی واضح نہیں ہوتی۔ بلکہ غلط فہمیوں، شکوک، شبہات اور اختلافات میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے سرکار دو عالم کی ذات اقدس اور رسالت پناہ کی حیثیت ایک کلید کی سی ہے۔ جن لوگوں کے پاس یہ کنجی نہ ہو وہ قرآن کا قفل ہرگز نہیں کھول سکتے۔ یورپ اور دوسری غیر مسلم دنیا کے جن مفکروں نے قرآن کی صداقت کا اعلان کیا۔ وہ بھی اس کی صداقت کے قائل سیرتِ محمدی کے مطالعہ کی وجہ سے ہوئے ورنہ "صرف قرآن مجید رسول کریم کی الحکمۃ اور اسوۂ حسنہ کے بغیر ناقابل فہم تھا ——— شبلی نے دیکھا کہ رسالت کو ہر کلاسے اور خطوطِ رسالت کا مقام دیکھ چند لوگ قرآن کی غیر محمدی تفسیر اور من مانی شرح کرنا چاہتے ہیں۔ اور حالات کے ساتھ ساتھ یہ ناپاک کوشش زور پکڑ رہی ہے۔ لہٰذا انہوں نے سیرت النبی کی مجلدات کی تصنیف کا پروگرام بنایا تاکہ جدید نسل کے ذہن و دماغ پر حضور کی سیرت کا نقشہ واضح طور سے جم جائے اور وہ کسی ایسی تفسیر کو قبول نہ کریں جو اس نقشہ کے خلاف ہو۔ یہ احساس اتنا قوی تھا۔ کہ مرتے وقت ان کی زبان سے آخری لفظ سیرت کا نکلا۔

سیرت النبی :۔ موجودہ دور کا مسلم نوجوان علامہ شبلی اور سلیمان ندوی کے احسان کو ہرگز فراموش نہیں کرے گا۔ اگر یہ سیرت النبی نہ ہوتی تو حضور کی سوانح کے متعلق ہمارے پاس صرف وہ کتابیں تھیں جو آج کل کہیں کہیں میلاد کے جلسوں میں نثر یا نظم کی صورت میں پڑھی جاتی ہیں۔ اور جس میں حضرت آمنہ کے بطن سے لے کر وقت وصال کے معجزات کا بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ معجزات ہماری نئی نسل کے لئے ہرگز حجت ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ اور سیرت پر یہ کتابیں دیکھ کر لوگ ان کے ہمنوا ہو جاتے "صرف قرآن کافی ہے" کا نعرہ لگا کر مطالعہ سیرت کے علم کو بے کار اور باعثِ تضیع اوقات قرار دیتے ہیں۔ مگر سیرت النبی کی اشاعت نے قوم میں حضور کے حالات کو جاننے، سمجھنے، پڑھنے اور سمجھانے کا ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ اور اس کی بدولت دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں میں ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے نے بڑی حد تک حضور کی سیرت اور سنت سے اچھا خاصا تعارف حاصل کر لیا۔ اس طرح وہ فتنہ جو قرآن کو رسالت کے [illegible] سے الگ کر کے دیکھنے کی خیالی تعلیم پر مبنی ہے اس طبقے سے زیادہ پھیل نہیں سکا۔ سیرت النبی کی ابتداء میں انہوں نے مسلمانوں کے فنِ روایت پر بھی ایک باقاعدہ تاریخ لکھی ہے۔ اور بتایا ہے کہ تاریخ و اخبار کی دنیا میں سب سے زیادہ معتبر چیز [illegible]

اسلامی تاریخ :۔ علامہ شبلی [illegible] صحابہ کرام، خلافت راشدہ [illegible] اسلامی تاریخ کے بعد اسلامی تاریخ [illegible]

تھا۔ انگریز حکمران چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کی تاریخ سے نفرت کرنا سکھایا جائے۔ لیکن یہ کوششیں علامہ شبلی کے تاریخی مضامین، مقالات و تصنیفات کی بنا پر ناکام ہو گئیں۔

معرکہ جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلامی کا جواب، کتب خانہ اسکندریہ کو جلا دینے کے الزام کی تردید، اورنگ زیب کو نام نہاد ہندو دشمنی کی فرد جرم سے بچانے کی کوششیں، مسلمانوں پر علم فلسفہ اور سائنس سے دشمنی کی تہمت کا ازالہ غرض مخالفین و معاندین اسلام نے مسلمانوں میں احساس کمتری کو پیدا کرنے کے لئے تاریخ کو جہاں جہاں آلہ کار بنایا وہیں علامہ شبلی کی ذات نمودار ہوئی۔ اور یورپی مستشرقین اور مسلم فرنگیت زدہ طاقت کو علمی جنگ کے ذریعے شکست فاش دی۔ علامہ شبلی جانتے تھے کہ اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے اور بگاڑ کے پیش کرنے کی تحریک کا نقطۂ آغاز دور فاروقی سے متعلق گمراہ کن پروپیگنڈا ہے اور حضرت عمرؓ کے جنکی عظمت و رفعت کو کم کر کے براہ راست صحابہ کرام سے ربط و تعلق کی جڑ پر کلہاڑا چلایا جا رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ نوجوانوں کے سامنے حضرت عمرؓ اور خلافت کی ایک مستند تاریخ پیش کی جائے تاکہ مسلم معاشرہ کے وہ نفاق پسند عناصر جو انگریزوں کے ساتھ ساز باز کر کے ملت اسلامیہ کی ذہنی بنیادوں کو منہدم کرنا چاہتے ہیں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

یورپی مستشرقین نے سالہا سال کی عرق ریزی اور محنت کے بعد حضرت عمرؓ کے دور کی الزامی تاریخیں مرتب کیں اور ان تاریخوں کی وجہ سے علمی دنیا میں حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کا مقام خطرہ کی عین زد میں تھا۔ لیکن شبلی کی الفاروق جلد اول و دوم نے اس ساری محنت پر پانی پھیر کر جماعت اہل سنت کا مسلک ناقابل تردید دلائل کے ساتھ واضح کر دیا — اصل میں تمام صحابہ کرام اور خاص طور سے حضرت عمرؓ کی سیرت کا صحیح طرز پر مطالعہ کئے بغیر وہ مقاصد واضح نہیں ہو سکتے جو محمد رسول اللہؐ کے پیش نظر تھے۔ ان مقاصد نے بعد ازاں خلافت راشدہ کے سماج میں عملی شکل اختیار کی اور اب اس سماج کے متعلق گندہ پروپیگنڈا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنے آئیڈیل سے برگشتہ کیا جائے۔

مشرق میں غالی اور انتہا پسند شیعیت[1] یہ افسوسناک اور نفرت انگیز کام کرتی رہی اور مغرب میں مستشرقین کی ایک پوری جماعت نے اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ان سب کے مقابلہ میں تنہا شبلی نے حیرت انگیز فتح حاصل کی۔ بلاشبہ ہمارے مذہبی طبقے کے لئے الفاروق شاید زیادہ مفید ثابت نہ ہوئی ہو۔ لیکن جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لئے جو مذہب اور تاریخ سے جاہل محض تھا، یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔

الفاروق کی علمی قدر و قیمت — اس کتاب کے ذریعے پہلی بار اردو زبان میں اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کا ایک خاکہ مستند علمی اور تاریخی دلائل کے ساتھ سامنے آیا۔ شبلی کے بعد جن لوگوں نے اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کو دوسرے

---

[1] خوب واضح رہے کہ یہاں انتہا پسند شیعیت پر حملہ ہو رہا ہے نہ کہ عام اثنا عشریوں اور شیعوں پر۔

مروجہ تقاضات کے مطابق پیش کیا ہو گا ہی نہیں۔ مگر الفاروق بھی ان کے لئے ایک اہم ماخذ ثابت ہوا۔ دراصل شبلی کو اس امر کا احساس ہو چلا تھا۔ کہ آئندہ اسلام کے سیاسی اور معاشی نظریات سے عدم واقفیت کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں سخت تباہ کن ثابت ہوگا۔ لہٰذا وہ الفاروق کے ذریعے اس خلا کو بھی پر کرنے کے خواہشمند تھے اس کتاب کی اہمیت خود مصنف کے نزدیک اتنی زیادہ تھی کہ اس کے لئے انہوں نے قسطنطنیہ تک کا سفر کیا تاکہ اہم تاریخی ماخذوں کا مطالعہ کیا جاسکے۔ اور اسی کتاب کی خاطر ہی انہوں نے اپنے دیرینہ اور قدیم دوست سر سید سے تعلقات خراب کر لئے۔ سرسید نے الفاروق کی تصنیف کے کام کو بالکل ناپسند کیا تھا۔ کیونکہ وہ بدقسمتی سے چند غلط قسم کے شیعہ[1] نوابوں اور انگریزی طاقت کے ہاتھ میں آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔ اور ان کے مفادات کے لئے الفاروق کی حیثیت زہر قاتل سے کم نہ تھی۔ سرسید اس تصنیف کی راہ میں یوں بھی مانع ہوئے کہ وہ خود شیعیت سے متاثر تھے چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میں تو ان صفات کو جو ذات نبوی میں جمع تھیں دو حصوں پر تقسیم کرتا ہوں ایک سلطنت اور ایک تقدسیت اول کی خلافت حضرت عمرؓ کو ملی اور دوسری کی خلافت حضرت علی و ائمہ اہل بیت کو مگر یہ کہدینا تو آسان ہے لیکن کس کو جرأت ہے کہ اس کو لکھے کہ حضرت عثمان نے تو سب چیزوں کو غارت کر دیا۔ حضرت ابوبکر صرف برائے نام بزرگ آدمی تھے پس میری رائے میں ان کی نسبت کچھ لکھنا اور مورخانہ تحریرات کا زیر مشق بنانا نہایت نامناسب ہے۔ جو ہوا سو ہوا۔ جو گزرا سو گزرا۔ (سرسید کا خط بنام نواب عماد الملک مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۹۵ء)۔

بہر حال علامہ شبلی نے سرسید کی مخالفت کے باوجود بالآخر الفاروق کی تصنیف کا کام مکمل کر دیا۔ اور یہ شے ان کے اور سرسید کے تعلقات میں بگاڑ پیدا کرنے کا بڑا سبب بنی۔

فلسفہ و سائنس کے میدان میں :- مسلمانوں میں سیرت نبوی کا صحیح علم پھیلانے، صحابہ کرام کی محبت کو عام کرنے اور اسلامی تاریخ پر طرح طرح کے بے بنیاد الزامات کی تردید کرنے کے علاوہ انہوں نے الکلام اور علم الکلام لکھ کر جدید تعلیم یافتہ طبقے کو آگاہ کیا کہ اسلامی افکار کی تاریخ کے تیرہ سو سال کا یہ مختصر دور مذہب و سائنس اور مذہب و فلسفہ کی معرکہ آرائیوں کا حتمی و آخری فیصلہ بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور سرزمین یورپ سے فلسفہ و سائنس کے جو لشکر اسلامی تصورات پر یلغار کرنے کے لئے آج یہاں آن کھڑے ہوئے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ ہماری تاریخ تو اس طرح کے مناظر سے بھری پڑی ہے کہ مسلمانوں کے مختلف کلامی مکاتب کی تاریخ بیان کر کے علامہ شبلی نے نئی نسل کی اس گھبراہٹ اور دہشت کو دور کیا جو مغربی فلسفہ و

---

[1] ایسے بھی شیعہ نواب تھے جو الفاروق کا لکھا جانا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ نواب عماد الملک سے جب سرسید نے الفاروق کی تصنیف پر رائے مانگی تو انہوں نے جواب دیا کہ ان کی سوانح حیات ضرور لکھی جانی چاہئے۔

سائنس کے نتیجہ میں پھیل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے علم کلام کی تدوین جدید پر بھی علمائے دین کو متوجہ کیا۔ علم کلام کے مختلف مکاتیب خیال اشاعرہ، ماتریدیہ اور معتزلہ کے عنوان سے ہماری تاریخ میں مذکور رہے۔ اشاعرہ کا مسلک رکھنے والے حضرات عقلی طریقہ فکر کو معیوب بات خیال کرتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں معتزلہ پکے ریشنلسٹ اور عقل پرست واقع ہوئے تھے۔ لیکن ماتریدیہ ان دو انتہاؤں کے بین بین ایک معتدل مسلک کے حامی رہے ہیں وہ اشاعرہ کے مسلک کے برخلاف احکام شریعت کو مصالح اور مفاد عامہ پر مبنی سمجھتے ہیں۔ اور عقائد کو بعید از عقل نہیں قرار دیتے۔ حنفی ائمہ و علما ابتداً اسی ماتریدیہ سکول کے پیرو تھے، مگر بعد میں جو علما آئے وہ اشاعرہ کے ہمنوا ہو گئے۔ اور شبلی کے زمانے میں حالت یہ تھی۔ کہ سب حنفی عالموں نے اشاعرہ کے نظریات کو قبول کر لیا تھا۔ اس سبب سے عام طور پر ہمارا مذہبی نقطہ نظر غیر عقلی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

علمائے دین کو موجودہ دور میں اس خامی کی جانب سے پہلے شبلی نے متوجہ کیا اور بتایا۔ کہ ہمیں ماتریدی مکتب خیال کی پیروی کرنی چاہئے۔ کیونکہ علم کلام کا یہ سکول فلسفہ سائنس کی مسلمہ صداقتوں کا منکر نہیں ہے۔ اور نہ ان بے جا عقائد کو تسلیم کرتا ہے جنہیں موجودہ زمانے میں غیر سائنٹفک کہا جاتا ہے۔ مثلاً اشاعرہ کا خیال ہے۔ کہ جادوگر آدمی کو گدھا اور گدھے کو آدمی بنا سکتا ہے۔ انسان کو اپنے افعال پر کچھ بھی قدرت نہیں بلکہ سب کچھ اللہ کرواتا ہے۔ اشیا میں خواص اور تاثیریں نہیں ہیں اور دنیا میں علت و معلول کا کوئی سلسلہ نہیں پایا جاتا اور خدا کے احکام کسی مصلحت پر مبنی نہیں ہیں۔ اسی طرح کے کچھ دوسرے عقائد ہیں جن کی تردید ہمیشہ ماتریدیوں کی جانب سے ہوئی۔ علامہ شبلی اس ماتریدی سکول کو وسعت دیکر ایک جدید علم کلام کی عمارت اٹھا رہے تھے۔ لیکن افسوس کہ موت نے انہیں یہ مہلت نہ دی۔ وہ آخر وقت تک یہی کہتے رہے کہ کاش مجھے ماتریدی علم کلام کے اصولوں کی وضاحت اور شرح کا موقع ملتا۔ تاکہ ہمارے نوجوان دین کے بارے میں ایک سائنٹفک نقطہ نظر سے واقف ہو جاتے۔ افسوس کہ شبلی مرحوم کی یہ خواہش اس حد تک پوری نہیں ہوئی جیسی وہ چاہتے تھے تاہم اس ضمن میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ بھی دماغ کی اندھیاریوں میں روشنی پھیلانے کے لئے بہت کچھ کام آ سکتا ہے۔ اس جدید علم کلام کی خاطر ہی شبلی یہ چاہتے تھے علمائے دین انگریزی لازماً سیکھیں۔ اور یورپی مفکرین و سائنسدانوں کے خیالات سے آگاہ ہوں۔ مگر علما کے طبقے نے ان کی اس خواہش کو زیادہ وقعت نہ دی پھر بھی اس نے بڑا اثر پیدا کیا۔ اور آج شبلی کے شاگردوں میں بہترین انگریزی داں علمائے دین موجود ملیں گے۔

ایک نیا تعلیمی منصوبہ اور اس کی ناکامی:۔ علامہ شبلی مسلمانوں کے دینی نظام تعلیم کی تبدیلی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ان کے خیال میں قدیم یونانی فلسفہ کی کتابیں لاحاصل تھیں وہ چاہتے تھے کہ دینی مدارس میں یونانی فلسفہ کی جگہ مغربی فلسفہ و سائنس کی تعلیم دی جائے۔ مگر علما کی قدامت پسندی کی بنا پر علامہ شبلی کا یہ منصوبہ خاطر خواہ پورا نہیں ہوا۔ اور خود ندوۃ العلما سے بھی بالآخر ان رجعت پسند مولویوں نے علامہ شبلی کو دھکے دیکر باہر نکال پھینکا حالانکہ اس مدرسہ کو قائم کرنے والے یہی تھے۔ ندوہ میں علمائے دین کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر شبلی کو سخت مایوسی ہوئی۔ اور وہ سمجھ گئے کہ اس قوم کو قدامت کا روگ

لگ چکا ہے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میری کتابوں کے قبول عام کی بنا پر مجھ کو خیال ہوا کہ قوم میں تاریخ کا صحیح مذاق پیدا ہو گیا ہے جو قوم کی علمی ترقی کی جان ہے لیکن واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ محض دھوکا تھا مقبولیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم میں عموماً داستان فروشی اور اسلاف پرستی کی خاصیت موجود ہے۔ اس لئے بزرگوں کی عظمت کی نسبت جو کچھ صحیح یا غلط کہا جاتا ہے۔ خواہ مخواہ اسکو قبول ہو جاتا ہے" (رسائل شبلی)

ماضی پرستی سے جنگ اور امام ابو حنیفہ کا دفاع ۔ بدقسمتی سے ماضی پرستی رجعت پسندی اور قدامت دوستی علم معاشرہ کی تباہی و بربادی کا ایک اہم سبب ہے، اس کے خلاف جہاد کرنا ضروری تھا چنانچہ شبلی اس مقصد کے لئے بھی اٹھ کھڑے ہوئے مسلمانوں میں یہ قدامت پسندانہ اور ماضی کی اندھی پرستش کا جذبہ خاص طور سے اس جماعت کا پھیلایا ہوا تھا جو سرے سے تہذیبی و تمدنی تفصیلات، سیاسی و حکومتی تبدیلی، ذرائع پیداوار اور معاشیات کے ارتقاء جغرافیائی اور علاقائی امتیازات اور ذہن و فکر و شعور کی حرکت سے منکر ہے۔ یہ جماعت حدیث کے نام پر بدترین قسم کی جمود پسندی میں خود بھی مبتلا تھی اور دوسروں کو بھی اس نے اپنے اسی مرض سے متاثر کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے امام ابو حنیفہ کو منکر حدیث قرار دیا اور ان پر الزام لگایا کہ یہ حدیث کے مقابلہ میں اپنی رائے قیاس اور عجمیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، حالانکہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے ساتھی ہر حدیث کو درایت کے ساتھ روایت کی کسوٹی پر بھی کس کر دیکھتے تھے۔ اور حدیث کا حنفی سکول یہ ضروری سمجھتا تھا کہ ہر حدیث کا تاریخی پس منظر جان کر اس کی قدر و قیمت کو طے کیا جائے۔ امام صاحب کتاب اللہ اور سنت رسول سے انحراف کو ہمیشہ کفر کے ہم معنی سمجھا کئے۔ لیکن وہ اس کے قائل نہیں تھے کہ مسلمانوں کے سر پر ایک خاص دور کے وہ قوانین بھی مسلط کئے جائیں جو ایک مخصوص سماج کے ذرائع پیداوار اور نظام معاشیات کی مناسبت سے اختیار کئے گئے تھے یا جن کا تعلق جغرافیائی و قومی مزاج کے ساتھ خاص تھا۔ یا جو ایک خاص قسم کی ذہنی و فکری سطح کا نتیجہ ہے[1] یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ امام صاحب کو اس بات کا بھی پورا پورا احساس تھا کہ قدیم عربی سماج کے صحت مند اور صالح عنصر کو جو بین الاقوامی طور پر رواج پانے کی صلاحیت رکھتا تھا محمد صلعم نے اپنی عالمگیر شریعت کا جزو قرار دیا تھا۔ اور اس عنصر کی پیروی و پابندی لازمی ہے تاہم بہت سے معاملات میں بہت سی احادیث چند مخصوص حالات ہی کے متعلق ہیں اور یہ خاص حالات اس زمانے کے سیاسی، معاشی، جغرافیائی اور ذہنی نظام کے لئے خاص تھے، اب جبکہ سماج تبدیل ہو چکا ہے تو اس مناسبت سے احکام فقہ کا یہ حصہ بدلے گا[2] ——— دوسرے معنوں میں حنفی طرز فکر ہر حدیث کو سنت نہیں سمجھتا اور تشریعی اور غیر تشریعی احادیث

---

[1] مقالہ نگار نے حنفی مکتب فکر کی تعریف کرتے ہوئے یہاں جو بات فرمائی ہے وہ محل نظر ہے (چراغ راہ)۔ [2] ان فقروں میں گویا مولینا سندھی کے افکار کی جھلک دکھائی دیتی ہے (چراغ راہ)

کے فرق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ یہ اصول ایک خاص جماعت کو ناگوار گزرا اور اس جماعت نے امام ابوحنیفہ کے خلاف باقاعدہ تحریک چلائی۔ اس تحریک کا اثر ہے کہ صرف عوام ہی نہیں بلکہ حنفی علما بھی امام ابوحنیفہ کو فراموش کر گئے۔ اور پروپیگنڈے کے طوفان سے نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ ہمارے علما رفع یدین، آمین بالجہر اور فاتحہ خلف الامام کے چند جزئی مسائل کے سوا اپنی ذہنیت میں اس غیر حنفی جماعت کے ہم نوا ہو کر معاشرے میں جمود، قدامت اور ماضی کی عبادت کا مرض پھیلا رہے تھے۔ ان حالات میں علامہ شبلی نے اپنی کتاب سیرۃ النعمان پیش کی۔

سوسائٹی میں اسلام کو پھر سے ایک متحرک طاقت بنانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ فقہ و حدیث کے اس حنفی سکول کی وضاحت کی جائے جو قدامت پرستی اور رجعت دوستی کا مخالف ہے۔ اس مقصد کے لئے سیرۃ النعمان بڑی معاون ثابت ہوئی اور فقہ و حدیث کے مسائل میں وہ حنفی مکتب خیال کھل کر سامنے آیا جو ایک ترقی پذیر اور جاندار معاشرہ کی تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور جس کی نمایاں خصوصیت اس غلط مذہبیت سے کنارہ کشی ہے جو عام طور پر مذہبی حلقوں میں مروج رہی ہے۔

دراصل کتاب اللہ، سنت رسول اور اسوۂ صحابہ کو پیش نظر رکھ کے احکام فقہ کی ترتیب و تدوین میں حنفی اصولوں کے استعمال کی اہمیت یوں ہے۔ کہ یہ اصول واقعی مادی و تمدنی حالات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہ اصول حقیقت کے اعتراف پر مبنی ہیں۔ کہ سماج کی حرکت کبھی اور کہیں نہیں رکتی، بلکہ ہمارا معاشرہ مسلسل تبدیل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ فقہ حنفی کے مقابلہ میں اس کی مخالف جماعت چونکہ مادی حالات اور سماجی تبدیلیوں کے عمل کو اہمیت دینے اور اس کے تقاضے ماننے کے لئے تیار نہیں ہے لہذا وہ کتاب اللہ، سنت رسول اور اسوۂ صحابہ سے جو فقہ اخذ کرے گی۔ وہ فقہ لازماً ایک طرح کے جمود و قدامت پر مبنی رہے گی یہی وجہ ہے کہ ہمارے اہل نظر علما نے حنفی فقہ کو بڑی اہمیت دیتے رہے اور اس کی حفاظت و اشاعت کے لئے تصنیفات و تالیفات سے نئے کر مناظرے تک کا سلسلہ سامان کیا خود علامہ شبلی کی زندگی کا بڑا حصہ اہل حدیث جماعت کے اکابرین کے ساتھ مناظروں میں گزرا۔ انہیں فقہ حنفی سے اس قدر عشق تھا کہ جب کبھی کوئی یہ اطلاع دیتا کہ فلاں قصبہ و ضلع میں کوئی اہل حدیث عالم فقہ حنفی کے خلاف محاذ بنائے ہے تو شبلی بہ نفس نفیس وہاں پہنچتے اور مناظرہ کا چیلنج دے کر بحث و جدل کے ذریعے فریق مخالف کو میدان چھوڑ دینے پر مجبور کرتے۔ ظاہر ہے کہ شبلی جیسا عظیم مورخ مناظرہ بازی کے لاحاصل مشغلہ کو کبھی اختیار نہ کرتا، اگر یہ حقیقت اس کے پیش نظر نہ ہوتی کہ فقہ حنفی کی شکست اسلام کی ایک ترقی پسند طاقت کے خاتمے کا باعث ہو گی اور یہی احساس سیرۃ النعمان کی تصنیف کا باعث بنا۔

تصوف کا تحفظ ۔ علامہ شبلی کا ایک اور کارنامہ امام غزالی اور مولانا روم کی سوانح حیات کا لکھنا بھی ہے۔ فقہ اکبر

[illegible] ۔ (حیات شبلی)

حدیث اور فقہ، انکارِ فقہ کے ساتھ ساتھ تصوف کی عظمت کو بھی وہ متاثر ہوتا دیکھ رہے تھے دراصل مغربی تعلیم اور مغربی تحریک نے ہماری قوم کو اپنے سرمایۂ احادیث و اخبار، اپنے فقہ و قانون اور اپنے نظامِ تصوف و روحانیت کو ترک کرنے ہی کی تعلیم دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل تصوف کو بھی ایک بھول بھلیاں اور ایک احمقانہ شے سمجھ کر نظر انداز کر رہی ہے، حالانکہ انبیائے کرام اور صحابہ کرام کے بعد اولیائے کرام کی ذات ہر اعتبار سے ہمارے لئے اہمیت رکھتی ہے۔

دراصل قرآن مجید و احادیث کا اعلیٰ علمی سطح پر سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ تصوف سے آدمی واقفیت حاصل نہ کرتے۔ بلاشبہ عوام ہر زمانے میں اسلام پر یقین رکھتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس یقین کی بنیادیں سراسر وہم و گمان پر تھیں۔ تصوف نے چاہا کہ کم از کم ہمارے معاشرہ کا ذہین عنصر توہمات کی دنیا سے باہر آ کر حقائق اور علم کی بنیاد پر اپنے ایمانیات کی بنیادیں مستحکم کرے[1] چنانچہ اس کا نتیجہ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود کے مکاتبِ خیال تھے۔ جو آگے چل کر شاہ ولی اللہ دہلوی کی ذات میں مکمل یکجا ہوئے۔

تصوف نے کوشش کی کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ ظواہر اور رسومات کی دنیا سے ماورا ہو کر دین و شریعت کے پیچھے کارفرما حقیقت و طریقت کو جاننے کی کوشش کریں اور قرآن و حدیث کے ظاہر الفاظ کے باطن میں جو اصل روح اور مغز پوشیدہ ہے اس کی معرفت حاصل کریں۔ صوفیائے کرام نے اپنے اس منشا کی تکمیل کے لئے دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کا مطالعہ اور یونان سے لے کر ہندوستان تک کے سارے فلسفے کھنگال ڈالے۔ اور ہر عہد کے سائنٹفک علوم پر نظر کی اور اس کے بعد ان سب کا عطر کشید کر کے ایک نظامِ فکر کو تشکیل دیا۔ بلاشبہ اس نظامِ فکر میں غلطیوں کا پایا جانا بھی ممکن ہے۔ لیکن ان کے اتنے عظیم کام اور اتنی بڑی جد و جہد کو از سر تا پا غلط بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ ممکن نہیں کہ جس شے کے پیچھے محی الدین ابن عربی، مجدد الف ثانی، امام غزالی، مولانا روم، شہاب الدین سہروردی اور ان کی طرح کی ہزاروں شخصیتوں نے دیوانہ وار اپنی عمریں صرف کر دی ہوں۔ وہ شے حقیقت سے بالکل خالی ہو۔ ان صوفیوں کے آستانوں پر صرف عوام ہی نہیں۔ بلکہ وقت کے ایک ایک ابن رشد اور بو علی سینا نے گردن جھکا دی تھی۔ اور آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ جن حقائق تک مغربی سائنٹسٹ اور فلاسفر بڑی کوششوں اور محنت کے بعد پہنچے ہیں۔ یہ حقائق تصوف کے پاس بطور اصول مسلمہ مدتوں پہلے سے طے تھے: یہی وجہ ہے کہ شبلی نے تصوف کو دین کی سائنٹفک تعبیر کا نام دیا۔

کہا تو یہ ہے کہ علم و سائنس کی ہم سفری ہمیشہ تصوف کے حصے میں آئی۔ مثلاً صوفیوں کے نظریۂ تجدد امثال کو لیجئے۔ اس کی رو سے یہ کائنات ہر آن فنا ہو رہی ہے اور ہر آن پیدا ہو رہی ہے۔ یہ دنیا مادی ذرات کا مجموعہ ہے اور یہ ذرات اپنا

---

[1] [illegible] کہ عام لوگ عقلی طور پر [illegible] تصوف [illegible] شعور حاصل ہو دوسرے [illegible] اسلام [illegible] (نداء)

مستقل وجود نہیں رکھتے بلکہ ہر آن اور ہر لحظہ فنا اور پیدا ہوتی رہتی ہے ۔ سب ہیں کائنات کے اس حرکیاتی تصور کی تصدیق آج نہ صرف سائنس بلکہ ریاضی کے ذریعے بھی ہو گئی ہے اور تجدد امثال کا نظریہ حقیقت بن چکا ہے ۔ اسی طرح تصوف کے دوسرے نظریات بھی ہیں جن کی تصدیق موجودہ سائنسی دنیا کر رہی ہے ۔

تصوف کی ایک اہم خصوصیت اس کا جذبۂ انسانیت دوستی ہے تاریخ گواہ ہے کہ صوفی سب سے زیادہ مزاجی انسان رہے ۔ لیکن اس کے باوجود یہ سب سے زیادہ روادار عنصر ہے جو تاریخ میں پایا گیا ان کی وسیع المشربی ان کی صلح کل طبیعت ان کا سب مذہبوں کی تعظیم و احترام کا جذبہ اور ان کا مذہبی و فرقہ واری جتھہ بندی سے احتراز براہ راست نتیجہ تھا۔ تصوف کے بعض نظریوں کا اور یہ نظریے اگر پھر سے فروغ پا جائیں تو آج بھی دنیا سے تعصب اور نفرت کی فضا ختم ہو سکتی ہے

علامہ شبلی کو تصوف کی اس صداقت کا احساس اپنی عمر کے آخری دور میں ہوا ۔ اور وہ الغزالی اور سوانح مولانائے روم لکھنے کے بعد اپنے بقیہ پروگرام کی تکمیل نہ کر سکے تاہم یہ دو کتابیں تصوف کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں آج نہیں تو کل جب ہمارا نوجوان طبقہ اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے عام علمائے دین کی کتابوں کو ناکافی سمجھ کر آگے بڑھے گا ۔ تب اسے شبلی کی یاد آئے گی اور وہ جان لے گا کہ غزالی اور روم کی سوانح حیات ان کے لئے کس قدر قیمتی شے ہے ۔ ان دو کتابوں نے اس حلقے کا بھانڈا پھوڑنے میں بھی کامیابی حاصل کی جو تصوف کو "ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" بتا رہے ہیں ۔ اور "علم سینہ" کا نعرہ لگا کر غزالی و روم کے اجارہ دار بن بیٹھے تھے

سیاسی حرکت کے لئے تحریک :۔ علامہ شبلی کی یہ ساری محنت اور جدوجہد جو انہوں نے سیرت' تاریخ' فلسفہ' فقہ' کلام' اور تصوف کے سلسلہ میں انجام دی' فقط اس لئے تھی ۔ کہ مسلمان پھر سے ایک طاقتور سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کر جائیں ان کی نگاہوں میں ابھی عہد فاروقی کا حکومتی رعب و دبدبہ اور عباسی خلافت کے زمانے میں مسلمانوں نے جو سیاسی عروج حاصل کیا ۔ اس کا نقشہ گھوم رہا تھا ۔ اور اس لئے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان پالٹیکس میں حصہ لے کر پھر سے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کریں ۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا ۔ جب کہ پالٹیکس اور سیاست کا نام لینا بھی نہ صرف عوام بلکہ ہمارے آزاد خیال طبقے کو بھی ناگوار گزرتا تھا ۔ حق یہ ہے کہ سرسید جیسے نڈر اور بے خوف آدمی بھی سیاسیات کا نام سن کر کانپ جاتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ساتھیوں سمیت مسلمانوں کو سیاست سے الگ رکھنے کی پوری پوری کوششیں کیں ۔ لیکن یہ شبلی تھے ۔ جنہوں نے اس ذہنیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ۔ اور مطالبہ کیا کہ مسلمان جوق در جوق کانگریس میں شریک ہو کر حکومت خود اختیاری کے لئے جدوجہد کا آغاز کریں ۔ وہ سرسید کے اس نقطۂ نظر کو کہ کانگریس میں شرکت مسلمانوں کی انفرادیت کو مٹانے کا باعث ہو گی کوئی وقعت نہیں دیتے تھے اور نہ ہی وہ اس اندیشہ کو بجا سمجھتے تھے ۔ کہ مسلمان سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے ہندوؤں کی طاقت کی چکی میں پس جائیں گے ۔ اپنے اس نقطۂ نظر کو انہوں نے کئی مضامین میں مضبوط دلائل کے ساتھ واضح کیا ۔ ان کو مسلم لیگ سے ہمیشہ نفرت و کراہت رہی اور انہوں نے علانیہ کہا کہ نہ صرف آج بلکہ آئندہ ہزار برس تک

بھی یہ توقع ہے نہیں ہے کہ مسلم لیگ ملتِ اسلامیہ کی نجات کا باعث ہو۔ تاہم مسلم لیگ سے اس قدر مایوس و دل شکستہ ہونے کے باوجود انہوں نے لیگ کی اصلاح کے لئے مضامین لکھے۔ مسلم لیگ کی اصلاح کے سلسلہ میں سب سے زیادہ ضروری بات وہ یہ کہتے تھے کہ پہلے مسلم لیگ کو بڑے بڑے زمینداروں، جاگیرداروں، علاقہ داروں اور سرکاری خطاب یافتہ افراد سے پاک کیا جائے اور پھر مسلم لیگ کے سامنے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے فی صدی تناسب و دیگر حقوق کے جھگڑوں کی بجائے ہندوستان کے مظلوم کاشتکاروں کی نمائندگی کا نصب العین رہے اور وہ ان تمام مطالبوں کو اختیار کرے جو کانگریس اور ہندوؤں کا ماڈرن طبقہ برطانوی حکومت کے علی الرغم پیش کر رہا ہے۔ سرسید سے ہمیشہ انہیں سیاسی اختلاف رہا۔ کالج میں ایک دفعہ نظام حکومت کے موضوع پر کوئی مباحثہ تھا۔ سرسید نے بادشاہی طریق حکومت کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ ہندوستان کے لئے یہی طرزِ حکومت موزوں ہو سکتا ہے۔ لیکن اسی وقت شبلی اٹھے اور جمہوری نظامِ حکومت کے حق میں ایک مدلل تقریر کی اور بتایا کہ مسلمان سوائے جمہوریت کے اور کسی دوسرے طریقۂ حکومت کو کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ سیاسی نقطۂ نظر کا یہ اختلاف شبلی اور سرسید کے درمیان آخر وقت تک قائم رہا۔ اور اس کی وجہ سے شبلی کانگریس میں شامل ہوئے تو سرسید نے اس کی مخالفت کو اپنا نصب العین قرار دیا

بہتر ہوگا کہ ہم علامہ شبلی کی تحریر سے کچھ اقتباس پیش کریں تاکہ انکا سیاسی مسلک اچھی طرح واضح ہو۔ ذیل میں ہم ان کے ایک طویل مضمون "نئی پولیٹیکل کروٹ" کے بعض حصے نقل کرتے ہیں۔ جو ۱۲ جنوری ۱۹۱۲ء کا لکھا ہوا ہے:۔

"نواب وقار الملک کا سنجیدہ لیکن بہادرانہ مضمون ایک سچے دلیر مسلمان کی آواز ہو سکتا تھا۔ اگر اس میں یہ غلط منطق شامل نہ ہوتی کہ ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہو جائیں گے تو ہماری ہستی اس طرح برباد ہو جائیگی جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل جاتے ہیں اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے ۱۹ کروڑ اور مسلمانوں کے ۷ کروڑ افراد کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے اگر دادا بھائی نوروجی تمام ہندوستان کے مقابلہ میں سب سے پہلے پارلیمنٹ کا ممبر ہو سکتا ہے۔ اور اگر گوکھلے تنہا ریفارم سکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے۔ تو ۸ کروڑ مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیئے"۔

ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جس چیز کو ہم پالیٹکس سمجھتے تھے وہ پالیٹکس کی تکفیر تھی۔ ہماری پالیٹکس کا کعبہ دراصل بتکدہ تھا۔ ہماری پالیٹکس جس کی آواز کلمہ شہادت کی طرح ولادت کے دن سے بچے کے کان میں پڑتی تھی صرف یہ تھی کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے ___ ابھی ہم کو پالیٹکس کے قابل بننا چاہیئے ___ ابھی صرف تعلیم کی ضرورت ہے ___ ہماری تعداد کم ہے اس لئے جمہوری دنیا کا اصول سلطنت ہمارے لئے مناسب نہیں ___ [illegible]

[illegible]

"دنیا میں صرف آئیڈیل ایک چیز ہے۔ جو انسان کے جذبات و احساسات کو برانگیختہ کر سکتا ہے۔ ہم نے کس چیز کو تاکا ہے؟ ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ ـــ بی اے اور نوکریاں! ـــ کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پر زور جذبات پیدا ہو سکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لئے زحمتیں برداشت کی جا سکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا ولولہ دل میں پیدا کر سکتا ہے؟ اس ذوق میں فرشِ خاک پھولوں کی سیج بن سکتا ہے؟ اس پست مقصد سے سخت نقصان یہ ہوا۔ کہ تمام قوم کی قوم میں پست حوصلگی، جبن اور بزدلی چھا گئی ہے تمہارے پولیٹیکل لغت نے جائز آزادی کا نام بغاوت رکھ دیا ہے ایک پارسی یا ہندو کانگریس میں جاتا ہے انتظام حکومت پر نکتہ چینیاں کرتا ہے اور پھر پارلیمنٹ میں اور وائسرائے کی کونسل میں ممبر باقی رہتا ہے، لیکن مسلمان ایجوکیشنل کانفرنس میں آتے گھبراتے ہیں اور سر سید سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ یہاں تک کہ مرحوم کو علی گڑھ گزٹ میں مراسلہ چھاپنا پڑتا ہے کہ تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونا ممنوع نہیں ہے"

"اس بنا پر پالیٹکس کی بحث میں سب سے بڑا اور مقدم کام یہ ہے کہ یہ سمجھا دیا جائے کہ مسلم لیگ نہ آج بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالیٹکس نہیں بن سکتی۔ مسلم لیگ کب قائم ہوئی؟ کیونکر قائم ہوئی؟ کس نے قائم کی؟ اور سب سے بڑھکر یہ کہ وہ خود دل سے اٹھی تھی۔ یا کوئی فرشتہ اوپر سے لایا تھا۔؟ یہ سوالات اگرچہ اصل مسئلہ پر کسی قدر اثر رکھتے ہیں۔ اور اگرچہ ان کے جواب دینے کا حق ہم کو اسی قدر حاصل ہے جسقدر خود بانیٔ اول کو، کیونکہ جب یہ تماشہ ہو رہا تھا۔ تو مجھ کو پردہ کی طرف جھانکنے کی اجازت تھی تاہم اس سے ضروری تر باتیں درپیش ہیں۔ اور ہم کو پہلے ان طرف متوجہ ہونا چاہئے"

"لیگ کا سنگِ اولین شملہ کا ڈیپوٹیشن تھا۔ اور اب یا آئندہ جو کچھ اسکا ترکیبی نظام قرار پائے، ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہیگی ۔ ڈیپوٹیشن کا مقصد سراپا یہ تھا اور یہی ظاہر بھی کیا گیا تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے اپنی تیس سالہ جد و جہد سے حاصل کئے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کا حصہ متعین کیا جائے"۔

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ اپنی اس خصوصیت کو چھوڑ دے گی۔ کہ اس کو سب سے پہلے دولت اور جاہ کی تلاش ہے۔ اور اس کو اپنے صدر انجمن کے لئے نیابتِ صدر کے لئے سکرٹری شپ کے لئے ارکان کے لئے اضلاع کے عہدہ داروں کے لئے، وہ مہرے مطلوب ہیں۔ جن پر طلائی رنگ ہو۔ لیکن پولیٹیکل بساط میں ان مہروں کی کیا قدر ہے؟ کیا ایک معزز رئیس، ایک بڑا زمیندار، ایک حکام رس دولت مند اپنی عزت و آبرو کو نقصان پہنچانا گوارا کر سکتا ہے؟ ہندوؤں کے پاس زمینداری، دولت اور خطاب کی کمی نہیں، لیکن کیا انہوں نے اس تیس برس کی مدت میں کسی بڑے زمیندار یا تعلقہ دار کو پریسیڈنٹی

کا کرسی نشین کیا؟ کیا اس کے صندوں میں کسی کا سر شعاب کے تاج سے آراستہ ہے۔

"سب سے پہلا اور مقدم کام یہ ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقاصد کے دائرہ کو وسعت دے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو کسی خاص فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ ان چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دے جن پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ موقوف ہے۔ مثلاً ایک بندوبست کا مسئلہ ہے جس کو لیگ نے کبھی خیال کے ہاتھ سے بھی نہیں چھوا۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ہندوستان کی سرسبزی کا مدار ہے۔ ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ کاشتکار اور مزدور مفلس ہوتے جاتے ہیں۔ ہر بندوبست مال گزاری کی مقدار میں اس قدر اضافہ کر دیتا ہے کہ جو زمینیں مویشیوں کا حق تھیں ان کو اپنے کام میں لانا پڑتا ہے، چارہ نایاب ہو جاتا ہے، چراگاہیں مزروعہ بنتی ہیں۔ ایک فصل بھی اگر کمی کر جائے تو نوبت فاقہ تک پہنچ جاتی ہے۔ ہزاروں کاشتکار گھر چھوڑ کر نئی آبادیوں میں بھاگتے جاتے ہیں۔ مالگزاری کے وقت ہزاروں لاکھوں کے زیورات رہن ہو کر بے دردمہاجنوں کے گھر پہنچے ہیں۔ باایں ہمہ ہر تیسویں سال نیا بندوبست ہوتا ہے۔ فرض کرو اگر بنگال کی طرح ہمارے ملک میں بھی استمراری بندوبست ہو جائے تو یہ ہندوستان کے حق میں رحمت ہوگا یا یہ کہ چند مسلمانوں کو موجودہ تعداد سے زیادہ نوکریاں مل جائیں؟"

"مسلم لیگ کی انتظامی کمیٹی بڑے بڑے زمینداروں اور علاقہ داروں سے بالکل خالی کر لی جائے۔ صرف وہ لوگ شریک کئے جائیں۔ جو آزادی اور حق گوئی کے ساتھ اظہار رائے کر سکیں۔ ان تمام تجاویز کو جو کانگریس میں پیش کی جاتی ہیں۔ مسلم لیگ کو اپنے پروگرام میں داخل کرنا چاہئے۔ جس طرح ہندوؤں کا ماڈریٹ فرقہ کرتا ہے"

مسلم لیگ سے متعلق مندرجہ بالا اقتباسات کافی طویل ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ اس پہلو سے مفید ہے کہ آج ہمارے سیاسی رہنماؤں کے سامنے لیگ کی اصلاح کا مسئلہ ہے۔ علامہ شبلی کا اس موضوع پر یہ مضمون ہماری رہنمائی کے لئے آج بھی کافی ہے اور اس کی روشنی میں لیگ کو اپنی خرابیاں دور کرنے کا موقع اب بھی حاصل ہے۔

اتحادِ عالمِ اسلامی:۔ علامہ شبلی یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان کی جنگِ آزادی میں شریک رہنے کے علاوہ بقیہ اسلامی ممالک سے بھی تعلقات قائم کریں۔ اس غرض کے لئے انہوں نے قسطنطنیہ اور مصر و شام وغیرہ کا سفر کیا اور پھر اپنا سفرنامہ لکھ کر مسلم عوام میں اسلامی ممالک کی محبت کا جذبہ بیدار کرنا چاہا۔ مگر سفرنامے کی اشاعت سے سرسید اور برطانوی حکومت سخت ناراض ہو گئے۔ کیونکہ انہیں [illegible] چنانچہ سرسید کی ناراضگی کے علاوہ شبلی کو حکومت [illegible] کو زندگی بھر اپنی معاشی [illegible] کی خوش نودی مزاج کو [illegible]

حاصل کئے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔ لہذا شبلی نے کوشش کی کہ سرسید کو خوش رکھیں۔ مگر وہ اس میں کوشش کے باوجود ناکام رہے بعض مضامین انہوں نے سرسید کے کہنے پر لکھے۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں کو برطانیہ کی وفادار رعایا بنکر رہنا چاہئے اور نہ کوئی تعلق رکھنا نہ چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان مضامین میں ایک تو آورد آورد ہی ہے، اور پھر اس کے خلاف ان کی پوری زندگی اور ان کی دوسری تحریرات زبردست شہادت تھیں۔ تاہم سرسید نے انہیں اس لئے گوارا کیا کہ ان کو شبلی کی وجہ سے معتزلہ کے عقائد اور ان کے طریقۂ استدلال سے واقفیت حاصل ہو رہی تھی اور اس واقفیت کو وہ اپنی مغربی آزاد خیالی کی تحریک کے لئے بطور بنیاد استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ ایک بڑا حزنیہ ہے کہ شبلی جیسا عظیم آدمی محض معاشی مجبوریوں کی بنا پر ایک عرصہ تک سرسید کا آلۂ کار بھی بنا رہا۔ اور ان کو اس تفسیر کے لکھنے میں بڑی مدد دی جو مسلمہ اسلامی عقائد کے خلاف ہے۔ اگر شبلی سرسید کی مدد نہ کرتے تو یہ مذہبی بغاوت جتنی کچھ بھی کامیاب ہوئی وہ بھی نہ ہوتی کیونکہ یہ شبلی ہی تھے۔ جنہوں نے نہ صرف اپنا علم انہیں کرایہ[1] پر دیا۔ بلکہ دیگر اسلامی ممالک میں پہنچ کر وہاں کے کتب خانوں میں معتزلہ کی کتابیں تلاش کر کے سرسید کو پہنچائیں۔

تاہم الفاروق کی تصنیف پر جو اختلاف رائے پیدا ہوا۔ اس نے شبلی کی آنکھیں کھول دیں اور ان کا ضمیر جاگ اٹھا۔ اس کے بعد وہ کالج سے الگ ہو کر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ مگر بعد میں ندوہ کا مدرسہ جو انہوں نے قائم کیا وہ بھی حکومتی امداد پر چل رہا تھا، اس لئے حکومت سے براہ راست ٹکر ندوہ کے مفاد کے خلاف تھی، تاہم وہ اپنے دلی جوش پر زیادہ قابو نہ پا سکے۔ ان کی باغیانہ نظمیں حکومت برطانیہ نے ضبط کر لی تھیں۔ اور آخرکار ان کی گرفتاری کا حکم بھی جاری کر دیا گیا۔ لیکن اس حکم پر عمل ہونے سے پہلے ہی علامہ شبلی فرشتۂ اجل کے لائے ہوئے حکم نامہ پر دستخط کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ مگر وہ اپنی تصنیفات کی وجہ سے حیاتِ جاوداں کے مالک ہیں۔ بالخصوص سیرۃ النبی، الفاروق، المامون، تاریخ علم کلام اور جدید علم الکلام، الغزالی، مولانا روم اور ان کے دیگر مضامین و مقالات مجموعی طور سے ملک و ملت کے لئے نشانِ راہ کا کام دینگے، اور مسلمانوں میں انقلابی سیاست کی روح پھونکنے کے لئے جو جد و جہد انہوں نے کی وہ بھی انشاءاللہ مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

---

[1] اصل میں علم کو کرایہ پر دینے کا الزام اس صورت میں عائد ہوتا ہے جبکہ کوئی شخص بالارادہ نفسانیت کی راہ پڑ جائے۔ علامہ شبلی کا مقام اس سے بلند تر ہے۔ مثال ملی لوگ بسا اوقات مقصد سے قطع نظر کر کے محض نشۂ تحقیق میں بہت سے عجیب و غریب کارگزار لیتے ہیں۔ (ر۔ح)

ایک گمنام شاعر

— ادارہ —

—— حبیب کیفوی

چند ہفتے گزرے، ایک دوست ملاقات کو تشریف لائے۔ پہلے سے شناسائی تھی۔ پہلی تعارفی ملاقات میں اتنا معلوم ہوا کہ یہ نئے دوست شاعر بھی ہیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ میرا اندازہ بہت ہی غلط تھا۔ خیال ہوا کہ کچھ جعلی لوگ ہوتے ہیں جو شاعر نہ ہوتے ہوئے اور شاعر ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوئے الفاظ سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ان پر خود غلط قسم کی غیر معمولی شخصیتوں سے دوست احباب تفریح کرتے رہتے ہیں اور موقع بے موقع ان کی شاعری کا تعارف کراتے اور ان سے کچھ پڑھواتے سنتے رہتے ہیں۔ میں سمجھا کہ یہ دوست بھی کوئی ایسی ہی غیر معمولی شخصیت ہوں گے۔ چنانچہ میرا ان کی ذات سے تو دوستانہ رابطہ رہا لیکن ان کی شاعری سے میں نے کوئی دلچسپی نہ لی۔

اس مرتبہ انہوں نے خاص طور پر وقت لے کر اپنی شاعری کا تعارف کرانا چاہا۔ وہ مجھ سے مخلصانہ مشورہ لینے آئے کہ انہوں نے گزشتہ کئی برس کی کاوشوں سے جو سرمایۂ سخن جمع کیا ہے اس میں کوئی قدر و قیمت ہے یا نہیں! میں صبر و استقامت کی ساری تاب سمیٹ کر ان کا تختۂ مشق بننے کے لئے تیار ہو گیا —— اور خدا کے فضل سے یہ صلاحیت میں نے تحریکی زندگی کے گزشتہ بارہ چودہ سال میں اپنے اندر ضرورت کی حد تک پیدا کر لی ہے۔ دوست نے بیاض نکالی اور غزل کے پیرائے میں مرتب کردہ خیالات سنانے لگے۔ پہلی ہی چیز سن کر ان کے بارے میں میرا تاثر بالکلیہ بدل گیا۔ بلکہ الٹا اس غیر شعوری اور دلائل و شواہد سے بے نیاز رائے پر ندامت ہوئی جو ان کے بارے میں قائم چلی آ رہی تھی۔ اس کے بعد میں شوق سے سنتا رہا اور وہ دلی جذبے سے ایک کے بعد دوسری چیز سناتے چلے گئے۔ آخر میں میں نے اپنے تاثرات سیدھے سادے طریق سے عرض کر دیے اور میرا خیال ہے کہ اس گفتگو سے ان کی ہمت دوچند ہو گئی ہو گی

پہلی چیز میں نے یہ محسوس کی کہ اس شخص کے سینے میں وہ میٹھا میٹھا درد اور وہ دھیمی دھیمی جلن موجود ہے جو شعر و فن کا بنیادی سرمایہ ہے اور جس کے بغیر کوئی تخلیقی کام نہیں کیا جا سکتا۔ آرزو کے شعلے بھڑکتے ہوئے خونِ جگر کی بو مجھے اس گمنام شاعر کے ہر ہر شعر میں محسوس ہوئی۔

دوسری چیز مشقی پختگی اور زبان کی صفائی و سلاست تھی جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ بہت ہی سادہ الفاظ میں سادہ خیالات کو پیش کرتے ہوئے ان میں فنی جمال پیدا کر دکھانا کھیل نہیں۔ میں نے دیکھا کہ میرا دوست اس لحاظ سے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

تیسری چیز سنجیدگیٔ فکر اور پاکیزگیٔ خیال تھی جس کا غزل جیسی لذتیت کی جولانگاہ میں کامیاب مظاہرہ کرنا بڑی بات ہے بلکہ بہت ہی بڑی بات ہے۔

چوتھی چیز جو میرے لئے جاذب توجہ بنی وہ شاعر کے ذہن میں کام کرنے والی روحِ اسلامیت تھی۔ دو چار اشعار سنتے ہی اندازہ ہو گیا کہ ان شاعرانہ کاوشوں کے پیچھے ایک مسلم دل دھڑک رہا ہے۔ غزل کی دنیا میں صراحت سے کام لینے کا تو اذن نہیں، لیکن کنایت کی چلمن کے پیچھے جو چہرۂ زیبا جھلکتا دکھائی دیتا ہے اس کے خدوخال ان عالمگیر صداقتوں اور آفاقی حقیقتوں پر مشتمل ہیں جن کے مجموعے کا نام اسلام ہے۔

یہ جن دوست کا میں نے تذکرہ کیا ہے، انہی کا شاعرانہ نام حبیب کیفوی ہے۔ اس تفصیلی ملاقات کے بعد سے ان کے لئے دل میں نئی جگہ پیدا ہو گئی ہے۔ حبیب صاحب کا وطن کشمیر ہے۔ برصغیر ہند و پاک کی تقسیم کے واقعہ نے ان سے چناروں اور زعفران زاروں کی اس سرزمین کو چھڑوایا اور مہاجر بنا کر پاک پنجاب میں لا ڈالا۔ اس گردشِ چرخ چنبری نے حبیب صاحب کے جذبوں کو بُری طرح مجروح کیا ہے۔ ان کے رستے ہوئے زخم شعروں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ کشمیر کی یاد میں انہوں نے متعدد نظمیں اور غزلیں کہی ہیں جو فنی پختگی اور جذباتی گہرائی کے ساتھ ندرت و جدت کا رنگ اپنے اندر رکھتی ہیں میرا خیال ہے کہ صرف کشمیر سے متعلق ان کے تاثرات کا سرمایہ ایک چھوٹے سے مستقل مجموعۂ کلام کی صورت میں آ سکتا ہے اور شاید وہ اس کی آرزو بھی رکھتے ہیں۔

حبیب کیفوی ان صاحبِ صلاحیت افراد میں سے ہیں جو بدقسمتی سے آگے بڑھنے کا راستہ نہیں پا سکتے اور شہرت کی محفلوں سے دور گوشۂ گمنامی میں عمر گزار دیتے ہیں۔ ایسے افراد کے کئے ہوئے کام بسا اوقات بہت سے شہرت یافتہ لوگوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں، لیکن دنیا ان سے استفادہ کرنے سے محروم رہ جاتی ہے۔

مذکورہ بالا ملاقات میں میں نے ان کو آمادہ کیا کہ وہ طلسمِ ہیچ مقداری میں اسیر نہ رہیں بلکہ اپنی کاوشوں کو سامنے لائیں۔ اس سلسلے میں چراغِ راہ کے صفحات میں اُن کے لئے جگہ کی پیشکش بھی کی گئی۔ حال ہی میں موصوف نے اپنے کچھ اشعار ہمیں بھجوائے ہیں۔ ان کو تعارفِ اولیں کے لئے ہم یکبارگی پیش کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ قارئین ان سے لطف اندوز ہوں گے اور اہلِ نظر ان کو جانچ پرکھ کر ان کی قدر و قیمت مشخص کریں گے۔ حبیب کیفوی صاحب سے یہ درخواست ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً چراغِ راہ کی محفل میں رونق افروز ہوتے رہیں۔ ان کے لئے ان کا مقام ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

غ

اگرچہ عجز سراپا تھے شرمسار آئے / ترے حضور یہ نشہ بھی ہم اتار آئے
کسے خبر ہے کہ کیا رنگ ہو طبیعت کا / ابھی تو مانگ رہا ہوں دعا بہار آئے
بدل سکا نہ ابھی ذہن آدمیت کا / پیامبر تو زمانے میں بے شمار آئے
بڑے عذاب میں کاٹی ہے زندگی میں نے / کہوں تو کون سنے کس کو اعتبار آئے

جو ان کے تمام سے کچھ اس قدر بیزار ہوا ۔۔۔ کسی بھی رنگ میں آئے مگر بہار آئے
خدا ہی جانے کہ کیا سحر تھا ان آنکھوں میں ۔۔۔ پلٹ کے آئے وہاں سے تو بیقرار آئے
جو کشانِ محبت کے پھر قدم نہ رکے ۔۔۔ طلب کی راہ میں سنگِ گراں ہزار آئے
تمام عمر کا سرمایہ جس کی نذر کیا
غضب ہوا کہ وہ بازی بھی آج ہار گئے

غ

سنے نہ جب کوئی اس دل کی آرزو کیا ہو ۔۔۔ تری نظر ہی نہ پوچھے تو آبرو کیا ہو
ہزار دل میں تمنائیں جرأت افزا ہوں ۔۔۔ سراغ ہی نہ ملے جب تو جستجو کیا ہو
اگر ہوئے بھی کبھی ملتفت تو فکر ہے یہ ۔۔۔ بیانِ حال ہو گیا طرزِ گفتگو کیا ہو
سما چکا ہو جہاں کیفِ لازوال ترا ۔۔۔ وہاں حقیقتِ صہبائے مشکبو کیا ہو
ابھی روایتیں قائم ہیں، سوچتا ہوں کبھی
ترے بغیر گلستاں کا رنگ و بو کیا ہو

غ

بندہ ہوں مرے پیشِ نظر اور ہی کچھ ہے ۔۔۔ منشائے خداوند مگر اور ہی کچھ ہے
گلشن کا سماں اور ہوا اور چمن اور ۔۔۔ گوشہ میں قفس کے تو خبر اور ہی کچھ ہے
خرمن میں تو یا شعلۂ بیباک ہے یا دود ۔۔۔ سینہ میں اگر ہے تو شرر اور ہی کچھ ہے
شاہیں تو بہر حال دلآویز ہیں لیکن ۔۔۔ اندازِ یہ ہنگامِ سحر اور ہی کچھ ہے
کیا کیا نہیں مانگی ہیں دعائیں مرے دل نے ۔۔۔ افسوس مگر ان کا اثر اور ہی کچھ ہے
محروم نہیں اب بھی ترے لطف سے لیکن
وہ خاص عنایت کی نظر اور ہی کچھ ہے

[illegible]

آسماں پر کمند پھینکی ہے　　آفریں تجھ پہ فقرِ خاک نشیں!
سجدے بیتاب ہوتے جاتے ہیں　　کیا ارادے ہیں آرزوئے جبیں؟
حسن چھپتا نہیں نگاہوں سے　　ڈھونڈھ لیتا ہوں میں کہیں نہ کہیں
کس کے جلووں سے دل منوّر ہے　　کون گذرا ہے میرے دل کے قریں
وہ سنورتے رہے نکھرتے رہے　　ہوش اڑاتے رہے دمِ تزئیں
اور بھی ہیں تلاش میں مصروف
اس کے متلاشیوں میں ہم ہی نہیں

غ

بخشا ہے غموں کا اک خزانہ　　فیّاض ہے کس قدر زمانہ
اظہارِ وفا ہے مشفقانہ　　اخلاص تمام تاجرانہ
مسکن ہے کوئی نہ اب ٹھکانہ　　باقی ہے چمن نہ آشیانہ
ہر زخم ہے داستانِ غمگیں　　ہر داغِ جگر ہے اک فسانہ
جانا پڑے کس طرف نہ جانے　　لکھا ہے کہاں کا آب و دانہ
خالی تو نہ جائے برق در سے　　جل جائے چلا سے آشیانہ
تسکیں کا یہی ہے ایک موجب　　انداز نظر ہے خسروانہ
کڑھتے ہی رہیں گے اہلِ دانش　　چلتا ہی رہے گا کارخانہ
لائیں بھی حبیب اب کہاں سے
وہ لذتِ بادۂ شبانہ

غ

آزمائش ہی ترا مقصد سہی پوچھا تو ہے　　شکر ہے تو نے کسی قابل مجھے سمجھا تو ہے
مشکلوں میں گھر کے نکلا ہے مرا عزمِ بلند　　فخر یہ کیا کم ہے تو نے مجھ کو پہچانا تو ہے
بے تکلف کرتا ہوں عرضِ مطلب بار بار　　میں نے گو دیکھا نہیں تجھکو مگر مانا تو ہے
دل کا ہر گوشہ منوّر جس کے فیضِ حسن سے　　سامنے میری نظر کے وہ رخِ زیبا تو ہے
اس کے در کی خاک سے لپٹے رہیں نہ کیوں جبیں
شوکتیں ہوں کی کمائے کون! یہ سوچا تو ہے

قسائی

نعیم صدیقی

(چند سال پہلے کا لکھا ہوا ایک خاکہ)

وہ ڈاکٹر تھا ـــ ڈاکٹر گلاب دین!

اجی چھوڑیئے ـــ ایم، بی، بی، ایس اس کے سامنے کیا چیز ہے۔ ڈاکٹری سند سے نہیں ہوتی، تجربے سے ہوتی ہے۔ اللہ جس کے ہاتھ میں شفا رکھ دے۔

وہ ایک یونانی حکیم کا بیٹا تھا جو پنساری سے اپنی قابلیت اور تجربے کے بل پر حکیم حاذق بن گیا۔ بیٹا کمپونڈر سے چھلانگ لگا کر ڈاکٹر ہو گیا۔ ڈاکٹر ہو گیا اور علاج کرنے لگا۔ علاج کرنے لگا اور مریضوں کی بھیڑ ہونے لگی، مریضوں کی بھیڑ ہونے لگی اور پیسہ آنے لگا!

ڈاکٹر گلاب دین کا بورڈ بہت ہی بڑے سائز کا تھا۔ ایم بی بی ایس کی جگہ اس نے نہ جانے کیا کیا انگریزی کے حروف لکھ رکھے تھے۔ لوگ حروف اور الفاظ کے دیوانے ہوتے ہیں اور یہ شخص کے سودائی۔ لیکن یہاں صرف حروف اور بورڈ ہی نہیں تھے، قابلیت اور مہارت بھی تھی۔ گلاب دین کا مطالعہ پیٹنٹ دواؤں کے اشتہاری لٹریچر تک وسیع تھا۔ دوسرے اس نے انجکشن کرنا سیکھ لیا تھا اور یہ بھی اس کو معلوم تھا کہ آج کل پنسلین کے انجکشن بہت کئے جاتے ہیں۔ سردرد ہو یا زخم لگ جائے، بخار ہو یا سرسام ہو جائے وہ ہر حالت میں پنسلین کا انجکشن ضرور کرتا تھا۔ سٹیتھ سکوپ یعنی ٹونٹی ہر وقت گردن میں لٹکی رہتی۔ بلڈ پریشر دیکھنے کا آلہ بھی اس کے ہاں زیر استعمال رہتا، گلا اور کان دیکھنے کے لئے وہ ٹارچ بھی استعمال کرتا۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس یہی کچھ ہوتا ہے۔ ایم بی بی ایس اور کیا کرے گا۔ اسلئے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ ضلعوں بھی ڈاکٹروں کا پاکستان میں قحط ہو رہا ہے اور کوئی جھولا بھی ڈاکٹر بن جائے تو لوگ جانیں اس کے حوالے کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر گلاب دین تو بہرحال ایک تجربہ کار ڈاکٹر تھا اور اس کے ہاتھوں ہزاروں مریض شفا بھی پا چکے تھے لاکھوں راہئ ملک بقا بھی ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے اس کا مرجع خلائق بننا متوقع تھا بھی۔

کہتے ہیں کہ جب اس نے ابتدا کی تو بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتا، جب کوئی مریض آتا تو وہ فوراً اس کے لئے اپنا آرام قربان کر دیتا، کوئی گھر پر بلاتا تو فیس لئے بغیر چلا جاتا، غریبوں کو دوا مفت بھی دے دیتا اور متوسط طبقہ سے ادھار سدھار پر بھی معاملہ کر لیتا۔ لیکن جب مردم در مور و ملخ "چشمۂ شیریں" کے گرد زیادہ جمع ہونے لگے تو اس نے اپنی خودی کو بحال کیا اور اپنے وقار کو استوار کیا اور اپنی قیمت چڑھا دی۔

صبح سات بجے دکان کھلتی اور مریض بچے، عورتیں، جوان اور بوڑھے جمع ہونے لگتے۔ ڈاکٹر صاحب کا انتظار ہوتا، بچے بلکتے اور مائیں ان کو تھپکتیں، بوڑھے کراہتے اور کمپونڈر سے پوچھتے کہ ڈاکٹر صاحب کب آئیں گے، جوان ہر چاپ کی آواز پر ٹھٹک کر دیکھتے کہ ڈاکٹر صاحب

زیادہ خراب ہوگی تو حکومت کے ایک بڑے کام میں گڑبڑ ہوگی اور یہ قومی نقصان ہوگا، نیز ایک موٹی تازی بکری ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ جمال دین نے کمپونڈر سے دوا کی چھ پڑیاں لیں اور ڈیڑھ روپیہ بڑے دکھ کے ساتھ ادا کیا اور ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہوا گلاب دین کے کلینک سے رخصت ہو گیا۔ وہ بچاس کئی روز سے اپنی اس بچی کے لئے اسی طرح خوار ہو رہا تھا پہلے گلے کی خرابی کے لئے، پھر دانت نکلنے کے دستوں کے لئے، پھر بخار کے لئے، پھر کالی کھانسی کے لئے اور پھر نمونیے کے لئے۔ وہ دکان چلاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ گلاب دین کے ضمیر نے کیا اسے اس بات پر کبھی متوجہ نہیں کیا کہ وہ ایک بچی کیلئے دو مہینے سے دوا دے رہا ہے اور وہ برابر بیمار چلی آ رہی ہے۔ وہ کیوں نہیں سوچتا کہ اس بچی کی اصل بنائے مرض کیا ہے۔ اور اس کے لئے بندھے ٹکے ہی نسخے میں کیا لایعنی پن ہے، آخر وہ کس ٹھنڈے مزاج کے ساتھ اس سے دس بارہ آنے روز — یعنی اس کی آمدنی کا آدھا — وصول کئے جا رہا ہے۔ مگر پھر وہ سوچتا کہ وہ ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ادھر ڈاکٹر سپرنٹنڈنٹ کرد دیکھنے سائیکل پر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ابھی اسے پانچ سو روپیہ ماہانہ پورا نہیں مل رہا۔ کسی نہ کسی طرح پنسلین کے ٹیکوں کی تعداد بڑھانی چاہیئے۔ اب تک اوسطاً روزانہ آٹھ ٹیکے مریضوں کو لگتے تھے، لیکن ایک بڑے ڈاکٹر جتنی آمدنی حاصل کرنے کے لئے اس نے طے کیا کہ آئندہ اوسط پندرہ ٹیکوں تک پہنچ جانا چاہیئے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ وہ ہر آنے والے مریض کو پنسلین کے ٹیکے لگوانے کی ہدایت کرنے لگا اور پھر بکریاں مجبور تھیں کہ اپنے آپ کو سرجن کی چھری کے نیچے ڈال دیں۔

مستری جمال دین نے جاتے ہی اپنی بچی کو دوا دی، اس نے قے کر دی، اور پھر قے کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ دودھ، چائے، پانی ہر چیز معدہ پہنچنے سے پہلے خارج ہونے لگی۔ شام تک بچی نڈھال ہو گئی۔ مستری جمال دین مغرب کے وقت تک خوراکیں پلانے کی کوشش میں مشغول رہا۔ آخر ڈاکٹر کو بلانے چلا۔ کلینک پر پہنچا تو وہ اتوار کی وجہ سے بند تھا۔ اس نے گلاب دین کے مکان کا اتا پتا بڑی دقتوں سے معلوم کیا اور وہاں جا پہنچا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب ایک دوست کے ہاں گئے ہیں۔ جمال دین ضرورت کا مارا وہاں بھی جا دھمکا۔ ڈرتے ڈرتے کوٹھی میں داخل ہوا۔ وہ دیر تک کھڑا رہا کہ کوئی نکلے تو وہ کچھ معلوم کرے، پھر جب بچی کی حالت کا نقشہ اس کی چشم تصور کے سامنے آیا تو اس نے جرأت پیدا کر دی۔ اس نے ایک کمرے میں روشنی دیکھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک لڑکا باہر آیا اور اس نے بتایا کہ ڈاکٹر گلاب دین آئے تھے مگر تھوڑی دیر ہوئی یہاں سے چلے گئے ہیں۔ جمال دین پھر گلاب دین کے مکان پر پہنچا۔ نوکر سے معلوم ہوا کہ وہ تو پتا کر کسی نامعلوم جگہ گئے ہیں کہ نو بجے پلٹوں گا۔ گلاب دین بے بس ہو کر گھر واپس چلا گیا۔ بچی اسی طرح نڈھال تھی۔ یہاں تک کہ جب ساڑھے نو بج گئے تو پھر ڈاکٹر گلاب دین کے دولت کدہ پر جا موجود ہوا۔ اطلاع ملی کہ جناب ڈاکٹر گلاب دین صاحب سو گئے ہیں۔ جمال دین نے نوکر سے کہا کہ ان کو جگانا ہے کیونکہ میری بچی کی حالت نازک ہے۔ بہت شور مچانے اور چیخنے چلانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں روشنی ہوئی اور نوکر اطلاع کرنے گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہیں سے چٹ لکھ دی کہ یہ دوا کسی دکان سے لے کر بچی کو پلا دو۔ اور پھر بتی گل کر کے سو گئے۔ مستری جمال دین نے چٹ لی اور آس پاس کی انگریزی دواؤں کی دکانوں کو دیکھا، وہ سب بند ہو چکی تھیں۔ آخر وہ چٹ لے کر گھر پہنچا اور بیوی کے ہاتھ میں تھما دی

آ گئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کہیں نو بجے آتے ــــــ جیسے کسی جلسہ عام میں لیڈر یا وزیر مقررہ وقت سے گھنٹہ دو گھنٹہ بعد آتا ہے تاکہ اس کی قدر و منزلت کو پہچانا جائے۔ مریضوں کا حال ایسے ہوتا جیسے قصاب خانے میں بھیڑ بکریاں جمع ہوں اور قصائی کا انتظار کریں لیجئے اب موذی قصاب پہنچ گیا اور بھیڑ بکریوں کی جان میں جان آئی۔ ہر ایک بے چین ہے کہ اس کے ذبح ہونے کی باری کب آتی ہے

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بامید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

ڈاکٹر گلاب دین کی ایک خاص ترتیب ہوتی تھی۔ پہلے ان لوگوں پر کرم ہوتا جو اچھی موٹی آسامیاں ہوتیں۔ پھر مڈل کلاس کے لوگوں میں سے اول نمبر پر وہ لوگ ہوتے جو سوٹ پہنے ہوں اور دوسرے نمبر پر وہ جو شیروانی پاجامے سے آراستہ ہوں اور تیسرے نمبر پر وہ جو محض قمیض پاجامے میں چلے آئے ہوں۔ اس کے بعد "پبلک"۔ یہی ہماری سوسائٹی کی فطری ترتیب و قدر ہے۔ اسے بھلا ڈاکٹر گلاب دین توڑ کر بھی سکتے تھے۔ اس دوران میں کراہنے والے کراہتے، کھانسنے والے کھانستے، رونے والے روتے، بولنے والے بولتے! ڈاکٹر گلاب دین اول درجہ کے لوگوں سے باتیں کرنے کے عادی تھے، سیاسی باتیں، فنی باتیں، گپیں، ملفوظات، سبھی طرح کی باتیں! ادھر یہ باتیں ہوتی رہتیں، ادھر عام بھیڑ بکریاں جن کا قصور یہ تھا کہ ان کی جیبوں پر چربی کم تھی، ڈاکٹر صاحب کے منہ کی طرف برابر دیکھتی رہتیں کہ کب وہ پوچھتے ہیں کہ تم کو کیا ہے۔ جب چربی والی بھیڑیں بکریاں چھٹ جاتیں تو مریل بھیڑوں بکریوں کی باری آتی اور چھری چل جاتی۔

مستری جمال دین حسب معمول بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا مگر ڈاکٹر صاحب ایک ٹھیکیدار سے ٹھیکے کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ٹھیکیدار پنسلین کا ٹیکہ لگوا کر جب اٹھ کھڑا ہوا تو مستری جمال دین نے ڈاکٹر صاحب کی طرف ایک عجیب نظر سے دیکھا ــــ یہ نظر کہہ رہی تھی کہ میرا بہت حرج ہو رہا ہے، میں بڑے دور سے آیا ہوں، میری دو سالہ بچی نمونیہ میں مبتلا ہے اور کھانستے کھانستے اس کا برا حال ہو رہا ہے، اب تک نہ جانے وہ کس حال میں ہو گی ــ مگر ڈاکٹر گلاب دین کو ایک ڈپو ہولڈر زیادہ اہم معلوم ہو رہا تھا، کیونکہ وہ پیسے بھی زیادہ دیتا تھا اور پھر شکر بھی کوٹے سے زائد دیتا تھا۔ ڈاکٹر گلاب دین بے وقوف نہیں تھا کہ وہ مستری جمال دین کے لئے کوئی جذباتی پن دکھاتا۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے مستری جمال دین تنہا رہ گیا۔ مگر اب ڈاکٹر صاحب ایک کینی کا نام پڑھنے لگ گئے۔ آخر جمال دین ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا تاکہ ان کو محسوس ہو کہ مستری جمال دین بھی کلینک میں آیا ہے۔ پھر اس نے جرأت کر کے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب بھی کر ڈالا اور بچی کی ساری کیفیت بھی بیان کر دی، اور یہ درخواست بھی کر دی کہ وہ ذرا اسے چل کے دیکھ لیں۔ مرض پیچیدہ ہے نمونیہ کا دورہ ہے، شدت کی کھانسی ہے اور تیز بخار ہے۔ مگر ڈاکٹر گلاب دین نے نسخہ لکھ دیا اور جمال دین سے کہہ دیا کہ دیکھنے کی ضرورت نہیں، حال معلوم ہو گیا ہے۔ آخر بچارا گلاب دین کیسے جاتا جبکہ اسے پہلے سے محکمہ ریلیف ایکشن کے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے بلا رکھا تھا، نقصان بچاس کا اور خراب تھا اور وہ جمال دین کی بچی سے زیادہ تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ پھر فیس بھی دس روپے ادا کرنے تھے اور سواری کا خرچ الگ۔ حالانکہ مستری جمال دین زیادہ سے زیادہ دو روپے دیتا اور وہ بھی اللہ کا واسطہ دے کر۔ ڈاکٹر گلاب دین نے سوچ نہ کیا کہ اگر جمال دین کی دو سالہ بچی مر بھی گئی تو دنیا کے نظام میں خلل واقع نہیں ہو گا، لیکن اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب کی طبیعت

کر دے گی۔ یہ بات کہ اس کے محلے میں ... تھوڑی دیر کے بعد مستری جمال دین بے دم ہو کر بستر پر گر گیا پھر کوزہ کی کھانسی اُٹھی اور درد کی شدت سے جب کر اہنے لگی تو وہ پھر کل کھڑا ہوا بغیر یہ سوچے کہ جانے کدھر ـــ گھر کے دروازے سے نکل کر اس نے راستے [illegible] ارادہ کیا کہ وہ کرم بخش پنساری کے ہاں جائے گا وہی جس کی چھوٹی سی دکان میں الٹی سیدھی گندی بوتلیں اور ڈبے پڑے [illegible] اور ڈاکٹر گلاب دین جس کا ہمیشہ اپنے کلینک میں بیٹھ کر مذاق اڑایا کرتا تھے۔ واقعی کرم بخش مذاق اڑانے کے قابل تھا اور وہ حکیم وغیرہ بھی نہیں تھا لیکن جو کچھ بھی ہو، قصائی نہیں تھا!

وہ آدھی رات کو اٹھ کھڑا ہوا، مستری کے ساتھ چل پڑا، اس کی بچی کو دیکھا، محبت بھرے ہمدردانہ کلمات سے تسلی دی، فیس لینے سے انکار کر دیا، رات کو دکان کھول دی۔ اس کے گلے پر گھسا ہوا بادام پان کے ساتھ لگا کر باندھے، مالش کرنے اور عرق گاؤزبان کے ساتھ اکسیر نمونیہ دینے سے فوراً آرام ہو گیا۔ وہ سو گئی، رات بخیریت گزر گئی۔ مگر حالت پھر بگڑی اور بچی اگلے ہی روز صبح سویرے ختم ہو گئی۔ دس بجے اس کا جنازہ ڈاکٹر گلاب دین کی دکان کے سامنے ہی سے گزر رہا تھا اور اس وقت گلاب دین ایک مریض کو پنسلین کا انجکشن لگا رہے تھے اور درد کی وجہ سے اس کے منہ بگاڑ لینے پر معذرت کر رہے تھے کہ کیا کیا جائے ڈاکٹر کا کام کچھ قصائی کا سا ہوتا ہے۔

مستری جمال دین اس روز سے ایک ڈاکٹر گلاب دین ہی سے نہیں، ڈاکٹروں کی پوری برادری سے روٹھ گیا ہے اور اس نے اپنے آپ کو پنساریوں کے حوالے کر دیا ہے جو چاہے کیسے بھی ہوں، انسانیت سے خالی نہیں ہوتے مگر مستری جمال دین ان پڑھ ہونے کی وجہ سے خواہ مخواہ ضد میں پڑ گیا ہے، ایک ڈاکٹر، بس ڈاکٹر ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ انسان بھی ہو۔

قطعہ

محسن بھوپالی

روشنی کے بغیر پروانے
کس قدر بے قرار ہوتے ہیں
چاند کے صرف اک تبسم پر
کتنے تارے نثار ہوتے ہیں

کوئٹہ، قلات ڈویژن کی صحافت پر ایک نظر

اختر واحد قاضی

اختر واحد قاضی صاحب کا یہ مقالہ ہمیں پاکستان کے ایک ایسے دور افتادہ مگر اہم حصے کے دائرۂ صحافت میں لے جاتا ہے جس سے پاکستان کی کثیر آبادی پوری طرح آشنا نہیں ہے۔ مقالہ اجمال کے باوجود جامعیت اور وسعت نظر کا مظہر ہے۔ اتنی بات البتہ ہم ضرور عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ بلوچستان کے اخبارات کے متعلق جو رائے مقالہ نگار نے ظاہر کی ہے، ان کی دیانت پر اعتماد رکھنے کے باوجود ہم اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتے، کیونکہ بلوچستان کی صحافت کے بارے میں براہ راست ہماری اپنی معلومات بقدر صفر ہیں۔

ہندوستان میں تحریک خلافت اور ترک موالات اگرچہ خالص سیاسی تحریکیں تھیں لیکن ان تحریکوں کا اثر ادب اور صحافت پر نمایاں پڑا۔ اس دور میں گو بہت سے ادیبوں اور صحافیوں نے مقرروں کی جگہ لے لی، اس کے باوجود ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان تحریکوں نے صحافت کا رخ موڑ دیا لیکن ادب ۱۹۳۶ء تک اپنا کوئی واضح راستہ متعین نہ کر سکا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد نئے ادب[1] یا بہ الفاظ دیگر ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کا مقصد زندگی اور ادب میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ چونکہ ہندوستان کی فضا اس کے لئے کافی سازگار تھی اس لئے یہ جلد ہی زور پکڑ گئی۔ ہر تحریک کی ابتدا چونکہ جوش و خروش سے کی جاتی ہے اس لئے اس میں انتہا پسندی اور بے اعتدالی پیدا ہو گئی۔ آسکر وائلڈ اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی تقلید کی گئی اور بہت سے اہل قلم فرائیڈی نظریات کے مبلغ بن گئے جو شریعت کے سراسر منافی تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بھوک اور افلاس کا ڈھنڈورا اس زور و شور سے پیٹا گیا کہ عوام چکرا گئے اور ترقی پسند ادیبوں کو روکنے کے لئے "خدا پرستوں کے گروہ" کو میدان میں آنا پڑا۔ اب جو رد عمل شروع ہوا تو ترقی پسندی کے مبلغ بھی سوچنے پر مجبور ہوئے۔ حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے، وہ خیالات جو انکا مسلک دنیا بھی بدلتی چلی گئی اور آخر وہ وقت آگیا کہ ترقی پسند ادیب بھی مجبوراً اعتدال پسند ہو گئے۔ گو آج وہ اقرار کرنے سے ہچکچاتے ہیں لیکن جلد ہی وہ وقت بھی آئے گا جب وہ اس تلخ حقیقت اور اپنی غلطیوں کا خود اعتراف کریں گے۔[2]

---

[1] بظاہر تو نئے ادب کی تعریف یہی کی گئی مگر حقیقت صرف اتنی ہی نہ تھی کہ زندگی اور ادب کے درمیان رشتہ جوڑا جائے بلکہ اصل مدعا یہ تھا کہ زندگی اور ادب کے درمیان جدید ملحدانہ و مادہ پرستانہ خصوصاً اشتراکی فکر کے ذریعے جوڑ لگایا جائے۔ (چراغ راہ)

[2] اگر آپ نے وہ خفیہ خود تنقیدی رپورٹ پڑھی ہوتی جو کمیونسٹ پارٹی کی مرتب کردہ تھی اور چراغ راہ میں شائع ہو چکی ہے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ اعتراف ہو چکا ہے۔ (چراغ راہ)

۱۹۲۰ء کے بعد ہندوستان بھر میں مغربی مصنفوں کا اندھا دھند اتباع کیا گیا، حالانکہ خود مغرب نے ان عریاں نگاروں کے خلاف غیر مقبولیت کا فتویٰ صادر کر دیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں اس وقت یہ تحریک مقبول ہو رہی تھی۔ بالکل اسی طرح تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے سابق صوبہ بلوچستان میں صحافت کا حال ہوا۔ ہندوستان کی صحافت پر تحریک خلافت اور ترک موالات نے جو اثرات ڈالے وہی اثرات تقسیم ہند نے سابق صوبہ بلوچستان کی صحافت پر ڈالے۔

بلوچستان میں انیسویں صدی کے آخر میں بعض اخبارات کا اجرا ہو چکا تھا۔ یکم نومبر ۱۸۸۸ء میں سب سے پہلا ماہنامہ اخبار "بلوچستان ایڈورٹائزر" (BALN : ADVER-TISER.) شائع ہوا۔ یہ اخبار بعد میں (۲۲ اگست ۱۸۸۹ء) ہفت روزہ "بارڈر نیوز" (BORDER NEWS) کے نام سے نکلنا شروع ہوا۔ یکم جنوری ۱۸۹۰ء میں ایک اور اخبار "بلوچستان گزٹ" کے نام سے جاری ہوا۔ یہ تینوں اخبار وکٹوریہ پریس میں چھپتے رہے۔ ان کی اشاعت اڑھائی تین سو سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ تینوں اخبار انگریزی کے تھے۔ اول تو یہاں پڑھا لکھا طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا، اور دوم انگریزی میں اخباروں کا چھپنا عوام کے لئے کوئی دلچسپی رکھتا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں ایک اخبار "ڈیلی بلیٹن" (DAILY BULLETIN) نکلا۔ لیکن یہ بھی اول الذکر اخبارات ہی کی طرح تھا۔ البتہ اس سے بعد البرٹ پریس نے ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی کہ جہاں وہ انگریزی میں "بلوچستان ہیرلڈ" (BALN : HERLAD) شائع کرتا تھا وہاں ایک اردو اخبار "سرحدی اخبار" کے نام سے بھی نکالنا شروع کیا۔ ایک خاص بات اس سلسلے میں قابل ذکر ہے کہ بلوچستان میں انڈیا پریس ایکٹ (XXY OF 1867) کا نفاذ نہیں تھا بلکہ یہاں اخبارات کا وجود تمام تر نوٹیفیکیشن نمبر ۱-۲۹۵۱ مورخہ ۲۵ جون ۱۸۹۱ء کے رحم و کرم پر تھا۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مندرجہ بالا تمام اخبارات انگریزی سامراجیت کے پراپیگنڈا آرگن تھے اور کوئی اخبار عوام کی نمائندگی نہ کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ عوام کو بھی ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

۱۹۳۷ء میں جب کانگریسی وزارتیں بنیں اور کانگریس نے صوبہ بلوچستان پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی تو یہاں سوائے چند انگریزی اخبارات کے اور کچھ دکھائی نہ دیا اور وہ بھی حکومت کے مبلغ ہونے سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے۔ کانگریس کو اپنا پراپیگنڈا کرنے کے لئے کسی مقامی لیڈر اور اخبار نویس کی ضرورت محسوس ہوئی جو میدان ہموار کرے۔ آخر یہ فال صمد اچکزئی کے نام نکلی۔ صمد اچکزئی کی شخصیت اس وقت کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی تھی لیکن بعد میں کانگریس کی حمایت کی وجہ سے بلوچستان کے گاندھی مشہور ہو گئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ موصوف نے کانگریس کے لئے یہاں کافی کام کیا۔ آخر دسمبر ۱۹۳۸ء میں ہفت روزہ "استقلال" نکالا گیا۔ جس کے سب سے پہلے ایڈیٹر اللہ بخش سلیم ہوئے لیکن جلد ہی ان کی جگہ محمد حسن نظامی صاحب نے لے لی جنہوں نے کافی عرصہ کام کرنے کے بعد اس سے کنارہ کشی کی۔ سب سے آخری ایڈیٹر محمد درانی ہوئے جنہوں نے بھی معیار قائم رکھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس کی پالیسی شدید ہو گئی اور مخالفت شروع کر دی اور تخریب ہی مقصد ٹھہرایا۔ ایک بار ضمانت بھی ضبط ہوئی اور اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں حکومت نے اسے بند کر دیا۔ ابتدا میں یہ اخبار عوام میں کافی مقبول ہوا لیکن اس کے اجرا کے تقریباً ایک سال بعد ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب قاضی عیسیٰ نے ہفت روزہ "الاسلام" نکالا تو اس پر کافی اثر پڑا۔ اول الذکر کانگریسی اور آخر الذکر مسلم لیگی پالیسی کا حامل تھا۔ اس لئے دونوں میں خوب مقابلے ہوتے رہے۔ "الاسلام" کے مدیر بلوچستان کے مشہور صحافی مولانا عبدالکریم تھے۔ ۱۹۴۲ء میں قاضی عیسیٰ اس اخبار سے بالکل الگ ہو گئے لیکن مولانا باوجود مالی مشکلات کے اسے باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ یہ

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان بھر کے مسلمان پاکستان کے تخیل سے آشنا ہو چکے تھے۔ گو صوبہ بلوچستان پر لیگ کے اثرات ابھی بہت مدھم تھے لیکن اتنا ضرور تھا کہ مسلم عوام کانگریس کی ہندو نوازانہ پالیسی سے متنفر ہو چکے تھے، اگرچہ کانگریسی اخبار "استقلال" کی حمایت کرنے والا ایک اور ہفت روزہ اخبار "پاسبان" جون ۱۹۳۹ء میں مولانا عبداللہ صاحب جاری کر چکے تھے۔ اخبار پاسبان تقسیم ملک تک کانگریس کا ہمنوا رہا لیکن پاکستان کے قیام کے بعد اس کی پالیسی یکسر بدل گئی۔ یوں مولانا موصوف آج بھی لیگ کے ہمنوا ہیں۔ اخبار کا معیار بھی اب پہلے سے بہت گر چکا ہے پھر بھی مولانا موصوف یہاں کے صحافیوں میں اپنے تجربہ اور کہنہ سالی کی وجہ سے خاص مقام رکھتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب پھر آزادیٔ ملک کا سوال ہندوستانی عوام کے ذہنوں میں ابھرا تو اس وقت مسلم لیگ صحیح معنوں میں ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی اور ہر طرف سے پاکستان کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ کانگریس نے ہر جگہ مسلم لیگ کو مختلف طریقوں سے ناکام بنانا چاہا اور مسلمانوں کو پاکستان کے مطالبے سے باز رکھنا چاہا چنانچہ اس نے بلوچستان میں بھی جال بچھانا شروع کر دیا اور یہاں اپنے پراپیگنڈے کے لئے دو اور اخبار نکالے جو دونوں قابل ذکر ہیں۔ پہلا اخبار لالہ چرن داس ڈھوندی نے "بلوچستان سماچار" کے نام سے ۱۹۴۲ء میں نکالا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا اخبار مہاسبھائی اخبار تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ کانگریس کا ہمنوا بھی تھا۔ دوسرا اخبار پندرہ روزہ "صداقت" مسٹر اے ایم کابلی نے اگست یا ستمبر ۱۹۴۲ء میں جاری کیا۔ آپ اندازہ لگا لیجئے کہ کانگریس کے چار اخبار اور مسلم لیگ کی حمایت میں شائع ہونے والا صرف "الاسلام" تھا۔ ۱۹۴۶ء میں قاضی فضل احمد نے (جنہوں نے صحیح معنوں میں بلوچستان کے عوام کو مسلم لیگ اور پاکستان سے روشناس کرایا اور ملک دوست تحریک چلائی) میں سے ایک یعنی ہفت روزہ "جمہور" کا اجرا کیا لیکن حقیقت میں یہ اخبار نہ ہونے کے برابر تھا۔ اسی دوران کشمکش میں ہفت روزہ "تنظیم" نے "الاسلام" کی امداد کی۔ "تنظیم" کے مالک جعفر جان جمالی اور ایڈیٹر پاکستان کے مشہور ناول نویس نسیم حجازی تھے۔ یہ اخبار اکتوبر ۱۹۴۲ء میں نکلا۔ اس اخبار کا اصل مقصد حقیقت میں جاگیرداروں اور زمینداروں کا تحفظ اور ان کی ترجمانی کرنا تھا۔ چونکہ اس کے ایڈیٹر نسیم حجازی کٹر مسلم لیگی تھے اور لیگ اس وقت پورے عروج پر تھی اس لئے اخبار کی پالیسی پر گہرا اثر پڑا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ تقسیم ہند نے بلوچستان کی صحافت پر گہرے اثرات ڈالے لیکن یہاں کی بدقسمتی ہے کہ آج بھی یہاں کوئی ایسا اخبار نہیں جسے عوام ذوق سے پڑھتے ہوں بلکہ لوگ لاہور اور کراچی کے اخبارات کے منتظر رہتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ شام کو آپ لاہور اور کراچی کا کوئی اخبار کسی بک سٹال پر بڑی مشکل ہی سے حاصل کر سکیں گے۔

دوستانہ مراسم اور تعلقات بے لاگ تنقید کی راہ میں سنگ گراں ہیں اور یہ بات ایک نقاد کے لئے بہت بڑی رکاوٹ ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار بے باکی سے کر سکے۔ بہرحال کوشش کرتا ہوں کہ حق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

اس وقت بلوچستان (دوسرے لفظوں میں کوئٹہ) کہ لیں کیونکہ تقریباً سب اخبارات یہاں ہی سے شائع ہوتے ہیں) سے تیس کے لگ بھگ اخبارات شائع ہوتے ہیں جن میں روزنامے، ہفت روزے، پندرہ روزے اور ماہنامے شامل ہیں [illegible] سال میں دو تین روپے [illegible] سامنے آتا ہے۔ کسی ہفت روزہ کو کبھی [illegible] یہاں [illegible] کی وجہ سے مشکلات [illegible] نہیں [illegible] اخبار [illegible]

مضامین کا کام نہیں کرتا۔ اس اخبار کا ایک ... سننے میں آتا ہے کہ یہ اخبار ایڈیٹر نے [illegible] دیکھا ہے۔ حکومت نے اسے [illegible] اخبارات کو [illegible] مضمون کا [illegible] علاوہ [illegible] دین کی [illegible] اور مضامین [illegible] کے اخبارات یا رسائل سے نقل کئے جاتے ہیں۔ یہ اخبار ۱۹۵۲ء میں خلیل صدیقی [illegible] سب سے [illegible]

ہفت روزہ اخباروں میں "میزان" قابلِ ذکر ہے جسے ہم بلوچستان کی صحافت کے اعتبار سے معیاری کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر اور مالک وہی ہیں جو اخبار "الاسلام" کے مدیر مولانا عبدالکریم صاحب ہیں۔ جب اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا تو انہوں نے "الاسلام" کو بند کرکے اس کی جگہ ہفت روزہ "میزان" نکالا اور ستمبر ۱۹۴۷ء سے اب تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس میں ایک صفحہ بچوں کے لئے بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات اچھے مقامی شعرا اور ادبا بھی اس کی قلمی معاونت کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے دیگر اخبارات کی طرح یہ کسی [illegible] نہیں اچھالتا۔

تیسرا ہفت روزہ اخبار "ترقی" قابلِ ذکر ہے۔ یہ محکمہ تعلقاتِ عامہ حکومت مغربی پاکستان کا ہے۔ ایک یونٹ سے پیشتر اس کا نام "اخبار بلوچستان" تھا۔ اس کے مدیر پاکستان کے مشہور ادیب جناب اقبال سلطان صاحب ہیں۔ مدیر گو فاضل ہیں لیکن اخبار کو کم از کم میں معیاری نہیں کہہ سکتا۔ باہر کے شعرا اور ادبا کا تو ذکر ہی کیا مقامی شعرا اور ادبا بھی اس کے معیاری نہ ہونے کی وجہ سے اس میں کچھ لکھنے سے کتراتے ہیں۔ اہلِ قلم کی بیزاری کی دوسری وجہ اس کی عجیب و غریب پالیسی ہے جس کے اندر کسی شاعر یا ادیب کے لئے کام کرنے کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔

انگریزی میں ایک ہفت روزہ اخبار "کوئٹہ ٹائمز" کے نام سے (QUETTA TIMES) البرٹ پریس سے شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کی کوئی خصوصیت نہیں سوائے اس کے کہ یہاں سے انگریزی میں شائع ہونے والا یہ واحد اخبار ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں یہ بہت مشکل ہے کہ میں تمام اخبارات کا فرداً فرداً ذکر کروں جن کے متعلق میں نے مختصراً ہی لکھا ہے۔ ان پر سرسری طور پر روشنی ڈالی ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ قابلِ ذکر اخبارات "رہبر"[1]، "نسوان"، "تعمیر بلوچستان"، "پکار" اور "قاصد" ہیں۔

پشتو میں ایک رسالہ "پشتو" یہاں سے مولانا دوست محمد صاحب نکالتے تھے جو محض اس لئے بند ہو گیا ہے کہ صاحب اور ان کے دیگر رفقا میں کچھ تنازعہ ہو گیا تھا۔ ایک ہفت روزہ اخبار "نوائے وطن" قابلِ ذکر ہے جس کے مدیر غلام محمد [illegible] صاحب تھے جو اب بند ہو چکا ہے۔ ایک اور ہفت روزہ اخبار [illegible] شائع ہوا کرتا تھا جسے یہاں کے مشہور کمیونسٹ انجم قزلباش صاحب ترتیب دیتے تھے۔ انجم صاحب کے جیل جانے کے بعد ۱۹۵۴ء میں بند ہو گیا۔

اس سلسلے میں ایک بڑی تلخ حقیقت ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے ندامت ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں سے کوئی علمی ادبی یا نیم ادبی پرچہ شائع نہیں ہوتا۔ گو [illegible] ایک سالانہ رسالہ "بولان" کے نام سے اگست ۱۹۳۹ء میں [illegible] جاری ہوا تھا [illegible] مضمون کے اعتبار سے بھی کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

(باقی بر صفحہ ۱۱)

۱؎ یہ اخبار [illegible] اور [illegible] عورتوں کے متعلق کچھ لکھتا ہے۔ میری ذاتی رائے اس بارے میں یہ ہے کہ جناب اے۔ آر۔ [illegible] کو اس کا نام [illegible] ۲؎ یہ [illegible] پڑھا نہیں جا سکا (چراغ ماہ)۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے!

——— ؟

برسات کی ایک ابرآلود شام تھی۔ میرزا صاحب چائے پر مدعو تھے اس لئے سفید سوٹ زیب تن کئے سائیکل پر سوار چلے جا رہے تھے ایک پرانا دوست سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

"اوہو حیدر میرزا چلے آ رہے ہیں" دوست نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا میرزا صاحب نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور بولے "کہو بھئی افضل کیا حال چال ہیں؟ آج کل کیا کرتے ہو، کہاں ہوتے ہو، معلوم ہے کتنے عرصہ کے بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے" افضل نے ایک سیکنڈ کے لئے سوچا پھر مسکرا کر بولا۔

"تمہارے پہلے سوال کا جواب ہے اچھا ہوں، دوسرے کا سرکاری ملازمت کرتا ہوں، حیدرآباد شہر میں ہوتا ہوں اور ہم تقریباً چار برس کے بعد ملے ہیں۔ یہ تمہارے تیسرے اور چوتھے سوالوں کے جواب ہیں۔"

حیدر میرزا ہنس پڑے اور دوست میں دلچسپی لیتے ہوئے اُسے پاس ہی ایک گلی تھی اس طرف لے گئے۔ "آؤ دو منٹ یہاں ٹھہر کر باتیں کرتے ہیں۔"

"ہاں کوئی مناسب ہوٹل بیٹھنے کے لئے اس علاقے میں دکھائی نہیں دیتا۔ پھر تم نے بھی سفید شارک سکن کا بے داغ سوٹ پہن رکھا ہے۔"

"دیکھو بھئی نظر نہ لگا دینا۔ بالکل نیا ہے۔ پہلی مرتبہ پہن کر نکلا ہوں۔ اب تم سے کیا چھپانا۔ میرے ہونے والے سسر نے مجھے چائے پر بلا رکھا ہے۔ آج تک اتنا بدحواس نہیں ہوا...... آخر یہ میری شادی کا معاملہ ہے۔ معلوم وہ کیا سوال کر ڈالیں۔ نہ جانے میں کیسا جواب دوں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ لڑکی کو میں دیکھ چکا ہوں۔ میری ہمشیرہ کی ہم جماعت ہوا کرتی تھی......"

حیدر میرزا یہ کہہ ہی رہے تھے کہ انہوں نے محسوس کیا گویا پانی کی بوندیں سی ان کے شانوں پر گر رہی ہیں۔ پہلے تو سمجھے کہ شاید بارش آگئی۔ مگر فوراً ہی جب پانی تیزی کے ساتھ ان پر پڑا تو دو قدم پیچھے کو ہٹے منہ موڑ کر اوپر کی طرف دیکھا۔ ایک دو منزلہ مکان تھا جس کی اوپر کی منزل میں ایک صاحب کھڑکی سے گردن باہر کو نکالے پانی کے غرارے کر رہے تھے۔ میرزا صاحب نے رومال نکال کر گردن پر پھیرا۔ کچھ خفیف سے ہوئے۔ پھر سوٹ پر نظر پڑی۔ تمام ستیاناس ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی دعوت کا پروگرام بھی یاد آ گیا۔ غیرت سے رعب داب والے آدمی تھے گرجدار آواز میں للکارے۔

"کون بدتمیز ہے جو اس طرح راہ چلتوں پر پانی گرا رہا ہے؟"

کھڑکی والا شخص ہنستی ہوئی آواز میں بولا۔

"صاحب آپ ہی ذرا ہٹ کر کھڑے ہوتے۔ میرا گلا بیٹھا ہوا ہے۔"

———

جنوری ۶۱ء میں لاہور میں۔ پاکستان اور ایم۔سی۔سی کرکٹ ٹیموں کا ٹیسٹ میچ کھیلا گیا جسے دیکھنے کو ایک دنیا جاتی تھی۔ ایک دوست کے اصرار پر اتوار کے روز میں بھی چلا گیا۔ میچ شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی بیٹھنے کی جگہ ختم ہوگئی تھی۔ لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر جمے بیٹھے تھے۔ کرسیاں چھوٹی چھوٹی تھیں اور اس طرح ساتھ ساتھ جوڑ کر رکھی گئی تھیں کہ آدمی صرف بندھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ بیشمار لوگوں کو نیچے دریوں پر بیٹھنا پڑا۔ جنہیں یہ منظور نہ تھا وہ کھڑے رہے۔ مگر کھیل شروع ہوچکنے کے آدھ پون گھنٹہ کے بعد ایک صاحب ہمارے ENCLOSURE میں آئے جن کے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں۔ ایک بڑا سوٹ کیس اور کمبل میں لپٹا ہوا ایک بستر دوسرے سازو سامان کے علاوہ ان کے ساتھ آیا۔ پہلے نصف گھنٹہ تو یہ ذات شریف ہر طرف جگہ ڈھونڈتے پھرے کہ کہیں بیٹھ جائیں۔ مگر جب کامیابی نہ ہوئی تو راستے میں کھڑے ہوگئے۔ اگلی لائین میں میرے سامنے کی کرسی پر جو شخص بیٹھا تھا وہ سگریٹ بیرے سے خریدنے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ یہ صاحب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ صف کو چیرتے ہوئے ان کی خالی کرسی کی جانب لپکے اور کھٹاک سے اس پر بیٹھ گئے۔ ساتھ کی کرسیوں پر اس شخص کے بھائی بند بیٹھے تھے انہوں نے اس زبردستی پر بہت لے دے کی مگر یہ صاحبزادے ٹس سے مس ہونے والے نہ تھے۔ ڈھیٹ بن کر بیٹھے رہے اور ترکی بہ ترکی جگہ والے کو اور اس کے ساتھیوں کو جواب دیتے رہے۔ اس اثنا میں سوٹ کیس پکڑ کر اپنے پاس جما لیا جس پر ان کے ساتھ والی عورت آ دھمکیں۔ کمبل میں بندھا ہوا بستر میرے گھٹنوں پر آ رہا۔ اس کے بعد ان صاحب نے جو طوفان بدتمیزی مچایا ہے وہ ہر کس و ناکس کے لئے عذاب جان بن گیا۔ پانچ دس منٹ بعد ڈبیہ میں سے پان نکال کر کھاتے۔ پان کھانے سے بحث نہیں۔ اس کے بعد بے تحاشہ ادھر ادھر پیک کے پرنالے بہاتے۔ پان نکال کر کھاتے۔ پان کے ساتھ ساتھ سگریٹ نوشی کا بھی بے حد شوق تھا۔ ماچس کہیں کھو بیٹھے۔ آس پاس والوں کے ساتھ پہلے ہی تناؤ پیدا ہوچکا تھا۔ اب سگریٹ منہ میں لگا گھوم کر ہر بار میرے دوست کا منہ تکنے لگتے اور میرے دوست لائیٹر جلا کر آگے کر دیتے۔ اسی پر اکتفا نہیں۔ پھر انہوں نے ہر کس و ناکس سے گفتگو بھی شروع کر دی۔ "—— وقار آؤٹ کیوں نہیں ہوتا؟" "—— حنیف کب سنچری بنائے گا" "—— فضل محمود کہاں ہے؟" وغیرہ وغیرہ آس پاس بیٹھے ہوئے تماشائیوں میں کچھ منچلے بھی تھے وہ بدتمیز نقلیں اتارتے اور ان کی بھد اڑاتے رہے مگر صاحب ڈھٹائی ہو تو ایسی۔ سب کچھ جان بوجھ کر بھی یا اپنی فطرت سے مجبور عادات سے باز نہ آئے۔ رفتہ رفتہ ہر کوئی ان کا مضحکہ اڑانے لگا۔ مختصر یہ کہ اپنے ماحول کا پاس و احترام نہ کرنے کے باعث یہ صاحب ایک اچھا خاصہ تماشہ بن گئے۔

عزیز بابال

آبلہ پا کوئی اس دشت میں آیا ہوگا
یہ سرِ راہ چراغ اس نے جلایا ہوگا

امتحانِ اشہبِ عمر کی وہی رفتار رہ گیا
میرے نالوں نے اثر کچھ تو دکھایا ہوگا

لگتا ہے کہ مری زنجیر چھنک جاتی ہے
اک اجالا سرِ زنداں نظر آیا ہوگا

مژدہ اے شوق وہ زنجیر و سلاسل آئے
سر پہ اب خنجر و شمشیر کا سایا ہوگا

ایک مشعل سی فروزاں ہے سرِ دامنِ شب
کسی میکش نے کہیں جام اٹھایا ہوگا

منزلیں گرد سفر ہیں کہ کسی راہی نے
اپنی آنکھوں میں کوئی خواب چھپایا ہوگا

ٹوٹنے کو ہے فضا مہرِ تبسم شاید
رات نے صبح کا افسانہ سنایا ہوگا

خاک چھانی ہے بہت دل نے غمِ دوراں کی
اس کو یہ دشت بھی کچھ راس نہ آیا ہوگا

کوثر نیازی

باوجودِ رازِ بے چینی عیاں ہونے لگی
چشمِ ناشستہ ہی دل کی ترجماں ہونے لگی

خیر مجھ پر تو رہی تھی آپ کی مشقِ ستم
ساری دنیا آپ سے کیوں بدگماں ہونے لگی

جب جوانی تھی امنگوں پر بڑھاپا آ گیا
اب بڑھاپا ہے تو ہر خواہش جواں ہونے لگی

اللہ اللہ تیرے دیوانوں کی راحت کا خیال
ریگِ صحرا بھی حریر و پرنیاں ہونے لگی

آہ پر نگرانیاں، فریاد پر پابندیاں
بے زبانی اب مجھ کو بھر کی زباں ہونے لگی

طبعِ نازک کو رہِ الفت میں جلنے کیا ہوا
ہر مصیبت باعثِ آرامِ جاں ہونے لگی

کیا دیارِ دوست اے کوثر قریب آنے کو ہے
دل کی ہر دھڑکن خوشی سے نغمہ خواں ہونے لگی

(''لوحِ گل'' کا ایک ورق)

بانو صدیقی

غ

وہ تصوّر، وہ تصوّرِ انتظار
اللہ اللہ درد کی فصلِ بہار

اک طرف ٹوٹا ہوا سازِ امید
اک طرف میرا دلِ امیدوار

زندگی کے اُف، دہکتے ماہ و سال
ہر نفس سوزِ نہاں سے بے قرار

مدتوں سے فصلِ گل آئی نہیں،
اس طرف بھی آ کبھی بادِ بہار

پے بہ پے رقصِ شرر جاری رہا
زندگی بنتی گئی شاخِ چنار

خامشی کو گفتگو بننا پڑا،
کام کچھ آئے نہ جب یہ چنگ و تار

کچھ بیادِ عہدِ رفتہ گیت ہوں
کچھ بیادِ شہرِ زرینِ نگار

آخرش میری اُمیدیں بن گئے
کچھ لرزتے سائے زیرِ شاخسار

شبنم سبحانی

غ

ہمارے دم سے یہ سودائے عشقِ یار تو ہے
جنونِ دل بہ تہِ گلشن میں اک بہار تو ہے

گراں رہی مرا خونِ جگر مگر ہمدم!
پھر آج گل رخِ ہر غنچہ تابدار تو ہے

میں چل پڑا ہوں بعد شوقِ جادہ پیمائی
نہ کارواں ہو نہ رہبر ہو، رہگزار تو ہے

ہوا لہٰذا اب بھی مداوائے غمِ نہ ہو لیکن
کوئی جفاؤں پہ آج اپنی شرمسار تو ہے

مری وفا کے ثمر تلخ تر سہی ہمدم
مری وفا پہ نہیں آج اعتبار تو ہے

ہوئی جو نذرِ فنا نہ متاعِ خندہ لبی
نہیں ہے غم کہ ابھی چشمِ اشکبار تو ہے

نہیں بچایا زمانے نے تختۂ گل نہ سہی
ہماری یاد میں [illegible] تو ہے

ایم۔ ریحان

غ

تیری دہلیز پر جب سے جبیں ہے
مقدر بر سرِ عرشِ بریں ہے

بجا ہے ماہِ انور بھی حسیں ہے
مگر اک وہ جو میرے دلنشیں ہے

لٹاؤں کیوں نہ دل راہِ وفا میں
کہ یہ انساں کا فرضِ اولیں ہے

یہ کیا اندھیر ہے اے جذبِ کامل
میرا سجدہ ہے اور جذب رہیں ہے

مقاماتِ جنوں ان کو دکھا دو
غرور پر اہلِ عالم کو یقیں ہے

خدا گر ہو میرے حرفِ دعا پر
کوئی طعنہ نہیں، گلہ نہیں ہے

پھٹا جاتا ہے دامانِ خرد چاک
تیری رفتار کیا محشر آفریں ہے

عدم کو اپنے کیا منہ لے کے جاؤں
میرے ہاتھوں میں دنیا ہے نہ دیں ہے

زکی زاکاف

غ

جنونِ عشق کو سرمایۂ کمال بنا
بنا بنا اسی نعمت کو لازوال بنا

شکار گاہِ تمنا میں آ پھنسا ہے عشق
نظر کو تیر بنا گیسوؤں کو جال بنا

زوالِ آدمِ خاکی ترا کمال نہیں
کمال یہ ہے کہ ہر شے کو لازوال بنا

خیالِ رنگ ہے آلودہ طائرِ معنی
فضائے حسن میں تازہ نظر سے جال بنا

مری حیات کو دے تازگی بہاروں کی
مری نگاہ کو اک حسنِ لازوال بنا

ہر ایک چیز میں آئے نظر مری تصویر
ہر ایک شے کو مرا پرتوِ خیال بنا

میں تیرے حسن کی مستی کو عام کر دوں گا
تو میری آنکھ کو پیمانۂ جمال بنا

کبھی کبھی تو کچھ وقت کے تقاضوں کو
کبھی تو نوحۂ غم کو نوائے حال بنا

جنونِ شوق کا حاصل یہی ہے اکائی!
حیاتِ شوق کو اک لمحۂ وصال بنا

زکی کاکوروی

مانا کہ تیرے ہاتھ میں جامِ شراب ہے — آہستہ بات کر کہ زمانہ خراب ہے
میرا قرار باعثِ صد پیچ و تابِ شوق — میرا قرار حاصلِ صد اضطراب ہے
پرتو ہے میرے عشق کا تیرا فروغِ حسن — تیرا شباب میری نظر کا شباب ہے
بس شرط ہے کہ ساقیِ محفل رہے قریب — رندوں کو جامِ آب بھی جامِ شراب ہے
میں وہ نہیں کہ بزمِ شبانہ کا غم کروں — میرے لئے تو نورِ سحر بھی شراب ہے
دامن ہے چاک چاک مرا دل ہے داغ داغ — میری نمود موسمِ گل کا شباب ہے
مجھ کو ترے جہاں سے کوئی واسطہ نہیں — میرا ہے وہ جہاں کہ جہانِ خراب ہے

صد چاک مجھ سے سینۂ افلاک اے زکی!
ہر تیر میری آہ کا تیرِ شہاب ہے

ہر پردۂ نظر میں کوئی بے نقاب ہے — کس درجہ کامیاب جنونِ شباب ہے
بیخود بنے بغیر ہی ہر شیخ و شاب ہے — ساقی کی بات بات میں لطفِ شراب ہے
نادان مرے جنوں سے مجھے بدگمان نہ کر — یہ بیخودی نہیں ہے خودی کا جواب ہے
بخشا تجھے فروغ مرے ذوقِ عشق نے — تیرا شباب کیا ہے مرا انتخاب ہے
سامانِ صد حجاب ہے ہر جلوۂ جمال — کس کو یہاں نگاہ اٹھانے کی تاب ہے
اللہ دے تو بخششِ ساقی کے واسطے — عالم تمام جیسے کہ جامِ شراب ہے

قطعِ رہِ شباب نہیں کھیل اے زکی!
رکھ سوچ کر قدم کہ زمانہ خراب ہے

نسیم صدیقی

وہ جو میٹھی سی کسک آہ و فغاں تک پہنچی
کیسی معصوم سی تھی بات، کہاں تک پہنچی

عشق نے دیکھا یہ انجام تو دل بھر آیا
عقل آفاق میں پھر پھر کے گماں تک پہنچی

آرزوئیں ہوں کہ شکوے ہوں کہ جذبات بیاں
دل میں جو بات بھی آئی سو وہاں تک پہنچی

تھام کر یاد بہاری کا چلی تھی دامن
ہائے وہ آس کہ تھک تھک کے خزاں تک پہنچی

رازدارانہ حکایت جو کہی تھی ہم نے
خود کہو، کیسے وہ دشمن کی زباں تک پہنچی!

وہ خودی جس نے زمانے کو کیا زیر و زبر
آخر اس بار جو مشرق کے جواں تک پہنچی!

سلسلہ جو بات بھی چھیڑی کبھی احباب کے ساتھ
پھر پھرا کر وہ اُسی دردِ نہاں تک پہنچی

قیمتی چیز تھی زاہد کے تقدس کی ردا
بن کے اک مالِ تجارت وہ دکاں تک پہنچی

آنکھ وہ آنکھ ہے جو حسنِ ازل کو دیکھے
جان وہ جان ہے جو جانِ جہاں تک پہنچی!

نعیم صدیقی

اگرچہ ہم جگر داغ داغ رکھتے ہیں — تمہارے خیال سے دل باغ باغ رکھتے ہیں

اسی سبب سے شکایت ہے میر و سلطاں کو — ترے غلام کچھ اونچا دماغ رکھتے ہیں

زمانہ بیت گیا، طاقِ شوق پہ اب بھی — جلا کے یاد کا تیری چراغ رکھتے ہیں

یہ پردے لگتے ہیں، جلوے کو پا نہیں سکتے — یہ لوگ دل نہیں رکھتے، دماغ رکھتے ہیں

ہمیں تو پیاس بھی ساقی! غرور دیتی رہی — ذرا غیور ہیں، خالی ایاغ رکھتے ہیں

مسافرانِ شبِ تیرہ کا خیال رہے — ہوا! کہ ہم تہِ دامن چراغ رکھتے ہیں

نکل گیا ہے کدھر کو وہ کاروانِ بہار؟ — گمان ہے کہ یہ کانٹے سراغ رکھتے ہیں

خدا کا شکر، کوئی پردۂ فریب نہ تھا — کھلے کھلے یہ گناہوں کے داغ رکھتے ہیں

جگہ قفس میں ملی جا کے عندلیبوں کو — وہ اپنے باغ میں گلبانگِ زاغ رکھتے ہیں

مسافرانہ خود اپنے وطن میں کٹتی ہے — نہ قصر و بام، نہ کچھ باغ و راغ رکھتے ہیں

وہ روزِ حشر کلیجوں کی جانچ کرتے پھرے
کہ کون لوگ محبت کا داغ رکھتے ہیں



نعیم صدیقی

تھا ٹوٹے گا تاریکی کا زنداں ! ہم نہ کہتے تھے
فضائیں ہوں گی آزادی کی رقصاں ! ہم نہ کہتے تھے
یہ مٹی جس کے ذروں پر شہیدوں کا لہو ٹپکا !
یہ مٹی ہو گی اک دن گل بداماں ! ہم نہ کہتے تھے
بدل جائیں گے ساقی، محتسب، جام اور پیمانے
منڈھائی جائے گی مہمائے قرآں ! ہم نہ کہتے تھے
وہی ہو کر رہی آخر جسے کہتے تھے ان ہونی !
بت کافر بھی لے آئے گا ایماں ! ہم نہ کہتے تھے
خزاں کی گود میں پل پوس کر وقتِ معیّن پر
یکایک آئے گی فصلِ بہاراں ! ہم نہ کہتے تھے
یقیں آتا نہ تھا کل تک قنوطیت کے ماروں کو
نئے نعروں سے گونجیں گی یہ گلیاں ! ہم نہ کہتے تھے
غلط فہمی میں تم مارے گئے اے بت کدے والو !
تمہارے کٹ نہیں سکتا مسلماں ! ہم نہ کہتے تھے !

یہ تصویریں ہیں تیری!

ایڈیشنل سیشن جج گجرات نے ایک مقدمہ قتل کا فیصلہ سناتے ہوئے گجرات کی پولیس کے بارے میں تفصیل و دلائل و شواہد کی روشنی میں لکھا ہے کہ۔

اس مقدمے کے فائل پر جو مواد موجود ہے وہ ہمیں اٹھارھویں صدی کی ریاستوں کے حالات کی یاد دلاتا ہے بعض اوقات ہمیں حیرانی ہوتی ہے کہ کیا گجرات کی پولیس نے اپنے لئے خود قواعد و ضوابط وضع کر رکھے ہیں۔

اس فیصلے میں فاضل جج نے پولیس اور مقامی سول ہسپتال کے ڈاکٹروں پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے اس مقدمے سے چند چوہدریوں کو بچانے کے لئے سازش کی ہے اور استغاثہ کے مقدمے کو خراب کرنے اور ملزموں کی مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔ فیصلے میں یہ حقیقت واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ پولیس کے دو کارندے ملزموں کے خلاف شہادتیں فراہم کرنے کے بجائے ایسا مواد اکٹھا کرنے میں مصروف رہے جس کے بل پر ملزم [illegible] نکل سکیں۔ ڈاکٹر بھٹی کا کردار ملاحظہ فرمائیے:۔

"میرے خیال میں ڈاکٹر بھٹی شروع ہی سے ملزموں کی امداد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پوسٹ مارٹم کے بعد اپنے نتائج دیئے جنہیں اگر بغور نہ پڑھتا تو شاید مطلق نہ ہوتا۔ جب مقتول کے زخموں کے متعلق ڈاکٹروں نے غلط نتائج دیے تو متوفی کی پارٹی نے شور مچایا اور ڈاکٹر بھٹی اور ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر سے پوسٹ مارٹم کرانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ان کی رائے میں ملزموں سے مل چکے تھے۔ لیکن اس کے بعد ہوا یہ کہ تھانہ صدر کے انچارج سب انسپکٹر نے زیر دستی مقتول کی چارپائی اٹھوائی اور ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم کر دیا:۔"

آخر میں فاضل جج کے یہ الفاظ پڑھئے کہ:

"اب جب کہ یہ بات [illegible] کے مقابلہ میں [illegible] [illegible]"

[illegible] چند اہم تفصیل ادارہ [illegible]

عدالت نے [illegible] کی [illegible]

[illegible] کی تعداد ۱۳۸۲ [illegible]



مرکزی خزانے کو حسابی اندازے سے کم ٹیکس کی وصولی کی وجہ سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کا اندازہ چند سال کے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

سال	جملہ رقم وصول طلب (وصول شدہ + بقایا)	عملاً وصول شدہ
۱۹۵۰-۵۱ء	۱۸۰۲۲۲۱۵۷ روپے	۳۷۹۲۴۱۳۵ روپے
۱۹۵۱-۵۲ء	۳۲۱۸۶۷۲۰۸ "	۷۴۹۳۴۳۰۶ "
۱۹۵۲-۵۳ء	۳۶۸۴۸۷۴۸۹ "	۷۹۶۱۵۸۸۲ "

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: آل پاکستان انکم ٹیکس رپورٹس اینڈ ریٹرنز، بابت سال ۱۹۵۲-۵۳ء)

واشنگٹن میں چند روز قبل غیر ملکی طلبہ کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کے خاتمہ پر جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے دار المطالعت میں رقص و نغمہ کی ایک محفل منعقد ہوئی جس میں دنیا کے بہت سے ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے قائم کردہ سفارت خانے کے کلچرل اتاشی مسٹر شمس الحق نے پاکستانی فنونِ لطیفہ پر روشنی ڈالی۔ بعدہٗ پاکستانی سفارت خانے کے سیکنڈ سیکرٹری کی صاحبزادی شہلا اختر نے مشرقی پاکستان کا ایک کوہستانی رقص پیش کیا۔ یہ رقص سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ جرمن سفارت خانے کے سیکنڈ سیکرٹری لیفکس نے شہلا کو گرم جوشی سے خراجِ تحسین پیش کیا۔ موصوف جب اسٹیج پر اپنا ساز لے کر آئے تو حاضرین سے فرمایا کہ ایسے حسین و نفیس رقص کے بعد آپ کی سمع خراشی کرنے پر معذرت چاہتا ہوں۔

چوہدری محمد جلیل خان کی عدالت (لاہور) سے ایک نوجوان محمد عظیم اور ایک طالب علم امانت علی کو بالترتیب اٹھارہ ماہ اور دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔ امانت علی کو ۱۹۵۳ء میں میٹرک کے امتحان میں بیٹھنا تھا۔ اس نے اپنے بجائے ایک رشتہ دار محمد عظیم کو امتحان دینے کے لئے بھیج دیا۔ محمد عظیم نے امانت علی کی جگہ اپنی تصویر کارڈ پر چسپاں کر دی۔ امتحان کے آخری روز یہ راز فاش ہو گیا۔

یارانِ حلقہ

رفیق گرامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ... آپ کا خط ملا تھا جواب نہ لکھ سکا۔ تاخیر کے لئے معاف فرمائیے گا۔ ادھر انور صدیقی کے دو ایک خطوط نظر سے گزرے اور اپنے چند احباب کی گفتگوؤں سے بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ ترقی پسند حلقوں کی طرح ہمارے یہاں بھی آجکل جمود اور سرد مہری کا ادبی زبان سے اکثر چرچا ہو رہا ہے۔ اس جمود کی کیا حقیقت ہے اور تعمیری ادب کی دس سالہ پچھلی تاریخ سے کن تاثرات کا اظہار کر کے ہمارے احباب یہ شکایتیں زبان پر لائے ہیں ان کا جائزہ لینے کے لئے ایک نہایت تفصیلی مقالہ درکار ہے میں اس خط میں مختصر چند باتوں کی طرف اشارہ کروں گا۔

اسلامی ادب کی پچھلی دس سالہ تاریخ کا جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۰ء تک ادیبوں کی جو کھیپ اپنی علمی صلاحیتوں کے ساتھ اسلامی شعر و ادب کی تخلیق کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ وہ ادھر چار پانچ سال سے بالکل خاموش ہوگئی۔ "چراغ راہ"، "طلوع"، "حیات نو"، "یثرب" اور "المنصف" کے پچھلے فائل دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے لکھنے والے جنہوں نے چند دنوں پہلے ایک درخشاں افق کی نشاندہی کی تھی، خدا جانے ادھر کن حادثوں کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ان کی معنی خیز خاموشی (کہ نہیں، سخت بے معنی ہی سہی) بہت کچھ مایوس کن ہے۔ جمود کے دراصل شکار یہی ہیں۔ انہوں نے جن امنگوں، تمناؤں اور امیدوں کے ساتھ ادارۂ ادب اسلامی کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اور اس مقصد کو لے کر اٹھے تھے۔ اگر آج بھی مستقل مزاجی کے ساتھ وہ آگے بڑھتے رہتے تو یقیناً آج ادارہ ادب اسلامی ہند و پاک دنیا کے سامنے اسلامی ادب کے کلاسیکل اور مثالی نمونے رکھ چکا ہوتا اور [illegible] کم مائیگی کا شکوہ باقی نہ رہتا۔ ہمیں تنقیدی، افسانوی، شعری ادب کا خلا اپنے یہاں نظر نہ آتا اور ہم جمود کا احساس نہ کرتے۔ اپنے ان پرانے رفقاء میں چند کا نام میں یہاں پیش کرتا ہوں۔ محمد مسلم صدیقی۔ اسعد گیلانی۔ محمود الحسن گلشن آبادی۔ انور اعظمی۔ حسان کلیمی۔ شفیق جونپوری۔ جمال احمد امین آبادی۔ ابو الفتاح۔ طلیش صدیقی۔ عبد الباسط مقصد۔ راز مشتاق علی خان۔ افضل خان [illegible]۔ ضیاء محمد ضیا۔ عبد الکریم ثمر۔ جمیل احمد فاروقی[1]

آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ یہ رفقاء کس سرد مہری کا شکار ہو کر رہ گئے [illegible] سال کے عرصہ میں انہوں نے کتنی بہت اسلامی ادب کی خدمت کر کے اپنے کو [illegible] کر دیا [illegible] ہوگا یا کسی احساس کمتری کے شکار ہوگئے [illegible] اسلامی ادب کا دامن [illegible] جنید [illegible] ماہر القادری[2] [illegible]

[1] ان میں صرف چند احباب ایسے ہیں جو ایک حد تک سرگرم کار ہیں باقی بالکل خاموش ہیں اور ان کی [illegible]

[2] ماہر القادری صاحب [illegible]

نے بھی کوئی قابلِ قدر تخلیق نہیں کی ۔ ۱۹۶۵ء کے بعد کیمپ میں کسی قسم کا جمود نہیں پیدا ہوا ۔ وہ اپنے عزم اور اپنے حوصلے کے ساتھ ایک پائندہ مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔ ان میں بعض نئے رفیقوں سے بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں اور وہ دن دور نظر نہیں آتا جبکہ ہم پچھلے کیمپ کی محرومیت سے جو خلا واقع ہوا ہے ۔ اس کو پورا کریں ۔ ان میں ابو المجاہد زاہد، انور صدیقی، رشید کوثر فاروقی، کوثر نیازی، سہیل زیدی، شمیم جاوید وغیرہ نے شعری ادب کے سلسلے میں بہت سی قابلِ قدر چیزیں پیش کی ہیں ۔ [illegible] نسیم صاحب نے محمود فاروقی اور اسعد گیلانی کے بعد افسانوں کے میدان میں پیدا ہونے والے خلا کو پورا کیا ہے ۔ ان کے دو افسانے "انتقام سے پہلے" اور "صدقہ" "کوہن پیامی" اور "ظلم بن ہو" ہی کی صف میں بلکہ ان سے کچھ آگے ہی رکھنے کے قابل سمجھتا ہوں ۔

پھر بھی پرانے احباب سے ہم مایوس نہیں ہوں گے ۔ آج ہمارے یہاں تنقیدی ادب کی بڑی کمی ہے ۔ سنجیدہ مقالے بہت کم لکھے جا رہے ہیں ۔ شعری ادب کی بھرمار ہے ۔ افسانوں کی بھی بڑی کمی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے ہمارے احباب ادب کے سلسلے میں اپنی خدمات کو اضافی یا اوپری سمجھے ہوئے ہیں ۔ وہ اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو عرق ریزی اور دل سوزی کے لئے وقف کرنے پر تیار نہیں ۔ وہ کسی ٹھوس اور تعمیری کام کی طرف راغب نہیں ہو رہے ہیں ۔ شاید ادبی محاذ کو وہ چٹکی بجاتے ہوئے ختم کر لینا چاہتے ہیں ۔ مگر شاید انہیں معلوم نہیں سب سے زیادہ صبر آزما ۔ ہمت شکن اور سخت مرحلہ یہی ہے ۔ جہاں جذبۂ شہرت اور جذبۂ نام کو دبانا پڑتا ہے ۔ اور صبر و آزمائش کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے ۔ فنی ریاضت کے بغیر "مقصدی" لگن کے بنا قلم اٹھانا تضیعِ اوقات ہے ۔ اگر ہمارے احباب ایسے ہی سستے چھوٹنا چاہتے ہیں ۔ اور کوئی ہمت افزا فیصلہ کن قدم اٹھانے پر تیار نہیں ۔ تو یہ ہمارے لئے بہت مایوس کن ہے ۔ آج اسلامی ادب کی تحریک اس منزل پر آگئی جہاں پر اسے اب طفلِ ناداں کے بجائے ایک باعزم اور باہمت نوجوان سمجھا جانے لگا ہے ۔ لوگ اب اس کی حرکتِ دست و بازو سے چونکنے لگے ہیں ۔ اب اس طائرِ نو پرواز پر جلدی ہی طنز و تنقید اور تعریض کے جال پھینکے جانے والے ہیں ۔ اور اس کا آغاز بھی ہو چکا ہے ۔ میں اپنے مطالعہ کی بنا پر یہ محسوس کر رہا ہوں ۔ کہ اب اسلامی ادب کی تحریک سے ہمارے مخالفین کتنی گھبراہٹ اور الجھن محسوس کر رہے ہیں ۔ ادب میں ابھرتے ہوئے ان صالح رجحانات کو جو ان کی آزادی، ان کی عیاشی، جو ان کی زہرناکی پر قدغن لگا رہے ہیں ۔ یہ دبا دینے کی فکر میں ہیں ۔ اس منزل پر ہمارے قلم سے نکلنے والا کوئی لفظ اور کوئی جملہ بے مقصد، پھسپھسا اور مضحکہ خیز نہ ہونا چاہئے ۔ ویسے بھی اسلامی ادب کی شان اور درجے سے یہ گری ہوئی بات ہے کہ ہم کوئی بات محض لکھنے کے لئے لکھیں ۔ ایسی غیر ذمہ دارانہ روش کا خود اسلام سخت مخالف ہے ۔ ہمیں ہمیشہ اس احساس کے ساتھ لکھنا ہے کہ کل خالقِ کائنات کے آگے ہر ایک لفظ کا جو ہمارے قلم سے نکلا ہے جواب دینا ہے ۔ ——— یہ احساسِ جواب دہی ہر وقت ہمارے پیشِ نظر ہونا چاہئے ——— اگر آج ہمارے احباب ذرا سی توجہ سے کام لیں ۔ اور اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کو آگے بڑھائیں ۔ تو ہمارے یہاں فنی کم مائیگی کا شکوہ باقی نہ رہ جائے ۔ جتنی تخلیقات پر جو مقصدی ٹھوس خامی نظر آتی ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے ۔ کہ دراصل ابھی ہم مقصد کی صحیح اسپرٹ سے بے بہرہ ہیں ۔ مقصد کا صحیح شعور اور اس کا عشق اسی صورت میں ممکن ہے ۔ جبکہ ہم اپنی عملی زندگی میں تحریکیت پیدا کریں ۔ اور حق کے لئے اپنی عملی زندگی کو وقف کر دیں ۔

پاکستان کے متعلق تو مجھے علم نہیں ۔ البتہ ہندوستان میں ابھی تنظیمی معاملات میں ادارہ بہت ہی کمزور ہے ۔ اور اس لحاظ سے یہاں

بہت انتشار ہے۔ اسلامی ادب پہ بہت سے مقالات لکھے گئے ہیں۔ پھر بھی ابھی مقصد بہت کچھ غیر واضح اور مبہم ہے ـــــ یعنی ہم دنیا کے سامنے کس مختصر اور جامع انداز میں اسلامی ادب کی تشریح کریں؟ ۔ اس سلسلے میں ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اسلامی ادب کا تنقیدی نقطۂ نظر، افسانوی معیار اور شعری معیار نہیں مرتب کیا گیا۔ بات کہاں سے نکلی تھی کہاں جا پہونچی۔ میں اور میرے احباب چاہتے ہیں کہ ہم مندرجہ بالا احباب کو پھر سے قلم اٹھانے پر اکسائیں۔ اور ان کی خاموشی کے لئے ان سے جواب طلب کریں۔ مجھے امید ہے آپ بھی ان سے فرداً فرداً دریافت فرمائیں گے کہ آخر ان کی خاموشی کن مصلحتوں اور مجبوریوں پر مبنی ہے۔

شبنم سبحانی

چراغ راہ:-

بات یہ ہے کہ جوہر تخلیق ایک تخم نمو طلب کی نوعیت رکھتا ہے۔ تخم جب مٹی میں دب جاتا ہے۔ تو اس کی قوتِ نمو دباؤ کے خلاف ردِ عمل دکھاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر اوپر کوئی پتھر رکھ دیا گیا ہو۔ تو پھوٹنے والا بیج کسی نہ کسی طرف سے ڈنٹھل باہر نکال ہی لیتا ہے۔ آپ اگر پہاڑی علاقوں میں گئے ہوں تو چٹانوں کا سینہ چیر کر نشو و نما پانے والے پودوں اور درخت کو دیکھا ہوگا۔ میں نے سنگین دیواروں کی درزوں میں سے سر نکال مظاہرۂ نمو کرتے ہوئے پیپل کا ایک درخت کہیں دیکھا ہے۔ پھر میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ چنے اور جو کے دانے نم پا کر گھر کے مٹکوں میں پڑے پڑے پھوٹنے لگے۔ ایسی ہی ایک مثال چشموں سے لی جا سکتی ہے۔ زمین میں اگر پانی کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے تو وہ باہر نکلنے کے ذریعے زور کرتا ہے اور مٹی اور کنکر دل کی تہوں کو مجبور کر دیتا ہے کہ اسے راستہ دیں۔ بلکہ میں نے اپنے وطن میں بھی اور مری کے علاقے میں خود مشاہدہ کیا ہے کہ چٹانوں کے اندر سے پانی کے جھرنے بہ رہے ہیں۔ قرآن میں بھی کہا گیا ہے کہ۔ لما یتفجر منہ الانھار کبھی کبھی پتھر کی سلوں سے نہریں بہنے لگتی ہیں یہی مثال ہے انسانی انا کے ذوقِ اظہار احساس کے رجحانِ تخلیق کی۔ یہ اگر فی الواقع موجود ہو تو یہ اپنا کام کرتا ہے اور اپنے لئے راستے بناتا ہے۔ اور آدمی کو اس وقت تک چین سے بیٹھنے نہیں دیتا جب تک کہ وہ اس کی نکاسی کی کوئی صورت اختیار نہیں کر لیتا۔ ادب و شعر جس سوزِ جگر سے وجود پاتے ہیں۔ وہ اگر سینے میں موجود ہو تو آدمی کا کھانا پینا اور سونا جاگنا اس وقت تک کے لئے حرام ہو جاتا ہے۔ جب تک کہ یہ سوزِ پنہاں اپنے آپ کو کسی نہ کسی راستے باہر نہیں لے آتا۔ فن کے دائرے میں جو کچھ بھی ہماہمی رہتی ہے۔ وہ بس ایک جذبۂ بیدار کے کرشمے ہیں۔ یہ جذبہ بیدار موجود ہو تو اس کی تربیت اور نشو و نما تو کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر یہی موجود نہ رہا ہو یا یا چار دن کی بہار دکھا کر مر گیا ہو تو کوئی خارجی تدبیر اس کے خلاء کو پر نہیں کر سکتی۔ جسے فطرت نے اس دولت سے مالا مال کیا ہے وہ ادیب یا شاعر یا کچھ اور بننے سے باز نہیں رہ سکتا، چاہے کوئی اکسانے والا ہو یا نہ ہو۔ کوئی تنظیم موجود ہو یا نہ ہو۔ اور فرض کا واسطہ اسے دلایا جائے۔ یا نہ دلایا جائے۔ اور یہ دولت موجود نہ ہو تو شعر و ادب کی روح باہر سے کوئی کسی کے سینے میں نہیں پھونک سکتا۔ اصل میں ایک بڑی عام پائی جانے والی شعوری مغالطہ اس دائرے میں یہ ہوتی ہے کہ بہر گاہ شہرت و نمود میں کچھ نوجوان کبھی کبھی گھومتے گھامتے آنکلتے ہیں۔ اور ان سے امیدیں وابستہ ہونے لگتی ہیں۔ کہ شاید یہ بھی یہاں کچھ کام کرنے اور کچھ بنانے سنوارنے آئے ہیں۔ لیکن وہ چہل قدمی کر کے جلد ہی چل دیتے ہیں۔ ایسے کچھ لوگ پہلے بھی آئے تھے۔ اور گئے۔ اور آج بھی ہمارے ساتھ ایسے بہت سے ہم سفر گامزن ہیں جو تھوڑے عرصے کے بعد الوداع کہ جائیں گے۔ کیونکہ ان کی کاوشوں میں روح موجود نہیں ہے۔ جو ادیب و شاعر نہیں ہے۔ اسے آپ اپنا پیالوں اور تحریکوں کے زور سے ادیب و شاعر نہیں بنا سکتے۔ لہٰذا چلتے چلتے کر کھسک کر لیٹ جانے والوں کو بگانے اور کھینچ کھانچ کر ساتھ گھسیٹنے کی فضول سعی میں نہ پڑئیے البتہ جو کام کر رہے ہیں۔

آپ کیا پڑھیں —!

ادارہ

اسلامی فکر وتمدن کا بہت ہی بڑا موڑ تھا جسے تاریخ نے حادثۂ کربلا کا نام دیا۔ انحراف اور ردِ عمل کی جن قوتوں نے حضرت عثمان کے دور میں سر اٹھایا اور حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں طوفانی زور پکڑ لیا ان کا راستہ روکنے کی آخری کوشش امام حسین نے کی، لیکن بگاڑ کی وہ بپھری ہوئی قوتیں امام کا لاشہ روندتی ہوئی عجمیت کی راہ پر پڑ گئیں۔ اسلامی تاریخ سمجھنا فکر وتمدن کے اس موڑ کا گہرا مطالعہ کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مشکل یہ ہوئی کہ واقعہ کربلا اور امام حسین کے کارنامے کو ایک تو تاریخ کی مجموعی حرکت سے بےتعلق کر کے دیکھا جاتا رہا ہے اور دوسرے فرقہ وارانہ اور فتنہ گرانہ اختلافات کا ایک خارزار تاریخ کے اس خرمن باب میں پھیلا نظر آتا ہے۔ داستانِ حسین وکربلا سے زندگی کے لئے اصول ونتائج اخذ کرنے میں ہم سے بڑی کوتاہی ہوئی ہے۔

اس سلسلے میں علمی وتحقیقی لٹریچر کی ضرورت واضح ہے۔ اس وقت اس موضوع پر مکتبۂ جدید (انارکلی، لاہور) کی شائع کردہ ایک دیدہ زیب کتاب "الحسین" نامی ہمارے سامنے ہے۔ یہ کتاب عمر ابو النصر نے اصلاً عربی زبان میں لکھی اور اس کا اردو ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی کے قلم سے شائع کیا گیا ہے۔

"الحسین" کا انداز مورخانہ ہے اور اس میں ذمہ دارانہ رنگ جھلکتا ہے۔ واقعات کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر روایات کے اختلافات کو تفصیل سے زیرِ بحث لا کر پھر اپنا محققانہ ومدلل فیصلہ دینے کا مورخانہ اسلوب اختیار نہیں کیا گیا۔ ایسا کیا جاتا تو کتاب بہت ضخیم ہو جاتی اور عام لوگوں کے ذوقِ مطالعہ کی سطح سے بلندتر ہو جاتی۔

ہم نے بڑی توجہ سے یہ بات سمجھنے کی کوشش کی کہ مصنف کا خود تاریخ کے بارے میں تصور کیا ہے اور وہ اس کی حرکت کی کون سی توجیہ سامنے رکھ کر تاریخی واقعات کا جائزہ لیتے ہیں، لیکن اس سوال کے جواب میں کچھ پلے نہیں پڑا۔ حالاں کہ مقصدی تاریخ نگاری اور سوانح نویسی کے لئے تاریخ کی ماہیئت متعین ہونی چاہئے خصوصاً ایک مسلم مورخ کو خود اسلامی تاریخ کے بارے میں ایک مجموعی تصور قائم کرنا چاہیے کہ یہ کن طاقتوں، کن عوامل اور کن اصولوں کے تحت مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی ہم تک آئی کہ ہمارے ماضی کا رشتہ ملا ہی سے۔ اس کمی کا نتیجہ یہ ہے کہ فاضل مؤلف امام حسین کے کارنامۂ شجاعت وایثار کے مرکزی مقصد کا غیر مبہم اور قطعی انداز سے تعین نہیں کر سکے۔

یہ چند جملے ہم نے خالص علمی نقطۂ نظر سے عرض کئے ہیں ورنہ جہاں تک اوسط درجے کے اہلِ ذوق کا تعلق ہے، یہ کتاب ان کے لئے خاصی معلومات افزا ثابت ہوگی اور اس سے ان کے فکر وجذبہ میں تحریک بھی پیدا ہوگی۔ ترجمہ ایسا ہے کہ ترجمہ پن محسوس نہیں ہوتا۔ کتاب

لمبے کاغذ پر خوشنما ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت ڈھائی روپے

احسان دانش کی شخصیت سے اصحاب ذوق میں سے کون آج ناواقف ہوگا۔ مگر موصوف نے صرف شاعری ہی پر احسان نہیں فرمایا، کرنے کے بھی کچھ کام کئے ہیں۔ ان میں سے ایک "لغت الاصلاح" ہے۔ مطالعے سے یقین ہو سکے گا کہ اس لغت میں بالکل ہر طرح ایسے الفاظ کی تحقیق درج کی گئی ہے جو تحریر و گفتگو میں بکثرت مستعمل ہیں اور بالعموم ان کے تلفظ یا ان کے محل استعمال یا قاعدہ اور محاورہ کے لحاظ سے غلطیاں کی جاتی ہیں۔ ۲۸ کے صفحات میں اردو میں استعمال ہونے والے عربی الفاظ کو صنف اور قواعد کے خاص ماخذ کے تحت جمع کر کے ان کا تلفظ واضح کر دیا گیا ہے۔ تذکیر و تانیث کے زیر عنوان کئی صفحوں میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ تحقیقی انداز سے مرتب اور منقسم کیا گیا ہے۔

اصل لغت کے اسلوب ترتیب اور افادیت کا اندازہ کرنے کے لئے چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:۔

— اُنْدُلُس: درست نہیں۔ اسے بالفتح "اَنْدَلُس" کہنا چاہئے (یہ اسپین کا اسلامی نام ہے) (ص ۱۹)

— انسپکٹران مدارس: انسپکٹر کی جمع ہے انسپکٹران اور یہ ترکیب اضافی غلط اور بالکل غلط، لیکن غلط العام (ص ۲۹)

— جِہْنَہ: اصل لفظ ہے جُہَنّہ۔ اس میں ہائے ہوز کو مفتوح بولنا غلط ہے (ص ۱۰۹)

— علیٰ ہٰذا لقیاس: صحیح نہیں ہے۔ اس کا تلفظ یوں ہے (علیٰ ہٰذا القیاس) ۔ اس قیاس کے مطابق (ص ۱۴۳)

— قابو کرلیا۔ تمام لوگوں کو قابو کر لیا یا زید کو قابو کر لیا۔ درست نہیں۔ یہ اس طرح ہے، تمام لوگ قابو میں کر لئے۔ زید کو قابو میں کر لیا۔ البتہ قابو پانا درست ہے، مثلاً فلاں علاقے پر قابو پا لیا یا مجمع پر قابو پا لیا۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب مصنفین، صحافیوں، خطیبوں اور اساتذہ و طلبہ کے لئے کتنی قدر و قیمت رکھتی ہے۔

جناب مولف کو احساس ہے کہ "کتاب ابھی مکمل نہیں" لیکن وعدہ فرماتے ہیں کہ اس میں ہر ایڈیشن پر اضافہ ہوتا رہے گا۔ مفید کتاب مکتبۂ دانش مزنگ لاہور نے شائع کی ہے اور اس کی قیمت ساڑھے چار روپے رکھی ہے۔ افسوس ہے کہ طباعتی معیار اس قیمت کے مطابق نہیں۔

یوں بھی ہم ایک مسلم قوم ہیں، لیکن اب پاکستان کو جمہوریہ اسلامیہ قرار دینے کے بعد اسلام کے نقشے پر زندگی کی تعمیر نو کرنے کا کام ہمارے سامنے ہے اس کام کے لئے ہمارے عوام کو سوانح افراد اور جذبۂ تعمیر کی ضرورت ہے۔ ۔۔۔ اس ضرورت کے مطابق ایک اچھی کتاب "اسلامی زندگی" کے نام سے مرتب کر کے بھی وقت پر پیش کی ہے۔ اس میں عقائد و عبادات، اخلاق و معاملات اور حکومت و سیاست کے ۔۔۔ کے تحت خلفائے راشدین، صحابۂ کرام اور تابعین کے دور کے خاص خاص مثالی واقعات اور نمونے مختصر اور سادہ انداز بیان کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں ۔۔۔ کی تحریکات کے لئے بھی ۔۔۔ کا ساتھ قائم رکھتا ہے۔ بلاشبہ ۔۔۔ کتاب کو پڑھنے سے ۔۔۔ ہے کہ ایک ۔۔۔ مسلمان کس طرح عمل کرتا ہے

[illegible] ریاست و معاشرہ کو اسلامی بنا سکتے ہیں۔

یہ کتاب نوجوانوں اور ترقی پسندوں سب کے لئے مفید مطالعہ ہے۔ اسے مدرسوں کی لائبریریوں میں موجود ہونا چاہیئے بلکہ دینیات کے نصابی سلسلہ میں داخل ہونی چاہیے۔

یہ کتاب مکتبہ تحریک اسلامی [illegible] نے اوسط درجے کے اچھے معیار طباعت کے ساتھ شائع کی ہے۔ قیمت [illegible]

ہمارے ممتاز رفیق مقصود چوہدری علی احمد خان جو جادۂ دعوت حق پر عین گامزنی کی حالت میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے ان کی کتاب عمل کا ایک روشن باب مشرقی پاکستان میں دعوت اسلامی کی علمبرداری کا دور ہے۔ ہندو ڈپلومیسی، کمیونسٹ سازش اور جاہ پرست مسلم لیڈروں کی فتنہ گری کی اس جولانگاہ میں مختصر سی مدت کے اندر اسلامی فکر کو پھیلانے اور اسلام پسند نوجوانوں کو منظم کرنے میں مرحوم نے حیرت انگیز کام کر کے دکھایا۔ کام کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی و معاشرتی لحاظ سے مشرقی پاکستان کے ماضی و حال کو سمجھنے کے لئے انہوں نے بڑی کاوشیں کی ہیں۔ ان کاوشوں کی ایک واضح جھلک موصوف کے قلم نے ایک مقالہ کی صورت میں محفوظ کر دی ہے۔ "بنگال کے سیاسی حالات کا منظر و پس منظر" کے عنوان سے یہ مقالہ اولاً ماہنامہ "تعمیر انسانیت" کے مشرقی پاکستان نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اب کتابی صورت میں مکتبہ تعمیر انسانیت (اردو بازار لاہور) نے شائع کر دیا ہے۔ باعتبار نفس مضمون یہ مقالہ ایک خاصی ریسرچ کا آئینہ دار ہے۔ حیرت سی ہوتی ہے کہ وہ شخص جس نے پولیس کی نوکری سے زندگی کا آغاز کیا تھا، اس کے اندر سے اتنا اچھا انشا پرداز کیسے نمودار ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے سیاسی سمندر میں تقسیم کے بعد سے اب تک جو اتار چڑھاؤ واقع ہوتے رہے ہیں ان کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے یہ مقالہ ضرور بہ مفید ہوگا۔ چوہدری علی احمد خان مرحوم سے اب ہم لوگ ان کی تصانیف اور تحریروں ہی کے ذریعے ایک روحانی ملاقات کر سکتے ہیں اور ان کو پھیلا کر مرحوم کے علمی صدقہ جاریہ کا دائرہ وسیع تر کر سکتے ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔

مکتبہ نور، گوجرانوالہ نے جناب راسخ عرفانی کا ایک مجموعہ کلام "خلش خار" کے نام سے شائع کیا ہے۔ شاعر اور مجموعہ کلام پر وہی کچھ گزری جو اس دیس کی ریت ہے۔ یہ مجموعہ کئی سال پہلے مرتب ہوا، اس پر تعارف بھی لکھا گیا مگر "حالات کی ناسازگاریاں" اس کی اشاعت میں مانع رہیں۔ افسوس کہ حالات کی یہ ناسازگاریاں ہماری قوم کے جوہر قابل کا نہ جانے کتنا نقصان کر چکی ہیں اور کرتی رہیں گی۔

"خلش خار" کے شاعر کے قلب میں شاعری کی حقیقی روح کا ابھرنا بہرحال ہو رہا ہے۔ راسخ عرفانی کے ساز شعر کی اصل سے حق پاس کی نئے ہے۔ نالۂ محبت کا ایک کانٹا ہے جس کی خلش ان کے جذبہ و خیال کے لئے موجب تحریک بنی اور یہی خلش اس مجموعہ کی ہر نظم اور ہر شعر میں محسوس ہوتی ہے۔ حساس اور طالب حق قلب نے ان کے اندر محنت کش عوام کے لئے جذبۂ غم و ہمدردی پیدا کیا۔ جو متعدد نظموں میں کارفرما ہے۔ لیکن [illegible] اشتراکی ترقی پسندوں کے حلقوں میں گھومے، وہ اشتراکیت زدہ بالکل بھی نہیں ہو سکے۔ راسخ کی شاعری کی سب سے بڑی کمزوری نصب العین کا فقدان ہے۔ بدقسمتی سے عقیدت کا راستہ کسی نصب العین کی طرف لے جاتا ہی نہیں۔

زیادہ سے زیادہ دو ایک مواقع پر "وطن" کی ضرورت کے لئے کروڑہا جذبہ ظاہر کیا گیا ہے اور ایک آدھ مقام پر عظمتِ اسلاف کا تصور کرکے اس کو دوبارہ حاصل کرنے کی رسمی سی آرزو کی گئی ہے۔ مگر ایسے دو چار اشعار کا ہونا حقیقی دائرے میں شاعر کے صاحبِ مقصد ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

فن اور زبان کی کچھ تھوڑی سی غلطیاں بھی قارئین کے سامنے آئیں گی اور یوں بحیثیت مجموعی خیالات اور اسالیب کا معیار پہلی پہلی کوشش کی نوعیت رکھتا ہے۔ الطاف مشہدی اور ڈاکٹر وحید قریشی کے قلم سے "پیش لفظ" اور "تعارف" مجموعہ کی زینت ہیں۔ دلچسپ یہ کہ دونوں حضرات نے شاعر کے نام پر اپنے اپنے راگ الاپے ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل متضاد قسم کی باتیں لکھی ہیں۔ الطاف شاعر کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور ڈاکٹر وحید کہتے ہیں کہ "اسلامی اقدار حیات اور سماجی قواعد و ضوابط کی تبلیغ کو راسخ جزو ایمان سمجھتے ہیں"۔ ہمارا خیال ہے کہ شاعر کے کلام سے زیادہ یہ دونوں مقدمے قابلِ بحث ہیں۔

کتاب متوسط معیارِ طباعت اور ہلکی جلد بندی کے ساتھ ۲/ میں دی جا رہی ہے۔

علمی سطح کا ایک انگریزی پمفلٹ جناب پروفیسر محمد عزیز ایم اے کے قلم سے ہمارے سامنے ہے عنوان ہے: "AN OUTLINE OF INTERESTLESS BANKING." یعنی — غیر سودی بینک کاری کا خاکہ۔ "اسلامی نظام کی دعوت" کے رونما ہوتے ہی قسم قسم کے سیاسی و معاشی سوالات پیدا ہوئے اور ان کے جواب میں علمی بحثیں چھڑیں۔ ان سوالات میں سے ایک یہ ہے کہ اگر سود کو اسلامی قانون کے مطابق حرام ٹھہرایا جائے تو نظامِ بینک کاری ختم ہو جائیگا جو آج نظامِ صنعت و تجارت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس سوال کے جواب میں گنتی کی چند اچھی چیزیں اب تک سامنے آئی ہیں جن میں ایک یہ پمفلٹ ہے۔ بحث وسیع مطالعہ کے ساتھ چھیڑی گئی ہے اور مسئلے کے ضروری پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ اس لئے مطالعہ سے نوجوانوں کے سامنے سوچنے کی نئی راہیں کھل سکتی ہیں — اسے ریحان پبلیکیشنز — (کراچی و ڈھاکہ) نے شائع کیا ہے اور ۱/ قیمت رکھی ہے۔

ماہنامہ تذکرہ (آرام باغ، کراچی) ایک اچھے مزاج کا مذہبی پرچہ ہے جو عقائد، تفسیر، حدیث، تاریخ اور اخلاق و تصوف کے دائروں میں ایسی چیزیں شائع کرتا ہے جو عوام کے لئے مفید ہوتی ہیں۔ تذکرہ کا ضخیم سالنامہ ۱۹۵۶ء ہمارے سامنے ہے جو خوبصورت رنگین ٹائیٹل کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے مختلف پہلوؤں کا لحاظ کرتے ہوئے خاصے اچھے متنوع مضامین نظم و نثر اس میں جمع کئے گئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے معلومات بھی حاصل ہوں گی اور معتدل قسم کی پُر افادیت تفریح بھی!

سال بھر میں یہ اشاعتِ خاص ارزاں ہے۔ عام شمارے ہر مہینے جاتے ہیں چندہ [illegible]

ہفت روزہ "الاعتصام" (گوجرانوالہ) مسلک اہل حدیث کا ترجمان و حامی ہے [illegible] اس

[illegible] حدیث کی تشریعی حیثیت کا انکار کرنے والے جدید طبقوں کا رد ہے۔ مولانا داؤد غزنوی، مولانا محی الدین قصوری، مولانا محمد اسمٰعیل مولانا محمد حنیف ندوی، علامہ [illegible] اسد، مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ڈاکٹر عبید اللہ ایم اے، مولانا حافظ محمد اسحاق شیخ الحدیث [illegible] الاسلام [illegible] مولانا محمد عطاء اللہ حنیف، مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب (مرحوم)، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، پروفیسر عبد القیوم ایم اے، مولانا سید رئیس احمد جعفری اور بعض دوسرے اصحاب علم و قلم نے اس کی ترتیب میں حصہ لیا ہے بحیثیت مجموعی [illegible] کا مواد [illegible] اور علم آموز ہے۔ البتہ اس نمبر کے ایک مقالہ نگار مولانا محی الدین احمد قصوری بی اے نے مولانا مودودی جیسے [illegible] نے بہت [illegible] سنت اور پاسبان حدیث کو منکرین حدیث کے زمرے میں شمار کر کے جس بے انصافی اور تعصب اور فرقہ وارانہ تنگ دلی سے کام لیا ہے اس کی وجہ سے بے شمار قارئین کے سر ندامت سے جھک جائیں گے اس سنگین زیادتی کی ذمہ داری [illegible] پر بھی عائد ہوتی ہے جس نے ایک علمی مجموعے کو داغدار بنا دیا۔ اگر بڑے کام کرنے کے حوصلے ہوں تو ایسی چھوٹی حرکات سے دامن بچانا چاہئے۔ تاہم قارئین سے ہم یہی عرض کریں گے کہ یہ مجموعۂ مقالات مفید مطالعہ ہے۔ قیمت خاص نمبر عہ

جناب محمد شفیع علی نقشی کی ادارت میں ماہنامہ شیبان (دامو دالی شریف ضلع گوجرانوالہ) کا "رسالت نمبر" بھی حمایت حدیث و سنت کے مقصد سے نکالا گیا ہے نظم و نثر یا یہ مجموعہ بھی خاصا معلومات افزا دلچسپ اور متنوع ہے۔ قیمت عہ۔

انگریزی ہفت روزہ مسلم (MOSLIM) مشرقی پاکستان سے یہ اخبار حال ہی میں زور دار اسلامی رجحانات کو لے کر نمودار ہوا ہے۔ اداریہ فروغ [illegible] اور اے [illegible] پر مشتمل ہے مضامین معلومات افزا، جذبہ آفریں اور بامقصد نوعیت کے ہیں۔ ہم اس تو خیز معاصر کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ قیمت فی پرچہ ۴ر، سالانہ ڈاک سے ۵ر۔

جماعت اسلامی نے اس دور الحاد میں اسلام — اور خالص اور پورے اسلام — کی اجتماعی دعوت کا علم بلند کر کے جو گناہ عظیم کیا ہے اس کی سزا دینے والے صرف اغیار ہی نہیں، اپنے بھی ہیں۔ کیا مقام تجزیہ کریں گے آپ ان اصحاب منبر و محراب کا کہ جو غلام [illegible] تحریک اقامت دین کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف ہیں، ایسے ہی مجاہدین حق کے طرز فکر اور ان کے اخلاقی [illegible] کے ساتھ جائزہ لینے کے لئے مولانا عبد الرحیم اشرف نے "کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟" کے [illegible] عنوان سے ایک [illegible] کتاب مرتب کر دی ہے۔ اس میں مخالفین کے مضحکہ خیز اعتراضات بھی درج ہیں، جماعت اسلامی کے [illegible] کے مدلل جوابات بھی، اور غیر جانب دار مخلص علما کی آزادانہ رائیں بھی! ۔
یہ کتاب [illegible] متوسط معیار [illegible] ہے قیمت دو روپے بارہ آنہ ہے
[illegible]

— ایک بامقصد ادیب

— ایک شعلہ بیاں شاعر

— ایک دردمند مسلماں

— ایک حساس انساں

ماہر القادری

کے آٹھ سالہ کلام

کا

مجموعہ

فردوس

دیدہ زیب سرورق	اعلیٰ کتابت
حسین جمیل جلد	معیاری طباعت

قیمت تین روپے آٹھ آنے

مکتبہ "چراغ راہ"

— آرام باغ روڈ — کراچی

— بیرون لوہاری دروازہ لاہور

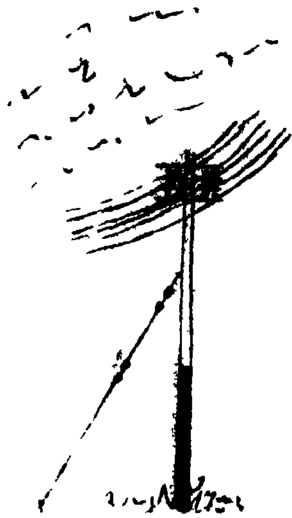
مشین کا
راگ

"ترقی کی شاہراہ پر قدم بڑھائے چلو" یہ ہے وہ نغمہ جو
سے نکل رہا ہے پارچہ بافی کی صنعت میں ہماری ترقی اطمینان بخ
لیکن ابھی بہت کچھ کرنا ہے ... کوششیں جاری
... سے بے نیاز ہو
وہ دن ...

باوانی ... ایا



کھمبے نے کہا!





"................

"بابوجی! مجھے کوئی کام دلوا دیجئے"

"میٹرک فیل ہوں"

"سال بھر سے بے روزگار ہوں"

"بچے بھوکوں مر رہے ہیں"

"................

کھمبے نے کہا —

جوان! جاؤ، مولینا مودودی کو گالیاں دیا کرو، اللہ تمہیں روزی دے گا!"

سراپائے رسولؐ

پر

پیش لفظ لکھتے ہوئے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے آخر میں تحریر فرمایا ہے

"مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی تمام مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے اس مختصر سے رسالہ میں یہ سراپا اس طرح پیش کر دیا ہے۔ کہ ہر معمولی پڑھا لکھا اردو دان اس کو پڑھ سکتا ہے۔ اور ایک اَن پڑھ آدمی بھی اس کو سن کر بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ کیا ہی بہتر ہو کہ ذکرِ رسولؐ میں موجودہ کی غلط اور گمراہ کن کتابوں کی بجائے ایسی کتابوں کو رواج دیا جائے، اور ہر مسلمان بچے کو یہ رسالہ پڑھوا کر اس کے ذہن میں یہ بات نقش کر دی جائے کہ یہی وہ نمونہ ہے جس کے مطابق اس کو اپنی زندگی ڈھالنی چاہئے"۔

مولانا اعجاز الحق صاحب قدوسی

کی تصانیف

مکتبۂ فلاحِ انسانیت ایک پلان کے تحت شائع کر رہا ہے۔ اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:-

سراپائے رسولؐ — قیمت: ۱/۱۰ روپیہ

ہمارے نبیؐ کے صحابہؓ — قیمت: ۱/۱۴ روپیہ

رسولِ پاکؐ کی صاحبزادیاں — قیمت: ۱/۸ روپیہ

رسول اللہؐ کے دو محبوب — قیمت: ۱۰ آنے

درسگاہِ رسولؐ کے دو طالب علم — قیمت: ۱۲ آنے

مکتبۂ فلاحِ انسانیت کراچی

٭ جس شخص میں ظرافت کا مادہ ہے۔ وہ ضرور خوش اطوار ہوگا۔ کیوں کہ اگر وہ اوروں پر ہنسے گا۔ تو بعض اوقات اپنے پر بھی ہنس دے گا۔

٭ اس سے بڑی غلطی کوئی نہیں کہ ہم یہ سمجھ بیٹھیں کہ زندگی صرف سنجیدہ ہے۔

٭ ہنسو اور موٹے ہو جاؤ، یہ تھا پرانا مقولہ ــــ نیا فلسفہ ہے، ہنسو اور نیک بنو۔

علی سفیان آفاقی

کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین

کا

مجموعہ

کمندیں!

جس کا مطالعہ تضیع اوقات نہیں، ذہنی و حسی آسودگی کیلئے ناگزیر ہے۔

خوبصورت سرورق ــــ خوشنما جلد

قیمت: تین روپے ۳/

مکتبہ چراغ راہ، کراچی

شاخ بیرون لوہاری گیٹ، لاہور

مجھے ہے حکمِ اذان ———

انسان کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ بدن اور روح، نفس اور ضمیر، ظاہر اور باطن کی کش مکش کا مسئلہ ہے۔ اس کش مکش پر اس دنیا کے اندر انسان کی قلبی طمانیت اور آخرت میں اس کی نجات کا انحصار ہے

جیلانی بی اے

کے بیش تر افسانوں کا موضوع زندگی کی اس فیصلہ کن کش مکش کے کوائف ہیں۔ وہ محض تفریحِ اوقات کے لئے نہیں لکھتا۔ وہ اپنے افسانوں کی بنیاد زندگی کے فلسفے پر اٹھاتا ہے اور اپنے قاری کے ذہن کو چپکے چپکے زندگی کے بنیادی مسائل کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے

جیلانی بی اے

کے افسانوں کا پہلا مجموعہ

اذان

اور

دوسرے افسانے

حسین و دل افروز ——— قیمت: تین روپے ۳/-

مکتبہ چراغِ راہ، کراچی

شاخ: بیرون لوہاری دروازہ لاہور

روشنی ——— گرمی ——— حرکت

ماہنامہ چراغِ راہ کراچی

جولائی سنہ ۱۹۵۶ء

شمارہ ۶ ——— جلد ۱۰

فہرست



چندہ سالانہ: ۵/- روپے۔ فی پرچہ: ۸ آنے

دفتر اشاعت و انتظام ——— ۹ لقمانیہ بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی نمبر ۱

دفتر ادارۂ تحریر ——— ۱-۱-۱ (۸/۱) محلہ رسول پورہ اچھرہ لاہور

سیّد کاظم حسن پرنٹر پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر چراغِ راہ۔ آرام باغ روڈ کراچی سے شائع کیا۔

ادارہ

سوچ بچار

غبارِ پریشاں

قلم کی طاقت بڑی طاقت ہے۔ اور اگر صاحبِ قلم کو خدا تعالیٰ ادبی زورِ بیان نصیب کرے اور اسے مؤثر اسالیب پر قدرت ہو جائے تو قلم کی طاقت شمشیرِ جوہردار سے کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ پھر اگر ادبی زور رکھنے والا قلم صحافت کے میدان میں اپنی جولانگہ پیدا کرلے تو عوام الناس کے دل و دماغ کی ایک وسیع دنیا اس کے زیرِ نگیں آجاتی ہے۔ ایک مسلم کی نگاہ سے دیکھیں تو یہ سب اللہ تعالیٰ کے عطیات اور اس کی سپرد کردہ نعمتیں ہیں جن کا صحیح مصرف یہ ہے خدا تعالیٰ کے عطا کردہ کلمۂ حق کا بول بالا کیا جائے اور اس کے بندوں کے خیالات اور اخلاق کو سنوارا جائے — اور یہی ان عطیات اور نعمتوں کا شکرانہ ہے!

ایک آدمی کو اگر اس امر کا موقع حاصل ہو جائے کہ ہزارہا بندگانِ خدا ہر روز یا ہر ہفتے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوں اور پھر اسے یہ صلاحیت بھی نصیب ہو جائے کہ وہ دلوں اور دماغوں میں داخل ہونے کے مختلف دروازوں کو کھول سکتا ہو اور لوگوں کے خیالات کی ترتیب کو اپنے ڈھب پر لاسکتا ہو تو کوئی شک نہیں کہ وہ چاہے تو کارِ پیمبری کر سکتا ہے اور چاہے تو ساحری کے کمالات دکھا سکتا ہے۔

ہر بڑی طاقت اور صلاحیت آدمی کے پاس اپنے خالق کی طرف سے ایک امانت ہوتی ہے اور کوئی شک نہیں کہ اس امانت کے استعمال کے بارے میں ایک دن پائی پائی کر کے حساب دینا ہوگا۔ آدمی اگر امانت دار ہو تو خداداد طاقت یا صلاحیت کے صحیح استعمال سے اپنے قومی اور وطنی اور نوعی بھائیوں کی بگڑی بنا سکتا ہے اور اگر آدمی خیر ذمہ دار اور خیانت کار ہو جائے تو وہ جس دائرے میں جتنی چاہے تخریب کر سکتا ہے۔ قوتوں اور صلاحیتوں کو خدمت کا وسیلہ بھی بنایا جا سکتا ہے اور ان کو کاروباری جنس بنا کر ان کے بل پر روپیہ پیسہ، اونچا معاشرتی مرتبہ، اکابر کی بارگاہوں میں مقربیت، ناموری اور شہرت جیسی ہر متاعِ غرور حاصل کی جا سکتی ہے۔

دوسروں کے ذہن و کردار کو متاثر کرنے والی طاقتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی کو بھی لے کے چلنے والوں کے لئے کام کرنے کے دو راستے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سوچ سمجھ کر کچھ اصول و مقاصد کو متعین کریں، خوب جانچ کر خیر و شر کے پیمانے سامنے لیں اور قوم یا انسانیت کی جو خدمت بھی ان کو سرانجام دینی ہو اس کا پورا نقشہ مرتب کر کے سامنے رکھیں۔ پھر اس سے قطع نظر کر کے اپنی عمر تعمیر و اصلاح کے کام میں کھپا دیں کہ دولت ملتی ہے یا فقر و فاقہ گھر میں پھلاوڑی ڈال دیتا ہے، لوگ واہ واہ کرتے ہیں یا ناک بھوں چڑھاتے ہیں، جلدی جلدی کچھ نتائج نکلتے ہیں یا لمبا انتظار کرنا پڑتا ہے، معاشرتی مرتبہ اونچا ہوتا ہے یا پہلے سے بھی گھٹ جاتا ہے، دوستیوں کا دائرہ وسعت اختیار کرتا ہے یا سکڑتا ہے، اکابر کی نگاہ میں قدر و منزلت بڑھتی ہے یا ان کا عتاب حصے میں آتا ہے — دوسرا یہ کہ اصول یا

کی کاوش میں پڑے بغیر آدمی چل کھڑا ہوا اور دو قدم ایک ڈگر پر اور چار قدم دوسری پگڈنڈی پر اور دس قدم تیسری روش پر گھومتا پھرے اور جو کچھ ہاتھ آ جائے وہی مقصد و غایت بنا جائے اور ہر آن ایک نیا اصول اپنی کوتیل نکالتا رہے۔

بد قسمتی سے ہمارے ہاں بے اصولاپن اور لامقصدیت یا ذہنی آوارگی عام ہے۔ یہاں کا لیڈر، مقرر، ادیب، شاعر، واعظ اور صحافی ہر کوئی آوارہ گردی میں مصروف نظر آتا ہے۔ خصوصیت سے دنیائے صحافت میں سرمائے، خیال، ادبیت اور علم کی طاقتیں انتہائی شانِ لاابالی اور الفضولی سے استعمال ہو رہی ہیں۔ اکّا دکّا استثنائی مثالوں کو پیش کرنے سے ایک عمومی حقیقت کی نفی نہیں ہو سکتی۔ یہاں اصول و غایت کے بغیر ایک شخص میدان میں اترتا ہے، زیادہ سے زیادہ وہ کسی سیاسی بزرگ یا کسی پارلیمانی جتھے کا دامن تھام لیتا ہے، پھر وہ ادھر سے ٹوٹ کر ادھر لڑھکتا، ادھر سے کٹ کر ادھر آملتا رہتا ہے، وہ بڑی آسانی سے ایک خیال کے اخبار کو چھوڑ کر دوسرے مخالفانہ خیال کے اخبار میں نوکری کر لیتا ہے، صبح کو وہ ایک چیز کی حمایت کرتے کرتے شام کو اس کی مخالفت کر سکتا ہے اور پوری رات کسی کی مخالفت میں گزارنے کے بعد مرغ کی اذانِ سحر کے ساتھ وہ اسی کی قصیدہ خوانی کر سکتا ہے۔ ضمیر کی آواز اس میں آڑے آتی ہے اور کسی گہرے گڑھے میں گری ہوئی اس کی خطرت کراہتی ہے لیکن جب ایک جاندار قلم سے مسلح صحافی یہ دیکھتا ہے کہ ہزاروں نہیں تو سینکڑوں بندگانِ خدا اس کے لکھے کو پڑھنے کے منتظر رہتے ہیں، گلی گلی اس کا نام گونجتا ہے، کچھ لوگ اس کی خوشامدیں کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس سے ڈرتے ہیں، وہ لوگوں کے خیالات کو ہنکائے پھرتا ہے، وہ جذبات کو انگلیوں کے پوروں میں گردش دے سکتا ہے، وہ رائے عام کے سیلاب کی لہروں کو انگلی کے اشاروں سے رُخ پلٹنے پر مجبور کر سکتا ہے تو شہرت و ناموری، اثر و رسوخ اور ذہنی اقتدار کا نشہ اس پر چھا جاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر جب سیاسی طور پر باخبر اور ادبی لحاظ سے بااثر صحافی ملکی ایوانِ اقتدار کے جوڑ توڑ سے بھی جیتے جیتے "وزیر گری" اور "لیڈر سازی" کا کھیل کھیلنے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر اس کا نشہ ایسا دو آتشہ و سہ آتشہ ہو جاتا ہے کہ ساری عمر اسے ہوش میں آنے کا موقع ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ملتا۔ پھر اسے احساسِ برتری کی معجونِ فلک سیر اتنا اونچا اڑاتی ہے کہ بڑے سے بڑے نظریات اور اصول اور عقیدے اور دین اور مدارسِ فکر اسے یکسر لایعنیات معلوم ہوتے ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی شخصیتیں اسے چیونٹیوں جیسی حقیر دکھائی دیتی ہیں، تنظیمیں اور تحریکیں اس کی نگاہ میں بچوں کا کھیل ہو جاتی ہیں، اور وہ خود اپنے آپ کو ہر چیز سے بالاتر سمجھتا ہے۔ چنانچہ ہمارے آج کے صحافی کے ہاں حفظِ مراتب کے شعور کو سرے سے بار ہی نہیں ملا، کسی کے علم، کسی کی عمر اور کسی خدمات کا کوئی لحاظ باقی نہیں رہتا، اندازِ گفتگو اور زبانِ تنقید کے لئے تہذیب اور شرافت کی کوئی آخری حد وہ باقی نہیں رہیں۔ جس کے دامن پر چاہا روشنائی کے چھینٹے ڈال دیئے، نوکِ قلم سے جس کی چاہا پگڑی اچھال دی اور جس کا چاہا گریبان نوچ ڈالا۔ بیچارے عوام کا تو کیا مقام — وہ اس نشے میں نادان بچوں کا ایک ہجوم دکھائی دیتے ہیں جن کو کبھی استدلال کے شعبدوں سے، کبھی اسالیبِ بیان کے کرتبوں سے اور کبھی جذبات کی پھلجھڑیوں سے مسحور کیا جا سکتا ہے۔ ایسے عالم میں پہنچ کر ایک عظیم اشاعتی قوت سے مسلح صحافی دھڑوں کی ملک کو کیا بنائے گا، خود اپنے آپ کو سنبھالنے اور سنوارنے کے قابل نہیں رہتا۔

مگر مجموعی طور پر کئی لاکھ کی تعداد میں چھپنے اور چند کروڑ افراد کے وسیع حلقے میں پڑھے جانے والے اخبارات اس طرح کے صحافیوں

سکے ہیں یہ تو ہو نہ سکا کہ وہ کسی نظریۂ حق اور کسی تعمیری نقشے کو لے کر قوم کے خیالات اور اخلاق کو بنانے سنوارنے اور اس کی سیاسی تقدیر کو بہتر بنانے کی مہم میں لگ جاتے تو دس برس کی مدت میں زندگی نیا رنگ روپ حاصل کر لیتی۔ لیکن اصول و مقصد سے بے نیاز تھا، منگ رہ گئے پن، تضادات، ابنائے معاد، عوام فریب ہنروں اور کرتبوں کی نمائش، جذبات سے کھیلنے کے سستے اسالیب اور اخبار کی اشاعت بڑھانے کے لئے بازاری تدبیریں وہ بلائیں ہیں جنہوں نے صحافت کی عظیم الشان اور موثر ترین طاقت کو صرف رائیگاں ہی نہیں، ملکی سیاست اور اخلاق دونوں کے لئے تباہ کن بنا دیا ہے۔ حقیقت میں ایک اخبار اپنی جگہ ایک کالج یا ایک یونیورسٹی ہوتا ہے جو مسلسل اپنے قارئین کی تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ اگر اخبارات کا کام فی الواقع معلمانہ ذہن سے چلایا جائے اور تعمیر فکر و اخلاق مقصود ہو تو ایک قوم چند برس میں کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ لیکن جب نقطۂ نظر تاجرانہ ہو جائے اور باہمی مسابقت میں ہر صحافی اس امر کے درپے ہو کر اس کے [illegible] بڑھیں، اور وہ قلفی ملائی اور کباب بیچنے والوں کی طرح لوگوں کے چٹخارے کا اصل لحاظ رکھے تو پیسہ بھی آئے گا اور واہ واہ اور شہرت بھی ملے گی، لیکن کوئی مثال اس کی نہیں ملتی کہ کبھی کبابیوں اور قلفی ملائی بیچنے والوں کے ہاتھوں کسی قوم کے خیالات اور کسی معاشرے کے اعمال سنورے ہوں یا کوئی معلمانہ کام سرانجام پا سکا ہو۔ یہی تاجرانہ ذہن ہے جس نے صحافت کی بہت بڑی تعمیری طاقت کو اُلٹا ذریعۂ تخریب بنا کے رکھ دیا ہے۔

ہمارے ایک صحافی بھائی لاہور سے ایک مقبول ہفت روزہ مجلہ نکالتے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے قلم کی طاقت دی، ادب کی طاقت دی، اثر کی طاقت دی اور پھر ان کے سامنے دائرۂ صحافت میں ایک وسیع میدان کار کھول دیا اور اپنے ہزاروں بندوں پر اثر انداز ہونے کا موقع بہم پہنچایا۔ اگر انہیں توفیق ہوتی تو وہ دوسروں پر اثر انداز ہونے کا منصب سنبھالنے سے پہلے بڑی کاوشوں سے یہ طے کر لیتے کہ انسانی زندگی کا بھلا کس نظریے اور کس اصول میں ہے جسے ابتداءً خود مجھے اپنانا چاہیے اور پھر اپنے قومی اور انسانی بھائیوں کو بھی ان کی طرف بلانا چاہیے۔ وہ پہلے ان پیمانوں کو اپنے لئے نصب العین متعین کرتے کہ مجھے ادھر جانا ہے اور ماسی قوتیں اور صلاحیتیں [illegible] ہیں وہ پہلے [illegible] امتیاز کا ایک اصولی پیمانہ اختیار کرتے کہ ہر قسم کے حالات میں مجھے اسی پیمانے سے نظریات و حوادث اور اشخاص و جماعات کی قدر و قیمت متعین کرنی ہے اور اپنی قوم کو اسی پیمانے کے قبول کرنے پر آمادہ کرنا ہے۔ وہ دل میں ایک بار سوچ سمجھ کر بات طے کر لیتے کہ پاکستان کی زندگی اور ترقی کا ضامن کونسا نظام حیات ہے اور اس کی طرف بڑھنے کے لئے کدھر سے کس طرح اقدام ہونا چاہئے، اس نظام کی تاسیس اور اس کی تعمیر کے لئے کس نوعیت کے افراد کو معاشرے میں سے ابھارنا چاہئے اور کیسے عناصر طاقت ور [illegible] توڑنا چاہیے، نیز کن طاقتوں سے تصادم اور کن طاقتوں سے تعاون کرنا اس سلسلے میں [illegible] پھر یہ بھی سوچتے کہ اپنی قوم کو نیا خیال برائیاں [illegible] ہیں جن کو دور کرنے کا اہتمام کرنا ہے۔ اور اس کو کن [illegible] ہے۔ وہ سوچتے کہ اس قوم میں مسلم ہونے کے [illegible] اس کو زندہ تر کرنا ہے، [illegible] قول و عمل کے تضاد سے نکالنا ہے [illegible] کے لئے تیار [illegible] اور خیانت کی [illegible] سے چھڑانا ہے، [illegible] سلیقہ بتانا

ہے، اسے معاملات کو سوچنے سمجھنے کے صحت مندانہ اطوار کی تعلیم دینی ہے، اسے جذبات میں بہک جانے کی کمزوری سے نجات دلانی ہے، اسے تبدیلی کی جدوجہد کے لئے تیار کرنا ہے اور اسے غلط قسم کی قیادت کے جوئے سے آزاد کرانا ہے۔ اس طرح وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے لئے ایک لائحہ عمل طے کرتے اور پھر یکسو ہو کر اس پر پڑ جاتے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو آج چند برس کا کام اپنی جڑیں چھوڑ چکا ہوتا۔ آج ان کے پیش کردہ خیالات ہر گوشے میں گونج رہے ہوتے۔ ان کا بنایا ہوا ذہن جگہ جگہ متحرک نظر آتا، ان کا پیدا کردہ کردار مختلف حلقوں میں کام کرتا ملتا۔

بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ سو اب ایک صاحبِ صلاحیت صحافی کی گراں بہا طاقتیں جس نہج پر صرف ہو رہی ہیں اس کو دیکھ کر ان کے ہر خیر خواہ کو رنج ہوتا ہے۔ زبان اور اندازِ بیان کے معاملے میں انہوں نے اپنے عوام کے ذوق اور ان کی ذہنی سطح کو شاید دوسرے تمام معاصرین سے زیادہ اچھی طرح سمجھ کر ایک معیار سامنے رکھ دیا ہے۔ اسالیب کے لحاظ سے دیکھیں تو خطابتی جذباتیت، انتہا پسندانہ مبالغہ، چبھتا طنز، سنسنی خیز انکشافات، استعجاب انگیز اشارات اور معانی رنگینی وغیرہ بہت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ موضوعات وہ لئے جاتے ہیں جن سے کسی بھی اچھی یا بری قسم کی دلچسپی عوام میں پائی جاتی ہو۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی ہستیوں کے پہلو بہ پہلو فلم ایکٹرسوں کا ذکرِ خیر بھی ملے گا اور کافی ہاؤس کی صحبتوں کی روداد کے ساتھ ساتھ "اس بازار" کی سیر کا حاصل بھی پیش کر دیا جائے گا۔ علاوہ بریں ایک ایک کر کے ان تمام زندہ و مردہ شخصیتوں اور تنظیموں کو زیرِ بحث لایا جاتا رہتا ہے جن سے ملک کے کسی عنصر میں دلچسپی پائی جاتی ہے۔ مگر مستقل طریقہ یہ ہے کہ ایک بار جس کی حمایت میں کوئی چیز آئے گی، دوسری بار اسی کی مخالفت میں کوئی دوسری چیز چھپ جائے گی۔ اس ہفتے کسی کے حریف کا مراسلہ شائع ہوگا اور اگلے ہفتے اس کے کسی حامی کا جواب آ جائے گا۔ بلکہ بعض اوقات ایک ہی شمارے میں کسی صفحے پر تعریفی کلمات شائع ہوں گے اور کسی دوسرے صفحے پر سنگین قسم کی تعریض جلوہ گر ہوگی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک ہی نوٹ میں دونوں باتیں کہی آ جائیں گی اور وہ اس انداز میں آئیں گی کہ فلاں شخص یا گروہ بڑا اچھا ہے، اس کے یہ اور یہ کمالات اور ایسی اور ایسی خدمات ہیں مگر اس میں فلاں خرابی ہے یا اس کے برعکس یوں کہا جائے گا کہ اس میں یہ خرابیاں ہیں مگر وہ بڑا اچھا ہے۔ متضاد باتیں اس "مگر" کے محور پر گھومتی رہتی ہیں اور کبھی ایک پہلے آ جاتی ہے، کبھی دوسری۔ اگر وہ خود ہی کسی دن بیٹھ کر کسی شخصیت اور جماعت —— مثلاً بخاری صاحب اور مجلسِ احرار —— کے بارے میں اپنے لکھے ہوئے اور اپنے شائع کردہ کلمات کو تاریخی ترتیب سے جمع کر لیں اور پھر اس مواد پر خود بھی نگاہِ تنقید ڈالیں تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ نفی و اثبات کے کس چکر میں گھوم رہے ہیں۔ ان چیزوں کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ عوام دو ٹوک فیصلے کرنے اور صحیح اور غلط کی پرکھ کرنے کے قابل نہ رہیں اور ہمیشہ ایک تذبذب اور انتشار میں پڑے رہیں۔ شاید شعوری طور پر ہمارے صحافی بھائی کو یہ نتیجہ پسند نہ ہو، مگر وہ جس نہج پر ایک خدمت انجام دے رہے ہیں، ان کی نیک نیتی کے باوجود اس کا حاصل وہی کچھ ہو سکتا ہے جو فطری طور پر ہونا چاہئے۔ سیدھا سیدھا طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو بتاتے کہ فلاں اصول اور فلاں پروگرام مطلوب ہے، لہٰذا جو شخصیت اور جو گروہ اس کو لے کر کام کر رہا ہو وہی ان کی توجہات کا مرکز ہونے کے قابل ہے اور جو کوئی بھی اس سے منحرف ہے وہ چاہے کیسے ہی کمالات اور کرامات اپنے اندر رکھتا ہو [illegible] نہیں ہونا چاہئیں۔

[illegible] کا سیاسی پارٹ بھی بڑا اہم ہے۔ وہ کسی جماعت یا پارٹی میں شامل ہو کر اور کسی لیڈر کے پیچھے چل کر

کام کرنے سے تو ببا بلند ہیں، لہٰذا ان کی سیاسی دلچسپیوں کا میدان بھی ذرا اونچی سطح پہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایوانِ اقتدار کے ہنگامہ ہائے درون در سے شغف پیدا کیا ہے اور اکھیڑ پچھاڑ کی حکمتِ لطیف کو خوب سمجھ لیا ہے۔ وہ ٹوٹتے اور بنتے دھڑوں کا مطالعہ کرتے ہیں، ان دھڑوں کے اساطین کو پہچانتے ہیں، ان اساطین کی رقابتوں اور چالوں کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس کے اوپر ابھرنے اور کس کے نیچے بیٹھ جانے کا امکان ہے۔ سو اول بدل اور جوڑ توڑ کے ہر نئے موقع پہ وہ اس گھنے وچوگان میں کسی نہ کسی کھلاڑی کو اپنا ممدوح بنا لیتے ہیں اور اس کے مدِمقابل کو حریف۔ پھر قلم، ادب، استدلال اور صحافت کا سارا زور اس طرح کے وقتی اور لاحاصل معرکوں میں صرف کر دیتے ہیں۔ پھر ویسا ہی کوئی دوسرا مرحلہ آتا ہے تو پھر کوئی نیا ممدوح ہوتا ہے اور کوئی نیا حریف۔ ہو سکے تو کبھی وہ اپنے مختلف اوقات کے ممدوحین اور حریفوں کی بھی ایک فہرست اپنے مجلّے کے مطبوعہ ریکارڈ کی مدد سے مرتب کریں اور ٹھنڈے دل سے حساب لگائیں کہ اس طرح کے مختلف معرکوں کا حاصل کیا نکلا، زندگی میں کون سی تبدیلی آئی اور قوم کی کونسی بگڑی بن گئی۔ اس طرح اپنا محاسبہ کرنے پر انہیں خود اپنے دل کی گہرائی میں سارے کئے کرائے پر ندامت ہو گی۔

کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کی نیت کے بارے میں کوئی بُرا تاثر دیں۔ اغلباً وہ نیک نیتی اور قوم کی محبت اور عوام کی خدمت کے جذبے سے اسی اکھیڑ پچھاڑ میں دلچسپی لیتے ہوں گے۔ لیکن شاید ان کی توجہ کبھی اس حقیقت کی طرف نہیں گئی کہ ہم ایک ایسا بگڑا ہوا معاشرہ ہیں جس کے پورے نظامِ قیادت پر محلے کی چودھراہٹ اور نمبرداری سے لے کر وزارتوں اور صدارتوں تک بہ حیثیت مجموعی ایک غلط عنصر چھایا ہوا ہے۔ چھایا ہوا ہی نہیں، اس نے سربراہ کاری کے خدائی حقوق پیدا کر لئے ہیں۔ تمام مناصب اور عہدے سیاسی برہمنوں کے اسی چھوٹے سے حلقے میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں اور اسی کے اندر کے افراد آگے اور پیچھے اور اوپر اور نیچے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ایک ہی طرح کا ذہن و کردار ہے جو کبھی مسلم لیگ کا لباس زیبِ تن کر کے آتا ہے، کبھی جناح عوامی لیگ کا بانا پہنے جلوہ گر ہوتا ہے، کبھی آزاد پاکستان پارٹی کا بھروپ بھرتا ہے اور آج کل ری پبلکن پارٹی کا خلعت اپنے قامتِ پر راست کئے ہوئے نمودار ہے۔ ایکٹروں کی ایک ہی ٹیم ہے جو طرح طرح کے لباس بدل کر ایک ہی سے کرتب چار دن دکھاتے ہیں اور لوگوں کو مایوس کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ سیاسی برہمنوں کا یہ خاندان معاشرہ کے بگاڑ کو جوں کا توں قائم رکھنا بلکہ اسے کچھ اور ترقی دیتے رہنا چاہتا ہے، اور عملاً ایسا ہی ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس میں سے دو تماشہ آگے آئیں یا ڈاکٹر خان، کھوڑو دولتانہ کرسیٔ یا میر غلام علی تالپور یا فضل الحق کرسی پر قابض ہوں یا سہروردی، حالات کے نقشے میں کوئی اصلاحی تعمیری رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے ان سیاسی برہمنوں کو سیاست، مذہب اور صحافت کے حلقوں میں ایسے ذہین افراد مل گئے ہیں جو اپنے مفاد اور اپنے روابط کے پیشِ نظر اس "شاہی خاندان" کی اجارہ دارئ قیادت کے محافظ اور پاسبان بن کر سرگرمِ جہاد رہتے ہیں۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس شاہی خاندان سے باہر کی کسی ایسی طاقت کو عوام کی نگاہوں کا مرکز نہیں بننے دیتے جو معاشرہ کی اصلاح کے لئے کوئی مستقل نظریہ سامنے رکھتی ہو اور جو عوام کو سرے سے اس شاہی خاندان سے نجات حاصل کرنے اور ناموں اور لباسوں کے بجائے نئے ذہن و کردار کو سامنے لانے کا راستہ دیتی ہو۔

خصوصاً صحافتی حضرات پروپگنڈہ کا پورا زور صرف کر کے عوام کے سامنے ترتیب وار یوں اپنا سلسلۂ استدلال پیش کرتے ہیں —

مسلم لیگ ناکارہ تھی، سو وہ مر چکی، اس سے کوئی امیدِ خیر اب وابستہ نہیں کی جا سکتی۔

مسلم لیگ کی جگہ لینے کے لئے اور جتنی بھی طاقتیں سامنے ہیں ان میں سے کوئی بھی قابلِ اطمینان نہیں، سب کی سب بری اور ناقص ہیں۔

لیکن انہی میں سے عارضی طور پر کسی کے ذریعے کام چلانا ہے۔

آؤ، اس ضرورت سے جائزہ لے کر دیکھیں اور بے لاگ قسم کا تبصرہ کریں۔

فلاں اور فلاں اشخاص اور جماعتیں (جو سیاسی برہمنوں کے اس طبقہ کے اندر شامل نہیں) بڑی اچھی ہیں، ان میں یہ اور یہ خوبیاں ہیں لیکن فلاں ٹیڑھ ان میں ایسی ہے کہ ان کو تو زیرِ بحث لانا ہی بے کار ہے۔

باقی دو ہی قابلِ ذکر دھڑے رہ جاتے ہیں، سو ان میں سے فلاں کے اندر بڑی بڑی خرابیوں کے باوجود یہ اور یہ کرامات موجود ہیں اور ان کو کرسی پر بٹھاتے ہی کایا پلٹ جائے گی۔

اس طریقِ تلقین سے بار بار عوام کو قیادت کی ہمہ گیر تبدیلی کی جدوجہد سے غافل رکھا جاتا ہے اور بار بار ان کو "کام چلاؤ" طرزِ فکر کی طرف لایا جاتا ہے اور بار بار ان کو چند برائیوں میں سے کسی ایک برائی کے حق میں ہموار کر لیا جاتا ہے۔

ایک غیور صحافی شاید اس پوزیشن کو سوچ سمجھ کر قبول نہ کر سکے، لیکن دوستانہ اور حریفانہ تعلقات اور حمایت و مخالفت کے جذبات کے دھارے بعض اوقات ایسے رخ بہا لے جاتے ہیں کہ آدمی کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں ملتا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ لیکن کوئی شعوری ارادے سے پیرتا ہوا ادھر جا رہا ہو یا غیر شعوری طور پر بہا جا رہا ہو، غلط کام کا غلط نتیجہ تو برآمد ہوئے بغیر نہیں رہتا اور یہ غلط نتیجہ جا کے بدنصیب قوم کی آنے والی کرۂ جانوں کی جھولیوں میں پڑتا ہے۔ ہم جب ایک صاحبِ صلاحیت بھائی کی طرف سے یہ پارٹ سیاسی اسٹیج پر دیکھتے ہیں تو دلی صدمہ ہوتا ہے۔

ہم لوگ اپنے ان صاحبِ صلاحیت صحافی بھائی کے اس لحاظ سے بھی ممنونِ کرم رہے ہیں کہ آپ کی طرف سے جماعتِ اسلامی پر بھی برابر نوازشات ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے دماغ کی بہت سی طاقت اور قلم کی بہت ساری جنبشیں اور اپنے جریدۂ پسندیدہ کے بہت سارے صفحات مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کو ارزانی فرمائے ہیں۔ مگر اسلوب وہی رہا۔ ایک نوٹ حمایت میں آیا، تو دوسرا مراسلہ مخالفت میں؛ چند کلماتِ احترام شائع ہوئے تو دوسری طرف اسی کے ہم قدر طنز و تضحیک کا مظاہرہ بھی ہوا۔ ایک اشاعت میں کسی مخالف کی گالیاں شائع ہوئیں تو دوسری میں کسی ہمنوا کی جوابی اور حامیانہ تحریر سامنے آ گئی۔ باری باری دونوں رُخ دکھانے کا یہ چٹ پٹا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے کبھی بٹ صاحب کا لکھا چھپا، کبھی سردار آفاقی حبیب یا درِ روزگار مبنی کی ریسرچ شائع ہوئی، کبھی پرویز صاحب کے زورِ قلم کا مظاہرہ ہوا، کبھی کیفیت حلقوں کے خیالات منعکس کئے گئے، کبھی حاجی امین الدین صحرائی کی سند سے کوئی انکشاف کر دیا گیا، کبھی جیل میں

مولانا مودودی سے نواب ممدوٹ کی معنی خیز ملاقات کی خبر نشر کی گئی، بد حالی اور نا مقاصد کا کال میں ایک گوشہ چڑھا گیا۔ ایک ہفتہ روزہ خان ہے کہ ہمارے یہ محترم بھائی خود ہی کسی دن اپنے لکھے ہوئے اور شائع کئے ہوئے سارے مواد کو اس موضوع پر جمع کر کے سامنے قائم کریں کہ لکھنے والے کے بارے میں کیا تاثر ملتا ہے اور اس لکھنے کا حاصل کیا ہے۔

نوٹ کرنے کی چیز اس دو گونہ سلسلہ اظہار میں یہ ہے کہ مولانا مودودی سے مخلصانہ محبت اور جماعت اسلامی پر عنایت فرمائی کا پلہ کس قدر بھاری معلوم ہوتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ آپ یہ دیکھیں گے کہ جب کبھی قیادت کی ترتیب نو کا اہم موقع پیدا ہوتا ہے یا شاہی خاندان کی صفوں میں کوئی رد و بدل ہونے والا ہوتا ہے تو ایسے تاریخی مواقع پر ہمارے ان محترم بھائی کا مجلہ تمام لحاظ داریوں کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنے ہی لکھے ہوئے حامیانہ کلمات کو قعر فراموشی میں غرق کر کے یکایک اس مہم میں لگ جاتا ہے کہ مولانا مودودی کی دعوت اصلاح اور جماعت اسلامی کی تحریک تغیر کی طرف عوام کی توجہ جمنے نہ پائے بلکہ مختلف حربوں سے ان کو چکر میں ڈال دیا جائے۔ پھر ان کو ملامت سے اس پر آمادہ کر لیا جائے کہ لیڈری کے موجودہ اجارہ داروں ہی میں سے کسی ممدوح کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ پنجاب کے گزشتہ انتخابات عام کے موقع پر ہمارے اس مقبول عام ہفت روزہ نے جو پارٹ ادا کیا تھا اس کا جائزہ ان دنوں کے فائل سے لے کر دیکھئے کہ ممدوحین کے ایک دھڑے کو آگے آنے کا راستہ بنا کر دینے کے لئے جماعت اسلامی کے خلاف کس طرح دھواں دھار مہم چلائی گئی تھی۔ ذرا یہ بھی ضرور نوٹ کر لیجئے کہ اس وقت کے ممدوحین کے ٹولے کے بارے میں لوگوں کو کیسی امیدیں دلائی گئی تھیں اور پھر یہ حساب بھی لگائیے کہ ان امیدوں کی کھیتیوں میں کتنی فصل پیدا ہوئی۔

یہ ہیں وہ خطوط جن پر جماعت اسلامی کے بارے میں اس معزز معاصر کی پالیسی چلتی ہے۔

چند مہینوں کی بات ہے کہ لاہور کے اس نامور ہفت روزہ میں جماعت اسلامی کی حمایت میں بڑے زوردار کلمات خیر لکھے گئے۔ ان کلمات خیر کو پڑھ کر قدرتی طور پر انتظار کیا جانے لگا کہ اب دوسرا رخ آئے گا۔ مگر یہ پہلا نادر موقع تھا کہ یکے بعد دیگرے مسلسل اچھی باتیں کہی گئیں۔ بڑا اچنبھا ہوا اور یہ امکان سامنے آیا کہ شاید ہمارے محترم بھائی کے مزاج میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے، یا اب وہ آہستہ آہستہ جماعت کے بارے میں کسی مستقل رائے پر آ پہنچے ہیں۔ جماعت کے بہی خواہ اس عنایت کے لئے ان کے بڑے ممنون تھے لیکن حال ہی یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ اس دریائے مواج نے اپنا رخ بدل لیا ہے اور چھ سات مہینوں میں جتنی خیر میٹھی بادہ عطا ہوئی تھی اسے ایک ہی ہلّے میں بہا لے گیا ہے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو انہی کم ظرف مولویوں کے فرمودات کے اقتباس جلی حروف میں چھپ رہے ہیں جن کے خلاف موصوف نے جماعت اسلامی کے دفاع میں چند ہی ماہ قبل روز قلم صرف کیا تھا، سرور آفاقی جیسی اتھارٹی کے ملفوظات شائع ہو رہے ہیں، دیوبندی علماء کے فتاوائے تکفیر کے مجموعے کا اشتہار مجلہ مذکور کے اپنے مکتبہ کی طرف سے آ رہا ہے، غرض یہ کہ جہاد شروع ہو گیا ہے اور اس کے لئے ہر طرف سے اسلحہ حاصل کئے جا رہے ہیں۔

آپ کے دل میں سوال پیدا ہونا چاہیئے کہ اس جہاد کا تازہ محرک کیا ہے؟ — محرک یہ ہوا کہ مغربی پاکستان کی پارٹیاں زندگی

میں [illegible] کا ایک تاریخی موقع پھر پیدا ہوگیا۔ اس موقع پر دو طاقتیں آمنے سامنے آگئیں، ایک طرف سردار بہادر خاں تھے جو مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے اور ان کی اوٹ میں دولتانہ اقدام کر رہے تھے۔ دوسری طرف ڈاکٹر خاں صاحب تھے اور انہوں نے بھی مقابلے پر ایک ری پبلکن پارٹی کا نیا علم اٹھا دیا اور ان کی آڑ میں گورمانی کھیل رہے تھے۔ دونوں گروہوں نے اقتدار طلبی کا کھیل ایسے گھناؤنے انداز میں کھیلا کہ تمام پچھلے ریکارڈ مات کر دیئے۔ اور یہ ساری دھماچوکڑی ایسے عالم میں مچ رہی تھی کہ کشمیر کا مسئلہ مدت کے بعد یو۔ این۔ او میں لے جایا جا رہا تھا، پاکستان کی سرحدوں پر دشمن کی "دراز قدمیاں" اور "دراز دستیاں" ہو رہی تھیں، پاکستانی شہریوں کو ہندوستان میں سازشی مقدموں میں پھانسا جا رہا تھا اور ایک شہری کو تو بے دردی سے قتل تک کر دیا گیا، پنڈت نہرو چترال کی ملکیت کا دعویٰ لے کے اٹھ رہے تھے اور ہندوستانی سفارت خانہ مشرقی پاکستان میں سیاسی سازشیں کر رہا تھا۔ جماعت اسلامی نے ایک اصولی دعوت کی بناء پر اشخاص اور جتھوں کے اس سارے مجموعے کو اور ان کی پوری ہنگامہ آرائی کو اسلام کے لئے رسوا کن اور پاکستان کے لئے باعث تباہی اور عوام کے لئے سخت مضر سمجھا اور اس کا اظہار بھی کیا۔ اس کے نزدیک دولتانہ اور گورمانی سردار بہادر خاں اور ڈاکٹر خاں یا مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی میں سے کسی ایک کی جیت اور کسی دوسرے کی ہار سے نہ نظام زندگی میں کوئی تعمیری تبدیلی آسکتی ہے اور نہ بین الاقوامی اور قومی مسائل کی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں اور نہ ان میں سے کسی بھی فرد اور جتھے کو کوئی پائداری حاصل ہو سکتی ہے۔ قیادت کی داخلی ترتیب کے جزوی ردّ و بدل پاکستان بننے سے لے کر اب تک بہت سے ہو چکے ہیں اور ہر ردّ و بدل پر کچھ نہ کچھ ذہین صحافی امیدیں دلانے اور متوقع کرامات کا شمار کرانے کے لئے زورِ قلم صرف کرتے رہے ہیں۔ خود ہمارے بھی صحافی بھائی بھی تاریخ سیاست میں ایسا حصہ پہلے لے چکے ہیں۔ آج وہ حساب مرتب کر کے دیکھیں تو سہی کہ ان کے کسی بھی صاحبِ کرامات ممدوح سے قوم کو کیا ملا۔ بچاری قوم کا تو ہر کسی کے ہاتھوں الٹا اور ستیاناس ہوا ہے اور پچھلے نو برس میں تو تمام تر ایک داستانِ انحطاط مرتب ہوئی ہے۔ ہم اصول کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ سابق تجربات کی روشنی سے بھی استفادہ کر کے کہتے ہیں کہ کرسیوں کی تازہ تقسیم و ترتیب سوسائٹی کو ہمہ گیر۔۔۔۔۔۔ بگاڑ سے نکال کر اصلاح و ترقی کے راستے پر ہرگز نہیں ڈال سکتی۔ آج یہ دعویٰ نظری ہوگا، کل واقعات اسے تاریخی حقیقت بنا دیں گے۔

جماعت کا یہ نقطۂ نظر اس کے اخبارات اور ترجمانوں کے ذریعے سامنے آتا رہا۔ چوں کہ مسلم لیگ کی ناکارگی اور نااہلیت کے بارے میں دو رائیں موجود ہی نہیں تھیں، اس لئے قدرتی طور پر اس پہلو سے بہت زیادہ زورِ استدلال کی ضرورت نہ ہوئی، لیکن دوسری طرف چوں کہ ایک نیا جھنڈا بلند ہو رہا تھا اور اس جھنڈے کے ساتھ عوام کو عقیدت میں استوار کرنے کی تلقین کی جا رہی تھی، لہٰذا ضروری ہوا کہ لوگوں کو غلط امیدوں میں بہکنے اور بہک جانے کے بعد پھر مایوسی کے گڑھے میں گرنے سے بچایا جائے اور اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کرنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ تحریر و تقریر میں عوام کو بتایا گیا کہ ڈاکٹر خاں صاحب نے جن مخالفِ ملت سیاسی نظریات میں عمر گذاری ہے ان سے آج تک انہوں نے رجوع نہیں کیا، یہ کہ انہوں نے چند مہینوں کے زمانۂ اقتدار میں جو جو ادعا گفتگوؤں اور بیانوں میں کئے تھے ایک ایک کر کے سب کو خود ہی پامال کر دیا ہے، یہ کہ انہوں نے بھی دوسرے جاہ طلب لیڈروں کی طرح عہدوں کی کرسیوں

کی قیمت دے کر لوگوں کی جماعتیں خریدی ہیں اور معمول سے زیادہ گھٹیا انداز سے جوڑ توڑ کئے ہیں، یہ کہ انہوں نے اپنے گرد بہاں بھی کا کنبہ جوڑ لیا ہے، یہ کہ ان کی صفوں میں کل کے مسلم لیگی اپنے اسی ذہن و کردار کے ساتھ آج کے ری پبلکن بن کر بڑی کثیر تعداد میں جلوہ فرما ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، یہ کہ انہوں نے نہ اپنی طرف سے کوئی جامع اصول اور کوئی تعمیری نظریہ پیش کیا ہے اور نہ اپنی پارٹی ہی کی طرف سے کوئی منشور اور پروگرام قوم کے سامنے رکھا ہے۔ اندریں حالات محض ایک نیا سائن بورڈ لگ جانے سے درون خانہ کے حالات بدل نہیں سکتے اور نہ کسی تعمیری و اصلاحی کارنامے کی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

لیکن بعض دوسرے وزیر اگر صحافیوں کے ساتھ ہمارے صاحبِ صلاحیت بھائی بھی حسبِ معمول اپنا پورا زور، ذہانت ڈاکٹر خان صاحب اور ان کی پارٹی کو ممدوح بنا کر صرف کر رہے ہیں۔ اسی معرکے کے لئے ایک مرتبہ تو وہ اسٹیج پر بھی آئے ــــ اور جس انداز سے اس ڈرامے میں انہوں نے حصّہ لیا اس پر ان کا ہر خیر خواہ محسوس کرتا ہے کہ یہ انداز ان جیسے خوددار اور ذہین آدمی کے شایانِ شان نہ تھا ــــ اور اپنے جلہ میں تو انہوں نے مستقل محاذ کھول دیا۔ دماغ اور قلم اور دلیل اور ادب کی ساری طاقتیں اس جلیل القدر نصب العین کی راہ میں جھونک دی گئیں کہ میرا آدمی کامیابی کا سہرا باندھے اور اس کا حریف چت رہے۔ اس ذہنی جہاد میں ان کا سلسلۂ استدلال وہی تھا کہ مسلم لیگ تو نا اهل پڑھیئے، باقی سب ردّی مال ہے مگر اسی میں سے کام چلانا ہے اور اس میں سے کسی کو وقت کی ضروریات کے لحاظ سے چار دن کے لئے آگے کرنا ہے، سو ضروری ہے کہ بے لاگ سا جائزہ لیا جائے ــ پھر جماعتیں گنوائی گئیں اور ان میں سے مجلس احرار اور جماعتِ اسلامی کو ایک ساتھ میں ڈال کر (یہ سب پروپیگنڈے کے فنونِ لطیفہ ہیں) ان کی کوئی خوبی بیان کر کے حرفِ "مگر" کو بیچ میں ڈالا اور پھر ان کے ناکارہ پن کی کوئی وجہ بیان کی اور ان کو اٹھا کے دائرۂ بحث سے خارج کر دیا، یعنی ان کے بارے میں زیادہ کاوش ہی کرنے کی ضرورت نہیں ــــ اب باقی رہ گیا ذہنی سیاسی برہمنوں کا طبقہ، سو اس میں سے مسلم لیگ کے بارے میں تو انتخابات کافی ہو جاتی ہے کہ "آزمودہ را آزمودن جہالت"۔ اب دوسری طرف ایک طاقت رہ گئی جسے امیدوں اور عقیدتوں کا مرجع بنایا جا سکتا ہے۔ اب آپ لاہور کے اس بے مثال جریدے کے پچھلے شمارے اٹھا کر ڈاکٹر خان اور ان کے بعض ساتھیوں کی شان میں لکھے ہوئے قصیدے دیکھئے۔ ان کو پڑھ کر آدمی سوچتا ہے کہ کسی کی حمایت بھی کرنی ہو تو آخر صفت کے ان انتہائی الفاظ کو کیوں اتنا سستا کر دیا جائے۔ خصوصاً یہ خیال بھی تو رکھنا چاہئے تھا کہ دلوں کی چند ہی گردشوں کے بعد اسی مجلے میں بالکل برعکس قسم کی تحریریں بھی تو شائع ہونے والی ہیں۔ (آخر پہلے اس کی نظیریں موجود ہیں) ان قصائد کے ساتھ ساتھ متعدد کرامات بھی مسلسل گنوائی گئی ہیں، انہیں پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑا بھاری انقلاب آ رہا ہے۔ زمین و آسمان بدل جانے والے ہیں، جمہور کی تقدیر کوئی تاریخی پلٹا کھانے والی ہے ــ اور محض اتنی تبدیلی کے نتیجے میں کہ جس کرسی پر پہلے کوئی اور تھا اب وہاں بھائی صاحب کے ممدوح جلوہ فرما ہوں گے ۔

عجیب بات ہے کہ ہمارے صحافی دوست اور حمید نظامی اور دوسرے لوگ بھی ڈاکٹر خان کی حمایت میں [illegible] ہیں [illegible] قلم سے لکھ رہے ہیں، لیکن بس وہی "مگر" کی کڑی وہ بھی لگاتے ہیں کہ ان صاحب خاندان کے حق میں ہو [illegible] شائع کیا جاتا۔

یہاں کے ذہنی معرکے میں چونکہ جماعت اسلامی ان کی ہمنوا نہیں تھی اور ان کے ممدوح کی عقیدت میں سرشار ہو کر خیالی امیدیں نہیں باندھ سکی، لہٰذا اس قصور پر انھوں نے اس کو سزا دینے کا تہیہ کر لیا۔ سو جو کچھ عنایات ان دنوں ہو رہی ہیں وہ اسی ناقابل عفو جرم کی سزا ہیں۔ آدمی کا جذباتی پن اس کو کہیں سے کہیں جا پہنچاتا ہے۔ بھائی! سیدھی سی بات تھی کہ جماعت کے نقطۂ نظر کو آپ غلط یا حقیر قرار دیتے اور اپنا آپ رستہ لیتے، جماعت کو اس کے اپنے رستے پر چلنے کے لئے چھوڑ دیتے۔ یہ کیا ضرور تھا کہ ایک جماعتی لڑائی چھیڑ دی جائے۔ محض اختلاف کافی تھا، مخالفت کا طوفان اٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔ مخالفت بھی کرنی تھی تو ایک بار دل کھول کر اپنے قلم سے کر لی ہوتی، یہ طریقہ آپ کو کیوں پسند آیا کہ جماعت کے گھٹیا سے گھٹیا حریفوں کی فضولیات تسلسل سے شائع کی جانے لگیں۔

غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ آئندہ انتخابات کا معرکہ پیش نظر ہے اور اس کے لئے ابھی سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ابھی سے مورچے کھد رہے ہیں، ابھی سے پروپگنڈے کے خطوط متعین ہو رہے ہیں۔ ورنہ موجودہ پارلیمنٹری کش مکش سے جماعت اسلامی کی تو کوئی دلچسپی نہ تھی وہ اس گندے کھیل کے میدان سے باہر تھی۔

بہر حال آج کل مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر وہ کچھ لکھا جا رہا ہے جو لاہور کے اس مجلہ کی اپنے ہی شائع کردہ بہت سی باتوں سے بالکل متضاد ہے ——— اور متوقع یہی ہے کہ چند روز بعد آج کل کی باتوں پر خط نسخ پھیرنے والی نئی عنایات ہو جائیں۔

تازہ مجلہ میں ایک بات ——— بار بار کی دہرائی ہوئی ——— یہ کہی گئی ہے کہ جماعت اسلامی کے لوگ زعم صالحیت اور ادعا کبر تقویٰ میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو مسلمان نہیں مانتے۔

الحمد للہ کہ جماعت کی اصل دعوت و تحریک دلیل اور قبولیت عام کے لحاظ سے اتنی مضبوط ہے کہ اس پر براہ راست حملہ کرنا تمام حملہ آوروں کے لئے مشکل رہا ہے اور اگر کسی نے اقدام کیا بھی ہے تو اسے جلد ہی قدم واپس اٹھانا پڑا ہے۔ گنجائش بس یہی رہتی ہے کہ ہیرا پھیری کر کے شبخون مارے جائیں۔ ادھر ادھر کے شوشے اور الزام اور لوگوں کو بھڑکانے اور شبہ میں ڈالنے والے نکتے پیدا کئے جاتے ہیں۔ یہی نوعیت اس فرسودہ الزام کی بھی ہے۔ اس الزام کے تیر سے بیک دم دوہرا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک سمت یہ برسر اقتدار حضرات کو اکسانے اور چڑانے کا ذریعہ ہے ——— جن کے لئے ہر دور میں کوئی بھی اصولی دعوت اصلاح و تعمیر ناقابل برداشت ہوتی ہے اور جو اس کے خلاف ہاتھ آنے والے ہر نکتہ کے قدردان ہوتے ہیں ——— کہ دیکھئے، یہاں تو آپ لوگوں کے ایمان و اسلام کا صفایا بول دیا گیا ہے، یہ لوگ بڑے تنگ نظر، متعصب اور انتہا پسند ہیں۔ دوسری جانب یہ عوام اور خصوصاً تعلیم یافتہ عنصر میں جذباتی اشتعال پیدا کرنے کا نسخہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب کسی کے متعلق یہ بتایا جائے کہ وہ اپنے سوا ہر ایک کو کافر و گمراہ کہتا ہے تو کون اس کی بات سننے کے لئے تیار ہو گا، الٹا وہ نفرین بھیجے گا۔

لیکن سوچنے کی بات ہے کہ یہ الزام نکالا کہاں سے گیا ہے؟ جماعت اسلامی کا حال یہ ہے کہ اس کے اجتماع اول کے موقع پر جن ہدایات کو اساسی پتھروں کے طور پر اس کی بنیاد میں رکھا گیا تھا ان میں سے ایک یہ تھی کہ تکفیر و تفسیق، فرقہ وارانہ مناظرہ آرائیوں اور

عام مسلمانوں سے علیحدگی و تفوق کے فتنہ میں نہیں پڑتا ہے۔ جماعت کے لٹریچر میں بحثیں کی گئی ہیں کہ داعی و مصلح کا کام تکفیر کرنا نہیں ہے۔ اسی سبب سے ایک مثال بھی نہ ملے گی کہ جماعت نے من حیث الجماعت یا اس کے امیر یا دوسرے ذمہ دار علماء میں سے کسی نے ایک بھی مسلمان کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہو اور کوئی ایک فتوائے تکفیر بھی شائع کیا ہو۔ پھر اس سنگین الزام کا ماخذ کیا ہے؟

کسی اصولی دعوتِ اصلاح اور کسی مقصدی تحریکِ تغیر کو ایک ناخوشگوار فریضہ یہ ادا کرنا پڑتا ہے کہ وہ اس بگاڑ کو پوری طرح الم نشرح کرنے پر مجبور ہوتی ہے جو معاشرے کو روگ بن کے چمٹ جاتا ہے۔ یہ ہر ایسی دعوت کا لازمی نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کو تبدیلی کا پیغام دینے سے پہلے جو شعور دلائیں گے وہ یہ ہوگا کہ موجودہ حالات غلط اور نامطلوب اور مضر ہیں۔ بغیر اس کے کوئی مثبت پیغامِ حرکت و تغیر دیا ہی نہیں جا سکتا۔ مثلاً کانگریس اٹھی تو اس نے انگریزی اقتدار اور اس کی غلامی کو ختم کرنے کے لئے جذبات پیدا کئے، مسلم لیگ نمودار ہوئی تو اس نے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے خطرہ سے نکلنے کے لئے اکسایا، کمیونزم آتا ہے تو جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کے مفاسد پہلے نمایاں کرتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ مزدورو اور کسانو! متحد ہو جاؤ اور انقلاب اٹھا دو۔ قرآن کو پڑھیئے تو مکہ کے نظامِ جاہلیت و شرک اور مدینہ کے یہودیوں کے مذہبی طلسمات کے خلاف جھنجھوڑ دینے والی تنقید ہر سورت میں ملتی ہے۔ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ معاشرہ کے موجودہ بگاڑ ——— معتقدات، اخلاق اور سیاست و معیشت کے ہر دائرے میں ——— پورا تجزیہ کر کے عوام کے سامنے رکھ دیا اور پھر یہ احساس دلایا کہ مسلمان ہونے کے دعوے کے ساتھ یہ صورتِ حالات بالکل متضاد پڑتی ہے، لہٰذا انہیں انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو یکسر بدل دینا ہوگا۔

ظاہر بات ہے کہ جب بگاڑ اجتماعی قسم کا ہو اور اس کی عمر کئی صدیوں لمبی ہو چکی ہے تو کوئی طبقہ اور کوئی عنصر اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا باقی نہیں رہتا جس میں اس بگاڑ کی جلوہ گری نہ ہو۔ زہر بدن میں پھیلتا ہے تو پھر انگ انگ رگ رگ اور پور پور میں پھر جاتا ہے۔ خصوصیت سے اجتماعی دائرے میں اثر و رسوخ اور بالادستی رکھنے والے طبقوں میں عام لوگوں سے کہیں زیادہ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان خواص کے کچھ مناصب قائم ہو جاتے ہیں، ان کے کچھ مفاد فاسد نظام سے وابستہ ہو جاتے ہیں، ان کو کچھ عادات غلط ماحول میں پرورش پا جاتی ہیں اور ان کے کچھ مخصوص روابط پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب کوئی دعوتِ اصلاح اگر موجودہ زندگی کے تاریک پہلوؤں کو عمومی طور سے پیش کر کے ان کے خلاف نفرت ابھارتی ہے تو خواص یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شاید ہمارے عیوب کو الم نشرح کیا جا رہا ہے، یہ ہمارے اوپر چوٹ لگائی جا رہی ہے، یہ ہمیں کچھ گھٹیا قسم کے لوگ ثابت کیا جا رہا ہے، "یہ ہمارے مقابلے میں صالحیت و تقویٰ کی دھاک بٹھائی جا رہی ہے اور ہماری توہین و تذلیل کی مہم شروع کی گئی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے برسرِ اقتدار اور بااثر تعلیم یافتہ اور مالدار اور مفاد سے کھیلیں بھرنے والوں میں ایسا ہی تاثر پیدا ہوا اور پھر مخالفانہ پروپگنڈہ کے استادوں ماہرین نے بار بار اسے اور زیادہ بڑھا دینے کے لئے حرکات کی ہیں۔ اور عجیب بات ہے کہ ہر دور میں تحریکِ اسلامی کو اس الزام سے سابقہ پڑا۔ کم سے کم حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا یہ طنز تو قرآن میں محفوظ ہے کہ "انھم اناس یتطھرون" یعنی بدکاری سے روکنے کے لئے جب [illegible] ان کے جماعت [illegible]

اصلاح کا درس دیتے تھے تو پروپیگنڈہ یہ کیا جاتا تھا کہ دیکھو! دیکھو! یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں، اپنے زہد و تقویٰ کے کبر میں پڑ کر ہمیں بدکار اور گنہگار گردانتے ہیں۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقا تک کے لئے لوگوں نے "بخشلو" قدیم مخالفین حق کا یہ رنگ آج بھی استعمال کر ڈالا کہا جانے لگا کہ "غزنخوا ذمہ دیں نہم" ۔ یعنی ان لوگوں کے زعم پرہیزگاری نے ان کا سر پھرا دیا ہے، انہیں اپنے متعلق فریب ایمان و زہد میں ڈال دیا ہے اور اب یہ کسی اور کو صاحبِ ایمان اور صاحبِ اخلاق ماننے ہی پر تیار نہیں۔ بچاری جماعتِ اسلامی تو معمولی درجے کے انسانوں کی تنظیم ہے، اس پہ تو جو زیادتی بھی کر ڈالئے روا ہے۔ ذرا مزید تفصیل سے دیکھئے کہ جماعتِ اسلامی کا پیغام کس سلسلۂ استدلال پر قائم ہے :۔

پہلی بات — ہماری موجودہ زندگی بہ حیثیت مجموعی وہ نہیں ہے جو اسلام چاہتا ہے۔

دوسری بات — لہٰذا موجودہ صورتِ حالات کو ختم کرنا چاہئے۔

تیسری بات — موجودہ صورتِ حالات سے نکلنے کے لئے ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ پورے غور و فکر سے اس کلمہ کو جانیں جس پر ایمان لائے ہیں اور شعوری طور پر مسلمان ہونے کے معنی کو نگاہ میں رکھ کر کتاب و سنت کے تقاضوں کو — انفرادی پہلو سے بھی اور اجتماعی دائرے میں بھی — عملاً پورا کریں۔

چوتھی بات — جو لوگ سوچ سمجھ کر برضا و رغبت اپنے آپ کو اسلام کے حوالے کر دیں اور عملاً اس کی پیروی اختیار کر لیں وہ منظم ہو کر مزید بندگانِ خدا تک اسی دعوت کو پہنچائیں نیز اجتماعی ہئیت کو بدلنے کے لئے جد و جہد کریں۔

یہ خلاصہ ہے جماعتِ اسلامی کے وسیع لٹریچر اور اس کی پندرہ برس سے عمل میں آنے والی مختلف سرگرمیوں کا! بتائیے کہ ان چاروں کڑیوں میں سے کوئی ایک بھی غلط اور فاسد ہے؟ ہر کوئی مانتا ہے، سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم جیسی زندگی آج گزار رہے ہیں یہ کسی کے لئے اطمینان بخش نہیں ہے، چند افراد یا کسی خاص عنصر کے استثنیٰ کے ساتھ — اجتماعی ذہن یہ بھی مانتا اور علی الاعلان کہتا ہے کہ یہ زندگی اسلامی زندگی نہیں ہے۔ علماء یہی کہتے ہیں، مقالہ نگاروں اور مصنفوں نے یہی لکھا ہے، حالی، اکبر اور اقبال جیسے عظیم شعراء نے یہی شعور دیا ہے۔ محمد علی جوہر، ابو الکلام اور ظفر علی خاں جیسے صحافیوں نے حقیقت کو اسی طرح تسلیم کیا ہے اور خود ہمارے یہ صحافی بھائی بھی اگر اپنے مجلۂ مقبول کے اوراق کو پڑھیں تو وہ اپنے قلم سے اسی خیال کو کئی مقامات پر ثبت پائیں گے۔ اور اگر انہیں اس سے اختلاف ہو تو وہ آج لائیں اس کے لئے دلائل و شواہد! — وہ معاشرے کے کسی ایک گوشے اور اس کے کسی ایک عنصر (مثلاً شعبۂ صحافت یا ری پبلکن پارٹی) کو سامنے رکھ کر دعویٰ کریں کہ یہاں سارا نقشۂ احوال قرآن اور رسالت مآبؐ کے پیش کردہ خاکے کے مطابق ہے۔ لیکن یہ جھوٹا دعویٰ کیا نہیں جا سکتا۔ پھر کیا وہ چاہتے ہیں کہ اس کا تذکرہ نہ کیا جائے اور اس کی طرف توجہ نہ دلائی جائے؟ اگر ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر کوئی دعوتِ اصلاح دی ہی نہیں جا سکتی۔ یہ اگر ایسی ہی پرہیز کرنے کی چیز ہو تو پھر ذرا وہ اپنے چند سال کے لکھے کو ایک بار پڑھ جائیں اور دیکھیں کہ وہ خود کن بلندیوں پر بیٹھ کر اشخاص اور گروہوں اور طبقوں کے حالات کی چیر پھاڑ کرتے ہیں اور کیسے کیسے درشت اور کھردرے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے ہاں تو اپنے سوا اور ہر ایک کی اس اس طرح خبر لی جاتی

ہے کہ پچھلا ریکارڈ پڑھ کر شاید ہمارے یہ صاحب صلاحیت بھائی اپنے ہی خلاف یہ الزام لئے کر اٹھ کھڑے ہوں کہ میں اخلاص وکرواہ اور بصیرت و قابلیت کے مونٹ ایورسٹ پر کھڑا ہو کر باقی ساری دنیا کو بدنیت، بدکردار اور احمق و نالائق قرار دیتا رہا ہوں۔ اور اگر وہ موجودہ حالات پر تنقید کرنے اور ان کے نامطلوب پہلوؤں کو نمایاں کرنے کا اذن دیتے ہیں اور اس حق کو اپنے ہی لئے نہیں دوسروں کے لئے بھی جائز حق مان لیں تو پھر وہی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی آپ جس برائی کا تذکرہ بھی کریں گے — مثلاً رشوت، بلیک مارکیٹ، جاہ طلبی کے لئے گندے جوڑ توڑ کرنے کی وبا، بدکاری، نظربازی، غنڈہ گردی، انتخابات میں دھاندلی وغیرہ — تو جس کسی میں یہ برائی اس درجہ پائی جائے گی کہ وہ اپنی کمزوری کا اعتراف کرکے قبولِ اصلاح پر آمادہ نہ ہو سکے وہ اپنے ضمیر اور رائے عام کی نگاہ میں عزت بچانے کے لئے اس بہترین حیلہ کو استعمال کئے بغیر نہ رہے گا کہ دعوتِ اصلاح کے علمبرداروں میں کوئی گندا کیڑا نکال کے دکھادے۔ اس الزام سے زیادہ گندا کیڑا کیا ہوگا کہ کسی اصلاح پسند طاقت کے بارے میں بتایا جائے کہ اصلاح وغیرہ کا تو یونہی نام ہے، اصل میں زعمِ صالحیت کی بیماری لگ رہی ہے اور اب لذتِ کبر سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے دوسروں کی برائیاں چھانٹی جارہی ہیں۔ دیکھو جی، ساری دنیا بری ہے اور یہ اچھے ہیں! سنو جی، اور سب نامسلمان ہیں اور بس یہ بڑے مسلمان آئے ہیں!

ہو سکتا ہے کہ تیسری اور چوتھی بات کی بنا پر اس مغالطے کو کھڑا کیا جاتا ہو یعنی بدگمانی یہ ہو کہ چونکہ یہ لوگ ایک تنظیم پیدا کرتے ہیں اور اس تنظیم میں ایک خاص ڈھنگ کے مسلمانوں کو لیتے ہیں اور بقیہ کو باہر چھوڑ دیتے ہیں، لہٰذا یہ ان کو کافر سمجھتے ہوں گے۔ حالاں کہ سیدھی سی بات ہے کہ جو دعوت قول و عمل اور اعتقاد اور کردار کا تضاد ختم کرانے اور اسلام کو عملاً اختیار کرانے کے لئے اٹھی ہو اس کو اختیار کرکے آگے پھیلانے کا کام بہرحال ایسے لوگوں کے ذریعے تو ہو نہیں سکتا جو خود یہی تضاد رکھتے ہوں۔ اصلاح و تعمیر کے ہر کام کرنے والوں کو کچھ نہ کچھ عملی تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ ان تقاضوں کو تحریکِ تغیر چلانے والی جماعت کی شرائطِ رکنیت میں رکھنا پڑتا ہے — اور ہر تبدیلی چاہنے والی تنظیم اس طرح کی شرائطِ رکنیت رکھتی ہے — پھر لازماً وہی لوگ اس میں لئے جا سکتے ہیں جو ان شرائطِ رکنیت کو پورا کریں اور جو پورا نہ کر سکیں ان کو دعوت تو دی جاتی رہتی ہے مگر تنظیم کے اندر نہیں لیا جا سکتا۔ اس کے یہ معنی کہاں سے نکل آئے تو جو لوگ جماعت اسلامی کی تنظیم میں نہ آئیں وہ مسلمان ہی نہیں ہیں۔ جماعت کے لٹریچر میں واضح تصریحات موجود ہیں کہ عملی بگاڑ کے باوجود مسلمانوں کو اعتقادی لحاظ سے مسلمان ہی مانا جانا چاہئے اور ان کے ساتھ مسلمانوں ہی کا سا معاملہ — دوستی، کاروباری شراکت، نکاح و قرابت، عبادات میں شمولیت، سارے حقوقِ مسلم کی ادائی وغیرہ صورتوں میں — کیا جانا چاہئے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ تک لکھا ہوا موجود ہے کہ ہمارے اس دائرہ سے باہر امکان کی حد تک اور بھی گروہ ہو سکتے ہیں جو اسی کارِ حق کو کسی دوسرے نہج سے کر رہے ہوں اور ایسے افراد ہو سکتے ہیں جو ہم سے بھی زیادہ بہتر ہوں۔

غالباً ہمارے صاحبِ صلاحیت بھائی — جن تک جماعت کا بیشتر لٹریچر پہنچا ہے اور جن کے بارے میں میری ذاتی معلومات یہ ہیں کہ مطالعہ ضرور کرتے ہیں — ان چیزوں سے بے خبر نہیں ہیں۔ باخبری کے باوجود جب وہ ایک ایسی بات کہتے ہیں جس کی کہ

حقیقی بنیاد موجود نہیں ہے تو بڑا افسوس ہوتا ہے۔ اور خود یہ طرزِ عمل معاشرے کے اس ہمہ گیر بگاڑ کا مظہر ہے جس سے نجات پانے کے لئے ہم لوگ جدوجہد کر رہے ہیں۔

لیکن درحقیقت ذہن کے غیر شعوری پس منظر میں جو چیز کام کرتی ہے وہ یہ ہے کہ تم بگاڑ کو مزید نہ بگاڑو، بھاڑ اور شوق سے اس کی اصلاح کے جنون میں پڑے رہو، لیکن جو خیالات ہم نے اختیار کر رکھے ہیں، جو مفاد اس بگاڑ کے اندر ہمارے لئے پیدا ہو گئے ہیں، جو عادات اور مشاغل اس ماحول کے زیرِ اثر ہم نے پیدا کر لئے ہیں اور جو روابط ہمارے کسی جانب استوار ہو چکے ہیں اور جن جن کو ہم نے ممدوح بنا لیا ہے ان کا احترام کرو، اور ان کی طرف کبھی توجہ نہ فرماؤ۔ ہمیں جوں کا توں رہنے دو اور اپنا کام کرو۔ یہ ہے اصل مطالبہ جو خواص کے طبقوں میں ایک ایک فرد کے اندر پایا جاتا ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر تمہاری دعوت کی کسوٹی نے ہماری زندگیوں کو کندن نہ مانا اور ہمارا اعتبار رائے عام کے دائرے میں جانا نہ رہنے دیا تو پھر ہم تم کو نہیں بخشیں گے۔ پھر ہم یہی سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ تم اپنے سوا کسی دوسرے کو مسلمان اور شریف آدمی ماننے کو تیار نہیں ہو، تم اگر ہمارے کسی بگاڑ کو چھیڑو گے تو ہم تمہیں مدعیٔ صالحیت کی حیثیت سے چوراہے میں کھڑا کر کے تم پر کیچڑ اچھالیں گے۔ سو اب دوسرے "خواص" کی طرح ہمارے یہ صحافی بھائی بھی جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر صالحیت کے زعم اور تقویٰ کے کبر کا الزام لگا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ایسے برے لوگوں کی بات سن کر کیوں دی جائے۔

اور یہ الزام بڑی خوبصورتی سے لگایا جاتا ہے۔ بالعموم اس کے آگے پیچھے کچھ تعریفی کلمات ارزانی فرمائے جاتے ہیں کیا ہائے گا کہ دعوت ٹھیک ہے، اصلاح ہونی چاہیے، حالات واقعی غلط نقشے پر ابھر گئے ہیں، کارکن بڑے مخلص ہیں، بہت سے اچھے کام کر رہے ہیں، لیکن بس طایفہ اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کا شکار ہیں اور اس وجہ سے اپنے حلقے سے باہر کسی اور کو مسلمان نہیں مانتے۔ اس دوگونہ طرزِ کلام کے بغیر چارہ نہیں۔ اصل دعوتِ حق اور آنکھوں کے سامنے ہونے والی عملی سرگرمیوں کی نفی یا مخالفت کرنا مشکل ہے ـــــ استدلال کے لحاظ سے بھی مشکل اور رائے عام کے اچھے تاثر سے ٹکرانے کے لحاظ سے بھی مشکل! ـــــ لہٰذا چار حرف اعتراف کے دئے جاتے ہیں۔ اس طرح ضمیر کی ملامت سے بھی نجات ہو جاتی ہے اور جمہور بھی نصفت شعاری کے قائل ہو جاتے ہیں کہ اچھی چیز کو بڑی فراخ دلی سے اچھا مان لیا۔ حرفِ اعتراف کے ساتھ پھر علمبرداران دعوت پر ایک گھٹیا سی بات پھینک دی جاتی ہے۔ اب دعوت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے ڈھال بھی مہیا ہو گئی اور تحریکِ اصلاح کو آگے بڑھنے سے روکنے کا کارگر ہتھیار بھی مل گیا۔

یہ اتنا استدلالی و کلامی ہیر پھیر اگر نہ کیا جائے تو کسی اخلاص مند اور شریف آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مولانا مودودی جیسی شخصیت کو تو ایک کسوٹی پر پرکھ کر کھوٹا مال قرار دے اور پرے پھینک دے اور اس کے بعد کوئی دوسری کسوٹی اٹھا لے اور اس پر جانچ کر کبھی اس شخصیت کو ہیرا قرار دے اور کبھی اس گروہ کو زرِ خالص ٹھہرا لے۔ لاہور کے اس عظیم الشان مجلہ کے گزشتہ دو تین شمارے

اٹھا لیجئے اور دیکھئے کہ صحافت کے اس میزانہ میں کس شان سے کھرا کھوٹا پرکھا جا رہا ہے اور شخصیتوں اور گروہوں کی قیمتیں مشخص کی جا رہی ہیں۔ اندازِ نقد کتنا بے لاگ ہے کہ مولانا مودودی تک کو بے باکی سے پیتل اور رانگ قرار دے کر الگ رکھ دیا گیا ہے۔ مگر صرافی کی پوری شان معلوم کرنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ اس مال کو بھی دیکھئے جسے زرِ خالص قرار دیا گیا ہے۔ نام ہم نہیں لیتے، وہ آپ خود ملاحظہ فرما لیں اور پھر غور کریں کہ مولانا مودودی میں ہزارہا ہزار برائیاں ہوں گی لیکن کیا وہ اتنے گئے گزرے ہیں کہ اب آپ ہر بدنامِ روزگار آدمی کو اٹھا کے اپنا ممدوح بنا لیں گے۔ اس طرح کے تبصروں میں کچھ توازن ہونا چاہئے، رایوں میں کچھ تناسب باقی رہنا چاہیے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ مفاد کے بل پر متحرک رہنے والی ہر دوسری شخصیت اور ہر دوسری تنظیم کے ساتھ خاصانِ کرام کے سودے اور سمجھوتے ممکن ہیں ـــ لیکن مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی دعوت چونکہ اصولی ہے اور وہ مفاد و مناصب کی موجودہ فاسد ترتیب کو بالکل ہی بدل دینا چاہتے ہیں اور ان کے لئے مفاد کی بنیاد پر لین دین کرنا اور فاسد روابط پیدا کرنا ممکن نہیں ہے، لہٰذا یہ خاصانِ کرام ان سے خیر و فلاح کی امیدیں نہیں باندھ سکتے۔ ان کا مرکزِ امید تو موجودہ بگاڑ کی حفاظت کرنے والے سیاسی براہمنوں کے طبقہ ہی میں واقع ہو سکتا ہے، لہٰذا یہ اسی کے اندر سے دو یا تین بلاؤں کو سامنے رکھ کر کسی بہتر بلا کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ اندریں حالات کوئی نہ کوئی بدنما دھبہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے دامن پر ڈالنا ضروری ہے، سو اہلِ صحافت کی دواتوں کی غلیظ روشنائیاں سلامت رہیں!

ہم پوچھتے ہیں کہ اس طرح کی مغالطہ انگیزیوں کا سلسلہ کب تک چلے گا اور کب تک آپ کبھی سردار نشتر کو، کبھی نواب ممدوٹ کو، کبھی راجہ حسن اختر کو، کبھی شہید سہروردی کو اور کبھی ڈاکٹر خان اور مشتاق احمد گورمانی وغیرہ صاحبان کو یکے بعد دیگرے قصائدِ مدحیہ پڑھ پڑھ کر عوام کے سامنے پیش کرتے رہیں گے اور ان سے گوناگوں کرامات کی امیدیں دلاتے رہیں گے۔ ہر بار سنگریزوں کے ڈھیر چھان پھٹک کر ان میں سے آپ ایک نہ ایک ہیرا نکال لیتے ہیں اور قوم سے کہتے ہیں کہ گھر بار لٹا کر اسے خرید لو۔ پھر جب وہ اسے خرید چکتے ہیں تو چند ہی روز میں اس کی درخشانی غائب ہو جاتی ہے۔ اب آپ پھر تلاش کے لئے نکلتے ہیں اور انہی ڈھیروں سے ایک اور ہیرا نکال لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس اسی "کوہ نور" پر دل و جان نچھاور کر دو۔ پھر وہ بھی چند دنوں بعد کنکر ثابت ہوتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کب تک چلے گا یہ کاروبار! کب تک رہے گی ایسے بازارِ صرافاں کی ساکھ! آپ چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی بھی آپ کے منتخب روزگار ہیروں کی جوہریت پر ایمان لے آئے، مگر یہ آنکھوں پر پٹیاں باندھے بغیر ممکن ہے نہیں! اس قصور پر جو سزا واجب آتی ہو اسے سہنے کے لئے ہم حاضر ہیں۔

جس طاقت پر براہِ راست حملہ دلیل کے ہتھیاروں سے کارگر نہ ہو سکتا ہو، اس پر جب غصہ آئے تو افک و بہتان کا اسلحہ مفید مطلب ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے کے بگاڑ ہی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ یہاں دلیل کے بجائے افک و بہتان ہی سے اکثر حملے کئے جاتے ہیں۔ یہ سیدھا سا شریفانہ طریقہ کہ آپ کسی کی رائے یا کسی کے اقدام کو غلط کہہ دیں، ناپسندیدہ قرار دے دیں، اس سے اظہارِ اختلاف کر دیں، کافی نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ کھٹ سے کوئی گھناؤنی بات منسوب کر دی جاتی ہے۔ سو جماعت اسلامی پر ایسی عنایات اس کے

کرم فرماؤں کی طرف سے اکثر ہوتی رہی ہیں۔ اسے انڈیا، امریکہ اور ماسکو سے روپیہ دلوایا جاتا رہا ہے۔ اسے جہادِ کشمیر کا مخالف قرار دیا گیا۔ (اور مولانا مودودی کے بارے میں یہ ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ انہوں نے اس جہاد میں جانیں قربان کرنے والوں کے بارے میں فتوے دیا ہے کہ وہ حرام موت مرے ہیں) اسے ایران کے فدایانِ اسلام اور انڈونیشیا کی دار اسلام پارٹی سے سازشی تعلقات رکھنے کا ملزم گردانا گیا، اس کے بارے میں یہ اشتہار بھی دیا گیا کہ وہ فوجیوں اور سرکاری ملازمین کو ریاست کی وفاداری سے باز رکھنے کے لئے کوشاں ہے، یہ پروپگنڈہ بھی ہوتا رہا کہ یہ گروہ تشدد کے ذریعے انقلاب لانا چاہتی ہے، اور خود یہ بات بھی ایک گھٹیا اور بے بنیاد بہتان ہی تو ہے کہ جماعت اسلامی باہر کے ہر آدمی کو کافر سمجھتی ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے فاضل صحافی بھائی نے بھی اس طرح کے احسانات سے جماعت کو نوازنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ وقت وقت کے لحاظ سے مختلف باتیں انہوں نے بھی کبھی بطور دعویٰ اور کبھی بطور حکایت و روایت عوام کے کانوں میں ڈالی ہیں۔ مثلاً جب مولانا مودودی پچھلے دنوں جیل میں تھے تو موصوف نے غمازانہ شان کے ساتھ یہ شوشہ اڑایا کہ نواب ممدوٹ مولانا مودودی سے جیل میں ملے ہیں اور تاثر یہ دیا کہ کوئی سانٹھ گانٹھ ہوگئی ہے۔ لیکن بعد میں کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ سانٹھ گانٹھ کہاں گئی! اب وہ ایک نیا انکشاف لے کے آئے ہیں۔ اپنے مجلۂ نامور کے اوراق میں انہوں نے یہ بات چھاپ ڈالی ہے کہ نشانہ باتوں میں جماعتِ اسلامی نے سودا کر لیا۔

اس بہتان کی تردید میں ہم کچھ نہیں کہتے اور اسے جیل والی سانٹھ گانٹھ کے انکشاف کی طرح یونہی رہنے دیتے ہیں تاکہ شب و روز کی چند گردشیں خود ہی عوام کے سامنے شہادت دے دیں کہ یہ جھوٹ تھا اور ایک شوشہ تھا اور صحافیانہ پروپگنڈے کا ایک شعبدہ تھا اور اس سے مقصود محض غصہ اتارنا تھا اور کچھ نہیں! البتہ ہم اپنے صحافی بھائی سے یہ ضرور کہیں گے کہ دنیا بھر کی شخصیتوں کو جن جن نیوز آپ چھانتے ہیں اور ان کے خلوص و راستی کو جن چھاجوں آپ پھٹکتے ہیں، کبھی اپنے اس انکشاف کو بھی ان چھلنیوں چھاجوں سے گذار کے آپ اتنا بڑا بہتان سے کہہ اٹھے کہ اگر وہ صحیح ہو تو جماعت اسلامی کی پندرہ برس کی ساکھ تباہ ہو جائے، لیکن کیا آپ یہ فرما سکتے ہیں کہ مولانا مودودی یا ان کے کسی ذمہ دار رفیق نے چپکے سے جا کر آپ کو اس رازِ نہاں سے آگاہ کر دیا ہے تاکہ آپ اس کا ڈھنڈورا پیٹ سکیں؟ کیا آپ کا ذریعۂ معلومات بنفسِ نفیس دولتانہ صاحب ہیں؟ کیا کوئی اور موقع کا گواہ آپ کے پاس تھا؟ یہ غیر ذمہ دارانہ بہتان اور لوگ لگائیں تو دکھاتے ہیں، آپ جیسے سکہ بند صحافیوں سے اس کی امید نہ تھی۔ کیا ایسی غیر ذمہ دارانہ بات کہنے والے کا مقام ان مولویوں سے کچھ بھی بلند رہ جاتا ہے جو کہتے پھرتے ہیں کہ مولانا مودودی اس ہستی عظیم کی طرف بھی جھوٹ کی نسبت کرتے ہیں جس کے بارے میں کوئی جاہل اور فاسق مسلمان بھی ایسی لغو باتیں نہیں سوچ سکتا، اور جو لہک لہک کر اسٹیج سے یہ خبر سناتے پھرتے ہیں کہ مولانا مودودی نے دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا جائز ٹھہرایا اور متعہ کو حلال کر دیا؟

کیا اعلیٰ درجہ کی ادبی و صحافی صلاحیتوں کا مصرف بس یہی کچھ رہ گیا ہے؟ اس سے قوم کی بگڑی بن جائے گی؟

اس ساری گفتگو سے مقصود کوئی انتقام لینا یا مخالفت کا محاذ آراستہ کرنا یا مخاطب کو تکلیف دینا یا چڑانا نہیں ہے، بلکہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ایک بھائی کو اب تک کے کام پر سنجیدگی سے غور کرنے پر توجہ ہو اور دوسروں کے بھلے کے لئے کام کرنے کے ساتھ کبھی وہ اپنے بھلے کے لئے بھی کچھ کریں۔ وہ سوچیں کہ جو لمبا چوڑا اعمالنامہ انہوں نے اپنے قلم سے لکھ لکھ کر خود ہی تیار کر لیا ہے یہی اگر جوں کا توں آخرت کی عدالت میں اٹھا کر رکھ دیا گیا اور پھر اس کے ایک ایک نقطہ کا حساب مانگا گیا اور دماغی صلاحیتوں اور ادبی ہنرمندیوں کے ایک ایک مصرف کا تجزیہ کیا گیا تو وہ جواب دہی کے اس مرحلے میں اپنا کیس کس شکل میں پیش کریں گے۔ وہ سوچیں کہ آج تک، کس کس کے بارے میں کیا کیا کہا اور لکھا اور اس کا حاصل کیا ہے؟ کس کس کو اچھالا اور کس کس کو گرایا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ قوم کے بھلے کے لئے کیا کیا نسخے تجویز کئے مگر ان نسخوں کے استعمال سے روگ کون کون سے مٹے؟

پھر ہمارا مدعائے گزارش یہ بھی ہے کہ وہ کوئی جامع اصول اور کوئی مستقل معیار لے کے چلیں اور اسی ایک اصول کی روشنی میں حالات کو دیکھیں اور اسی ایک معیار پر اشخاص اور گروہوں اور نظریوں اور پروگراموں کو پرکھیں۔ پرکھیں اور دو ٹوک رائے قائم کریں۔ جسے اچھا پائیں، اسے اچھا کہیں اور جسے برا یقین کریں اسے ضرور برا کہیں۔ یہ "اچھا مگر برا" اور "برا مگر اچھا" کا اسلوب خود قائل بھی کے لئے اور عوام کے حق میں بھی سخت مضر ہے۔ جماعتِ اسلامی کے بارے میں بھی ہم ان سے یہ نہیں کہتے کہ وہ اسے کوئی سہارا بہم پہنچائیں، ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اس کا لٹریچر اس کے بارے میں ہر ضروری بات اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور اس کی سرگرمیاں جو کچھ بھی ہیں سب کے سامنے ہیں۔ ان دونوں پہلوؤں سے اسے اس کی پانزدہ سالہ تاریخ کے آئینہ میں خوب اچھی طرح دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے اور ایک دو ٹوک رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر آپ محسوس کریں کہ یہ ایک ناقابلِ توجہ چیز ہے تو پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں، اسے جینا ہوگا تو اپنے بل بوتے پر جیئے گی اور اگر مٹنا ہوگا تو کسی کے مٹائے بغیر طبعی طور پر مٹ جائے گی۔ اگر آپ کی رائے یہ ہو کہ فی الجملہ یہ کوئی اچھی چیز ہے یا مقابل کی دوسری طاقتوں کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہے تو آپ کا جی چاہے تو اس کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اسے بہ حیثیتِ مجموعی خطرناک، مضر ناکارہ یا فاسد وجود سمجھیں ——— خواہ بزعمِ خویش اسی بنیاد پر کہ یہ لوگ دوسروں کو مسلمان نہیں سمجھتے ——— تو آپ کا حق نہیں، فرض ہے کہ اپنا پورا زورِ قلم اس کے خلاف صرف کر دیں۔ ہمارے نزدیک اس "کہ مکرنی" قسم کی حمایت و کرم فرمائی سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ آپ اس پر عمر بھر پتھر برسائیں۔ پھر اگر آپ کی رائے فی الحقیقت غلط ہوئی اور جماعتِ اسلامی میں کسی خیر و خوبی کا وجود ہوا تو یہ انشاء اللہ اس طوفان سے اسی طرح بچ نکلے گی جس طرح دوسرے حلقوں کی ہنگامہ آرائیوں میں سے یہ سلامتی کے ساتھ نکل آتی رہی ہے۔ ہمارے محترم بھائی کو مان لینا چاہیے کہ مقبول ترین صحافی ہو کر بھی کوئی شخص دوسروں کے لئے تقدیر ساز نہیں ہو سکتا کہ بس دنیا جہان کی زندگی اور موت، فنا اور بقا اور ترقی اور زوال کے معاملات اس کی نوکِ قلم سے بندھے ہوں۔ شاید کچھ لوگ کسی کے بارے میں ایسا گمان رکھتے ہوں گے، لیکن اسلام کی دعوتِ حق کے علمبرداروں نے کسی بھی دور میں خدا کے سوا کسی اور کی حمایت پر تکیہ کیا ہے، نہ کسی اور کی مخالفت سے خوف کھایا ہے۔ آپ خود ہی کیوں نہ گزرے ہوئے چند سالوں پر نگاہِ بازگشت ڈال کر جائزہ لے لیں اور ان افراد یا جماعتوں کی فہرست

بائیں جن کو آپ کے قلم کی جنبشوں نے مردہ سے زندہ کر دیا ہو یا زندگی سے محروم کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ آپ نے پہلے جن جن کے حق میں پرانہ حمایت صرف کر دیا تھا، چند برس بعد اب دیکھئے تو ان کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں ملتا اور آپ نے جن کے خلاف کسی موقع پر پہلے پورا جوشِ مخالفت استعمال کر ڈالا تھا ان میں سے بعض تابندہ تر ہو گئے ہیں اور بقیہ بھی مٹ مٹا نہیں گئے۔ اور ہمارا تو اپنا تجربہ ہے کہ ہر چہار جانب سے ایسی بھرپور مخالفتیں کی گئیں کہ بظاہر ان سے بچ کر کسی کا زندہ و سلامت نکل جانا تک متصور نہیں ہو سکتا، لیکن یہ دعوت اور یہ تحریک نہ صرف اپنی جگہ قائم ہے بلکہ اس کی شاخیں پہلے سے زیادہ ہی پھیلاؤ رکھتی ہیں اور نئی کونپلیں برابر نکل رہی ہیں۔ اب اگر کسر ایک ہفت روزہ ہی کے محاذ پر آنے کی ہے تو رو رعایت چھوڑ دیجئے اور اس کسر کو پورا کر کے بھی دیکھ لیجئے۔ یہ کوئی چیلنج نہیں دیا جا رہا، بلکہ صرف ایک غلط قسم کے صحافیانہ زعم کو دور کرنا مطلوب ہے اور اس مقصد کے لئے ہم وہی بات کہہ رہے ہیں جو خدا کے دین کے ایک جلیل القدر علمبردار نے اپنے مخاطبین سے کہی تھی کہ ان کان کبُر علیکم مقامی و تذکیری بآیٰت اللہ فعلی اللہ توکلت فاجمعوا امرکم و شرکاءکم ثم لا یکن امرکم علیکم غمۃً ثم اقضوا الیّ ولا تنظرون (یونس۔ ۱۱) حالات نے ایسا موقع پیدا کر دیا کہ داعیٔ حق کو کہنا پڑا کہ میری دعوت اگر نا قابلِ برداشت ہو گئی ہے تو میں نے اللہ پر تکیہ کر لیا، سو تم سر جوڑ کر اپنا نقشۂ محاذ طے کر لو اور پھر جو کچھ میرے ساتھ کرنا ہے کر لو اور عنایت ہو گی کہ مجھے کوئی مہلت اور گنجائش سرے سے نہ دو۔ غرض آپ چاہیں تو طلوعِ اسلام کی طرح اپنے اخبار کے ہر شمارے کو اس سرے سے لے کر اس سرے تک مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے خلاف دل کا بخار نکالنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں اور اگر آپ کا اصول و مقصد اسی کا تقاضا کرے تو ضرور ایسا ہی کیجئے۔

لیکن کیوں نہ ایسا ہو کہ آپ سیدھی سی اس بات کو سامنے رکھیں کہ جماعت اسلامی اجتماعی پیمانے پر اصلاح و تعمیر کا وہ کارِ مطلوب کرنا چاہتی ہے (چاہے آپ کو جزوی اختلافات بھی ہوں) جسے کرنے کے لئے اور کوئی منظم طاقت سامنے موجود نہیں ہے، اس بات کو بھی سامنے رکھیں کہ جماعت اسلامی کا سرچشمۂ فکر و عمل اسلام ہے (چاہے آپ کو اس کی کچھ تعبیرات سے اتفاق نہ بھی ہو) اور ایک مسلمان کے لئے عقیدہ اور عقل اور دنیا و آخرت دونوں لحاظ سے اسلام ہی کا ذریعۂ فلاح و نجات ہو سکتا ہے ۔۔۔ درآں حالیکہ دوسری سیاسی تنظیموں کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ اس بات کو بھی سامنے رکھیں کہ جماعتِ اسلامی تعلیم و تربیت کے ذرائع سے کام لے کر جو کردار پیدا کر رہی ہے وہ کم سے کم جھوٹا اور کھوٹا کردار نہیں ہے (چاہے آپ اس کے اندر سے بعض ناپسندیدہ رُخ بھی نکال دکھائیں)

اس نہج پر سوچیں تو پھر آپ کا ضمیر کہے گا کہ فی الجملہ یہ کام اس نوعیت کا ہے کہ جو تعاون جس درجے میں بھی ممکن ہو، ہم پہنچا دینا چاہیے اور اگر مثبت طور پر کوئی حصہ لینا ممکن نہ ہو تو کم سے کم اس کے آگے پیچھے غبار نہیں اڑانا چاہئے۔ جزوی پہلوؤں اور ضمنی باتوں پر اختلاف بھی کیجئے، مگر اختلاف کیجئے، نہ کہ جونہی کوئی بات ناخوش آئی مخالفت کی طوفانی مہم اٹھا دی۔

ایک اصولی ذہن کے ساتھ ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک کو اخلاص مندانہ طریق سے اپنا لیجیے۔ یہ ایک ہاتھ سے

زخم لگانا اور دوسرے ہاتھ سے مرہم رکھنا فضول مشغلہ ہے۔ اصول و مقصد کے بغیر جماعت اسلامی کی، یا کسی اور کی جو حمایت و مخالفت کی جائے گی وہ ایک شورش بے معنی ہے۔ شورشِ بے معنی حمایت میں ہو تو، اور مخالفت میں ہو تو، بالآخر رائیگاں جاتی ہے۔ ایسے کھیل تماشوں میں جو قوتیں صرف کی جاتی ہیں، جو زورِ استدلال کام میں لایا جاتا ہے اور جو موثر ادبی اسالیب استعمال کئے جاتے ہیں، یہ سبھی کچھ غبارِ پریشان بن کر اڑ جاتا ہے۔ ایسے گملوں کی آبیاری میں وقت صرف نہ کیجئے جن کی جڑ نہیں ہوتی، کسی ایسے کام کو لیجئے جو زمین میں جڑیں چھوڑے اور آسمان میں شاخیں پھیلا کر برگ و بار لا سکے۔

یہ تجزیہ و تبصرہ یقیناً اپنے اندر اتنی تلخی ضرور رکھتا ہوگا جتنی اس ناخوش گوار کام میں فطری طور پر ہوتی ہے۔ لیکن لکھنے والے نے اسے نیک نیتی، دردمندی اور خیر خواہی کے جذبے سے لکھا ہے۔ وہ اس امکان کو مانتا ہے کہ وہ مطالعۂ حقائق میں کوئی غلطی کر گیا ہو یا کسی موقع پر روا روی میں نامناسب الفاظ استعمال کر بیٹھا ہو، سو وہ اس کے لئے پیشگی معذرت خواہ بھی ہے اور تعین کرنے پر اپنی رائے یا اپنے الفاظ واپس لینے کے لئے بھی تیار ہے۔ پیشِ نظر افہام و تفہیم ہے، ایک دوسرے کے قریب ہونا اور باہمدگر جاننا سمجھنا ہے۔ اور اختلاف کو غلط راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر ڈالنا ہے۔ اب اگر محترم مخاطب نے اسی نقطہ نظر سے اس تحریر کو پڑھا تو لکھنے والے کی محنت ٹھکانے لگی، اور اگر وہ غصے میں آگئے تو میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے قوتِ صبر و برداشت دے گا!

گزارش

مدیر چراغِ راہ اپنی سابق اقامت گاہ (۱۲۔ شاہ جمال، اچھرہ) کو چھوڑنے کے بعد عارضی طور پر سمن آباد میں مقیم ہے، لیکن یہاں کا قیام بھی مختلف وجوہ سے اطمینان بخش نہ تھا۔ اب اچھرہ میں مرکز کے قریب ہی نئی اقامت گاہ (۱۱۔اے، ۸/۱، محلہ رسول پورہ) حاصل کی گئی ہے لہٰذا خط و کتابت کے لئے یہی نیا پتہ استعمال کریں جو صفحۂ فہرست پر درج ہے۔

(ادارہ تحریر)

نعیم صدیقی

فریب

محض اِن نینوں سے، کاجل سے مجھے پیار نہ تھا!
تیری ان زلفوں کے چھل بل سے مجھے پیار نہ تھا!
لہریے رنگوں کے آنچل سے مجھے پیار نہ تھا!
عامیانہ مرا معیار نہ تھا!

تیری تعلیم کے اب جا کے کمالات کھلے
میٹھے بولوں میں جو مخفی تھے خیالات کھلے
جو تبسم کے غلافوں میں تھے جذبات کھلے
منتظر تھا کہ ذرا بات کھلے

جاؤ، اب جاؤ، یہ انداز و ادا لے جاؤ
سارا ہنگامۂ اخلاص و وفا لے جاؤ
اپنا مرہم مرے زخموں سے اٹھا لے جاؤ
ایک دکھی کی دعا لے جاؤ



انور صدیقی

طلوعِ بشر

(اسلامی نشاۃ جدیدہ کا ایک غنائی تاثر)

گہر فروشیٔ گل ہائے تر کے دن آئے — مرے چمن میں نمودِ سحر کے دن آئے

سکوتِ مرگ کی ٹوٹی پڑی ہیں زنجیریں — بہت دنوں پہ طلوعِ بشر کے دن آئے

رہِ وفا میں بھی کچھ ارتقا کے پھول کھلے — اُٹھاؤ رخت اٹھاؤ، سفر کے دن آئے

روش روش پہ اُمڈ آئی جوئے رنگِ بہار — چمن میں جنبشِ صد بال و پر کے دن آئے

فسانہ ہائے غمِ ما و من میں کچھ بھی نہیں، — خبر کرو کہ غمِ معتبر کے دن آئے

بہت زمانہ ہوا اک جھلک سی دیکھی تھی، — کسی کے جلوۂ بارِ دگر کے دن آئے

پھر ایک بار مٹی ظلمتِ شبِ دوراں — پھر ایک بار فروغِ نظر کے دن آئے

چھڑے ہیں وسعتِ کون و مکاں کے گیت انور
شکستِ محبس و دیوار و در کے دن آئے



راغب مراد آبادی

یہ بوالعجبی!

ہجومِ تیرگیِ شب کو بھی سحر سمجھو
وہ مسکرا کے جو فرمائیں معتبر سمجھو

رہے نہ دیدۂ باطن کی آبرو، نہ رہے
گہر کو سنگ، کبھی سنگ کو گہر سمجھو

نئے اصولِ زمانہ میں دل پذیر اگر
تو شر کو خیر کہو، عیب کو ہنر سمجھو

یہی ہے اہلِ خرد کا مآلِ فکر و تلاش!
کہ راہزن جو ملے اُس کو راہبر سمجھو

یہ اور بات ہے دُنیا اسے غلط مانے
شرر کو برق، کبھی برق کو شرر سمجھو

تمام عمر رہو اضطرابِ دل سے دوچار
سکونِ دل کی تمنا کو دردِ سر سمجھو

بلا سے ہو کوئی رجعت پسند ہمیں جو کہیں
خضر کو شوق سے ہم معنیٔ سفر سمجھو

کہیں گے ہم نہ کبھی گو جہاں کہے راغبؔ!
ضرر کو سود کہو، سود کو ضرر سمجھو

رشید کوثر فاروقی

غ

زندگی زندگی! ہوش میں آ! سنبھل! ہولے ہولے چلی آ رہی ہے اجل

ڈھے گئے تیرے سپنوں کے اونچے محل آرزو! اب نئی وادیوں میں نکل!

وہ حقیقت کا ادراک پہلے پہل جیسے برسات کی رت میں پہلا کنول

جس طرح دوڑے کھیتوں میں بادل کی چھاؤں ایک پتی نہ ہلنے، مگر تیز چل

بات جب ہے کہ اے بت فروشِ حرم دل کے اصنام گرنے لگیں منہ کے بل

چاند کی ہر کرن آ کے واپس گئی کوئی منزل ہو، مرکز نہ اپنا بدل

لوگ جنگل میں منگل منانے گئے بستیوں میں ہے ویرانیوں کا عمل

کون ہے — آؤ پوچھیں ذرا شیخ سے مار در آستیں، آستیں در بغل

چھوڑ کوثر یہ بے وقت کی راگنی
آندھیوں میں سنانے چلا ہے غزل

ادارہ

ایک نیا تحقیقی کارنامہ

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی بڑے اہم موضوعاتِ تحقیق و تجزیہ بن چکے ہیں۔ ایک طرف بڑے بڑے دارالافتاؤں کی لیبارٹریاں مصروفِ کار ہیں اور کہیں بال کی کھال کھینچی جارہی ہے، کہیں الفاظ کا آپریشن کرکے ان کے اندر نئے نئے معانی بھرے جارہے ہیں، کہیں مختلف اقتباسات کو اِدھر اُدھر سے لے کر ان کے نئے نئے کیمیاوی مرکبات تیار کرکے تجربے کئے جارہے ہیں، کہیں سیدھے سے ایک مدعا کو پھاڑ کر ایٹمی دھماکے برپا کئے جارہے ہیں اور کہیں تحریکِ اسلامی کی فکر کا خوردبینی امتحان کرکے اس کے اندر کفر اور فسق اور ضلالت اور توہینِ اسلاف کے جراثیم کی تلاش ہورہی ہے۔ دوسری طرف "مستغربین" ہیں کہ جنہوں نے ریسرچ کے کام کے لئے یہی دائرہ پسند کرلیا ہے اور اسی میں اپنی عمریں کھپا دینے کی قربانی دے رہے ہیں۔ ان جلیل القدر محققین میں مولوی روشن دین تنویر قادیانی، "محترم" پرویز صاحب منکرِ حدیث اور مولوی میکش صاحب جیسی شہرۂ آفاق ہستیاں شامل ہیں۔ اس فیکلٹی کے ایک اہم ممبر اور تھے جن کے کام اور نام کو زمانہ بھولتا جارہا تھا، لیکن اب وہ ایک ایسا نادر تحقیقی کارنامہ لے کے آئے ہیں کہ ان کے سابق کارناموں کی یاد بھی تازہ ہوجائے گی۔ اس کارنامہ کو دیکھ کر ہر جوہر شناس یہ مشورہ دے گا کہ اس حاصلِ محنت کو نوبل پرائز حاصل کرنے کے لئے مبصرین کے سامنے رکھا جانا چاہئے ورنہ کم سے کم حکومتِ پاکستان کی علم دوستی اور دانش پژوہی سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی تمغہ یا خطاب اس تحقیقی کارنامے کے اعتراف کے لئے ضرور جاری کرے تاکہ ٹھوس قسم کے علمی کاموں کی طرف اصحابِ نظر مائل ہوں۔

اپنے "مستغربین" کو اور ان کے دل و دماغ کی کیفیات کو ہم نے ایک بار اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور ان کے "کارناموں" کی ماہیت کو پالیا ہے۔ ان کے مدعا اور ان کے استدلال، دونوں کا پورا پورا اندازہ ہوچکا ہے۔ لہٰذا اب اتنا سن لینا کافی ہوتا ہے کہ فلاں محقق کا کوئی نیا کارنامہ جماعت اسلامی یا مولانا مودودی کے موضوع پر مارکیٹ میں آگیا ہے۔ ان کارناموں سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے نہ ہم دماغ رکھتے ہیں، نہ ذوق، نہ فرصت! ــــ ہم تو کسی سنجیدہ حریف اور کسی مہذبانہ و شریفانہ مخالفت کے لئے ترس گئے ہیں! لو کے تھپیڑے لگتے ہیں، مگر منزلِ حق کے مسافر چپ چاپ اپنی مقررہ سمت میں چلتے رہتے ہیں سو وہ نہ بادِ صرصر کے ہر ہر جھونکے کا دامن پکڑتے ہیں، نہ ایک ایک بگولے کا تعاقب کرتے ہیں اور نہ اڑتے ذرات اور خس و خاشاک کا جائزہ لینے کے درپے ہوتے ہیں۔ وہ اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں، ہم اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔ نہ ہم ان کے مشغلے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں، نہ ہماری سرگرمیوں کو وہ روک سکتے ہیں۔ وہ بھی اپنی سعی کر دیکھیں اور ہم بھی! ــــ کچھ مدت کے بعد زمانہ خود دیکھ لے گا کہ کس کے کئے کا پائیدار نتیجہ کیا ہے!

حال ہی میں سنا کہ جناب محمد سرور صاحب نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر کوئی کتاب لکھی ہے۔ سرور صاحب کو ہم جانتے ہیں، ان کی فکر سے آگاہ ہیں، ان کے اسلوبِ نگارش کا اندازہ ہے، نیز تاریخ پاکستان میں جو پُراسرار خدمات انہوں نے انجام دی ہیں ان سے بھی ہم نابلد نہیں۔ اس لئے ان کی تحقیق انیق کے مطالعہ کی کوئی تحریک دل میں پیدا نہ ہو سکی۔ چند ہی روز ہوئے کہ ایک دوست نے اپنے خط میں بڑا زور دے کر تقاضا کیا کہ اس کتاب کو پڑھا جائے۔ محض ان دوست کے اصرار پر یہ کتاب حاصل کی گئی۔ مگر میں پشیمان ہوں کہ کیوں میں نے ان دوست کا مشورہ قبول کیا۔ کتاب کی ورق گردانی کر کے سخت مایوسی ہوئی — اس وجہ سے نہیں کہ اس میں ہماری مخالفت کی گئی تھی، کیونکہ مخالفت تو کسی دعوت کے علمبرداروں کے لئے بہت تحریک انگیز ہوتی ہے — بلکہ اس وجہ سے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے لئے رہوارِ ذوق کو تازیانے لگا لگا کر حرکت دلانی پڑی اور دماغ کے ایک ایک خلیے کا خزانۂ قوت نچوڑنا پڑا، لیکن اتنی محنت و کاوش کے بدل میں پلّے کچھ نہ پڑا۔ اتنی خشک، بے ربط، معانی کے لحاظ کھوکھلی اور اپنے ہی آپ میں الجھی ہوئی تحریر شاید ہی کبھی نظر سے گزری ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی بے سروپا کتاب لکھ کر اور اس کا ایک انبار چھاپ کر اور پھر ساڑھے چار روپے کی قیمت لگا کر اسے کس امید پر بازار میں لا ڈالا گیا ہے۔ بے ورق خرچ کر دینے کے لئے کہاں سے اتنا روپیہ آیا اور پاکستان میں ذوقِ مطالعہ رکھنا والا وہ کونسا طبقہ ہے جس کے اندر سے یہ پبلشر اور مصنف کو واپس لوٹے گا۔

ہمارا اندازہ یہ ہے کہ "مولانا مودودی" کے نام کی جاذبیت سے فائدہ اٹھانا مدِّ نظر ہے۔ یعنی چاہے اس نام پر گالیاں ہی دی جائیں اور خرافات کا کوئی پلندہ ہی باندھ کر بک اسٹالوں پر رکھوا دیا جائے، بے دیکھے بھالے لوگ خرید لیں گے مولانا مودودی کے قدر شناس یہ جاننا چاہیں گے کہ کیا مخالفت کن بنیادوں پر کی گئی ہے، مخالف اس شوق میں لپکیں گے کہ وہ بات کس ڈھنگ سے کہی گئی ہے جو ہمارے دل میں ہے، اور غیر جانب دار اصحاب محض ذوقِ تجسس کے ساتھ کتاب کو حاصل کریں گے کہ معلوم تو ہو کہ یہ سارا جھمیلا کیا ہے۔ شاید ایسی ہی امیدوں کی بنا پر اس موضوع پر ایک لمبے چوڑے اشاعتی سلسلہ کا منصوبہ بنایا گیا ہے اور مصنف یہ مژدہ سناتے ہیں کہ اگر ان کی اس کوشش کو پسند کیا گیا اور ان کی ہمت افزائی کی گئی تو وہ اس کے آئندہ حصص بھی شائع کریں گے۔ گویا ان کے سامنے "مودودی انسائیکلوپیڈیا" لکھنے کا نقشہ ہے اور وہ عمرِ عزیز اس کام میں کھپا دیں گے، بشرطیکہ قوم اہلیت اور قدردانی کا ثبوت دے۔ اب جبکہ اس کتاب پر ہم نے دماغ کی قوت اور وقت کا ایک حصہ صرف کیا ہے، ناگزیر ہو گیا ہے کہ اس کے کمالات کا کچھ نہ کچھ تعارف اصحابِ ذوق کو کرا دیا جائے۔

اس کتاب کا نام ہے "مولانا مودودی کی تحریکِ اسلامی"۔ اس کی امتیازی شان یہ ہے کہ مولانا مودودی کے پیغام اور نظریات کے بارے میں براہِ راست تردیدی استدلال کرنے کے بجائے مولانا مودودی کی نفسیاتی ساخت کا تجزیہ کیا گیا ہے اور ان کے بچپن کے حالات ان کی نوعمری کے مشاغل، ان کے مختلف مواقع اقامت، ان کے معاصر سیاسی و صحافی ماحول وغیرہ کو کرید کرید کر غیر شعوری رجحانات کے بیج دریافت کئے گئے ہیں جن سے بعد میں ان کی "تحریکِ اسلامی نفسیاتی جبریت کے تحت نمو پذیر ہوئی"۔ ایسی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لازم آتا ہے کہ خود اس کے مصنف کے ذہن کا مطالعہ بھی کر لیا جائے۔

سرور صاحب کی نفسیاتی ساخت

سرور صاحب کی ذہنی و عملی زندگی کے دور دراز گوشے معلوم عام نہیں ہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ اتنے دور تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ چند پیش یا افتادہ حقیقتیں سامنے رکھنا کافی ہے۔ وہ اولاً ایک پروفیسر بن کر میدان میں اترے تھے۔ پروفیسر کا کام دوسروں کو سکھانا پڑھانا ہوتا ہے اور اسے طلبہ سے سابقہ رہتا ہے جو ذہنی لحاظ سے فروتر درجے کے ہوتے ہیں اور جن کے ذہنوں پر اپنی علمی برتری کی دھاک اسے بٹھانی پڑتی ہے۔ چنانچہ چھوٹے پیمانے پر مدرس یا بڑے پیمانے پر پروفیسر بن کر کام کرنے والے لوگ — الا ماشاءاللہ — ساری عمر دوسروں کو سکھاتے پڑھاتے رہتے ہیں اور ان کے کاموں کو اس ذہنی برتری کی شان سے دیکھتے ہیں جس سے ایک استاد طلبہ کی مشقی کاپیوں کو دیکھتا ہے اور ان میں غلطیاں چھانٹتا ہے۔

سو پروفیسری کے چکر میں پڑ کر نکلے ہوئے ذہن کا بالعموم ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ اس کو ملحوظ رکھ کر ہی کسی پروفیسر قسم کے آدمی کے کارنامے کی قدر و قیمت لگائی جا سکتی ہے۔

پروفیسری کے بعد سرور صاحب صحافت کی جولانگہ میں اترے۔ صحافی کے ذہن و کردار کا اگر سائنٹفک جائزہ لیا جائے تو اس میں "عقل کل" اور "ہمہ دان" ہونے اور باقی ساری دنیا کو ہیچ سمجھنے کا زعم کارفرما ملتا ہے۔ خصوصاً ہمارے ہاں کا صحافی تو قلم ہاتھ میں پکڑتے ہی زمین سے اٹھ جاتا ہے اور پہلے ہی قدم پر آفاقی بن جاتا ہے۔ اس کا لکھا جب چھپنے لگتا ہے اور چند ہزار افراد اسے پڑھنے لگتے ہیں تو وہ ایک ہی پرواز میں ستاروں سے آگے کے خلاؤں میں جا پہنچتا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد اس کا منصب صرف ایک ہی رہ جاتا ہے — اپنے علاوہ ہر دوسرے کو جانچنا پرکھنا اور ہر ایک کے کھوٹ نکالنا اور ہر ایک کے ٹیڑھ دکھانا! غرض یہ کہ وہ اچھا خاصا "فوق البشر" ہوتا ہے۔ سرور صاحب اس مرحلہ سے بھی ہو گزرے ہیں۔ شاید صحافت کی مسند کبھی نہ چھوڑتے، لیکن برا ہو زمانہ نا ہنجار کا کہ جس نے بڑی بدتمیزی سے یہ مسند ان کے نیچے سے سرکا لی اور ان کو چلتا کیا۔ تقدیر کی ایسی چپٹیاں بھی ذہن کے توازن پر اثر انداز ہوتی ہیں

سرور صاحب کا ذہنی مقام

ذہین لوگوں کی صف اول میں جگہ پانے والے تو ہمیشہ کسی قوم کے اندر سے چند ہی افراد نکلا کرتے ہیں، لیکن صف دوم بھی ایک قلیل تعداد ہی پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس مرتبے کے لوگ بھی خاصی قدر و قیمت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں سرور صاحب کی جگہ اس صف سے پیچھے بہرحال نہیں ہے۔ صف دوم کے رجال مرتبۂ اول کی شخصیتوں کو اپنے راستے میں حائل پاتے ہیں اس لئے یہ اکثر ذہنی الجھنوں میں پڑ جاتے ہیں۔ اپنی ذہنی الجھنوں کی وجہ سے یہ صف اول کے افراد سے الجھتے ہیں۔ ذہن پست ہوا اور ظرف چھوٹا تو کسی کی مخالفت و تردید پر کمر باندھ لیں گے اور زبان اور قلم سے طوفان اٹھاتے رہیں گے۔ ذہن ذرا اونچا اور ظرف ذرا وسیع ہوا تو وہ ناقد بن کر غیر شعوری طور پر دل کی بھڑاس نکالتے رہیں گے علی الخصوص جن اصحاب کا اصل سرمایۂ علم و صلاحیت تیسرے درجے کا ہوتا ہے لیکن حالات ان کو صف دوم تک رسائی حاصل کرنے کا موقع دے دیتے ہیں ان کی تمام تر قوتوں کا مصرف ایسے ہی منفی ہنگامے ہوتے ہیں۔

یوں بھی صفِ دوم میں کم لوگ ایسے آتے ہیں جو اپنا کوئی سرمایۂ فکر و فن رکھتے ہوں اور اس کے بل پر کوئی اپنا کارنامہ سامنے لا سکیں زیادہ تر وہ دوسروں کو پیش کرنے اور دوسروں کے کام سے متعلق کچھ کام کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ سو یا تو وہ کسی بڑے آدمی کے ترجمان اور شارح اور وکیل بن کے اٹھیں گے، یا پھر وہ کسی نمایاں شخصیت کی مخالفت پر کمر باندھ لیں گے اور اس کا پول کھولنے اور تجزیہ کرنے اور اس کے کام میں کیڑے نکالنے کی خدماتِ جلیلہ انجام دیں گے۔

سرور صاحب ان دونوں ہی کوچوں کی سیر سے مشرف ہو چکے ہیں۔ پہلے وہ مولانا سندھی مرحوم کے شاگردِ خاص اور شارح اور "جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی" کے ترجمان بن کر اٹھے تھے۔ اس خدمت میں بڑا زورِ قلم صرف کیا اور اسی سلسلے میں ہفت روزہ آفاق نکالا جو بعد میں روزنامہ ہوا۔ لیکن یہ ساری محنت و کاوش رائگاں گئی اور وہی حشر ہوا کہ "آن قدح بشکست و آں ساقی نماند"! سرور صاحب اگر ایک اوسط درجے کے صحت مند دماغ کے ساتھ اس دعوت کو پہلے سے پوری طرح جانچ لیتے (اور اس کام میں شاید مولانا مودودی پر ناقدانہ کتاب لکھنے سے کم ذہانت و محنت صرف آتی) اور اندازہ کرتے کہ ایسی بے ڈھب اور بے ہنگم باتوں کو قبول کرنے کے لئے ان کی قوم میں از خود رفتہ خبطیوں کی تعداد مایوس کن حد تک کم ہے تو شاید وہ اپنے آپ کو کسی بہتر کام میں لگا سکتے اور اب تک کچھ بنا چکے ہوتے۔ پہلے سے سوچ کر چلنے والے وہ اگر نہ بھی بن سکے تھے تو کم سے کم ایک تجربہ کو مکمل کر لینے کے بعد تو ان کو کٹے کرنے کا جائزہ لینا چاہیئے تھا کہ اجتماعیات کے دائرے میں میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا اور کس حد تک تاریخ پر اثر انداز ہو سکتا ہوں اور کس حد تک نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ اتنی تکلیف فرماتے تو شاید مولانا مودودی پر ساڑھے تین سو صفحے فضولیات سے رنگ کر نہ لے آتے، بلکہ اس سے ہزار درجہ بہتر ان کی نگاہ میں یہ کام ہوتا کہ وہ حفظانِ صحت کے اصولوں پر کوئی رسالہ قلمبند کر دیں۔ ایسے رسالے کو پڑھ کر شاید اللہ کا کوئی بندہ اپنی قوت کے خزانوں کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جاتا۔ لیکن بد قسمتی سے ان کا ذہن چونکہ "منطقی" نہیں "آفاقی" ہے، لہٰذا وہ پہلے سے کسی معاملے کو سوچ سمجھ کر آغازِ کار کرنے اور سعی و نتیجہ میں ربط کی ساری کڑیاں جوڑ کر نقشہ بنانے سے بہت ہی بالاتر ہیں۔ وہ حالات کو اپنی باگ ڈور تھما دینے کے قائل ہیں کہ جب جس کام کے لئے حالات محرک ہوں وہ کر دیا جائے اور حالات ہی کی روشنی میں ساتھ کے ساتھ نہج معین کیا جائے اور جب حالات پلٹی کھا لیں تو ایک کام چھوڑ کر دوسرا اختیار کر لیا جائے — چاہے وہ پہلے کے بالکل متضاد بھی کیوں نہ ہو۔ ان کی نگاہ میں ذہن کی وسعت اور فکر کے پھیلاؤ کی شان یہی ہے۔

سرور صاحب کا ایک تاریخی پارٹ ایک بات اور — قارئین کو یاد ہو گی — ۵۲ء میں جب دستوری مہم بہت زور پکڑ گئی تھی اور جماعت اسلامی کے خلاف یکے بعد دیگرے جو محاذ کھولے جا رہے تھے ان میں سے ایک ایک کے ناکام ہو جانے پر مرکز میں ایک نیا خفیہ محاذ کھولا گیا تھا۔ یہ محاذ جس کے کمانڈر انچیف مولانا احمد شہید صدانی تھے اور کمانڈر انچیف کی طرح جس کے ہر سپاہی نے نام اور بھیس بدل رکھا تھا بلکہ چہروں پر کالی نقابیں ڈال رکھی تھیں، اس کی طرف سے جماعت اسلامی پر خاصی گولہ باری کی گئی۔ لیکن تھے یہ سب "پھوکے فیر"، ان سے یہاں بال تک بیکا نہ ہوا۔ بالآخر اس محاذ سے ایک بڑا جہیری بم پھینکا گیا جس کے دھماکے سے ایک زلزلہ برپا ہو گیا اور شعلوں اور دھوئیں کا ایک طوفان ہر طرف پھیل گیا۔ لیکن اس سے کسی کا کچھ نہ بگڑا۔ در حقیقت

یہ ایک کاغذی بم تھا اور اس میں جھوٹ کی بارود بھری گئی تھی۔ یعنی "جماعتِ اسلامی پر ایک نظر"[1] کے نام سے ایک کتاب ......
...... اسپیشل قسم کے معیارِ طباعت (نوٹ لکھنے کو اس میں ہر صفحے کے بالمقابل ایک خالی صفحہ بھی دیا گیا تھا) کا جامہ پہنے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی یعنی محض "ایک نظر" کی کرامات سے جماعتِ اسلامی کو نسیاً منسیا کر دینا پیشِ نظر تھا۔ یہ بھاری لاگت کی کتاب بڑی دریادلی سے مفت تقسیم کی گئی۔ اس کے اوپر "ملک محمد افضل" کے الفاظ کے علاوہ مصنف کا اتا پتا دینے والی اور کوئی عبارت درج نہ تھی۔ آج تک کسی بندۂ خدا کو اس نام کے کسی صاحبِ قلم کا پاکستان کی حدود میں تو کیا، پاکستان کے باہر بھی سراغ نہیں مل سکا۔ یعنی یہ صاحب بھی مولانا ابو رشید و جدانی کے فنفتہ کالم سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ سوال بہرحال بڑا اہم تھا کہ اس کتاب کی تیاری میں کون کون سے دماغ حصہ دار ہیں۔ چنانچہ اہلِ تجسس نے اتا پتا ڈھونڈ نکالا اور سب سے پہلے مولانا ابو رشید وجدانی کی نقاب الٹ دی، کیا دیکھتے ہیں کہ مولانا عبدالمجید سالک کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اس کے بعد اس کتاب کے دوسرے مصنفوں اور اس کے کاتب اور اس کے ناشر اور اس پر سرمایہ لگانے والے حضرات، سب کا پول ہفتہ وار "جہانِ نو" (کراچی) نے بیچ کھیت کھول دیا۔ سرور صاحب بھی ان تاریخی ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے اس "پچور محاذ" سے دادِ جہاد دی ہے۔ ان دلوں آفاق سے یہ ایسے عجیب ڈھنگ سے نکالے جا چکے تھے کہ جس کو خود وہ بھی بڑی دیر میں جا کر سمجھے ہوں گے کہ یہ کیا ہو گیا۔ آفاق سے نکلنے کے بعد، نہ تو ان کے پاس کوئی جاگیر تھی کہ وہ زمینداری میں لگ جاتے، نہ کوئی کارخانہ ان کے نام الاٹ تھا، نہ کوئی تجارت ان کی چلتی تھی، نہ انہوں نے کوئی خاص اشاعتی سلسلہ شروع کیا۔ کراچی کی ہواؤں نے کان میں ان سے کہہ دیا کہ آج کل وہاں بڑی قدر سخن ہے اور ایک ایک "اہلِ صحافی" دو دو ہزار ماہانہ پر اٹھ رہا ہے۔ اور سرور صاحب کراچی میں جم گئے۔ آخر وہاں وہ تبدیلِ آب و ہوا کے لئے تو گئے نہیں تھے، نہ انہیں سیاحت کا جنون ہے۔ وہ مقصدی آدمی ہیں، مقصد کے لئے گئے اور مقصد حاصل ہو گیا۔ انہوں نے ایک ایسے شعبے میں ملازمت اختیار کر لی جس کی سرگرمیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ حکومتِ وقت سے اختلاف کرنے والوں کے خلاف چیزیں لکھوا لکھوا کر اخبارات میں شائع کرائی جائیں۔ جماعتِ اسلامی چونکہ دوسروں سے زیادہ "خطرناک" تھی، لہذا اس پر حملہ کرنے کے لئے مستقل تحقیقی کتاب لکھوائی گئی۔ آج بھی سرور صاحب یہی خدمت انجام دے رہے ہیں اور آج بھی ان کی صحافیانہ صلاحیتوں سے وہی کچھ متوقع ہے جو کچھ کہ عملاً سامنے آیا ہے۔ افسوس ہے کہ انہوں نے اپنی تازہ کتاب لکھتے ہوئے سہجنے کی توتوں سے بہت ہم کم کام لیا ہے وہ تسلیم کریں گے کہ "جماعتِ اسلامی پر ایک نظر" کی تسوید و تدوین میں چونکہ متعدد اہلِ قلم شریک تھے اور ان میں سے بعض ذہانت اور توازن کے لحاظ سے ان سے زیادہ بہتر تھے، لہذا وہ اپنے موضوع پر نسبتاً بہت بلند تحریر تھی۔ اس کی زبان ان کی تازہ کتاب سے زیادہ شگفتہ تھی، اس کی ترتیب افکار و مضامین، ان کی کتاب کے مقابلے میں زیادہ سلجھی ہوئی تھی، اس کا تحقیقی انداز زیادہ نمایاں تھا، اس میں جماعت کے لٹریچر سے اخذ کر کے جو اقتباسات درج کئے گئے تھے وہ نگاہِ انتخاب کی دوررسی کا ثبوت تھے اور [illegible]

[1] اس کتاب کے حوالوں سے سرور صاحب نے اپنی تازہ کتاب کو مزین کیا ہے [illegible]
بھی ایک طرح کا لدنی علم ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے [illegible]

پر نہیں پہنچ سکے۔ پھر اس کا معیارِ کتابت و طباعت بے مثل تھا۔ پھر وہ مفت تک دی جارہی تھی۔ لیکن اتنی خوبیوں اور کمالات کے باوجود وہ ناکام ہو گئی اور اس کی ادبیت اور اس کا استدلال سب کچھ ہوا میں اڑ گیا تو آخر سرور صاحب کی یہ کتاب کون سا انقلاب برپا کر دے گی۔ اگر وہ یہ بات سوچتے تو ایسی فضول کاوش میں نہ اپنا وقت صرف کرتے، نہ اس کے پڑھنے میں دوسروں کا وقت برباد ہوتا اور نہ قومی دولت کی ایک قابلِ لحاظ مقدار اس طرح ضائع جاتی۔

زعمِ غیر جانب داری

تاہم سرور صاحب کے اس موقف اور مقام کو سامنے رکھئے کہ وہ ایک حکومت کے محکمۂ اطلاعات عامہ سے وابستہ رہ کر قلم رانی کا کمایا کھاتے چلے آرہے ہیں جس سے جماعت اسلامی بہرحال نظریاتی و مقصدی اختلاف رکھتی ہے اور جو اسی سبب سے جماعت اسلامی پر خاص نگاہِ کرم رکھتی ہے۔ اس رابطے کے بعد ایک شخص کا جماعت اسلامی پر قلم اٹھاتے ہوئے یہ کہنا کہ وہ مقدور بھر غیر جانب داری سے کام لیگا، الفاظ کا ایک فضول استعمال ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے میکدے میں بیٹھ کر ساقی گری بھی کی جائے اور پھر ادعائے زہد اور اعلانِ تقویٰ بھی کیا جائے۔ واللہ! غیر جانب داری کا یہ بالکل ہی نیا تصور سامنے آیا۔ پہلے بھی لوگ غیر جانب دار ہو گزرے ہوں گے۔ مگر اس شانِ غیر جانب داری و نصفت شعاری کی کوئی دوسری نظیر تاریخِ انسانیت میں کسی جوئندہ کو مشکل ہی سے ملے گی۔

خود صاحبِ نظریہ ہیں!

ان کے مقام اور موقف کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ بھی جاننا چاہئے کہ وہ نظریاتی کشمکش کے ہیجے سے خود باہر نہیں ہیں۔ اگر وہ میدان سے باہر کے محض تماشائی ہوتے تو ان کی غیر جانب داری کا سکہ کسی طرح کی جانبداری کے باوجود چل جاتا۔ یا پھر وہ میدان کے اندر امپائر یا ریفری ہوتے تو ان کے ہر لفظ کو بے چون و چرا قبول کرنا کم سے کم کھلاڑیوں کے لئے واجب تھا۔ واقعہ اس کے بالکل خلاف یہ ہے کہ وہ خود ایک کھلاڑی ہیں اور بدقسمتی سے ہرے ہوئے کھلاڑی ہیں اور شاید اپنی کامیابی کی دوبارہ کی امیدیں بھی ابھی دبی دبائی رکھتے ہوں۔ جس کسی نے ایک بار کسی نظریے کا علم بلند کیا ہو، اس کا نشہ پھر مشکل ہی سے اترتا ہے۔ وہ خود ایک مستقل نظریۂ اسلام اور ساری امت سے علیحدہ ایک تصورِ اسلام کے داعی رہے ہیں۔ ان کا عجیب و غریب متضاد اور متنوع عناصر سے مرکب تصور جوں کہ قرآن سے بھی، حدیث سے بھی، اور مسلمانوں کے اجتماعی ذہن سے بھی ٹکراتا ہے، لہٰذا اس کے جڑیں چھوڑنے کا امکان یہاں ایک فی صد بھی نہ تھا۔ سرور صاحب دوسروں کو حالات اور عوام کے رجحانات کا اندازہ کرنے اور مصلحت آمیز طرزِ فکر اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، لیکن خود انھوں نے ذرا بھی خیال نہ فرمایا کہ وہ کہاں کے پودے کس زمین اور کس آب و ہوا میں کاشت کرنے چلے ہیں۔ مصیبت یہ کہ وہ ایسی باتیں سوچنے کے قائل نہیں ہیں اور ان کو اس منطقی طرزِ فکر سے سخت کراہت ہے۔

سرور صاحب کا سیکولر تصورِ اسلام

آئیے ذرا ان کے مخصوص تصورِ اسلام سے جس کا عنوان ہم ان سے مستعار لے کر سیکولر تصورِ اسلام تجویز کرتے ہیں۔۔۔ کے اہم اجزا کو [illegible] تاکہ نہیں اور ان کے معیارِ تنقید اور ان کے تحقیقی کارنامے کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ یہ تو معلوم [illegible] ہم پہلے بیان بھی کر چکے ہیں کہ سرور

۱؎ کہ ذرے جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کے تعلقات کی ریسرچ کا کام [illegible] تا [illegible]

صاحب مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے مدرسۂ فکر سے متعلق ہیں۔ مرحوم کے دو تین شاگردوں کے حلقے میں آپ کو امام کا مقام حاصل ہے۔ لہٰذا آیئے کہ شاگرد کے ذہن کو خود استاد ہی کے ذریعے سمجھیں اور یہ جو سلسال جو صحافت اور فلسفہ و سیاست اور علم و تحقیق کی کیاریوں کو سیراب کرتی چلی آ رہی ہے، اس کے منبع کو دیکھیں۔

سرور صاحب "خطبات مولانا عبید اللہ سندھی" نامی کتاب کے مرتب ہیں۔ اس میں وہ اپنے قلم سے "عرضِ مرتب" کا خاتمہ ان سطور پر کرتے ہیں۔

"مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کا یہ پیغام زندگی کی آنی جانی چیز نہیں۔ بیشک وہ ہم میں نہیں رہے، لیکن ان کا پیغام ہمارے وطن کی فضاؤں میں برابر گونجتا رہے گا، اور آج نہیں تو کل زمانے کے تقاضے مجبور کر دیں گے کہ ہم ادھر کو چلیں جس طرف کی راہ حضرت مولانا مرحوم دکھا گئے ہیں۔"

مقدمہ کا خاتمہ وہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:۔

"نئے دور میں اگر مسلمانوں کو ایک فعال اور صالح جماعت کی حیثیت سے ہندوستان میں رہنا ہے تو اس کا انحصار زیادہ تر اس پر ہے کہ مسلمان مولانا کے فکر و عمل کو کہاں تک اپنے لئے مشعلِ راہ بناتے ہیں۔"

ان الفاظ سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ سرور صاحب محض ایک تحقیقی ذوق سے مولانا سندھی کے افکار پیش نہیں کر رہے، بلکہ وہ ان پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے داعی ہیں اور ان کو مسلمانوں کے لئے قطعی ذریعۂ فوز و فلاح سمجھتے ہیں۔ اب ضرورۃً سرور صاحب ہی کے قلم سے یہ دعا بھی سن لیجئے کہ مولانا سندھی کا پیغام تمام تر ترجمانیٔ کتاب و سنت ہے:۔

"مولانا کے نزدیک اس دینی انقلاب کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن کریم ہے"۔ ص۱۹

"یہ ممکن ہے بعض معترضین یہ فرمائیں کہ ہم کتاب و سنت کے عالم ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابیں ہم نے بھی پڑھی ہیں لیکن جو باتیں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کتاب و سنت کی انقلابی تعلیمات اور شاہ ولی اللہ کی انقلابی حکمت کے متعلق کہتے ہیں وہ ہمیں تو ان کتابوں میں کہیں لکھی ہوئی نظر نہیں آتیں، آخر یہ معمہ کیا ہے۔ ان بزرگوں کی خدمت میں ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ حضرات کو شاید اس بات سے تو انکار نہ ہو گا کہ مولانا بھی کتاب و سنت کے بہت بڑے عالم تھے اور ان کی ساری زندگی قرآن مجید کے مطالعہ اور اس کے حقائق کو سمجھنے میں گزری"۔ ص۲۱

"لیکن اگر اہلِ علم کے اوپر کے گروہ ہی میں سے کوئی صاحب یہ کہیں کہ ہم نے کتاب و سنت کو پڑھا ہے اور شاہ صاحب (یعنی شاہ ولی اللہ۔ ن۔ص) کے علوم کا بھی احاطہ کیا ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں قرآن کی انقلابی تعلیم اور شاہ صاحب کی انقلابی حکمت کا کہیں سرے سے پتہ نہیں چلا، تو اس کے جواب میں مجبوراً یہی عرض کرنا پڑے گا کہ محترم بزرگو! پڑھنے پڑھانے میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے"۔ ص۲۵

"غرض یہ کہ آپ کی (یعنی مذکورۂ بالا بزرگوں کی! ن۔ص) یہ ساری تگ و دو اور کاوش و جستجو اپنی محدود دنیا میں محصور رہی۔ [illegible] اسلام اور تاریخِ اسلام کے مطالعہ سے جو نتائج برآمد ہوں گے ان کی حیثیت بالکل جدا ہو گی

اس شخص کی بحث و تحقیق کے نتائج سے جس کے ذہن میں سب سے پہلے اسلام کا تصور آیا ہو تو اس شکل میں کہ اگر اسلام کے پیش کردہ "اللہ" کو مانتے ہو تو سب سے پہلے "اِلٰہ" کا انکار کرو۔ (کہنا چاہئے تھا کہ ہر دوسرے "اِلٰہ" کا انکار کرو۔ ل۔ن۔ص) چنانچہ جب اس نے اسلام کا کلمۂ شہادت پڑھا ہو تو وہ واقعتہً "اِلٰہ" کا انکار کر چکا ہو۔ اور پھر اس کے بعد اپنی تمام زندگی میں الا اللہ کی راہ میں جہاں بھی اس نے کسی "اِلٰہ" کو حائل پایا تو وہ "اِلٰہ" کو ترک کرنے کے بعد "الا اللہ" کی طرف بڑھا۔ ظاہر ہے "لا الٰہ الا اللہ" کے یہ معنی جو مولانا سمجھے تھے ان لوگوں کے تصورِ توحید سے کتنے مختلف ہوں گے جنہیں اپنی زندگی میں کسی اِلٰہ کو ترک کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ——— چنانچہ مولانا مسلمان ہوئے تو اسلام کا یہ مفہوم سمجھ کر مسلمان ہوئے کہ وہ عقیدہ میں توحید خالص اور عمل میں جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔" ص ۳۱-۳۰

——— "مولانا کے معترضین کو معلوم ہونا چاہئے کہ حسنِ اتفاق یا سوءِ اتفاق سے مولانا کے حالات کچھ ایسے تھے کہ موصوف نے آپ حضرات کی طرح کتاب و سنت کو اپنے مخصوص خاندانی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا۔ اور پھر وہ آپ لوگوں کی طرح بزرگوں کی تقلید میں مسلمان نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے خود تحقیق کی۔" ص ۳۱

——— "حقیقت یہ ہے کہ مولانا کتاب و سنت کے نام سے جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل اور دماغ پر کتاب و سنت کے مطالعہ سے واقعتہً یہی کیفیات گزری ہیں۔" ص ۳۲

——— "مستقبل کا یہ ہندوستان جس کے بنانے کے منصوبے لے کر مولانا وطن لوٹے اس کا ایک عنصر تو مشین ہوگا اور دوسرا عنصر جمہوریت لیکن اگر مشین اور جمہوریت کی برکات ایک طبقے تک محدود رہیں تو اس کا نتیجہ موجودہ سرمایہ داری ہے جس سے بڑھ کر آج کے زمانے میں کوئی لعنت تصور میں نہیں آسکتی۔ مولانا مشین اور جمہوریت کی برکات ہر خاص و عام میں مشترک کرنا چاہتے ہیں۔ اسے آج کی اصطلاح میں سوشلزم کا نام دے دیجئے۔ مولانا چاہتے ہیں کہ اس نئے ہندوستان کا ظاہری ڈھانچہ تو بے شک مشین، جمہوریت اور سوشلزم کے عناصر سے ترکیب پائے۔ لیکن ان کا معنوی وجود ان عناصر کی طرح کہیں باہر سے مستعار نہ لیا جائے، بلکہ یہ معنوی وجود حاصل ہو ہمارے وطن کے اس سلسلۂ ارتقاء کا جو ہزارہا سال سے اس ملک میں جاری ہے (اب اس سلسلۂ ارتقاء نے کتاب و سنت کی جگہ لے لی۔ ل۔ن۔ص) جسے پہلے تو آریائی فکر و ذہن نے نمو بخشا، پھر صدیوں تک مسلمان اس کو سنوارنے اور ترقی دینے میں لگے رہے۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ ہمارا یہ معنوی وجود ہندوؤں اور مسلمانوں کی تاریخی جد و جہد اور ان کے ہزارہا سال کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ اور آج ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے وطن کے اس معنوی وجود کی بنیادوں پر اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق ایک آزاد، جمہوری، صنعتی اور سوشلسٹ ہندوستان کی تعمیر کریں۔ مولانا کے نزدیک ہندوستان کے اس معنوی وجود کے بہترین شارح اور آخری ترجمان شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی ہیں۔" ص ۴۹

لہ یہ سب کتاب و سنت کی ترجمانی ہو رہی ہے! (ل۔ن۔ص)

اب ذرا مولانا سندھی کا مقام ان کے شاگرد کے نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیے:

—— "مولانا کی یہ دعوت نئے دور کے آنے کا اعلان تھا۔ اگر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دے دی اور انہوں نے نئے دور کے اس پیغامبر (سرور صاحب اپنے استاد کے حق میں یہ ذہن... رکھتے ہیں اور کسی دوسرے پر تنقید کرنے چلیں تو وہ جس کی آئینہ دار ان کی کتاب ہے۔ ن۔ص) کی بات کو سمجھ لیا اور وہ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے تو یقیناً ان کے لئے فوز و فلاح کے دروازے کھلے ہیں، ورنہ جس انقلاب سے مولانا ڈرا رہے تھے اگر اس نے ہمیں اسی حالت میں جس میں کہ ہم اس وقت ہیں، اپنی دارہ گیر میں لے لیا تو پھر جو حضرت نوح کی قوم پر گزری تھی (اس تشبیہ نے اور زیادہ صراحت سے مقام کا تعین کر دیا۔ ن۔ص) وہ حشر ہمارا بھی ہوگا۔ اور اپنی عمر بھر کی جان توڑ کوششوں کا یہ افسوس ناک انجام دیکھ کر حضرت نوح علیہ السلام کی طرح بے شک مولانا عبید اللہ صاحب سندھی بھی اپنے پروردگار کی خدمت میں یہی عرض کریں گے کہ: رَبِّ اِنَّھُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْہُ مَالُہٗ وَوَلَدُہٗٓ اِلَّا خَسَارًا" ص۵۲

سرور صاحب دوسروں پر تو محض یہ الزام لگا کر برستے ہیں کہ ان کے ہاں اپنے تصورِ اسلام کو پیش کرنے میں تحکم و ادعا پایا جاتا ہے، لیکن یہاں اپنے قلم سے استاد کو خود بشیر و نذیر ہونے اور بجائے خود انتہائی اور قطعی حجت ہونے کا آخری پیغمبرانہ مقام دے رہے ہیں جس کی بنا پر آپ کے استاد اللہ کے سامنے جا کر یہ استغاثہ کریں گے کہ "عصونی" (ان لوگوں نے میری نافرمانی کی!)

چند اہم اقتباسات

سرور صاحب کے سرچشمۂ فکر و نظر کا تعارف سرور صاحب کے ذریعے حاصل کر لینے کے بعد اب ہم خود استفادہ کرتے ہیں:

—— "بے شک خلافتِ راشدہ کی حکومت قرآنی حکومت کا نمونہ ہے، لیکن یہ نمونہ بعینہٖ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا۔"
("مولانا عبید اللہ سندھی" از پروفیسر محمد سرور ص۱۴۷)

—— "اسلام گو بین الاقوامیت کی دعوت ہے مگر وہ قومیتوں کا انکار نہیں کرتا۔" (ایضاً ص۱۹۶)

—— "میرا قومی اور ملی مذہب، وحدتِ ادیان اور وحدت الوجود ذہنی ارتقاء کے مراحل ہیں۔" (ایضاً ص۱۵۱)

—— "اس عالمگیر قانون (یعنی اسلام۔ ن۔ص) کو حجاز میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ یہ جامہ اس عالمگیر قانون کی ایک تعبیر ہے جو زمانہ و ماحول اور اہلِ حجاز کی طبیعت کے مطابق کی گئی۔ اس تعبیر کو اصل قانون کی طرح عمومی اور ابدی سمجھنا ٹھیک نہیں۔" (ایضاً ص۲۲۱)

—— "دین صرف قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے......... اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے، اور وہ غیر متبدل رہے گی، لیکن جہاں کہیں کسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند ثانوی قوانین بنائے جاتے ہیں، قانون اساسی تو غیر متبدل ہوتا ہے، لیکن ثانوی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں، ہم سنت اور ثانوی قوانین کو بدل سکتے ہیں۔" (ایضاً)

—— "مولانا کے نزدیک بھی قرآن میں کہیں کہیں جو احکام ہیں، وہ دراصل ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان احکام کو اپنی

خاص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں۔ عرب کے خاص حالات میں قرآن کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی عملی صورت دی جاسکتی تھی۔" (ایضاً ص ۱۵۴)

—"ہندوستان میں فطرۃً ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں۔ اس لئے اگر کوئی ہندوستانی ذبح حیوانات سے بچے (یعنی اپنے اوپر حیوانات کا گوشت حرام کرلے) تو اس کا یہ فعل خلافِ نبوت نہ ہوگا۔" (ایضاً ص ۲۵۵)

—"چنانچہ اکبر پہلا مسلمان فرماں روا ہے جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ مسلمانوں کی قیادت میں ہندوستان میں قومی حکومت کی تشکیل تھی، اور اسلام کے اصول و قوانین کے اندر ہندوستانی قومیت اور ان کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش۔" (ایضاً ص ۲۹۳)

—"مولانا کے نزدیک وحدت الوجود کا عقیدہ اکبر کے فکر کی اساس تھا اور اسی پر اس کے دینِ الٰہی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔" (ایضاً ص ۹۶-۲۹۶)

—"اکبر کی حکومت حقیقت میں ہندوستانی اسلامی حکومت تھی۔" (ایضاً ص ۳۰۹)

عملی پروگرام | اجمال ملحوظ ہے، لہٰذا ان چند حوالوں سے سرور صاحب کے سیکولر اسلامی اسکول کا دھندلا سا تصور قائم فرما لیجئے۔ اب اس تصورِ اسلام کے ماتحت کام کرنے کے لئے جتا پیدا شدہ سا گر پارٹی کے عملی پروگرام کے چند اہم اجزاء بھی ملاحظہ فرمایئے۔ جو "خطبات مولانا عبید اللہ سندھی" (مرتبہ سرور صاحب) سے ماخوذ ہیں:-

دفعہ ۱ —تمہید— "دار الرشاد، السواد الاعظم، قاسم المعارف کے پرانے کارکن اور ان کے رفقاء جو وطنی خدمت کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں، انڈین نیشنل کانگریس کے اندر ایک مستقل پارٹی تشکیل کرتے ہیں۔ ..." (ص ۱۸۰)

دفعہ ۲ — شق و — "عدم تشدد کی پابندی سے کامل آزادی حاصل کرنا۔" (ص ۱۸۱)

شق ج — "ہند کو ایک ملک نہیں، بلکہ یورپ کی طرح مجموعہ ممالک ماننا۔ زبان اور معاشرت کو ملکی تقسیم کی اساس ماننا۔" (ص ۱۸۱)

شق ہ کی تشریح — "جو ہندوستانی زبانیں عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں ان کی تعمیم تعلیم موجودہ رسم الخط کے ذریعہ سے دشوار ہے، اس لئے ضروری ہے کہ یا تو حروف علیحدہ علیحدہ لکھنے کو رواج دیا جائے یا رومن حروف میں لکھنا شروع کریں۔" (ص ۸۲-۱۸۱)

شق و — ...... "مرد و عورت کو جاہلانہ رسموں سے بچانے کے لئے یورپین معاشرت اختیار کرنا۔" ص ۱۸۲

شق ز — "فکر اور اخلاق اور سیاست میں یکسانی پیدا کرنے کے لئے امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت اور فلسفہ کو پارٹی کی عقلی اساس ماننا اور اس واسطے سے انسانیت کی خدمت کے لئے تیار کرنا۔" ص ۱۸۲

شق ز کی تشریح — "دوسری ہزار ہجری کے ابتداء سے یعنی جلال الدین اکبر کے زمانہ سے مسلمانانِ ہند کے مفکرین کا ایک طبقہ ابن عربی کے فلسفہ یا دیانت خلاصی کی اصلاح اور تکمیل میں اس لئے مصروف رہا ہے

ہندوستانی زندگی کے لئے سیاسی اساس بنائے ۔امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ ان تمام مساعی کا نچوڑ ہے۔ اس سے تمام ادیان میں تطبیق دی جا سکتی ہے" ص۱۸۲

شق ط ـــــ "فیڈریشن کی تکمیل کے لئے ایک کافی لمبی مدت تک برٹش کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کرنا" ص۱۸۳

ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ اب اس نظریے اور پروگرام کی ناکامی کے بعد سرور صاحب حالات کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئے ہوں گے ۔نہیں وہ اپنے سیکولر تصورِ اسلام کے بڑے پکے مومن ہیں ۔اپنی اس تازہ تصنیف میں بھی وہ کچھ نہ کچھ تبلیغ کر ہی گئے ہیں ۔ ملاحظہ ہو :۔

ـــ "بات دراصل یہ ہے کہ دنیا کے مسلمانوں کے مذہبی رجحانِ فکر نے بالعموم اور برِ عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے بالخصوص ابھی تک اس حقیقتِ واقعی کو تسلیم نہیں کیا کہ ایک ہوتی ہے روحِ مذہب اور ایک ہوتا ہے اس کا وہ خارجی وجود (ہیئتِ معروضی) جو ایک خاص زمانے میں اور ایک خاص ماحول کے اندر انسانوں کی ایک جمعیت کے عمل و قول سے متشکل ہوتا ہے ...... اب حالت یہ ہے کہ اسلام کی اس روحِ مذہب کو جسے قرآن نے دین سے تعبیر کیا ہے اور اسی کو ہر نبی کی دعوت کا اصل الاصول قرار دیا ہے، اسلام کے ایک دور کی مخصوص ہیئتِ معروضی سے گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ اور ہم بالعموم دونوں سے ایک ہی مراد لے لیتے ہیں۔ بے شک اسلام کی روحِ مذہب مسلمانوں کی پوری زندگی اور ان کی پوری تہذیب پر حاوی ہونی چاہئے اور یہ روح عالمگیر ہے، اور زمانے کی طرح ابدیت اور دوام کی حامل بھی، لیکن ہمارے ذہنوں میں عام طور پر اس روح میں اور اس کی مخصوص ہیئتِ معروضی میں جو مسلمانوں کی تاریخ کے ایک دور میں متشکل ہوئی کوئی واضح حدِ فاصل نہیں اور اسی وجہ سے اسلام کے متعلق ہمارے ہاں بڑا فکری انتشار ہے جس میں کسی نہ کسی حد تک آپ اور میں اور باقی سب مبتلا ہیں" ص۱۵۱

میرا خیال ہے کہ یہ نکاتِ لطیف کسی تشریح کے محتاج نہیں، لیکن اس میں جو گنجلک پن ہے اور جو فلسفیانہ اصطلاحاتی تنگ لطور پردہ معانی کے چہرے پر پڑا ہے اس کے پیش نظر اتنا عرض کیا جاتا ہے کہ سرور صاحب کا اسلام مروجہ تصورِ اسلام سے دورِ رسالت کے پورے عملی کارنامے کو خارج کر دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ قانون، سیاست، معیشت، اخلاق، معاشرت وغیرہ کے عملی مظاہر کا چھلکا اتار پھینکئے اور اندر سے روحِ خاص نچوڑ لیجئے۔ پھر اطمینان سے عملی زندگی کا نیا چھلکا یورپ، روس، بھارت سے مستعار لیجئے اور اس میں روحِ اسلام بھر دیجئے۔ خیر اور آگے چلئے :۔

ـــ "چنانچہ اپنے حال سے ہماری بیزاری اور اپنے مستقبل سے ہمارا خوف برابر بڑھتا گیا۔ جس کا قدرتی ردِ عمل یہ ہوا کہ نہ صرف ہمارے عوام اور متوسط طبقوں نے بلکہ ہمارے خواص اور اہلِ علم و فکر بلکہ شعراء و ادباء نے بھی ماضی کو اپنی پناہ گاہ بنایا

لہ یہاں معلوم ہو چکا یہ بحث چلی آ رہی تھی کہ مودودی صاحب نے عام مسلمانوں کے مسلمہ تصورات اور ان کے اسلاف امجاد کے خیالات سے الگ کوئی اپنا تصورِ دین گھڑ لیا ہے، اور اب یہاں خود اپنے تصورات کو اس تمہید کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں نے مذہب کی ایک حقیقتِ واقعی کو اب تک قبول نہیں کیا، اور وہ یہی حقیقتِ واقعی سرور صاحب پیش فرماتے ہیں) ۔

.... اب جوں جوں زمانہ بڑھتا گیا، حال سے ماضی کی طرف ہماری مراجعت زیادہ ہوتی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ہماری نظروں میں ماضی کی دلکشی اور بڑائی بھی بڑھتی گئی " صـ ۲۵۱-۲۵۲

یعنی رسول اکرم کے کارنامے اور آپؐ کی سنت اور آپؐ کے پیش کردہ نمونے کے تمدن سے جس نے درسِ فکر و عمل لیا وہ بس اسلام کی اصلی روح کو کھو بیٹھا اور ایک خاص دور کی مخصوص ہیئت ترکیبی کے ظاہر پہ مر مٹا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس تصورِ اسلام کا علمبردار کسی دور کے کام کو چلتا ہوتا دیکھ کر چپ بیٹھا رہ سکتا ہے۔ اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ...... ہر مودودی کے پیچھے اشہبِ قلم دوڑاتے ۔ اور سنئے :۔

۔۔" بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں صدیوں سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ اسلام کا مقصد تمام روئے زمین پر اللہ تعالٰے کی حکومت قائم کرنا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں سارے مسلمان برابر ہیں۔ اسی عقیدہ کی بنا پر مسلمانوں میں اسلام کی ایک عالمگیر مثالی سلطنت یعنی دارالاسلام کا تصور وجود میں آیا جس کا اساس وطنی قومیت کی نفی تھا اور جو انسانوں کے دو ہی طبقے مانتا تھا۔ ایک مومنین اور دوسرے منکرین کا !" صـ ۱۴۳

۔۔" ایمان جس سے جماعت میں نظم اور اجتماعی قوت پیدا ہوتی ہے وہ کوئی بندھا ٹکا فارمولا نہیں کہ اسے پڑھ دیا اور ایمان پیدا ہو گیا، بلکہ ایمان بے پناہ جذبۂ عمل ہوتا ہے جمہور کا، جسے تاریخی قوتیں عمل میں لاتی ہیں تو خدا کا کوئی بندہ خدا کی مرضی کے مطابق اس جذبۂ عمل کو اعمالِ صالحہ کی راہوں پر ڈال دیتا ہے۔ اور یہ اعمالِ صالحہ عبارت ہوتے ہیں اس زمانے کے زیادہ سے زیادہ انسانوں کی بھلائی کے کاموں سے۔ چنانچہ اس ایمان کو پیدا کرنے کے لئے خدا کے ساتھ ساتھ اس کے بندوں پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے۔ اور خدا کی قوتِ کارساز کے ساتھ ساتھ بندوں کی قوتِ کارساز کو بھی ماننا ضروری ہوتا ہے " صـ ۲۶۵

ان سطروں کو خود ہی پڑھئے اور خود ہی ان الفاظ میں معانی تلاش کیجئے اور ان معانی کے نتائج بھی خود ہی متعین کیجئے۔ ان اقتباسات سے کچھ اسلام پوری طرح سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اتنا تو ہر قاری محسوس کرے گا کہ اس ذہن کا آدمی مودودی صاحب کا دامن نوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ ہے کتاب و سنت سے اخذ کردہ نظریۂ ولی اللٰہی پر مبنی نقشۂ انقلاب !!

سرور صاحب اس کے داعی تھے اور ہیں۔ اس نظریہ اور پروگرام کے آئینہ میں ان کی ذہنی ساخت کا مطالعہ کرنے کے علاوہ یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ایک شخص جو خود ایک نظریہ اور پروگرام کا داعی ہے اسے پیش کرنے والے کو اپنے کا "بشیر و نذیر" مانتا ہے اور اسی نظریے اور پروگرام میں مسلمانوں کی فوز و فلاح کو منحصر جانتا ہے۔ وہ کسی دوسرے تصورِ اسلام کے لئے غیر جانبدار ناقد و مبصر کیونکر ہو سکتا ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی یہاں ہم یاد دلا دینا چاہتے ہیں کہ دوسرے منکرین کے علاوہ مولانا مسعود عالم مرحوم نے جماعتِ اسلامی کی اندر سے مولانا سندھی کے افکار پر تنقید کی تھی جسے آج بھی کتابی شکل میں "مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر" کے نام سے دیکھا جا سکتا ہے۔ جناب زید اے سندھ ساگر پارٹی کی ناکامی میں اس کتاب کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ اور پھر جماعتِ اسلامی کی قوت بھی ...

ہی سرور صاحب کے اختیار کردہ "سیکولر اسلام" کا راستہ روکنے والی تھی۔ جوں جوں یہ دعوت بڑھتی گئی، سیکولر اسلام کے فروغ کے امکانات ختم ہوتے چلے گئے۔ اندریں حالات سرور صاحب کا یہ خیال کہ وہ مولانا مودودی اور ان کی تحریک اسلامی سے کوئی غیر جانب دارانہ معاملہ کر سکیں گے، بالکل بے سروپا ہے۔ وہ قطعی طور پر ایک حریف کی سی پوزیشن رکھتے ہیں ۔۔۔۔ اور حریف بھی ایک زخم خوردہ حریف!! بہتر یہ تھا کہ وہ جرأت مندی کے ساتھ جانب دار بن کر سامنے آتے اور اپنے نظریے کو ذہنی گہرائیوں میں دبا رکھنے کے بجائے کھل کر اس کی وکالت کرتے اور اسی کو معیار بنا کر دوسروں کے خیالات کی جانچ کرتے۔ مگر ان کے ذہن کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ داعیانہ جسارت کھو بیٹھے ہیں اور اب اپنے خیالات کی تبلیغ کرنا تو کجا، الٹا ان کو اخفا میں رکھتے ہیں۔

کتاب کے مصنف کا کسی ضروری حد تک ذہنی تعارف کرانے کے بعد اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کتاب میں کیا ہے اور مصنف نے ذہن سے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ واضح رہے کہ بحثوں کی ژولیدگی اس امر میں رکاوٹ ہے کہ مصنف کے دعووں کو بآسانی سمجھا جا سکے۔ تاہم جو کچھ دعاوی اور جو کچھ استدلالات ہمارے سامنے واضح ہو سکے ہیں وہ اپنی مضحکہ انگیز نوعیت کے لحاظ سے اس قابل تو ہرگز نہیں ہیں کہ ہم ان کا جواب دینے بیٹھ جائیں۔ سطر سطر میں جواب دینے کی چیزیں بکھری پڑی ہیں، اب اگر ان میں سے ہر چیز پہ گرفت کی جائے اور اصل پوزیشن واضح کرنے کے لئے اقتباسات جمع کئے جائیں تو سرور صاحب کی کتاب سے چار گنا بڑی کتاب وجود میں لانی پڑے گی۔ ہم اصل حقیقت کو معلوم کرنے کا کام کتاب کے قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ خود ہی جماعت کا لٹریچر دیکھ کر اپنا ذہن بنالیں۔ یہاں تو ہم محض چند ایسے پہلو سامنے لانا چاہتے ہیں جن سے کتاب کی مجموعی نوعیت کا اندازہ کیا جاسکے۔

کتاب ایک طائرانہ نظر میں

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، یہ کتاب اپنی ترتیب اور معنویت کی الجھنوں ۔۔۔۔ اور دماغ کو تھکا دینے والی الجھنوں ۔۔۔۔ کے سبب کسی صحت مند ذہن کی عکاس نہیں ہے، اس میں مریضانہ نفسیات کی جھلک ہر جگہ موجود ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک بات میں سے کوئی دوسری ہی نوعیت کی بات نکالنے کی کھینچ تان ہو رہی ہے۔ ایک اچھی چیز میں برائی ثابت کرنے کے لئے پہلے سے فلسفیانہ تمہید باندھی جا رہی ہے، کچھ الزامات عاید کرنے کے لئے مصنوعی طور پہ تعریفی کلمات استعمال میں لائے جا رہے ہیں، پروپیگنڈہ کے ایک اہم اصول کی بنا پر بعض فضول باتیں جا بجا دہرائی گئی ہیں، حالانکہ ان کو ایک جگہ ایک فصل میں سمیٹ دینا حسن ترتیب کی تعریف میں آتا اور صاحب کتاب کے ذہن کا اچھا تصور دلاتا، اور پھر "اگر" اور "مگر" کی تو بھرمار ہے، اچھا ہوتا کہ اس کتاب کا نام ہی "اگر مگر" رکھ دیا جاتا۔

دوسری صفت اس کتاب کی یہ ہے کہ یہ تمام تر ایک منفی کارنامہ ہے، یعنی ایک شے کی تردید کی جا رہی ہے، مگر سامنے کوئی مثبت نظریہ نہیں رکھا گیا۔ دل میں چور نظریہ کا وجود اور بات ہے، مگر گفتگو کی بنیاد کے طور پر کوئی مثبت چیز قارئین کو نہیں دی گئی۔ ایسی کتاب پڑھ کر سرور صاحب کے کام کے جو لوگ اس سے متاثر ہوں گے بھی، وہ زیادہ سے زیادہ اس دعویٰ پر ایمان لے آئیں گے کہ "مودودی بہت برا ہے اور جماعت اسلامی بڑی خراب جماعت ہے"۔ لیکن اس کے بعد اچھا کیا ہے اور ہونا کیا چاہئے، اس کے جواب میں خلا ہی خلا ہے۔ سرور صاحب سمجھائیں کہ کسی شخص سے اگر آپ نے یہ منوا لیا کہ مودودی کام کا آدمی نہیں۔

تو اس سے آپ کے متاثر کے اندر کون سی فکر اور کون سا کردار پیدا ہو جائے گا۔ اگر ساری قوم بھی آپ کے استدلال پر آمنّا کہہ لے تو اس سے کون سی بگڑی بن جائے گی۔ پھر کیا آپ یہ توقع کرتے ہیں کہ مودودی صاحب سے جن لوگوں کا ذہنی رشتہ آپ کاٹ لے جائیں گے وہ لپک کے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔ جب یہ سب کچھ نہیں، کوئی تعمیری مدعا نہیں، کوئی اصلاحی و انقلابی مشن نہیں تو روشنائی اور کاغذ کے اس صرفِ بے جا کی ضرورت کیا پڑی تھی۔

ہماری حتمی رائے یہ ہے کہ سرور صاحب کے سامنے ایک خاص طبقہ ہے — وہی سیکولر ذہن والا — جسے وہ مودودی سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے سامنے متعصبانہ تصورات کی اینٹیں چُن چُن کر دیواریں کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ اس خاص طبقے میں جتنے بھی ذہنی ہوے اور نظریاتی ڈراوے موثر تھے ان سب کو سرور صاحب نے مودودی صاحب کی ذات اور دعوت میں جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب مولانا مودودی کی بڑی ہی ڈراؤنی تصویر پیش کرتی ہے۔ یکے بعد دیگرے پڑھنے والے کے سامنے سرور صاحب کی یہ "تحقیقات" آتی ہیں کہ مولانا مودودی آزادی کے مخالف تھے اور انگریزی اقتدار کو قائم رکھنے میں مدد دیتے رہے، اور مودودی صاحب مسلم لیگ کے مخالف تھے اور اس کے لیڈروں کی توہین کرتے رہے، وہ قومی تحریک کے خلاف تھے، پاکستان میں ان کا پارٹ تخریبی رہا، وہ ملازمین کو حلف سے روکتے تھے۔ نوجوانوں کو ورغلاتے تھے۔ وہ ۱۹۵۳ء کے قادیانی ہنگاموں کے ذمہ دار ہیں، وہ جمہوریت کو نہیں مانتے، جمہور کو کچھ حقوق نہیں دینا چاہتے، وہ نازی تحریکوں سے متاثر ہیں، وہ ڈکٹیٹر بننا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی بات منوانے میں تحکم سے کام لیتے ہیں۔ وہ عقل سے کام لینے کا حق نہیں دیتے، وہ ہر ذاتی رائے کو کتاب و سنت کی ترجمانی کہہ کر خدا و رسول کے نام پر منوانا چاہتے ہیں، انھوں نے ایک نیا اسلام خود گھڑ لیا ہے، — اور یہ سب کچھ اس وجہ سے کہ ان کے اندر بڑی انانیت اور خود امتیازی تھی اور ان میں "میں" کا بڑا زور تھا۔ ہم نے بہت ہی اجمال سے سرور صاحب کی بنائی ہوئی تصویر کا خاکہ دیا ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر اگر کوئی شخص مصنف کی دیانت پر اعتماد کر لے تو وہ ان سے کوسوں دور رہ جائے گا اور جماعتِ اسلامی کے قریب نہ پھٹکے گا۔ تصویر جن نقوش سے بنائی گئی ہے وہ بول کر کہہ رہے ہیں کہ کس طرح کا ذہن ہے جسے چڑانا مطلوب ہے۔

حقیقت کا بلیک آؤٹ

سرور صاحب ہوں یا کوئی اور، کسی کی دیانت پر خواہ مخواہ حرف رکھنے کی جسارت کرنا کوئی پسندیدہ طرزِ عمل نہیں ہے۔ نہ محض اختلاف یا تنقید کا ردِ عمل یہ ہونا چاہیے۔ لیکن جس طرح کا کام سرور صاحب کرنے چلے ہیں وہ اپنے مقصد اور اپنی تکنیک دونوں کے اعتبار سے — کم از کم غیر شعوری جذباتی عالم میں — آدمی کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے اور اس سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً جب کسی خاص ذہن کے ساتھ آپ کسی کی مخالفت کرنے اٹھیں گے تو [illegible] ایسے عالم میں حقیقت کا بلیک آؤٹ ہو ہی جایا کرتا ہے۔ اس کتاب میں ایسی افسوس ناک مثالیں بہت ہیں، مگر اکثر ایسی ہیں کہ ان کا تجزیہ کرنے کے لیے طویل گفتگو کرنی پڑے گی۔ لہٰذا ہم دو تین سادہ سی مثالیں سے لیتے ہیں۔

(۱) سیاسی کشمکش میں مولانا مودودی نے اپنے سیاسی نظریہ اسلامی کو ذہن میں رکھتے ہوئے [illegible] انگریزی اقتدار کو

ہٹاکر اس کی جگہ وطنی نیشنلزم اور سیکولر ڈیموکریسی کو لانے کی کوشش اور اسی طرح اس کے مقابلے پر وطنی یا نسلی قومیت کی بنیاد پر مسلمانوں کی محض قومی (اسلامی نہیں!) حکومت قائم کر لینے کی دعوت اسلام کے مطابق نہیں، بلکہ تحریک درحقیقت غیر اسلامی نظام کو ہٹاکر اسلامی نظام زندگی قائم کرنے کے لئے چلانی چاہئے۔ لیکن سرور صاحب تیسرے جزء کو اکثر مواقع پر قاری کی نگاہ سے اوجھل کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایسے ہی ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ:۔

—"یعنی مطلب یہ ہؤا کہ انگریز کو اطمینان سے ملک پر حکومت کرنے دو" ص ۱۵۴

مگر ساتھ ہی ان کی دیانت و امانت بھی اپنا حق مانگتی ہے، اس لئے وہ بطور استہزاء تیسرے جزء کو غلط محل میں یوں جاری کرتے ہیں۔

—"...... اور خود اس کے ظلِ ہمایونی کے نیچے حکومتِ الٰہیہ کے لئے قلمی پروپیگنڈہ کرتے رہو" ص ۵۵-۱۵۴)

(۲) کوئی بھی دل درد مند رکھنے والا داعئ اصلاح اپنے سامنے پھیلے ہوئے عوام کی کمزوریوں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا، بلکہ وہ بعض اوقات ان کمزوریوں کو دکھ اور کرب کے ساتھ برسرِ عام بیان بھی کرتا ہے، خصوصاً ان سربراہ کاروں کو وہ جھنجھوڑنا چاہتا ہے جو حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ دیئے بغیر جذباتی رو میں خود بھی بہ رہے ہوتے ہیں اور قوم کو بھی بہائے لئے جاتے ہیں۔ اسی ضرورت سے مولانا نے بعض مواقع پر عام مسلمانوں کے ذہن و کردار کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اور کہیں مسلم لیگ کی تنظیم اور اس کی قیادت پر اظہارِ خیال کیا ہے[1]۔ اس نوعیت کے متعدد اقتباسات کو مختلف مواقع پر سرور صاحب نے اپنی رائے زنی سے بالکل دوسرے معنی پہنا دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۴۹-۱۴۸، ص ۱۵۲، ص ۱۵۷، ص ۶۳-۱۶۲۔

(۳) مولانا مودودی کے نظریۂ حاکمیتِ الٰہی کے سلسلے میں سرور صاحب فرماتے ہیں کہ یہی مسلک جماعت احمدیہ کا رہا ہے۔ (ص ۱۵۹) حالانکہ سرور صاحب آگاہ ہوں گے کہ مولانا مودودی اسلام کو انفرادی مذہب کی حیثیت سے نہیں پیش کرتے جس کی مجرد وعظوں سے تبلیغ کی جاتی ہو بلکہ وہ اسے نظامِ حیات کی حیثیت سے سامنے لاتے ہیں جس کی اقامت کی جدوجہد کو وہ واجب ٹھہراتے ہیں اور اس جدوجہد کا منظم ہونا بھی ضروری مانتے ہیں۔ نیز احمدیہ جماعت کے بخلاف جماعتِ اسلامی کا نظریہ کسی بھی غیر اسلامی نظام کے نیچے سازگاری کے ساتھ پڑے رہنے کا قائل نہیں ہے۔

(۴) سرور صاحب نے مولانا کو ڈیموکریسی کا مخالف قرار دیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

—"آپ نے ڈیموکریسی کو اسلام کے خلاف ٹھہرایا اور اس کے بجائے تھیوکریسی کی اصطلاح وضع کی اور اسے نظامِ اسلامی کا مرادف بتایا۔ آپ نے عوام کی مرضی پر حکومت کے بننے کو باطل ثابت کیا...... آپ سالہا سال سب کے لئے ایک ہی قانون ہونے کی مخالفت کرتے رہے" ص ۲۳۶

اس عبارت میں پہلا مغالطہ یہ ہے کہ مولانا نے "سیکولر ڈیموکریسی" اور "لادینی جمہوریت" کی ضرور مخالفت کی ہے اور پورے زور سے کی۔

---

[1] اور جن نتائج کا خدشہ ظاہر کیا گیا تھا وہ سب اب پورے ہو رہے ہیں۔

ہے، اور اس طرح کی بحثوں میں اگر کہیں مجرد "ڈیموکریسی" اور "جمہوریت" کے الفاظ استعمال کر دیتے ہیں تو ان کی مراد بہرحال اسی مغربی جمہوریت سے ہے جس میں عوام کی مرضی بدستور خدا کے بنیادی قانون کی پابند اور اسلام سے آزاد ہو۔ پھر اس کے بجائے مولانا نے "تھیوڈیموکریسی" کی اصطلاح استعمال کی ہے نہ کہ مجرد تھیوکریسی کی۔ (واضح رہے کہ مولانا نے تھیوکریسی کے خلاف بھی ویسا ہی زورِ قلم صرف کیا ہے) ہو سکتا ہے کہ یہاں سہوِ کتابت ہوا ہو۔ مولانا نے "عوام کی مرضی پر حکومت کے چلنے کو باطل" نہیں ثابت کیا بلکہ خدا کی مرضی سے آزاد اور آخری اتھارٹی بن کر کام کرنے والی مرضیٔ عوام کو خلافِ اسلام ٹھہرایا ہے۔ سب کے لئے ایک ہی قانون ہونے کی مخالفت معلوم نہیں کہاں سے ماخوذ ہے، ملکی قانون کو اسلامی نظام میں مولانا مودودی اسی طرح سب کے لئے یکساں قرار دیتے ہیں جس طرح آج بھی وہ یکساں ہوتا ہے، البتہ وہ مختلف مذاہب کے لئے پرسنل لا کے الگ الگ ہونے کی گنجائش مانتے ہیں ...... اور یہ گنجائش بھی اس وقت عملاً موجود ہے۔

(۵) اسی سلسلے میں سرور صاحب نے یہ عجیب تاثر پیدا کیا ہے کہ تحقیقاتی عدالت میں اپنی جان بچانے کے لئے مودودی صاحب نے پہلی بار حکومت کی ظل الٰہی پر ایمان رکھنے سے انکار کیا۔ حالانکہ "اسلام کا نظریۂ سیاسی" جو کئی برس پہلے لکھا گیا تھا اس میں یہ انکار صراحت سے موجود ہے اور بعد میں بھی بار بار اس مدعا کی وضاحت کی جاتی رہی ہے۔ اسی طرح وہ فرماتے ہیں کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا نے جمہوریت کی قدروں کو اہمیت دی، حالانکہ ترجمان القرآن اور دوسرے جماعتی جرائد کے فائل اور متعدد کتابیں اور پمفلٹ اس کی تردید کے لئے موجود ہیں۔

(۶) جماعتِ اسلامی کے اجتماعِ عام ۱۹۵۱ء میں مولانا نے ایک تقریر "ہمارے داخلی و خارجی مسائل" کے عنوان سے کی اور اس میں بہت سارے قومی و بین الاقوامی معاملات سامعین کے سامنے رکھے۔ ۱۱ نومبر کو ایک دوسری جامع تقریر "مسلمانوں کا ماضی و حال اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل" — میں مختلف مسائل کا حل پیش کیا۔ پہلی تقریر میں سے سرور صاحب نے ایک جزء کاٹ کر نکالا ہے جس میں مولانا نے "خرابی کا دوسرا سبب" یعنی عوام کی جہالت کو پیش کیا۔ عجیب ہنرمندی ہے کہ دوسری تقریر کے ایک غیر متعلق اقتباس کو اس جزء کا حل اور جواب بنا کر پیش کر رہا ہے۔ اس اقتباس میں اتنی بات قاری کے سامنے آتی ہے کہ جماعتِ اسلامی کا پروگرام اختیار کردہ جو پورے اسلامی نظام کو قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ صریحاً ایک مفسدانہ حرکت ہے۔

بے شمار مثالوں میں سے ان دو چار کو ہم نے بطورِ نمونہ قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ سرور صاحب کا ایسے موقع پر اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنی ایک معصومانہ سی شان برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کسی کو شبہ نہیں ہوتا کہ انہوں نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہو گی۔ یہ شخص پہلے پروفیسر اور پھر صحافی رہا وہ سطحی لوگوں کی طرح مغالطے نہیں دیتا، بلکہ وہ غیر جانبداری کی دھاک بھی باندھے رکھتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ سرور صاحب نے اقتباسات کو انتخاب کرنے اور ان کو جوڑنے میں بہت زیادہ کاوش کی ہے۔ ہم اس کاوش کی داد ان کی خدمت میں پیش کرنا دوستانہ بے تکلفی کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ (باقی - باقی)

یارانِ حلقہ

(۱)

مکرم و محترم! اپریل کے "چراغ راہ" میں برادر عزیز ابن فرید کا مقالہ "منٹو کا فن شخصیت کے آئینہ میں" پڑھا — ابن فرید صاحب نے ایک جگہ شفیق الرحمٰن کے متعلق لکھا ہے — "شفیق الرحمٰن بھی رومانی کہانیاں لکھنے کے لئے مجبور ہیں اور حوالہ کے لئے محمد خالد اختر صاحب کا تحریر کیا ہوا "شفیق الرحمٰن" دیا ہے —

شفیق الرحمٰن صاحب ہارون آباد کے رہنے والے ہیں۔ فوجی ملازمت کے سلسلے میں راولپنڈی میں مقیم ہیں — پچھلے دنوں موصوف یہاں آئے تو میں نے انٹرویو لیا تھا — اور اب یہ حاضر خدمت ہے — میں نے اس انٹرویو سے جو اندازہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ "ترقی پسند" خود اپنے لوگوں کی روش سے مطمئن نہیں ہیں — عزیز احمد نے "دھوال" پر جو تبصرہ کیا ہے — وہ میرے نظریہ کو تقویت دیتا ہے — اور پھر — منٹو مرحوم کو "ترقی پسندوں" نے رجعت پسند قرار دیا — کسی کے متعلق اچھے برے خیالات کا اظہار کر دینا بڑا آسان معاملہ ہے — اور خود اپنے ہی لفظوں کی پیروی بڑی مشکل — عزیز احمد صاحب کی کتاب "ہوس" میں نے پڑھی ہے — عریانی تو عریانی رہی البتہ پردے کے موضوع پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کم از کم انہی کا حصہ ہے — اگر عزیز احمد صاحب منٹو مرحوم پر لکھنے سے پہلے یا اب بھی اپنی کتاب "رقص ناتمام" پڑھ لیں تو انہیں اپنی تحریر کا اندازہ ہو جائے گا — فقط والسلام

(محمد مرتضیٰ۔ سکھیرا)

(۲)

محترمی السلام علیکم۔ آپ کا لفافہ مجھے اس حال میں ملا کہ میری آنکھوں میں سخت تکلیف تھی۔ ہنوز اس قابل نہیں ہوں کہ لکھنے پڑھنے کا کام کر سکوں بہت سی ڈاک جمع ہو چکی تھی اس لئے یہ مناسب سمجھا کہ کسی دوست سے ان خطوط کے جوابات دلوا دیئے جائیں۔ آپ کے مشورے[1] بہر حال بہت قیمتی ہیں۔ جہاں تک "پر"[2] کا سوال ہے میں نے بھی اسے محسوس کیا تھا۔ لیکن اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے مجھے یہاں "پر" سے زیادہ خوبصورت لفظ نظر نہیں آیا۔ مصرعہ کی بناوٹ بدلی جا سکتی تھی لیکن اس طرح اس کی خوبصورتی پر ضرب پڑتی تھی اس لئے یہ سمجھ کر کہ بعض مقامات پر شاعر مجبور ہو جاتا ہے اسے باقی رہنے دیا اور ناقدین میں کم از کم اتنا لوچ تو ہونا چاہیئے کہ جہاں پر شاعر مجبور ہو وہاں پر اس کے ساتھ ہمدردی برتنی چاہیئے۔

[1] شاد صاحب کے قلم سے جو رباعیات و قطعات گذشتہ شمارے میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں چند مواقع ایسے تھے جن میں تبدیلی کرنے کے لئے مشورے بھی کئے گئے تھے۔ یہ خط انہی مشوروں کے جواب میں موصول ہوا۔ افادہ عام کے لئے اسے شائع کیا جا رہا ہے (ا ن ص)

[2] مصرعہ تھا محمد کی ذات پر انکار سے اقرار آساں ہے۔ (چراغ راہ)

یہ بات تو قریب قریب میرے تمام ساتھی اور میرے بعد ادب میں آنے والے تسلیم کرتے ہیں کہ میں فن کا احترام کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا لیکن پھر کہیں کہیں اگر ضرورتاً تھوڑی سی بغاوت کرنا پڑے اور وہ اسلوب و بیان کے منافی بھی نہ ہو تو میں بخل بھی نہیں برتتا۔ اب رہا "منبجان بنوطیت" کا معاملہ۔ جاننے کی بات ہے کہ میں یہاں "بتبان بنوطیت" رکھ سکتا تھا لیکن اس میں استلذاذ یا شکل پیدو قسمی نہیں پڑتی تھی اس لئے میں نے اس کو نظم کرتے وقت خاص طریقے سے پیش نظر رکھا لیکن جب "منبجان" کی ترکیب پر کانوں نے میرا ساتھ نہیں دیا تو میں نے اساتذہ پر نظر ڈالی (یہی میرا طریقہ بھی ہے) تو سب سے پہلے میری نظر "خاصان خدا"[1] کے اکثر و بیشتر استعمال کی طرف گئی اور اس کے ساتھ ہی فراق کا "خاصگان مائی" پایا گیا۔ چنانچہ میں نے "خاصان خدا" اور "خاصگان مائی" کی موجودگی میں اس کا استعمال جائز سمجھا اور یوں بھی کسی اسم ترکیبی کے کسی جزو کو الگ کر کے اس میں معنی پہنانا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا جیسے غضنفر علی خان سے غضن الگ کر کے یہ دیکھنا کہ فرعلی خان کا کیا مطلب ہوتا ہے کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ "منبجان بنوطیت" میں جو روانی ہے وہ "منبجگان بنوطیت" میں نہیں پائی جاتی۔

اب رہا چلو کا سوال۔ آپ نے جہاں تک سمجھا واقعی قابل داد ہے لیکن میں نے "چلو"[2] "سہی" کے معنی میں ہی استعمال کیا ہے۔

---

[1] "خاصان" جمع ہے "خاص" کی اور "خاصگان" جمع ہے "خاصہ" کی۔ "خاصہ" بمعنی "خاص" بلکہ "اخص" استعمال ہوتا ہے۔ اس کی دلیل حالی کے ہاں سے لیجئے: "اے خاصۂ خاصان رسل" ... وہ الفاظ جو اس طرح "ہ" پر ختم ہوتے ہیں ان کی جمع فارسی میں محض "ان" لگانے سے نہیں آتی۔ ان کی "ہ" "گ" سے بدل جاتی ہے اور پھر "ان" لگتا ہے۔ مثلاً "بندہ" سے "بندگان"، "افتادہ" سے "افتادگان"، "شاہزادہ" سے "شاہزادگان"، "گزشتہ" سے "گزشتگان"، "تشنہ" سے "تشنگان"، "جنوں زدہ" سے "جنوں زدگان"۔ اسی اصول پر "ہیچ" سے "ہیچگان" بھی کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ "ہیچان" کے استعمال کی کوئی نادر مثال بھی مل سکے گی۔ (ا۔ ص)

[2] "چلو" کا لفظ اردو میں کئی کئی مفہوم دیتا ہے۔ عملی استعمال کے لحاظ سے کہیں یہ ترغیب کے لئے، کہیں قبول و تائید کے لئے اور کہیں دوسرے مقاصد کے لئے آتا ہے۔ لیکن یہاں یہ کلمہ ایک جذبۂ ایثار کا ترجمان ہے۔ اس کے بولنے سے متکلم کا بحث و کشمکش سے گریز واضح ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اس میں بڑی ملائمت آ جاتی ہے یعنی یہ کہ یہ ایک طرح کا اظہار اطاعت و باعث ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے متکلم مخاطب کو کوئی زیادتی یا بے انصافی کرنے یا کسی فائدہ کے حاصل کرنے کا موقع بخوشی دے دیتا ہے۔ دوسری طرف "سہی" بنیادی طور پر حرف تحمل و برداشت ہے۔ مگر اس میں بالعموم ایک روح شکوہ کا فرما رہتی ہے یا کسی حد تک بے بسی و بے چارگی کا اظہار ہوتا ہے۔ "چلو" اور "سہی" کو جب جمع کر دیا جاتا ہے تو روح شکوہ دب جاتی ہے اور جذبۂ ایثار نمایاں تر ہو جاتا ہے۔ یعنی متکلم محض بے بس ہو کر نہیں بلکہ قربانی سے کام لے کر مخاطب کے حق میں کسی اقدام کا راستہ خود کھول دیتا ہے۔ "چلو" کے بجائے ذرا سے فرق کے ساتھ "اچھا" بھی ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے جیسے "اچھا یوں ہی سہی!"

"سہی" کا استعمال پیش نظر پیرایہ میں ہے۔ مگر "چلو" کا استعمال کبھی تو اپنے طور کسی مستقل فعل کو ... مثلاً "چلو بھئے" ... "چلو دل کا غبار نکال" "چلو چھوڑو" "چلو جانے دو" "چلو جا بھی جاؤ" کبھی اس کے ساتھ کوئی حرف کھول دو اعتراف ... مثلاً "چلو بھئی" "چلو تسلیم" ... [illegible] ... کر کسی [illegible] کے ترغیب کے [illegible]

چنانچہ آپ یہ مصرعے یوں بھی پڑھ سکتے ہیں: میرے حصے میں رنج و غم ہی سہی چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ یہاں میں نے چلو سہی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ادھر یہ بھی کہتے ہیں چلو چھوڑو۔ چلو رہنے دو، یہ بھی کچھ میری موافقت میں آتے ہیں۔ پھر بھی آپ اگر فرمائیں تو میں ان متنازعہ فیہ الفاظ کو نکال سکتا ہوں مگر یہ طے ہے کہ اشعار کی برجستگی فنا ہو جائے گی۔

رسالہ کے میرے نام جاری کئے جانے کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کے لئے ممنون ہوں۔ امید کہ خیریت سے ہوں گے اپنی خیریت اور جواب سے مطلع کیجئے گا۔

(شاد عارفی)

(۴)

ابھی چند گھنٹوں پہلے "چراغِ راہ" کا تیا شمارہ ملا ہے۔ میں نے اس کی تقریباً تمام اہم چیزیں پڑھ لی ہیں — اچھا کی مرتبہ پورے شمارے پر ایک بلند ادبیت چھائی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے "چراغِ راہ" کا مجموعی تاثر ادبی سے زیادہ سیاسی اور معاشرتی رہا کرتا تھا۔ اگر آپ اپنے چراغ کی لَو یہی رکھیں تو بڑے قابل قدر ادبی اضافوں کی توقع ہے۔ ابن فرید کا مقالہ منٹو کا فن شخصیت کے آئینہ میں مجھے کچھ زیادہ اپیل نہ کر سکا — اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کسی واضح اور نئے نقطہ نظر سے منٹو کا مطالعہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ انہیں چیزوں کا اعادہ کیا گیا ہے جو منٹو کے بارے میں کہی یا لکھی جا چکی ہیں۔ مجھے پورا مقالہ "مجموعہ اقتباسات" معلوم ہوتا ہے۔ ہاں مقالہ نگار کی قوت ترتیب کی ضرور داد دوں گا۔ اشاریت کے موضوع پر شبنم سبحانی کا مقالہ قابل مطالعہ ضرور ہے مگر اس میں اکثر جگہوں پر شبنم نے استدلال سے زیادہ جذبات سے کام لیا ہے۔ تنقید میں علیحدگی اور بلند فکر سنجیدگی (HIGHER SERIOUSNESS) کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں جج کی طرح صرف فیصلہ صادر نہیں کیا جاتا بلکہ کیوں اور کیسے بھی بتانا ہوتا ہے۔ شبنم سبحانی نے تعمیری غزل میں اشاریت کے موضوع کے ساتھ انصاف بھی نہیں کیا ہے۔ انہیں اس دور میں تمام کی تمام اشاریت صرف فیض اور مجروح کے یہاں نظر آئی، کوئی تعمیر پسند غزل گو انہیں ایسا نظر نہیں آیا جس نے اردو غزل کے ملازمی اشاروں کو فنکارانہ چابک دستی سے استعمال کیا ہو۔ انہوں نے تعمیر پسندوں میں اشاریت پسندوں کے جو گروپ قائم کئے ہیں وہ میرے خیال میں بالکل غلط ہیں — افتخار اعظمی اور اکبر زمزم کی تعمیری غزل گوئی میں کچھ بھی اہمیت نہیں ہے — اور جہاں تک عمران انصاری کی شاعری کا تعلق ہے وہ تو راست اندازی اور مجرد انقلابیت کے قائل ہیں۔ انہیں کٹر اشاریت پسندوں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۴) نگارشات میں دہلی نہ ملے گی کہ یہ کلمہ "سہی" کو اپنے ساتھ نہ لے۔ نہ اس کی کوئی نظیر موجود ہے کہ محاورہ در روزمرہ میں سے خاص اندازسے استعمال ہونے والے کسی حرف کو محذوف رکھا گیا ہو۔ کوئی فقرہ جو "چلو سہی" سے ملتا ہو، اردو زبان کے دفتروں میں ایسا نہ ملے گا جس میں چلو تو اپنی جگہ پر رہے۔ اور "سہی" کی جگہ خالی رکھی جا سکے۔ مثلاً

چلو میرے لئے دال ہی!
چلو آج رات فاقہ ہی!
چلو میرے حصے میں رنج و غم ہی!

یہ فقرے ناقص اور بے معنی ہیں۔ سہی کے ساتھ یا تو فعل آنے چاہئیں (مثلاً علی الترتیب پکا لو، کر لیتے ہیں، رہنے دو وغیرہ) یا پھر حرف "سہی" کا استعمال۔ اگر یہ ہے تو ممکن ہے کہ چلو اپنی جگہ پر رہنے کے ساتھ ساتھ "سہی" کے خلا کو نہیں بھر سکتا۔ یہ میرا نقطۂ نظر بہر حال میرے ناقص مطالعہ پر مبنی ہے اگر کوئی کوتاہی فہم ہو گئی ہو تو میں اپنے دلائل کو قبول کرنے کے لیے بصد صدق تیار ہوں۔ یہ بھی تسلیم کہ زبان کے معاملے میں میرا قول حسند نہیں ہو سکتا۔

کے ساتھ رکھنا میرے خیال میں کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ ابو البیان حماد کو بھی شبنم نے غزل گو شاعر بتایا ہے ——— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں جب وہ تو ایک بندھے ٹکے انداز میں نظمیں لکھتے ہیں۔ ایک آدھ غزل لکھ لینے سے تو کوئی غزل گو نہیں ہو جاتا ——— اب کی مرتبہ عبد اللہ خاور اور آپ کی غزلیں پسند آئیں۔ خاور صاحب کی غزل میں ایک جان گداز داخلیت ہے۔ آپ کی غزل میں طاؤس و رباب اور شمشیر و سنان کا امتزاج ہے۔ آج کل مجھ پر پاکستان کے آئینی انقلاب کا بڑا اثر ہے۔ اسلام کی بیداری اور تجدید میرے خاص موضوع بن گئے ہیں ——— ادھر جو کچھ لکھ رہا ہوں سب میں یہی تاثر ہے۔ ایک نظم "رقص حیات" اور تین غزلیں بھیج رہا ہوں۔ آپ کی رائے کا طالب ہوں۔ آپ کے مشوروں سے مجھے بہت فائدہ پہنچا ہے۔

(انور صدیقی)

بقیہ: آپ کیا پڑھیں ——؟

کچھ اور منصب تھا، جو کچھ قصبی ہیرا پھیریاں پچھلے دنوں ایک غلط جذبے کے تحت تحریک اسلامی کے خلاف کی ہیں ان کو پوری عالمانہ شان سے ماہنامہ تجلی نے بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان شماروں میں مختلف مسائل پر بڑی وسیع ریسرچ پیش کی گئی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس سلسلے کے مضامین سستے کتابی مجموعے میں آ جائیں۔

ایک مشورہ ہماری طرف سے نوجوان مدیران تجلی کی خدمت میں یہ ہے کہ وہ جس حلقے کے بزرگوں کو خطاب کر رہے ہیں، ان کے ذوق کا خاص لحاظ رکھتے ہوئے زبان کو ذرا اور نرم اور انداز بیان کو ذرا اور ثقہ بنائیں۔

تجلی عامر عثمانی اور [ ] عثمانی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپے ہے اور ایک پرچہ ۸ آنے میں ملتا ہے۔ پتہ: ماہنامہ تجلی دیوبند یوپی انڈیا۔

اداره

آپ کیا پڑھیں؟

اس مرتبہ کا شمارہ مقررہ نقشہ ترتیب سے ہٹا ہوا ہے۔ زیادہ تر اوراق دو ہی مضامین نے لے لئے، اس وجہ سے بہت سے کتابت شدہ صفحات روک لینے پڑے۔ کتابوں اور رسالوں کے تعارف کے لئے بھی ضرورت کے مطابق جگہ نہیں نکل سکی، بمشکل دو جرائد کے بارے میں چند سطریں لکھی جا رہی ہیں

ماہنامہ تعمیرِ انسانیت کا تعارف تو آپ کو پہلے سے ہے، بلکہ معاملہ "زغاصگانِ مائی" کا ہے۔ اس جریدہ کی شان یہ ہے کہ یہ عام طور پر خاص نمبر شائع کرتا ہے، کبھی کبھار کوئی عام شمارہ بھی سامنے آجاتا ہے، جیسے دوسرے جرائد کے خاص نمبر! چنانچہ اس وقت "سالنامہ" ہمارے سامنے ہے۔ بڑے ٹھاٹھ کا رنگین سرورق ہے۔ بیشتر اچھے لکھنے والے اس کی ترتیب میں حصہ دار ہیں مقالات، نظمیں، غزلیں، ڈرامے، افسانے شانِ تنوع کے ساتھ لائے گئے ہیں۔ افسانوں کو خاص توجہ سے دیکھا کیونکہ اس میدان میں کام کی رفتار اطمینان بخش نہیں لیکن اس خاص نمبر کے افسانوں نے امید بڑھا دی ہے۔ لالہ صحرائی کے کلپاش قلم نے "سنجوگ" کے زیرِ عنوان ہمارے ایک خاص طبقے کی زندگی سے حقیقت کا ایک بڑا ہی تاریک پہلو اخذ کر کے جوں کا توں ہمارے سامنے آراستہ کر دیا۔ فنی لحاظ سے یہ افسانہ صفِ اول کی چیز ہے اور دو چار مقامات تو اس میں ایسے آتے ہیں جہاں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ صحرائی نے ادب کو کچھ متاعِ نو دی ہے۔ مقصد کے لحاظ سے دیکھیں تو بھی یہ نگارش ایک اچھی مثال ثابت ہوئی ہے۔ لیکن موضوع ایسا ہے کہ عریانی سے بچ بچا کر نکلنے کے باوجود کچھ ناگوار چیزوں کو لائے بغیر فنی تقاضے پورے نہیں ہوتے "حقیقت نگاری" کی یہ خاص مجبوریاں ہیں۔ ہمارے بالائی طبقے کی زندگی دراصل ایک ایسے بیت الخلاء کی طرح کی ہے جو کسی سہ منزلہ عمارت کی چوٹی پر بنایا گیا ہو۔ یعنی دور سے دیکھو تو سب سے بالا، قریب جاؤ تو بد بو آئے۔ معاشرے کے اس بیت الخلاء کی حقیقت نگاری کی جائے گی تو ایک مسلم ذہن کی نفاستِ ذوق کی چیز نہیں! کہانی کا خاتمہ بڑا جذباتی ہے — ایک نفسیاتی انقلاب کا آئینہ دار — اس مصرع کی عملی تصویر —:

"جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا"

میرزا ادیب کے افسانے "مجو" نے بھی تبصرہ نگار کو بہت متاثر کیا۔ اس میں مذہب کا رنگ اختیار کئے بغیر خالص انسانی سطح پر فطرت کی روشنی میں ایک کردار کا مطالعہ کیا گیا ہے، مگر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ روحِ اسلامیت اس میں آکر جذب

بھی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ انسانیت — اور خلوص اور تہذیب یافتہ انسانیت — کا دوسرا نام اسلام ہے۔ ضروری نہیں کہ میرزا ادیب نے شعوری طور پر اسلامی نظریۂ اخلاق و گناہ کو سامنے رکھا ہو۔ مگر ان کا نتیجۂ کاوش دین فطرت سے ہم آہنگ ہے۔

"گیارہ آدمی ایک جزیرہ میں" ابن فرید نے تیسری ہی کی اونچی کگروں کو چھو دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ قرآن کی کشتی والی مثال کے اجمال کو تفصیل کا رنگ دیتے ہوئے گیارہ متنوع انسانی کرداروں کے واسطے سے پوری اولاد آدم کا مطالعہ کرا دیا ہے۔ یہ کہانی بالواسطہ فنی انداز سے بتاتی ہے کہ خاکی مخلوق کی نجات نہ اربابِ اقتدار کے ہاتھوں میں ہے، نہ سرمایہ داروں کے بس میں، نہ رومان زدہ ذہنیتوں پر منحصر اور نہ آرٹسٹوں کے امکان میں — بلکہ صرف اخلاقی ذمہ داری کا احساس رکھنے والے کرداروں سے خیر و فلاح کی کچھ امید کی جا سکتی ہے۔ "کشادہ پیشانی والا نوجوان گویا ابن فرید کا انسانِ مطلوب ہے یہ کہانی گویا آج کی دنیا اور آج کے تمدن کی کہانی ہے۔ یہ تمدن گویا طوفان میں گھری ہوئی ایک کشتی ہے جو اپنے مسافروں کو تیرانے کے قابل نہیں رہی اور اس کے ملاح جواب دے رہے ہیں۔ سامنے ایک ریت کا تودہ ہے — ایک عالم بے چارگی — اور اس کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہیں۔ کسی روشن مستقبل کا ساحل ناپید ہے اور اس تک لے جانے والا وسیلہ کوئی نہیں۔ اس عالم بے چارگی میں اقتدار، سرمائے اور آرٹ میں سے کوئی چیز بھی انسان کی دستگیری نہیں کر سکتی، وہ محتاج ہے خدا پر یقین رکھنے والے کسی پیکرِ محبت و ایثار کا — وہ پیکر تنہا سب کو دلاسا دیتا ہے، سب کی مدد کرتا ہے، سب کے عزم کو زندہ رکھتا ہے" یہاں تک کہ ایک کشتی نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ ہے کہانی کا بلند معیار مقصدی پہلو۔ فنی لحاظ سے بھی کہیں ناپختگی یا سطحیت کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ بہت کامیاب نگارش ہے۔

اسعد گیلانی نے "پردہ" کے پیچھے نئے حقائق دکھائے ہیں۔ ایک نوجوان کی متلاشی نگاہ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے چلی جاتی ہے اور وہ ایک اجلا چہرہ دیکھ کر پہلا اثر وہی لیتی ہے جو اس طرح کے گھرے ہوئے معاشرہ میں بالعموم اوسط درجے کے تمام نوجوانوں کی تعمیری صلاحیتوں کو غارت کرتا رہا ہے مگر آگے چل کر اسی پردے کے پیچھے کی دوسری حقیقتیں سامنے آتی ہیں تو ایک نیا تعمیری ردعمل پیدا ہوتا ہے جس میں اصل فطرتِ انسانی اپنے روپ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے ضمناً یہ دردناک صورتِ حالات سامنے آتی ہے کہ ہمارے ہاں علمی، ادبی اور سیاسی عظمت رکھنے والی ہستیاں کیسے ناسازگار حالات میں اپنے دن کاٹتی ہیں۔ اسعد گیلانی نے حسبِ معمول سیاست کا دامن یہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، وہ ایک ہال میں لے جا کر ہمیں کہانی کے ایک فرد کی تقریر سناتے ہیں، اور اس تقریر میں حالات پر تنقید بھی ہے اور عوام کے لئے پیغام بھی — مگر کوئی بے جوڑ پن پیدا نہیں ہوا۔

"دھماکے" میں سید نظر زیدی بھی موجودہ عالمگیر تاریخی گرداب سے انسانیت کی نجات کا مسئلہ لے کر نمودار ہوئے ہیں اور وہ ایٹمی دور کے تخریبی امکانات کا تصور دلا کر ہر فردِ بشر کو چوکنا کرنا چاہتے ہیں۔ سید نظر زیدی کے فن کا مرکزی مسئلہ یہی ہے اور وہ مختلف اسالیب سے اسے لے رہے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔

محمد وارث کامل بی اے کے قلم سے بولتے نقوش ایک عجیب اور کاری طنز ہے ان اصلاح دشمن اور مخالف تعمیر عناصر کے لئے جو معاصرانہ تنگ نظری، حسد اور تعصب کے جذبے کو گالیوں اور تکفیر کے فتووں میں ڈھال کر ہر اس شخص کے درپے ہوجاتے ہیں جو حق کا علم بلند کرتا ہے۔ کامل صاحب ایک خواب میں اسلامی تاریخ کی بزرگ ترین ہستیوں کو سامنے لاتے ہیں اور خود ان کی زبان سے ان زیادتیوں کی داستان سناتے ہیں جو خود بعض مسلمانوں نے ان کے ساتھ روا رکھیں۔ انہوں نے اپنے اس خواب کے آئینے میں درحقیقت اپنے دور کی مخفی طاقتوں کو ان کا روئے زیبا دکھانا چاہا ہے۔ مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ دوسرے بزرگان دین سے پہلے وہ انبیاء علیہم السلام ـــ خصوصاً حضرت سیدنا ختم المرسلین ـــ کی دردناک سرگزشت پیش کر دیتے کہ اس مقدس ترین ہستیوں کا خیر مقدم بگڑے ہوئے ارباب مذہب نے کس طرح کیا۔

بقیہ کہانیاں نہیں دیکھی جا سکیں۔

بہ حیثیت مجموعی یہ نمبر کامیاب ہے۔ گر تعمیر انسانیت کا یہ رجحان کہ تنوع کے لئے مختلف حلقوں سے نگارشات جمع کی جائیں اگر اس حد تک رکا رہے کہ دوسروں کے ہاں سے جو کچھ کہ اپنے نظریہ و مقصد کے مطابق ملے وہ لے لیا جائے تب تو خیر، ورنہ اگر معاملہ اور آگے بڑھا اور نظریہ و مقصد کی تمیز آہستہ آہستہ ختم ہو گئی تو یہ ایک افسوس ناک حادثہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رجحان حلقہ ادب اسلامی کی کمزوری نے پیدا کیا ہے اور اس کا سدباب جبھی ہو سکتا ہے کہ لوگ فی الواقع کچھ کام کریں۔

ہاں کتابت کی غلطیاں اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی معذرت ان کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً میں نے اپنے مقالے میں بہت سارے نشانات لگائے ہیں۔ خاص نمبر نکالتے ہوئے تصحیح کا خاص اہتمام کرنا چاہئے تھا۔

”تعمیر انسانیت“ اور اس کے سالنامے کے مرتب کوثر نیازی اور عبدالحمید شیخ ہیں۔ سالنامہ کی قیمت دو روپے ہے۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔ دفتر تعمیر انسانیت موچی دروازہ، لاہور سے طلب فرمائیں۔

ادھر ماہنامہ ”تجلی“ دیوبند کے تین شمارے (اپریل، مئی، جون) نظر سے گزرے ہیں۔ پہلے بھی کبھی کبھار یہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اس میں بعض اصحاب کے بقول اس حلقے کی مخصوص شانِ فقاہت نہ سہی جس سے اس کا تعلق ہے لیکن حق گوئی کی جرأت کے لحاظ سے اس نے سلف کی وہ تابندہ روایات عملاً از سرِ نو قائم کر دی ہے، جو بدقسمتی سے مذہبی حلقوں میں آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہے۔ یہ رسالہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتب فکر کا ترجمان ہے۔

جماعت اسلامی کے خلاف بعض حلقوں کی طرف سے علم دین کو جس گھٹیا طریق سے استعمال کیا جا رہا ہے اس پر اس مجلہ کے نوجوان مدیر نے بڑی غیرت محسوس کی ہے اور ادھر کوئی جماعتی و تنظیمی علاقہ نہ رکھنے کے باوجود محض جذبہ منصفت شعاری کے تحت بہت سے لوگوں کو ناخوش کر کے صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہا ہے۔ خصوصاً بزرگان دیوبند نے جن کے شایانِ شان

(باقی بر صفحہ ۴۸)

آزما کر اطمینان کر لیجئے



بناول

کھانا پکانے کا بہترین روغن ہے

لذیذ

صحت بخش

خوشگوار

ہاتھوں سے چھوئے بغیر تیار کیا جاتا ہے

بنولے کی قوت بخش خصوصیات مدت سے مسلم ہیں
اس کا روغن توانائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ مانا گیا ہے۔
صحیح اصولوں کے مطابق تیار کیا ہوا بنولے کا روغن صحت
کے لئے مفید ترین اور بے ضرر چکنائی کا کام دیتا ہے۔



ہمارا تیار کردہ "بناول" (بنولے کا پاک صاف روغن)
ایک معیاری پیداوار ہے۔ جدید اصولوں کے مطابق بنایا ہوا
یہ روغن ملک بھر میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے

۳۵ پاؤنڈ۔ ۱۰ پاؤنڈ اور ۵ پاؤنڈ کے مہر بند ڈبوں میں ملتا ہے

بنگال آئل ملز لمیٹڈ بنگال [illegible] کراچی [illegible]

★ ایک گروہ ملت کی فلاح [illegible] سمجھتا ہے
★ دوسرا گروہ ملت کی فلاح اسلام کی پیروی میں سمجھتا ہے

---ہمارے ملک میں اس وقت الحاد اور اسلام [illegible] کشمکش جاری ہے۔

---"ملا" اور "مذہبی حکومت" کو ہوا بنا کر [illegible] سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے



لیکن اصل حقیقت کیا ہے

★ اسلام کیسی حکومت پیش کرتا ہے ؟
★ "مذہبی حکومت (تھیا کریسی) کیا ہوتی ہے ؟
★ اسلام اور تھیا کریسی میں کیا فرق ہے ؟
★ اسلام کیوں نام نہاد "مذہبی حکومت" پیش نہیں کرتا ؟

الحاد اور اسلام کی کشمکش کو سمجھنے کیلئے مطالعہ فرمائیں

اسلام اور تھیا کریسی

مصنفہ:— پروفیسر عبدالحمید صدیقی ایم اے

صفحات : ۱۵۸ قیمت :— ۲ روپے

تحریک اسلامی کا لٹریچر ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ایک ناواقف کو پوری بات مختصر سے الفاظ میں سمجھانے کے لئے اب تک کوئی ایسی گائیڈ بک نہ تھی جو اس کے سامنے تھوڑے سے وقت میں تحریک کا پورا نقشہ پیش کر دے۔

اسعد گیلانی

نے تحریک اسلامی کے کارکنوں کی انہی مشکلات کو سامنے رکھ کر پورے لٹریچر کا ایک ملخص تیار کیا ہے۔ اسے پڑھ کر پوری تحریک کو جاننے اور اس کے لٹریچر کو پڑھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہوتا ہے۔

سمندر کوزے میں دریا حباب میں

تحریک اسلامی

"اپنے لٹریچر کے آئینے میں"

مرتبہ : اسعد گیلانی قیمت :- ایک روپیہ آٹھ آنے

مکتبہ چراغ راہ [illegible] کراچی

[illegible] McLeod Road, Karachi
[illegible] oh Road, Karachi





سوچ بچار

ادارہ

عائلی کمیشن اور اس کی رپورٹ

ہمارا موجودہ نظام زندگی ہر پہلو سے اصلاح طلب ہے۔ دوسرے شعبوں کی طرح ازدواجی اور خاندانی زندگی کا شعبہ بھی حد درجہ فساد زدہ ہے۔ اجتماعی و تمدنی زندگی کے اس مرکزی شعبہ کی اصلاح پر معاشی اور اخلاقی ترقی کا دار و مدار ہے۔

ازدواجی اور خاندانی زندگی کے فساد سے یوں تو مرد اور عورت دونوں ہی شدید طور پر متاثر ہیں۔ اور نہ شوہر کے لئے اس میں امن ہے، نہ بیوی کے لئے سلامتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ مظلوم اور قابلِ رحم ہے۔

آزادی حاصل کرنے کا مصرف ہی یہی ہے کہ ظلم و فساد سے زندگی کو پاک کیا جائے اور ہر طبقے اور صنف اور فرد کو اس کے حقوق بہم پہنچائے جائیں اور اس کو ان فرائض کی ادائی کے لئے تیار کیا جائے جو فطرت اور عقل، دین اور معاشرتی مفاد کے تقاضے سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔

ایک اسلامی دستور اختیار کرنے کے بعد تعمیر و اصلاح کے خطوط معین ہو جاتے ہیں۔ خدا کو اپنا حاکم اور قانون ساز اور کتاب و سنت کو سرچشمۂ ہدایت مان کر ہم نے طے کر دیا ہے کہ ہمیں تبدیلی پیدا کرنی ہے اور اسلامی نہج پر کرنی ہے۔

پچھلے دنوں جو میرج کمیشن قائم ہوا تھا اس کا تقرر اس لحاظ سے خوش آئند تھا کہ بہرحال ہمارے اندر تعمیر و اصلاح کے لئے ذہنی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن اس کمیشن کا قیام جس واقعاتی پس منظر میں ہوا اس کی وجہ سے اس کے معتمد علیہ ہونے کی پوزیشن دھندلا گئی ہے۔ سابق وزیر اعظم محمد علی بوگرا کی دوسری شادی پر "اپوا" کی طرف سے جو شور و شرابہ ہوا اس کے ردِ عمل کے طور پر اس کمیشن کا قیام عمل میں آیا اور اس کے حدودِ کار اور اس کے ارکان مقرر کرنے وقت زیادہ تر اپواہی کے ذہن کو ملحوظ رکھا گیا۔ گویا یہ ایک ردِ عملی اقدام تھا، نہ کہ اثباتی!

ہمارے اندر اس وقت ذہنی لحاظ سے سہ گونہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ ایک مغرب زدہ طبقہ ہے جو ان شئون و اطوار پہ ریجھ گیا ہے جو اسے امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں دکھائی دیتے ہیں اور جو کچھ ان سے مختلف ہے وہ اس کے لئے وجہ ندامت ہے اور وہ اس بات کے لئے بے چین ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو اپنے سارے نظام زندگی — خصوصاً خاندانی و ازدواجی نظام — کو فرنگی فکر و تمدن کے سانچے میں ڈھال دے اور پھر جا کر اپنے خداوندانِ ازل کی خدمت میں فرشی سلام کر کے عرض کرے کہ حضور، دیکھئے ہم نے

آپ کی تعالیٰ کا حق ادا کر کے بالآخر ترقی کی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کر ہی لیا۔ یہ طبقہ ایک طرف کلچر اور آرٹ کے نام سے مغربی تمدن کی ساری بیہودگیاں اپنے ہاں لا رہا ہے، دوسری طرف حیا و عصمت کے حفاظتی نظام کو توڑ رہا ہے اور تیسری طرف نکاح و طلاق کے معاملات میں وہی رنگ ڈھنگ پیدا کرنا چاہتا ہے جو سمندر پار مغربی جنت میں دکھائی دیتا ہے۔ پہلے یہ طبقہ کھلم کھلا اسلام سے بغاوت اور انحراف کا رجحان رکھتا تھا، بعد میں جب اس کی آنکھوں کے سامنے روحِ اسلامیت جاگ اٹھی اور وہ آہستہ آہستہ جمہوری و عوامی تحریک کی شکل اختیار کرتی گئی تو اس نے اپنے خیالات و مقاصد کو جوں کا توں رکھتے ہوئے اسلام کا نعرہ لگانے کا آغاز کر دیا۔ پھر جب اسلامی تحریک ملک کو ایک اسلامی دستور کی منزل تک لے آئی تو اس دن سے اس طبقے نے اپنے ہر دعوے کے لئے اسلام سے باقاعدہ استدلال کرنے کا تاویلی انداز اختیار کر لیا۔ دوسرا ہمارے ہاں جامد مذہبیت پر اعتقاد رکھنے والوں کا ایک گروہ ہے۔ یہ لوگ اجتہاد کا دروازہ بند کئے بیٹھے ہیں اور نہیں مانتے کہ آج کچھ نئے احوال اور مسائل بھی زندگی کو درپیش ہیں۔ ان کو اصرار ہے کہ قیامت تک کے ہر مسئلے کو فقہائے متقدمین حل کر گئے ہیں اور ان کے فیصلوں کو جوں کا توں نافذ کرنا چاہئے اور اب کسی کے لئے جائز نہیں کہ ان سے کسی معاملے میں اختلاف کرے۔ تیسرا ہمارے اندر وہ قیمتی عنصر ہے جو اسلام کا بھی گہرا مطالعہ رکھتا ہے اور جدید دور کے افکار و احوال کو بھی خوب سمجھتا ہے۔ اس کا اندازِ فکر یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور کتاب و سنت کے منصوص احکام کو مضبوطی سے برقرار رکھتے ہوئے اور محدثین اور ائمہ فقہا کے سرمایۂ فکر و تحقیق سے پورا پورا استفادہ کرتے ہوئے ہمیں نئے حالات میں پیش آمدہ نئے مسائل کو اجتہادی نگاہ سے حل کرنا چاہئے۔ یہ متوازن ذہن رکھنے والا عنصر نہ تو بنیادی عقیدہ و قانون سے روگردانی کرنے کو روا رکھتا ہے اور نہ سلف کی طے کردہ فقہی جزئیات کے دائرے میں محصوری کو واجب ٹھہراتا ہے۔ تعمیر و اصلاح کے آئندہ کاموں میں اصل کارآمد عنصر ہمارے پاس یہی ہے، لیکن اسی کے لئے کام کے راستے بند ہیں۔ جامد ذہن کے بزرگانِ دین اسے اپنے سکّہ بند تصورِ مذہب سے منحرف سمجھتے ہیں اور مغرب زدہ طبقہ اسے اپنے لئے جامد مذہبیت کے علمبرداروں سے زیادہ خطرناک سمجھتا ہے کیوں کہ اس کا اعتدال و توازن اور اس کے ہاں پایا جانے والا ایمان اور عقلیت کا امتزاج اسے ایک مضبوط اور موثر اور فعال طاقت بنا دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے خلاف بہت برافروختہ رہتا ہے اور ظلم یہ کہ جامد مذہبیت کی کمزوریوں کو اس کے کھاتے میں ڈال کر بلکہ کہنا چاہئے کہ دونوں کو شئے واحد قرار دے کر حملے کرتا ہے۔ اب چونکہ مغرب زدہ طبقہ ہی کا سکہ سیاسی اقتدار کے دائرے میں چلتا ہے لہذا اعتدال پسند عنصر کے لئے کام کرنے کے راستے سرکاری اداروں اور کمیشنوں میں بند ہیں۔

اس صورتِ حالات کو سامنے رکھ کر اگر میرج کمیشن کی ترکیب کا جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس آخری عنصر کی کوئی نمائندگی سرے سے کمیشن میں نہ تھی۔ عملاً جن لوگوں نے کام کیا ہے ان میں سوائے مولانا احتشام الحق کے اور کوئی بھی رکن اسلامیات میں قابلِ اعتماد حصہ تک اختیار ٹی نہیں رکھتا۔ اور وہ کمیشن کی رپورٹ سے بہرحال متفق نہیں ہیں۔ زیادہ تر اراکین بیگمات تھیں اور رپورٹ کی ترتیب گواہی دیتی ہے کہ بڑی حد تک خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا ذہن اس میں بول رہا ہے جو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی صورت

میں ایک فتنہ کے علمبردار ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ایسے معاملات میں کمیشن کی تشکیل نہایت احتیاط سے کی جانی چاہئے تھی اور اس میں شریعت اسلامی اور قانونِ مروج کے ایسے ماہرین لئے جانے چاہئیں تھے جن کی بصیرت اور جن کے ذہنی توازن اور فکری اعتدال پر قوم کو عمومی اعتماد ہوتا۔ افسوس ہے کہ کمیشن بناتے وقت قوم کے بجائے صرف اپوا کی بیگمات کو مطمئن کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایسے بے ڈھب کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں معاشرتی نظام کو اُدھیڑ ڈالنا اور اسے کوئی نئی شکل دے دینا مزید خرابیاں پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔

یہ کمیشن دستور بننے سے پہلے مقرر کیا گیا تھا، لہٰذا نئے دستور کے نفاذ سے چوں کہ زندگی کی طرح نو ڈال دی گئی ہے لہٰذا موجودہ نئے دستور کے وجود میں آنے سے اس کمیشن کی اتھارٹی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر چوں کہ نئے دستور میں قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کرنے کی دفعہ موجود ہے اور اس کی حدودِ کار میریج کمیشن کی حدودِ کار سے ٹکراتی ہیں، نیز آئندہ کے لئے اصلاحِ قانون کا ذریعہ "صرف" اسی آئندہ کے کمیشن کو قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا میریج کمیشن اور اس کا کیا کرایا سب از خود کالعدم ہو جاتا ہے۔ البتہ پروپگنڈہ کے میدان میں اس کی رپورٹ کو گولہ بارود کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے۔

بہرحال اب جب کہ رپورٹ سامنے ہے، اور اس پر ہر طبقے کی طرف سے اظہار خیال ہو رہا ہے، مفید ہوگا کہ ہم بھی اس کا جائزہ لیں

ہماری رائے یہ ہے کہ اس رپورٹ میں کم سے کم اس اصول کا تسلیم کیا جانا کہ کتاب وسنت ہی سرچشمۂ ہدایت و قانون ہے، ایک خوش آئند بات ہے۔ نیز یہ تبدیلی بھی فی نفسہٖ اچھی ہے کہ قانونی بحثوں میں قرآن و حدیث اور ائمہ فقہا کے اقوال سے استدلال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پہلو سے یہ رپورٹ ایک عام تعلیم یافتہ آدمی کے لئے جسے اسلام کے قانونی مسائل کی گہرائیوں میں جانے کا موقع نہ ملا ہو، بڑی نظر فریب بھی ہے۔

اور اس رپورٹ کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اوپر اوپر آیات، احادیث اور بزرگانِ سلف کے ارشادات کا پالش کر کے اس کے اندر مغز فکر وہی رکھا گیا ہے جو مغرب زدہ طبقہ کا ہے اور ہیر پھیر کے ساتھ نتائج ٹھیک وہی برآمد کئے گئے ہیں جو دین سے برگشتہ ذہنوں کا ہدفِ مقصود ہیں۔

گویا یہ رپورٹ ایک معصومانہ نفاق کی مظہر ہے اور اسی وجہ سے اس کا تجزیہ کرنا اور عام اور متوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے اس کے خیر و شر کو منقح کرنا آسان کام نہیں ہے۔

اس رپورٹ میں چونکہ بعض واقعی مظالم اور مفاسد کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن کا ردِعمل ہر کسی کے دل میں ایک جذباتی تحریک پیدا کر دیتا ہے لہٰذا کمیشن کے لئے دلوں کے دروازے کھل جاتے ہیں، لیکن ان مظالم و مفاسد کے ازالے کے لئے جو قانونی حل پیش کئے گئے

ہیں ان کی خرابیوں اور کمزوریوں کو بغیر تفصیلی بحثوں کے سمجھا نہیں جا سکتا، لہٰذا عام لوگ "سب اچھا" کہہ کر رہ جاتے ہیں۔

اس رپورٹ میں ازدواجی اور خاندانی زندگی کے مفاسد کے جو حل پیش کئے گئے ہیں ان کے اندر بعض اجزاء اسلام کے منشا کے مطابق ہیں، یا کم سے کم جواز کی واضح گنجائش رکھتے ہیں۔ لیکن اکثر صورتوں میں جہاں کسی گنجائش سے نارواحد تک فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے یا کسی اجنبی چیز کے لئے زبردستی اسلامی قانون میں جگہ نکالنے کے لئے ایک نئے مفہوم کے ساتھ (جو مہذب طبقہ میں رائج ہے) مجتہدانہ تصرف کیا گیا ہے، ایسے فیصلے کر ڈالے گئے ہیں جن کو اگر نافذ کر دیا جائے تو اسلامی نظامِ خاندان و معاشرت کی کسی نہ کسی اہم بنیاد کی تباہی ناگزیر ہے۔

اس رپورٹ کی روح کے فاسد ہونے کے سبب اس میں چند پہلو ایسے آگئے ہیں جن کے ہوتے ہوئے عدل اور توازن کا کوئی امکان ہی نہیں۔ مثلاً ایک تو اس رپورٹ کا پس منظر اس کش مکش سے بنا ہے جو مذہب پسند اور تارکِ مذہب عناصر کے درمیان مدت سے چلی آرہی ہے اور روز بروز شدت اختیار کر کے ایک فیصلہ کن نتیجے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رپورٹ کا خیر مقدم کرنے اور اس کو ٹھکرانے کے لحاظ سے یہ دونوں عناصر بالکل ممیز ہو کر آمنے سامنے آگئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں معاشرے کی ان خرابیوں کو اصل حد سے بڑھا چڑھا کر سامنے رکھا گیا ہے جو مہمل مذہبیت اور رسمیت کے زیرِ اثر پیدا ہوئی ہیں مگر ان خرابیوں سے بالکل صرفِ نظر کر لیا گیا ہے جو جدید غیر اسلامی نظام ہائے تمدن و معاشرت کی یورش سے پیدا ہو رہی ہیں۔ تیسرے اس رپورٹ میں مرد کے بالمقابل عورت کو ایک محاذ قائم کر کے دیا گیا ہے اور دونوں صنفوں میں اسلام کے مطلوبہ تعاون کو برقرار رکھ کر مشترک نقطۂ نظر سے اصلاحات تجویز کرنے کے بجائے طبقۂ ذکور کے خلاف طبقۂ اناث کی وکالت کی گئی ہے۔ یورپ میں اسی فاسد طرزِ فکر کے نتیجے میں تحریکِ نسواں مشتعل ہوتی گئی اور وہ جذباتی کھینچا تانی نے خاندان کے ادارہ کو تباہ کر ڈالا۔ یہ رپورٹ بھی حالات کو اسی غلط راستے پر ڈالنے کی ایک خطرناک کوشش ہے اور اس کوشش کو اسلامی رنگ دے کر اور بھی مکروہ بنا دیا گیا ہے۔ چوتھے یہ کہ یہ رپورٹ خاندانی و ازدواجی زندگی کی اصلاح کے لئے چند قانونی تدابیر دیتی ہے مگر ان قانونی تدابیر کو کامیاب نتائج کا حامل بنانے کے لئے جس تعلیمی، سوشل اور کلچرل فضا کی ضرورت ہے اس کے بارے میں تمہید اور خاتمے کی بحثوں میں ہمیں کوئی رہنمائی نہیں دیتی۔ گویا ذہن یہ کار فرما ہے کہ مجرد قانون کے ڈنڈے سے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ اسی جھکے اور یک رُخے ذہن کی وجہ سے رپورٹ نے اخلاقی دائرے کی ہر چیز کو بھی اٹھا اٹھا کر قانون کے دائرے میں ڈال دیا ہے اور تمام معاملات جو زوجین کے درمیان گھریلو فضا میں درپردہ سلجھ جانے چاہئیں ان کو عدالت کے کھلے دنگل میں لانا لازم کر دیا ہے۔ یہ بڑے بڑے وجوہ ہیں جو اس رپورٹ کو فکری توازن و اعتدال کی صفت سے خالی ثابت کرتے ہیں۔

مگر اس رپورٹ کے خلاف محض عوام کی طرف سے غم و غصہ کا اظہار کافی نہیں۔ یہ اس بات کی محتاج ہے کہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اس پر علمی تبصرہ کیا جائے۔ علمی تبصرہ میں اس کی بالکل ضرورت نہیں کہ مرتبین کی نیتوں کو زیرِ بحث لایا جائے بس یہ کافی ہے کہ اس کے

(باقی برص ۱۳)

عاصی کرنالی

بارگاہِ اقبالؒ میں

لائے ہیں کچھ دردِ دل، کچھ اشکِ غم نذرانہ ہم
آئے ہیں اقبال کی محفل میں درویشانہ ہم

رنج اٹھاتے، ظلم سہتے، ٹھوکریں کھاتے ہوئے
اور کسی کی روح کو تکلیف پہنچاتے ہوئے

زندگی افسردہ، دل ڈوبے ہوئے، چہرے اداس
روح پر اک خوف سا طاری، نگاہوں میں ہراس

کارنامے جس کے دنیا کو ابھی تک یاد ہیں
ہم خدا کے فضل سے اُس قوم کے افراد ہیں

دیکھتے ہی دیکھتے کچھ اور نقشہ ہو گیا
قوم کے اقبال! تیری قوم کو کیا ہو گیا!

ہچکیاں لیتی ہیں ہر سے پر فضائیں بار بار
ٹوٹنے والے ہیں شاید آج فریادوں کے تار

آج آوازِ شکستِ ساز بن جائیں گے ہم
اپنی حد میں اک نوائے راز بن جائیں گے ہم

آج شبنم نے بدل ڈالا ہے شعلوں کا مزاج
کل سے کتنی مختلف ہے ملّتِ بیضا کی آج

عیش کی وادی میں غفلت نے تراشے ہیں محل
سو رہے ہیں بے حسی کی گود میں فکر و عمل

عزم جھولے جھولتا ہے، جوش محوِ خواب ہے
یہ بھی اک تاریخِ ملّت کا سنہری باب ہے

عشق کے انداز سراپا بدل کر رہ گئے
وقت کی رفتار کے سانچے میں ڈھل کر رہ گئے

حسنِ عریاں اب پرانی رسم کا قائل نہیں،
اب نگاہوں کو تلاشِ لیلیٰ محمل نہیں!

روح کی یہ پستیاں، یہ آرزو، یہ اشتیاق
کس قدر بدلا ہے ملّت کے جوانوں کا مذاق

جب حقیقت خون ہو کر اشکِ داماں بن گئی
خون کی سرخی کسی قصّے کا عنواں بن گئی

نشتر اٹھے اور نظر بن کر رگِ جاں بن گئے
تیر ٹوٹے اور کسی کافر کی مژگاں بن گئے

خنجر ابرو میں ہیں اور ناوکِ نگاہِ ناز میں
فرق کتنا آگیا ہے وقت کے انداز میں

آرزو نے اپنے مرکز سے کنارا کر لیا
عشق نے حسنِ مجازی کو گوارا کر لیا

کیا یونہی قلب و نظر ہوتے ہیں جلوؤں میں اسیر؟
کیا یونہی آلودہ ہو جاتے ہیں قوموں کے ضمیر؟

سوز کی فطرت جو بدلی ساز بن کر رہ گیا
ہر ترانہ وقت کی آواز بن کر رہ گیا

عار آتی ہے مسلماں کو خدا کے نام سے
حال کتنا مختلف ہے ماضیٔ اسلام سے

مسجدیں اجڑیں، اجڑ کر خانقاہیں بن گئیں
منزلیں پیچھے کی جانب ہٹ کے راہیں بن گئیں

فطرتِ اسلام کے اوصاف ظاہر ہو گئے!
یہ ترقی کی، کہ قبروں کے مجاور ہو گئے

بن چکی ہے قوم کی تربت مزاروں کے قریب
ہائے وہ طوفان جو سوتے ہیں کناروں کے قریب

نرخ ہوتے ہیں مقرر جنسِ عصمت کے لئے
مقبرے کتنے مناسب ہیں تجارت کے لئے

اہلِ دیں کی روح کا نیلام ہو جانے کو ہے
یہ ڈراما جلد سرانجام ہو جانے کو ہے

بن گئی ہے مقتلِ ذوقِ عمل دل کی زمیں
کون جانے کتنے ارمانوں کی لاشیں اٹھ چکیں

ان دنوں کس کس نوائے شوق کا زنداں ہے دل
کون جانے کتنی فریادوں کا قبرستاں ہے دل

اشک آنکھوں میں سمندر بن کے لہراتے نہیں
آج ان قطروں میں طوفاں پرورش پاتے نہیں!

اب نظر کی قوتِ تاثیر کو کیا ہو گیا!
کند ہے شمشیر کیوں، شمشیر کو کیا ہو گیا

بجلیاں بھی طور کے سینے سے گر کر سو گئیں
آگ کی چنگاریاں پانی کی بوندیں ہو گئیں

ہائے وہ سوزِ تمنا، ہائے وہ سینے کے داغ
ہم نے پھونکیں مار کر گل کر دیئے گھر کے چراغ

دین کو جانے نہ ہم اسلام کو سمجھے نہ ہم
شاعرِ ملت! ترے پیغام کو سمجھے نہ ہم

درد کی لہریں کہاں، سینے میں ایسا دل نہ تھا
آہ اپنا ظرف اِس طوفان کے قابل نہ تھا

کوئی بھی پیغام دل پر کارگر ہوتا نہیں
جیسے کانٹوں پر بہاروں کا اثر ہوتا نہیں!

کوششیں دہقان کی بے کار ہیں، بیہودہ ہیں
ہم تو وہ خرمن ہیں جن میں کلیاں آسودہ ہیں

مدتیں گزریں کہ بنجر ہو چکی دل کی زمیں
ابرِ نیساں سے اب اس میں پھول کھل سکتے نہیں

آنکھ سے اب مضطرب آنسو نکل سکتا نہیں
اس صدف میں کوئی موتی اور ڈھل سکتا نہیں

دل میں برسوں سے نہیں پاتے کسی کے نور کو
اب تو بالکل پھونک دینا چاہیے اس طور کو

اپنی بربادی کے بھی احساس سے محروم ہیں
واقعی اقبال! اب ہم امتِ مرحوم ہیں

بے بسی کی زد میں آکر مر گئے فکر و عمل!
ہاں مگر باقی ہے اب تک خوفِ بیدادِ اجل

وقت اپنے ساتھ ابھی ایک اور آندھی لائے گا
یہ چراغِ آخری بھی بزم کا، بجھ جائے گا!

اور اگر ملت کو اپنی زندگی مقصود ہے
عالمِ امکاں میں وہ شے آج بھی موجود ہے

جس کے ایک اِک حرف کی تفسیر ہے تیرا کلام
جس کے ایک اِک راز کا آئینہ ہے تیرا پیام

اصطلاحِ عام میں قرآن کہتے ہیں جسے!
اصطلاحِ خاص میں ایمان کہتے ہیں جسے

دیتی ہے جو درسِ ایمان و صداقت وہ کتاب
بخشتی ہے جو غلاموں کو حکومت، وہ کتاب

یہ کتابِ پاک اِک آئینۂ کردار ہے
مومنوں کے ہاتھ میں اللہ کی تلوار ہے!

محمد مرتضیٰ

چند لمحے

ایک صاحبِ طرز مزاح نگار کے ساتھ!

شفیق الرحمٰن کا نام جدید ادبی حلقوں میں درخشاں ہے۔ مرتضیٰ صاحب کی اُن سے ایک دلچسپ گفتگو ہوئی جس کی روداد انہوں نے قلمبند کر کے اشاعت کے لئے بھیجی ہے۔ یہ تصریح نہیں کی گئی کہ یہ روداد خود شفیق صاحب کو دکھلائی گئی ہے اور ان سے اس کی اشاعت کی اجازت لے لی گئی ہے یا نہیں۔ تاہم چونکہ یہ افادۂ عام کی چیز ہے اور ایک ادیب کے ذہنی مطالعہ میں اس سے مدد مل سکتی ہے اس لئے ہم اسے اپنے صفحات میں لے رہے ہیں۔ چند مواقع پر زبان کی بعض کھلی کھلی کمزوریوں کو خفیف ترامیم سے دور کرنے کی جسارت ہم نے کی ہے لیکن اصل مدعا کا تحفظ کرتے ہوئے۔ واضح رہے کہ مرتضیٰ صاحب نے اپنے خط میں اس گفتگو کو انٹرویو قرار دیا ہے۔

(ن میں)

شام کے وقت میں شفیق صاحب کے ہاں پہنچا تو نوکر کی زبانی معلوم ہوا ڈاکٹر صاحب سیر کو جا چکے ہیں — نوکر نے ایک پگڈنڈی کا اشارہ کر کے بتایا کہ صاحب اس پر گئے ہیں — دو ایک میل تک تو میں اُس راستہ پر گیا مگر شفیق صاحب ملے نہیں —— ان کے دولت کدے پر واپس آیا، دیکھا کہ شفیق صاحب انگلش کی کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف ہیں مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے، علیک سلیک کے بعد باتیں شروع ہوئیں

"شفیق صاحب، بہت دور سیر کو نکل گئے تھے؟"

"نہیں صاحب آج تو خلافِ معمول دو ایک میل جا کر واپس آ گیا ہوں"

"بڑی لمبی سیر کے شوقین ہیں آپ؟"

میرا ایک نعمت ہے۔"

"شفیق صاحب آپ اردو کے کن مزاح نویسوں کو پسند فرماتے ہیں؟"

"مجھے پطرس بخاری پسند ہے۔ اگرچہ اُن کی ایک ہی کتاب ہے تاہم میں اُسے کئی دفعہ پڑھ چکا ہوں۔"

"آپ جو اردو کے اتنے مزاح نویسوں میں سے صرف ایک ہی صاحب کو پسند فرماتے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ آپ کو اردو ادب پڑھنے کا موقع کم ملتا ہے؟"

"نہیں! نہیں! جو کچھ چھپتا ہے میں سب ہی پڑھتا ہوں۔ مگر پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔ جب میرا شعور پختہ نہیں تھا تو میں بہت سے مزاح نویسوں کو پسند کرتا تھا۔ مگر اب تو پطرس بخاری صاحب میرے محبوب مزاح نویس ہیں۔"

"نقوش شخصیات نمبر میں جن صاحب نے آپ پر فیچر تحریر کیا ہے انہوں نے آپ کو رومانی سا شخص بنا کر پیش کیا ہے۔ کیا آپ اُس تحریر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے؟"

"اوّل تو میں شخصیت نگاری ہی کے خلاف ہوں ــــ پھر لکھنے والے نے میری زندگی کے اُن ہی واقعات کو لکھا ہے جن سے اس کو دلچسپی تھی۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ مجھ پر وہی کچھ لکھتے جس سے مجھے رغبت تھی یا جن چیزوں کا مجھے ٹیسٹ تھا۔ میری بہت سی سرگرمیوں کو انہوں نے حذف کر دیا ہے۔ فوٹوگرافی اور سیاحت تو میرے دل پسند مشاغل ہیں۔ ویسے اُس شخص نے میری طالب علمی کی زندگی تک کے واقعات لکھے ہیں، اور اس کے بعد تو خبر ہی نہیں میرے ادبی رجحانات میں عظیم ترین انقلاب آئے ہیں۔ میرا ادبی نقطہ نظر بھی تو ان ہی دنوں بدلا۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد مجھے عجیب جھنجھلاہٹ (معلوم نہیں کیا مطلب ہے؟) ـــ الجھن محسوس ہوئی۔ وہ خود چڑچڑی سی طبیعت اور لاعلم کا شخص ہے۔ وہ منتقد بہت ہے۔ اور ہاں کچھ دوستوں نے میری توجہ اس طرف مبذول بھی کرائی مگر میں ایکشن نہیں لیا کرتا۔ ایسے لوگ دوسروں کی شہرت کے بل بوتے پر اپنا نام اچھالنا چاہتے ہیں۔ طفیل صاحب (مدیر نقوش) مجھے لاہور میں ملے تھے۔ میں نے اُن سے کہا۔ آپ اس چیز کو تو جانے دیجئے کہ اس میں حقیقت کس حد تک ہے۔ فن ہی کو دیکھا ہوتا۔ اس میں کتنی فنی کمزوریاں ہیں۔ طبع کرنے سے پہلے کم از کم واقعات کی صحت کے بارے میں مجھ سے ہی مشورہ کر لیا ہوتا۔ میری تاریخ پیدائش یکسر غلط ہے۔ اس میں مجھے مشورے دیئے گئے ہیں۔ عجیب بات ہے۔ اسے سوانح نگاری کون کہتا ہے۔ طفیل صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ میں دوسری اشاعت میں اس مضمون کو خارج کر دوں گا۔

"آپ کا افسانہ 'ریویو' پڑھنے کے بعد خیال آتا ہے کہ آپ کو بھی اپنے ناقدین سے شکایت رہی ہے۔"

"میرے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے کچھ اوٹ پٹانگ سی تحریر لکھی تھی۔ میں نے اسے پڑھنے کے بعد کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے میری صرف پہلی کتاب ہی پڑھنے کے بعد مضمون لکھ دیا ہے۔ کئی دن بعد میرے جان پہچان کے آدمیوں کے ہاں عبادت صاحب مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ باتوں ہی باتوں میں تنقید والا قصہ چل پڑا۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب خدا کی قسم کھا کر بتائیے کہ آپ نے میری ایک ہی کتاب پڑھنے کے بعد یہ مضمون نہیں لکھا تھا؟ ڈاکٹر عبادت صاحب نے یہ تسلیم کیا کہ میں نے پہلی کتاب کے بعد یہ مضمون لکھا تھا۔ یہ سچ

اپنا سیٹ ان کو دیا۔ بعد میں انہوں نے مجھ پر بہت کچھ اچھا بھی لکھا۔ مجھ پر کوئی اچھا لکھے یا بُرا، میں کبھی ایکشن نہیں لیا کرتا۔ بس زبانی جمع خرچ چلتا ہے۔"

آپ کے خیال میں کس ناقد نے آپ کے ادب پر صحیح تنقید کی ہے؟

میں عرض کر چکا ہوں کہ مجھ پر کوئی اچھا لکھے یا برا۔ میں کبھی ایکشن نہیں لیا کرتا۔ دوست احباب بہت کچھ کہتے ہیں مگر میں اپنے اصول پر کاربند ہوں۔ نقاد اچھا لکھے یا برا، جو فن ہوگا اپنا مقام خود پیدا کر لے گا۔"

کئی ایک ترقی پسند حضرات آپ کے ادب کو غیر مقصدی ادب کہتے ہیں، اور یہ کہ آپ فرج کی بور (گفتگو میں تو چیرا تحریر میں اپنی زبان کے کسی مناسب لفظ کو لیا جا سکتا تھا — ن۔ص) زندگی کو قصوں میں تبدیل کر کے اپنے سے بورتینا (اور لیجیا ن۔ص) دور کرتے ہیں؟"

"ترقی پسند حضرات میں سے اکثر کمیونسٹ ہیں۔ وہ گھناؤنا ادب پیش کرتے ہیں۔ ان کی اپنی شکل و صورت اداس اور غیر مہذب سی ہوتی ہے۔ اُن کے نظریہ کے مطابق ادب صرف آہ و فغاں کا دوسرا نام ہے۔ انگریز تو چلے گئے۔ اب موجودہ حکمرانوں کی مخالفت نہ کریں تو شر پسند طبیعتوں کو چین کیسے نصیب ہو۔ ادیب کافی ہاؤسوں اور ٹی سٹالوں میں بیٹھ کر لکھنے اور ادب پیدا کرنے والے خدا کی عجیب مخلوق ہیں۔ ان لوگوں کا مطالعہ بڑا کم ہوتا ہے۔ یہ پاکستان سے تو کیا اپنے صوبوں سے باہر نہیں نکلے۔ ان کا نظریہ ادب ہمیشہ ادب رہتا ہے خواہ حالات کتنے ہی اُلٹ پلٹ کیوں نہ ہو جائیں۔ مگر آپ ان کے ادب کو دیکھئے، اگر حالات CHANGE ہو جائیں تو بس ان کا ادب بھی ختم۔ اسے ہم ادب نہیں، صحافت کہہ سکتے ہیں۔"

"کیا آپ پر کبھی اشتراکی خیالات بھی اثر انداز ہوئے ہیں؟"

"نہیں صاحب! نہیں! کبھی نہیں! ویسے میں کئی ایک کمیونسٹ حضرات کو جانتا ہوں اور کئی ایک سے تو میں کہہ چکا ہوں کہ صاحب آپ جو کہتے ہیں کہ اشتراکی قانون (یا نظام؟ ن۔ص) یہاں بھی نافذ ہو جائے تو اگر قانون آئے گا تو کوئی وجہ نہیں قانون والے نہ آئیں گے۔ اور پھر اشتراکی تو کام اور صرف اپنا کام لینا جانتے ہیں۔ وہ ہر فرد کو روٹی دیتے ہیں مگر عوض میں بارہ اور چودہ گھنٹے کام بھی لیتے ہیں۔ اور ہاں، آپ لوگوں نے تو ٹی سٹالوں اور کافی ہاؤسوں میں بیٹھ کر اپنی طبیعتوں کو عیاش بنا لیا ہے، وہ تو سب سے پہلے آپ ہی کو جوتیاں لگائیں گے۔ صاحب یہ کمیونسٹ تحریک بھی کوئی ادب ہے۔ بکواس بیہودہ، فن سے نا آشنا!"

"قاری کے نقطۂ نظر سے عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو مرحوم کے ادب پر آپ کی رائے کیا ہے؟"

عصمت چغتائی گھناؤنی شکل و صورت کی عورت ہے میں اس کی اکثر تحریروں کو فن سے گرا ہوا پاتا ہوں۔ عصمت چغتائی نفسیاتی طور پر بیمار ہے۔ بیمار ذہن نے اس کے قلم سے وہ وہ کچھ لکھوا دیا ہے کہ جو ایک عورت کے شایانِ شان نہیں۔ میں نے اکثر یو پی، سی پی وغیرہ کی عورتوں میں عورت "مردہ" پائی ہے، اس کے ہاں عورت ہوتی ہی نہیں۔ عریاں لکھنا اور پھر ایک عورت کا! — عجیب بیہودگی ہے۔ میں نے عصمت کو پونا میں دیکھا تھا۔ اس کی شکل سے ہی مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ شکل و شباہت سے خشت

(باقی ص ۲۶)

ادارہ

ایک نیا تحقیقی کارنامہ

-۲-

مولانا مودودی کے متعلق متضاد باتیں

ذہن صاف نہ ہو تو آدمی کسی شخص میں خوبی موجود پاتے ہوئے بھی اسے ماننا نہیں چاہتا، لہٰذا وہ اس کے ہونے کی وجہ سے پہلے کوئی حرفِ اعتراف لائے گا، پھر اس کے ساتھ ہی "مگر" اور "لیکن" لگا کر تردیدی کلمات بھی جمع کر دے گا۔ اسی طرح وہ اگر اپنے کسی حریف پر کوئی برائی چپکیتے ہوئے اسی پہلو سے اس کی کسی واقعی خوبی کو رکاوٹ پاتا ہے تو پہلے دل کا بخار نکال لیتا ہے اور پھر "مگر" اور "لیکن" کہہ کر دو حرفِ تعریف بھی کلام میں حل کر دیتا ہے۔ سرور صاحب نے مودودی صاحب سے سارا معاملہ اسی نہج پر کیا ہے۔ یہ ان کے قلم کا ایک بے مثل اعجاز ہے کہ انہوں نے مولانا مودودی کی بیک وقت دو تصویریں کھینچی ہیں۔ ایک تصویر کو سامنے رکھئے تو ایک بلند مرتبہ تاریخی شخصیت سامنے آتی ہے جس سے قوم خیر و فلاح کی امیدیں وابستہ کر سکتی ہے۔ دوسری تصویر نگاہوں میں لائیے تو ایک بیمار ذہن، ایک فاسد فکر اور ایک تخریبی کردار سے تعارف حاصل ہوتا ہے۔ ان دونوں تصویروں کے ملے جلے خد و خال پوری کتاب میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں "مودودی ایسا ہے، مگر ویسا ہے"۔ "یوں بھی ہے لیکن ووں بھی ہے" کے اسلوب سے یہ دو تصویریں بالکل الگ الگ بنتی چلی جاتی ہیں۔ ان دونوں تصویروں کے خد و خال کو جس طرح سرور صاحب نے ملا جلا دیا ہے، اسی طرح سرسری نگاہ سے دیکھتے چلے جائیں تو مصنف کے کارنامے کا پورا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے نتیجے میں صرف ایک پریشان خیالی اور ذہنی ژولیدگی پیدا ہوتی ہے اور یہی مصنف صاحب کو مطلوب ہے۔ لیکن اگر دونوں تصویروں کے خد و خال الگ الگ جمع کر دیجئے اور ان کو مکمل کر کے آمنے سامنے رکھ دیکھئے تو اولین نگاہ میں آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر مودودی وہ ہے تو یہ نہیں ہو سکتا اور یہ ہے تو وہ نہیں ہو سکتا۔ ایک نقشہ پورے کا پورا الگ ہے اور دوسرا نقشہ سرتاپا اس سے مختلف ہے۔ دونوں کو ایک شخصیت میں کبھی جمع نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی شخصیت و کردار کے مختلف نمونوں کا ہمہ گیر مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ایسا تو ہو سکتا ہے کہ ایک اچھے ذہن و کردار میں اکا دکا کمزور پہلو بھی موجود ہوں یا ایک گندے ذہن و کردار کے ساتھ چند جزئی خوبیوں کا پیوند لگا ہوا ملے، لیکن یہ ناقابلِ تصور ہے کہ ایک ہی آدمی کے اندر ذہن و کردار کی دو مکمل دنیائیں الگ الگ آباد ہوں۔ زیادہ سے زیادہ نفسیات کے عالم میں استثنائی اور غیر معمولی صورتیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں کہ شخصیت دو پارہ (SPELIT) ہو جائے یا کچھ غیر معمولی عوامل کا رد عمل کوئی ایک آدھ پہلو بے جوڑ قسم کا پیدا کر دے، لیکن ایک قالب کے اندر دو ایسی جانوں کا انکشاف جو ایک دوسرے کی نفی کر دینے والی ہوں، سرور صاحب کے ذہن رسا کا ایک بے مثال معجزہ ہے۔

ایک تصویر

سرور صاحب کے اس آرٹ کو تعارفی کلمات کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، ہم آرٹ کے دونوں شاہکار

پیش خدمت کئے دیتے ہیں۔

خلوص ـــ

- "..... جن کے قائدین فکر و عمل اور ان کے اہم رفقائے کار کی نیتوں اور خلوص پر فی نفسہٖ ہمیں اعتماد ہے۔" ص۲۳۳
- "اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے پیشِ نظر (ان کے اپنے خیال کے مطابق) اصلاح ہے، تخریب نہیں، نیکی ہے، بدی نہیں لیکن.." ص۲۳۱

ذہنی کرتب،

- "مودودی صاحب تحریر و تقریر کے ایک ماہر صناع ہیں (اس پر سرور صاحب نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "مودودی صاحب کی یہ صناعی خداداد معلوم ہوتی ہے") جب کبھی وہ کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں تو اس کی عمارت اٹھانے میں اپنی اس فنی مہارت سے خوب کام لیتے ہیں۔ مجموعی طور پر عمارت کا نقشہ بڑا دلکش ہوتا ہے۔ اس کی کھڑکیاں، دروازے اور کمرے سلیقے سے بنے ہوتے ہیں۔ عمارت کی بناوٹ میں وہ منطقی توازن کا خاص خیال رکھتے ہیں اور اس میں جو الفاظ اور پیرایۂ بیان کی اینٹیں لگاتے ہیں ان کی موزونیت اور تاثیر خاص نمایاں ہوتی ہے۔ اور پھر بحث کی یہ عمارت اتنی بھاری بھرکم نہیں ہوتی کہ ناظرین پر اس کی سیر بار گزرے۔ بلکہ ہلکا پھلکا اس کا نقشہ ہوتا ہے اور عمارت کو اٹھانے میں بھی فنی تکلّف سے زیادہ کام نہیں لیا جاتا۔ مولانا کی تحریر و تقریر کی صناعی کا یہ انداز آج کل کی عام ضرورت کے مطابق ہے۔ اس میں اختصار ہے، مشکل سے مشکل مسئلے کو بالکل آسان بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور پھر عام اور متوسط طبقے کی نفسیاتی احتیاج اور اس کے جماعتی مذاق کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا ہے۔" ص۲۳۸
- "وہ عمارت کے ظاہری رنگ و روغن سے عام ناظرین کو مطمئن کرنے کا خاص خیال رکھتے ہیں اور اس میں وہ منطق و استدلال اور خوش ذوقی سے بھی خوب کام لیتے ہیں۔ لیکن ...." ص۲۳۹
- "مولانا مودودی صاحب بھی بہت ذہین ہیں" ...... "اور مودودی صاحب نظم و ضبطِ افکار کی طرف زیادہ مائل ہیں"... ...... "اور دوسرے کا (یعنی مولانا مودودی کا) ذہن گو اتنا تیز رفتار نہیں لیکن ثابت قدم ضرور ہے اور ایک سمت جُتے ہوئے بیل کی طرح اَن تھک ہے۔" ص۹۲
- "مودودی صاحب جو کچھ کرتے ہیں وہ بالعموم نتیجہ ہوتا ہے ان کے ذہن کے منطقی عمل یعنی وہ قدم اٹھانے سے پہلے[1] سوچتے ہیں کہ اگر یوں ہوا تو اس کا یہ نتیجہ ہوگا اور اگر اس طرح ہوا تو اس کا وہ نتیجہ ہوگا۔" ص۹۴
- "مولانا مودودی کا یہ طرزِ تحریر انہی لوگوں کی یادگار رہے۔ مذہب و اخلاق، سیاست و معیشت، معاشرت و مسائل عمرانی اور تعلیمی

---

[1] سوچنے کے تین فارمولے ایک لطیفہ کے طور پر مشہور رہے ہیں! قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا انگریزوں اور ہندوؤں کا معمول تھا، قدم اٹھاتے وقت سوچنا مسلمانوں کا 'طریقہ' اور قدم اٹھانے کے بعد سوچنا سکھوں کا شعار۔ سرور صاحب کو صدمہ ہے کہ مولانا مودودی نے مسلمانوں کا یہ روائتی طریق چھوڑ دیا ہے۔

مسائل سے متعلق کوئی بھی پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ ہو وہ چند صفحات میں اس پر جامع و مانع بحث کر کے اس سے دوٹوک نتیجہ نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔" ص۱۰۱

- "الجمعیت اور ترجمان القرآن میں مودودی صاحب کو ایک ایسے قلم کا مالک ثابت کیا جو عام طور پر ہر دلچسپی رکھنے والے عام مسلمانوں کے لئے لکھتا تھا اور بڑے دلنشین اور صاف سیدھے انداز میں لکھتا تھا، اور یہ سب اس کے قدردان تھے" ص۱۰۱

- "چنانچہ آپ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ مولانا مودودی کی دعوت کا ہر جزئیہ بیان اور اس کے الفاظ کتنے انقلابی ہوتے ہیں۔ لیکن....." ص۱۵۴

قبولیت عام —

- "..... اس لئے مولانا مودودی کی دعوت بالعموم اچھی خاصی مقبول ہے اور وہ اسلام کے سب سے بڑے مفکر سمجھے جاتے ہیں" ص۱۵۵

اصل سرچشمۂ فکر —

- "بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں صدیوں سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ اسلام کا مقصد تمام روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں سارے مسلمان برابر ہیں۔ اس عقیدہ کی بنا پر مسلمانوں میں اسلام کی ایک عالم گیر شاہ سلطنت یعنی دارالاسلام کا تصور وجود میں آیا جس کا اساس وطنی قومیت کی نفی تھا اور جو انسانوں کے صرف دو ہی طبقے مانتا ہے۔ ایک مومنین کا، دوسرا منکرین کا"۔ ...... "مولانا مودودی نے اسی تصور سے جو مسلمانوں میں ورثے میں چلا آتا ہے، فائدہ اٹھایا" ص۱۴۳-۴[۱]

نقطۂ نظر —

- "...... مودودی صاحب نے بھی اسلامی دینیات کے اکثر مسائل میں قابلِ تعریف حد تک راہِ وسط اختیار کی یعنی نہ تو قدامت پرستی میں اس حد تک پہنچے کہ پچھلوں کی باتوں کو عین اسلام سمجھ لیا، اور نہ تجدید (یہاں دراصل "تجدد" کی اصطلاح استعمال ہونی چاہئے تھی (ن۔ ص) کے اس قدر حامی ہوئے کہ روشن خیال مذہبی طبقے بھی ان سے بدظن ہو جائیں"۔ ص۱۶۳

- "دین اسلام میں حدیث اور سنت کی حیثیت، فقہ و حدیث کا باہمی تعلق، اجتہاد نیز دوسرے فقہی مسائل میں مولانا مودودی کا نقطۂ نظر قدامت پسندانہ نہیں بلکہ مجتہدانہ ہے"۔ ص۱۸۱

- "وہ حدیث کی روایت اور اس کی درایت کے متعلق بھی بڑا متوازن مسلک رکھتے ہیں"۔ ص۱۸۱

- "اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا مودودی نے بہت سے فقہی مسائل میں حدیث و فقہ اور روایت و درایت میں اپنے اس متوازن مسلک، نیز ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھ کر حکم شرعی کی تحقیق کی اور علماء زیادہ تر ان کے انہی اجتہادات سے ناراض ہیں"۔ ص۱۸۶[۲]

---

[۱] اصل و نجدہ حادثہ تو یہی ہے اور اس کے بارے میں سرور صاحب نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لئے "سمجھے جاتے ہیں" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔
[۲] سرور صاحب اپنے مطلب کے لئے خود انہی علماء میں سے ایک نمایاں بزرگ کو اپنی مدد کے لئے لے آئے ہیں۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ص۱۹۵-۹

- "خطبہ جمعہ کی زبان کے متعلق انہوں نے بڑی مدلل اور مجتہدانہ بحث کی ہے۔" ص۱۸۶
- "مولانا مودودی کے رسائل و مسائل کے دو مجموعوں میں بہت سے معاملات پر ان کی فقہی تحقیقات ہیں۔ جن میں موصوف کی اصابتِ رائے اور فقہی صحتِ نظر کا اعتراف کرنا پڑے گا۔" ص۱۸۷

کیریکٹر —

- "مولانا مودودی کو بھی اپنی گفتار، کردار، تحریر اور عادات پر بڑا قابو ہے۔ نیز ان کی زندگی میں بڑا نظم و ضبط ہے۔ وہ بہت کم اشتعال میں آتے ہیں اور ان کے جذبات بھی شاذ و نادر بے عنان ہونے پائے ہیں۔" ص۱۹۱
- "سخت سے سخت حادثے میں اپنے اوپر پوری طرح قابو رکھنے کا جو نمونہ مولانا مودودی نے پچھلے دنوں پھانسی کا حکم ملنے پر پیش کیا وہ ان کے کردار کا بہترین رُخ ہے۔ آپ اس وقت بھی ہر ایک سے حسبِ معمول کشادہ روئی سے ملے اور آپ کے چہرے پر کوئی اضطراب نہ تھا۔" ص۱۹۲

تنظیمی صلاحیت —

- "اب جہاں تک مولانا کی تنظیمی صلاحیتوں کا تعلق ہے، موصوف کا کوئی شدید ترین مخالف بھی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ جماعتِ اسلامی کی موجودہ تنظیم اور کارکردگی موصوف کی ان صلاحیتوں کا عملی ثبوت ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ پاکستان میں اس وقت جماعتِ اسلامی سے بڑھ کر کوئی فعال اور منظم جماعت موجود نہیں۔" . . . . بے شک مولانا ایک مسلمہ ماہرِ تنظیم بزرگ ہیں اور اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔" ص۱۹۷

تاریخی کارنامہ —

- "واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے نام سے اور قرآن و حدیث کے حوالوں سے مولانا مودودی نے مسلمانوں کو اس دور میں ہندوستانی قومیت سے محفوظ رکھنے میں بڑا کام کیا۔ اور اسلامی قومیت کو بہ حیثیت ایک سیاسی اصول کے مسلمانوں سے متعارف کرایا۔" ص۱۰۹
- "جماعتِ اسلامی کے اہلِ قلم کا دعویٰ ہے کہ کانگریس نے متحدہ قومیت کا جو قلعہ بنایا تھا اور جس کی تعمیر میں مولانا آزاد اور جمعیت العلماءِ ہند کے علمائے کرام بھی شریک تھے، یہ مولانا مودودی ہی تھے جنہوں نے اسے ڈھایا۔ بے شک ان حضرات کا یہ دعویٰ بہت حد تک صحیح ہے اور اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ سیاسیات کے ایک علمی اصول کی حیثیت سے اسلامی قومیت کے تصور کے حق میں سب سے پہلے مولانا مودودی نے اس زمانے میں باقاعدہ قلمی جدوجہد کی اور مذہبِ اسلام کو اس کا اساس بنایا۔ لیکن . . ." ص۱۱۳

بے شک مودودی صاحب مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوئے لیکن ایک غیر متعلق معاون کی حیثیت سے مولانا نے شروع میں مسلم لیگ کو بالواسطہ بڑی مدد پہنچائی۔ کتاب و سنت کے حوالوں اور اپنے زوردار، مؤثر و مدلل مقالوں کے ذریعہ، واقعہ یہ ہے کہ

مودودی صاحب نے کانگریس کی معیت میں جمعیت العلماء ہند اور مولانا آزاد کے بنائے ہوئے متحدہ قومیت کے قلعہ کو مسمار کرنے میں بڑا کام کیا۔" ص۱۴۹

- "انہی کی ہمت و کوشش سے پاکستان کے تمام مذہبی فرقوں کے قابلِ ذکر علماء ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے، اور یہ ایک معجزہ تھا کہ ملک بھر کے ۳۳ علماء دستور کے ۲۲ بنیادی اصولوں پر متفق ہوا، اور علماء بھی ہر فرقے اور ہر گروہ کے، دیوبندی، بریلوی، شیعہ، جماعت احرار اور جماعتِ اسلامی سب کے۔" ص۳۴۲

حلقۂ اثر —

- "...... اب لے دے کے مذہبیت سے ربط رکھنے والے وہ اہلِ علم رہ گئے جن میں مذہبی شعور کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی تھا۔ چنانچہ جماعت اسلامی میں اس طرز کے بعض با اثر اصحاب موجود ہیں۔" ص۱۹۴
- "جماعتِ اسلامی کی تشکیل میں ایک تو کانگریس کی سیکولر پالیسی سے ناراض اور مایوس ہو کر اس کو چھوڑنے والا یہ فعال عنصر موثر ہوا ہے۔ دوسرے اس میں علماء اور مولویوں کا وہ عنصر بھی پیش پیش ہے جو خلوصِ دل سے اسلام کا احیاء چاہتے ہیں۔ .... مولویوں کا یہ احیاء پرست طبقہ اپنے معتقدات میں بڑا مخلص ہے اور مولانا مودودی کو صحیح معنوں میں اپنا امام سمجھتا ہے۔ تیسرا عنصر جس کی تعداد کچھ کم نہیں ایسے حضرات کا ہے جو باقاعدہ مولوی تو نہیں، لیکن طبیعت کے نیک اور اخلاقیات کی ذرا ذرا سی بات میں احتیاط کرنے والے ہیں جنہیں انگریزی میں PURITANS (انگریزی میں مردود صاحب کا طبقہ اس لفظ سے ٹھیک وہی گالی دیتا ہے جو اردو میں لفظ "صالحین" کے طنزیہ استعمال سے دی جاتی ہے)۔ کہتے ہیں۔ اس عنصر میں زیادہ تعداد تاجروں، سرکاری ملازمین اور نوجوان طالب علموں کی ہے۔ اور چوتھا عنصر نا کام سیاست دانوں اور معزول شدہ اصحاب اقتدار کا ہے جو اپنی سیاہ بختی میں یا تو اپنے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے یا کسی نہ کسی طرح اپنی سیاسی مرادیں برلانے کے لئے وقتاً فوقتاً جماعت اسلامی کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور اس کے لئے وہ اس سے زبانی ہمدردی بھی کرتا رہتا ہے۔" ص۱۹۵-۶
- "جماعت اسلامی کے حامیوں کی سب سے بڑی تعداد جو اس کے جلسوں اور امیرِ جماعت اسلامی کے استقبالیہ جلوس میں ہزاروں کی تعداد میں شامل ہوتی ہے ان عوام کی ہے جو گردشِ روزگار سے خوش نہیں اور ہر اپنی تکلیف کا ذمہ دار حکومت کو سمجھتی ہے ......" ص۱۹۶ -

اس تصویر پر ایک نگاہِ تبصرہ | یہ تصویر کسی بھی انسان کے ذہن و کردار کی ہو، جس سے بھی اسے منسوب کیا جائے گا اس کے بارے میں لازماً نہایت ہی اچھی رائے پیدا ہوگی، اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوگا، اس کی بصیرت و قابلیت کا اعتراف کیا جائے گا، اس سے دین اور قوم اور انسانیت کی بہت ہی قیمتی خدمات کی توقع بندھے گی۔ بلکہ ایسا آدمی ان شخصیتوں میں شمار ہوگا جو اپنے وقت کے آسمان پر ماہ و اختر بن کے چمکتے ہیں اور دنیا کو خیر و برکت کا نور بہم پہنچاتے ہیں۔

سرور صاحب جس آدمی کا تعارف کرا رہے ہیں وہ نیت کے لحاظ سے مخلص ہے اور وہ اصلاح اور نیکی کے فروغ کا خواہش مند ہے۔ وہ تحریر و تقریر کے دائرے میں غیر معمولی درجے کی خداداد صلاحیتیں رکھتا ہے۔ وہ جس موضوع پر بات کہتا ہے، جامعیت اور حسنِ ترتیب سے کہتا ہے۔ الفاظ اور پیرایۂ بیان بہترین اختیار کرتا ہے۔ سادہ اور ہلکا پھلکا اسلوب مخاطبین کے دل موہ لیتا ہے۔ اس کا طرزِ کلام موجودہ دور کے ذہن کے مطابق ہوتا ہے اور عام اور متوسط طبقے کے ذوق کا اس میں پورا پورا لحاظ ہوتا ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مسئلوں کو آسان بنا کے پیش کرتا ہے۔ اس کے خیالات میں نظم و ضبط اور توازن کار فرما ہے۔ وہ ذہنی لحاظ سے ثابت قدم ہے۔ وہ قدم اٹھانے سے پہلے معاملات کو سوچتا ہے اور اس کا ذہن سوچنے کی منطقی ترتیب سے کام لیتا ہے۔ وہ بڑے سے بڑے علمی اور اجتماعی موضوعات پر چند صفحات کی بحث کے بعد دو اور دو چار کی طرح کا دو ٹوک نتیجہ نکال کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اس کی دعوت کا پیرایۂ بیان اور اس کے پسند کردہ الفاظ بڑے انقلابی ہوتے ہیں ان وجوہ سے اس کی بات بالعموم اچھے خاصے پیمانے پر مقبولِ عوام ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں وہ مفکرانہ مقام رکھتا ہے۔ اس کے خیالات کا بنیادی سرچشمہ اوائلِ اسلام سے چلے آنے والا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام کا مقصد ساری دنیا پر خدا کے قانون کے مطابق نظامِ زندگی قائم کرنا ہے اور یہ کہ سارے مسلمان باہم برابر ہیں۔ وہ دینی معاملات میں قابلِ تعریف حد تک مسلکِ اعتدال اختیار کرتا ہے اور نہ قدامت پرستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نہ تجدد کی رو میں بہتا ہے۔ حدیث و سنت اور فقہ و اجتہاد کے دائرے میں اس کے سوچنے کا انداز مجتہدانہ ہے۔ وہ حدیث کی روایت و درایت کے متعلق بھی بڑا متوازن طرزِ فکر رکھتا ہے۔ اس نے فقہی مسائل میں ضروریاتِ زمانہ کا لحاظ رکھ کر حکمِ شرعی کی تحقیق کی ہے۔

قدامت پسند مولوی اسی تصور پر اس سے ناراض ہوتے ہیں۔ اس کی اصابتِ رائے اور فقہی صحتِ نظر کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔ وہ گفتار و کردار اور عادات و اطوار پر پورا قابو رکھتا ہے۔ اس کی پوری زندگی میں نظم پایا جاتا ہے۔ وہ اشتعال میں نہیں آتا اور جذبات کی رو میں نہیں بہتا۔ وہ سخت سے سخت حادثے میں اپنے اوپر قابو رکھتا ہے۔ پھانسی کی سزا سن کر بھی اس کے مجموعی کردار میں کوئی تغیر نہیں آتا اور وہ پورے پورے استقلال کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ کوئی مخالف بھی اس کی تنظیمی صلاحیت کا انکار نہیں کر سکتا اور اس کا عملی ثبوت جماعتِ اسلامی ہے جس سے بڑھ کر کوئی اور منظم اور فعال جماعت پاکستان میں موجود نہیں۔ اس نے متحدہ قومیت کا قلعہ مسمار کرنے اور اس طلسم سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے میں بڑا کام کیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے اسلامی قومیت کے تصور کو استوار کیا۔ اس نے مسلم لیگ سے باہر رہتے ہوئے بھی اس کے مقصد کو بڑی مدد بہم پہنچائی۔ اس کی مساعی کے نتیجے ہیں تمام فرقوں کے علماء اسلامی دستور کے بائیس بنیادی اصولوں پر مجتمع ہوئے اور یہ ایک معجزہ تھا۔ اس کی دعوت پر متعدد ایسے با اثر اصحاب جمع ہوئے جو مذہبی شعور کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور سے بھی بہرہ مند ہیں کانگریس کی لادین سیاست سے متنفر ہونے والے مذہب پسند لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ ایسے مولوی بھی جو اسلام کا احیاء چاہتے ہیں، اس شخص کی آواز پر لبیک کہتے ہیں اور اسے اپنا امام مانتے ہیں۔ قوم کے اندر تاجروں، سرکاری ملازمین اور نوجوان طلبہ میں جتنے لوگ طبیعت کے نیک اور اخلاقی لحاظ سے حساس ہیں وہ بھی اس کے گرد سمٹ رہے ہیں۔ کچھ ناکام سیاست دان اور اقتدار کھو بیٹھنے والے لیڈر بھی ذہنی طور پر اس کی طرف مائل ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ایسے عوام بھی اس کے حامی بن کر متحرک نظر آتے ہیں جو موجودہ حالات سے غیر مطمئن ہیں اور حکومت کے رویے میں تبدیلی چاہتے ہیں۔

کتنی روشن اور دلکش تصویر ہے۔ اس نقشے نمونے کے آخر کے آدمی پورے پاکستان میں ہوں گے؟ ان کا تناسب فی ہزار نہیں، فی کروڑ کیا ہو گا؟ لیڈروں اور رہنماؤں کے مختصر سے ایک منتخب گروہ کے اندر غور سے دیکھئے اور ایک ایک شخصیت کو جانچ تول کر بتایئے کہ ان اوصاف کا آدھا حصہ بھی کسی کے اندر یکجا ملتا ہے۔ پھر یہ سوچئے کہ جس شخص کا ذہنی اور عملی نقشہ یہ ہو اس کے اندر آخر کتنی ایک برائیاں کھپائی جا سکتی ہیں؟ اس فریم میں نامطلوب اور مکروہ عناصر کس حد تک داخل کئے جا سکتے ہیں؟ اس چمن میں کانٹے بھی ہوں گے، مگر اسے یکسر خارزار بنا دکھانا کتنا مشکل کام ہو گا! ہاں مگر ابھی ہمارے دیس میں ایسے ایسے ماہرینِ فن موجود ہیں کہ یہ دلکش تصویر دکھانے کے بعد ایک بار "لیکن" کا جھرلو گھما دیں تو پلک جھپکنے میں یہ پوری تصویر ایک برعکس قسم کی تصویریں بدل جائے گی۔ اگر مگر کا منتر پڑھ کر ہمارے یہ جادوگر دن کو رات اور بہار کو خزاں اور گل کو خار اور ہیرے کو کوئلے میں بدل کے دکھا سکتے ہیں۔ ابھی ہماری ساکھ قائم رکھنے کو ایسے ہنرور زندہ موجود ہیں۔

دوسری تصویر | لیجئے اب پلک جھپکے بغیر دیکھتے رہیئے کہ اوپر کی وہ تصویر کیسے آپ کی نگاہوں سے یکایک ہٹ جائے گی اور ایک دوسری مکروہ تصویر اس کی جگہ لے لے گی۔

کھوٹ ہی کھوٹ ـ ـ

- "...... اور انہوں نے جب ترجمان القرآن نکالا تو اس مرض کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ ممکن[1] ہے کہ اس اقدام میں کچھ بڑے لوگوں کا بھی اشارہ ہو۔ بہرحال اگر یہ قیاس صحیح بھی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا کیوں کہ بقول غالب:۔

  چاک مت کر جیب بے ایامِ گل ۔۔۔ کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیئے ص ۱۰۵

- مولانا بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھ کر حیدر آباد کے زوال آمادہ اور تعیش پسند ایک مختصر سے حکمران طبقے کی خاطر اسلام کے نام سے سیاست کے یہ غلط نظریے گھڑتے رہے" ص ۱۴۱
- "...... تو معلوم ہوتا[2] ہے کہ ان کے یہ تاثرات نتیجہ ہیں ان گفتگوؤں کا جو شاید ان کی موجودگی میں ان کے نیاز مند حکومت ہند کے بعض بڑے مسلمان افسروں کی محفلوں میں ہوتی ہوں گی" ص ۱۵۵
- " اس ضمن میں نوائے وقت ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کا یہ تبصرہ خاص طور سے قابل توجہ ہے:۔

  ...... گورنمنٹ آف انڈیا کے بعض اعلیٰ افسر مودودی صاحب کے معاون و سرپرست تھے اور مودودی صاحب کو ان سے مالی اعانت بھی ملتی رہی[3]

  نوائے وقت کے ان[4] الفاظ کی اس لئے اور بھی زیادہ اہمیت ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ان اعلیٰ افسروں سے جن کا ان میں ذکر ہوا ہے۔ اخبار مذکور کے ایڈیٹر کے خصوصی تعلقات ہیں اور وہ ان کے متعلق پوری ذمہ داری سے بات کہنے کے مجاز ہیں"۔ حاشیہ ص ۳۲۴-۵
- "...... اور گو مولانا کو STRATAGIST (حکمت عملی کا ماہر) کہنا شاید مشکل ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ

---

[1] ذرا اس "ممکن ہے" کی شان ضرور ملاحظہ ہو۔ [2] یہ "معلوم ہوتا ہے" بھی عجیب قسم کی ہمہ خیالہ ذہنیت کا مظہر ہے۔ [3] پورے اقتباس کا اہم ترین جزو ہم نے لے لیا ہے، باقی عبارت چھوڑ دی ہے۔ [4] یہ نوٹ لکھ کر سرور صاحب نے نوائے وقت کے اس بہتان کی ذمہ داری میں شرکت کر لی ہے۔

TACTICS (داؤ پیچ) کے ماہر ضرور ہیں۔" ص۲۳۰

- "......آخر میں اپنی جماعت بنائی تو خود اس کے امیر بنے"[1] (سرور صاحب نے اس پر حاشیہ میں ورڈز ورتھ کا پامال سا فقرہ بطور پھبتی کے لکھ مارا ہے کہ CHILD IS THE FATHER OF MAN) ص۲۷
- "...... ایک جماعت بنائی اور خود اس کے امیر بن گئے" ص۴۸
- "......وہ اپنی خیالی ریاست کے نقشے بنانے میں منہمک رہے جس میں خدا کا (یہ خدائی تصور بھی خود ان کے اپنے ذہن کی پیداوار تھی) اقتدارِ اعلیٰ ہوگا اور مولانا اس کے نام سے قانون سازی کے فرائض انجام دیں گے۔" ص۳۲۷
- "شروع سے مولانا مودودی نے اپنا مقصد یہ معین کر لیا تھا کہ ان کی پارٹی[2] زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کر کے حکومت[3] کی مشین پر قابض ہو جائے۔" ص۳۲۸
- "...... اور اس کا نتیجہ ہے کہ ان کی اور ان کی جماعت کی نظر اس کے (یعنی پاکستان کے) ان سے متعلق تمام تر تنقیدی ہے، یا اسے آپ تخریبی[2] کہہ لیجئے۔" ص۱۶۳

نفسیاتی ساخت اور ذہنی مرتبہ —

- "مودودی صاحب جیسے نفسیاتی خود مرکزیت کے بزرگ دوسروں کی شخصیت کو کبھی نہیں مانتے۔" ص۷۶
- "......بچپن میں ہی ان میں خود مرکزیت تھی اور پھر ہم عمروں میں چھوٹا ہونے کے باوجود تعلیم میں ان سے ممتاز ہونے کی وجہ سے اس خود مرکزیت کو اور بھی تقویت ملی۔ اب الجمعیت کی ایڈیٹری کے اس ماحول نے مودودی صاحب کے اس احساس کو اور پختہ کیا اور وہ گویا ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا۔ چنانچہ موصوف کی تحریروں اور تقریروں میں 'میں' کا جو اس قدر مظاہرہ ہوتا ہے وہ اسی زمانہ ایڈیٹری کی یادگار ہے۔" ص۹۹
- "جو شخص اس الجھن میں گرفتار ہو کہ وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر معاملے میں اس کی قطعی رائے سننے کا ہزارہا قارئین کو انتظار رہتا ہے، اور اتفاق سے اگر اس کی عمر بھی زیادہ نہ ہو اور زندگی کے تجربات بھی اس کے محدود ہوں تو وہ اچھا افتتاحیہ نگار یا ایڈیٹر تو ہو سکتا ہے لیکن صحیح معنوں میں طالب علم نہیں رہ سکتا۔" ص۱۰۱
- "......مولانا مودودی اسلامی دینیات کی نظری بحثوں میں پڑ کر یا کچھ INTROVERSION کی نفسیاتی الجھن میں بھی مبتلا ہو گئے تھے۔" ص[illegible]
- "......لیکن عام قارئین جس طرح کہ اخبارات کے افتتاحیوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے اسی طرح مودودی صاحب کے

---

[1] اس شریف قومی کو یہ معلوم نہیں کہ جماعتِ اسلامی کے پہلے اجتماع میں اس کے اولین ارکان نے مولانا مودودی کو اپنی آزادانہ مرضی سے سوچ سمجھ کر امیر منتخب کیا تھا۔ "خود امیر بنے" نہیں بلکہ جماعت کی طرف سے یہ ذمہ داری ان کے کندھوں پر رکھی گئی۔ [2] یہ فقرہ اس آسمانی کتاب سے لیا گیا ہے جو "جماعتِ اسلامی پر ایک نظر" کے نام سے سرکاری طور پر مرتب کرائی گئی تھی۔ [3] اف یہ جنہل خودانہ ذہنیت!!

ان مضامین سے بھی قدرتاً متاثر ہوتے ہیں اور انہیں حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اور جس طرح اپنے تیر بہدف ٹوٹکوں کے ذریعے عطائی حکیم بہت کامیاب رہتے ہیں، اسی طرح سیاست و معیشت اور معاشرت جیسے دقیق موضوعات پر عطائی اہلِ قلم کی تحریریں بڑی مقبول ہوتی ہیں۔ ص ۱۰۱

- "۔۔۔۔۔۔ لیکن جن بنیادوں پر وہ تحریر و تقریر کی یہ عمارت اٹھاتے ہیں وہ بالکل غیر منطقی اور عملاً بودی ہوتی ہیں۔" ص ۲۳۹
- "مولانا ۱۹۴۷ء تک اسی جوش و خروش میں لکھتے چلے گئے بلکہ جوں جوں دن گزرتے گئے ان میں شدت اور غلو زیادہ ہوتا گیا۔" ص ۲۲۳
- "دیکھیں عجیب بات یہ ہے کہ جب مولانا مودودی سیاسی، معاشی، اجتماعی اور موجودہ زندگی کے اس قسم کے دوسرے شعبوں کے مسائل میں اجتہاد کرتے ہیں تو ان سے بڑی بنیادی اور فاحش غلطیاں ہوتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان علوم میں ان کو زیادہ درک نہیں۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان کا علم تمام تر سطحی اور اخباری ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ مولانا تاریخ سے مطلب یہ کہ تاریخی تنقید سے بے نیازانہ واقع ہوئے ہیں۔" حاشیہ ص ۱۸۷
- "لیکن مولانا مودودی کو اصرار ہے کہ نہیں، جو کچھ وہ اپنے اجتہادات اور استنباطات پیش کر رہے ہیں وہی اللہ اور اس کے نبی کے مقصود اصلی ہیں اور آیات و احادیث سے جو مفہوم (مدلول) انہوں نے اخذ کیا ہے وہ بمنزلہ نص کے ہے یعنی خدا اور رسول کے صریح اور غیر مبہم حکم کے درجے پر۔ اب اگر کوئی ان کے اس مفہوم کو صحیح اسلام نہیں مانتا تو وہ غیر صالح اور معلوم نہیں اور کیا کیا کچھ ہے۔ اب اس سے زیادہ ایک شخص کا ادعا و تحکم کیا ہو سکتا ہے۔ اور میرے خیال میں اسی بنا پر بعض علماء کی طرف سے مودودی صاحب پر نعوذ باللہ نبی بننے کا الزام[1] لگایا جا رہا ہے۔" ص ۱۹۶
- "حالات کے الٹ پھیر کی وجہ سے ہر روز جو نت نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان کے متعلق مولانا اپنے فیصلوں کو خدا اور اس کے حتمی اور قطعی فیصلے قرار دیتے ہیں۔" ص ۲۴۱
- "دین اللہ اور حکم اللہ کا جو مفہوم مولانا لیتے ہیں وہ پہلے کبھی نہیں لیا گیا۔" ص ۲۴۲
- "دوسرے مولانا تو اجتہاد کے مدعی ہیں[2]۔" ص ۲۵۰
- "لیکن جہاں تک اس کے (یعنی جماعت اسلامی کے ۔ ن ص) افکار و خیالات کا تعلق ہے ان میں اتنا ہی تشدد و تحکم اور آمریت ہے جتنی نازیوں کے اعمال میں تھی۔" ص ۲۲۶
- "اسی طرح مولانا مودودی کی ذات کے گرد جماعت اسلامی گھومتی ہے۔ اس سیاسی و مذہبی قیادت میں جو کشش ہے اور قیصریت اور پاپائیت کی یکجائی میں جو لذتِ اقتدار ہے اس سے بچنا بڑا مشکل ہے۔" ص ۲۰۶

---

[1] خدا جانے وہ کون سے علماء سرور صاحب نے کہیں چھپا رکھے ہیں جو مولانا مودودی پر ادعائے نبوت کا الزام رکھتے ہوں۔ تاہم سرور صاحب کو یاد نہیں رہا کہ وہ مودودی صاحب کی پہلی تصویر کھینچتے ہوئے یہ رائے ظاہر کر چکے ہیں کہ علماء مودودی صاحب کے ان اجتہادات کی وجہ سے ناراض ہیں جو اصابت رائے اور توازنِ فکر کے مظہر ہیں۔ ملاحظہ ہو حوالہ از ص ۱۸۶۔ [2] پہلی تصویر میں خود ہی مولانا کی اجتہادی بصیرت کی داد دی ہے۔

- "یہ شوشہ کے مسٹر اور بعد کے علامہ اور مفکرِ اسلام (اشارہ ہے جماعت اسلامی کے افراد کی طرف جن میں مولانا مودودی بھی شامل ہیں — ن ص) اپنی اس مذہبیت میں اتنے متشدد، اس قدر کٹر، اس حد تک تنگ دل ہو گئے ہیں کہ ایک عربی درس گاہ کا فارغ التحصیل مُلا کیا ہو گا۔" ص۸۴

فکری سرچشمہ —[1]

- "......چنانچہ مولانا مودودی کی تقریریں اور تحریریں اس ابوالکلام کی گویا صدائے بازگشت ہیں" ص۵۷ (نیز ملاحظہ ہو ص۳۰۵)
- لیکن اگر آپ ذرا غور کریں تو دیکھیں گے کہ مودودی صاحب کے انقلابی فکر کا سارا تار و پود مولانا ابوالکلام آزاد کے دورِ اوّل کی دعوت سے مستعار ہے۔ اور جو باتیں مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیانی زمانے میں کہیں وہی باتیں مودودی صاحب اب دوہرا رہے ہیں۔" ص۳۰۸۔

"مودودی صاحب کی تمام تر دعوت مولانا آزاد کی دعوت کی نقل ہے۔" ص۹۲

عملی پارٹ —

- "......اور اس کا عملی نتیجہ ظاہر ہے، یہی ہو سکتا ہے کہ انگریز بدستور رہے اور ہمیں سے ہم پر حکومت کرے اور ہم اس کے زیر سایہ احیائے اسلام اور تجدید دین کے ہفت خوان بڑے صبر و ضبط سے طے کرتے رہیں۔" ص۱۵۹
- "......لیکن مودودی صاحب خدا کی حاکمیت کو خدا کے ان کروڑوں بندوں کی حاکمیت کی ضد ثابت کر کے چاہتے ہیں کہ یہ کروڑوں انسان اپنے اس حق سے متمتع نہ ہونے پائیں اور وہی گردشِ صبح و شام رہے اور بندے حسب سابق خواجۂ بلند بام کی کوچہ گردی میں لگے رہیں۔ اور نہ سلطانیِ جمہور کا زمانہ آئے اور نہ یہ نقشِ کہن مٹیں۔" ص۲۶۹
- "...... اس لئے اسلامی سیاست کا یہ قرونِ وسطیٰ کا دینیاتی تصور ان (حیدرآباد دکن اور ہندوستان کے دوسرے مسلم اقلیت والے صوبوں کے اونچے اور با اثر طبقے کی طرف اشارہ ہے — ن ص) کے بڑے کام آیا اور اس کے نام سے انہوں نے ڈیموکریسی، جمہوریت اور عوام کے حقِ اقتدار کی مخالفت شروع کر دی اور اس میں خوش قسمتی سے مولانا مودودی ان کے لئے صاحبِ کتاب نہیں بلکہ صاحبِ کتب ثابت ہوئے۔ قومی ریاست کے قیام کو تو یہ تصور اور اس پر مبنی جد و جہد نہ روک سکی، لیکن اس کے کارن مسلم اقلیتوں کے صوبوں کے مسلمان کہیں[2] کے نہ رہے۔" ص۱۴۴

دوسری تصویر کا ماحصل

لیجئے اب دوسری تصویر مرتب ہو کر سامنے آ گئی ہے اور پہلی تصویر اس کے پیچھے اوجھل ہو گئی ہے۔ اس دوسری تصویر میں جو شخصیت جلوہ گر ہے اس میں خلوص نام کو بھی نہیں۔ ہمارے سامنے ایک ایسا انسانی وجود آتا ہے جو دوسروں کے

---

[1] اس بارے میں سرور صاحب نے اتنی متضاد باتیں کہی ہیں کہ ان پر علیحدہ گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ [2] سرور صاحب کو یہ تک معلوم نہیں کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو وقت سے پہلے مولانا مودودی ہی نے یہ انتباہ دیا تھا کہ وہ جس اندھا دھند طریق سے مسلم قوم پرستانہ جذبات میں بہک رہے ہیں اس کی وجہ سے کہیں کے نہ رہیں گے۔ اسی انتباہ کی وجہ سے قبل تقسیم کے اجتماعِ مدراس میں ان کو مسلم لیگی رضاکاروں کے ہنگامے کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن بعد میں وہی ہوا جس کا انتباہ مولانا دے رہے تھے۔ عجیب بات ہے کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں سے کہو اور پاکستان زندہ باد کے نعرے تو مسلم لیگ لگواتی رہی اور فردِ جرم لگ رہی ہے جماعت اسلامی پر!!

اشاروں پر کام کرنے والا ہے، وہ سرکاری افسروں سے ذہنی رہنمائی حاصل کرتا ہے، ذہنی رہنمائی ہی نہیں، مالی مدد بھی پاتا ہے، وہ خود مرکزیت اور انانیت کا مریض ہے، وہ امارت کا حریص اور اقتدار کا شیدائی ہے، وہ تخریبی سرگرمیوں میں مصروف رہنے والا ہے، وہ خود اپنا سرمایۂ علم و فکر نہیں رکھتا بلکہ کسی کے ہاں سے نقل مارتا ہے، وہ سیاسی چالیں چلتا اور داؤں پیچ لڑاتا ہے، اس کی تقریر و تحریر کی بنیادیں بالکل کھوکھلی اور بودی ہوتی ہیں، اس کی مقبولیت بالکل عطائی حکیموں کی نوعیت کی ہے، وہ بسم اللہ کے گنبد میں محبوس پڑا رہتا ہے، وہ جدید مسائل سے آشنا نہیں، وہ اجتہادات میں مروجہ کی تنگ نظری اور رجعت پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ مسٹر سے علامہ بنتے ہوئے کٹر ملا بن جاتا ہے، وہ اپنی ہدایات کو خدا و رسول کے قطعی حکم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اس میں غلو دکھاتا ہے، وہ جو دعویٰ کرتا ہے اسے تحکم سے منوانا چاہتا ہے اور اگر کوئی نہ مانے تو اسے غیر صالح قرار دیتا ہے، اسے مجتہد ہونے کا زعم ہے، وہ قیصریت و پاپائیت کا لذت آشنا ہے، وہ آزادی کا دشمن اور انگریزی اقتدار کو قائم رکھنے میں معاون رہا ہے اور اس نے قومی ریاست کے قیام کی مخالفت کی ہے۔

اس تصویر کے انسان کا سراپا دیکھنے کے بعد کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس میں ان خوبیوں کا دسواں حصہ بھی کھپایا جا سکے جن سے پہلی تصویر بنتی ہے۔ پھر اس ذہن و کردار کے آدمی میں یہ صلاحیت کبھی پائی ہی نہیں جا سکتی کہ وہ اپنے گرد خواص یا عوام کی کوئی تعداد مجتمع کر سکے، تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اثر میں لے سکے اور ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ اس نقشہ کو دیکھ کر کسی کی نگاہ میں کوئی جذبۂ احترام نہیں پیدا ہو سکتا۔

دونوں تصویروں کو اور ان کے مختلف اجزاء کو آمنے سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ کیا ایک ہی شخص کے یہ دونوں روپ بیک وقت ہو سکتے ہیں۔ سرور صاحب کا کمالِ فن یہ ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کے دو آدمی بنا دکھائے ہیں۔ پہلے آدمی کی وہ تعریف کرتے ہیں، دوسرے کے خلاف فردِ جرم لگاتے ہیں۔ ایک کو داد دیتے ہیں، دوسرے پر بیداد کرتے ہیں۔ اس کمال کے عوض اگر ان کو حکومت پاکستان کوئی جاگیر عطا کرے تو یہ فن کی بڑی قدردانی ہوگی۔

مولانا مودودی کے ذہنی مآخذ

یہ نادر تحقیقی کتاب سب سے اہم تصور جو لاتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا مودودی گویا ایک ایسے آدمی ہیں جن کے پلے اپنا کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے دماغ کہیں کسی دوسرے کا لے لیا ہے اور خیالات بنے بنائے کہیں سے حاصل کر لئے ہیں اور اب صنعت میں اپنی دھاک جمائی ہے۔ اتنا ہی نہیں، سرور صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ گویا مولانا مودودی کا بیس بائیس برس کا کام سرے سے کوئی شعوری اور ارادی عمل نہیں ہے بلکہ وہ ماحول کے ایک بے جان آلۂ کار ہیں۔ سرور صاحب نے مولانا کے جو ذہنی آخذ بیان کئے ہیں، ہم نمبروار ان سب کو پیش کرتے ہیں:۔

ا۔۔۔ خاندانی ماحول۔۔۔ "مولانا مودودی کی تربیت ان کے والد نے خاص توجہ سے کی اور مذہبی تعلیم بذاتِ خود دیتے رہے۔ اپنی ذہانت اور مذہبی امور سے شغف رکھنے کے باعث چار سال ہی کی عمر میں مودودی صاحب پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی کے ساتھ اپنے والد کے ساتھ مسجد میں جا کر ادا کرنے کے عادی ہو گئے۔ پانچ سال کی عمر میں انہیں قرآن شریف کی تقریباً ۳۰ آیات بامعنی یاد ہو چکی تھیں۔ روزے کی عمر کو پہنچنے سے پہلے انہوں نے باقاعدگی سے روزے رکھنے شروع کر دیئے تھے۔ (ص ۱۰)" "مولانا ماں باپ کے لاڈلے تھے۔ (ص ۱۱) ماں باپ کے علاوہ گھر میں مولانا کے بڑے بھائی بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ (ص ۱۲)" "آپ کے پھوپھا

سارا زمانہ اس ماحول میں گزرا۔ ایک طرف ماں باپ اور بڑے بھائی کی غیر معمولی محبت تھی اور دوسری طرف اپنی عمر سے بہت بڑے والد کے دوستوں کی صحبت جو سب کے سب سنجیدہ، شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔" (ص۱۴) "چنانچہ گھر کے ماحول میں ان کے اندر اوروں سے کچھ ممتاز اور سب کا مرکزِ توجہ ہونے کا جو احساس پیدا ہو گیا تھا ......" (ص۱۵) "غرض یہ کہ اپنے ماحول میں کسی نہ کسی طرح دوسروں سے ممتاز ہونے کے لئے مولانا کا کوشاں رہنا مولانا کے شخصی کردار کا ایک اہم پہلو بن گیا ہے۔ وہ مولویوں میں اپنی مسٹریت کی وجہ سے جس کا اظہار ان کی باقاعدہ زندگی اور تقریر و تحریر کے جدید اسلوب میں ہوتا ہے ممتاز ہیں، اور مسٹروں میں اپنی مولویت کی وجہ سے۔" (ص۱۶) "اور مولانا مودودی نے ۱۹۳۲ء میں اپنے حالات لکھے تو انہیں اسی خاندانی فخر و شرف کے ذکر سے شروع کیا۔" (ص۹) "نیز ان کی زندگی میں بڑا نظم و ضبط ہے ...... یوپی اور دہلی کے پرانے مسلمان شریف خاندانوں کی تربیت کا یہ قدرتی نتیجہ ہے۔" (ص۱۹) "مودودی صاحب کا افلاطونی طرز کی اسٹیٹ کا تصور جہاں صرف اشراف کو حقِ حکمرانی ہو، مولانا کے ہاں ان خاندانی اجتماعی اور تاریخی حالات و ظروف کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ بے شک اشراف کی گروہی خصوصیات اور ان کے ذاتی اوصاف زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے اور بعد میں شرافت کا مطلب تقویٰ ہو گیا۔" (ص۲۰)

۲ــــ الجمعیت کا ماحول ــــ "الجمعیت کا یہ ماحول جس میں مودودی صاحب نے زندگی کے نو سال گزارے، ظاہر ہے بڑا بھنچا ہوا ہو گا۔ لمبی لمبی ڈاڑھیوں اور کافی بڑی عمر والے علماء کے اندر ایک ڈاڑھی منڈے نوجوان کا اس طرح زندگی گزارنا، کہ وہ عمر میں ان سے چھوٹا ہونے کے باوجود ان کے اخبار کا ایڈیٹر اور اس لحاظ سے ان کا ترجمان اور ذہنی قائد ہو، کچھ عجب معلوم ہوتا ہے اور یقیناً اس کا اثر مودودی صاحب کے فکری ارتقاء پر بھی پڑا ہو گا۔" (ص۹۹)

۳ــــ حیدر آباد کی فضا ــــ "لیکن ریاست حیدر آباد بھی فتنوں سے مامون نہ تھی۔ کانگریس اور انگریز کی کشمکش کے اثرات وہاں بھی پہنچ رہے تھے ...... اور پھر دستور ۱۹۳۶ء کے نفاذ سے کانگریس کو قوت ہوئی اور اس نے ریاستیوں کے خلاف مہم شروع کر دی۔. ...... لیکن سب سے بڑی ہل چل جس نے ان دنوں کے ریاست کے حکمرانوں کو تشویش میں ڈال دیا تھا وہ وہاں کی ملکی تحریک تھی ...... اس تحریک سے ریاست کے بڑے عہدہ دار اور ملازمت پیشہ مسلمان طبقے جو شمالی ہند بالخصوص یوپی اور دہلی کے تھے، سخت پریشان ہوئے ...... مودودی صاحب بھی ان حالات سے متاثر ہوئے اور انہوں نے جب ترجمان القرآن نکالا تو اس مرض کا مداوا کرنے کی کوشش کی ...... ظاہر ہے، مولانا مودودی کی اس دعوت کی اساس اسلام ہی ہو سکتا تھا، کیوں کہ اسلام ہی کے ذریعے وہ ایک مسلمان اقلیت کے لئے ہندو اکثریت پر حکومت کرنے کا حق ثابت کر سکتے تھے۔" (ص۱۰۴-۱۰۵) "غرضیکہ قرآن کے منبعِ فیض اور اعتصام بحبل اللہ کا حاصل مقصود مختصراً جاگیر داروں کو جھنجھوڑنا اور عام مسلمانوں کو یہ یقین دلانا ٹھہرا کہ حیدر آباد تمہارا مفتوحہ، مقبوضہ ملک ہے اور تم اس کے کشور کشا اور فاتح ہو، الی آخرہ ــــ گویا مودودی صاحب کی اسلامی قومیت کی دعوت بعد میں اس مادی شکل میں بروئے کار آئی۔" ص۱۰۶ "وہاں کی (حیدر آباد کی) ملکی تحریک کی مخالفت اور ریاست کی غیر مسلم غالب اکثریت کے مقابلے میں حکمران جاگیردار اور ملازمت پیشہ مسلمان اقلیت کے شاہانہ حقوق کی حفاظت کی ضرورتوں نے ہمارے خیال میں مولانا مودودی کو آمادہ کیا کہ وہ اسلامی سیاست کے متعلق اپنے مخصوص نظریات پیش کریں۔ ان نظریات کی اس وقت حیدر آباد کے مسلمانوں کو بڑی ضرورت تھی اور وہ نظریات کافی مقبول بھی ہوئے۔ بعد میں انہی نظریات کے

اساس پر وہاں مجلس اتحاد المسلمین بنی جس نے کہ آخر میں قاسم رضوی کی قیادت کو پروان چڑھایا"۔ ص ۱۳۳

۴ ــــ ہندوستان کے مخصوص حالات ــــ "مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کے افکار و آراء کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ ان کے خاندانی حالات کے ساتھ ساتھ اس ذہنی فضا کا بھی تجزیہ کیا جائے جس نے مولانا کے خیالات کو جنم دیا اور ان کی فکری و عملی سرگرمیوں کو ایک خاص ڈھرے پر ڈالا"۔ ص ۲۹ "ہندوستان کے مسلمانوں کا معاملہ (قیام پاکستان سے پہلے) دنیا جہان کے مسلمانوں سے نرالا رہا ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جہاں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہو اور پھر وہ اسی ملک کے باشندوں کے مقابلے میں اقلیت میں بھی ہوں"۔ (ص ۲۹) "ہندوستان ہی ایسی سرزمین ہے جس کے طول و عرض میں مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک حکومت کی ہے اور حکومت جانے کے بعد وہ وہاں اقلیت میں ہیں اور ان کو غیر مسلم اکثریت کے تسلط سے اپنا اسلامی وجود خطرے میں نظر آتا ہے"۔ (ص ۳۰) دوسری وقت یہ بھی کہ ...... غیر مسلم اکثریت میں جو پہلے ان کی محکوم تھی، اس طرح ضم ہونا انہیں گوارا نہ تھا کہ دونوں کا تمدن ایک ہو جائے۔ (ص ۳۱) "ہندوستان کے مسلمان اور ہندو ایک قوم نہ بن سکے اور اکبر، داراشکوہ اور گورونانک کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں"۔ (ص ۳۱) "ان حالات کی وجہ سے مسلمانوں میں نہ تو علاقائی و وطنی قومیت کے خیالات نشوونما پا سکے اور نہ وہ ہندو اکثریت کو دیکھتے ہوئے نمائندہ اداروں سے مطمئن ہو سکے نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی ساری توجہ اپنے مذہب، اپنے تمدن اور مسلمان قوم کی نظری برتری کی طرف مبذول ہو گئی اور ان کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا یہی مرکزی نقطہ بن گیا اور چونکہ اس مرکزی نقطے کا تعلق تخیل سے زیادہ اور حقیقت سے کم تھا .... اس لئے یہ زیادہ سے زیادہ نظری بنتا گیا۔ اور اس کے ساتھ اس میں بلند پروازی اور آفاق پیمائی بھی آتی گئی جو بے عملی کا لازمہ ہے۔ (ص ۳۵) "پہلے تو ان کے رہنماؤں نے یہ کوشش کی کہ نمائندہ ادارے ہی نہ بنیں ...... بعد میں جب نمائندہ ادارے وجود میں آ ہی گئے، تو جداگانہ انتخاب اور نامزد سرکاری نمائندوں کی مدد سے وہ کونسلوں میں ہندو اکثریت کے مقابلے میں اپنا بھرم قائم رکھ سکے۔ لیکن آخر میں جب نامزد سرکاری نمائندوں کا یہ سہارا بھی جاتا نظر آیا تو ان میں ایک عام مایوسی پھیل گئی"۔ (ص ۳۶-۳۵) اس مایوسی نے ان میں ایک ذہنی ہیجان پیدا کر دیا اور عام مسلمان مردے از غیب کا انتظار کرنے لگے"۔ (ص ۳۶) "یہ تھی مختصراً ہندوستان کی سیاسی و ذہنی فضا جس میں مولانا مودودی کے تصورات تشکیل پذیر ہوئے"۔ ص ۳۸۔

۵ ــــ اسلامی رومانیت کا دور ــــ "الغرض سرسید کی اسباب پرستی، اطاعت شعاری، حقیقت پسندی اور مصلحت کیشی کا ردعمل یہ ہوا کہ ہم جذبات پرستی، مصلحت کشی اور جوش و خروش کے طوفان میں بہ گئے جسے ایک لفظ میں اسلامی رومانیت کہا جا سکتا ہے۔ اس کو سب سے زیادہ اس دور میں الہلال نے ہوا دی۔ مولانا محمد علی تو آخر تک کسی نہ کسی حد تک اس اسلامی رومانیت سے وابستہ رہے۔ اور علامہ اقبال تو بہرحال شاعر تھے، یہ کیسے ممکن تھا کہ ان کا موضوع شاعری اسلام اور اس میں رومانیت نہ آئے۔ اس دور میں یہ رومانیت ہماری قوم کی پوری زندگی پر چھا گئی"۔ (ص ۵۰) "علامہ اقبال کی ۱۹۰۸ء سے بعد کی بانگ درا میں جو نظمیں ہیں ان میں یہ اسلامی رومانی رنگ بڑا گہرا ہے" (ص ۶۱) "شکوہ کے جواب میں خدا بندے سے ہم سخن ہو کر اقبال کی زبان میں جو کچھ کہتا ہے وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اسلامی رومانیت کے اس دور کی بہترین تصویر ہے"۔ (ص ۵۳) "بدقسمتی سے ہمارا حال بڑا مایوس کن ہے ..... چنانچہ اپنے حال سے ہماری بیزاری اور اپنے مستقبل سے ہمارا خوف برابر بڑھتا گیا جس کا قدرتی ردعمل یہ ہوا کہ نہ صرف ہمارے عوام اور متوسط طبقوں نے بلکہ ہمارے خواص اور اہل علم و فکر بلکہ شعراء اور ادباء نے بھی ماضی کو پناہ گاہ بنایا جو ہر لحاظ سے ہمارے حال سے زیادہ ہمارے لئے باعث افتخار تھا ...... یہ ردعمل فطری تھا اور اسے اجاگر کرنے اور مقبول بنانے میں گزشتہ ساٹھ ستر سال میں شبلی، حالی، ابوالکلام، محمد علی جوہر، اقبال اور ظفر علی خاں وغیرہ سب نے

حصہ لیا" (ص ۲۱۰-۲۱۲) "غرض یہ کہ دوش کے آئینے میں فردا کو دیکھنا اور ماضی سے استقبال کی تفسیر کرنا اپنی اپنی پسند اور مرتبے کے مطابق مسلمانان پاک و ہند کے ہر طبقے کا دلپسند مشغلہ بن گیا ... مودودی صاحب بھی قدرتاً ہندوستانی مسلمانوں کی اس عام ذہنی فضا سے متاثر ہوئے" (ص ۲۵۵) "...... یہ تھا وہ علمی، ذہنی اور سیاسی پس منظر جس میں وہ (یعنی مولانا مودودی — ن ص) گھرے ہوئے تھے۔ اس پس منظر کے نقوش مولانا مودودی کے ذہن پر اتنے گہرے مرتسم ہو چکے ہیں کہ وہ اب تک انہی نقوش کی عینک سے دیکھتے ہیں۔" (ص ۲۵۶)

۶- مولانا آزاد کی دعوت[1] — "واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی آج وہی کچھ کہتے ہیں جو ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۱۲ء تک مولانا ابوالکلام کہتے اور لکھتے رہے اور جس پر کہ کبھی ہندوستانی مسلمان سر دھنتے اور انہیں آنکھوں پر بٹھاتے تھے ...... چنانچہ مولانا مودودی کی تقریریں اور تحریریں اسی ابوالکلام کی گویا صدائے بازگشت ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ دوسرے ماحول میں اور مختلف صداکار کی زبان سے" (ص ۵)۔ "مولانا آزاد نے جو دعوت ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء میں دی اور اس کے بعد انکے پیرو اسی وقت برسر کار ہو گئے اور خطابت کی بلند پروازیوں سے سیاسی حقائق کی ٹھوس زمین پر اتر آئے، مولانا مودودی اس نغمے کو ذرا دوسرے سروں میں ۱۹۳۹ء میں الاپ رہے ہیں" (ص ۳۰۵) "مودودی صاحب کے انقلابی فکر کا سارا تار و پود مولانا ابوالکلام آزاد کے دور اول کی دعوت سے مستعار ہے۔" (ص ۳۰۴) "مولانا ابوالکلام آزاد کی اس دور کی تحریروں کے ان طویل اقتباسات سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مودودی صاحب کے بیشتر مفکرانہ کارنامے کس حد تک مولانا آزاد ہی کی دعوت کا نقش ثانی ہیں" (ص ۳۱۱)

۷- دہلی کے ایوانوں اور سرکاری افسروں کے حلقے — "اسلامی قومیت کی اشاعت کی وجہ سے مولانا حکومت ہند کے بعض اعلیٰ افسروں میں جو دہلی میں مقیم تھے بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور وہ آپ کو اپنا بزرگ اور ایک طرح سے مرشد سمجھتے تھے۔ ان دنوں جب کبھی مولانا دہلی تشریف لاتے تو ان کا قیام اپنے ان نیازمند افسروں ہی کے ہاں ہوتا۔ ان میں بعض افسروں کو مولانا کی تحریروں کے [illegible] تھے ...... اگر کوئی شامت کا مارا متحدہ قومیت کا حامی ان کے نرغے میں آجاتا تو وہ اس پر انہی دلائل کو دے مارتے اور اس طرح اسے بڑی آسانی سے مغلوب کر لیتے۔ چنانچہ نئی دہلی کی اسلامی فضا میں اس زمانے میں مولانا مودودی کا خوب چرچا ہونے لگا اور ہندوستانی متحدہ قومیت کی مخالفت کی وجہ سے وہ بقول شخصے پجنے لگے۔ بات یہ تھی کہ خدا خدا کر کے بڑی مدت کے بعد دہلی کے ان مسلمان سرکاری حلقوں کو ایک ایسا مسلمان عالم ملا تھا جو ان کے خیال میں جدت افکار اور اسلوب نگارش میں مولانا آزاد کے مقابلے میں لایا جا سکتا تھا۔ ...... قیاس یہ بتاتا ہے کہ مندرجہ ذیل چار حقیقتیں — ایک یہ کہ اسلام کا مقصد زندگی کے خارجی نظام کو بالکل بنیادی طور پر بدل دینا ہے، دوسرے[2] یہ کہ کلی و اساسی تغیر اسی طریقے پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے

---

[1] اس مقام پر سرور صاحب لکھتے ہیں "بات یہ ہے مستقبل کی راہ 'وطنی قومیت' کی راہ تھی"۔ [2] اسلام کی بنیادی دعوت کو چونکہ ہر دور میں رجال امت نے بار بار پیش کیا ہے، لہٰذا ایک مولانا آزاد تو کیا، کسی بھی اسلامی شخصیت کو لے کر کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مودودی نے اس سے خیالات مستعار لئے ہیں۔ درحقیقت اسلامی دعوت کے علمبرداروں کی ذہنی مشابہت کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ سب کا سرچشمہ ایک ہے اور سب کے سامنے اسلام کا وہ جوہر حقیقت ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔ رہا وہ فرق جو مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے طرز فکر، طریق دعوت اور طریق کار میں ہے اسے جاننے کے لئے سرور صاحب کیوں کاوش کریں۔

اختیار کیا تھا۔ تیسرے[۳] یہ کہ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ اب ہو رہا ہے سو وہ تو اس مقصد کے لئے صحیح ہے۔ ورنہ اس طریقہ پر ہے۔ چوتھے[۴] یہ کہ اب ایک ایسی سیاسی جماعت کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں اسلامی جماعت ہو اور اسلامی نصب العین کے لئے اسلامی طریقے پر کام کرے (یہ چاروں نکات 'سیاسی کشمکش' کے حوالے سے درج کئے گئے ہیں۔ ناقل) — مولانا مودودی پر اسی زمانے میں وا انکشاف ہوئیں جب کہ بڑے بڑے مسلمان افسر ان کے سامنے تعظیماً بیٹھا کرتے اور ان کے ارشادات کو ایک دوسرے سے تبرکاً روایت کیا کرتے تھے۔ اور ان کے گرد تقدس کا ایک ہالہ بنا دیا گیا تھا اور ادھر ہر طرف نیازمندی ہی نیازمندی تھی۔" (ص ۱۱۲-۱۱۰) "معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہ تاثرات تمہید ہیں ان گفتگوؤں کا جو شاید ان ہی موجودگی میں ان کے نیازمند حکومت ہند کے بعض بڑے مسلمان افسروں کی محفلوں میں ہوتی ہوں گی اور جن میں بڑے خلوص سے ان خیالات کا اظہار کیا جاتا ہوگا کہ ملت کے مفاد کا تقاضہ یہ ہے کہ انگریزی اقتدار جلد یہاں سے نہ جائے ......" (ص ۱۰۰) "..... ممکن ہے مولانا مودودی اپنے نیازمندوں کے خلوص سے متاثر ہو کر اُن کے ان خیالات سے ایک حد تک ہم نوا ہو گئے ہوں۔" (ص ۱۵۶)

۸ - طبقۂ شرفا — "بے شک مودودی صاحب رؤسا کے اس طبقے کے نمائندہ نہ تھے۔ لیکن اس سے نیچے کے مسلمان شرفا کے طبقے سے تو ان کا ضرور تعلق تھا...... اس طبقے میں عام دکھ دکھاوا بھی ہے، مذہب سے وابستگی بھی، اور حسنِ اخلاق کا بھی اسے خاص پاس رہتا ہے...... اس طبقے کو ادبار و زوال دیکھ کر مولانا کو بڑا دکھ ہوتا ہوگا اور ایک ذہین آدمی ہونے کی وجہ سے وہ اس کے تدارک کا بھی سوچتے ہوں گے۔" (ص ۲۵۸)

۹ - تحریک اخوان المسلمون — "ہمارے ہاں کی جماعت اسلامی اور مصر کی جماعت اخوان المسلمون میں بڑی مشابہت[۱] پائی جاتی ہے" (ص ۱۶۲) "جماعت اسلامی کے مخصوص دینی و فقہی افکار اور معاشرتی نظریات پر اخوان کے ان رجحانات کا کتنا بڑا اثر ہے" (ص ۱۹۱) "اس سلسلے میں دونوں جماعتوں کی تکنیک کس قدر آپس میں ملتی ہے" (ص ۱۹۲) "آپ نے ان صفحات میں دیکھا کہ اخوان اور جماعت اسلامی کے اصول و مبادی اور ان کے طریقۂ کار، طرزِ کار اور تکنیک میں کتنی مشابہت ہے" (ص ۲۱۴) "ہاں یہ ہے کہ اخوان کی یہ ساری کامیابیاں ۱۹۳۸ء تک اتمام کو پہنچ چکی تھیں اور اس کے پورے تین سال بعد مولانا مودودی ۱۹۴۱ء میں اپنی جماعت کی بنیاد رکھتے ہیں[۲]۔" (ص ۲۱۵)

۱۰ - خیری برادرس — "دہلی کے باخبر اور معتبر حضرات کا قول ہے کہ مولانا مودودی ایک مدت تک خیری برادرس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ جماعتی تنظیم اور پروپیگنڈا کے جو اصول مولانا عبدالستار خیری جرمنی سے سیکھ کر آئے تھے وہ ان سے اخذ کئے، انہوں نے مولانا عبدالجبار خیری کی وحدتِ آمریت پر تو آمنا و صدقنا نہ کہا لیکن جو تحریک خود انہوں نے بعد میں چلائی اس میں خیری برادران کی

---

[۱] اس مشابہت کا ماخذ بھی وہی وحدتِ سرچشمہ ہے۔ ظروف و احوال کے اختلاف کے باوجود اسلام کے مرکزی چشمے سے جو طالب بھی استفادہ کرتا ہے وہ ایک ہی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ اور آج تو احیائے اسلام کی تحریکیں ترکیہ سے لے کر انڈونیشیا تک ہر جگہ موجود ہیں اور ان کی بنیادی دعوت میں یکسانی پائی جاتی ہے۔ [۲] سرور صاحب یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب نے اخوان کا چربہ اتارا ہے اور کچھ نہیں۔

تحریک کی بہت سی خصوصیات شامل تھیں۔" (ص ۲۵۸-۵۹) [1]

۱۱۔ نازی اور فاشسٹی تحریکیں ——— "مولانا مودودی کی ابتدائی زندگی سے واقفیت رکھنے والے حضرات کا بیان ہے کہ ایک زمانے میں موصوف بعض نازی اور فاشسٹ رجحانات رکھنے والے افراد کے زیرِ اثر رہے ہیں اور ان کے اسلامی تصورات ریاست میں بہت کچھ جھلک نازی اور فاشسٹی تحریکوں کی ہے اور یہ کہ مولانا جس طرح ایک زمانے میں ہٹلر اور مسولینی سے متاثر تھے اسی طرح مارکس، لینن اور اسٹالین کی کامیابیوں نے بھی ان کے دماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے اور کمیونزم کی کتابیں بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں۔" [2] (ص ۲۱۱) "مودودی صاحب اشتراکی تحریک سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔" (ص ۲۶۰) "بات در اصل یہ ہے کہ ان دنوں مودودی صاحب مسلمانوں کے حق و بدل کے غیر فانی اصولوں کی تشریح نازی اثرات کی روشنی میں کرنے کی طرف مائل تھے۔" (ص ۲۶۴)

"اس سلسلہ میں نازیوں کے ہاں آریائیت یا ذور تفاخیں کا تصور نظری رہا ہے تھا اور اس میں نسلی حقیقت کم تھی، مولانا مودودی اس کی جگہ اسلامیت کو رکھتے ہیں اور اس کی اپنی تشریح کرتے ہیں اور اسے پوری دنیا میں اقتدار کے حصول کا سرٹیفکیٹ قرار دیتے ہیں۔ نازیوں کی طرح مولانا کا اسلامی اسٹیٹ بھی ہمہ گیر ہے اور اس اسٹیٹ کے امیر کو بھی غیر معمولی اختیارات حاصل ہیں۔ نیز اس کے عوام ہرگز شریکِ حکومت نہیں ہوں گے بلکہ ان کا کام صرف اطاعتِ امیر ہو گا۔ مختصراً سوائے اس کے کہ ہٹلر کا خدا صرف آریاؤں کا خدا تھا اور مولانا کا خدا یا صحیح معنوں میں ان کے خدا کا تصور صرف صالح مسلمانوں کا خدا ہے اور اول الذکر کا عقیدہ آریائی فوقیت پر تھا اور مولانا کا اسلامی صالحیت پر ہے۔ باقی جہاں تک مودودی صاحب کے اس سیاسی فکر کی عمارت ہے وہ بالکل نازی فکر کا چربہ ہے۔" (ص ۲۶۵-۶)

۱۲۔ خاکسار تحریک ——— "حالاں کہ خاکسار تحریک کے بنیادی اصول بعینہ وہی تھے جن کی تلقین خود مودودی صاحب کرتے تھے۔" (حاشیہ ص ۲۴۳)

۱۳۔ ملتِ اسلامیہ ——— "...... اور عوام مسلمانوں میں بھی صرف اسلام ہی کی اپیل کارگر ہو سکتی ہے اور مودودی صاحب یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے، کانوں سے سن چکے اور صفحاتِ کاغذ پر پڑھ چکے تھے۔" (ص ۲۵۷) "ہماری قوم کا یہ رجحان کوئی دس بیس سال سے نہیں، بلکہ اس کا سلسلہ بہت دور تک جاتا ہے۔ ہندوستان میں مغل حکومت کے زوال کے ساتھ ہی اٹھارویں صدی میں مسلمانوں کی جو اصلاحی تحریکیں اٹھیں وہ خالص مذہبی تھیں ..... اور ہندوستانی مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا تمام تر مذہب ہی بن گیا چنانچہ مذہبی علماء کے علاوہ خالص سیاسی لیڈروں کو بھی جمعیت بہم کرنے کیلئے مجبوراً مسلمانوں کے مذہبی شعور سے ہی اپیل کرنی پڑی۔ اب اگر کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی عالمِ دین یا مولانا ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کے اس عام مذہبی شعور کے مطابق بات نہیں کرتا تو وہ اپنے گرد کبھی مسلمانوں کی جمعیت بہم نہیں کر سکتا۔" [3] (ص ۵۸)

---

[1] یہ الفاظ بھی سرور صاحب نے اسی "اسماعی" کتاب کے حوالے سے درج کئے ہیں جس کے مجہول مصنف پر ان کو ذاتی طور پر بڑا اعتماد ہے۔ [2] حاشیے میں سرور صاحب نے حوالے دیئے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کی میز پر کمیونزم کے بارے میں جدید ترین معلومات آفرین کتاب رکھی تھی اور ایک دوسرے موقع پر ہٹلر کی خود نوشت سوانح عمری زیرِ مطالعہ تھی۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ مودودی صاحب ان کتابوں کو پڑھ کر اپنا نقشۂ کار نازی فاشسٹی خطوط پر مرتب کر رہے تھے ——— دوسری طرف اسی شخص پر جدید حالات سے ناواقف ہونے اور بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھنے کا الزام بھی ہے۔ [3] سرور صاحب کس غیر شعوری طریق سے اعتراف کر رہے ہیں کہ ہمارا قومی و ملی ذہن و فکر بنیادی طور پر اسلامی ساخت رکھتا ہے۔

"...... ان کی تمام تر جذباتی وابستگیوں اور عملی صلاحیتوں کا مرکز مذہبی شعور رہا ہے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں سب سے نمایاں اور بنیادی جذبہ یہی تھا۔ اور اسی سے ان کے عمل کی بیشتر سوتیں پھوٹتی تھیں۔ چنانچہ جب کبھی ان کے عوام بلکہ خواص تک کو کسی اجتماعی اقدام کی دعوت دینی ہوتی تھی تو اس دعوت کو مؤثر اور محرکِ عمل بنانے کے لئے ان کے مذہبی شعور سے اپیل کرنی پڑتی۔ مذہبی امور کے علاوہ سیاسی و اقتصادی معاملات تک میں بھی اس اپیل کے بغیر چارہ نہ تھا ...... آخر میں تحریکِ پاکستان کے خالص سیاسی لیڈروں کو بھی اپنی تحریک کو عوام مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لئے مذہبی رنگ دینا پڑا اور اس کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی شعور ہی سے اپیل کی گئی۔ (ص ۲۰) "سیاسی اغراض کے لئے مسلمانوں کی آبادی کے متوسط طبقوں اور عوام کو جنہیں مولانا مودودی نے دوسرے اور تیسرے عنصر سے (سرور صاحب ایک اقتباس پیش کر کے یہ گفتگو کر رہے ہیں ۔ ن س) تعبیر کیا ہے اور اسلام سے جن کی شیفتگی کی اس قدر تعریف کی ہے کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ اور اسلام کے نام سے اپیل کرنا ہندوستان کی اسلامی قیادت کا اس صدی کے شروع ہی سے دستور رہا ہے۔ یہ اپیل بڑی مؤثر اور زود اثر ہے اور نسبتاً آسان بھی ہے، کیوں کہ اس میں زیادہ تر مذہبی جذبات سے کام لینا ہوتا ہے اور اسلام کے نام سے ان طبقوں کے مذہبی جذبات کو ابھارنا چنداں مشکل نہیں۔" (ص ۲۱-۲۲) "ان حالات میں لازماً مولانا مودودی صاحب کو بھی اسی نقشِ قدم پر چلنا پڑا۔ چنانچہ جب انہوں نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی تو وہ از سرِ نو مسلمان ہوئے اور اب ان کی کوشش ہے کہ وہ معمولی سے معمولی مذہبی شعار کی بھی سختی سے پابندی کریں۔" (ص ۲۶)

اس ریسرچ کا ماحصل

سرور صاحب نے بڑی محنت اور عرق ریزی کر کے مودودی صاحب کے سرچشمہ ہائے فکر کا کھوج لگایا ہے۔ اور دور تک تاریخ کی زمین کو کرید کرید کر دریافت کیا ہے کہ اسلامی تحریک کی جڑیں کہاں کہاں تک پہنچتی ہیں۔ حقائق پر کوئی دفتر گنگالیں بجز اس کے یہ معلوم کیا ہے کہ مودودی صاحب کے اسلامی نظریات کے بیج کس کس جگہ سے آئے ہوں گے، لیکن انہوں نے اتنی متضاد باتیں کہہ ڈالی ہیں کہ پڑھنے والے کا ایک بار تو سر چکرا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مودودی صاحب کا ذہن نتیجہ ہے ان کے خاندانی ماحول کا، پھر کہتے ہیں کہ ان کے نظریات حیدرآباد میں بنے، اس کے بعد پھر فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی مسلم قومیت اور اسلامی ورثے کے ماحول نے ان کو ایک خاص طرزِ فکر دیا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ ایک خاص طبقۂ شرفا کے مفاد کے تحفظ کا جذبہ ہے جس نے اسلامی تحریک کی شکل اختیار کی ہے، پھر دعویٰ ہے کہ انہوں نے دلی میں حکومت بنا کے اونچے مسلمان عہدہ داروں سے روشنی حاصل کی ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ وہ ابوالکلام آزاد کی صدا سے بازگشت ہیں، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ انہوں نے اخوان کا چربہ اتارا ہے، پھر فرمایا جاتا ہے کہ انہوں نے خیری برادران سے درس لیا ہے، پھر یہ کہ وہ نازی اور فاشسٹی تحریکوں کے لٹریچر سے فیض پا کر سب کچھ بنے ہیں، پھر یہ کہ انہوں نے اہلِ مشرق کی نقل کی ہے۔ اور آخر میں یہ بات بھی کہہ ڈالی ہے کہ ملت کے عوامی رجحانات کا اتباع کر لیا ہے۔

ملہ سرور صاحب اپنے پورے تحقیقی کارنامے کے خلاف خود ہی یہ الٹا کہیں بیان ثابت کر رہے ہیں کہ مسلمان قوم کے متوسط اور عوامی طبقے اسلامی دعوت کے لئے ساز گار ذہن رکھتے ہیں اور ان کی وابستگی کتاب و سنت سے ہے۔ اور اسی وجہ سے جو کوئی بھی کام کرنا چاہتا ہے اسے بغیر اس کے کامیابی نہیں ہوتی کہ وہ اسلام کا نام لے۔ یہ اس قوم کی مخصوص ساخت اور فطرت ہے۔ ہمارے ہاں ایک غیر فطری مگر عین جائزہ ہے اور اس فطرت کے لحاظ سے یہاں عوامی دعوت و تحریک ہے جو عوام کے اساسی میلانات و جذبات کا لحاظ کرے۔ سرور صاحب یہ بھی اقرار کر گئے ہیں کہ مسلمانوں کا قلیل التعداد بالائی طبقہ اس مذہبیت سے آزاد ہے لہٰذا وہ (بیچ اپنے تنخواہ دار اور بے لوث انصار کے) قوم کے اجتماعی مزاج کے خلاف جا رہا ہے۔

اصل میں سرور صاحب نے مودودی صاحب کو چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے ایک دعوے کی تردید ہو جائے تو دوسرا موجود، اور دوسرا جھوٹا نکلے تو تیسرا حاضر، تیسرا باطل ثابت ہو تو چوتھا پیشِ خدمت!۔ بہرحال کوئی کسی ایک دعوے سے، کوئی دوسرے سے، کوئی تیسرے سے متاثر ہوگا، ورنہ کم سے کم ہر قاری ذہنی الجھن میں تو پڑ ہی جائے گا۔ یہی کتاب کا اصل مقصود ہے۔

بہرحال سرور صاحب کا تصور یہ ہے کہ مودودی صاحب کا سرے سے کوئی مطالعہ نہیں، انہوں نے نہ زمانے کا مطالعہ کیا ہے، نہ تاریخ دیکھی ہے، نہ قرآن اور حدیث سے استفادہ کیا ہے، نہ زندگی کے معاملات پر کبھی غور و فکر کیا ہے، نہ اپنی کبھی کوئی رائے قائم کی ہے، نہ بطورِ خود کسی مقصد کو شعوری طور پر متعین کیا ہے، نہ کام کا کوئی نقشہ اپنی آزاد مرضی سے بنایا ہے، بلکہ یا تو کچھ غیر شعوری اثرات ہیں جنہوں نے ان کے دل و دماغ میں گھر کر لیا ہے اور یا کچھ مانگے تانگے کے نظریات[1] ہیں جن کو تھوڑا سا پیرایہ بدل کر انہوں نے بیان کر دیا ہے۔ کسی متوازن ذہن کے آدمی میں تو یہ بات نہیں آسکتی کہ اس طریقے سے سرور صاحب جیسا کوئی آدمی بھی تشکیل پا سکتا ہے، کجا کہ کوئی مودودی وجود میں آ جائے۔ پھر وہ میدانِ عمل میں کام بھی کرے، لوگوں کو متاثر بھی کرے، ان کو متواتر پندرہ بیس سال اپنے ساتھ لے کر بھی چلے، کام کے پروگرام بنائے اور ان پر ایک جماعتی نظام کو متحرک بھی رکھے، مخالفتوں کے طوفانوں سے بھی گزرے، نہایت درجہ سفلہ اور گندے پروپگنڈے کی آندھیوں کا بھی سامنا کرے، تاریخ کی رفتار پر اثر انداز بھی ہو جائے اور بین الاقوامی دائرے میں اس کے کام کا وزن بھی محسوس کیا جانے لگے۔ سرور صاحب نے جو شخصیت تیار کر کے کتاب میں پیش کی ہے وہ عملاً اور جو کچھ بھی ہو، مودودی نہیں بن سکتی۔

ہنر بھی عیب بن گئے

سرور صاحب کے کمالات میں سے ایک قابلِ ذکر کمال یہ ہے کہ ان کے قلم نے اس کتاب میں مودودی صاحب کے ہر ہنر کو عیب بنا دیا ہے۔

قاعدہ کی بات ہے کہ ہر وہ شخص جو ذہنی یا عملی رہنمائی کے میدان میں کوئی کارنامہ دکھاتا ہے، وہ غیر معمولی شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اور اس کے غیر معمولی پن کے آثار اس کے بچپن میں پہلے سے ملتے ہیں۔ مولانا مودودی کا بچپن بھی بعض پہلوؤں سے غیر معمولی نوعیت رکھتا ہے۔ ان کو بہترین سنجیدہ و مہذب ماحول ملتا ہے، اس میں وہ دین سے وابستگی پیدا کر لیتے ہیں، ان میں سنجیدگی بہت قبل از وقت آ جاتی ہے، دماغی لحاظ سے وہ امتیازی مرتبہ رکھتے ہیں۔ مدرسہ جاتے ہیں تو شریف طلبہ کو دوستی کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ دوسری طرف شریر طلبہ کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں، وہ بڑوں کی مجلس میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں اور بڑوں کے سے انداز و اطوار پیدا کر لیتے ہیں۔ کسی بھی شخص کا بچپن اگر اس نقشے کا ہو تو سنتے ہی آدمی توقع کرتا ہے کہ یہ کوئی بڑا آدمی ہوگا اور کوئی خاص کام اس کے ہاتھوں سے انجام پانے والا ہوگا۔ لیکن سرور صاحب نے اس سے بالکل الٹے نتائج برآمد کر لئے۔

نو عمری میں مولانا کا الجمعیت کی ادارت کی مسند سنبھالنا اور اس منصب کا حق ادا کر دکھانا ایک ایسا واقعہ ہے کہ جو غیر معمولی قابلیت و ذہانت کا ثبوت ہے۔ اسی طرح الجہاد فی الاسلام جیسی تحقیقی تصنیف کا عنفوانِ شباب میں مرتب کر دکھانا مودودی صاحب کی علمی عظمت

---

[1] سرور صاحب ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ مودودی صاحب نے یہ خیالات فلاں اور فلاں سے لئے ہیں اور دوسری طرف یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ انہوں نے ایک نیا اسلام بطورِ خود گھڑ لیا ہے کہ علامہ اقبال نے جسے سوچ سمجھ کر اتوں نے لکھا ہے، (زیر)!

کی ایک دلیل ہے۔ اور ان کے بارے میں توقع ہوتی ہے کہ وہ اس سے بڑے کام کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہوں گے، لیکن سرور صاحب نے برعکس رائے قائم کی۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ ایسے غیر معمولی درجے کے کام کرنے سے آدمی میں خود مرکزیت اور واحدیت اور امتیاز پسندی کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ تندرست ذہن ہوگا جو اس طرح کے کام نہ کر دکھائے۔

ایک شخص نوعمری میں جب تک شعوری طور پر کسی قطعی نظریہ و مقصد پر ٹھک نہیں جاتا، تو اس کی زندگی میں بعض بےجوڑ چیزیں موجود ہو سکتی ہیں۔ بعد میں جب پختگی کا دور آنے پر وہ کوئی راہِ عمل معین کرتا ہے تو بشرطیکہ اخلاص وہ اپنی پوری زندگی کو یک رنگ بنا کر اس پر ڈال دیتا ہے۔ مودودی صاحب اوائل میں وضع قطع کے لحاظ سے وہ کچھ نہ تھے جو کچھ آج ہیں یعنی داڑھی منڈاتے تھے، انگریزی بال رکھتے تھے، غالباً کبھی کبھی ہیٹ بھی استعمال کر لیتے تھے، سینما بھی دیکھ لیتے تھے۔ بعد میں جب نظریۂ اسلامی کو شعوری طور پر اپنایا تو پھر ایک مخلص آدمی کی طرح اپنے آپ کو اس نظریے کے سانچے میں ڈھال دیا۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہوئی، کوئی افسوسناک حادثہ نہیں ہوا، لیکن اسی پر سرور صاحب نے "پہلے کے مسٹر اور بعد کے علامہ" کی پھبتی کسی ہے۔

آج ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ایک طرف جدید زمانے کو جانتے ہوں اور دوسری طرف اسلام کا تحقیقی علم رکھتے ہوں۔ اس ضرورت کو بہ دل سے محسوس کیا جا رہا ہے مگر اب تک ایسے لوگ شاذ ہی پائے جاتے ہیں۔ ان شواذ میں سے ایک مولانا ہیں چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ "میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں جس نے قدیم اور جدید دونوں طریقہ ہائے تعلیم سے کچھ کچھ پایا ہے"۔ اس پر بھی سرور صاحب نے پھبتی کس دی ہے کہ وہ امتیاز پسندی کے جذبے کے تحت مولویوں میں مسٹریت کی وجہ سے اور مسٹروں میں مولویت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ (ص ۱۶)

سرور صاحب نے مولانا کے اندر منطقیت کے ہونے کا بھی بار بار ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "انھوں نے جو اس دعوت کو اپنایا تو لازمی تھا کہ اسے اس کے آخری منطقی نتائج پر لے جاتے" (ص ۲۲) یعنی دراصل سرور صاحب وہ بات کہہ رہے ہیں جسے آج کل کی اصطلاح میں "ریاضیاتی طرزِ فکر" کہا جاتا ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر خوبی ہوتی ہے اور اس طرزِ فکر کے لوگوں کا مقام جدید دور کی دوسری اقوام میں ہمیشہ عزت مندانہ ہوتا ہے۔ لیکن سرور صاحب بار بار منطقیت کا لفظ ایک گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، جیسے کوئی بیماری ہے، کوئی جرم ہے!

انسانی معیارات کے لحاظ سے ہمیشہ ان افراد کو قابلِ قدر قرار دیا گیا ہے جو اپنی دھن کے پکے اور اپنے اصول کی علمبرداری میں ثابت قدم ہوتے ہیں اور حالات کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔ لیکن سرور صاحب کے ہاں یہ بھی کوئی شرمناک گناہ ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ایک دنیاوی سیاست دان کے لئے بدلے ہوئے حالات سے اپنے آپ کو عملاً موافق کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا، لیکن ایک ایسے شخص کے لئے جس کی سیاست بقول اس کے خدا کے مقرر کئے ہوئے دستور پر مبنی ہو اور اس کا عقیدہ ہو کہ یہ قیامت تک کے لئے اٹل دستور ہے ...... اس کا بالکل توقع اور اندازہ کے خلاف

رونما ہونے والے حالات سے مصالحت کرنا بڑا مشکل ہے۔" (ص ۱۶۲-۱۶۱)

یہ بات کہ علمی اور سیاسی میدان میں کام کرنے والا کوئی شخص جدید تحریکات اور دنیا کے حالات کا مطالعہ کرتا ہو، ایک متوقع اور ضروری چیز ہے اور جہاں ہو قابلِ تحسین ہے۔ لیکن اگر مولانا مودودی دنیا کے جدید نظاموں اور جدید تحریکوں کا مطالعہ کریں تو سرور صاحب اس میں سے یہ نکتہ نکال لاتے ہیں کہ یہ شخص ہٹلر اور مارکس سے نظریات اور تکنیک اخذ کرتا ہے۔

ان چند مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود سرور صاحب کے ذہن کو کوئی خاص بیماری لگ گئی ہے لیکن کیا کریں اس بیماری کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں!

گزارش

ہم نے سرور صاحب کے تحقیقی کارنامہ کا تجزیہ پیش کر دیا ہے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ دوسروں سے زیادہ خود سرور صاحب اسے غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ پھر سوچیں کہ وہ کن فضولیات سے صفحے کے صفحے رنگ کرا گئے ہیں، اور ابھی اور مجلدات لانا چاہتے ہیں۔ خدا کے لئے وہ سرمایہ اور کاغذ اور روشنائی کے اس صرفِ بے جا کو روکیں اور ایک الجھی ہوئی اور مزید الجھنیں پیدا کرنے والی کتاب کے لئے بے چارے عوام کی جیبوں سے خون پسینے کی کمائی نہ نچوڑیں۔ کیا اب ان کے کرنے کا کوئی شریفانہ اور مہذب کام باقی نہیں رہا کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ کتاب مولانا مودودی صاحب کے کئے کرائے کام کا خاتمہ کر دے گی اور اصلاحی تحریک کا توڑ بن جائے گی۔ اور پاکستان میں اس کی وجہ سے کوئی انقلاب آ جائے گا۔ خدا جانے وہ کس غلط فہمی میں ہیں۔ ہم پھر ان سے اپیل کریں گے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور قوم کے اوپر رحم کھائیں اور اپنے لئے کوئی اچھا مشغلہ تلاش کریں۔

کتاب کی سطح اور نوعیت ایسی نہ تھی کہ اس میں تعلیم یافتہ لوگوں کو مبتلائے فریب کرنے کے لئے جو غلط باتیں کہی گئی ہیں۔ ان کا مدلل جواب دیا جاتا۔ فاضل مصنف نے مولانا مودودی پر ڈکٹیٹری اور تحکم اور تنگ نظری اور مخالفتِ اجتہاد کا جو الزام لگایا ہے اس کے جواب کے لئے "اسلامک لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن" نام کی ایک ہی کتاب کافی ہے جو مولانا مودودی کے تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔

بقیہ۔ عائلی کمیشن اور اُس کی رپورٹ

عیب و ہنر کی تحقیق کر دی جائے۔ مگر اس رپورٹ پر تحقیق و تنقید محض منفی حد تک ہو جانا مفید مقصد ہرگز نہیں۔ قوم کو یہ بتانا ناگزیر ہے کہ اسلامی نظامِ معاشرت کے اصولوں کی روشنی میں تعمیر و اصلاح کا راستہ کیا ہے اور کن تبدیلیوں کی ہمیں ضرورت ہے۔

ان نکات کے تحت ہم بھی رپورٹ پر غور کر رہے ہیں اور اپنے احباب و رفقاء سے بھی درخواست کرتے ہیں وہ بھی غور و فکر سے کام لیں۔ چراغِ راہ کے صفحات اس سلسلے میں ہر نقطۂ نظر سے بحث کرنے کے لئے حاضر ہیں اور اغلباً ہم خود بھی بحث کریں گے۔

کوثر نیازی

غ

اپنوں کی شکایت ہے، نہ غیروں کا گلا ہے
ہر حال میں خوش ہوں کہ یہی اس کی رضا ہے
اِس دورِ زبوں کار میں کہتا ہوں "خدا ہے"
مجھ بندۂ عاجز کی فقط اتنی خطا ہے
سینے میں محبت ہے، نہ آنکھوں میں حیا ہے
ہر کوئی یہاں شیفتۂ کذب و ریا ہے
بدلی ہوئی اس دن سے زمانے کی ہوا ہے
جس روز سے وہ جانِ وفا مجھ سے خفا ہے
کیا طالعِ بیدار ہے، کیا بختِ رسا ہے
کہتے ہیں مجھے لوگ یہ اس در کا گدا ہے
ہر رہزنِ مشّاق جنہیں راہنما ہے
اُن قافلے والوں سے مری راہ جدا ہے
کیوں اُس کی طرف نگہِ محبت نہیں ہوتی
کوثر بھی تو منجملۂ اربابِ وفا ہے

ناصر بچھرایونی

واپسی

کردار

انور: تیس سالہ کلرک

رضیہ: انور کی بیوی

اختری: لازمہ جو بچپن سے اسی گھر میں رہتی چلی آتی ہے۔

فرقان: انور کا دس سالہ لڑکا

غفران: انور کا ڈیڑھ سال کا بچہ

اور ڈاکٹر وغیرہ

پہلا منظر

[چھوٹا سا ایک کمرہ۔ معمولی فرنیچر متوسط طبقہ کے گھرانے کا پتہ دیتا ہے۔ کمرہ کے ایک جانب میز کرسی رکھی ہے جس پر کتابوں اور رسائل کے علاوہ دوا کی شیشیاں، گلاس، چمچہ، تھرمامیٹر وغیرہ رکھا ہے۔ دوسری جانب ایک پلنگ بڑا ہے۔ اور اس پر غفران بیماری میں بے ہوش پڑا ہے۔ لاغر و نحیف جسم سوکھا پتلا چہرہ۔ بیماری نے حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ ایک پتلی سی چادر اوپر پڑی ہے۔ پلنگ کی پائنتی پر رضیہ مغموم و افسردہ بیٹھی غفران کے چہرہ کو تک رہی ہے۔ سرہانے کی طرف ایک کرسی پڑی ہے۔ اس پر انور بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے سے بھی تردد اور تفکر عیاں ہے۔ اس کا ایک ہاتھ غفران کی نبض پر ہے۔ اور نظریں اس کے تمتمائے ہوئے چہرے پر گڑی ہیں۔ کمرہ کی فضا میں بے کیفی و اداسی رچی ہوئی ہے۔ دونوں کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلتی۔ البتہ رضیہ کے منہ سے وقفہ وقفہ بعد ایک لمبی آہ نکل جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی وہ انور کی جانب ایسی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ جس میں خوف و نفرت کی ملی جلی کیفیت پائی جاتی ہے۔ غفران ایک جھرجھری لیتا ہے۔ اور پھر بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ اور چہرہ کو بغور تکنے لگتی ہے کچھ دیر یونہی دیکھتے رہنے کے بعد اچانک مجنونانہ انداز میں چیخ اٹھتی ہے:]

رضیہ: نہیں نہیں۔ میرا لعل مجھ سے نہیں مل سکتا۔ وہ جا رہا ہے۔ ہائے اللہ میں کیا کروں

[انور بڑی بے چارگی و مایوسی سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر ذرا سنبھل کر کہتا ہے۔]

انور۔ نہیں گھبراؤ مت رضو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ دل کو مضبوط رکھو۔

رضیہ۔ کیوں جھوٹی تسلیاں دیتے ہو۔ کیا میں خود نہیں دیکھ رہی۔ ایسی حالت میں شفا کس طرح ہو سکتی ہے۔ آہ میرا لال، تجھے کیا ہو گیا۔ تجھ کو کس کی نظر کھا گئی۔ تو مجھ کو چھوڑ جائے گا۔ میرے چاند مجھ کو ساتھ لے جانا۔

انور۔ دیکھو اس طرح رونے چلانے سے تو اس کی جاتی زندگی واپس آ سکتی نہیں۔ صبر و ضبط سے کام لو۔ دعا کرو۔ شاید قبول ہو جائے۔

رضیہ۔ کیا کہتے ہو۔؟ صبر کو کہتے ہو۔؟ ——— اور کتنا صبر کروں۔ کب تک چپ رہوں۔ تم باپ ہو۔ حیرت ہے۔ تمہارا دل نہیں پسیجتا۔ کیسے چپ ہو۔ تم کیوں نہیں چیختے۔ چیخو چلاؤ۔ اپنے خدا سے چیخ کر پوچھو۔ کیوں وہ ہمارے دل کے ٹکڑے کر رہا ہے۔ اس ننھی معصوم جان نے کیا قصور کیا ہے۔ جو اس پہ رحم نہیں کھاتا ——— ہائے! اے اللہ میں تجھ ہی سے شکوہ ہے۔ برسوں کی خوشیوں کو یوں خاک میں ملا رہا ہے۔ آخر ہم پر ہی یہ ستم کیوں! رحم اے خدا ظالم و سنگ دل خدا!

انور۔ نا سمجھ رضیہ۔ یوں بے وقوفوں کی سی باتیں نہ کرو۔......

رضیہ۔ میں پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے صبر کی تلقین نہ کرو۔ مجھے کہنے دو۔ کہنے دو۔ اپنا دکھ سنا لینے دو۔

انور۔ اپنا درد ضرور کہو۔ لیکن جوش میں اتنا آگے نہ بڑھو رضو! خدا ہمارا امتحان لے رہا ہے۔ دیکھو ہماری ذرا سی لغزش کہیں ہم کو آزمائش میں ناکام نہ بنا دے۔ رضو۔ یہ بڑی کٹھن گھڑی ہے۔ بڑی ہمت و بلندی دکھانے کا وقت ہے۔ دیکھو رضو۔ کہیں ہمارے قدم نہ ڈگمگا جائیں۔ مجھے تمہارے دل کی حالت کا بخوبی احساس ہے۔ لیکن ذرا دل کو تسلی دو۔ اس چیز کے ہم اصلی حقدار ہی کب ہیں۔ یہ امانت ہے۔ مالک جب چاہے لے جا سکتا ہے۔ لہذا ہم کو چاہیے کہ صبر کر کے دعا کریں ممکن ہے۔ قبول ہو جائے۔ اور اس کو شفا بخش کر پھر اس امانت کو ہم میں رہنے دے۔ یہ نادانوں کی سی باتیں نہ کرو رضو۔ یہ کٹھن مرحلہ ہر ذی نفس کے سامنے آتا ہے لیکن بہت کم بندے ایسے نکلتے ہیں۔ جو اپنا سفینۂ ضبط صحیح سلامت پار لے جائیں۔

رضیہ۔ بس خدا کے واسطے چپ رہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے دل میں میرے لعل کے لئے اتنا بھی درد نہیں ہے کہ ذرا تمہاری پلکیں ہی بھیگ جاتیں۔ اگر یہ اس کی امانت تھی۔ تو اس نے دی ہی کیوں۔ ہم نے کب مانگی تھی ......۔ اچھا اگر لینا ہی تھی۔ تو اور جہان بھر کے بچے مر گئے تھے جو اس ننھی جان کے درپے ہے۔

(انور کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بچہ کی صورت دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ بے چینی سے دروازہ کی طرف دیکھتا ہے۔ اور بڑبڑاتا ہے۔ ابا ابھی تک نہیں آیا۔ اتنی دیر کیوں ہو گئی ہے۔؟ کہاں بیٹھ رہا ——— اچانک دروازہ کھلتا ہے اور فرقان داخل ہو کر کہتا ہے ڈاکٹر صاحب باہر کھڑے ہیں۔ انور تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔ بچے پر جھکی ہوئی رضیہ سر اٹھا کر فرقان کو دیکھتی ہے۔ فرقان آگے بڑھ کر تشویش ناک لہجہ میں پوچھتا ہے۔

فرقان۔ امی اب کیسی طبیعت ہے۔ یہ کب جائے گا نا امی؟ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔ وہ ابھی دوا دے کر اچھا کر دیں گے نا؟

رضیہ ۔ نہیں میرے بچے یہ مر جائے گا ۔ دیکھو نہیں رہا سانس کیسے لے رہا ہے ۔ تیری امی اکیلی کیا کرے ۔ تیرے ابا کو تیرے بچانے کے لئے کچھ فکر نہیں ــــــ اللہ سے دعا کر ۔ ہم سب کو موت دے کے اس عذاب سے نجات دے ۔ ......

(عفران پھر ایک جھرجھری لیتا ہے ۔ رضیہ کی بات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے ۔ اور وہ بچے کو لپٹ جاتی ہے ۔ فرقان حیرانی سے دونوں کو دیکھتا ہے ۔ انور ڈاکٹر کو لئے ہوئے داخل ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر مسکرا کر رضیہ کو سلام کرتا ہے ۔)

ڈاکٹر ۔ تسلیمات بیگم صاحبہ ۔ کیا ہوا بچہ کو ۔ کیسی طبیعت ہے ؟

رضیہ ۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے تمام عمر ڈاکٹری پڑھی ہے ۔ اتنے دنوں سے انسانوں کا علاج کر رہے ہیں ــ کیا آپ کسی طرح اس کو موت کے ظالم ہاتھوں سے نہیں چھین سکتے ۔ ؟

ڈاکٹر ۔ انشاءاللہ کیوں نہیں ۔ اگر خدا نے چاہا ۔ تو آپ کا بچہ تندرست ہو جائے گا ۔

رضیہ ۔ دیکھئے ڈاکٹر صاحب تسلی تشفی کی باتیں رہنے دیجئے ۔ صاف صاف کہہ دیجئے کہ اچھا کر دوں گا ۔ یا نہیں ــــ ڈاکٹر صاحب اب میرا دل کسی دلاسے کو قبول نہیں کرتا ۔ انہوں نے ایک دو مہینہ تک دلاسہ دیا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرا چاند زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے ۔ اب مجھے کسی پر یقین نہیں رہا ۔ سب کے دل دل نہیں ۔ پتھر ہو گئے ہیں ۔ محبت و رحم کا جذبہ نام کو نہیں ۔ خود غرض اور طاقت رہ گئی ہے ۔ کسی کو دائمی مسرت نہیں بخشتا ۔ ایک یہ ہیں ۔ ان کے دل میں کوئی ہمدردی نہیں ـــ مر جائے اچھا ہے ، شکر کریں گے ۔ امانت مالک نے واپس لے لی ۔ اور آپ ہیں ، سو ہنستے ہیں ۔ اور تسلی دیتے ہیں ۔ تسلی سے میرا چاند تو واپس نہ آ جائے گا ۔ اس کے لئے اپنی تمام قوت صرف کر دیجئے ۔ ڈاکٹر صاحب ۔ ہائے میرا لختِ جگر !

ڈاکٹر ۔ آپ اتنی فکر کیوں کرتی ہیں ۔ یہ بچہ انشاءاللہ صحت یاب ہو جائے گا ۔ یہ تسلی نہیں ۔ آپ بس خاموشی سے دعا کریں ۔ میں دیکھتا ہوں میرے لئے جہاں تک ممکن ہوگا ، موت کے چنگل سے اس کو چھڑانے کے لئے انتھک جد و جہد کروں گا ۔

(اتنا کہہ کر ڈاکٹر صاحب جھک کر بچے کو دیکھتے ہیں ۔ دیکھتے ہی اچانک چونک اٹھتے ہیں ۔ پھر جلدی جلدی گھبرا کر سینہ ٹٹولتے ہیں نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں ــــ آنکھوں کے پپوٹے کھول کر اندر جھانکتے ہیں ۔ پھر جلدی سے ایک چھوٹا سا انجکشن لگا دیتے ہیں ۔ بچہ تھوڑی دیر بعد جھرجھری لے کر آنکھ کھول دیتا ہے ۔ بے نور سفید آنکھیں ۔ لیکن رضیہ دیکھتے ہی لپٹ کر منہ چوم لیتی ہے ۔ اور ڈاکٹر کی طرف ممنونانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہتی ہے ۔)

رضیہ ــ کس منہ سے شکریہ ادا کروں ڈاکٹر صاحب ۔ میرے بچے نے آنکھیں کھول دیں ۔ اس کی زندگی واپس آ گئی ۔

(اس اثناء میں ڈاکٹر رضیہ کی آنکھ بچا کر انور کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتا ہے ۔ جس میں بے بسی و بے چارگی صاف نظر آتی ہے ۔ انور یہ دیکھ کر کانپ سا جاتا ہے اور حسرت بھری نظروں سے بچہ کو دیکھتا ہے ۔ ڈاکٹر رضیہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے)

ڈاکٹر ۔ اچھا بیگم صاحبہ میں جاتا ہوں ، یہ دوا دے جاتا ہوں ۔ آدھ گھنٹہ بعد اس کو ایک چمچہ پلا دینا ۔ ایک خوراک میں خود پلا جاتا ہوں (یہ کہہ کر ایک شیشی نکال کے ایک چمچہ دوا نکال کر بچہ کے منہ میں ڈال دیتا ہے ۔ بچہ کے حلق سے صرف چند قطرے اترتے ہیں

باقی دوا اِدھر اُدھر بہ گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر سلام کر کے چپ چاپ جانے لگتا ہے ــــ رضیہ اچانک چیخ کر کہتی ہے۔)

رضیہ ۔ ڈاکٹر صاحب ایسے نہ جائیے۔ میرے بچے کو واپس لائے ہیں، بلا کچھ لئے نہ جائیے، ذرا ٹھہریئے!

ڈاکٹر ۔ میں دوبارہ آؤں گا، آپ بچہ کو کامل تندرست ہونے دیجئے۔

(ڈاکٹر چلا جاتا ہے ۔ انور رومال سے آنسوں کے دو نکلے ہوئے قطرے پونچھ ڈالتا ہے۔ رضیہ مسرت بھرے لہجے میں انور سے کہتی ہے۔)

رضیہ ۔ دیکھا دیکھا میرا چاند مجھے واپس مل گیا۔ واقعی خدا چپ چاپ رحم کرتا ہے۔ میرے لعل کا اچھا ہو جانا معجزہ سے کم نہیں ــ اگر تم پہلے ہی سے اس ڈاکٹر کو لے آتے تو اس کو دو مہینہ تکلیف اٹھانی نہ پڑتی۔ لیکن تم نے من کے ہی کب دیا ہے۔ جانے کس گمنام معلی ڈاکٹر کو لے آتے تھے ــ (بچے کی طرف دیکھ کر) دیکھو دیکھو ہاتھ پیر بھی ہلانے لگا ہے۔ زندگی واپس آ رہی ہے ــــ میرے اللہ تو نے میری فریاد سن لی۔

(تھوڑی دیر یونہی گزر جاتی ہے۔ بچہ کی حالت سنبھالا لیتے لیتے پھر غیر ہونے لگتی ہے۔ انور گھبرا کر کہتا ہے۔ میرے خیال میں دوا پلا دینی چاہئے۔ رضیہ اور انور مل کر دوا پلاتے ہیں۔ لیکن اس دفعہ دوا کا ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ سب باہر نکل کر بہہ جاتی ہے۔ رضیہ گھبرا کر چلاتی ہے)

رضیہ ۔ جلدی پھر بلاؤ۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ وہ اتنی جلدی کیوں چلا گیا۔ ؟

(انور احمد کو آواز دیتا ہے۔ احمد داخل ہوتا ہے۔ انور اٹھ کر کہتا ہے۔)

انور ۔ جاؤ احمد۔ وہ ڈاکٹر صاحب ابھی گھر ہی میں ہوں گے۔ باہر نکل کر جلدی سے بلا لاؤ۔

(احمد غفران پر ایک نظر ڈال کر باہر تیزی سے نکل جاتا ہے۔ انور غفران کا سر ہاتھ پر اٹھا کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگتا ہے تھوڑی دیر میں غفران پھر ایک بار کانپتا ہے۔ لیکن یہ جھرجھری کچھ اور طرح کی ہے۔ کانپنے کے بعد جب بچہ ساکن ہوتا ہے۔ تو آنکھیں سفید پڑ جاتی ہیں گردن ایک طرف کو ڈھلک جاتی ہے۔ رضیہ دیوانوں کے مانند بچہ سے لپٹ جاتی ہے۔ اور دلدوز چیخ مارتی ہے۔ انور صبر کرو رضو، کہہ کر رومال آنکھوں پر رکھ لیتا ہے۔)

ــ (پردہ گرتا ہے) ــ

دوسرا منظر

(ایک چھوٹی سی تاریک کوٹھری جس میں ایک روشندان کے ذریعہ تھوڑی بہت روشنی آ رہی ہے۔ کمرہ میں گھر کا مختلف سامان بکس، بستر، پلنگ چھوٹی بڑی گٹھڑیاں بکھری پڑی ہیں۔ رضیہ اس کے درمیان بیٹھی صندوقوں میں سامان ٹھیک کر رہی ہے چھوٹی موٹی چیزیں ان کے اندر قرینے سے رکھ رہی ہے۔ چہرہ سے بیزاری جھلک رہی ہے۔ جھنجھلا کر کبھی کبھی صندوقوں کے ڈھکنوں کو زور زور سے کھٹ کھٹ بند کرتی ہے۔ اور ساتھ ہی بڑبڑاتی جا رہی ہے۔ صندوقوں کو ٹھیک

کرکے اور ان میں تالے لگا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور سوچ کے بحرِ عمیق میں غرق ہوجاتی ہے۔ سوچتے سوچتے چہرے کی سختی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ چہرہ کا تناؤ بڑھ جاتا ہے اور جھنجلاہٹ کے ساتھ غصہ اور نفرت کے آثار بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک جھٹکے سے خوداعتمادی کے ساتھ اٹھتی ہے۔ گویا کوئی بڑا عزم دل میں ٹھان لیا ہے۔ پلنگ سے لحاف گدوں کو کھینچ کھینچ کر زمین پر ڈالتی ہے ——— عین اس وقت بھڑا ہوا دروازہ کھول کر آہستہ سے اختری داخل ہوتی ہے۔ اور کہتی ہے۔

اختری۔ بیگم صاحبہ آپ ذرا چل کر باورچی سے کہہ دیجئے۔ وہ ابھی تک بھوکے ہیں۔ ناشتہ کو بھی منع کر دیا ——

رضیہ (طیش سے) اری تجھے منع کر دیا ہے۔ اب سے میرے سامنے ان کا نام نہ لینا مجھے کچھ غرض نہیں وہ بھوکے مریں یا رہیں ——— آ تو ادھر مل کر ذرا بستر بندھوا دے۔

اختری۔ یہ کیا کر رہی ہیں بیگم صاحبہ؟ بستر کیوں باندھ رہی ہیں؟

رضیہ۔ کیوں تجھے کیا۔؟ تو یہ کیوں پوچھتی ہے۔؟ سیدھی طرح آ کے بندھوا دے۔ یا پھر جا۔

(اختری چپ چاپ آگے بڑھ جاتی ہے۔ اختری اور رضیہ مل کر بستر باندھتے ہیں۔ رضیہ کا چہرہ سرخ سے سرخ تر ہوتا جاتا ہے۔ اختری کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتی جاتی ہے لیکن بولنے کی ہمت نہیں کرتی۔ اس وقت باہر سے انور کی آواز آتی ہے۔)

انور۔ اختری، اختری۔ کدھر ہے تو۔؟

رضیہ۔ چپ رہ۔ پہلے یہ کام ختم کر لے۔

(انور اختری کو پے درپے آواز دیکر اور جواب نہ پاکر رضیہ کو آوازیں دیتا ہے۔ آواز آہستہ آہستہ قریب ہوتی جاتی ہے۔ اور پھر کمرہ کے اندر انور قدم رکھتا ہے۔ اور غصہ سے کہتا ہے)

انور۔ کیوں ری۔ اختری کیا بہری ہو گئی۔ سن نہیں رہی کب سے پکار رہا ہوں۔ یہاں کیا کر رہی ہے ——؟ (بستر اور سامان وغیرہ تیار ہوتا دیکھ کر تعجب سے رضیہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے) ارے یہ کیا ——؟ یہ کیا ہو رہا ہے ——؟ یہ کیوں باندھا جا رہا ہے؟

(اختری آہستہ آہستہ کمرہ سے باہر نکل جاتی ہے۔ رضیہ یونہی منہ پھلائے بیٹھی رہتی ہے) لو لو یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ بستر کیوں بندھ رہا تھا۔؟ ——— رضیہ کچھ جواب دینے کے لئے منہ کھولتی ہے۔ لیکن صرف ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ جاتے ہیں۔ شدتِ خفگی سے الفاظ حلق میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ انور پھر کہتا ہے۔)

…… رضو میرا دل گھبرا رہا ہے۔ کچھ تو کہو؟ مجھ سے کیا چھپاتی ہو۔

رضیہ۔ میرا دل توڑ کے تمہارا جی گھبراتا ہے ——؟

انور۔ (حیرانگی سے) کیا مطلب؟

رضیہ۔ مطلب تم خود جانتے ہو۔ میں کیا کہوں۔

انور ۔ (ایک بکس پر بیٹھ کر اور رضیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) رضو۔ صاف صاف کہو یہ اچانک کیا ہو گیا تم کو ۔ پہیلیاں نہ بجھواؤ۔

رضیہ ۔ (غصہ سے ہاتھ چھڑا کر) : یہ کیا ہو گیا ۔ اچانک کیا ہو گیا ۔ ؟ اگر تم میرے دل کے اندر جھانک کر دیکھتے ۔ تو یہ نہ کہتے کہ اچانک کیا ہو گیا ۔ میرا دل اب ناسور بن چکا ہے ۔ جب سے میرے گھر میں بہار آئی ہے ۔ وہ تمہاری آنکھوں میں خار کی طرح کھٹک رہی ہے ۔ یہ تم کو ایک آنکھ نہیں بھائی ۔ تم اس کو اذیت دے رہے ہو ۔ چرکے لگا رہے ہو ۔ ضربیں لگا رہے ہو ۔ ایک عورت کا دل آخر کب تک برداشت کر سکتا ہے ۔ تمہارے برتاؤ سے میرا دل زخمی ہو گیا تھا ۔ اور اب وہ ناسور بن چکا ہے ۔ جس کے ذریعے میری زندگی کی تمام مسرتیں ، خوشیاں ، عیش و آرام رس رس کر نکل گئے ہیں ۔ اب میری زندگی میں تم نے گھن لگا دیا ہے ۔ جو آہستہ آہستہ زندگی کو کھوکھلا کر رہا ہے ۔ دیمک لگا دی ہے ۔ جو رفتہ رفتہ عمر کے ایام کو چاٹ رہی ہے ۔ میرا عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے ۔

انور ۔ رضو ۔۔ میرا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا ہے ۔ تم یہ کیا کہہ رہی ہو ۔ میں نے آخر کون سی ایسی کاری ضرب لگائی ہے ۔ میرا کون سا ایسا برتاؤ ہے جس سے تمہارا دل ناسور بن گیا ہے ۔۔۔۔۔ اچھا اگر یہ بات صحیح ہے ۔ تو اب تک تم کیوں خاموش تھیں ۔۔ میں نے تم کو حتی المقدور راضی رکھنے کی کوشش کی ۔ اگر کوئی بات خلاف مرضی تھی تو چپ کیوں رہیں ۔۔ ؟ بتاؤ مجھ کو بتاؤ ۔ میں نے کیا تکلیف دی ۔ ؟

رضیہ ۔ (طنز سے) تو گویا تم ابھی بے خبر ہی ہو ۔ ؟ کس قدر بھولے پن سے اپنا قصور پوچھ رہے ہو ۔

انور ۔ اچھا میں جانتا بھی ہوں ۔ مان لیا ۔ لیکن میں تمہاری زبانی سننا چاہتا ہوں ۔

رضیہ ۔ اگر اس قدر ہی انجان بنتے ہو تو سنو ۔ تم مجھ سے زیادہ میرے بچوں سے زیادہ اپنی دولت کو چاہتے ہو ۔ اپنی اولاد کا اتنا درد نہیں ۔ جتنا خیال پیسہ کا ہے ۔ اپنے بچوں سے اتنی محبت نہیں ۔ جتنا اپنے روپیہ سے پیار ہے ۔

انور ۔ رضیہ ۔۔۔۔ یہ تم کہہ رہی ہو ۔ ؟

رضیہ ۔ ہاں ، ہاں ! میں آج تمام باتیں کھول کے رکھ دوں گی ۔ اب مجھ سے یہ راز سینہ میں پوشیدہ نہیں رکھے جا سکتے ۔ میری زبان ان کو اگلنے کے لئے بیقرار ہے ۔ میں نے اب تک برداشت کیا ہے ۔ پھول کے عوض خار کھائے ہیں ۔ تمہاری ہر بے جا بات خندہ روئی سے قبول کی ہے ۔ صرف اس لئے کہ میں اس غلط فہمی میں تھی کہ ضرور تم کبھی تو واپس آ جاؤ گے ۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچے گی ۔ میرے دل کا ٹکڑا میرا لختِ جگر مجھ سے جدا ہو گیا ۔ یہی وہ غم ہے ۔ جس نے میرے زخم کو ناسور میں تبدیل کر دیا ہے ۔

انور ۔ اور تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ میری غلطی سے جدا ہوا ہے ۔

رضیہ ۔ یقیناً ۔ تم ایمان سے کہو ۔ جب بیماری نے پہلے پہل حملہ کیا تھا ۔ جس وقت مرض زیادہ نہیں بڑھا تھا تو تم نے کس قدر بے توجہی برتی پیسے کا درد زیادہ تھا اور بچے کی بیماری کو معمولی جھا ۔ اس لئے معمولی علاج کیا ! ۔۔ کیا یہ صحیح نہیں ۔۔ ؟

انور ۔ صحیح ۔۔۔ بالکل صحیح ۔ سو فیصدی ٹھیک ، شروع میں میں نے معمولی بخار سمجھا لیکن تم بھی سچ بتاؤ کہ تم تو پہلے پہل دوا کو بھی منع کر رہی تھیں

کہ یہ ایسے ہی اچھا ہو جائیگا۔ بچے بیمار ہوتے ہی رہتے ہیں ___ لیکن جب مرض نے ترقی کی، تو میں نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا ___ مگر شفاء تو بندے کے بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر کے باوجود جب بیماری بڑھتی گئی۔ تو تم یہ کہنے لگیں کہ سستا ڈاکٹر بلا لائے ہو ___ خیر یہ تو حال ہی کی بات ہے۔ اس سے قبل تم نے کون سے صدمے اٹھائے ہیں ___ ؟

رضیہ۔ .... اور کیا کیا کہوں، بچوں کے خرچ پر ہمیشہ تم نے کنجوسی دکھائی ......

انور۔ تعجب ہے رضو ___ صدمے نے تمہاری یہ حالت کر دی ہے۔ ورنہ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں نے کپڑے، کھانے، تعلیم کے خرچ میں کچھ کمی نہیں کی۔ ہاں۔ البتہ فضول خرچی اور بے جا اسراف سے میں نے ہمیشہ پرہیز کیا ہے۔ کیا تم یہ پسند نہ کرتیں کہ ہماری فضول خرچیوں کی بجائے ان بیچارے تنگدستوں کا پیٹ بھر جائے۔ جنہیں دو وقت روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے ___

رضیہ ___ میں یہ تقریر نہیں سننا چاہتی۔

انور۔ اچھا۔ اگر سننا پسند نہیں تو نہ سنو۔ لیکن للہ یہ بے جا الزام تو نہ لگاؤ۔

رضیہ۔ میں نے بار بار کہہ دیا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ میرا لعل تمہاری غفلت کی وجہ سے گیا ہے۔ اس کی وجہ سے میرا دل پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ مجھ میں اب صبر کی طاقت نہیں۔ اب میں یہاں نہیں رک سکتی۔ میں آج رات ہی کو ۱۲ والی ٹرین سے اپنے میکے جا رہی ہوں۔

انور۔ (گویا آسمان گرتے ہوئے) یہ کیا کہا ___ یہ کیا کہا رضو ___ ؟

رضیہ۔ (بے اعتنائی سے) رات کو بارہ والی ٹرین سے گھر جا رہی ہوں۔

انور۔ مجھ سے پوچھے بغیر ہی یہ پروگرام بنا لیا ___ ؟

رضیہ۔ میرا جی چاہا بنا لیا۔ اس میں کسی کی رضامندی کو دخل نہیں۔ اور صرف پروگرام ہی نہیں بلکہ سامان بھی تیار ہے۔ اور اب میں کسی طرح نہیں رک سکتی۔

انور۔ اور میرے کہے سے بھی نہیں رک سکتی۔

رضیہ۔ ہاں تمہارے کہنے سے بھی نہیں رک سکتی۔

انور۔ اس پر بھی میں التجا کرتا ہوں۔ مجھ کو خار میں پھینک کر دل کو یوں توڑ کر نہ جاؤ رضو۔ میرے سینہ میں بھی دل ہے۔ وہ بھی احساس رکھتا ہے۔ ضبطِ غم سے یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ گوشت پوست کا دل پتھر بن گیا ہے۔ مجھ پر بھی آفات کی یورش ہو رہی ہے۔ ابھی میں بچے کا صدمہ اٹھا کر اس قابل نہیں ہوا کہ تمہاری جدائی کا بوجھ اٹھا سکوں۔ رضو ___ دیوانی نہ بنو آؤ ہم دونوں مل کر اس مصیبت کا مقابلہ کریں۔

رضیہ۔ میرے اوپر تمہاری باتوں کا مطلق اثر نہیں ہو سکتا۔ میں نے طے کیا ہے کہ میں چلی جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ آج ہی جاؤں گی۔

انور۔ اچھا یہ بات ہے ___ مگر تم کیا حق رکھتی ہو۔ تم زبردستی نہیں جا سکتیں ___ میری اجازت کے بغیر تم نہیں جا سکتیں۔

رضیہ۔ میں جا سکتی ہوں۔ شوہر کی طرح بیوی کا بھی حق ہے۔

انور۔ تم زبردستی پر اتر آئی ہو ___ میں اجازت نہیں دے سکتا۔ میں حکم دیتا ہوں کہ مجھ سے بن پوچھے گھر سے باہر قدم نہ رکھنا ___

رضیہ۔ میں نہ تمہاری اجازت چاہتی ہوں، نہ تمہارے حکم کی پرواہ ہے! اب تک میں نے تمہارا حکم مانا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ آج دیکھو ہزاروں عورتوں نے اسی لئے شوہروں سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ مرد کے برابر عورت بھی عقل رکھتی۔ میں بھی آج سے خود مختار ہوتی ہوں۔ میری جہاں مرضی ہوگی جاؤں گی۔
انور۔ رضو ——— حد سے مت نکلو۔ یہ تمہارے حق میں برا ہوگا۔ تمہارا جہاں تک حق ہے۔ وہاں تک میں پورا کرتا ہوں۔ اس طرح بغاوت کر کے تم بھی خوش نہ رہ سکو گی اور میں بھی بے چین رہوں گا ——— رضو ——— آج کل انسان ہر چیز، ہر بندھن سے سرکشی میں فلاح دیکھ رہا ہے ساری قیود سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اپنے بزرگوں اور اسلاف کی ہر بات میں بغاوت کو ترقی کی نشانی سمجھتا ہے۔ مگر پیاری رضو ——— دیکھو تو اس کا انجام کیا ہو رہا ہے ——— سکون و آرام نام کی چیز دنیا سے یوں رفتہ رفتہ، چپ چاپ اٹھ رہی ہے، جیسے سورج کی گرمی پاکر شبنم کے موتی غائب ہو جاتے ہیں آخر انسان عبرت پکڑنے کے بجائے فتنہ و فساد کیوں آمادہ ہے۔ رضو آخر فطرت سے بغاوت کر کے چین پا لوگی یہ محال ہے۔ یہ تمہارا محض خیال ہے۔ میں تم کو قبل ہی آگاہ کئے دیتا ہوں کہ حرص کے نشے اور ے اور جذبات کے جوش میں برباد ہونے والی عورتوں کی روش پر مت چلو ——— آؤ رضو ——— پھر مل جل جائیں ہم دونوں مل کر اس مالکِ حقیقی کے آگے گڑگڑائیں۔ امید ہے کہ وہ ہمارے دلوں میں صبر اور اتفاق ڈالے گا ......

رضیہ ——— (اکتائے ہوئے لہجے میں) ۔ جو کچھ کہو ——— لیکن میں نے فیصلہ کر لیا۔ اٹل فیصلہ ——— میں ضرور جاؤں گی ہر قیمت پر جاؤں گی ———

انور ——— (کچھ دیر رضیہ کے چہرے کو بغور دیکھ کر اور کچھ سوچ کر) اچھا ——— پیاری رضو ——— میری طرف سے اجازت ہے۔ تم جا سکتی ہو۔

~~~ پردہ گرتا ہے ~~~

تیسرا منظر

(رات کے گیارہ بجے ہیں۔ اندھیری تاریک رات ہے۔ آسمان پر چمکیلے تاروں کے بجائے کالی گھٹا پر تولے کھڑی ہے۔ وقفہ وقفہ سے بادل کی گڑگڑاہٹ در و دیوار کو لرزا جاتی ہے تھوڑی تھوڑی دیر بعد بجلی کی تیز چمک سے آنکھوں میں چکاچوند آ جاتی ہے۔ بارش کے آثار شروع ہو چکے ہیں۔ تیز ٹھنڈی ہواؤں کے جھکڑ خوفناک اور مشتعل دیو کی مانند کمرے کے اندر گھسے چلے آ رہے ہیں اور ان کی سائیں سائیں کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کبھی کبھی دور کسی درخت کے ٹوٹ گرنے کی آواز آتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد اچانک بارش کی پہلی بوندیں ٹپ ٹپ گرتی ہیں۔ اور پھر یکبارگی بوچھاڑ شروع ہو جاتی ہے اور تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ ایسی موسلا دھار بارش ہے کہ معلوم ہوتا ہے، سارے شہر کو بہا لے جائے گی۔ بارش کے ساتھ ہی سردی بھی زور پکڑ گئی ہے انور کرسی پر بیٹھا ہے۔ چہرہ یاس و حسرت کا مرقع نظر آتا ہے۔ اس کی صورت سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کہ اس کے دل میں کیا خیالات موجزن ہیں لیکن اس بات کا صاف پتہ چل رہا ہے کہ وہ اپنی ملتی توجہ سمیٹ کر کسی فکر میں لگائے ہوئے ہے۔ اس کے دل میں جوش کے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ اور وہ ان پر بڑی ہمت سے قابو پا رہا ہے۔ اس کی نگاہیں کھڑکی کے پار افق میں ٹکٹکی لگائے ہوئے ہیں ——— وہ بارش اور سردی کی طرف سے بالکل بے خبر بیٹھا ہے۔ اچانک اس کے خیال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اور وہ کھڑکی سے نظریں ہٹا کر [illegible] اندر داخل ہو
~~~

ہے ــــ اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی انور کے پاس آکر رک جاتی ہے ۔)

انور ۔ کیوں آئی ہو ۔؟ رات کے گیارہ بجے کیا کام ہے اختری ۔؟

اختری ۔ آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا ـــ ؟

انور ۔ مجھے بھوک نہیں تھی ـــ

اختری ۔ کیسے نہیں ہے ۔ دو دن سے کچھ نہیں کھایا !

انور ۔ نہیں اختری ۔ واقعی کھانے کو قطعی جی نہیں چاہتا ۔

اختری ۔ اس طرح دل میلا نہ کیجئے ۔ کچھ تو کھا لیجئے ۔

انور ۔ اختری ـــ مجھے پریشان نہ کرو ۔ جاؤ چلی جاؤ ـــ !

اختری ۔ میں جا رہی ہوں ۔ لیکن للہ اس طرح بھوکے رہ کر جان نہ گھلایئے !

انور ۔ تم ہی بتاؤ اختری ـــ ایسے وقت میں میرے حلق سے کس طرح کھانا اتر سکتا ہے ۔؟

اختری ۔ آپ اس کا اتنا اثر کیوں لے رہے ہیں ۔ وہ آج جا رہی ہیں ۔ چند دنوں میں خود ہی آجائیں گی .... آپ اتنا کیوں فکر کر رہے ہیں ۔ گھروں میں اس طرح کے جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں اور پھر ختم بھی ہو جاتے ہیں ۔ اتنی سی بات پر اس قدر پریشانی بھی کیوں ؟ اٹھئے ۔ کچھ نہ کچھ کھا لیجئے ـــ

انور ۔ اختری ـــ تم سمجھ سکو گی ۔ تم بھی ایک ذی نفس ہو ، تم میں بھی احساس ہے ۔ بتاؤ تو وہ چند دنوں میں تو آجائیں گی لیکن وہی تو چند دن تھے جن میں ہمیں اپنے زخمی دلوں پر پھاہے رکھنا ہیں ۔ دونوں اکٹھے ہوں تو اس بھنور سے نکل کر ساحل تک آ سکتے ہیں ۔ اب میں اکیلا رہ گیا ... مجھے اکیلا چھوڑ دیا ۔ سوچو تو دو دو عظیم صدمے میں کیسے برداشت کروں گا ـــ !

اختری ۔ بابو جی ـــ آپ تو خود جانتے ہیں ۔ آپ تو بیگم صاحبہ کی طرح ناواقف نہیں ہیں ۔ خدا نے ہمیں ایک بہت بڑا ہمدرد غمگسار ساتھی دیا ہے ۔ جس کے ہوتے ہوئے ہم ہر مصیبت کا مقابلہ کر سکتے ہیں ـــ وہی دکھ درد میں تسلی دیتا ہے ۔ وہی زخموں پر ٹھنڈے پھائے رکھتا ہے ۔ اور وہی آئندہ کے لئے ہمیں راہ بھی دکھاتا ہے ـــ کیا آپ قرآن شریف کے وجود کو بھول گئے ۔

انور ۔ (مسکرا کر) ہاں ! اختری ۔ تمہارا ممنون ہوں تم نے یاد دلا دیا میں نے واقعی اس کتاب کو زندگی کا ساتھی اور راہبر بنا لیا ہے ۔ اس کے اشاروں اور حکموں پر چلتا ہوں اور یہ اس کا فیض ہے کہ تم مجھ کو یہاں بیٹھا دیکھ رہی ہو ۔ یوں میری زبان کو خاموش دیکھ رہی ہو ۔ ورنہ بچے کی جدائی سے میرے دل میں بھی شگاف پڑ گیا تھا ۔ میرا دل بھی بے قرار تھا ۔ لیکن اس دکھ درد کے ساتھی اور سچے غمگسار کی تسلی پر صبر و ضبط سے کام لے رہا ہوں ۔ ورنہ میں بھی چیخ اٹھتا ۔ میں بھی قدرت سے بغاوت کرتا ۔ میں بھی چیخ چیخ کر شکوے شکایات کے دفتر کھول دیتا لیکن میری تشویش کی وجہ دوسری ہے ، اختری ! ـــ بیگم کی باتوں میں جن نئی پریشان خیالیوں کی جھلک ہے اس نے میرا دماغ بکھیر دیا ہے [illegible] ہے ۔ جیسا کہ تمام کی طرف انہوں نے اپنے قدم بڑھا دیئے ہیں ۔ میں کیا کروں کس طرح

روکوں! ــــ دوسری وجہ بے چینی کی یہ ہے کہ ان کے چلے جانے کا بچوں پر بڑا اثر پڑے گا۔ میں ماں کی محبت ان کو نہیں دے سکتا وہ جب امی کہہ کر چیخیں گے تو مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔ غرض اختری ــــ میرے گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ میں کیا کروں ــــ!

اختری۔ بابوجی۔ ۔ آپ بچوں کے لئے کیوں فکر کر رہے ہیں۔ ان کو تو بیگم صاحبہ ساتھ لے جا رہی ہیں۔

انور۔ (اچانک جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو) کیا کہا۔۔۔۔ کیا کہتی ہو اختری ــــ؟

اختری۔ (ڈر کر نیچی آواز میں) ان کو تو بیگم صاحبہ لے جا رہی ہیں ــــ

انور۔ (جس کے چہرے پر گہرے کرب و بےچینی کے آثار نقوش ہیں) اف اف ...... اختری ...... انہوں نے مجھے پوری طرح برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے پورے گلستان کو اجاڑ دیں گی۔ میری تسکین کے لئے کچھ نہ چھوڑنے کی ٹھان لی ہے۔

(آہستہ آہستہ سر جھکا کر میز پر ٹکا دیتے ہیں۔ آواز دھیمی دھیمی سسکیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ اختری کچھ دیر کھوئی کھوئی کھڑی رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتی ہے)

اختری۔ بابوجی۔۔۔ اٹھئے اتنا غم نہ کیجئے۔ میں جاتی ہوں۔ انہیں مناؤں گی۔ بچوں کو چھوڑ جانے کے لئے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گی۔ مجھے امید ہے وہ میرا کہا مان لیں گی۔ پھر میں بچوں کی دیکھ بھال کروں گی۔ ماں کی جدائی کا احساس تک انہیں نہ ہونے دوں گی ــــ

انور۔ (تیزی سے سر اٹھا کر) میں التجا کرتا ہوں۔ خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ اختری! ــــ تم انہیں منانے کی کوشش نہ کرنا۔ انہیں بچے ساتھ لے جانے دو اختری! ــــ کہیں میکے میں انہیں بچوں کی وجہ سے بےچین نہ ہونا پڑے۔ انہیں خوش رہنے دو۔ ان کا دل بہلنے دو ــــ اختری میں کلیجے پر پتھر رکھ سکتا ہوں۔ لیکن ان سے صبر نہیں ہو سکتا۔ وہ نادان ہیں۔ قدرت سے سرکشی کر بیٹھیں گی۔ ان کی بغاوت سے اختری! ــــ اس کا انجام بہت برا ہے۔

(اچانک رضیہ کی آواز آتی ہے۔ اختری.... اختری کہاں مر گئی ــــ؟ انور اختری سے کہتا ہے)

انور۔ جاؤ اختری۔ جلدی جاؤ۔ لیکن دیکھو للہ بچوں کو روکنے کی کوشش نہ کرنا!

(اختری سر جھکائے خاموشی سے چلی جاتی ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے اور جلدی جلدی گھبراہٹ میں)

اختری۔ فرقان کہاں ہے۔ ؟ تمام گھر میں ڈھونڈ ڈالا۔ نہیں ملا۔

انور۔ (گھبرا کر کھڑے ہوتے ہوئے) ایں ــ؟ کیا کہا۔ فرقان نہیں ہے؟

اختری۔ بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ وہ ایک گھنٹہ سے ڈھونڈ رہی ہیں۔ لیکن نہیں ملتا۔

انور۔ خوب ہیں نئے نئے شگوفے کھل رہے ہیں ــ جاتا کہاں۔ ہوا کی طرح غائب تو نہیں ہو سکتا۔ ڈھونڈو۔ سردی کی وجہ سے لحاف میں دبکا پڑا ہوگا ــ

(اختری خاموشی سے چلی جاتی ہے۔ انور بےچینی سے ٹہلنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اختری دوبارہ داخل ہوتی ہے۔ اس دفعہ وہ پہلے سے زیادہ حیران و پریشان نظر آتی ہے۔ اور لرزتی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔)

اختری۔ بابوجی واقعی وہ نہیں ہے۔ میں نے خود ایک ایک چپہ ڈھونڈ ڈالا۔
انور۔ یہ کیا ہوا۔ ؟ آخر کب تک تھا۔ کھانا کس وقت کھایا تھا۔
اختری۔ کھانا تو میں نے پکایا تھا۔ لیکن چونکہ بیگم صاحبہ نے غصہ میں نہیں کھایا۔ اس لئے اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ میں نے بہتیری کوشش کی۔ لیکن اس نے یہی کہا کہ جب تک امی نہ کھائیں گی۔ تب تک وہ بھی نہ کھائے گا۔
انور۔ (بڑبڑا اٹھتا ہے) رحم اِ خدایا رحم!۔
اختری۔ رات کے نو بجے تک تو وہ تھا۔ اس وقت بارش بھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ایسی سردی بھی نہیں پڑ رہی تھی۔ جب بارش کے بعد سردی بڑھی تو بیگم صاحبہ بستر پر گئیں وہاں دیکھا کہ فرقان نہیں ہے۔۔ تب سے وہ غائب ہے۔۔

(انور اور کچھ سنے بغیر تیزی سے دوسرے کمرے میں نکل جاتا ہے۔۔۔ اختری سراسیمہ ہو کر وہیں کھڑی رہتی ہے سانس بڑبڑاتی جاتی ہے "یا الٰہی تجھے کیا منظور ہے۔ یہ کیا ہوا رحم کر۔ اے خدا۔۔ کہاں گیا میرا بچہ۔۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی تک آتی ہے۔ باہر اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اور بارش بھی زور سے ہو رہی تھی۔ اختری اس کی پرواہ کئے بغیر کھڑکی سے باہر سر نکال کر ادھر ادھر اندھیرے میں گھورتی ہے۔ پھر سر کو اندر کھینچ کر کھڑکی بند کر دیتی ہے اور پھر ہاتھ ملتی ہوئی دھیرے دھیرے دروازہ سے دوسرے کمرہ میں نکل جاتی ہے۔)

۔۔ پردہ گرتا ہے۔۔

چوتھا منظر

(ایک کمرے میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں۔ دونوں پر بستر لگے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک پر دو بچے سو رہے ہیں۔ ایک خالی ہے۔ رضیہ کھڑکی کے پاس کھڑی باہر تک رہی ہے۔ اتنے میں انور داخل ہوتا ہے۔ رضیہ منہ پھیر کر دیکھتی ہے۔ چہرہ پر خفگی اور اکتاہٹ کے ملے جلے جذبات نظر آتے ہیں۔ انور کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف آتے ہوئے کہتی ہے۔)

رضیہ۔ فرقان کہاں ہے۔ کہاں ہے میرا بچہ۔۔؟
انور۔ میری عقل بھی حیران ہے، وہ کہاں جا سکتا ہے؟ کب سے نہیں ہے؟
رضیہ۔ میں کیا بتاؤں، تم بتاؤ، میرا لعل کہاں ہے۔؟ (اختری داخل ہوتی ہے) اختری۔۔ دیکھ ان کی باتیں! یہ الٹا مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔
انور۔ (حیرانگی سے) یہ کیا کہہ رہی ہو رضو۔؟ (اختری سے) انکا کیا مطلب ہے اختری! یہ ہمیشہ مبہم باتیں کرتی ہیں۔۔
رضیہ۔ کیا مجھے بچہ سمجھا ہے۔ میں کچھ نہیں سمجھتی۔؟ کیا مجھ میں اتنی عقل بھی نہیں۔ کیا میں تمہاری چالاکی کو نہیں سمجھتی۔۔؟
اختری۔ بیگم صاحبہ۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟

رضیہ — اچھا۔ تم بھی انجان بنتی ہو۔ تم بھی ان کے ساتھ شریک ہو —؟

انور — (مسکرا کر) فرقان کھو گیا ہے۔ میں یہاں آیا کہ شاید کچھ معلوم ہو۔ لیکن دوسری پریشانی میں پھنس گیا۔ رضیہ! معموں میں نہ الجھاؤ کبھی تو سیدھی طرح بات کرو۔

رضیہ — اچھا۔ تو سیدھی طرح کہہ دوں۔ کیا تم نے فرقان کو نہیں چھپایا؟ — اب بنتے ہو؟ تمہیں معلوم تھا کہ میں رات کو جاؤں گی اور بچوں کو بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ لہٰذا تم نے یہ سوچ کر کہ اگر ایک بچہ یہاں رہے گا۔ تو میں بے حیا بن کر لونڈیوں کی طرح پھر آؤں گی۔ اس لئے فرقان کو دوسری جگہ بھجوا دیا۔ وہ ذرا سمجھ دار تھا اور اس سے یہ اندیشہ کم تھا کہ وہ مجھے یاد کر کے پریشان کرے گا۔ اس لئے تم نے اسی کو منتخب کیا۔ کہو ہے نا یہی بات؟ اب سمجھتے ہو کہ میں اس طرح دھوکہ دے کر اپنا کام بنا لوں گا — میں ان دو بچوں کو لے کر چلی جاؤں گی؟ اور بعد میں تم خط لکھ دو گے کہ فرقان مل گیا۔ لو یہی تھی نا اسکیم۔؟

انور — (غصہ سے) تم سمجھتی رہنا اسکیمیں۔ مجھے سیدھی طرح بتاؤ۔ تم نے اسے مارا دھاڑا تھا یا کچھ کہا تھا۔ جلدی بولو —؟

رضیہ — تمہارے غصہ دکھانے سے مجھے یقین نہیں آئے گا۔ یہ بہروپ کسی اور کے سامنے دکھانا — مجھے سیدھی طرح بتاؤ، وہ کہاں ہے؟ میری گاڑی کا وقت قریب ہے۔ اگر تم نہیں بتاتے تو جاؤ اس سے لے کر خوش رہو۔ میں ایسے ہی چلی جاؤں گی۔ جہاں ایک کو صبر کیا وہاں دو کو کر لوں گی — کچھ دن رو پیٹ کے اس پر بھی صبر آ جائے گا — لیکن تم خود ہی دیکھ لو، تمہاری طرف سے کیسے کیسے صدمے پہنچ رہے ہیں ....!!

اختری — (بے صبری سے ٹوک کر) بیگم صاحبہ ایسا نہ کہیئے۔ للہ ایسا نہ کہئے۔ آپ نے ابھی ان کو نہیں سمجھا — یہ خود......

انور — بس بس اختری۔ انہیں کہنے دو۔ تم خاموش رہو۔ یہ کچھ نہ بتائیں گی۔ تم بتاؤ میں کیا کروں۔ وہ کہاں جا سکتا ہے!

اختری — میرے خود ہوش حواس غائب ہیں۔ میں کیا بتاؤں۔ ایسی بارش میں اور ایسے اندھیرے میں وہ کہاں جا سکتا ہے — (رضیہ سے) بیگم صاحبہ آپ خواہ مخواہ کہیں سے کہیں چلی جا رہی ہیں، کاش کہ گتھی سلجھاتے میں کچھ مدد کرتیں۔ آپ نے دوسرا ہی جھگڑا شروع کر دیا۔ بیگم صاحبہ خدا را اس چکر سے نکلئے، کوئی تدبیر کیجئے — آہ ایسی رات میں وہ کہاں گیا۔ خدا اسے صحیح سلامت رکھے۔

رضیہ — (ہنس کر) تم دونوں اداکاری میں کمال رکھتے ہو۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ نہ میں اب رک سکتی ہوں۔ نہ پھر دوبارہ آؤں گی۔ شوق سے تم اس کو رکھو۔ دیکھو ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ گاڑی کا وقت ہو گیا۔ مجھے تیار ہونا ہے۔

(انور ڈھیلے قدموں سے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چلا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے اختری بھی چلی جاتی ہے۔)

—(پردہ گرتا ہے)—

پانچواں منظر

(انور کھڑکی کے پاس کھڑا ہے۔ کھڑکی کی چوکھٹ کھلی ہے۔ تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بارش کی پھوار اندر آ رہی ہے

اور اس کے کپڑوں کو بھگوے دے رہی ہے۔ سردی سے اس کے جسم میں ہلکی کپکپی سی طاری ہے۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش ساکت وصامت کھڑا باہر اندھیرے میں گھور رہا ہے۔ اختری داخل ہوتی ہے۔ اور کچھ دور کھڑی ہوکر بغور انور کو دیکھتی رہتی ہے۔ کافی دیر تک دیکھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ہونٹ کپکپانے لگتے ہیں۔ آنکھیں سکڑ جاتی ہیں — اور قریب تھا کہ زور سے رو دے کہ انور مڑتا ہے۔ اختری کو کھڑا دیکھ کر کہتا ہے —)

انور— اختری تم جاؤ۔ آرام کرو۔ رات بہت بیت گئی۔ تم کب تک میرے دکھوں کا ساتھ دوگی —— ایں — ؟ تم رونے لگی ہو — ؟ کیوں ..... ؟ کیوں رو رہی ہو — ؟

(اختری کی آنکھوں سے دو قطرے چھلک کر گالوں پر بہنے لگتے ہیں۔ وہ انہیں یونہی رہنے دیتی ہے۔ پونچھنے کا جیسے دھیان ہی نہیں — خاموش کھڑی زمین کو دیکھتی رہتی ہے۔)

انور— اختری ان آنسوؤں کو یوں نہ بہاؤ۔ ان کو آنکھوں میں جذب کرو۔ اختری یہ بہت قیمتی ہیں — یہ بزدل لوگوں کا کام ہے کہ وہ تو ت ارادی کو آنسوؤں کی شکل میں ضائع کر دیتے ہیں — ان میں حرارت ہے، آگ ہے، زندگی کی تب وتاب ہے اختری اگر ہر معمولی واقعہ پر ان کو اس طرح بہانا شروع کر دیا تو دل کی فورس نکل جائے گی، ارادوں کی گرمی ختم ہو جائے گی۔ قدرت نے ایک خاص موقعے اور ایک خاص ضرورت کے لئے ان کو ہمیں بخشا ہے۔ یہ موتی صرف زندگی کے آقا کی بارگاہ میں نذر گذرانے کے لئے ہیں۔ بات بات پر موقع بے موقع ضائع کرنے کے لئے نہیں ہیں۔ جاؤ آرام کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کو بھی بے حد صدمہ ہے۔ لیکن صبر کرو، اور دعا کرو کہ خدا ہمیں اس بھنور اور آزمائش سے صحیح سلامت نکالے۔ فرقان لازماً گھر سے کسی طرف کو نکلا ہے۔ وہ ہماری لڑائی سے ڈر گیا ہوگا۔ لیکن اب مجھے سخت اندیشہ ہے کہ وہ اس طوفان کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ چکا ہوگا۔

رضیہ— میں پاؤں پڑتی ہوں۔ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالئے۔ وہ آئے گا، ضرور آئے گا، آپ مایوس نہ ہوں —!

انور— مایوس میں کب ہوں لیکن دل نہیں کہتا۔ بھلا تم ہی بتاؤ، اس کا اس جگہ کون ہے۔ کس کے یہاں جا سکتا ہے، ایسے طوفان میں کہاں پناہ ملی ہوگی اسے ...... ؟ سنو تو یہ کس کی آواز ہے —— ؟ (بھاگتی تیز ہواؤں پر ایک کمزور سی آواز بہتی چلی آرہی ہے)

آواز— اَبّا جا آآن .... ؟

اختری— یہ کس کی آواز ہے — ؟ (آواز پھر سنائی دیتی ہے) اَبّا جا آآن ...... — میرے اللہ یہ کیا ہے۔

انور— مجھے تو فرقان کی سی آواز معلوم ہوتی ہے — (آواز پھر سنائی دیتی ہے) ...... آ ...... جا آآن) .....

اختری— ہاں ہاں! یہ تو فرقان ہی کی آواز ہے —

انور— (بے تابی سے) ہائے میرا بچہ (وہی آواز پھر سنائی دیتی ہے) ابا ...... جا آآن — میں جا رہا ہوں [illegible]

اختری— لیکن سنئے تو آپ بھی طوفان میں اس طرح نہ جائیے۔ (وہی آواز پھر آتی ہے) ابا آجان [illegible]

انور — میں نہیں رک سکتا۔ اختری۔ وہ مجھے بلا رہا ہے۔ آیا میرے بچے آیا۔

(انور دروازہ کھول کر بارش میں چل دیتا ہے۔ اور اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔ اختری دروازہ میں کھڑی آواز کی طرف کان لگائے گھورتی رہتی ہے۔ ہوا خوفناک دیو کی طرح کمرے میں گھسی چلی آتی ہے، اور ساتھ ہی بارش کی تیز بوچھار بھی آجاتی ہے۔ تمام کمرے میں پانی بھر جاتا ہے۔ اختری کے کپڑے بھی شرابور ہو جاتے ہیں لیکن وہ اسی طرح اپنے آپ سے غافل کھڑی رہتی ہے۔ اور بڑبڑاتی ہے)

اختری — رحم! خداوند کریم رحم! — تیری رحمت، تیرا کرم بے پایاں ہے۔ ادھر بھی کرم کی ایک نظر ڈال دے خدا! — بچہ صحیح سلامت آجائے (اچانک پلٹتی ہے۔ اور زور زور سے پکارتی ہے) بیگم صاحبہ۔ بیگم صاحبہ — جلدی یہاں آئیے —

(رضیہ نئے کپڑوں میں ملبوس آتی ہے۔ گویا سفر کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اختری اپنے پاس بلا کر کہتی ہے۔) سنیئے۔ غور سے سنیئے یہ کیسی آواز ہے — ؟ (وہی پتلی آواز پھر سنائی دیتی ہے) ابا ...... جان ......

رضیہ — (بے تابی سے) یہ تو میرے بچہ کی آواز ہے۔ ہائے میرے لعل! تجھے کہاں نکال دیا تھا۔

اختری — گھبرایئے نہیں۔ وہ اسے ہی لینے گئے ہیں — دعا کیجئے خیریت سے آجائے۔

(تھوڑی دیر میں انور فرقان کو گود میں لئے داخل ہوتے ہیں۔ رضیہ جھپٹ کر اسے لیتے ہوئے پوچھتی ہے —)

رضیہ — میرے چاند تجھے کہاں نکال دیا تھا — ؟ اے ہے۔ سب تیرے دشمن ہیں۔

فرقان — (سردی سے کانپتے ہوئے) امی .... عفو .... کی .. آواز آئی .... بھی ... ہم اسے .... لینے گیا .... تھا .... امی ....

(سسکیاں بھرتا ہے) ابا .. ..

رضیہ — (زور سے سینہ سے چمٹا کر) اے ہے میرے بچے — تو بھیا کو لینے گیا تھا — میرے لعل —

(انور فرقان کو رضیہ کو دینے کے بعد خود ایک کرسی پر گر پڑتے ہیں۔ اور ایک آہ بھر کر سر تھام لیتے ہیں کنپٹی سے خون بہہ رہا ہے — اختری اور رضیہ فرقان کی طرف متوجہ تھیں۔ انور کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اچانک اختری کی نگاہ اس پر پڑتی ہے "یا اللہ" کہہ کر وہ ان کی طرف لپکتی ہے — رضیہ بھی نظر پھیر کر دیکھتی ہے اور پھر خود بھی آہستہ آہستہ اس کی طرف جاتی ہے —)

— پردہ گرتا ہے —

چھٹا منظر

(انور چارپائی پر پڑا ہے۔ بالکل خاموش پُرسکون۔ سر پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں — اختری پائنتی بیٹھی پاؤں سہلا رہی ہے۔ رضیہ سرہانے بیٹھی دیکھ رہی ہے — اچانک انور ہوش میں آتا ہے۔ نحیف آواز میں پانی مانگتا ہے۔ اختری

جلدی سے چائے کا کچھ منہ سے لگا دیتی ہے۔ انور چائے پی کر ایک بار کراہتا ہے اور پھر خاموش ہو جاتا ہے —
دوسرے کمرے سے بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ اختری اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ اچانک دور سے انجن کے وسل کی
باریک آواز آتی ہے — انور چونک اٹھتا ہے۔ نظریں پھر کر رضیہ کی طرف دیکھتا ہے۔ اور پوچھتا ہے۔)

گاڑی کا وقت ہو گیا شاید —

جی۔

(انور پھر خاموش ہو جاتا ہے — تھوڑی دیر میں دوسری بار وسل کی آواز سے پھر چونک کر کہتا ہے)

ارے .... اس گاڑی سے تو تم جاؤ گی —

(رضیہ خاموش رہتی ہے)

جاؤ — مجھے چھوڑ دو۔

(رضیہ خاموش)

جاؤ جلدی — پھر دیر ہو جائے گی۔

(رضیہ خاموش)

خدا را جاؤ۔ دیکھو اپنا چین آرام نہ کھو دو — تمہارے جانے کے بعد مجھے اطمینان ہو گا — جاؤ —!

(رضیہ ہنوز خاموش)

(وسل کی آواز اور نزدیک سے آتی ہے۔ انور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے)

رضیہ میرا کہا مانو چلی جاؤ — میں حکم دیتا ہوں چلی جاؤ۔ جلدی کرو۔ ورنہ گاڑی نہ پکڑ سکو گی۔ میں التجا کرتا ہوں!

رضیہ — لیٹے رہیئے، لیٹے رہیئے۔ میں نے ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ میں اب کبھی نہیں جاؤں گی۔

انور — (حیرت و مسرت کے لہجے میں) سچ رضو —؟

رضیہ — ہاں۔ سرتاج مجھے معاف کر دیجئے —

(انور اس کا ہاتھ تھام کر سینے پر رکھ لیتا ہے، اور اس کی پلکوں پر آنسو جھلملانے لگتے ہیں۔)

— پردہ گرتا ہے —

بقیہ چند لمحے —

برتی ہے اور سعادت حسن منٹو مرحوم عریاں لکھنے کے باوجود فن سے کبھی نہیں گرا، اُس کے ہاں آرٹ ہے۔ وہ میرا محبوب افسانہ نویس تھا۔"

یہ تھی میری اور شفیق صاحب کی گفتگو جو بے تکلفانہ ماحول میں ہوئی۔ باتیں ہو چکیں تو ایک ناشتہ کے ساتھ ان کو الوداع کہی۔

———

انور صدیقی

رقصِ حیات[1]

— ۱ —

تیز کرو روشنی
رقص میں ہے زندگی
آج ہر اک رنج و غم
بھولا سا خوابِ عدم
آج سرِ چشمِ نم
کتنے ستاروں کا رم
آج ہر اک جام میں
معجزۂ کیف و کم
شورشِ پیہم کے طور
اپنے جنوں کے قدم
رقصِ مسلسل میں ہے
موجِ رواں یم بہ یم
آج جلاؤ چراغ
بھول کے ہر شامِ غم
تیز کرو روشنی
رقص میں ہے زندگی

— ۲ —

رات کا کچھ غم نہیں
رات ہے کتنی حسیں
اب بھی اسی بزم میں
کتنے ہیں روشن جبیں
برق سے چشمک کرے
جن کی ہر اک آستیں
اب بھی سحر تاب ہے
مشعلِ سوزِ یقیں
اب بھی ہر اک تارِ غم
حق میں ترے انگبیں
گنبدِ مینا ہلا ——
ناچ رہی ہے زمیں
تیز کرو روشنی
رقص میں ہے زندگی

— ۳ —

رات کے شہپر تلے
جاگ رہی ہے سحر
نیل بھی کاجل بھی
جس کی ہیں برقِ نظر
دامنِ مہتاب میں
صبح کے یہ بام و در
ان کو بھی دیکھو ذرا
ان پہ بھی کر لو نظر
رات ابھی ہے تو کیا
جاگ رہی ہے سحر
آج جلاؤ ایاغ
آج بجاؤ گجر
تیز کرو روشنی
رقص میں ہے زندگی

---

[1] انڈونیشیا کا ایک مشہور رقص (ا۔ص)



چمچہ بھر صافی

• صافی کا صرف ایک چمچہ موسم کی تبدیلی کے دنوں میں استعمال کرنے سے آپ نہ صرف خرابی خون سے پیدا ہونے والے امراض سے محفوظ رہیں گے بلکہ صافی آپ کے دوران خون میں توازن پیدا کر کے آپ کے جسم میں تازہ خون کی لہر دوڑا دے گی۔ صافی آپ کے معدہ کے فعل کو درست بنائے گی۔ قبض سے محفوظ رکھے گی اور بھوک بڑھائے گی۔

موسم کی تبدیلی کے دنوں میں اپنے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی صافی پینے کی عادت ڈالئے۔ اس سے وہ پھوڑے پھنسیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔

نوٹ:- بیرونی استعمال کے لئے ہمدرد مرہم بے حد مفید ہے۔

ہمدرد دواخانہ، کراچی





"ترقی کی شاہراہ پر قدم بڑھائے چلو" یہ ہے وہ نغمہ جو مشینوں سے نکل رہا ہے پارچہ بافی کی صنعت میں ہماری ترقی اطمینان بخش ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کی گنجائش ہے، ہماری کوششیں جاری ہیں اور وہ دن یقیناً دور نہیں جب ہم غیر ملکی کپڑے کی درآمد سے بے نیاز ہو جائیں گے

باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

مینجنگ ایجنٹس: احمد برادرز لمیٹڈ۔ کراچی



روشنی ——— گرمی ——— حرکت

ماہنامہ **چراغ راہ** کراچی

ستمبر ۱۹۵۶ء

شمارہ ۸ ✻ جلد ۱۰

فہرست

چندہ سالانہ: ۵/- روپے ——— فی پرچہ ۸ آنے

دفتر اشاعت و انتظام: — فیض محمد فتح علی روڈ کراچی نمبر ۵

دفتر ادارۂ تحریر ——— ۱۰۱ (۸/۱) محلہ رسول پورہ، اچھرہ لاہور

سید کاظم علی پرنٹر و پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر چراغ راہ فیض محمد فتح علی روڈ کراچی نمبر ۵ سے شائع کیا۔

سوچ بچار — اِدَارَہ —

پاکستانی عورت خنگی درندوں کے نرغے میں!

پاکستان ایک مسلم قوم کا دیس ہے جس نے اپنے دستور میں نظامِ اسلامی کی نیو ڈالی ہے۔ ایسے ملک اور دینی ریاست کو امن اور سلامتی کا گھر ہونا چاہئے اور بیکسوں اور مظلوموں کے لئے محفوظ پناہ گاہ۔ مگر عملاً صورت حالات بالکل برعکس ہے اور امن و نظم کا معیار خدا ناشناس اور ملحد قوموں سے بھی نیچے گیا ہے۔ حد درجہ افسوس ناک ہے۔ اس کے واقعاتی شواہد ہر روز اخبارات میں کثرت سامنے آتے ہیں اور ان سامنے آنے والے حوادث کے پیچھے ہزاروں واقعات عبرت نامعلوم رہ جاتے ہیں۔ خصوصیت سے عورت کے حق میں یہ اسلامی معاشرہ ایک ایسا جنگل بن گیا ہے جس میں ہر جھاڑی کے پیچھے کوئی خونخوار بھیڑیا اور گھاس کے ہر تختے میں کوئی کالا ناگ چھپا بیٹھا ہے۔ اپنے ہی وطن میں مسلمان عورتوں کا ناموس اس سے زیادہ شدید خطرے میں گھر گیا ہے جتنا ہنگامۂ تقسیم کے دوران میں سرحد پار کے سیوک سنگھیوں کی بہیمیت کے ہاتھوں خطرے میں تھا۔ آج کیا فریاد کرتے ہو ان مسلمان عورتوں کی مظلومی پر جو بھارت کے غنڈوں کے گھروں میں لونڈیاں بن کر قید ہیں، جب کہ یہاں اپنے گھر میں آزاد مسلم خاتون راستہ چلتے چلتے، دن دہاڑے اپنے ہی مسلمان بھائیوں اور باپوں اور بیٹوں کے غنڈہ ازم کا شکار ہو رہی ہے۔

گجرات کا سانحہ، پھر گوجرانوالہ کا حادثہ، پھر چشتیاں کا واقعہ اور اس کے بعد کراچی میں عین نکاح سے قبل ایک لڑکی کا پولیس کے کسی ملازم کے ہاتھوں اغوا ہماری اسلامیت، ہماری اخلاقی حس، ہمارے قانون اور ہماری قیادت کے دامن پر ایسے گندے دھبے ہیں کہ جن کو کسی پانی سے دھویا نہیں جا سکتا۔ ایسے واقعات ہر روز پے در پے سامنے آتے رہتے ہیں اور بے شمار تو ایسے ہیں جو اخبارات کے پردۂ نمائش پر سرے سے آ نہیں پاتے۔

اسلامی حکومت کا وہ دورِ سعادت جس کی نیو نبیٔ اکرم نے ڈالی تھی اور اب جس کا احیا کرنے کی سعی پر رجعت پسندی، ماضی پرستی اور ملا ازم کے آوازے کسے جاتے ہیں، اس کی پوری تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ کسی نے مسلمان تو کیا، کافر عورت کو راہ چلتے تاکا گھورا ہو، اسے چھیڑا ہو، اغوا کیا ہو یا اس کے ناموس پر ڈاکہ ڈالا ہو۔ اس کا باعث یہ تھا کہ پورے ماحول کو بدنگاہی کے محرکات سے پاک کر دیا گیا تھا، عورتوں کو گھروں کی زندگی کا ذمہ دار بنا کر پردے کا قانون نافذ کیا گیا تھا، اختلاطِ مرد و زن کی جاہلی تہذیب کا قلع قمع کر دیا گیا تھا اور پھر نکاح کو آسان اور عام کر کے زنا کے لئے سنگین سزا مقرر کر دی گئی تھی۔

آج عالم یہ ہے کہ شہر شہر، قصبے قصبے شیطان نے ایسی تماشا گاہیں کھول رکھی ہیں جن کے ذریعے ایک طرف غریبوں کی جیب کا پیسہ نکل نکل کر سرمایہ دار کی جیب میں جاتا ہے اور دوسری طرف ان کی اخلاقی حس تباہ ہوتی ہے۔ ان تماشا گاہوں میں

اور ان کے ساتھ ساتھ رقص اور گانے بجانے اور مصوری اور شاعری کے بتکدہ ہائے فن میں عورت کو عریاں کر کے لایا جاتا ہے، اور نتیجۃً عوام کی شہوانی تو نفس تمام حدود کو توڑنے لگتی ہے۔ پھر اشتہارات میں عورت کی تصویروں کو لاسہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اور اپنا مال بیچنے کے لئے صناع اور تاجر آوارہ نگاہوں کے ہاتھ عورت کے ناموس کا نیلام بولتے پھرتے ہیں۔ اور اس پر قیامت ہے مغرب کی جدید جاہلیت کی صہبا سے بدمست ہو کر ترقی کی سڑک پر گل گشت کرنے والی "مردانہ خواتین" کا ہر ہر غول ــــ جو پردہ تو دور رہا، سر کے آنچل اور گریبانوں کے بٹن اور آستینوں کی طوالت تک سے بغاوت کر کے آرائش اور بھڑک کے ساتھ اسلام کے اصول اور ملت کی روایات کو تباہ کر رہی ہیں۔ پھر تباہی کا یہ کام محض انفرادی اور اتفاقی طور پر نہیں بلکہ منظم اور جماعتی طریق سے کیا جا رہا ہے۔

گھر ہی سے نہیں، جدید عورت اب جامے سے باہر ہوتی جا رہی ہے اور سڑکوں پر، باغات اور تفریح گاہوں میں، ہوٹلوں اور ضیافتوں میں، پریڈوں اور سلامیوں میں وہ مرد کے دوش بدوش اور شانہ بہ شانہ نمودار ہو رہی ہے۔ جلتی پر تیل کا کام کرتی ہیں اخبار کی تصاویر جو تہذیب نو کی اس آتشِ خانہ سوز کو گھر گھر پہنچا رہی ہیں۔

اس ذہنی ماحول نے نگاہوں کو آوارہ کر دیا ہے۔ آپ ہر روز دیکھتے ہوں گے کہ کسی عورت ــــ اور خصوصاً ماڈرن بیگمات ــــ کے سامنے آنے اور راستہ گزرنے پر تمام مرد ــــ بوڑھے بھی، نوجوان بھی، کچی عمر کے بچے بھی ــــ اُدھر گھورنے لگتے ہیں۔ کوئی سائیکل پر جا رہا ہوگا تو دور تک سر گھما گھما کر دیکھے گا اور کوئی کار میں بیٹھا ہوگا تو کھڑکی سے منہ باہر نکال نکال کر ایسے تو جدیگا جیسے کوئی اس کی اپنی بیوی ہے اور وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ شعر پڑھے جائیں گے، دبی زبان سے فقرے کسے جائیں گے، دوست آنکھوں آنکھوں میں باہم اشارے کریں گے۔ جیسے پوری قوم کے سامنے کوئی دوسرا کام ہے ہی نہیں اور زندگی کا ایک ہی مصرف باقی رہ گیا ہے۔ یہ تو اوپر اوپر کی سطح ہے، نیچے معاشرے کے تاریک تہ خانے میں اتر یئے تو بدکاری کا طوفان اُبل رہا ہے

جدید عورت تو اپنی عصمت کی پوٹلیا باندھ کر اسے کلفٹن کی موجوں میں ڈبو کر بے فکر ہو گئی ہے مگر شامت آ گئی ہے غریب دیہاتی ان پڑھ اور مذہب پسند عورت کی جس کی عصمت ہی اس کی متاعِ حیات ہے۔ مگر اب اس کی یہ متاعِ حیات خطرے میں پڑ گئی ہے۔ وہ اگر ضرورت کے مارے گھر سے نکلتی یا سفر کرتی ہے اور کسی محرم مرد کو ساتھ لینے کی ضروری احتیاط نہیں کر پاتی تو پھر گھر کے دروازے سے لے کر منزلِ مقصود تک ہر قدم پر اس کو صرف فاسد اور گندی اور کمینہ نگاہوں سے سابقہ پڑتا ہے اور کہیں "باپوں اور بھائیوں" یا کم سے کم شریف انسانوں کی سی ایک نگاہ اس کے حصے میں نہیں آتی۔ وہ اگر تنہا ہوتی ہے تو کوئی متنفس اس کی حفاظت کرنے والا نہیں نکلتا، صرف چور اچکے سامنے آتے ہیں۔ اسے اگر کسی جگہ بس یا گاڑی سے رہ جانے پر رات گزارنی پڑتی ہے تو اسے کوئی جائے امن نہیں ملتی اور کوئی مسافر نواز اور انسانیت کا احترام کرنے والا اسے نہیں ملتا۔ اسے صرف رہزن اور لٹیرے ملتے ہیں جو گھیر گھار کر اسے شکار کر لینے کے سوا کوئی دوسری بات سوچ ہی نہیں سکتے۔

کوئی وزیر اور کوئی لیڈر، اور کوئی جماعت اور کوئی پارٹی ہے، جو ان حالات کا فکر کرے؟ کوئی اخبار اور صحافی ہے جو آہن گے شدید لگے بیٹے قومی طور پر تحریک چلائے؟ کوئی مذہبی اور سوشل ادارہ ہے جو اس سلسلے میں کام کرنے کے لئے بے چین ہو؟

"مسئلہ سویز"

"سامنے بھیڑیے پیچھے اژدھا!"

۸ اگست کو ہم نے مسئلہ سویز کے سلسلے میں ایک شذرہ لکھا تھا۔ لیکن اس کی کتابت ہونے سے قبل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا جامع تر بیان سامنے آگیا۔ ہم اپنے شذرہ کی جگہ اسی بیان کو دے رہے ہیں۔ [ادارہ]

نہر سویز کو قومی ملکیت قرار دینے کا جو اقدام حال ہی میں حکومت مصر نے کیا ہے اس کے جائز اور حق بجانب ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ کسی ملک کے حدود میں کوئی شاہراہ یا گزرگاہ خواہ بین الاقوامی راستے کی نوعیت ہی رکھتی ہو، بہرحال اس قوم کی ملکیت ہے اور ہونی چاہیئے جس کے حدود میں وہ واقع ہو۔ اس پر کسی دوسرے ملک کا قبضہ، یا مشترک بین الاقوامی قبضہ ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ برطانوی حکومت نے اگر سازش اور زبردستی سے ۷۵ سال تک اس پر قبضہ کئے رکھا تو یہ درحقیقت ایک سیاسی اور اخلاقی جرم تھا جس سے آئندہ اس تسلط کے برقرار رہنے کے لئے کوئی وجہ جواز پیدا نہیں ہوتی۔ مصر کے لئے بہرحال یہ حالت ناقابل برداشت تھی، اور آزاد اور خود مختار ہونے کے بعد اسے وہی کچھ کرنا چاہیئے تھا جو اس نے کیا۔ برطانیہ اور اس کے حلیفوں کو ہرگز یہ امید نہ رکھنی چاہئے کہ جو ممالک کل تک ان کی دست برد کے تختۂ مشق بنے رہے ہیں وہ آزاد ہو جانے کے بعد بھی ان کے بے جا تصرفات کو حسب سابق برقرار رہنے دیں گے۔ اب حالت سابقہ کو قائم رکھنے کی جو کوشش بھی کی جائے گی وہ استعماری طاقتوں کے خلاف نفرت، غصہ اور تلخی بڑھانے کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ پیدا نہ کرے گی۔ اور اگر اس ناپاک مقصد کے لئے طاقت استعمال کی گئی۔ تو اس کے نتائج اور بھی زیادہ خراب ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ جس چیز کا مطالبہ نہر سویز کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ اس گذرگاہ سے تمام قوموں کے جہازوں کو گزرنے کا آزادانہ حق حاصل رہے۔ اور اس کے لئے صرف یہ امر کافی ہے کہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں جو کسی مخصوص دھڑے کی ساختہ و پرداختہ نہ ہو بلکہ سب قوموں کی مرضی سے بلائی جائے، ۱۸۸۸ء کے معاہدے کی طرح کا ایک معاہدہ قرار پا جائے۔ ایسی کانفرنس دوستانہ فضا میں ہر وقت ہو سکتی ہے اس کے لئے وہ شور و شر اور مظاہرۂ قوت بالکل غیر ضروری ہے جو حکومت برطانیہ اور اس کے حلیفوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔

اس موقع پر یہ کہنے کی حاجت نہیں ہے کہ پاکستان کے ہر فرد کی ہمدردی فطری طور پر حکومت مصر کے ساتھ ہے، نہ صرف اس وجہ سے کہ مصر ایک مسلمان ملک ہے۔ اور نہ صرف اس بنا پر کہ اس کا مقدمہ سراسر حق بجانب ہے، بلکہ اس بنا پر بھی کہ جس استعماری شکنجے کی گرفت

بقیہ بر ص ۶۲

مسعود جاوید

مسعود مرحوم

ذکرِ مسعودِ ناتواں مت چھیڑ
قصۂ مرگِ ناگہاں مت چھیڑ
ٹیس سی دل میں ہونے لگتی ہے
بھیگی پلکوں کی داستاں مت چھیڑ

یاد آتی ہے یاریاں اس کی
بے غرض جاں نثاریاں اس کی
اُٹھ کے رونا وہ رات کو اس کا
ہائے وہ بے قراریاں اس کی

کھویا، کھویا ہمیشہ رہتا تھا
بات لیکن پتہ کی کہتا تھا
سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا مگر
نازِ ہر ایک کے وہ سہتا تھا

بات کیا تھی یہ کوئی کیا جانے
اپنے خوش تھے، نہ اُس سے بیگانے
نیم شب تک تو شمع جلتی رہی
جمع لیکن ہوئے نہ پروانے،

جانے اس کی سمجھ میں کیا آئی
ہوگیا جیسے کوئی سودائی،
آخر کار موت نے اس کو
زندگی سے نجات دلوائی،
مرگیا یہ بہت ہی اچھا ہُوا!

— —

شاعر نے جیتے جی اپنے قلم سے اپنا مرثیہ لکھ کر ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ اس میں اپنا غمِ پنہاں بھی آگیا ہے اور غمِ دوراں بھی!

غ۔ج۔قاسمی

لندن سے.....!

کچھ دن پہلے ایک دوست نے آپ کا ذکر کر کے آپ کی یاد تازہ کر دی۔ ایک مدت کے بعد کل ایک صاحب سے تفہیمات مانگ لایا۔ آج ذہنی غلامی سے متعلق مضمون مطالعہ کیا۔ بہت عرصہ پہلے پاکستان میں نے یہ مضمون پڑھا تھا لیکن آج جو کیفیت تھی، اس کی اور ماہیت ہے۔ دل کی عجب حالت ہوئی۔ اپنا تمام ماضی نظر کے سامنے آیا۔ اور دس سال پہلے کی لکھی ہوئی بات نے میرے دل کو اک تازہ ولولہ بخشتا ہے۔ بحمد اللہ میں ان دنوں نماز کی مقدور بھر پابندی کر رہا ہوں۔ ایک عیسائی گھر میں، میں اردو پڑھانے ہر اتوار جایا کرتا ہوں۔ عصر اور مغرب کی نماز وہیں ادا کرتا ہوں۔ ان کی رواداری کا بھی مداح ہوں۔ گو یہ بجائے خود ایک الگ داستان ہے۔ اور اس رواداری کا بھی ایک پس منظر ہے۔ تاہم میں نے جب کچھ عرصہ پہلے یہ فیصلہ کیا کہ اب اس تضاد اور تناقض کو چھوڑ دوں۔ اور خود کو جہاں تک ہو سکے، خدا کے حوالے کر دوں۔ اور مسلمان بن کر رہوں۔ تو سب سے پہلا قدم نماز کی ادائیگی کا اٹھایا۔ اب یہ ہے کہ زندگی میں جو FRUSTR ATON اور STAGNATION نفسیاتی طور پر تھی۔ وہ جاتی رہی ہے۔ ایک اور نتیجہ جو ظاہر ہوا۔ وہ یہ تھا کہ مجھے ایک لحاظ سے ملی عزت نفس دوبارہ مل گئی ہے۔ اب جب میں کٹر عیسائیوں کے گھر میں نماز کے وقت اٹھ کھڑا ہوتا ہوں تو گویا اپنی ملت کی انفرادیت کا اعلان کرتا ہوں اور ملت سے اپنے ربط کا اعادہ اور اظہار کرتا ہوں۔ بحمد اللہ ریا سے یہ عمل پاک ہے اور لندن جیسے اداس اور اداس کرنے والے شہر میں بھی اب راحت محسوس کرتا ہوں۔ ملی عزت نفس کا احساس مجھے اس وقت بھی ہوا۔ جب مسجد قرطبہ میں (گزشتہ سرما میں) میں نعلین اٹھائے پھر رہا تھا اور پادری مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اسی روز مجھے دو مراکشی بھی اس مسجد میں ملے تھے۔ جنہوں نے جوتے پہن رکھے تھے۔ لیکن انہوں نے میرے فعل کی برملا تعریف کی اور خود بھی جوتے اتار دیئے۔

لالہ صحرائی

تین تصویریں

میرے ذہن میں ماضی کی یادوں کا جو البم ہے، آج اس کی تین تصویریں آپ کو بھی دکھانا چاہتا ہوں، یہ تصویریں اگرچہ بظاہر کوئی شدید جذباتی قدر و قیمت نہیں رکھتیں، بس یونہی عام سے، سادہ سے، سپاٹ سے مناظر کی حامل ہیں، لیکن جانے کیوں، گزشتہ دو ماہ سے بس یہی تصویریں میری ذہنی آنکھوں کے سامنے ٹِک کر رہ گئی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کسی نے ان تصویروں کو میری یادوں کے البم سے نکال کر میرے ذہن کے چوکھٹے میں جڑ دیا ہے، اور میرا سارا اندرونی وجدان کی سمت تکتے رہنے پر مجبور ہے،..... تو لیجئے، دیکھئے آپ بھی ان تصویروں کی ایک جھلک!

یہ پہلی تصویر جماعت اسلامی کے اجتماع پٹھانکوٹ کا ایک منظر پیش کرتی ہے۔ رات کا وقت ہے، آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں، چاروں طرف ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا محیط ہے۔ اس پر تیز جھکّڑ کے فراٹے فضاؤں کے رخسار پر طمانچے بن بن کر لگتے ہیں، لحظہ بہ لحظہ بادلوں کی دبیر چادر کی اوٹ سے بجلی ایک خوفناک کڑک کے ساتھ چمکتی ہے، اور آنکھوں کو خیرہ کر جاتی ہے، دارالاسلام میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے صدہا مہمان اس وقت بستی کی ننھی منی مسجد کے سامنے جمع ہیں، جس کے چاروں طرف چند گیس روشن ہیں، لوگ ابھی ابھی عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے ہیں، ایک جانب دارالاسلام کے پلاٹوں میں ایستادہ خیمے ہواؤں کی یورش سے کسی طوفان زدہ کشتی کے بادبانوں کی مانند ڈول رہے ہیں،..... سامنے، دور بہت دور تاریکیوں کے بطون میں نارنجی رنگ کا ایک ہیبت ناک آلاؤ روشن نظر آ رہا ہے، یہ کسی جنگل کی قدرتی آگ ہے، جس کا دائرہ تیز ہوا کے جھکڑ بظاہر رفتہ رفتہ لیکن درحقیقت ایک شہرۂ آفاق سرعت کے ساتھ وسیع کرتے چلے جا رہے ہیں، کالی بھجنگ رات میں میلوں پرے جلنے والی آگ کا یہ دائرہ گہری اور دبیز تاریکیوں کی پیہم یورشوں سے گھلا کر بڑے ہی ڈراؤنے رنگ پیدا کر رہا ہے، جیسے تاریکی کی خبیث روحیں آپس میں آتشبازی کھیل رہی ہوں!...... یکایک ہواؤں میں ایک تلملی سی مچ جاتی ہے، بادل زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں، اور بجلی زیادہ تیزی کے ساتھ کڑکنے لگ جاتی ہے، مسجد کے باہر ایستادہ مہمانوں میں ایک نمایاں ہستی بھی آن شامل ہوئی ہے کھلا سر، گردن سے ذرا اونچے لمبے بال، ایک متناسب اور نفیس ڈاڑھی، گول اور وجیہہ چہرا، چشمہ اور چشمے کے نیچے فراست، فطانت حیا اور وقار سے لبریز آنکھیں، بھرا بھرا جسم اور میانہ قد...... فوراً دو رویہ لوگ خاموشی کے ساتھ آگے بڑھنے کا راستہ دیتے ہیں، اور وہ ایک انکسار آمیز وقار کے ساتھ آ کر ان کے بیچ میں کھڑے ہو جاتے ہیں...... یہ مولانا مودودی ہیں، وہ اس وقت صرف قمیص پاجامہ میں ملبوس ہیں، اور پاؤں میں کھڑاؤں ڈالے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شدید ناگہانی ضرورت کے ماتحت انہیں گھر سے اچانک باہر آنا پڑ گیا ہے۔ ان کے

اطوار سے خاص گھبراہٹ ٹپک رہی ہے، اور ان کی آنکھوں کی گردش سے تردد مترشح ہو رہا ہے، وہ اپنے اردگرد کے لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ اگر بارش آگئی، تو باہر سے آئے ہوئے سینکڑوں خیمہ نشین مہمان کہاں سمائیں گے؟ اجتماع کے منتظمین مولانا کے گرد جمع ہیں، اور اپنے اپنے مشورے پیش کر رہے ہیں، مولانا بار بار کھڑے کھڑے پہلو بدلنے لگتے ہیں، اور کبھی کبھار اُن کے چہرے پر سلوٹیں سی بھی پڑجاتی ہیں۔ حاضرین میں سے ایک صاحب مجھے بتلاتے ہیں، کہ مولانا صبح ہی سے دردِ گردہ میں مبتلا ہیں، اور شاید اس وقت بھی وہ تکلیف میں ہیں، اور میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ یہ کیسے عجیب اور غیر معمولی قسم کے لیڈر ہیں، جو منتظمین کی ایک خاطر خواہ جمعیت ہونے کے باوجود اپنی جماعت کے عام لوگوں کو محض بارش کے چھینٹوں سے بچانے کی خاطر، بسترِ علالت سے خود اٹھ کر باہر آگئے ہیں، اور ان کے آرام و استراحت کے لئے اس قدر بے تاب و مضطرب ہیں، اور میرا دل جواب دیتا ہے، کہ یہ ایک اسلامی جماعت کا اجتماع ہے، اور اسلامی جماعت کے قائد کو واقعی ایسی ہی عجیب اور غیر معمولی صفات کا مالک ہونا چاہیئے .... ناگہاں میں محسوس کرتا ہوں، کہ مولانا کو مشورے دینے کے سلسلے میں حاضرین میں سے ایک صاحب بہت پیش پیش ہیں، اور میری نگاہیں ان پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ نوجوان عمر، لانبا، چھریرا اور کسا ہوا بدن، وجاہت سے لبریز چہرا، گول اور گھنی ڈاڑھی، بل کھائی مونچھیں، تیکھی ناک، غیور و جید آنکھیں، جسم پر سادہ قمیص اور تہبند، سر پر کالی ٹوپی اور ایک سادہ سی چھڑی کے ساتھ ہلکی سی ٹیک لگائے وہ یوں پُرعزم طریق سے کھڑے ہیں، جیسے چلتے چلتے اُن کے سامنے کوہِ ہمالیہ آگیا ہو، اور وہ اس سادہ سی چھڑی کے سہارے اس کی عظیم رفعتوں کو آن کی آن میں پاؤں تلے روند ڈالنے کا ولولہ ذہن میں ابھار رہے ہوں ...... میرے پوچھنے پر ایک رفیق بتلاتے ہیں، کہ یہ چودھری احمد علی خاں ہیں، جو اس لشکرِ حق کے سپاہی بننے سے پہلے پولیس میں تھانیدار تھے، لیکن باطل کے خلاف ہمہ گیر جہاد کی نفیر سنتے ہی انہوں نے اپنی تھانیداری پر ایک مومنانہ لات رسید کر دی۔ اور اب لشکرِ حق کے ادنیٰ سپاہیوں میں شامل ہو گئے ہیں، یہ سن کر میں اور زیادہ اشتیاق کے ساتھ اُن کی سمت دیکھنے لگتا ہوں، وہ اس وقت مسجد کے دروازے کے پاس لگے ہوئے گیس کے عین نیچے کھڑے ہیں، گیس کی روشنی اُن کے چہرے پر پھوار بن کر پڑ رہی ہے، اور اس پھوار میں اُن کا چہرا بڑا نکھرا نکھرا نظر آتا ہے، ذرا گہری نظر جماتا ہوں، تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے، کہ اُن کے چہرے کا نکھار محض گیس کی روشنی کا ہی مرہونِ منت نہیں ہے، بلکہ اس کی تب و تاب میں کوئی اور غیر مرئی روشنی بھی شریک ہے ــــ خلوص اور صداقت کی روشنی ــــ عزیمت اور جسارت کی روشنی ــــ ایمان کی روشنی ــــ جذبۂ شہادت کی روشنی! میں اس روشنی کو نہ صرف دیکھتا ہوں، بلکہ اپنے بدن کے ساتھ اس کا لمس صاف محسوس کرتا ہوں، اور اس لمس کے محسوس کرنے کے ساتھ ہی میرا ضعیف قلب اپنے اندر ایک نئی طاقت ابھرتی ہوئی پاتا ہے .... اُدھر چودھری علی احمد مسلسل بڑھ بڑھ کر مشورے دیئے جاتے ہیں، اور پھر میں دیکھتا ہوں، کہ بارش کی صورت میں مہمان رفیقوں کو مختلف مقامات پر نظم اور باقاعدگی کے ساتھ لے جانے کا جو منصوبہ بنتا ہے، اسے روبہ عمل لانے کے لئے چودھری صاحب اپنے ذمے رضاکارانہ طور پر سب رفیقوں سے زیادہ کام لے لیتے ہیں!

یہ ہے پہلی تصویر، اس کے بعد لیجئے دوسری تصویر ــــ

تسنیم کے جماعتی انتظامات کے ماتحت شائع ہونے کا ابتدائی زمانہ ہے، جبکہ نکلسن روڈ کے بالائی فلیٹ میں واقع دفترِ تسنیم میں ہم کئی لوگ فاروقی صاحب کے کمرے میں بیٹھے ہیں، برسات کا موسم ہے، فضاؤں میں ایک پیاری پیاری خنکی رچی ہوئی ہے، کمرے کی دریچوں سے گاہ بگاہ ٹھنڈی ہوا کے روح افزا جھونکے آ کر مشامِ جان کو تازہ کر دیتے ہیں، باہر بھورے اور مٹیالے بادلوں کی آوارہ ٹولیاں دھوپ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں، اور اندر ہم کئی رفیق بیٹھے فاروقی صاحب کی گوناگوں محبت کی عطا کی ہوئی چائے کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ ناگہاں کمرے کا دروازہ ایک محبت آمیز بے تکلفی کے ساتھ کھلتا ہے، اور ساتھ ہی ایک وجیہ صورت شخص بڑی ہی پیاری آن بان کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں .... ایک سچی، فطری، اور بھرپور مسکراہٹ ان کے شاداں و فرحاں چہرے پر یوں لوٹ رہی ہے، جیسے سونے پر سہاگا۔

وہ اندر داخل ہوتے ہی سب کو ایک بڑے ہی والہانہ انداز میں السلام علیکم کہتے ہیں، اور ہم سب چونک کر ان کی سمت بے اختیار محبت کے ساتھ تکنے لگتے ہیں ۔ یقیناً یہ چودھری علی احمد خاں ہیں! .... وہی اجلا اجلا ناک نقشہ، سڈول اور قوی بدن، سادہ، فطری اور مجاہدانہ انداز و اطوار، محبت، عزیمت، جسارت، اور ایمان و یقین کی بجلیوں سے معمور ولولہ خیز آنکھیں، اور سر سے لے کر پاؤں تک سادگی، خلوص اور شجاعت کا ایک دلآویز مرقع! .... بناوٹ، تصنع، انانیت اور ہر قسم کے جھوٹے اور مصنوعی مظاہر سے پاک و صاف، ایک سراسر خالص، سچا، اور شفاف انسان! ...... باہر سے کھڑکی کے راستہ سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا مستانہ وار اندر آتا ہے، اور مجھے آنے والے کے السلام علیکم کہنے کے انداز سے یوں محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے یہ تسنیم کا دفتر نہیں، بلکہ میرا اپنا گھر ہے، جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہیں، وہ سب ایک ہی پُرمحبت گھرانے کے افراد ہیں، اور یہ نووارد ہم سب کے ایک بے حد محبوب و شفیق حقیقی بھائی ہیں، جو ابھی ابھی یہاں سے کسی ضرورت کے ماتحت اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے تھے، اور اب پھر ہماری خوش گپیوں میں شامل ہونے کے لئے یہاں لوٹ آئے ہیں .....

..... ہم سب ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور وہ مسرت سے کھلکھلاتے ہوئے چہرے کے ساتھ سب سے مصافحہ کرتے ہیں پھر فاروقی صاحب انہیں ایک کرسی پیش کرتے ہیں، اور وہ بڑی ہی بے تکلفی کے ساتھ اس پر جم کر بیٹھ جاتے ہیں، اسی دوران میں ابو صالح صاحب ان کے لئے چائے کی ایک پیالی تیار کر دیتے ہیں، جسے وہ بغیر کسی رسمی اظہارِ تکلف کے اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں، اور سب سے فرداً فرداً خیریت پوچھ کر وہ بڑے ہی مزے کے ساتھ چائے کی چسکیاں لینے لگتے ہیں، ابو صالح صاحب کے پوچھنے پر وہ بتلاتے ہیں، کہ وہ شرقپور والے سیلاب کے امدادی کیمپ سے ابھی ابھی لاہور پہنچے ہیں، اور بس سے اترتے ہی سیدھے دفترِ تسنیم میں آ گئے ہیں، حاضرین میں سے ایک صاحب سیلاب زدہ علاقے کے حالات دریافت کرتے ہیں، اور یک بیک اُن کے شگفتہ چہرے پر زردیاں سی بکھر جاتی ہیں، اور وہ ایک بھاری آواز میں سیلاب کی قہرمانیوں کے سامنے انسان کی بے بسی کی تفصیلات سنانے لگتے ہیں، اور ساتھ کے ساتھ اپنے امدادی کیمپ کی سرگرمیاں بھی بتلاتے جاتے ہیں، میں اُن کی اس روداد میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرتا ہوں، ایک یہ، کہ وہ اپنے زیرِ نگرانی کیمپ کی قابلِ قدر امدادی خدمات کی تفصیل سناتے وقت کہیں بھی "میں" کی نمائش نہیں فرماتے، اور بلا تامل ہر خدمت کا ذکر "ہم" سے منسوب کرتے ہوئے خود اپنی ذاتی خدمات میں بھی اپنے تمام رفقاء کو شریک کر لیتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ ان کی تمام گفتگو میں مایوسی و دل شکستگی کا کوئی ہلکا سا پرتو بھی نظر نہیں آتا، اور وہ سیلاب سے پیدا شدہ ہر بڑی سے بڑی مصیبت سے مایوس و ہراساں ہونے کی بجائے سننے والوں کو بالکل غیر شعوری

طور پر اپنی آہنی شخصیت کے کھلے پُر انہار کے ذریعے، عزم صمیم اور امید و خود اعتمادی کا پیغام بھی دیتے چلے جاتے ہیں، اور میں، اس پیغام کا نظر نہ آنے والا ہتھوڑا، خود اپنے دل کے بند دروازوں پر صاف ضرب انداز پاتا ہوں......... ہمارے سامنے چائے کی پیالیاں جوں کی توں دھری ہیں، اور ہم سب ایک صحیح معنوں میں جان نثار قومی خادم، ایک سراپا اخلاص اور ولولۂ خدمت سے سرشار ملّی کارکن کی یہ عبرت آموز اور ولولہ انگیز گفتگو کو ایک شوق بھری خموشی کے ساتھ گم صم بیٹھے سن رہے ہیں — مجاہدِ داستاں سرا اپنی طویل روداد سنانے کے بعد ذرا سی دیر کے لئے رکتا ہے، اسی دوران میں ابو صالح کی طبع شوخ گدگداتی ہے، اور وہ اپنی پیالی میں سے ٹھنڈے سیال کی ایک چسکی لے کر لاابالیانہ کہتے ہیں "اور سنائیے چودھری صاحب، آج کل آپ کیا لکھ پڑھ رہے ہیں؟" چودھری صاحب ذرا سی دیر کے لئے خموش رہتے ہیں، ادھر ابو صالح اپنی صحافیانہ ہٹ کے ماتحت دوسرا سوال داغتے ہیں، "ہاں تو کہئے، کیمونزم کے متعلق کوئی نئی کتاب بھی ان دنوں آپ کے دیکھنے میں آئی؟" اتنے میں چودھری صاحب اپنے معنوی وجود کو سیلاب میں غرقاب بستیوں اور اُن کے امدادی منصوبوں کی دنیا سے واپس لانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، وہ ذرا سا کھانستے ہیں، کمر سیدھی کر کے چائے کی ایک چسکی لیتے ہیں، پھر ہم سب پر اپنی گفتگو بے تکلفی کے ساتھ اپنے دماغ کی عظیم لائبریری کے پٹ کھول دیتے ہیں، اور میں یہ سوچ سوچ کر بے حد حیران ہونے لگتا ہوں کہ یہ خاشے کے پاجامے اور خاشے کی قمیص میں ملبوس، اور ہر قسم کے ظاہری سامانِ نمائش سے یکسر معرّا اور بے نیازانہ انسان، جو مسلسل کئی کئی دنوں تک گھٹنوں گھٹنوں سیلابی پانی میں سے گزر کر شب و روز عفونتوں اور تباہیوں میں گھرے ہوئے آفت زدہ دیہاتیوں کو ماچس کی ڈبیاں، اور نون مرچ جیسی اشیاء پہنچانے اور ان کے لئے خوراک اور اُن کے مویشیوں کے لئے بھوسے کی ٹوکریاں سر پر لاد لاد کر فراہم کرنے کے بعد ابھی ابھی یہاں آیا ہے، اور جو اپنی وضع قطع کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ بس ایک مضبوط جُثّے کا کم تعلیم یافتہ دہقان نظر آتا ہے، درحقیقت اپنے ذہن میں جدید ترین علوم کا کتنا بڑا ذخیرہ لئے پھرتا ہے، اور وقت کے تازہ مسائل کے متعلق اس کی وسیع معلومات، عارفانہ بصیرت اور دقیقہ رس و نکتہ سنج طبیعت کس طرح بڑی بڑی علمی سندات کے مالک اہل علم و فضل کے ساتھ ہمسری میں مصروف ہے........ ہم سب پر اب پھر ایک تحیر آمیز خموشی کا غلبہ ہو جاتا ہے، اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے تسنیم کا دفتر اب ایک اعلیٰ تعلیمی درس گاہ میں بدل گیا ہے، اور اس درس گاہ کا کوئی بالغ نظر اور عالی خیال معلم ہمارے سامنے عہد حاضر کی ایک عظیم فکری و سیاسی تحریک یعنی اشتراکیت پر ایک ہمہ گیر، سائنٹفک اور عالمانہ تنقید کر رہا ہے، .... کسی شخص واحد میں بیک وقت جوہر عمل اور ذہنی علو کا یوں یکجا وافر موجود ہونا، میرے لئے سراسر ایک نیا انکشاف بن جاتا ہے اور میں بڑی حیرت کے ساتھ چودھری صاحب کے ان مضبوط و توانا ہاتھوں کی سمت تکنے لگتا ہوں، جو بڑے سے بڑے مشقت کے کام اور بڑی سے بڑی علمی کتاب کو یکساں بے تکلفی اور مہارت کے ساتھ تھام لیتے تھے......

...... چودھری صاحب اشتراکیت کے متعلق اپنی تازہ ترین تحقیق کے ذکر کو تقریباً ختم کرتے ہوئے ذرا سی دیر کے لئے رکتے ہیں، اور پھر چائے کا ایک گھونٹ لے کر میز پر پڑے ہوئے پیپرویٹ سے کھیلنے لگتے ہیں۔ ابو صالح کی سیمابی طبیعت پھر جاگ اٹھتی ہے، وہ ایک پڑیا سے پان نکال کر منہ میں رکھتے ہیں، اور پھر بڑی ہی معصومیت کے ساتھ یہ سوال کرتے ہیں "چودھری صاحب، آخر آپ کو اپنی گوناگوں جانی مصروفیات کے ہوتے ہوئے ان بڑی بڑی کتابوں کے اتنے گہرے مطالعہ کا موقعہ کس طرح مل جاتا ہے" چودھری صاحب ہنس دیتے ہیں۔

اور پھر کہتے ہیں " بالکل اسی طرح جس طرح کہ میں ان مصروفیتوں کے دوران میں اپنے لئے دو وقت کھانا کھانے کا موقعہ نکال لیا کرتا ہوں "
——— اس کے ساتھ ہی وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور " اچھا تو، ذرا مرکز ہو آؤں " کہہ کر سب کے ساتھ ایک گرم جوش مصافحہ کرتے ہیں، اور پھر دروازے کی سمت چل دیتے ہیں۔

تو یہ میرے ذہنی البم کی دوسری تصویر ہے!

اور اب یہ رہی تیسری تصویر ———

یہ تصویر کراچی میں جماعت اسلامی کے دوسرے سالانہ اجتماع کی ایک جھلک پیش کرتی ہے، یہاں اندرون ملک کے کونے کونے سے کھنچے چلے آنے والے مسافرانِ راہِ حق نے اپنے آئندہ مراحلِ سفر کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لئے شہر کے ایک جانب اپنا پڑاؤ ڈال رکھا ہے، جو دیکھنے والوں کو دور سے اور قریب سے جدید وضع کی ایک خوب صورت بستی نظر آتا ہے۔ ۔۔۔ شب کے پہلے پہر کا سماں ہے اور یہ بستی اپنی بے شمار رنگا رنگ برقی ٹیوبوں کی تابانیوں سے دلہنوں کی دلہن بنی ہوئی ہے، اس کے تمام باشندے ابھی ابھی عشاء کی نماز میں خدا کے حضور سرِ عبودیت جھکا کر فارغ ہوئے ہیں، بستی کے ایک گوشے میں جلسہ گاہ کے اندر ایک ادبی مجلس جمی ہوئی ہے، جو جماعتی پروگرام کی بجائے، ایک غیر رسمی، اور دوستانہ جذبۂ ملاقات کے تحت وجود میں آئی ہے، سپید براق چادروں میں ملبوس ڈائس کے چاروں طرف اور رنگ برنگ روشنیوں کے سایوں میں تین چار سو اشخاص فرش اور کرسیوں پر بیٹھے ہیں، اور دھیمی دھیمی خوش گپیوں میں مصروف ہیں، ناگہاں اس مجلس کے میزبان، اسعد گیلانی کہیں سے کاغذ کا ایک پرزہ ڈھونڈ لانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، پھر وہ جلدی جلدی اس پر مجلس میں حصہ لینے والے شاعروں کے نام لکھتے ہیں، اور آخر میں ڈائس کے قریب آ کر ایک شاعر کے نام کا اعلان کرتے ہیں جسے سن کر ایک نوجوان ڈائس کے ایک کونے پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں، اور پھر ایک پرسوز لَے میں نعیم صدیقی کی ایک غزل سناتے ہیں، شب کا سناٹا، پرسکون ماحول، شستہ و شگفتہ اہلِ محفل، نعیم کی درد میں ڈوبی ہوئی غزل، اور گانے والے کی پرسوز لَے، یہ سب کچھ مل کر ایک پرکیف سماں باندھ دیتے ہیں، اور اہلِ محفل ایک منجھے ہوئے وقار کے ساتھ، واہ واہ اور سبحان اللہ کے دھیمے دھیمے نعرہ ہائے تحسین پیش کرتے ہیں، اس تحسین و آفرین میں ایک صاحب کی آواز دوسروں کی نسبت زیادہ بلند ہے، وہ ڈائس کی دائیں جانب پریس گیلری کی ایک کرسی پر بیٹھے ہیں وہلکے نیلے رنگ کی ایک ٹیوب کی روشنی سیدھی اُن کے چہرے پر پڑ رہی ہے، جس کی چھوٹ میں اُن کا وجیہ چہرہ بہت دلکش نظر آ رہا ہے، اُن کا سر ننگا ہے، اور قمیص کی آستینیں کہنیوں تک تہ کی ہوئی ہیں، انہوں نے اپنے دونوں بازو سامنے ڈیسک پر ایک تکون کی شکل میں پھیلا رکھے ہیں، اور اُن کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی ہیں، ہر اچھے شعر کی آمد پر وہ بیٹھے بیٹھے بے اختیار جھومنے لگتے ہیں، اور پھر سبحان اللہ، سبحان اللہ " کے بلند نعروں کے ساتھ داد پیش کرتے ہیں ...... وہ اُن کا وجیہ چہرا، تیکھے نقوش، پیالے کی طرح تڑپتی ہوئی آنکھیں، اُجلے خاصے کی دہی سادہ قمیص اور دہی پاجامہ، سادہ اور بناوٹ سے خالی انداز و اطوار، خوب غور سے دیکھ لیجئے یہی چودھری علی احمد خان ہیں۔ .... ڈائس پر یکے بعد دیگرے حلقۂ ادبِ اسلامی کے تمام معروف اور غیر معروف شعراء

آرہے ہیں، ابھی نعیم صدیقی آئے تھے، اب ماہر القادری تشریف لائے ہیں، اور لیجئے اب عبداللہ شاکر کی باری آئی، انہیں دیکھتے ہی چودھری صاحب پکار اُٹھتے ہیں "شاکر صاحب! مارشل لاء دے قیدی والی نظم سنائیے!" اور پھر تقریباً ساری محفل سے اس مطالبہ کی تائید ہونے لگتی ہے! عبداللہ شاکر اس مطالبہ پر تھوڑا سا مسکراتے ہیں، پھر اپنے منحنی وجود کو ایک لمحہ کے لئے ولائس پر یوں حرکت دیتے ہیں، جیسے اپنے پر تول رہے ہوں، اس کے بعد وہ اپنی ننھی منی ٹوپی کو سر پہ ذرا زیادہ دبا کر ایک قلندرانہ انداز میں کہتے ہیں، "تے لو فیر سنو" —— اُن کی نظم کا پہلا بند ختم ہوتے ہی سامعین کی طرف سے تحسین کا ایک دھیما شور بلند ہوتا ہے، اور مجمع میں ہل چل سی پیدا ہو جاتی ہے، اُدھر چودھری علی احمد خان کی داد میں ایک نیا جوش ابھر آتا ہے، عبداللہ شاکر اپنی اونچی اور تکلف سے عاری، کھری آواز میں بڑی ہی بے ساختگی کے ساتھ اپنی نظم کے بند پر بند پڑھتے چلے جاتے ہیں، اور پھر آن کی آن میں اپنے دھان پان وجود کے ساتھ سارے مجمع پر چھا جاتے ہیں، مجمع میں پنجابی، سندھی، بلوچی، سرحدی اور بنگالی سبھی موجود ہیں۔ لیکن شاکر صاحب کو سب کے سب بلا امتیاز پورے جوش کے ساتھ داد دے رہے ہیں، مجمع کے پنجابی نہ جاننے والے حضرات، پہلے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر خوب داد دیتے ہیں، اور پھر دھیمے سے اپنے پنجابی ساتھیوں سے پوچھتے ہیں "کیوں جی، شاکر صاحب کا کیا مطلب ہے؟" —— پھر جب شاکر صاحب ایک داعی حق کی گرفتاری کا منظر پیش کرنے کے بعد اُن کے جیل میں وارد ہونے کا تخیلی نقشہ کھینچتے ہیں، اور کہتے ہیں، کہ "مولانا مودودی آئے گُنڈے کھڑ کھڑ بولے نیں" تو مجمع کا جوش دوچند ہو جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی چودھری علی احمد صاحب بھی بالکل وارفتہ ہو جاتے ہیں۔ اور میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ میں زندگی میں پہلی مرتبہ ایک سادہ و فطری شاعر اور اس کے ایک سادہ و فطری مداح سے آشنا ہو رہا ہوں، اور "از دل خیزد بر دل ریزد" والی کتابی حقیقت کو پہلی مرتبہ اپنی آنکھوں کے سامنے "مجازاً" کے روپ میں مجسم دیکھ رہا ہوں .... اور پھر میں سوچتا ہوں، کہ ہمارے یہ چودھری علی احمد خان جو اپنی بہترین تنظیمی صلاحیتوں کے ذریعے حال ہی میں بنگال کے اندر تحریک اسلامی کے لئے ایک عظیم الشان فیلڈ ورک کا ریکارڈ پیش کر چکے ہیں، جو فکری و علمی لحاظ سے بھی عہدِ حاضر کے تقاضوں کے بموجب ایک اعلیٰ درجہ کے ذہین انسان ہیں، اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے کس قدر لوح سادہ واقع ہوئے ہیں، کہ اہلِ اخلاص کی اس بے تکلف محفل میں بالکل بچوں کی مانند بھولے، معصوم اور مسرور نظر آتے ہیں —— یہ میرے ذہنی مرقع کی تیسری تصویر تھی!

اور اب —— خود ہی غور فرما لیجئے کہ میرے ذہنی البم کی یہ تینوں تصاویر بظاہر کتنے سادہ اور بے ساختہ مناظر پیش کر رہی ہیں، لیکن جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، نہ جانے کیوں، گزشتہ چند ماہ سے یہ تصاویر میرے ذہن کے فریم میں جیسے کسی نے جڑ کر رکھ دی ہیں، اور میں آج کل انہیں دیکھتے رہنے پر طبعاً مجبور ہو رہا ہوں!

ان تین تصاویر کے بعد مجھے مستقبل میں چودھری صاحب کی کم از کم ایک اور تصویر دیکھنے کا بھی پختہ یقین ہے، ان کی یہ تصویر ایک روز پردۂ قیامت پر نمودار ہوگی، اور مجھے اس روزِ عظیم کے مالک کی رحمت سے پوری امید ہے کہ چودھری صاحب کی یہ چوتھی تصویر بھی انشاء اللہ انہی تین تصاویر کی مانند دلکش، درخشاں اور تابناک ہوگی، کیوں کہ آپ جانئے، اس تصویر میں اُن کے چہرے پر بالیقین غازۂ شہادت جھلک رہا ہوگا!

الٰہی! اس روز ہم سب کی تصویروں کو بھی رسوائی کے داغوں سے بچائیو! ✦

اختر رضوانی

رُباعیات

۱

اک کیف سا جذبات میں بھر جاتے ہیں
پل بھر میں کئی دل میں اتر جاتے ہیں
معصوم و حیراں بیاں گلستاں زادے
پیچھے سے مسافر کہ جب گزرتے ہیں

۲

قوار و حرم، نیز دکاں آپ کے پاس
املاک و زر و تیغ و سناں آپ کے پاس
دنیا ہے ادھر ایک فغاں کی زد میں
تسلیم کہ ہے ایک جہاں آپ کے پاس

۳

جینے کا جنوں چھوڑ دیا کرتے ہیں
ظالم کا فسوں توڑ دیا کرتے ہیں
وہ لوگ کہ ساحل پہ اترنا ہے جنہیں!
ہر موج کا منہ موڑ دیا کرتے ہیں

زاھد

پس پردہ

آسماں پر پھیلے بھیگے ابر پارے سو گئے
تھکی تھکی بوندوں کی جھنجھناہٹ کھو گئی
جھومتے انگڑائیاں لیتے دوشالے سو گئے
رفتہ رفتہ رات کے قدموں کی آہٹ کھو گئی

جگمگایا صبح کی دیوی کا البیلا شباب
دھیمی دھیمی سی ہنسی ہلکی مسکراہٹ جاگ اٹھی
جھلملایا ایک اودے بیخودی میں جھوم کر
شبنمیں کرنوں میں بستہ لہلہاتا حسن جاگ اٹھی

یہ تغیر روز و شب کا، یہ مرتب کائنات
خود بخود کیا آ گیا ہے ان میں یہ نظم و شعور؟
فلسفہ کے پاس کتنے ہی دلائل ہوں مگر
کارفرما ان کے پیچھے ہے کوئی طاقت ضرور

محمد عبداللہ ایم اے

مشرقی پاکستان میں اردو کی نشوونما

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ دکن، دہلی اور لکھنؤ اردو کے مرکز ہیں اور ان جگہوں میں وہ پلی، بڑھی اور پروان چڑھی مگر در حقیقت دوسرے علاقوں اور صوبوں نے بھی جن کی اپنی اپنی علاقائی زبانیں تھیں، اس کی نشوونما میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، یہ خدمات اگر سرانجام نہ پاتیں تو شاید ہی اردو کو وہ رتبہ نصیب ہوتا جو اب اسے حاصل ہے۔ تحقیقاتی مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ دیگر صوبوں کی طرح صوبۂ بنگال کا بھی شروع سے لے کر ہر دور میں اردو سے گہرا تعلق رہا ہے اور اس برِ صغیر نے اردو کے بہت سے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی آغوش میں پرورش دی جنہوں نے ارتقائے اردو میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ مغلیہ عہدِ حکومت میں دہلی کے تہذیب و تمدن اور زبانوں کا اثر دیگر مقامات کے ساتھ ساتھ یکساں طور پر بنگال پر بھی مسلسل پڑتا رہا اور اسی کا ثمرہ یہ ہوا کہ فارسی اور اردو کے ہزاروں الفاظ بنگلہ زبان میں گھل مل گئے اور وہ سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ کے جانشین ہو گئے۔ الفاظ کا یہ سرمایہ بنگال میں ارتقائے اردو کے لئے بڑا معاون ثابت ہوا۔ اسے دہلی اور لکھنؤ کے آفتابِ شاعری کی ضیا باریوں کا اثر سمجھنا چاہئے کہ اس سرزمین نے نساخ جیسے بلند پایہ شاعر کو بھی جنہوں نے ناسخ اور انیس سے ٹکر لی، پیدا کیا ہے

بنگال میں ارتقائے اردو پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ یہاں اردو زبان آٹھویں صدی ہجری میں پہنچ چکی تھی اور ہر دور میں اس کی کم و بیش خدمت ہوتی رہی۔ حضرت اخی سراج بنگلی، مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی اور حضرت شیخ نور الحق پنڈوی کے ملفوظات ہمیں چھ سو برس قبل کی اردو میں ملتے ہیں۔ اور ان ملفوظات کو یہاں کی قدیم اردو سمجھنا چاہئے۔ جس وقت دہلی میں میرؔ اور سوداؔ کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا، عین اس وقت عظیم آباد میں راسخؔ اور ڈھاکے میں خواجہ میرؔ اپنی جولانیٔ طبع دکھا کر دنیائے اردو سے خراجِ تحسین لیتے رہے۔ مصحفیؔ، انشاؔ اور جرأتؔ کے زمانے میں ہوگلی کے قاضی صادق اخترؔ اپنی شاعرانہ تاب سے ملک کے اس حصہ کو گرماتے رہے۔

جس وقت حکومتِ مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور اس کی رہی سہی طاقت ختم ہونے پر تھی اسی وقت اردو شاعری دہلی اور لکھنؤ میں اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہڑبونگ سے یہ دونوں دبستان، جو عرصہ دراز تک اردو شاعری کا مرکز رہ چکے تھے، اجڑ گئے اور تھوڑی دیر کے لئے شعراء بے سہارا ہو کر رہ گئے، مگر اس میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہماری شاعری جو بڑی حد تک دہلی اور لکھنؤ کی سرزمین میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، اپنی چار دیواری سے نکل کر فرخ آباد، عظیم آباد اور رامپور وغیرہ میں پھیل گئی۔ صوبۂ بنگال بھی اس وقت اردو کا مرکز بن گیا۔ مرشد آباد کے نوابوں نے میر سوز، میر قدرت اللہ قدرتؔ، مرزا مظہر علی علیقؔ، علی نقی خاں انتظارؔ، سید امام الدین فداؔ،

سید عبدالولی عزلت، شیخ فرحت اللہ فرحت، محمد فقیہ دردمند، مخلص علی خاں خلق، ہردے رام جودت، نقی علی فراق، مرزا محمد ولی ہوتی اور دوسرے معاصرین کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی۔ ان شاعروں کی سرگرمیوں سے شعر و سخن کا ذوق دور دور تک پھیلا۔ ہاں زمین بنگال ان کی اردو نوازی کے لئے رہین منت رہے گی۔ انشاء اللہ خاں انشا مرشد آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ غدر کے بعد اردو کے قابل ذکر شاعر اور سرپرست نواب واجد علی شاہ اختر، اپنے دربار کے شاعروں، مرزا محمد رضا برق، درخشاں صولت، بہار اور صبا وغیرہ کو لے کر مٹیا برج کلکتہ پہنچے۔ ان کی صحبتوں اور مشاعروں سے یہ جگہ بھی اردو شعر و شاعری کا مرکز بن گئی اور مدت تک یہی بہار دکھاتی رہی۔ مٹیا برج کے بعد اسی دور میں ڈھاکہ بھی اردو کا مرکز بنا۔ ڈھاکہ کے اس مرکز نے اردو کی ترویج میں قابل قدر حصہ لیا ہے۔ عبدالغفور نساخ، حکیم حبیب الرحمٰن خاں، بخش کلکتوی، احسن اللہ شاہین، شائق، اختر، سید محمود آزاد، نواب سید محمد آزاد، خواجہ عتیق اللہ شیدا، خواجہ بیدار بخت بیدار وغیرہ اس مرکز کی علمبردار ہستیاں ہیں۔ نساخ اور حکیم حبیب الرحمٰن پر مشرقی پاکستان جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ یوں تو نساخ کے کارنامے بہت ہیں مگر جس چیز نے ان کو حیات جاودانی بخشی وہ ان کی تالیف "سخن شعراء" ہے۔ اس کتاب کی قدر و قیمت شروع سے مسلّم ہے۔ مگر قیام پاکستان کے بعد اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، کیوں کہ پاکستان بننے کے بعد مشرقی پاکستان میں اردو کو نئی اہمیت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی نہایت شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی کہ یہاں کے پرانے ادیبوں اور شاعروں کو جنہیں زمانہ بھولتا جا رہا ہے، منظر عام پر لایا جائے۔ نساخ کے اس تذکرہ کو اٹھائے بغیر کوئی شخص بھی اس موضوع پر قلم نہیں تھام سکتا۔ اس میں بعض ایسی مفید اطلاعات بھی مل جاتی ہیں جو کہیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ حکیم حبیب الرحمٰن بھی ڈھاکہ کے ایک جلیل القدر ادیب گزرے ہیں۔ انہوں نے قدیم ڈھاکہ کے متعلق اردو میں بہت سے مضامین لکھ کر اس کی پرانی تاریخ اور تہذیب و تمدن پر قابل قدر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی بیاضیں اور قلمی نسخے مشرقی پاکستان کی تاریخ ادب اردو کے سلسلے میں بڑی افادیت کے حامل ہیں۔

حکومت برطانیہ کے زیر نگرانی کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں نثر اردو کی جو خدمات سرانجام پائی ہیں وہ ہرگز ایام سے کبھی نہیں مٹ سکتیں۔ اس حلقے میں اچھے اچھے ادیب اور شاعر ملک کے مختلف حصوں سے کھنچ کر چلے آئے۔ انہوں نے اردو نثر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ فصیح اور سلیس اور بول چال کی زبان لکھنے کا ڈول ڈالا۔ آج ڈیڑھ سو سال ہونے کو آئے مگر اس کالج کی اہم پیداوار میر امن کی "باغ و بہار"، شیر علی افسوس کی "باغ اردو" اور سید حیدر بخش حیدری کی "آرائش محفل" اپنی سادہ نگاری کی بدولت آج بھی ویسی ہی مقبول ہیں۔ جیسے کہ پہلے تھیں۔ صحیح معنوں میں سرزمین بنگال کے اسی ادارے میں اردو نثر کی بنیاد پڑی ہے۔ اس سے پہلے سلجھی ہوئی نثر میں مختلف فنون میں کتابوں کی تصنیف و تالیف کی کوئی تحریک وجود میں نہیں آئی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد ملک کے اس حصہ یعنی مشرقی پاکستان میں اردو کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد یہاں کی اردو نے حیات تازہ حاصل کر لی ہے۔ اس نئے عروج کو مشرقی پاکستان میں اردو کی "نشاۃ ثانیہ" سمجھنا چاہیئے۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کا دینیات و اخلاقیات کی طرف ہمیشہ فطری میلان و رجحان رہا ہے۔ جہاں بھی انہیں مذہبی امور سے واقف ہونے کا مواد مسالہ ملتا ہے

وہ اسے جان و دل سے عزیز رکھتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ قدیم زمانے سے بڑی تعداد میں واعظ، مبلغ، صوفی اور علمائے دین دور و نزدیک سے وقتاً فوقتاً مشرقی پاکستان پہنچتے رہے اور یہاں کے عوام و خواص کو اردو میں وعظ و نصیحت سناتے رہے۔ سلیس اور عام فہم اردو میں مذہبیات پر کتابیں لکھ کر انہیں حقیقتِ اسلام سے روشناس کراتے رہے اور یہاں کے لوگ بھی نہایت شوق اور دل دہی کے ساتھ انہیں پڑھتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اردو زبان کا سکہ ان کے دلوں میں بیٹھ گیا اور وہ اس کے دلدادہ بن گئے۔ اردو زبان کا جو رعب اگلوں پر پڑا تھا اس کا اثر پچھلوں تک بھی آپہنچا ہے۔ چنانچہ اب بھی مشرقی پاکستان کے عوام کی کافی تعداد اردو کو نہایت ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور زیادہ تر اردو کتابوں کے ذریعے مذہبیات سیکھ لیتی ہے۔ بعض لوگوں کی اردو کے ساتھ خوش اعتقادی کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآنی رسم الخط میں لکھی ہوئی فارسی اور اردو کتابوں کے سامنے بھی اپنا فرشِ اعتقاد بچھا دیتے ہیں اور انہیں مذہبی زبانیں سمجھ کر طہارت حاصل کئے بغیر ان کتابوں کو چھونا تک گوارا نہیں کرتے۔ یہاں کے علماء کو اردو زبان سے ہمیشہ خاص انس رہا ہے۔ انہوں نے اسے اہتمام سے سیکھا اور اسی میں دینیات و اخلاقیات پر مختلف کتابیں بھی لکھی ہیں اور اب بھی لکھتے ہیں۔ "ہدایت الاسلام"، "راہِ نجات"، "مفتاح الجنۃ" اور "صلوٰۃ الرحمٰن" وغیرہ اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ علمائے کرام مدرسہ کے طالب علموں کو اردو ہی میں قرآن و حدیث، فقہ و کلام، سیرت و تاریخ وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اسی میں فتوے شائع کرتے، میلاد پڑھتے وعظ و نصیحت سناتے ہیں۔ اردو زبان نے نہ صرف یہاں کے علماء پر اپنا اثر جمایا بلکہ بنگالی زبان کے بہت سے ادیبوں کے دلوں میں بھی اپنا گھر کر لیا ہے۔ قاضی نذر الاسلام کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی شاعری پر فارسی اور اردو کا کس قدر اثر پڑا ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ فارسی اور اردو کے الفاظ اور بحور سے اپنی شاعری کو نئے طرزِ تحریر کی زینت بخشی اور بنگالی ادب پر اسلامی تہذیب و تمدن کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے بہت سے اردو محاورات و اصطلاحات کو بنگالی زبان کا لباس پہنا کر انہیں اپنی شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے[1]۔ اب بنگالی ادب میں بڑی تعداد کے فارسی اور اردو الفاظ استعمال ہونے لگے ہیں اور زبانِ اردو و بنگالی ایک دوسری سے قریب ہونے لگی ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد متعدد ناظم و نثر کے لکھنے والے مشرقی پاکستان پہنچے اور انہوں نے یہاں اردو کی نشر و اشاعت میں ہر ممکن کوشش کی اور اب بھی اسی میں مصروف ہیں۔ حال ہی میں یہاں اردو کے بلند پایہ شاعر ڈاکٹر عندلیب شادانی، سرزمینِ بنگال کی مایۂ ناز شخصیت رضا علی وحشت، پروفیسر احسن احمد اشک، فطرت واسطی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، سید اقبال عظیم، مولانا عبید اللہ فیضا سلہٹی، مولانا اجمل علی شوق سلہٹی اور مولانا اسماعیل الم سلہٹی و دیگر حضرات اردو کی گراں بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں اردو کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب یہاں ہر اسکول اور مدرسے میں ابتدائی کلاسوں سے لے کر اعلیٰ کلاسوں تک میں کافی تعداد کے اردو خواں طالب علم نظر آتے ہیں اور وہ اردو کے ساتھ "میٹرک" کا امتحان بھی پاس کرتے ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم اردو کے لئے لازمی عہدے پیدا کئے گئے ہیں۔ ریڈیو اور گراموفونوں میں اردو گانے کی زیادہ آؤ بھگت ہوتی

[1] قاضی نذر الاسلام کے متعلق یہ نقطۂ نظر کم سے کم ہمارے سامنے پہلی بار آیا ہے۔ ہمارا اب تک کا علم یہ تھا کہ وہ مسلم بنگلہ کے بجائے ہندو بنگلہ کے ادیب تھے۔ (ن۔ م)

ہے۔ راستہ چلنے والے نوجوان لڑکے، رکشا والے اور مزدور اردو گیتوں اور ملہاروں سے اپنا دل بہلاتے جاتے ہیں۔ سینما گھروں میں اردو فلموں کو دیکھنے کے لئے بنگلہ فلموں سے بھی زیادہ بھیڑ لگی رہتی ہے۔ ڈھاکہ، چاٹگام اور سلہٹ وغیرہ مقامات میں بعض پرانے شریف گھرانوں میں اب بھی ویسے ہی اردو بولی جاتی ہے جیسے کہ پہلے تھی۔ اردو کے قومی زبان قرار پانے کی وجہ سے اب نہ صرف مسلمان گھرانوں بلکہ ہندو گھرانوں میں بھی اس کی باقاعدہ تعلیم ہونے لگی ہے۔ اس کی ترقی کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ مختلف شہروں میں "کل پاکستان انجمن ترقی اردو" کی شاخیں قائم کی گئی ہیں۔ انجمن کی طرف سے مستحق اردو خواں طالب علموں کو ترغیب دہی کے طور پر وظیفے دیئے جاتے ہیں۔ ڈھاکہ کے کتب خانوں مثلاً "پاک کتاب گھر" اور "قرآن منزل" وغیرہ میں اردو میں کم و بیش ہر قسم کی کتابیں ملتی ہیں۔ "بزم ادب" کے زیر اہتمام ڈھاکہ میں گاہ گاہ مشاعرہ کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ ڈھاکہ کا روزنامہ "پاسبان" قیام پاکستان کے بعد سے نہایت کامیابی کے ساتھ صحافت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ ڈھاکہ اور راجشاہی یونیورسٹیوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے "ریسرچ" کا کام بھی ہو رہا ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ماتحت اردو کا "ڈپلوما کورس" کھولا گیا تھا۔ اس میں بہت سے بنگالی طالب علموں نے اردو میں کافی معلومات بہم پہنچائی اور متعدد کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اردو کے یہ دلدادگان اب ملک کے مختلف حصوں میں تعلیم اردو کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ "ڈپلوما کورس" بند کر دیا گیا ہے۔ کاش کہ اس قسم کا کوئی اور ادارہ پھر وجود میں آ جاتا!

غرض آج مشرقی پاکستان میں اردو دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اس کا چرچا وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور ایک روشن مستقبل اس کے لئے انتظار کر رہا ہے۔ بنگالی پاکستان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے۔ مشرقی پاکستان میں اردو پر اس کا اثر پڑے بغیر کیسے رہ سکتا ہے! بنگال میں اردو کے ادیب اور شاعر بنگالی ادب سے نئے نئے پودے لا کر اپنے باغ لگاتے رہیں گے۔ مشرقی پاکستان فطری مناظر کا گہوارہ ہے، اس لئے اب یہاں شاعروں کو دہلی اور لکھنؤ، کراچی اور لاہور سے الگ تھلگ چھالیہ اور ناریل کے درختوں کی سائیں سائیں، بڑھتی ہوئی بڑی ندیوں کی موجوں کا خرام، پورے بانس کے بادبان اڑاتی ہوئی کشتیوں کی سبک رفتاری، جالوں کے حلقوں میں سیماب پیکر مچھلیوں کی تڑپ، غرض جولانیٔ طبع کے لئے نئی نئی خیال انگیز فضائیں مہیا ہیں۔ یہاں سماجی اور سیاسی پس منظر کے تحت نئے پہلو سامنے آتے ہیں جو افسانوی ادب کے لئے بڑا وسیع سرمایۂ خیالات و جذبات بہم پہنچاتے ہیں۔ ان اہل قلم کے لئے بے شمار اچھوتے مضامین موجود ہیں۔ نہ جانے مرحوم اکبر آبادی کی نظم "مشرقی بنگال کا ملاح" اور "بوڑھی گنگا کے کنارے شام کا ایک منظر" کی طرح کتنی اور نظمیں مستقبل قریب میں معرض وجود میں آنے والی ہیں جن کے سُروں میں دہلی اور لکھنؤ، کراچی اور لاہور کے بجائے مشرقی پاکستان کے دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیں گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مرکزوں کی طرح ڈھاکہ اور چاٹگام بھی رفتہ رفتہ اردو کا مرکز بن جائیں گے۔ زبان اردو کا جو چشمہ یہاں جاری ہوا ہے اس کی سوتیں بہہ کر نہ صرف ملک کے اس بازو کو سیراب کریں گی بلکہ نئے ماحول سے توانائی اور تازگی لے کر مغربی پاکستان کے باغ اردو کو بھی ہرا بھرا کر سکتی ہیں!

ہماری معلومات کے بموجب یہ کوششیں ضرور ہندوستان کے مقابلہ میں بہت حقیقت پسندانہ معیار رکھتی ہیں اور ان کی یادآوری میں بھی عصبیت کی وہ مصنوعی ناموزوں رکاوٹ بن رہی ہے جسے ہندو، کمیونسٹ اور مسلم بندگانِ اغراض پچھلے تین چار برس سے مشتعل کر رہے ہیں۔

نعیم صدیقی

پو پھٹی

افق کے ماتھے سے کالی ردا ہٹی آخر
غمِ غلامی کی گردِ کہن چھٹی آخر
دراز تھی شبِ فرقت، مگر کٹی آخر
بڑے غبار اڑے، پھر بھی پو پھٹی آخر
تنک تنک سہی صہبائے حق بٹی آخر

نظامِ پاک! تو آئے تو زندگی آئے
حرارت آئے ترے ساتھ روشنی آئے
شعور آئے، خودی آئے، بیخودی آئے
امیدیں جاگیں تو روحِ عمل نئی آئے
ترے جلو میں پھر امن و سلامتی آئے

یہ تیرے چاہنے والے بہت ستائے گئے
یہ زخم خوردہ کلیجے بہت دکھائے گئے
یہ راہ دیکھتے دیدے بہت رلائے گئے
وہ دیکھ لاشے کہ جو پھانسیوں چڑھائے گئے
اُجڑ گئے ہیں نشیمن، قفس بسائے گئے

یہ وہ ہیں کندھوں پہ ہفت آسماں اٹھاتے رہے
شہوں کی شاہی کا بارِ گراں اٹھاتے رہے
یہ ظالموں کی جفا کے نشاں اٹھاتے رہے
بڑے ہی بھاری جوئے یہ بے زباں اٹھاتے رہے
کبھی گھٹے ہیں کہیں پر فغاں اٹھاتے رہے

یہ لوگ جو کبھی تاریخ کے امام رہے
یہ حریت کے خداکار تھے غلام رہے
یہ آشیانوں کے ڈھنڈ اسیرِ دام رہے
خود اپنی محفلِ مے میں شکستہ جام رہے
نظامِ کفر کے سائے میں بے نظام رہے

کھنڈر ہوئیں دل و دیدہ کی بستیاں کیا کیا!
اجڑ گئی ہیں محبت کی کھیتیاں کیا کیا!
لٹے پڑے ہیں یہ سیرت کے گلستاں کیا کیا
بھٹک رہے ہیں امیدوں کے کارواں کیا کیا
ہزار سالہ تباہی کا ہو بیاں کیا کیا!

ترے خدائی کہ جینا بھی جن کو راس نہیں!
یہ ہڈیوں کے ہیں ڈھانچے کہ تن پہ ماس نہیں!
سروں پہ سایہ نہیں، جسم پر لباس نہیں!
یہ فاقوں مارے ہیں کوڑی بھی ان کے پاس نہیں
ترے بغیر نہیں اور کوئی آس نہیں

مگر یہ سینوں میں اک اعتقاد رکھتے ہیں
یہ پست ہو کے بھی اونچی مراد رکھتے ہیں
یہ اپنی عظمتِ رفتہ کو یاد رکھتے ہیں
دبا دبا سا غمِ افتاد رکھتے ہیں
انہیں پکار! یہ جوشِ جہاد رکھتے ہیں

یہ جاں نثار ہیں تیرے، یہ کام آئیں گے
زمانے بھر میں یہ پرچم ترا اڑائیں گے
جہاں پسینہ بہاتا ہو، خوں بہائیں گے
یہ زندگی کی عمارت نئی اٹھائیں گے
جہاں کو جنتِ امن و سکوں بنائیں گے

تو ان کی قوتِ خوابیدہ کو جگا کے تو دیکھ
دلوں میں ہے جو قیامت اسے اٹھا کے تو دیکھ
تو خاکِ پاک سے انسانِ نو بنا کے تو دیکھ
نگاہ کر کے جگر ان کے آزما کے تو دیکھ
ذرا وہ نغمۂ رقت انہیں سنا کے تو دیکھ

یگانگت کی ادا سے انہیں اشارا دے
انہیں گلے سے لگا لے، انہیں سہارا دے

بقیہ رابعہ فرواری

"نہیں میری زندگی میں ایسا نہیں ہو سکتا۔" گلبدن بہت بےقرار ہوئی تو اس نے تمام ماجرا دریافت کرنے کی ہمت کی۔ پہلے تو یکتاش ٹالتا رہا لیکن جب گلبدن نے بہت ضد کی تو اس نے تمام ماجرا کہہ سنایا۔

گلبدن حالات سن کر سکتے میں آ گئی۔ اسے یہ خیال ہی نہ تھا کہ حالات اس قدر خراب ہو جائیں گے اس وقت تو زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا لیکن جس وقت تلوار لے کر یکتاش باہر جانے لگا تو اس سے لپٹ کر رونے لگی مگر یکتاش نے سخت لہجے میں اس سے کہا "گلبدن دنیا کی تمام آسائشیں صرف تمہارے لئے ہی مخصوص نہیں ہو سکتیں۔ رابعہ کا بھی مجھ پر کچھ حق ہے۔ اس نے میری خاطر بڑی ذلتیں اٹھائی ہیں اب اس نے دنیا بھی ترک کر دی ہے۔ ایسی حالت میں اس کی جان بچانا میرا فرض ہے۔ ترکِ دنیا کے بعد اس پر فسق و فجور کا الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ تم مجھے روک کر خدا کو کیا جواب دو گی۔ کیا مظلوم کی مدد کرنا ہمارا فرض نہیں۔ رابعہ نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا جس کی سزا موت ہو اور اگر کوئی گناہ کیا بھی تو وہ اب اس سے تائب ہو چکی ہے۔ گلبدن اتنی خودغرضی بھی انسانیت سے دور ہے۔ انسان ہو کچھ قربانی دینے کی ہمت کرو۔ خودغرضی بڑی بری لعنت ہے گلبدن یہ انسان کو انتہائی بزدل بنا دیتی ہے۔ میں تمہارا ہوں اور زندگی بھر تمہارا ہی رہوں گا۔ رابعہ بازی ہار چکی ہے۔ وہ مجھے تو تم سے چھین نہیں سکتی لیکن ایسے نازک وقت میں اس کی مدد کرنا محبت کا فرض نہیں بلکہ انسانیت کا فرض ہے۔ اس وقت دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے وہ بالکل تنہا ہے۔ یہ وقت اگر کسی دوسری عورت پر پڑتا تب بھی میں اس کی ضرور مدد کرتا۔"

گلبدن کو منطقی اور اخلاقی دلائل پر غور کرنے کی نہ ہمت تھی اور نہ فرصت وہ اٹھ کر یکتاش سے لپٹ گئی اور کہنے لگی پہلے مجھے مار دو۔ یکتاش کو طیش آ گیا۔ وقت تنگ ہو چکا تھا۔ گلبدن کو دھکا دے کر باہر نکل گیا۔ خانقاہ میں لوگ رابعہ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یکتاش نے انہیں للکارا۔ وہ رابعہ کو چھوڑ کر یکتاش پر ٹوٹ پڑے تلوار چلنے لگی۔ خانقاہ کے لوگ ڈر کر کمروں میں چھپ گئے۔ یکتاش زخموں سے چور ہو کر گرا تو رابعہ اس کی طرف دوڑی تڑپتے ہوئے جسم پر جھکی ہی تھی کہ ایک ساتھ چار تلواریں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔

اسرار احمد سجادی

"رابعہ قزداری"

ایران میں سامانی حکمرانوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔ آلِ سامان انتہائی خوش مذاق، لطیف طبع اور مربیٔ شعر و شاعری بادشاہ گزرے ہیں۔ ان کے دربار کا نابینا شاعر رودکی فارسی شاعری کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔ بادشاہ وقت کی تربیت کا یہ اثر ہوا کہ ہر قصبے اور شہر میں شعر و شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ گویا ایرانیوں کے جذبات کی عرصے سے دبی ہوئی چنگاری ایک ساتھ بھڑک اٹھی۔ اسی زمانے کی ایک ناکام آرزو شاعرہ رابعہ بھی تھی۔ اس کی زندگی کے حالات یونان کی مشہور شاعرہ سفو سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ رابعہ کا والد عربی النسل تھا لیکن رابعہ عجم میں پیدا ہوئی۔ اس وجہ سے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی۔ رابعہ بلخ کے ایک خوبصورت قریے قزدار میں پیدا ہوئی تھی۔ قزدار کا علاقہ ایران کے شاداب ترین خطوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وسیع سبزہ زار حد نظر تک باصرہ نوازی کرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت پہاڑیاں اس دلفریب آبادی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ان پہاڑیوں سے متعدد قدرتی چشمے نکلتے ہیں جو آگے بڑھ کر ایک نرم رو ندی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ پہاڑوں کی گھاٹیاں رنگ رنگ کے پھولوں اور بھانت بھانت کے خوش الحان پرندوں سے جنت کا نمونہ بنی ہوئی ہیں۔ آبادی مختصر ہے لیکن اکثر خوش مذاق اور صاف پوش لوگ رہتے ہیں۔ یوں تو ایران کا چپہ چپہ رومان آفریں اور شاعر خیز ہے مگر قزدار اپنی قدرتی خوبصورتی کے لحاظ سے عشق آفرینی اور شعر زائی کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔

رابعہ اسی خوبصورت قصبے کے رنگین ماحول میں پیدا ہوئی۔ انہیں نظر فریب سبزہ زاروں میں کھیلی جہاں کے طائرانِ نغمہ خواں اس کی رنگین بیانی اور خوش الحانی کے استاد بنے۔ یہیں سے پھول چنے۔ آبشاروں کے نت نئے گیت سنے۔ صحبت اور تربیت بھی خوش طبع اور تعلیم یافتہ لوگوں کی پائی۔ بچپن سے ہی بلا کی ذہین تھی۔ سازگار ماحول ملا چنانچہ فطری ذکاوتِ طبع کو چار چاند لگ گئے کہتے ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں خاصے اشعار موزوں کر لیتی تھی۔ آغازِ کار میں ماں باپ نے اسے شعر گوئی سے باز رکھنا چاہا مگر قدرتی آبشاروں اور چشموں کی روانی کس نے روکی ہے۔ رابعہ کے اشعار اب تک "سوزِ غمہائے نہانی" سے بہرہ ور نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک معصوم مگر موزوں طبع کے بے کیف سے گیت تھے۔ گویا بچپن کا ایک کھیل تھا۔ رابعہ کے اشعار میں درد اور نغموں میں سوز و اثر پیدا کرنے کے لئے اس کے مطمئن دل میں محبت کی شعلہ افشانی کی ضرورت تھی۔ بغیر زخم کھائے نہ شعر گوئی کا لطف ہے نہ نغمہ آرائی کا۔ ان دونوں کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کے خرمنِ ہستی میں آگ لگنے کا سامان بھی مہیا ہو گیا۔

رابعہ کے حسن و شباب کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ قرب و جوار کے بڑے بڑے رئیس زادے رابعہ

طمانیت و رقابت کی تلخی سے مل کر ایک عجیب قسم کا تبسم پیدا ہوا اور فوراً ختم ہو گیا۔

چند دنوں کے بعد دوسری مجلس میں جو رابعہ نے تازہ اشعار پڑھے تو عجیب رنگ پیدا ہو گیا تھا حقیقی درد و تاثر کی چاشنی بھلا کہاں چھپ سکتی ہے۔ سب کو بڑا تعجب ہوا کہ رابعہ کے کلام میں یہ سرمستی اور سوز کہاں سے پیدا ہو گیا۔ لیکن "نہاں کے ماند آن رازے کزو سازند محفلہا" عشق وہ بھی شاعر کا پوشیدہ کیوں کر رہتا۔ طشت از بام ہونا تھا اور ہوا۔ رابعہ کی بڑی رسوائی ہوئی۔ اس زمانے کی شاعری دیکھ کر رابعہ کے عشق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی مشہور کتاب شعر العجم میں رابعہ کی زندگی کے مختصر حالات لکھ کر اس دور کی شاعری کا نمونہ بھی دیا ہے۔ میں طوالت کے خوف سے اس کو نظر انداز کرتا ہوں لیکن رابعہ کی زندگی کا تاریک ترین پہلو یہ تھا کہ وہ جس پر جان دیتی تھی وہ دوسری شمع کا پروانہ تھا۔ رابعہ کا حسن اس کی مشہورِ خلائق شاعری اور اس کی خوش الحانی اس کے کچھ بھی کام نہ آ سکی۔ اس کے مقابلے میں ایک کنیز گلبدن کامیاب ہو گئی۔ رابعہ کے دل پر اس ناکامی سے سخت چوٹ لگی۔ خدا کی شان ہے کہ وہ رابعہ جس کے قدموں پر بڑے بڑے پرتکبر سر جھکنے کی آرزو رکھتے تھے وہ ایک غلام کے در کی ناکام جبیں سائی کر رہی تھی۔

عشق است و ہزار بدگمانی۔ گلبدن کو رابعہ کی طرف سے ہر وقت خلش سی رہتی تھی اس نے کوشش کر کے حلیمہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ گلبدن اور بکتاش خاموشی سے نکاح کر لیں حلیمہ نے رابعہ کی بہبودی بھی اسی میں سمجھی۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ بکتاش کا نکاح گلبدن کے ساتھ ہو جانے کا یہ اثر ہو گا کہ رابعہ کے سر سے عشق کا سودا نکل جائے گا اور وہ بدنامی سے بچ جائے گی۔ بکتاش کا گلبدن سے نکاح کر لینا رابعہ کے لئے ایک سخت سانحہ ثابت ہوا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اس نے ترکِ دنیا کی ٹھان لی لوگوں نے لاکھ سمجھایا لیکن اس نے ایک نہ مانی اس کے تمام اعزا اس کی اس حرکت سے انتہائی نالاں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ رابعہ نے ایک غلام سے اس قدر برملا عشق کر کے ان کے خاندان کی آبرو کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ایک شریف زادی کو یہ حرکت کسی طرح زیب نہیں دیتی۔ اس کو اپنی شرافت کا خیال کر کے ضبط سے کام لینا چاہئے تھا۔ ان میں سے اکثر یہ سوچا کرتے تھے کہ کسی دن موقع ہاتھ آئے تو اسے پوشیدہ طریقے سے ٹھکانے لگا دیا جائے۔

رابعہ نے جس دن سے فقیری لباس بدلا اسی دن سے گھر بار چھوڑ کر بستی کے کنارے ایک خانقاہ میں جا کر بیٹھ گئی۔ اس کے [illegible] کو اب اس کی زندگی کا خاتمہ کرنے میں کچھ سہولت نظر آئی۔ چنانچہ انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کر لیا کہ چار [illegible] پہنچ جائیں اور رابعہ کا وہیں خاتمہ کر کے بھاگ آئیں۔ بکتاش کو کسی طرح اس منصوبے [illegible] بکتاش کے دل میں ایک زبردست تغیر ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوا۔ یہ خبر سننے کے تھوڑے عرصے کے بعد ہی [illegible] کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ بہت دیر تک بے قراری کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ گلبدن نے یہ حالت دیکھی تو سراسیمہ [illegible] نہیں ہو سکتا۔ وہ اب [illegible] مجھ سے محبت کرنے کے جرم میں اسے مرنے [illegible]

(باقی پر صفحہ ۲۰)

ضیاء الرشید

"اپنی باتیں"

(رپورتاژ)

دفتر کا وقت ختم ہونے سے چند منٹ پیشتر مجھے ہسپتال والوں نے ٹیلی فون کیا کہ آکر اپنی بیوی کو واپس لے جاؤ، بچہ حرکت کرنے لگا ہے اور ولادت تقریباً ایک ہفتے کے بعد ہوگی۔

یہ سعودی عرب کے ایک مقام "راستنورہ" کا ذکر ہے جہاں میں اُن دنوں آئیل کمپنی میں ملازم تھا اور یہ پیغام مجھے کمپنی کے بڑے ہسپتال سے موصول ہوا تھا جو راستنورہ سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

اُس روز دوپہر کے کھانے کے لئے میں حسبِ معمول گھر گیا اور خبریں سننے کے لئے ریڈیو لگا رہا تھا کہ ملحقہ کمرے میں برتنوں کے گرنے کی جھنکار سنائی دی۔ گھبرا کر دیکھا تو فرش پر میری حاملہ بیوی گری ہوئی تھی اور برتنوں کے کانچ چُبھ جانے کی وجہ سے اس کے ہاتھوں اور ٹھوڑی سے خون بہ رہا تھا۔

ناتجربہ کاری، پردیس، تنہائی اور یہ حادثہ...... چند لمحوں تک تو دم بخود کھڑا رہا آخر لرزتے ہاتھوں سے بیوی کو سہارا دیا۔ مقامی ہسپتال پہنچنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا کہ بچہ حرکت نہیں کر رہا ہے۔ بڑے ہسپتال لے جاؤ۔ فوراً ایمبولنس تیار ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم بڑے ہسپتال پہنچ گئے۔

راستے میں نرس نے متعدد بار بچے کی حرکت کو محسوس کرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ مایوس ہوکر پیٹ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیتی اور میں راستے بھر خوفزدہ اور سہمی ہوئی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے پُرہول خیالات سے جنگ کرتا رہا۔

ہسپتال میں داخل کرانے کے بعد میں اُسی وقت واپس آگیا کہ دفتر کا وقت ختم ہونے سے چند منٹ پیشتر مجھے یہ خوش خبری موصول ہوئی اور رات تک میں بیوی کو گھر واپس لے آیا۔

ہم دونوں اس خطرناک حادثے کے بعد خوبیٔ قسمت پر شاداں و خنداں تھے ہماری سال بھر سے بھی کم عرصے کی ازدواجی زندگی میں یہ پہلا عارضی غم تھا جس نے آنے والی خوشی کو دوبالا کر دیا تھا۔

مگر دوسرے ہی روز دفتر میں ٹیلی فون پر کسی محلے والے نے اطلاع دی کہ آپ کی بیوی کی طبیعت خراب ہے جلدی سے گھر آیئے۔ گھر پہنچا تو بیوی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی گویا اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور زار و قطار رونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ وہ درد ہے جو منت کش دوا نہیں ہوتا۔ فوراً مقامی ہسپتال پہنچے اور وہاں سے آخری مرحلے سے گزرنے کے لئے بڑے ہسپتال روانہ ہو گئے۔ چالیس میل کے اس ناقابلِ فراموش سفر کے دوران میں انگاروں پر مچلتی ہوئی ایک عورت کے نالے تھے

ایک عورت نما نرس کا تجاہلِ عارفانہ تھا۔ میں تھا اور میرا جگر لخت لخت ....

کبھی بیوی کو تسلی دیتا، کبھی اس کے پریشان بالوں کو اُس کے ہاتھوں سے چھڑاتا، کبھی اُس کے زخمی ہونٹوں کو اُس کے دانتوں کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کرتا۔ کبھی رحم طلب نظروں سے نرس کی طرف دیکھتا۔

اور اِس کشمکش میں ہسپتال پہنچ گئے۔

امید و بیم کے عالم میں بیوی کی "زندگی اور موت" کے حقوق ہسپتال والوں کو سونپ کر چلنے لگا تو اس نے زخمی لہجے میں درد سے کراہتے ہوئے کہا "میرے لئے دعا مانگنا"۔ میں نے چاہا کہ تسلی کے لئے چند رسمی الفاظ کہوں مگر جیسے نطق سے محروم ہوگیا تھا۔ اور لب وا ہونا بھول گئے تھے .... سر بہ گریباں ہسپتال سے نکل آیا۔

گھر پہنچا تو ہر مانوس چیز اجنبی نظر آئی۔ در و دیوار نحوست آفریں، سامان و سامان ویران، شام "شامِ غم" کے لباس میں گھر کی چار دیواری میں قدم رکھ چکی تھی۔ گھر کے ہُو بہ لب ماحول میں صرف "ٹیگ بین" کے "ٹائم پیس" کی ٹِک ٹِک گونج رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اکتا کر باہر نکل آیا۔ اس وقت چھ بجے تھے۔ تھوڑی دور "پبلک ٹیلی فون بوتھ" تھا۔ وہاں جا کر میں نے ہسپتال فون کیا۔

چند لمحوں کے بعد ایک نسوانی آواز نے بتایا کہ "فطری درد کے علاوہ اور سب خیریت ہے"۔ گھر کی طرف لوٹتے ہوئے مجھے ایک عام سا خیال آیا کہ آخر دنیا میں یونہی ہر عورت کے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں .... ملکۂ الزبتھ کو بھی اسی طرح تکلیف ہوئی ہوگی۔ مجھے کئی اور مثالیں یاد آئیں "بچے کی پیدائش" یہ لوگوں کے کانوں پر گویا بس ایک "جوں" سی رینگ جاتی ...... اپنے ہی گھر میں کئی بہن بھائی پیدا ہوئے اور باشعور ہونے تک میں اسی غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ واقعی بزرگوں کے کہنے کے مطابق ہر دو ڈھائی سال کے بعد ایک نئی بہن یا بھائی آسمان سے اتر آتے ہیں۔

اور اس قسم کی ہمت افزا باتیں سوچتے ہوئے گھر پہنچ کر میں نے سگریٹ سلگائی اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر اپنے پاؤں پھیلا دیئے۔ خاموشی، تنہائی اور اداسی میں حسبِ معمول ماضی کی یادیں دل و دماغ پر چھا گئیں۔

گزشتہ سال میں رخصت پر پاکستان گیا ہوا تھا اور ماں باپ رخصت ختم ہونے سے پیشتر کہیں نہ کہیں میری شادی کر دینا چاہتے تھے۔ اور میں اس دور کے عام نوجوانوں کی طرح سوچ رہا تھا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک ایسی لڑکی کو میرے ساتھ منسلک کر دیا جائے جس کا میں نے سایہ تک بھی نہیں دیکھا ....

مگر جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ بذاتِ خود "تلاش" "انتخاب" یا کوئی فلمی قسم کا رومان میرے بس کا روگ نہیں۔ میں مذہبی اور اخلاقی قدروں کی قربانی دے کر والدین کی یہ طفلانہ ضد پوری کرنے سے قاصر ہوں .....

مجھے اسی طرح شادی کرنا ہوگی جیسے میرے باپ اور اس کے باپ اور اس کے باپ نے کی تھی "روائت پرستی" انسانی فطرت ہے اور پھر اس روائت پر تو میرے ماحول کے تقدس اور اس کی تابندہ قدروں کی اساس ہے اور اگر اسے ترک کر دیا جائے تو

پھر ان گنت بدصورت غریب اور جاہل لڑکیوں کو کون سے شہزادے آکر پسند کریں گے ؟ کیا ہر لڑکی دلہن بننے کا حق نہیں رکھتی ؟ کیا ہر لڑکی کے احساسات قابلِ احترام نہیں ہیں ؟ پھر ہر اُس بدنصیب لڑکی کا کیا حشر ہو گا جو جانچنے کے بعد ٹھکرا دی جائے گی ؟.....

اور مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگی ...... میں سوچ رہا تھا شادی سے پہلے "میل جول" "دیکھ بھال" اور "پسند ناپسند" کے چکر میں کتنے حجاب اُٹھ جایا کرتے ہیں۔ کتنی جوانیوں کے ساغر چھلک جاتے ہیں، کتنی عصمتوں کے آبگینے پاش پاش ہو جاتے ہیں..... ہم اس دور کے فرانس اور اٹلی کے کس قدر قریب ہو جاتے ہیں؟ اور دوسری طرف ان مراحل سے بخیر و خوبی گزر لینے والوں کی تعداد کتنی محدود ہے ؟

آخر میں نے والدین کو اپنے خیالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ وہ کسی لڑکی کو رد کرتے وقت ایک تو یہ نہ بھولیں کہ ان کی بھی لڑکیاں ہیں جن کا انتخاب ہو گا اور دوسرے وہ لڑکی اور اُس کے خاندان کے ماحول میں صرف "عمومی خصوصیات" کے متلاشی ہوں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک متوسط سرپرست کے لئے بخیر و خوبی لڑکی کی شادی کرنا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ زیورات، ملبوسات، برتن، فرنیچر، قورمے، پلاؤ اور زردے کے لئے اُسے کیسے کیسے "جوڑ توڑ" کرنے پڑتے ہیں! ادھر لڑکے والے عموماً اپنی لڑکی کی شادی کے وقت ان تمام مراحل سے گزر چکے ہوتے ہیں لہٰذا ایک انتقامی جذبہ ان کے ذہنوں میں کار فرما ہوتا ہے۔

میں نے اس تباہ کن چکر کو روکنے کی موہوم سی کوشش کی اور اس میں ناکام رہا۔ میں جانتا ہوں کہ جتنے لوگوں نے میری بارات کا جلوس دیکھا ہو گا، اور باجے سنے ہوں گے، میری پھولوں سے سجی ہوئی کار دیکھی ہو گی، اور دونوں گھروں کے قورمے اور پلاؤ ہضم کئے ہوں گے وہ سب یہی کچھ چاہیں گے . . جس کی وجہ سے ایسی لاتعداد لڑکیاں جن کے غریب یا سفید پوش لواحقین ان "خرافات" کے متحمل نہیں ہو سکتے گھروں میں بیٹھی رہیں گی یا سیدھے راستے کے بجائے پگڈنڈیوں کے پیچ و خم میں بھٹک جائیں گی . . . . . .

میں ایک فرد کی حیثیت سے اپنے اس متعدی معاشرتی گناہ پر سخت نادم ہوں۔ حجلۂ عروسی میں داخل ہونے کے بعد میں نے اضطراب و شوق کے عالم میں کافی تذبذب کے بعد آخر بڑے غیر شاعرانہ انداز میں یعنی سیدھے سادے الفاظ میں اپنی ان دیکھی بیوی کو پہلی بار مخاطب کیا۔ لیکن صبح تک ہم ایک دوسرے سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے جیسے کئی ماہ کی COURTSHIP کے بعد ہماری شادی ہوئی ہو..... جیسے ہم نے کئی پکنکیں ENJOY کی ہوں، کئی "ROSES" اور "LILIES" ایک دوسرے کے بالوں اور کالروں میں لگائے ہوں، کئی بار ایک ساتھ SHOPPING کی ہو..... کئی PRESENTS آپس میں بدلے ہوں، کئی چاندنی راتوں میں باہوں میں باہیں ڈال کر "STROLL" کی ہو، جیسے ہم LOVE LETTERS ایک دوسرے کو لکھے ہوں اور اب ہم ذہنی اور جسمانی طور پر ہم آہنگ ہو کر اپنے معاشرے کے ایک مخصوص طبقے کی طرف سے "IDEAL COUPLE" کے خطاب کے مستحق ہوں۔

اور پھر مجھے خیال آیا [illegible]

[illegible] ....

.........میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی مجھے محسوس ہُوا کہ جیسے میں نے اپنے بچے کو گود میں اٹھا رکھا ہے اور پھر چند لمحوں کے بعد میرے تصور کی نگاہوں نے دیکھا کہ میرا جوان بیٹا دولہا بن کر میرے سامنے کھڑا ہے مگر "بہو" کا تصور پیدا ہوتے ہی میں آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے ساتھ اپنی بیٹی کو وِداع کرتا ہُوا ایک بوڑھا باپ تھا اور میرے کانوں میں بیٹی کی سہیلیوں کا پُر درد الوداعی گیت گونج رہا تھا۔

میں نے سوچا شادی اور پھر اولاد کی تمنا، پھر اُن کی جوانی اور شادیوں کی خواہش اور پھر ان کی اولاد کو پروان چڑھتا دیکھنے کی آرزو...... جیسی باتوں کے پیشِ نظر انسان اپنے آپ کو مجبور و بے بس، اور آرزوؤں کی زنجیر گراں کا پابند قرار دے دیتا ہے۔ مگر فی الحقیقت یہی زنجیریں تو اس کی عظمت کی پاسباں ہیں۔ یہی زنجیریں تو انسانی زندگی کا زیور ہیں...... ٹیلی فون پر نرس کی زبانی یہی دِل شکن جواب سنتے ہی میری نگاہوں کے سامنے ایمبولنس کا منظر آ گیا جب کہ میری بیوی شدتِ جذبات سے بار بار اپنے بالوں کو نوچ رہی تھی...... اس کے نچلے ہونٹ سے خون رسنے لگا تھا۔ اسکے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی اور وہ مجھے اپنی تکلیف کا احساس دلا رہی تھی حالانکہ دنیا کی کوئی طاقت اسے مقررہ وقت سے پیشتر اِس تکلیف سے نجات نہیں دلا سکتی تھی۔

میں اندھیری رات میں کسی ایسے قیدی کی طرح آہستہ آہستہ گھر کی طرف بڑھ رہا تھا جو دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد مایوس پریشان اور تھکن سے چور اپنی کوٹھڑی کی طرف لوٹ رہا ہو...... صحرائے عرب کی یخ بستہ شمالی ہَوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ آسمان حدِ نظر تک غبار آلود تھا اور ساری بستی پر سردیوں کے معمول کے مطابق شام ہی سے ہُو کا عالم طاری ہو چکا تھا۔ ماحول کی ویرانی کے احساس پر مجھے یاد آیا جس روز ہم نے ہوائی جہاز سے اتر کر عرب کی سرزمین پر قدم رکھا تو میری رفیقۂ حیات نے چاروں طرف حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ریگزاروں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں...... اگر یہاں دِل نہ لگے تو واپس چلی جانا"...... مگر میرا قیاس غلط تھا...... وہ تو اس وقت میری طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ایک محنتی، جفاکش، اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والا آدمی کس قدر قابلِ احترام ہوتا ہے...... اور اُس نے کہا "میں اس لاثانی نصیحت کو کیونکر فراموش کر سکتی ہوں...... جو مجھے میرے باپ نے حسبِ معمول ڈولی میں بٹھاتے وقت کی تھی"......

اور پھر جب آنے والے مہمان کی خبر طشت از بام ہوئی تو اُس رات خواب میں کئی ننھے منے بچے میرے بالوں سے کھیلتے رہے، میری گود میں مچلتے رہے، میری ناک اور مُنہ کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے مسلتے رہے...... میں بیوی سے ان کی شکایتیں کرتا رہا وہ مسکراتی رہی...... ہنستی رہی۔

صبح جب میں نے اس خواب کا ذکر کیا تو وہ اضمحلال اور نقاہت کے باوجود خوب ہنسی اور میں نے محسوس کیا کہ اِس ہنسی کے بعد وہ نو ماہ کی تکلیف جھیلنے کے لئے مستعد ہو گئی ہے۔

پھر موسم گرما شروع ہو گیا۔ لُو، ریت، آفتاب کی حدت اور سمندر کی وجہ سے حبس کے مقابلے میں برف سے لے کر تازہ سبزیوں تک

کا فقدان، اور اگر یہ چیزیں دستیاب بھی ہوتیں تو صرف محدود مقدار میں کمپنی کے سٹوروں سے سونے اور چاندی کے بھاؤ...... میں سوچتا کہ خدا نے اپنی آخری کتاب اور اپنے آخری پیغمبر کے نزول کے لئے غالباً اسی لئے اس سرزمین کو منتخب کیا ہوگا کہ یہ لوگ "آئیڈیل مسلمان" بن کر دنیا میں پھیل جانے پر مجبور ہوں...... لیکن پھر میں اس سرچشمے کی موجودہ بدحالی پر غور کرتے ہوئے یاسیت کے دھندلکوں میں کھو جاتا۔ آخر خدا خدا کر کے موسمِ سرما کے آثار نظر آنا شروع ہوئے اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہماری کیفیت اُن مسافروں کی سی تھی جو کسی لق و دق صحرا کو عبور کر کے نخلستان میں پہنچ گئے ہوں۔

گھر پہنچ کر میں بہت دیر تک آنے والے مہمان کے فراکوں، موزوں، ٹوپیوں اور سوئٹروں کی تہیں کھول کھول کر جماتا رہا جنہیں میری بیوی نے کئی ماہ سے تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں وقت گزارنے کے لئے گھر کے بکھرے ہوئے سامان کو سنوارنے لگا۔ میں نے ایک صندوق کو سیدھا کرنا چاہا کہ ایک چوہا نکل کر بھاگ گیا۔ صندوق باہر کھینچ کر دیکھا تو چوہیا کا ایک بچہ لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ میں نے صفائی کرنے والے برش سے اُسے سمیٹنا چاہا لیکن جیسے میرا ہاتھ خود بخود رک گیا۔ میں نے صندوق کو آہستہ سے اس کی جگہ پر سرکا دیا تھوڑی دیر کے بعد میری نظر گھڑی پر پڑی تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں ٹیلی فون بوتھ کی طرف لپکا۔

مگر ہر قدم پر دل کو وسوسے اور اندیشے سیاہ بادلوں کی طرح آ کر گھیر رہے تھے میرا خوف بتدریج بڑھ رہا تھا مجھے اپنی بیوی کے اعزہ و اقربا کے اُس جمِ غفیر کا خیال آیا جو اُسے ریلوے سٹیشن تک الوداع کہنے آیا تھا۔ میرے جسم میں ایک خنک رَو دوڑ گئی۔ میں نے سوچا کہ اُن لوگوں کو کس زبان سے یقین دلاؤں گا کہ میں نے وہ سب کچھ کیا جو میرے بس میں تھا...... ان ہی خیالات کی رَو میں میں نے ٹیلیفون کیا مگر وہی منحوس جواب تھا۔ گھر لوٹتے وقت مجھے خیال آیا کہ میری بیوی نے دعا مانگنے کے لئے کہا تھا۔

"میں خدا کے حضور میں اپنے آپ کو مشہور و معروف صنّاع" کریٹر کے بنائے ہوئے "توانائی، عقل اور فخر" کی متوازن خصوصیات والے "فوق الانسان" کے داعی "نطشے" کے اُس رُلا دینے والے مجسمے سے زیادہ قابلِ رحم محسوس کر رہا تھا جس مجسمے نے بر خود غلط نطشے کے بھیانک اور عبرت انگیز انجام کی تشہیر کی۔" آخر تھک کر میں لیٹ گیا۔ اور پھر مجھے خیال آیا کہ دراصل یہی تکلیف تو وہ مامتا ہے جو سلطان سبگتگین کو ہرنی کی آنکھوں میں نظر آئی...... وہی مامتا جو ماں سے کوڑھی اولاد کے لئے بھی آغوش وا کرا دیتی ہے...... پرانے زمانے میں انسان کے ناپختہ دماغ نے سب سے زیادہ "مادرِ فطرت" ہی کی پرستش کی اور میری نگاہوں کے سامنے قدیم عراق کی مقدس ملکہ "نینا" کی وہ مورتی آ گئی جس میں وہ ایک بلندی پر کھڑی اپنی چھاتیوں کو دبا کر دودھ کی دھاروں سے گویا کائنات کی پرورش کر رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا "ماں" کے لفظ میں مٹھاس، سکون، سلامتی، امن اور نیند ہے۔ اپنی ماں کے سامنے ایک ظالم و جابر خود غرض اور چالاک۔ فریبی اور دغاباز شخص بھی ایک معصوم بچے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور پھر مجھے محسوس ہوا جیسے میری "ماں" مجھے تھپک رہی ہو۔ میری پیشانی کو سہلا رہی ہو۔ مجھے ذہنی اور جسمانی آسودگی کا احساس ہونے لگا۔ اور میں سو گیا۔

صبح کا وقت شروع ہونے سے چند منٹ پیشتر میری آنکھ کھلی۔ دفتر پہنچتے ہی میں نے ٹیلیفون کیا۔ لیکن جونہی دوسری جانب گھنٹی بجی

(باقی بر صفحہ ۳۹)

حبیب کیفوی

غ

نہ سیم و زر کو نہ لعل و گہر کو جانتا ہوں
متاعِ ہر دو جہاں چشمِ تر کو جانتا ہوں

سرِ نیاز کو حاصل جہاں وقار رہا
جہاں میں ایک فقط ایک در کو جانتا ہوں

عظیم ہی سہی ان سے بھی ہے عظیم کوئی
نشاں یہ کس کے ہیں! مہر و قمر کو جانتا ہوں

ملا ہے در گہِ عالی سے اختیار ہی کیا
خدا کے سامنے عجزِ بشر کو جانتا ہوں

کہاں تک، اس کی ہے پرواز بے خبر تو نہیں
بساطِ طائرِ بے بال و پر کو جانتا ہوں

وفورِ شوق سے افشا نہ رازِ الفت ہو
کہیں ڈبو ہی نہ دے چشمِ تر کو جانتا ہوں

قبول ہو کہ نہ ہو مانگتا رہا پیہم
اگرچہ اپنی دعا کے اثر کو جانتا ہوں

کہیں بھی ہوں مری نظروں سے چھپ نہیں سکتے
ہجومِ عام میں ہو اس نظر کو جانتا ہوں

عبداللہ خاور

غ

فلک پہ جام اچھالو، چمن میں عید کرو — مگر نہ خاک نشینوں کو مستفید کرو!
تمہاری بزم کی شاید فضا نکھر جائے، — دلوں کے خون سے رنگِ حنا کشید کرو!
جو گزری طور پہ وہ شوخیٔ تمام نہ تھی — مٹا مٹا کے ہمیں، اذنِ بازدید کرو!
ہزار تم نے مہ و مہر کو اسیر کیا! — ہمیں بھی غمزۂ بے باک کا مرید کرو!
حجابِ ناز بھی محرمِ دید کر نہ سکا — مری نگاہ کے انداز کو شہید کرو!
خموش کیوں ہیں یہ دیوانے، اہلِ دار و رسن — تم اب مواخذۂ حرفِ ناشنید کرو!
ہوائے صبح سے ٹوٹا نہیں طلسمِ بہار — نوائے شوق کے آہنگ کو شدید کرو!

بہک کے شہرِ نگاراں میں آ گیا خاور
عوض فریب کے جنسِ وفا خرید کرو!



شادؔ عارفی

۶

ہر دل پہ آزمائشِ تیغِ کمر ہے آج !
پاسِ حجابِ ناز کہاں ہے، کدھر ہے آج !

عصمت ہو یا لحاظ، محلِ نظر ہے آج !
"بجری کا مال" "حُسنِ سرِ رہگذر" ہے آج !

اللہ راس لائے کچھ ایسی خبر ہے آج !
"گلشن میں بند و بست برنگِ دگر ہے آج !

تسکین پائیے۔ غالبِ آشفتہ سر کی روح
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج"!

کل تک نہ تھا کسی کو بھی احساسِ برتری،
شاید شریکِ بزم کوئی فتنہ گر ہے آج !

اب کس کو "دوش دیں" "کہ ہماری ہی بھول ہے"
جس کو تمیزِ راہ نہیں، راہبر ہے آج !

آنے لگا مزاجِ فلک اعتدال پر
ترچھی نظر ہے آج نہ برہم نظر ہے آج !

فردا سے بہتری کی توقع نہ توڑیے
اس میں تو شک نہیں کہ دعا بے اثر ہے آج !

محسوس ہو رہا ہے جبینِ نیاز کو،
دنیائے بیکسی ہمہ نمودِ سحر ہے آج !

لیکن — یہ اعتمادِ وطن کے خلاف ہے
تم جس کا اعتبار کرو — معتبر ہے آج !

مقطع میں آپڑی ہے سُخن گسترانہ بات
اے شادؔ فرضِ شعر بڑا دردِ سر ہے آج



حسین عارف

غ

کتنی بار آپ مسکرائے ہیں!
کتنے ہم نے فریب کھائے ہیں!
یہ جو دو چار اشک آئے ہیں!
کتنے طوفاں سمیٹ لائے ہیں!
ہم نے پُر پیچ رہ گزارِ دل پر!
تیرگی میں دیئے جلائے ہیں!
منزلوں نے لئے انہیں کے قدم
چوٹیں کھا کر جو مسکرائے ہیں!
بڑھ گیا ذوقِ آبلہ پائی ——؟
ایسے بھی رہ گزار آئے ہیں!
آپ ہی باغ باغ ہوں گے نہ کیوں!
آپ ہی نے یہ گل کھلائے ہیں!
فاصلے اور بڑھ گئے جیسے!
جب وہ میرے قریب آئے ہیں
مژدہ اے کشتگانِ جور کہ ہم
زندگی کا پیام لائے ہیں!
عارف انعامِ دوستی ہے یہی!
پھول برسا کے خار پائے ہیں،

شاکر تسلیم

غ

اب کوئی چال بھی نظمِ عالم چلے
ہم وہ صبحیں نہیں جن کا سورج ڈھلے
دور تک ہے فضاؤں میں جھنکار سی
پابہ زنجیر گزرے ہیں کچھ قافلے
اتنے ہی دل مرے ہمنوا بن گئے
جتنی شدت سے طوق و سلاسل ڈھلے
صرف عزمِ سفر شرط ہے ہمنشیں
مشکلیں بخش دیتی ہیں خود حوصلے
منتظر ہیں ابھی تو کئی منزلیں
بیٹھ کر کیا گنیں پاؤں کے آبلے
تم نے شاید ابھی ہم کو سمجھا نہ ہو
ہم نہ اتنے برے ہیں نہ اتنے بھلے
شمعِ ہستی کا شاکر بھروسہ نہیں
جلتے جلتے بجھے اب بجھتے بجھتے جلے!

سید نظر زیدی

کفن چور

چودھری صاحب نے اپنے کارندے کو گھور کر یوں گھورا جیسے کوئی سخت مزاج استاد اپنے غبی شاگرد کی کسی بہت بڑی نالائقی پر ناراض ہوتا ہے۔ اور کچھ دیر تک اسی طرح گھورتے رہنے کے بعد بولے "بندۂ خدا تم یہ معمولی سا کام نہیں کر سکے تو اتنا بڑا کارخانہ کس طرح سنبھالو گے؟ کہیں اپنے نام کے ساتھ یہ خاں صاحب کا لفظ محض تخلص کے طور پر تو شامل نہیں کر رکھا؟"

"جی کام تو وقعی معمولی تھا لیکن میں نے عرض کیا نا ——؟"

"کیا عرض کیا حضرت آپ نے! میں نے آپ کو اپنی ایک ڈوبی ہوئی رقم وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا طول اور عرض ناپنے کے لئے نہیں بھیجا تھا اگر آپ ایک اچھے کارکن ہوتے تو یہ یوسف زلیخا سنانے کے بجائے رقم پیش کرتے یا یہ اچھی خبر سناتے کہ اس خبیث نادہندہ کا سامان نکال کر سڑک پر پھینک آئے ہیں۔ غضب خدا کا لوگوں کی آنکھوں میں ذرا لحاظ نہیں رہا ہمارا یہی احسان اس کی آنکھیں نیچی رکھنے کے لئے کافی تھا کہ اس مہنگائی کے زمانے میں بھی اس سے پچاس سال پہلے کا کرایہ لے رہے ہیں۔ آپ ہی بتایئے ڈھائی روپے بھی کوئی کرایہ ہے۔ اگر وہ آج ہی یہ کوٹھڑی خالی کر دے تو پندرہ بیس آسانی سے مل سکتے ہیں"

"جی ہاں جی ہاں آپ کا یہ احسان تو واقعی ایسا ہے۔ کہ اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے اور سچ پوچھیئے تو وہ غریب اس کے لئے شکر گزار بھی ہے"

"خاک شکر گزار ہے یاد نہیں اس دن کس بےحیائی سے کہہ رہی تھی چودھری جی اب بھی ڈیڑھ روپیہ ہر مہینے زیادہ دے رہی ہوں رسید تو آپ ایک روپے کی دیتے ہیں۔ کیا اس کا نام شکر گزاری ہے؟"

"جی ہاں یہ تو واقعی اس کی زیادتی ہے۔ لیکن بات یہ ہے قبلہ کہ ——؟"

"کیا بات ہے قبلہ —" چودھری صاحب کے لہجے میں طنز کا غصہ اور گہرا ہو گیا اور ان کی نگاہوں میں ایسا تیکھا پن آ گیا ایسا کہ نرعمر کارندے کو ان کی کڑی نظریں اپنے سینے میں اترتی ہوئی محسوس ہوئیں وہ مضبوط دل کا نوجوان تھا۔ لیکن مسلسل طنز پہ فقروں اور ان زہر میں بجھی ہوئی نظروں سے اسے ہلکا سا چکر آ گیا اس نے سوچا چھوڑو کس جھنجھٹ میں پڑے ہو۔ دوسروں کی وکالت کرتے کرتے کہیں اپنی روزی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھنا۔ کن کن مصیبتوں کے بعد تو گھر بندے چار پیسوں کی صورت دیکھنی نصیب ہوئی ہے۔ لیکن فوراً ہی اس کی نظروں کے سامنے اس مظلوم بڑھیا کی تصویر پھر گئی جو چودھری اکرم خاں رئیس و میونسپل کمشنر کی حسین و جمیل بلڈنگ کی نچلی منزل میں نیم تاریک سی کوٹھڑی میں موت اور زندگی کی کش مکش میں مبتلا تھی اور اس کے دل میں انسانی ہمدردی کا وہ جذبہ پھر

بیدار ہو گیا جسے وہ اپنی سب سے قیمتی متاع خیال کرتا تھا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ سر اوپر اٹھا کر کے اپنے سخت گیر آقا کی طرف دیکھا اور پرسکون لہجے میں بولا "بات یہ ہے قبلہ۔ کہ وہ غریب ان دنوں سخت آزمائش سے گزر رہی ہے۔ جب تک تندرست رہی اوتے پوتے گزارہ کرتی رہی اب تو ایک وقت کی روٹی کو بھی محتاج ہے۔"

" کیوں کیا ہوا اسے ؟"

" اوہو شاید آپ کے علم میں نہیں وہ غریب تو گزشتہ دو مہینے سے بیمار ہے اسی لئے تو کرایہ ادا نہ کر سکی ہے" کارندے کو امید بندھی۔ کہ شاید بڑھیا کی مصیبت کا حال سن کر اس پتھر میں بھی جونک لگ جائے۔ اپنے لہجے کو موثر بنا کر وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ چودھری صاحب نے پہلے سے زیادہ کراری آواز میں اس کی بات کاٹی۔ " اسی لئے تو میں کہے جا رہا ہوں۔ کہ آپ اس منصب کے کسی طرح اہل نہیں خوشامد کی دو باتیں سنیں اور جھٹ موم کی طرح پگھل گئے۔ آپ اس طبقے کی نفسیات سے واقف نہیں حضرت۔ ان کا حال تو ہم سے پوچھیے۔ اپنی میلی بدبودار گودڑیوں میں ہزاروں روپے دبائے پڑے ہوں گے لیکن ہونٹوں پر وہی فریاد ہو گی۔ مر گئے۔ مٹ گئے۔ تباہ ہو گئے۔ کھانے کو نہیں۔ پہننے کو نہیں، آپ کا کیا خیال ہے یہی بڑھیا خالی ہو گی، کوٹھڑی کی تلاشی لینے سے اگر ہزار دو ہزار روپے نہ نکلے تو ہمارا ذمہ !"

" نہیں نہیں قبلہ! آخر انسانوں کو پرکھنے کا کچھ ملکہ آپ کے اس خادم کو بھی ہے۔ وہ تو ایسی خوددار معلوم ہوتی ہے۔ کہ اگر ایک پیسہ بھی پاس ہوتا تو اپنے اوپر خرچ کرنے کی بجائے کرائے میں ادا کرتی ۔"

" بہرحال میں آپ کو ان منحوسوں کی وکالت کرنے کی تنخواہ نہیں دیتا۔ مختصر لفظوں میں یہ بتائیے آپ نے اپنے فرائض سے غفلت کیوں برتی۔ اگر اس نے کرایہ ادا نہیں کیا تھا تو آپ نے اس کا سامان باہر سڑک پر کیوں نہیں پھینک دیا ؟"

" جی میں نے تو یہی خیال کیا تھا۔ کہ ان دنوں مصیبت میں مبتلا ہے اور کسی لمبی چوڑی رقم کا معاملہ بھی نہیں۔ کل پانچ روپے کی تو بات ہے۔"

" آپ کے نزدیک پانچ روپے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتے۔ بہت اچھا اس مہینے یہ پانچ روپے آپ کی تنخواہ سے وضع کر لئے جائیں گے غریبوں سے ہمدردی کا کچھ عملی طور پر بھی تو مزہ چکھنا چاہیئے۔ بس اب آپ جائیے اور ہاں یہ بات نوٹ کر لیجئے اگر اپنے رویئے میں تبدیلی پیدا نہ کر سکے تو آئندہ ماہ آپ کو رخصت کر دیا جائے گا۔ ہم نے کوئی یتیم خانہ نہیں کھول رکھا۔ کہ اس کے لئے چندہ وصول کرنے کے لئے آپ ایسے آدمی کی ضرورت ہو۔ یہاں تو ایسے ہوشیار انسان کی ضرورت ہے جو نادہند بدمعاشوں کے حلق میں انگلیاں ڈال کر اپنا روپیہ نکال سکے۔" بات ختم کر کے چوہدری صاحب نے کارندے کی طرف سے رخ پھیر لیا اور ایک موٹا سا رجسٹر اٹھا کر آمد خرچ کا موازنہ کرنے لگے۔

نوجوان کارندے کے ذہن پہ ایک بار پھر ہلکی سی دہشت طاری ہو گئی۔ چودھری صاحب کی کرایہ دار نیم مردہ بڑھیا کے وجود کو پھلانگتا ہوا اس کا خیال ایک بار پھر اپنے خاندان کے درجن بھر افراد تک جا پہنچا اور بے روزگار ہونے کی صورت میں اسے ان سب کے چہروں پر اس بڑھیا کی سی بیکسی نظر آنے لگی۔ اپنے موجودہ منصب پر جمے رہنے کی صورت میں وقت نے اس کے سامنے جو آزمائش پیش کر دی تھی وہ اس کی قوت برداشت سے زیادہ تھی۔ وہ گھبرا کر پھر اپنی حقیقی دنیا میں واپس آ گیا اس دنیا میں جہاں چوڑے چکلے چہرے والے چودھری صاحب اس کی پوری شخصیت پر چھا جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس دنیا میں جہاں اس سے مطالبہ کیا جا رہا تھا تمہیں اس انداز سے سوچنا چاہیئے جس طرح ہم چاہیں اور اسی

طرح عمل کرنا چاہیے جیسے ہدایات دی جائیں۔

یہ خیالات کا ایک ایسا موڑ تھا جہاں پہنچ کر اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج سی ہو گئی۔ ایک طرف کرایہ دار بڑھیا کی طرح کے ہزاروں لاکھوں مجبور بے کس لوگ تھے جن کی حالت سدھارنے کے لئے اس کے دل میں شروع ہی سے ہزاروں ولولے تھے اور دوسری طرف اس کے اپنے دل کے ٹکڑے اور جسم کے حصے تھے جن کی طرف آہستہ آہستہ وہی نکبت اور نحوست رینگ رہی تھی جس نے دوسرے لوگوں کو اس کی نظروں میں اعانت کے قابل بنا دیا۔ وہ زندگی کے اس پہلو پر زیادہ دیر غور نہ کر سکا۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک پُردرد آہ نکل گئی۔ جیسے زخمی پرندہ آخری بار چیختا ہے اور وہ سر جھکا کر انسانی زندگی کی اس المناکی پر غور کرنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری ٹریجڈی کیوں منظم کی ہے۔ اگر اس چھوٹی سی زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو اس نے پیدا کیا ہے اور وہ ان سب سے ایک ہی جیسا پیار بھی کرتا ہے تو پھر ان کی حالت میں اتنا گہرا فرق کیوں ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ چودھری صاحب کی طرح سنگ دل اور بہت سے کرایہ دار بڑھیا کی طرح مظلوم کیوں ہیں!!

"آپ ابھی تک گئے نہیں؟" چودھری صاحب نے رجسٹر سے نگاہیں اٹھا کر اسے غصے بھری نظروں سے گھورا اور اس بات کے جواب میں کچھ کہنے کی جگہ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کا یہ فعل بالکل غیر ارادی تھا اور وہ یوں کھویا کھویا اور مضمحل نظر آ رہا تھا جیسے گہرے نشے کی حالت میں ہو جیسے کسی تاریک غار سے نکل کر اس کی طبیعت کسی قدر سنبھلی اور اس نے اکڑے پہلوان زمین پر قدم جماتے ہوئے پیچھے پھر کر اس آراستہ پیراستہ کمرے کی طرف دیکھا جس کی تمام وسعتیں اور آسائش صرف ایک وجود کے لئے وقف تھیں۔ ایک ایسے انسان کے لئے جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں بے کار پڑے رہنے اور اپنے ہم جنسوں کو ڈانٹتے ڈپٹتے رہنے کے سوا کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اس نے کڑی نظروں سے نیم وا دروازے کو گھورا۔ بجلی کے پنکھے کی تیز ہوا سے دروازے کا ریشمی پردہ آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا جیسے شفاف چمکیلے پانی کی کوئی موج کنارے کی طرف بڑھ رہی ہو۔ غصے کی وجہ سے اس کے دل میں چنگاریاں سی اٹھنے لگیں۔ اس کا دل چاہا پلٹ کر ان رنگین ریشمی پردوں کو نوچ کر پھینک دے اس بے سلوے کپڑے کی ایک ایک چیز کو توڑ پھوڑ ڈالے اور اپنے اس سخت گیر آقا کے بھاری بھر کم وجود کو چکنا چور کر دے۔ لیکن اس کے یہ خیالات رنگین ریشمی پردے کی ہلکی سی جنبش سے زیادہ دیرپا نہ تھے۔ اسے بہت جلد یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑی کہ وہ دل ہی دل میں گھٹنے اور پریشان ہونے کے سوا اس بارے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بے بسی کے اس احساس نے اس کے ذہن کو اس اَن دیکھی صاحبِ اقتدار ہستی کی طرف رجوع کر دیا جس کا سہارا لینے پر جابر سے جابر انسان بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ اچھا دنیا کی چند روزہ زندگی میں یہ فرعون من مانی کر لیں قیامت کے دن پتہ چل جائے گا ان سب کو دوزخ کے دہکتے ہوئے ہوں گے اور ان کے نرم و نازک جسم۔ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے ایک ایک ظلم کا بدلا لے گا۔ انہیں ان کی ایک ایک برائی کی سزا دی جائے گی۔

اسی قسم کی باتیں سوچتا ہوا وہ غیر ارادی طور پر اسی بلڈنگ کے سامنے جا پہنچا جس کی ایک تاریک سی کوٹھڑی میں وہ بڑھیا رہتی تھی جس کے باعث یہ سارا ہنگامہ ہوا تھا۔ چودھری صاحب کی تاکید کے باوجود اس کے ذہن میں یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا انجام خواہ کچھ ہو۔ نوکری رہے یا جائے۔ میں اس مظلوم عورت کو پریشان نہ کروں گا۔ مذہب کے رچے بسے تصورات نے اس کے دل میں گداز پیدا کر دیا تھا اور یہ اسی کیفیت تھی جس کے پردے میں وہ اپنی اس کم ہمتی کو آسانی سے چھپا سکتا تھا جس کا مظاہرہ چودھری صاحب کے مقابلے میں ہوا تھا۔ لیکن جب وہ یہاں پہنچ ہی گیا تو سوچا چلو بڑھیا کی طرف ہوتے ہی چلیں۔

چھوٹی سی متعفن کوٹھڑی کا تنگ دروازہ ہمیشہ کی طرح تسلیم و رضا کی حالت میں تھا۔ کناروں سے محروم مٹی کا خلیفہ گھڑا و ذہین کا چھوٹا سا صندوقچہ بھی اسی حالت میں تھے۔ میلے کپڑوں کی چھوٹی سی پوٹلیا بھی اسی انداز سے دھوپ میں رکھی ہوئی دیوار کا حسن دوبالا کر رہی تھی لیکن آج خود بڑھیا پہلی حالت پر قائم نہ تھی نہ اس کی آہٹ پاکر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ نہ دعا کے لئے ہونٹ ہلائے نہ بے بسی ظاہر کرنے کے لئے ہاتھوں کو خاص انداز سے حرکت دی۔ خودداری اور توکل کے گہرے شعور کے باعث ہمیشہ بلند رہنے والا اس کا سر جھک کر چھاتی پر ڈھلک گیا تھا۔ گھٹنے ٹوٹی ہوئی کمان کی طرح اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ متورم ہاتھوں کی مٹھیاں کچھ اس انداز سے بھنچی ہوئی تھیں جیسے کوئی خوفناک منظر دیکھ کر ڈر گئی ہو۔ اس کی ان آنکھوں میں جن سے ہمدردی اور محبت کے چشمے اُبلتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے خوف بھی تھا اور فریاد بھی جیسے پوچھ رہی ہو۔ کیوں کیا تم پھر کرایہ مانگنے آگئے! اور کیا میری یہ حالت دیکھ کر بھی تمہیں رحم نہ آئے گا!

حساس نوجوان کے ہونٹوں سے ایک دبی سی آہ نکل گئی۔ "اُف معبود یہ کیا! اس مظلوم کا یہ انجام تو ہرگز نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس سزا کا مستوجب تو وہ سنگدل مجرانٹ ہے جس کے مجرب دماغ میں لوگوں کو تکلیف دینے کے سوا کبھی کوئی بات آتی ہی نہیں۔ آخر یہ بے ضرر بڑھیا تیری کائنات کے کونسے گوشے کو دھندلا کر رہی تھی۔ اس غریب کا تو پیشہ ہی یہ تھا کہ لوگوں کی جان مال کو دعائیں دیتی رہے"!

جذبات کا یہ ابال بے حد شدید تھا۔ جیسے زمین کا سینہ چیر کر موٹی دھار کا کوئی چشمہ اُبل پڑے۔ آج کے اس مشاہدے نے اس کے ان تمام تصورات کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں جو بچپن سے اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ جو اس کے خون میں شاید سُرخ ذروں سے بھی زیادہ گھلے ملے تھے۔ اس نے نڈھال سا ہو کر ایک طویل آہ کھینچی اور یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا کہ اب اس مظلوم کو آخری منزل تک پہنچانے کے لئے کیا تدبیر کی جا سکتی ہے۔

درختوں کے سائے طویل ہوتے ہوتے رات کی سیاہ چادر میں تحلیل ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اب ان چراغوں کی روشنی بھی نظر نہ آتی تھی جو محبت کرنے والے عزیزوں نے بعض قبروں کے سرھانے روشن کر دیئے تھے۔ اس غمناک بھیانک ماحول میں بس ایک چودھری صاحب کی قبر جگمگا رہی تھی کیونکہ ان کے عزیزوں نے کڑوے تیل کے دیئے روشن کرنے کی جگہ ان کی آخری آرامگاہ کے سرہانے گیس کا چھوٹا لیمپ رکھ دیا تھا۔ امارت کے اظہار کا اگر کوئی اور ذریعہ ہو سکتا تو یقیناً وہ بھی اختیار کیا جاتا لیکن یہ تو مقام ہی ایسا تھا۔ کہ امیر غریب سب کو پہلو بہ پہلو دراز ہونا پڑتا ہے۔ چودھری اکرم خاں رئیس اعظم و میونسپل کمشنر کو دوسرے مُردوں سے ممتاز کرنے کیلئے ان کے سعادت مند بیٹے اور محبت کرنے والے عزیز یہی کچھ کر سکتے تھے اور انہوں نے اس سے تغافل نہ کیا تھا۔

اس سلسلے میں دوسرا اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ محلے کی مسجد کے مولوی صاحب اور ان کے نوجوان کارندے کو ساری رات قبر کے سرھانے بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کرنے پر مقرر کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کا تو خیر پیشہ ہی یہ تھا لیکن کارندے کی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور نماز روزے کی پابندی اس تکلیف کا باعث بنی تھی۔ اس چھوٹی سی گھریلو سٹیٹ کی گدی پر بیٹھنے والے نئے حکمران نے تقریباً التجا کے انداز میں درخواست کی تھی لہٰذا اسے بادل ناخواستہ یہ درخواست ماننی پڑی تھی۔

اسے قرآن معاملات کا کچھ تجربہ ہی نہ تھا لیکن اس کے ساتھی مولوی صاحب اس نکتے سے بخوبی آشنا تھے۔ کہ رات کے پچھلے قرآن شریف کی تلاوت کرنے سے مردے کو زیادہ ثواب ملتا ہے اور ان کی تجویز پر وہ دونوں عشاء کی نماز کے بعد فوراً گھر سے جی کے لئے قبرستان کی مسجد میں دراز ہو گئے تھے۔ اس وقت مولوی جی خوب گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے اور کار ندے چند روز کے ان واقعات سے الجھا ہوا تھا جو اس کی پوری شخصیت ہی کو نابود کئے دے رہے تھے۔

یہ واقعی قدرت کا انتقام تھا یا محض حادثہ کہ اس سنگدل بوڑھے رئیس کو بھی عین اسی دن موت کا تلخ جام نوش کرنا پڑا تھا جس دن مظلوم بے یار و مددگار بڑھیا دنیا سے سدھاری تھی۔ اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہوئی تھی، کہ اس کی قبر بھی قبرستان کے پہلو میں تھی اور ان دونوں باتوں سے نوجوان کارندے کو کچھ سکون ملا تھا۔ اسے عقائد کا وہ مقدس حصار پھر روشن روشن نظر آنے لگا تھا جس اندر اس نے بچپن سے آج تک نہایت پُرسکون زندگی گزاری تھی۔ لوگوں کا خیال اس بارے میں خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو لیکن وہ چودھری صاحب کی اچانک موت کو قدرت کا انتقام ہی سمجھ رہا تھا اور ایک بے یار و مددگار بڑھیا اور شہر کے ایک بڑے رئیس کی قبریں پاس کھودنے میں چاہے گورکنوں کی سہولت ہی کار فرما ہوئی ہو لیکن وہ اسے بھی قدرت کی ایک طنز سمجھ کر مطمئن تھا۔

البتہ جب اس نے مکہ شریف کی مبارک چادر کے نیچے چودھری صاحب کا جگمگاتا ہوا ریشمی کفن اور پھولوں کا انبار دیکھا تھا جب اسے مولوی صاحب کے ساتھ ان کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر ساری رات قرآن شریف پڑھنے پر مقرر کیا گیا تھا تو اس کی اس خوش فہمی کو پھر دھچکا سا پہنچا تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اس ظالم انسان کو آخر موت نے بھی کونسا نقصان پہنچایا قبرستان کی فضا میں بھی اس کی امتیازی شان باقی ہے، ایک طرف بڑھیا کی نیچی سی قبر "نے چراغ نے گلے" کا منظر پیش کر رہی تھی اور دوسری طرف چودھری صاحب کی قبر کسی ولی اللہ کا مقدس مزار نظر آ رہی تھی۔

قبرستان کی مسجد کے ٹھنڈے فرش پر لیٹے ہوئے اس وقت اس کا ذہن انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ اور ایسا اندازہ ہوتا تھا زندگی ان سے چھٹکارہ نصیب نہ ہوگا کہ اچانک گیس کی روشنی غائب ہو گئی۔

انتہائی نفرت کے انداز میں ہنکارہ بھر کر لیمپ دوبارہ روشن کرنے کے خیال سے وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو اور لیمپ کے اس کے ذہن میں اس کے سوا کوئی خیال نہ تھا۔ کہ یہ ایک معمولی بات ہے۔ لیمپ بجھ ہی جایا کرتے ہیں لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ ننگ دھڑنگ انسان آہستہ آہستہ قبر کی طرف رینگ رہے ہیں تو اس کے قدم غیر ارادی طور پر رک گئے۔ اس کے دل میں خطرے کا ہلکا احساس بھی پیدا ہوا اور یہ جاننے کی خواہش بھی، کہ دیکھیں یہ لوگ کیا کرتے ہیں اب اس کے لئے یہ کوئی راز کی بات نہ تھی کہ لیمپ بوجھ کر گل کیا گیا ہے، وہ دبے دبے پاؤں رکھتا ہوا ایک درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

ننگ دھڑنگ انسانوں میں سے ایک نے سوال کیا "یار اس مولوی اور منشی کے بارے میں بھی اطمینان کر لیا ہے اگر خدا نخواستہ پکڑے گئے تو سب کو پھانسی پر لٹکوا دیا جائے گا"

"لے کر لیا ہے اطمینان، کیا ہم ان کرائے کے لوگوں کو جانتے نہیں۔ ان دونوں نے بھی آج خوب پیٹ بھر کر حلوہ اڑایا ہوگا:

کھا کر جیسی گہری نیند آتی ہے تم سب جانتے ہو۔ ہاں میت کا کوئی رشتے دار ہوتا تو فکر کی بات تھی اب تو تم جلدی جلدی اپنا کام کرو۔"
اس کے بعد ان لوگوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ کدالیں سنبھال کر جلدی جلدی چودھری صاحب کی قبر اُدھیڑ ڈالی۔ پھر نہایت بے دردی سے ان کی لاش کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور خوشبو میں بسا ہوا ان کا آخری پیرہن نوچ کر لاش کو پھر قبر میں دھکیل دیا۔
جب یہ لوگ دوبارہ قبر کو ٹھیک ٹھاک کر چکے تو ان کے ساتھیوں میں سے ایک نے بڑھیا کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بھئی ہاتھوں اس کا کام بھی کر ڈالو یارو؟"
"مجھو یار معلوم ہوتا ہے تیرا ایمان تو بالکل ہی خراب ہو گیا۔ دفن کرتے وقت آنکھیں پھوٹ گئی تھیں کل پانچ روپے کا تو سارا کپڑا بھی نہیں ہو گا۔ کیا ہم پانچ روپے کے لئے اپنا ایمان خراب کر لیں؟" کفن چوروں میں سے ایک نے نفرت بھری آواز میں کہا اور وہ سب مالِ غنیمت سمیٹ کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔
ان لوگوں کا یہ مختصر سا مکالمہ سن کر اور چودھری صاحب کی اس درگت کا خیال کر کے کانسے کے ذہن میں بجلی سی کوند گئی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ بے یقینی کی وہ تاریکی اب کبھی نہ ابھر سکے گی جس نے اس کے ایمان کی شمع پر حملہ کیا تھا اس نے عقیدت کے جذبات میں ڈوب کر آسمان کی طرف دیکھا اور بے اختیار مسکرا اٹھا۔
جب وہ مسجد کی طرف لوٹ رہا تھا تو اس نے انتہائی بے دلی اور حقارت کے انداز میں چودھری صاحب کی قبر کی طرف دیکھا۔ وہ روشن نقطے آہستہ آہستہ قبر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ بجّو کی ڈراؤنی آنکھوں کی روشنی تھی۔ نوجوان کانسے کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی اور وہ روشنی اور چمک اٹھی جس سے اس کا ذہن جگمگا رہا تھا۔

بقیہ۔ اپنی باتیں

میری سانس خود بخود رک گئی۔ ذہن استفسار کے بعد "ذرا ایک منٹ" کہہ کر چلی گئی تھی۔ اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سارے جسم کا خون دماغ میں آ کر جمع ہو گیا ہو۔ اور اب تھوڑی دیر میں میری آنکھوں، کان، ناک اور کنپٹیوں سے خون کے دھارے اُبل پڑیں گے شاید پھانسی کے تختے پر بھی کسی کی بعینہٖ یہی حالت ہوتی ہو گی۔
لیکن اس دفعہ جب میں نے ٹیلی فون کا ریسیور واپس رکھا تو گویا ہماری ازدواجی زندگی کی "تثلیث" مکمل ہو چکی تھی۔
میرے دفتر کے تمام ساتھی مجھے بیٹے کی پیدائش پر مبارکباد دے رہے تھے ۔۔۔۔۔

یارانِ حلقہ

انور صدیقی ــــ

برادرِ گرامی قدر ــــ اِدھر میں حد درجہ پریشان رہا۔ اس وجہ سے آپ کے خط کا جواب نہ لکھ سکا۔ اور یوں بھی اس صنعتی دور میں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ‌ ‌ ‌ ‌ ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

والا معاملہ ہوتا ہے۔ زندگی جب زیادہ بھیانک ہو جاتی ہے تو فن کی روح تو بن سکتی ہے مگر فن کار کے لئے پیامِ موت ہوتی ہے۔ میری پریشانیوں میں زندگی کے تلخ حقائق کارفرما تھے۔ ان حقائق نے مجھے اِدھر ادب سے بیگانہ سا کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مجھے ان الجھنوں سے رستگاری مل چکی ہے۔ آپ کا خط میرے لئے بہت اہم ثابت ہوا ــــ آپ نے میرے بعض مصرعوں پر جو رائے زنی کی ہے اس سے مجھے جزوی طور پر اتفاق تو ہے ہی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش تو ادب کی ابدی روایت رہی ہے۔ بلند سے بلند ادبی تخلیق میں 'اور کیا ہونا چاہیے' والی بات ہر شخص کہہ سکتا ہے۔ ہمارے اردو نقاد خصوصاً نیاز فتح پوری قسم کے نقاد اسی طرح کی ادبی عینیت پسندی '(IDEALISM) میں گرفتار رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی تنقید زیادہ وجدانی اور ذوقی رہی ہے ــــ نقاد کے لئے "کیوں اور کیسے" کا بھی جواب دینا ضروری ہوتا ہے۔ آپ کی تنقید کی اس خامی کے باوجود مجھے آپ کی بیشتر آرا سے اتفاق ہے۔ آپ نے اپنے خط میں مجھے نئے تجربوں کی طرف اکسایا ہے۔ تجربوں کے سلسلے میں میرا اپنا ایک نقطۂ نظر ہے (خصوصاً غزل کے میدان میں) ادب کو میں آوازِ بازگشت کے سلسلوں (SERIES OF ECHOE[1]) کا نام دیتا ہوں۔ ادب میں خواہ مخواہ نئی بولیوں کا اضافہ میری نگاہ میں اپنے اندر روایت کے احترام کے بجائے روایت پسندی کے جراثیم رکھتا ہے۔ میں ادب میں انہیں تجربوں کا قائل ہوں جو اپنے اندر ادب کی برگزیدہ روایات[2] کا شعور رکھتے ہوں۔ بہرحال میں غزل میں معنوی تجربوں کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں اور اب آپ کو میری غزلوں میں کچھ اشعار ایسے ضرور مل جایا کریں گے جنہیں آپ نیا کہہ سکیں گے۔

ــــ "چراغِ راہ" کے نئے شمارے میں میں نے محترمی شبنم سبحانی کا خط پڑھا۔ انہوں نے جمود کے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اِدھر مہینوں سے ہمارے یہاں بھی اس مسئلے نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ سب سے پہلے آپ نے بڑی جرأت سے کام لے کر موجودہ صورتِ حال

---

[1] آپ کی یہ بات مجھے بہت ہی پسند آئی۔ گویا کسی جھیل میں میرے سامنے یکے بعد دیگرے لہریں اٹھ رہی ہیں۔ ادبی تخلیقات کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن میرا مدعا یہ ہے کہ غزل کے میدان میں خصوصیت سے معانی، اسالیب اور الفاظ و اصطلاحات تک کی تکرار اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ آدمی سوچ سمجھ کر ہی کسی غزل کو پڑھنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اس تھکا دینے والی یکسانی کے طلسم کو توڑے بغیر آپ مشکل ہی سے دوں کی دنیا فتح کر سکتے ہیں۔

[2] روایت کو تو اتنی محکم نہیں جتنا دیکھا جا سکتا ہے بلکہ اجتہاد تو ہوتا ہی مستقل روایات کے تحفظ کے ساتھ ہے، ورنہ نری ترقی پسندی ہو گی۔

کو جمود سے تعبیر کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں لوگ سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کرنے لگے ہیں ورنہ ہمارے یہاں خوش فہمیاں بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہیں تا ادب کا خام شعور رکھنے والے معمولی ادبی تخلیقات کو شاہکار کا درجہ دے دیتے ہیں ــــ حالانکہ ان تخلیقات کو ادب کے عمومی پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو ان کی قدر و قیمت صفر ہی ٹھہرے گی ـــ ادب ہمیشہ اضافوں یعنی (CONTRIBUTIONS) کو اہمیت دیتا رہا ہے۔ میرے خیال میں اسلام پسند ادبا و شعرا نے ادب کے فن اور فکر میں کوئی حیرت انگیز اضافہ نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے ان میں سے کسی کو کوئی مسلم الثبوت درجہ دیا جا سکے۔ میری یہ بات بہت ساری خوش فہمیوں کے خوابوں کو ضرور بکھیر رہی ہے مگر پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے ــ بہت ہی تلخ حقیقت جس سے چشم پوشی کرنا ایک آبادی نما تباہی کو دعوت دینا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی ہمارے ادب کے اندر (MASS APPEAL) کی بھی بہت کمی ہے ہندوستان کے سلسلے میں کم از کم میں نے یہی محسوس کیا ہے ہمارے شعرا اور افسانہ نگار صرف چند فارمولوں ـــ۔۔۔ یا چند نعروں کے سہارے چل رہے ہیں۔ زندگی اور سماج کے مسائل کے اندر ڈوب کر اور پھر ان مسائل پر اسلام کے (APPROACH) کی فنکارانہ وضاحت سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں رہ گیا ہے۔ جمود سے مراد یہ نہیں ہے کہ لوگ کچھ لکھ پڑھ نہیں رہے۔ بلکہ جمود سے مطلب یہ ہے کہ اچھا انسانیت نواز اور پائدار ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں کا جمود ایک طرح "سکونِ خرام نما" والی کیفیت رکھتا ہے نئے لکھنے والے ضرور رہے ہیں مگر ان کی تخلیقات میں آپ کو ایسی چیزیں مشکل ہی سے ملیں گی جنہیں کلاسیکل کہا جا سکے شبنم سبحانی صرف چند لوگوں کو قلم چلاتا ہوا دیکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں یہ طرزِ فکر تعمیری ادب کے حق میں شاید ہی مفید ثابت ہو سکے۔ بلند اور پائیدار ادب جو اپنی جگہ ایک اضافہ ہو کی تخلیق کی اہمیت پر زور دینا بہت ضروری ہے۔ ہماری صف میں تخلیقی قوت ـــ ایک غیر معمولی تخلیقی قوت ـــ رکھنے والے اصحاب کی کمی ہے۔ ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کیجئے جن کے اندر فطانت کی درخشندگی موجود ہو۔ میرے خیال میں صرف یہی ایک طریقہ ہے جو عظیم ادب کی تخلیق میں آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔ تنظیمی کوششیں تو ثانوی درجہ رکھتی ہیں شعلۂ تخلیق کو ہوا دینے کے لئے ایک اچھی فضا درکار ہے۔

۲

سید محسن ہاشمی ـــ

السلام علیکم۔ آپ سے ذاتی یا تحریری تعارف نہ ہونے کے باوجود میں آپ کے مفید کام اور آپ کی نگارشات کا مداح ہوں اور اُن سے متاثر بھی۔ اور اسی تعلق کی بنا پر یہ چند سطور لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ "چراغ راہ" عرصہ سے زیر مطالعہ ہے۔ اور اس سلسلے میں میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ اس کے مندرجات میں افادیت تو بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے لیکن ادبی لحاظ سے بعض مضامین نظم و نثر بلند پایہ[1] نہیں ہوتے۔ میری رائے میں کوئی مضائقہ نہ ہو گا اگر آپ ایسے نامور ادیبوں اور فنکاروں کی تخلیقات کو بھی "چراغ راہ" میں جگہ دیں۔ جو حلقہ تعمیر پسند ادب کے ارکان تو نہ ہوں لیکن اُن کی تخلیقات آپ کے عظیم مقصد کی نفی بھی نہ کرتی ہوں[2]۔ اس طرح جہاں جریدے کی ادبی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گا وہاں یہ طریقہ غالباً حلقے

---

[1] ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمیں دو چیزوں کا اہتمام کرنا ہوتا ہے، ایک مقصدیت کا، دوسرے فن کا۔ اس وقت ان دونوں میں سے ہم اول الذکر کو اہم تر سمجھتے ہیں اور فن کو اس کا خادم قرار دے کر سوچتے ہیں۔ مقصدیت کے لحاظ سے فن کے دائرے میں چونکہ ہم بالکل ایک نو خیز طاقت ہیں اور ابھی اپنے آپ کو نشو و نما دے رہے ہیں اور بالکل نئے لکھنے والوں کو ساتھ لے کر نئے تجربات کر رہے ہیں اس لئے کہیں کہیں قائم شدہ فنی معیار سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ دور ہر نو خیز طاقت پر آتا ہے اور اس کی وجہ سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

[2] اس معاملے میں ادارۂ "چراغ راہ" نے کبھی کوئی تعصب نہیں برتا۔ اچھی چیز کہیں سے آئے، ہم نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ لکھنے والا کون ہے۔ البتہ دوسرے حلقوں کے اکثر لکھنے والے اپنی جگہ ایسے تعصبات رکھتے ہیں۔

کہ اپنے پیشروؤں کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔

مارچ کے شمارے میں جناب ابن فرید بی اے کا منٹو سے مضمون پڑھا اور یقین جانئے پڑھ کر انتہائی دکھ اور صدمہ ہوا۔ دراصل یہی صحیح اس عریضہ کی تحریر کا فوری محرک ہوا ہے۔ ابن فرید کا اکڑ کر یہ فتویٰ دے دینا کہ منٹو نے ادب میں جس اخلاقی پستی کی عکاسی کی ہے۔ اس کے لئے نہ انہیں ریاضت اور مجاہدہ کرنا پڑا ہے اور نہ ان کے اندر گرے ہوئے طبقات کے لئے خلوص تھا۔ بلکہ انہوں نے اپنی زندگی کی تمام گراوٹوں کا شمارہ اس طرح پورا کیا ہے کہ اسے ادب میں ڈھال کر عوام کی جیبیں شراب کی بوتلوں کے لئے خالی کرالی ہیں۔[۱] منٹو مرحوم اور ان کے ادب پر ایک ظلم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک منٹو کے فن کا تعلق ہے۔ ابن فرید صاحب کی رائے وقیع نہیں کیوں کہ ادب و تنقید میں ابھی تک ان کا کوئی مقام نہیں[۲]۔ اور جن لوگوں کا اردو ادب کے عالموں اور نقادوں کی حیثیت سے مقام مسلمہ[۳] ہے سو وہ سب منٹو کی فنی عظمت کے قائل ہیں اور عظیم انسان دوستی[۴] کے بھی۔ منٹو کی فنی عظمت کے متعلق ابن فرید صاحب بھی مضمون کی ابتدا میں ان لفظوں میں اعتراف فرماتے ہیں۔ "وہ دراصل ٹالسٹائی اور گورکی جیسے عظیم فنکاروں کی صف میں کھڑا کرتے ہیں۔" لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی شخص خلوص سے کام لئے بغیر اپنی زندگی کی تمام گراوٹوں کو ادب کے قالب میں ڈھال کر عوام کی جیبیں شراب کی بوتلوں کے لئے خالی کروا کر کس طرح[۵] عظیم فنکار بن سکتا ہے۔ اور عظیم ادب کی تخلیق کر سکتا ہے ۔۔۔ منٹو کی موت کے بعد ان کا مکمل مطالعہ کئے بغیر اور ان کی شخصیت اور ان سے متعلق ذاتی معلومات سے کما حقہ واقفیت نہ ہونے کے باوجود ان پر اس قسم کا اتہام سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔ مجھے جہاں اس تحریر پر تعجب ہوتا ہے وہاں اس کی اشاعت پر بھی حیرانی ہوتی ہے۔ آپ نے غالباً منٹو کو پڑھا ہوگا۔ اگر آپ نے منٹو کی تمام نگارشات کا مطالعہ فرمایا ہو تو ابن فرید صاحب کے اس فتوے کا بودا پن آپ پر روشن ہو گیا[۶]۔ آپ کے مجموعۂ اشعار "خیال" پر کسی مظفر حسین صاحب کے تبصرے سے آپ کو رنج ہوا۔ اور آپ نے اپنے جواب میں

---

[۱] کسی کی رائے اگر غلط ہو تو اتنا کافی ہے کہ اس سے اظہار اختلاف کر دیا جائے، رنج اور دکھ کاہے کو ہو!

[۲] کیا جس شخص کو پہلے سے شہرت کا مقام حاصل نہ ہو اس کی بات لازماً بے وزن ہونی چاہیئے!

[۳] منٹو کے جن مداحوں کا ادبی و تنقیدی مقام مسلمہ ہے وہ تنقیدی زاویۂ نظر بھی ایسا رکھتے ہیں جو منٹو کے ذہن سے قرب رکھتا ہے، مگر ابن فرید نظریۂ حیات سے لے کر نظریۂ ادب و تنقید تک ایک مختلف قسم کے آدمی ہیں لہٰذا ان کی بات کو خود انہی کے زاویۂ نظر سے سمجھنا ضروری ہے۔

[۴] اصل میں ابن فرید صاحب کے نقطۂ نظر سے انسان دوستی انسانی کردار کا کوئی ایسا مستقل اور محدود جز نہیں ہے جسے پوری زندگی سے الگ کر کے ایک شخص ادبی سرگرمیوں میں جلوہ آرا کر دے۔ وہ انسان دوست ہوگا تو اپنی پوری زندگی میں ہوگا۔ ابن فرید صاحب نے اس کے ذہن و کردار کے بعض پہلو نمایاں کر کے یہ دکھایا ہے کہ اس کا مستقل کردار انسان دوستی کا آئینہ دار نہیں ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا ادب انسان دوستی کی روح سے مزین ہو۔ اب یہ ان کا اپنا مطالعہ ہے، کوئی دوسرا اہل ہے تو اس کی تردید میں دلائل لائے۔

[۵] یہی تو بات ہے جسے ابن فرید پورے زور سے پیش کرتے ہیں۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ کچھ لوگ کسی اعلیٰ اخلاقی مقصدیت سے بے نیاز ہو کر محض فنی خوبیوں کی بنا پر منٹو کی نگارشات کو عظیم ادب کا عنوان دیتے ہیں، لیکن وہ ان لوگوں سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس صاحب فن کا حال یہ رہا ہو کہ اس نے قلم کی نوک سے شراب کے پیالے بھرے ہوں اور شراب شراب کا نام لیتے دم توڑ دیا ہو، اس کے ہاں اخلاقی مقصدیت نہیں ہو سکتی اور اخلاقی مقصدیت جب ناپید ہو تو محض فنی شعبدوں کے کمال کا نام عظیم ادب نہیں ہو سکتا۔

[۶] میں نے اپنی ذاتی رائے منٹو کے بارے میں ایک مختصر سے اداریتی نوٹ میں واضح کر دی تھی جو ابن فرید صاحب کے مقالے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ میرے نزدیک منٹو ایک اونچے درجے کے نفسیاتی مریض تھے اور ادب کے میدان میں جب اونچے درجے کا کوئی نفسیاتی مریض کام کرتا ہے تو اس کا فن اپنی کج رویوں کی وجہ سے عوام کے لئے انتہائی دلچسپی کا موجب ہوتا ہے، لیکن ایسے ادب سے انسانیت کا بھلا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اب جو لوگ محض دلچسپی سے متاثر ہوتے ہیں وہ اسے عظیم ادب سمجھ بیٹھتے ہیں۔

تنقیداتِ تنقیص کا فرق نہایت دلنشین انداز میں واضح کیا ہے۔ ابن فرید صاحب کی یہ تحریر محض تنقیص کے زمرے میں آتی ہے۔ اور ان کی یہ کوشش ایک عظیم فنکار کی شخصیت اور فن پر غیر تحقیقی اعتراضات سستی شہرت پسندی کی خواہش ہے اور بس۔ ورنہ کوئی پڑھا لکھا آدمی آپ کی تحریر کو کوئی اہمیت نہ دے گا۔

منٹو فرشتہ نہ تھے۔ انسان تھے۔ ان میں خامیاں بھی تھیں لیکن تمام انسانوں سے زیادہ نہ کم۔ اس کے باوجود وہ ایسے فاسق و فاجر اور اخلاقی لحاظ سے گرے ہوئے بھی نہ تھے جیسا کہ ابن فرید صاحب سمجھتے ہیں یا سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے مضمون میں آپ نے بعض اقتباسات دے کر اپنی بات کو منوانا چاہا ہے۔ مگر جن لوگوں کی تحریروں کے نامکمل اقتباسات دے کر اور ان کا بالکل غلط مطلب لے کر، انہوں نے منٹو کے اخلاق کے بارے میں فیصلہ دیا ہے۔ وہاں ان لکھنے والوں کی آراء کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ جو علمی اور ادبی حیثیت سے یقیناً ابن فرید صاحب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ یہ لوگ منٹو کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ اور یقیناً ان کی رائے منٹو کی شخصیت کے بارے میں زیادہ وقیع اور قابلِ اعتبار ہے۔ منٹو نے جنسی افسانے ضرور لکھے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے بعض افسانوں میں بعض لوگوں کے نزدیک لذت پرستی یا گھن ہو۔ لیکن منٹو کی تخلیقات محض انہی چند افسانوں تک تو محدود نہیں۔ منٹو نے دیگر بھی تو درجنوں موضوعات پر افسانے لکھے ہیں[1]۔ جنہیں ہر لحاظ سے "پاکیزہ" کہا جا سکتا ہے۔ تقسیم کے بعد معاشی مصائب اور شراب کی مکروہ عادت کے باعث منٹو نے زود نویسی یا بسیار نویسی شروع کر دی تھی جو ان کی گراوٹ کا سبب بنی۔ لیکن یہ کہنا کہ ان کی تقسیم کے بعد کی تمام تحریریں خالص جنسی اور فنی مرتبہ سے گری ہوئی ہیں، سراسر کذب و افترا پر مبنی ہے۔ کیا انہوں نے منٹو کے تقسیم کے بعد لکھے گئے افسانوں "یزید" "بادشاہت کا خاتمہ" "کتے کی دعا" "منظور" "آخری سلوٹ" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" "ٹوٹو" "سڑک کے کنارے" "اس منجدھار میں" "۱۹۱۹ کی ایک رات" اور متعدد دیگر افسانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اور کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانے جنسی ہیں۔ کیا کوئی غیر جانبدار ادبی نقاد منٹو کے افسانوں "بادشاہت کا خاتمہ" "ٹوٹو" "سڑک کے کنارے" "اس منجدھار میں" "منظور" وغیرہ کو فنی مرتبہ سے گرا ہوا قرار دے سکتا ہے۔

منٹو کی موت پر برِ عظیم ہند و پاکستان کے علمی اور ادبی حلقوں بلکہ عوام[2] نے بھی جس رنج و غم اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اردو زبان کے کسی

---

[1] اصل میں دیکھنے والے نے یہ دیکھا اور دکھایا ہے کہ منٹو کا مرکزی اور ذہن پر چھایا ہوا موضوع کیا تھا۔ ورنہ اس سے انکار نہیں کہ انہوں نے دوسرے موضوعات بھی لئے ہیں اور گندہ پن سے کسی قدر خالی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ سوال منٹو کے مجموعی ادبی کام کا ہے، نہ کہ منفرد کہانیوں کا۔

[2] جی ہاں، آپ کے عوام ــ اور دنیا بھر کے عوام ــ کا حال یہ ہے کہ اگر ایک بیسوا ان کے سامنے آکر ننگی ہو کر ناچنے لگے تو وہ اس کے ہاتھوں ذبح ہونے پر تیار ہو جائیں گے۔ منٹو کی مقبولیت کا اصل راز یہی ہے کہ اس نے عوام کے آتش گیر سفلی میلانات کو سامنے رکھا اور "جنسیت" کو ایک بیسوا کی طرح چوراہے پر ننگا ناچ نچایا۔ اس تماشے سے لذت اندوز ہونے کے لئے آتے جاتے راہگیر رک کر کھڑے ہو گئے، آس پاس کی عمارتوں کے مکین کوٹھوں پر آ گئے، ٹریفک رکنے لگا۔ ایسے میں اگر تماشاگر کی موت واقع ہو جائے تو پورا مجمع جو اس کا ممنونِ احسان ہے، شدید جذباتی تاثر میں ڈوب جائے گا اور دل کھول کر ماتم کرے گا۔ یہ بات اگر اسے عظیم بناتی ہے تو صرف ان لوگوں کی نگاہ میں جو لذتیت کو اصل روحِ فن مانتے ہوں۔ ہمارا نظریۂ ادب دوسرا ہے، ہم فن میں تفریح کا مقام ویسا ہی مانتے ہیں جیسا کھانے کے پیالے میں نمک کا۔ اپنے نظریۂ حیات ہماری نگاہ میں پیالے کی یخنی ہے جو ادب کی اصل مرکزی روح بنتا ہے۔ اخلاقی مقصدیت کو دودھ کا سا مقام دیا جا سکتا ہے۔ جس فن میں آدھا یا تین چوتھائی پیالہ نمک سے بھر دیا گیا ہو وہ عامیانہ ذوق کے لئے تو بہت مسرور کن ہو گا، مگر ذوقِ سلیم کی تو جان پر بن جائے گی۔ پس عوام کی نگاہ میں منٹو کی مقبولیت کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کا فن لذتیت کے لحاظ سے پیش پیش ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ نظریۂ حیات اور اخلاقی مقصدیت کے لحاظ سے بھی وہ لازماً عظیم ہو گا، بلکہ برعکس اس کے ادب میں لذتیت کی فراوانی ہمیشہ اس کی نظریاتی و مقصدی روح کو غارت کرنے والی ہوتی ہے۔

افسانہ نگار کو اس کا عشرِ عشیر بھی نصیب نہیں ہوا (اگرچہ یہ ظاہرہ ہماری قوم کی مُردہ پرستی کی روایات میں ایک شاندار اضافے کی ہی حیثیت رکھتا ہے) اور منٹو کے بارے میں جس قدر مشاہیرِ فن اور اربابِ علم و ادب نے لکھا — اردو ادب کی تاریخ میں کم از کم کسی افسانہ نگار کے بارے میں اس قدر تا حال نہیں لکھا گیا — اُردو افسانہ میں پریم چند سے لے کر مشیم تک کے کسی افسانہ نگار نے اتنی تعداد میں عظیم افسانے نہیں لکھے جتنے کہ منٹو نے۔ برِعظیم ہند و پاک کے تمام صفِ اوّل کے ادیبوں اور فن کاروں نے اس کی موت پر اظہارِ افسوس کیا اور نقادانِ ادب حتیٰ کہ اُس کے مخالفوں نے بھی اس کی فنی عظمت کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا (جس میں ہمارے فاضل تنقید نگار ابنِ فرید بھی شریک ہیں) اور ابنِ فرید صاحب کا یہ ارشاد کہ اس مقامِ بلند کے لئے نہ انہیں ریاضت اور مجاہدہ کرنا پڑا اور نہ ان کے اندر خلوص کا جذبہ کارفرما تھا۔ بلکہ انہوں نے محض اپنی اخلاقی گراوٹوں کو ادب میں ڈھال دیا — تا بلقہ سرِ گریبان ہے اسے کیا کہئے۔ کہ منٹو کے افسانے "نیا قانون" "آم" "سڑک کے کنارے" "اُس منجدھار میں" "منظور" اور بیسیوں دیگر افسانے ادب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی منٹو کی زندگی کی گراوٹیں ہیں[1]۔ اس بے تکی بات پر مزید کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ ابنِ فرید صاحب کا یہ "شاہکار" "چھوٹا منہ بڑی بات" والا معاملہ ہے۔ اور پھر اس "بڑی بات" کا کوئی سر پیر بھی ہوتا تو کوئی بات تھی۔ دو چار اقتباسات اک غلط سلط تاویل فرما کر آپ نے تنقید نگاری اور شخصیت نگاری کا ہی حق ادا نہیں کیا بلکہ تحقیق اور فتوے کی مسند پر بھی جلوہ افروز ہو گئے۔ منٹو نے عصمت چغتائی سے محض ضد میں آ کر چند ناموزوں کلمات کہے۔ محض ان کلمات کے لفظی معنی لے کر اور ان کے موقعہ محل کو نظر انداز کرتے ہوئے بغیر تصدیق یا ذاتی معلومات کے ایک عظیم فنکار پر اس کی موت کے بعد یہ بیہودہ الزام تھا۔ شی کہ وہ اپنی زندگی میں اس "بازار" کا محتاج تھا۔ اور اس "بازار" کی بقا اس کی بھی زندگی کے لئے ضروری تھی، کیا اور جائز ہے؟ کیا بغیر ریاضت اور مجاہدہ کئے بغیر کسی خلوص کے محض اپنی زندگی کی گراوٹوں کو افسانوی قالب میں ڈھال کر کوئی فنکار عظیم ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ عظیم فنکار بن سکتا ہے بلکہ فنکار کہلانے کا مستحق بھی ہو سکتا ہے؟ ان دو سوالات کا جواب ادب کا ایک معمولی طالب علم بھی نفی ہی میں دے گا۔ البتہ ان باتوں سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ ابنِ فرید صاحب بغیر کسی ریاضت و مجاہدہ کے عظمت اور شہرت کی مسند پر جلوہ افروز ہونے کے خواہش مند ہیں۔ لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ ایوانِ ادب میں اس "چور دروازے" سے داخلہ ناممکن ہے[2]۔

اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک مفصل مضمون لکھ کر ابنِ فرید صاحب کی تنقید نگاری اور شخصیت نگاری پر روشنی ڈالوں اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو آپ براہِ کرم اس خط کو اپنے موقر جریدہ میں ضرور جگہ دیں اور مجھے آپ کی انصاف پسندی سے اس کی پوری امید ہے۔ تاکہ "چراغِ راہ" کے بعض حضرات میں ایک عظیم فنکار سے متعلق پیدا شدہ غلط تاثر کو زائل کر سکیں جس کا وہ غریب یقیناً مستحق نہیں — والسلام

---

[1] پھر یہ بات ضروری نہیں کہ تخلیق کار نے فنی طور پر منٹو کا بیان بھی نہیں دیا بلکہ اس نے یہ دکھلایا ہے کہ اس کی نگارشات کے مجموعی آئینہ میں اس کی شخصیت اور اس کی [illegible] سامنے آتی ہیں۔ اور منٹو نے اپنے فنی کارنامے کے پس منظر میں اپنے قلم سے بنائی ہوئی اپنی جو تصویر پیش کی ہے۔ وہ کیسی ہے۔

[2] میرا خیال یہ ہے کہ ابنِ فرید سے آپ ان کلمات کے کہے بغیر بھی حسن و خوبی سے اختلاف فرما سکتے ہیں اور [illegible] اگر فرید کی تحقیق ذاتی حملے کا کیا ہے۔ ایک شخص کے خلاف انتقامی معرکہ آرائی کے زاویے سے آپ کچھ لکھیں تو اسے ہم نہیں چھاپیں گے۔ البتہ اگر محض تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا مقالہ معیاری ہونے کی صورت میں ہم اسے بصد شکریہ قبول کریں گے۔

ضیاء

صدیوں کے بعد آپ کا مکتوب دلنواز ملا۔ گزرے ہوئے زمانے اور بھولے ہوئے فسانے یاد آ گئے۔

عہد ماضی کی یاد آتی ہے

تیر ہوتا ہے اک جگر سے پار

میں اب ایک سازِ خاموش ہوں ایک ٹوٹا ہوا ابطال اور ایک محروم نوا رباب ہوں۔ زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے جس کے تاروں کو توڑ دیا ہے۔ اور ماحول کی چیرہ دستیوں نے جس کے پردوں سے نوا چھین لی ہے۔ یہ وہی تار ہیں کبھی جن سے نغموں کا سیلاب امنڈتا تھا اور یہ وہی پردے ہیں جن سے پیہم نواہائے تازہ بلند ہوتی تھیں۔ اب کوئی مضراب ان تاروں کو مرتعش نہیں کرتا اور کوئی زمزمہ اس سازِ خاموش کے پردوں میں سوئے ہوئے نغموں کو نہیں جگاتا۔

بلبل طبعم کنوں باشد ز تنہائی خموش — نغمہ ہا بودے مرا تا ہمزبانے داشتم

کاروان سے بچھڑ جانے والے ایک رہرو درماندہ کی حسرتوں کا اندازہ وہ تیز قدم اہل قافلہ کیا لگا سکتے ہیں جو اپنی منزل کی دھن میں سرشار پیہم آگے بڑھ رہے ہوں اور جادۂ شوق کا ہر مرحلہ برق رفتاری سے طے کر رہے ہوں مگر کیا یہ ٹریجیڈی نہیں ہے کہ۔۔

کاروان، اب منتظر ہے تمہارا اٹھو سوئے منزل بڑھاؤ قدم

فقش کتنے سنورنے کو بیتاب ہیں تھام لو پھر سے ہاتھوں میں اپنے قلم

کی صدا لگانے والا اب خود نقش کف پا سے زیادہ نہیں۔ اور کل جو دوسروں کے سکوت کا شکوہ سنج تھا آج خود مہر بلب ہو چکا ہے۔

لیکن اے یارانِ تیزگام اور اے رہروانِ بے قیام کبھی ہم بھی تمہارے شریک سفر تھے۔ تمہارے ساتھی تھے تمہارے قافلے میں شامل تھے بلکہ جرس بجانے والوں میں ہمارا شمار ہوتا تھا۔ ہر چند ہماری کمزوریاں اور مجبوریاں اب ہمیں تم سے جدا کر چکی ہیں لیکن ہمارا دل تو تمہارے ہی ساتھ دھڑک رہا ہے۔ اور قدم اگرچہ تمہارے ساتھ نہیں اٹھ رہے ہیں لیکن ہماری مخلصانہ دعائیں اور حسرت پرور تمنائیں تو تمہارا ہی ساتھ دے رہی ہیں اور تم کو منزل مراد پہ جلد پہنچنا نصیب ہو۔ الدہر تاتی النجا تم سے عرض کرتے ہیں کہ دشت جنوں کی وحشت کو دیوانہ وار عبور کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنے ہم سفروں اور پا شکستگاں کو بھی یاد کر لیا کرو جو شاید خرد کے فریب میں آ گئے اور تھوڑی ہی دور چل کر سفر کی صعوبتوں اور راہ کی دشواریوں سے گھبرا گئے۔ اور بحر عشق کی تلاطم خیز موجوں میں اپنے سفینے کھینے ہوئے کبھی پلٹ کر ان حسرت زدگاں اور دل خستگاں کا سلام بھی لے لیا کرو جو ساحل پر کھڑے تم کو الوداع خدا حافظ کہہ رہے ہیں مگر جو طوفانی موجوں کو دیکھ کر خود تمہارے ساتھ سفینوں میں سوار نہیں ہو سکے۔

زندگی چراغ ... کی بات تو یہ ہے جب تک ہم بقید حیات تھے۔ اس میں تیل ڈالتے اور اس کی لو کو بڑھانے میں بقدر توفیق اور یارانِ ... بہت ... خونِ جگر کے ہر قطرے کو ہمیشہ دولت ... یار سمجھا کئے۔ لیکن اب ایک تند اور گو ہو چکا

اور بقول کسے شاعری کی ایک چلتی پھرتی قبر اور شعر و سخن کا ایک متحرک مزار بن چکے ہیں۔ خود اس کے محتاج ہیں کہ کوئی ہماری تربت پر شمع جلائے اور پھول چڑھا جائے۔ ہماری شمع تو گل ہو چکی تھی۔ آپ کے چراغ کو جلتا رکھے۔ تبھی آپ کے حق میں جب کہ جبری طور پر آپ ہم سے جدا کر دیئے گئے تھے۔ ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا تھا اسے سن لیجئے اور چراغ راہ کی معرفت دوسروں کو بھی سنا دیجئے ؎

بگاڑ لے گی نہ کچھ بھی شب سیاہ ترا رہے گا زندہ و روشن چراغ راہ ترا

رات مختصر ہے اور داستان شوق طویل سے طویل تر ہوتی جاتی ہے۔ مجبوراً رشتۂ سخن ہاتھ سے رہا کرتا ہوں یعنی اس حکایت بے پایاں کو خاموشی سے ادا کرتا ہوں۔

آپ سے ایک ہی روز پہلے خالد بھائی کا محبت نامہ ملا تھا۔ ان کی خدمت میں میرا سلام شوق اور ان کی اہلیہ محترمہ کے حق میں دعائے صحت پہنچا دیجئے۔ اور یہ خط بھی انہیں پڑھوا دیجئے۔ کیوں کہ آپ دونوں کے خطوط کا جواب اس میں شامل ہے۔

کوثر صاحب کی یاد ہر وقت دل میں تازہ ہے۔ ان کی بارگاہ میں بھی ہدیۂ سلام پیش کرتا ہوں۔ حقیر عیال و اطفال بفضلہ خیریت سے ہیں امید ہے آپ بھی مع جمیع وابستگان بخیر و جمعیت ہوں گے۔ والسلام

بقیہ۔ مسئلہ سویز

ہیں ہم ایک مدت دراز سے جکڑے رہے ہیں اس کی ہر کڑی کو ٹوٹتے دیکھ کر ہمیں خود اپنی آزادی کے تحفظ کا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ البتہ دو باتیں ایسی ہیں جن کا صاف صاف اظہار کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک یہ کہ ہمارے لئے اینگلو امریکی بلاک کا استعمار جتنا مبغوض ہے، اتنا ہی روس کا استعمار، اور ہندوستان کا نوخیز اور پردہ پوش استعمار بھی مبغوض ہے۔ تمام مسلمان ملکوں اور خصوصاً عرب ممالک کو ہوشیار رہنا چاہیئے کہ وہ بھیڑیوں سے بچ کر اژدہوں کے منہ میں نہ چلے جائیں۔ اس تنبیہ کی ضرورت میں اس بنا پر محسوس کرتا ہوں کہ مشرق وسطیٰ کے تازہ دورے میں مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ عرب ممالک ان اژدہوں سے غافل ہیں جو پیچھے سے ہمدردی کے بھیس میں ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب تمام مسلمان ملکوں کے درمیان ایک مضبوط رشتۂ اتحاد قائم ہونا سخت ضروری ہے اور اس کی طرف ممالک اسلامیہ کے مدبرین کو فوراً توجہ کرنی چاہئے۔ یہ عربی قومیت اور ترکی قومیت اور دوسری محدود قومیتوں کے احساسات جو مسلمانوں میں باہم تفریق پیدا کر رہے ہیں، اور جن کی بنا پر مختلف مسلمان قومیں اپنے اپنے مفاد کی خاطر دنیا کے بڑے بڑے حریص اقتدار بلاکوں کے ساتھ الگ الگ معاملے کر رہی ہیں، ان کا نتیجہ بالآخر تمام مسلمان ملکوں کے حق میں سخت نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ہماری خیر اگر ہے تو صرف اس امر میں ہے کہ ہم دوسری تمام قومیتوں کو بھول کر ایک اسلامی قومیت کو یاد رکھیں، اور اسلام کے رشتے سے متحد ہو کر ایک دوسرے کے حامی و مددگار بن جائیں۔ میں نے اپنے تازہ دورے میں نسلی و وطنی اور لسانی قومیتوں کے تعصبات اور مسلم ممالک کی تصادم خیز سیاستوں کے جو اثرات دیکھے ہیں ان کی بنا پر میں اس تنبیہ کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔"

آپ کیا پڑھیں؟

ادارہ

کوثر نیازی کو قارئینِ چراغِ راہ جانتے ہیں۔ ان کی غزلیں ہمارے ہاں شائع ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر میدان کی طرح شاعری کے میدان میں بھی فوق العام رفتار سے آگے بڑھے ہیں، چنانچہ بالکل غیر متوقع طور پر ان کا ایک مجموعۂ کلام "نذرِ گل" دیدہ زیب لباسِ طباعت سے آراستہ ہو کر بر سرِ فروخت ہے۔ کوثر صاحب سے چونکہ دوستانہ مراسم رہے ہیں، اس لئے تعریف کروں تو وہ اپنی تعریف ہو جاتی ہے اور تعارف کرانا چاہوں تو اصلاحی صاحب جیسے مبصر کے قلم سے ایک بار اس ضرورت کے بہتر طور پر پورا ہو جانے کے بعد سوئے ادب معلوم ہوتا ہے۔ محض چند پسندیدہ اشعار اور ان کے ساتھ چند کمزوریوں کا شمار کرا دینا میرا طرز نہیں ہے۔ یوں مجھے کچھ کہنا تو ہے، اس لئے مختصراً یہ کہتا ہوں کہ کوثر صاحب کا اصل میدانِ شاعری "غزل" ہے اور اس کے لئے ان کی طبیعت بنیادی طور پر موزوں ہے یہی وجہ ہے کہ اس مرحلۂ ابتدا میں بھی انہوں نے بہت اچھے اچھے اشعار اور اچھی اچھی غزلیں ہمارے سامنے رکھی ہیں۔ ان کے پہلے ایک طرف اسلامی فکر اور مقصدیت ہے اور دوسری طرف وہ غزل کے روایتی اسلوب سے پوری ذہنی وابستگی رکھتے ہیں اور ان کی عمر اور اس عمر کے فطری جذبات اس وابستگی کو تازہ تر رکھتے ہیں۔ یہ دونوں اثرات ان کے ذہن میں ابھی غیر محسوس طور پر برسرِ کشمکش ہیں، ان میں پورا پورا امتزاج نہیں ہو پایا۔ اسی سبب سے ان کے مجموعۂ کلام ــ خصوصاً غزلوں میں ــ جہاں وہ اسلامی فکر و مقصدیت کو لاتے ہیں وہاں رنگ بالکل اور ہو جاتا ہے، اور جہاں وہ روایتی تغزل کے دھارے میں بہتے ہیں وہاں رنگ دوسرا ہوتا ہے۔ مقصدیت آتی ہے تو ان کا تغزل کمزور رہ جاتا ہے اور نظم کا مزاج ابھر آتا ہے، لیکن جہاں کہیں نظم کا مزاج ابھر آتا ہے وہاں وہ فنی اور شعری طور پر کمزور رہتے ہیں۔ دوسری طرف جہاں تغزل عروج پر ہوتا ہے اور اس میں فنی شان پائی جاتی ہے وہاں ان کا فکری و مقصدی پہلو دب جاتا ہے، بلکہ غائب ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری کی جوئے سیمابی کا اس طرح پھٹ کر بہنا کچھ دیر کے لئے ناگزیر معلوم ہوتا ہے ــ اتنی دیر کے لئے جب تک کہ ان کے فکری و مقصدی رجحانات اور ان کے فنی اور شاعرانہ اور جذباتی میلانات باہم دگر گھل مل کر ایک وحدت نہ ہو جائیں۔ لیکن نذرِ گل میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر یہ توقع استوار ہوتی ہے کہ یہ نوخیز شاعر فکر و فن میں فطری امتزاج پیدا کر لے جائے گا، اور شعریت تو کوثر نیازی کی فطرت کا ایک جزء ہے، لہٰذا اور بھی اطمینان ہوتا ہے کہ اس کا مستقبل روشن ہوگا۔

زبان اور ادائے خیال کے اسلوب میں کہیں کہیں کمزوریاں سامنے آتی ہیں مگر وہ کس میں نہیں ہوتیں۔

"نذرِ گل" کا اصل مرکزی عنصر تو نغمۂ زنداں کے عنوان سے سب جو زمانۂ نظربندی (۱۹۵۳ء) کی شعری کاوشوں کا حاصل ہے۔ کچھ چیزیں پہلے کی اور بیشتر بعد کی ہیں۔

مکتبۂ تعمیرِ انسانیت (موچی دروازہ - لاہور) نے اسے بہت اچھے معیار کے ساتھ پیش کیا ہے مگر افسوس ہے کہ جلد بندی گویا ریشم میں ٹاٹ کا پیوند بن گئی ہے۔ ایک سو ساٹھ صفحات کی کتاب، اس وجہ کی جلد بندی کے ساتھ، دو روپے بارہ آنے میں دینا شدید معاشی بدحالی کے دور میں ناشر اور مصنف دونوں کے حق میں مضر نہ ہو۔

معجزاتِ القرآن (جلد اول)

مولانا سید شاہ محمد شاہ صاحب ابوالقاسم قادری دشتقادری کی لکھی ہوئی انتہائی ترقی پسندانہ تفسیر "معجزاتِ القرآن" کے نام سے جماعتِ قرآنیہ (مسعود پورہ حیدرآباد دکن) نے شائع کی ہے۔

...... : "در اصل میں جماعتِ قرآنیہ کے سامنے طباعت کا اشاعتی سلسلہ ہے اور اسی سلسلے کی یہ ایک کڑی "معجزات القرآن" کے لئے خاص ہے۔ یہ اوراق جماعتِ قرآنیہ کے دلچسپ اسلوبِ تفسیر کے مظہر ہیں۔ جماعتِ قرآنیہ در اصل ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرح قرآنی دین کی علمبردار ہے مگر ترقی پسندی کے لحاظ سے کچھ زیادہ آگے ہے۔ یہاں ہم صرف چند تفسیری لطائف عرض کریں گے۔

سورۂ ذاریات کی قسمیں سنیئے "یہ قسم ہے ان تیز رو گاڑیوں اور سواریوں کی جو دھواں اور گرد اڑاتی ہیں، پھر ان گاڑیوں کی جو بوجھل سامان کو اٹھائے جاتی ہیں اور نقل و حمل کا کام کرتی ہیں، پھر ان جہازوں کی جو نہایت سرعت و سہولت کے ساتھ پانی اور ہوا (سمندر و فضا) میں دوڑتے پھرتے ہیں، پھر اسٹیشنوں، ڈاک خانوں اور گوداموں کی قسم جو پارسلوں، سامانوں، تاروں، چٹھیوں کو تقسیم کرتے ہیں (فالمقسمات امرًا) ...... " آگے چل کر سورۂ طور کی قسموں کی توضیح بھی جاذبِ توجہ معلوم ہوتی ہے۔ "والطّور" کے جملہ میں پہاڑوں کو گرمائی مقام بنانے کی پیشگوئی ہے۔ "کتابِ مسطور" میں پریس کی ترقیات کی طرف اشارہ ہے۔ "بیتِ المعمور" سے مراد یونیورسٹیاں، اسٹیشن اور کارخانوں کی عمارتیں ہیں۔ "السقف المرفوع" میں انہی عمارتوں کی اونچی چھتوں کا ذکر ہے۔ "والبحر المسجور" میں بحری بیڑوں اور گودیوں کا بیان آیا ہے۔ "تمور السماء مورًا" میں تذکرہ ہوائی جہازوں اور ٹن طلعوں کا ہے۔ "تسیر الجبال سیرًا" میں بھاری بھر کم گاڑیوں اور ٹینکوں کے چلنے کی پیش گوئی ہے۔ سورۂ مرسلات میں "واذا الرسل اقتت" کا جو ٹکڑا آیا ہے اس میں شاہ صاحب رسول سے مراد مندوب، ڈیلی گیٹ اور سفیر وغیرہ لیتے ہیں۔ یعنی یہاں ایک بڑی بین الاقوامی کانفرنس یا پارلیمنٹ (یا موجودہ یو این او) کی طرف اشارہ ہے۔ سورۂ نازعات کے مرادِ و صورۂ تلاش کرتے ہوئے "ائنا لمردودون فی الحافرۃ" کا مطلب یوں بتایا کہ "تباہ شدہ قومیں اپنی انتہائی تباہی کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے شبہاً یہ سوال کریں گی کہ آیا ہم اپنی خوشحالیوں کی طرف پھر لوٹ جائیں گے یا نہیں!" "فانما ھی زجرۃ واحدۃ فاذا ھم بالساھرۃ" کا ترجمہ اسی سلسلۂ تفسیر کے تحت یوں کیا کہ "پھر تو تباہی ہوگا کہ اس قوم کو ایک جھٹکا لگتا ہے کہ یکا یک وہ بیدار ہو جاتی ہے یا آزادی کے کھلے میدان میں آ جاتی ہے" [illegible] ایک اور دھوکے سے آپ کو نکالتی ہے تاوہ یہ کہ آپ نے جنت کہیں اور اور مرنے کے بعد کی چیز سمجھ رکھا ہے حالانکہ وہ جستجو [illegible] ہے ۔۔۔ [illegible] آپ جنت [illegible] دوزخ [illegible] کا حشر ہوتا ہے۔

[illegible] جماعتِ قرآنیہ [illegible] ادارۂ طلوعِ اسلام دونوں میں [illegible] شاہ محمد شاہ صاحب ابوالقاسم [illegible] صاحب خلیفہ عبدالحکیم [illegible]

آزما کر اطمینان کر لیجئے

بناول

کھانا پکانے کا بہترین روغن ہے

لذیذ

صحت بخش

خوشگوار

ہاتھوں سے چھوئے بغیر تیار کیا جاتا ہے



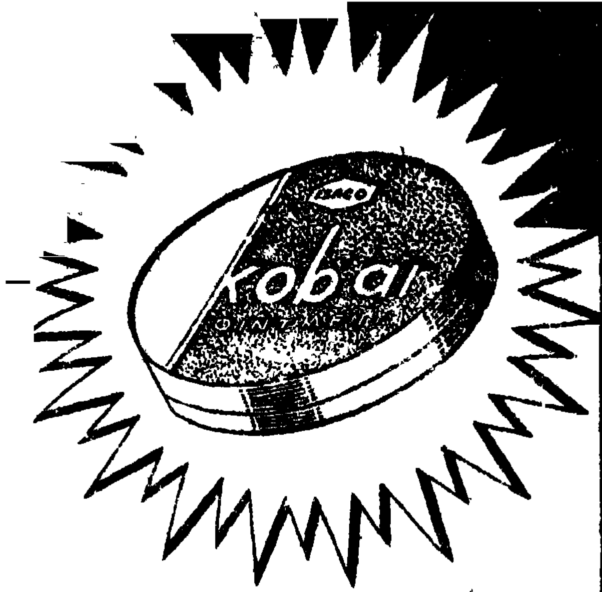
بنولے کی قوت بخش خصوصیات مدت سے مسلمہ ہیں
اس کا روغن توانائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ مانا گیا ہے۔
صحیح اصولوں کے مطابق تیار کیا ہوا بنولے کا روغن صحت
کے لئے مفید ترین اور بے ضرر چکنائی کا کام دیتا ہے۔



ہمارا تیار کردہ "بناول" (بنولے کا پاک صاف روغن)
ایک معیاری پیداوار ہے۔ جدید اصولوں کے مطابق بنایا ہوا
یہ روغن ملک بھر میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے

۳۵ پاؤنڈ۔ ۱۰ پاؤنڈ اور ۵ پاؤنڈ کے مُہر بند ڈبوں میں ملتا ہے

ہاؤس کراچی



کوبالی

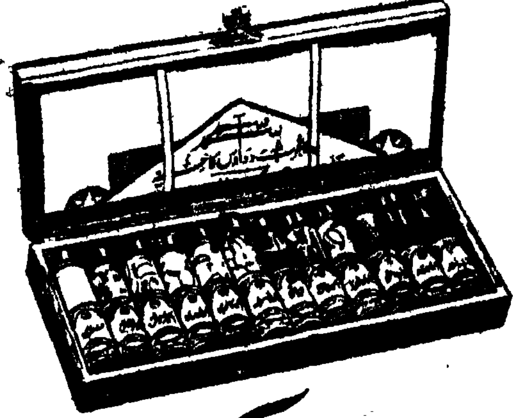
داد، اکزیما اور دیگر جلدی امراض کا بہترین مرہم

مُہاسوں اور چہرے کے دانوں کا موثر ترین علاج

قیمت: ایک روپیہ فی ڈبیہ

آئی سا کو پاکستان کراچی

آپ بھی ڈاکٹر کا بل ۸۰ فیصدی کم کر سکتے ہیں



سفرِ حج کے لئے بہترین تحفہ

بارہ مُجرّب دواؤں کا خزینہ

گھریلو علاج اور اہلِ محلہ کی طبّی خدمت کا آسان اور قابلِ اعتماد ذریعہ

یہ بارہ دوائیں بڑی حد تک آپکی طبّی ضروریات کو پورا کردینگی

مثلاً بخار کھانسی۔ دردِ نمونیا اختلاجِ قلب خفقان گھبراہٹ ملیریا قبض اسہال پیچش۔ دردِ شکم خرابیٔ جگر قے متلی بدہضمی ہیضہ۔ دردِ سر نزلہ زکام۔ نکسیر یا اسیر خونی۔ دردِ دنداں۔ دردِ گوش۔ حاملہ کی شکایات۔ بچوں کی جملہ شکایات خارش۔ فسادِ خون چوٹ اور زخم وغیرہ تکالیف کا خاطر خواہ علاج محض ان ہی مختصر دواؤں سے کیا جاسکیگا۔ قیمت بارہ روپے فی بکس

آئی سا کو (پاکستان) کراچی

تیار کنندگان ادویہ

گارڈن ٹرام ٹرمینس ۔ کراچی ۳

سراپائے رسولؐ

پر

پیش لفظ لکھتے ہوئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے آخر میں تحریر فرمایا ہے

"مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی تمام مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے اس مختصر سے رسالہ میں یہ سراپا اس طرح پیش کر دیا ہے۔ کہ ہر معمولی پڑھا لکھا اردو دان اس کو پڑھ سکتا ہے۔ اور ایک ان پڑھ آدمی بھی اس کو سن کر بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ کیا ہی بہتر ہو کہ ذکر رسول میں "مولود" کی غلط اور گمراہ کن کتابوں کی بجائے ایسی کتابوں کو رواج دیا جائے۔ اور ہر مسلمان بچے کو یہ رسالہ پڑھوا کر اس کے ذہن میں یہ بات نقش کر دی جائے کہ یہی وہ نمونہ ہے جس کے مطابق اسے اپنی زندگی ڈھالنی چاہیئے۔"

مولانا اعجاز الحق صاحب قدوسی

کی تصانیف

مکتبہ فلاح انسانیت ایک پلان کے تحت شائع کر رہا ہے۔ اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں

سراپائے رسول ——— قیمت:- ۱۰/۱ روپیہ

ہمارے نبیؐ کے صحابہؓ ——— قیمت:- ۴/۱ روپیہ

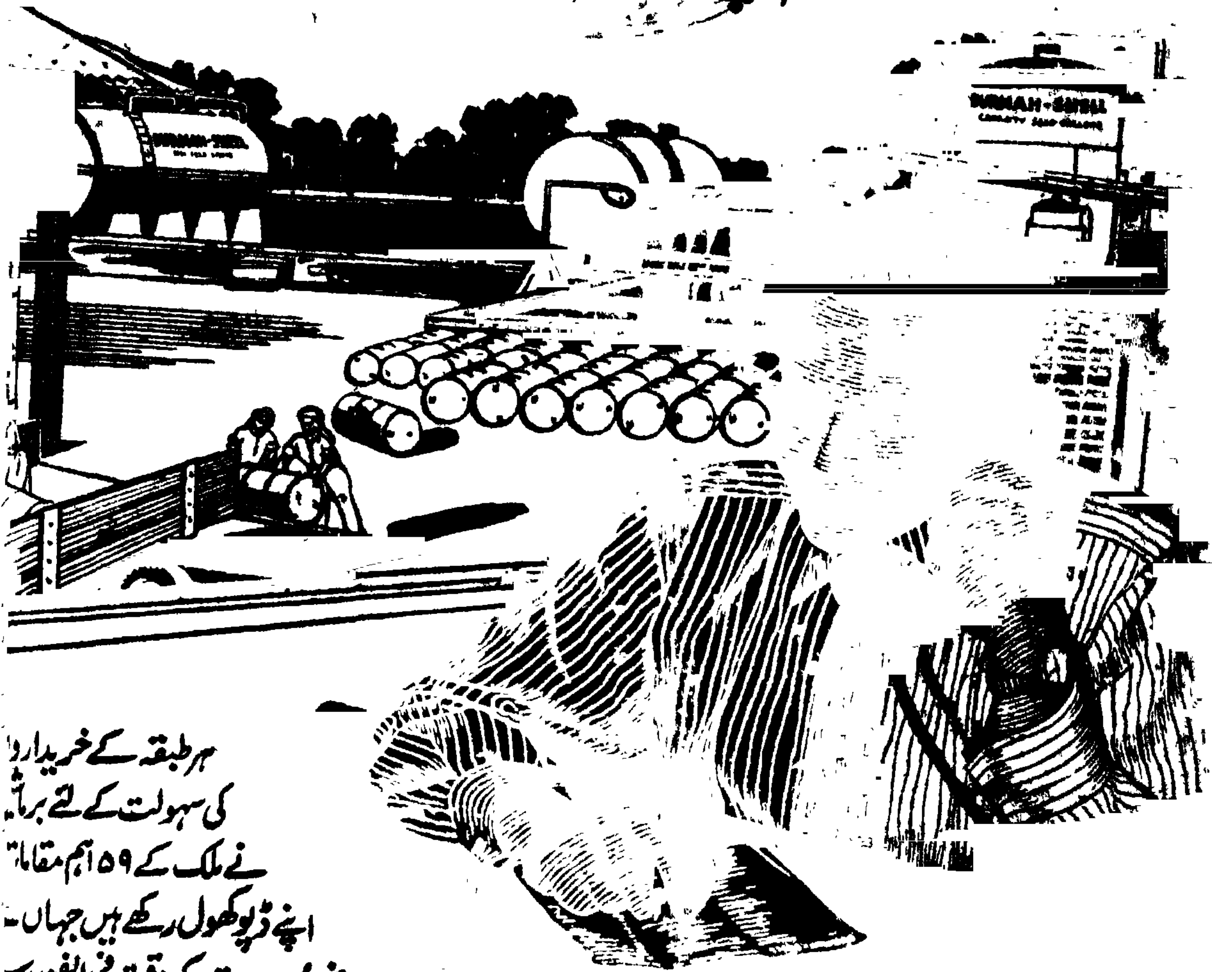
رسول پاک کی صاحبزادیاں ——— قیمت:- ۴/۱ آنے

رسول اللہ کو دو محبوب ——— قیمت ۴/ آنے

درسگاہ رسول کے دو طالب ——— قیمت ۲/۱ روپیہ

مکتبہ فلاح انسانیت کراچی

آپ کو مال کس جگہ چاہیئے؟



ہر طبقہ کے خریدار
کی سہولت کے لئے برما
نے ملک کے ۵۹ اہم مقاما
اپنے ڈپو کھول رکھے ہیں جہاں
ضرورت کے وقت فی الفور ر
حاصل کی جا سکتی ہے۔ پٹرولیم کی مصنوعا
کے نقل و حمل اور ذخیرہ اندوزی کے سلسلہ میں برما شیل
تجربہ اور کامل انتظام ملک کے گوشہ گوشہ میں بہ کفایت تقسیم
کا ضامن ہے

برما شیل

ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے


اکتوبر
۱۹۵۶

روشنی — گرمی — حرکت

ماہنامہ

چراغ راہ

کراچی

اکتوبر ۱۹۵۶ء

شمارہ ۱۰ × جلد ۱۰

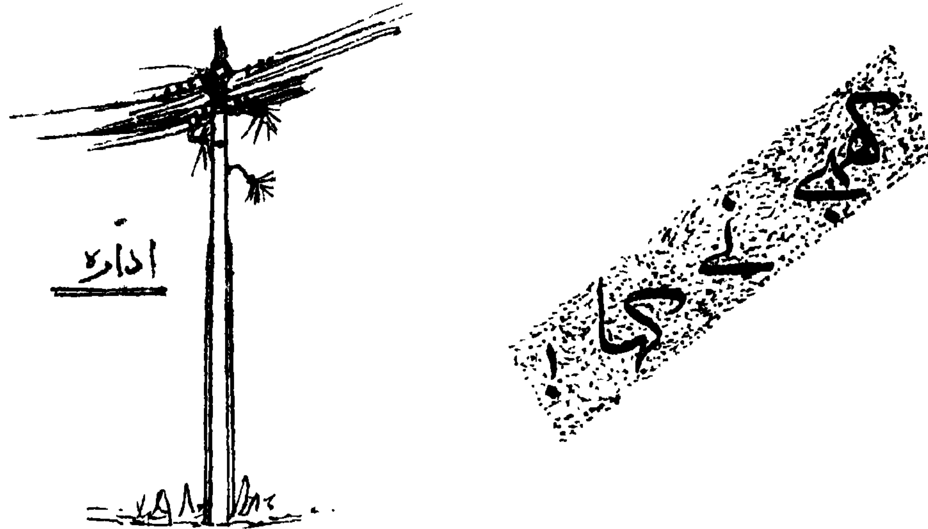
فہرست

چندہ سالانہ: ۵/- روپے، فی پرچہ ۸ آنے

دفتر ادارۂ تحریر ـ ـ ـ ۱-اے محلہ رسول پورہ اچھرہ لاہور

دفتر اشاعت و انتظام: ـ ـ ـ فیض محل فتح علی روڈ کراچی

سید کاظم علی پرنٹر و پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر چراغ راہ فیض محل فتح علی روڈ کراچی سے شائع کیا



(عامل کھمبے کے پاس کھڑا ہے — سامنے سفید چادر اوڑھے معمول لیٹا ہے — چاروں طرف بھیڑ لگی ہے — کھیل شروع ہوتا ہے)

عامل:- "میں کون؟"

معمول:- "عامل"

عامل:- "تم کون؟"

معمول:- "معمول!"

عامل:- "سوالوں کے جواب دوگے؟"

معمول:- "ہاں، ٹھیک ٹھیک!"

عامل:- "رشوت ستانی کا علاج کیا ہے؟"

معمول:- "ایسی آمدنی پر بھاری ٹیکس لگا دیا جائے۔"

عامل:- "بتاؤ کہ حصولِ کشمیر کی اب کیا تدبیر کرنی چاہیے؟"

معمول:- "تمام وزرا، اسمبلیوں کے ارکان، صحافیوں اور رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ ایک دن مقرر کر کے کشمیر، کشمیر، کشمیر کی تسبیح پڑھ کر لاکھ لگا لیں۔"

عامل:- "نفل کی ترقیاتی اسکیم کی رفتار کمزور پڑ گئی ہے، اسے کیوں کر آگے بڑھایا جائے؟"

معمول:- "اپوا کی بیگمات سے درخواست کی جائے کہ وہ نفل میں جا کر 'مینا بازار' لگائیں اور اس کے ساتھ ایک مقابلۂ حسن کا انتظام کر دیں۔"

عامل:- "اغوا اور بدکاری کے شرمناک واقعات ترقی پذیر ہیں۔ کوئی راہِ نجات بتاؤ۔"

معمول :۔ "عائلی کمیشن کو ایک بار اور تکلیف دی جائے کہ بدلتے حالات کی روشنی میں ذرا سا اجتہاد اور فرما کر کتاب و سنت کے رو سے اغوا اور بدکاری کے جواز کا فتویٰ دے دے۔"

عامل :۔ "سیلابوں کی تباہ کاری سے قوم کو بچانے کے لئے تم کیا راہِ عمل بتاتے ہو؟"

معمول :۔ "بڑھتی ہوئی آبادی کو کم کرنے کے لئے اس غیبی امداد کا ہر سال خیر مقدم کرنا چاہیئے۔"

عامل :۔ "کراچی کی سی، آئی، ڈی کے بارے میں جو انکشافات ہوئے ہیں، ان کے سلسلے میں کیا کارروائی ہونی چاہیئے؟"

معمول :۔ "مجرمین کو اس کوتاہی کی عبرتناک سزا ملنی چاہیئے کہ محکمہ کا سرکاری راز افشا کیوں ہونے دیا، نیز آئندہ سی آئی ڈی کے تمام افسروں کو تربیت کے لئے روس اور چین بھیجا جایا کرے۔"

عامل :۔ "پنج سالہ منصوبہ میں سب سے بڑی کوتاہی کیا ہے؟"

معمول :۔ "اس میں ناچ گانوں کے فروغ کا کوئی پروگرام نہیں دیا گیا۔"

عامل :۔ "کامیاب لیڈر کون ہوتا ہے؟"

معمول :۔ "جو پوری قوم کو ہپناٹزم کا شکار بنا سکے!"

عامل :۔ "دیکھو ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ ان بصیرت مندانہ جوابوں کے صلے میں تمہاری قدر افزائی کس طرح کی جائے؟"

معمول :۔ "۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (خاموشی) ۔۔۔۔۔۔۔۔"

مجمع نے کہا :۔

"اسے وزیر بنا دیا جائے!"

سوچ بچار

ایک تموج اور !

ادارہ

محمد علی گئے، سہروردی آ گئے !

پاکستان کی سیاست ایک نو عمر کمسن ننھی منی بچی ہے جس کی کھلونوں کی الماری میں ڈیڑھ دو درجن گڑیاں، گڈے رکھے ہیں۔ وہ ایک گڑیا کو اٹھاتی ہے، اس کو رنگا رنگ کپڑے پہناتی ہے، اسے کرسی پر بٹھاتی ہے، تالیاں بجاتی ہے، سہیلیوں کو بلا بلا کے دکھاتی ہے، پھر اچانک بد دل ہو کر اس کو پٹخ دیتی ہے۔ پھر کوئی دوسرا گڈا نکال لاتی ہے اور چند گھڑیاں دل بہلانے کے بعد اسے بھی اٹھا کر دور پھینک دیتی ہے۔ یہ ننھی منی سیاست خانم نو سال سے اسی طرح دل بہلا رہی ہے۔ نو سال سے بیڈری کے گڈے اور گڑیاں اسی طرح ایک ایک کر کے اسٹیج پر لائے جا رہے ہیں۔ ایک ہی جیسے گڈے اور گڑیاں!— ایک ہی جیسی شکلیں، ایک ہی جیسے لباس، ایک ہی سے رنگ ڈھنگ! گڈے اور گڑیاں جو ایک ہی طرح چیں چیں کرتے ہیں، ایک ہی طرح سے آنکھیں مٹکاتے ہیں، کل کے زور سے ایک ہی جیسے کرتب دکھاتے ہیں، بولتے ہیں مگر کچھ کر کے نہیں دیتے، پیکر مرعوب کن ہیں مگر ان میں جان نہیں، حرکتیں دلچسپ کرتے ہیں مگر کوئی بگڑی بنا نہیں سکتے!— کھلونے — رنگین اور دلچسپ کھلونے — مگر افسوس کہ محض کھلونے!

زیب دیتا ہے کہ زندگی کے سمندر میں کبھی کبھار طوفان اٹھتے رہیں، تاریخ میں تغیر کا مد و جزر ضرور ہونا چاہیے، کتابِ حوادث کے اوراق یکے بعد دیگرے لازماً پلٹے جانے چاہئیں۔ لیکن سمندر کی عالی ظرفی کا تقاضا یہ ہے کہ ہوا کا ہر جھونکا اس پہ کارفرمائی نہ کرنے لگے اور اس میں طوفان کے بعد ٹھہراؤ بھی آئے، تموج کے بعد سکون بھی ہو، مد و جزر کے بعد وہ سطح کو ہموار بھی کرتا رہے۔ تاریخ میں تغیر قابلِ خیر مقدم ہے، مگر ہر تغیر کے بعد کوئی دورِ ثبات بھی نمودار ہونا چاہیے۔ کتابِ حوادث کے اوراق الٹے ہی جانے چاہئیں، لیکن ہر ورق الٹنے کے بعد اتنا وقفہ ضرور ملنا چاہیئے کہ ایک قوم اپنی تقدیرِ نو کے مرقومات کو پڑھ سکے اور اپنے قلم سے بنانے کے نقوش بنا سکے۔ ہمارے ہاں بد قسمتی سے تموج ہی تموج ہے، سکون و ثبات اور ٹھہراؤ نام کو بھی نہیں!— تموج اور بے معنی تموج! تغیر اور لاحاصل تغیر! گردش اور ہنڈولے کی طرح فضول گردش!

نو سال میں ملک کے سب سے بڑے انتظامی منصب پر یکے بعد دیگرے چار شخصیتیں جلوہ گر ہو چکی ہیں۔ مرکزی وزارتِ عظمیٰ کے ایوان میں پانچواں مردِ سیاست مسند آرا ہوا ہے۔

چوہدری محمد علی گئے! چوہدری محمد علی ذاتی حیثیت سے برسرِ اقتدار گروہ میں کے بہترین فرد تھے۔ اپنا دور خوبی سے گزارا اور پہلی بار خود دارانہ اور جمہوری شان سے مسندِ اقتدار سے الگ ہو جانے کی مثال قائم کر کے رخصت ہوئے۔ قوم کو ان کے استعفیٰ دینے سے رنج ہوا، اطلاعِ عام

نے برسرِ اقتدار گروہ سے، ان کو ان کی جگہ پر قائم رکھنے کی اپیل کی اور جب مجبوراً انہوں نے اپنے منصب کو الوداع کہہ دی تو سارے ملک کی نگاہ میں ان کی عزت بڑھ گئی۔

لیکن کرنے کا کام چوہدری محمد علی نہ کر سکے، وقت اور حالات کے لحاظ سے ان کو جو موقع ملا تھا وہ ایک اہم تاریخی پارٹ اور ایک انقلابی حرکت کا تقاضا کرتا تھا، لیکن چوہدری محمد علی کا دور اس تقاضے کو پورا کرنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ بلاشبہ انہوں نے قوم کو نیا دستور — اور اسلامی رنگ کا دستور — دینے میں جو قائدانہ حصہ لیا ہے وہ بجائے خود ایک بڑا اور قابلِ یادگار تاریخی کام ہے، لیکن اتنا بڑا کام کر کے اس کا بھاری کریڈٹ لینے والی شخصیت کو آگے بھی بہت کچھ کرنا تھا، جسے وہ کر نہیں سکی۔

ہمیں چوہدری محمد علی کے وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر آتے وقت بھی یہی اندیشہ تھا کہ وہ اپنے ذمے عاید ہونے والے فرائض سے مشکل عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ چنانچہ ہم نے ستمبر ۵۵ءٔ میں جو افتتاحیہ "نئی وزارت" کے عنوان سے انہی صفحات میں درج کیا تھا اس میں اپنا اندیشہ عرض کر دیا تھا۔ چند سطریں یہاں دوہرائی جاتی ہیں:-

"— ہمارے نئے وزیرِ اعظم چوہدری محمد علی نے آج تک اپنی قابلیت کو دوسروں کے تحت استعمال کرتے ہوئے اور اقتدار کے پس منظر میں رہ کر وقت گزارا ہے (یہاں اس عبارت میں سہو کتابت کی ذرا سی تصحیح کر دی گئی ہے) اور اختیار کی باگ ڈور ہاتھ میں لے کر کام کرنے کا یہ پہلا موقع پیدا ہوا ہے۔ بنا بریں نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تجربہ کیسا رہے گا"

"— یہ امر واقعہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ چوہدری محمد علی جس مسلم لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کریں گے اس کے فسادِ نظام کے ہوتے ہوئے ایک شریف آدمی کی شرافت اول روز سے پیچیدگیوں سے دوچار ہو سکتی ہے اور وہ ذاتی طور پر بہترین عزائم رکھنے کے باوجود ناکام کر دینے والی رکاوٹوں کے سامنے بے بس ہو سکتی ہے۔"

بدقسمتی سے یہ دونوں باتیں درست ثابت ہوئیں۔ محمد علی ایک سیاسی مرد کار کی حیثیت سے بازی پوری ماہرانہ شان کے ساتھ نہ کھیل سکے۔ اور دستور دے کر قوم کی جو خدمت انہوں نے سرانجام دی تھی اس کا سرمایۂ اعتبار حاصل کرنے کے باوجود عوامی طاقت کے قریب ہو کر اس کو اپنی طرف پکار نہ سکے۔ علاوہ بریں جس سازشی ماحول میں انہوں نے ایک نازک ذمہ داری قبول کر لی اس ماحول میں سے اپنا راستہ نکالنے اور اس کی فاسد قوتوں کو شکست دینے کے لئے وہ پورا پورا مجاہدہ نہ کر سکے۔ دوسری طرف مسلم لیگ نے فی الواقع ان کے لئے ایسی مشکلات پیدا کیں کہ قدم آگے بڑھانا ممکن نہ رہا۔

اس موقع پر ہم ایک اہم اصولی حقیقت کی یاد تازہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مجموعی طور پر اگر صفِ اقتدار میں ناہمواری موجود ہو تو اس کے اندر کا اِکا دُکا بھلے مانس آدمی اچھے سے اچھے عزائم رکھنے کے باوجود کوئی اصلاحی و تعمیری کام نہیں کر سکتا — الا یہ کہ وہ رائے عام کی پوری طاقت کو اپنے ساتھ لے کر اقدام کرنے کی کوئی غیر معمولی تدبیر اختیار کیے۔ حالات کی وہ غلط رَو جو اقتدار کی مجموعی صف کے زیرِ کار ان چلائی جا رہی تھی اس میں چوہدری

محمد علی بالکل بے بس سے ہو کر ہاتھ پاؤں مارتے رہے، مگر ان کے لئے ممکن نہ ہوا کہ وہ قوم کے سامنے اپنا نقشۂ کار رکھ کر اسے جرأت مندی سے پکارتے اور پھر دھارے کے خلاف شناوری کرتے اور اس کا رخ موڑ دکھاتے۔ رخ موڑنا تو کجا وہ اپنی قیادت میں بننے والے دستور کی رمق کو نمایاں کرنے اور اس کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ تقاضے کے مطابق ہلکا سا کوئی تغیر پسندانہ اقدام کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس لئے یہی جب کمل ہو چکا تو انہوں نے ایک سعیٔ رائیگاں کو مزید جاری رکھنے سے ہاتھ اٹھا لیا۔

چوہدری محمد علی کی ناکامی میں ایک سبق یہ بھی مخفی ہے کہ انقلابی انداز سے اصلاحی و تعمیری اقدامات عملاً کر دکھانے کے لئے محض بصیرت و ذاتی شرافت کافی نہیں ہوتی بلکہ کسی شخص کو فعال اور متحرک کا، یہ دائرہ بنانے والی اصل طاقت اصول اور نظریے اور نصب العین کی طاقت ہوتی ہے۔ چودھری محمد علی اگر کسی تعمیری اصول اور کسی انقلابی نظریے اور کسی اجتماعی نصب العین کا نام ہوتا تو اس کی طاقت گرد و پیش کے فاسد عوامل کو پامال کر دیتی اور کوئی اس کے آڑے آنے کی جرأت نہ کرتا کیونکہ قوم اس کی پشت پر ہوتی۔ لیکن بدقسمتی سے چوہدری محمد علی کی قابلیت و بصیرت نظریے کی روح سے مالامال نہ تھی۔

پھر ایک اور سبق یہ ملتا ہے کہ ہمارا سیاسی ماحول اپنے باطن میں اتنا فاسد ہو چکا ہے کہ وہ چوہدری محمد علی کے معیار کی مذہبیت و شرافت کو اندر گوارا کرنے پر تیار نہیں ہے۔ ایک شخص جس نے برسوں ملک و قوم کی خاموش خدمت کی، کامیابی سے خدمت کی، بے مزد خدمت کی، جو کبھی فائدے و نفع اندوز ہو کر سامنے نہیں آیا، جس نے اسلامیت اور مشرقیت کی کچھ نہ کچھ اخلاقی قدریں اپنے ساتھ سنبھال رکھی تھیں اور جس کا دامنِ کار کردگی کے دھبوں سے پاک رہا ہے، موجودہ ایوانِ سیاست میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اندازہ کیجئے کہ ہمارا اوپر کا طبقہ کس قدر بگڑ چکا ہے اور کس آخری نقطۂ خطرناک تک جا پہنچے ہیں۔ یہاں وہ اس نقطہ تک جا چکے ہیں کہ چوہدری محمد علی کی تاریخِ شرافت پر یوں خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے کہ انہیں سیاست آتی ہی نہیں تھی۔ اس قول کا اگر ترجمہ صاف زبان میں کر دیا جائے تو اصل بات یہ کہی گئی ہے کہ چوہدری محمد علی سازباز اور جوڑ توڑ کا ہنر نہیں جانتے۔

بہرحال اب محمد علی جا چکے، اب تو دیکھئے کہ آگے کیا ہوتا ہے!

اور سہروردی آ گئے!

ہم نے مارچ ۵۶ء کے شمارے میں جو افتتاحیہ "دو ذہن آمنے سامنے" کے عنوان سے سپردِ قلم کیا تھا، ہو سکے تو اسے ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ اس افتتاحیے میں ہم نے چوہدری محمد علی اور سہروردی صاحب کی ایک ایک تقریر تقابلی مطالعہ کے لئے پیش کر کے عرض کیا تھا کہ دو تقریروں میں دو متقابل ذہن اور دو متصادم نظریے بول رہے ہیں۔ یہ دو اشخاص کے محض شخصی خیالات نہیں ہیں بلکہ قوم کے اجتماعی ذہن میں ٹکرانے والے رجحانات ہیں۔ اس افتتاحیے کا حرفِ آخر یہ تھا کہ:

"ان دونوں اجتماعی ذہنوں کو سامنے رکھ کر اور باریکی سے ان کا جائزہ لے کر پوری قوم اور اس کے سوچنے سمجھنے والے افراد کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کس کا ساتھ دیں، کس کے ہاتھ مضبوط

کریں، کس سے امیدیں وابستہ کریں ۔ دونوں میں سے کسی نہ کسی ایک کا زور توڑے بغیر ہم
ترقی و تعمیر کی راہ پر ایک انچ نہیں بڑھ سکتے ۔ اب آپ خود یہ رائے قائم کیجئے کہ دونوں میں سے
کسے ختم کیا جائے اور کسے پنپنے کا موقع دیا جائے ۔"

دراصل ہم نے قوم کے حساس اور ذی فہم عناصر کو بروقت ایک انتباہ دیا تھا کہ یہاں اسلامی و تعمیری نظریے کے لئے ایک ہموار شدہ راستہ ہے بلکہ یہ دور کش مکش کا دور ہے اور مخالف طاقت کیل کانٹے سے لیس ہو کر مورچے سنبھالے ہوئے ہے اور وہ کوئی معمولی سی طاقت نہیں بلکہ اس کے ہمارے دو صد سالہ دور غلامی کا پورا ترکہ ہے، اس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار اور معاشی خزائن ہیں اور بڑی بڑی عالمی طاقتیں اس کی ہیں ۔ اس انتباہ کا مقصد یہ تھا کہ قوم کی وہ ساری طاقت جو اسلام پسند ہے اپنے آپ کو بیدار، فعال اور متحرک کرے اور اپنی پوری حمایت رجحان کے پلڑے میں ڈال دے ۔ لیکن اس طاقت نے اپنا فرض پوری طرح ادا نہیں کیا اور اس کا نتیجہ اب اسے بھگتنا ہے ۔

ذاتی طور پر سہروردی صاحب سے ہمیں کوئی کد نہیں ہے ۔ شخصی لحاظ سے ہمارا اُن سے کوئی تصادم نہیں ہے ۔ بحث جو کچھ ہے وہ سہروردی کے خیالات اور ان کے سیاسی کردار سے ہے ۔

سہروردی کسی فلسفۂ زندگی کے علمبردار نہیں ہیں، سہروردی کوئی اجتماعی نصب العین نہیں رکھتے، سہروردی کوئی انقلابی و تعمیری پروگرام نہیں آئے ۔ بلکہ ان کی سیاسی شخصیت عبارت ہے حصولِ اقتدار کی جدوجہد سے! حصولِ وزارت کے لئے انہوں نے بڑی کوچہ گردیاں اور ردیاں کی ہیں ۔ وہ لیاقت علی خاں مرحوم کے وقت سے لے کر آج تک بام اقتدار پر بار بار کی ناکامیوں کے باوجود کمندآرزو ڈالتے ہے ہیں ۔ وہ انہدامِ دستوریہ کے ڈرامے کے ایک اہم کردار تھے ۔ انہوں نے ایک وقت پر قوم کو مارشل لاء کی دھمکی دی تھی ۔ انہوں نے دستور بنانے کے لئے دستوری کنونشن کے سازشی منصوبہ کی وکالت کی ہے، بلکہ اس نام نہاد عبوری دستور کا مسودہ تیار کرنے میں بھی لیا ہے ۔
نے دستوریۂ دوم کے بھرے اجلاس میں مخالفانہ تقریر کرتے ہوئے ذیل کے نکاتِ لطیف ارشاد فرمائے تھے :-

—— مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اسلام اصل ذریعۂ ربط نہیں ہے ۔

—— صدرِ ریاست کے مسلم ہونے کی شرط غیر ضروری اور عوام کی ذہانت کی توہین ہے ۔

—— پاکستان کو اسلامی ریاست کا نام نہ دیا جانا چاہئے ۔

—— مسودۂ دستور میں جب تک پاکستان کے اسلامی جمہوریہ ہونے اور اسلام سے مطابقت نہ رکھنے والے قوانین کو پاس نہ کرنے کی دفعات موجود ہیں، یہ دستور لازماً انتشار پیدا کرنے کا موجب ہوگا ۔

—— اسلام غلامی کے نظام کو تسلیم کرتا ہے ۔

—— آؤ ایسا کریں کہ پاکستان ایک ایسی ریاست نہ بنے جو اسلامی ہونے کی مدعی ہو کیوں کہ وہ درحقیقت یہ نہیں ہے ۔

—— حکران پارٹی ایسی ترقی دشمن طاقتوں کی حوصلہ افزائی نہ کرے جن کی ہمت اگر بندھائی گئی تو

وہ ملک میں ایک متوازی حکومت قائم کریں گی ——— ایک متوازی عدلیہ، ایک متوازی انتظامیہ
——— جس کے زیر سایہ لوگوں کو کوڑے لگائے جائیں گے، ان کے اعضا کٹیں گے اور وہ
پتھر مار مار کر ہلاک کر دیئے جائیں گے۔
ملک کو اسلامی ریاست کا نام دے کر آپ ہندوستان کے مسلمانوں کے مفادات کو سخت خطرے
میں ڈال رہے ہیں۔

یہ ہیں خیالات جن کا نام سہروردی ہے۔

پھر سہروردی ایک ایسی پارٹی کے سربراہ ہیں جس کا اب تک کوئی دستور اور منشور ملک کے سامنے نہیں آیا اور ان کی پارٹی نے اشتراک بھی اسی شان کی دوسری پارٹی سے کیا ہے۔ یہ نام نہاد پارٹیاں وہ ہیں کہ جن میں ہوٹلوں اور سراؤں کی طرح کسی اصولی مقصد کے بغیر بھانت بھانت کے مسافر آتے ہیں اور کچھ عرصہ ٹھہرتے ہیں اور پھر سامان اٹھا کر کسی اور طرف چل دیتے ہیں۔ اصول و نظریہ کے بغیر پارٹیوں کا بننا اور چلنا پاکستانی جمہوریت کی اولیں ایجاد ہے۔ ان پارٹیوں کے اتار چڑھاؤ عوامی دائرے میں نہیں بلکہ شیش محل کے اندر واقع ہوتے ہیں اور ہر اتار چڑھاؤ کے بعد عوام کے سامنے ایک نیا شگوفہ آجاتا ہے۔ سہروردی وزارت بھی اسی طرح کا ایک نیا شگوفہ ہے جسے انگلیاں دانتوں میں ڈالے تماشائی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس لحاظ سے دیکھیں تو سہروردی ایک عالم انتشار کے نمائندہ ہیں۔

کرسی سنبھالتے ہی جو افتتاحی بیان انہوں نے دیا ہے وہ سیاسی جادوگری کا ایک اچھا شاہکار ہے۔ اس میں ایک طرف بڑے فلسفیانہ انداز سے جمہوری تقاضوں کی تفسیر کی گئی ہے اور دوسری طرف ان تمام مسائل کی فہرست امید افزا انداز سے گنوا دی گئی ہے جن سے عوام کے کسی عنصر کو کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کسی مسئلے کا کوئی واضح حل اگرچہ نہیں بتایا گیا لیکن تاثر یہ دیا گیا ہے کہ بس اب انقلاب آجائے گا زندگی کی کایا پلٹ جائے گی۔ اصل میں خوش آئند اور خوشنما وعدوں کے ساتھ اسٹیج پر آنے کا اسلوب ہمارے ہاں اول روز سے چل رہا ہے۔ جو بھی آیا وہ لفظوں کی دنیا میں سبز باغ ساتھ لے کر آیا۔ لیکن ان سبز باغوں میں نہ عمل کے پھول کبھی کھلے، نہ نتائج کے پھل کبھی آئے۔ نو سال سے قوم ایک ایک باغبان کی تقریریں سنتی رہی اور جھولیاں پھیلائے کھڑی رہی مگر وہی بات کہ "مجھے پیٹ کا کوئی بھی پھل نہ ملا"! لیڈری کی کھیتی ہمیشہ اپھل رہی۔

سہروردی صاحب کہتے ہیں کہ ان کو کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ ہر کام کرنے والے کو موقع ملنا چاہئے اور کوئی وجہ نہیں کہ سہروردی صاحب کو یہ موقع نہ ملے ——— اور جو شخص کرسی سنبھال چکا ہو، یہاں ہے کون جو اس کے حاصل کردہ موقع کو چھین سکے۔ سیاست کا عالم بالا اگر راضی ہے تو قوم کی کیا مجال کہ وہ آڑے آئے۔ ہاں تو موقع ضرور ملنا چاہئے، لیکن جس قوم سے آپ موقع مانگتے ہیں وہ یہ دیکھنے کا حق بھی تو رکھتی ہے کہ آپ کے پاس کونسا فلسفۂ زندگی ہے اور آپ کا سیاسی کردار کس نوعیت کا ہے!

فلسفۂ زندگی کا پہلو دیکھیں تو آپ اپنے پیشروؤں اور اپنے معاصرین سے کوئی اصولی فرق نہیں رکھتے۔ بزم سیاست کے دوسرے ہم نشینوں کی طرح آپ مغربی فلسفۂ و تمدن پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہیں سے جمہوری تصور لیتے ہیں، وہیں سے اسالیب کار اخذ کرتے ہیں اور وہیں کے سانچوں میں آپ کی پوری شخصیت ڈھلی ہوئی ہے۔ اپنے بیان کے مطابق اسلام سے آپ کو محبت ضرور ہے مگر وہ بس اجتماعی زندگی سے باہر

باہر کی پھبتیاں ہیں ۔ اسلام کے اصولوں کو آپ اہمیت دیتے ہیں مگر آپ کے نزدیک وہ سب کچھ ان اصولوں کے مطابق ہے جو مغرب میں ہو رہا ہے اور جس کی نقل آپ اتار رہے ہیں ۔ یہ "آٹومیٹک اسلام" ہے ــــــــ یعنی مسلمان جو کچھ کرتا پھرے وہی اسلام ہے ۔ جب یہ آٹومیٹک اسلام کارفرما ہو تو پھر کیا ضرورت اس کا نام لینے کی، بلکہ اسلام کا نام لینا تو آپ کی نگاہ میں اس کا ایک ناجائز استعمال ہے ـــ ایک نا روا لنفع اندوزی !

سیاسی کردار کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اقتدار پر آنے سے قبل جو کچھ آپ کے خیالات تھے اور جو کچھ پارٹی کی پالیسی تھی، ایک آن میں اس کے اندر انقلاب آگیا ہے ۔ پہلے مغرب سے وابستگی پر اظہارِ احتجاج تھا، لیکن اب ہمارا مغرب کی دوستی سے استفادہ کرنے کو واجب مانا گیا ہے ۔ پہلے معاہدۂ بغداد پر تنقید کے نشتر چلتے تھے، اب تمام معاہدانہ روابط کے تحفظ کی پالیسی سامنے آگئی ہے ۔ پہلے مشرقی پاکستان کے مفاد کا نقارہ کئی سال سے پاکستان کے مجموعی مفاد کے خلاف لڑا جا رہا تھا، لیکن اب سارے پاکستان کا مشترک مفاد غالب آگیا ہے ۔ پہلے آپ اور آپ کے ہم خیال لوگوں کے تقاضے سے یہ روایت قائم ہوئی تھی کہ ملک کے دو بڑے عہدوں پر ایک وقت میں ایک ہی طرف کے دونوں افراد نہ لئے جائیں بلکہ ایک ادھر سے ہو ایک ادھر سے ! لیکن اب چونکہ دونوں عہدے آپ کے پاس چلے گئے ہیں، لہٰذا یہ کوئی قابلِ توجہ مسئلہ نہیں رہا ۔ پہلے انتخابات جلد از جلد کرانے کے مطالبے تھے مگر اقتدار کی باگ سنبھالتے ہی حقیقت پسندانہ شان سے اعلان کر دیا گیا ہے کہ یہ جلدی کا کام نہیں ہے ۔ پھر سیاسی کردار کے علو کی دلیل یہ ہے کہ وہ تمام عناصر جو پاکستان کے بنیادی نظریے اور اکثریتی فیصلے سے نافذ شدہ دستور کی اسلامی رُوح اور وحدتِ پاکستان کے ماننے ہوئے دشمن ہیں ـــ کمیونسٹ، کانگریسی اور انڈیا سے ساز باز رکھنے والے غیر مسلم ـــ ان کو عوامی لیگ میں جمع کر لیا گیا ہے اور انہی کی خاطر لفظِ مسلم کو پارٹی کے نام سے خارج کر دیا گیا ہے ۔ اس نظریہ و کردار کے ساتھ آپ کا دیا ہوا افتتاحی بیان لفظوں کا عظیم الشان قطب مینار کیوں نہ ہو، لوگ یہ حسنِ ظن کیسے قائم کر سکتے ہیں کہ ان لفظوں میں کوئی نیا معنی بھی ہو سکتے ہیں ۔ تاہم آپ کو موقع حاصل ہے ۔ ہم چاہتے ہیں کہ چند روز آپ کو کام کرنے کا موقع ملے تاکہ ایک بار سب کچھ پوری طرح قوم کے سامنے آجائے ۔ اگر آپ واقعی کچھ تعمیری و اصلاحی کام کر دکھائیں تو چشم ما روشن دل ما شاد ! نہ کر سکیں تو جو حشر اس سے پہلے کے بزرگوں کا ہو چکا ہے وہ از خود آپ کا بھی ہو کے رہے گا ۔ !

چند باتیں عوام سے !

سہروردی صاحب کو ایک فرد کی حیثیت سے نہ لیجئے کہ ایک فرد کے جانے کے بعد دوسرا فرد آگیا ۔ بلکہ دیکھئے کہ اس نئے موڑ کے بعد ہوا کا رخ کیا ہو گا ۔ چند باتیں بالکل سامنے ہیں :۔

ایک یہ کہ سہروردی صاحب کے گرد وہ تمام عناصر جمع ہو گئے ہیں اور ان کی کمان میں حرکت و اقدام کا دور شروع کر رہے ہیں جو اسلام، اسلامی قومیت، اسلامی دستور، اسلامی تصورِ ریاست اور پاکستان کے اساسی نظریے کے خلاف ہیں ۔ کانگریسی بھی، کمیونسٹ بھی، ایک خاص ذہن کے ہندو بھی اور اپنی ہوسِ جاہ پر پاکستان کے مجموعی مفاد کو بے دھڑک قربان کر دینے والے سیاست باز بھی !

"دوسرے یہ کہ اسلامی نظریۂ قومیت جس کی آبیاری شاہ ولی اللہ سے لے کر اقبال اور قائدِ اعظم تک ایک ایک مسلم مفکر قائد نے کی تھی اسے ملیامیٹ کر کے وطنی قومیت کا دور شروع کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہے ۔

تیسرے یہ کہ سہروردی صاحب جس طرح بنگالی ہندوؤں کے ممنونِ احسان چلے آرہے ہیں اس کی بنا پر اب وہ اکثریت کو اقلیت کی سواری بنانے پر مجبور ہوں گے۔

چوتھے یہ کہ اب بنگالی ہندوؤں کی خواہش کے مطابق اسلامی دستور کے تقاضے اور مسلم اکثریت کے رجحان کو پامال کرکے "مخلوط انتخاب" کا طریقہ رائج کرنے کے دیرینہ ارادے تازہ ہو چکے ہیں۔

پانچویں یہ کہ مخلوط انتخاب کا آزمائشی پیچ اگر سہروردی صاحب نے جیت لیا تو پھر وہ دستور پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے اگلے قدم اٹھائیں گے کیوں کہ دستور کی اسلامی دفعات کے خلاف ان کی جس تقریر کے اقتباسات ہم اوپر درج کر آئے ہیں وہ ابھی تک ملک کی فضاؤں میں گونج رہی ہے، نیز ان کے ایک اہم رفیق کار اور ان کی پارٹی کے ایک لیڈر حال ہی میں یہ نقارہ بجا چکے ہیں کہ دستور بدل دیا جائے گا۔

چھٹے یہ کہ اسی طرح کے شورش پسندانہ طریقِ سیاست کی اب حوصلہ افزائی ہوگی جیسا کہ مشرقی پاکستان میں رائج تھا۔

ساتویں یہ کہ پاکستان پر غیرت انگیز قسم کے مظالم ڈھانے اور اس کے خلاف ہر طرح کے جارحانہ اقدامات کرنے والے انڈیا کے لئے سہروردی صاحب کے جو تاریخی جذبات معلوم عام ہیں اور جن کی ہلکی سی پراسرار جھلک ان کے افتتاحی بیان میں آگئی ہے، ان کے زیرِ اثر ایک دن وہ انڈیا کے سامنے محبت و دوستی کی درخواست لے کے پہنچیں گے —— اور وہ دن زیادہ دور نہیں، بلکہ چھوٹتے ہی انہوں نے اُدھار پر غلہ منگا کر ...... "پاک ہند دورِ معاشقہ" کا غیر محسوس سا آغاز کر دیا ہے۔ ہماری پیشینگوئی یہ ہے کہ انڈیا فوراً یہ غلہ دے گا۔ ایک طرف تو ہندوستان بھر میں اس پر چرچا ہوگا کہ لو جی اب پاکستان دانے دانے کو ترسنے لگا ہے اور ہمارے سامنے جھولی پھیلا رہا ہے، دوسری طرف مشرقی پاکستان کے بھارت پسند ہندو پروپگنڈہ کریں گے کہ ہندوستان کتنا اچھا پڑوسی ہے جو بُرے وقت پر کام آیا اور سہروردی صاحب کتنے لائق لیڈر ہیں کہ انہوں نے غذائی مسئلہ حل کر دیا۔ "جس کا کھائیے اُس کے گن گائیے" کا اصول اپنا کام کرے گا اور محبت و دوستی کا روشن دور شروع ہو جائے گا۔ اس دور میں بعید نہیں کہ مسئلہ کشمیر ایک بھولی بسری کہانی بن جائے۔

آٹھویں یہ کہ اب بڑی جرأت مندی سے سہروردی صاحب نے انتخاباتِ عام کا معاملہ کھٹائی میں ڈال دیا ہے۔ چوہدری محمد علی کا ایک بہت بڑا قصور یہی تھا کہ وہ دیانت داری سے انتخابات کا فوری انعقاد چاہتے تھے اور کرسیوں کے بہت سے خداکاروں کو یہ پسند نہ تھا کہ ان کے حقوق پوری طرح محفوظ ہونے سے قبل انتخابات کا انعقاد عمل میں آئے۔ سہروردی کو ایسے بزرگانِ ملت نے بڑے شوق سے خوش آمدید کہا ہے۔ اب کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ انتخابات کب ہوں گے۔ ہاں —— سہروردی صاحب فرماتے ہیں کہ انتخابات آزادانہ ہوں گے۔ لاریب، لاریب! —— آزادانہ انتخاب کے لئے سب سے بڑی ضمانت اس ملک میں سہروردی صاحب کی شخصیت اور ان کی پارٹی کے کارناموں کا ریکارڈ ہی تو ہے!۔

نویں یہ کہ جمہوریت کی سرپرستی کے ادعا کے باوجود پچھلے تجربات کی بنا پر لوگوں کو یہ اندیشہ ہے کہ اب جمہوری خطوط پر سیاست کے ارتقاء کو سخت نقصان پہنچے گا۔

سہروردی وزارت کے اسٹیج پر آتے ہی یہ خدشات تمام ملک میں ابھر آئے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سہروردی صاحب اور ان کی مخلوط پارٹی کو اپنے خیالات اور اپنے عزائم کو بروئے کار لانے کا حق حاصل ہے، اگر جمہوریت اگر کوئی حقیقت ہے تو واحد جائز طریق کار یہ ہے کہ

اپنے ہر اقدام کے لئے سہروردی وزارت رائے عام کو مطمئن کرے اور قوم کا تعاون ساتھ لے۔ بدقسمتی سے سہروردی صاحب اپنے خیالات اور عزائم میں قوم کے اجتماعی رجحانات اور خواہشات سے برسرِ اختلاف ہیں۔

اندریں حالات عوام کو اگر اسلام اور مملکت کے مفاد کا تحفظ کرنا ہو تو ان کا کام یہ ہے کہ وہ منظم طور پر اپنے نظریات اور اپنی امنگوں اور اپنے مطالبوں کو سامنے لائیں۔ محض اندیشے کرنا محض اختلاف یا بیزاری کا جذبہ پالتے رہنا عالمِ سیاست میں ہرگز کوئی اثر نہیں رکھتا۔ ان کو اس شعور کے ساتھ اٹھ کھڑے ہونا چاہئے کہ ملک ان کا ہے، حکومت ان کی اپنی ہے، دستور کے فیصلے ان کے اپنے اجتماعی فیصلے ہیں، اسلام ان کا پسندیدہ نظامِ زندگی ہے اور وہی ملک و دین کے مفاد کے اصل محافظ ہیں۔ بدلتی ہوئی وزارتیں اور حکومتیں اور ان کے کارکن ان کے خادم اور ان کی مرضی کے پابند ہیں۔ قوم اگر ایک چیز نہ چاہتی ہو تو کوئی اس کے سر اسے تھوپ نہیں سکتا اور قوم ایک چیز کا اگر مطالبہ رکھتی ہو تو کوئی اسے اس کے حصول سے باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ شعور اگر متحرک ہو جائے تو کام کرنے کے لئے جمہوری راستے کھلے موجود ہیں۔ اس سے پہلے بھی بہت سے اکابر اور بہت سے جتھوں نے بڑے بڑے غلط اور خلاف عزائم باندھے ہیں اور اس سے پہلے بھی بعض عناصر کی طرف سے اضطراب انگیز خدشات پیش آتے رہے ہیں، لیکن محض رائے عام کی قوت نے ان کو بروئے کار نہیں آنے دیا۔ اسی طرح آج بھی جو اندیشے سامنے ہیں ان کا سدِباب بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال اب پوری قوم کو فکر کرنی چاہیے کہ ہماری ریاست گڑیوں کا کھیل کھیلنے والی نادان لونڈیا نہ بنی رہے، اب ہوش کے ناخن لے!

اس سلسلے میں خصوصیت سے اسلام پسند طاقتوں کو۔۔۔ چاہے ان کا تعلق جدید طبقے سے ہو یا قدیم صفوں سے، وہ سیاسی میدان میں ہوں یا مذہبی دائرے میں ۔۔۔ ہم اس نازک حالتِ کش مکش کی طرف دردمندی سے متوجہ کرتے ہیں جو فرنگیت زدہ عنصر نے پیدا کر رکھی ہے۔ آج یہ کشمکش زندگی کے ہر دائرے میں کارفرما ہے۔ اس حالتِ کش مکش میں جو طاقت بھی ایک لمحہ کے لئے غفلت اور جمود اور تساہل میں پڑ جائے گی، وہ بازی ہر جائے گی۔ ہر دم چوکنا اور متحرک اور فعال رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کش مکش میں چند باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہیں:۔

۱۔ اسلام پسند عناصر کو اپنا پورا پورا زور متحدہ طور پر ایک خطرناک ترین دشمن ۔۔۔ الحاد و فرنگیت ۔۔۔ کے خلاف میدان میں لا ڈالنا چاہئے۔ بہت سے محاذ بیک دم کھول لینا اور خصوصیت سے خود اپنی صفوں کے اندر چپقلش پیدا کرنا اور اسے بڑھانا پورے معرکہ میں شکست کھا لینے کا موجب ہوگا۔

۲۔ محض منفی کام ۔۔۔ کہ جب کبھی کوئی بات اسلام، اسلامی دستور یا پاکستان کے بنیادی نظریے کے خلاف سامنے آئے تو ایک ردِ عمل کے طور پر تردیدی حرکت شروع ہو جائے، ایک کامیاب طریقِ کار نہیں ہے۔ مثبت طور پر اپنے نظریہ حیات اور اپنے نظامِ زندگی کو لے کے آیئے اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اسے غالب کرنے کا علم بلند کیجئے اور پھر اس علم کو بلند رکھئے۔ عوام کے عملی مسائل کا اسلامی نقطۂ نظر سے حل پیش کیجئے اور اس حل کو مقبول بنایئے اور اس کے لئے عوامی تائید حاصل کر کے آگے بڑھیئے۔ صاف صاف کہئے کہ ہم ملک کو ایسے عناصر سے نجات

دلانا چاہتے ہیں جو اسلام کے اصولوں اور پاکستان کے مفاد اور عوام کے حقوق سب کو پامال کر کے عہدہ وجاہ اور دولت و حشمت کے حصول کے لئے مہرہ بازی کر رہے ہیں۔ ہاں صاف صاف کہیے کہ ہم غلط اصولوں کے ہاتھ سے زمامِ اقتدار چھین لینا چاہتے ہیں اور اسے اسلامی نظریۂ حیات کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔

۳۔ سیاست کے اصل عملی میدانِ کار سے باہر بیٹھ کر حالات پر تبصرہ کر دینے اور کام کرنے والوں کے غلط اقدامات پر احتجاج کر دینے سے کبھی وہ فرض ادا نہ ہو گا جو اسلام کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ تمام حساس اور ذمہ دار لوگوں کو عملی میدان میں اتر کر براہِ راست اس کھیل میں حصہ لینا چاہیے جس کی جیت ہار پر آٹھ کروڑ انسانوں کے بھلے برے کا دار و مدار ہے بلکہ جس کا اثر پورے جہانی مستقبل پر پڑنے والا ہے۔ اب مذہب و سیاست کی تفریق کے تصور کا کوئی پرتو باقی نہ رہنے دینا چاہیئے۔

اگر ان اشارات کے مطابق اسلام پسند طاقت متحد اور فعال اور متحرک ہو کر کام کرے تو یہاں کسی دوسرے نظریۂ حیات کسی ملحدانہ اور وطن پرستانہ طرزِ سیاست اور کسی مسند پرست قیادت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ باطل نظریات اور فاسد منصوبے لے کر اٹھے اور بے دھڑک قیادت کے بڑے سے بڑے منصب پر قابض ہو جائے۔ آپ اپنا فرض ادا کریں گے تو موجودہ دستور اپنے برگ و بار بھی لائے گا، اسے مختلف پہلوؤں سے مزید ترقی دی جا سکے گی اور آہستہ آہستہ کتاب و سنت کا دیا ہوا نظامِ خیر و برکت پروان چڑھنے لگے گا۔ ورنہ جتنا کچھ میدان اب تک جیتا گیا ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔

سہروردی ہوں یا کوئی اور ــــــ شخصیتوں کا سوال درکنار رکھتے ہوئے ــــــ اس وقت غیر اسلامی نظریہ و سیاست کے علمبردار حد درجہ کمزور حالت میں ہیں۔ کوئی ایک لیڈر اس ملک میں ایسا موجود نہیں ہے جس کے لئے محبت و احترام کا جذبہ قوم کے اندر پایا جاتا ہو اور جس سے کچھ امیدیں وابستہ کی جاتی ہوں۔ کوئی مستحکم پارٹی موجود نہیں ہے کہ جو تن تنہا اقتدار کی باگیں ہاتھ میں لے سکے۔ سارا کام گٹھ جوڑ پر چل رہا ہے۔ ایسے حالات میں اسلام کے نظریۂ حق اور اس کے تعمیری طرزِ سیاست کو لے کے چلنے کے لئے فضا بالکل سازگار ہے۔ کسی کے عزائم کچھ بھی ہوں اگر اسلام پسند طاقت سارے عام کو بیدار رکھے تو کوئی اپنے اندر اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ اپنے عزائم کو پورا کر کے جائے۔ تقریریں اور بیان اور نعرے اور دعوے جو کچھ بھی سامنے آ رہے ہیں یہ سب مختلف کھلاڑیوں کی بولیاں ہیں جن کو بول کر وہ شاخِ قیادت سے اڑ جانے والے ہیں "بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!"

البتہ اگر خود آپ ہی لوگ زندگی کا حق ادا نہ کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کریں تو پھر یہاں ایک چیونٹی اور ایک مچھر بھی اپنی خدائی کا ڈنکا بجا سکتا ہے۔

آخر میں سہروردی صاحب اور ان کے ساتھیوں سے ہم دردمندی کے ساتھ یہ گزارش کرتے ہیں کہ خدا نے آپ لوگوں کو ذمہ داری کے مقام پر لا کر بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ جو مہلتِ کار اس کی طرف سے آپ کے لئے مقدر ہے اس میں آپ کے لئے صحیح اور غلط دونوں راستوں پر گامزن ہونے کا موقع ہے۔ آپ چاہیں تو اسلام کے اصول و غایات کو سامنے رکھ کر اس ملک کی عظیم اکثریت کے اعتقاد و منشا کے مطابق پاکستان میں ایک پاکیزہ معاشرہ تعمیر کرنے میں حصہ لے سکتے ہیں اور عوامی مسائل کو حل کر کے اپنا اور پارٹی کا ایک مستقل مقام پیدا کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ نے وہ تمام اندیشے پورے کر دیئے جو آپ کے نظریات و مقاصد کے تحت عوام الناس کے لئے وجہ اضطراب ہیں تو آپ لوگ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو آگے جانے والوں کو پیش آ چکا ہے۔

ہماری خارجہ پالیسی

حالات کے نئے مدوجزر کے درمیان!

سلطنت کوئی نرم و گداز بستر نہیں ہے کہ جس پر ایک قوم لمبی تان کے سو رہے، یہ تو کانٹوں کی سیج ہے۔ آزادی کوئی پھولوں کا ہار نہیں ہے کہ جسے گلے میں ڈال کر اکابرِ ملت مسندوں پر جلوہ فرما ہو جائیں، یہ تو نشتروں کی مالا ہے۔ قیادت عشرت کا میخانہ نہیں فرض کی شہادت گاہ ہے۔ لیکن خدا جانے ہماری کیا شامت اعمال ہے کہ ہمارے رہنماؤں نے احساس ذمہ داری کا کوئی واضح ثبوت اب تک نہیں دیا۔ تمام کے تمام بڑے بڑے مسائل جوں کے توں پڑے ہیں، ساری گرہیں اسی طرح ناخنِ تدبیر کے انتظار میں ہیں، ایک ایک زخم اور ناسور مرہم کا آرزومند ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اونچے دماغوں میں سرے سے کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ جیسے سوچنے کے قویٰ ہی معطل ہیں۔

توڑا اگر محض فکر و تدبر ہی کا ہو تو اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ آدمی اپنی حماقتوں کو ہی معلمِ حکمت بنا لیتا ہے۔ وہ دشمن تک سے درس خرد لے سکتا ہے۔ لیکن یہاں یہ حال ہے کہ جن مسائل میں بے شمار مشورے اور باقاعدہ تدبیریں موجود ہیں اور جن گتھیوں کے حل قوم کے مختلف دماغوں کی طرف سے بار بار برسرِ عام پیش کئے جاتے رہے ہیں ان پر بھی کچھ نہیں ہو سکا۔ کوئی اقدام نہیں، کوئی ترقی نہیں، کوئی تبدیلی نہیں۔

بے شمار اہم اور حل طلب مسائل پر دوسرے سوچنے والوں کے ساتھ ساتھ ہم نے بھی دن رات کاوشیں کر کے ہر ضروری موقع پر اصلاحی تدابیر اور تعمیری اقدامات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہمیشہ ہم نے توقع یہ باندھی ہے کہ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اسے عالم بالا میں غور و خوض سے پڑھا جائے گا اور قابلِ عمل چیزوں کو اختیار کیا جائے گا مگر بدقسمتی سے ہمیشہ اور بار بار ہماری صدا، صدا بہ صحرا، بلکہ صدا بہ گورستان ثابت ہوئی شاید اکابر قوم دوسروں کے مشوروں سے استفادہ کرنے میں توہین محسوس کرتے ہیں۔ یوں تو چراغ راہ کا ایک ایک حرف خوردبینیں لگا کر پڑھا جاتا ہی ہوگا، لیکن وہ بالکل دوسرے مقصد سے ——— افسوس ہے کہ اخذ و اکتساب کے لئے کبھی نہیں!

ملک کے جرائد اور لٹریچر کو اپنی حکومتیں اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا کریں کہ کہاں کسی سیفٹی قانون کا چھرا گھونپنے کا موقع پیدا ہوتا ہے اور کہاں پریس ایکٹ کا ناوک سینہ دوز نازل ہو سکتا ہے اور کس لفظ کی بنیاد پر ضمانت طلب کی جا سکتی ہے۔ اپنی حکومتیں اصل توجہ اس طرف رکھتی ہیں کہ ملک کے عوامی دماغ پالیسی اور نظم کی کون سی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور مختلف مسائل میں کیا کیا تعمیری تدابیر سامنے لاتے ہیں۔ آخر چراغ راہ جیسے جرائد اپنے اداریوں میں محض شاعری تو نہیں کیا کرتے، گل بکاؤلی اور چہار درویش کی داستانیں تو نہیں لکھتے، کسی دوسری دنیا کے باشندوں سے تو مخاطب نہیں ہوتے، بلکہ بااصول مقصدی جرائد کے اداریے اور مقالات اہم دینی، معاشرتی، ادبی اور سیاسی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں اور ان مسائل کے حل کی راہ نکالنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں خطاب ایک طرف شہریوں سے ہوتا ہے دوسری طرف حکمران طاقت سے! شہری ملکی صحافت اور لٹریچر سے استفادہ کرتے ہیں مگر جو کوئی ایک بار حکومت کی مسند پر بیٹھ جاتا ہے

وہ پھر عقلِ کل بن کر ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جو علم و صحافت کسی مختلف نظریہ و اصول کو اپنی روح فکر بنائے، اسے غدار اور اہلِ منصب کی نگاہ میں مقامِ عتاب دیا جاتا ہے، سیاسی تعصب اجازت نہیں دیتا کہ ایسی چیزوں کو پڑھا جائے ـــــــ کجا کہ ان سے استفادہ کا قصد آپ کا گناہِ کبیرہ سرزد ہونے لگے۔

آج ہم ایک اہم ترین مسئلے کے سلسلہ میں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم نے کیا قابلِ عمل مشورے دئے تھے جن سے بے جا طور پر تغافل برتا گیا اور اس تغافل کا خمیازہ برابر بھگتا جا رہا ہے۔

حال ہی میں سویز کا بین الاقوامی مسئلہ چھڑنے پر ہمارے محکمۂ تعلقات خارجہ اور ہمارے سفارتی نظام کی نااہلیت ایک بار پھر پوری طرح طشت از بام ہوئی ہے۔ عجیب صورتِ حال یہ ہے کہ مسئلہ سویز میں پاکستان کا موقف اگرچہ حد درجہ معقول ہے اور بنیادی طور پر مصر و عرب کے مفاد سے متصادم نہیں۔ لیکن سارا عربستان پاکستان کے خلاف برافروختہ ہے۔ اس حقیقت کو سب سے پہلے مولانا مودودی نے سفرِ حج سے واپسی پر واضح کیا۔ اس کے بعد چٹان میں شائع شدہ ایک مراسلہ میں اس کی افسوسناک تصویر پیش کی گئی، پھر جماعت اسلامی کے چند ذمہ دار حضرات کے تاثرات تسنیم میں شائع ہوئے جو ان دنوں شام و عراق کی سیاحت کر رہے ہیں اور اب "الشہاب" کا اداریہ تسنیم میں آیا ہے جو اگرچہ عربوں کو پاکستان کے حق میں آمادۂ انصاف کرنے کے لئے لکھا گیا ہے لیکن اس میں بھی وہ غیظ و غضب پوری طرح جھلک رہا ہے جو پاکستان کے خلاف عربوں کے دلوں میں موجزن ہے۔ عربوں کا ردِ عمل پاکستان کے خلاف دو وجہ پر مبنی ہے۔ ایک معاہدۂ بغداد، دوسرے مسئلہ سویز۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ معاہدۂ بغداد اگر ضروری یا مفید تھا تو اس کو استوار کرتے ہوئے خوب اچھی طرح غور کر لیا جاتا کہ مسلم ممالک کے مفاد اور ان کی رائے عام کا رخ کیا ہے اور اس سلسلے میں پہلے سے گفت و شنید اور پبلسٹی کر کے فضا تیار کر لی جاتی، نیز اس معاہدہ کی استواری کے بعد اس کے ردِ عمل کا جائزہ لے کر اپنی پوزیشن عرب رائے عامہ کی نگاہوں میں درست کرنے کے لئے نشر و اشاعت اور رابطۂ ذہنی کے مختلف ذرائع متحرک کئے جاتے۔ اسی طرح مسئلہ سویز میں جو کچھ بھی موقف لیا گیا تھا اس کے سلسلے میں عرب لیڈروں اور عوام سے رابطہ پیدا کر کے، وفود بھیج کر اور پبلسٹی کا غیر معمولی اہتمام کر کے اپنے موقف کے لئے فضا ہموار کی جاتی۔ بصورت دیگر اس موقف میں ضروری حد تک تغیر پیدا کیا جا سکتا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں کہ آخر ہمارے سفارت خانے کیا کرتے رہے، لاکھوں روپے کا خرچ جو ان کے عملے اور انتظامات کی نذر ہو رہا ہے اس کا حاصل کیا ہے۔ ملک کا ایک ایک تعلیم یافتہ آدمی یہ حقیقت جانتا ہے کہ ہمارے سفارت خانے دعوتوں، ضیافتوں، کلچرل مظاہروں اور نمائشی تقریبوں کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔ وہ بصیرت اور رابطہ کے کام سے بغیر محض مسرفانہ ٹھاٹھ باٹھ کے مظاہروں سے بین الاقوامی ساکھ بنانے کی لایعنی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب تک مغربی ممالک میں پاکستان کو انڈیا کا ایک صوبہ شمار کیا جاتا ہے اور پڑھے لکھے لوگ بکثرت موجود ہیں جو پاکستان کے نام تک سے آشنا نہیں۔ کون ذمہ دار آدمی ہے جو سفارتی نظام کی اصلاح کے لئے

کو اگر ذہنی سانچے میں ڈھالنا ہو تو اس کے لئے بھی وہ منتخب، وزگار دماغ جمع کر سکتی ہے، مگر بچارا مسئلہ کشمیر ایک ایسا یتیم مسئلہ ہے کہ جس کے لئے نہ خرچ کیا جا سکتا ہے، نہ لکھنے والے مل سکتے ہیں اور نہ پبلسٹی کی مشینری بروئے عمل لائی جا سکتی ہے۔ زیادہ نہیں تو کیا اتنا ممکن نہ تھا کہ تین چار اہلِ قلم کو انگریزی اور عربی دو زبانوں میں لٹریچر کی تیاری پر لگا دیا جاتا۔ جن لوگوں کے تعلقات عالمِ عرب میں قائم ہیں ان کی خدمات حاصل کر کے ان کو میدان میں اتارا جاتا۔ مگر بس جمود ہے ــــ جمود ــــ جمود ــــ جمود!!

مسئلہ کشمیر پہ یہ مقالہ پیش کرنے کے بعد دوسرے ہی متصل شمارے میں ہم نے "مسلم بلاک" (Muslim Nation united) کے قیام کی دعوت دی اور اس کے لئے کام کرنے کا ایک خاکہ پیش کیا۔ اسی وقت لکھتے ہوئے اندازہ تھا کہ ایسے تعمیری اور پتہ ماری کے کام کرنے کی فرصت ہمارے سربراہ کاروں کو کب حاصل ہو گی اور ایسے بھاری بھرکم اداریے بھلا ان کی توجہ کیا جذب کریں گے۔ چنانچہ اداریے کا خاتمہ ان سطور پہ ہوا تھا :

"اس کا امکان تو بہت کم ہے کہ یہ سطور عالمِ اسلامی ــــ بلکہ خود پاکستان کے ذمہ داروں تک بھی پہنچیں اور ان کو متاثر کر سکیں اور فوری طور پر ایک احساس ان کے اندر پیدا ہو جائے......"

وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ خیر خواہی کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ لکھے ہوئے یہ اوراق بھی ہوا میں اڑ گئے۔ آج تک نہ کوئی اقدام اس سمت پہ ہوا ہے، نہ اس طرح کے عزائم کا اظہار کسی بزرگِ قوم کی طرف سے ہوا ہے۔ البتہ خود خدا کی کارسازی سے عالمِ اسلام کے اسلام پسند مردانِ کار کو توفیق ہوئی کہ انہوں نے "موتمر اسلامی" کے انعقاد کا اہم قدم اٹھایا اور یہ پوری طرح کامیاب رہا۔ لیکن خداوندانِ مغرب نے عالمی پریس میں اس کا "بلیک آؤٹ" کرا دیا۔ خود رہنمایانِ پاکستان نے بھی اس کو اہمیت دینے اور اس کی کارروائی کو نمایاں کرنے کی بجائے پیرِ مغرب کی کھینچی ہوئی لکیر کی فقیری ہی کی۔ ورنہ یہاں اگر کوئی بصیرت مندہ دینی قیادت برسرِ عمل ہوتی تو وہ اس موتمر کو اس سے زیادہ جذباتِ مسرت کے ساتھ فالِ نیک سمجھتی جس کا قابلِ تقلید مظاہرہ حکومتِ شام نے کیا ہے۔

بھارت کی مخالفِ پاکستان خارجہ پالیسی کی فاتحانہ یلغار کو روکنے کے لئے ہم نے جون ۵۶ء میں ایک اہم تجویز اداریہ صفحات میں پیش کی۔ اس کا عنوان تھا "تہذیب و انسانیت کے لئے خطرۂ عظیم" عنوان ہی سے واضح ہے کہ ہمارا مدعا کیا تھا۔

ہم نے یہ بتایا تھا کہ انڈیا ایک ایسا ملک ہے جو اپنے پڑوسی ملک کے خلاف بین الاقوامی قانون و اخلاق کے تقاضوں کو پامال کر کے بار بار دھاندلیاں کر رہا ہے۔ اس نے کشمیر پہ جابرانہ قبضہ کیا۔ اس نے استصواب رائے کا پیمان بزمِ عالم کے روبرو باندھ کر اسے توڑا، اس نے حیدرآباد کے خلاف پولیس ایکشن کیا، اس نے جوناگڑھ اور مناوادر پر دراز دستی کی، اس نے چڈبیٹ کے معاملے میں افسوسناک قسم کا جارحانہ اقدام کیا، اس نے بار بار پاکستان کی سرحدوں پہ شر انگیزیاں کیں۔ اس کی سرزمین پر مسلمان عورتوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلموں کے تصرف میں ہے اور ان کو اب تک نجات نہ دلائی جا سکی۔ اس کے حدودِ ریاست میں مسلمان شہریوں کے خلاف نت نئی

۱۔ بین الاقوامی رابطے اور پروپیگنڈے کا محاذ ــــــ

ــــــ فرانس، امریکہ اور انگلینڈ میں نشر و اشاعت کے مستقل مراکز قائم کئے جائیں اور ان مراکز سے مسئلہ کشمیر پر پورا پورا خبری مواد باقاعدگی سے دنیا بھر میں پھیلایا جائے۔ ان مراکز کے ذریعے ایسی لٹریچر علمی تصانیف شائع ہوں جن میں تاریخی، جغرافی، نسلی، لسانی، معاشی اور ساتھ ہی مذہبی بنیادوں پر کشمیر کا پاکستان سے فطری طور پر مربوط ہونا ثابت کیا گیا ہو۔

ــــــ کم از کم تین وفود بین الاقوامی فضا کو متاثر کرنے کے لئے روانہ کئے جائیں۔ ایک امریکہ، انگلستان اور یورپ کے لئے۔ دوسرا روس، چین اور دوسرے اشتراکی ممالک کے لئے ــــ تیسرا اسلامی ممالک کے لئے۔ ان وفود میں آزاد کشمیر اور کشمیری مہاجرین کے نمائندے، حکومت پاکستان کے ترجمان، سیاسی پارٹیوں کے نمایاں کارکن اور ممتاز صحافی شامل ہونے چاہئیں۔

۲۔ بین الاسلامی اتحاد کی مہم ــــــ

ــــــ اسلامی بلاک کی تشکیل کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا جائے اور مسئلہ فلسطین، مسئلہ کشمیر اور مسلم ممالک کے دوسرے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے اس کی مشینری کو متحرک کیا جائے۔

ــــــ مسئلہ کشمیر کو تقویت پہنچانے کے لئے فوری تدبیر اور اسلامی بلاک کی تشکیل کا راستہ نکالنے کے لئے ابتدائی اقدام کے طور پر "آل مسلم نیشنز کشمیر کانفرنس" کراچی میں طلب کی جائے (اسی سلسلے میں انتباہ دیا گیا تھا کہ عرب ممالک کے مفاد سے بے نیاز ہو کر خارجہ پالیسی کو چلانے اور معاہدات استوار کرتے چلے جانے کا طریق بدل دیا جائے)

۳۔ مقبوضہ کشمیر کی داخلی جدوجہد آزادی اور پاکستان ــــــ

ــــــ وہ فعال عنصر جو مقبوضہ کشمیر کے اندر مطالبۂ استصواب رائے کا محاذ چلا رہا ہے اس کے بارے میں سوچ سمجھ کر ایسی پالیسی معین کی جائے کہ اس کی قوت میں اضافہ ہو۔

ــــــ اس سلسلے میں ضروری قرار دیا گیا کہ آزاد کشمیر کے باشندوں اور کشمیری مہاجرین کے ساتھ بہتر طرز عمل اختیار کیا جائے تاکہ اس رویئے کا اثر مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کے حق میں رائے عامہ کو مضبوط کر سکے۔

۴۔ اندرون پاکستان جذبات کی آبیاری ــــــ

ــــــ باشندگان پاکستان میں حصول کشمیر کے جذبے کو بیدار رکھنے کے لئے لٹریچر اور تفریحی لٹریچر مسئلہ کشمیر کے متعلق شائع ہونا چاہئے۔

ــــــ آئندہ نسلوں کو عزم و ولولہ ودیعت کرنے کے لئے نصاب تعلیم میں ضروری مواد حل کر دیا جانا چاہئے۔

تنقیدی نگاہ سے دیکھئے کہ یہ ساری تدابیر مفید، معقول، قابل عمل بلکہ واجب العمل ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی اختیار نہ کی جا سکی حتیٰ کہ ترسیل وفود اور نشر و اشاعت کے مراکز کے قیام کا معمولی سا اقدام بھی نہ ہو سکا۔ عرب ممالک میں سرے سے کوئی قابل ذکر اور موثر سلسلہ نہ ہو سکی۔ پھر آخر فرشتے تو آ کر ہماری ذمہ داریوں کو پورا نہیں کریں گے۔

حکومت کو اگر جماعت اسلامی کے خلاف مہم چلانی ہو تو اس کے لئے وہ ذہین صحافیوں کو بھرتی کر سکتی ہے اور اسلام کے عائلی نظام

ملک میں بار بار نہ پہنچا ہوگا، مگر پہنچتا کچھ نہیں۔

عرب مسلمان آبادی پر مشتمل ہے، ہمارے عوام میں تمام اسلامی ممالک کے لئے بہترین جذباتِ محبت پائے جاتے ہیں لیکن ہمارے سفارتی نظام کی نااہلیت کا کرشمہ ہے کہ ہم عالمِ عرب میں اپنی کوئی جگہ نہ بنا سکے ——— باوجودیکہ ہم نے فلسطین، الجیریا، ٹیونس، الجزائر وغیرہ کے تمام مسائل میں عرب ممالک کی حمایت کی ہے اور شاید کسی ایک معاملے میں بھی (بجز معاہدۂ بغداد کے) ہمارا موقف مسلمان ملکوں کے نقطۂ نظر سے متصادم نہیں ہوا۔ دوسری طرف انڈیا ہے کہ جس نے یہودی ریاست کو تسلیم کر کے عربوں اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگائی لیکن وہ عربوں کا دوست اور محسن ہے۔ اسے کھلا موقع حاصل ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کر کے مسلمانوں کو باہم دگر آویزش میں مبتلا کرے اور فائدہ اٹھائے۔ کرنل ناصر عرب نیشنلزم کی آگ دہکانے کے لئے اپنی دھونکنی کو زور و شور سے حرکت دے رہے ہیں اور اس آگ کی آنچ پر انڈیا کی پاکستان دشمن پالیسی کی دال گل رہی ہے۔ اس کی کامیابی اب اس حد تک آپہنچی ہے کہ چٹان کے شائع کردہ مراسلے (جس کے مندرجات کی تصدیق اس گفتگو سے بھی ہوتی ہے جو کچھ پاکستانی باشندوں نے مولانا مودودی سے سفرِ حج کے دوران میں ایک موقع پر کی تھی) کے مطابق اب پاکستانیوں کی عام انسانی حرمت بلکہ معاشی اور جانی سلامتی تک خطرے میں پڑتی نظر آتی ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کے بعد تازہ ترین خبر یہ ہے کہ اب پاکستانی تاجروں کو سعودی حکومت نکال دینے کے درپے ہو گئی ہے (اس سلسلے میں ایک اخباری مراسلہ میں مراسلہ نگار نے پاکستانی سفیر کی عدم دلچسپی کی سخت شکایت کی ہے)، گویا عرب کے میدان میں انڈیا نے پاکستان کی پالیسی کو پوری طرح شکست دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے لئے عرب میں سرسری حد تک بھی ویسے جذبات موجود نہیں ہیں جیسے مسئلہ فلسطین کے سلسلے میں ہمارے یہاں پائے جاتے ہیں۔

اور ——— سب سے پہلے کشمیر ہی ایک ایسا مسئلہ تھا جس کی حقیقت کو عرب اور مسلم ممالک کے سامنے نمایاں کر کے ہم اپنے لئے ہمدردی اور انڈیا کے ظالمانہ رویے کے خلاف نفرت پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن کشمیر کے لئے نہ مغربی ممالک اور اشتراکی ریاستوں میں ہم کچھ کر سکے اور نہ قریبی تعلق رکھنے والے مسلم ممالک میں کرنے کا کام کسی ادنیٰ حد تک بھی ہو سکا۔ دنیائے عرب کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ مسئلۂ کشمیر کیا ہے[1]، اور انڈیا کی کونسی دھاندلی اور ڈوگرا راج کا کیسا استبداد اور لاکھوں مسلمانوں کی کتنی عبرت انگیز خانہ ویرانی اور پاکستان کے لئے کیسی دفاعی پیچیدگی اس مسئلہ کے زیرِ عنوان آتی ہے۔

ہم نے عین اس زمانے میں جبکہ محمد علی صاحب کی مدعو کردہ کشمیر کانفرنس منعقد ہو رہی تھی مسئلہ کشمیر پر ایک اہم اداریہ (نومبر ۵۵ء) لکھا تھا جس میں محض سرسری صحافیانہ انداز سے جذباتی باتیں نہیں کہی گئی تھیں بلکہ ایک عملی نقشۂ کار دیا گیا تھا اور ضروری تدابیر اور اقدامات گنوائے گئے تھے۔ ان کرنے کے کاموں میں یہ چیزیں بھی شامل تھیں:-

---

[1] جماعتِ اسلامی کے مذکورہ بالا وفد نے اپنے مراسلے میں لکھا ہے کہ مسئلہ کشمیر کی نوعیت سے عام طور پر لوگ بے خبر ہیں۔

ظالمانہ کارروائیاں ہوتی ہیں اور ان کی جان، مال، ناموس اور ایمان پر ڈاکے ڈالے جاتے ہیں اور ان کو دینی اور تہذیبی اور معاشی حیثیت سے ختم کرنے کے اقدامات ہو رہے ہیں۔ اس کے قانون کی نگاہوں کے سامنے پاکستان سے پرمٹ لے کر جانے والے شہری قتل ہوتے ہیں اس کا سفارتی نمائندہ مشرقی پاکستان میں بیٹھ کر کھلم کھلا سیاسی سازشیں کرتا ہے اور اب تو یہ کہ اس کے سیکولر دستور کے سایۂ عاطفت میں مسلمانوں کے ہادی اور عالمِ انسانی کے محسن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدزبانی کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں مسلمانوں کے احتجاج کرنے پر حکومت تشدد کا لٹھ لے کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے[1]۔ ساتھ ہی ساتھ متعصب ہندو جماعتیں اور اخبارات عوام کو بھڑکا کر ان کے خلاف میدان میں لے آتے ہیں۔ اور اب بعد از خرابیٔ بسیار کتاب کی ضبطی ہو جانے کے بعد مسلمانوں پر نئے دورِ ظلم کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ ان کی مسجدیں جلائی گئیں، ان کے اوپر حملے کئے گئے۔ ان کے خلاف پاکستان سے سازشی روابط رکھنے کا الزام لگا دیا گیا، ان کی گرفتاریاں عمل میں آ رہی ہیں۔ غرضیکہ ان کی مذہبی حس کو کچلنے کے لئے انسانیت کی ساری حدوں کو توڑ کر ہر کمینہ کارروائی عمل میں لائی جا رہی ہے اور یہ سلسلہ احوال پچھلے قریب برس سے روز افزوں رفتار کے ساتھ جاری ہے۔ ہم نے مشورہ دیا تھا کہ وحشت و بربریت کی ان ساری داستانوں کو انگریزی اور عربی میں مرتب کیا جائے اور انہیں دنیا بھر میں پھیلا دیا جائے۔ ایک بار اگر تقسیم کے خونیں ہنگامے سے لے کر انڈیا کی ساری وحشیانہ کارروائیوں کا ریکارڈ دنیا کے سامنے رکھ دیا جائے تو مغربی اور مسلمان ملکوں کی رائے عامہ پلٹا کھا جائے گی۔ لیکن اس مشورے کے مطابق بھی کچھ نہ ہوا۔ تعجب ہے کہ ہمارے لیڈر اور محکمۂ خارجہ کے کارپردازان اور سفارتی نظام کے دل و دماغ اس قدر سُن کیوں ہیں؟

عرب میں نیشنلزم کے دیرینہ جذبات جس تیزی سے مشتعل ہوتے جا رہے ہیں ان کے پیشِ نظر سخت اندیشہ ہے کہ آئندہ مسلمان ممالک کے درمیان اسلامی جذبۂ اخوت کا رشتہ ٹوٹ جائے گا اور ملی جذبات کو متحرک کر کے ایک دوسرے کے لئے کچھ نہ کیا جا سکے گا اسلامی وحدت و اخوت کی روح کے مر جانے اور وطنیت و قومیت کے غالب ہو جانے کے بعد سیکولرازم اور دنیا کی لادین طاقتوں خصوصاً کمیونزم کے لئے کام کرنے کا میدان مسلم ممالک میں پوری طرح کھل جائے گا۔ دنیا کی فاسد الحادی طاقتیں مسلمان حکومتوں کو باہم لڑا کر اس سے زیادہ کامیابی کے ساتھ لڑا سکیں گی جس کی عبرتناک مثالیں مغربی امپریلزم نے پیدا کی ہیں۔

اس نیشنلزم کی مہلک وبا کا سدِباب کرنے میں پاکستان بڑا اہم پارٹ ادا کر سکتا ہے اور اس کا بہترین تاریخی و نفسیاتی موقع اسے حاصل تھا۔ پاکستان میں صدیوں کی تاریخ زوال کے بالمقابل پہلی مرتبہ اسلام کو نظامِ حیات کی شکل میں جلوہ گر کرنے کے عزائم نے ایک اسلامی دستور کی صورت اختیار کی تھی۔ اس دستور کو پاس کرنے کے بعد ایک موقع پیدا ہوا تھا کہ تمام عالمِ اسلامی کے سیاسی و دینی سربراہ کاروں کو

---

[1] یہ واقعہ معمولی نوعیت کا واقعہ نہیں .... توہینِ رسالت کی ذلیل حرکت میں یو۔ پی کے گورنر صاحب تک کا حصہ ہے اور مسلمانوں کو ذہنی صدمہ پہنچانے کے بعد اب ان کی آزادی اور ان کے جان و مال پر ہاتھ صاف کیا جا رہا ہے۔ تنہا اسی واقعہ کی اشاعت اگر باقاعدگی سے عالمِ اسلام میں کی جائے تو انڈیا کی موجودہ پوزیشن متزلزل ہو کر رہ جائے۔ لیکن کچھ نہیں ہوتا۔

یومِ دستور پر مدعو کیا جاتا اور ان کو اس اہم اقدام سے متعارف کرایا جاتا۔ یہ نہیں تو کم سے کم مسلمان ممالک کے لئے خاص طور پر ایسا لٹریچر تیار کرایا جاتا جو ان کو پاکستان کے دستور کی آئیڈیالوجی، اس کے اسلامی و جمہوری پہلوؤں اور ان کے مضمرات اور اس کی مرکزی روح سے آشنا کرتا۔ پھر اس دستور کے تقاضوں کے مطابق تیز رفتاری سے اصلاحی و تعمیری اقدامات کئے جاتے اور ان اقدامات کا جہاں دیس دیس از خود چرچا ہونے لگتا، وہاں محکمۂ خارجہ اور سفارتی نظام کے ذریعے دنیا بھر کو آگاہ کیا جاتا کہ پاکستان اسلامی نظریہ سے کس طرح نئی زندگی اور نئی حرکت حاصل کر رہا ہے۔ اگر ہمارے ہاں کچھ ایسا کام ہوا ہوتا جس کے چرچے مسلمانانِ عالم کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے تو آج عرب ممالک کی رائے عام پوری محبت و عقیدت کے ساتھ ہماری طرف جھک چکی ہوتی۔ چین ایک نیا نظریہ و دستور اختیار کرتا ہے جس کے تحت عملاً تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں تو قدرتی طور پر اس کا چرچا بھی ہوتا ہے اور وہ خود بھی اپنے نئے دور کا تعارف کرانے کے لئے ساری تدبیریں عمل میں لا رہا ہے لیکن پاکستان کے اربابِ اقتدار نہ تو عملاً کوئی قابلِ ذکر کارنامہ اسلامی تقاضوں کے تحت سرانجام دے سکے اور نہ اتنی توفیق ہی ہوئی کہ دستور کے اسلامی پہلوؤں کا پورا پورا تعارف باہر کرا سکتے۔ جماعتِ اسلامی کے مذکورہ بالا وفد کے بیان کے مطابق صرف ایک قرار دادِ مقاصد عرب ممالک تک پہنچی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ دستور کے اسلامی پہلوؤں کا بلیک آؤٹ کرنا چاہتے ہیں اور ان کو دنیا کے سامنے بیان کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ احیائے اسلام کا بیڑا اٹھانے والے قائدینِ پاکستان کی ذمہ داری تو یہ تھی کہ وہ نظریۂ اسلامی کے لئے تمام دنیا میں — اور خصوصاً عالمِ اسلام میں — فضا ہموار کرتے۔ اس مقصد کے تحت ضروری تھا کہ وہ مسلم ممالک کی دینی شخصیتوں اور جماعتوں سے روابطِ اخوت استوار کرتے اور خود اندرونِ ملک کی اسلام پسند طاقتوں کو مسلم ممالک میں روابط بڑھانے اور خیالات پھیلانے کی سہولتیں مہیا کرتے۔ کیونکہ اقوامِ عرب کے اندر صرف دینی جماعتیں ہی ہیں جو نیشنلزم کے میکدے سے اپنے جام نہیں بھرتیں اور جن کی مدد سے نیشنلزم کی رکاوٹ کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔

یہ ساری باتیں ایسی ہیں جنہیں ہم نے متفرق طور پر بار بار کہا ہے — مگر رائگاں — بالکل رائگاں!!

اسلامیت کے شعور کی کمزوری اور قومیت کے طوفان کی تندی سے فائدہ اٹھا کر روس اور انڈیا دونوں عربی سیاست میں دخیل ہو گئے ہیں۔ سوئیز کے پانی سے ان کی ڈپلومیسی خوب اچھی طرح سیراب ہو گئی ہے، مغربی بلاک کی گرفت جہاں جہاں کمزور پڑ رہی ہے، ایشیائی بلاک اس کے خالی ہونے والے مورچوں کی طرف ہوشیاری سے بڑھ رہا ہے۔ روس اور انڈیا دونوں ہی پاکستان کے حق میں اچھے عزائم نہیں رکھتے۔ اب عرب ممالک میں ان کو جو نفوذ حاصل ہوا ہے اس کے ذریعے یہ پاکستان کے خلاف عربستان کو بھڑکا کر پاکستان پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں۔ باہر سے یہ دباؤ پڑ رہا ہے اور اندرونِ ملک یہ حال ہے کہ کمیونسٹ کارکن جن جن تنظیموں میں گھسے پڑے ہیں وہ ہنگامہ آرائی کی تمام تدابیر سے کام لے کر پاکستان کی خارجہ پالیسی کا رخ اس حد تک موڑ دینا چاہتی ہیں کہ پاکستان، روس اور انڈیا کے ایشیائی امپریلیزم کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔ یہ پیچیدہ اور خطرناک صورتِ حالات نتیجہ ہے اس نااہلیت کا جو ہمارے محکمۂ خارجہ اور سفارتی نظام — بلکہ کہنا چاہئے کہ مجموعی طور پر کارپرداز طاقت — نے نو برس میں دکھائی ہے۔

اب یہ سارا تعمیری تبصرہ پیش کرنے کے بعد سفارتی نظام کے بارے میں ہم صاف صاف لفظوں میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس کو بالکل

انقلابی اسپرٹ کے ساتھ تبدیل کر ڈالا جائے۔ ایسا ارادہ ہو تو ذیل کے اشارات قابلِ غور ہو سکتے ہیں:

—— سفارتی مناصب کے بارے میں قطعی طور پر طے کیا جائے کہ یہ سیاسی رشوت کے طور پر نہ دیا جایا کریں گے اور نہ ان پر ایسے لوگوں کو مامور کیا جائے گا جن کو سیاسی میدانِ کشمکش سے باہر نکالنا مطلوب ہو۔ چاہئے کہ آئندہ تعلیم و تجربہ کے لحاظ سے درجۂ اول کی صلاحیتیں رکھنے والے مردانِ کار ہی کو ان خدمات کے لئے مامور کیا جائے۔

—— دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کا معمول یہ ہے کہ وہ مختلف ممالک اور اقوام کے اندر کام کے لئے خاص اہتمام سے افراد تیار کرتی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ان کے نظامِ سیاست، و تمدن کے متعلق علمی و تحقیقی شعبے قائم کئے جاتے ہیں، ان کے بارے میں ماہرین کے ذریعے لٹریچر تیار کرایا جاتا ہے۔ پھر اعلیٰ تعلیم سے آراستہ نوجوانوں کو خارجہ پالیسی اور سفارتی امور کے ماہرین کی نگرانی میں خاص تربیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس وقت امریکہ کی یونیورسٹیوں میں مشرقِ وسطیٰ اور دوسرے مسلمان اور ایشیائی ملکوں کے بارے میں مستقل شعبہ ہائے تحقیق موجود ہیں۔ تازہ بہ تازہ لٹریچر برابر چلا آرہا ہے اور امریکہ کے نام نہاد "ماہرین"، طلبہ، سیاح، وفود اور عیسائی مبلغین سب کے سب معلوماتی مواد بہم کرنے میں مصروف ہیں۔ کام کا اتنا پھیلا ہوا دائرہ ہے جس کے آغوشِ تربیت میں محکمۂ خارجہ اور سفارتی نظام کے کارکن بھی تیار ہوتے ہیں اور سربراہ کار طاقت کو ذہنی مدد دینے والے مشیر بھی!

ہمارے ہاں اس کے مقابلے میں سواں حصہ بھی کام نہیں ہو رہا۔ نتیجہ یہ کہ نااہل ترین افراد کو —— محض سوشل روابط بڑھانے کی معمولی سی صلاحیت یا کھوٹی سی شہرت کی بنا پر —— سفارتی ذمہ داریاں سونپ دی جاتی ہیں۔ پھر نتیجہ یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کو یو۔این۔او میں پھیلانے والے وفد کی قیادت کے لئے ایک موزوں آدمی ملنا مشکل ہو رہا ہے۔ اب منصوبہ بندی کے ساتھ جملہ اقوامِ عالم اور خصوصاً اسلامی ممالک کے بارے میں تحقیقی شعبے کھولے جائیں۔ پی۔ایچ۔ڈی کے مقالات لکھوائے جائیں، مختلف ذرائع سے تازہ اور مکمل معلومات بہم پہنچائی جائیں اور ٹھوس لٹریچر فراہم کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ محکمۂ خارجہ منتخب نوجوانوں کو سفارتی ذمہ داریوں کی ادائی کے لئے ایک موزوں تربیتی نظام سے گذارنے کا انتظام کرے۔ محکمہ حکمران طاقت کی مدد کے لئے ایسے مشیر پیدا کرے جو تعلقاتِ خارجہ کے معاملات میں خصوصی مہارت رکھتے ہوں۔

—— سفارت خانوں کا اصل کام یہ ہے کہ وہ جن ملکوں میں کام کریں ان کی سرکاری پالیسی اور رائے عام کا تفصیلی شعور حاصل کریں اور اس سے اپنی حکومت کو آگاہ رکھیں۔ دوسری طرف وہ مقابلے میں اپنی پالیسی کو بیرونی حکومتوں اور رائے عام کے سامنے نہ صرف خوش اسلوبی سے واضح کریں بلکہ اس کے لئے پوری پوری ہمدردی و حمایت حاصل کریں۔ اس مرکزی فرض کو ادا کرنے میں جو افراد نااہل ثابت ہوں ان کو فوراً الگ کر دیا جائے اور جس سفارت خانے کے لئے ایسے آدمی نہ ملیں، بہتر ہے کہ مناسب آدمیوں کی فراہمی تک اسے بند کر دیا جائے۔

—— سفارت خانوں پر کڑی نگرانی رکھی جائے اور تفصیلی ہدایات دی جاتی رہیں۔ اس کے لئے محکمۂ خارجہ کے پاس نہایت زیرک، فعال اور مضبوط مشینری ہونی چاہئے۔

ب —— سفارت خانوں کو اس امر سے سختی کے ساتھ روکا جائے کہ وہ مسرفانہ اور عیاشانہ تقاریب اور مظاہروں سے دھاک جمانے کی بیہودہ کوشش کو جاری رکھیں۔ سدِّباب کیا جائے کہ ہماری جمہوریہ اسلامیہ کے سفارت خانوں میں شراب کے دور چلیں، شیطانی آرٹ

اور کلچر کی نمائش کی جائے اور بہ حیثیت مجموعی غیر اسلامی فکر و کردار کا مظاہرہ کیا جائے۔ اسلام سے آزاد اور اغیار کی غلامی میں مبتلا ذہنوں کو سفارتی ذمہ داریوں کا اہل ہرگز نہ قرار دیا جائے۔ صرف وہ لوگ لئے جائیں جو دنیا کے سامنے اپنا یہ مقام واضح کر سکیں کہ ہم ایک جداگانہ نظامِ امن و عدل لے کے اٹھے ہیں اور ہم ایک نئی دنیا کے معمار ہیں۔

——— عالمِ اسلامی کے بارے میں خاص اہتمام کیا جائے کہ ان میں سفارتی ذمہ داریاں وہی لوگ سرانجام دیں جو اسلامی نظامِ حیات اور ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کا ماہرانہ مطالعہ رکھتے ہوں، جو متعلقہ مسلم قوم کے فکری، تہذیبی اور سیاسی ارتقاء سے واقف ہوں۔ نیز عربی ممالک میں کام کرنے کے لئے عربی زبان کا بلند ترین ادبی سطح تک مطالعہ ہونا چاہیئے۔ اسی سلسلے میں ایک ناگزیر عملِ تطہیر یہ کرنا ہوگا کہ قادیانی عنصر کے تسلط سے محکمہ خارجہ کو پاک کیا جائے۔ کیونکہ بروئے نظریہ و اعتقاد یہ عنصر ایک طرف امریکہ و برطانیہ کا غلبہ پسند کرتا ہے، دوسری طرف مرزا صاحب کی پیشین گوئیوں کی تکمیل کے لئے اور قادیان کے مرکز کے تحفظ کے لئے کشمیر کے مسئلے میں ایک سازشی پارٹ ادا کر رہا ہے، تیسری طرف مسلمان قوموں کو اعتقادی عناد کی بنا پر باہم دگر پھاڑنا اور ٹکرانا چاہتا ہے۔ اس عنصر کو فوراً نہیں تو دھیرے دھیرے حکیمانہ پالیسی سے نکالا جا سکتا ہے اور نئے افراد کو لیتے ہوئے احتیاط برتی جا سکتی ہے۔

——— سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر خارجہ پالیسی کو منضبط بنایا جائے، اسے دھڑوں اور بلاکوں کے مفاد سے آزاد رکھا جائے، اسے اصولی خطوط پر مثبت طور سے استوار کیا جائے، اپنے مقاصد واضح طور پر متعین کئے جائیں اور پھر خارجہ پالیسی کو رائے عام کی تائید کے ساتھ آگے چلایا جائے۔ علاوہ بریں خارجہ پالیسی اسی ریاست کی کامیاب ہوتی ہے جس کی قیادت داخلی طور پر کوئی بڑا تعمیری کام ریاست کے نظریے اور دستور کی روح اور اس کے تقاضوں کے مطابق کر کے دکھائے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کرنے کی اتنی چیزیں سامنے ہیں لیکن آخر کچھ ہوتا کیوں نہیں؟

بقیہ: عذرا

پہنچائی گئیں کہ جن کو دوبارہ دماغ میں لانے سے بھی جسم و جان پر ہیبت طاری ہوتی ہے، کئی کئی دن بھوکے رہنے، ہیئت بدل گئی، اس دوزخ میں زندگی کی سنگین گھڑیاں گزارتے ہوئے قدرت نے ہمارا ساتھ دیا، اتحادیوں نے برلن پر قبضہ کیا ——— ہم آزاد ہوئے، آپ کو نمبر ۱۵ جنرل ہسپتال قاہرہ کی معرفت خطوط لکھے مگر جواب ندارد۔ قید کے دوران میں چند مخصوص قیدیوں کی خط و کتابت ممنوع قرار دی گئی تھی جن میں ایک میں بھی تھا۔ لہٰذا میں معذور تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میرا نام زندگی کی فہرست سے خارج ہو چکا ہے۔"

جمیل بھر یہ کیا لکھوں ——— صرف یہ یاد دلاتی ہوں کہ اپنے والد کی وصیت اور مرحوم کے عطا کردہ صحیفے کے احکام کی خلاف ورزی نہ کیجیے۔ خدا حافظ۔

"عذرا"

صبحِ کائنات

فروغ احمد

۱

شجر خموش کھڑے ہیں، ستارے ساکت ہیں
زمین سوئی ہوئی ہے، فضا اُداس اُداس
یہ چاندنی کا فسوں ہے کہ کائنات ہے خواب
مگر وہ سایہ سا کیسا ہے اس چٹان کے پاس!

۲

یہ دھیمی دھیمی سی لے آ رہی ہے کانوں میں!
فغانِ شب سے جگاؤں گا کائنات کو میں!
میں چاندنی کے طلسمِ گراں کو توڑ دوں گا
پیامِ صبح سناؤں گا اپنی رات کو میں

۳

ہے ارتعاش پہ موقوف سوز و سازِ وجود
نوائے زیست سے لبریز ہے فضائے بسیط
ہے نغمہ بار ابھی تارِ بربطِ ناہید،
اک ارتعاش کا ہے منتظر خلائے بسیط

۴

شجر خموش کھڑے ہیں، ستارے ساکت ہیں
یہ دھیمی دھیمی سی لے آ رہی ہے کانوں میں
میں اس جمود کو توڑوں گا، چشمے پھوٹیں گے
چھپے ہیں چشموں کے سوتے انہی چٹانوں میں

۵

ہے کائناتی شعاعوں کا سیلِ بے پایاں
میں سالمات کو تاب و تبِ شرر دوں گا
میں تابکار کروں گا ہر ایک ذرّے کو
میں کائنات کو نورِ سحر سے بھر دوں گا

۶

یہ دھیمی دھیمی سی لے آ رہی ہے کانوں میں
زمین جاگے گی، پھر آدمی اٹھے گا ضرور!
طلسمِ عہدِ رواں کو وہ اٹھ کے توڑے گا
طلوعِ مہر سے بھول گے ستارے سب کا نور

۷

سحر ہوئی، رُخِ خاور ہوا ہے نورانی
شجر کی ڈالیاں جھومیں، چٹک چلیں کلیاں
ہوا نے بادۂ کیف و نشاط برسایا
سحر یہ کیسی ہے! کیف و سرور کا ہے سماں

۸

وہ آبشار کے پاس اک جواں ہے نغمہ سرا
سحر ہے یہ تو طلسمِ سحر بھی توڑوں گا
اگر اُتر نہ سکا نیند کا خمار ابھی
تو کائنات کو پوری طرح جھنجوڑوں گا

۹

ابھی تو رات سے بڑھ کر یہ صبحِ کاذب ہے
زمین سوئی ہوئی ہے، فضا اداس اداس
یہ چاندنی کا فسوں کا ہے کہ کائنات ہے خواب
وہاں وہ سایہ سا کیسا ہے اس منار کے پاس!

۱۰

یہ دھیمی دھیمی ندا آ رہی ہے کانوں میں
بتانِ عصر کے اب آستانے چھوڑ بھی دو
بس اک پیامی کو مانو خدا کو پہچانو!
اٹھو سلاسل و طوقِ گراں کو توڑ بھی دو!

۱۱

اذانِ صبح سے کھلتا ہے چاندنی کا فریب
گمانِ صبح یقینِ سحر سے بدلا ہے۔
کہاں وہ رات ہے! لو قافلے نکلتے ہیں
وفورِ گریۂ شب اب اثر سے بدلا ہے

۱۲

وہ اُبلا سینۂ گیتی سے نور کا چشمہ
اُلٹ گئی ہے یکایک یہ گردشِ ایام
ستارے کانپ رہے ہیں، سحر کی آمد ہے
لرز رہا ہے شبستانِ کائنات تمام

۱۳

وہ دھیمی دھیمی سی لے آ رہی ہے کانوں میں
وہ آدمی، وہ مشیّت کا شاہکار اٹھا
زمین جاگی ہے، قسمت زمیں کی جاگی ہے
وہ دیکھو مرکبِ دوراں کا شہسوار اٹھا
یہ دھیمی دھیمی سی لے آ رہی ہے کانوں میں

عذرا

چوہدری محمد نواز وامق

یہ افسانہ جو تاریخ بیانی اور واقعہ نگاری کی ایک متروک شدہ تکنیک پر لکھا گیا ہے اور بلحاظ زبان بھی وقت سے کچھ پیچھے رہ گیا ہے، ارباب فن کی نگاہوں میں کوئی بڑا مقام حاصل کرے یا نہ کر سکے ۔۔ کوئی شک نہیں کہ یہ ہمیں زندگی کے ایک خاص دور اور خاص دائرے میں حقیقت کے بہت قریب لے جاتا ہے۔ اس کے آئینے میں وہ سارے خطرات اپنے بھیانک چہروں کے ساتھ منعکس ہیں جو مردانہ کاموں، بیرون خانہ کی سرگرمیوں اور مخلوط معاشرے کے فتنوں میں خواتین کے گھر جانے سے نمودار ہوتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان خطرات کے بھیانک چہرے بیٹیوں کے باپ، بہنوں کے بھائی اور بیویوں کے شوہر ذرا غور سے دیکھیں۔ اخلاقی مقصدیت کے لحاظ سے دیکھیں تو اس میں عذرا کا کردار جو اسلامی تصور و قاعدہ مشرقی نظریہ عصمت سے تشکیل پاتا ہے، فاسد ماحول کے ساتھ کئی پہلوؤں سے غیر شعوری طور پر سازگاری پیدا کر لینے کے باوجود مغربی تہذیب کا شکار بن جانے سے بڑی مضبوطی کے ساتھ ابا کرتا ہے۔ مگر یہ کردار عالم واقعہ میں اتنا کم یاب ہو چکا ہے کہ کہانی میں بھی کچھ انوکھا انوکھا لگتا ہے۔ لیکن ہمیں ضرورت اسی کردار کی ہے جو گناہ کے بلاوے کو مسترد کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔

(ادارہ)

رات کی تاریکی میں ہمارا جہاز لنگر انداز ہوا۔ باہم چہ مے گوئیاں ہو رہی تھیں مگر کسی کو صحیح طور پر معلوم نہ تھا کہ اس مقام کا نام کیا ہے۔ ہمیں جہاز سے اترنے کا حکم ملا۔ اب تک کسی کو منزل مقصود کی خبر نہ تھی۔ دو گھنٹے کے بعد ہمیں ٹرین میں بٹھایا گیا۔ رات کے بارہ بجے کے قریب گاڑی ایک ریگ زار میں رکی۔ وہاں کسی نے یہ آواز بلند کی کہ ہم مصر میں ہیں۔ ایک موٹر سائیکل سوار کی راہنمائی میں ہمیں پیدل مارچ کرنے کا حکم ملا۔ تقریباً بیس میل چلنے کے بعد ایک کیمپ میں پہنچے جہاں خورد و نوش کا معقول انتظام کیا گیا تھا مگر کھانا پینا کیسا یہ تو تھا مارے تکان کے اب ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے، بارے گرتے پڑتے لنگر پر پہنچے، ماحضر تناول کیا۔ قیام گاہ میں پہنچے، نیند نے ایسا غلبہ پایا کہ رات کو کوئی سائبان تک اڑا کر لے گیا اور ہم بیچارے سونے والوں کو بالکل خبر نہ ہوئی۔ صبح سائبان کی تلاش میں نکلے ہی تھے کہ مصری پولیس مین کو دیکھا جو ایک فلاح کو گرفتار کئے سائبان اس کے سر پر رکھائے چلا آ رہا تھا۔ ہم نے پولیس مین کا شکریہ ادا کیا۔

دوسرے دن I.M.N.S. (انڈین میڈیکل نرسنگ سروس) سٹاف کی آمد تھی۔ کرنل چندا اور میجر بین ان کے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے۔ قاہرہ کے تاریخی قلعہ میں جس کے چاہ عمیق میں یوسف کنعاں کو قید کیا گیا تھا نرسوں کو پہنچایا گیا۔ تیسرے دن ہمیں بھی اسی قلعہ میں دارالشفا کھولنے کا حکم مل گیا۔ آفیسرز میس میں یکے بعد دیگرے نرسوں سے ملاقات ہوئی۔ اکثر اینگلو انڈین تھیں اور چند یورپین

ہیں۔ ان میں سے ایک خاموش طبع لڑکی کرنے والی میز پر بیٹھی عالمِ تفکرات میں مستغرق بڑے تساہل سے کھانے کے لئے ہاتھ مار رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک میں اس کی ہر حرکت کو بنظرِ تعمق دیکھتا رہا۔ ہرچند اس کے پاس جاکر دریافت کرنے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔

اتفاقاتِ زمانہ دیکھئے کہ اسی خاموش طبع خاتون کو میرے ساتھ اپریشن تھیٹر میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ نرسنگ سپاہی حکمت خان مجھے آہستہ سے آکر بتایا "لیفٹیننٹ صاحب! یہ سسٹر مسلمان ہے۔" میں نے کہا یہ ناممکن ہے۔

"مجھے سسٹر میس کے بیروں نے بتایا ہے"

"لیفٹیننٹ جمیل" ناگاہ کسی نسوانی آواز نے پکارا "کیپٹن ایم (کوارٹر ماسٹر) نے یہ چادر پھٹی ہوئی بھیج دی ہے۔ حکمت کو کہو تبدیل کر دے ———" "ہاں کیا جلدی ہے ——— آپ کا اسمِ گرامی؟"

"عذرا" ——— گو حکمت کے بیان کی قدرے تائید ہوگئی تاہم مجھے یقین نہ آیا۔

"آپ کے آفیسرز سب بھیڑیئے ہیں" بے تکلفی کا دروازہ کھلتے ہی اس مسلمان نرس نے اپنا دلی اضطراب نمایاں کر دیا۔ "آفیسرز میس میں ہمیں مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی میجر سین نے ڈانس کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ بھلا میں کیا جانوں ڈانس کیا ہوتا ہے ——— ٹھکرا دیا۔ مگر اسی جبار قدوں نے میری عزتِ نفس کو بار بار لہولہان کیا ہے"

عذرا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ——— میں نے تسکین دی۔

عذرا میرے ساتھ کام کرتی رہی وہ مغموم نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اسے اس زندگی سے دلچسپی نہ تھی تاہم اپنے کام میں ہمہ تن محو رہتی۔

کرنل چندرا سے کرنل شیر جنگ نے چارج لیا۔ حالات قدرے سدھرتے نظر آئے۔ کرنل شیر جنگ بحیثیت مسلمان ہونے کے مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان تھے۔ گاہے بگاہے ان سے ہفتہ وار معائنہ پر تبادلۂ خیالات کے مواقع ملتے رہتے۔

نرسنگ سسٹروں کی قیام گاہیں ہمارے نزدیک ہی تھیں مگر گرد و نواح کانٹے دار آہنی تاروں کی موجودگی براہِ راست آمد و رفت میں رکاوٹ تھی۔ عذرا اور میری قیام گاہ کے درمیان صرف آہنی تار حائل تھے۔ کبھی موقع ملتا تو ایک دوسرے سے بات کر لیتے۔

ایک دن عذرا کو چائے پر مدعو کیا۔ باتوں باتوں میں رات کے ساڑھے نو بج گئے یک دم ریڈ وارننگ ہوگئی۔ سب مورچوں کی طرف دوڑے مگر عذرا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے اسے ہرچند مجبور کیا مگر وہ وہیں ڈٹی رہی۔ پانچ منٹ بعد ہم نے ڈیوٹی آفیسر کو چند سپاہیوں کے ہمراہ اپنے خیمے کی طرف آتے دیکھا۔ اس پر عذرا گھبرا گئی۔ جان کی تو شاید اسے پروا نہ تھی مگر اس وقت اُس کا میرے ٹینٹ میں موجود ہونا ہم دونوں کے لئے سخت خطرناک تھا۔ آخر وہ جبر کر کے میرے ساتھ خندق میں داخل ہوئی۔ دو منٹ بعد دشمن کے جہازوں نے بم باری شروع کر دی۔ مجروحین کی چیخ پکار اور آہ و بکا سے فضا گونج اٹھی۔ ایک کمزور ساتھی کے لئے ہمدردی کے جذبہ کے تحت میں عذرا کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھا۔ وہ میری پاکیزگیٔ کردار سے آگاہ تھی۔ اسے مجھ پر اعتماد تھا تاہم وہ نسائی فطرت کے سبب مجھ سے الگ ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

دو تین گھنٹے کے بعد بم باری تھمی۔ ریڈ وارننگ ختم ہوئی اور سب اپنے اپنے مورچوں سے نکلے۔ میں دبے پاؤں عذرا کو اپنے خیمہ میں لے گیا اور وہاں سے ایک گھنٹے کے بعد اسے اُس کی آرام گاہ میں پہنچا دیا۔

دوسرے دن آپریشن تھیئٹر میں ہم دونوں موجود تھے مگر مہرِ سکوت کو توڑنے کی کسی نے کوشش نہ کی۔ آخر میں نے بعد عبادت عذرا کی طرف دیکھا۔ فرطِ حجاب نے اس کی نگاہیں اوپر نہ اُٹھنے دیں۔ میں ٹکٹکی لگائے لمحہ بھر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ رات کے تصور سے نادم تھی۔ مگر آخر کب تک خاموش رہتی۔ گاہے گاہے مجھ سے اپنا دردِ دل بیان کرتی۔ اپنے شوہر کے قصے دہراتی اور مسلسل آنسو بہاتی۔ آنسو بہاتے بہاتے اس کو کچھ تسکین حاصل ہو جاتی۔

میں بھی اس کی صورت و سیرت کا مداح تھا۔ عنفوانِ شباب کی بھڑکتی ہوئی امنگیں بیکل بنا رہی تھیں، مگر میں اپنے والد مرحوم کی وصیت کو کبھی نہ بھولتا تھا "بیٹا نیک کرداری اور ایمان داری ہی سے دنیا فتح کی جا سکتی ہے، انہیں کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ شیطنت روپ بدل بدل کر گنجینۂ راستی کو تاراج کرنے کی کوشش کرے گی مگر ہر وقت اس صحیفے کا خیال رکھنا جو میں تمہیں عطا کر رہا ہوں، یہ دنیا کی گراں بہا شے ہے۔"

دن بیت رہے تھے، راتیں گزر رہی تھیں، اگرچہ گاہے بگاہے عذرا سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا رہتا تاہم اس کا تصور پیہم بیزار رکھتا۔ ایک صبح سسٹرز میس کے احاطہ میں اپنے بالمقابل سٹاف سارجنٹ ٹینٹ میں کسی کو محو رکوع و سجود دیکھ کر میں متحیر ہو گیا۔ خیال ہی آیا کہ یہ عذرا ہی ہو گی۔ وہ اسی کا ٹینٹ تھا۔ اس لئے کسی سے استفسار کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ایک بار "ورتل القرآن ترتیلا" کی گونج سُن کر متعجب ہوا کہ عذرا کو کون سی خانگی پریشانیوں نے نرسنگ سروس میں بھرتی ہونے پر مجبور کیا جب کہ وہ اپنی صورت و سیرت، علم اور سلیقہ سے کسی کاشانہ کو کاخِ شاہانہ بنانے کی تمام صلاحیتوں کی مالک تھی۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ آخر مضراب کے اک تار کو چھیڑا۔ سیلِ اشک رواں ہو گیا میں پچھتا رہا تھا کہ میں نے یہ کیا ستم کیا۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا "آئندہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کروں گا۔"

"میں اپنی دردبھری داستان سے آپ کو مغموم کرنا نہیں چاہتی تھی، تاہم اب چھیڑا ہے تو سنیئے اور کلیجے پر پتھر رکھ کر سنیئے۔"

"میں سابق کمانڈنگ آفیسر، فیلڈ ایمبولینس ایم ای ایف (مڈل ایسٹ فورسز) لفٹیننٹ کرنل شہباز خان کی بیوی ہوں۔ میں نہی کے خاندان کی ایک عورت ہوں۔ میں ایم بی بی ایس میں پڑھتی تھی کہ ہم ازدواجی رشتہ میں منسلک کر دیئے گئے۔ میرے شوہر اس وقت میجر تھے۔ چھ ماہ بعد انہیں سمندر پار جانے کا حکم ملا۔ میں نے اُن کے بغیر زندگی وبالِ جان سمجھی۔ اس لئے آنے والی طویل مفارقت کے بھیانک خوابوں نے میری صحت پر بڑا اثر کیا۔ بہت دنوں کے غور و خوض کے بعد مرحوم نے مجھے آئی۔ ایم۔ این۔ ایس (انڈین میڈیکل نرسنگ سروس) میں بھرتی کرا کر اپنے ہمراہ لے جانے کے خیال کا اظہار کیا۔ اپنے اقربا کی مخالفت کے باوجود میں رضامند ہو گئی۔ میرے سرتاج مجھے ہر روز عسکری دارالشفاء کی نرسوں کے قصے سناتے اور ان کے کردار پر کاری نکتہ چینی کرتے۔ کئی بار میں شکستہ خاطر ہو کر مفارقت کو رفاقت پر ترجیح دیتی مگر اسلامی روایات اور خاندانی نجابت میرے عزائم کی استواری کا باعث ہوتی۔"

"بالآخر ہم دونوں میدانِ کارزار میں پہنچ گئے۔ ایک سال ایک ہسپتال میں اکٹھے رہنے کے بعد میرے رفیقِ حیات لفٹیننٹ کرنل ہو کر، فیلڈ ایمبولینس کے کمانڈنگ کی حیثیت سے طبروق سدھارے۔ چھ ماہ کی طویل مفارقت کے بعد چھٹی لے کر میں بھی ان کے یہاں پہنچ گئی۔ جرمن

افواج پیشقدمی کرتی ہوئیں طبروق تک قریب پہنچ گئیں۔ دشمن ہوائی حملہ اس شدت سے کرتا کہ زخمیوں کا سنبھالنا تو درکنار، دن رات مورچوں سے نکلنا دشوار ہو جاتا۔ گاہے بگاہے جب قیام گاہوں کی طرف جانے کا موقع ملتا تو ہیبت ناک اور قیامت خیز نظارے دیکھ کر دل دہل کر رہ جاتے۔ کٹے ہوئے اعضائے انسانی، لاشہ ہائے بے دست و پا، والیانِ سطوت و صولت کے کاسہ ہائے سر، غرض یہ کہ تہذیبِ مغرب کے مقتل میں بسملوں کی وحشت ناک تڑپ کے نظارے اتنے ہوشربا تھے کہ ہماری سپاہ کو اپنی تخریب کے اندیشے کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ ہماری آتش باری جرمن ٹینکوں پر بالکل اثر نہیں کرتی تھی۔ بخلاف اس کے دشمن پرچمِ نصرت لہراتا ہوا برابر پیش قدمی کرتا چلا آ رہا تھا۔ پنجاب رجمنٹ کی سکھوں کی ایک کمپنی "ست سری اکال" کا نعرہ لگا کر نکلی۔ پانچ منٹ میں جرمن افواج نے انہیں ختم کر دیا۔ بلوچ رجمنٹ جوش میں آئی، نعرۂ تکبیر سے فضا گونج اٹھی مگر مغرب کے کارخانوں میں بنی ہوئی لوہے کی بار دو بار بے جان مشینیں جانتی تھیں کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی یہ قوم جہاد، جنگ و جدال کو بھول چکی ہے ——— چند لمحوں میں تمام بلوچیوں کا صفایا کر دیا۔ آخر اتحادی محض دفاعی کارروائی پر مجبور ہو گئے۔"

"میرے شوہر زخمیوں کو فرنٹ لائن سے اٹھا لانے کے سلسلے میں افسرانِ بالا کے احکام اپنے جوانوں کو سنا رہے تھے کہ اچانک دشمن نے گولہ باری شروع کر دی مگر ہائے خلاقِ عالم پہ بھروسہ کرنے والا وہ مجاہد اپنی تقریر میں محو رہا۔ نتیجہ وہی ہوا جو حشر بپا ہونے سے اس عالمِ فانی کا ہوگا

"میں ٹینٹ سے بھاگ کر مورچے میں پہنچ چکی تھی۔ اپنے سرتاج کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ جسم کے رونگٹے رونگٹے پر خوف و ہراس طاری تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب میں اپنی قیام گاہ میں پہنچی تو مجھے اس جانکاہ اور روح فرسا خبر سے آگاہ کیا گیا جو عورت کی ساری دنیا کو تاراج کر رکھ دینے والی ہو سکتی ہے۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔ جب ہوش میں آئی تو میں نے اپنے آپ کو ایک ایمبولینس کار میں موجود پایا جو مجھے کسی نامعلوم منزل کی طرف لئے جا رہی تھی۔"

"قاہرہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ اتحادیوں کو کمک پہنچ چکی ہے۔ امریکہ کے بنے ہوئے ٹینکوں نے جرمن افواج کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں اور ان کی پیش قدمی رک گئی ہے۔ دو ماہ ہسپتال میں رہنے کے باوجود میرے درد و الم میں کمی نہ ہوئی ——— ٹوٹے ہوئے دل سے صدا بلند ہوتی کہ جن کی خاطر میں نے اپنے اعزا و اقربا کی مفارقت گوارا کی جب وہی نہ رہے تو اب اس عسکری زندگی میں جہاں قدم قدم پر مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میرے لئے کون سی دلچسپی رہ گئی ہے۔ بارہا وطن لوٹنے کی استدعا کی مگر صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں!"

میں نے ایک آہ سرد بھرتے ہوئے کہا "عذرا ——— آپ کی داستان سراپا درد ہے۔ میں انشاءاللہ آپ کو ہندوستان پہنچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا ——— گھبراؤ نہیں اس دار المحن میں ہر کوئی مبتلائے الم ہے اور یہی سلسلۂ کرب و بلا اور پیہم تگ و دو کا نام زندگی ہے۔ ؎

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں"

چنانچہ حسن و شرافت کے پیکرِ مغموم کی اعانت کرنا میں نے فرضِ اولین سمجھا۔ ساتھ ہی ساتھ اُسے دردبھری سرگزشت کو فراموش کرانے کی ٹھانی۔ لہٰذا سیر و تفریح کی طرف راغب کرنا چاہا۔

"اگر آپ چاہیں تو آج شب تفریحِ طبع کے لئے میرے ہمراہ چلیں۔ اگر اعتراض نہ ہو تو میڈم لی صاحبہ سے اجازت لے لوں"۔۔۔ میں نے رک رک کر کہا۔

عذرا خاموش تھی۔

"لوگ یہاں کے بدلیع ڈانس کے بہت مداح ہیں۔ ارادہ ہے کہ کم از کم ایک بار تو دیکھ لوں اور کچھ نہیں تو معلومات میں اضافہ تو ہوگا۔" میں نے پھر کہا۔

"مجھے اس سے دلچسپی نہیں"

"ہاں یہ تو صحیح ہے مگر رونے اور کڑھنے سے آخر کون سا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تفریحی لمحات کی مدد سے تلخ یادوں کا بوجھ کم کیا جا سکتا ہے"

"بس! مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیجئے"

"عذرا! آج تمہیں میرے ساتھ ضرور جانا ہوگا"

"اچھا سوچ کر جواب دوں گی"

تھوڑی دیر بعد کہنے لگی "گو میں ڈانس سے متنفر ہوں تاہم مجھے آپ کی دل شکنی گوارا نہیں"

میں نے عذرا کو لے جانے کے لئے میڈم سے ٹیلیفون پر اجازت لے لی۔ شام کے پانچ بجے شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ مصر کے دارالسلطنت کی آٹھ آٹھ، دس دس منزلوں کی فلک بوس عمارات دیکھتے جا رہے تھے۔ عذرا اپنے گرد و نواح کے ماحول کو بصد حیرت دیکھ رہی تھی، گویا پہلی بار اُسے کھلی فضا میں سیاحت کا موقع ملا تھا۔ دریائے نیل کے کنارے دلفریب نظارے ہوش رُبا تھے مگر ہم ان میں ہمہ تن منہمک نہ ہوئے۔ ہم اپنی اپنی لے میں مگن ان طلسمات کو بیگانہ وار دیکھتے جا رہے تھے۔ آدھ گھنٹہ کی گشت کے بعد دنیائے اسلام کی عظیم ترین یونیورسٹی جامعہ الازہر میں پہنچے۔ وہاں کے ایک دو پروفیسروں سے اسلامی تمدّن پر بحث کی۔ مغرب کی نماز وہیں پڑھی۔ وہاں سے سیدھے جاپانی گارڈن میں پہنچے، تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد قریب کے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا، کھانے سے فارغ ہوتے ہی تقریباً ½ ۹ بجے بدلیعہ گھر پہنچ گئے۔ ٹکٹ خریدے اور گیلری کے صوفوں پر جا ڈٹے۔ عذرا کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ وہ حسن و تجمل کی جیتی جاگتی تصاویر کو بنظرِ حقارت دیکھ رہی تھی۔ آخر میں نے مہرِ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا:

"یہ مشرق کا پیرس ہے۔ یہاں دل کے بہلانے کا ہر ایک سامان موجود ہے"

عذرا کے تیور بدلے۔ اُس کا چہرہ غصّے سے لال ہو گیا۔ میں نے بھی ہوش سنبھالا۔ فوراً مومن مرحوم کا مصرع یاد آیا۔ ع:

مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

تھوڑی دیر بعد برقی قمقمے بجھ گئے۔ سامنے اسٹیج پر نیم عریاں ایک حسین لعبتِ رنگین متحرک نظر آئی۔ اس کے رقص میں ایک بے پناہ کشش تھی۔ شباب کی نو خیز امنگیں سامنے رقص کناں تھیں مگر سینے پر پتھر رکھے ہوئے دو نوجوان روحیں ابلیسی توہمات پر غالب آنے کا عزم بالجزم کر چکی تھیں۔ میری کمزوریٔ فطرت کہ خیالات کی اس کشمکش میں میرا کانپتا ہوا ہاتھ عذرا کی طرف بڑھا۔ مگر بجلی کی طرح عذرا مجھے جھٹکا دے کر الگ ہو گئی تقریباً

پانچ منٹ بعد عذرا اٹھ کر چل دی۔ میں نے دبی آواز سے عذرا عذرا پکارا، مگر اس نے ایک نہ سنی۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی بدیں گھر سے باہر نکلا، اُس کا تعاقب کرنا چاہا مگر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ قلعہ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ عذرا اپنی آرام گاہ میں پہنچ گئی ہے۔ دوسرے دن اپریشن تھیٹر میں عذرا کا کافی انتظار کیا مگر وہ وہاں نہ آئی۔ میٹرن نے ٹیلیفون پر اطلاع دی "عذرا بیمار رہے۔ ہسپتال میں داخل ہو گئی ہے"۔ ساتھ طنزاً ایک ریمارک بھی دیا کہ "یو آر اے ناٹی بوائے"!

میٹرن کے اس پامال انگریزی فقرے پر مجھے بہت غصہ آیا، مگر قہرِ درویش بر جانِ درویش! میڈیکل وارڈ میں ٹیلیفون کیا۔ عذرا کی صحت کے بارے میں دریافت کیا، لیکن تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ خود وارڈ میں جانے کی ٹھانی مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔ آخر حکمت کو بھیجا۔ تھوڑی دیر کے بعد حکمت واپس آیا۔ اُس کے چہرے سے مایوسی عیاں تھی "لیفٹیننٹ صاحب وہ آپ سے بالکل ملنا نہیں چاہتی"۔

"کیوں"

"وہ آپ کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی"۔

ایک ماہ گزر گیا میں عذرا کو اب تک نہ دیکھ سکا۔ ایک دفعہ پھر عذرا کی بیمار پرسی کی ٹھانی۔ میڈیکل وارڈ میں ٹیلیفون پر عذرا کو بلوایا۔

"مزاج شریف"۔

"قدرے بہتر ہوں۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں"۔

"کیا آپ ناراض ہیں"۔

"نہیں...... مگر..... مگر آپ کون ہیں"۔

"میں ——— میں جمیل"

سلسلۂ گفتگو منقطع کر کے اُس نے ریسیور فوراً رکھ دیا۔ میری پریشانی میں اضافہ ہوا۔ شام تک اپریشن تھیٹر میں ہی رہا۔ لنچ کے لئے میس میں بھی نہ گیا۔ چائے تک یاد نہ رہی۔ سگریٹ کے چار پیکٹ نذرِ آتش کر دیئے۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب سسٹر داؤسن کی معرفت میڈیکل وارڈ میں عذرا کے پاس پہنچا۔ عذرا مجھے وہاں موجود پا کر پہلے تو ششدر رہ گئی مگر کچھ سوچ کر ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"مزاجِ اقدس" میں نے کہا۔

"ابھی زندہ ہوں"۔

"کیا میں اس کنارہ کشی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"نہیں" ——— تقریباً پانچ منٹ تک ہم دونوں پر سکوت طاری رہا!

"کیا آپ مجھے کچھ کہنے کا موقع عطا کر سکتی ہیں؟"

"جمیل —— ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں —— اگر سو میں نہیں تو کم از کم ہزار میں تو آپ کو ربّ العزت کے ایسے پرستار ملیں گے جو کڑی سے کڑی مصیبت میں بھی راست روی، راست گفتاری اور راست کرداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ میں جوانی کی لغزشوں کو

قابل ہرگز نہیں سمجھتی۔ میں اِن پر موت کو ترجیح دیتی ہوں۔ میں نے آپ سے اپنے خلوص کا اظہار کیا۔ اپنی زندگی کے مستقبل کے روزنوں کے دریچے کھول دیئے۔ آپ کو ایک فرزندِ اسلام سمجھ کر آپ پر اعتبار کیا مگر آپ نے نسوانی کمزوری اور شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا۔"

"بس کرو عذرا ـــ خدا کے لئے بس کرو۔ میرا شیشۂ دل چور نہ کرو۔ میں تو زندگی کی بہت سی امیدیں آپ سے وابستہ کئے بیٹھا تھا!"

"آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ اگلے مہینے کی دس تاریخ کو میں بحری جہاز وکٹوریا میں وطن جا رہی ہوں۔ میں ایڈریس لکھے دیتی ہوں، آپ سلسلۂ خط و کتابت جاری رکھ سکتے ہیں، اگر میں کسی خدمت کے قابل ہوئی تو اس کو سرانجام دینے میں ہرگز کوتاہی نہیں کروں گی۔"

مجھے یہ سن کر تاسف ہوا مگر جگر تھام کر رہ گیا

"مگر عذرا......"

"ہاں ـــ لیفٹیننٹ جمیل۔ آپ کے شیشۂ دل کے چور ہونے اور امیدوں کی وابستگی کو سمجھ چکی ہوں ـــ آپ ابھی نوجوان ہیں، شباب کی تلاطم خیز موجوں سے کھیل رہے ہیں۔ آپ کی کشتی کنارے لگے گی۔ آپ کی امیدوں پر بہار آئے گی۔ آپ پھر کبھی ٹھوکریں کھائیں گے۔ آپ کی امنگیں پروان چڑھیں گی ـــ مگر اپنے والد کی وصیت اور اُن کے عطا کردہ صحیفے کو نہ بھولئے ـــ بہرکیف اپنے حالات سے اطلاع دیتے رہئے۔ میں کل ہی سویز جا رہی ہوں، ایک ہفتہ بعد وہاں سے بحری جہاز میں بمبئی پہنچوں گی۔"

میں خاموش بیٹھا رہا ـــ عذرا کچھ لکھتی رہی۔

"لیجئے میرے والد صاحب کا ایڈریس"

"میاں عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ۔ چاندنی چوک نئی دہلی"

"اچھا جمیل ـــ خدا حافظ"

"خدا حافظ"

میں سکون و اطمینان کھو چکا تھا ـــ عذرا کے پاس ہونے کی وجہ سے جن عیوب سے بچا ہوا تھا، آہستہ آہستہ میں ان کی زد میں جا رہا تھا ـــ بے قراری کے اس دور کی طویل گھڑیاں حرکت کرتی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔

ایک دن اسی آشفتہ حالی میں محوِ غمِ روزگار بیٹھا تھا کہ ناگاہ نظر کیلنڈر پر پڑی۔ آج مہینے کی تیس تاریخ ہے ـــ تیس تاریخ یعنی عذرا نئی دہلی پہنچ چکی ہوگی ـــ اُس نے اطلاع نہیں دی ـــ لیکن۔ مجھے آج ضرور خط لکھنا چاہئے ـــ نہیں وہ مجھے ضرور یاد رکھے گی ـــ غرض یہ کہ گوناں گوں خیالات میرے دماغ میں سمانے لگے ـــ کافی عرصہ تک میں نے خط لکھا نہ عذرا نے مجھے یاد کیا!

اتوار کا دن تھا صبح سویرے بصد خشوع نمازِ فجر ادا کی۔ پردہ پوشِ وحدت کی سرکار میں دست بدعا تھا۔ کردگارِ عالم کو میری آشفتہ حالی پر رحم آیا۔ تقریباً ۹ بجے آفیسر میس کا بہرا لکھن ایک خط لایا۔ میں نے لپک کر خط اس کے ہاتھ سے لے لیا اور عجلت و بیتابی سے کھول کر اُسے پڑھنا شروع کیا۔

لیفٹیننٹ جمیل۔ سلام مسنون! بارہا آپ کو اپنی خیر و عافیت سے آگاہ کرنے کا ارادہ کیا مگر اس کی تکمیل نہ کر سکی، مہینے بیت گئے۔ تساہل و تاخیر

معاف یا ــــ حوادثِ زمانہ نے سنبھلنے ہی نہ دیا۔ آزمائشوں پر آزمائشیں درپیش تھیں لیکن خلاقِ کون و مکاں نے میرے پائے استقلال میں لغزش آنے سے مجھے ہمیشہ محفوظ رکھا۔ جونہی ہمارا جہاز بحرِ احمر RED SEA میں پہنچا موجوں کے تلاطم نے آن گھیرا۔ ابھی یہ طوفان ختم نہ ہوا تھا کہ دشمن کی آبدوز کشتیوں نے ناک میں دم کر دیا جہاز محدود سے دائرے میں سطحِ آب پر چکر لگاتا رہا۔ آخر الامر ہم آماجگاہِ غم و الم بنے۔ جہاز ڈوبنے لگا، کشتیاں سمندر میں پھینک دی گئیں، سب سے پہلے خواتین کو کشتیوں میں اتار دیا گیا۔
مگر سب کو جان کے لالے پڑے تھے، ہر طرف کہرام مچنے لگا، لوگوں نے اندھا دھند کشتیوں میں کودنا شروع کیا۔ نتیجۃً ہماری کشتی ڈوبنے لگی۔ بعض حضرات لائف بیلیٹ سنبھالے سمندر میں کودنے لگے۔ کشتی کو ڈوبتا دیکھ کر لائف بیلیٹ سے کرئیں نے بھی بحرِ عمیق میں چھلانگ لگا دی۔ گرد و نواح جو تیل گرا تھا اس میں آگ لگ چکی تھی، سطحِ آب سے شعلے نکل رہے تھے، بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ دور سے ایک سٹیمر آتا دکھائی دیا۔ سٹیمر کے پہنچتے پہنچتے کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں ــــ میرے لئے زندگی کی کوئی امید باقی نہ تھی۔ سٹیمر قریب آگیا تو معلوم ہوا کہ یہ سٹیمر نہیں تھا سطحِ آب پر تیرنے والا ہوائی جہاز تھا۔ میں نے ایسی بلا ہائے ناگہانی کب دیکھی تھیں۔ سمجھ چکی تھی کہ زندگی کے آخری لمحے قریب ہیں خلاقِ عالم کو یاد کر رہی تھی، ہوائی جہاز کے کارکن ڈوبنے والوں کو بچا رہے تھے۔ اسی دوران میں کسی نے "عذرا عذرا ہم پہنچ گئے" کہہ کر پکارا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، قدرے میری حوصلہ افزائی ہوئی، کارکنوں میں سے ایک نے میری جان بچانے میں بڑی جد و جہد سے کام لیا۔ میں عورت ذات، کمزوری اور پست ہمتی کی وجہ سے اب ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ آخر میرے اس محسن نے پانی میں اتر کر سمندر کی لہروں سے کھیلتے ہوئے مجھے سہارا دیا اور ایک کشتی میں پہنچایا۔ کافی دیر تک تو میں سنبھل بھی نہ سکی نیم خوابی کے سے عالم میں اپنے اس محسنِ اعظم کو اپنے پاس ہی کھڑا پایا۔

مَیں نے کہا: "آپ کا بہت شکریہ" یہ کہہ کر میں نے دوبارہ ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کی۔ صرف اتنا کہا "ربّ العزّت نے آپ کی وساطت سے مجھے بچا لیا"

وہ مہر بلب کھڑے رہے اور ہاتھ کے اشارے سے ہی الوداع کہہ کر چلے گئے۔ اسی اثنا میں ایک چھوٹا سا بحری جہاز مدد کو آپہنچا۔ ہم اُس میں سوار ہوئے، خدا خدا کر کے سفینہ ساحلِ سلامتی پر جا لگا۔ بمبئی میں ایک دن کے قیام کے بعد میں دہلی سدھاری اقربا و اعزہ بیتابی سے انتظار کر رہے تھے۔ میرے گھر پہنچتے ہی سب نے بصمیمِ قلب کردگارِ عالم کی نوازشات کا شکریہ ادا کیا۔
تقریباً دو ہفتے کے بعد والدہ صاحبہ نے آکر بتایا "جس مشفق محسن نے تمہیں عزیزی آب ہونے سے

بچایا تھا وہ تمہاری مزاج پرسی کو آئے ہیں اور تمہارے والد سے محوِ گفتگو ہیں"۔۔۔ میں نے اُن سے ان کا نام تک بھی نہیں پوچھا تھا، مگر خدا جانے ان کو کس نے میرے گھر کا پتہ بتایا۔

تھوڑی دیر بعد والدہ پھر مسکراتی ہوئی آئیں۔ کہنے لگیں "وہ چند روز یہیں قیام کریں گے ۔۔۔ وہ تمہیں کافی عرصہ سے جانتے ہیں۔ تمہارے ...... تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں لیعنی سمندر پار ہسپتال میں بھی تمہارا کام دیکھ چکے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ جس تن دہی اور ایمانداری سے عذرا نے اپنے فرائض کو سرانجام دیا شاذ و نادر ہی کسی عورت سے ایسی توقع کی جا سکتی ہے" وہ دوسرے کمرے میں تمہارے منتظر ہیں چلو میں ساتھ چلتی ہوں" "ہاں ٹھہرو ...... وہ طبروق کے مقام پر دشمن کی گولہ باری ...... وہ جو تم نے لکھا تھا ..... اِدھر آؤ میں تمہیں وہ خط دکھاؤں" والدہ مجھے واپس لے گئیں ......

وہ کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہی تھیں۔ اتنے میں والد صاحب بھی آ گئے ۔۔۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگے

"آؤ بیٹیا ۔۔۔ والد صاحب کہتے جاتے تھے "عذرا تعجب نہ ہو ذاتِ کریم وہ کام کرتا ہے۔ جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں ہوتے، انہی کرشموں سے اس کی یکتائی اور وحدت کا نقش دل پر بیٹھتا ہے"۔۔۔ اتنے میں کسی مانوس آواز نے پکارا:

"عذرا ۔۔۔ آؤ ۔۔۔"

میں والدین کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو بجائے اُس محسن کے کسی اور آدمی کو سامنے کھڑے ہوئے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس نے پھر کہا "عذرا"۔

میری نظریں اُس سے دوچار ہوئیں ۔ میرے منہ سے نکلا ..... "آپ" "آپ زندہ" ۔۔۔ میں زمین پر گرنے کو تھی کہ والدہ نے تھام لیا اور مجھے صوفے پر لٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہوش و حواس بحال ہوئے تو والدہ نے بتایا ۔۔ "ہاں بیٹی ۔۔۔ بیٹا شہباز خدائے عز و جل کے لطف و کرم سے ابھی تک زندہ ہے۔ وہ شہید نہیں ہوا تھا۔ گرفتار ہو گیا تھا۔ جرمنی میں محبوس رہا اُس پر ایسے ایسے ظلم و ستم ڈھائے گئے کہ ہیئت جسمانی دگرگوں ہو گئی۔ پہلے دن تو جب لمبی مونچھیں اور داڑھی رکھے یہاں آیا، ہم بالکل نہ پہچان سکے ۔۔۔ اچھا اب تم بیٹھو، میں باورچی خانے جا رہی ہوں۔

وہ ۔۔۔ عذرا ۔۔۔ عذرا پکارتے اُٹھے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ اس کے بعد انہی کے الفاظ ہو بہو لکھے دیتی ہوں۔ "عذرا ۔۔۔ ہم اللہ تعالٰی کے متشکر و ممنون ہیں کہ اس نے ہمیں دوبارہ زندگی بخشی۔ میں نے جنرل ہیڈ کوارٹرز مڈل ایسٹ (قاہرہ) سے تمہارے متعلق دریافت کیا اور معلوم ہوا کہ تم ہندوستان سے جانے والے جہاز پر ہو۔ پھر جب تمہارے جہاز کی غرقابی کا تار سویز میں پہنچا، میں وہیں تھا اس لئے ہوائی جہاز میں جانے کی اجازت لے لی تاکہ تمہاری مدد کر سکوں۔ میں نے پہنچتے ہی تمہیں پہچان لیا لیکن نہیں چاہتا تھا کہ مصائب کے عالم میں محض چند ثانیوں کی فرصت نکال کر تعارف کراؤں اور اپنی سرگزشت سناؤں۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ شاید تم جذبات میں اتار چڑھاؤ پیدا کرنے والے ایک اہم انکشاف کا دھچکا نفسیاتی طور پر برداشت نہ کر سکو ہم فوجی ڈسپلن میں جکڑے ہوئے تھے اور ہمیں عجلت سے لوٹنے کی ہدایات دی گئیں تھیں۔ اس لئے اس موقع پر دل پر پتھر رکھ کر اخفائے احوال کو ہی ترجیح دی اور اپنی ملاقات اور گفتگو میں بھی اختصار سے کام لیا۔ جرمنوں نے ہم پر دل کھول کر ظلم و ستم ڈھائے، زد و کوب کی، ناگفتہ بہ ایذائیں پہنچائیں، نئی تہذیب کے نئے آلات سے ہمیں ایسی ایسی تکالیف

(باقی برصفحہ ۔۔)

غ

انور صدیقی

پاسِ دم توڑ چکی، مطلعِ امکاں تو کھُلا
زلفِ زنجیر تو بکھری، درِ زنداں تو کھُلا

کچھ دریدہ سا نظر آتا ہے دامانِ بہار
ہم پہ جو گزری، مآلِ غمِ پنہاں تو کھُلا

ذوقِ رَم نام ہے اک درد کا، درماں کا نہیں
چلو اچھا ہُوا یہ رازِ غزالاں تو کھُلا

خیر سے خونِ جگر اپنا بہا ہم نفسو!
کچھ نہ کچھ رنگِ گل و لالہ ریحاں تو کھُلا

کیوں نہ دیوانوں کے دل اور بھی دھڑکیں انورؔ
بعد مدّت کے درِ شہرِ نگاراں تو کھُلا

غ

عبداللہ خاور

ہوائے شوق کو اپنی روش پہ چلنے دو
جنوں کو راہگذاروں کا رُخ بدلنے دو

نکل ہی آئے گا کوئی قرار کا پہلو،
طلب کو مرحلۂ شوق تک سنبھلنے دو

کسی کے وعدۂ فردا کا انتظار سہی
اسی حسین سہارے پہ غم کو ٹلنے دو

سحر تک اور بہوسلے تراش لے گا خیال
ابھی تو چاند ستاروں کی رات ڈھلنے دو

نگاہِ شوق سے پھوٹے گی صبحِ نو کی کرن
افق پہ تیرگیٔ شامِ غم مچلنے دو

کبھی تو آئے گا گم گشتہ کاروانِ سحر
روش روش پہ دلوں کے چراغ جلنے دو

جو راہزن ہیں کمین گاہِ تیرگی میں نہاں
نہ بچ سکیں گے نگاہوں سے، دن نکلنے دو

جہاں میں اہلِ سیاست بہلا نہ سکے
سبو کشانِ محبت کا دور چلنے دو

ابھی تو دور ہے اہلِ نیاز کی معراج
دلوں کو آہِ سحرگاہ سے پگھلنے دو

افق کی اوٹ میں سو آفتاب ہیں خاور
کچھ اور حوصلۂ تیرگی نکلنے دو

غ

سلیم صدیقی

منزلِ اہلِ جنوں بزم بھی تنہائی بھی — بادہ پیمائی بھی ہو، بادہ بہ پیمائی بھی!
اُٹھ کہ فطرت سے ہم آہنگ ہے اب موجِ نشاط — جاگ اے دل! کہ بہار آئی، گھٹا چھائی بھی!
حسنِ نظارہ کو ہے ذوقِ نظر بھی درکار — یعنی اجزائے تماشا ہیں تماشائی بھی!
ہے یہ طوفانِ طرب، بحر کی اک موج کا رقص — نغمہ و نور بھی، رنگینی و رعنائی بھی!
لامکاں کیسے سمائے جو سمجھ میں آئے، ناداں — ذہن میں عالمِ محدود کی پہنائی بھی!
بات تو جب ہے کہ کانٹوں پہ بھی آ جائے نکھار — یوں تو آئی تھی گلستاں میں بہار آئی بھی!
خس و خاشاکِ نشیمن پہ توجہ اتنی؟! — کچھ تو لازم ہے، خیالِ چمن آرائی بھی!
جنسِ ارزاں ہے فقط رونقِ بازارِ ہوس — یہی باقی تھا کہ ہو حسن کی رسوائی بھی!!
تجھ سے امید ہی کیا طعنۂ لغزش کے سوا! — تیری کشتی کسی طوفان سے ٹکرائی بھی؟!
عافیت کوش! یہ تقویٰ ہے؟ ادھر خلشِ نارِ جنوں! — دعویٔ عشق بھی ہے، مصلحت آرائی بھی!
دل کے روزن ہوئے در، بن گئے در راہگزر — اب تو ہنگاموں سے پامال ہے تنہائی بھی!
وہم کے نقش تھے، تخییل کی رنگ آمیزی! — ورنہ احباب سے کم کم تھی شناسائی بھی!

رنجشیں سب دلِ حساس کی بے جا ہیں سلیم
ایسے کم ظرف کو دنیا کبھی راس آئی تھی!!

[illegible] ہے کہ اس مفہوم کا [illegible] اشارہ ہے جو ایک روایت کے مطابق (غالباً) حضرت عمر فاروقؓ نے بیان فرمایا تھا یعنی "پُرخار راستہ میں کانٹوں سے دامن بچا کر چلنا" (سلیم)

غ

نعیم صدیقی

لبوں پہ عشق کا پیغام لا رہا ہوں میں — خود اپنی جان کی شامت بلا رہا ہوں میں

مرے جوانوں کے سینوں میں حوصلے جاگیں — کھڑا ہوں آگ میں اور مسکرا رہا ہوں میں

بھلانے والے کبھی تجھکو یاد آؤں گا — گھڑی گھڑی کو تجھے یاد لا رہا ہوں میں

کہو ہوس سے کہ اس انجمن سے اٹھ جائے — ادب اب کہ نغمۂ الہام گا رہا ہوں میں

ترے وہ بول جنہوں نے جلا دیا مجھکو — وہ پیارے بول کو سنا رہا ہوں میں

ہزار عالم نو اس سے پائیں گے تشکیل — غبار اپنا ہوا میں اڑا رہا ہوں میں

یہی ہے میرا ہنر جادوئے تخیل سے — ترے جمال کے پیکر بنا رہا ہوں میں

جو جی میں آئے تو اے میرے ساتھ کر گزرو — خدا کے سامنے لو اب سر جھکا رہا ہوں میں

اندھیرے چار طرف مشتعل ہیں میرے خلاف — حرم کی گل شدہ شمعیں جلا رہا ہوں میں

ہزاروں جانیں ہیں جو لب ہلا نہیں سکتیں — ہزار دل جانوں کا دکھڑا سنا رہا ہوں میں

گئی جو ہاتھ سے اک لغزشِ نگہ کے سبب
کہاں کہاں وہی شے ڈھونڈتا رہا ہوں میں

استفسارات

نعیم صدیقی

—— زندگی اور شعر

—— فنونِ لطیفہ اور اسلام

—— وکالت

[افسوس ہے کہ سوالات کی عبارت محفوظ نہیں رہی لیکن غالباً جوابات خود ہی سوالات کو پوری طرح نمایاں کر دیں گے ۔ ادارہ]

مکرمی! و السلام علیکم۔ آپ کا خط کئی روز ہوئے ملا تھا۔ طویل وقفے سے جواب دے رہا ہوں کچھ کام درمیان میں حائل تھے۔

آپ کو میرے متعلق مغالطہ ہوا کہ میں کوئی عالم فاضل قسم کا آدمی ہوں، بس ایک اوسط درجے کی معلومات رکھنے والا طالب علم ہوں، پھر یوں بھی میں عامیوں میں سے ہوں، مجھ سے مرعوب ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ نہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے لئے مرعوب کرنے والا ہونا چاہئے اور نہ ایک مسلمان کو کسی بھی دوسرے انسان سے مرعوب ہونا چاہئے۔ میں اپنے خیالات دوسروں کے سامنے رکھتا ہوں اور دوسروں کو بھی حق ہے کہ اپنے خیالات سے مجھے فائدہ پہنچائیں۔

"چراغِ راہ" کے لئے جو کلمات آپ نے تحریر فرمائے ہیں، ان پر آپ کا شکر گزار ہوں اور اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے دل میں جذبۂ شکر و سپاس پاتا ہوں جس کی توفیق سے یہ جریدہ کسی مفید خدمت کے قابل ہوا۔

آپ جس ذہنی کیفیت سے دوچار ہیں، یہ ہر اس سوچنے سمجھنے والے نوجوان کو پیش آتی ہے جس کے عالمِ افکار کے دروازے پر حقیقت پہلی بار آکر دستک دیتی ہے۔

"مدت ہوئی گزرا تھا میں اس راہ گزر سے"

اس کیفیت میں گھر جانے پر اسی طرح سوالات پیدا ہوتے ہیں جیسے آپ کے دل میں ہوئے ہیں اور ابھی ہوتے رہیں گے۔

آپ کے سوالوں کا مختصر جواب میں دینا چاہتا ہوں، لیکن اس سے قبل جوڈ کی کتاب اور اس پر شائع شدہ مضمون کے سلسلے میں تمہیداً چند جملے کہنا ضروری ہے۔ جوڈ کی کتاب پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مطالعۂ عام کا پس منظر بہت ہی وسیع ہے اور اس کا ذہنی معیار خاصا اونچا ہے۔ اس کے سوال اٹھانے کے لئے، ان سوالوں کا جواب اسی معیار پر دینے کے لئے اور پھر اسی معیار پر دیئے ہوئے جوابات کو سمجھنے کے لئے ویسی ہی اونچی ذہنی سطح کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ اونچی ذہنی سطح "کوئی تعریفی" بات نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مادی علوم اور حسی عقل کے راستے پر جو لوگ جتنا زیادہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کے سوچنے سمجھنے کی پیچیدگیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور سادہ ترین مسائل اور نمایاں ترین حقیقتیں ان کو الجھن میں ڈال دیتی ہیں، اس کا رونا خود جوڈ نے بھی رویا ہے۔ جوڈ جن بھنوروں میں پڑا ہے، آخر ہم لوگ کیوں ان میں پڑیں، ہمارے لئے تو وہی گرداب تماشے

پریشان کن ہیں جن سے ہم اپنے ذہنی سمندر میں دوچار ہوتے ہیں ۔

زندگی کے اصل مسائل (نظری بھی اور عملی بھی) ایک عامی اور فلسفی کے سامنے یکساں طور پر ہوتے ہیں، مگر عامی انہیں سادہ انداز سے لیتا ہے، سادہ نظر سے دیکھتا ہے، اور سادہ طریق سے ان کو حل کرنا چاہتا ہے۔ اور فلسفی انہی میں فکری گہرائیاں پیدا کرکے اور اصطلاحات سے ان کو بوجھل بنا کر لیتا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے میں دسیوں گنی زیادہ کاوش صرف کرتا ہے۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عامی اپنی ذہنی بھنوروں سے نسبتاً آسانی سے کشتیٔ فکر کو نکال لے جاتا ہے، لیکن فلسفی بسا اوقات ساری عمر ہی چکر کھاتا رہتا ہے اور یقین کا ساحل نہیں پا سکتا ۔

اس لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر آپ فی الحقیقت فلسفہ کی بھول بھلیاں۔ اور غیر معمولی عقلیت کے گورکھ دھندوں میں نہ پڑ گئے ہوں اور عملاً دانش پرپیچ کی سطح پر نہ جا پہنچے ہوں تو پھر زندگی کے مسئلے کو سیدھے سادے طریق سے سوچئے اور تعلیم یافتہ و ذہین عامیوں کی طرح ان کو حل کیجئے ۔ اس صورت میں آپ سستے چھوٹیں گے ۔

لیجئے اب اپنے سوالات کے جوابات سنئے :۔

۱۔ جوڈ کی فکری لغزش جس پر پہلا سوال مبنی ہے، یہ ہے کہ دکھ درد اور کرب کو وہ اس معنی میں "شر" (EVIL) قرار دیتا ہے کہ یہ لازماً کسی گناہ اور بدی کا نتیجہ ہیں ۔ اس کے اس غلط تصور کی بنیاد بائیبل کے فلسفہ پر ہے جس نے زندگی میں پیش آنے والی ناخوشگواریوں کو گناہِ آدم کا نتیجہ قرار دیا ہے اور انہیں ایک غیر مختتم تعزیر کی حیثیت دی ہے ۔ چنانچہ اس فلسفہ نے جوڈ کے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا کہ پھر نوعِ انسانی کے ظہور سے قبل کے زندہ موجودات اور ان آنکھوں کے سامنے پائے جانے والے عالمِ حیوانات و اجسامِ نامیہ میں جو شر پایا جاتا ہے وہ کس قصور وار کے جرائم کا نتیجہ ہیں ۔ اس سوال کی درحقیقت بنیاد ہی غلط ہے ۔ آدم کی لغزش کے بارے میں قرآن نے پوزیشن صاف کر دی ہے کہ وہ اسی کے طلبِ عفو پر فوراً معاف کر دیا گیا تھا اور اب اس کا کوئی وبال نسلاً بعد نسلٍ منتقل نہیں ہو رہا ہے ۔

اب سیدھا سادا سوال یہ رہ جاتا ہے کہ زندگی میں آخر درد و کرب اور شر و فساد کے مظاہر کیوں ہیں ؟ ۔ ان کی غایت یا ان کا سبب کیا ہو سکتا ہے ؟ اس سیدھے سادے سوال کا جواب میں آپ کو مذہبی رنگ کی بجائے کسی قدر فلسفیانہ رنگ ہی میں دوں گا کیونکہ اس صورت میں آپ کے لئے بات کو سمجھنا زیادہ آسان ہوگا ۔ مگر پھر بھی سوچنے کا سادہ ترین انداز قائم رہے گا ۔!

مادہ کی شان جمود ہے (اگرچہ اس کا باطن بھی حرکت ہی حرکت ہے، اور اس لحاظ سے سرے سے وجود کا مدار ہی حرکت پر ہے) لیکن زندگی حرکت کا نام ہے ۔ یہ حرکت محض طبعی نہیں ۔ طبعی حرکت تو مادہ میں بھی پائی جاتی ہے ۔ یہ ارادی حرکت ہے ۔ زندگی کا ظہور اولاً اگرچہ جبلی حرکت سے ہوتا ہے، لیکن اس کی تکمیلی صورت ارادی حرکت ہے ۔ ارادی حرکت کے معنی ہیں، کسی ایک حالت سے کسی دوسری حالت کی طرف اپنی مرضی سے بڑھنا ۔ اس حرکت کے لئے محرک کیا ہو ؟ کیوں آخر زندگی اپنی کا خزانہ ایک حرکت کو جاری رکھنے کے لئے لٹائے ؟ ایک راستے پر گامزن رہنے کی تکلیف کیوں اٹھائی جائے ؟ کیوں نہ کسی ٹھنڈی چھاؤں میں ہاتھ کا سرہانہ اور سبزے کا بچھونا بنا کر سو یا جائے ؟ ـــ ایک پرندہ کیوں فضا میں چھانیں مارے ؟ ایک مچھلی کیوں سارا دن سمندر میں تیرتی پھرے ؟ ایک مکڑی کیوں جالا تننے اور شکار پھانسنے کی محنت مزدوری میں لگی رہے ؟ ایک چڑیا کیوں تنکے چن چن کر آشیانہ بنایا کرے ؟ ایک شیر کیوں روز جنگل میں جولانیاں دکھائے ؟ اور کیوں، آخر کیوں ایک آدم زاد صبح سے شام تک بازاروں، کھیتوں، دفتروں

اور کارخانوں میں خون پسینہ ایک کرتا رہے کیوں نہ تمام جاندار — اور خصوصاً انسان ایک چٹان، ایک اینٹ اور لوہے کے ایک زنگ آلود ٹکڑے کی طرح آرام سے ایک جگہ پڑے رہا کریں؟ — کونی محرک ہے جو انہیں تگ و دو میں رکھتا ہے، وہ محرک کیا ہے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور کیا ہونا چاہیئے؟

زندگی کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ کچھ حالتوں میں سکون پاتی ہے اور کچھ دوسرے حالتوں میں وہ تکلیف کا احساس کرتی ہے۔ جس حالت میں وہ تکلیف کا احساس کرتی ہے اس سے وہ بھاگنا چاہتی ہے، جس حالت سے اُسے سکون ملنے کی توقع ہوتی ہے اس کو منزل مقصود بنا کر وہ سفرِ عمل جاری رکھتی ہے۔ بس یہی تکلیف اور درد و کرب سے فرار اور سکون اور راحت کی طرف لپکنے کا ایک میلان ہے جو زندگی کے ادنی ترین اشکال سے لے کر نوعِ انسانی تک ہر جگہ محرک بن کر کام کر رہا ہے۔ یہ نہ ہو تو ساری چلتی گاڑیاں رک جائیں۔ بہتے دریا تھم جائیں اور زندگی کے قافلے موت کی نیند سو جائیں۔

بھوک پیاس، سردی گرمی، بیماریاں، وبائیں، حوادث، موت کے واقعات، انسانی جرائم، جنگیں اور تصادم اور غم و اضطراب کے دوسرے بے شمار موجبات ہیں کہ جن کے چنگل سے بچنے کے لئے انسان فلسفہ بناتا ہے۔ ایجادیں کرتا ہے۔ تنظیمیں پیدا کرتا ہے۔ سرمایہ صرف کرتا ہے اور اپنا خون پسینہ بہاتا ہے۔ اس سے کش مکش کا میدان تیار ہوتا ہے۔ اس سے زندگی ایک امتحان گاہ بن جاتی ہے اور اس سے ایک حالت سے زیادہ بہتر حالت کی طرف ترقی کرنے کے ولولے بیدار ہوتے ہیں۔

لیکن اور سارے موجباتِ غم و اضطراب کو اگر آپ زندگی سے نکال کر پھینک دیں تو نہ احساس ہوگا نہ شعور رہے گا، نہ فکر و کاوش، نہ ارادہ نہ عمل، کچھ بھی نہیں۔ ہم اینٹ پتھر کی طرح جامد و ساکت ہو کر رہ جائیں گے۔ انسانی شعلہ ہائے جوالہ، تودہائے برف میں بدل جائیں گے۔ مثلاً بھوک اور فاقہ نہ ہو یا سردی گرمی کا کوئی اثر ہم پر نہ پڑے تو کاشتکاری اور تیاریٔ لباس اور تعمیر عمارت کی ساری سرگرمیوں کے لئے سرے سے ہمارے ذہن میں کوئی محرک ہی نہیں رہے گا۔ موت کا خوف اٹھا دیجئے تو پھر زندہ رہنے کے لئے کوئی بھی کیوں وہ سب پاپڑ بیلنے کے لئے تیار ہوگا جن کی وجہ سے ساری گہما گہمی ہے۔ اندھیرا نہ ہوتا تو چراغوں سے لے کر برقی قمقموں تک کے سارے انتظار کا تصور ہی نہ کیا جا سکتا۔ جنگ کا اندیشہ نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ایٹمی طاقت کا راز سمجھنے کے قابل بھی ہم ہو سکتے۔

پس دکھ اور کرب، خوف اور پریشانی کے موجبات زندگی کی ادنیٰ ترین اشکال سے لے کر نوعِ انسانی تک کے لئے اگر ضروری ٹھہرے ہیں تو محض اس لئے کہ زندگی کی وہ حرکت جاری رہ سکے جس کا نام زندگی ہے۔

یہ آگے کی تفصیلی بحث الگ ہے کہ خیر و شر کی دو بنیادی قسموں، طبعی و فطری اور اخلاقی و تمدنی میں بڑا فرق ہے۔

فطرت و طبیعت اور خارج کے عالمِ مادی کے قوانین کا عمل خالص جبری نوعیت کا ہے اس لئے اس میدان میں خیر و شر کی تقسیم و تعین یقینی ہے، نیز اس میدان میں شر سے خیر کی طرف حرکت کی اصل رہنما جبلت ہے اور ہمارے طبعی علوم و ایجادات زندگی کو سنبھالنے کا ذریعہ ہیں لیکن اخلاقی و تمدنی زندگی چونکہ شعوری، ارادی اور اختیاری نوعیت کی ہے اس لئے یہاں تقسیمِ خیر و شر جبلی جبریت سے نہیں ہوتی بلکہ شعوری فیصلے سے ہوتی ہے۔ شعوری فیصلے میں انسان مختلف معیارات استعمال کرتا ہے اور بار بار غلطیاں کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پہلو سے بحث کو زیادہ آگے لے جانے سے بہت سے سوالات آپ کے ذہن میں پیدا ہوں گے اور ان کو حل کرنے کے لئے ایک خط کیا کئی خط کافی نہیں ہوں گے۔

اصل سوال جو سامنے تھا اس کا جواب ہو چکا۔ یعنی خیر و شر اور برائی اور بھلائی اور تکلیف و راحت کے مظاہر زندگی کے چاروں طرف اس لئے پھیلا دیئے گئے ہیں اور ان میں تمیز کرنے اور ان کا احساس کرنے کی صلاحیت اسے اس لئے ودیعت کی گئی ہے کہ انسان ایک حرکت کرتی ہوئی، کشمکش کرتی ہوئی اور ترقی کی راہ پر آگے بڑھتی ہوئی طاقت بن کر کام کرے۔

جوڈ کی مشکل یہ ہے کہ وہ مادی فلسفے کی اندھیاریوں سے اکتا کر مذہب کی طرف پلٹا تو اس کو سابقہ پڑا اپنے آبائی مذہب سے، جو اس کے قریب واقع تھا۔ اس مذہب نے دنیا کی زندگی میں شر کے موجود ہونے کی ایک ایسی توجیہ اس کے سامنے رکھی کہ جس نے نئی الجھنیں پیدا کر دیں لیکن آپ آخر جوڈ کی الجھنوں میں کیوں پڑیں۔

۲۔ خدا نے انسان کو ایک محدود درجے کی خود مختاری (AUTONOMY) دی ہے یعنی اخلاقی و تمدنی دائرے میں اسے اختیار دیا ہے کہ وہ نظریات و معتقدات اور اخلاقیات و قانونیات اور عملی اقدامات اور فیصلوں کی مختلف صورتوں میں سے اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر بھلے برے کا انتخاب خود کرے۔ اس معاملے میں اسے پوری پوری مدد بہم پہنچا دی ہے، یعنی اسے عقل کی آنکھیں دی ہیں، اور ساتھ ہی الہامی ہدایت کی روشنی دی ہے۔ اب اگر فرد یا کوئی قوم یا پوری نوعِ انسانی الہامی روشنی سے اور عقل کی آنکھوں سے کام لے کر راہِ حق نہ دیکھنا چاہے، اور تباہی ہی کے کسی راستے پر بڑھنا چاہے تو اس کا موقع بھی اسی طرح کھلا رکھا گیا ہے جس طرح ترقی اور کامیابی اور فلاح کی طرف بڑھنے کا موقع موجود ہے۔ اب اگر مشیت الٰہی بالجبر انسانوں کو کسی عقیدہ و عمل پر جما دینے کا اسلوب اختیار کرتی تو آخر انسان اور درختوں اور پتھروں میں فرق کیا ہوتا۔ اس میدان میں جبریت نہیں رکھی گئی یہی مدعا ہے "لا اکراہ فی الدین" کا!۔

جوڈ نے دراصل انسانیت کے مقام اور مرتبے کا تصور ہی غلط باندھ کر سوچا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ آدمی کو اخلاقی و تمدنی زندگی میں اچھے فکر و عمل کا نتیجہ تو اچھا ملنا ہی چاہئیے لیکن جب اس نے غلط افکار و عمل اسے کسی نتیجۂ بد کی طرف لئے جا رہے ہوں تو پھر خدا کو چاہیے کہ وہ زبردستی تمدن کی باگ موڑ کر اسے اچھے رستے پر ڈال دے۔ گویا انسان سے اس کا اختیار سلب کر لیا جانا چاہیے اور مشیت کو سارا چارج اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے۔

آپ اس معاملے کو ذرا چھوٹے پیمانے پر سوچئے کہ ایک فردِ انسانی اپنی صحت کے بارے میں دو راستے اختیار کر سکتا ہے، ایک یہ کہ وہ حفظانِ صحت کے قواعد پر عمل کرے اور تندرست رہ کر پھلے پھولے۔ دوسرے یہ کہ وہ قانونِ صحت سے بالکل بے نیاز ہو کر بلکہ اس کے مخالف عمل پیرا ہو کر اپنے قویٰ کو تباہ کرے۔ یہ دونوں راستے اس کے لئے یکساں کھلے رکھے گئے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنی بربادیٔ صحت کے اسباب پیدا کرنے میں مصروف ہے اور موت کے گڑھے کی طرف جا رہا ہے تو مشیت اسے جبراً صحیم و شحیم بنانے سے تو رہی! بالکل ایسا ہی معاملہ پوری نوعِ انسانی یا اس کے کسی قومی و نسلی گروہ کا ہے۔ اس کے سامنے بھی دونوں راستے کھلے رکھے گئے ہیں اور ان میں سے کسی کو انتخاب کرنے اور اس پر بڑھتے چلے جانے کی آزادی دے دی گئی ہے۔

انسانی اختیار اور ذمہ داری کا یہ تصور سامنے رکھا جائے تو جوڈ کے اٹھائے ہوئے سوالات یکسر ختم ہو جاتے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ ہاں خدا مستقبل کے سارے امکانات کو جانتا ہے، وہ کسی چیز کا جبراً سدِ باب کر سکتا ہے، لیکن اس نے انسانی زندگی کے نظام کے لئے جو دستورِ اساسی

معین کیا ہے وہ عطائے اختیار (AUTONOMY) پر مبنی ہے، وہ انسان کو خلافت کے منصب پر بٹھاتا ہے، بنابریں خدا تعالیٰ علم اطلاع اور قدرت ما اختیار کے باوجود انسان کو اختیار کے استعمال کا کھلا موقع دیتا ہے اور کسی طرز عمل کا جبری طور پر سدباب نہیں کرتا۔

۳۔ سنگتراشی، موسیقی اور مصوری — یا بالفاظ دیگر فنون لطیفہ کے بارے میں آپ نے جو سوال کیا ہے اس کے جواب میں کہنے کی بات یہ ہے کہ "فنون لطیفہ کی حیثیت زندگی میں وہی ہے جو چائے کے پیالے میں شکر کی ہوتی ہے۔ فنون لطیفہ کی مٹھاس سے ہم تلخابہ حیات کو گوارا بناتے ہیں، لیکن شکر اگر حدِ اعتدال سے زیادہ استعمال کی جانے لگے اور بچوں کا سا چٹورپن مٹھاس کے لئے پیدا ہو جائے تو پھر شکر کی یہ زیادتی صحت میں بگاڑ پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح فنون لطیفہ، ذوق جمال اور تفریحی دلچسپیوں سے اگرچہ زندگی میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے لیکن اگر ان کو اپنے حدود سے بڑھ جانے دیا جائے تو اخلاق اور تمدن میں فساد آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ صورت ہر میدان میں یوں بھی پیش آتی ہے۔ مثلاً تجارت کتنی ضروری شئے ہے، صحافت کی کتنی اہمیت ہے، حاکمانہ اختیارات کا منظم سوسائٹی میں بروئے عمل ہونا کتنا ضروری ہے، فرد کی آزادی کی کتنی قدر و قیمت ہے، لیکن زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی خاطر ان میں سے ہر چیز پر کچھ پابندیاں ہر معاشرے میں لگائی جاتی ہیں۔ اسی طرح فنون لطیفہ پر بھی کہیں نہ کہیں جا کر کوئی تحدید دنیا کی ہر تہذیب لگاتی ہے۔ البتہ اباحت کی آخری سرحد مقرر کرنے میں ہمارے مختلف نظام اپنے اپنے نظریات کے تحت مختلف فیصلے دیتے ہیں، لیکن کوئی نہ کوئی آخری حد ہر تی ہر نظام میں ہے۔ اسلام نے بھی فنون لطیفہ پر تحدیدات عائد کی ہیں اور یہ جانچ اس کے نظریات و مقاصد کے مطالعہ ہی سے ہو سکتی ہے کہ یہاں تک ضروری ہیں اور کس قدر حکیمانہ و عادلانہ ہیں۔

مثلاً اسلام کے سامنے ایک مفسدہ صورت گری یہ ہے کہ اس راستے سے آدمی میں بت پرستی داخل ہوتی ہے، دوسرا مفسدہ اس کے سامنے یہ ہے کہ موسیقی و مصوری کے ذریعے سے انسان کو تعیش پسندی اور لذت پرستی کے روگ لگے ہیں، پھر اس کے سامنے یہ مفسدہ ہے کہ فنون لطیفہ کے ذریعے جنسی آوارگی پیدا ہوتی ہے، پھر اس کے سامنے یہ مفسدہ ہے ان جمالی و تفریحی سرگرمیوں نے معاشرے کو اسراف میں مبتلا کیا ہے اور انسان کے عملی قویٰ کو مضمحل کر کے چھوڑا ہے۔ ان مفاسد کو سامنے رکھ کر اس نے کچھ پابندیاں لگا دی ہیں جس کی تائید انسان کے بے حساب تاریخی تجربات کرتے ہیں۔ آخری حد سے ورے ورے اس نے میدان کھلا چھوڑ دیا ہے۔

فنون لطیفہ چند متعین مظاہر کے پابند نہیں ہیں، بلکہ انسان کے جمالی ذوق اور تخلیقی رجحان کے مشترک عمل کو اگر ایک طریق اظہار سے روک دیا جائے تو وہ دوسرے طریقہ ہائے اظہار نکال لیتا ہے۔ اس کی ایک مثال خود مسلم تمدن میں ملتی ہے۔ سنگتراشی کے میدان میں صنم گری کو روک دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فن تعمیر میں غیر معمولی کاوشیں ہونے لگیں اور خیال کی تجلیوں کو اینٹ پتھر اور چونے گارے میں مسلمانوں نے اس شان سے منتقل کیا کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اسی طرح موقلم سے صورت گری پر پابندی لگی دیکھ کر ذوق جمال نے تخلیق کا نیا راستہ خطاطی اور نقاشی کے میدان میں نکال لیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فنون لطیفہ کے نہ جانے کتنے عالم ابھی ہماری نگاہوں سے اوجھل پڑے ہیں جن میں تخلیقی رجحان کو جولانیاں دکھانے کا وسیع موقع مل سکتا ہے۔

۴۔ وکالت کو بطور پیشہ موجودہ معاشرے میں اختیار کرنے سے آدمی بحیثیت مسلم ان اخلاقی اصولوں کی پابندی کر کے مشکل ہی سے کامیاب ہو سکتا ہے جن کے اختیار کرنے ہی سے وہ مسلم بنتا ہے۔ اس وجہ سے معاملہ ٹیڑھا ہے۔ اگر آپ اس امر کا اہتمام کر سکیں کہ اسلامی معتقدات اور

اخلاقیات کی نگہداشت کرتے ہوئے وکالت کر سکیں تو بسم اللہ۔ لیکن اس صورت میں انکا "وکاموکل ہی ہاتھ آ سکیں گے

جو لوگ کوئی اصول و عقیدہ اختیار کر کے جوانمردوں کی سی بامقصد زندگی شروع کرتے ہیں وہ یہ نہیں دیکھا کرتے کہ انہوں نے سولہ سترہ برس کسی کام کو کرنے کی تیاری میں گزارے تھے اور اب ان کو ایک دوسرا ہی راستہ نکالنا پڑے گا۔ اگر مقصد کی لگن موجود ہو تو آپ کی تعلیم رائیگاں نہیں جا سکتی۔ آپ قانون کے میدان میں ریسرچ اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کر سکتے ہیں۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ دو چار سال مزید صرف کر کے آپ اسلامی قانون اور اس کے مآخذ سے ربط پیدا کریں اور پھر موجودہ قانون کے ساتھ اس کا تقابلی تجزیہ پیش کرنے میں مصروف ہو جائیں۔

پھر اس ملک میں امکانات پیدا ہو رہے ہیں کہ قانون — خصوصاً اسلامی قانون — کے موضوع پر محققین و مفکرین پیدا ہوں اور ان بڑے بڑے کاموں کے لئے زندگیاں وقف کریں۔ جو ایک اسلامی ریاست کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں۔ والسلام۔



غ

ساحر کانپوری

دعویٰ ہو کچھ تو میری نظر کو شکست دیں — وہ شعلہ رو جو نورِ قمر کو شکست دیں
دل فیض یابِ حسنِ حقیقت ازل سے ہے — جلوے ہزار بار نظر کو شکست دیں
چاہیں اگر یہ رند تو ہنگامۂ مے کشی — ساغر اٹھا کے دورِ قمر کو شکست دیں
کیسی دعا، کہاں کا اثر، وہ جو ٹھان لیں — ہنستے ہوئے دعا و اثر کو شکست دیں
یہ آشیاں ہے سوختہ جانوں کا آشیاں — چاہیں تو اس کے تنکے شرر کو شکست دیں
ہمت سے اپنی کام جو لیں اہلِ آشیاں — سو بار زورِ برق و شرر کو شکست دیں

ساحرؔ ہیں اس جہان میں ایسے بھی بے ہنر
جو چاہتے ہیں اہلِ ہنر کو شکست دیں

میں ہوں خانہ بدوش

راسخ عرفانی

فسونکارِ فطرت کا ہم راز ہوں میں
شناسائے اسرارِ پرواز ہوں میں!

نہ گرویدۂ رونقِ انجمن ہوں!
نہ پابندِ زنجیرِ زلفِ وطن ہوں

نہ ذوقِ وفا ہے، نہ فکرِ ستم ہے
نہ جینے کی حسرت، نہ مرنے کا غم ہے

مرا دل شہیدِ ادائے سفر ہے
جہاں بیٹھ جاؤں وہیں میرا گھر ہے

یہاں آج ہے تو وہاں کل ہے ڈیرا
کہ ہے شاخِ آہو پہ میرا بسیرا

بیاباں میں خود رو گلوں کے نظارے
مچلتے ہوئے آبِ زریں کے دھارے

انہیں کی رفاقت سے میں جی رہا ہوں
خوشی سے شرابِ الم پی رہا ہوں

جب آتی ہیں سردی کی خاموش راتیں
تو کرتا ہوں میں چاند تاروں سے باتیں

مرے محرمِ راز ہیں ماہ و اختر
مری خلوتوں پر ہے جلوت نچھاور

زہے خوش نصیبی! یہ حسنِ مقدر،
کہ ہر سو بچھی ہے یہ سبزے کی چادر

یہی سبز چادر بچھونا ہے میرا،
گلِ روح پرور کھلونا ہے میرا!

مرے سر پہ شبنم نے موتی لٹائے
مجھے دیکھ کر چاک گل مسکرائے

لبِ آب جو جب ترانے سناؤں
تو کوہ و دمن کا جگر گد گداؤں!

ادھر آبشاروں نے بربط بجایا
ادھر طائرِ خوش گلو چہچہایا!

پرندوں نے بھی جب حسیں راگ چھیڑا
ہواؤں نے بھی دلنشیں راگ چھیڑا

فضاؤں میں نغمات کی کیف باری
زمانے پہ ہوتا ہے اک وجد طاری

مرے سحر سے اژدھا پھنک رہے ہیں
درندے مرے پاؤں پر جھک رہے ہیں

مرا دل بھی اپنا، فسانہ بھی اپنا
امنگیں بھی اپنی، ترانہ بھی اپنا!

نہ مجھ کو جگاؤ، نہ مجھکو جھنجوڑو،
خدارا مرا خوابِ رنگیں نہ توڑو

مجھے زیرِ دامِ تمنا نہ لاؤ!!
نہ شہروں کے مجھ کو فسانے سناؤ

مجھے بام و در سے لگاؤ نہیں ہے،
مجھے سیم و زر سے لگاؤ نہیں ہے

بکوں کا راشکوں سے منہ دھو رہے ہیں
مرے دن مزے سے بسر ہو رہے ہیں

گیت

اختر واحد قاضی۔

میں نے گلشن گلشن وادی وادی خار چنے ہیں
تیری خاطر اپنوں کے بھی چبھتے بول سنے ہیں
پھر بھی برسوں تیرے پیار کے اجلے جال بنے ہیں
جنوں کی راہوں پہ لیکن خود کو تنہا پایا
دل میں ہوک اٹھی ہے اب کے ایسا ساون آیا

گھور اندھیاروں میں اجیالا بن کے آنے والی
میرے سکھ کی ساتھی، میرا درد بٹانے والی،
دور افق کے پار دھندلکوں میں چھپ جانے والی
تو نے چھپ کر کیسا آنکھ مچولی کھیل رچایا
دل میں ہوک اٹھی ہے اب کے ایسا ساون آیا

پھیل گئے اندھیارے شامِ الم کے ڈھلتے ڈھلتے
عمر گزاری تنہا کانٹوں ہی پر چلتے چلتے
جیون بیتا انگاروں کی سیج پہ جلتے جلتے
تیرا آنچل ہاتھ نہ آیا اور سکھ چین مٹایا
دل میں ہوک اٹھی ہے اب کے ایسا ساون آیا

تو ہے صبح کا اجیالا میں ہوں جیسے غم کی رات
تیرا میرا میل نہیں ہے یہ ہے سچی بات
جو بھی بازی میں نے کھیلی اس میں کھائی مات
مجھ پر کیا کیا بیتی تجھ کو چاہا اور نہ پایا
دل میں ہوک اٹھی ہے اب کے ایسا ساون آیا

یارانِ حلقہ

ادارہ

ڈھاکہ ۲۲ اگست ۵۶ء

محترم رفیق! السلام علیکم۔ آہستہ روی کی مسابقت میں آپ مجھ سے بازی نہیں لے جا سکتے۔ تقریباً پونے دو ماہ بعد ایک ایسے خط کا جواب لکھنے بیٹھا ہوں جو خاصا کاروباری اور نہایت اہم تھا۔ حسن صاحب کا میں نے لکڑی کے کام کے سلسلہ میں تذکرہ کیا تھا وہ اس دوران میں بیمار ہوئے، اچھے ہوئے اور پھر موسم کا تختۂ مشق بنے۔ سیاسی اور معاشی عالم میں نجانے کیا کیا تغیرات آئے۔ لیکن میں نہ بدلا پر نہ بدلا۔ ہاں صاحب اعتراف کا یہ اسلوب اس لئے میں نے اختیار کیا ہے کہ "منکسرانہ کبر" کے متعلق اصلاحی صاحب کا "فتویٰ" مجھے یاد ہے۔

محترم منظور الٰہی صاحب معاف فرمائیے، کیوں کہ وہ آپ کے دریں اثناء (کاروبار تو خیر کریں گے ہی، غالباً وہ لکڑی کے درآمد برآمد پر چراغِ راہ کے اقتصادیات نمبر کے لئے کوئی مقالہ بھی تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے سوالناموں کا طول "شیخ فضیلت مآب" کے دستار کے طول سے مشابہ ہے۔ نہیں نہیں! میں مجازؔ "مرحوم" کا وہ مصرعہ نہیں پڑھوں گا۔ ع:

جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب!

بہر حال میں اپنے ڈھاکہ کے کاروباری رفیق سے اُن کی علالت اور ضعف کے سبب آپ کے درج کردہ سوالات کا جواب طلب نہ کر سکا۔ دعا کیجئے کہ جلد ہی اس کی نوبت آئے۔

وعدہ تو نہیں کرتا۔ البتہ توقع دلاتا ہوں (تاکہ بقول غالبؔ آپ شکایت تو کر سکیں!) کہ ایک مضمون میں تینوں شاعروں، نعیم صدیقی، ماہر القادری اور کوثر نیازی کو باندھنے کی کوشش کروں گا۔ یعنی شعلۂ خیال، فردوس اور زر گل پر اکٹھے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اشعار نشان زدہ کر چکا ہوں اور ایک منصوبہ بنا چکا ہوں۔ بس تعمیل رہ گئی ہے۔ خوب یاد آیا۔ اسی قسم کی ایک مشکل میں نے اپنے ایک رفیق سے بیان کی اور ان سے پوچھا "کہو! یہ مشکل کام کیسے ہوگا؟" انہوں نے اس کا حل بتلایا "بس کر ڈالو کسی طرح"! یہ تو وہی بات ہوئی کہ جمہوریت کی خرابی کا علاج ہے؟ — زیادہ جمہوریت" بقول کسے دنیا کے سارے کاروبار DOGMAS کے مرہون منت ہیں۔ اس سے کچھ ہمت بندھتی ہے۔ گویہ نظریۂ عمل بالکل انوکھا ہے لیکن یہی واحد عملی نظریہ!

آپ بھی کہتے ہوں گے یہ باتیں خوب بناتا ہے۔ کیا کیا جائے۔ گرہم مشکل نہ گرہم مشکل۔ اچھا فی الحال ایک "عذاب" ارسال کرتا ہوں۔ گوارا کرسکیں تو اسے گوارا کیجئے۔ ایک نظم ہے "مسیح کائنات" اسے ٹھکانے لگائیے۔ نثر کا انتظار کیجئے کہ وہ نازل نہیں ہوتی، دریافت کی جاتی ہے — والسلام فروغ احمد

لہ خطاب خالد احمد صدیقی صاحب سے ہے۔

آپ کیا پڑھیں!

ادارہ

"کنیز" — "نیا گھر"

زندگی کے ہر شعبے میں چند افکار اور معمولات کے تکرار سے ایک ڈگر بن جاتی ہے۔ ڈگر بن چکتی ہے تو بڑی بڑی ذہین اور طباع اور بلند ذوق ہستیاں غیر شعوری طور پر اسی ڈگر کو گئے بعد دیگرے پکڑتی چلی جاتی ہیں۔ آدمی جدت اور ترقی کے نعرے بلند کرتا ہے مگر وہ بھیڑ چال کا پرانا مریض ہے۔ دنیائے ادب میں بھی انسانی فطرت اپنی اسی کمزوری کے ساتھ ہر دور میں کچھ لکیروں کی فقیری کرتی نظر آتی ہے چنانچہ آج ہمارا جدید ادب بھی ایک ڈھلواں ڈگر کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اور جوائد الٹریچر اور ادیب اس پر لڑھک رہے ہیں۔ اس مقدر شدہ ڈگر کے توڑنے سے باغیوں میں ایک نام سید نظر زیدی کا ہے جس سے ہم اپنے حلقہ کو متعارف کرا چکے ہیں۔ برسوں سے غمِ دوراں کا پامال کیا ہوا یہ صاحبِ خودی نوجوان غمِ انساں اور غمِ ایماں کی دوگونہ متاع سے مالا مال ہے۔ اس نوجوان نے اسلامی زاویۂ نظر کے ساتھ انسانیت کی بلند تر اور وسیع تر فلاح کو سامنے رکھ کر مقصدی ادب میں فکر و اسلوب کے لحاظ سے جداگانہ سی راہ اپنے لئے پسند کی ہے۔ اس نے چلمنوں کے پیچھے کی دنیا کو مخاطب کیا ہے جو اس وقت دو تاریکیوں — قدیم کہر آلود تاریکی اور مدید چکاچوند پیدا کرنے والی تاریکی — کی زد میں ہے — سید نظر زیدی نے اس دنیا کی چیخ پکار سن کر بڑے والہانہ جذبے سے صدائے لبیک بلند کی ہے کہ "میں ترے کام آؤں گا۔"

اس وقت سید نظر زیدی کے دو تازہ ناول ہمارے سامنے ہیں جن کا تعلق عالمِ نسوانی سے ہے۔ ان میں سے ایک "کنیز" ہے جس میں عرب کے نظامِ جاہلیت کے سائے میں سسکیاں لیتی ہوئی نسائیت کو ایک کنیز کے کردار میں ڈھالا گیا ہے۔ شریف گھرانے میں پلی ہوئی یہ کنیز ظلم کی چکی میں پستی ہے، انسانی بہیمیت کی زد میں آتی ہے، کوڑے کھاتی ہے، لہو لہان ہوتی ہے مگر اپنے جوہرِ عصمت کو نفسیانیت زدہ درندوں سے بچانے کے لئے ایک مجاہدانہ عزم سے کام لیتی ہے۔ اس کی پوری زندگی قاہر و فاسد ماحول سے کش مکش کرنے میں گزرتی ہے، لیکن اسی دوران میں تحریکِ اسلامی پروان چڑھتی ہے اور مکہ کی بھٹیوں میں تپ کر نکھرنے والے انقلابی کردار کے ساتھ عرب کی نوجوان طاقت مدینہ کو مرکز بنا کر انقلاب برپا کر دیتی ہے تحریکِ اسلامی کا دستِ شفقت اس کنیز کی طرف بڑھتا ہے اور وہ اسے قعرِ مذلت سے اٹھا کر سینے سے لگا لیتی ہے۔ یہ ناول آج کی مظلوم عورت کو دراصل یہ دعوت دیتا ہے کہ اسے اگر کھوئے ہوئے انسانی حقوق مل سکتے ہیں تو اب بھی اسلام ہی کے دستِ شفقت کے ذریعے مل سکتے ہیں۔ مولف کے سامنے اگر عرب کے جغرافیائی و تمدنی ماحول کی مزید تفصیلات بھی ہوتیں تو ناول کی ادبی قدر و قیمت میں خاصا اضافہ ہو جاتا۔ عربی ماحول کو سب سے بڑھ کر علامہ محمد اسد نے "روڈ ٹو مکہ" میں پیش کیا ہے۔ ہمیں بڑی مسرت انتساب کو پڑھ کر ہوئی کہ ان چند حروف کے ذریعے زیدی صاحب نے ہماری قوم کی ایک بلند مرتبہ مجاہد خاتون مسعودہ بیگم نانوتوی کا نام پوری طرح محفوظ کر دیا ہے جس نے اپنی خودی اور آبرو کے تحفظ کی جنگ بھارتی غنڈوں کے چنگل میں کئی برس گرفتار رہنے کے باوجود جاری رکھی اور آخر کار اسی جہاد میں جامِ شہادت نوش کیا۔ درحقیقت سوچا جائے تو مسعودہ ہی کا کردار ناول کا مرکزی کردار ہے۔

دوسرا ناول ہے "نیا گھر"! ہر لڑکی کی طرح عطیہ ماں باپ کے گھر سے رخصت ہو کر نیا گھر بساتی ہے لیکن وہ اپنے اسلامی ذہن و کردار کے ساتھ سسرال کے مغرب زدہ ماحول میں پہنچ کر گول خانے میں چوکھونٹی چیز بن جاتی ہے۔ ٹھیک وہی کش مکش جو عالمِ واقعہ میں بہت سے گھروں میں اسی شکل کے ساتھ یا برعکس صورت میں درپیش ہے۔ یہ کش مکش عطیہ کی نند للی کے آجانے سے بہت ہی تند ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ "ماڈرن گرل" ہے۔ کھلاؤ خطرناک

حد تک جا پہنچا ہے، لیکن علیہ ہی کی قابلیت سے حالات پھر پلٹا کھاتے ہیں۔ آخر کار علیہ مخالف ماحول کو حسنِ کردار سے شکست دے کر نئے گھر بسا جاتی ہے۔ اس کے متوازی چنچل للی بڑے چاؤ سے اپنی پسند کی شادی کا تجربہ کرتی ہے، لیکن چار ہی دن میں یہ تجربہ تلخ انجام سامنے لے آتا ہے۔ للی کے قہقہوں کے شیشے سنگین حوادث کی زد پر آکر ٹوٹتے ہیں اور ان کی کرچیاں آنسو بن کر بکھر جاتی ہیں۔ اس طرح اسلام اور مغربیت کی نظریاتی کش مکش کے میدان میں للی علیہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ ناول مقصدیت کے لحاظ سے صراطِ مستقیم پر گیا ہے مگر علیہ کا کردار کمزور رہا ہے۔ علیہ بہت ہی خشک مزاج اور منفی قسم کے طرزِ عمل کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ یہ کردار دراصل ہمارے ہاں کی جامد مذہبیت کی بڑی گہری پرچھائیں اپنے اوپر رکھتا ہے، حالانکہ اس سے کام اسلام کے تحریکی تصور کے مطابق لیا گیا ہے۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ ناول میں واقعاتی مواد بہت کم ہے اور بحثیں بہت زیادہ ہیں۔ ناگزیر تھا کہ بحثوں میں واعظانہ رنگ پیدا ہو۔ اس سے پہلے بالکل اسی موضوع اور اسی طرح کے پلاٹ کے ساتھ ایک ناول شوکت تھانوی "بکواس" کے نام سے پیش کر چکے ہیں۔ اس ناول میں علیہ کی جگہ جو کردار رکھا گیا ہے وہ مذہبیت میں گنجائش پسند اور غیر محتاط سہی، اچھا خاصا ہنس مکھ اور متحرک کردار ہے۔ علاوہ بریں عورت سسرال میں اپنا مقام بنانے کے لئے جن ہتھیاروں کے ذریعے کامیاب ہوتی ہے وہ ٹالسٹائی کے افسانے "فیملی ہیپی نیس" میں نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ٹالسٹائی نے وہ مواقع بڑے جذباتی اپیل رکھنے والے پیدا کئے ہیں ——— ایک جب شوہر شراب کے نشے میں وحشت آدھی رات کو گھر آتا ہے تو اس ذہنی حادثہ پر بیوی دلی صدمے کا شکار ہو جاتی ہے اور یہی چیز شوہر کا دل پگھلا دیتی ہے، دوسرے جب شوہر معاشی پریشانیوں میں الجھ جاتا ہے تو بیوی اس کے لئے ایثار کرتی ہے۔ اس قسم کا واقعاتی مواد ناول کو زیادہ حقیقی اور دلچسپ بنا سکتا تھا۔ کاش کہ واقعاتی اتار چڑھاؤ ہی کے ذریعے علیہ کا نظریہ اور کردار نمایاں کیا جاتا اور یہ سارا کام مکالموں سے نہ لینا پڑتا۔ ان کمزوریوں کے باوجود ناول مقصدیا دلچسپی کے لحاظ سے ناکام ہرگز نہیں ہے۔

یہ دونوں ناول ایسے ہیں کہ خواتین کے حلقوں میں ان کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے اور زنانہ درسگاہوں اور دوسرے مردوں کی لائبریریوں میں ان کو داخل کیا جانا چاہئے۔ "ادارۂ خواتین" (اچھرہ، لاہور) ان کو خوبصورت پیرائے میں شائع کر کے مبارکباد کا مستحق ہے۔ قیمت علی الترتیب تین روپے آٹھ آنے اور دو روپے چار آنے

آدم کے تین بیٹے ———

کسی بک اسٹال پر جب کبھی آپ کی نظر مندرجہ عنوان کی کتاب پر پڑے گی تو پبلشر کے حسنِ ذوق کے آئینہ دار سرورق کو دیکھ کر آپ خیال فرمائیں گے کہ شاید بچوں کے لئے کوئی نئی معلوماتی کتاب آئی ہے۔ مگر دراصل یہ آدم کے عمر رسیدہ بچوں کے لئے مرتب شدہ مجموعہ ہے افسانوں کا ——— اسعد گیلانی کے افسانوں کا۔ اسعد گیلانی قارئینِ چراغِ راہ کے لئے اجنبی نہیں۔ سب اسے جانتے ہیں، اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی نگارشات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ وہ ادبی ساحر ہے، کیوں کہ وہ خیالوں کو لے کر ان میں جان ڈالتا ہے اور پھر ان کو کردار بنا کر متحرک کر دیتا ہے۔ مگر وہ ساحر ہی نہیں تھوڑا سا کار پیام بری بھی کرتا ہے، یعنی وہ مخاطب کو زندگی اور حرکت دینا چاہتا ہے اس مجموعہ میں اس کے ایسے ہی چند افسانے شامل ہیں جن میں ساحری کے ساتھ ساتھ پیام بری کی گئی ہے۔ ان افسانوں میں وہ زمین کے مسائل لیتا ہے اور ان کو آسمانی انداز سے نمایاں کرتا ہے۔ وہ حقیقت کے کچھ چراغ روشن کرتا ہے مگر خیالیت کے فانوس میں رکھ کر سامنے لاتا ہے۔ فن کے اس خاص دائرے میں محمد حسین آزاد کے بعد اس نے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ "آدم کے تین بیٹے" اور "ایک عورت دو ملک" بڑے اثر انگیز تجربات سامنے لاتے ہیں۔ ان کی فضا واقعاتی مواد نہ ہونے کے باوجود عجیب الف لیلوی سی محسوس ہوتی ہے اور اس کے رنگین دھندلکے میں نظریات کی تاریخی آویزش دلچسپ کرداروں کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مقصدی لحاظ سے اسعد نے ادب میں جو قدم آگے بڑھایا ہے وہ یہ ہے کہ اس معرکۂ افکار میں اس نے اسلام کو مثبت طور پر حصہ دار بنا دیا ہے۔ دوسرے افسانے بھی یہی مزاج اور یہی رنگ رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں اگرچہ نمایاں آفاقیت پائی جاتی ہے مگر اس کے باوجود پاکستان کی

اجتماعی زندگی اس آفاقیت کے اندر پوری طرح منعکس ہے۔

مؤلف کے "حرفِ اوّل" کے ساتھ ہمارے ادبی رفیق فروغ احمد صاحب کی "چند باتیں" بڑی خیال افروز اور پُرمواد ہیں۔ مکتبہ تعمیرِ انسانیت لاہور نے اسے اچھے معیار کے ساتھ چھاپا ہے۔ قیمت ۲/۸

تعلیم القراۃ العربیہ —

دینی اہمیت تو تھی ہی، اب تو پاکستان کی اسلامی ریاست مسلم ممالک سے سفارتی تعلقات کو وسعت دینے کے لئے بھی عربی زبان کو فروغ دینے پر مجبور ہے۔ ناگزیر ہے کہ عربی زبان دانی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے نوجوان ذوق و شوق سے آگے بڑھیں۔ اس سلسلہ میں طریقِ تعلیم اور نصاب کو نیا رنگ دینے کی جو ضرورت ہے اس کے احساس کے تحت بعض لوگوں نے اچھا کام کیا ہے۔ یہ رسالہ بھی ایسی ہی ایک قابلِ قدر کوشش کا مظہر ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف حروفِ ابجد سکھائے جا سکتے ہیں بلکہ خاصا سرمایۂ الفاظ بچے کو حاصل ہو جاتا ہے۔ ہر صفحے پر تین تین ایسے حروف دیئے گئے ہیں جن سے ثلاثی مجرد کا فعلِ ماضی صیغہ واحد غائب بن جاتا ہے۔ بین دگو کے اصول پر ہر فعل کو تصویر سے نمایاں کیا گیا ہے۔ افعال ایسے لئے گئے ہیں کہ ان کا تسلسل تصاویر کے مدد سے دو کہانیوں کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر صفحہ پر دیئے ہوئے تین حروفِ ابجد کے ساتھ ایسی تصاویر بھی ہیں جن کے اسماء انہیں حروف سے شروع ہوتے ہیں۔ اسماء کا ذخیرۂ الفاظ آخری اوراق میں الگ دیا گیا ہے۔ علاوہ بریں قواعدِ ہجا کی تعلیم کے لئے چند مشقیں اور الفاظ کا لغت بھی شامل ہے۔ یہ نئے طرز کی کاوش قابلِ خیر مقدم ہے۔ نظریۂ تعلیم کے لحاظ سے ایک بات قابلِ غور ہے، یہ کہ ایک مصور کہانی چوری کے ایک واقعہ پر مشتمل ہے۔ باوجودیکہ اس کا عبرت ناک انجام سامنے آتا ہے، لیکن پھر بھی داستانِ جرم و سزا پیش کرنا مناسب نہیں تھا۔ تعلیمات کے مدارس فکر اس معاملے میں اختلاف رکھتے ہیں، لیکن ہمارا نقطۂ نظر یہی ہے کہ بچوں کے سامنے کہانی، فلم یا ڈرامے کے ذریعے کسی مجرمانہ فعل کا منظر ہرگز پیش نہ کرنا چاہیئے۔ ویسے اس رسالہ کی دلچسپی و جاذبیت کا عالم یہ ہے کہ جب بھی یہ ہمارے بچوں کے سامنے آتا ہے وہ اس کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی "ہتھکنڈا" ان سے واپس لے کر یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔

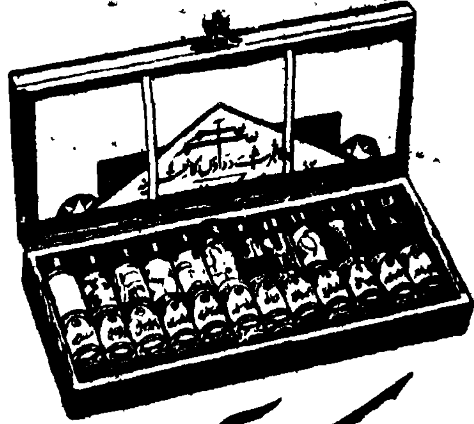
اسے المکتبۃ العلمیہ، ۱۵۔ ایبک روڈ، لاہور نے بڑے حسنِ طباعت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قیمت ۸/

جرائد —

ایک دلچسپ ہفت روزہ "الیومنٹ" کراچی ایم احمد فاروقی کی ادارت میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ اس کی ندرت یہ ہے کہ اس کی دو زبانیں ہیں، یہ دل کی بات اردو اور بنگلہ دونوں میں ایک ساتھ سناتا ہے۔ تاکہ مشرقی اور مغربی دونوں خطوں کو قریب تر کیا جا سکے۔ بہتر ہوتا کہ بنگلہ کو عربی رسم الخط میں لیا جاتا۔ مقامِ اشاعت: بلاک نمبر ۲، ناظم آباد، کراچی۔

انگریزی ماہنامہ "ینگ پاکستان" طلبائے پاکستان کے بعض حلقوں کا ترجمان ہے۔ سیاسی، معلوماتی اور تعلیمی مضامین تنوع کے ساتھ شریکِ اشاعت ہیں۔ تصویریں بھی ہیں، تفریحی مواد بھی ہے اور انعامی مقابلوں کے چند سلسلے بھی اس کے پروگرام میں ہیں۔ ڈھاکہ مشرقی پاکستان سے شائع ہوتا ہے۔ فی شمارہ ۴؍

آپ بھی ڈاکٹر کا بل ۸۰ فیصدی کم کر سکتے ہیں



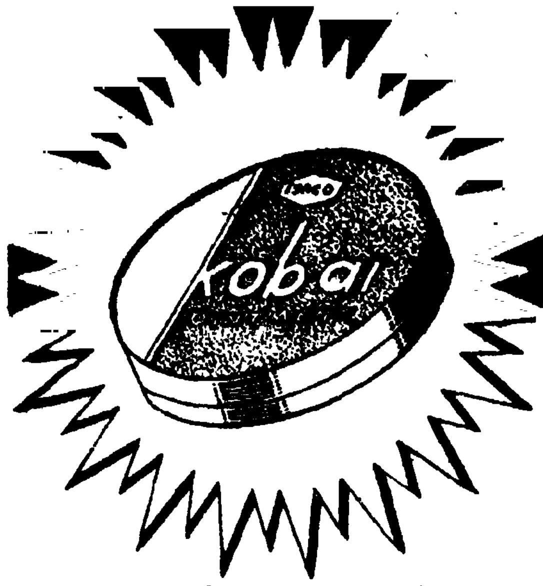


بارہ مُجرّب دواؤں کا خزینہ

گھریلو علاج اور اہل محلہ کی طبّی خدمت کا آسان اور قابل اعتماد ذریعہ
یہ بارہ دوائیں بڑی حد تک آپکی طبّی ضروریات کو پورا کردینگی
مثلاً بخار کھانسی۔ درد، نمونیہ اختلاج قلب خفقان گھبراہٹ ملیریا قبض
اسہال پیچش درد شکم خرابئ جگر تے متلی بدہضمی ہیضہ درد سر نزلہ زکام۔
نکسیر بواسیر خونی۔ درد دنداں۔ درد گوش۔ حاملہ کی شکایات۔ بچّوں کی جلد
شکایات خارش۔ فسادِ خون چوٹ اور زخم وغیرہ تکالیف کا خاطر خواہ علاج
محض ان ہی مختصر دواؤں سے کیا جا سکیگا۔ قیمت بارہ روپے فی بکس

آئی ساکو (پاکستان) کراچی

تیار کنندگان ادویہ
گارڈن ٹرام ٹرمینس ۔ کراچی ۳



کوبائی

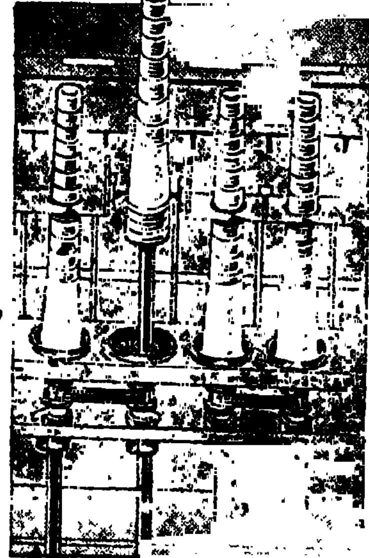
داد، اکزیما اور دیگر جلدی امراض کا بہترین مرہم

مُہاسوں اور چہرے کے دانوں کا موثر ترین علاج

قیمت: ایک روپیہ فی ڈبیہ

آئی ساکو (پاکستان) کراچی

(تیار کنندگان ادویہ)
لارنس روڈ۔ گارڈن۔ ٹرام ٹرمینس۔ کراچی ۳




دسمبر
۱۹۸۶

روشنی — گرمی — حرکت

ماہنامہ **چراغ راہ** کراچی

نومبر، دسمبر ۱۹۵۶ء

شمارہ ۱۱-۱۲ جلد ۱۰

فہرست

سالانہ چندہ: ۵/- روپے ، فی پرچہ: ۸/ آنے

دفتر ادارۂ تحریر: — ۱-۱ اے، محلہ رسول پورہ اچھرہ - لاہور

دفتر اشاعت و انتظام: — فیض محمد فتح علی روڈ کراچی ۱

مستقیم کاظم علی پرنٹر و پبلیشر نے چھپوا کر دفتر چراغ راہ - فیض محمد فتح علی روڈ کراچی سے شائع کیا۔

ادارہ

سوچ بچار

گرد و غبار

مصر کے خلاف برطانوی، فرانسیسی اور یہودی جارحیت سے مغربی امپیریلزم کی نقاب ریا کی رہی سہی دھجیاں بھی تار تار ہو گئیں۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ امن و سلامتی کے نام پر اصول و قانون کا تحفظ کرنے والے درحقیقت محض بت مفاد کے پجاری نکلے جو لاٹھی کی دلیل سے بھینس کی ملکیت ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس واقعہ نے برطانیہ کے رہے سہے وقار کو تباہ کر دیا ہے اور مشرقِ وسطیٰ بلکہ پورے عالمی دائرے میں مغربی بلاک کے اثر کو گھٹا کر روس اور اشتراکی بلاک کے لئے پیش قدمی کے نئے راستے کھول دئے ہیں۔ ڈپلومیٹک نقطۂ نظر سے توازنِ قوت یکسر بدل گیا ہے۔ اس جارحیت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہودی ریاست کو مغربی طاقتوں نے کس مقصد کے لئے پالا ہے اور وہ مسلم ممالک کے خلاف آڑے وقتوں میں کیا کچھ اقدامات کر سکتی ہے۔ اس جارحیت کے علمبرداروں نے یو، این، او کو نظر انداز کر ہی دیا تھا مگر روس کی مداخلت اور اس پر امریکہ کے مجبورانہ ردِعمل نے پندرہ سولہ برس کی اس تعمیر کو کھنڈر بننے سے بچا لیا۔

اس جارحیت کے دوران میں مشرقِ وسطیٰ افریقہ اور ایشیا میں روس کے اثرات کی نئی لہر اٹھ رہی ہے۔ ایشیا، افریقہ اور خصوصاً مسلمان ممالک کو اب سوچنا یہ ہے کہ وہ کیسے ان اثرات سے اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں۔

اس جارحیت کے دوران میں مشرقِ وسطیٰ کے میدان کے اندر انڈیا نے جو ڈپلومیٹک چالیں چلی ہیں ان کی وجہ سے ہمیں بڑا نقصان پہنچا ہے۔ کچھ ہماری اپنی کوتاہیاں تھیں اور کچھ مصر و عرب کے حکمرانوں کی کوتاہ بینیاں جن سے حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ پبلک عام کے تقاضے کے مطابق حکومتِ پاکستان نے پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کے طور پر بڑھ چڑھ کر مصر کی حمایت کی اور طبی اور مالی امداد کے علاوہ رضاکاروں کی پیشکش بھی کی اور بین الاقوامی دستے میں بھی حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن کرنل ناصر نے جن کا دماغ اس وقت آسمان پر ہے، اس برادرانہ پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ بغداد پیکٹ اور اس میں حصہ لینے والی طاقتوں کے خلاف عرصہ سے عرب ممالک کے جذبات برہم ہیں۔ پہلے یہاں اسلام ازم کا تصور ختم کر کے وطنی بنیادوں پر پاک اسلام ازم اختیار کرنے کا جو مشورہ دیا ہے اور خصوصیت سے نون صاحب نے اب یہودی ریاست کو تسلیم کرنے کا جو ارادہ بد اس نازک موقع پر ظاہر فرمایا ہے اس نے تناؤ کو اور بڑھا دیا ہے لیکن اس کا دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں عرب نیشنلزم کا جھنڈا لہرا رہا ہے جس کو ناصر ہی کے ہاتھوں نے پہلے سے زیادہ اونچا کر دیا ہے عرب نیشنلزم کے دائرے میں ناصر کی قیادت جم گئی ہے۔ کوئی دائرہ اگر دوسرے مسلم ممالک تک وسیع ہو جائے تو پھر اس قیادت کو گارنٹی حاصل نہیں رہتی۔ تیسرا سبب یہ بھی ہے کہ انڈیا اور بالخصوص روس مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے ذریعے پاکستان پر دباؤ ڈلوا کر اسے اپنے سامنے جھکانا چاہتے ہیں۔ بہرحال ناصر نے پاکستان کی مخلصانہ پیشکش کو ٹھکرا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔

اس پیچیدگی کو حل کرنے کے لئے ہمارے صدر اور وزیرِ اعظم دوڑ دھوپ کر رہے ہیں وہ حالات سے مجبور ہیں کہ بغداد پیکٹ کا "تابوتِ سکینہ"

ساتھ ساتھ گھسیٹتے پھریں۔ اسی بدنام پیکٹ کو وہ اب "مسلم بلاک" قائم کرنے کے لیے بنیاد بنانے کا نعرہ بلند فرما رہے ہیں۔ حالانکہ وہ کس منہ سے "مسلم بلاک" کا نعرہ لگاتے ہیں جبکہ ان کے وزیر خارجہ بین الاقوامی پالیسی میں اور پوری مخلوط حکمران پارٹی ملکی پالیٹکس میں اسلام کو بنائے ربط ماننے پر تیار نہیں۔

ان حالات نے سہروردی صاحب کو عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔ وہ پہلے خود ہی مغربی طاقتوں سے رابطہ رکھنے کے خلاف زور دیتے رہے ہیں۔ اب اس رابطہ اور خصوصاً بغداد پیکٹ کو بچانے کے لئے سرگرم عمل ہو رہے ہیں۔ اس تضاد نے ان کی اپنی پارٹی میں خلفشار پیدا کر دیا ہے۔ اس طرح ری پبلکن پارٹی کے ساتھ ساتھ عوامی لیگ کی ساکھ بالکل ختم ہوتی جا رہی ہے۔

اب دیکھئے کہ بین الاقوامی دائرے میں بھی اور ملکی دائرے میں بھی اس گرد و غبار سے کیا برآمد ہوتا ہے؟

زکی زاکانی

"کمی"

مے بھی ہے مینا بھی ہے گردش بھی پیمانے کی ہے
تیری محفل میں کمی بس ایک دیوانے کی ہے

ایک دیوانہ غم زندی سے جو سرشار ہو
ایک میکش جس کا دل مئے خانۂ اسرار ہو
جس کے فیضِ چشم سے ہو گردشِ ہفت آسماں
جس کی چشمِ فیض ہو اسرارِ باقی کا جہاں
جس کے دستِ بیخودی میں زندگی کا جام ہو
جس کا لب اِک پرتوِ آئینۂ الہام ہو
ہو بچھونا جس کی خودداری کا فرشِ خاک پہ
نقشِ پا جس کا ہو خنداں رفعتِ افلاک پر
جس کا اندازِ نظر ہو حُسن کی جُوئے رواں
جس کا قلبِ شوق ہو رشکِ حریر و پرنیاں
جس کے داغِ عشق سے ہو روشنی تدبیر کی
جس کے ہاتھوں میں عناں ہو اشہبِ تقدیر کی
جس کی رندی پر عیاں ہو رازِ تسخیرِ حیات
جس کا عزمِ زندگی ہو عزمِ تعمیرِ حیات
بے خودی میں جو طلسمِ جام و مستی توڑ دے
جو زمانے کو جدھر چاہے اُدھر کو موڑ دے
دامنِ صد چاک جس کا لے بہاروں سے خراج
جس کی خاکِ پا کے آگے گرد ہوں شاہوں کے تاج
جو بکھیرے گلشنِ عالم میں تنویریں نئی
جو بنائے خاک کے ذرّوں پہ تصویریں نئی
جس کے دورِ جام میں گردش ہو صبح و شام کی

جس کے دل کی دھڑکنیں ہوں شورشیں الہام کی
جو بنائے ساغرِ نو دل کے ٹکڑے جوڑ کر
پھینک دے جو سب پرانے جام و مینا توڑ کر
جو گدائے راہ ہو لیکن جہانبانی کرے
جو لباسِ فقر میں دُنیا پہ سلطانی کرے

یُوں تو ذوق سے بھی ہے صہبا بھی پیمانہ بھی ہے   دیکھ تیرے میکدے میں کوئی دیوانہ بھی ہے

کوئی دیوانہ بہاریں جس کے قدموں پر نثار
کوئی میکش جس کے چہرے پر ستاروں کا نکھار
کوئی بیخود جس کی مستی مستیٔ ابرِ بہار
کوئی نالہ کش نوائے شوق جس کی دل فگار
روشنی تاروں کو بخشیں جس کی آہوں کے شرار
رختِ مستی پارہ پارہ جس کا دامن تار تار
جس کے ہاتھوں میں زمامِ عالمِ تقدیر ہو
جو سراپا عشق ہو جو حُسن کی تصویر ہو

آہ تیرے میکدے میں کوئی دیوانہ نہیں   آہ اِن رندوں میں کوئی جانِ میخانہ نہیں

ہاں پلا مجھ کو پلا اِک بادۂ مستی کا جام   ہاں دکھا مجھ کو دکھا تنویرِ حسن شاد کام
مجھ کو دیوانہ بنا ہاں مجھ کو دیوانہ بنا   مجھ کو دے اِک جام مجھ کو جانِ میخانہ بنا
اے خدائے بیخودی! رندی و ہشیاری سکھا   مجھ کو دے ساغر مجھے اندازِ میخواری سکھا
تا کہ جامِ زندگی میں خونِ دل اپنا بھروں
تیری محفل کی کمی کو آج میں پورا کروں

سلمیٰ یاسمین نجمی

منٹو ـــــ عظیم افسانہ نگار

میں نے منٹو کے متعلق ابنِ فرید صاحب کا مضمون بھی پڑھا اور سید محسن ہاشمی صاحب کے اعتراضات بھی دیکھے۔ یہ صحیح ہے کہ میں منٹو سے ذاتی طور پر تو ملی نہیں ہوں لیکن ان اصحاب سے ضرور مل چکی ہوں جو اس سے مل چکے ہیں اور میں نے خود اس کو پڑھا بھی ہے اور جو کچھ اس کے متعلق لوگوں نے اور اس کے عزیزوں نے لکھا ہے وہ بھی پڑھا ہے۔

میرا خیال ہے ہاشمی صاحب کو منٹو سے ذاتی طور پر بے حد عقیدت ہوگی اور پھر جیسا کہ معتقد اشخاص کا حال ہوتا ہے کہ جس سے عقیدت ہو اس کو فرشتوں سے بالاتر ہستی تصور کرنے لگتے ہیں، چنانچہ اسی طرح جب انہوں نے یہ مضمون پڑھا تو ان کے عقیدتمندانہ جذبات کو ٹھیس پہنچی ہوگی لیکن انہوں نے ان برائیوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی بجائے بھڑک کر خواہ مخواہ کی طرفداری شروع کر دی۔ انہوں نے ابنِ فرید صاحب کا مضمون غالباً غور سے نہیں پڑھا۔ ابنِ فرید صاحب کیا اگر وہ ان بہت سے لوگوں کے مضامین پڑھ لیتے تو آج انہیں یہ خط لکھنے کی ناحق تکلیف برداشت نہ کرنا پڑتی۔ شروع میں ہاشمی صاحب لکھتے ہیں "جہاں تک منٹو کے فن کا تعلق ہے ابنِ فرید صاحب کی رائے وقیع نہیں کیونکہ اردو تنقید میں ابھی تک ان کا کوئی مقام نہیں" یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہاشمی صاحب کا خیال ہے کہ نقاد ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے یا وہ آسمان سے شہرت کی پوٹلیاں ساتھ باندھ کر لاتا ہے۔ تنقید ہر کوئی کر سکتا ہے۔ اگر اس کی رائے میں وزن ہے اور اس کی تنقید تعمیری ہے تو اس کی رائے ضرور وقیع ہے چاہے ابھی تک اس کا مقام اردو تنقید میں پیدا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ آگے چل کر فرماتے ہیں "لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی شخص خلوص سے کام لئے بغیر ایسی زندگی کی تمام گراوٹوں کو ادب کے قالب میں ڈھال کر عوام کی جیبیں شراب کی بوتلوں کے لئے خالی ار دہ اکر کس طرح عظیم فنکار بن سکتا ہے" میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ اس بات کو کیوں نہ سمجھ سکے، وہ بغیر خلوص کے فنکار کیسے بن گیا خلوص کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ انہیں۔ بظاہر تو خلوص ٹپکتا دکھائی دیتا نہیں، رہا دل کا حال تو خدا بہتر جانتا ہے۔

اب یہ کہ عظیم فنکار کیسے بن گیا، اس لئے کہ عظیم ادب تخلیق کیا۔ عظیم ادب کیسے تخلیق کیا، اس لئے کہ عظیم فنکار تھا، اور یہ فنکاری اس کی پیدائشی صلاحیت ہے اس میں نہ اس کے خلوص کو دخل ہے نہ ہمدردی کو۔ ورنہ ان کے دل میں اور ہمارے دل میں یقیناً خلوص بدرجۂ اتم موجود ہوگا تو پھر ہم کیوں نہیں عظیم فنکار بن جاتے اور نہیں تو ابنِ فرید صاحب کے فقرے میں کہیں کوئی بودا پن نظر نہیں آتا، اس کے برعکس آپ کے اعتراضات بے حد بودے معلوم دیتے ہیں جو عدم واقفیت کا ثبوت ہیں۔

آپ رقم طراز ہوتے ہیں "وہاں ان لوگوں کی آراء کو نظر انداز کر گئے جو علمی اور ادبی حیثیت سے بقول جناب کے

یقیناً ابنِ فرید صاحب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔" تو صاحب آپ ہی ان لوگوں کی آرا سے قارئین کو مطلع فرما دیتے، جہاں انہوں نے منٹو کی پاکیزگی، نیکی، ایمانداری، انکساری، بلند اخلاقی اور انسان دوستی کی تعریف کی ہو۔ اچھا خیر اب میں ہی یہ خوشگوار کام سرانجام دے لوں گی۔

آپ فرماتے ہیں: "منٹو فرشتہ نہ تھے، انسان تھے۔ ان میں خامیاں بھی تھیں لیکن عام انسانوں سے زیادہ نہ کہ اس کے باوجود وہ ایسے فاسق و فاجر[۱] اور اخلاقی لحاظ سے گرے ہوئے بھی نہ تھے جیسا کہ ابنِ فرید صاحب سمجھتے ہیں یا سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

آپ نے یہ جو کچھ لکھا ہے بے حد مضحکہ خیز ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ منٹو میں خامیاں تھیں اور عام انسانوں جیسی، لیکن ایک ایسا شخص جو اپنے کو مصلح کہتا ہو اور جس کا دل ان برائیوں کو دیکھ کر خلوص سے تڑپ اٹھتا ہو وہ انہی خامیوں اور برائیوں میں عام انسانوں سے زیادہ پھنسا ہوا ہوگا تو وہ اس کے متعلق کیا اندازہ لگائیں گے؟ ہم تو اس کو اپنے سے ارفع سمجھیں اور وہ ہم سے بھی گرا ہوا نکلے تو اس سے عقیدت ہوگی یا نفرت؟

اب ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ فاسق و فاجر کا مطلب کیا ہے، پھر ہم منٹو کا تجزیہ کر کے دیکھیں گے کہ وہ کیا تھے کیا نہیں تھے۔ ان کے کردار میں گالی دینا، دھوکا دینا، شراب خوری، جوا اور ان چیزوں کے متعلقہ لوازمات ہمیں بالکل نمایاں ملتے ہیں۔ ان چیزوں کو سامنے رکھ کر فرمایئے کہ اگر وہ فاسق و فاجر نہ بھی تھے تو کیا وہ مصلحِ انسانیت بننے کے سزاوار تھے؟ آیئے ذرا ان کے قریبی عزیزوں اور ان کی بیوی سے قابلِ اعتماد معلومات حاصل کریں۔ لوگ رسائل میں صحیح چیز پیش نہیں کرتے۔

"اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا یا وہ خاموش ہوتا منٹو جھنجھلا اٹھا اور اس نے غصہ سے پاگل ہو کر دو تین غلیظ گالیوں کے ڈھیلے میری طرف لڑھکا دیئے۔" (اوپندر ناتھ اشک "منٹو میرا دشمن")

یہ گالیاں اس نے پہلی مرتبہ نہیں دی تھیں، بلکہ یہ اس کی عادت تھی جس سے سب دوست تنگ تھے اور یہی گالیاں وہ افسانوں میں اپنے کسی کردار سے دلوا کر معصومیت سے کہتا ہے "مجھے کیا کہتے ہو؟ گالی دینے والے سے پوچھو" اور بھولے بھالے عوام خوش ہو جاتے اس کی حقیقت نگاری پر۔ اور اشک اپنے مضمون "منٹو، میرا دشمن" میں لکھتے ہیں کہ منٹو نے ٹائپ رائٹر میرے ہاتھ فروخت کیا اور بیاسی روپے دھوکے سے اپنے پاس رکھ لیے۔ خود منٹو ایک مضمون میں جو انہوں نے اپنے اوپر لکھ کر "نقوش" میں شائع کروایا تھا، لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ انہوں نے اپنی بیوی کو کچھ روپیہ دیا اور اس میں سے سو روپے اڑا لیے اور شراب پی ڈالی۔ بیوی غریب لوکسل پر خفا ہوتی رہی۔

تو یہ حال تھا ان کے منٹو کا۔

"وہ لڑکپن سے ہی دینو یا فضلو کمہار کی دوکانوں کے اوپر جمنے والی جوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا تھا اور ان کو

---

[۱] "فاسق و فاجر" کی اصطلاح ہاشمی صاحب نے یہاں گھٹیا طنز کے طور پر استعمال کی ہے۔ حالانکہ ادبی تنقید کے دائرے میں جب ادیبوں کے کردار جانچے جاتے ہیں تو "دارالافتاء" کی اصطلاحیں استعمال نہیں کی جاتیں، بلکہ ادبی مزاج کی اصطلاحات میں بات کی جاتی ہے۔ اسلام پسند حلقے کے ادیب اور ناقد اپنی حدود کو جانتے ہیں۔ ہاشمی صاحب طنز اور پھبتی پر کیوں اتر آئے؟ (ان ص)

خواب بھی تلاش کے ہی دیکھتا تھا' اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ رند بلانوش تھا اور میں نے شراب تو در کنار سگریٹ بھی پہلی بار ۱۹۴۶ء میں پیا جبکہ میں تیئیس برس کا تھا۔ اس نے کٹرہ گھونیاں ہو، ہیرا منڈی ہو یا فارس روڈ ہو اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے جھانک کر بھی نہ دیکھا۔"

(اوپندر ناتھ اشک "منٹو، میرا دشمن")

اس کے علاوہ اس نے خود اپنے فاجر ہونے کا بھانڈا عصمت کے سامنے پھوڑ دیا' اگر یقین نہ آئے تو عصمت کا مضمون "میرا دوست میرا دشمن" پڑھ ڈالیئے جہاں وہ اس بات پر مُصر تھا اور اس نے قسمیں تک کھا ڈالی تھیں کہ وہ پکا بدمعاش ہے اور ثبوت دینے کو چل دیا تھا اور اس کی بیوی نے نہ جانے اسے کیسے روک لیا تھا۔

فرمایئے! اب آپ منٹو کو کونسا مرتبہ دینا چاہتے ہیں؟

اب اس کی انسان دوستی کو لیجئے۔

"ان کی سب سے بڑی لڑکی کو ٹائیفائڈ ہو گیا تو انہیں اس کا مبہم سا احساس ضرور رہا ہو گا کہ گھر میں روپیہ کی کمی ہے اور علاج کافی مہنگا ہو گا اور انہوں نے اس کے لئے کسی سے قرض لیا لیکن وہ انتہائی ضروری دواؤں کی بجائے وسکی کی بوتل لے کر گھر پہنچے۔ ان کی زندگی میں شراب کی یہ سب سے بڑی فتح تھی۔"

(حامد جلال "منٹو ماموں")

جو شخص اپنی بیٹی سے انسان دوستی کا ثبوت نہ دے سکا وہ غیروں کے ساتھ کیا کر سکے گا' اور سنئیے:

"اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ منٹو کتنا بزدل ہے، کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لئے وہ بہرگئے ۔ لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے' اور مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔"

(عصمت چغتائی "میرا دوست میرا دشمن")

یہ بھی اس کی انسان دوستی۔

اور اس کی بلند اخلاقی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا کہ اس کی ذاتی زندگی میں تو کوئی انسان اس سے خوش نہ تھا——ن م راشد، اشک، بیدی، سنیارتھی، احمد کم و بیش عصمت اور نہ جانے کون کون عزیز قریب تک اس سے عاجز تھے۔

تو جناب یہ تھے منٹو جو بے حد با اخلاق اور عظمت مآب تھے۔

تو یہ تھی اس کی ذاتی زندگی کیونکہ دراصل ہاشمی صاحب اس کی ذاتی زندگی کی صفائی کرنے پر بضد تھے ورنہ ان کی فنی عظمت کے تو ابنِ فرید صاحب قائل ہیں ہی۔

یہاں ان کو غلط فہمی ہو گئی۔ "لیکن منٹو کی تخلیقات محض انہی چند افسانوں تک تو محدود نہیں۔ منٹو نے دیگر بھی تو درجنوں موضوعات پہ افسانے لکھے ہیں۔" حد ہوتی ہے مبالغہ کی، کہنا چاہیئے تھا "لیکن منٹو کی تخلیقات محض انہی درجنوں افسانوں تک تو محدود نہیں منٹو نے

دیگر بھی تو چند موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔" لیکن اس کا جواب تو نسیم صدیقی صاحب نے بہت اچھے طریقے سے دیا ہے غالباً ان کا اطمینان ہو گیا ہوگا۔

آپ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں: "کیا کوئی غیر جانبدار ادبی نقاد منٹو کے افسانوں' بادشاہت کا خاتمہ' ٹوٹو' سڑک کے کنارے' اس منجدھار میں اور 'منظور' وغیرہ کو فنی مرتبہ سے گرا ہوا قرار دے سکتا ہے؟" دیکھئے فنی مرتبہ یا عظمت تو زیر بحث ہے ہی نہیں کیونکہ اس کو تو سب مانتے ہی ہیں۔ لوگ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ اخلاقی لحاظ سے گرے ہوئے ہیں اور بالفرض مان بھی لیا جائے کہ یہ افسانے پاکیزہ اور اخلاق کے تقاضوں سے بھرپور ہیں تو ان چھ سات افسانوں کے علاوہ جو ہزاروں افسانے ہیں وہ کس صف میں آتے ہیں؟ ہاں یہ تو بالکل غلط ہے کہ جیسا غم منٹو کی موت پر ہوا ہے اور کسی کی موت پر نہیں ہوا۔ آپ اپنی بات تو رہنے دیجئے' آپ کو تو ہو سکتا ہے لیکن خدارا سب کو تو مت گھسیٹئے۔

ملاحظہ فرمائیے: "اردو افسانے میں پریم چند سے کرم نسیم تک کے کسی افسانہ نگار نے اتنی تعداد میں عظیم افسانے نہیں لکھے جتنے کہ منٹو نے" پریم چند اور م نسیم پیشہ ور لکھنے والے نہیں ہیں اور جن کا پیشہ ہی قلم کی کمائی کھانا ہو ظاہر ہے کہ انہیں قلم تیز کرنا پڑے گا۔ اب یہ بات کہ ان کے دریائی ادیبوں نے اتنے عظیم افسانے تخلیق نہیں کئے تو یہ سراسر غلط ہے۔ عظیم افسانے لکھنے والے تو بہت ہیں' خود پریم چند نے اردو افسانے کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر یہ سب عظیم افسانے نہ لکھتے تو شہرت کیسے پاتے۔ خیر اب منٹو کے فن کے متعلق علمی ادبی حیثیت رکھنے والے لوگوں کی رائیں بھی ملاحظہ فرمائیے جس کے متعلق آپ کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ اور کسی نے اتنے عظیم افسانے نہیں لکھے۔

وقار عظیم:۔ "مجھے منٹو کی تکنیک میں جو چیز شروع سے کھٹکتی ہے یہ کہ وہ ہمارے سیاسی اور سماجی عقائد اور ہماری اخلاقی قدروں کے خلاف ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جو پڑھنے والے کو SHOCK دے۔ وہ نئی بات کے بجائے غیر متوقع بات کہتے ہیں اور چونکہ آدمی ذہین ہیں اس لئے وہ بات پیدا بھی کر لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بات اتنی غیر متوقع ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس سے بغاوت کرتا ہے"۔

انتظار حسین:۔ "ان کی تخلیق کا تصور یہ ہے کہ جو چیز ہے اسے کہا جائے کہ نہیں ہے۔ یہ رویّہ تخلیق کے لئے بہت مہلک ہے چیزوں سے انکار کرنے سے بات نہیں بنتی"۔

ندیم: "وہ FONTASY اور جھوٹ دونوں کو غلط ملط کر دیتے ہیں"۔

حمید اختر: "یہاں تک کہ اب ان کا مقصد صرف چڑانا رہ گیا ہے"۔

وقار: "اصل میں منٹو پڑھنے والے کو حیرت زدہ کرنا چاہتا ہے"۔

حمید اختر: "اور یہ بات کبھی بہت بڑی ہو جاتی ہے اور کبھی کچھ نہیں رہتی"۔

عبادت بریلوی:۔ "شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ منٹو کے ہاں زندگی کی کشمکش کا کوئی صحیح اور واضح شعور نہیں"۔

ندیم :- "میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ شدید قسم کے انفرادیت پسند ہیں اور ایسے شخص میں غصہ، ضد اور جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ضد میں لکھا اور کہتے ہیں کہ تم اگر "کالی شلوار" سے چڑتے ہو تو میں تمہیں "دھواں" لکھ کر پریشان کر دوں گا۔"

وقار :- "انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ زندگی طرح طرح کی الجھنوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ انہیں گرد و پیش کی زندگی کا صحیح احساس نہیں ہے۔ وہ فرد سے آگے بڑھ کر سوچنا نہیں چاہتے۔"

عبادت :- "ان کے افسانوں میں دو چیزیں خاص طور سے نمایاں ہیں۔ ایک تو افراد کی مصوری دوسرے سماج کے بعض خاص پہلوؤں کا ذکر لیکن ایسے نقطۂ نظر سے جس کے اندر زندگی کا کوئی طبقاتی اور تجزیاتی شعور نہیں ہے۔"

حمید اختر :- "ان کے ابتدائی افسانوں کے پڑھنے سے طوائف سے ہمدردی کا جو اظہار ہوتا ہے (CONVINCING) ہے لیکن آخری کہانیوں میں ضد وغیرہ کی وجہ سے گھن پیدا ہوتی ہے۔"

عبادت :- "گھن پیدا کرنا مقصد بنا رہی ہے۔ یہاں منٹو مقصدی ہو جاتا ہے یہ اس کا بڑا (CONTRIBUTION) ہے۔ اگر اس سماجی شعور کے ساتھ طبقاتی احساس بھی پیدا ہو جاتا تو وہ اس دور کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہوتا لیکن وہ ان مسائل کا کوئی حل نہیں پیش کر سکا۔ وہ اس کا شعور بھی پوری طرح نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ان مسائل پر جھنجھلاہٹ تو ہے لیکن سائنٹیفک زاویۂ نظر نہیں ہے۔"

حمید اختر :- "منٹو گندگی اچھالتے ہیں لیکن اس کا کوئی مداوا نہیں پیش کرتے۔"

ناجرہ :- "طوائف کے بارے میں تو ہوا لیکن 'بو' اور اسی قبیل کے دوسرے افسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

وقار :- "یہ ایک ذہنی تعیش اور بے بسی کی نشانی ہے۔"

عبادت :- "منٹو صاحب 'ٹھنڈا گوشت' وغیرہ نہ لکھتے تو یہ ان کی بڑائی ہوتی۔"

انتظار :- "مختصر افسانے کی تکنیک پر منٹو پوری طرح حاوی ہیں لیکن ادب محض تکنیک ہی تو نہیں اس سے باہر نکل کر دیکھیں تو ان کے افسانوں کی اتنی وقعت نہیں رہتی۔"

وقار :- "اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھی فنی تخلیق کے لئے جس انہماک، کاوش و جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے وہ منٹو کے پاس نہیں ہے۔ بیدی بعض حیثیتوں میں منٹو سے آگے ہیں۔ بیدی فنکار کی حیثیت سے لغزش کرنا گناہ سمجھتا ہے۔"

عبادت :- "منٹو بعض وقت زندگی کے حقائق کا مضحکہ بھی اڑاتے ہیں۔ اس کا اثر ایسا نہیں ہوتا۔ اگر وہ سماجی نظام کو سمجھتے اور اس کی بنیاد طبقاتی شعور پر ہوتی تو شاید وہ ایسا نہ کر سکتے۔" (اردو سمپوزیم "نقوش")

اچھا اب ختم کرتی ہوں اور فیصلہ ہاشمی صاحب پر چھوڑتی ہوں۔

اور ہاں اب وہ مہربانی فرما کر مجھ سے میرا مقام نہ پوچھ بیٹھیں کہ تم نے جو منٹو پر قلم اٹھایا تو تمہارا اردو تنقید یا ادب میں کیا مقام ہے اور اگر ایسا ہوا تو ان کو بھی اپنے مقام سے مطلع کرنا پڑ جائے گا ویسے یہ زمانہ تو آزادیٔ رائے کا ہے ہر شخص اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہے۔

رضوان بریلوی

چراغاں

وہ پو پھٹی وہ قدم ظلمتوں کے تھرائے   وہ رنگ و نور کے پرچم ہوا میں لہرائے
وہ کھل گیا درِ زنداں وہ چھوٹ گئے قیدی   قدم قدم وہ بہاروں نے پھول برسائے
عروجِ آدمِ خاکی کا وقت آپہنچا   فضا میں تیرتے پھرتے ہیں آتشیں سائے
سنِ جدید کے بانی اے غمِ جہاں والے
وہ چل پڑے افقِ نو سے کارواں والے
طلوعِ صبح کے لب پہ ہے نغمۂ منصور   نیا نظام لئے آگیا نیا دستور
کسان جھوم اٹھے کھیت لہلہا اٹھے   وہ گہری نیند سے گھبرا کے چونک اٹھے مزدور
خوشی کے گیت چھڑے، سرخوشی کی لے گونجی   زمیں سے تا بہ فلک بچھ گئی بساطِ نور
رہِ طلب میں وہی ارجمند ہوتے ہیں
جو لوگ دل سے تغیر پسند ہوتے ہیں
زمانہ جس کا بہت مدتوں سے تھا مشتاق   وہ دور آہی گیا لے کے دعوتِ تریاق
عوام چیخ اٹھے "انقلاب زندہ باد"   بکھر گئے جو نئی داستاں کے کچھ اوراق
کبھی کے موت کی وادی میں جا چکے روپوش   تمام مستِ دسیسہ ستم شہرۂ آفاق
غریب ملک کی تقدیر جگمگا اٹھی
سنہرے دور کی تاریخ مسکرا اٹھی!

ابوالوفا حجازی

منزل تو نہیں یہ!

منزل تو بہت دُور، بہت دُور کھڑی ہے
معلوم نہیں سنگِ گراں اور ہیں کتنے؟
سایہ بھی نہیں راہ میں اور دھوپ کڑی ہے ——— اے قافلے والو!

آوارہ خیالی، وہی گم گشتہ نگاہی
ایسے میں یہ کیا وقت ہے آرام و سکوں کا؟
منزل تو متعین ہوئی، بے ذوق ہیں راہی ——— اے قافلے والو!

ہر گُل کو مئے شوق سے سرشار بناؤ
ڈھونڈو کوئی اِس نرگسِ بیمار کا دارُو
گلشن میں صبا کی طرح پیغام سناؤ ——— اے قافلے والو!

دم لینا مناسب سرِ منزل ہی روا ہے!
اِک ایک قدم گرچہ کٹھن مرحلہ ہو گا،
کیا جذبِ وفا بھی کبھی ناکام ہُوا ہے؟ ——— اے قافلے والو!

گھبراؤ نہ گھمبیر ہوئے جاتے ہیں سائے
اُمّید کی ہر ایک کرن ڈوب چلی ہے
ظلمات میں خورشیدِ درخشاں کو چھپائے! ——— اے قافلے والو!
تن من سے رہِ شوق میں بازی تو لگا دو
انسان کو انساں کی غلامی سے چھڑا دو
مٹنے ہی کو آیا ہے، سو باطل کو مٹا دو! ——— اے قافلے والو!

پسند اپنی اپنی!

نعیم صدیقی

(ایک لڑکی کا خط)

بچپن میں کبھی ہم ملے تھے، کھیلے بھی ہوں گے، مل کر ہنسے اور روئے ہوں گے اور کبھی نہ کبھی لڑے بھی ہوں گے۔ مگر اب یہ خواب حافظے کی گہرائی میں اتر کر اس طرح تہ نشین ہوا ہے کہ کوشش کرنے کے باوجود کچھ یاد نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ میرے تازہ خوابوں کی تعبیر میں اس دیرینہ خواب کا کچھ رنگیں پرادہ اگر شامل ہو جاتا ہو۔ کبھی کبھی میں اپنے خوابوں میں اپنے آپ کو ایک گڑیوں کھیلتی بچی کے روپ میں دیکھتی ہوں، میرے اردگرد میری کچھ جانی پہچانی سہیلیاں ہوتی ہیں اور کچھ خاندان اور پڑوس کے لڑکے بھی، کبھی کبھی ان میں کوئی اجنبی چہرہ بھی دکھائی دے جاتا ہے، ممکن ہے کہ یہ آپ ہوتے ہوں۔ سوجھ بوجھ کی عمر کے بعد سے نہ آپ نے مجھے دیکھا، نہ میں نے آپ کو۔ بس ایک تصور رہا کہ آپ بھی ہمارے عزیزوں میں سے ہیں اور پڑھ رہے ہیں، بہت زیادہ پڑھ رہے ہیں، بہت بڑے آدمی بننے میں لگے ہیں۔ کبھی لاہور میں کبھی کراچی میں، کبھی جرمنی میں کبھی امریکہ میں! پھر یہ بھی سنا کہ آپ چیف انجینئر ہو گئے ہیں۔ بڑی تنخواہ ہے، ٹھاٹھ باٹھ ہیں، سلامیاں اور ڈالیاں ہیں۔ یہ سن کر سب خوش ہوتے، لیکن بات ہوتی اور آئی گئی ہو جاتی۔

بڑا حادثہ ہوا کہ آپ نے ہمارے ہاں قدم رنجہ فرمایا اور میرے لئے عنایتِ خاص کا بھی اظہار کیا۔ بدقسمتی سے آپ کی آمد کا تار پہنچنے سے چند ہی گھنٹے قبل میں بھائی جان کے ہمراہ ایبٹ آباد جا چکی تھی۔ افسوس کہ ملاقات کی سعادت سے محروم رہی۔ واپس آنے کے بعد میرے سامنے برابر آپ کا تذکرہ رہا۔ آپ کے لطیفے اور چٹکلے سنے، آپ کے سندباد جہازی جیسے سفروں کی داستانیں سنیں، آپ کی کامیابیوں کے ہمت آموز واقعات معلوم ہوئے، آپ کی عادات اور آپ کے اطوار کا نقشہ آنکھوں میں آراستہ ہو گیا اور آپ کی تصویر کی زیارت نصیب ہوئی۔

"شادی"؟ —— ہمارے یہاں بچاری عورت کب شادی کرتی ہے، شادی تو مرد کی ہوتی ہے۔ عورت بچاری تو بس ایک "بکرہ منڈی" میں لے جا کر گھمائی جاتی ہے اور دلّال اور قصاب اسے نگاہوں سے جانچتے اور ہاتھوں سے ٹٹولتے ہیں بلکہ ضرورت ہو تو اس جیتی جاگتی بھیڑ بکری کو ترازو پر ڈال کر تول لیتے ہیں۔ اچھی بھیڑ بکریاں تو خود ہی ہمک کر ترازو کے پلڑے میں جا چڑھتی ہیں اور آنکھوں آنکھوں میں کہتی ہیں کہ دیکھا ہم کتنی فربہ ہیں، چھری تلے سے نکلنے کے لئے بہت ہی موزوں! آج کل پڑھی لکھی بھیڑ بکریوں کی مانگ ہے، اس لئے منڈی میں یہ مال تیزی سے آ رہا ہے۔ گلے میں ایم اے اور بی اے کی سنہری سندیں آویزاں کئے چلی آ رہی ہیں۔ آج کل یہ بھی چاہا جاتا ہے کہ بھیڑ بکری اچھی میاں نے والی ہو۔ ناچ تھرک بھی سکتی ہو، ایک باڑے کی نہ ہو رہے بلکہ ہر طرف کھلتی ملتی پھرے۔ سو وقت کی طلب کے مطابق ماڈرن بھیڑ بکریاں خوب سدھ کر آتی ہیں۔

اب آپ بھی اس منڈی میں گھومنے لگے ہیں۔ میں آپ کا خیر مقدم کرتی ہوں۔ ہماری اس بکرمنڈی میں آپ کے ذوقِ خریداری کے

مطابق بہت سا رنگا رنگ مال موجود ہے۔ آپ آئیں تو سہی، چاروں طرف سے کالجوں کی سیدھی سادی بھیڑوں بکریوں کے غول آپ کو گھیر لیں گے اور ہر ایک یہ آرزو کرے گی کہ اسے آپ کی نقرئی چھری سے ذبح ہونے کی سعادت نصیب ہو۔

معاشرے نے آپ کی اس کنیز تابندہ سیما کو بھی یہاں لا کھڑا کیا ہے، اور وہ اس سے بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ ایک ترقی یافتہ قسم کی بھیڑ بکری ثابت ہو۔ مگر خوش قسمتی سے اسے ایسے ماں باپ ملے جنہوں نے اسے انسانی شعور سے مالا مال کیا ہے اور اس کے اندر اپنی خودی کا دیا روشن کر دیا ہے۔ معاف کیجئے گا کہ تابندہ سیما بھیڑ بکری نہیں ہے۔ وہ آپ کی بوجھل جیب میں بھرے ہوئے سکوں کی کھنک کے نغمے پر مست نہیں ہو سکتی۔ اس نے تعلیم ضرور حاصل کی ہے، مگر اس لئے نہیں کہ وہ نمبروں کے گلوبند کی طرح پہلو میں لٹکائے شادی کی بکرمنڈی میں پہنچے اور اچھے داموں بک جائے۔ میں نے تعلیم دل و دماغ اور فکر و کردار کی تعمیر کے لئے حاصل کی ہے۔ میرے سامنے خوابوں کی دنیا کا کوئی خیالی ہیرو کبھی نہیں رہا بلکہ اب تک میں اپنی زندگی کی ہیرو خود ہی رہی ہوں۔ اب آپ ہیرو بننا چاہتے ہیں، سوچ میں پڑ گئی ہوں کہ کیا کروں!

آپ کی تصویر میرے سامنے ہے۔ کاغذ کے پرزے پر ایک خوبرو نوجوان اپنے ڈرائنگ روم میں کھڑا ہے جس کے چہرے سے ایک شرارت آمیز مسکراہٹ جھلک رہی ہے۔ ہماری ماڈرن بھیڑ بکریوں کے دل موہ لینے کے لئے یہ جو کچھ ہے، بہت کافی ہے۔ یوسف ثانی، انجینئر وہ بھی "امریکہ پلٹ"، پھر بڑی تنخواہ، کوٹھی، موٹر، نوکر چاکر، یورپین زندگی، کلب اور بال روم کے ہنگامے ـــ اس سے زیادہ شاندار اور رنگین جنت کسی لڑکی کے خوابوں میں کہاں آ سکتی ہے۔ اس سے آگے کی کوئی منزل کسی بھیڑ بکری کے تصور میں نہیں آ سکتی۔ مجھ جیسی پچاسوں کو آپ ایک ہی سودے میں خرید لے جا سکتے ہیں۔

میں اس تصویر میں ـ ـ اس تصویر کے خوبرو نوجوان میں ـــ ایک اور چیز تلاش کرنے لگی۔ کیا کوئی ایسی نشانی باقی رہ گئی ہے جو کہے کہ یہ نوجوان مسلمان ہے، کم سے کم اتنا بتائے کہ یہ پاکستانی ہے۔ افسوس کہ کوئی ایک اثر بھی دیکھا باقی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوبرو نوجوان کوئی یہودی ہے۔ کوئی غیر مسلم ہے

اس کے سینے میں خودی نہیں، اپنے آپ کا شعور نہیں، اس کے اپنے کچھ نظریات و تصورات نہیں۔ اس کا اپنا کوئی کردار نہیں۔ یہ تو موم کا گڈا ہے جسے غیروں نے جس سانچے میں چاہا ڈھال دیا، جو لباس اسے پہنانا چاہا پہنا دیا اور جس طرح کا کردار مناسب سمجھا اس کے اندر پیدا کر دیا۔ اس کے اندر مدافعت کی قوت ہی موجود نہیں۔ عورت کا زنانہ پن بھی اس مردانگی سے کچھ زیادہ کڑا ہوتا ہے۔ مجھے اگر روپے یا عہدے یا کوٹھی یا موٹر سے شادی کرنی ہوتی تو میں اس وقت خدا جانے کن ارمانوں کی فضا میں پرواز کر رہی ہوتی اور کن امنگوں کے جھولوں جھول رہی ہوتی۔ اگر مجھے ایک موم کے گڈے سے کھیل کر عمر گزارنی ہوتی تو اس سے بہتر کوئی دوسرا انتخاب ممکن نہ تھا۔ دوسری طرف انکار بھی کرتے ہوئے جھجک ہوتی ہے ـــ آہ، ایک قابلِ رحم موم کا گڈا۔

تصویر میں کارنس پر سجا ہوا آرٹ کا ایک دلکش نمونہ نگاہوں سے خراجِ تحسین لئے بغیر چھوڑتا نہیں۔ بڑا ہی نادر شاہکار آپ نے تلاش کیا ہے۔ کسی لڑکی کا مرمریں مجسمہ جو کپڑے کی دو چھوٹی سی دھجیوں سے زیادہ کا شرمندۂ احسان نہیں ہے۔ رقص کی ایک فنکارانہ حرکت وقت کے آئینہ میں رنگوں کے جادو نے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دی ہے۔ نیچے نام کے حروف پڑھے نہیں جا رہے، مگر یہ ہے کوئی ایکٹریس ـــ میں نے یہ تصویر فلمی اشتہاروں میں دیکھی ہے۔

اس دلچسپ تصویر کی لڑکی نے مجھ سے باتیں کیں اور آپ کے بارے میں دلچسپ انکشافات کئے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ ایف، ایم سلامت عورت کو ہوس کا ایک کھلونا مانتے ہیں ––– ایک جھنجھنا ––– ایک گڑیا – جاپانی سے چھوٹا جھولتی گڑیا – وہ عورت کو انسان نہیں مانتے، اس کی عزت نہیں کرتے، ہمیں اس سے تفریح کرتے ہیں، دل لگی کرتے ہیں، غم غلط کرتے ہیں وہ لباس پہنتے اچھی لڑکی باتیں کرتے کرتے لبورنے لگی اور اس کی گفتگو فریاد میں بدل گئی کہ سلامت کی نگاہ میں عورت ایک بیہودہ بیہودا ایکٹیوالی کا کوچ ہیں۔ اس نے سرگوشی کی کہ وہ عورت کو بے لباس عیاں، عاری رکھنا چاہتے ہیں۔ میں یہ سنتے ہوئے ایسی گم سم ہوئی کہ مجھے کچھ پتا نہ رہا کہ کہاں ہوں۔ ایسا معلوم ہوا کہ آپ کمرے میں گھس آئے ہیں، آپ کی آنکھوں میں بہیمیت کے شرارے تڑپ رہے ہیں اور جیسے ننگا ہوں ننگا ہوں میں، تجھے کھا جانا چاہتے ہیں۔ کھانے سے پہلے میرا لباس نوچ دینا چاہتے ہیں۔ بلکہ میری کھال اتار دینے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں – اور یہ خواب کے سے عالم میں دیکھتی ہوں کہ آپ ایک خونخوار چیتے میں بدل گئے ہیں، میری حرکت قلب بند ہو جاتی۔ لیکن تصویر کے پردے سے نکل کر وہی ایکٹریس لڑکی بیچ میں آ کودتی ہے چیتا اس کے آگے گھونگھٹی ڈال دیتا ہے، اور میں جیسے بیہوش ہو کر گر پڑتی ہوں – ہوش میں آتی ہوں تو کچھ دیر ششدر رہنے کے بعد اپنے اوپر ہنسی آتی ہے کہ خیالوں ہی خیالوں میں میں کس عالم سے ہو آئی – وہی آپ کی تصویر سامنے ہے اور اس تصویر کے اندر وہی ایکٹریس ناچ کی ایک دلآویز حرکت کے ساتھ کاغذی قفس میں جکڑی دکھائی دیتی ہے – آپ مسکرا رہے ہیں اور میں سوچ رہی ہوں – آپ کی دعوت پر لبیک کہہ دوں تو آپ میرے پورے نسائی کردار کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے، آپ مجھ سے وہ کچھ چاہیں گے جس کے لئے میں موزوں نہیں ہوں – میں آپ کے اس ذہنی سیار کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی جو تصویر میں کارنس پہ آراستہ ہے۔ مگر ساتھ ہی آپ کے جذبات کا لحاظ بھی بہت ہے – کیا کروں!

میز پر آپ کی کتابوں کی قطار بھی بڑی خوبی سے سامنے آتی ہے۔ نظر جما کر ایک ایک کتاب کا نام پڑھا جا سکتا ہے۔ زیادہ تر کتابیں انجینئرنگ سے متعلق ہیں – دیکھتی ہوں، کوئی ادبی چیز بھی ہے؟ ––– اچھا، یہ "ہیملٹ" ہے – اور کیا ہے؟ ہیں کوئی اور چیز نہیں – یہ ایک یادگار بھی شاید تشنگیٔ ذوق کی باقی ہے۔ ہاں مگر یہ "سن ہاتھ" تو ادھر رکھا ہے ناں! اور بائیں ہاتھ "قرآن" کے پیچھے تہ بہ تہ رکھے دکھائی دیتے ہیں – فقط اس میز کا مطالعہ کر کے آپ کی پوری شخصیت کا جغرافیہ میں نے پڑھ لیا ہے۔ آپ اگر چاہیں تو میں آپ کے ذہن کے حدود اربعہ سے لے کر پیداوار وں تک کے بارے میں مرتب کیا ہوا مشکل سے مشکل پرچہ حل کر سکتی ہوں اور فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو سکتی ہوں۔ مگر میں آپ سے جغرافیہ کیا بیان کروں، یہ تو بڑا خشک موضوع ہے – میں نے پہلی نگاہ میں تو یہ دیکھا کہ اس سرمایۂ کتب میں کہیں وہ کتاب بھی جگہ لے سکی ہے جس نے مجھے اور آپ کو نظریاتی، اخلاقی اور ملی و اجتماعی وجود دیا ہے۔ لیکن مجھے اپنی جسارت بے جا پر سخت ندامت ہوئی۔ اب وہ وجود رہ ہی کہاں گیا ہے ایک نام باقی ہے سو وہ نام اسی طرح باقی رہے گا۔ الحمد للہ ہم مسلمان ہیں! سوچتی ہوں کہ جس گھر میں اور جس ماحول میں قرآن ہی کو جگہ نہ ملی اس میں عورت کی جگہ کہاں ہو گی! عورت کے لئے عزت کی جگہ بنانے والا تو قرآن ہی تھا۔ وہ گیا تو عورت گئی۔ اب تو جگہ ایک ایکٹریس ہی کی رہ گئی ہے۔ ہنسے کھیلے، ناچے کودے اور خوش رکھے۔

آپ کا دل توڑنا تو مجھے کسی حال میں پسند نہیں، لیکن سوچتی ہوں کہ اگر میں "لبیک" کہہ دوں تو مجھ پر قابو پاتے ہی آپ تقاضا کرنا شروع کر دیں گے کہ برقع جیسی علامت ماضی کو ترک کر دوں، پھر آپ دوستوں کی مجالس میں بٹھائیں گے اور سینما اور کلب لے جانا شروع کریں گے، پھر آہستہ

آہستہ موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کریں گے، پھر چاہیں گے کہ تھوڑا سا ناچ بھی جاننا چاہئے، پھر آپ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اچانک ثقافت کی اُس پھسلواں ڈھال سے لڑھکا دیے جائیں گے جس پر ان گنت ہزاروں جوڑے اور غول لڑھک لڑھک کر ایک گندے گڑھے میں جا گرتے ہیں اور پھر کبھی نکل نہیں سکتے۔

آپ کے ساتھ چلوں تو میرا مستقبل یہی ہو سکتا ہے اور اس کے تصور سے ہی کانپ جاتی ہوں۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کیوں نہ آپ کو بچانے کے لئے آگے بڑھوں۔ قوم نے ایک ذہین اور قیمتی نوجوان کو جو اس کے لئے تعمیر و ترقی کے دروازے کھولنے والی موثر طاقت بن سکتا ہے، پرائے افکار کے جادو سے چھڑاؤں اور گھٹیا اور گندے جذبات و مقاصد سے نکال کر خودی کے مرتبۂ بلند پر لے آؤں۔ مگر...... مگر...... اپنی جیسی صدہا لڑکیوں کا انجام دیکھتی ہوں تو ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ مقابلہ سلامت کی ذات سے نہیں، ایک فرد سے نہیں ——— ایک عالمی طوفان سے ہے اور اس عالمی طوفان کے مقابلے میں تابندہ سیما جیسی کمزور لڑکی کیا کر سکتی ہے۔

تابندہ سیما دل کی کمزور نہیں ہے، ایمان اور خودداری رکھتی ہے مگر اس کا یہی کارنامہ بہت ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو بچائے، بائے اور اپنے ہونے والے گھر کو قلعہ کی طرح محفوظ رکھ کر اس کے اندر عمر کے چند سال مسلسل پتہ ماری کرے اور اس کی حدود میں نیا ماحول بنائے اور تعمیری کام کے لئے نئے کردار کی تشکیل کرے۔ بس یہ ایک سا امنگ ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے، یہ اگر نہ رہے تو میں بآسانی تیار ہو جاؤں گی کہ سلامت کی خاطر بھیڑ بکری بن جاؤں اور ذبح ہو جاؤں۔

ہاں! آپ کے پیغام کے ساتھ میرے والدین کے سامنے ایک پیام اور بھی آیا تھا۔ ایک سادہ و غریب نوجوان ہے، تعلیم یافتہ بھی ہے اور "مسلم" بھی! اس کے سرمایۂ ایمان و اخلاق کو دیکھتی ہوں تو اس کا ہاتھ تھام لینے کو جی چاہتا ہے اور ایک مجاہدانہ ولولہ سا ابھر آتا ہے کہ فقر و فاقہ کے خارزاروں کو پار کر جاؤں گی۔ دوسری طرف آپ کی تنخواہ اور عہدے اور کوٹھی موٹر کا تقاضا ہے کہ اس طرف مڑو۔ ادھر مڑنا چاہتی ہوں تو میرا ایمان، میری تہذیب، میری قوم، میری تاریخ سب میرا دامن پکڑ لیتے ہیں۔ بڑی دیر میں اس کشمکش میں مبتلا رہی۔ آج صبح کی نماز کے بعد میں نے اپنے آقا سے گڑگڑا کر دعا کی اور پھر ذہن نے بیٹھے بیٹھے آخری فیصلہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے امّی کو اشارۃً آگاہ بھی کر دیا ہے۔

سو آپ کی دلکش تصویر واپس ارسال کر رہی ہوں آپ نے توجہ فرما کر جو عزت افزائی کی تھی اس کے لئے بہت شکر گزار ہوں۔

بقیہ:- اسلامی ادب اور جمود

اس سلسلے میں جماعتِ اسلامی کے طریقِ کار پر ایک لمبی بحث انہوں نے بے جا طور پر اس ادبی موضوع کے تحت چھیڑی ہے۔ ایسی بحث کا مقام یہ نہ تھا۔ یہاں اگر اہم امور قضیے حل کرنے بیٹھیں تو اصل موضوع بالائے طاق دھرا رہ جائے گا۔ پس میں نے اس بحث کو یہاں سے نکال دیا ہے اور ایک مستقل حیثیت میں اس پر اظہارِ خیال کو اگلے شمارے کے لئے کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں یہ ناگوار ہو لیکن ہر لحاظ سے یہی اسـ تھا۔

فضل من اللہ

اسلامی ادب اور جمود

یہ کسی کہانی کا عنوان نہیں ہو سکتا لیکن جی چاہتا ہے کہ اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو بھی ایسا ہو۔ اپنی تو طبیعت کا رنگ ہی ایسا ہو چلا ہے۔
جون ۱۹۵۶ء (تقریباً چار ماہ ہوئے) "چراغ راہ" میں اس موضوع پر محترم شبنم سبحانی کا ایک مراسلہ نعیم نے شائع کیا اور اس
کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات کا اظہار بھی کر دیا۔ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ رسائل میں عام طور پر ایسا ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اس خاکسار کو
اس قول و افعال میں کچھ کہنے کے جراثیم نظر آئے۔ چنانچہ اس نے اس موضوع پر کچھ لکھ ڈالا۔ یہ تحریر چند دن اس کے پاس مسودہ کی شکل میں رہی کہ
اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس طرح گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر نظریے گھڑنا اور انہیں کسی موضوع پر چھاپ دینا مناسب نہیں۔ بہتر ہو گا
کہ مختلف اسلام پسند ادیبوں سے اس موضوع پر باقاعدہ استصواب رائے کر لیا جائے۔ اس خیال کی پشت پر جیلانی کی سرگزشت تھی،
جیلانی نے عرصہ سے جب کچھ نہ لکھا اور خوش قسمتی سے مجھے ان سے لاہور میں ہی ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا تو دوران ملاقات اس
موضوع پر بھی گفتگو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ وہ عرصہ تک علیل رہا ہے اور اس لئے کچھ نہیں لکھ سکا۔ نظریہ سازی سے پہلے یہ حق ہے کہ ہمیں لکھنے والوں سے بھی
پوچھ لینا چاہیے کہ انہوں نے کس تقریب میں جب [illegible] کا مراسلہ جن حضرات کی خدمت میں ارسال کیا گیا ان کے
اسمائے گرامی یہ ہیں ——— پروفیسر آسی ضیائی صاحب رامپوری، پروفیسر [illegible] حمید صاحب، جناب آباد شاہپوری، [illegible] جیلانی، آثم مرزا،
اسعد گیلانی صاحب، ابو الخطیب صاحب، منظر حسین صاحب، محمود فاروقی صاحب، حمید اللہ [illegible] صاحب، نجم الاسلام صاحب،
اصغر عابدی صاحب اور ابو المجاہد زاہد اور جناب بشیر احمد ارشد، جناب عبد الغفار حسن، جناب عرفان غازی اور جناب ابو صالح اصلاحی۔
ایک کاپی اس مراسلہ کی نعیم صاحب کی خدمت میں بھی بھیج دی تا کہ وہ اس نشستہ کی اطلاع پائیں۔ یہ مراسلہ ۴ جولائی ۱۹۵۶ء کو حضرات
کی خدمت میں ارسال کیا گیا۔

باسمہ سبحانہ

اچھرہ - لاہور - ۴ جولائی ۱۹۵۶ء

مکرمی محترمی سلام مسنون

"چراغ راہ" کی حالیہ اشاعت میں محترم شبنم سبحانی صاحب کا ایک نامۂ گرامی شائع ہوا ہے جس میں فاضل
مکتوب نگار نے موضوع مندرجہ بالا پر گفتگو فرمائی ہے۔ زیر نظر مکتوب میں اسلامی ادب پسند ادیبوں کو دو حصوں
میں تقسیم کیا گیا۔ اوّل وہ اصحاب جن کے قلم ۱۹۵۰ء تک رواں دواں رہے اور بعد ازاں [illegible] جمود طاری ہو گیا

انتہائی پریشان کن ذہنی حالات میں لکھتا رہا ہوں ـــــ رہا دوسرا سوال تو اسے طوالت کے سبب اگلی بار کے لئے اٹھا رکھتا ہوں اس پر تبادلۂ خیال اور تنقید دونوں ضروری ہیں۔"

تیسرا گرامی نامہ مورخہ ۱۶ر جولائی کو سیالکوٹ سے جناب آسی ضیائی صاحب رامپوری نے اس فقیر کے کشکول میں بجواب "شیئاً للہ" ڈال دیا (موصوف کی یہ اسمی ترقی قابلِ داد ہے کہ پہلے گنہگار (عاصی) تھے اور اب ہیں آسی (رحمت باری کے امیدوار!) آپ نے رقم فرمایا:

"۴ر جولائی کا مراسلہ موصول ہوا۔ جواب میں چند دن کی تاخیر بعض مصروفیتوں کی بنا پر (جو اپنی جگہ خود آپ کے ایک سوال کا جواب بھی ہیں) ہو گئی۔ بیشک میں نے ایک عرصہ سے کچھ نہیں لکھا ہے۔ لیکن یہ عرصہ اول تو طویل نہیں، دوسرے میرے اپنے لکھنے کی اوسط رفتار بھی کم و بیش تین سال سے اتنی ہی رہی ہے اس کی تفصیل یوں ہے:

اگر آپ میری لکھی ہوئی چیزوں کا جو ۱۹۵۰ء تک شائع ہوئی ہیں تاریخ وار جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ نظموں اور غزلوں کے علاوہ یہ تمام چیزیں (جن میں افسانہ، ڈراما، تنقید سب شامل ہیں) اوسطاً چھ سات فی سال سے زیادہ نہیں، گویا میں پہلے بھی کچھ بہت زیادہ نہیں لکھتا تھا، البتہ اس وقت تحریک کے علمبردار جو آمد لکھنے والے تھوڑے سے تھے اور تحریک کے ساتھی پُرجوش۔ لہٰذا ایک چیز شائع ہوتے ہی بہت جلد سب کی نظروں میں آجاتی تھی۔ پھر جب بعض پرانے رسالے مالی کمزوری یا حکومتی دباؤ کی بدولت بجھنے یا ٹمٹمانے لگے، نئے نئے رسالے نئے اور گمنام تر نوشقوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نمودار ہونے لگے، پڑھنے والوں کے سامنے دوسرے اہم تر مسائل آگئے یا ادب کی طرف سے مایوسی اور پڑھنے کی طرف بدذوقی بڑھتی چلی گئی تو میرا لکھنا بھی لوگوں کی نظر میں بہت کم یا نہ ہونے کے برابر قرار پایا" حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ۵۰ء کے بعد میں نے کم لکھا، لیکن اتنا کم نہیں کہ بالکل روپوش سمجھا جانے لگوں۔ میری طرف سے اس کمی کی وجہ میری دوسری ذمہ داریوں کا اضافہ ہے۔ ستمبر ۴۹ء تک میں آزاد تھا، اپنے وطن کے محاورے کے مطابق "ہنکا" تھا، فرصت بھی خوب تھی اور مشق بھی چڑھی ہوئی تھی۔ ماہ مذکور میں میرے سر پر عائلی ذمہ داریوں کی گٹھڑی رکھی گئی۔ گو اس نے بھی وسط ۵۳ء تک میرے ادبی مشغلے پر کوئی خاص پابندی نہ لگائی تھی۔ مگر اس سال کے مذکورہ زمانے سے آج تک یہ عائلی زنجیریں ایک حد تک میرے قلم کو بھی ...... پابند کئے ہوئے ہیں پھر بھی میری اپنی تصنیف "کھوٹے سکے" (۵۰ء) کے بعد میں نے جتنا کچھ ۵۴ء کے وسط تک لکھا وہ ایک اور اتنے ہی ضخیم مجموعے کی شکل میں مرتب ہو سکتا ہے مگر اس دفعہ کسی ناشر نے حوصلہ افزائی نہ کی ورنہ یہ مجموعہ بھی شائع ہو جاتا۔ تنقیدی مضامین ان کے علاوہ ہیں۔

ابھی ۵۴ء کے نصف آخر میں میں بھارت گیا اور وہاں چھ مہینے صرف ہوئے جن میں چار مہینے "سرکاری ضیافت" میں کٹے جس کا حال آپ کو بھی معلوم ہوگا۔ اس طرح یہ پورے چھ مہینے بالکل خالی گئے۔ پھر ۵۵ء میں بھی کم و بیش چار مضامین "تعمیر انسانیت" میں اور شاید ایک "چراغ راہ" اور ایک ہفتہ وار "ایشیا" میں شائع ہوئے۔ اب اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟

البتہ اس سال میرا کوئی مضمون ابھی تک کہیں نہیں نکلا، صرف سالنامہ "عفت" کے لئے ایک چیز لکھی ہے جو امید ہے کہ ناول کی شکل اختیار کر لے) تو اس کی وجہ مجھ سے نہیں "مقامی رفقائے جماعت اسلامی" سے پوچھئے جنہوں نے میرے ہزار انکار کے باوجود مقامی امارت بھی میرے سر چپک دی۔ ادب نواز ساتھیوں میں سے سب نے میری اس نئی ذمہ داری پر میرے ساتھ اظہار ہمدردی کیا اور اسے مجھ پر ظلم قرار دیا، لیکن بہرحال یہ ایک واقعہ ہے جس نے میری آزادی اور بھی سلب کر لی۔

سردست میرے پاس ایک مسودۂ کتاب برائے اشاعت دو سال سے تیار ہے جس کا موضوع اقبال کی شاعری پر اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہے۔ مگر ہمارے کسی ناشر کو پسند نہیں کہ تفریحی کتابیں ہی چھاپیں، چہ جائیکہ خالص علمی۔ جب حالات یہ ہوں تو آپ ہم لوگوں ——— کم از کم مجھ ——— سے کیا توقعات قائم کر سکتے ہیں؟

رہا آپ کا یہ سوال کہ اسلامی ادب جمود کا شکار ہے تو میں کہوں گا شاید ایسا ہی ہو۔ بہت دن سے میرے پاس چراغ راہ، منبر اور بعض دوسرے رسائل نہیں آرہے ہیں کہ اس بارے میں صحیح صحیح بتا سکوں۔ ہاں! یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے شروع ہی سے اس کا کھٹکا تھا۔ نئے ادیبوں نے ادب کو نہ معلوم کیا سمجھ لیا تھا کہ بقول شخصے "کانا اور لے دوڑی" والا معاملہ کر رکھا تھا۔ ادب سے لئے خصوصاً مقصدی ادب کے لئے جو شرائط میرے خیال میں ضروری ہیں ان کا کئی بار اپنے مضامین میں ذکر کر چکا ہوں، مگر شاید ان پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ اب جو انہی شرائط کے فقدان یا نقصان کی بدولت قلم شکستہ پڑ گئے، ذہن خالی ہو گئے تو شکایت ہونے لگی کہ ادب میں جمود ہے! میں کہتا ہوں کہ صحیح معنوں میں حرکت ہی کب تھی؟ حرکت کے لئے مقصد سے سچی لگن، صحیح ادبی صلاحیت اور ضروری فنی واقفیت شرط ہیں اور یہ تینوں نہ ہوں تو ادب کہاں! پہلی شرط کا حال تو خدا ہی جانتا ہے کہ کس کس میں کتنی ہے، دوسری اور تیسری کا پول ہمارے ادیبوں نے اپنے قلم سے خود کھول دیا۔ پھر خود ہی سوچئے ادب کہاں سے آتے گا: آتش بازی کی روشنی بڑے زور شور اور تیزی سے پھیلتی ہے مگر ادھر مصالحہ ختم اُدھر پلیہ ختم! اندھیرا ہی اندھیرا! پائیدار روشنی لانا ہے تو بجلی گھر بنا بیٹھے، اس کی تمام ضروری مشینری فراہم کیجئے، ایندھن کا انتظام کیجئے پھر دیکھئے کیسی روشنی ملتی ہے۔

مکرر: یہ چند سطریں عدم فرصتی کے باعث قلمبند کی گئی ہیں۔ ممکن ہے آپ کی ان سے تسلی نہ ہو سکے اگر آئندہ اس سلسلے میں آپ کچھ اور چاہیں تو انشاءاللہ تفصیل کے ساتھ لکھوں گا بلکہ ایک منصوبہ اور لائحہ عمل بھی تیار کرنے کی کوشش کروں گا جس سے ہمارے ادیب بہت کچھ استفادہ کر سکیں گے۔"

معاف کیجئے گا ایک نظم معریٰ تو رہ ہی گئی۔ اس کے "شاعر" اپنے منظر حسین صاحب ہیں۔ قیاس آرائی کی اجازت ہو تو لاہور بیٹھے عرض کروں کہ "منبر" کراچی (ایڈیٹر مرزا عبدالغفور بیگ) کی ترتیب میں منظر صاحب کا بھی ہاتھ ہے ——— نظم معریٰ ملاحظہ ہو:

عنوان ہے ۸۶ ؍ ۷ :

کراچی۔ ۶ جولائی

آپ کا نوازش نامہ مورخہ ۴ جولائی ۵۶ء ملا، شکریہ!

میں ادیب نہیں اس لئے آپ کے سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہوں

میری چند تحریروں پر نہ جائیے گا

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

نوٹ: آئندہ اس موضوع پر خط و کتابت کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجئے گا

منظر حسین، مخلص

میں مزید جوابات کا منتظر تھا۔ مجھے کم از کم آثم، پروفیسر عبدالحمید، ابوالخطیب، محمود فاروقی اور بھارت سے کسی اور رفیق کے جواب کا انتظار تھا ——— اور اب تک انتظار ہے۔

ادھر میں نے چاہا کہ آسی ضیائی صاحب کی خدمت میں ایک اور عریضہ بھیج کر کچھ اور حاصل کیا جائے اور ادھر آسعد صاحب سے منظر صاحب کے متعلق کچھ پوچھا جائے کہ یہ حضرت جو ابھی تک کوئی نہ کوئی اچھی چیز لکھ دیتے ہیں، ادیب کو کافر ہونے کے برابر کیوں خیال کر رہے ہیں لیکن یہ خیال ذہن ہی میں رہے اور وقت گزرتا گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ ان احباب کو جن کی نوازش سے میں اب تک محروم رہا تھا یاد دہانی کرانے کا خیال آیا مگر یہ خیال بھی حقیقت نہ بن سکا اور وقت پھر گزرنے لگا۔

چند دن ہوئے کاغذات میں پہلے اس موضوع پر سرکلر نظر آیا۔ پھر وہ سطور جو "چراغ راہ" کے اس عنوان پر خیالات کے جواب میں تحریر ہوئی تھیں۔ سوچا کہ ان کے تار ایل سے اچھا خاصا مضمون تیار ہو سکتا ہے۔ مگر پھر طبیعت کا آلکسی پن غالب آنے لگا اور یہ موضوع ذہن سے اترنے لگا۔

اور پھر یہ موضوع فراموش ہو گیا۔

اور شاید ان سطور کی نوبت ہی نہ آتی کیونکہ آج بھی انہیں ضبط تحریر میں لانے کی خواہش کے باوجود ارادہ نہ تھا۔ آج سو کر اٹھنے کے بعد بالکل تازہ دماغ ہونے کے بعد سوچ رہا تھا کیا کیا جائے، کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ سونے سے پہلے السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں ایک کہانی تھوڑی سی پڑھی تھی ناچار وہی شروع کی اور ختم کر ڈالی اور پھر یہ سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ عین اس موقع پر خالدہ آئی ———
"ابا جی یہ خط آیا ہے۔" اس نے کہا۔۔۔ خط ملنے کی جتنی خوشی مجھے ہوتی ہے اتنی ہی بچوں کو ہوتی ہے۔ یہ خط نعیم نے لکھا تھا اسی موضوع پر یعنی "اسلامی ادب اور جمود"! لیجئے صاحب لکھنے کی تحریک ہو گئی۔ خام مواد موجود تھا تکنیک طے ہوتے دیر نہ لگی اور ان سطور کے ارقام کا آغاز ہو گیا ——— اب کیوں نہ یہ فقیر گوشہ نشین اپنی "سخنہائے گفتنی" پیش کرے؟

زیرِ نظر سوالنامہ کے دو حصے ہیں اوّل یہ کہ ایک عرصہ سے کچھ کیوں نہیں لکھا (اور اسی سوال کے ضمن میں یہ سوال کیا گیا ہے کہ اگر کچھ لکھا تو قابلِ ذکر ادبی تخلیق پیش نہیں کی) دوم یہ کہ کیا اسلامی ادب میں جمود ہے اگر ہے تو کیوں؟ اور اس جمود کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟

پہلے سوال کا جواب جہاں تک میرا تعلق ہے نفی میں ہے۔ میں لکھتا رہتا ہوں اور میری ہر دوسری تحریر میری پہلی تحریر سے بہتر ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ میں ایک لمبی مدت تک کچھ نہیں لکھ پاتا مگر پھر مجھ پر تحریر کا دورہ پڑتا ہے اور ایک طرح میں تقریباً حساب بے باق کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ خاموشی کا وقفہ کیوں ہوتا ہے میرے خیال میں مجھے یہاں اس کے متعلق مختصراً کچھ لکھنا چاہیئے۔

میرا خیال ہے اس خاموشی کا سبب میں خود ہی ہوں۔ میں ایک مخصوص ذہنیت کا مالک ہوں یعنی میں جماعتِ اسلامی پاکستان سے وابستہ ادیبوں کی سی ذہنیت نہیں رکھتا . . . . جماعتِ اسلامی (پاکستان) کی دستوری جدوجہد کے سلسلہ میں جو استدلال پیش کیا جاتا ہے، صاف بات ہے، وہ مجھے اپیل نہیں کرتا (اور یہ مندرجہ بالا نظریات کی بنا پر یہ عجیب بات بھی نہیں) میری رائے میں پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ فقط یہ ہے کہ اس کے (اسلامی نظام کے قیام کے) مسنون طریقِ کار کے مطابق یہاں اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے جدوجہد برپا رہے اور اس کے ساتھ یہاں مذہب نواز سیکولر جمہوری ریاست قائم رہے جس کے سربراہوں کو زیادہ سے زیادہ مسلمان، مخلص اور محبِ وطن ہونا چاہیئے۔

طریقِ رسول پر کام کرنے والی جماعت کی سعی کی بدولت بالآخر معاشرے کے صالح ترین افراد اسلام کو اپنا لیں گے اور اس طرح اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔

بدقسمتی سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

ان حالات میں میرے لئے افسانے لکھنا ایک وبال ہو گیا۔ نیز بدقسمتی سے میں اتنا پڑھا لکھا نہ تھا کہ منافقت سے زیادہ دیر کام لے سکتا۔ ادب زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں، ادب میں منافقت بمشکل ہی نبھ سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں کوئی ایسی تخلیق پیش نہ کر سکا جسے اسلامی ادب میں کلاسیکی حیثیت حاصل ہوتی۔ پھر اپنے نظریات کی بنا پر میں نے ادب کا مطالعہ بھی ترک کر دیا لیکن جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ جن نظریات کو میں نے سینے سے لگایا ہوا ہے ان کو پیش کرنے کے لئے ایک بہتر اور زندہ اور شخصیت کی ضرورت ہے۔ اب پھر ادب میری پناہ گاہ بن گیا چنانچہ میں نے کبھی قوم کی خاطر لکھا کبھی سوسائٹی کی بہتری کی خاطر اور کبھی سوسائٹی کے غلط نظام کے خلاف باغی کی حیثیت سے۔ "قسمت اور عقل" (مطبوعہ "مشیر") قومی برتری کی جانب ایک کوشش ہے، "سمن کپنا" (مطبوعہ "تحریک" دہلی) میں سوسائٹی کے غلط نظام پر طنز کیا گیا ہے اور "سگریٹ" (تمثیل مطبوعہ "تحریک" دہلی) میں "عشقیہ شادی" پر طنز ہے۔

آسی ضیائی صاحب کے نزدیک تخلیقِ فن کے لئے مقصد کا شعور ضروری ہے۔ اگرچہ اس رائے سے مجھے اتفاق تو ہے لیکن اس میں میں اس قدر اضافہ کروں گا کہ تخلیقِ فن کے لئے فطری ملکہ (TALENT) کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقصد اسے (ملکہ کو) مختلف صورتوں میں بروئے کار لانے کے لئے جذبۂ محرکہ کا کام دیتا ہے اور اگر مقصد ایسا ہو کہ خود اس میں ارتقا ہوتا رہے تو اس مقصد پر ایمان رکھنے والا ادیب بھی اس اعتبار سے آفاقی، کلاسیکی اور گہرا ادب پیدا کرے گا۔ ورنہ بات جذباتیت سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ مثال کے طور پر اسعد گیلانی

صاحب کے ہاں (کہ موصوف جماعت اسلامی لائلپور کے امیر ہیں) ایک سطحی خطابت چھائی ہوئی ہے۔ ان کا مجموعہ "ایک عورت دو ملک" یا ان کا ناول (یا رپورتاژ) "جہنم کے دروازوں پر" اٹھا دیکھئے میری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔ اس کے برعکس م نسیم صاحب کا کوئی اچھا افسانہ دیکھ لیجئے وہاں ایک دھیمی دھیمی اور گہری گہری کیفیت ہو گی ——— اور یہ بات موضوع پر بھی چسپاں ہے۔ خود نعیم کی "اذان دعوتِ حق" اور "یہ کون تھا کس کا تھا" کا موازنہ کر لیجئے حقیقت واضح ہو جائے گی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک ہی نام رکھنے والی جماعت دو ملکوں میں بالکل مختلف اور متضاد طریق کار اختیار کئے ہوئے ہے۔

اس وقت میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا مزاج ایک صالح ادیب کا مزاج بن چکا ہے جس کے پس منظر میں جن کے غیر شعور میں اسلامی اقدار اپنا کام کر رہی ہیں۔ لیکن اس کیفیت کو کیسے ترقی دی جائے، کیسے قائم رکھا جائے اور اس میں کیسے گہرائی پیدا کی جائے یہ سوال مجھے پریشان کر دیتے ہیں اور یہاں پہنچ کر مجھے ایک ذہنی جمود کا احساس ہوتا ہے۔

میری رائے میں ہمارا ادب ——— اسلامی ادب ——— جمود کا شکار ہے۔ یہ فیشن نہیں امر واقعہ ہے۔ جمود نام ہے حرکت کی نفی کا اور یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ ہمارے یہاں حرکت نہیں برائے نام ہی ہے ایک عام جمود کی سی کیفیت پائی جاتی ہے جو کہیں نظر نہیں آتی ہمارے اچھے لکھنے والے لکھنے میں مگر ان کے ہاں مقصد اور فن دونوں کے لحاظ سے کسی ارتقا کا احساس نہیں ہوتا۔ اسی کیفیت کو غیر حرکی کیفیت کو جمود کا نام دیا جاتا ہے۔

میرے نزدیک اس کی وجہ سیاسی ہے یعنی جماعت اسلامی (پاکستان) کی سیاسی تحریک اور اس کا یہ ہے کہ اسلام پسند ادیب و شاعر دراصل جس جماعت اور اس کا فکری لٹریچر ہے اور وہ کچھ نہ کچھ تخلیق کرنے کے لئے اسی کے نتائج میں پیدا ہوتی ہے بلاوجہ غیر شعوری ہے شعوری نہیں اس جماعت کی سیاست گزشتہ نو برس میں اس ڈھب پر چلی ہے کہ بظاہر پیش قدمی کرتی اور فتح و شکست کے پھیر سے الگ نظر آتی ہے ——— قرار داد مقاصد سے لے کر دستور اور اسلامی جمہوریہ کے اعلان تک یہی کیفیت ملتی ہے۔ ان حالات میں ادب کی حیثیت ثانوی سے بھی کم رہ جاتی ہے اور اس سے بڑھ کر اولین حیثیت سیاسی کاموں کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسعد نے سیاسی کاموں میں جتنا حصہ لیا ادب کے لئے اس نے ظاہر ہے اس کا دسواں حصہ بھی حصہ نہیں لیا۔ یہی حال بہاری اور اب آسی ضیائی صاحب کا ہے۔ ان حالات میں سیاست اور صحافت کی تو ترقی ہو سکتی چاہئے ادب کی نہیں (اور نہ ہی اس کی چنداں ضرورت ہی رہتی ہے) کیونکہ اگر اس ملک کی موجودہ سوسائٹی کو سیاسی جدوجہد کے ذریعہ حکومت پر قبضہ کر کے بدلا جا سکتا ہے تو ادب کا لٹریچر کھڑا کرنے سے حاصل؟ ادب کی جگہ صحافت نے لے لی تو زیادہ مناسب ہے لیکن پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ادب کو اس درجہ مقدس کیوں قرار دیا جائے؟

ادب کو مقدس بنانے کے خلاف سب سے پہلے میں نے کوثر نیازی کے "شبیر کے افسانہ نمبر" پر تبصرہ کرتے ہوئے آواز اٹھائی تھی اور ادبِ اسلامی میں جمود کا رونا رونے والا ان ادبی حلقوں میں یہی پہلا تھا۔ اس وقت تو سوائے صدیق الحسن صاحب کے ایک جلالی مکتوب کے کچھ نہ ملا مگر بعد میں "چراغِ راہ" میں کوثر نیازی نے بھی موضوع چھیڑا مگر اسعد صاحب اور دوسروں نے اپنے مکاتیب کے ذریعہ درجہ بدرجہ

خیریت کے علاوہ کچھ نہ کہا۔ اب کے شبنم سبحانی صاحب نے یہ موضوع چھیڑا ہے۔ شبنم سبحانی صاحب غالباً بھارت کے رہنے والے ہیں وہ اگر یہ بحث اٹھائیں تو قابلِ فہم ہے کیوں کہ وہاں جس انداز سے کام ہو رہا ہے اسے ادب کی ضرورت ہے، وہ اچھے ادیب اور اچھے ادبی جریدے پیدا کر رہی ہے جن کے ہاں ایک اتفاقی ذہنیت ملتی ہے اور اب میں اس موضوع کو ہوا دے رہا ہوں کیونکہ میرے نظریات اسی بات کے طالب ہیں)

اس لئے مناسب یہ ہے کہ ہم یہ فیصلہ کرلیں آیا ہمیں ادب کی ضرورت ہے بھی کہ نہیں؟ محض اس دعوے کی تسکین کے لئے ہم نے ادب کا میدان بھی خالی نہیں چھوڑا، کام نہیں چل سکتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ مسئلہ "اسلام پسند ادیب" نہیں کر سکتے، یہ فیصلہ جماعت اسلامی کو کرنا ہوگا اور جماعت اسلامی (پاکستان) شاید ہی ایسا فیصلہ کر سکے۔ ممکن ہے پاکستان کے دونوں بازوؤں میں ہونے والے انتخابات (اگر وہ کبھی ہوئے بھی) اس ضمن میں کچھ مدد ہوں (اگرچہ ماضی کا تجربہ حوصلہ افزا نہیں)۔——

اس فیصلہ کی عدم موجودگی میں ہمارے یہاں ادبی جمود ہے۔ اسی سبب سے لاہور میں حلقۂ ادب اسلامی بار بار بنتا اور بگڑ جاتا ہے اور اس کے سربراہ کسی نہ کسی (بنیادی نقطۂ نظر سے) اچھے اخبار سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ ابو صالح اصلاحی، بشیر احمد ارشد اور عبدالقادر حسن کے نام مثال کے طور پر لئے جا سکتے ہیں۔

اس بنیادی سبب کے علاوہ کچھ ذیلی اسباب ہیں (جو بنیادی اسباب معلوم ہوتے ہیں) یعنی:۔

(۱) تنقید کا فقدان

(۲) تحسین کی عدم موجودگی

(۳) اشاعتی اداروں کا نہ ہونا۔

(۴) ادبی حلقوں یا ادبی مراکز کی غیر موجودگی۔

تنقید کے فقدان کا یہ عالم ہے کہ ہم گذشتہ نو برس میں ایک نقاد بھی پیدا نہیں کر سکے۔ حد یہ ہے کہ سرے سے اسلامی ادب کی کوئی واضح تعریف و مفہوم ہی متعین نہیں ہے۔ تنقید کی کمی کو باہر کے نقادوں سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی "اذان" پر مظفر حنفی صاحب سے تبصرہ کروایا گیا، نتیجہ معلوم! کیونکہ انسان دنیا میں غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ آخر ایک ایسا شخص جسے ہمارے مقصد سے پرِ کاہ کے برابر دلچسپی نہیں ہماری پیش کردہ چیزوں کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے تلخ تنقید سے عیوب کی نشان دہی اور ہمدردانہ مشورے کیسے دے سکے گا؟ لے دے کے ایک آسی ضیائی صاحب تھے سو وہ بھی امیرِ جماعت ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون!

ہمارے ہاں تحسین کا فقدان ہے۔ تحسین —— جی ہاں تحسین (APPRECIATION) وہی تحسین جس کے متعلق مومن نے کہا تھا ؎

تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

تحسین سے مراد یہ نہیں کہ اپنے ادبی رفقاء کو بانس پر چڑھایا جائے (پہلے ترقی پسند بدنام تھے اب اس حمام میں غیر ترقی پسند بھی ننگے ہیں) مقصد یہ ہے کہ جو لوگ ادب کے شوقِ فضول کو ثواب کا کام سمجھ کر اختیار کرتے ہیں اور اس کے لئے محنت کرتے ہیں آپ کو بھی ان کی طرف

برابر متوجہ ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ کسی مصنف کی تحریر آپ کے ہاں تین ماہ پڑی رہے اور پھر بوقتِ ضرورت کام آئے۔ کسی تحریر کے وصول کے کم سے کم پندرہ دن بعد مصنف کو اس کے متعلق جواب پہنچ جانا چاہئے اور اگر وہ تحریر قابلِ اشاعت نہ ہو تو اس کے متعلق مصنف کو مفید مشورے ضرور ملنے چاہئیں۔ یا اگر وہ قابلِ اشاعت ہو تو شکریہ کا خط لکھنے کے لئے تین پیسے کا کارڈ اور چند منٹ ضرور نکلنے چاہئیں۔ جو لوگ پختہ مشق ہوں یا مقصد کے اعتبار سے ثقہ ہوں وہ ان باتوں کی پروا نہیں کرتے لیکن بے چارے مبتدی حضرات انہی باتوں کی وجہ سے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

پھر تحسین کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ ایک مصنف کے مجموعی کام پر ناقدانہ نظر ڈالیں، اس نے آپ کے مقصد کی جو خدمت کی ہے اسے سراہیں اور اس سے مزید خدمت لینے کے لئے اسے مفید مشورے دیں۔

پھر جو شخص آپ کے مقصد کی یا اپنے مقصد کی ادب کے ذریعہ تبلیغ کرتا ہے کوئی وجہ نہیں آپ اس کی ذات سے دلچسپی نہ لیں۔ اس کی زندگی کو اس طرح پیش کریں کہ خود اسے محسوس ہو کہ وہ کوئی خدمت سرانجام دے رہا ہے اور یہ خدمت اس پر چند ذمہ داریاں عائد کرتی ہے۔

پھر یہ بھی ایک صورتِ تحسین ہی کی ہے کہ ایسے لوگوں کے ادبی مجموعے مرتب ہونے چاہئیں اور شائع ہونے چاہئیں جن سے ان کی مالی مدد ہو۔

پھر یہ بھی ایک صورت ہے کہ جس مصنف سے آپ ایک مضمون اشاعت کے لئے حاصل کریں اسے کم از کم سال بھر کے لئے پرچہ مفت بھیجیں۔

جہاں تک ادبی حلقوں یا مراکز کا تعلق ہے ان کے ضمن میں پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ بھارت کے سلسلہ میں میں البتہ پُر امید ہوں۔ مجھے مولانا مودودی کی اس رائے سے بالکل اتفاق ہے جس کا اظہار آپ نے قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ قبل مدراس میں فرمایا تھا یعنی تحریکِ اسلام کے لئے بھارت میں کام کے زیادہ مواقع ہیں۔ وہاں اگر مختلف جگہوں پر ادبی حلقے قائم نہ ہوں تو جہاں زیادہ سے زیادہ ادیب ہوں (مثلاً لکھنؤ) وہاں مرکزی حلقۂ ادب قائم ہو جانا چاہئے اور اس حلقہ کو مختلف لکھنے والوں سے مضامین حاصل کر کے ان کی جانچ پڑتال کرنی چاہئے۔ ہفتہ وار ادبی اجتماعات بھی مفید ہو سکتے ہیں اور غائبانہ صدر کے ذریعہ بھی کام کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی مجلس میں صدارت کے فرائض شمسی ضیائی کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ حلقہ کا سیکرٹری مضامین نظم و نثر اور ان پر بحث آسی صاحب کی خدمت میں بھیج دے جو اپنے خیالات سے کم سے کم وقت میں حلقہ کو مستفید فرمائیں۔ یہ خیالات بعد میں حلقے میں سنائے جائیں اور متعلقہ مصنفوں تک پہنچا دئے جائیں۔

اب چلتے چلتے ایک لطیفہ سنئے۔ ادب میں جمود کا رونا تو اردو کے سبھی حلقوں میں رویا جاتا ہے (سوائے ہمارے پاک مصنفین کے)۔ لیکن شبنم صاحب کی طرح ادیبوں سے جواب طلبی کا خیال کسی ادیب یا ادب کے کسی طالبِ علم کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہم اسلام پسند مصنفین اس کے لئے بسر و چشم تیار ہیں۔ لیکن اس مسئولیت کا ایک غیر مسلم ادیب پر کیا اثر پڑا ـــ اس نے جھلا کر نیو رائٹنگ (New Writing) لندن کے ایڈیٹر جان لیہمن (John Lehman) کو لکھا:

TENNYSON HA TEN YEARS SILENCE

RIMBAUD WENT FROM VERSE TO VIOLENCE

HOUSMAN HAD ONLY ONE OFERTILE
PERiOD. CANT i FOR A WHILE
WiTHOUT SOME HORRiD EBiTOR
Dunning like a low-class creditor

اس وقت انگریزی ادب میں جمود کا مسئلہ درپیش نہ تھا۔ قصہ فقط اس قدر تھا کہ جان لیہمن نے ایڈیٹرانہ ضروریات یا شامت اعمال کے باعث ان شاعر صاحب سے درخواست کی کہ وہ عرصہ سے کچھ نہیں لکھ رہے لہٰذا کچھ بھیجیں اور یہ جواب پایا۔

اب میں نعیم کا وہ خط پیش کرتا ہوں جو اس مضمون کی تحریک کا باعث ہوا اور جس کا میں نے اپنی حقیر رائے بیان کرنے سے پیشتر ذکر کیا تھا اسے اس کہانی کا سسپنس سمجھئے، مجھے یہ عقدہ بھی حل ہونا ہے:

ا-۱ اے رسول پورہ۔ اچھرہ لاہور۔
۲۶ ستمبر ۱۹۵۶ء

مکرمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ آپ کا ایک قرض میرے ذمہ ہے یعنی ایک مطبوعہ مراسلہ آیا تھا اور اس کا جواب نہ دیا جا سکا۔

ادب میں جمود کے متعلق میری رائے "چراغ راہ" میں آ چکی ہے۔ جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے یہ تو میں برابر کر رہا ہوں رہا یہ مسئلہ کہ کوئی قابلِ ذکر ادبی تخلیق پیش کی ہے یا نہیں، یہ دراصل میرے فیصلہ کرنے کی چیز نہیں۔

والسلام
نعیم صدیقی

اور یوں یہ کہانی ختم ہوتی ہے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں محولہ بالا سرکلر نعیم صاحب کی خدمت میں اطلاعاً ارسال کیا گیا تھا، یہ جواب قدرت نے ان سے لکھوایا تا کہ میں یہ سب کچھ لکھ سکوں۔ یہ خط خوب بھی ہے اس لئے کہ میں چار چار مقتدر ادیبوں کی رائے اسی موضوع پر پیش کر سکا اور اپنے پریشان افکار سے آپ کو پریشان کیا لیکن اس کا ناخوب پہلو یہ ہے کہ اس کاغذ نے ـــــ اس مختصر سے پرزۂ کاغذ نے میری روح کو ٹھیس پہنچائی۔ میں اور نعیم چند گز فاصلے پر رہتے ہیں مگر بوجوہ اتنی دوری ہے جیسے لاہور اور کراچی! کہ اس دوری کے علی الرغم ملاقات کا ایک ہی ذریعہ ہے محکمہ ڈاک! جو خطوں کو پڑھتا ہے پیشتر اس کے کہ اسے متعلقہ لوگوں تک پہنچائے فکر کا یہ مفہوم رکھنے والا فقرہ نعیم کو کتنا پسند تھا!

لیکن ٹھہریئے کہیں میں اینٹی کلائمکس[1] تو پیدا نہیں کر رہا؟ یہ تو ایک ایسا فنی عیب ہے جس سے اساتذۂ فن بچنے کی تلقین کرتے رہیں۔

---

[1] (Anti-climax) اصطلاح میں کہانی کے نقطۂ عروج کی ضد کو کہتے ہیں۔ "رہنمائے افسانہ نویسی" کے مصنف کرولڈ مائیٹز کا خیال ہے کہ کہانی کو نقطۂ عروج تک پہنچانے کے بعد اگر فوراً نہیں تو تقریباً فوراً ختم کر دینا چاہئے ورنہ نقطۂ عروج تک کا اثر زائل ہو جائے گا، اور (Anti-climax) پیدا ہو جائے گا۔

چراغِ راہ ——

شبنم سبحانی نے جو بات کہی تھی اس میں حقیقت کا جو جزوِ اعظم تھا وہ تو نظر انداز ہو گیا اور جو چھوٹے چھوٹے نکاتِ اختلاف یا یوں کہئے کہ متشابہات موجود تھے وہ بحث و کاوش کا موضوع بن گئے۔ اسی طرح ادارۂ چراغِ راہ کے حواشی میں جو اصل جوہر تھا وہ کافور ہو گیا اور ایک جملۂ معترضہ اہمیت اختیار کر گیا کہ "جا ایں است" ایک بات جو بجائے خود حقیقت ہے (یعنی بیرگاہِ ادب میں تھوڑی دیر کے لئے لکھنے والوں کا تذکرہ) اس کا روئے سخن کسی اور طرف تھا اور ہمارے دوست نے اسے پھیر دیا کسی اور طرف! اپنے ہی قریبی حلقۂ تعارف میں یہ کرشمے دیکھنے میں آنے لگیں تو پھر سمجھ لینا چاہئے کہ تقدیر برگشتہ ہو گئی ہے۔ کمال یہ کہ ایک ذہین ترین قریبی دوست اپنے بارے میں میری فاعلانہ رائے کو برسوں سے جانتے کے باوجود ایک غیر متعلق بات کو اپنے اوپر لبتیہ سوچے، مجھے اوڑھ بھی لیتے ہیں اور اس کے سبب غیر متوقع قسم کا ردِّ عمل دکھاتے ہیں۔

حالانکہ مسئلہ الزام لگانے اور صفائی دینے کا نہیں، نہ سوالِ اصول اور جواب ناموں، نہ نگارشات کے اعداد و شمار جمع کرنے کا ہے۔ ان قضیوں کا دفتر لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیجئے اور سوچئے کہ ——

۱- اہلِ حلقہ کے اہم افراد لکھنے میں تسلسل نہیں ہے۔

۲- درجۂ اوّل کی نگارشات کا تناسب پہلے سے گھٹ رہا ہے۔ حالانکہ اگر وہ ایک جگہ پہ قائم بھی رہتا تو بھی مقامِ تفکر تھا۔

۳- خاص نمبروں اور خالص ادبی و شعری مجموعوں اور تنقیدی فکر کے لحاظ سے دیکھیں تو رفتارِ کار امید افزا نہیں ہے۔

۴- نوخیز طاقت کا کام روز افزوں رفتارِ ارتقا کا مظہر نہیں بلکہ اکثر ساتھی ایک ہی مقام پہ کھڑے ہوئے سے دائرے میں گھوم رہے ہیں۔

۵- ایسے نام گنوائے جا سکتے ہیں جو سامنے آئے تھے۔ پھر ایسے اوجھل ہوئے کہ ان کی یاد بھی اب دلوں سے مٹتی جا رہی ہے۔

۶- اہم ترین نکتۂ تشویش یہ ہے کہ اسلامی فکر کے جوہر سے آراستہ تحریکی انقلابی ادب پیدا نہیں ہو رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نہیں راستہ نہ مل رہا ہو اور دھندلکے میں ٹاک ٹوئیے مارتے پھر رہے ہوں۔ مدعا یہ کہ متفات اور کچرے اور ادھورے تجربے ہیں، بلکہ سوچے سمجھے تجربے کم اور اتفاقات ہماوشات زیادہ ہیں۔ ان کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ ان نگارشات کا ہے جن میں مذہبی رنگ نمایاں ہے، دوسرا وہ ہے جس میں سیاسی اور جماعتی رنگ نمایاں ہے، ان کے بالمقابل تیسرا حصہ وہ ہے جس میں ایسی عمومیت و آفاقیت ہے کہ اسلامی اور اشتراکی اور کوئی دوسرا نظریۂ حیات اس پہ یکساں حق جتا سکتا ہے یعنی اس میں اسلامی امتیازات بالکل نہیں ہیں۔ کچھ مذہبی یا کچھ متصوفانہ، آئیں کہ دنیا اسلامی ادب کے ہم معنی نہیں ہے۔ اسی طرح "جماعت اسلامی" اور اس کے سیاسی کاموں کو موضوع بنا لینے سے بھی اسلامی ادب کی تحریک نشو و نما نہیں پائی۔ اگرچہ ایک دائرے میں

اس موضوع کی اہمیت ہے اور اس سلسلے میں شعروادب کے اندر کام ہوتے رہنا نامطلوب نہیں ہے۔!

یہ سہ گونہ "تجربات"۔ "انفاقات"۔ سمیت اصل مقصد کے لحاظ سے بالکل ناکام ہیں اور چونکہ زیادہ تر کام اسی نہج پر ہوا ہے، لہذا اتنا کام کے ہونے کے باوجود ناکامی حلقہ کے لئے حوصلہ شکن ثابت ہوئی ہے۔ بہت ہی تھوڑا کام ہے جو اسلام کی رہنمائی میں ادبی تحریک کا راستہ بنانے کے سلسلے میں ہوا ہے۔ اس تھوڑے سے کام کی بھی پوری پوری پرکھ نہیں ہوسکی۔ اسے چیا نا پھٹکا نہیں جاسکا۔ بلکہ الٹا وہ تھوڑا کام بے اعتنائی کا شکار ہے اور مذہبی اور سیاسی رنگ کی قدر کی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ محض سیاست کی اہمیت نہیں بلکہ حلقۂ اثر میں ذوق کی تربیت یافتگی ہے۔

خود ستائی اور تسکی کے طور پر نہیں، محض بیانِ واقعہ کے لیے کہوں گا کہ میرے ہاں یہ سارے ہی تجربات پائے جاتے ہیں۔ مذہبی، سیاسی اور آفاقی رنگ کی چیزیں بھی ہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ وہ یا نظریاتی و تحریکی رنگ کے تجربات بھی ملیں گے۔ "فضلٌ من اللہ" نے "اذانِ دعوتِ حق" (دورِ قبلِ تقسیم) کے بالمقابل میرے ہاں سے "یہ کون تھا کس کا خون تھا" لے کر یہ دکھایا ہے کہ گویا اب ہم سب لوگ سیاسی پڑ گئے ہیں۔ بہت سے دوسرے رفقاء کی طرح میرے بارے میں ان کا یہ تاثر بالکل غلط ہے کہ میں نے کوئی تحریکی رنگ کو چھوڑ کر اب سیاسی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ میرے ہاں دونوں رنگ ہمیشہ پہلو بہ پہلو چلے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تحریک کی شان ہمہ گیری ہے اور اس کا عمل ہمہ جہتی ہوتا ہے۔ وہ نہ محض فلسفہ ہوتی ہے۔ نہ مجرد مذہب۔ نہ سراسر سیاست۔ وہ سب کی جامع ہوتی ہے۔ ابھی دیر نہیں گزری کہ "میرا فن" اور "جلال حاجی" دو چیزیں شائع ہوئی ہیں۔ اول الذکر غالباً آفاقیت کے ساتھ نظریاتی، تحریکی اور مقصدی گہرائی اتنی موجود ہے۔ کہ فضلٌ من اللہ اسے اذانِ دعوتِ حق سے کم قدر و قیمت کی حامل نہ سمجھیں گے۔ "اگر میں چاہوں تو ——" کا تو دیر تک چرچا رہا ہے جسے میں نے سیاسی سرگرمی کے دور ہی میں لکھا ہے۔ جلال حاجی سوسائٹی کے ایک خاص کردار کا مطالعہ ہے اور مقصدی! اس طرح غزل میں بھی اور افسانے میں بھی دونوں رنگ میرے ہاں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ اسعد گیلانی سیاسی موضوعات کو زیادہ پسند کرتے ہیں، لیکن دوسرے میدان سے وہ بھی بالکل غائب نہیں رہتے، ابھی ابھی انہوں نے سیاسی انہماک ہی کے دوران میں "ڈاکوؤں کی بستی" نامی افسانہ پیش کیا جو سیاسی پس منظر رکھنے کے باوجود معاشرے کی ایک تلخ ترین حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اسی طرح جیلانی، عاصی جیلانی اور دوسرے ساتھی سیاسی مصروفیت کے باوجود ٹھوس نظریاتی چیزیں لکھتے رہے ہیں۔ مگر وہ کم ہیں، نتھری ہوئی نہیں ہیں، ان کی رفتارِ ارتقاء کمزور ہے۔ اسی لئے کیا جا رہا ہے کہ جمود ہے!

بہرحال یہ نظریہ کہ "سیاست" جو اجتماعی زندگی کا یہ بہرحال اہم ترین شعبہ ہے اور جس سے ہر ذہین فرد اور ہر بامقصد جماعت کو دلچسپی ہونا لازم ہے، کوئی ایسی شے نہیں ہے کہ جو تخلیقِ ادب میں مانع ہو۔ بلکہ الٹا وہ ذہنی تحریک پیدا کرنے میں خاصا دخل رکھتی ہے۔ سیاسی سرگرمیاں جن معنوں میں رکاوٹ بنتی ہیں وہ یہ ہیں کہ ہمارے بعض ادیب، جماعتی کاموں میں ہمہ وقتی کارکن ہیں اور ان کی زیادتی انہیں علمی ادبی کام کا موقع نہیں دیتیں۔ اصل کمی صحیح ادبی شعور کی ہے اور ذہنی ریاضت کی —— جسے اپنے لفظوں میں طبنم صاحب نے بھی بیان کر دیا ہے۔ ادبی شعور اور ذہنی ریاضت کی کمی کے ساتھ چونکہ ہمارے بعض ادیبوں کو فوراً ہی صحافتی ذمہ داریوں کا بوجھ

اٹھانا پڑا ہے۔ (نہ بطورِ دنیا پرستی کے، بلکہ خود تحریک کی ضرورت کے لئے ——— یا حد سے حد جائز اور ناگزیر نوعیت کی فکرِ معیشت کے تحت) ایسے رفقا اپنے آپ کو بنانے کے بجائے ذمہ داریوں کی بھاری بھرکم گاڑیاں کھینچنے میں مصروف ہیں۔ ان کے پاس سوچنے اور مطالعہ کے لئے وقت کم ہے۔ اور بسا اوقات قلم برداشتہ لکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ نفسِ "سیاست" اگر زندگی کے لئے ضروری ہے۔ تو ادب کے لئے وہ مہلک نہیں ہو سکتی۔

انڈیا کے اسلام پسند ادیبوں کے بارے میں کسی غیر معمولی رفتارِ کار یا سیاہ کاری کا تصور بھی صحیح نہیں ہے۔ وہاں بھی لوگ ہماری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اب تک رسائل کا پیش کردہ مواد، خاص طور پر کتابی مجموعے دیکھیں تو پس مستقبل کے بارے میں امیدیں باندھنے کی تو گنجائش موجود ہے۔ مگر کوئی ایسا کام نہیں ہو سکا جسے دنیا کے سامنے اعتماد کے ساتھ رکھا جا سکے۔

فضلُ من اللہ صاحب نے ذہنی طور پر ٹھٹھر جانے کی جو آپ بیتی بیان کی ہے میرا خیال یہ ہے کہ اس کے اسباب خارج میں نہیں بلکہ خود ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنی ملازمانہ مجبوریوں اور جماعتی دلچسپیوں کی باہمی کشاکش کے سامنے ٹھہر نہیں سکے۔ اور اپنے اندر ہی میں الجھ کر رہ گئے۔ ورنہ ایک شخص جو مطالعہ کے ذریعے ایک بار تہذیبِ الحاد کے نظریات کے بالمقابل اسلامی نظریہ کو اپنا لے اور جسے اسلام کے سرچشمۂ فکر ——— قرآن و سنت ——— سے استفادہ کرنے کی تحریک ہو جائے وہ جماعت اسلامی کے طریق کار سے اختلاف رکھنے کے باوجود بھی زندگی کے مسائل میں خود کاوش کر کے ادبی موضوعات پیدا کر سکتا ہے اور تخلیقی اور تحریکی نوعیت کی نگارشات سامنے لا سکتا ہے۔ نظریۂ اسلامی کو بروئے کار لانے کے لئے جماعتِ اسلامی کے طریقِ کار بھی کسی کے سامنے ہو، جب بھی ادبی دائرے میں ایسے اختلافات کوئی بڑا اثر نہیں رکھتے۔ یہ بات البتہ الگ ہے کہ ایسے اختلاف اگر جذبات ہی کو ٹھٹھرا دیں تو وہ صحت مندانہ نہیں ہو سکتے۔ صحت مندانہ اختلاف وہ ہوتا ہے جو آدمی کی ذہنی حرکت کو تباہ نہیں کرتا۔ بہتر اور صحیح تر نظریہ رکھنے والے کا تو علمی و فکری معیار دوسروں سے بلند تر ہو سکتا ہے۔ میری ذاتی رائے یہی ہے کہ فضلُ من اللہ صاحب کا اختلاف پوری طرح شعوری نہیں ہے اور اس وجہ سے صحت مندانہ بھی نہیں ہے۔ آپ جماعتِ اسلامی سے مایوس ہوتے رہیں، آپ کو اس نظریۂ اسلامی سے تو مایوس نہیں ہونا چاہیے جس کے علمبردار خود ہیں۔ یہ گزارشات نہایت اخلاص اور بے تکلفی سے کی جا رہی ہیں۔ نہ کہ ان سے کوئی تحقیر یا الزام دینا مقصود ہے۔

بہر حال حاصلِ بحث یہ ہے کہ جمود ہے اور اس کا اعتراف خود فضلُ من اللہ صاحب کو بھی ہے۔ ایسی عالمِ حالت کی توجیہ کرنے کے لئے کسی ادیب کی انفرادی معذرت کافی نہیں کہ وہ بیمار رہا ہے یا معاشی پریشانیوں میں مبتلا رہا ہے۔ یہ سب کچھ تو حرکت کی صورت میں بھی رہتا ہے۔ یہ چیزیں سببِ جمود نہیں ہیں۔ اس میں کوئی اہمیت نہیں کہ ادیبوں سے ان کے نجی حالات کی تحقیق کرنے کے بعد ادبی جمود و حرکت کا مسئلہ چھیڑا جائے۔ یہ ایک اجتماعی مسئلہ ہے اور اس کے سبب انفرادی حالات میں نہیں۔ اجتماعی دائرے ہی میں تلاش کئے جانے چاہئیں۔

(باقی برصفحہ ۱۶)

پروفیسر اسرار احمد سہوہاروی

کلامِ اقبال میں آفاقیت کا عنصر

علامہ اقبال مرحوم کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا لیکن ان کے کلام کی آفاقیت کے متعلق لوگوں نے بہت کم لکھنے کی ہمت کی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس موضوع پر حال میں کچھ تفصیل سے لکھا گیا ہو اور میری نظر سے نہ گزرا ہو۔ بہر حال اپنے محدود مطالعے کے مطابق میرا یہی خیال ہے کہ اس موضوع پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ یا جتنا لکھا جانا چاہیئے تھا اتنا نہیں لکھا گیا۔ اور اس خاموشی کا میری سمجھ میں ایک ہی سبب آتا ہے کہ عموماً لوگوں نے شاید یہ نظریہ قبول کر لیا ہے (یا یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ان معاملے میں لوگوں نے اقبال کے معترضین کے مقابلے میں سپر ڈال دی ہے) کہ اقبال کے کلام میں آفاقیت مفقود ہے۔ اس پہلو کو کمزور سمجھ کر ادھر نظر نہیں اٹھاتے بلکہ اس کو کسی طرح نظروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کبھی کچھ ہمت کر کے لکھتے ہیں تو لکھنے کا انداز معذرت آفریں سا ہو جاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اعتراضات کی مدافعت کریں اور حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کریں اقبال کی طرف سے خود معذرتیں پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ میرے خیال سے اقبال نے سرے سے کوئی قصور ہی نہیں کیا جس کی معذرت پیش کی جائے یہ تو محض ذہنی مرعوبیت اور کہتری ہے جو ہمیں فریب دے کر معافی طلب کرنے اور عذر خواہی پر مجبور کر دیتی ہے ورنہ میں تو علی الاعلان کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کے کلام میں اسقدر آفاقیت کا عنصر موجود ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں آپ کو نظر نہ آئے گا اور یہی نہیں کہ کمیت کے لحاظ سے ہی اقبال اس معاملے میں دنیا کے دوسرے شعراء سے پیش پیش ہوں بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی آپ کسی دوسرے شاعر کو ان کے مقابلے میں نہیں لا سکتے۔ بات صرف اتنی ہے کہ بعض لوگوں کو اقبال سے چند وجوہ سے کد سی پیدا ہو گئی تھی اور انہوں نے ان پر بہت سے الزامات لگانا شروع کر دیئے تھے اور جب اقبال کے کلام نے ان کے الزامات کی کوئی وقعت باقی نہ چھوڑی تو معترضین کے ایک گروہ نے آخر میں آفاقیت کے مفہوم کی خاص طور پر من مانی ترجمانی کر کے ان کو صرف مسلمانوں کا شاعر قرار دینا شروع کر دیا اور اس طرح اپنی شکست خوردہ ذہنیت کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن الزام لگانے والوں سے زیادہ مجھے حیرت ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اس نامعقول الزام کو تسلیم کر لیا۔ یا اقبال کی طرف کمزوری محسوس کی اور خاموشی اختیار کر گئے۔ اب یہ بات عموماً تسلیم کی جانے لگی ہے کہ اقبال اوّل دور میں ایک وسیع النظر شاعر تھے۔ دوسرے دور میں وطنی شاعر ہو گئے اور تیسرے دور میں صرف اسلام اور مسلمانوں کے شاعر رہ گئے۔ گویا اقبال نے ساری عمر ترقیٔ معکوس کی تندکر دی۔ اور ان حضرات کے خیال کے مطابق اقبال کی شاعری کا آخری دور دورِ انحطاط قرار پایا۔ حالانکہ اقبال پر یہ الزامات محض تعصب۔ کوتاہ نظری اور وطنیت و اسلام کو غلط معنی پہنانے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ کچھ لوگوں کا خیال تو یہ بھی تھا کہ ہندوؤں نے اقبال کو نوبل پرائز سے محروم رکھنے کے لئے اور ٹیگور کو بڑھانے کے لئے دانستہ یہ پروپگنڈا کیا تھا۔ اگر اقبال کو بھی نوبل پرائز مل جاتا تو پھر ٹیگور کی اہمیت کم

ہو جاتی تھی جس کو ہندوؤں کا متعصب مزاج برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ نتیجے کے طور پر کچھ مسلمانوں کے اذہان بھی اس زہریلے پروپیگنڈے سے متاثر ہو گئے اور انہوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا کہ اقبال تو اب صرف مسلمانوں کے شاعر رہ گئے۔ ان کے کلام سے آفاقیت مفقود ہو گئی۔

علامہ اقبال پر لوگوں نے بہت سے الزامات لگائے۔ ان کی کوتاہیاں بیان کیں اور ان کی غلطیوں کی طرف اشارے کئے۔ ان سب کے متعلق تو کچھ لکھنے کا اس مختصر سے مضمون میں التزام نہیں کیا جا سکتا۔ یوں بھی ان مختلف اعتراضات پر سیر حاصل اور نتیجہ خیز بحثیں ہو چکی ہیں۔ یہ تمام اعتراضات اب بھولے بسرے ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ آفاقیت کا مسئلہ ابھی تشنہ ہے۔ اور اس اعتراض کا سلسلہ ابھی تک چلا جا رہا ہے اسی وجہ سے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس پر حتی المقدور خامہ فرسائی کی جائے۔ معترضین کے اقوال کا جائزہ لیا جائے کہ کہاں تک ان کے اس دعوے میں صداقت پائی جاتی ہے۔

ماہنامہ رسالہ نگار لکھنؤ کے مئی ۱۹۵۶ء کے شمارے میں فرمان فتحپوری صاحب نے غالب اور اقبال کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے اس میں موصوف نے علامہ اقبال مرحوم کے متعلق اس طرح اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے "ان کے اصل مخاطب بڑی حد تک صرف مسلمان اور ان کے موضوعات و تصورات زیادہ تر اسلامی ہیں اس لئے ان کا شاعرانہ پیغام اس وقت تک قبول حاصل نہیں کر سکتا تاوقتیکہ سارا زمانہ مشرف بہ اسلام ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کے فلسفۂ حیات کو پائدار ہونے پر بھی جامد کہنے کی بڑی گنجائش ہے۔"

اقبال کے متعلق یہ سرسری دعوے کر دینا کہ اب تک اس کو عالمگیر قبولیت حاصل نہیں عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کیا فاضل مصنف اب تک اس بات کو بھی نہیں جانتے کہ علامہ کا کلام تقریباً تمام دنیا میں پہنچ چکا ہے۔ اور روز بروز اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دنیا کی ہر معروف زبان میں اس کے تراجم بڑے ذوق و شوق سے کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں دوسری بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ دنیا میں کونسا ایسا ملک ہے جہاں مسلمان آباد نہیں اس لئے اگر بقول فرمان صاحب صرف مسلمان ہی علامہ کے کلام کو پڑھتے ہیں تب بھی ان کے کلام کی جہاں گیری مسلم ہو جاتی ہے۔

اور فرمان صاحب کا یہ فرمانا تو بڑا مضحکہ خیز سا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے کلام کو قبولِ عام اسی وقت حاصل ہوگا جبکہ ساری دنیا مسلمان ہو جائے۔ کیا دنیا میں ایسے بڑے شاعر نہیں گزرے جنہوں نے صرف اپنی قوم اور اپنے ہم مذہب لوگوں کو ہی مخاطب کیا تھا۔ لیکن ان کے کلام کی خوبی تخیل کی ہمہ گیری طرزِ ادا کی دلکشی اور جذباتِ انسانی کی کامیاب عکاسی کی وجہ سے ساری دنیا نے ان کے کلام کو پورے ذوق و شوق سے پڑھا اور استفادہ کیا۔ اپنے مطلب کی بات اس میں سے نکال اور جو بات اپنے مطلب کی نظر نہ آئی اس سے صرف نظر کر لیا۔ کیا فرمان صاحب کا خیال یہ ہے کہ کسی مصنف کی کتاب پڑھنے کے لئے اس کا ہم مذہب ہونا ضروری ہے۔ یا یہ کہ قاری کو مصنف کے ہر خیال سے ہم آہنگ ہونا لازمی ہے کیا اقبال کے کلام میں کہیں ایسی باتیں نظر نہیں آتیں جو دنیا کے غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچ سکیں اور اگر نہیں ہیں تو پھر غیر مسلم اقبال کے کلام کو اس قدر والہانہ شیفتگی سے کیوں پڑھتے ہیں۔ کیوں اپنی اپنی زبانوں میں اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ اور اگر اقبال کے کلام میں ایسے عناصر کافی حد تک موجود ہیں جن کی عالم گیری مسلم ہے تو کیا فاضل مقالہ نگار کا یہ مطلب ہے کہ اقبال کا سارا کلام ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک سے خیالات ہوتے ہیں ایک ہی قسم کا خطاب ہوتا ہے اور ایک ہی قسم کے مخاطب۔ کیا فرمان صاحب زندگی اور ادب میں کسی مقام پر تنوع کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ کیا فاضل مقالہ نگار دنیا کے کسی شاعر کے متعلق یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اس کا تمام کلام آفاقی قدروں کا حامل ہے اس لئے ہر مقام پر دنیا کے تمام انسانوں کو ہی مخاطب

کیا ہے۔ اس کے کلام میں کہیں مقامی رنگ پیدا نہیں ہوا۔ اس نے کسی جگہ کسی مخصوص فرقے اور مذہب والوں کو مخاطب نہیں کیا۔ اور اگر کیا ہے تو پھر علامہ نے کون سا نیا قصور کیا ہے جس کی بنا پر وہ اپنے کلام کے بعض حصوں میں صرف مسلمانوں کو مخاطب کر کے مطعون ہو جائیں اور ان کو آفاقیت اور قبول عام کے سہرے سے محروم کر دیا جائے۔ کیا فرمان صاحب ملٹن اور گیٹے سے بھی اسی قسم کا سلوک روا رکھنے کے لئے تیار ہیں۔ وہ بھی تو اپنا مخصوص مذہب رکھتے تھے اور انہوں نے بھی عموماً اپنے ہم مذہبوں کو ہی مخاطب کیا ہے۔ دوزخ اور جنت کا تصور اپنی مذہبی روایات کے مطابق ہی پیش کیا ہے۔ دوسرے مذہب والوں کو براہ راست مخاطب نہیں کیا۔ کیا اس تخاطب کی وجہ سے ان کو قبولِ عام حاصل نہیں ہوا۔ یا ہم یہ سمجھیں کہ فرمان صاحب کے تخیل کے مطابق ان کو قبول عام حاصل نہیں ہونا چاہیے تھا غلطی سے حاصل ہو گیا۔ کیونکہ ان کے تمام قدردان ان کے ہم مذہب نہیں بن گئے ہیں۔ کیا کالیداس اور دوسرے ہندو شعرا کو مسلمان اور عیسائی اس لئے نہیں پڑھتے کہ ان کی تصانیف پڑھنے کے لئے ہندو بن جانا ضروری ہے۔ کیا بھگوت گیتا سے لوگوں نے اس لئے استفادہ نہیں کیا کہ وہ کرشن جی کی کتاب ہے اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور اس کتاب میں زندگی کا ہندی فلسفہ حیات کے تحت مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ تو ایک عجیب سی بات فرمان صاحب نے لکھی ہے کہ اقبال کے کلام کو پڑھنے کے لئے مسلمان ہو جانا ضروری ہے۔ ایسی ایک دو نہیں سینکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ ایک شاعر کے کلام کو دوسرے مذہب سے متعلق لوگوں نے پورے ذوق و شوق سے پڑھا ہے۔ حالانکہ اس شاعر نے اپنے ہم مذہب لوگوں کو ہی اپنے کلام کے بعض حصوں میں یا تمام کے تمام کلام میں مخاطب کیا ہے۔

دنیا کے کسی مذہب نے یہ نہیں کیا کہ انسان کو صرف عبادت کے طریقے ہی بتائے ہوں اور اس دنیاوی زندگی سے قطعی کوئی تعلق نہ رکھا ہو۔ جن مذاہب نے ترکِ دنیا کا بھی سبق دیا ہے انہوں نے بھی کچھ نہ کچھ علاقہ اس دنیا اور اس کی زندگی سے ضرور رکھا ہے اور اس دنیا میں زندگی گزارنے کے طریقے بتائے ہیں۔ لیکن اسلام نے تو اس دنیا کی زندگی کے متعلق بڑی مفصل اور ہمہ گیر ہدایات دی ہیں۔ اسلام نے زندگی کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبے کو مستقل بالذات شے قرار نہیں دیا ہے۔ وہ تمام کی تمام زندگی کو ایک اکائی یا واحد سمجھتا ہے۔ اس نے دین و دنیا کی اس معاملے میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً "یعنی اپنی پوری زندگی کو اسلام کے حوالے کر دو۔ یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ دنیاوی زندگی کو کسی اور اصولِ حیات کے حوالے کر دو اور دینی زندگی یا حیات بعد الموت کے معاملات اسلام کے سپرد کر دو۔ علامہ مرحوم نے اگر اپنے کلام میں کہیں اسلام کا یا اسلامی معاشرت کا یا اسلامی اصولِ زندگی کا ذکر کیا ہے تو فلسفہ حیات کے ایک ایسے مکتبہ خیال کو پیش کیا ہے جو کہ پوری زندگی پر حاوی ہے اور جو یہ دعوت دیتا ہے کہ اگر دنیا چاہے تو اس کو اپنا سکتی ہے اور اپنی معاشرتی زندگی اس کے تحت گزار سکتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس قدر ہمہ گیر قسم کے فلسفہ حیات کو خواہ اس کا مخاطب کوئی ایک فرد واحد ہی کیوں نہ ہو تاثر کے لحاظ سے ہم محدود کس طرح کر سکتے ہیں۔ اگر تخیلات و تصورات میں ہمہ گیری اور آفاقیت موجود ہے اور طرزِ تخاطب بھی عالم گیر ہے تو ایسے کلام کی جہانگیری میں مخاطب کی حیثیت سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا اور نہ علامہ کے کلام پر اس قسم کا کوئی ....

اثر پڑا ہے۔ میرے اس دعوے کو مستقبل اور زیادہ واضح طریقے پر ثابت کر دے گا۔

دراصل جب علامہ نے وطنیت کے غلط تصور کو اختیار کرنے سے انکار کیا اور مسلمانوں کو خصوصیت سے مخاطب کر کے زندگی

تیں مذہبی اور اخلاقی قدریں شامل کرنے کی تلقین کی تو دو قسم کے لوگ علامہ سے بہت برہم ہو گئے۔ ایک تو اشتراکی حضرات جو کہ مذہب اور دین کو اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے تھے۔ دوسرے ہندوستان کے ہندو جن کے اپنے مفادات پر علامہ کے تصورِ وطنیت سے سخت زد پڑتی تھی۔ وہ وطنیت کے خاص تصور کی آڑ میں سارے ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنانے کی فکر میں تھے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ کسی شکاری سے اس کا شکار چھین لینے کی کوشش کریں گے تو وہ جھنجلائے گا۔ مدافعت کرے گا اور جارحانہ اقدام کرنے سے بھی باز نہیں رہے گا۔ چنانچہ ہندوؤں نے اشتراکیوں نے اور بعض دو قومی اصول کو نہ ماننے والے مسلمانوں نے بھی علامہ اقبال کی سخت مخالفت شروع کر دی۔ اور نتیجے کے طور پر ان کے کلام کی غلط اور من مانی ترجمانی شروع کر دی۔ دیانتداری کے راستے سے ہٹ کر غلط مبحث کو جائز قرار دے لیا۔ کچھ عرصے تک مدافعت کرتے رہے لیکن بعد میں جارحانہ اقدام بھی شروع کر دیا۔ اور اپنے متعصبانہ خیالات کا اس قدر پروپیگنڈا کیا کہ عام طور پر لوگوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ علامہ مرحوم اپنے آخری دور میں صرف مسلمانوں کے شاعر رہ گئے تھے۔

اور اس طرح بڑی ہوشیاری سے آخر دور کی شاعری کی آڑ میں سارے کے سارے کلام کے خلاف بددلی اور بیزاری پیدا کر دی۔ حالانکہ شاعر کا کسی خاص دور کا کلام ہی صرف کلام نہیں ہوتا بلکہ ہر دور کا کلام اس کا کلام ہوتا ہے۔ علامہ کا دورِ اول اور دورِ اوسط کا کلام کسی دوسرے شخص کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مرحوم کے ہی دل و دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ آخری دور کے کلام کی وجہ سے تمام کلام کو مردود قرار دینا کہاں کا انصاف ہے پھر جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں آخری دور کے کلام میں بھی سینکڑوں اشعار اور نظمیں اس قسم کی موجود ہیں جو آفاقی حیثیت رکھتی ہیں اور ان سے مخاطب ساری دنیا کے انسان ہو سکتے ہیں پھر یہ کہ آخری دور میں بھی علامہ مرحوم نے وطن کی محبت کو یا بنی نوع انسان کی محبت کو یا دوسرے بسیط قسم کے جذبات و تصورات کو مردود قرار نہیں دیا تھا۔ بلکہ انہوں نے ایک منصف اور سمجھدار آدمی کی طرح اپنی پختہ کاری کی وجہ سے ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھ دیا تھا۔ مثلاً وطن کا جو صحیح مقام تھا اس کو دیا۔ مذہب اور دین کا جو مقام تھا اس کے سپرد کیا۔ انسانیت کا جو درجہ تھا وہ اس کے حوالے کیا جو کچھ انہوں نے کیا عین انصاف تھا۔ یہ وہ کیسے کر سکتے تھے کہ وطن کو خدا کا مقام دیتے اور اس کی پرستش شروع کر دیتے۔ وطن کی دیوی کی مورت بنا کر گھر میں رکھتے اور اس کے پجاری بن جاتے۔ کیا علامہ نے کہیں یہ کہا ہے کہ وطن کی کوئی اہمیت نہیں اور اس سے محبت نہیں کرنا چاہیے۔ یا دوسرے مذہب والوں سے نفرت کرنا چاہیے۔ وہ عاشقِ رسول کس طرح وطن سے نفرت کی تلقین کرتے جب کہ رسول کریم کا قول موجود ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جز ہے۔ البتہ اس محبت کی ایک حد مقرر ہے اور بعض محبتیں اس قسم کی بھی ہیں جو وطن کی محبت پر غالب آ سکتی ہیں۔ اقبال کے معترضین یہ چاہتے تھے کہ وہ ان کا نظریۂ وطن بعینہٖ اپنا لیں اور اپنی رائے کو قطعی دخل نہ دیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ پر محبِ وطن نہ ہونے کا الزام محض ایک سیاسی فریب ہے اور سیاسی اختلاف کی وجہ سے لگایا گیا ہے۔

اسی سلسلے میں نیاز فتحپوری صاحب علامہ کے کلام کی آفاقیت پر تبصرہ کرتے ہوئے نگار ۱۹۴۱ء کے ایک مضمون میں فرماتے ہیں "مردِ مومن سے مراد اقبال کی کوئی ایسی معیاری ہستی نہیں جس کا تعلق ساری کائنات سے ہو بلکہ ان کی مراد صرف مسلمان سے ہے اور جس کی تعمیر میں چار عناصر قہاری، جباری، قدوسی و جبروت نظر آتے ہیں۔ یعنی جن میں تین عناصر جلالی ہیں اور ایک جمالی۔ اقبال کی شاعری یا فلسفے

کا بھی وہ پہلو ہے جس نے اقبال کو اسلامی شاعر کے حدود سے آگے بڑھ کر آفاقی یا کائناتی شاعر بننے سے باز رکھا اور جس کو ہمیشہ افسوس کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔" اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ اگر اقبال کا مردِ مومن کوئی معیاری ہستی نہیں تو پھر دنیا میں کوئی دوسری ہستی معیاری ہو ہی نہیں سکتی۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ نیاز صاحب کون سی ایسی معقول قسم کی صفات پیش کر سکتے ہیں جو اقبال کے معیاری انسان میں موجود نہیں ہیں۔ نیاز صاحب اگر چاہیں تو اس معیاری انسان کو مسلمان کے نام سے موسوم نہ کریں بلکہ کچھ اور نام دے لیں۔ اگر نیاز صاحب اقدارِ حیات کو کسی مقام پر بھی بنیادی نہیں مانتے اور ہر قدر کو اضافی سمجھتے ہیں پھر تو معیاری انسان کے تصور کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر تو ہر شخص بزعم خود معیاری انسان بن سکتا ہے لیکن اگر وہ زندگی کی کچھ قدروں کو بنیادی مستقل اور عالمگیر تسلیم کرتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ وہ قدریں اضافی نہیں اور ان کو من مانے طریقے پر کسی کو بدلنے کا حق نہیں تو پھر اقبال کا پیش کردہ مردِ مومن یقینی ایک معیاری انسان ہے خواہ اس کو مسلمان کے نام سے یاد کیا جائے یا کسی اور نام سے۔ نیاز صاحب نے اپنی دانست میں ایک بڑا طنز اقبال کے مردِ مومن پر یہ کیا ہے کہ چار میں سے تین صفات جلالی ہیں اور ایک جمالی۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا نیاز صاحب تمام تر جمالی صفات سے متصف یا بغیر جلالی صفات کے کوئی معیاری انسان پیش کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ گاندھی جی کے فلسفہ اہنسا کے اصول کے قائل ہو گئے ہوں، لیکن گاندھی جی کو بھی آخر عمر میں حفاظتِ خود اختیاری کے لئے دشمن کا مقابلہ کرنے کی اجازت دینی پڑی تھی اور ایک پرارتھنا کے دوران میں کسی کے سوال کے جواب میں یہ فتوے صادر کیا تھا کہ ہندو استریوں کو چاہئے کہ کم از کم اپنے گھروں میں ترکاری کاٹنے کے لئے بڑی بڑی چھریاں رکھیں تاکہ اگر مسلمان ان کے گھروں پر حملہ کر دیں تو وہ ان چھریوں سے ان کا پیٹ چاک کر سکیں اور اپنی جان اور آبرو بچا سکیں۔ کیا بغیر کسی جلالی صفت کے آدمی حفاظت خود اختیاری کی تدابیر اختیار کر سکتا ہے۔ آخر حفاظت کے لئے بھی تو خون بہانا پڑتا ہے۔ ہتھیار استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ ہمت اور دلیری کی ضرورت پڑتی ہے۔ خالی جمالیات سے تو نہ جان بچائی جا سکتی ہے نہ آبرو۔ نہ آزادی برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ نہ تہذیب۔ آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ گاندھی جی نے مدافعت کا حکم دیا ہے جارحیت کی اجازت نہیں دی۔ لیکن مدافعت کے لئے بھی تو جلالی صفات ہی کی ضرورت پڑتی ہے نہ کہ جمالی صفات کی۔ پھر علامہ مغفور نے یہ فتوے کہاں دیئے ہیں کہ تم دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو اور کسی انسان کو جب تک کہ مسلمان نہ ہو جائے چین سے نہ بیٹھنے دو۔ اور اسلام نے خود کس جگہ یہ تلقین کی ہے کہ ساری دنیا کے خلاف بلا امتیاز اعلانِ جنگ کر دو یہ وہی اسلام کے متعلق جارحیت پسندی کا الزام ہے جو کہ نیاز صاحب جیسے لوگوں کو مغربی مورخوں اور سیاست دانوں نے سمجھایا ہے۔ اسلام نے یہ اجازت ضرور دی ہے کہ پر امن طریقے سے اپنے فلسفۂ حیات اور اصولِ تہذیب و معاشرت کو دوسرے لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہو۔ قرآن کریم میں صاف طور پر فرما دیا ہے "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین کے معاملے میں زبردستی کی اجازت نہیں ہے۔ یہ تلقین برضا و رغبت ہو (چاہئے) سو یہ تلقین و تبلیغ ہر مذہب والے جائز سمجھتے ہیں اور اس طریقۂ اشاعت کو ہر قسم کی تحریک کے پیرو مناسب تصور کرتے ہیں اور اس پر آج بھی عمل کر رہے ہیں۔ پھر نہ معلوم کیوں نیاز صاحب کو اقبال کی پیش کردہ جلالی صفات سے اس قدر وحشت پیدا ہوئی۔

نیاز صاحب غالباً کرشن جی کو سب سے بڑا جمالی اوتار مانتے ہوں گے لیکن انہیں بھی کوروؤں اور پانڈوؤں کی لڑائی میں مدافعتی جنگ کی اجازت دینی پڑی تھی۔ بلکہ انہوں نے خود میدانِ جنگ میں جا کر اپنے ایک پجاری ارجن کو پوری بے جگری اور پوری قوت سے لڑنے کی ہدایت کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ پانڈو اس جنگ میں حق پر تھے اور کورو ظلم کر رہے تھے۔ میرے خیال سے تو بغیر جلالی صفات کے انسان مکمل اور معیاری ہو ہی نہیں سکتا۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا کوئی اور۔ انسانی زندگی کے لئے جلالی صفات ناگزیر ہیں۔ ہماری موجودہ زندگی میں میرے ذاتی اندازے کے مطابق جمال کا حصہ بہت کم اور جلال کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ آئندہ اگر زندگی کا رنگ کچھ بدل جائے تو معیاری انسان کے اجزائے ترکیبی میں بھی مناسب ردو بدل کے متعلق سوچا جا سکتا ہے۔ لیکن موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اقبال کے تجویز کردہ اجزا میں کوئی تبدیلی کرنے کا موقعہ نظر نہیں آتا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں آلِ احمد سرور کی ایک عبارت نقل کروں جو موصوف نے اپنے مضمون "اقبال اور اس کے نکتہ چین" کے عنوان سے رسالہ "اردو" کے اقبال نمبر ۱۹۳۸ء میں شائع کرایا ہے۔ فرماتے ہیں "کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں دوسروں کو ان سے کیا سروکار۔ اس خیال کو ذرا آگے بڑھایئے تو ٹیگو کا فلسفۂ زندگی صرف ہندوؤں کے لئے۔ گوئٹے کا پیغام صرف المانیوں کے لئے ہے۔ ملٹن کی تعلیم صرف مسیحی تعلیم کا عکس ہے اور کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اقبال عالمگیر انسانیت کی تکمیل چاہتے ہیں اس کے لئے جو راستہ ان کو موزوں نظر آیا اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی کوششوں کو ایک بلند نصب العین اور ایک اعلیٰ مقصد کے لئے صرف کر دیتے ہیں۔ پہلے وطن کو تو دیوتا اور خاکِ وطن کے ہر ذرے کو دیوتا سمجھتے ہیں۔ جب ذرا نظر میں وسعت آئی تو دیکھا کہ یہ تصور محدود ہے۔ اس تصور میں آریائی۔ یا صرف المانوی۔ یا صرف اطالوی ہی کی گنجائش ہے جب ان کا ترانہ شائع ہوا جس میں انہوں نے کہا کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ‏ ‏ ‏ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

تو ان کے بہت سے ہندو دوستوں نے کہا کہ اقبال اب ہمارے شاعر نہیں رہے بلکہ ایک مخصوص فرقے کے شاعر ہو گئے۔ یہ کہنا صحیح نہیں۔ ان کی شاعری میں سب کے لئے جنسِ حیات موجود ہے۔ انہوں نے جہاں کہیں وطن کے خلاف کچھ لکھا ہے وہاں اس محدود تصور کو لیا ہے جس میں اور کچھ نہیں سما سکتا۔ وہ تنگ نظر اور محدود ذہنیت جس کی بنا پر سفید سرمایہ داروں کی جگہ پر سیاہ سرمایہ دار بدلے جاتے ہیں اقبال کو پسند نہیں۔ مگر وہ اصلاح و فلاح کے دل سے خواہاں ہیں اور اس کے تمام دُکھ درد میں شریک ہیں۔"

یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ جو شخص اپنا وطن کسی خاص خطۂ زمین کو قرار دے۔ اس کی پوجا کرے۔ اس کے باشندوں کو دنیا بھر کے دوسرے باشندوں سے فائق سمجھے۔ ان کا مفاد ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کے درپے رہے حد یہ ہے کہ انہیں غلام بنا لینے سے بھی گریز نہ کرے تو وہ آفاقی نقطۂ نظر کا مالک سمجھا جائے لیکن جو عالمگیر برادری کا قائل ہو۔ جو ہر ملک سے وطن کی طرح محبت کرنے کے لئے تیار ہو اور کہے کہ سارا جہاں ہمارا وطن ہے اس کو تنگ نظر۔ غیر آفاقی۔ اور فرقہ پرست کے خطابات سے نوازا جائے اسی کو کہتے ہیں کہ برعکس نہند نامِ زنگی کافور۔ اب تو یوں بھی وطن پرستی کی تنگ نظری کے لئے دنیا میں بہت کم گنجائش باقی

رہ گئی ہے۔ آج کل تو بُعدِ زمانی و مکانی کی اہمیت روز بروز کم ہوتی چلی جا رہی ہے اور دنیا کی تمام قومیں ایک دوسرے کے قریب تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ہر شعبے میں بین الاقوامی تنظیمیں بن رہی ہیں۔ ان حالات میں وطنیت کے فرسودہ تصور کی طرف کون سمجھدار اور ذہین آدمی نظر اٹھا کر دیکھے گا۔

اس کے علاوہ فرمان صاحب اور نیاز صاحب اقبال کو صرف ایک فرقے کا شاعر کہتے ہوئے یہ بھول گئے کہ ہر انسان ایک عمرانی زندگی گزارتا ہے۔ اس کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں۔ مختلف گروہوں اور اداروں سے اس کو وابستگی ہوتی ہے۔ اس کو اپنے گھر، کنبے، قبیلے وغیرہ سے انس ہوتا ہے۔ پھر اپنے شہر والوں اور پڑوسیوں کے تعلقات ہوتے ہیں۔ اس کے بعد قوم اور وطن سے تعلقِ خاطر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں سے اس کا واسطہ ہوتا ہے۔ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے انسانی سطح پر بہت سے مراسم ہوتے ہیں۔ پھر مذہب کے واسطے سے روابط پیدا ہوتے ہیں۔ مذہب کے علاوہ دوسری تحریکیں بھی باہم دگر وابستگی کا سبب بن سکتی ہیں۔ اس طرح سے زندگی مختلف النوع خانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یہ کیسی زبردستی ہے کہ کسی شخص کی زندگی کے ایک پہلو کو لے کر اس کی تمام زندگی پر اور اس کی پوری شخصیت پر بلا امتیاز حکم لگا دیا جائے۔ مثلاً اقبال مرحوم نے عالم گیر اور انسانی سطح پر جو کچھ کہا اسے نظر انداز کر دیا گیا اور جو کچھ اسلام اور مسلمانوں کے لئے کہا اس کو زیرِ بحث لا کر ان پر غیر آفاقی اور فرقہ پرست ہو جانے کا الزام لگایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ مغفور نے اپنی زندگی کے تمام مختلف حیثیتوں کے فرائض کو بدرجۂ احسن ادا کیا۔ یعنی انہوں نے اپنے ہم وطنوں کے حقوق بھی پورے ادا کئے ہیں اور ہم مذہبوں کے بھی اور وہ اپنے ہم جنسوں یعنی انسانوں کے حقوق کی ادائیگی میں کسی طرح پیچھے نظر نہیں آتے۔ انہوں نے ہر گروہ کی یکساں خدمت کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی تنگ نظری اور کوتاہ بینی کی وجہ سے حسد اور تعصب میں مبتلا ہو جائیں۔ اور شکایت کرنے لگیں کہ علامہ نے ہمارے علاوہ کس دوسرے کے حقوق کیوں ادا کئے۔ یہ ہماری اپنی کم ظرفی اور خود غرضی ہوگی علامہ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے ایک انصاف پسند آدمی کی طرح ہر شخص کو اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے۔ کہ ہم اپنی کوتاہی اور کمزوری کو علامہ مرحوم کے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔ اپنے چاکِ گریبان پر نظر نہیں ڈالتے اقبال کا دامن رفو کرنے چلے ہیں ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت ۔۔۔ دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

اب میں چاہتا ہوں کہ علامہ مرحوم کے کلام میں سے کچھ ایسے اقتباسات پیش کر دوں جو حتی الامکاں ان کے ابتدائی دور کے کلام میں نہ ہوں اور اس دور سے متعلق ہوں جب کہ ان پر فرقہ پرست ہونے کا الزام تراشا جا رہا تھا اس دور کا کلام زیادہ تر فارسی کلام ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال رکھنے کی بات ہے کہ اس قسم کے دو چار اشعار نہیں بلکہ سینکڑوں اشعار نکالے جا سکتے ہیں۔

علامہ اقبال سرمایہ و محنت کی کشمکش اور ظلم و بدنظمی کو دور کرنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن اس مسئلے کا حل

ایک مسلمان کی حیثیت سے اسلامی نظریۂ معاشرت کے تحت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی چیرہ دستیوں حق تلفیوں اور فریب کاریوں کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے۔ مزدوروں کی حمایت کی ہے ان کو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے بیدار ہونے اور منظم ہونے کے لئے مستعد کیا ہے۔ مثلاً جاوید نامے میں "ارض ملکِ خدا است" کے تحت فرماتے ہیں۔

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک، ده خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک
ده خدایا نکتہ از من پذیر رزق و گور از وے بگیر اُو را مگیر

ترجمہ: بادشاہوں کے آئین و قوانین کا حاصل صرف یہ ہے کہ کاشتکار تو تکلے کی طرح سوکھ گئے ہیں اور جاگیردار موٹے تازے ہو گئے ہیں۔ اے جاگیردار میری یہ نصیحت مان لے کہ زمین کا اپنا حصہ صرف بقدرِ رزق اور قبر کی ضرورت کے مطابق رکھ، اس سے زیادہ طلب نہ کر۔

علامہ کے کلام کا اکثر حصہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے حالات پر منطبق ہو سکتا ہے۔ یہاں میں مثال کے طور پر بانگِ درا کے چند اشعار بھی پیش کر دینا چاہتا ہوں ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنّ الملوک سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

اسی نظم میں آگے چل کر مغرب کے جمہوری نظام پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اس سلسلے میں بانگِ درا کا کلام معتبر نہیں کیوں کہ علامہ نے اپنے خیالات سے بعد میں رجوع کر لیا تھا لیکن میں عرض کروں گا کہ یہ بات آپ صرف تصورِ وطنیت کے متعلق کسی حد تک کہہ سکتے ہیں جن خیالات کے اشعار میں نے نقلِ قول کے طور پر پیش کئے ہیں ان خیالات میں آخر وقت تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسی طرح اقبال مرحوم اسرارِ خودی میں امتیازِ عبد و حر کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

نکتۂ میگویمت روشن چو دُر تا شناسی امتیازِ عبد و حر
عبد گردد یاوہ در لیل و نہار در دلِ حُر یاوہ گردد روزگار
عبد از ایام می باقد کفن روز و شب را می تند بر خویشتن
سینۂ آزادہ چابک نفس طائرِ ایام را گردد قفس

ہمتِ حُر با قضا گردد مُشیر　　　حادثات از دستِ او صورت پذیر

ترجمہ: میں تجھے ایک روشن نکتہ بتاتا ہوں تاکہ تو آزاد اور غلام میں فرق کر سکے۔ غلام رات اور دن کے چکر میں پھنس کر رہ جاتا ہے لیکن آزاد کی وسعتِ قلبی میں زمانہ سما جاتا ہے۔ غلام زمانے کا پابند ہو کر اسے اپنا کفن بنا لیتا ہے لیکن آزاد آدمی وقت کے پرندے کو قید کر لیتا ہے اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے۔

"پس چہ باید کرد" میں مردِ حُر کے متعلق فرمایا ہے ؎

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ　　　زندگی او را حرام از بیمِ مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر　　　مرگ او را می دہد جانے دگر

ترجمہ: یعنی غلام کو ہر وقت موت کا خوف ستاتا رہتا ہے اور اس کی زندگی حرام کر دیتا ہے لیکن مردِ آزاد کی شان ہی نرالی ہے کہ موت اس کے لئے ایک نئی زندگی کا سبب بن جاتی ہے گویا بقول میر ؎

موت ایک زندگی کا وقفہ ہے　　　یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

بانگِ درا کا ایک زبان زدِ خاص و عام شعر ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب　　　اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

اسی قسم کے ضربِ کلیم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت　　　محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور　　　محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

ارمغانِ حجاز کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرما لیجئے ؎

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ　　　محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید　　　آزاد کا دل زندہ و پُرسوز و طربناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم　　　محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

زندگی کو لوگوں نے دو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے کچھ لوگوں کا زاویۂ نظر مایوس کن اور قنوطیت کا ہے لیکن کچھ لوگوں نے ایک پرامید اور رجائی نظر ڈالی ہے۔ علامہ مرحوم کا زندگی کے متعلق نقطۂ نظر رجائی اور پرامید ہے وہ زندگی سے خود بھی مایوس نہیں اور دوسروں کو مایوسی کی تلقین بھی نہیں کرتے۔ وہ زندگی کو ایک مفید چیز اور جد و جہد کا مقام سمجھتے ہیں اور زندگی میں فعالیت کا درس دوسروں کو دیتے ہیں۔ علامہ مرحوم کا بنی نوعِ انسان پر یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے لوگوں کو قنوطیت کے بڑھتے ہوئے رجحان سے بچا لیا ہے اور ابد الآباد تک ان کا کلام یہ خدمت انجام دیتا رہے گا۔ اسرارِ خودی میں فرماتے ہیں ؎

وائے قومے کز اجل گیرد برات — شاعرش وابوسد از ذوقِ حیات
بوسہ او تازگی از گل برد — ذوقِ پرواز از دلِ بلبل برد
نغمہ ہائش از دلت دزدد ثبات — مرگ را از سحرِ او دانی حیات
در یمِ اندیشہ اندازد ترا — از عمل بیگانہ می سازد ترا

ترجمہ: یعنی اس قوم پر افسوس ہے جو موت سے سامانِ زندگی حاصل کرے اور اس کا شاعر زندگی کے ذوق و شوق سے محروم ہو۔ اس کا بوسہ پھول کی تازگی کو غارت کر دیتا ہے اور بلبل کی طاقتِ پرواز کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کے نغمے تیرے دل سے زندگی کے ذوق کو نکال دیتے ہیں اور تو اس کی جادو بیانی کی وجہ سے موت کو زندگی سمجھنے لگتا ہے اور وہ تجھ کو خیالی دنیا کے سمندر میں ڈال دیتا ہے اور عمل سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اپنے خیالی تصورِ حیات کی بنا پر ہی علامہ مرحوم افلاطون کے فلسفۂ حیات "مسلکِ گوسفندی" سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ وہ اس دنیا کی زندگی کو ایک بڑا فریب اور ناقابلِ توجہ خیال کرتا ہے اس کا خیال ہے کہ زندگی سے زیادہ سے زیادہ بے نیازی برتی جائے تو بہتر ہے۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گفت سرِّ زندگی در مردن است — شمع را صد جلوہ در افسردن است
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود

ترجمہ: افلاطون حکیم جو کہ بھیڑوں کا قدیم مسلک رکھتا تھا اس نے کہا ہے کہ آدمی کی بھلائی اس میں ہے کہ اس زندگی کو ترک کر دے اور شمع کی اصل نور پاشی یہ ہے کہ گل ہو جائے۔ افلاطون دراصل عمل کے ذوق سے محروم تھا اور فنا یا عدم کا دالہ و شیدا تھا۔ اس کے خلاف علامہ کا خیال ہے کہ زندگی حقیقی، زندہ و پائندہ ہے۔ یہاں کی موت بھی دراصل موت نہیں ہے بلکہ نئی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ زندگی کو نت نئی آرزوؤں سے فعالیت کی حدت سے ہمیشہ متحرک اور جاندار رکھنا چاہیئے۔ بے آرزوئی اور مایوسی کی زندگی فطرت اور خدا دونوں سے بغاوت کے مترادف۔ بے مقصد زندگی موت سے بدتر ہے۔ زندگی میں کوئی مقصد کوئی نصب العین ضرور ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں اسرارِ خودی میں فرمایا ہے ؎

زندگانی را بقا از مدعاست — کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار — تا نہ گردد مشتِ خاکِ تو مزار

آرزوئے حیات کے بارے میں پیامِ مشرق میں رقم طراز ہیں ؎

دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم — نمی دانم چہ می خواہم چہ جویم
برآید آرزو یا برنہ آید — شہیدِ سوز و سازِ آرزویم

اگر ز رمزِ حیات آگہی مجوئے و مگیر   ولے کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است

زبورِ عجم میں آرزو کی خامکاری کے متعلق کیا خوب فرمایا ہے ؎

گماں مبر کہ نصیبِ تو نیست جلوۂ دوست
درونِ سینہ ہنوز آرزوئے تو خام است

تلاشِ مقصود کے سلسلے میں غالباً ارمغانِ حجاز ہی میں معرفتِ حق کے متعلق ایک شعر ہے ؎

سوز و گدازِ زندگی لذتِ جستجوئے تو
راہ چو مار می گزد گر نہ روم بسوئے تو

اشعار کے اس مختصر سے انتخاب سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ علامہ مرحوم و مغفور نے صرف مسلمانوں کو ہی مخاطب کر کے اشعار نہیں لکھے بلکہ زندگی کے ہر پہلو پر ایک انسان کی حیثیت سے بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کا پیغامِ عمل، حفظِ خودی کی تشویق۔ بلند نظری کی دعوت۔ پانسپاری اور استقلال کی ترغیب۔ بلاکشی اور صلابت کی ذوق آفرینی۔ انفرادیت اور شخصیت کے تحفظ کی نصیحت اور اس کے دوسرے متعدد موضوعات کا مخاطب پورا انسانی معاشرہ ہے اور اس سلسلے میں ان کا تمام کلام آفاقی اور عالمگیر ہے کمال ہے اگر کسی شخص کو علامہ کے اشعار میں آفاقیت و ہمہ گیری نظر نہ آئے اور وہ بزعمِ خود مرحوم کو فرقہ پرست یا مسلمانوں کا شاعر گردانے۔

نعیم صدیقی

●

آنسو ذرا ٹپک گئے، بس وہ چہک گئے
چھینٹے پڑے تو اور بھی شعلے بھڑک گئے،

اے شوق! تیرے ساتھ گئے، دُور تک گئے
ہم دور تک گئے تھے مگر اب تو تھک گئے

رنگِ شفق، فروغِ سحر، جلوۂ بہار!
کی تھی نظر کہ سینکڑوں پردے لٹک گئے

اللہ ری بے کسی کہ وہ پلکیں بھی نم ہوئیں!
جیسے اندھیری رات میں تارے چھٹک گئے

اُٹھو کہ ولولوں کی گھٹائیں اُمڈ پڑی ہیں،
آؤ کہ آرزوؤں کے ساغر کھنک گئے

خود ان کو بڑھ کے منزلِ جاناں نے لے لیا
جو نہی مسافرانِ محبت بھٹک گئے

مینائے دل سے اُڑ رہے غم اُنڈیلا ہیں کیا
پل میں وہ نیلگوں سے کٹورے چھلک گئے

اس گلستاں میں جب کوئی غنچہ چٹک گیا
کیوں مالیوں کے سینوں میں کانٹے کھٹک گئے

پہنچے جہاں جہاں سے پکارا ہے عشق نے
ہم قتل گاہِ ناز میں بھی بے دھڑک گئے

جس نے بھی کھایا زخم ہمارا جگر کٹا
جس پر بھی تیرا تیر چلا، ہم پھڑک گئے

اس دَور میں تو حُسن بھی دیوانہ ہو گیا
گھونگھٹ اُلٹ دیئے گئے! آنچل ڈھلک گئے

رندوں کی مستیاں تو کوئی راز ہی نہ تھیں!
زہّاد کو بھی دیکھئے کیسے بہک گئے

اب کس کی شرم! جو مئے باطل کے بائے ناز!
حق بات کہنے والے تو سولی لٹک گئے

کوثر نیازی

●

بے غرض، بے لوث، پاکیزہ رفاقت چاہیئے
اے ہجومِ دوستاں! مجھ کو محبت چاہیئے

کون جانے! کب وہ ٹھہرائیں ہمیں شایانِ لطف
ہر گھڑی اجڑے ہوئے دل کی یہ حالت چاہیئے

حسن خود نکلے گا پھر جستجو دیوانہ وار،
اے جنونِ عشق! بس تھوڑی سی غیرت چاہیئے

چند لمحوں کا نہیں ہے، عمر بھر کا کام ہے
ہر قدم پر راہِ الفت میں عزیمت چاہیئے

مسکرا کر بس یہ فرما دیجئے "ہم کو قبول"
آپ سے نقدِ دل و جاں کی یہ قیمت چاہیئے

ہر نفس آلائشیں ہیں ہر گھڑی رنج و محن،
اس نظامِ ظلم پرور سے بغاوت چاہیئے

شاعری کوثر نہیں آساں اس کے واسطے
رنگِ اصغر چاہیئے، اندازِ حسرت چاہیئے

حبیب کیفوی

●

سراغ اصلِ حقیقت کا پا نہیں سکتے
گرے ہوئے ہیں جو پردے اٹھا نہیں سکتے

کسی کو حال سے واقف بنا نہیں سکتے
گزر رہی ہے جو دل پر سنا نہیں سکتے

جنوں ہی میرے لئے ہوش ہے جنوں ہی خرد
متاعِ زیست یہی ہے لٹا نہیں سکتے

کسی کا حسنِ دلآویز ہی کچھ ایسا ہے
ہزار چاہیں بھی، دل سے بھلا نہیں سکتے

نگاہِ شوق کا مرکز بنا لیا ہے تو اب
جمالِ یار سے نظریں ہٹا نہیں سکتے

ٹھکانہ کوئی بھی جچتا نہیں نگاہوں میں
حضورِ حق کے سوا سر جھکا نہیں سکتے

نگاہِ دادِ طلب چاہتی ہے چیخ اٹھیں
کمالِ ضبط ہے ایسا جتا نہیں سکتے

بنتِ مجتبیٰ مینا

●

کون ہے! کون ہے جو آنکھوں میں گھُلا جاتا ہے
غمِ دل اب غمِ انساں میں ڈھلا جاتا ہے
لبِ ہر خار پہ ٹپکاتا ہوا خونِ جگر،
اِک مسافر ہے کہ منزل کو چلا جاتا ہے
یُوں تو بُت خانہ کی جانب سے بہت بچ کے چلے
اے خدا! دامنِ دل پھر بھی کھنچا جاتا ہے
ہاں تری نگہِ کرم ہی نے جلایا تھا چراغ
پھیر لی تو نے نظر کیا کہ بجھا جاتا ہے
جب بچھڑ جائے رہِ شوق کا ساتھی کوئی
یہ وہ صدمہ ہے جو مشکل سے سہا جاتا ہے
کبھی پیمانۂ ماضی! کبھی جامِ فردا!
دور چلتا ہے تو چلتا ہی چلا جاتا ہے
خالیٔ ذوقِ طلب! — اور قدح خواروں میں؟
شعلۂ مئے دلِ مینا میں بجھا جاتا ہے!

———

راسخ عرفانی

●

خزاں دیدہ چمن کو گل بداماں کون دیکھے گا
خدا جانے کہ پھر فصلِ بہاراں کون دیکھے گا
تمہیں نے درد بخشا ہے تمہیں ہو متعجب مجھ سے
مرے سینے کے اب یہ داغِ پنہاں کون دیکھے گا
ترے آشفتہ سر دیکھیں کہاں تک سر پٹکتے ہیں
شکستہ ہو گی کب دیوارِ زنداں کون دیکھے گا
ابھی تو نوکِ مژگاں اشکِ پیہم سے مزین ہے
مسرت کو لبِ حسرت پہ خنداں کون دیکھے گا
شبِ تیرہ کے یہ لمحات بھی اب تو غنیمت ہیں
مری جانِ سکوں صبحِ فروزاں کون دیکھے گا
مجازی عشق کی جب سرحدیں ہم پھاند جائیں گے
ترے جلووں کو اے حسنِ نمایاں کون دیکھے گا
بجا ہے، وہ بتِ کافر مسلماں ہو یہ ممکن ہے
مسلماں کو مگر راسخ مسلماں کون دیکھے گا

———

افتخار اعظمی

●

دلبری عام سہی، رسمِ وفا عام نہیں — لذتِ درد کا دنیا میں کہیں نام نہیں
کر دیا آج دل و جاں ترے قدموں پہ نثار — زندگی میری رہِ عشق میں ناکام نہیں
میرے ہی بیخودیٔ شوق کی تقصیر ہے یہ — یعنی تیری نگہِ ناز پہ الزام نہیں
ان میں اِک ربط ہے، جیسے گلِ رنگیں میں شمیم — غمِ محبوب حریفِ غمِ ایام نہیں
چشمِ ساقی کا ہے دراصل یہ فیضانِ نشاط — مستیٔ شوق رہینِ مئے گلفام نہیں

آج اِک نور برستا ہے چمن زاروں پہ — اب کوئی مُرغِ چمن زادِ تہِ دام نہیں،
مذہبِ عشق میں عصیاں ہے تمنائے سکوں — موت ہے عشرتِ ساحل، کوئی انجام نہیں
کیوں خفا مجھ سے ہے اے موجِ نسیمِ سحری — زلفِ جاناں کا ترے دوش پہ پیغام نہیں
جس کو توقیرِ جنوں کا نہ رہے کچھ بھی خیال — تیری محفل میں وہ شائستۂ اکرام نہیں
اِک نقطہ میں ہی رہا گرمِ رہِ منزلِ شوق — ورنہ اِس قافلے میں کوئی سبک گام نہیں
تو کہاں جائے گا اب اے دلِ مضطر کہ تجھے — گیسوئے یار کے سائے میں بھی آرام نہیں،
دشت و کہسار کی اب بھی ہے وہی تشنہ لبی — سایۂ ابر تو ہے، فیض مگر عام نہیں،
زلف و کاکل میں نہ اُلجھی، نہ رخ و ابرو میں — نگہِ شوق کی پرواز سرِ بام نہیں،
دلِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے — ایک نغمہ ہے، سکوتِ سحر و شام نہیں

چہرۂ صبحِ حقیقت سے اُٹھا دی جو نقاب
نور ہی نور ہے، اب ظلمتِ اوہام نہیں

آپ کیا پڑھیں؟

● "انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام" ۔ مصنف جناب عبدالحمید صدیقی ایم اے

یہ اپنی نوعیت کی ایک قابلِ خیر مقدم کتاب آئی ہے۔ اس ایک کتاب کو پڑھ کر آپ جدید تہذیبِ الحاد کا پورا فکری جائزہ لے سکتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ مؤلف نے اپنے وسیع مطالعہ کا حاصل پیش کرتے ہوئے ان جدید ناقدانہ رجحانات کو نمایاں کر دیا ہے جو خود مغرب کے اونچے مفکرین میں مادی نظریات کے لمبے تجربے کے بعد ردِ عمل کے طور پر ابھر آئے ہیں۔ وقت کی بہترین کتابوں کے اقتباسات ہمیں جھنجھوڑ کر غیرت دلاتے ہیں کہ تم جن کی تقلید میں مرے جا رہے ہو وہ تو خود اپنے فکر و نظام سے بیزار ہو کر کسی نئی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ اس کتاب کی رُو سے مستقبل اسلام کا ہے، بشرطیکہ اس کو ایک فکری اور عملی طاقت کی حیثیت سے پیش کرنے والے مسلمان نوجوان میدان میں آئیں۔ کاش کہ یہ کتاب اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں شامل ہوتی۔

شائع کردہ: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان، اچھرہ، لاہور۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

● ماؤزے تنگ کے دیس میں ۔ مصنف کارلو بیگو۔ مترجم جیلانی بی اے۔

یہ کتاب ایک نوشتہ ہے اطالوی مبلغِ عیسائیت فادر کارلو بیگو کا۔ یہ پادری ۱۹۴۸ء میں چین میں گیا اور سرخ فوج نے اسے گرفتار کر لیا۔ پہلی ناکام کوشش کے بعد یہ شخص جنوری ۱۹۴۷ء میں فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ اس کی آپ بیتی صرف آپ بیتی ہی نہیں بلکہ چینی انقلاب کے بعض اہم خد و خال کا البم بھی ہے۔ مترجم مشہور ادیب ہیں۔ نہ جانے کیوں ترجمہ میں ادبی کمزوریاں بکثرت رہ گئیں۔

شائع کردہ: مکتبہ چراغِ راہ، کراچی و لاہور۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔

● اشتراکی چین اور مذہب ۔ مؤلف جناب ارشاد احمد مدیر تسنیم

حال ہی میں پاکستانی اخبار نویسوں کا ایک وفد خیر سگالی کی رسم کے تحت چین گیا تھا اس وفد کے رکن ارشاد احمد صاحب بھی تھے۔ انہوں نے وہاں کا آنکھوں دیکھا حال بڑی خوبی سے کئی اقساط میں لکھا اور سرخ انقلاب کے تحت نئی زندگی کے نشو و نما کا ہر پہلو سے مفصل جائزہ لیا۔ اسی جائزہ کی ایک فصل کتابچے کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ حکومتِ چین کی مذہبی رواداری کے مظاہر اور ان کی اصل حقیقت کو اس میں بغیر کسی گہرے تعصب کے بیان کر دیا گیا ہے۔

شائع کردہ: مکتبہ جماعتِ اسلامی، کانپور (انڈیا)۔ قیمت ۴ر آنے

●

دستورِ ادارۂ ادبِ اسلامی ہند — مرتبہ ادارۂ ادبِ اسلامی

ہندوستان میں تعمیری اور انسانی ادب کی تحریکیں کچھ عرصہ سے چل رہی تھیں۔ انہی کے طرزِ فکر پر اب ادارۂ ادبِ اسلامی بھی استوار ہوا ہے۔ اس کا دستور ابھی ابھی پاس ہو کر آیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک ادبی ادارے کا دستور باقاعدہ ایک "پارٹی" کی طرح کا بھاری بھرکم دستور ہے۔ بطور منشور جو پیرایۂ آغاز اس میں درج ہے وہ اسلام کے سماجی اور سوشل نظریے کو انقلابی اور سائنٹفک انداز میں ہمارے سامنے نہیں لاتا جس سے ایک نظریۂ ادب اخذ ہوتا ہو بلکہ محض اسلام کے عقائد کو پیش کرتا ہے۔ لائحہ عمل اور شرائطِ رکنیت کی نوعیت ایسی ہے کہ ادارۂ ادب کے لئے عمومی پھیلاؤ ممکن نہ ہوگا۔ ادارۂ ادب کے بانیوں کے جذبہ و مقصد سے ہم آہنگی رکھنے کے باوجود ہم اس دستوری ہیئت سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ قیمت چار آنے

●

سیرت پراجکٹ — مرتبہ ملت ہائی اسکول، ملتان

ملت ہائی اسکول ایک دلچسپ اور امید افزا تعلیمی تجربہ گاہ بنتا جا رہا ہے۔ جدید طریقہ ہائے تعلیم میں ایک دلچسپ طریق یہ ہے کہ درسگاہ کسی موضوع پر ایک ہفتے یا پندرہ روز کا تعلیمی و نصابی منصوبہ بنا لیتی ہے اور پھر تمام درجوں اور تمام مضامین میں وہی موضوع مدتِ منصوبہ کے لئے اختیار کر لیا جاتا ہے۔ اس سے مضامین کے تنوع میں مقصد کی مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک موضوع پر طالب علم کو بیک وقت ہر جانب سے مواد ملتا ہے اور ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ طریقِ منصوبہ سے وہ بے کیف یکسانی بھی غائب ہو جاتی ہے جو درسگاہوں کی فضا پر چھائی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں ابتداءً جامعہ ملیہ دہلی نے طریقِ منصوبہ پر کام کیا تھا۔ اب ملت ہائی اسکول نے مملکت کے جدید اسلامی دستور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس طریق پر نئے رنگ کے تجربات شروع کئے ہیں۔ پہلے "رمضان پراجکٹ" لیا گیا تھا اور اب ربیع الاول میں "سیرت پراجکٹ" زیرِ عمل لایا گیا۔ اس پراجکٹ کا مطبوعہ نصابی نقشہ ہمیں بھیجا گیا ہے۔ اس کو مرتب کرنے والوں کی ذہانت کی داد دینا واجب ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اگر اسے مہارت سے زیرِ عمل لایا جائے تو دو ہفتے میں طلبہ اسلامیات میں اتنا کچھ سیکھ سکتے ہیں کہ عام طریق پر شاید چھ ماہ میں بھی نہ سیکھ سکیں۔ کمال یہ کہ دوسرے تمام مضامین کے نصابی تقاضے ساتھ ساتھ از خود پورے ہوتے جاتے ہیں۔ "سیرت نبی" کے موضوع کو لے کر ریاضی اور جغرافیے اور سائنس تک کے لئے نقشۂ کار نکال لینا ایک قابلِ قدر تعلیمی کارنامہ ہے۔ اس پراجکٹ کی روشنی میں ہمارے خداوندانِ تعلیمات اگر کاوش کریں تو وہ اسلامیات کی تعلیم کے لئے کوئی کامیاب اور قابلِ عمل صورت نکال سکتے ہیں۔ ورنہ اب تک جمود ہی جمود ہے!

غالباً فروخت کے لیے عام اشاعت نہیں کی گئی۔

●

نوائے فردا — ایوب

یہ مجموعہ کلام ہے جناب شیخ محمد ایوب صاحب کا جو مرکزی وزارتِ مواصلات پاکستان کے نائب مشیرِ مالیات ہیں۔ موصوف کی ذہانت

اور شعری کاوش کا کمال ہے کہ مجموعۂ کلام لفظاً معنیً اور اشاعتی پیرائے اور ضخامت سب ہی پہلو سے اقبال کی زبورِ عجم اور پیامِ مشرق کا مثنیٰ ہے۔ غزلوں کی بحریں وہی، قافیہ و ردیف وہی اور پھر مطالب وہی۔ اس پہلو سے تو یہ کارنامہ بالکل لاجواب ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ ایک حقیقت ہے کہ جس راستے سے اقبال جیسے شاعر ایک بار گزر جاتے ہیں اور معنی و فن کے پودوں سے گلچینی کر لے جاتے ہیں، پھر اس راستے میں دوسروں کے لئے کچھ رہتا نہیں یہی وجہ ہے کہ شاعری اور آرٹ کے میدانوں میں تقلیدِ محض کی روش کبھی کسی کو امتیازی مرتبے پر نہیں لاتی۔ بڑے صاحبِ فن وہی ہوتے ہیں جن کا اپنا رنگ ہو اور اس میں ان کا اپنا "انا" اور ان کی اپنی شخصیت بولے۔ پس نوائے فردا اقبال کا ایک ایسا عکس ہے جو خراجِ حیرت ضرور وصول کرتا ہے مگر آدمی کو اس سے کوئی مزید حاصل ہاتھ نہیں آتا۔ مقدمہ ڈائریکٹر اقبال اکیڈیمی کراچی جناب محمد رفیع الدین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی کے قلم سے ہے۔ — ملنے کا پتہ: فیروز سنز۔ لاہور، کراچی، پشاور۔ قیمت مجلد پانچ روپے۔

●

جرائد ——— :

— اسلامک لٹریچر (انگریزی) نے "اسلامی تمدن بمقابلہ تمدنِ مغرب" کے عنوان سے خاص نمبر نکالا ہے۔ کچھ مقالات قدر و قیمت کے حامل ہیں اور کچھ الجھنوں بھرے۔

بہ ادارت جناب محمد مظہر الدین صدیقی۔ مقامِ اشاعت کشمیری بازار لاہور۔ چندہ سالانہ: دس روپے۔ فی شمارہ عہ۔

— ماہنامہ تخلیق، کراچی۔ پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ زندگی کی حقیقتوں سے فرار کھنے والے ادب سے ہٹ کر "اچھا ادب" پیش کرنے کے ارادے ہیں۔ کسی نظریہ کی بندشوں سے تخلیق آزاد ہے۔ پہلے شمارے میں مختلف حلقوں سے تعلق رکھنے والے نامور اور نوخیز دونوں ہی قسم کے اصحاب شریکِ ترتیب ہیں۔ مواد خاصا دلچسپ اور اشاعتی معیار بہتر ہے۔ چندہ سالانہ ۸ روپے۔ فی پرچہ ۱۲/

— ماہنامہ تحریک۔ دریا گنج، دہلی۔ یہ گوپال متل کی ادارت میں نکلنے والا شہرت یافتہ معیاری رسالہ ہے چندہ سالانہ چار روپے فی پرچہ ۶/ آنے۔

— ماہنامہ "جمہوریت" کراچی۔ بادارت ابوالظفر آزاد۔ چندہ سالانہ ۴ روپے۔ فی پرچہ ۶/

— ماہنامہ "مدینہ" لاہور۔ بادارت جناب محمد میاں صدیقی۔ چندہ سالانہ تین روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ ۴/

— اخبار نوائے ہمدرد۔ اردو بازار لاہور۔ بادارت جناب عظمت درّانی۔ چندہ سالانہ تین روپے۔ فی پرچہ ۲/

— ہفت روزہ ہلالِ نو۔ بنوں۔ بادارت ایم اسلم خاں۔ چندہ نامعلوم۔

ادارۂ خواتین کی مطبوعات

فردوس کی راہ

(تین حصوں پر مشتمل مکمل سیٹ)

الحاد اور اخلاقی بے راہ روی کے اس دور میں مبارک ہیں وہ نفوس جو نہ صرف اپنے دامن کو اس گندگی سے بچانے کی جدوجہد کرتے ہیں بلکہ جنہوں نے اپنی آئندہ نسلوں کو بھی اس بے دینی اور بداخلاقی و بے حیائی کے طوفان سے بچانے کے لئے اپنی ساری صلاحیتوں کو میدان میں لا ڈالا ہے۔ 'فردوس کی راہ' کے نام سے یہ تینوں مجموعے ایسی ہی چند حساس اور اپنے ماحول سے نبرد آزما بہنوں کے ہلکے پھلکے مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہیں۔ اس کا مطالعہ خواتین کو اپنی زندگیوں پر ایک نئے زاویہ سے غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ پہلا حصہ ۱۲/۱/ ، دوسرا حصہ ۱۲/۱/ ، تیسرا حصہ ۲/-/-

اپنی گھریلو زندگی

کو خوشگوار بنانے کا خواہش مند کون نہیں ہوتا۔ زندگی کی تعمیر کے کئی نقشے پیش کئے جاتے ہیں اور کہیں دولت کے بل پر کہیں اقتدار کے بل پر اور کہیں چالاکی اور عیاری کے بل پر زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن ـــ

تعمیر حیات میں

آپ کو زندگی کی تعمیر کا ایک نیا نسخہ ملے گا۔ مختلف خواتین کے خیال افروز مضامین کا دلچسپ مجموعہ صرف دو روپے چار آنے میں طلب فرمائیں۔

کیا پردہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے؟

پروین رضوی کی وہ معرکۃ الآرا تقریر جو انہوں نے نشتر میڈیکل کالج ملتان میں منعقدہ آل پاکستان انٹر کالجیٹ مباحثہ میں ایسے واضح اور معقول دلائل اور ایسی روانی اور شستگی کے ساتھ کی کہ ایوان کی عظیم اکثریت نے پردہ کے حق میں رائے دی۔ پروین رضوی صاحبہ کو اس تقریر پر پہلا انعام ملا۔ قیمت : ۱/۱/۶

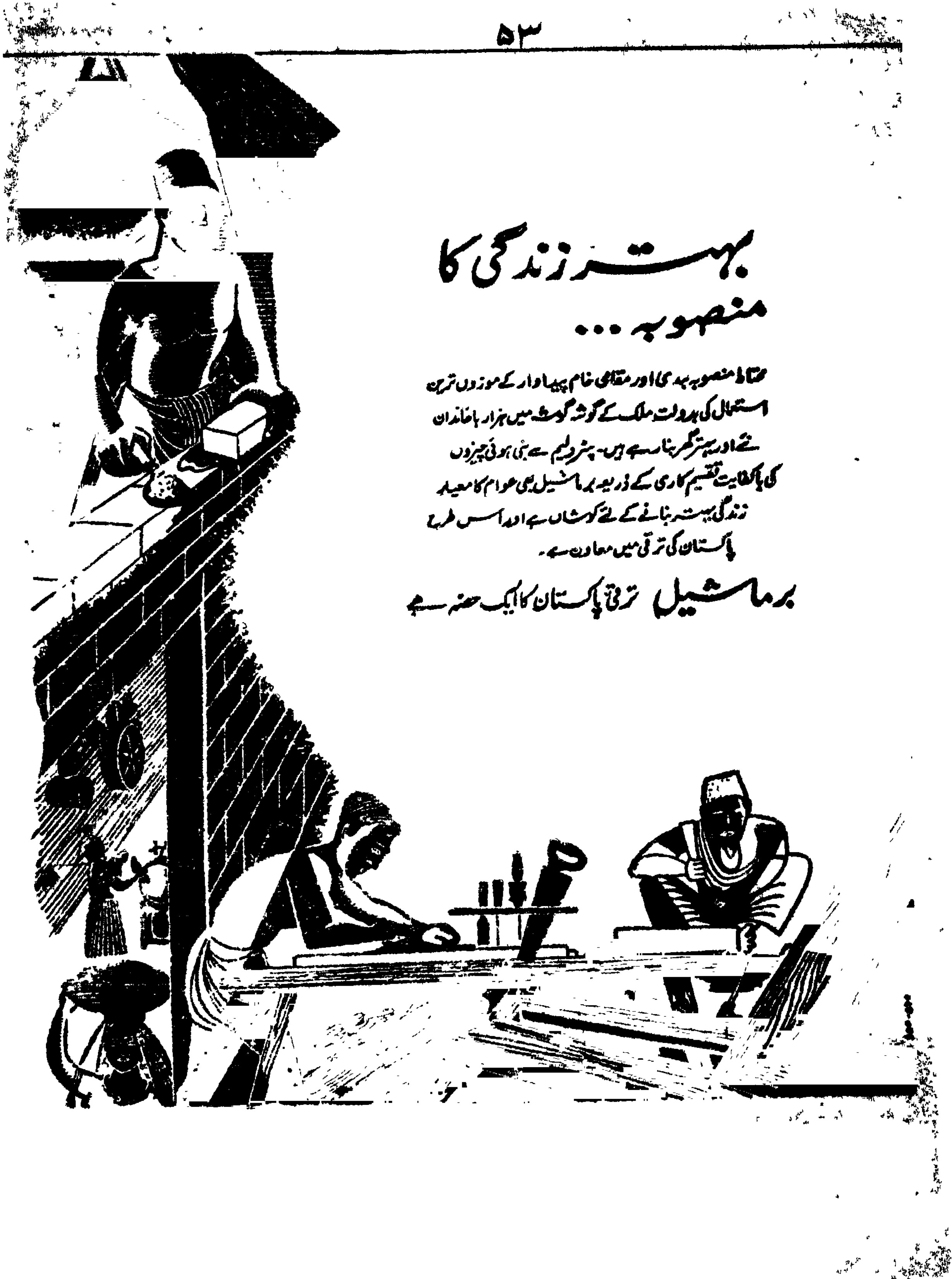
شادی کمیشن کی رپورٹ پر ایک نظر

شہزادی عابدہ سلطان کا شادی کمیشن کی رپورٹ پر بے لاگ تبصرہ اس قابل ہے کہ ہر پڑھی لکھی خاتون اس کا بغور مطالعہ کرے۔
قیمت ۳ر آنے

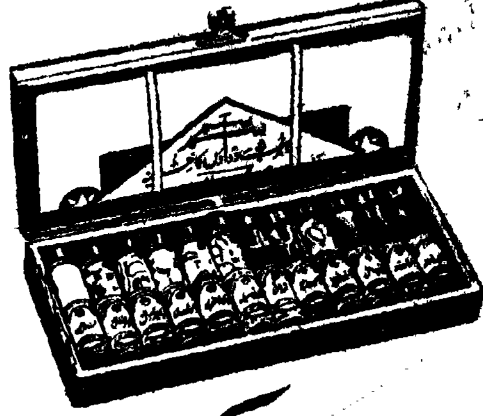
کنیز

نظر زیدی

کے اس ناول کے کرداروں کی حیثیت تاریخی نہیں لیکن اس کا پس منظر اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ قریب قریب حقیقی ہے۔ یہ اس دور کی ایک خیالی داستان ہے جب فاران کی چوٹیوں سے اسلام کی پہلی کرن طلوع ہوئی تھی۔


بہتر زندگی کا
منصوبہ ...
محتاط منصوبہ بندی اور مقامی خام پیداوار کے موزوں ترین
استعمال کی بدولت ملک کے گوشہ گوشہ میں ہزارہا خاندان
نئے اور بہتر گھر بنا رہے ہیں۔ پٹرولیم سے بنی ہوئی چیزوں
کی باکفایت تقسیم کاری کے ذریعہ برماشیل بھی عوام کا معیار
زندگی بہتر بنانے کے لئے کوشاں ہے اور اس طرح
پاکستان کی ترقی میں معاون ہے۔
برماشیل ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے

آپ بھی ڈاکٹر کا بل ۸۰ فیصدی کم کرسکتے ہیں



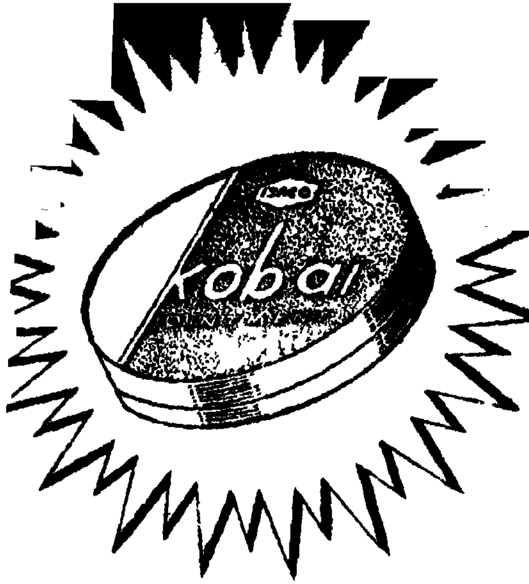
سفر حج کے لئے بہترین تحفہ

بارہ مجرب دواؤں کا خزینہ

گھریلو علاج اور اہل محلہ کی طبی خدمت کا آسان اور قابل اعتماد ذریعہ
یہ بارہ دوائیں بڑی حد تک آپکی طبی ضروریات کو پورا کردینگی
مثلاً بخار کھانسی۔ درد نمونیا اختلاج قلب خفقان گھبراہٹ ملیریا قبض
اسہال پیچش۔ درد شکم خرابی جگر قے متلی بدہضمی ہیضہ درد سر نزلہ زکام۔
بھگندر بواسیر خونی۔ درد دنداں۔ درد گوش۔ حاملہ کی تکلیفات۔ بچوں کی جلد
تکلیفات خارش فساد خون۔ چوٹ اور زخم وغیرہ تکالیف کا خاطر خواہ علاج
محض ان ہی مختصر دواؤں سے کیا جاسکیگا۔ قیمت بارہ روپے فی بکس

آئی ساکو (پاکستان) کراچی

تیار کنندگان ادویہ
گارڈن ٹرام ٹرمینس۔ کراچی ۳



کوبائی

داد، اکزیما اور دیگر جلدی امراض کا بہترین مرہم

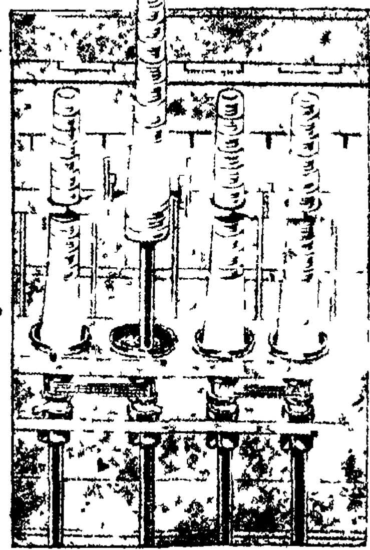
مہاسوں اور چہرے کے دانوں کا موثر ترین علاج

قیمت:۔ ایک روپیہ فی ڈبیہ

آئی ساکو پاکستان کراچی

(تیار کنندگان ادویہ)
اولس روڈ۔ گارڈن۔ ٹرام ٹرمینس۔ کراچی ۳





"ترقی کی شاہراہ پر قدم بڑھائے چلو" یہ ہے وہ نغمہ جو مشینوں سے نکل رہا ہے پارچہ بافی کی صنعت میں ہماری ترقی اطمینان بخش ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کی گنجائش ہے، ہماری کوششیں جاری ہیں اور وہ دن یقیناً دور نہیں جب ہم غیر ملکی کپڑے کی درآمد سے بے نیاز ہو جائینگے

باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

مینجنگ ایجنٹس:- احمد برادرس لمیٹڈ ۲۲-۲۲ زینت مینشن، میکلوڈ روڈ - کراچی

Printer & Publisher S. Kazim Ali